بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ صوبہ سرحد

محمد شفیع صابر

ایم اے (انگلش) ایم اے (اردو)

یونیورسٹی گولڈ میڈلسٹ، انجمن ترقی اردو گولڈ میڈلسٹ

آنرز ان پشتو، آنرز ان پرشین

ناشر

یونیورسٹی بک ایجنسی

خیبر بازار، پشاور

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

اشاعتِ اوّل ——— جون ۱۹۸۶ء
تعداد ——— ۱۱۰۰
خطاطی ——— محمد سعید احمد، محمد عاشق ندیم، لاہور
طابع ——— سید عبدالسلیم آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور
ناشرین ——— یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور

قیمت : ۴۵۰/-

اِنتساب

اُن جیالوں ، سرفروشوں اور مجاہدوں

کے نام

جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر

پرچمِ اِسلام

کو ہمیشہ بلند رکھا!

تاریخ

چیست تاریخ اَے زِ خود بیگانہ — داستانے، قصۂ، افسانہ
اِیں تُرا از خویشتن آگاہ کُند — آشنائے راہ و مردِ راہ گُند
سرزند از ماضیٔ تُو حالِ تُو — خیزد از حالِ تو، استقبالِ تُو
ضبط کن تاریخ را پائندہ شو — از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

مشکن اَر خواہی حیاتِ لا زوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

(علامہ اقبالؒ)

مندرجات

تعارف	۷
صوبہ سرحد کے مختلف تاریخی ادوار	۹
صوبہ سرحد کے گورنر	۱۱
صوبہ سرحد کے وزرائے اعلیٰ	۱۲
نقشہ شمال مغربی صوبہ سرحد	۱۳
نقشہ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے	۱۴
عرضِ حال	۱۵
پختون ـــــ ایک تاریخ ساز قوم	۱۹
صوبہ سرحد ـــــ جغرافیائی خدوخال	۴۳
قدیم دَور	۷۷
صوبہ سرحد کی تاریخی قدامت	۷۹
وادیٔ سندھ کی تہذیب	۱۱۵
ہخامنشی دورِ حکومت	۱۲۱
سکندرِ اعظم کا حملہ	۱۲۷
موریا خاندان	۱۴۳
یاختری یونانی	۱۵۵
ساکا خاندان	۱۵۹
ہندی پارتھین یا پہلوی	۱۶۱
کوشان حکمران	۱۶۵
ساسانی (دَورِ اوّل)	۱۷۹
کوشان کوچک یا کیدارا	۱۸۳
سفید ہُن	۱۸۷
ساسانی (دَورِ دوم)	۱۹۵
تین چینی سیّاح	۱۹۹
کابل شاہی حکمران	۲۰۵
صفاری ایرانی	۲۰۹
ہندو شاہیہ	۲۱۱
اسلامی عہدِ حکومت	۲۱۵
سُلطان محمود غزنوی	۲۱۷
شہاب الدین محمد غوری	۲۳۵
چنگیزی حملے	۲۴۳
تیمور لنگ	۲۵۳
ظہیر الدین بابر	۲۶۳
ہمایوں	۲۷۹
شیر شاہ سُوری	۲۸۷
شہنشاہِ اکبر	۲۹۳
پیرِ روشن یا پیرِ تاریک	۳۰۷
جہانگیر	۳۱۷
شاہ جہان	۳۲۳
اورنگ زیب عالمگیر	۳۳۱
خوشحال خان خٹک	۳۴۱
نادر شاہ	۳۵۵

احمد شاہ ابدالی	۳۶۱
تیمور شاہ	۳۷۷
شاہ زمان	۳۸۳
شاہ محمود اور شاہ شجاع	۳۸۹
بارک زئی حکمران	۴۱۵
امیر دوست محمد خان	۴۲۹
تحریک مجاہدین	۴۳۷
سکھ راج	۴۶۷
انگریزی دورِ حکومت	۵۳۳
انگریز کا دَور	۵۳۵
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء	۵۷۵
جہادِ امبیلہ	۶۰۳
۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۶ء تک	۶۲۹
دوسری جنگِ افغانستان	۶۵۱
۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک	۶۶۳
چترال کی مہم	۶۸۹
۱۸۹۷ء — تاریخِ سرحد کا ایک طوفانی سال	۷۰۱
صوبہ سرحد کا قیام	۷۴۷
پہلی جنگِ عظیم	۷۷۷
افغانستان کی تیسری جنگ	۷۹۳
خلافت اور ہجرت کی تحریکیں	۸۰۹
۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک	۸۲۷
۱۹۳۰ء — قصہ خوانی میں خون کا دریا	۸۵۳
صوبہ سرحد کا آئینی ارتقاء	۸۹۱
خدائی خدمت گار تحریک	۹۰۹
۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک	۹۲۱
صوبہ سرحد کی سیاسی جماعتیں	۹۵۵
قراردادِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک	۹۸۷
پاکستان کا پہلا سال	۱۰۳۱
عبدالقیوم خان کا دورِ وزارت اگست ۱۹۴۷ء — اپریل ۱۹۵۳ء	۱۰۴۹
۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک	۱۰۸۱
دَورِ ایوبی	۱۱۰۳
یحییٰ خان کا دورِ حکومت	۱۱۳۵
فہرست منابع و مراجع	۱۱۵۱

عرضِ ناشر

اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ سرحد کا شمار دنیا کے اُن علاقوں میں ہوتا ہے جہاں سے انسانی تہذیب و تمدن کا سورج طلوع ہوا یہ علاقہ بنی نوع انسان کا اولین ملجاء و ماویٰ رہا۔ یہاں کئی تہذیبوں نے جنم لیا۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ اب بھی صدیوں پرانی داستانیں سُنا رہے ہیں۔ محمد بن قاسمؒ کے علاوہ سب کے سب مسلمان فاتحین صوبہ سرحد سے ہوتے ہوئے ہی برصغیر ہند میں وارد ہوئے۔ ان غازیان صف شکن کے ہمراہ وہ دینی رہنما، مبلغ، عالم اور اہلِ قلم بھی آئے جن کی کوششوں سے یہ سرزمین اسلام کے نور سے منور ہوئی۔ پھر جہاں اپنی جغرافیائی اور تاریخی پوزیشن کے اعتبار سے یہ سرحدی علاقے کلیدی اہمیت کے حامل رہے وہیں یہاں کی پختون آبادی نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور اسلامی حمیت و غیرت کی بدولت تاریخ عالم میں ناقابلِ فراموش کردار انجام دیا اور بڑی شہرت پائی۔

صوبہ سرحد کی اس تاریخی عظمت کا تقاضا تھا کہ یہاں کے حالات و واقعات پر مشتمل کوئی جامع اور مستند تاریخ لکھی جاتی کیونکہ تاریخ ہر قوم کی بڑی قیمتی متاع ہوتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی تاریخ پر قلم اُٹھایا بھی تو سات سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگیوں نے اُٹھایا۔ اس طرح ہم خود اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے اور دوسروں کے بتائے ہوئے معیاروں پر پرکھنے کے عادی ہو گئے۔ یہ بات ایک آزاد اور عظیم قوم کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔

یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور نے اپنے قیام ہی سے اس مقصد کو عزیز رکھا ہے کہ صوبہ سرحد کے تمدن و ثقافت، زبان و ادب، تاریخ و معاشرت پر یہاں کے اہلِ قلم کی ذہنی کاوشوں کی بھرپور نشر و اشاعت کی جائے اسی ضمن میں "تاریخ صوبہ سرحد" مرتب کرنے کی تمنا عرصہ دراز سے ذہن میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔ بالآخر ایک مردِ قلندر نے اس مشکل کام کا بیڑا اُٹھانے کی حامی بھر لی، اور آج "تاریخ صوبہ سرحد" کو آپ کے ہاتھوں میں دیکھ کر مجھے جو اطمینان حاصل ہوا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

کتاب کے مؤلف محمد شفیع صابر مشرقی علوم کے فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب کے رموز

سے بھی شناسا ہیں، وسعتِ مطالعہ کی بدولت وہ ایک متوازن نقطۂ نظر کے مالک ہیں، اپنی علمی اور ادبی خدمات پر وہ ریڈیو پاکستان، پشاور یونیورسٹی، بورڈ آف ہشاریکل سٹڈیز اینڈ ریسرچ اور دوسرے ناموراداروں سے کئی انعامات اور اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ گذشتہ قریباً نصف صدی سے وہ تعلیم وصحافت کے شعبوں میں سرگرم عمل ہیں اور دینی اور علمی حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

کتاب قریباً آٹھ سال پہلے مکمل ہوئی تھی تاہم اس کی طباعت کئی وجوہ سے معرضِ التواء میں پڑی رہی اسی لئے اس میں آٹھ نو سال پہلے ہی کے حالات وواقعات کا احاطہ کیا جا سکا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ کتاب میں اہلِ سرحد کی ادبی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشرتی سرگرمیوں کا جائزہ پیش نہ کیا گیا کہ کتاب کی ضخامت اس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے چاہا تو "تاریخ صوبہ سرحد" کی آنے والی جلدوں میں ان تمام باتوں کی تلافی کر دی جائے گی۔

یہ حقیقت بھی پر واضح ہے کہ کوئی انسانی کوشش بھی مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ "تاریخ صوبہ سرحد" بھی ایک ایسی ہی کوشش اور کاوش ہے۔ قارئین کرام سے استدعا ہے کہ وہ ہمیں کتاب کی خامیوں اور فروگذاشتوں سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن بہتر انداز میں پیش کیا جا سکے۔ شکریہ

خلوص کار

فضل منان میاں

یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور

جون ۱۹۸۶ء

صوبۂ سرحد
کے مختلف تاریخی ادوار

۱ -	ھخامنشی ایرانی	———	۵۵۰	ق م تا	۳۳۱ ق م
۲ -	مقدونی یونانی	———	۳۲۷	ق م تا	۳۰۵ ق م
۳ -	موریا خاندان	———	۳۲۳	〃 تا	۱۹۰ 〃
۴ -	باختری یونانی حکمران	———	۱۸۵	〃 تا	۹۷ 〃
۵ -	ساکا (ایرانی)	———	۹۷	〃 تا	۵ عیسوی
۶ -	انڈوپارتھین	———	۷	عیسوی تا	۷۵ 〃
۷ -	کوشان	———	۶۰	〃 تا	۲۲۵ 〃
۸ -	ساسانی (ایرانی)	———	۲۳۰	〃 تا	۳۶۵ 〃
۹ -	خاندان کِدارا	———	۳۶۵	〃 تا	۴۶۵ 〃
۱۰	سفید ہُن	———	۴۶۵	تا	۵۵۰ 〃
۱۱ -	ساسانی ایرانی (دوبارہ)	———	۵۶۸	〃 تا	۶۴۴ 〃
۱۲	کابل شاہی	———	۶۵۰	تا	۸۷۰ 〃
۱۳ -	صفاری (ایرانی)	———	۸۶۱	〃 تا	۹۰۰ 〃
۱۴ -	ہندو شاہیہ	———	۸۷۰	〃 تا	۱۰۲۱ 〃
۱۵ -	خاندان غزنوی	———	۹۶۰	〃 تا	۱۱۵۰ 〃
۱۶ -	خاندان غوری	———	۱۱۸۱	〃 تا	۱۲۰۶ 〃
۱۷ -	خوارزم شاہ (سلجوقی)	———	۱۲۱۰	〃 تا	۱۲۲۰ 〃
۱۸ -	چنگیز	———	۱۲۲۰	〃 تا	۱۳۶۹ 〃

۱۹۔ تیمور ——— ۱۳۸۰ عیسوی تا ۱۵۰۱ عیسوی

۲۰۔ خاندان مغلیہ ——— ۱۵۲۶ " تا ۱۷۳۹ "

۲۱۔ خاندان افشار (ایرانی) ——— ۱۷۳۹ " تا ۱۷۴۷ "

۲۲۔ درانی (سدوزئی) ——— ۱۷۴۷ " تا ۱۸۱۸ "

۲۳۔ سکھا شاہی ——— ۱۸۲۳ " تا ۱۸۴۷ "

۲۴۔ برطانوی دور ——— ۱۸۴۶ " تا ۱۹۴۷ "

۲۵۔ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان ——— ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء تا حال

نوٹ: یہ نقشہ سراولف کیرو کی کتاب "دی پٹھانز" کے مطابق ہے۔

صوبۂ سرحد کے گورنر

سر جارج کننگھم	اگست ۱۹۴۷ء تا	جولائی ۱۹۴۸ء
سر ایمبروس ڈنڈاس	جولائی ۱۹۴۸ء تا	جولائی ۱۹۴۹ء
صاحبزادہ محمد خورشید	جولائی ۱۹۴۹ء تا	جنوری ۱۹۵۰ء
جناب ابراہیم اسماعیل چندریگر	فروری ۱۹۵۰ء تا	نومبر ۱۹۵۱ء
خواجہ شہاب الدین	نومبر ۱۹۵۱ء تا	نومبر ۱۹۵۴ء
جناب قربان علی خان	نومبر ۱۹۵۴ء تا	اکتوبر ۱۹۵۵ء

لیفٹیننٹ جنرل خواجہ محمد اظہر خان	جولائی ۱۹۷۰ء تا	دسمبر ۱۹۷۱ء
خان حیات محمد خان شیرپاؤ	دسمبر ۱۹۷۱ء تا	اپریل ۱۹۷۲ء
ارباب سکندر خان خلیل	اپریل ۱۹۷۲ء تا	فروری ۱۹۷۳ء
خان محمد اسلم خان خٹک	فروری ۱۹۷۳ء تا	مئی ۱۹۷۴ء
میجر جنرل سید غوث خان	مئی ۱۹۷۴ء تا	۲۸ فروری ۱۹۷۶ء
میجر جنرل نصیر اللہ خان بابر	۲۹ فروری ۱۹۷۶ء تا	۵ جولائی ۱۹۷۷ء
مسٹر جسٹس عبدالحکیم خان	۵ جولائی ۱۹۷۷ء تا	۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء
لیفٹیننٹ جنرل فضل حق	۱۸ ستمبر ۱۹۷۸ء تا	حال

صُوبۂ سرحد کے وزرائے اعلیٰ

خان عبدالقیوم خان ——— اگست ۱۹۴۷ء تا اپریل ۱۹۵۳ء

سردار عبدالرشید خان ——— اپریل ۱۹۵۳ء تا جولائی ۱۹۵۵ء

سردار بہادر خان ——— جولائی ۱۹۵۵ء تا اکتوبر ۱۹۵۵ء

وحدتِ مغربی پاکستان کا دور

مولانا مفتی محمود ——— اپریل ۱۹۷۲ء تا ۱۸ فروری ۱۹۷۳ء

عنایت اللہ خان گنڈہ پور ——— اپریل ۱۹۷۳ء تا یکم مئی ۱۹۷۵ء

نصراللہ خان، خٹک ——— ۲، مئی ۱۹۷۵ء تا ۵ جولائی ۱۹۷۷ء

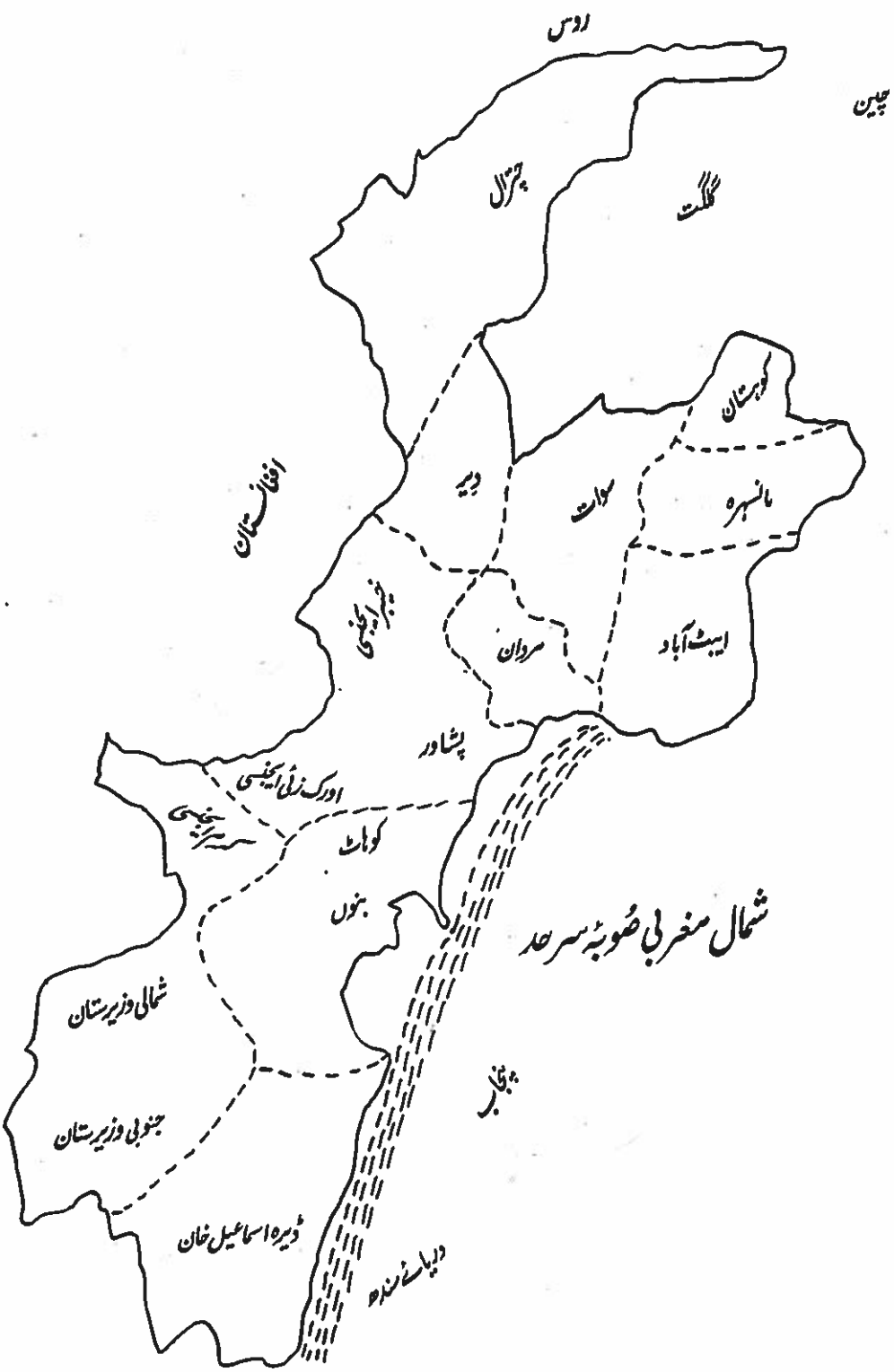
روس
چین
چترال
گلگت
کوہستان
مانسہرہ
سوات
دیر
افغانستان
چارسدہ
مردان
ایبٹ آباد
پشاور
اورک زئی ایجنسی
خیبر ایجنسی
کوہاٹ
بنوں
شمالی وزیرستان
جنوبی وزیرستان
ڈیرہ اسماعیل خان
دریائے سندھ
پنجاب
شمال مغربی صوبہ سرحد

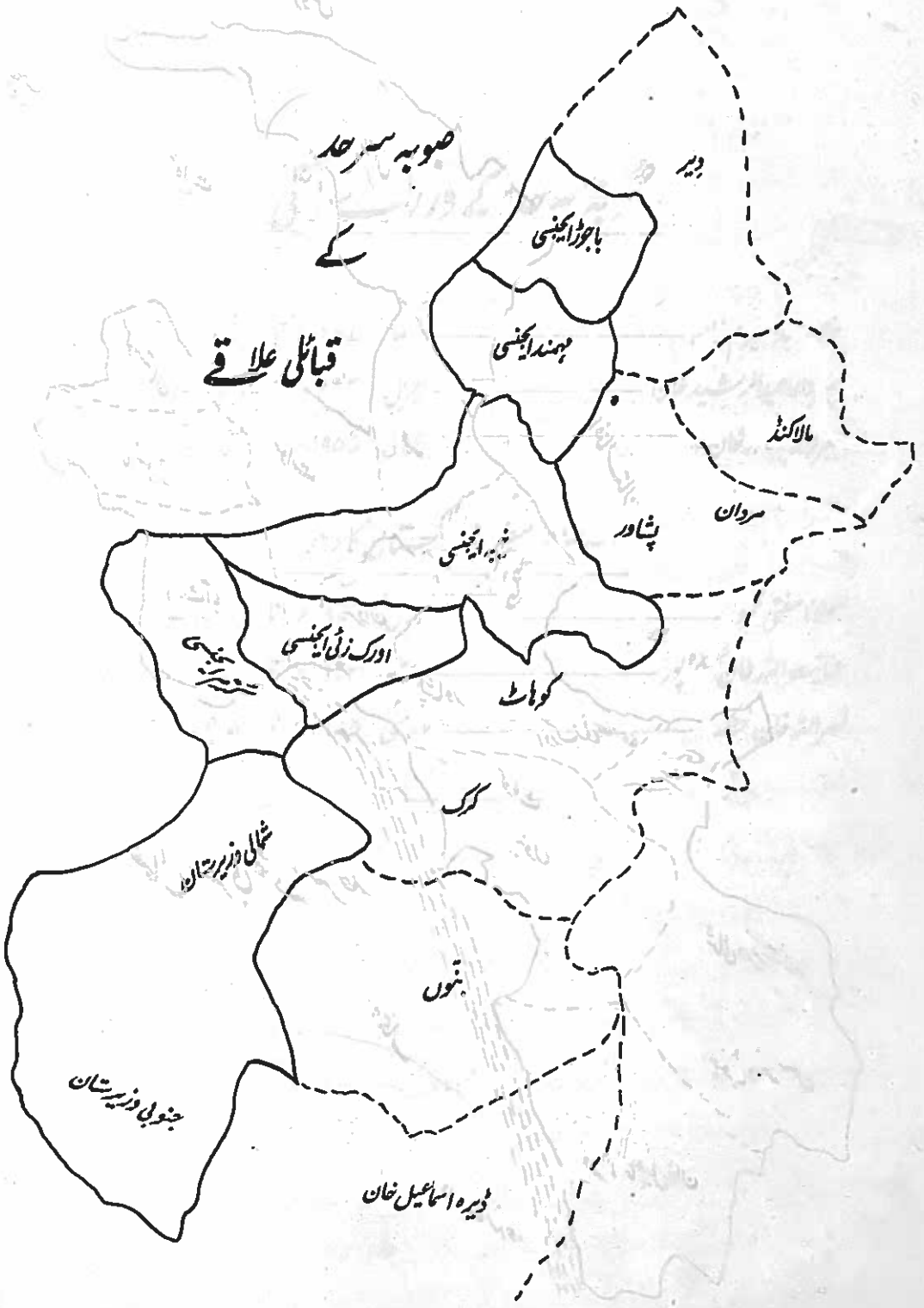
صوبہ سرحد
کے
قبائلی علاقے
دیر
باجوڑ ایجنسی
مہمند ایجنسی
مالاکنڈ
مردان
پشاور
خیبر ایجنسی
اورک زئی ایجنسی
کوہاٹ
کرک
شمالی وزیرستان
بنوں
جنوبی وزیرستان
ڈیرہ اسماعیل خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

الحمد للہ! ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور "تاریخ صوبہ سرحد" چھپ کر قارئین کرام کے ہاتھوں تک پہنچی۔

اسلامی علوم میں تاریخ کو ایک بنیادی علم کی حیثیت حاصل ہے۔ خود قرآنِ حکیم اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر بحث کرکے تاریخی مثالیں پیش کرتا ہے۔ یہ مسلمان علماء ہی تھے، جنہوں نے فلسفۂ تاریخ کی بناء ڈالی اور علم التاریخ کے دائرہ کار کو وسعت بخش کر اُسے سائنس کا درجہ عطا کیا گویا تاریخ انسانی کوششوں، کاوشوں، کارناموں اور کارگزاریوں کا ایک ریکارڈ ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی کسوٹی بھی ہے۔ جس پر اجتماعی نیکی اور بدی اور فضائل و رذائل کو پرکھا جاسکتا ہے۔ تاریخ ہمیں ماضی کا آئینہ دکھاکر اپنے حال و استقبال کی اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے اور ہم خود اپنے محتسب بن کر یہ سوچنے پر مائل ہوتے ہیں کہ ہم کون تھے؟ کیا تھے؟ کیا ہیں؟ اور اب کس طرف جارہے ہیں؟ گویا! تاریخ ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتی، قوتِ عمل بخشتی اور فکری انقلاب سے ہم کنار کرتی ہے اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ جب افکار کی دُنیا میں انقلاب آتا ہے، انسانیت کو نئی زندگی، نئی روشنی، نئی طاقت، نئی حرارت، نیا یقین، نیا تمدن اور نیا معاشرہ ہاتھ آتا ہے اور اس طرح انسانیت کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تاریخ انسان کی تخلیق بھی ہے اور خالق بھی۔

وہ قوم جو اپنی تاریخ سے بے گانہ ہوگئی، ایسے انسان کی مانند ہے، جو اپنا حافظہ کھو چکا ہو، جس طرح انسان حافظہ کھوکر اپنی شخصیت کھو دیتا ہے، اسی طرح تاریخ سے بے نیازی اور بے پرواہی برتنے والی قوم بھی اپنی ہستی کھو بیٹھتی ہے ——— ملّتِ اسلامیہ اس اعتبار سے دنیا کی وہ خوش قسمت قوم ہے، جس کا ماضی درخشندہ روایات کا امین ہے، جس کی تاریخ کا مطالعہ دِلوں کو جوش اور ولولہ عطا کرتا اور اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی ترغیب دیتا ہے ——— مسلمانانِ صوبہ سرحد کی تاریخ تو

بالخصوص بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہاں کے تاریخ ساز لوگوں نے ہزاروں انقلاب دیکھے ہیں، انہیں سینکڑوں حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور انہوں نے بیسیوں تہذیبوں کو اُبھرتے اور ڈوبتے دیکھا ہے۔ اس سرزمین کی تاریخ بڑی دلچسپ اور رنگین ہے اور بے حد سبق آموز بھی، اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ صوبہ سرحد کی تاریخ کو سمجھے بغیر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا، گویا اس خطۂ ارض کی تاریخ کا مطالعہ فی الاصل سارے برصغیر پاک و ہند کے تاریخی مطالعہ کی کلید ہے۔

صوبۂ سرحد کی جغرافیائی اور تہذیبی اہمیت اس امر کی متقاضی تھی کہ اس تاریخ ساز خطے کی تاریخ نگاری کی طرف کما حقہٗ توجہ دی جاتی، لیکن عملاً ایسا ہونے نہ پایا، نامور دانشور پروفیسر حافظ محمد ادریس مرحوم اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ "صوبہ سرحد کے عظیم المرتبت باشندوں نے دینی تحریکوں اور سیاسی انقلابات میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، مگر افسوس ہے کہ اُن کی پُشت پر ایسے اربابِ قلم موجود نہ تھے جو اُن کی قلمی تصویر اُتار کر انہیں زندۂ جاوید بناتے۔ اس طرح بہت سی بے مثال شخصیتیں سامنے آئیں، اور اپنا فریضہ ادا کر کے رخصت ہو گئیں ——— زمانہ آگے بڑھ گیا اور وہ پیچھے رہ گئے ——— نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کارنامے تو موجود ہیں، لیکن حالنامے ناپید ہیں۔" [1]

پھر یہی نہیں کہ صوبۂ سرحد کی کوئی مستند تاریخ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نئی نسل اپنے عظیم اسلاف کے کارناموں سے بے خبر رہی بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں کی تاریخ پر قلم اٹھایا بھی تو غیر ملکی سامراجیوں نے اٹھایا ——— فرنگی اہلِ قلم اور افسروں نے صوبۂ سرحد کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ لیکن جو کچھ لکھا اپنے ہی نقطۂ نظر سے لکھا ——— انہوں نے عمداً برطانوی حکومت اور انگریز عمائدین کے کارناموں کو اُجاگر کیا، ہر جگہ اپنی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھا اور اپنے قلم سے محض سامراجی مقاصد کو تقویت دینے کا کام کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد صوبۂ سرحد کی ایک مستند قومی تاریخ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو صوبائی حکومت نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلی قسط کے طور پر بیس ہزار روپیہ کی رقم مختص کی اور یہ کام ایک ہسٹاریکل بورڈ کو سونپا۔ کئی برس تو صلاح مشوروں میں گزر گئے، پھر مختلف سکالروں کو مختلف موضوع سپرد کئے گئے، لیکن کام آگے بڑھنا تھا نہ بڑھا اور چھتیس[۳۶] سال یونہی بیت گئے۔

---

[1] دیباچہ "تذکرۂ علماء و مشائخ سرحد"

مجھے نہ مورخ ہونے کا زعم ہے، نہ محقق کہلانے کا داعیہ۔ میری جولان گاہ ادب و صحافت کا میدان ہے، تاہم صوبہ سرحد کا ایک شہری اور اس کی تاریخ و ثقافت کا ایک ادنیٰ طالب علم ضرور ہوں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی ہے۔ "داستانِ خیبر"، "قائدِ اعظمؒ اور صوبہ سرحد" اور دوسری کتابیں بھی شائع کی ہیں اور اب "تاریخ صوبہ سرحد" پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ کتاب میرے تیس۳۰ سالہ مطالعہ کا حاصل ہے، اس سلسلے میں جو تحریر بھی ہاتھ لگی۔ اس سے استفادہ کیا، جس وسیلے سے بھی معلومات حاصل ہوئیں، اکٹھی کیں اور جہاں سے بھی کوئی رہنمائی مل سکی۔ اُسے غنیمت جانا۔ برسوں کی دیدہ سوزی اور عرق ریزی کے بعد کتاب مرتب ہوئی، مجھے احساس ہے کہ کتاب کئی پہلوؤں سے تشنۂ تکمیل ہے، تاہم میں نے کام کا آغاز کر دیا ہے، اللہ کرے اہلِ علم آگے بڑھیں اور اس میں اضافے کرتے رہیں ——— کتاب کے قارئین کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ تاریخ ایک فردِ واحد کی کاوش کا نتیجہ ہے نہ کہ ماہرین کے ایک بورڈ کی محنتوں کا ثمرہ ——— فردِ واحد اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

میری یہ ناچیز کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟ ——— اس کا فیصلہ کرنا قارئین کرام کا کام ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ صوبۂ سرحد کی تاریخ پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو خالصتاً قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس نوع کی سابقہ کتابوں سے کہیں زیادہ مفصل اور اَپ ٹو ڈیٹ ہے۔ اس سے قبل اس موضوع پر یا تو فرنگی اہلِ قلم کی نگارشات تھیں، جو سراسر یکطرفہ اور معاندانہ نقطۂ نظر کی حامل تھیں اور یا وہ پشتو تصانیف، جن میں من الحیث القوم افغانوں کے عمومی کارناموں کا احاطہ تو کیا گیا تھا، لیکن صوبۂ سرحد کے حالات و واقعات پر کُلی اور خصوصی توجہ نہ دی گئی تھی ——— ان کے برعکس میری تمام تر توجہ شمال مغربی سرحدی صُوبہ پر مرکوز رہی ہے، زیرِ نظر کتاب میں ماضی کے اختلافی اور نزاعی مسائل سے دامن بچاتے ہوئے دورِ حاضر کے حالات و واقعات، قومی تحریکوں اور جدوجہد آزادی پر زیادہ زور دیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کتاب کے مطالعہ سے خود آگاہی، خود شناسی اور قومی شعور کی دولت پائے اور جذبۂ عمل سے سرشار ہو کر اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے سرگرمِ کار رہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ صوبۂ سرحد کی تاریخ کے بارے میں یہ کتاب ملک کے پڑھے لکھے باشعور طبقے کے لئے لکھی گئی ہے نہ کہ ایک تحقیقی مقالہ کے طور پر ——— اسی لئے

اس کا اندازِ بیان سادہ اور عام فہم ہے اور اُسے حوالہ جات اور تشریحی نوٹوں سے بوجھل نہیں بننے دیا گیا۔ کتاب کے آخر میں اُن کتابوں کی فہرست دے دی گئی ہے جو میرے زیرِ مطالعہ رہیں۔ میں اُن تمام اہلِ قلم کی عظمتِ علمی کا دلی اعتراف کرتا ہوں، جن کی تحریروں سے اس کام کے سلسلے میں استفادہ کیا گیا، اُن حضرات کا بھی ممنون ہوں، جن کے مشورے میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے اور اُن قارئین کرام کا بھی سپاس گزار رہوں گا، جو کتاب کی غلطیوں اور فروگزاشتوں سے مجھے آگاہ کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کوتاہیوں کی تلافی اور ان غلطیوں کی تصحیح ہو سکے۔

آخر میں مَیں اپنے کرم فرما مولانا فضل منّان میاں مالک یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور کا خصوصی شکریہ ادا کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں۔ جن کی ترغیب اور توجّہ خصوصی سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کرام تک پہنچی ——— یہ اشاعتی ادارہ صوبۂ سرحد کی تہذیب و ثقافت، علم و ادب اور تاریخ و تمدّن کے مختلف پہلوؤں پر بہت سی گراں مایہ کتابیں پیش کر چکا ہے اور آئندہ بھی علم کی روشنی پھیلانے میں اپنا کردار بجا لاتا رہے گا۔ انشاء اللہ!

۳/۲ خالدین، فورٹ روڈ
پشاور

محمد شفیع صابر

پختون ـــــــ ایک تاریخ ساز قوم

"میری جان کی قسم! اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے اور کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے تو بھی کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا اور اُن کا عزم جواں رہے گا۔" [1]

نامور عرب مؤرخ اور مفکر امیر شکیب ارسلان کے یہ الفاظ ایک بہت بڑی تاریخی حقیقت کے آئینہ دار ہیں، عصرِ حاضر کے ممتاز عالمِ دین اور محقق سید ابوالحسن ندوی نے اپنی ایک تحریر میں اس حوالے سے اہلِ سرحد کے شاندار تاریخی کردار کا اعتراف کرتے ہوئے اِن مردانِ کُہسان کے جذبۂ حریت کو دلی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

یُوں تو ہر قوم کا ایک تاریخی مزاج ہوتا ہے۔ اور ہر خطّہ کے لوگ تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، تاہم بعض قومیں صرف تاریخی واقعات کی شاہد ہی نہیں ہوتیں، بلکہ تاریخ سازی کا کردار بھی بجا لاتی ہیں، اپنے شاندار کارناموں سے وہ تاریخ کا رُخ پھیر دیتی ہیں، اپنی روایات کا لازوال نقش صفحۂ دہر پر ثبت کرتی ہیں اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک روشن مثال قائم کر جاتی ہیں ـــــ صُوبہ سرحد کے مسلمان ایک ایسی ہی تاریخ ساز قوم کے فرزند ہیں۔

سر اولف کیرو (جنہوں نے اپنی آدھی زندگی صوبہ سرحد میں بسر کی) اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کی بناء پر لکھتے ہیں[2]:۔

---

[1] حاضر العالم الاسلامی، جلد دوم ص ۱۹۷ [2] دی پٹھان

"اِس خطّے نے تاریخ میں اتنے زیادہ حملے دیکھے اور برداشت کئے ہیں، جو ایشیاء کے کسی اور ملک بلکہ دنیا کے کسی اور علاقے نے ہرگز نہیں دیکھے ـــــ یہاں سُورج اور ہوا میں ایسی تاثیر ہے جو سرحدی لوگوں کو اُٹھنے، بڑھنے اور مرنے مارنے پر اُکساتی ہے اور یہاں کی دُشوار گزار اُونچی نیچی چٹانوں کے لامتناہی سلسلے دِلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔"

"پٹھان عقاب کی طرح آسمان کی بلندیوں میں مصروف پرواز رہتا ہے، لیکن جونہی اُسے شکار نظر آتا ہے۔ وہ بلندی سے اس پر جھپٹتا ہے، پھر شکار کو دبوچ کر وہ انتظار نہیں کرتا بلکہ پلک جھپکتے ہی کسی دُور دراز جگہ پہنچ جاتا ہے اور شکار کے مزے لیتا ہے۔"

کیروان الفاظ میں اہلِ سرحد کی مہم جویانہ صفات کا ذکر کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے علاقے وزیرستان کی مثال دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

"جہاں تک وزیرستان کا تعلق ہے، تاریخ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی نے اس پر حکمرانی کی ہو۔ انگریز غالباً واحد قوم ہے جو اس علاقے میں داخل ہوئی اور وہاں چھوٹے بڑے قلعے بنا لئے، لیکن ان کی حکمرانی قلعوں کے اندر ہی محصور رہی۔ باہر وہ کوئی حکم نہ چلا سکے اور نہ ہی ان لوگوں سے ٹیکس وغیرہ وصول کر سکے۔"

بابائے پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی حقوق و مراعات اور درجہ دینے کے لئے کوشاں رہے، اس لئے کہ وہ اِن تاریخ ساز لوگوں کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور اس امر کا یقین رکھتے تھے کہ "صوبہ سرحد کے لوگوں کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔"

علّامہ عنایت اللہ خان المشرقی جو ایک عرصہ تک اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل رہے اور یہاں کے سیاسی حالات و واقعات کا قریب سے مطالعہ کیا، اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر جدوجہد آزادی کے سلسلے میں برصغیر کے دوسرے تمام لوگوں کی قربانیوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی قربانیوں کو دوسرے پلڑے میں تو یقیناً صوبہ سرحد کے مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہے گا۔[1]

---

[1] "اکثریت یا خون"

مفکرِ ملت علامہ محمد اقبال نے اپنے کلام میں بارہا "ملت افغانیہ" کی شاندار صلاحیتوں، حریت پسندی اور جمہور دوستی کو خراجِ تحسین ادا کیا، انہوں نے ایشیا کے پیکرِ آب و گل میں ملت افغانیہ کو قلب کا درجہ دیا، وہ اپنی چشمِ تصور میں مسلمانانِ صوبہ سرحد کے شاندار مستقبل کو صاف دیکھ رہے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ جب مشہور ادیب اور دانش ور فضل حق شیدا، اپنے دو دوستوں عبدالمجید خاں (سابق ڈائریکٹر محکمہ تعلیم صوبہ سرحد) اور فیض اللہ خان خٹک (سابق پرنسپل کیڈٹ کالج کوہاٹ) کے ہمراہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے باتوں باتوں میں فرمایا :۔[1]

"پٹھانوں کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے، اس قوم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے، اور مجھے توقع ہے کہ یہ آئندہ بھی اسلام کی عظمت اور سربلندی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔"

حکیم الامت اقبالؒ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"دنیا کی متعدد قومیں عروج کمال کو پہنچ کر زوال پذیر ہوئی ہیں اور آج کل تم جن ترقی یافتہ قوموں کو دیکھ رہے ہو، وہ بھی رُو بہ زوال ہیں، لیکن پٹھان قوم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ابھی بچپن کی حالت میں ہے، یہ آہستہ آہستہ بڑھے گی اور وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ جب یہ پورے شباب پر ہوگی۔ خدا کرے میں اس عالمِ شباب کو دیکھ سکوں۔ میں جس اسلامی مملکت کا تصور کر رہا ہوں، مجھے اُمید ہے کہ پٹھان اپنی دیرینہ روایات کے پیشِ نظر اس کے قیام میں بہت مدد دیں گے۔"

پشاور یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابوالفضل بخت رواں کہتے ہیں کہ

"اقبال متاثر ہوئے تو صرف ملتِ افغان سے۔ انہوں نے خوشحال خاں خٹک کی عظمت کو پہچانا، جمال الدین افغانی کی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کیا، محراب گل افغان کے افکار کے تحت اس قوم کی شجاعت، خودداری اور جذبہ حریت کو سراہا۔"

ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک (جلد ۱۷ شمارہ ۲) میں شائع ہونے والے اپنے ایک مقالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام ابوحنیفہ اور بوعلی سینا جیسے عظیم مسلم اکابر بھی افغان نژاد تھے۔

---

[1] "انجمن" از فقیر سید وحیدالدین صفحہ ۴۰

مصری ادیب ابوالیقین محمد فہمی نے "آج کا افغانستان" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ

"افغان قوم مصریوں اور دیگر عرب اقوام سے زیادہ قریب ہے، اس قوم نے اسلام اور عرب دنیا کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں ——— ان میں بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے، جنہوں نے اسلامی معارف کو چار چاند لگا دیئے۔"

اتحاد عالم اسلام کے عظیم داعی، مفکر مشرق علامہ جمال الدین افغانیؒ نے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ افغان اتحادِ عالم اسلام کی ایک مضبوط کڑی ہیں "العروۃ الوثقیٰ" میں لکھا کہ

"اور نہ سے پشاور تک اسلامی مملکتیں پھیلی ہوئی ہیں، اُن کی سرحدات ایک دوسرے سے متصل ہیں، وہ قرآنی قانون کی ایک اجتماعی وحدت کے اجزاء ہیں۔ ان کی آبادی (اُس زمانے میں) دو کروڑ سے کم نہیں۔ بہادری اور شجاعت میں وہ ہمیشہ تمام قوموں پر فوقیت کے مالک رہے ہیں، تو کیا ایسے میں اُن کا یہ مشن نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دشمنوں کے خلاف اپنی مساعی کو ہم آہنگ کریں اور دوسری قوموں کی طرح اپنی قومی عزت بحال کریں۔"

صوبہ سرحد اپنے جغرافیائی محل وقوع اور کلیدی اہمیت کے اعتبار سے وہ مردم خیز خطہ ہے۔ جہاں ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں شخصیتیں اُبھریں۔ جب بھی کسی غیر مسلم طاقت کی وجہ سے اسلام پر کٹھن وقت آیا۔ یہ مردانِ غازی ہتھیلیوں پر سر رکھے میدان میں اُترے اور انہوں نے از سرِ نو مسلمانوں کو نئی قوت اور نیا حوصلہ عطا کیا۔ مولانا اعجاز الحق قدوسیؒ تذکرۂ صوفیائے سرحد" میں رقمطراز ہیں کہ

"قریب تھا کہ وہ شمع جس کو عرب کے نمازیوں نے برصغیر پاک و ہند کی وادی سندھ میں روشن کیا تھا، داخلی اختلافات کی وجہ سے گل ہو جائے کہ اچانک اُسے خیبر کے راستے ایک نئی طاقت ملی اور پرچم اسلام اس سرزمین پر سرنگوں ہونے سے بچ گیا ——— اس مرتبہ اس کا سہرا ان غیور و جسور افغانوں کے سر ہے۔ جن کے رگ و ریشہ میں اسلام کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ اُن کا ہر فرد جذبۂ شوق شہادت سے مست اور سرشار تھا۔"

حقیقت یہی ہے کہ کوہ سلیمان کے دروں سے گزر کر صرف فاتحین اور طالع آزما لشکر ہی برصغیر پاک و ہند میں داخل نہیں ہوتے رہے بلکہ ان فاتحین کے جلو میں بڑے بڑے عالمانِ دین، شاعر، ادیب، طبیب، فن کار اور مورخ بھی آئے، جنہوں نے ہندوستانی لوگوں کے اذہان اور معاشرے کے افکار و روایات کو پوری

قوت سے متاثر کیا، یہ لوگ علوم و فنون کے مشعل بردار بن کر آئے۔ انہوں نے پورے برصغیر کو علوم و فنون کی روشنی سے منور کر دیا اور ہندوستانی معاشرے کو ایک بہتر اور صحت مندانہ تہذیب و تمدن عطا کیا۔

اہلِ سرحد کی ان تمام کامیابیوں کا راز اسلامی تعلیمات سے ان کی گہری وابستگی میں پوشیدہ تھا۔ وہ اسلام کی عسکری اور جمہوری روایات پر کاربند تھے اور سادگی، جفاکشی اور مسلسل جدوجہد کے کامیاب اصولوں کا دامن تھامے ہوئے تھے۔

یوں تو صوبہ سرحد میں مختلف قبائل اور خیل آباد تھے اور آباد ہیں تاہم قبیلوں کے یہ نام محض پہچان کا ایک ذریعہ ہیں، وحدت اور مساوات کے اعتبار سے وہ سب ایک ہیں، اُنہیں یہ فخر حاصل ہے کہ خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ رحمت میں آکر وہ سب یکساں اور مساوی ہیں، اس اعتبار سے سارے اہلِ سرحد پختون، پشتون یا پٹھان کہلانا اپنے لئے باعث افتخار خیال کرتے ہیں۔

پروفیسر سید خیال بخاری اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]:

"یہ قوم جسے تواریخ کی عام کتابوں یا پڑوسی قوموں کی زبان میں پٹھان یا افغان کہا جاتا ہے، اپنے آپ کو نہ تو پٹھان کہتی ہے اور نہ افغان ـــــ بلکہ اپنا نام پختون یا پشتون بتاتی ہے، اور اپنی زبان کو بھی اسی نسبت سے پختو یا پشتو کہتی ہے ـــــ پٹھان کا نام ان کو ہندی نژاد پڑوسیوں نے دیا ہے اور افغان کا نام فارسی گو اقوام نے ـــــ یہ دونوں نام اتنی شہرت پا گئے کہ غیر لوگ انہیں اُن کے اصلی ناموں یعنی پختون یا پشتون کے نام سے کم تر جانتے ہیں بلکہ یہ نام تحریروں میں بھی کم دیکھنے میں آتا ہے۔ (مغل دَور کے) پرانے سرکاری کاغذات اور تمسکات وغیرہ میں بھی ان کو افغان ہی کے نام سے لکھا جاتا رہا ہے، جو درست نہیں۔"

دینی اور مذہبی اعتبار سے نامور دانش ور میر عبدالصمد خان کی یہ وضاحت قابلِ غور ہے کہ "حقیقت میں پختون ایک ایسی ملّت کا نام ہے جو کُلّیہ مسلمان ہیں۔ اس قوم کی حقیقی تاریخ کا آغاز ظہورِ اسلام ہی کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہے، پختونیت اور اسلام کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ پختون اور مسلمان مترادف الفاظ بن چکے ہیں، جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص عظیم اور سچا پختون ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑا اور سچا مسلمان ہے۔"[2]

---

[1] "فارسی شاعری کا اثر پشتو شاعری پر" [2] میر عبدالصمد خان ـــ "لوئے پختون"

پشتو اکادمی پشاور کے جناب پور دل خان خٹک پشتون کے اسلامی کردار پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں[1]:

"روئے زمین پر صرف اور صرف پشتونوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ کوئی پشتون اسلام قبول کئے بغیر اس قوم کا فرد نہیں ہو سکتا، جو شخص دائرہ اسلام سے نکلا، پشتون برادری سے بھی خارج ہو گیا ـــــ لہٰذا پشتون اور اسلام لازم ملزوم ہیں ـــــ انہوں نے اسلام کے پیغام اور تعلیمات کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا ہے۔"

کوئٹہ کے سلطان محمد صابر کے نزدیک "پشتون دو چیزوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، جن سے اوّل دین ہے۔ دوم وطن ـــــ وہ دین پر وطن کو تو قربان کر سکتے ہیں، لیکن دین کو وطن پر قربان نہیں ہونے دیتے۔" اُن کے خیال میں "اسلام اور پشتو روایات میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ پشتونوں میں اسلام کی جڑیں بہت گہری ہیں۔"

چونکہ پختون معاشرہ صرف اور صرف مسلمانوں پر مشتمل ہے، اس لئے اس معاشرے میں پلنے والے نوجوان کی تربیت بھی اسلام اور پختو کے شاندار بنیادی اصولوں کے مطابق ہوتی ہے، پختون معاشرے میں جرگہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، دیہات اور قبائلی علاقہ میں جرگہ کو ایک پارلیمنٹ کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور ایک جیوری کی بھی، ایک بڑے سے بڑا اور مالدار سے مالدار خان بھی جرگے کا اسی طرح کا رکن تصور ہوتا ہے۔ جس طرح ایک غریب اور نادار شخص، اس جرگے کو اس امر کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ نافذ کرے اور اگر کوئی اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کرے تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ یا قطع تعلق کرے۔ بڑے قبیلوں میں جرگہ عموماً معمر اور سفید ریش بزرگوں پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم قبیلے کا ہر رکن اپنا مسئلہ اور اپنا نقطۂ نظر جرگے میں پیش کر سکتا ہے، پختون جہاں جہاں گئے۔ اپنی روایات اپنے ساتھ لے گئے، علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں:

"جب سے پشتون ہندوستان میں وارد ہوئے۔ یہاں جمہوری خیالات کی داغ بیل پڑ گئی۔"[2]

مغل شہنشاہ اور ہندو راجے مطلق العنان ہوتے تھے، وہ دوسرے کی رائے کو خاطر میں نہ لاتے تھے، لیکن اس کے برعکس پشتون حاکم ہر شخص کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ بہلول لودھی کے بارے میں تو یہاں تک

---

[1] روزنامہ "مشرق" پشاور، ۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء [2] بحوالہ پروفیسر پریشان خٹک۔ "خوشحال نامہ"

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا سلطان بننے کے بعد بھی اس نے پشتونوں کی قبائلی اور جمہوری روایات کو قائم رکھا۔ نہ کبھی تخت پر بیٹھا، نہ کبھی تاجِ شاہی زیب سر کیا، کوئی سردار خفا ہوتا تو اپنی پگڑی اتار کر اس کے پاؤں میں رکھ دیتا اور کہتا کہ "یہ میری مشری (حاکمیت) کی علامت ہے، اگر میری سیادت تمہیں پسند نہیں تو پگڑی (دستارِ فضیلت) تمہیں لوٹاتا ہوں اور خود ایک عام سپاہی کی طرح خدمت بجالانے کو تیار ہوں۔"

حجرہ بھی پٹھانوں کا ایک مخصوص اور معروف ادارہ ہے، حجرہ ایک ایسی عمارت میں قائم ہوتا ہے جہاں قبیلے یا گاؤں محلہ کا ہر شخص جا سکے۔ حجرہ پٹھانوں کا کلب بھی ہے، پارلیمان اور دارالمشاورت بھی، تفریح گاہ بھی اور بیٹھنے اُٹھنے کی جگہ بھی ـــــ مہمان خانہ بھی تو شادی ہال بھی۔ محلے یا قبیلے کے مرد اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتے ہیں۔ بڑے بوڑھے مختلف مسائل پر بات چیت کرتے ہیں تو نوجوان بڑے ادب سے ان کی باتوں کو سُنتے ہیں، چھوٹے موٹے جھگڑے اور تنازعے وہیں طے ہوتے ہیں، گویا حجرہ نوجوان نسل میں اجتماعی سوچ پیدا کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہیں سے اپنی قبائلی روایات و خصوصیات نوعمروں میں منتقل ہوتی ہیں۔ قبیلے کے کنوارے نوجوان رات کو حجرے ہی میں سوتے ہیں اور ہنگامی صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ گویا یہ ایک قلعہ کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ پٹھانوں کی مہمان نوازی مشہور ہے، اگر کوئی مسافر بھی شب بسری کیلئے حجرہ میں چلا جاتا ہے تو اس کی پوری خاطر مدارت ہوتی ہے، یہاں تک کہ جب تک وہ حجرے میں رہتا ہے اُس کی حفاظت اور سلامتی کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہے۔ حجرے کی بدولت پختون نوجوانوں میں اجتماعی شعور اور معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

پختون تیغ آزما اور مُہم باز لوگ ہیں، اُنہوں نے سلطان محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک سبھی فاتحین کا ساتھ دیا ہے۔ وہ ہر حملہ آور فوج کے ہراول دستہ میں شامل رہے ہیں، انہوں نے اپنے تاریخ ساز انہ کارناموں کی بدولت پورے برصغیر میں اپنے لئے ایک نمایاں اور منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالہ میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر ایم۔ اے رحیم نے انہیں ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ [1]

"افغانوں (پشتونوں) نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی دورِ اسلامی کی تاریخ میں بے حد نمایاں کردار انجام دیا ہے بلکہ اس خطہ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان غیور اور شجاع لوگوں نے مسلم معاشرے اور ریاست کو تازہ خون دے کر بہت بڑا کام کیا

---

[1] (AFGHANS IN INDIA)

ہے اور نظامِ حکومت اور تہذیب و تمدن کے شعبوں میں ایک قیمتی اور مستقل ورثہ چھوڑا ہے۔"

اُنھوں نے روھیل کھنڈ، فرخ آباد، بھوپال، رامپور، مالیر کوٹلہ، بنگال اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کیں، پختون سرداروں نے تھوڑی سی فوج کو ساتھ لے کر ڈھاکہ اور نواحی علاقہ فتح کیا، وہ فرنگی حکمرانوں کی طرح اجنبی بن کر نہ رہے بلکہ جہاں بھی گئے۔ عوام سے گھُل مِل گئے۔ اُن کی زبان کو اپنایا، ان کی اچھی روایات کو گلے لگایا اور خود اپنے کردار اور طرزِ عمل سے مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کے دل جیت لئے۔

پختون پہلے پہل اسلام کے مجاہدوں کے طور سلطان محمود غزنوی کے جلو میں برصغیر پاک و ہند میں آئے، وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حملہ کرتے اور دشمن کو کچل کر رکھ دیتے، محمود کے سترہ حملوں میں اس کا ساتھ دینے والوں کی اکثریت پختونوں ہی پر مشتمل تھی، جو اسلام کے دامنِ رحمت میں آتے ہی نئے جوش اور جذبے سے سرشار ہو کر اُٹھے تھے اور مطلع عالم پر چھا جانے کے ارادے رکھتے تھے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھنے کا شرف بھی ایک پختون بادشاہ محمد غوری کو حاصل ہوا، بعد میں خلجی پختونوں نے اسلامی حکومت کی جڑیں اور مضبوط کیں اور اسلام کا پیغام جنوبی ہند اور گجرات احمد آباد تک پہنچا دیا۔

بابر کی فوج بھی زیادہ تر پختون غازیوں پر مشتمل تھی، اُسے اُس وقت تک ہندوستان کی طرف بڑھنے کا یارانہ ہوا۔ جب تک باجوڑ، سوات، پشاور اور کوہاٹ کے علاقے اُس کے تصرف میں نہ آئے۔ بابر شعر و نغمہ اور تہذیب و ثقافت کا دلدادہ تھا، اس کا واسطہ یوسف زائی لوگوں سے پڑا تو وہ اُن کے مہذبانہ طور طریقوں سے بڑا متاثر ہوا اور اس قبیلے سے مزید تعلق استوار کرنے کے لئے یوسف زئی سردار کی صاحبزادی بی بی مبارکہ سے شادی کر لی۔

ہمایوں کا دَور افراتفری کا دَور تھا، اُسے جم کر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ شکست کھا کر ایران کو بھاگا تو پختون سردار فرید خان عرف شیر شاہ دارالسلطنت دہلی پر دادِ حکومت دینے لگا۔ اکبر اور بعد کے مغل فرماں رواؤں نے آدابِ حکمرانی اسی پختون قائد سے سیکھے۔ شیر شاہ کے جانشین اسلام شاہ نے مدبرانہ طریق پر حکومت کی اُس نے پختون سرداروں کو حتی المقدور اجازت دی کہ وہ اپنی قبائلی روایات کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلائیں، لیکن خود سر سرداروں کی وجہ سے سلطنت کمزور ہوتی گئی۔

اسلام شاہ کے تحت فارسی اور ہندی شعر و ادب نے بڑی ترقی کی، شاہ محمد ہندی کا نامور شاعر تھا، دوسرا ہندی شاعر اور موسیقار سُور داس اسی کا درباری تھا۔ پختون سردار باز بہادر کا دربار راگ رنگ اور عشق و رومان کے مرکز کی صورت اختیار کر گیا تھا، باز بہادر اور رُوپ متی کا معاشقہ گیتوں کا سب سے بڑا موضوع بن گیا، درباروں میں موسیقی کی محفلوں کا رواج چل نکلا۔ آگے چل کر شہنشاہ اکبر نے اس روش کو آگے بڑھایا ـــــ اکبر کے عہدِ حکومت میں ہندو مسلم اتحاد کو حکمت عملی کا سنگِ بنیاد ٹھہرایا گیا، بھگتی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا ـــــ وحدت الوجود کے چرچے ہونے لگے۔ صلح کُل کا جنون دماغ پر ایسا سوار ہوا کہ خود شہنشاہ اور مغل شہزادے ہندو لڑکیوں سے شادیاں رچانے لگے، اکبر کی جرأت اتنی بڑھی، کہ "دینِ الٰہی" کے نام سے نئے مذہب کی طرح ڈال دی۔

ایسے میں اگر پختون سردار اور سپاہی اسلام کی حمایت میں آگے نہ بڑھتے تو برصغیر کے مسلمان ہندو اکثریت میں جذب ہو کر رہ جاتے، یہ پختون ہی تھے، جنہوں نے عظیم روحانی پیشوا امام ربانی، مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کی قیادت میں اکبری الحاد کے خلاف پرچم جہاد بلند کیا اور دینِ اسلام کو نئی قوت اور توانائی سے ہمکنار کیا۔

اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں فوج اور سرکاری ملازم تین گروہوں میں بٹے ہوئے تھے:

(۱) پختون یا پٹھان اُمراء اور سپاہی، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک اصلاح و ارشاد کے حامی تھے۔

(۲) ایرانی اُمراء جو ہمایوں کے ساتھ ایران سے آئے تھے، لیکن طبعاً آزاد رَو، آرام طلب اور عیش و عشرت کے دلدادہ تھے۔

(۳) ہندو اُمراء اور کارکن، جو اکبر کو ہندوانہ طور طریقوں کی طرف لے جا رہے تھے اور اسلام کے خلاف در پردہ سازشوں میں مصروف تھے۔

ہندو کارکن تو کھل کر سامنے نہ آتے تھے، البتہ ہندو رانیاں اکبر کا "برین واش" کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھیں ـــــ لیکن ایرانی اور پختون امراء کے مابین شدید کش مکش تھی، افغان سادہ جفاکش، اور اسلام کے دلدادہ تھے، انہوں نے دینِ اسلام کی سربلندی کی غرض سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا پورا ساتھ دیا، اُنہی کی معاونت سے تحریکِ مجددی (جو اصل میں تحریکِ پاکستان ہی کا پیش خیمہ تھی) کامیاب ہو کر رہی، اور جہانگیر سے دین کے راستے پر آگیا۔

شاہ جہان اور اورنگ زیب نے قندہار اور صوبہ سرحد کی فوجی مُہموں میں اپنی توانائیاں ضائع کر دیں۔ خزانہ خالی ہوگیا، بد دِل ہوکر پختون سردار اُن کا ساتھ چھوڑ گئے تو مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہوگیا، اورنگ زیب کے جانشینوں کے دَور میں مرہٹے اور جاٹ اتنے دلیر ہوگئے کہ اٹک تک سارے میدانی علاقوں میں دندناتے پھرتے، دارالسلطنت بھی اُن کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ مغل حکمرانوں اور اُن کے ساتھیوں کو عیش و عشرت اور راگ رنگ ہی سے فرصت نہ تھی، اِن مایوس کن حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھے، ایک بار پھر پختون غازیوں نے دین کی سربلندی کے لئے اس عظیم قائد کا ساتھ دیکر برصغیر ہند میں مسلمانوں کے گرتے ہوئے اقتدار کو سنبھالا دیا۔

شاہ ولی اللہؒ کو اگر کہیں سے مدد ملنے کی توقع تھی تو وہ روہیلہ پٹھانوں ہی سے تھی، چنانچہ انہوں نے پختون سردار نجیب الدولہ کو لکھا کہ "اَب ملک و قوم کی اصلاح و ترقی ہمارے ہاتھ میں ہے"۔ انہوں نے کہا، کہ "ان روہیلوں کی تنظیم اور قومی خصوصیات بڑی زبردست ہیں کیونکہ ان میں وہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں، جو شاہی فوج اور اُس کے افسروں میں نظر آتی ہیں"۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ ہی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے پختون بادشاہ احمد شاہ ابدالی مسلمانانِ ہند کی امداد کو پہنچا، یہ وہ نازک دَور تھا، جب مرہٹے دارالسلطنت دہلی پر قابض ہو چکے تھے اور مغل حکمران اُن کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پاتے تھے، اس انتہائی نازک صورتِ حال میں بھی روہیلہ پٹھانوں نے اپنے غیور اور نیک دِل راہنما حافظ رحمت خان کی قیادت میں احمد شاہ باباؒ کے مجاہدوں کا پورا پورا ساتھ دیا، اور اسلامی محبت اور پشتون ولی کا حق ادا کیا، "تواریخ حافظ رحمت خانی" کے مقدمہ میں میاں سیّد رسول رسا (ڈائریکٹر پشتو اکادمی) نے اس اتحاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "پانی پت کی تیسری لڑائی ایک فیصلہ کن معرکہ تھا، اگر اس موقع پر احمد شاہ باباؒ اور اُن کے مجاہد کامیاب نہ ہوتے تو ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ اس اعتبار سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے اصل مؤسس احمد شاہ ابدالی تھے اور اُن کی بھرپور امداد روہیلہ (پٹھان) لوگوں نے ہی کی تھی"۔

حافظ رحمت خان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اصلاً وہ صوابی ضلع مردان کے رہنے والے تھے، تاہم نقل مکانی کرکے شمالی یو۔پی روہیل کھنڈ میں آباد ہو گئے تھے، وہ اُن عظیم مسلمانوں میں سے تھے، جو بادشاہی

میں بھی دولتِ فقر کو اپنا اصل سرمایہ سمجھتے تھے، اور دینِ اسلام کی رُوحِ جہاد سے سرشار تھے، نواب صفدر جنگ والیٔ اودھ حافظ رحمت خان کی عظمتِ کردار کے بارے میں یُوں معترف ہیں کہ

"میں نے ولایتِ افغان کے لوگوں میں سے کوئی شخص اس لیاقت و فہمید کا نہیں دیکھا۔"

پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہوئی، لاکھوں مرہٹہ سپاہی کھیت رہے، اُنکی طاقت ہندوستان بھر میں ختم ہو کر رہ گئی، اس معرکہ کے بعد ملک بھر کا کوئی ہندو گھرانہ ایسا نہ تھا جو اپنے عزیزوں کا ماتم نہ کر رہا ہو، پانی پت میں پختون غازیوں کی فتح کے نتائج بہت دُور رس ثابت ہوئے، فرمانروایانِ دہلی کو سنبھلنے اور اپنی طاقت مجتمع کرنے کا موقع ملا ـــــ مرہٹوں کی کمر ٹوٹ جانے سے سلطان حیدر علی میسور (جنوبی ہند) میں اپنی خود مختار مسلم حکومت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُدگیر میں نظام رکن کو جو شکست ہوئی تھی، اس کی تلافی کا موقعہ مل گیا اور ریاست حیدر آباد مکمل تباہی سے بچ گئی۔

اُنیسویں صدی کے رُبع اوّل میں جب پنجاب اور صوبہ سرحد میں سکھوں کو اور باقی ماندہ ہندوستان میں انگریزوں کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے مسلمانوں پر جینا دوبھر کر دیا۔ ایسے میں شاہ ولی اللہؒ کے پیروکاروں نے تحریکِ جہاد کا آغاز کیا۔ اسی علمی گھرانے کے فیض یافتہ شخص سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اسی خانوادے کے فرزندوں شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحیٔ نے تحریکِ مجاہدین کو منظم کیا اور سکھ حکومت کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں، تحریک مجاہدین کی پشت پناہی میں بھی روہیلہ پختون پیش پیش تھے، سیّد احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے صوبہ سرحد ہی کو اپنی سرگرمیوں کی آماج گاہ بنایا، کیونکہ وہ پختونوں کی اسلامی حمیت اور مجاہدانہ خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے (تفصیل آگے چل کر آئے گی) سرزمینِ سرحد ہی کے جیالوں نے ان مجاہدین کو آخر تک پناہ دی اور ان شیدائیانِ اسلام کے شانہ بشانہ ملّتِ اسلامیہ کی عزت و ناموس کے لئے ناقابلِ فراموش قربانیاں دیں۔

جہاں تحریکِ مجاہدین برصغیر کی پہلی اسلامی تحریک تھی۔ وہیں ۱۸۵۷ء کا ہمہ گیر جہاد بھی برصغیر کی پہلی جنگِ آزادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جنگِ آزادی میں بھی روہیلہ پختونوں کی قربانیاں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں، تحریکِ مجاہدین میں روہیلوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کا کہنا ہے کہ

"سرحد کے باغی کیمپ کو بہترین شمشیر آزما روہیلوں ہی نے فراہم کئے تھے"
لارڈ میکالے کی گواہی ہے کہ

"روہیلے جنگ میں شجاعت کا بہترین نمونہ اور امن کے زمانے میں بہترین منتظم تھے"

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے بھی روہیلوں نے فرنگیوں کے ساتھ کئی بار پنجہ آزمائی کی، ایسے ہی ایک معرکہ میں ۲۲، اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت خان دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ انگریزوں نے روہیلوں سے جی بھر کر انتقام لیا، "روہیلوں کے پانچ لاکھ خاندان جمنا پار بھگا دیئے گئے اور روہیل کھنڈ کا خطہ غیر آباد ہوتا گیا"۔ [1]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جان تبھی پڑی۔ جب روہیلہ سردار جنرل بخت خان نے اس کی کمان سنبھالی۔ جہاں مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ عبدالغنی مجددی اور مفتی لیاقت علی نے اس موقع پر فرنگی کے خلاف انتہائی جرأت مندی سے جہاد کا فتویٰ جاری کیا۔ وہیں جنرل بخت خان، عظیم اللہ خان، نواب خان بہادر خان (نبیرہ حافظ رحمت خانؒ) نواب سعداللہ خان نجیب آبادی، محمد خان مراد آبادی اور دوسرے روہیلہ سرداروں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک ملک و ملت کے ناموس کے لئے بہانے سے دریغ نہ کیا۔ غداروں کی سازشوں اور فرنگی کی مکاری کی وجہ سے اس جہادِ آزادی میں بظاہر ناکام ہوئی، تاہم جہاں تک اس کے نتائج و عواقب کا تعلق تھا، مسلمانوں اور بالخصوص روہیلوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، "انگریزوں نے سات دن تک برابر قتل عام کیا۔ ۲۷، ہزار مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا۔ آٹھ ہزار مجاہدین آزادی نے جامِ شہادت نوش کیا، فرنگی نے وہ انتقام لیا کہ مسلمان بچوں اور عورتوں تک کو مار ڈالا"۔ [2]

فرنگی کے خلاف جہاد میں روہیلہ جانبازوں کے جوش و خروش کا نقشہ مولوی نجم الغنی خان رامپوری نے یوں کھینچا ہے:۔ [3]

"نواب صاحب (غلام محمد خان ابن نواب فیض اللہ خان) کے ہمراہ ان کے بھائی بھی تھے اور ان کی فوج کے پٹھانوں کا جوش و خروش حد سے بڑھا ہوا تھا ـــــ جب کڑکیت بولتے تو ہر ایک اینٹھتا اور سوار کو داتا ـــــ پٹے باز پٹیتی دکھاتا اور پھکیتی ظاہر کرتا تھا، کوئی

---

[1] رُولز آف انڈیا ص ۳۔ ایل۔ جے۔ ٹرائٹر ترجمہ ابن حسن۔ [2] قیصر التواریخ ص ۴۵۳۔

[3] اخبار الصنادید ص ۶۳۵۔

نیزہ لہراتا تو کوئی تلوار چومتا ـــــ سینکڑوں سپاہی راستے میں تبتل بجاتے اور چار تبیہ گاتے جاتے تھے۔"

انگریز کامیاب ہوئے تو انہوں نے روہیلوں سے وہ انتقام کیا، جس کی مثال کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی، صرف میدانِ جنگ ہی میں فرنگی بہادر نے غصہ نہ نکالا بلکہ بعد میں بھی چُن چُن کر انہیں موت کے گھاٹ اُتارا جاتا رہا ـــــ لارڈ میکالے نے ایک تقریر میں بہتے اور بے گناہ لوگوں پر ڈھائے گئے ان مظالم کے بارے میں لکھا ہے کہ

"ایک لاکھ سے زائد انسان بے خانماں ہو کر پہاڑی علاقے کی طرف بھاگ نکلے، اُن کے دیہات جلا دیئے گئے، اُن کی عورتوں کی بے عزتی کی گئی، اُن کے بچے ذبح کئے گئے، یہ سلوک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہیٹنگز نے بے گناہ روہیلوں سے روا رکھا۔"

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب ہندوستان کے سبھی علاقے فرنگی سے دب گئے اور بد دل اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے، تب بھی صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے میں مزاحمت جاری رہی، آئے دن انگریز پختون قبائل کے خلاف فوج کشی کرتے رہے، لیکن اپنی بے سروسامانی کے باوجود یہ حریت پسند لوگ پوری پامردی سے دشمن کے مقابلے پر ڈٹے رہے، انگریز نے ایک دو نہیں سینکڑوں فوجی مہمیں مجاہدینِ آزادی کے خلاف بھیجیں، لیکن مجاہدین نے ہار نہ مانی، جونہی فرنگی لاؤ لشکر اور توپ خانہ حرکت میں آتا، قبائلی مجاہد اپنے بیوی بچے اور سامان نکال کر پہاڑوں کی غاروں کو چلے جاتے، لیکن ہر بار فرنگی لشکر کے بیٹھ پھیرتے ہی وہ عقاب کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے اور تہس نہس کر کے رکھ دیتے، ہزاروں فرنگی افسر اور گورا سپاہی سرحدی جنگوں کی نذر ہوئے، بے پناہ فوجی سامان اور اسلحہ قبائلیوں کے ہاتھ لگا، بڑے سے بڑے آزمودہ کار جرنیل پختون قبائل کے کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے، پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعے بے پناہ سرکاری روپیہ قبائلیوں کو خریدنے اور ساتھ ملانے کے لئے خرچ کیا گیا۔ بارہا حکومتِ ہند کے ایوانوں میں انسانی جانوں اور دولت کے ضیاع پر سخت احتجاج اور واویلا ہوا، لیکن ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء تک فرنگی کی آتش انتقام ٹھنڈی نہ ہو سکی اور وہ برابر قبائلی علاقوں کو نشانۂ ستم بناتے رہے۔ اس عرصے میں ایک سرکاری اندازے کے مطابق سرحدی قبائل نے انگریز کے خلاف نوّے کے قریب لڑائیاں لڑیں۔ جن میں ایسے ایسے معرکے بھی شامل تھے۔ جب پچاس پچاس ہزار کا سامراجی لشکر ان نادار اور بے سہارا قبائلی مجاہدوں کے خلاف بھیجا گیا۔

تاریخ عالم گواہ ہے کہ صرف افراد کی کثرت قوموں کو ایک باعزت مقام نہیں دلا سکتی، دنیا میں ہمیشہ وہی قومیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچتی ہیں۔ جو اپنا خون بہانا جانتی ہیں اور جو عسکری صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہیں، یہ صفت پختونوں میں بدرجہ کمال موجود ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکیم الامت علامہ اقبالؒ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

"اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسدِ سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوارتقاء میں آزادانہ قدم اُٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ فوجی ہو یا نظریاتی، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صد ہے، لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فیصد ہے، اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے اُن ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فیصد ہو جائے گی، حالانکہ اس اندازہ میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں ہیں، جو بلوچستان اور صوبہ سرحد ہی سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ اُن تمام صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں۔" [1]

بیسویں صدی کے آغاز سے جب حصولِ آزادی کے لئے آئینی جدوجہد کا آغاز ہوا تو بھی پختونوں نے اس میں شاندار کردار انجام دیا، جمعیت خلافت وہ پہلی تحریک تھی جس نے عوام کو آزادی کا سچا جوش اور جذبہ عطا کیا ـــــ یہ ایک ایسی مؤثر تحریک تھی، جس کی جڑیں عوام میں تھیں، اس تحریک کے قائدین مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی پختون الاصل تھے، اُن کے آباؤ اجداد صوابی ضلع مردان [2] سے نقل مکانی کر کے ریاست رامپور میں آباد ہوئے تھے، اس خاندان کی خواتین تک نے آزادی وطن کی راہ میں قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ یہی تحریک کانگرس اور مسلم لیگ کو تقویت دینے کا باعث بنی، پشاور ہی کے ایک جلسے میں جو ۲۵، دسمبر ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر نے برملا کہا تھا کہ

"کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے، اس سے پہلے وہ عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی، مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اس میں شریک ہوئے، اُسی دن

---

[1] خطبہ صدارت، سالانہ اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۰ء (الہ آباد) [2] یوسف زئی، اللہ بخش یوسفی

سے اس میں جان پڑ گئی۔"

ہجرت کی تحریک میں اگرچہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے حصّہ لیا، تاہم گھر بار، مال و دولت اور کاروبار چھوڑ کر افغانستان کی طرف ہجرت کرنے والوں کی زیادہ تعداد صوبہ سرحد کے لوگوں ہی کی تھی، تحریکِ ہجرت کے ایک ممتاز رہنما اقبال شیدائی کا کہنا ہے کہ "پشاور اُن دنوں ایک اسلامی دارالسلطنت کا سماں پیش کر رہا تھا، ہر جگہ سے مہاجرین کے قافلے آتے تو اہلِ سرحد اُن کی راہ میں آنکھیں بچھاتے اور اُنہیں ہر ممکن آسائش بہم پہنچاتے۔"[1]

"مجلسِ خلافت (اور تحریکِ ہجرت) اور اس کی شورش سیاسی اور مذہبی سے زیادہ جذباتی نوعیت رکھتی تھی۔"[2] تاہم اس سے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا رُخ متعین ہو گیا، مولانا محمد علی جوہر اور اُنکے ساتھی اوّل و آخر مسلمان تھے، چنانچہ اُن کی تقریروں اور تحریروں سے مسلمانوں میں اسلامی قومیت کا جذبہ بیدار ہوا اور وہ ملتِ اسلامیہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے میدانِ عمل میں نکل پڑی۔

جہاں تک نظریۂ پاکستان سے وابستگی کا تعلق ہے، سرحدی مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہے، ۱۹۲۴ء میں جب (فرنٹیئر انکوائری کمیٹی) کے نام سے سر ڈینس برے کی قیادت میں ایک وفد صوبہ سرحد کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے صوبہ سرحد آیا تو انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے صدر سردار محمد گل خان نے اس کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ

"ہندو مسلم اتحاد کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتا، اس کی بجائے ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ رہنے دیا جائے، جنوب میں ۲۳ کروڑ ہندوؤں کی حکومت ہو اور شمال میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کا ہو اور آگرے سے پشاور تک مسلمانوں کا۔"[2]

سردار گل محمد خاں کی آواز مطالبہ پاکستان کی ابتدا تھی۔ بعد میں جب کیمبرج میں چوہدری رحمت علی نے (NOW OR NEVER) نام کے کتابچے میں تصورِ پاکستان پیش کیا تو صوبہ سرحد کے نامور فرزند خان محمد اسلم خان خٹک کا نام بھی اس مطالبے پر دستخط کرنے والوں میں موجود تھے۔

---

[1] تاریخ مسلمانانِ پاک و بھارت، سید ہاشمی فرید آبادی۔

[2] اوبرائے۔ (EVOLUTION OF N.W.F.P.)

صوبہ سرحد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر، سیّد علی عباس، قاضی ولی خان، قاضی میر احمد خاں اور خان بہادر سید سکندر شاہ کوہاٹ ابتداء ہی سے مسلم لیگ سے وابستہ رہے، اور صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر حقوق و مراعات دلوانے کی کوشش کرتے رہے، ۳۱، دسمبر ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ میں سر عبدالرحیم کی صدارت میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے اس میں یہ تجویز پیش کی کہ

"سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کو بلا تامل عملی جامہ پہنایا جائے اور صوبہ سرحد کو مراعات دلانے کے لئے حکومت پر زور اور دباؤ ڈالا جائے۔"

۱۹۲۶ء کے سالانہ اجلاس میں میاں عبدالعزیز نے پھر یہ مطالبہ دہرایا کہ

"حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بلا توقف اصلاحات رائج کی جائیں۔"

قائد اعظم محمد علی جناحؒ اپنے مشاہدے اور بصیرت کی بناء پر سرحدی مسلمانوں کے تاریخ ساز کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ

"بحیثیت مجموعی پٹھان سب لوگوں سے زیادہ منظم (اور باشعور) ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کی غلامی کا زمانہ نسبتاً کم ہے۔"

یہ قائد اعظم ہی تھے، جن کی تحریک پر ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے بجٹ اجلاس ۱۹۲۶ء میں مجلسِ خلافت مرکزیہ کے رہنما اور مرکزی اسمبلی کے رکن سیّد مرتضیٰ بہادر نے یہ قرارداد پیش کی کہ

"مرکزی اسمبلی گورنر جنرل ان کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ دستورِ ہند کی اُن دفعات کو جن کا تعلق لیجلٹو کونسلوں اور وزراء کے تقرر سے ہے، صوبہ سرحد میں بھی نافذ کرے اور وہاں ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات بلا توقف نافذ کی جائیں۔"

پختون قوم کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر مارچ ۱۹۲۷ء میں جب بابائے قوم محمد علی جناحؒ نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں اپنے چودہ (۱۴) نکات پیش کئے تو اس میں بھی اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ

"سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مثل آئین نافذ ہوگا۔"

۱۹۳۰ء وہ ناقابلِ فراموش سال تھا، جب اہلِ سرحد منظم ہو کر اُٹھے، انہوں نے تحریکِ آزادی میں

بھرپور حصہ لیا، اسی سال ۳۰ اپریل کو قصہ خوانی بازار میں سینکڑوں مجاہدوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ وہ نہتے ہونے کے باوجود فرنگی کے ٹینکوں اور آرمڈ کاروں پر چڑھ دوڑے اور شمع آزادی پر پروانہ وار نثار ہوئے، قصہ خوانی بازار کے اس ٹکراؤ کے بعد تحریک آزادی صوبہ سرحد کے طول و عرض میں پھیل گئی، بازارِ کلاں پشاور، ٹکر، ہاتھیاں، سپین تنگی (بنوں) اور دوسرے کئی مقامات پر پختون مجاہدوں نے گورا فوج کی گولیاں اپنے سینوں پر کھائیں، پختونوں کی ان عظیم قربانیوں کا منظر مشہور ریاضی دان علامہ عنایت اللہ المشرقی نے بہت قریب سے دیکھا کہ وہ ان دنوں صوبہ سرحد ہی میں مقیم تھے، تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ [1]

"جہاں تک قربانی اور ایثار کا تعلق ہے، مسلمانوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں تمام قوموں سے زیادہ مالی اور جانی قربانی دی، لیکن افراد کی اکثریت چونکہ ہندو کو حاصل تھی، اس لئے کامیابیوں کا سہرا ہندو ہی کے سر بندھتا رہا ـــــ اگر صرف سرحدی مسلمانوں ہی کی جانی قربانی کو لیا جائے تو باقی ماندہ سارے ہندوستان سے بڑھ کر صرف اس علاقہ کے لوگوں نے آزادی وطن کی خاطر اپنا خون دیا ہے۔"

مسلمانان سرحد کی انہی قربانیوں سے متاثر ہو کر دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد کے صدارتی خطبے میں صوبہ سرحد کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کے برابر آئینی حقوق اور مراعات دینے کی پُر زور سفارش کی اور پختون قوم کے جذبۂ جہاد کو دلی خراج تحسین پیش کیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ تمام غیر مسلم رہنما (بلکہ خود کانگرس کے نیتا بھی) صوبہ سرحد کو سیاسی مراعات دیئے جانے کی پُر زور مخالفت کر رہے تھے، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کا پردہ یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ

"رہا، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سو یہ امر نہایت افسوناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے، ان کی سفارشات برے (BRAY) کمیٹی سے بھی کم ہیں اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں، وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانیت کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی ـــــ پختونوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں، محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ

---

[1] "اکثریت یا نحوس" ـــــ علامہ مشرقی

ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل جس قدر دل خوش کن کیوں نہ ہو، اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا ——— سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی اور ہمارا فرض ہے کہ تمام انسانوں تک یہ روشنی پہنچائیں، خواہ وہ بارود خانہ میں رہتے ہوں، خواہ کوئلے کی کان میں۔"

پختون ایک بہادر اور ذہین قوم ہے، وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں، وہ ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے، جو اُن کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے ——— گزشتہ دنوں اس بد قسمت صوبہ میں جو المناک واقعات رونما ہوئے ہیں، وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں۔"

ہندوستان میں اصولِ حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے اب تک صوبہ سرحد سے جو وطیرہ اختیار کیا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ برطانوی مدبر صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبے میں جو کچھ پیش آرہا ہے، خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

"حکومت ہند نے اپنی یادداشت میں صوبہ سرحد کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے۔ وہ ناکافی ہیں ——— کیونکہ اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا گیا جو ملک کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ پختون جبلتاً اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں، کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری اداروں میں حصہ لیں۔"

پروپیگنڈہ عصرِ حاضر میں بہت طاقتور ہتھیار ہے، چونکہ اس وقت تک اخبارات زیادہ تر غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھے، وہ مسلمانانِ ہند اور بالخصوص سرحدی مسلمانوں پر طرح طرح کے الزامات لگا کر فرنگی حکمرانوں کے دل اُن سے بدظن کرتے تھے، صوبہ سرحد کے بیدار مغز رہنما صاحبزادہ عبدالقیوم نے ۱۹۲۸ء میں لاہور کے انگریزی جریدہ میں "رسولِ پاکؐ اور پختون" کے عنوان کے تحت اپنے مقالہ میں ان شرپازوں کے غلط پروپیگنڈہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ

"مسٹر ستیارتھی ہمیں لاکھ ظالم، خون آشام، غارت گر اور وحشی کہے، لیکن جس دیانتدار اور غیر جانبدار مبصر نے صوبہ سرحد کے لوگوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت کو تسلیم

کرتا ہے کہ ہم ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں رہنے والوں اور اصلاحات سے بہرہ مند بہت سے ہندوستانیوں سے زیادہ مہذب ہیں ـــــ سرڈینیز برے کمیٹی نے، جو خاص اس غرض کے لئے مقرر کی گئی تھی کہ ہمارے اس صوبے کی ضروریات اور اصلاحات کے لئے ہماری موزونیت اور اہلیت کے بارے میں تحقیق کرے، متفقہ طور پر ہمیں اصلاحات کے قابل پایا۔"[1]

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان رہنماؤں بالخصوص ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان، سر محمد شفیع، سر شفاعت احمد خان، ہز ہائی نس آغہ خان ثالث، سر شاہ نواز بھٹو اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے سرحد کو ایک صوبہ بنانے اور دوسرے صوبوں کے مساوی حقوق دینے کی پُرزور حمایت کی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے تقریر کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ

ہم ایک خود دار قوم ہیں ـــــ ہم اپنے ماتھے سے احساسِ کمتری کا داغ دور کرنا چاہتے ہیں ـــــ ہمیں ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ ہمیں مساوی حقوق اور مراعات دی جانی چاہئیں۔"

صوبہ سرحد کے قبائلی مسئلہ کے متعلق بھی صاحبزادہ صاحب نے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرنگی حکمرانوں پر واضح کیا کہ

"قبائلی مسئلہ خالصتاً ایک اقتصادی مسئلہ ہے، ورنہ بحیثیتِ مجموعی سرحدی قبائل زندگی کی اعلیٰ قدروں کے نقیب ہیں۔" صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے کہا: "قبائلی لوگ روزگار کے سلسلے میں آسٹریلیا جاتے ہیں، کراچی میں محنت مزدوری کرتے ہیں ـــــ تاہم وہ جس ماحول میں رہتے ہیں، اُس میں اپنے دفاع کے لئے انہیں بندوقوں اور کارتوسوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خرید نہیں سکتے تو سرکاری علاقہ کے لوگوں سے زبردستی لے جاتے ہیں ـــــ اگر انہیں روزی میسر آسکے تو پھر کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔"

مسلمانانِ سرحد کی قربانیاں آخر رنگ لائیں، گول میز کانفرنس کے نتیجے میں صوبہ سرحد کو گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا، صوبہ سرحد میں پہلی بار لیجسلیٹو کونسل قائم ہوئی، جس میں چالیس ارکان تھے، ۲۸ منتخب شدہ اور بارہ نامزد

---

[1] لوئے پختون ـــــ میر عبدالصمد خاں

کردہ، کونسل میں صرف ایک ہی غیر سرکاری وزیر تھے اور وہ تھے سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان ـــــ زیدہ کے خان بہادر عبدالغفور خاں کونسل کے صدر تھے تو ڈیرہ اسماعیل خان کے خان بہادر عبدالرحیم خان ڈپٹی سپیکر۔

اپریل ۱۹۳۲ء میں کونسل کا پہلا اجلاس ہوا۔ صوبہ سرحد کی مجلس قانون ساز کی کارکردگی تاریخی حیثیت کی حامل تھی، یہ فخر صوبہ سرحد ہی کو حاصل ہوا کہ یہاں ملک بھر کے صوبوں سے پہلے شریعت ایکٹ منظور کیا گیا۔ گویا اسلامی قوانین کے نفاذ میں اولیت کا سہرا اہل سرحد ہی کے سر بندھا۔ اس قانون کی منظوری سے پہلے وراثت، عائلی اور دوسرے امور مقامی رسم و رواج کے مطابق حل کئے جاتے تھے، شریعت ایکٹ کے تحت یہ معاملے اسلامی شریعت کے مطابق طے ہونے لگے۔ شریعت ایکٹ کے تحت عورتوں کو ان کے معاشرتی اور معاشی حقوق حاصل ہو گئے، موروثی جائیداد کی تقسیم بھی اسی ایکٹ کی رو سے ہونے لگی گویا قانون سازی میں بھی اس صوبے نے دوسرے صوبوں کو راہ دکھائی ـــــ پنجاب میں شریعت ایکٹ پاکستان کے قیام کے بعد نافذ ہوا۔

۱۹۳۶ء میں بابائے قوم محمد علی جناح نے صوبہ سرحد کا پہلا دورہ کیا، ان دنوں صوبے میں کانگرس یا خدائی خدمتگاروں کا طوطی بول رہا تھا، قائداعظم کے اس دورے کے کوئی فوری نتائج تو سامنے نہ آسکے، البتہ مسلمانانِ سرحد کیلئے دعوتِ فکر کا سامان مہیا ہوگیا، ایک ملک گیر اسلامی تنظیم سے وابستگی سرحدی مسلمانوں کی ایک ناگزیر ضرورت تھی، ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان کی منظوری اور ۱۹۴۵ء میں قائداعظم کے دورے نے فضا پلٹ کر رکھ دی، یا تو وہ وقت تھا، جب کوئی مسلم لیگ کی دعوت پر کان نہ دھرتا تھا اور یا ۱۹۴۷ء میں وہ وقت بھی آیا کہ جب وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن اپنی اہلیہ کے ہمراہ پشاور کے حالات دیکھنے آیا تو قلعہ بالاحصار کے پاس ایک لاکھ پختون مسلم لیگ کے جھنڈے اُٹھائے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ تاریخ صوبہ سرحد میں میں پہلی بار ہزاروں برقع پوش خواتین پاکستان کے حق میں مظاہرے کر رہی تھیں، پختون مجاہد پیر صاحب مانکی شریف، پیر صاحب زکوڑی شریف، مولانا بخت جمال اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی قیادت میں حصولِ پاکستان کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کی سو فیصد کامیابی اور صوبائی اسمبلیوں میں شاندار فتح کے بعد فضا بالکل پلٹ چکی تھی ـــــ ۳، جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا تو حضرت قائداعظمؒ نے اپنی اولین نشری تقریر میں اعلانیہ اعتراف کیا کہ

"آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کے تمام طبقوں اور خاص طور پر سرحدی خواتین نے جو اہم

خدمات انجام دی ہیں۔ میں اُن کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

پاکستان کا مطالبہ منظور ہو چکا تھا، تاہم فرنگی حکمرانوں نے ایک اور مشکل پیدا کر دی، بجائے اُسکے کہ واضح مسلم اکثریت کے اس علاقے ـــــ صوبہ سرحد کو پاکستان کا ایک حصہ قرار دے دیا جاتا یہ شرط لگا دی کہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) کے ذریعے یہ معلوم کیا جائے کہ یہاں کے لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں ـــــ اہلِ سرحد اس آزمائش میں بھی پورے اُترے، پاکستان کے حق میں دو لاکھ نواسی ہزار دو سو چالیس ووٹ پڑے تو ہندوستان کے حق میں دو ہزار آٹھ سو چوہتر ـــــ مسلمانانِ سرحد نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کر کے اپنے لئے آزاد اسلامی مملکت میں بسنا پسند کیا ـــــ اگر یہ باشعور لوگ پاکستان کی حمایت نہ کرتے تو آج یہاں کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔

اضلاع سرحد کے عوام اپنا تاریخی کردار ادا کر چکے تو قبائل سرحد کی طرف نگاہیں اُٹھنے لگیں۔ ہر جگہ قبائلی جرگے بلائے گئے، جرگوں کے ارکان نے متفقہ طور پر پاکستان سے اپنی غیر مشروط حمایت اور وفاداری کا اعلان کیا ـــــ چترال سے قلات تک وقفے وقفے سے قبائلی نمائندوں کے اجتماع ہوتے رہے، بالآخر نومبر ۱۹۴۷ء تک ڈیورینڈ لائن سے اس طرف کے تمام علاقے پاکستان کی عملداری میں شامل ہو گئے اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت عالم وجود میں آگئی۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو اہلِ سرحد کی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ

"ہمیں اُن خدمات سے بخوبی واقف ہوں جو آپ حضرات (پختونوں) نے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد اور جنگ میں آپ نے جس ہمدردی اور حمایت کا اظہار کیا، میں اس کے لئے شکر گزار ہوں اور آپ کے اظہار وفاداری حمایت اور قول و اقرار کے پیشِ نظر ہم نے اپنی تمام افواج کو قبائلی علاقوں سے واپس بُلا لیا ہے، ہمارے اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ ہم آپ پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔"

پاکستان بن چکا تھا اور بفضلِ خدا یہ قائم رہنے کے لئے بنا تھا، تاہم حاسدوں کی جانب سے اسکو کمزور کرنے کی کوششیں جاری تھیں، فرنگی نے جان بوجھ کر ہمارے لئے مسائل کھڑے کر دیئے تھے ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریت کا علاقہ تھا، لیکن ایک سازش کے تحت وہاں کے ڈوگرہ حکمران نے عوام کی مرضی کے

عین خلاف اور جغرافیائی تقاضوں کو بالکل نظر انداز کر کے بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق کر دیا تھا، کشمیری عوام بے بس تھے، انہوں نے اپنے بھائیوں کو مدد کے لئے پکارا، سرحدی مسلمان ایک بار پھر دینی غیرت کے جذبے سے اُٹھے اور اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کو پہنچے ——— بھارت میں شور مچ گیا، "حملہ آور آ گئے" ان کے واویلا کے جواب میں پختون جرنیل محمد اکبر خان کو یہ کہتے ہی بن پڑی کہ

"کشمیر کی پہلی جنگِ آزادی (۴۸—۱۹۴۷ء) کی ابتداء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے پٹھان محاذ پر پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے سری نگر کے دروازے پر دستک دینے لگے، بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اُن پر حملہ آور ہونے کا الزام لگایا ——— میں (جنرل اکبر خان) کہتا ہوں، ہمیں حملہ آور کہلانے پر فخر ہے۔ محمد بن قاسمؒ بھی حملہ آور تھا اور محمود غزنویؒ بھی ——— اور کشمیر کے بے بس اور مجبور انسانوں کو ڈوگرہ راج کے ظلم و تشدد اور جبری غلامی سے آزاد کرانے کے لئے (قبائلی) پٹھانوں نے اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور آ کر جو حملہ کیا تھا۔ وہ ہماری روایات کے عین مطابق اور قرآن کریم کے اس فرمان کی تعمیل میں تھا کہ جس بستی میں مسلمانوں پر تشدد ہو رہا ہو۔ وہاں پہنچو اور انہیں ظالم حکمران سے آزاد کراؤ۔"[1]

قبائلی مجاہد ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے روز کشمیر میں داخل ہو گئے ——— انہوں نے بھارت کو مجبور کر دیا کہ وہ معاملہ اقوامِ متحدہ کے سامنے لے جائے تاکہ "جنگ بندی" ہو سکے، لیکن اقوامِ متحدہ کے فیصلہ کے مطابق کشمیر میں ——— رائے شماری آج ۳۶ سال بعد بھی نہیں کرائی گئی، انصاف پسند قومیں محوِ حیرت ہیں کہ کیا وعدے کی پابندی اسی کو کہتے ہیں؟

صرف سیاسی محاذ پر ہی نہیں، تعلیمی، تہذیبی اور اقتصادی شعبوں میں بھی پختون قوم نے اپنی عظمتِ کردار کا ثبوت دیا ہے، مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی، امریکی اہلِ قلم جیمز میچنر، سر فریزر ٹیٹلر اور دوسرے مغربی دانشور آج صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کو دیکھتے ہیں تو دم بخود رہ جاتے ہیں، ہر طرف باہمی اعتماد کی فضا ہے، رزمک، وانا اور سرحدی قلعے فوجیوں سے خالی ہیں، نہ جنگیں ہیں نہ خونی معرکے۔ نہ بیروزگاری ہے، نہ فقر و فاقہ ——— اہلِ سرحد دولتِ آزادی پانے کے بعد ایک نئے جذبے اور تعمیری لگن کو لیکر اُٹھے ہیں، جہاں دُور دُور تک مدرسہ دیکھنے میں نہ آتا تھا، وہاں آج چار یونیورسٹیاں، پچاس کے قریب کالج، ایک ہزار کے قریب

---

[1] کشمیر کے حملہ آور، میجر جنرل اکبر خان، مرتبہ عنایت اللہ ——— مدیر "حکایت"

ہائی سکول اور ہزاروں پرائمری سکول علم کی روشنی پھیلانے میں مصروف ہیں، ہر طرف نئی سڑکیں ہیں، جن پر کاریں، بسیں اور ویگنیں دوڑ رہی ہیں، تجارتی منڈیاں قبائلیوں کے ہاتھ میں ہیں، کروڑپتی ٹھیکہ دار اُن میں موجود ہیں، وہ اونچے عہدوں پر فائز ہیں، وہ پاکستان کے صدر اور سربراہ بھی رہے ہیں، فوج میں جرنیل ہیں، اُن میں بڑے بڑے انجینئر، ڈاکٹر اور وکیل ہیں، سینکڑوں شاعر، ادیب، اہلِ قلم اور صحافی پشتو ادب و شعر کی نوک پلک سنوار رہے ہیں، اُن پر ترقی کی ہر راہ کھلی ہے، وہ پاکستان کی سرحدوں کے محافظ ہیں، تو پاکستان اُن کے جذبۂ ایمانی اور قوت بازو پر نازاں ——— وہ خوشحال خان کے "شاہین" ہیں تو اقبال کے "مردِ مومن" ——— انہوں نے پاکستان بنانے کی گراں قدر حصہ لیا ہے تو اب اس آزاد مملکت کی تعمیر و استحکام میں بھی انہیں پورے خلوص اور تن دہی سے اپنا کردار انجام دینا ہے۔

اُن کا ماضی قابلِ فخر ہے، حال درخشاں ہے تو مستقبل تابناک تر! ——— اتحاد اور یقین محکم کے جذبے سے سرشار وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے شاہراہ ترقی پر رواں دواں ہیں، اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف! ——— اُنہیں اس یقین کے ساتھ ملتِ پاکستان کی تاریخ کے روشن باب رقم کرنے ہیں کہ ؎

ترا جہاں ہے وہی جس کو تُو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

صُوبۂ سرحد ـــــ جغرافیائی خدوخال

جغرافیائی حالات کو سمجھے بغیر کسی خطے کی تاریخ، ثقافت، تہذیب اور روایات کو سمجھنا محال ہے ـــــ صوبہ سرحد جغرافیائی اعتبار سے دنیا کا ایک بے حد اہم بلکہ منفرد خطہ ہے۔ ہر دور میں اسے ایک کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے ـــــ اس کے تاریخ ساز لوگوں نے ہزاروں انقلابات دیکھے ہیں اور اس کے سخت کوش عوام ہر دور میں ملکی سرحدوں کی حفاظت میں سربکف رہے ہیں ـــــ یہ سرزمین صرف پاکستان ہی کی شمال مغربی سرحد نہیں، بلکہ یہاں چین، روس، افغانستان اور پاکستان کی چار مملکتیں گلے ملتی نظر آتی ہیں، صدیوں سے انسانی تہذیب کے سینکڑوں قافلے یہاں سے گزر کر جنوبی زرخیز میدانوں میں آباد ہوتے رہے ہیں، اسی لئے یہاں انسانی تہذیبوں کی بوقلمونی کا مشاہدہ اپنے پورے پس منظر میں کیا جا سکتا ہے، ہر قوم اور ہر قبیلہ کے لوگوں نے یہاں اپنے تہذیبی نقوش چھوڑے ہیں اور سابقہ حملہ آوروں اور فاتحین کے حالات و واقعات ہر مؤرخ اور دانش ور کے لئے ایک روحانی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہیں۔

وطنِ عزیز کا یہ خطہ اس اعتبار سے بھی ایک انفرادی شان لئے ہوئے ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف بلند و بالا پہاڑ، برف پوش چوٹیاں، خطرناک گلیشیئر اور دشوار گزار درّے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف ریتلے میدان، بے آب و گیاہ ویرانے اور نُکیلی چٹانوں کے سلسلے بھی موجود ہیں، ہر قسم کی آب و ہوا اور پیداوار پائی جاتی ہے، اس میں سیاح کو یکسانیت اور اکتاہٹ سے واسطہ نہیں پڑتا، بلکہ مناظر کی رنگا رنگی اُس کا دل لُبھاتی ہے۔ صوبہ سرحد میں جہاں دلکش اور پُر بہار صحت افزاء مقامات پائے جاتے ہیں۔ وہیں تپتے ہوئے صحرا اور سنگ زار بھی موجود ہیں۔ جنگلات کی دولت کے اعتبار سے بھی یہ صوبہ اپنی

انفرادی شان رکھتا ہے تو معدنی وسائل، زمرد، یاقوت اور قیمتی پتھروں کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ یہاں قدم قدم پر گنگناتے دریا، گیت گاتی ندیاں اور آبشار پر آبشار بناتے پہاڑی نالوں کی موسیقی کانوں میں رس گھولتی ہے تو دل کش قدرتی نظارے، دل فریب بہاریں اور فطرت کی رنگینیاں جنت نگاہ کا سامان لئے ہوئے ہیں، جہاں ایک طرف ہیبت ناک پہاڑی چوٹیاں، اژدہا کی طرح منہ کھولے درّے اور پُرخطر گھاٹیاں اپنی شانِ جلالی کا مظاہرہ کرتی ہیں تو دوسری طرف زمرّدیں وادیوں کی رعنائیاں دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ صوبہ سرحد پاکستان میں پن بجلی کا سب سے بڑا مخزن بھی ہے تو آثارِ قدیمہ کی دولت کا سب سے بڑا مرکز بھی ——— یہ سیاحوں کی جان ہے تو مُہم بازوں اور کوہ پیماؤں کی سرگرمیوں کی جولان گاہ بھی ہے۔ یہ سرزمین مؤرخوں، علم الانساب کے ماہروں، اور علم نباتات اور طبقات الارض سے دلچسپی رکھنے والے سکالروں کے لئے تحقیق و تجسس کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے تو عمرانیات اور معاشیات کے علماء کی کاوشوں کا میدانِ تگ و تاز بھی ——— ہر اعتبار سے صوبہ سرحد کا جغرافیائی مطالعہ بیحد اہم بھی ہے اور بہت دلچسپ بھی۔

برصغیر پاک و ہند کے شمال مغرب پر واقع ہونے کی وجہ سے برطانوی حکمرانوں نے اُسے "شمال مغربی صوبہ سرحد" کا نام دیا۔ جبکہ قدیم ایام میں اُسے گندھارا، بگرام، پشکال وتی اور دوسرے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ صوبہ سرحد مملکتِ خداداد پاکستان کے چار صوبوں میں سے ایک ہے۔ یہ ۳۰ درجہ اور ۳۸ درجہ طول بلد شمالی اور ۶۸ اور ۷۵ درجہ عرض بلد شرقی کے مابین پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں ہندوکش کے پہاڑی سلسلے، جنوب میں بلوچستان اور پنجاب کے علاقے، مشرق میں پنجاب کا ضلع اٹک اور دریائے سندھ اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔ صوبہ سرحد کا کل رقبہ— ۳۹۲۸۴ مربع میل ہے، اس میں اضلاع سرحد بھی شامل ہیں اور قبائلی علاقے بھی۔ اضلاع کا رقبہ— ۱۰۵۱۱ مربع میل ہے، جبکہ قبائلی علاقے ۲۸۷۷۳ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔[1] ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اضلاع کی آبادی ایک کروڑ آٹھ لاکھ پچاس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ جبکہ قبائلی علاقوں میں اکیس لاکھ پچہتر ہزار لوگ رہ رہے ہیں، صوبے کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۴۰۸ میل اور زیادہ سے چوڑائی ۳۸۰ میل ہے۔

---

[1] (N.W.F.P. YEAR BOOK--1981)

صوبہ سرحد میں تین طرح کے علاقے شامل ہیں، اضلاع سرحد، پولیٹیکل ایجنسیاں اور وفاق کے تحت قبائلی علاقے جو متعلقہ ڈپٹی کمشنروں کے زیرِ انتظام ہیں۔ اضلاع سرحد پانچ ڈویژنوں پر مشتمل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے :۔

ڈویژن	اضلاع
(۱) مالاکنڈ ڈویژن	دیر، سوات، مالاکنڈ اور چترال
(۲) پشاور ڈویژن	پشاور اور مردان
(۳) ہزارہ ڈویژن	کوہستان، مانسہرہ، ایبٹ آباد
(۴) کوہاٹ ڈویژن	کوہاٹ اور کرک
(۵) ڈیرہ اسماعیل خان	بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان

پولیٹیکل ایجنسیاں

(۱) باجوڑ ایجنسی ——— رقبہ ۱۲۷۳ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام خار

(۲) مہمند ایجنسی ——— رقبہ ۲۲۷۰ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام غلنئی

(۳) خیبر ایجنسی ——— رقبہ ۲۵۷۴ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام پشاور و لنڈی کوتل

(۴) کرم ایجنسی ——— رقبہ ۳۳۴۰ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام پاڑہ چنار

(۵) اورک زئی ایجنسی ——— رقبہ ۲۰۳۱ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام ہنگو

(۶) شمالی وزیرستان ——— رقبہ ۴۶۵۱ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام میراں شاہ

(۷) جنوبی وزیرستان ——— رقبہ ۶۵۴۲ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام وانا

وفاق کے زیرِ انتظام دوسرے علاقے

(۱) پشاور ——— رقبہ ۲۵۷ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام پشاور

(۲) کوہاٹ ——— رقبہ ۴۱۷ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام کوہاٹ

(۳) بنّوں ——————— رقبہ ۸۶۷ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام بنّوں

(۴) ڈیرہ اسماعیل خاں ——————— رقبہ ۳۱۸۸ مربع کلومیٹر۔ صدر مقام ڈیرہ اسماعیل خان

پولیٹیکل ایجنسیوں اور وفاق کے زیرِ انتظام دوسرے قبائلی علاقوں کا نظم و نسق اضلاع سرحد کے نظم و نسق سے بالکل جُدا ہے۔ ان علاقوں میں حکومتِ پاکستان کے حکام مقامی قبائل کے تعاون سے امن و امان برقرار رکھتے ہیں اور پاکستانی سرحدات کی حفاظت کرتے ہیں، یہاں نہ اضلاع کی طرح پولیس ہے نہ عدالتیں ——— قبائلی لوگ اپنے تنازعات اپنے جرگوں (پنچایٹ) میں طے کرتے ہیں۔ حکومت اُنکے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی، چنانچہ وہ صدیوں سے اپنے وضع کردہ اصولوں اور رسم و رواج کے مطابق زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔

پہاڑی سلسلے

صوبہ سرحد کی تاریخ پر قدرتی پہاڑی سلسلوں اور دّروں نے بھی گہرا اثر چھوڑا ہے، انہی طبعی حالات کی بناء پر دنیا کے کسی علاقے کو اتنے تغیرات، انقلابات اور حملہ آوروں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جتنا صوبہ سرحد کے ان علاقوں کو ——— سہولت کی خاطر صوبہ سرحد کو تین طبعی خطّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) دریائے سندھ کا مشرقی علاقہ (ہزارہ ڈویژن) (۲) دریائے سندھ کے مغرب میں میدانی علاقہ (مالاکنڈ، مردان، پشاور، کوہاٹ، کرک، بنّوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے اضلاع) (۳) ڈیورینڈ لائن اور اضلاع سرحد کے مابین پہاڑی علاقے (پولیٹیکل ایجنسیاں اور وفاق کے زیرِ انتظام علاقے)

ہزارہ اور گلیّات

ہزارہ ڈویژن بلند و بالا پہاڑی سلسلوں، قدرتی نظاروں اور صحت افزا مقامات کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، اس کے شمال میں ہمالیائی سلسلے کے وہ پہاڑ ہیں جو شاہراہِ چین سے کوہ متری تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ ایک پہاڑی شاہراہ مری کو ایبٹ آباد سے ملاتی ہے، ایبٹ آباد، خانس پور، کالا باغ، چھانگا گلی، ڈونگا گلی، نتھیا گلی اور ایوبیہ کے پُر بہار مقامات ہیں (گلی مقامی زبان میں درّہ کو کہتے ہیں) ہر سال ہزاروں مُلکی اور غیر ملکی سیاحوں کی جماعتیں موسمِ گرما میں ان خوبصورت مقامات کی سیر سے لُطف اندوز ہوتی ہیں، بہت سے لوگ پورا سیزن یہیں گزارتے ہیں۔ سارے پہاڑ چیڑ، دیودار اور دوسرے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، نباتات کی بہتات ہے، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے، جگہ جگہ پہاڑی ندی نالے اور چشمے علاقے کی زرخیزی اور شادابی میں

اضافہ کرتے ہیں، اُنہی ندی نالوں کی وجہ سے علاقہ چھوٹی چھوٹی زمردیں وادیوں میں بٹا ہوا ہے۔ علاقے کو مزید ترقی دینے کے لئے ہزارہ ہل ٹریکٹ امپروومنٹ سکیم بنائی گئی ہے، جس کے تحت سڑکوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے، بستیاں آباد ہو رہی ہیں، ایوبیہ اور ٹھنڈیانی کو مزید دل کش بنانے کے سامان کئے جا رہے ہیں، ایوبیہ میں سیاحوں کی تفریح کے لئے بجلی کی لفٹ (جھولا) لگائی گئی ہے۔ جس میں بیٹھ کر کافی بلندی سے دُور دُور تک جگہوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ سارا علاقہ فردوسِ بریں کا منظر پیش کرتا ہے۔

نتھیا گلی کے نواح میں میراں جانی کی چوٹی سطح سمندر سے کوئی دس ہزار فٹ بلند ہے، اس کے پاس ہی نانگا پربت اور کے۔ ٹو کی شہرہ آفاق چوٹیاں ہیں۔ نتھیا گلی میں حکومت صوبہ سرحد کے دفاتر اور بنگلے بھی ہیں اور عام سیاحوں کے لئے ہوٹل بھی۔

کاغان کی وادی سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہے۔ کُنہار کا خوبصورت دریا اس کے بیچوں بیچ بہتا ہے، بالاکوٹ وادیٔ کاغان کا دروازہ ہے۔ یہیں سے گلگت کو سڑک نکلتی ہے۔ سیف الملوک اور لولوسر وادیٔ کاغان کی قدرتی جھیلیں ہیں، ہر طرف ایک مسحور کن فضا ہے، نظارے اتنے دل کش ہیں کہ انہیں دیکھنے سے طبیعت سیر ہونے نہیں پاتی۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہزارہ ڈویژن کے علاقے ولایتِ کشمیر کا حصہ تصوّر کئے جاتے تھے، لیکن انگریزوں نے جموں کا علاقہ دیکر ہزارہ کو اپنے تصرف میں لے لیا اور اُسے صوبہ سرحد کے ساتھ شامل کر لیا۔ آزادیٔ وطن سے پیشتر انگریز افسر اور گورا سپاہی گرمی کے دنوں میں ہزارہ کے ان ٹھنڈے مقامات کو منتقل ہو جاتے تھے، آجکل عام آسودہ حال لوگوں نے یہاں مکان تعمیر کر رکھے ہیں، گرمی میں ہوٹل بھی کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں، مقامی آبادی بھی اب خوشحال ہے، سفری سہولتیں میسر ہیں، پہلے ان مقامات تک لوگ گھوڑوں اور خچروں پر آتے جاتے تھے، پھر جیپ چلنے لگی ——— آج کل ہر قسم کی بڑی چھوٹی گاڑیاں ایک جگہ اور دوسری جگہ کے مابین چلتی ہیں۔

ہزارہ کے یہ پہاڑ مغربی کاغان رینج، کوہ سیاہ، مشرقی کاغان رینج، سری کوٹ اور مارگلہ کے سلسلوں پر مشتمل ہیں، ان میں سے مغربی کاغان کا سلسلہ طویل ترین پہاڑی سلسلہ ہے، جنوبی ہزارہ میں مرگلہ اور خان پور کی پہاڑیاں ہیں تو شمال مغرب میں کالا ڈکہ (کوہ سیاہ) ہے، شمالی پہاڑوں میں "موسیٰ کا مصلّےٰ" بلند ترین مقام ہے، کاغان کے مشرقی اور مغربی پہاڑوں کے درمیان کاغان یا کنہار کی حسین اور دلکش وادی

ہے جو بابوسر پاس سے لے کر بالاکوٹ تک لمبائی میں بانوے ۹۲ میل اور چوڑائی میں پندرہ ۱۵ میل تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ کاغان میں بارہ ۱۲ ہزار فٹ سے سترہ ۱۷ ہزار فٹ تک اُونچی اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں، بڑے بڑے گلشیر (برف کی چٹانیں) صاف شفاف نیلے پانی کی کٹوروں جیسی جھلیں اور آبشار پر آبشار بناتی گنگناتی ندیاں انتہائی دلفریب منظر پیش کرتی ہیں۔

ان پہاڑی سلسلوں کی بدولت سرزمین ہزارہ کئی وادیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مانسہرہ میں پکھلی کا میدان، ایبٹ آباد میں اورش کی وادی، اوگی کے پاس اگر در کا علاقہ، دریائے سرو کی زرخیز وادی اور ہری پور کے میدان میں سرسبز باغوں کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے۔

بالائی ہزارہ جنگلات کی دولت سے مالا مال ہے، ان پہاڑوں میں سالانہ ۳۰" سے ۷۰" تک سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس لئے نباتات اور جڑی بوٹیوں کی بھی کثرت ہے، حکومت ان علاقوں میں سیب کے باغات لگا رہی ہے، زیتون کی کاشت ہو رہی ہے، یہاں تک کہ اب تجرباتاً چائے کی کاشت بھی ہونے لگی ہے، چائے کے پودے اُن مقامات پر زیادہ پھلتے پھولتے ہیں، جو پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع ہوں اور جہاں بارش کافی ہوتی ہو، چنانچہ مانسہرہ کے قصبہ بفہ اور دوسرے مقامات پر چائے کے باغ لگائے گئے ہیں۔ نتائج حوصلہ افزا ہیں اور وہ وقت دور نہیں، جب ان باغات سے چائے کی مقامی ضرورت پوری ہونے لگے گی۔ مانسہرہ اور ہری پور کے میدانی علاقوں میں عمدہ قسم کا ولائتی تمباکو بھی کافی پیدا ہوتا ہے، چونکہ ان علاقوں میں بارش خوب ہوتی ہے اور ندی نالوں اور چشموں سے آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے مکئی کی فصل بہت عمدہ ہوتی ہے، کہیں کہیں دھان کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ دن بدن زرعی ترقی کے امکانات روشن ہو رہے ہیں، یوں بھی سیر و شکار کے شائقین کے لئے یہ علاقے بڑی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہیں اور سیاحت کے فروغ سے بھی ان علاقوں کے لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہونے کی اُمید ہے۔

کوہ ہندوکش کا سلسلہ

دریائے سندھ کے مغرب میں چترال، دیر، سوات اور بونیر کے پہاڑ ہیں، جو شمالاً جنوباً متوازی خطوط میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان چترال، سوات اور پنجکوڑہ کے دریاؤں کی وادیاں ہیں، اوسطاً ان پہاڑوں کی بلندی دس ۱۰ بارہ ۱۲ ہزار فٹ ہے، تاہم چترال شہر سے تھوڑی دور ترچ میر کی مشہور چوٹی سطح سمندر سے

پچیس ہزار دو سو تریسٹھ فٹ اونچی ہے، یہ پاکستان میں سلسلۂ ہندوکش کی بلند ترین چوٹی ہے، وقتاً فوقتاً کوہ پیماؤں کی ٹیمیں دنیا بھر کے ملکوں سے یہاں آتی رہتی ہیں، سوات میں سترہ ہزار آٹھ سو فٹ اُونچی چوٹی کاچی کونی بھی کوہ پیماؤں اور مہم بازوں کے لئے بیحد دلچسپی کا باعث ہے، سوات کے مقام مالام جبّہ میں سکیٹنگ کرنے والوں کے لئے بھی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں، جس کی وجہ سے یہ علاقہ سیاحوں کے لئے بڑا دل کش ہے، اس کے قریب ہوٹل اور آرام گاہیں بھی تعمیر کی گئی ہیں، پشاور سے چترال اور سید و شریف تک فضائی سروس کی سہولت بھی موجود ہے، چترال کے نواح میں کافرستان کا علاقہ ہے، جہاں صدیوں پُرانی تہذیب اور رسم و رواج پائے جاتے ہیں، تاریخ کے نامعلوم زمانے سے اس علاقہ کے باشندے (کالاش) یہاں دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے ہیں، چترال میں گرم چشمہ بھی ایک قابلِ دید جگہ ہے، سوات کا کوہستانی علاقہ گوجر قوم کے خانہ بدوش چرواہوں کا مسکن ہے، ان لوگوں کی زبان اور رہن سہن بھی دوسرے سرحدی علاقوں سے بالکل جُدا ہے۔ ان کی بولی قدیم اُردو برج بھاشا سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے۔ تاریخ کے طالب علموں کے لئے یہاں تحقیق و تجسّس کے وسیع مواقع موجود ہیں۔

لواری، مالاکنڈ اور امبیلہ کے درّے شمالی پہاڑی علاقوں اور صوبہ سرحد کے زیریں میدانوں کے مابین آمد و رفت کا ذریعہ ہیں۔ ان پہاڑی سلسلوں میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ چترالی یا کاشکاری بڑے نرم خُو، امن پرور اور تنہائی پسند ہیں، کافر لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور جُداگانہ مذہب اور رسوم کے حامل ہیں، کوہستانی خانہ بدوش اور پسماندہ لوگ ہیں، سوات، باجوڑ، بونیر، دیر مالاکنڈ اور علاقہ اتمان خیل میں مشہور پختون قبیلہ یوسف زئی کی مختلف شاخیں آباد ہیں، تاریخ کے ہر دَور میں انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنی آزادی کی حفاظت کی ہے اور ہر غاصب اور حملہ آور طاقت سے ٹکر لی ہے، کسی وقت بھی وہ بیرونی حملہ آوروں کے غلام نہیں رہے۔

دریائے چترال، دریائے سوات اور دریائے پنجکوڑہ یہاں کے مشہور دریا ہیں، یہ دریا پہاڑوں سے تازہ مٹی لا کر میدانوں میں بچھاتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں آبپاشی کی سہولت موجود ہے، علاقہ بڑا زرخیز ہے، دریائے سوات سے امان درّہ اور مچنی کے مقام سے نہریں نکالی گئی ہیں، جن کی بدولت مردان کے بیابان اب لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ دریائے سوات کے پانی کو قلعہ مالاکنڈ کے قریب میلوں

لمبی سُرنگ سے گزار کر جبّن پہنچایا گیا ہے، جہاں ایک بجلی گھر ۱۹۳۸ء سے قائم ہے، ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرتا ہوا پانی بجلی گھر کی مشینوں (TURBINES) کو گھماتا ہے تو ہزاروں کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے، جبّن کو صوبہ سرحد کا پہلا پن بجلی گھر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جبّن سے کچھ میل نیچے درگئی کے مقام پر بھی ایک بجلی گھر قائم ہے۔

ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں کی ڈھلوانوں پر چیڑ، دیودار اور صنوبر کے سدا بہار جنگلات ہیں، پاکستان بھر میں عمارتی لکڑی کی ضروریات انہی جنگلات سے پوری ہوتی ہیں، چنانچہ درگئی میں عمارتی لکڑی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ جنگلات کی اس دولت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے حال ہی میں چکدرہ کے مقام پر دیر فارسٹ کامپلیکس کے نام سے ایک کارخانہ قائم کر دیا گیا ہے۔

کوہِ سلیمان اور کوہِ سفید

کوہِ سلیمان، کوہِ سفید اور کوہِ شوال کے سلسلے شمال میں دریائے کابل کی وادی سے جنوب میں بلوچستان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض شمالاً جنوباً ہیں اور بعض شرقاً غرباً۔ یہ نسبتاً کم اُونچے پہاڑ ہیں، اُن کی اوسط بلندی آٹھ ہزار فٹ ہے، سب سے اُونچی چوٹی وزیرستان کے پاس تختِ سلیمان ہے جو گیارہ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے پاکستان اور افغانستان کے مابین حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں، مغربی سرحد کے اکثر درّے انہی پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں، پشاور کے مغرب میں تہترا کی پہاڑی ہے، جس میں شہرہ آفاق تاریخی گزرگاہ درّہ خیبر واقع ہے۔ زمانۂ قبل از تاریخ سے انسانی تہذیب کے قافلے وسطی ایشیا سے آتے اور درّہ خیبر سے گزر کر دریائے سندھ اور دریائے گنگا کے میدانوں میں آباد ہوتے رہے، درّہ خیبر کے مغربی کنارے پر لنڈی کوتل اور مشرقی کنارے پر جمرود اور پشاور کی حفاظتی چھاؤنیاں ہیں، جمرود کے مقام پر ایک خوبصورت محراب بنائی گئی ہے۔ جسے "بابِ خیبر" کہتے ہیں، اس گیٹ پر درّہ خیبر کی راہ آنے والے مختلف حملہ آوروں کے حالات مختصراً درج ہیں۔

کوہِ سفید کُرم پاڑہ چنار کے مغرب میں واقع ہے، یہاں ٹیری منگل اور دوسرے مقامات سے افغانستان کے صوبوں خوست اور غزنی کو راستے نکلتے ہیں، کوہِ سفید کی بدولت اس سارے علاقے کی آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے، ہزاروں لوگ موسمِ گرما میں میدانی علاقوں کی شدید گرمی سے بچنے کیلئے پاڑہ چنار کا رُخ کرتے ہیں، سارا علاقہ سرسبز و شاداب ہے اور جگہ جگہ مناظرِ فطرت بڑے دلکش ہیں۔ پاڑہ چنار کے

نواح میں تیراہ کی وادی بھی ایک صحت افزاء علاقہ ہے۔ دریائے باڑہ، دریائے کرم اور دریائے گومل نے اس پہاڑ کو کاٹ کر درّے بنا دیئے ہیں، جن کے نام انہی دریاؤں کے نام پر ہیں۔ ہر درّے کے سر پر ایک حفاظتی چھاؤنی ہے، چنانچہ درّہ خیبر کے سر پر پشاور، درّہ کرم (پیواڑ کوتل) کے سر پر کوہاٹ، درّہ ٹوچی کے سر پر بنوں اور درہ گومل کے سر پر ڈیرہ اسماعیل خان کی چھاؤنی ہے، کوہ سلیمان جوں جوں جنوب کو جاتا ہے، اس کی اونچائی کم ہوتی جاتی ہے، وزیرستان کی پہاڑیاں خشک ہیں اور اُن پر بارش بھی بہت کم ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں نہ تو گھنے جنگلات ہیں اور نہ زیادہ زرعی زمینیں ——— البتہ جہاں جہاں پہاڑی ندی نالوں سے آب پاشی ہوتی ہے، تھوڑی بہت پیداوار ہوتی ہے۔ دریائے کرم برفانی پہاڑوں سے آتا ہے اور پاڑہ چنار کی وادی کو سیراب کرتا ہے۔ اس لئے یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ ٹوچی اور گومل بڑے دریا نہیں، برسات کے دنوں میں ان میں کافی پانی ہوتا ہے، لیکن سردیوں کا اکثر حصہ یہ دریا خشک رہتے ہیں۔ اس لئے زرعی شعبے میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتے ——— پہاڑوں پر گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے علاقے کے لوگوں کا گزارہ زیادہ تر گلہ بانی پر ہے یا درختوں کی لکڑی کاٹ کر شہروں میں فروخت کی جاتی ہے ——— قیام پاکستان کے بعد قبائلی علاقوں میں کامل امن و امان ہے، حکومت قبائل سرحد کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے سرگرم عمل ہے، مختلف ترقیاتی منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے، ایسی صنعتیں قائم کی گئی ہیں، جن کی بدولت ان علاقوں کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ سکول اور کالج کھل گئے ہیں، جہاں قبائلی بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے، انہیں ترجیحی بنیاد پر ملازمتیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے شانہ بشانہ شاہراہ ترقی پر آگے بڑھ سکیں۔ یہاں کے لوگ انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی ادائیگی سے بھی مستثنیٰ ہیں، یہاں تک کہ یہاں قائم کی جانیوالی صنعتوں کو بھی کئی سال تک ٹیکسوں میں چھوٹ دے دی گئی ہے۔

ان بڑے پہاڑی سلسلوں کے علاوہ ضلع پشاور میں اٹک اور چراٹ کے پہاڑ ہیں۔ چراٹ خوشگوار آب و ہوا کا حامل ہے، اب اس کے پاس سیمنٹ کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا گیا ہے، چراٹ میں بارش ہوتی ہے تو بیّ اور دوسرے نشیبی علاقوں میں سیلاب آ جاتا ہے، اٹک اور مانکی کی پہاڑیاں خشک ہیں، ان میں کہیں کہیں سلیٹ کا پتھر اور چونا بنانے کا پتھر پایا جاتا ہے، خیرآباد اور جہانگیرہ کے پاس جگہ جگہ چونا بنانے کی بھٹیاں لگائی گئی ہیں۔

کوہاٹ میں آدم خیل کے پہاڑ عموماً خشک ہیں۔ جن سے جلانے کی لکڑی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، البتہ جنوب میں مہادر خیل کے پاس نمک کے پہاڑ ہیں۔

ہری پور ہزارہ کے جنوب میں خان پور کی پہاڑیاں دریائے ہرو کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہیں، یہاں اب دریائے ہرو پر بند باندھا گیا ہے، اس ڈیم کے نتیجے میں پانی کا جو ذخیرہ ہوگا، اس سے اسلام آباد کو پینے کا پانی ملے گا اور ہزاروں ایکڑ اراضی بھی اس سے سیراب ہوگی ——— ہری پور سے مغرب میں دریائے سندھ کے بائیں کنارے گندگڑ کے پہاڑ ہیں۔ علاقہ مہمند کے پہاڑ بھی نسبتاً کم اُونچے اور خشک ہیں۔

درّے

برصغیر پاک و ہند ایک قلعہ ہے۔ جس کی حفاظت کا انتظام قدرت نے خود کر رکھا ہے اس کے شمال اور مشرق میں دنیا کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ کوہ ہمالیہ پندرہ سو میل لمبی دیوار کی طرح کھڑا ہے، جنوب میں وسیع سمندر بحر ہند" ہے۔ مغرب میں کوہ سلیمان اور کوہ سفید کی فصیل ہے، یہ دیوار البتہ کم اُونچی ہے اور اس میں پہاڑوں کے درمیان کہیں کہیں تنگ گزرگاہیں موجود ہیں جنہیں درّے کہا جاتا ہے ——— تاریخ کے نامعلوم زمانے میں وسطِ ایشیا سے آنے والے تمام حملہ آور انہیں درّوں سے گزر کر برصغیر میں وارد ہوئے۔ آریا، یونانی، ایرانی، ہتھین، ترک، تاتار، مغل اور درانی تہذیبوں کے کارواں انہی درّوں سے آ آ کر میدانی علاقوں میں آباد ہوتے رہے۔ انہی مختلف تہذیبوں کے خلط ملط ہونے سے پاکستان میں ایک نئی اور منفرد تہذیب نے جنم لیا، وہی تہذیب جسے آج ہم وادیٔ سندھ کی تہذیب یا پاکستانی تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں۔

گویا صوبہ سرحد کے ان پہاڑی درّوں نے برصغیر کی تاریخی تشکیل میں وہ اہم کردار ادا کیا جو کسی اور مقام یا مقامات کو نصیب نہیں ہو سکا چنانچہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ان پہاڑی درّوں کی اہمیت کو سمجھنا لازم اور ناگزیر ہے ——— ان درّوں کی تفصیل یہ ہے :۔

درّہ گلگت ، درّہ بابوسر

درّہ گلگت ملک کا سب سے شمالی درّہ ہے، یہ مغرب کی جانب سے ترکستان سے کشمیر پہنچنے کا راستہ ہے، درّہ بابوسر بھی اس کے نواح میں واقع ہے، قدیم زمانے سے یہ درّے چین، ترکستان، کاشغر اور دوسرے علاقوں سے پاکستان آنے کے لئے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ حسن ابدال، جولیاں، ایبٹ آباد اور کوہستان ہزارہ سے چین جانے

والی شاہراہ انہی درّوں سے گزرتی ہے۔ یہ تجارتی شاہراہ، شاہراہِ ابریشم بھی کہلاتی ہے اور اُسے شاہراہِ قراقرم بھی کہا جاتا ہے۔

درّہ لواری یہ چترال اور ترکستان کی جانب سے صوبہ سرحد آنے کا راستہ ہے، چونکہ یہ درّہ کافی بلندی پر ہے اور یہاں ہر وقت تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں، اس لئے یہ بڑا دشوار گزار ہے، موسم سرما میں برف پڑتی ہے تو یہ بالکل ناقابلِ گزر ہو جاتا ہے، حکومتِ پاکستان نے لواری ٹاپ کے نیچے سُرنگ نکالنے کا منصوبہ تیار کیا تھا، جس پر ابتدائی کام بھی شروع ہو گیا تھا تاہم ابھی یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ ابھی تک درّہ لواری سال میں صرف چار پانچ ماہ کھُلا رہتا ہے تاہم آج کل پشاور اور چترال کے مابین فضائی سروس کی سہولت موجود ہے، اس لئے سرد موسم میں بھی لوگوں کو پہلے جیسی تکلیف کا سامنا نہیں ہوتا۔

درّہ مالاکنڈ یہ درّہ وادیٔ مردان اور پشاور کا شمالی دروازہ ہے۔ جو ان علاقوں کو دیر، سوات اور باجوڑ سے ملانے کا ذریعہ ہے، سکندر یونانی اور کئی دوسرے حملہ آوروں نے برصغیر پہنچنے کے لئے یہی راستہ اختیار کیا، آج یہاں عمدہ سڑک موجود ہے اور بسیں۔ ویگنیں اور کاریں دن رات چلتی رہتی ہیں۔

درّہ مالاکنڈ سے مشرق کو مردان کے مقام رستم ستدوم سے کچھ اُوپر درّہ امبیلہ ہے، جو مردان سے بونیر اور سوات جانے والی گذرگاہ پر واقع ہے۔ یہ درّہ بڑی سڑک سے ہٹ کر ہے، اس لئے کم استعمال ہوتا ہے، ۱۸۶۳ء میں یہاں فرنگیوں اور سرحدی مجاہدوں کے مابین زبردست لڑائی لڑی گئی تھی۔ جس میں فرنگی کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔

درّہ خیبر خیبر برصغیر پاک و ہند کا سب سے مشہور تاریخی درہ ہے، یہ پشاور سے کوئی دس میل مغرب میں واقع مقام جمرود سے شروع ہوتا ہے اور ۳۲ میل تک دشوار گزار اور تنگ گھاٹیوں سے ہوتا ہوا ڈکہ کے مقام پر ختم ہوتا ہے، علی مسجد اور لنڈی کوتل اس گزرگاہ پر مشہور مقامات ہیں، درّے کے سبھی کلیدی مقامات پر حفاظتی قلعے اور چوکیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ جہاں پاکستانی سرحدوں کے پاسبان متعین ہیں، تورخم کے مقام پر جہاں پاک افغان سرحدات ملتی ہیں، کسٹمز پوسٹ، ریسٹوران اور دوسرے دفاتر تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس تاریخی درّے کے نام پر سارے علاقہ کو خیبر ایجنسی کہا جاتا ہے ——— یہ علاقہ دو لاکھ آفریدی اور شنواری مردانِ تیغ آزما کا مسکن ہے، جو اپنے وطنِ عزیز کی جغرافیائی اور نظریاتی

سرحدوں کی حفاظت کے لئے ہر وقت سربکف رہتے ہیں۔

درّہ خیبر کی اہمیت کے پیشِ نظر ۱۹۲۵ء سے یہاں خیبر ریلوے بھی قائم کی گئی ہے۔ یہ ریلوے لائن انجنیئرنگ کا ایک شاہکار ہے۔ پہاڑوں کے مابین یہ ریلوے لائن متعدد سرنگوں سے گزرتی ہوئی موڑ پر موڑ کاٹتی تورخم تک پہنچتی ہے جو سطح سمندر سے قریباً تین ہزار فٹ بلند ہے۔ تنگ گھاٹیوں سے گزرنے والی اس ریلوے لائن پر ٹرین کا سفر بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ آجکل پشاور سے لنڈی کوتل تک ہفتہ میں صرف ایک بار گاڑی آتی جاتی ہے۔

درّہ خیبر نے سکندر اعظم، تیمور، بابر، سلطان محمود غزنوی، محمد غوری، احمد شاہ ابدالی، سکھوں اور انگریزوں کو فوجی مہمات میں مصروف دیکھا ہے، ۱۹۶۳ء میں "باب خیبر" تعمیر ہوا تو مشہور حملہ آوروں کے حالات اس پر کندہ کر دیئے گئے۔ ہزاروں غیر ملکی سیاح ہر سال درّہ خیبر دیکھنے آتے ہیں۔

درّہ کُرّم درّہ کُرم یا پیواڑ کوتل، پاڑہ چنار کے متصل واقع ہے، یہ کوہاٹ سے غزنی جانے والی سڑک پر واقع ہے، اس کے نواح میں مختلف قدیم تہذیبوں کے آثار پائے گئے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ صدیوں سے یہ درّہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان آمدورفت کا ذریعہ رہا ہے، کُرم ایجنسی میں تیری منگل اور دوسرے چھوٹے درّے بھی ہیں، جہاں سے افغانستان کے صوبے خوست کو راستے نکلتے ہیں، محمد غوری جسے بجا طور پر ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ کُرم ہی کے درّے سے برصغیر میں وارد ہوا تھا۔

درّہ ٹوچی وزیرستان کا علاقہ دریائے کُرم اور دریائے گومل کے درمیان واقع ہے، ان دونوں دریاؤں کے مابین تین چھوٹے دریا یا پہاڑی نالے مغرب سے مشرق کو بہتے ہوئے آتے ہیں۔ جن کے نام ٹوچی۔ کیٹو اور ٹانک زام ہیں۔ ٹوچی ان تینوں میں بڑا ہے، یہ دریا دریائے سندھ میں گرتا ہے، جبکہ کیٹو دریائے کُرم کا معاون بنتا ہے اور ٹانک زام ڈیرہ اسماعیل خاں کے ریگستانی علاقے ہی میں ختم ہو جاتا ہے، دریائے ٹوچی کی گزرگاہ درّہ ٹوچی کے نام سے موسوم ہے، انگریزوں نے اس درّے کی حفاظت کے لئے بنّوں چھاؤنی آباد کی تھی۔ غزنی سے بنّوں، میانوالی، بھکر، خوشاب اور ملتان جانے والے قافلے یہی راستہ اختیار کیا کرتے تھے، سلطان محمود غزنوی نے درّہ ٹوچی ہی کے راستے سندھ، ملتان اور دوسرے علاقوں پر چڑھائی کی تھی۔

درّہ گومل درّہ گومل افغانستان اور ہندوستان کے مابین ایک قدیم تجارتی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہ قندھار کی جانب سے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچنے کا مختصر ترین راستہ ہے۔ یہ درّہ نسبتاً کم اونچے پہاڑوں میں واقع ہے۔ اس لئے سارا سال کھلا رہتا ہے۔ پاوندے یا خانہ بدوش افغانی باشندے عموماً اسی راہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ قدیم ایام میں جب دہلی کو جانے والی شاہراہ ملتان سے ہو کر گزرتی تھی، اس درّے کی بڑی اہمیت تھی۔ پچھلے دنوں جب ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس درّے کے نام پر اس کا نام گومل یونیورسٹی رکھا گیا۔

کوہ سلیمان کے یہ درّے صوبہ سرحد کی جغرافیائی حدود میں واقع ہیں، ان کے علاوہ درّہ گومل کے جنوب میں درّہ تخی سرور، درّہ بولان، درّہ ملا اور درہ مکران بھی ہیں۔ ان درّوں کی راہ افغانستان اور بلوچستان کے مابین آمد و رفت ہوتی ہے۔

یہ سرحدی درّے صرف اسی لئے مشہور نہیں کہ مختلف حملہ آور یہاں سے گزر کر ہندوستان کے میدانی علاقوں تک پہنچتے رہے، بلکہ انہی درّوں کی راہ وہ مبلغینِ اسلام آئے، جنہوں نے کفر زار ہند میں اسلام کی روشنی پھیلائی ——— پھر حملہ آوروں کے جلو میں وہ عالم فاضل، شاعر اور دانش ور بھی آئے۔ جن کی کوششوں سے برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی ایک شاندار انقلاب سے ہم کنار ہوئی، علاوہ بریں قدیم الایام سے برصغیر پاک و ہند اور وسطی ایشیاء کے ممالک کے مابین تجارت بھی انہی درّوں کی راہ ہوتی رہی گویا ان سرحدی درّوں نے کئی قوموں کا عروج و زوال دیکھا، یہ کئی مہم بازوں اور طالع آزماؤں کی سرگرمیوں کے شاہد رہے اور یوں اُنھوں نے برصغیر کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کو پوری طرح متاثر کیا۔

دریا دریاؤں کا انسانی تہذیب و تمدن کے ساتھ بہت گہرا تعلق رہا ہے، قدیم انسان نے جب چوپانی اور دشت نوردی سے ترقی کر کے زراعت کو اپنا پیشہ بنایا اور اپنے لئے مستقل بستیاں بسائیں، تو دریاؤں ہی سے سیراب ہونے والے میدانوں کو اپنی رہائش کے لئے پسند کیا، آریا وسطی ایشیا سے نکلے تو پہلے پہل دریائے سندھ اور اس کے معاونوں کی وادیوں میں اُترے، آریوں کی مذہبی کتاب "رگ وید" صوبہ سرحد ہی کے دریاؤں کی وادیوں میں مرتب ہوئی۔ اسی لئے اس میں سندھو (دریائے سندھ) کوبھا (دریائے کابل) سواستو (دریائے سوات) کورمو (دریائے کُرم) اور دوسرے سرحدی دریاؤں اور مقامات کا واضح ذکر ملتا ہے۔

دریائے سندھ اور اس کے مشرقی اور مغربی معاونوں سے سیراب ہونے والا خطّہ سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے ہمیشہ ایک الگ وحدت سمجھا جاتا رہا۔ تاریخ میں اس خطہ کو کبھی "ہندوستان" یا "بھارت" کے نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ اِسے گندھارا، دریائے سندھ کی وادی یا پنجاب ہی کہا جاتا رہا۔ سرہند کا نام اس امر کا غماز ہے کہ سرہند ان دونوں خطّوں (وادی سندھ اور وادی گنگا) کا مقام اتصال تھا۔ سرہند یا دریائے بیاس سے پرے ہندوستان کا علاقہ تھا، جبکہ اس سے مغرب میں موجودہ مسلم اکثریت کا علاقہ یا پاکستان ——— سرہند سے اُدھر بسنے والوں کو "ہندوستانی" کہا جاتا تھا، جبکہ دریائے سندھ کی وادی میں بسنے والے لوگ دوسرے مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے۔

دریائے سندھ

دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا اور سب سے لمبا دریا ہے۔ جو کوہِ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں سے نکل کر اُنیس سو میل کا راستہ طے کر کے ڈیلٹا بناتے ہوئے بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے، پاکستان اس مشہور دریا کے مشرقی اور مغربی معاونوں کے میدانوں ہی پر مشتمل ہے، بالفاظ دیگر پاکستان، دریائے سندھ کی وادی ہی کا نام ہے، اگر مصر کو دریائے نیل پر فخر ہے تو پاکستان دریائے سندھ پر بجا طور پر نازاں ہے، مصر اگر "تحفۂ نیل" ہے تو پاکستان دریائے سندھ کا تحفہ ہے ——— مختلف مقامات پر یہ عظیم دریا مختلف ناموں سے موسوم ہے، اُسے اباسین بھی کہا جاتا ہے تو اٹک بھی، نیلاب بھی تو سندھ بھی، مہران بھی اور انڈس بھی ——— پاکستان کے دوسرے تمام دریا اور ندی نالے دریائے سندھ ہی میں گرتے ہیں۔ دریائے کنہار، دریائے نیلم، دریائے سرن، دریائے دوڑ، دریائے ہرو، دریائے جہلم، دریائے چناب، توی، دریائے راوی، دریائے ستلج اور دریائے بیاس، اس کے مشرقی معاون ہیں تو دریائے چترال، دریائے پنجکوڑہ، دریائے سوات، دریائے غور بند، دریائے بڑندو، دریائے کابل، دریائے باڑہ، دریائے کرم، کوہاٹ توئی، دریائے ٹوچی، دریائے گیٹو اور دریائے گومل مغرب کی جانب سے آکر دریائے سندھ کے معاون بنتے ہیں۔

گلگت، کوہستان، پتن اور بشام کے پہاڑی علاقے میں دریائے سندھ کا پاٹ آدھ میل سے بھی کم چوڑا ہے، ان مقامات پر دریا گہری گھاٹیوں میں بہتا ہے، پہاڑی لوگ اُسے رسّوں کے پل کے ذریعے پار کر لیتے ہیں۔ تربیلا کے قریب یہ دریا میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے، اس جگہ دریا پر ایک بند باندھا گیا ہے، جو دنیا بھر میں مٹی اور پتھر کا سب سے بڑا بند اور انجینئرنگ کا ایک شاہکار ہے۔ بند کی

وجہ سے دریا کا پانی تیس چالیس مربع میل پر پھیلی ہوئی ایک گہری جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تربیلا ڈیم کی بدولت جہاں اتنا بڑا ذخیرہ آب حاصل ہوتا ہے۔ وہیں اس جگہ بہت بڑا بجلی گھر بھی قائم کیا گیا ہے جس کی بدولت پاکستان میں پن بجلی کی مقدار دگنی ہو گئی ہے۔ تربیلا ڈیم کی تعمیر اس لئے بھی ناگزیر تھی کہ بھارت نے دریائے ستلج اور دریائے بیاس کی نہروں کا پانی روک رکھا ہے۔ جس کے نتیجے میں ملتان، بہاولپور، ساہیوال اور دوسرے پاکستانی علاقوں کی نہریں خشک ہو کر رہ گئی تھیں، سندھ طاس منصوبے کے تحت تربیلا ڈیم سے ان نہروں کو پانی مہیا کیا جائے گا تاکہ پاکستان کی زرعی معیشت متاثر ہونے نہ پائے ——— تربیلا سے کچھ میل جنوب کو کیاڑہ کے مقام پر دریائے سندھ ضلع اٹک میں داخل ہوتا ہے تو کئی چھوٹی بڑی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ہنڈ کے بالمقابل دریا کو کشتیوں کے ذریعے عبور کیا جاسکتا ہے، اٹک کے مقام پر دریا کے کنارے خانوادۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک عظیم بزرگ شیخ محمد یحییٰ عرف حضرت جی باباؒ کا مزار ہے، اس کے پاس ہی سیاحوں کے لئے ایک تفریح گاہ "اٹک اِن" کے نام سے بنائی گئی ہے۔ اٹک اِن اور تاریخی قلعہ کے مابین حال ہی میں دریائے سندھ پر ایک خوبصورت پل بنایا گیا ہے، سابقہ اور پرانا پُل قلعے سے جنوب کو واقع ہے، جو دو منزلہ ہے، اُوپر سے ریل گاڑی گزرتی ہے، اور نیچے سے بسیں اور کاریں، یہ پُل ایک تنگ گھاٹی پر بنایا گیا ہے، جہاں دریا کا پانی بہت گہرا ہے۔ اٹک کے ریلوے پُل سے گزرنے کے بعد دریا پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے، آگے چل کر اس پر خوشحال گڑھ کا پُل ہے جو کوہاٹ اور راولپنڈی کو ملاتا ہے۔ بنّوں سے متصل ماڑی انڈس کے مقام پر بھی ایک پل ہے کالاباغ تک دریا کم چوڑا لیکن گہرا ہے، ایک منصوبے کے تحت اب کالاباغ میں بھی دریائے سندھ پر بند باندھا جائے گا۔ کالاباغ سے جنوب میں دریائے سندھ سے بہت سی نہریں نکالی گئی ہیں۔ جن کی بدولت تھل کا ریگستان لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے نواح میں دریا میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پاٹ میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی چوڑائی چودہ پندرہ میل کو پہنچ جاتی ہے۔ جہاں موسم گرما میں دریا کو سٹیمر (دخانی جہاز) کے ذریعے عبور کرنا پڑتا ہے، تاہم موسم سرما میں پانی کم ہوتے ہی دریا مختلف شاخوں میں بہنے لگتا ہے تو اس پر کشتیوں کے پُل بنا دیئے جاتے ہیں۔ اب دریا خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے مابین کافی لاگت سے دریائے سندھ پر ایک پُل تعمیر کیا جا رہا ہے۔ جس کی تکمیل پر آمدورفت میں بہت آسانی ہو جائیگی۔ ضلع

ڈیرہ اسماعیل خان کے مقام پہاڑ پور سے ایک نہر نکالی گئی ہے جو وسیع علاقے کو سیراب کرتی ہے تاہم اب چشمہ کے مقام پر دریائے سندھ کے دائیں کنارے سے نہر نکالی جا رہی ہے جو علاقے کی زرعی معیشت میں انقلاب برپا کر دے گی، چشمہ رائٹ بینک کینال پر تعمیری کام تیز رفتاری سے جاری ہے اور جونہی یہ منصوبہ مکمل ہوا، لاکھوں ایکڑ پیاسی زمین کو نہروں کا پانی ملنے لگے گا۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے نکلکر دریائے سندھ پنجاب کی حدود میں بہتا ہے۔ جہاں مٹھن کوٹ کے مقام پر پنجاب کے پانچ دریا (جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس) اس سے آملتے ہیں، پنجند، سکھر اور کوٹری کے مقامات پر بھی نہریں نکالی گئی ہیں، جو پنجاب کے زیریں علاقوں اور صوبہ سندھ کی اراضی کو سیراب کرتی ہیں، روہڑی کے مقام پر دریائے سندھ پر ایک معلق پُل ہے جو سکھر کو کوئٹہ بلوچستان سے ملاتا ہے۔ حیدر آباد سندھ کے قریب سے گزرتا ہوا یہ عظیم دریا کراچی کے نواح میں بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔

دریائے سندھ کے کنارے موہنجو دھارو کا وہ شہر ہے۔ جہاں سے برآمد ہونے والے آثار قدیمہ اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب پانچ ہزار برس پُرانی ہے اور یہ دریائے گنگا کی تہذیب سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن ہے ——— دنیا کے نقشہ پر پاکستان نیا ملک سہی، لیکن تاریخی اعتبار سے یہ بے حد قدیم، مہذب اور متمدن علاقہ رہا ہے۔

دریائے سندھ اور اس کے معاون پاکستان کی زرعی اور معاشی خوشحالی کے ضامن ہیں۔ صدیوں سے یہ دریا پہاڑوں سے زرخیز مٹی بہا کر لاتے اور میدانی علاقوں میں بچھاتے چلے آرہے ہیں۔ ملک کے کُل زیرِ کاشت رقبے کا نصف سے زیادہ حصہ انہی دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے، جہاں دریاؤں کے اتنے فائدے ہیں۔ وہیں کبھی کبھی یہ نقصان کا موجب بھی بنتے ہیں، موسم گرما میں جب پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے یا زور کی بارش ہوتی ہے تو بعض دریاؤں میں سیلاب آجاتا ہے۔ جس سے فصلوں اور آبادیوں کو نقصان پہنچتا ہے، تاہم اب سیلاب کی روک تھام کے لئے جگہ جگہ حفاظتی بند باندھے گئے ہیں اور دوسری احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

سرزمینِ ہزارہ کے دریا

دریائے کُنہار | کُنہار صوبہ سرحد کا واحد دریا ہے جو دریائے سندھ کی بجائے دریائے جہلم میں

گرتا ہے، یہ دریا کاغان رینج کے پہاڑوں سے نکلتا ہے، جن کی اُونچائی بارہ ہزار سے پندرہ ہزار فٹ تک ہے اور وادیٔ کاغان کے بیچوں بیچ بہتا ہے، کاغان یا کُنہار کی حسین و دلفریب وادی درہ بابوسر سے بالاکوٹ تک لمبائی میں کوئی ۹۲ میل اور چوڑائی میں پندرہ میل ہے، دریائے کُنہار گلیشیئرز (برفانی تودوں) سے نکلتا ہے۔ اس لئے اس میں سال بھر پانی کی بہتات رہتی ہے، دریا کی کل لمبائی کوئی ایک سو دس میل ہے، بالاکوٹ کے مقام تک یہ تنگ گھاٹیوں سے بہتا ہے اور چٹانوں سے ٹکراتا، آبشار پر آبشار بناتا آگے بڑھتا ہے۔ بالاکوٹ تک اس کا بہاؤ اتنا تیز ہے کہ کوئی چیز اس میں زندہ نہیں رہ سکتی، البتہ بالاکوٹ سے گڑھی حبیب اللہ تک لوگ اس میں نہاتے ہیں اور پیراکی کرتے ہیں، گڑھی سے گزر کر دریائے کُنہار پھر پہاڑیوں میں داخل ہو جاتا ہے اور بتراسی کے درّے سے گزرتا ہے، جہاں اس پر ایک مضبوط پل ہے، پُل پر سے وہ سڑک گزرتی ہے جو ایبٹ آباد اور مانسہرہ کو مظفرآباد (آزاد کشمیر) سے ملاتی ہے، پہاڑی علاقوں میں جہاں دریا کا پاٹ تنگ ہے، مقامی لوگ رسیوں کا پُل بنا کر اُسے عبور کرتے ہیں، بالاکوٹ اس کے کنارے مشہور قصبہ ہے۔ جہاں جمعیت مجاہدین کے زعماء سید احمد بریلویؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کے مزارات ہیں۔ ان حضرات نے ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی۔

کاغان گلگت روڈ اسی دریا کے ساتھ بل کھاتی ہوئی جاتی ہے، پہلے پہل یہ سڑک صرف جیپ گاڑیوں کے قابل تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد اُسے کشادہ کر دیا گیا۔ اس سارے علاقے میں جنگلات کی بہتات ہے۔ اس لئے درخت کاٹ کر عمارتی لکڑی اس دریا میں بہائی جاتی ہے، کُنہار کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہے، اس کی رفتار بہت تیز ہے اور میلوں دور سے اس کی تیز و تُند موجوں کا شور سنائی دیتا ہے، گڑھی حبیب اللہ کے بعد دریائے کُنہار جنوب مشرق کو ہو لیتا ہے اور مظفرآباد کے نزدیک بالآخر دریائے جہلم سے جا ملتا ہے۔

دریائے ہرو ہرو دریائے سندھ کا ایک مشرقی معاون ہے، جو اٹک خورد سے نو میل جنوب میں دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ اس دریا کی کل لمبائی نوّے میل ہے جس میں سے یہ پچاس میل تک ایبٹ آباد کے ضلع میں اور چالیس میل اٹک کے ضلع میں بہتا ہے۔ دریائے ہرو گلیات اور مری کے پہاڑی سلسلوں سے نکلتا ہے اور چھ ہزار سے نو ہزار تک اُونچی پہاڑیوں میں سے گزرتا

ہے۔ موچھپوری کے سلسلۂ کوہ میں اس کے کنارے بہت اُونچے ہیں۔ یہ دتّا، ناڑہ، خان پور، عثمان کھٹر اور حسن ابدال کے نواحی دیہات کو سیراب کرتا ہے، خان پور کے مقام پر اس پر ایک ڈیم تعمیر کیا گیا ہے، جس سے کافی مقدار میں پانی ذخیرہ ہوگا۔ اس ڈیم سے نہ صرف آبپاشی کا کام لیا جائے گا بلکہ اسلام آباد کو پینے کا پانی بھی فراہم کیا جائے گا۔ ڈیم اَب تکمیل کے قریب ہے۔

دریائے ہرو دو پہاڑی نالوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک وہ جو کوہ مری کی چوٹیوں کے نیچے سے نکلتا ہے اور ڈھونڈ ہرو کہلاتا ہے اور دوسرا وہ جو موچھپوری کی پہاڑیوں میں سمندر اور پچکوٹ کے پہاڑی نالوں کے یکجا ہونے پر وجود میں آتا ہے اور کٹرل ہرو کہلاتا ہے۔ خان پور سے سولہ میل اُوپر دوتارہ کے مقام پر دونو شاخیں آپس میں مِل جاتی ہیں، میرپور ضلع راولپنڈی کے پاس جبّی نالہ بھی اس میں آگرتا ہے۔ جس سے اس کے پانی کی مقدار خاصی بڑھ جاتی ہے۔ ضلع ایبٹ آباد کے دریاؤں میں سے ہرو کا بہاؤ نسبتاً بہت تیز ہے، جونہی پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے۔ اس میں طغیانی آجاتی ہے، چونکہ یہ اپنے ساتھ بہت سی پہاڑی مٹی بہا کر لاتا ہے۔ اس لئے طغیانی کے دنوں میں اس کا پانی باڑہ کے پانی کی مانند سُرخ ہوتا ہے۔ یہ دریا علاقے میں آبپاشی کا بہت بڑا وسیلہ ہے، علاوہ بریں اس سے بہترین بجری برآمد ہوتی ہے، جو عمارتی ضرورتوں میں کام آتی ہے، ہرو کی بجری ملک میں سب سے اچھی بجری تصور کی جاتی ہے اور عثمان کھٹر اور برہان کے ریلوے سٹیشنوں سے دوسرے مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔ عثمان کھٹر کے قریب بہت سے باغات اور زرعی فارم ہیں جو ہرو کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں، انہی میں سے ایک بہت بڑا فروٹ فارم سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے خاندان کا بھی ہے۔ ہرو چونکہ ٹیکسلا کے قریب واقع ہے جو قدیم زمانے میں دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے مابین سب سے متمدن شہر اور دارالحکومت رہا ہے۔ اس لئے اس کے کناروں پر آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں۔ حسن ابدال، شاہیا، اور لارنس پور کے قریب اس پر پُل بنائے گئے ہیں۔ جن پر سے جرنیلی سڑک اور ہزارہ ٹرنک روڈ گزرتی ہیں۔

دریائے ہرو دریائے ہرو ایک تیز رفتار دریا ہے، یہ بھوگڑ منگ کی دلکش وادی سے بہتا ہوا آتا ہے اور تربیلا کے قریب دریائے سندھ میں مل جاتا ہے، ہرو کی کل لمبائی ۱۰۰ میل ہے، کئی اعتبار سے اُسے ہزارہ کا سب سے خوبصورت دریا کہا جاتا ہے، اس کے کناروں پر جہاں

بھوگڑ منگ، کونش، پکھلی اور تناول کی سرسبز و شاداب وادیاں ہیں، وہیں ایک پہاڑی ٹیلے پر چناروں سے گھرا ہوا، ڈاڈر سینی ٹوریم بھی بنایا گیا ہے، سارے صوبہ سرحد سے تپ دق کے مریض یہاں آتے ہیں، ڈاڈر کی آب و ہوا خوشگوار ہے اور اس میں وہ مسیحائی تاثیر ہے کہ مریض جلد تندرست ہو جاتے ہیں۔ مقامی لوگ دریا سے چھوٹی چھوٹی نہریں یا کٹھے نکال کر اپنی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں، سرن کے علاقے میں مکئی بہت عمدہ اور لذیز ہوتی ہے، دھان کی کاشت بھی ہوتی ہے، دریا کے زیریں علاقے میں مچھلی پائی جاتی ہے اور جگہ جگہ اس پر پن چکیاں لگائی گئی ہیں۔

دریائے دَوڑ دَوڑ دریائے سرن کا معاون ہے، تھپلہ کے قریب (موجودہ ترہیلا) دونوں دریا آپس میں گلے ملتے ہیں، دریائے دَوڑ کا منبع میاں جانی کی پہاڑیوں میں ہے، جہاں سے یہ ایبٹ آباد، نتھیا گلی روڈ کے ساتھ ساتھ گہری گھاٹیوں سے بہتا ہوا آتا ہے، کئی جگہ پر اس کے کنارے بہت اونچے ہیں تاہم اکثر مقامات پر اس سے آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ بونی، نواں شہر، دھمتوڑ، رجوعیہ حویلیاں، شنگری، مانکرائے، جاگل، سرائے صالح اور ہری پور کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتا ہے، سرائے صالح تک پہنچتے پہنچتے دَوڑ کا پانی قریباً ختم ہو جاتا ہے، تاہم سرائے صالح سے چار میل آگے مقصود کے چشموں کا پانی اس کی معاونت کرتا ہے تو یہ ہری پور کی زرعی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے، چونکہ دریا، اُونچے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ اس لئے موسم برسات میں کبھی کبھی اس میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔ دریائے دَوڑ کی کل لمبائی چالیس پینتالیس میل ہے۔

ان بڑے دریاؤں کے علاوہ خطہ ہزارہ میں بے شمار چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالے ہیں۔ جن میں اُنار، مانگل اور نیلاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اُنار سابق ریاست امب اور اگرور کی وادی سے کچھ اُوپر دریائے سندھ میں گرتا ہے، اس کی لمبائی کوئی چالیس میل ہے، اکثر پہاڑوں کے مابین بہتا ہے، اس میں پانی بھی زیادہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کا عبور کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ تاہم بارش کے دنوں میں اس میں اچانک طغیانی آجاتی ہے۔ تو تیز بہاؤ کی وجہ سے اُسے پار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مانگل اور نیلاں مشرقی پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ ان پہاڑی نالوں نے سرزمینِ ہزارہ کو چھوٹی چھوٹی وادیوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ان کی وجہ سے راستے دُشوار گزار ہیں، چونکہ ہر جگہ پُل تعمیر نہیں ہو سکتے اس لئے بارش اور طغیانی کے دنوں میں کئی انسانی جانیں ان پہاڑی نالوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔

ہزارہ کی پہاڑیوں میں جگہ جگہ قدرتی چشمے بھی پائے جاتے ہیں۔ نواں شہر، شیخ البانڈی، شنکیاری اور دوسرے مقامات کے چشمے خاصے مشہور ہیں، ان چشموں سے بھی مقامی لوگ آبپاشی کا کام لیتے ہیں۔

دریائے چترال دریائے سندھ کے مغرب میں چترال، کنڑ، پنجکوڑہ اور سوات کے مشہور دریا ہیں، دریائے چترال کی وادی صوبہ سرحد کی سب سے بلند و بالا وادی ہے، جو سولہ ہزار فٹ سے بیس ہزار فٹ اُونچے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ چترال شہر کے نواح میں علاقہ میں سب سے اُونچی پہاڑی چوٹی ہے، جو سطح سمندر سے ۲۵۴۲۶ فٹ بلند ہے، سوات اور کوہستان کے پہاڑ بھی خاصے اُونچے، ان پہاڑوں سے چترال، سوات اور پنجکوڑا کے دریا نکلتے ہیں جو دریائے سندھ کے متوازی بہتے ہوئے بالآخر اُسی میں جا گرتے ہیں۔

دریائے چترال کا منبع چیانتر کے گلیشیرز (برفانی چٹانوں) میں واقع ہے، اس دریا کی لمبائی کئی سو میل ہے اور اُسے مختلف مرحلوں پر پانچ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، شروع شروع میں اُسے دریائے یارقند کہا جاتا ہے، بعد میں لاس پور کا نالہ اس میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کا نام بھی دریائے مستوج میں تبدیل ہو جاتا ہے، تھوڑی دور آگے جا کر ترچ میر سے آنے والا دریا لٹ کوہ اس سے آن ملتا ہے، تو دونوں دریا یکجا ہو کر دریائے چترال کہلاتے ہیں ـــــ یہی دریائے چترال بہتے ہوئے جب افغانستان کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو اُسے کُنڑ کہا جاتا ہے ـــــ کبھی کبھی دریائے چترال کو دریائے کاشکار (کاشغر) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

جُوں جُوں دریائے چترال آگے بڑھتا ہے، اس میں لس پور، توری خو، ملی خو، شیش کو اور لٹ کہو کے پہاڑی نالے بھی آن شامل، آج کل دریائے چترال کے پانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، جہاں کہیں ممکن ہو، اُس پر بجلی گھر بنائے گئے ہیں، اسی طرح کہیں کہیں دریا کے پانی کو روک کر یا اس پر پمپنگ سٹیشن لگا کر آبپاشی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

دریائے چترال کی وادی بہت تنگ ہے، اس کی چوڑائی ایک میل سے ڈھائی میل تک ہے ـــــ پاکستانی علاقے سے نکل کر جب دریائے چترال، نگر کے مقام پر افغانستان کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو علاقے کی شادابی کا باعث بنتا ہے۔ وارسک ڈیم سے کچھ اوپر یہ دریا دریائے کابل میں آ گرتا ہے تو دریائے کابل کے پانی میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔

دریائے چترال کے کنارے کنارے سڑک بنائی جائے تو آمدورفت کی کافی آسانیاں میسر ہوسکتی ہیں، سڑک پشاور یا جلال آباد کو چترال سے ملاسکتی ہے اور سال کے بارہ مہینے قابل استعمال قرار دی جاسکتی ہے، اس کے برعکس دیر اور لواری ٹاپ سے ہوکر جانے والی موجودہ سڑک برف باری کی وجہ سے سال کا اکثر حصہ ناقابل گزر رہتی ہے اور سال میں صرف چار پانچ ماہ کام آسکتی ہے، تاہم یہ سڑک تبھی بن سکتی ہے جب پاکستان اور افغانستان کی حکومتیں ایسا کرنے پر متفق اور متحد ہوں۔

دریائے پنجکوڑہ دیر، سوات اور کوہستان کی پہاڑیوں سے آنے والے ندی نالوں کا سارا پانی دریائے سوات اور دریائے پنجکوڑہ میں گرتا ہے۔ یہ دونوں دریا ایک دوسرے کے متوازی بہتے ہیں، دریائے پنجکوڑہ بعض جگہ سوات اور دیر کے اضلاع کے مابین حدِ فاصل کا کام بھی دیتا ہے، قدیم ایام میں دیر کے پہاڑ گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ درخت کاٹ لئے گئے تو سالانہ بارش کی اوسط میں خاصی کمی آگئی۔ پنجکوڑہ ایک تیز رفتار پہاڑی دریا ہے، موسم گرما میں جب اس میں طغیانی آتی ہے تو فصلوں اور بستیوں کے لئے بڑی تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

دریائے پنجکوڑہ عموماً دیر اور جندول کے میدانوں کو سیراب کرتا ہے، پیتر ک کے مقام پر گوالیدی ندی اس میں آکر شامل ہوتی ہے۔ جگہ جگہ دریا کو عبور کرنے کے لئے پُل بنائے گئے ہیں، ضلع دیر کا ایک چوتھائی میدانی حصہ دریائے پنجکوڑہ سے سیراب ہوتا ہے، کہیں کہیں قدرتی چشموں اور ندیوں سے بھی آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے، دریا کے کنارے نشیبی جگہوں پر دھان کی فصل بہت عمدہ ہوتی ہے۔

دریائے سوات یہ وہی دریا ہے، جسے آریاؤں کی مقدس کتاب "رگ وید" میں "سواستو" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، دریا کے نام پر یہ سارا علاقہ بھی سوات کہلاتا ہے، دریائے سوات کا منبع کالام کے پہاڑی سلسلہ میں ہے۔ جس کی اونچائی سطح سمندر سے قریباً سولہ سترہ ہزار فٹ ہے، شمال سے آنے والی اوشوندی اس کا پہلا معاون بنتی ہے، پھر گبرال اور زندرئی کی ندیاں آکر اس میں شامل ہوتی ہیں، تینوں ندیاں یکجا ہوکر پہلے پہل چوبیس میل تک شمالاً جنوباً بہتی ہیں، پھر ایک تنگ گھاٹی سے ہوتی ہوئیں مدین کے مقام پر میدانی علاقے میں داخل ہوتی ہیں۔ مدین سطح سمندر سے کوئی تین چار ہزار فٹ اونچا ہے۔ مدین کے جنوب میں سوات کی وادی نسبتاً فراخ ہے، یہ بڑی زرخیز اور سرسبز ہے، اس دریا میں سال کے بارہ مہینے پانی کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ بحرین اور کالام کو جانے والی سڑک دریائے

سوات کے کنارے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے، مناظرِ فطرت کے اعتبار سے وادیٔ سوات بہت ہی دلکش خطہ ہے، اس کے مناظر بہشتِ نظیر کشمیر سے ملتے جلتے ہیں، جگہ جگہ پہاڑی نالے اور چشمے اپنا پانی دریائے سوات کی نذر کرتے ہیں، چنانچہ منگورہ پہنچ کر دریا خاصا چوڑا اور گہرا ہو جاتا ہے ـــــ لنڈاکئی کے مقام تک یہ ضلع سوات کی حدود میں بہتا ہے، یہاں سے کچھ آگے پنجکوڑہ کا دریا بھی اس سے آن ملتا ہے، چکدرہ اور بٹ خیلہ اس کے کنارے پر مشہور قصبے ہیں۔ بٹ خیلہ کے پاس امان درہ ہیڈورکس سے دریائے سوات سے نہر نکالی گئی ہے ـــــ قلعہ مالاکنڈ کے نواح میں دریائے سوات کا پانی ایک لمبی سُرنگ سے گزر کر جبّن پہنچایا گیا ہے، جہاں بہت بڑا بجلی گھر ہے، بجلی گھر کی دیوپیکر مشینیں دریائے سوات کے پانی سے چلتی اور بجلی پیدا کرتی ہیں۔ جبّن سے آگے دریا کا پانی ایک نہر کی صورت میں آبشار پر آبشار بناتا درگئی پہنچتا ہے، جہاں ایک اور بجلی گھر بنایا گیا ہے۔ ابازئی کے قریب دریائے سوات ہشت نگر (تحصیل چارسدہ) کے زرخیز میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے۔ ابازئی سے کچھ اُوپر یہ دریا دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جو خیالئی اور جنیدئی کہلاتی ہیں۔ چارسدہ تک یہ دونوں شاخیں الگ الگ بہتی ہوئی آتی ہیں، لیکن پڑانگ کے مقام پر پھر یکجا ہو جاتی ہیں۔ پڑانگ سے تھوڑی دُور جنوب کو نشتہ کے قریب دریائے سوات، دریائے کابل میں جا گرتا ہے۔ دریائے کابل اور دریائے سوات کے ملنے کے بعد دریا کا نام "لنڈا" میں بدل جاتا ہے، لنڈا نوشہرہ چھاؤنی، اکوڑہ خٹک اور جہانگیرہ سے بہتا ہوا قلعہ اٹک کے پاس دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔

دریائے سوات سے دو نہریں اپر سوات اور لوئر سوات نکالی گئی ہیں، مردان اور چارسدہ کی ساری زرخیزی اور شادابی کا باعث یہی نہریں ہیں، ان نہروں کے بننے سے پہلے مردان اور صوابی کے علاقے بارانی اور بنجر تھے، لیکن نہری پانی آجانے سے اب یہ زمینیں سونا اُگلنے لگی ہیں، نہروں کی وجہ سے علاقہ کی آبادی اور خوشحالی میں اضافہ ہوا تو مردان کو ایک الگ ضلع کی حیثیت دے دی گئی ـــــ ورنہ اس سے پیشتر مردان ضلع پشاور ہی کی ایک تحصیل تھا۔

سوات کے معاونوں میں بعض چھوٹے دریا یا خوڑ بھی شامل ہیں۔ جن میں دریائے گیرال، دریائے درال، دریائے ہرنوئی، دریائے بشگرام اور دریائے میاں دم قابلِ ذکر ہیں، کوہستان سوات کے وہ دریا جو مشرقی ڈھلوانوں سے نکل کر دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ دریائے گندیا، دریائے دوبیر، دریائے غوربند

اور دریائے بڑندو ہیں۔

دریائے کلپانی کلپانی ایک چھوٹا دریا ہے، جو مردان شہر کے قریب سے گزرتا ہے، اس کا منبع سوات کے جنوب میں مورہ کی پہاڑیوں میں ہے، علاقہ بائیزئی سے مردارا، بگیاڑی، لونڈ خوڑ اور گدر کی ندیاں اس کی معاون بنتی ہیں، جنوب میں باکرے خوڑ، شاہ گئی نالہ اور نارنجی خوڑ اس سے آکر ملتے ہیں۔ سنڈوم کی جانب سے مقام کا دریا طوروکے نواح میں اس میں شامل ہوتا ہے، نوشہرہ چھاؤنی کے بالمقابل کلپانی دریائے کابل میں جاگرتا ہے۔ کلپانی سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے، کلپانی اور دوسرے ندی نالوں اور دریاؤں کی بدولت جہاں ضلع مردان کی زرعی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے، وہیں یہ نقصان بھی پہنچا ہے کہ ضلع کے بہت سے نشیبی علاقے سیم وتھور کا شکار ہوگئے ہیں، حکومت ان ناکارہ زمینوں کو پھر سے قابل کاشت بنانے کے لئے سکارپ (SCARP) نامی منصوبے پر کام کر رہی ہے۔ اس کاروائی کے نتیجے میں ضلع مردان کی لاکھوں ایکڑ بنجر اراضی پھر سے لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو جائے گی۔

صوابی کی تحصیل میں بدری کا مشہور نالہ ہے جو مہابن کے پہاڑوں سے نکل کر ہریانہ کے قریب دریائے سندھ میں جاگرتا ہے۔

ضلع کے مشہور قصبہ ٹوپی کے نواح میں کچھ قدرتی چشمے ہیں۔ جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ہر سات آٹھ سال بعد وہ خشک ہو جاتے ہیں، لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُن سے دوبارہ خود بخود پانی اُبلنے لگتا ہے۔

دریائے کابل یہ دریا افغانستان کے دارالحکومت کابل سے کوئی ۴۵ میل مغرب میں سرچشمہ کے مقام سے نکلتا ہے اور چار دیہہ کے قریب میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے، شہر کابل کے بیچوں بیچ بہتے ہوئے یہ ایک معمولی ندی سے زیادہ بڑا دکھائی نہیں دیتا۔ شہر کابل کے بعد اس پر بند باندھ کر ماہی پر کا بجلی گھر بنایا گیا ہے، کافی دور تک پہاڑی گھاٹیوں میں بہنے کے بعد سروبی کے مقام پر یہ پھر میدانی علاقے میں سر نکالتا ہے۔ جہاں کابل حکومت نے اس پر ڈیم تعمیر کر رکھا ہے، سروبی سے دریائے کابل جلال آباد کا رُخ کرتا ہے۔ جہاں لغمان جانے والی سڑک ایک پل پر سے گزرتی ہے، جلال آباد تک پہنچتے پہنچتے اس میں کئی پہاڑی ندی نالے اس میں شامل ہو جاتے ہیں، جس سے پانی کی

مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جلال آباد سے چار میل جنوب میں دریائے چترال (یا گنٹر) اس سے آن ملتا ہے، دریائے چترال میں دریائے کابل کی نسبت پانی کئی گنا زیادہ ہے ـــــ جلال آباد کے پاس دریا کشتی رانی کے قابل ہے، ڈکہ سے گزر کر دریا پھر ایک تنگ پہاڑی گھاٹی میں بہتا ہے، پاکستانی حدود میں اس پر وارسک کے مقام پر بہت بڑا ڈیم تعمیر کیا گیا ہے، جہاں سے دو نہریں بھی نکالی گئی ہیں اور بہت بڑی مقدار میں بجلی بھی پیدا ہوتی ہے، دائیں کنارے کی نہر سے خیبر ایجنسی اور ضلع پشاور کی ہزاروں ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے، جبکہ بائیں کنارے کی نہر سے علاقہ مہمند کے کھیتوں کو پانی ملتا ہے۔ وارسک ڈیم کے جنوب میں دریائے کابل سے ایک اور نہر نکالی گئی ہے، جو پشاور شہر کے باغات اور زمینوں کی شادابی کا باعث بنتی ہے۔ وارسک سے کچھ آگے مچنی کے قلعے کے قریب دریائے کابل دو بڑی شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، شمالی شاخ ادیزئی شاخ اور جنوبی شاخ ناگمان کہلاتی ہے۔ چغرسٹی کے گاؤں کے پاس ناگمان سے ایک اور شاخ نکلتی ہے جو شاہ عالم کہلاتی ہے۔ علاوہ بریں مچنی قلعہ سے چند میل جنوب کو ناگمان ہی سے ایک اور شاخ جُدا ہوتی ہے، جو بڈھنی کہلاتی ہے۔ آگے چل کر اس شاخ سے جُوئے شیخ نکالی گئی ہے، جو دارالحکومت پشاور کی اراضی کو پانی مہیا کرتی ہے، اُسے شیخ کا کٹھہ بھی کہا جاتا ہے، یہ نہر مغلوں کے دور میں نکالی گئی تھی اور اب تک عمدگی سے کام کر رہی ہے، بڈھنی شاخ کئی میل تک الگ بہنے کے بعد کنکولہ کے گاؤں کے پاس پھر دریائے کابل سے جا ملتی ہے۔ اسی طرح ادیزئی شاخ اور ناگمان شاخ بھی بیس۲ میل تک الگ الگ بہنے کے بعد نستہ کے پاس دوبارہ یکجا ہو جاتی ہیں۔ اُدھر دریائے سوات کی دونوں شاخیں اکٹھی ہو کر نستہ کے پاس دریائے کابل سے جا ملتی ہیں۔ ان شاخوں کے مقام اتصال سے اٹک تک یہ دریا لنڈا کے نام سے پکارا جاتا ہے، سڑکوں اور ریلوے لائن کی تعمیر سے پہلے چارسدہ کی تجارتی منڈی سے زیادہ تر سامان کشتیوں ہی کے ذریعے نوشہرہ اور اٹک پہنچایا جاتا تھا، پشاور سے مردان اور مالاکنڈ جانے والی سڑک دریا کو ایک نئے اور مضبوط پُل کے ذریعے پار کرتی ہے۔ نوشہرہ چھاؤنی میں بھی دریائے کابل پر ایک پُل موجود ہے، جو ریل گاڑیوں اور بسوں وغیرہ کی آمد و رفت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، نوشہرہ میں لب دریا ایک تفریحی پارک بنایا گیا ہے، جب کہ خیرآباد کُنڈ کے مقام پر سیاحوں اور سیر و شکار کے شائقین کے لئے ایک ریسٹ ہاؤس بھی موجود ہے، اس ریسٹ ہاؤس کے پاس دریائے کابل اور دریائے سندھ کے مابین ایک جزیرے پر سیاحوں کیلئے

جھونپڑے بنائے گئے ہیں، جزیرے تک پہنچنے تک کشتیاں بھی یہاں سے مل سکتی ہیں۔ پشاور سے لاہور جانیوالی شاہراہ دریائے کابل کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جاتی ہے اور اس پر نوشہرہ، اکوڑہ خٹک، جہانگیرہ اور خیرآباد کے قصبے واقع ہیں، جہانگیرہ سے ایک سڑک دریائے کابل کے پُل کو پار کرکے صوابی، ٹوپی اور دوسرے علاقوں کو بھی نکلتی ہے، دریائے کابل سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں جو وادیٔ پشاور کے مختلف علاقوں کو سیراب کرتی ہیں، صوبہ سرحد کا محکمہ انہار ان نہروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

دریائے کابل قلعۂ اٹک سے کچھ اُوپر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے، سنگم کا نظارہ دیدنی ہے۔ دریائے سندھ کا پانی نیلا ہے۔ جبکہ دریائے کابل کا پانی سُرخی مائل ——— دونوں دریاؤں کی دھاریں دُور تک ساتھ ساتھ چلتی ہیں، بالآخر اٹک پُل کے قریب دونوں کا پانی خلط ملط ہو جاتا ہے۔

دریائے باڑہ باڑہ ایک چھوٹا سا دریا ہے، لیکن اپنے صحت بخش، میٹھے اور خوش ذائقہ پانی کی وجہ سے بڑا مشہور ہے، کہا جاتا ہے کہ مغل اور سکھ حکمران باڑہ کا پانی کنستروں میں بھر کر دہلی اور لاہور لے جایا کرتے تھے، یہ دریا تیراہ کی دلکش اور حسین وادی سے بہتا ہوا آتا ہے، راج گل اور بازار کے پُربہار علاقوں سے دوسرے ندی نالے بھی آکر اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، مستورہ یا تیراہ توی اس کا مشہور معاون ہے، مستورہ اورک زئی کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ باڑہ فورٹ سے کوئی دس میل اُوپر باڑہ اور مستورہ یکجا ہو جاتے ہیں اور پھر اکاخیل اور کھجوری کے میدانوں سے بہتے ہوئے شیخان کے قصبہ کے قریب وادیٔ پشاور میں داخل ہوتے ہیں، دریائے باڑہ کا پانی علاقہ خلیل اور مہمند کی زمینوں کو سیراب کرتا ہے، اسی دریا سے پشاور شہر اور چھاؤنی کو پینے کا پانی بھی مہیا ہوتا ہے۔ باڑہ سے پانی بڑے بڑے پائپوں کے ذریعے پشت خرہ کے تالابوں میں پہنچتا ہے، جہاں اُسے کیمیاوی طریق پر صاف کرکے پشاور شہر اور چھاؤنی میں پہنچایا جاتا ہے۔ پہلے اہلِ پشاور کے لئے باڑہ کا پانی کافی ہوا کرتا تھا، لیکن آبادی میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے اَب یہ پانی علاقے کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا، اس لئے جگہ جگہ ٹیوب ویل لگا دئے گئے ہیں، تاہم اِن کنوؤں کا پانی باڑے کے پانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دریا کے نام پر باڑہ ایک بستی بھی ہے، یہ مقام پہلے ایک غیر معروف چھوٹا سا گاؤں تھا، لیکن آج کل اتنی بڑی تجارتی منڈی بن گیا ہے۔ جہاں روزانہ لاکھوں روپیہ کا کاروبار ہوتا ہے۔ باڑے کا نام اَب

پاکستان بھر میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔

باڑہ کے مقام پر کچھ قدرتی چشمے بھی ہیں، ان چشموں کا پانی بھی دریا میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ پانی بے حد ہاضم ہے، کوئی ایک سو سال پہلے تک باڑہ کے کنارے نہایت عمدہ چاول ہوتے تھے، جو اپنی لذت اور خوشبو کی وجہ سے دُور دُور تک پسند کئے جاتے تھے، والیٔ کابل امیر عبدالرحمٰن خان کو باڑے کے چاول بہت مرغوب تھے، سکھ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی بطور خاص یہ چاول منگوایا کرتے تھے۔ پچیس تیس سال پہلے تک باڑہ کے کنارے شیخان اور شیخ محمدی میں کالا انگور بھی بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ دونوں چیزیں بالکل ناپید ہیں۔ کسی زمانے میں دریائے باڑہ پشاور شہر کے سب سے بڑے بازار قصہ خوانی میں بہتا تھا ـــــ اس کے کناروں پر شہتوت کے درخت تھے، لوگ ان کی چھاؤں تلے بیٹھ کر قہوہ نوش کیا کرتے تھے۔ قصہ خوانی بازار کے عقب اور کوہاٹی دروازہ میں اَب بھی وہ پختہ نہریں موجود ہیں۔ جہاں کبھی باڑے کا پانی لہریں لیتا تھا، تاہم اب ان نالوں سے گندے پانی کی نکاسی کا کام لیا جاتا ہے۔

۱۸۶۰ء میں باڑہ میں زبردست سیلاب آیا تو قصہ خوانی کے مکانوں اور دکانوں کو بھی نقصان پہنچا ـــــ سیلاب میں لوگوں کو بچاتے بچاتے لنڈی ارباب کے ایک مشہور ارباب صاحب بھی جاں بحق ہو گئے، شہر کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے دریائے باڑہ کا رُخ بدل دیا گیا، لنڈی اخون محمد سے کئی نہریں نکالی گئیں اور دوسری احتیاطی تدبیریں اختیار کی گئیں، تاہم اَب بھی کبھی کبھی باڑہ میں سیلاب آجاتا ہے، چونکہ یہ تیراہ کی سرزمین سے آتا ہے، اس لئے طغیانی کے دنوں میں اس کا پانی سُرخ ہوتا ہے، خیبر ایجنسی میں اب دریائے باڑہ پر بند باندھ کر نہر نکالی گئی ہے، جو وسیع علاقہ کو سیراب کرتی ہے۔

خیال ہے کہ پہلے باڑہ میں پانی کافی مقدار میں ہوتا تھا، لیکن جوں جوں تیراہ کے پہاڑوں سے درخت کاٹے جاتے رہے، پانی کی یہ مقدار کم ہوتی گئی اور اس کی حیثیت محض ایک ندی کی رہ گئی۔ بابر بادشاہ نے اپنی خودنوشت میں پشاور کے نواح میں "سیہ آب" نامی ندی کا ذکر کیا ہے، جس کے کنارے گھنے جنگل تھے اور بابر نے وہاں گینڈے کا شکار کیا تھا۔ یہ "سیہ آب" باڑہ یا بڈھنی دونوں میں سے ایک دریا ہو سکتا ہے۔

پشاور سے گزر کر باڑہ چکنی اور دوسرے دیہات کی زمینوں کو سیراب کرتا ہوا اکبرپورہ کے قریب دریائے کابل میں جا گرتا ہے، جی۔ ٹی روڈ پر سردار گڑھی کے قریب باڑہ کے کنارے ایک زرعی تحقیقاتی فارم بھی قائم کیا گیا ہے۔ جسے ترناب فارم کہا جاتا ہے، فارم کی آب پاشی کا کام دریائے باڑہ ہی سے لیا جاتا ہے، باڑہ کے دونوں کناروں پر ناشپاتی، آڑو اور آلوچہ کے عمدہ باغات ہیں ـــــ اکبرپورہ میں باڑہ کے کنارے مشہور ولی اللہ حضرت اخون نیجو صاحبؒ کا مزار ہے۔ جہاں عید کے دنوں میں میلہ لگتا ہے۔

دریائے کُرّم دریائے کُرّم میندھیر کے سلسلۂ کوہ سے نکلتا ہے، کوہ سفید کی برفانی چوٹیوں اور چشموں سے پانی رِس رِس کر اس میں ملتا جاتا ہے، یہ پہاڑ بارہ تیرہ ہزار، فٹ اُونچے ہیں۔ خرلاچی کے مقام پر دریا پاکستانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے، پاڑہ چنار کی وادی کی زرخیزی اور شادابی کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ یہ وادی بارہ تیرہ میل چوڑی ہے اور اپنی خوشگوار آب و ہوا، پھلوں، سبزیوں اور فصلوں کے لئے مشہور ہے، کُرّم ایجنسی میں جُوئے کرمان اس سے آن ملتی ہے، تب دریا کا رُخ جنوب مشرق کو ہو جاتا ہے، سدّہ کے قریب خرمانہ ندی اس کا معاون بنتی ہے، ٹل کا مشہور قلعہ دریائے کُرّم ہی کے کنارے آباد ہے۔ ٹل کا قصبہ عمارتی لکڑی کی مشہور منڈی ہے۔ ـــــ ضلع کوہاٹ اور وزیرستان سے ہوتا ہوا دریائے کُرّم ایک تنگ گھاٹی سے گزر کر بنّوں سے سات میل مغرب کو پھر میدانی علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ صدیوں سے دریائے کُرّم بنّوں کے کھیتوں کو سیراب کرتا رہا ہے، اس ضلع کا سب سے زرخیز علاقہ کرم اور گمبیلا کا دوآبہ ہی ہے، اس میدان کا علاقہ کوئی ۲۷۰ مربع میل ہے، بنّوں کے شمال میں ایک جگہ کُرّم گڑھی سیکم کا ہیڈ ورکس ہے، جہاں سے نہریں نکالی گئی ہیں، سکھوں نے ان نہروں کی حفاظت کے لئے بنّوں میں دلیپ گڑھ کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔

لکّی مروت کے پاس دریائے گمبیلہ، دریائے کُرّم سے آن ملتا ہے، دونوں دریا یکجا ہو کر درّہ تنگ سے بہتے اور تحصیل لکّی اور عیسیٰ خیل کی زمینوں کو سیراب کرتے ہوئے دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں۔

وزیرستان کی پہاڑیوں سے کیتو کا دریا بھی نکلتا ہے، یہ بھی دریائے کُرّم کا ایک معاون ہے۔

کوہاٹ توئی کوہاٹ کے ضلع میں دو مشہور ندیاں ہیں۔ جن پر علاقے کی آب پاشی کا دارو مدار ہے، شہر کوہاٹ کے نواح میں کوہاٹ توئی ہے، جس کی کل لمبائی ۱۴۵ کلومیٹر ہے، یہ تیراہ کی خانکی وادی سے نکل کر ہنگو ہوتی ہوئی کوہاٹ پہنچتی ہے۔ اس علاقے کو میراں زئی کی زیریں وادی بھی کہا جاتا ہے۔ کوہاٹ اور نواحی علاقے کے امرود کے باغات اور کھیتوں کی شادابی کوہاٹ توئی ہی کی مرہونِ منت ہے، کوہاٹ چونکہ خشک علاقہ ہے۔ اس لئے اس دریا کا پانی آبپاشی کی ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا البتہ بارش کے دنوں میں توئی پانی سے بھری رہتی ہے۔ صدیوں سے کوہاٹ کے کسان اپنی مقامی ضروریات کے مطابق کوہاٹ توئی سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتے ہیں۔ کوہاٹ شہر سے کچھ میل دُور اس دریا پر تاندہ ڈیم کے نام سے ایک بند باندھا گیا ہے، اس ڈیم کی بدولت بارش کے دنوں میں دریا کا پانی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور دریا ایک جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، بعد میں اس آبی ذخیرہ سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے، شکر درّہ سے گزر کر کوہاٹ توئی دریائے سندھ میں جا گرتی ہے۔

کوہاٹ شہر اور کئی نواحی علاقوں میں قدرتی چشمے پائے جاتے ہیں، ان چشموں کا پانی بھی تھوڑی بہت زمینوں کو سیراب کرتا ہے، کوہاٹ کی مٹی پھلوں اور فصلوں کے لئے بہت اچھی ہے تاہم بارش کی کمی اور آبپاشی کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے ضلع کا بیشتر علاقہ خشک اور بنجر ہے۔

شکلائی ندی اور ٹیری توئی جہاں کوہاٹ توئی میراں زئی کی زیریں وادی کی شادابی کا باعث ہے، وہیں شکلائی توئی اور دوسری ندیاں میراں زئی کی بالائی وادی میں آبپاشی کا وسیلہ ہیں، شکلائی توئی تیراہ اور اورک زئی کے پہاڑوں سے نکل کر ٹل کے قریب دریائے کُرم میں گرتی ہے، اس میں سال کے بارہ مہینے تھوڑا بہت پانی موجود رہتا ہے۔

ٹیری کی تحصیل رقبے کے اعتبار سے ضلع کی سب سے بڑی تحصیل ہے تاہم اس کا زیادہ علاقہ خشک اور چٹیل ہے۔ ٹیری کا تاریخی قصبہ اس کا مرکزی مقام ہے جو ٹیری توئی کے کنارے واقع ہے اس ندی میں پانی اتنا تھوڑا ہے کہ صرف چند سو ایکڑ زمین اس سے سیراب ہوتی ہے۔ یہ ندی بہادر خیل کے پاس نمک کے پہاڑوں سے گزرتی ہے تو اس کا پانی اتنا کھارا ہو جاتا ہے کہ وہ آبپاشی کے لئے قابلِ استعمال نہیں رہتا۔

ضلع کرک کے برساتی نالوں میں سے دو زیادہ مشہور ہیں جو ترخا الگدا اور لواغر الگدر کہلاتے ہیں، ان نالوں میں صرف بارش کے دنوں میں پانی ہوتا ہے، سال کا باقی حصہ یہ خشک رہتے ہیں دونوں نالے شمال مشرق سے جنوب مغرب کو بہتے ہوئے دریائے کُرم میں جاگرتے ہیں۔

دریائے ٹوچی یا گمبیلا دریائے ٹوچی یا گمبیلا وزیرستان کا سب سے بڑا دریا ہے، یہ کوہ سلیمان کی مشرقی ڈھلوانوں سے نکلتا ہے اور عرباً شرقاً شمالی وزیرستان سے بہتا ہوا ضلع بنوں میں داخل ہوتا ہے، یہ دریائے کُرم اور دریائے گومل کے مابین واقع علاقے کو پانی مہیا کرتا ہے اور لکی مروت کے پاس دریائے سندھ میں جاملتا ہے ——— دریا کے کنارے اکثر جگہوں پر بہت اُونچے ہیں، اس لئے یہ آبپاشی کے لئے زیادہ مفید نہیں تاہم مقامی لوگ کہیں کہیں اس کے پانی کو روک کر اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔

دریائے شکتو اور دریائے خیسورہ بھی اس علاقے کے دو چھوٹے دریا ہیں۔

دریائے گومل دریائے گومل صوبہ سرحد کا انتہائی جنوبی دریا ہے، یہ کوہ سلیمان کے کم اُونچے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ اس لئے اس میں پانی کی مقدار زیادہ نہیں ہوتی، یُوں بھی جنوبی اضلاع سرحد میں دو قسم کے ندی نالے ہوتے ہیں، ایک وہ جن میں سال کا اکثر حصہ پانی ہوتا ہے، یہ "زام" کہلاتے ہیں، اس قسم کا سب سے بڑا دریا گومل زام ہے، اسے دریائے لُونی بھی کہتے ہیں۔ یہ افغانستان کے پہاڑوں سے نکل کر وزیرستان سے ہوتا ہوا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں داخل ہوتا ہے اور پروا، تحصیل کلاچی کے پاس دریائے سندھ میں جاگرتا ہے، گومل نام کا درّہ بھی اس کے نواح میں واقع ہے، چند سال پہلے جب ڈیرہ اسماعیل خان میں یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کا نام بھی گومل یونیورسٹی رکھا گیا۔

ٹانک زام (جو آگے چل کر ڈیرہ کے ریگستان میں گم ہو جاتا ہے) درابن زام اور چودھوان زام بھی ڈیرہ اسماعیل خان کے چھوٹے دریاؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان دریاؤں کے علاوہ وہ برساتی نالے ہیں، جو سال کا اکثر حصہ خشک رہتے ہیں، البتہ پہاڑوں پر بارش ہونے پر اُن میں سیلاب "نوز" آجاتا ہے، ان نالوں میں نالہ سہیلی، نالہ ٹکواڑہ اور نالہ گلستان مشہور ہیں۔

صُوبہ سرحد کے دریا پنجاب کے میدانی دریاؤں کی نسبت بڑے دلچسپ اور دلکش ہیں، پہاڑی

علاقوں میں یہ پیچ پر پیچ کھاتے، آبشاریں بناتے، گنگناتے، گیت گاتے اپنا سفر طے کرتے ہیں، کئی مقامات پر اُن کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے، اِن دریاؤں کے دیکھنے سے شکوہ و جلال کا احساس ہوتا ہے، ان میں ترنم اور موسیقی ہے، مناظر کا تنوع ہے، اکثر دریاؤں کی وادیوں میں قدیم تہذیبوں کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ جن کے مطالعہ سے انسان کا تاریخی شعور بیدار ہوتا ہے۔

آب و ہوا آب و ہوا کے اعتبار سے بھی صوبہ سرحد ملک کا ایک منفرد خطّہ ہے، اس میں ایک طرف چترال، کاغان، تیراہ اور پاڑہ چنار کے سرد علاقے ہیں، جہاں کے پہاڑوں کی چوٹیاں سال کا اکثر حصہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں تو جنوب میں ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کے تپتے ہوئے ریگستان بھی ——— گرمیوں میں یہاں اکثر علاقوں میں شدید گرمی پڑتی ہے تو موسم سرما میں برفانی ہواؤں کی وجہ سے سخت سردی بھی ہوتی ہے ——— ہر طرح کی آب و ہوا کے خطّے اس صوبے میں موجود ہیں، اس آب و ہوا اور جغرافیائی ماحول کا اثر یہاں کے رہنے والوں پر بھی پڑتا ہے، وہ سخت جان اور جفاکش، لوگ ہیں، پہاڑوں کی چٹانوں تک میں رزق تلاش کر سکتے ہیں، سرحدی لوگ گرمی سردی برداشت کرنے کے عادی ہیں، دنیا بھر کے ہر خطّے میں روزگار کی خاطر پہنچتے ہیں اور ہر قسم کے حالات میں گزارہ کر لیتے ہیں ——— سال کا بہترین موسم بہار ہے، جو صحت بخش بھی ہے اور لطف افزا بھی، سرحد کے زندہ دل پھولوں کے بڑے دلدادہ ہیں، یہاں تک کہ اکثر اپنے ناموں کے ساتھ بھی "گل" کا لاحقہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ روزی گُل، خیال گُل، خان گُل، عجب گُل، ماہ گُل، گُل بی بی یہاں کے عام نام ہیں۔

بارش کی سالانہ اوسط یہاں پندرہ انچ تک ہے۔ موسم عموماً خشک ہوتا ہے قابلِ کاشت زمینیں کم ہیں، اکثر پہاڑی اور بارانی علاقوں کے لوگ حصولِ معاش کے لئے کراچی، لاہور اور دوسرے شہروں کا رُخ کرتے ہیں یا پاکستانی افواج اور ملیشیا میں بھرتی ہو کر اپنے وطنِ عزیز کی سرحدوں کا دفاع کرتے ہیں۔ تعلیم کے فروغ کے بعد اب یہاں کے نوجوان ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سائنسدان اور پروفیسر بن کر اُونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ تجارت، صنعت اور معیشت کے دوسرے شعبوں میں وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔

لوگوں کی اکثریت کا دارو مدار زراعت پر ہے تاہم صوبہ سرحد معدنی دولت سے بھی مالا مال ہے یہاں زمرّد، یاقوت اور دوسرے قیمتی پتھر پائے جاتے ہیں، سیمنٹ اور چونے کا پتھر قریباً ہر جگہ پایا

جاتا ہے، جگہ جگہ سیمنٹ کے کارخانے لگ گئے ہیں، یہ صوبہ پن بجلی کا خزانہ ہے، ملک بھر میں سب سے زیادہ جنگلات یہیں پائے جاتے ہیں، ترقی کے مختلف منصوبوں پر تیز رفتاری سے کام ہو رہا ہے۔ غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں اہل سرحد خوشحالی کی منزل پر رواں دواں ہیں اور صوبے کا مستقبل درخشاں و تابناک ہے۔

تقسیم آبادی یوں تو ہر جگہ ہر قوم اور قبیلہ کے لوگ آباد ہیں، تاہم مختلف علاقوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہیں :-

چترال : چترالی ۔ کاشغری ۔

دیر، سوات، باجوڑ اور مردان : یوسف زئی، منداڑ اور اتمان خیل کی مختلف شاخیں۔

ہزارہ : یوسف زئی ، سواتی ، جدون ، ڈھونڈ ، کرڑال ، ترین ، تنولی ، ترک ، گوجر ، دلازاک ، اعوان اور سیّد ۔

مہمند : ترک زئی اور حلیم زئی

خیبر : آفریدی ، شنواری ، شلمان خیل اور ملاگوری ۔

پشاور : خلیل ، مومند، محمد زئی ، داؤد زئی ، خٹک ، گگیانی ، درّانی اور اعوان ۔

کوہاٹ : خٹک ، بنگش ۔

بنوں : مروت اور بنوچی ، وزیر ، منداڑ خیل ، غزنی خیل ۔

کرک : بارک خٹک ، سینی خٹک ۔

وزیرستان : درویش خیل وزیر اور محسود ۔

ڈیرہ اسماعیل خان : بلوچ ، جاٹ ، گنڈہ پور ، قصوریہ ، میاں خیل ، کندی ، سدوزئی ، اسماعیل زئی۔

جنوبی وزیرستان : شیرانی ، بھٹنی ، محسود ، داوڑ ۔

کُرّم ایجنسی : طوری ، بنگش اور داوڑ ۔

معاشرت "جیسی مٹی ویسے لوگ" کا مقولہ اہل سرحد پر خصوصیت سے صادر ہوتا ہے، بلند و بالا پہاڑوں، پتھریلی چٹانوں، گنگناتے دریاؤں اور ندی نالوں، حسین نظاروں کی سرزمین میں بسنے والے یہ خود دار اور غیور لوگ مملکت پاکستان کی سرحدوں کے پاسبان ہیں، اس جغرافیائی

ماحول نے انہیں سپاہیانہ خصوصیات، ہمہ وقت بیداری اور حریت پسندی کی خوبیاں عطا کر رکھی ہیں، محنت و مشقت اور سخت کوشی کی عادت اُنہیں ورثہ میں ملی ہے۔ وہ زیادہ تر اُن مردانِ غازی اور فاتحین کی اولاد ہیں جو وقتاً فوقتاً برصغیر پر حملہ آور ہوتے رہے، یہی وجہ ہے کہ صوبہ سرحد کے لوگ قد و قامت، خدو خال اور ناک نقشے کے اعتبار سے دنیا کی اکثر قوموں میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ آزادی پسندی، خودداری، بے نیازی اور صاف گوئی کی خوبیاں ان کی سرشت میں داخل ہیں۔ وہ شاہین صفت انسان اور شیدائیان اسلام ہیں۔ یُوں تو صوبہ سرحد کے اکثر لوگ صحت مند، بلند ہمت، وجیہہ اور شکیل ہیں، تاہم دیر، سوات، مالاکنڈ اور مردان کے یوسف زئی، بنّوں کے مروت، خیبر ایجنسی کے آفریدی اور شنواری اور نواحِ ہنگو کے بنگش نسبتاً زیادہ شکیل اور باوقار ہیں۔

ڈیڑھ سو سال پہلے صوبہ سرحد میں وارد ہونے والے انگریز سیّاح الفنسٹن نے جس کا مشاہدہ بہت گہرا اور تیز ہے پٹھانوں کے اخلاق و کردار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

"پٹھانوں میں اگر ایک طرف انتقام کا جذبہ اور چند دوسری خامیاں موجود ہیں تو دوسری طرف بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ پٹھان آزادی کا دلدادہ، دوستوں کا خیر خواہ، اپنے لواحقین پر مہربان، مہمان نواز، محنتی، کفایت شعار اور زیرک ہوتا ہے، میں نے ایشیاء میں ایسے لوگ کہیں بھی نہیں دیکھے، جن میں پٹھانوں کی طرح عیب کم ہوں اور عیش و عشرت سے بے رغبتی پائی جاتی ہو۔"

"پٹھان عمدہ طرزِ عمل کا مالک ہوتا ہے، اس کا ارادہ قوی اور قوتِ فیصلہ مستحکم ہوتی ہے، وہ دوسروں سے بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے، اس کا کردار ریاکاری سے مبرّا ہوتا ہے۔ وہ شگفتہ مزاج اور خندہ رو ہوتا ہے۔ اس کی باتوں میں ظرافت کی چاشنی پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے بارے میں دوسروں کی پھبتیاں سُن کر بھی داد دینے سے

نہیں چوکتا ۔"

صُوبۂ سرحد کے اس جغرافیائی ماحول اور یہاں کے لوگوں کے اس قومی مزاج نے یہاں کی تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا ہے ۔ ان حقائق کو پیشِ نظر رکھے بغیر صُوبۂ سرحد کی تاریخ کو کما حقہ ، سمجھا نہیں جا سکتا ۔

قدیم دَور

صُوبہ سرحد کی تاریخی قدامت

صوبہ سرحد کا تاریخی اور تہذیبی مطالعہ بڑا اہم اور دلچسپ ہے، کہنے کو تو اس خطہ کو شمال مغربی صوبہ سرحد کا نام ۱۹۰۱ء میں دیا گیا تاہم یہ علاقہ تاریخ عالم کے آغاز ہی سے سیاسی اعتبار سے انسانی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز رہا ہے اور یہ بات پُورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ برِصغیر پاک و ہند بلکہ سارے وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ کی تشکیل میں کسی دوسرے خطہ نے اتنا حصہ نہیں لیا، جتنا صوبہ سرحد نے۔

ایک مشہور مؤرخ کا کہنا ہے کہ شہر دہلی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے انسان پُورے پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ سے آگاہ ہو جاتا ہے، یہ مقولہ دہلی سے کہیں زیادہ صوبہ سرحد کی سرزمین پر صادق آتا ہے، اس لئے کہ یہ خطۂ ارض اپنی جغرافیائی اور کلیدی حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ مختلف حملہ آور قوموں کی آماجگاہ بنا رہا، گوناگوں تہذیبوں کا مرکز اور مختلف اقوام کی ثقافتی اور تہذیبی روایات کا سنگم قرار پایا اور اسی لئے پاکستان کے شاید ہی کسی علاقے کو اتنے تغیراتِ زمانہ سے سابقہ پڑا ہو جتنا شمال مغربی صوبہ سرحد کو، اس امر کے پیشِ نظر مجھے یہ کہنے ہوئے کوئی باک نہیں کہ صوبہ سرحد کی تاریخ و ثقافت کو سمجھے بغیر پاکستان کی تاریخ کو سمجھنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

آج سے پچاس برس پہلے برطانوی حکومت نے برصغیر پاک و ہند کے سیاسی حالات کے مطالعہ کے لئے سائمن کمیشن کے نام سے ایک وفد بھیجا تو اپنے مشاہدہ کے بعد اس نے بھی صُوبہ سرحد کی تاریخی اہمیت اور قدامت کو ان الفاظ میں تسلیم کیا کہ

"شمال مغربی صوبہ سرحد صرف ہندوستان ہی کی شمال مغربی سرحد نہیں بلکہ یہ ایک بین الاقوامی

سرحد کا درجہ رکھتا ہے، یہاں ہندوستان، چین، روس اور افغانستان کی سرحدیں پاکستان سے ملتی ہیں اس لئے عسکری نقطۂ نظر سے یہ پوری سلطنت برطانیہ (جو اس وقت نصف دنیا پر پھیلی ہوئی تھی) کے اہم ترین کلیدی مقامات میں سے ایک ہے۔"

وہ زمانہ لد چکا جب ایلفنسٹن نے اس سرزمین کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "سکندر اعظم سے پہلے کی کوئی تاریخی تولیت حتماً صحیح نہیں کہی جا سکتی اور نہ کسی واقعہ کی تاریخ کا تعین ممکن ہے۔" کیونکہ اب علم آثار قدیمہ کی بدولت پچھلے کئی ہزار سال کی تاریخ و تہذیب حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ گئی ہے، اسی اثری تحقیق و تدقیق اور علوم جدیدہ کی روشنی میں اب ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا پہلا انسان دریائے سندھ کی وادی یا صوبہ سرحد ہی میں آباد ہوا اس لئے اس سرزمین کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی روئے زمین پر حیاتِ انسانی کا وجود!

حال ہی میں سائنس دانوں کی ایک بین الاقوامی ٹیم کے سربراہ اوریل یونیورسٹی امریکہ کے شعبۂ علوم انسانی کے صدر پروفیسر ڈیوڈ پل بیم نے اسلام آباد میں انکشاف کیا کہ انہوں نے دریائے سندھ کے مشرق میں چند میل دور واقع ایک مقام سے چھوٹے جانوروں مثلاً چوہے اور بندر وغیرہ کے فاسلز تلاش کئے ہیں جو ساڑھے چار کروڑ برس پرانے ہیں۔

محققین کی ایک اور جماعت نے بتایا تھا کہ "دریائے سوان (راولپنڈی) کی وادی سے دستیاب ہونے والے آثار انسانی اتنے ہی قدیم ہیں جتنے چین اور جاوا کے۔ یعنی یہ انسانی آثار پانچ لاکھ سال پرانے ہیں"

مؤرخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دریائے سندھ کے علاقے کی تہذیب دریائے گنگا کی وادی کی تہذیب سے قدیم تر اور درخشاں تر ہے، خود بھارت کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گوکھلے نے اپنی کتاب (ANCIENT INDIA) میں تسلیم کیا ہے کہ

"انسان اس سرزمین پر پیدا ہوا یا کہیں اور سے یہاں وارد ہوا؟ ہمارے پاس اس تحقیق کا کوئی حتمی ذریعہ نہیں، لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ انسان نے اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر چلنا یہیں شروع کیا۔"

پروفیسر گوکھلے نے اس سرزمین کی وضاحت کرتے ہوئے اسے صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ

کاٹھیاواڑ اور گجرات پر مشتمل قرار دیا۔ ان میں سے اکثر مقامات پاکستان ہی میں واقع ہیں، بالفاظ دیگر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی رُو سے پہلا انسان پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں پیدا ہوا اور یہیں انسانی زندگی نے ابتدائی مراحل طے کئے۔

"ویدک ایج" (VEDIC AGE) کے مؤلف کا کہنا ہے کہ پاکستان میں پہلا آدمی شمال مغربی پہاڑی دامنوں میں آباد تھا، یہ پہاڑی دامن ایک تودہ ہیں جنہیں دریائے ہرو اور دریائے سوان سیراب کرتے ہیں یعنی ضلع ہزارہ، کیمبل پور اور راولپنڈی اور دوسرے سیالکوٹ، جموں، میرپور اور پونچھ وغیرہ۔

ہندوؤں کے رگ وید میں صاف مرقوم ہے کہ پہلا انسان "سرسوتی" کے دامن یعنی موجودہ پاکستان میں پیدا ہوا۔ علامہ اقبالؒ نے نہ جانے کن اسباب و قرائن کی بناء پر فرمایا تھا:

اے ہمالہ! داستان اس وقت کی کوئی سُنا
مسکنِ آبائے انسان جب بنا دامن ترا

یہ شعر ظاہر کر رہا ہے کہ مفکرِ پاکستان حضرت اقبال کو پورا یقین تھا کہ پہلا انسان پاکستان ہی میں پیدا ہوا۔

دورِ حاضر کے ایک مبصر کا خیال ہے کہ قدیم مشرقی قومیں اگر وجود میں نہ آتیں تو جدید مغربی تمدن کا ظہور ناممکن ہوتا، تمدن کے اکثر خصائص اہلِ مغرب کو مشرقی قوموں، آشوریوں، بابلیوں، مصریوں، ایرانیوں، سماریوں اور آریاؤں وغیرہ سے ملیں ظاہر ہے کہ صوبہ سرحد میں قریب قریب ان سبھی قوموں کے تمدن کو خلط ملط ہونے کا موقعہ ملا۔ اور اسی اختلاط اور میل جول کے نتیجے میں وہ عظیم تمدن عالمِ وجود میں آیا جس کے روشن آثار موہنجوڈھارو، ہڑپا، ٹیکسلا اور کوٹ دیجی کے مقامات سے ملے ہیں۔

سر ایلفرڈ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اول میں کہتے ہیں کہ

"پاکستان، ایران، افغانستان اور بلوچستان ایک ہی سطح مرتفع ایران کے مختلف عنوان ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کا تہذیب و تمدن بھی ایک دوسرے سے نہایت قریب ہے"

زمانہ قدیم میں روم، مصر، ایران اور چین کی تہذیبیں اپنے انتہائی عروج پر تھیں، ان عظیم مملکتوں کو

ایک دوسرے سے ملانے والی شاہراہ سرزمین گندھارا (صوبہ سرحد) ہی سے ہوکر گزرتی تھی۔ کابل سے یہ شاہراہ جلال آباد اور لال پورہ سے ہوتے ہوئے دریائے کابل کے شمال میں چارسدہ، (پشکال وتی) پہنچتی اور پھر وہاں سے مالاکنڈ اور سوات کی راہ موجودہ شاہراہ چین سے جا ملتی۔ ان ممالک کے مابین تجارتی مال کا لین دین ہوتا اور ایک ملک دوسرے ملک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوتا، علوم و فنون کی دنیا میں بھی اس باہمی اختلاط نے نئی تخلیقی راہیں کھولیں اور گندھارا آرٹ اور وادیٔ سندھ کی تہذیب وجود میں آئی، جو پاکستانِ قدیم کی ثقافتی برتری کا ثبوت اور علامت ہے۔

قدیم نوشتوں میں صوبہ سرحد کے زرخیز میدانوں، دریاؤں، پہاڑوں اور درّوں کا ذکر بہت کثرت سے ہوا ہے۔ مشہور مستشرق مارکس مولر دریائے سندھ کی تہذیبی برتری کے ضمن میں جو تفصیل بیان کرتے ہیں اس کی رُو سے قدیم الایام میں دریائے سندھ کا اصل نام "سندھو" تھا، رگ وید نے بھی اس عظیم دریا کو اسی نام سے یاد کیا ہے اور اسے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

ٹولی نے دریائے کابل کا قدیم نام "کوبھا" بتایا ہے اور تصدیق کی ہے کہ مغرب سے جو دریا دریائے سندھ کے معاون بنتے ہیں اُن میں کوبھا سب سے اہم دریا ہے۔ کئی دوسرے مصنفوں نے کابل کو کوبھین یا کوبھس بھی لکھا ہے، رگ وید اسے "گبھ" لکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ دریا، دریائے سندھ میں گرنے سے پہلے دریائے کنڑ، دریائے سواستو، پنجکوڑہ اور باڑہ وغیرہ کو ساتھ لیتا ہوا دریائے سندھ سے گلے ملتا ہے۔

سر ٹامس ہولڈچ نے جہاں ان دریاؤں کے نام گنوائے ہیں وہیں گرم، ٹوچی اور گومل کا ذکر بھی کیا۔ اس نے کوہ سلیمان کے درّوں کے قدیم نام بھی دیئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ پہلے پہل انسان چونکہ دریاؤں کے کناروں ہی پر آباد ہوا کرتے تھے، اس لئے مغربی درّوں سے گزر کر آنے والے قافلے ابتداء میں صوبہ سرحد کی انہی دریائی وادیوں میں آباد ہوئے اور یہیں سے انہوں نے متمدن زندگی کا آغاز کیا اور مہذب انسانوں کے سے طور طریقے سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام سرحدی دریاؤں کے کنارے وہ قدیم بستیاں ملتی ہیں جو ابتدائی دور کے انسانوں کا مسکن تھیں اور جہاں سے برآمد ہونے والے آثار و نوادرات سے اس دور کی تہذیب و ثقافت

پر روشنی پڑتی ہے۔ مسٹر وہیلر (EXCAVATION OF HARARA) کے صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں کہ "ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں اگر کوئی شخص ایرانی حدود سے نکل کر دریائے سندھ کی وادی (موجودہ پاکستان) میں داخل ہوتا تو اسے سڑک کے دونوں طرف سینکڑوں میل تک ایسی مہذب بستیاں ملتیں جن کے رہنے والوں کا رہن سہن، اوزار، اسلحہ اور دوسرا ساز و سامان بالکل ایک جیسا تھا۔"

موہنجوڈارو، ہڑپہ اور دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والے آثار و باقیات کا ذکر کرتے ہوئے سر جان مارشل اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "دریائے سندھ کے شمالی علاقوں سے لے کر جنوبی میدانوں تک کا سارا خطہ ایک ہی تہذیب و ثقافت کا علمبردار ہے، مشرق میں مقام روپڑ سے مغرب میں نورالائی تک اور ڈیرہ جات اور بنوں سے لے کر کشمیر کی جنوبی حدود تک سارے علاقے میں کمال کی تہذیبی اور تمدنی وحدت پائی جاتی ہے۔"

یہ تہذیب کسی لحاظ سے بھی اُس دور کی مصری اور بابلی تہذیب سے ہیٹی نہ تھی۔

"تاریخ مغربی پاکستان" کے مؤلف رشید اختر ندوی بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ پہلا انسان پاکستان ہی کے شمال مغربی علاقوں میں آباد ہوا بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ برفانی عہد کے انسان کے آثار بھی شمالی پنجاب میں "ڈھوک پٹھان" کے مقام سے برآمد ہوئے ہیں۔

صوبہ سرحد کی تاریخی قدامت اور یہاں کے رہنے والوں (پختونوں) کے اصل نسل پر بحث کرتے ہوئے مشہور محقق مولانا عبدالقادر مرحوم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

"پشتو زبان، پشتون ثقافت اور تہذیب و تمدن کے متعلق میرا اپنا بھی ایک نظریہ ہے۔ میرے عقیدے کے مطابق پشتون نہ آریہ ہیں نہ سامی اور نہ ہی انہیں منگولوں یا تاتاریوں سے وابستہ کرنا درست ہے، پشتون ان سب سے قدیم ایک قوم ہیں، اسی طرح اس قوم کا اصل نسل اور زبان بھی زمانۂ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتی ہے ـــــ اگر وسطی ایشیا بنی نوع انسان کی پیدائش اور تہذیب کا گہوارہ ہے تو پشتون قوم، ان کی تہذیب اور اُن کی زبان کو بھی لازماً تمام نسلوں اور زبانوں سے قدیم ہونا چاہیئے ـــــ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے گردوپیش بسنے والے لوگ خواہ وہ آریہ کہلاتے ہوں یا سامی یا کچھ اور۔ بہرحال وہ یہیں سے اور یہاں

سے نکلی ہوئی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرجان مارشل اور مولانا عبدالقادر کی تحریروں سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ موجودہ پاکستانی علاقے ہر دور میں ایک جداگانہ حیثیت کے مالک رہے ہیں، روپڑ یا سرہند سے مغربی علاقے کو کبھی ہندوستان نہیں کہا گیا اور اس کے باشندوں کو پختون، سرحدی یا پنجابی اور سندھی کے نام سے تو پکارا گیا لیکن کبھی ان کے لئے ہندوستانی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ سرہند کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقام ہندوستان کی آخری سرحد تھا، اس سے مشرقی سمت کا علاقہ ہندوستان کہلاتا تھا جبکہ اس سے مغربی سمت کا علاقہ ایک الگ جغرافیائی اور تہذیبی وحدت تھی۔ وہی وحدت جسے آگے چل کر پاکستان بننا تھا، گویا پاکستان آج سے نہیں تہذیبی طور پر ہزاروں سال پہلے سے قائم ہے۔

دوسرے یہ کہ پختون قوم صدیوں سے موجودہ سرحدی صوبے ہی میں آباد تھی، ممکن ہے کہ اس طویل عرصے میں قبائل کی باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے مختلف قبیلے تھوڑی بہت نقلِ مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں تاہم ان کی اکثریت زمانہ قبل از تاریخ سے اپنے موجودہ علاقوں ہی میں آباد تھی۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر دوسرے حملہ آوروں کی طرح پشتون بھی کسی دوسرے ملک سے نقلِ مکانی کر کے آتے تو ضرور تاریخ میں اس کا تذکرہ ہوتا۔ جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ایران، افغانستان یا دنیا کے کسی بھی ملک کی کسی مستند سیاسی تاریخ میں پشتون قبائل کی نقل مکانی کا کوئی ذکر اور ثبوت موجود نہیں۔

پتھر کا زمانہ

صوبہ سرحد کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے سے پہلے اس امر کا سمجھنا ضروری ہے کہ ابتدائی دور میں اس سرزمین کے انسان کا بھی وہی حال تھا جو کسی دوسرے علاقے کے ابتدائی انسان کا۔ روئے زمین پر انسانی آبادی کا آغاز ہوا تو انسان کے پاس نہ عمدہ لباس تھا، نہ رہنے کو مکان۔ نہ اُسے کھانا پکانا آتا تھا نہ کاشت کاری اور کسبِ معاش کے طریقے۔ جانوروں کی طرح وہ درختوں کی کھوہ میں یا پہاڑوں کے قدرتی غاروں میں پناہ لیتا، قدرتی پھلوں پر گزارا کرتا یا پتھر کے نوکیلے اوزاروں سے جنگلی جانوروں کا شکار کرتا، چقماق پتھر سے آگ جلاتا اور شکار کے گوشت کو بھون کر کھا جاتا۔ نہ گاؤں تھے،

نہ بستیاں اور نہ ہی اس زمانے میں انسان کو مل جل کر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس زمانے میں انسان چونکہ اپنے زیادہ کام پتھر سے نکالتا تھا اس لئے اس دور کو پتھر کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں سے پتھر کے زمانہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے آثار اور اشیاء برآمد کی ہیں۔ ضلع ہزارہ کے قصبہ خانپور کے قریب پہاڑی غار ملے ہیں جو اس دور کے انسان اپنی بود و باش کے لئے استعمال کرتے تھے، ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ غار آٹھ ہزار سال قبل مسیح کے حجری دور سے متعلق ہیں۔ دریائے ہرو کے کنارے سڑہ کی پہاڑیوں میں اس قسم کا ایک غار ۲۵ فٹ لمبا، ۱۸ فٹ چوڑا اور ۸½ فٹ اونچا ہے، غار میں قدرتی روشنی اور ہوا پہنچنے کا اہتمام کیا گیا ہے، غار سے پتھر کے بنے ہوئے اوزار بھی دریافت ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کا انسان انہی غاروں میں رہا کرتا اور انہی اوزاروں سے کام لیا کرتا تھا۔

ہزارہ کے قریب وادیٔ سواں سے برآمد ہونے والے اوزار ایک خاص نوع کی "دھاتیت" رکھنے والے پتھروں کے ہیں، اس لئے گمان کیا جاتا ہے کہ یہ اوزار عہدِ حجرِ اوّل کے آثار و باقیات میں سے ہیں۔ (WONDER THAT WAS INDIA) میں بالسٹم نے وادیٔ سون کے اوزاروں کو جنوبی ہند سے دریافت ہونے والے اوزاروں پر فوقیت دی ہے۔

نظام پور ضلع پشاور میں (جو اٹک سے چند میل مشرق میں چراٹ کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے) پتھر کے ایسے اوزار پائے گئے ہیں جو ایک لاکھ سال پرانے بیان کئے جاتے ہیں، یہ وادیٔ سون (راولپنڈی) سے برآمد ہونے والے اوزاروں سے ملتے جلتے ہیں، اور دریائے سواں کی وادی وہ مقام ہے جہاں سے لاکھوں برس پرانا انسان ڈھانچہ برآمد ہوا ہے اور جو برصغیر میں غالباً حضرت انسان کا اوّلین مسکن تھا۔

مردان بونیر سرحد پر شنگھاؤ کا گاؤں ہے جس کے اردگرد بہت سے آثارِ قدیمہ بکھرے پڑے ہیں، ان کھنڈرات سے پتھر کے زمانے کے برتن اور اوزار تو دریافت ہوئے ہیں لیکن دھات کا کوئی برتن یا سکہ قطعاً نہیں ملا جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مقام پتھر کے زمانے کے لوگوں کا مسکن تھا، یہ لوگ غاروں میں رہتے تھے اور پتھر کے اوزاروں سے کام لیتے تھے۔

پتھر کے یہ تیز دھار آلات صوبہ سرحد کی تاریخی اور تہذیبی قدامت کا روشن ثبوت ہیں۔

کاٹلنگ (ضلع مردان) سے شمال مشرق کی طرف سجنہ نام کے پہاڑ میں کشمیر سمٹس کے نام سے سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک قدرتی غار ہے جس کے بارے میں طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ پہلے زمانے میں یہ غار زمین کے نیچے ہی نیچے ضلع ہزارہ اور کشمیر تک پہنچ جاتے تھے اور اس وقت کے غیر مسلم حکمران ضرورت پڑنے پر بھاگ کر ان کے ذریعے بچ نکلتے تھے، جبکہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس جگہ بدھ مت کے راہب چلّے کاٹا کرتے تھے اور چونکہ یہ جگہ خاموش اور تنہا تھی اس لئے پورے سکون سے گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے۔

تاریخی اعتبار سے پتھر کے زمانے کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک تو پتھر کا ابتدائی زمانہ تھا جس میں باشندوں کی بود و باش غاروں میں تھی اور وہ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے سلسلے میں جو اوزار استعمال کرتے تھے وہ پتھر ہی کے بنے ہوتے تھے۔ تاہم بعد میں رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کی اور وہ غاروں کو چھوڑ کر جھونپڑوں میں رہنے لگا۔ جھونپڑوں میں رہنے کے بعد اجتماعی معاشرے کا تصور پیدا ہوا اور اس طرح متمدن زندگی کی ابتدا ہوئی اس دور کو "پتھر کا زمانہ جدید" کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے آثار جمال گڑھی ضلع مردان میں ملے ہیں، جمال گڑھی سے ملنے والے چیزوں میں پتھر کی کلہاڑیاں، چھریاں، چاقو اور برچھیاں وغیرہ ملی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے قدیم باشندوں میں کول ہی ایک ایسا قبیلہ تھا جو چھ ہزار سال قبل مسیح کے قریب صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں میں وارد ہوا۔ یہ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، کھیتی باڑی سے واقف نہ تھے، اس لئے شکار کر کے کھاتے یا جنگلی پھلوں وغیرہ پر بسر اوقات کیا کرتے تھے، بعد میں جب دراوڑ اور دوسرے قبیلوں نے زور پکڑا تو انہوں نے کول کو زرخیز علاقوں سے نکال کر جنوب کی طرف بھگا دیا اور خود صوبہ سرحد کے دریاؤں کی زرخیز وادیوں پر قبضہ کر لیا، جنوبی ہندوستان میں بھیل اور گونڈ نام کی جو قومیں آباد ہیں ان کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ کول قوم کی مختلف شاخوں سے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کول ذات پات کو نہیں مانتے تھے، اُن کا کوئی خاص مذہب بھی نہ تھا، بھوت پریت کو مانتے تھے اور انہیں خوش کرنے کے لئے قربانی دیا کرتے تھے، امن پسند لوگ تھے، لڑائی جھگڑا پسند نہ کرتے تھے، تنہا پسند تھے۔ اجنبی لوگوں اور نو واردوں سے رسم و راہ نہیں رکھتے تھے اور اپنے ہی مخصوص رسم و رواج پر چلنے پر قانع تھے۔

دھات کا زمانہ صوبہ سرحد میں دھات کے زمانے کا آغاز اس دَور سے ہوا جب مغربی ایشیا کی متمدن اقوام سے یہاں کے لوگوں کا واسطہ پڑا، اس زمانے میں تانبہ دریافت ہوا اور اس کا استعمال شروع ہو گیا۔ گنگا کی وادی کے علاوہ کرّم کی وادی سے بہت سی ایسی چیزیں ملی ہیں جو اُس دور کی یادگار ہیں، اس زمانہ میں تانبہ کو تاؤ دے کر سخت کر لیا جاتا اور اس سے مختلف قسم کے اوزار اور برتن بنائے جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے ترقی کی تو اُسے لوہے کا بھی علم ہو گیا اور طرح طرح کے اوزار بننے لگے، انسانی تہذیب و تمدن کا اصل آغاز لوہے کے زمانہ ہی سے ہوا۔ مختلف ملکوں میں مختلف صنعتوں نے رواج پایا اور انسانی معاشرہ خوشحالی کی طرف گامزن ہو گیا، بقول سر جان مارشل "مغربی ایشیا زمانۂ قدیم میں صنعتی تگ و دَو کا مرکز رہا اور اسی بناء پر ایک ایسی بھٹی بن گیا جس میں ایرانی، یونانی اور عراقی صنعتیں ڈھل کر ایک ہو گئیں، پھر اس جگہ سے کچھ نہریں نکلیں جو روم، ایران، ہند اور ترکستان تک جا پہنچیں ——" ایران اور روم سے آنے والے انہی کاری گروں کی بدولت صوبہ سرحد اور برصغیر کے لوگوں میں علم و ہُنر سے رغبت بڑھی اور دھات کا استعمال عمدگی سے ہونے لگا۔ وادیٔ گومل (ڈیرہ اسمٰعیل خان) میں کلاچی کے قریب سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں وہ کوٹ ڈیجی کی دھات کی چیزوں سے ملتی جلتی ہیں، غالیگی ضلع سوات کے غاروں سے بھی اس دور کے برتن اور اوزار دستیاب ہوئے ہیں، دیر، سوات اور چترال کے دور دراز علاقوں میں اس دور کے برتن اور اوزار ملنا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ دھات کے زمانے میں یہاں کے لوگ اپنے عہد کے دوسرے لوگوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ایک ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ ایران سے کوئی قوم صوبہ سرحد میں وارد ہوئی جو لوہے کا استعمال جانتی تھی اور اپنے مُردوں کو دفن کرتے وقت دھات کے برتنوں میں مختلف چیزیں قبر میں رکھ دیتی تھی، پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ نے دیر

چترال اور مالاکنڈ ایسی بہت سی قبروں کا سراغ لگا کر وہاں سے اس دور کی چیزیں برآمد کی ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں لال مہرہ شریف اور نواحی بستیوں میں ایسی قبریں پائی گئی ہیں جہاں قدیم زمانے کی کسی قوم کے لوگ دفن ہیں۔ مُردوں کے مُنہ آسمان کی طرف یعنی اُوپر کو ہیں۔ قبر میں اُن کے پہلو میں دھات کے برتن دفن ہیں جن میں مختلف چیزیں رکھی جاتی تھیں، یہ آثار ہزاروں سال پرانی تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔

صوبہ سرحد کے سینکڑوں مقامات سے ملنے والے آثارِ قدیمہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں کہ ماضی میں یہ علاقہ کتنی عظیم تہذیبی روایات کا امین رہا ہے اور اس نے کتنی رنگا رنگ اور قسما قسم تہذیبوں کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ یہاں سے کتنی قوموں کے کاروان گزرے ہیں انہوں نے صوبہ سرحد کی ثقافت کو کتنے بوقلموں اثرات دیئے ہیں اور آج ان کا مطالعہ ہمارے لئے ماضی کے کتنے دریچے وا کر کے ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان

درۂ گومل پر واقع اہم سرحدی شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان سے شروع ہو کر ہم شمال کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور تاریخی آثارِ قدیمہ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے گومل یا گومتی آریاؤں کا دیا ہوا قدیم نام ہے، شاید یہ گئومتی یا گئومل اس لئے کہلاتا ہو کہ یہاں کے آریائی باشندوں کا سب سے بڑا پیشہ مویشی پالنا تھا، ہنا منشی روایات میں اسے سناگیئو (سوگائیں رکھنے والا) بھی کہا گیا ہے، تاریخ کے نامعلوم زمانے سے بیسیوں حملہ آور درۂ گومل سے اتر کر صوبہ سرحد میں داخل ہوئے۔ آج کل بھی قندھار اور دوسرے افغان شہروں سے آنے والے پاؤندے انہی حملہ آوروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہاں پہنچتے ہیں اور یہاں سے مال تجارت ساتھ لے جاتے ہیں۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مغرب میں وہ پہاڑی چوٹی ہے جسے "تختِ سلیمان" کہا جاتا ہے، تختِ سلیمان، کوہ سلیمان، درۂ خیبر وغیرہ کے نام اب بھی بعض ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ پشتون بنی اسرائیل ہی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ "تختِ سلیمان" کی اس پہاڑی چوٹی کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ کشتی نوحؑ یہیں رکی تھی، نیز ملکہ بلقیس کا وطن یہی تھا، اگست ۱۸۹۴ء میں دو انگریز فوجی افسروں میجر کیلوی (KELVEL) اور میجر ہنری میکموہن نے اس چوٹی کی حقیقت

معلوم کرنی چاہی اور خود جاکر اسے دیکھا۔ یہ پٹھانوں کے قبیلہ شیرانی کے علاقہ میں واقع ہے، یہ چوٹی ساڑھے گیارہ ہزار فٹ ہے، اصل چوٹی گرد و نواح کی پہاڑیوں سے دو سو فٹ ابھری ہوئی ہے، چوٹی پر ایک مشہور زیارت ہے جس کے گرداگرد پتھر کی فٹ ڈیڑھ فٹ اونچی چار دیواری ہے، زیارت ایک چبوترے پر ہے جو ۱۲ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا ہے جس تک پہنچنے کے لئے راستہ بڑا سخت ہے، چٹان میں پائیدان سے بنے ہوئے ہیں تاکہ زائرین کو آسانی ہو۔

کافرکوٹ شہر ڈیرہ سے کوئی ۳۹ میل شمال کو پہاڑوں کے دامن میں ایک قدیم شہر کے آثار ہیں جس کا نام "کافرکوٹ" ہے، یہ شہر کوئی تین ہزار سال پرانا ہے اور یہاں ایک عظیم الشان محل، مندر، تالاب، قلعہ اور فصیلوں کے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں، قلعہ دفاعی لحاظ سے بہت کلیدی مقام پر بنایا گیا ہے۔ شہر کے تین طرف پہاڑیاں ہیں جبکہ چوتھی طرف دریائے سندھ بہتا ہے، ہوسکتا ہے کسی زمانے میں دریائے سندھ قلعہ کے بالکل نیچے بہتا ہو۔ لیکن رُخ بدل جانے کی وجہ سے اب کوئی دو میل دور بہہ رہا ہے۔ شہر کے گرداگرد پتھر کی بنی ہوئی مضبوط فصیل ہے جس میں باقاعدہ مورچے بنے ہوئے ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شہر میں پانی پہنچانے کا کیا انتظام تھا۔ ہوسکتا ہے ان دنوں پہاڑوں پر چشمے ہوں جو اب خشک ہوکر رہ گئے ہوں یا دریا سے پانی لانے کا کوئی بندوبست ہو، شہر کی کرسی بہت اونچی ہے تاکہ سیلاب سے محفوظ رہے، مکان اکثر پتھر کے بنے ہوئے تھے جن کی اب صرف بنیادیں باقی رہ گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں غیر مسلم راجہ بل کی حکومت تھی، اس لئے اسے بل کوٹ یا بلوٹ کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ بل اور نل دو بھائی تھے، دونوں نے قلعے اور شہر بنا رکھے تھے جو تھوڑے فاصلے پر تھے، دونوں قلعوں کے درمیان پیغام رسانی کے لئے رات کو مشعلوں سے اور دن کو نقارے سے کام لیا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ پانڈوؤں کی بیوی نے اپنے بن باس کے دنوں میں یہاں قیام کیا تھا۔

ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے گاؤں خزانہ والا اور درابن میں قدیم زمانہ کے پہاڑی غار ہیں۔ جہاں ہندو سادھو عبادت کیا کرتے تھے، یہاں سے ایسے سکے برآمد ہوئے ہیں جن پر یزدگرد اور دارا کے نام کندہ تھے۔ چودھواں بھی ایک قدیم مقام ہے۔ اسی طرح درازندہ کے متعلق

بتایا جاتا ہے کہ اصل میں یہ "درِ زندان" تھا اور حضرت سلیمانؑ نے یہاں جنوں کو قید کر رکھا تھا۔

رحمٰن ڈھیری ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں حال ہی میں ایک قدیم شہر کے آثار ملے ہیں، اس شہر کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا تاہم قریبی گاؤں گڑھ رحمٰن کی مناسبت سے اسے رحمٰن ڈھیری کہا جاتا ہے، یہ قدیم شہر ضلعی صدر مقام سے چودہ پندرہ میل شمال کو ڈیرہ بنوں روڈ سے ایک میل مغرب کو واقع ہے، پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ کے پروفیسر فرزند علی درّانی کا کہنا ہے کہ اپنے آثارِ قدیمہ کے اعتبار سے رحمٰن ڈھیری موہنجو ڈارو اور ہڑپہ کی تہذیب سے بھی چھ سو سال قدیم تر ہے، اس کی تہذیب کا تعلق اس دور سے ہے جب وادیٔ سندھ کی تہذیب ابھی ابھر رہی تھی، یہ شہر دریائے سندھ سے گیارہ میل مغرب میں ہے، شہر کوئی اٹھارہ سو فٹ لمبا اور تیرہ سو فٹ چوڑا ہے، شہر کے اردگرد مضبوط فصیل کے آثار ہیں، یہاں سے چاقو، چھریاں، چمچے، چوڑیاں وغیرہ برآمد ہوئی ہیں جو اس امر کی غماز ہیں کہ شہر خوشحال اور ترقی یافتہ تھا اور اس کا تجارتی رابطہ دوسرے شہروں سے قائم تھا، باشندے کھیتی باڑی میں دلچسپی لیتے تھے اور اُن میں شہری شعور بدرجۂ اتم موجود تھا کیونکہ شہر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت بنایا گیا معلوم ہوتا ہے۔ اس قدیم شہر سے پانچ ہزار سال پرانی مہریں برآمد ہوئی ہیں۔ جن پر مختلف جانوروں مثلاً بچھو، پہاڑی بکروں اور مینڈکوں وغیرہ کی تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں ہڈی سے بنے ہوئے آلات، کانسی کے کلہاڑے، موتیوں کے ہار وغیرہ بھی ملے ہیں۔ کئی برتنوں میں سے گندم، تربوز کے بیج، سرسوں، جَو اور سرخ مرچیں بھی ملی ہیں، بھیڑ بکریوں، ہرن، بیل اور دوسرے مویشیوں کی ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ عمدہ مویشی پالتے تھے، رحمٰن ڈھیری سے مٹی کے برتنوں اور دوسری چیزوں کے جو ٹکڑے ملے ہیں، ان کی بناوٹ بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی قدیم صنعت سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ان چاروں صوبوں کے صدیوں پرانے روابط کی زندہ شہادت ہیں، محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ رحمٰن ڈھیری کو برصغیر کا سب سے پرانا متمدن شہر ہونے کا فخر حاصل ہے، تاریخی اعتبار سے یہ قدیم شہر منفرد حیثیت کا حامل ہے

بنوں کی قدیم تہذیب بنوں بھی صوبہ سرحد کا ایک اہم اور قدیم شہر ہے۔ اس کا پرانا

نام "درنو" تھا۔ یہ دریائے کرم (رگ وید کے کورمو) کے کنارے آباد ہے' قریب ہی دریائے گمبیلہ ہے جو شاید سنسکرت لفظ "گھمبیر" بمعنی گہرا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ڈیرہ اور بنوں کی تہذیب و ثقافت کا زیادہ تر رابطہ اور میل ملاپ ملتان کے علاقے کی تہذیب سے رہا ہے' اسی لئے ان علاقوں کے لوگوں میں تمدنی اور لسانی رشتہ کافی استوار ہے۔

"تاریخ خٹک" کے فاضل مصنف محمد سرفراز خان عقاب خٹک بنوں کی تاریخی قدامت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"کوہ خٹک صوبہ سرحد کو دو قدرتی حصوں میں تقسیم کرتا ہے' اس کے شمال میں گندھارا کا علاقہ تھا اور جنوب میں تھتنگش کا قدیم علاقہ"۔ عقاب صاحب کا دعویٰ ہے کہ جنوبی علاقے تھتنگش (بنوں اور ڈیرہ) کی تہذیب گندھارا کی تہذیب سے کہیں قدیم تر ہے البتہ ابھی اس پہ تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے"۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ہخامنشی خاندان کے دوسرے بادشاہ داریوش نے ۵۱۶ قبل مسیح میں بہستون میں جو کتبہ نصب کیا تھا اس میں ایرانی شہنشاہیت کے مختلف مقبوضات کا ذکر تھا، انہی علاقوں میں ایک کا نام تھتنگش تھا"۔

ہیرڈوٹس نے یونانی زبان میں اس علاقے کو ستاگودائی لکھا ہے جو علاقہ خٹک ہی کا نام قدیم نام ہے۔

گریشمین نے اپنی کتاب "ایران" میں بتایا ہے کہ یہ علاقہ دریائے سندھ کے مغرب اور گندھارا کے جنوب میں واقع ہے۔

عقاب صاحب اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تھتنگش ہی پختون قوم کا اصل وطن تھا اور وہیں سے وہ نقل مکانی کر کے آہستہ آہستہ شمالی علاقوں میں بس گئے۔ ۴۳ ہجری میں اسلام کا پیغام صوبہ سرحد کے اسی علاقے میں پہنچا اور اسی سرحدی ضلع کو سب سے پہلے مسلمان مجاہدین کے قدم چومنے کا شرف ملا۔ بتایا جاتا ہے کہ بنوں کے نواحی گاؤں میں اب بھی اُن عرب مجاہدین کے مزارات موجود ہیں جو اس پہلے اسلامی قافلے کے ہمراہ بنوں میں وارد ہوئے عقاب صاحب لکھتے ہیں کہ ایسے سکے، مہریں اور چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو مسلمانوں کی اوّلین

آمد کا پتہ دیتی ہیں۔

اکرہ علاقہ تھتگش کا ایک اہم قدیمی شہر اکرہ، ہے جو شہر بنوں سے سات میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عقاب صاحب کے نزدیک اس کا اصل نام آگرہ تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ آریہ پہلے پہل صوبہ سرحد ہی میں آباد ہوئے لیکن جب ان کی تعداد بڑھی تو دریائے گنگا کی وادی کی جانب کوچ کرتے گئے۔ وہاں انہوں نے جو بستیاں آباد کیں اُن کے نام بسا اوقات اپنے قدیم سرحدی شہروں کے نام پر رکھے چنانچہ آگرہ (یا اکرہ) صوبہ سرحد میں بھی ہے اور یو پی بھارت میں بھی، پٹیالہ کوہاٹ میں بھی ہے اور پنجاب (انڈیا) میں بھی، دریمند ہنگو کے نواح میں بھی ہے اور دکنی ہندوستان میں بھی، لاہور تحصیل صوابی میں بھی اور پنجاب میں بھی، متھرا ضلع پشاور میں بھی اور جمنا کے کنارے پر بھی۔

سردار حزب اللہ خان نے اکرہ کے کھنڈرات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے:۔ کہ اب اکرہ صرف ایک ٹیلہ ہے جو کوئی سترفٹ اُونچا ہے تاہم اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے یہ بڑا قیمتی خزینہ ہے، قریبی دیہات کے لوگوں کو اس سے سکے، برتن اور دوسری پرانی چیزیں ملتی رہتی ہیں، یہ مجسمے اور سکے پہلی صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں، علاوہ ازیں یہاں سے بعد میں آنے والے مسلمان حکمرانوں کے سکے بھی دستیاب ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ صدیوں تک اکرہ ایک اہم مرکزی مقام رہ چکا ہے، اکرہ اور چینی ترکستان کے قدیم شہر ختن کے نوادرات میں گہری مماثلت دیکھنے میں آتی ہے۔

ہندوؤں کے نزدیک اکرہ بڑی تقدیس کا حامل رہا ہے۔ یہ لورہ نامی ندی کے کنارے ہے اور اس کے پاس ہی بھرت، لکی اور ماندیو کے دیہات ہیں جو ہندوؤں کے زمانہ شجاعت کے اکابر سے منسوب رہے ہیں

امپیریل گزٹیئر لکھتا ہے کہ "اکرہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ رستم ابن زال کی بیوی اور کابل شاہ نامی حکمران کی بیٹی کا پایۂ تخت تھا۔ رستم کی بہن کا نام بانو تھا، یہ سارا علاقہ اس کی جاگیر تھا۔ اس لئے اس ضلع کا نام بنوں پڑ گیا۔

اکرہ کے کھنڈر بھارت یا بوات نامی گاؤں کے پاس ہیں۔ رامائن کا یہ بھرت رانی کیکئی کا بیٹا

اور رامچندر جی کا سوتیلا بھائی تھا، روایت ہے کہ ٹیکسلا یا تکشا سیلا بھارت کے ایک بیٹے کے نام پر اور پشکلاوتی بھارت کے دوسرے بیٹے پشکلا کے نام پر آباد ہوئے۔

قریب ہی ککی کا گاؤں ہے جو رامچندر جی کی سوتیلی ماں کیکئی کے نام سے منسوب ہے۔ ان کھنڈرات کے نواح میں پٹھانوں کا ایک قبیلہ ککے بھی رہائش پذیر ہے، عقاب صاحب کا کہنا ہے کہ اگر گندھارا بدھ اور یونانی تہذیبوں کا مرکز تھا تو تھتگش (بنوں اور اکرہ) ہندو تہذیب کے عروج کی نشاندہی کرتا ہے۔ کابل شاہی ہندو راجہ ست رام یہاں کا مشہور حکمران تھا۔ کابل شاہیوں کا عہدِ حکومت ۶۵۰ء سے ۸۷۰ء تک محیط ہے۔

اکرہ سے کوشان بادشاہوں کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں جو ۶۰ء سے ۲۲۵ء تک برسرِ اقتدار رہے۔ ہو سکتا ہے کہ ۸۰ء میں جب کوشان بادشاہوں نے پشاور کو دارالحکومت بنایا تو تمام تر رونقیں اکرہ سے پشاور منتقل ہو گئی ہوں۔ اکرہ اُس عظیم شاہراہ پر واقع ہے جو غزنی، پیواڑ کوتل بلند خیل، عیسیٰ خیل اور کالا باغ سے ہوتی ہوئی بھیرہ کے راستے ہندوستان جاتی تھی، یہ مقام بہت بڑا تجارتی مرکز تھا لیکن جب پشاور اس سارے علاقے کا دارالحکومت بنا تو تمام تر تجارت درہ خیبر، جلال آباد اور کابل کی راہ ہونے لگی اور اس طرح اکرہ کی اہمیت ختم ہوتی چلی گئی۔ ۴۰۴ء میں فاہیان اور ۶۳۰ء کی چینی سیاح ہیون سانگ مذکورہ بالا راستے ہی سے بنوں آیا تھا۔ بعد میں سلطان محمود غزنوی کے حملوں میں یہ شاہراہ زیرِ استعمال رہی، اور امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں اسی راہ سے بنوں اور گردونواح کے علاقے پر حملہ کیا۔ کوچی یا پاوندہ لوگ بھی پہلے تو اسی راہ سے آیا جایا کرتے تھے لیکن بعد میں وہ گومل اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے راستے کو ترجیح دینے لگے

ایڈورڈز نے جو بنوں میں وارد ہونے والا پہلا انگریز حاکم تھا، لکھا ہے کہ اکرہ کا قلعہ یونانی طرزِ تعمیر کا حامل ہے۔ اس نے اکرہ کی اہمیت کے پیشِ نظر انگریز محققوں کو اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اکرہ بہت کلیدی مقام پر واقع تھا، اس کے ایک طرف لورہ یا لاہورہ کا پہاڑی نالہ ہے جو گہری گھاٹی میں بہتا ہوا دریائے گومل میں گرتا ہے جبکہ ایک اور نالہ ٹیلے کی دوسری جانب بہتا ہے، ٹیلے پر قلعہ کے آثار ہیں۔ کچھ کمرے اور دیواروں کی بنیادیں نظر آتی ہیں، بارش ہوتی ہے تو تانبے اور چاندی کے سکے برآمد ہوتے ہیں، بھرت کے قصبے کا امتیاز یہ ہے کہ اس

کے اردگرد پکی فصیل ہے جب کہ بنوں کی فصیل بھی کچی ہے۔ ۱۸۷۲ء میں سکھوں کے دور میں لوگ یہ قدیم سکے بنوں کے بازاروں میں لاتے اور اونے پونے بیچ دیتے تھے لیکن پھر انگریزوں نے ان سکوں کو مختلف عجائب گھروں میں محفوظ کر لیا۔

اکرہ کے مغرب میں شاہ محمود ڈھیری ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ اسے سلطان محمود غزنوی نے آباد کیا تھا لیکن اس وقت بنوں کی قدیم تہذیب رُو بہ انحطاط تھی، بعد میں التمش کے دور میں یہ علاقہ بالکل غیر آباد ہو گیا، ہو سکتا ہے اس علاقے کی تباہی میں قدرتی اور جغرافیائی عوامل بھی کارفرما رہے ہوں، دریاؤں کا رُخ بدل گیا ہو یا وہ چشمے خشک ہو گئے ہوں جن کا پانی لوڑ اور دوسری ندیوں میں آتا اور سارے علاقے کو سیراب کرتا تھا۔

اس قدیم تہذیب کی بربادی کے متعلق سردار حزب اللہ خان لکھتے ہیں کہ

"مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک کافر اور ظالم حکمران یہاں رہا کرتا تھا۔ لوگ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے تھے، اس پہ اس وقت کا ایک مشہور مذہبی بزرگ اُسے سمجھانے آیا لیکن راجہ نے اس کی نصیحت پہ کان دھرنے کی بجائے اسے قتل کرا دیا اور اس کی لوٹیاں گنوں کے آگے ڈال دیں۔ اس ظلم و ستم کو دیکھ کر آسمان لرز گیا اور زمین کانپنے لگی، چنانچہ دفعتاً ایسا تباہ کن زلزلہ آیا کہ اکرہ کے سارے محل، قلعے، دربار اور ساری آبادی بھسم ہو کر رہ گئی۔"

نہیں کہا جا سکتا کہ ان کہانیوں میں کہاں تک صداقت ہے اور آیا اکرہ کی تباہی کا اصل سبب یہی تھا یا کچھ اور!

چند دوسرے آثارِ قدیمہ

ماہرین نے پتہ چلایا ہے کہ اس سارے علاقے میں تاریخی آثار ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں، انگریزوں کو چونکہ وزیروں اور محسودوں کے خوف سے ان علاقوں میں کام کرنے کا موقع نہ مل سکا اس لئے ان آثارِ قدیمہ کی اہمیت پہ تاریکی کا پردہ پڑا رہا۔ اب پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ نے اس طرف توجہ دی ہے تو بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

بنوں میران شاہ روڈ کے قریب عیدک کے گاؤں کے پاس حکیم خان غنڈئی سے پرانے مجسمے اور تاریخی اہمیت کی دوسری اشیاء ملی ہیں جن میں ٹوچی اور کیتو دریاؤں کی وادیوں کی تاریخی

قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔

میر علی کے قریب وادئ ٹوچی کے پتھروں پر باختری یونانی، شاردا اور عربی رسم الخط میں بعض کتبے ملے ہیں۔ مؤخرالذکر کتبہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کی رائے میں قدیم ترین اسلامی آثار ہے جو اس علاقے میں ملا۔ یہ کتبہ ایک تالاب پر نصب تھا جسے کسی مسلمان حکمران نے بنوایا۔ یہ کتبہ جمعہ، ۲ ستمبر ۸۵۷ء کو تالاب پر نصب کیا گیا۔ اس جگہ کے قریب عہد کوشان کے آثار بھی ملے ہیں۔ میر علی ٹل روڈ پر بنی سے ۱½ میل شمال مشرق میں واقع ایک مقام سے ایک خروشتی کتبہ بھی ملا ہے۔ اسی طرح سپین ڈام میں ایک قدیم قلعے کے آثار بھی پائے گئے ہیں۔

اسی طرح وادئ ٹوچی سے ایک قدیم کتبہ دستیاب ہوا ہے، جس میں ایک مکان کی تعمیر کا ذکر ہے اس کا رسم الخط کوفی ہے، یہ کتبہ ۲۴۸ ہجری میں تیار ہوا۔ مالکِ مکان کا نام ظاہر کرتا ہے کہ وہ مسلمان تھا تاہم نام سے عرب ظاہر نہیں ہوتا، گویا یہ اس امر کا ثبوت کہ اسلام کا رحمت آفرین پیغام اس وقت تک صوبہ سرحد میں پہنچ چکا تھا اور بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، یہ کتبہ عجائب گھر پشاور میں محفوظ ہے۔

پشاور کے عجائب گھر میں ۵۳ کے قریب تاریخی کتبے ہیں، ان میں سے سب سے پرانا کتبہ خروشتی زبان میں تحریر ہے، یہ رسم الخط چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانیوں نے یہاں رائج کیا، یہ خط فارسی اور عربی کی طرح دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ یہ کتبہ اس بات کا مظہر ہے کہ صوبہ سرحد عرصۂ دراز تک ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہ چکا ہے۔

کوہاٹ کوہاٹ کے آثارِ قدیمہ بھی ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں، مزید تحقیق و جستجو سے اس علاقے کی تاریخ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے، جو آثارِ قدیمہ اب تک ملے ہیں ان کے مطابق کوہاٹ سے چار میل مغرب کو غیر مسلم راجہ آدھ یا عاد کے قلعے کے آثار ہیں۔ عوام اسے عاد و ثمود کی پہاڑیاں بھی کہتے ہیں۔

ٹل ضلع کوہاٹ کے آس پاس ندی نالوں کے کناروں پر پرانے شہروں کے آثار پائے جاتے ہیں جو اس علاقے کی قدامت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

پشاور روئے زمین کے کسی پہاڑی درّے نے انسانی تاریخ کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا درۂ خیبر

نے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر درّہ خیبر نہ ہوتا تو برصغیر پاک و ہند کی تاریخ بالکل جداگانہ ہوتی، یہی وہ پہاڑی گزرگاہ ہے جہاں سے آریہ، یونانی، سفید ہن، غزنوی، غوری، تاتاری، خلجی، درانی، ابدالی، مغل اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں برصغیر پر حملہ آور ہوتیں اور اپنا تاریخی کردار بجالاتی رہیں۔ پشاور درّہ خیبر کے دہانے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہر دور میں تاریخی اہمیت اور عظمت کا حامل رہا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس شہر نے بے شمار سیاسی انقلاب دیکھے ہیں اور ہر آنے والی قوم کی تہذیب نے اس شہر اور اس علاقے کی تہذیب و ثقافت پر دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ پشاور شہر اور گردونواح میں آثارِ قدیمہ کی دولت ہر طرف بکھری ہوئی ہے اور مؤرخ کو ان پتھروں کی زبان سے بے شمار تاریخی داستانیں سننے کا موقع ملتا ہے۔

شاہ جی کی ڈھیری

شاہ جی کی ڈھیری بیحد پرانی تاریخی یادگار ہے جہاں سے کوشان عہد کے بودھ آثار دریافت ہوئے ہیں، یہ جگہ شہر کے جنوب مشرق میں ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر واقع ہے، ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر سپونر SPOONER نے یہاں کھدائی کا آغاز کیا اور وہ نادر تاریخی ڈبیہ برآمد کی جس میں مہاتما بدھ کی ہڈیاں (پھول) رکھ کر دفن کئے گئے تھے۔ دھات کی بنی ہوئی یہ ڈبیہ گولائی میں پانچ انچ اور اونچائی میں چار انچ ہے، اس کے سرپوش کے وسط میں نصف دائرے کی شکل میں دھات کی تین مورتیاں ہیں جب کہ عین وسط میں مہاتما بدھ کا مجسمہ ہے، یہ ڈبیہ ایک عظیم الشان عمارت میں رکھی گئی تھی جسے مہاراجہ کنشک کے حکم پر ایک یونانی ماہر تعمیر اگسی لیسز (AGISILASES) نے بنایا تھا۔ شاہ جی کی ڈھیری کے موجودہ ٹیلوں پر ایک عظیم بودھی سٹوپا اور "سنگھرام" تھا، یہ سنگھرام ایک تیرہ منزلہ عمارت تھی جو چار سو فٹ اونچی تھی۔ دنیا بھر سے بودھ یاتری اس کی زیارت کو آیا کرتے تھے اور اس کی بدولت صوبہ سرحد بودھوں کے نزدیک مقدس ترین مقام کا درجہ رکھتا تھا، ہیون سانگ اور دوسرے چینی سیاحوں نے بھی اس مقدس مقام کی زیارت کی۔ اگرچہ یہاں سے برآمد ہونے والی مہاتما بدھ کی مقدس ہڈیاں تو انگریزوں نے برہما کی بودھ حکومت کو تحفتہً دے دی تھی، جس نے مانڈلے کے ایک مشہور پیگوڈا میں انہیں احتراماً رکھا ہوا ہے تاہم اصل ڈبیہ

اب بھی پشاور کے عجائب گھر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پنج تیرتھ جی۔ٹی روڈ پشاور پر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے بڑے اڈے کی مشرقی جانب چند تالاب ہیں جنہیں پنج تیرتھ کے نام سے پکارا جاتا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں فاہیان اور ہیون سانگ کے کہنے کے مطابق صدیوں تک مہاتما بودھ کے "کاسۂ گدائی" کی پوجا کی جاتی رہی، دنیا کے کونے کونے سے بدھ مت کے پیروکار یہاں آتے اور اس بودھ یادگار کی زیارت کرتے" فاہیان" کا کہنا ہے کہ سفید ہن یا ہفتالی حکمران نے اپنی روایتی مذہب دشمنی کی بناء پر اس کاسۂ گدائی" کو یہاں سے ہٹانا چاہا لیکن یہ بدھ کی کرامت تھی کہ وہ اسے ہٹا نہ سکا۔ آخر عاجز آکر اس ہفتالی حکمران نے یہاں ایک مقدس پیگوڈا اور سنگھرام تعمیر کرایا۔ تو اس مقام کا احترام لوگوں کی نظر میں اور بھی بڑھ گیا جب فاہیان نے اس مقدس معبد کی زیارت کی تو سات سو پجاری یہاں رہا کرتے تھے اور دن رات مندر میں گھنٹیاں بجا کرتی تھیں، تاہم بعد میں ہیون سانگ کی آمد تک بودھ مت رُوبہ انحطاط ہو چکا تھا اور "کاسۂ گدائی" کی وہ اہمیت باقی نہ رہی تھی۔

پنج تیرتھ کا نام اسے اس بناء پر دیا گیا کہ یہاں تالاب تھے جو براہمنوں کے کہنے کے مطابق پانڈو کے پانچ بیٹوں کی یادگار تھے، یہ پانچوں شہزادے مہابھارت کی جنگ کے شہرت یافتہ ہیرو یا کردار تھے، یہاں پیپل کے بے شمار درخت بھی تھے، قیام پاکستان تک شہر کی ہندو آبادی صبح سویرے ان تالابوں میں اشنان کرنے کے بعد دن چڑھے تک اپنے طریقے کے مطابق پوجا پاٹ کیا کرتی تھی لیکن اب وہ حال نہیں رہا۔ اب اس کے قریب ہی یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک رفاہی ادارہ" دارالاطفال" قائم کر دیا گیا ہے جس کے ایک حصے میں بے سہارا عورتوں کے لئے" ڈھوبند دکور" کے نام سے ایک ادارہ بھی کام کر رہا ہے۔

بالاحصار شہر کے شمال مغرب میں قلعہ بالاحصار ہے جو کسی زمانہ میں پشاور کے مسلمان حاکموں کی رہائش اور دفتر کا کام دیتا تھا لیکن آج کل یہاں فرانٹیئر کور کا ہیڈ کوارٹر قائم ہے۔ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق یہ قلعہ بابر نے تعمیر کرایا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قلعہ پہلے سے موجود تھا۔ البتہ بابر کے حکم پر اس کی تعمیر نو کی گئی اور اسے مستحکم بنا دیا گیا۔ افغانستان

کا بادشاہ شاہ شجاع پشاور کو بہت پسند کیا کرتا تھا اس لئے اُس نے اسے اپنا سرمائی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا، الفنسٹن نے اسی قلعے میں شاہ سے ملاقات کی تھی، اس کا بیان ہے کہ قلعہ اس وقت بیحد خوبصورت اور مزین تھا، سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں قلعے کی تعمیرِ نو پہ توجہ دی، انگریزی دور میں یہاں فوجی بیرکیں بنا دی گئیں اور خطرناک سیاسی قیدیوں کو بھی یہیں نظر بند رکھا جاتا رہا۔ ۱۹۳۰ء کی جنگِ آزادی کے دوران کئی مشہور سیاسی رہنماؤں نے یہاں قید کے دن گزارے۔ قلعے میں ایک مسلمان بزرگ کی زیارت بھی ہے، اہلِ شہر کی کافی تعداد جمعرات کو زیارت پہ حاضری دیتی ہے

گورکھٹڑی پشاور شہر کے مشرقی حصے میں گھنٹہ گھر سے کوئی دو فرلانگ دُور گورکھٹڑی کی عمارت ہے جو آج کل پولیس ہیڈ کوارٹرز کے طور پہ استعمال کی جاتی ہے اور اس کے ایک حصے میں تحصیلدار پشاور کا دفتر بھی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ عمارت بڑی تقدیس اور اہمیت لئے ہوئے تھی، قدیم الایام میں عمارت کے نیچے سُرنگ نما کوٹھڑیاں تھیں جہاں ہندو جوگی چلّے کاٹتے اور نفس کشی کا سبق سیکھتے۔ کوٹھڑیوں تک پہنچنے کے راستے نہایت تنگ تھے اور جانے والے کو پیٹ کے بل رینگ کر وہاں جانا پڑتا تھا۔ شہنشاہ بابر نے اس جگہ کا معائنہ کیا اور شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کے عہد کی تحریروں میں بھی اسے جوگیوں کے گُرو گورکھ ناتھ سے منسوب کیا گیا، پشاور چھاؤنی سے وارسک کو جاتے ہوئے مچنی روڈ کے مشرق میں قدرتی چشمے ہیں جنہیں گورکھ ڈگی کہا جاتا ہے، عام روایت تھی کہ گُرو گورکھ ناتھ گورکھٹڑی سے غوطہ لگاتے تھے اور گورکھ ڈگی سے سر نکالتے تھے اور اسی طرح گورکھ ڈگی سے غوطہ لگاتے تو گورکھٹڑی پہنچ جاتے۔

شاہ جہان بادشاہ کی بیٹی شہزادی جہاں آراء نے یہاں مسافروں کے لئے ایک سرائے بنوا دی تھی، اس لئے اسے "سرائے جہاں آراء" کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا۔ سکھوں کے زمانے میں اطالوی نژاد گورنر جنرل ایوٹیبل (بزبان پشاوری ابوطویلہ) یہیں رہا کرتا تھا۔

پشکال وتی پشکال وتی جو ایک عرصے تک گندھارا (صوبہ سرحد) کا صدر مقام اور دارالحکومت رہا۔ موجودہ چارسدہ اور پشاور کے پاس واقع تھا، جہاں ہشنغر گنگناتی ندیاں اور لہریں مارتی ہوئی نہروں سے سیراب ہونے والا انتہائی زرخیز خطہ زمین ہے وہیں اس کی تاریخی

اور تہذیبی قدامت اور اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پشکال وتی کا قدیم شہر ایتھنز کے یونانی شہر کی طرح بڑی عمدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ شہر کے باہر بودھوں کے مشہور معبد تھے، یہ وہی مقام ہے جسے سکندرِ اعظم کی فوجوں نے بیس بائیس دن کے طویل محاصرے کے بعد فتح کیا، اس وقت اس پر ہستی یا استیز نامی راجہ کی حکومت تھی، شہر چین کو جانے والی شاہراہ پر ایک اہم تجارتی منڈی تھا۔ کابل سے ہندوستان کو جانے والی سڑک بھی ان دنوں یہیں سے ہو کر گزرتی تھی۔

پشکال وتی یا چارسدہ میں بھی "بالاحصار" واقع ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ اب بھی یہاں ایک مضبوط قلعے کے آثار پائے جاتے ہیں۔

یہاں کے چار مشہور سٹوپاؤں کا ذکر مہاراجہ اشوک کے زمانے کی کتابوں میں موجود ہے۔ اشوک نے پشکال وتی کو ایک خوبصورت شہر بنانے پر بڑی توجہ دی ہے، ایک سٹوپا خاص طور پر مشہور تھا، یہ اس واقع کی یاد میں بنایا گیا تھا جب مہاتما بدھ نے اپنے کسی جنم میں کسی محتاج کو آنکھوں کا عطیہ دیا تھا۔ اس لئے اسے نین دان سٹوپا (EYE GIFT STUPA) کہا جاتا تھا۔

شہرناپرسان تحصیل چارسدہ کے موضع رجڑ سے ایک میل کے فاصلے پر بودھوں کی ایک قدیم بستی کا پتہ چلا ہے جسے میر زیارت یا "شہرناپرساں" بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ جگہ بڑی متبرک تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کے گورو گورکھ ناتھ یہاں اپنے چیلوں کے ساتھ چلے کاٹا کرتے تھے، پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندوؤں کا میلہ منعقد ہوا کرتا تھا، اس کے نواح سے کنشک اور یونانی بادشاہوں کے عہد کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں۔

پلاٹو ڈھیری میر زیارت سے پون میل مشرق میں ڈھو اور ٹیلے ہیں جنہیں لوگ پلاٹو ڈھیری اور غرڈھیری کہتے ہیں، ہیون سانگ نے جن دو عظیم بدھ سٹوپاؤں کا ذکر کیا ہے۔ اغلباً یہ ٹیلے اُنہی سٹوپاؤں کے گرنے سے بنے ہیں، بدھ مت کے عروج کے دنوں میں یہ مقام انتہائی ترقی پر تھا۔ خیال ہے کہ یہ پہلی صدی عیسوی میں آباد ہوا تھا لیکن بعد میں کسی بلائے ناگہانی کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گیا۔ یہاں سے مہاتما بدھ کے مجسموں کے علاوہ

ہندوؤں کی کالی دیوی کی مورتی بھی برآمد ہوئی تھی۔

پلاٹو ڈھیری کے بائیں جانب غرڈھیری کا مقام ہے، یہ جگہ موضع خان ماہی کے بالکل پاس ہے، اندازہ ہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں بادشاہ ساکرا نے ایک بودھ سٹوپا تعمیر کرایا تھا یہاں سے پتھر کا ایک ڈبہ بھی ملا ہے جس میں کچھ ہڈیاں اور تھوڑا سا سونا رکھا ہوا تھا، یہ ڈبہ یونان کے ان ڈبوں سے ملتا جلتا تھا جس میں یونان کے مُردوں کی ہڈیاں رکھ کر دفن کیا کرتے تھے۔

اس ٹیلے کے شمال مشرقی کونے سے مہاتما بُدھ کا ایک مجسمہ بھی نکلا تھا، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سارے بودھ آثارِ قدیمہ ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے برآمد ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری ڈھیریاں کسی دَور میں ایک ہی بڑے شہر کے حصّے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پشکال وتی کا یہ عظیم شہر اپنے دورِ عروج میں کتنی عظمت کا مالک ہوگا۔

ہریتی سٹوپا تحصیل چارسدہ ہی کے موضع عمرزئی سے کوئی آدھ میل شمال میں ساٹھ فٹ اُونچا ایک ٹیلہ ہے جس کی لمبائی اندازاً چھ سو فٹ اور چوڑائی چار سو فٹ ہے، مقامی لوگ اسے "بی بی سیدہ کی زیارت" خیال کرتے ہیں، تاہم تاریخی لحاظ سے ہیون سانگ کے بیان کے مطابق یہ وہی جگہ ہے جہاں مہاتما بُدھ نے جنوں کی رانی ہریتی کو راہِ راست پر لاکر اپنا مُرید بنایا تھا، ہریتی خبیث رُوحوں کی مدد سے لوگوں کے بچوں کو ہلاک کر دیا کرتی تھی لیکن جب مہاتما بدھ کے ہاتھ پر تائب ہوئی تو اسے ہریتی دیوی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ سادہ لوح عورتیں اس جگہ نذر نیاز دیتی ہیں تاکہ اُن کے بچے چیچک، خسرہ اور دوسری موذی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ بعض خواتین اس جگہ کی مٹی لے کر بچوں کے جسم پر ملتی ہیں یا ان کے منہ میں ڈالتی ہیں، اُن کے خیال کے مطابق ایسا کرنے سے بچے اُمّ الصبیان اور دوسری بیماریوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

ماماں ئے ڈھیری موضع شیرپاؤ تحصیل چارسدہ کے قریب ایک اور اُونچا ٹیلہ ہے جس پر چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا قریہ ماماں ئے ڈھیری کے نام سے موسوم ہے، اس جگہ سے گندھارا آرٹ کے نادر نمونوں کے علاوہ مہاتما بدھ کا ایک

ایسا مجسمہ بھی برآمد ہوا ہے جسے کمال چابک دستی سے بنایا گیا تھا۔ یہ شہر دوسری صدی عیسوی کے آخر یا تیسری صدی کی ابتداء میں آباد ہوا تھا۔

ضلع مردان آج سے چھیالیس برس پہلے تک مردان ضلع پشاور ہی کی ایک تحصیل تھا۔ لیکن دریائے سوات کی نہروں کی بدولت اس کی آبادی اور شادابی میں بیحد اضافہ ہوا اور اسے ایک علیحدہ ضلع قرار دے دیا گیا۔ یہ علاقہ صدیوں سے یوسف زئی قبیلے کا مسکن رہا ہے جو ایک انتہائی مہذب و متمدن قبیلہ ہے، طلوعِ اسلام سے قبل بھی اپنی زرخیزی کی بدولت یہ علاقہ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ سارے ضلع میں جگہ جگہ تاریخی آثار پائے جاتے ہیں جن کے مطالعہ سے اس علاقے کی تاریخ کے کئی چھپے ہوئے گوشوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسی ضلع میں ہنڈ اور لاہور کے قدیم قصبے ہیں تو اسی میں تخت بھائی، شہباز گڑھ اور جمال گڑھی جیسے آثارِ قدیمہ کے مخزن بھی واقع ہیں۔

تخت بھائی ہوتی مردان سے نو میل دُور مردان، مالاکنڈ روڈ پر ایک پہاڑی پر، جو سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ بلند ہے، قدیم زمانہ کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ پہاڑ کی عین چوٹی پر بودھوں کی ایک خانقاہ، عبادت گاہ اور درس گاہ کے آثار پائے جاتے ہیں، یہ امر حیرت انگیز ہے کہ چینی سیاحوں نے اس اہم تاریخی مقام کا کوئی ذکر اپنے سفرنامہ میں نہیں کیا، البتہ یہاں سے ملنے والے ایک خروشتی کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر انڈو پارتھین (یا پہلوی) بادشاہ گنڈوفریز کے تخت تھا جو ۴۶ء تک وہاں حکومت کرتا تھا۔ تاہم اس مقام کی اہمیت کا بڑا سبب یہاں سے ملنے والے آثارِ قدیمہ ہیں، پشاور کے عجائب گھر میں آج کل جتنے مجسمے مہاتما بدھ کے رکھے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر تخت بھائی ہی سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بدھ مت ان علاقوں میں پورے عروج پہ تھا۔

شہباز گڑھ مردان سے آٹھ میل مشرق کو صوابی جانے والی شاہراہ پر شہباز گڑھ کا قصبہ ہے شہنشاہ بابر نے توزک بابری میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قصبے نے موجودہ نام شہباز قلندر نامی ایک بزرگ سے پایا ہے جو بابر کی آمد سے تیس برس پہلے فوت

ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں اس کا قدیم نام ورشاہ پورہ لکھا گیا ہے۔

اس مقام کی شہرت کا بڑا سبب مہاراجہ اشوک کے عہد کی وہ چٹانیں ہیں جن پر اُس نے اپنے مذہبی اصول کندہ کرائے تھے، ساتویں صدی عیسوی تک یہ مقام بڑی اہمیت کا حامل تھا، ہیون سانگ نے اسے ایک بہت بڑا شہر لکھا ہے' بعد میں چینی سیاح سونگ یون نے بھی اس کا تفصیلی ذکر ہے' ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ شہباز گڑھ صوبہ سرحد کے اُن چار بڑے بڑے شہروں میں شمار ہوتا تھا جو اہم شاہراہوں کے کنارے واقع تھے۔ ان دنوں شہر کے کئی دروازے تھے، شمالی دروازے کے باہر (جہاں آج کل چنا کا ڈھیری آباد ہے)۔ بہت بڑا قدیم مندر تھا جس میں وہ قیمتی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے تھے، شہر کے مشرقی دروازہ کے باہر مہاراجہ اشوک کا تعمیر کردہ سٹوپا اور سنگھرام تھا۔

چانک ڈھیری۔ صوابی سڑک پر مزار اخوند پایا کے پاس "بت سری" اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ تعمیرات بدھوں کے دورِ عروج کی یادگار ہیں۔

جاپانی ماہرین آثارِ قدیمہ کی ایک جماعت ۱۹۵۹ء میں صوبہ سرحد آئی تھی اور اُس نے مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کی تحریروں کی روشنی میں آثارِ قدیمہ کی تلاش شروع کی تھی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں ان ماہرین نے جس معبد کا یہاں پتہ چلایا، وہ یقیناً وہی جگہ ہے جہاں مہاتما بدھ نے ایک فاقہ زدہ سوالی کو ایک سفید ہاتھی عطا کیا تھا، یہ سفید ہاتھی جہاں بھی پہنچتا بارش شروع ہو جاتی اور قحط سالی کا خاتمہ ہو جاتا۔ شاید اسی واقع کے زیرِ اثر بدھ مت کے پیروکار سفید ہاتھی کی بڑی عزت و تکریم کرتے ہیں۔

اسوٹہ یہ قدیم قصبہ مردان صوابی روڈ پر شہباز گڑھ سے کوئی بارہ میل شمال مشرق کو واقع ہے۔ یہاں سے ایک ذیلی سڑک شیوہ کو بھی نکلتی ہے، اس جگہ پتھروں کی بنی ہوئی ایک قدیم عمارت کے آثار ملے ہیں۔ عمارت گول ہے اور اس کا محیط پچاس فٹ کے قریب ہے' اس کے جنوب مشرق میں ایک خالی جگہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہی اس عمارت کا دروازہ ہوگا۔ یہاں پر تیس کے قریب بڑے بڑے پتھر ہیں۔ مقامی روایت کے مطابق تیس عورتوں کا ایک گروہ کہیں جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اُن

پر حملہ کر دیا، انتہائی بے بسی کے عالم میں اُن عورتوں نے دعا کی کہ ہماری عصمت محفوظ رہے یا ڈاکوؤں کے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ہمیں موت آجائے۔ دعا قبول ہوئی اور وہ عورتیں جہاں جہاں کھڑی تھیں وہیں پتھر کے بُت بن کر رہ گئیں۔

اس روایت کے برعکس محققین کا کہنا ہے کہ پتھر کی یہ عمارت ایک قدیم عبادت گاہ تھی جہاں سورج دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی، اُن کے خیال میں یہ مندر مشہور حکمران ساریوش کے زمانے میں آباد تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب زردشتی مذہب ابھی ایران میں پھیلے نہیں پایا تھا ان تیس الگ الگ پڑے ہوئے پتھروں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ مندر کو جانے والے تیس راستوں پر واقع تھے اور مہینے کے دنوں کی مناسبت سے یہ تیس کی تعداد میں اس لئے تھے کہ پجاری ہر روز نئے دروازے سے مندر میں داخل ہوتے تھے مثلاً پہلی تاریخ کو پہلے دروازے سے، دوسری تاریخ کو دوسرے دروازے سے، علیٰ ہذا القیاس۔

ساری بہلول تخت بہائی کے قدیم قصبہ سے دو ڈھائی میل جنوب مغرب کو ساری بہلول کا گاؤں ایک اُونچے ٹیلے پر واقع ہے یہاں سے انڈو ستھین اور کوشان راجوں کے عہد کے بہت سے قدیم سکے برآمد ہوئے ہیں اور بہت سے بُت بھی نکلے ہیں۔ ڈاکٹر سپونر اور سر ارل سٹین کے کہنے کے مطابق ساری بہلول صوبہ سرحد میں گندھارا آرٹ کا بہت بڑا خزینہ ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقام بیحد آباد تھا لیکن بعد میں آتش زدگی کی نذر ہو گیا۔ تاہم خیال ہے کہ یہ آگ اتفاقاً لگی تھی اور ارادتاً کسی نے اسے نذرِ آتش نہیں کیا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سے برآمد ہونے والے مجسمے صحیح سالم حالت میں ملے ہیں۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بہت سے بودھ سٹوپا اور سنگھرام موجود تھے۔ اس مقام کے قدیم نام کا پتہ نہیں چلتا تاہم ہو سکتا ہے کہ بعد میں کسی مسلمان حکمران کے نام پر اس کا نام شہرِ بہلول یا سرائے بہلول مشہور ہو گیا ہو۔ یہاں سے برآمد ہونے والے مجسمے اور نوادرات پشاور کے عجائب خانہ کی زینت بڑھا رہے ہیں۔

جمال گڑھی مردان سے آٹھ میل شمال کو کاٹلنگ جانے والی سڑک پر پجا کی پہاڑی پر جمال گڑھی کا قدیم مقام ہے، یہ جگہ پہاڑ کی عین چوٹی پر ہے اور یہاں

سے سارے علاقے کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ جمال گڑھی کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ یہ مقام مردان، تخت بھائی اور شہباز گڑھ سے قریباً برابر فاصلے پر آباد ہے، پھر جس طرح تخت بھائی سے میل ڈیڑھ میل ہٹ کر ساری مہلول کے کھنڈرات ہیں، اسی طرح جمال گڑھی سے میل ڈیڑھ میل دور ایک اور قدیمی بستی ساول ڈھیر واقع ہے، جمال گڑھی میں درمیان میں ایک بہت بڑے سٹوپا کے آثار ہیں جس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی عبادت گاہیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، ان مندروں کی وجہ سے جمال گڑھی یقیناً بودھوں کے نزدیک بڑی متبرک جگہ ہوگی تاہم یہ امر حیران کن ہے کہ چین سے آنے والے بدھ سیاحوں کے ہاں اس مقام کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

یہاں سے برآمد ہونے والے ایک خروشتی کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مقام ۲۷۵ء کے لگ بھگ خاصا آباد تھا لیکن مرورِ ایام سے اس کی ساری تاریخی عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہوکر رہ گئیں۔

ساول ڈھیر جمال گڑھی سے ڈیڑھ دو میل جنوب مغرب کو ساول ڈھیر کا قریہ ہے، موجودہ بستی بالکل اُسی جگہ واقع ہے جہاں قدیم شہر آباد تھا، گاؤں کی مسجد بالکل انہی بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہے جہاں ہزاروں سال پہلے ایک بودھ سٹوپا بنا ہوا تھا۔ زمین کھودتے وقت مقامی باشندوں کو یہاں سے گندھارا آرٹ کے نادر نمونے ہاتھ آتے ہیں، لاہور میں عجائب گھر میں بہت سے مجسمے ایسے ہیں جو ساول ڈھیر سے برآمد ہوئے تھے اگرچہ چینی سیاحوں کے سفرناموں میں اس مقام کا ذکر نہیں ملتا تاہم گندھارا سے متعلق تحقیق کرنے والے فرانسیسی ماہر آثارِ قدیمہ الفریڈ فوشے کا خیال ہے کہ ہیون سانگ شہباز گڑھ سے اُڈیانا (موجودہ ریاست سوات) جاتے ہوئے ضرور اس مقام سے گزرا ہوگا۔ سفرنامے میں اس جگہ کے متعلق کچھ نہ لکھنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس وقت تک یہاں کی بودھ خانقاہیں اُجڑ چکی ہوں یا یہ کہ ان مقامات میں بودھ آثار اس کثرت سے ہیں کہ سیاح نے اس کی تفصیل دینے کی چنداں ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں یہ مقامات خاصے آباد تھے اور ان کا شمار بودھ تہذیب کے گہواروں میں ہوتا تھا۔

ہنڈ ہنڈ ضلع مردان کا ایک نہایت ہی قدیم اور اہم قصبہ ہے، ہیون سانگ نے اسے "اوداکھانڈ" لکھا ہے۔ البوریحان البیرونی، رشید الدین، ابوالفداء اور دوسرے نامور مؤرخوں نے گندھارا کے جس صدر مقام کا ذکر کیا ہے وہ یہی "ہنڈ" یا "وہیہنڈ" ہے، مؤسیو مارٹن نے اسے "اوہنڈ" قرار دیا ہے، طبقات اکبری" کے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں سلطان محمود غزنوی نے ہندو راجہ جے پال کا محاصرہ کیا تھا مسعودی نے اسے ہندو شاہیہ حکمرانوں کا دارالحکومت قرار دیا ہے، ان مؤرخوں کے بیان سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچتی ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی تک ہنڈ ایک مشہور مقام تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ اس کی رونق کم ہوتی گئی اور آج یہ ایک معمولی قصبے سے زیادہ کچھ نہیں۔

ہنڈ کی اہمیت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہ اُس شاہراہ پر واقع تھا جو کابل سے جلال آباد اور لال پورہ ہوتی ہوئی دریائے کابل کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو جاتی تھی، ہنڈ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع تھا اور دریائے سندھ کو پار کرنے سے پہلے قافلے کو یہاں رُکنا پڑتا تھا، اس وقت اٹک کا راستہ استعمال نہیں ہوتا تھا اسی لئے ہنڈ "باب ہند" یا در ہند تھا۔ بعد ازاں جب مغل حکمرانوں نے اٹک کے مقام پر قلعہ تعمیر کرایا تو اس قدیم شاہراہ کی بجائے پشاور، نوشہرہ، اکوڑہ اور خیر آباد کی سڑک آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ یہ سڑک (موجودہ جی ٹی روڈ) دریائے کابل کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی اٹک پہنچتی ہے۔ اس سڑک کے چالو ہونے سے ہنڈ گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔

اس شہر کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ اسے سکندر اعظم یونانی نے تعمیر کرایا تھا، اگر یہ بات نہ بھی ہو تو بھی اس تاریخی حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے قبل یونانی فوجیں کافی عرصہ تک یہاں مقیم رہیں، اس عرصۂ قیام میں فوج کے انجینئر دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل بنانے میں مصروف رہے جبکہ سکندر اعظم باجوڑ، بونیر اور کوہستان کے سرکش حکمرانوں کی سرکوبی میں لگا رہا۔ موجودہ قصبہ فصیل کے اندر واقع ہے، فصیل کافی شکستہ ہے تاہم یہ فصیل اسی قلعہ کا ایک حصہ ہے جو سکندر اعظم کی آمد کے وقت یہاں موجود تھا۔ ہنڈ سے بہت سے سکے انڈو ستھین اور یونانی حکمرانوں کے ملے ہیں۔

دو کتبے بھی برآمد ہوئے ہیں، ان آثار کے مطالعہ سے برہمنی خاندان اور کشانی خاندان کے حکمرانوں کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

لاہور ہنڈ کے تاریخی قصبے کے پاس ہی لاہور نام کی قدیم تاریخی بستی ہے، یہ وہی مقام ہے جہاں سے صوبہ سرحد میں مہاراجا اشوک نے بدھ مت کی تبلیغی مہم کا آغاز کیا تھا اور پہلا سرحدی باشندہ جس نے بدھ مت قبول کیا۔ یہیں کا رہنے والا تھا۔ اس واقع کی یاد میں اشوک نے یہاں ایک بہت بڑا بودھ معبد، پیگوڈا، تعمیر کرایا تھا جس کے کھنڈرات اب بھی یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سنسکرت کا مشہور عالم پانینی جس نے اس زبان کی صرف و نحو تصنیف کی، اسی لاہور کا رہنے والا تھا، ہیون سانگ نے بھی اپنے سفرنامے میں لاہور کا ذکر کیا ہے، ہندو شاہیہ حکمرانوں کے دور میں بھی یہ شہر خاصی اہمیت کا حامل تھا، سلطان محمود نے اسی جگہ ہندو راجہ جے پال کو گرفتار کیا تھا۔

عرب مؤرخوں نے بھی اس مقام کو "الاہوار" کے نام سے یاد کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ مہلب بن ابی صفرہ کی قیادت میں پہلا اسلامی لشکر "لاہور" اور بُنہ تک پہنچا تھا۔ جس لاہور کا ذکر عربوں نے کیا ہے یقیناً وہ یہی قصبہ تھا، اللہ بخش یوسفی کے بیان کے مطابق بُنہ سے مُراد بنوں نہیں بلکہ لاہور ہی کے نواح میں واقع مقام بُنہ ڈھیری تھا۔ گویا لاہور کا شہر ۳۵۰ ق۔م سے خاصی شہرت کا مالک چلا آیا ہے۔

کشمیر سمٹس حال ہی میں پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ نے حجری دَور یا پتھر کے زمانے کے آثار دریافت کرنے کے لئے جو ٹیم بھیجی، اس نے "کشمیر سمٹس" پر خاصی توجہ دی، یہ بیحد قدیم غار ہے جو دور تک پہاڑوں کے اندر واقع ہے، مقامی باشندوں کا خیال ہے کہ یہ غار قدیم زمانہ کے راجوں نے بنوائے تھے اور وہ ان سے ہو کر اندر ہی اندر کشمیر تک جا پہنچتے تھے، اسی لئے غار کا نام "کشمیر سمٹس" پڑ گیا۔ یہ غار صوابی تحصیل کے علاقے رستم سدوم میں کاٹلنگ سے شمال مشرق میں واقع ہیں، غار کی بلندی سطح سمندر سے ۶۷۸۰ فٹ ہے۔

یہ غار بہت اُونچی بھی ہے اور فراخ بھی، یہ دو تین موڑوں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے غار میں داخل ہوں تو باہر سے آنے والی روشنی مددگار ثابت ہوتی ہے لیکن بعد ازاں سخت

اندھیرا چھا جاتا ہے۔ غار کی دیواروں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے ڈھیر لگے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہندو جوگی اور پنڈت یہاں چلّہ کاٹا کرتے تھے۔ لالٹین یا شمع کی روشنی میں آگے بڑھا جائے تو کئی سیڑھیاں ملتی ہیں جن کے گرد جنگلہ بنا ہوا ہے۔ تیسرا موڑ مڑنے کے بعد انسان ایک وسیع تر اور کھلی جگہ پہنچتا ہے جہاں ایک تالاب سولہ فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور دس فٹ گہرا واقع ہے، تالاب کی ایک جانب سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں تاکہ پانی تک پہنچنے میں آسانی ہو، ظاہر ہے کہ یہ جگہ ہندو جوگیوں کے اشنان کے لئے بنی ہوگی اور ان دنوں اس میں کسی قدرتی چشمے سے پانی آتا ہوگا تاہم آج کل تالاب خشک ہے اور شکست و ریخت کا شکار ہو چکا ہے۔

تالاب کے بعد غار میں چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ سیڑھیوں کے ذریعے اُوپر کو جائیں تو ایک بڑا ہال سامنے آتا ہے جس کی چھت میں روشن دان اس طرح بنا ہے کہ روشنی چھن چھن کر ہال کے فرش اور در و دیوار پر پڑتی ہے۔ ہال کے عین وسط میں ایک مربع چبوترہ ہے ہو سکتا ہے قدیم ایّام میں یہاں کوئی مورتی رکھی رہتی ہوگی، جسکے چہرے پہ عین اُوپر سے روشنی پڑتی ہو تو اس کا رعب و جلال پجاریوں پہ اور بھی زیادہ اثر انداز ہوتا ہو، ایک چھوٹا غار ہال سے نکل کر ایک کمرے میں پہنچتا ہے، اس کمرے سے پھر ایک سُرنگ شروع ہوتی ہے جو اتنی تنگ ہے کہ صرف رینگتے ہوئے بمشکل تمام بیک وقت صرف ایک آدمی آگے بڑھ سکتا ہے، یہی وہ غار ہے جس کے متعلق مشہور تھا کہ ہندو راجوں نے جنّوں بھوتوں کی مدد سے تیار کرایا تھا تاکہ کسی بھی متوقع خطرے کے وقت یہاں سے کشمیر پہنچ جائیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندو راجے اس غار میں اپنا خزانہ اور اسلحہ رکھا کرتے تھے۔

غار کے اندر ہر جگہ تک رسائی مشکل کام ہے۔ غار اتنا بڑا اور پیچیدہ ہے کہ بعض اوقات یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ غار کی تعمیر انسانی کام نہیں بلکہ پہاڑ میں زلزلے وغیرہ کی وجہ سے قدرتی شگاف واقع ہو جانے سے خود بخود غار کی سی شکل بن گئی ہے، بہر نوع دُنیا کے ہنگاموں اور شور و شغب سے دور یہ تنہا اور خاموش جگہ چلّہ کاٹنے والے راہبوں اور جوگیوں کے لئے ایک مثالی جگہ ہے اور یہاں پہنچ کر انسان اپنے آپ کو دُنیا سے الگ تھلگ اور دُنیا پرستوں سے

بالاتر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ضلع سوات سوات یا قدیم دور کا "اُڈیانہ" نہ صرف اپنے قدرتی نظاروں اور صحت بخش آب ہوا کے لئے دُنیا بھر میں مشہور ہے بلکہ اپنی زرخیزی اور جنگی اہمیت کے پیش نظر بہت سے سیاسی حملوں کا نشانہ اور فوجی کارروائیوں کی جولان گاہ بھی رہا ہے۔ سکندرِ اعظم کی آمد کے بعد سوات کے تاریخی مقامات سے تاریکی کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مساگا، بازیرہ، ارنوس کے مقامات جہاں سکندر اعظم کو اپنی زندگی کی مشکل ترین جنگیں لڑنی پڑیں، سرزمین سوات ہی میں واقع تھے۔ حال ہی میں اطالوی ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے سوات سے بہت سے تاریخی نوادرات برآمد کئے ہیں۔ خود سیدو شریف میں ایک عجائب خانہ بھی قائم کر دیا گیا ہے، اس طرح اس خطے کی قدیم تاریخ منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

"مساگا" مساگا جس کے متعلق محققوں کا خیال ہے کہ یہ درہ کٹ گلا کے نواح میں تالاش اور ادین زئی کی وادیوں کے مابین واقع تھا، وہ قدیم شہر تھا جہاں سکندرِ اعظم کو مقامی باشندوں سے خونریز لڑائی لڑنی پڑی۔ اس لڑائی میں "مساگا" کے حکمران کی مدد قریبی ریاستوں اورآسا اور امبھی سارا کے حکمرانوں نے بھی کی اور سکندرِ اعظم خود اس جنگ میں زخمی ہوا۔

بازیرہ (بری کوٹ) مساگا کی فتح کے بعد سکندرِ اعظم نے "بازیرہ" پر لشکر کشی کی، بازیرہ کا محل وقوع فوجی نقطہ نظر سے بہت اہم تھا اس لئے یونانیوں کو یہاں بڑی جانی قربانی دینی پڑی، بری کوٹ سے ہندو راجوں کے زمانے کے آثار بھی ملے ہیں جس سے اس مقام کی تاریخی قدامت کا ثبوت ملتا ہے۔

نوگرام "نوگرام"، ضلع سوات کی طوطالی تحصیل سے چار میل مغرب کو واقع ہے۔ "گرام" ہندی میں گاؤں کو کہتے ہیں، چنانچہ اس گاؤں کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق قدیم ہندو تمدن سے رہا ہے۔

یہاں پہ ایک بُرج یا مینار چالیس فٹ اُونچا ہے مقامی لوگوں کی روایت ہے کہ یہاں کی ہندو رانی اس بُرج پہ بیٹھ کر گردونواح کا نظارہ کیا کرتی تھی، اس عمارت پہ دربار یا دیوانِ عام ہونے کا بھی گمان ہوتا ہے اس کی دیواریں دس دس فٹ موٹی ہیں۔ اور یہاں سے بہت سے بُت

نکلے ہیں جو بدھ دور سے بھی پہلے کے بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ کمرہ جسے عدالت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، کافی اونچا ہے اور وہاں چار سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ شمال کے رُخ ایک پہاڑی سُرنگ ہے جو رانی گھاٹ تک جاتی ہے۔ دور دور تک آثار قدیمہ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ آثار جُدا جُدا حکمرانوں کے معلوم ہوتے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ کئی خاندانوں نے یہاں یکے بعد دیگرے دادِ حکومت دی، جو سکّے ملے ہیں اُن پہ ایک طرف بُت اور دوسری طرف بَیل کی تصویر ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ گپتا یا کوشان راجوں کے سکّے ہیں۔ نوگرام سے کچھ دُور ایک تالاب "رام کُنڈ" ہے جسے ہندو رام چندر جی کی نسبت سے بہت مقدس سمجھتے تھے اور پاکستان بننے سے پہلے وہاں ہندوؤں کا میلہ بھی لگا کرتا تھا۔ قریبی پہاڑی چوٹی اِلم کے اوپر ایک مقام "رام تخت" ہے، سکندر اعظم سے شکست کھانے کے بعد نوگرام کے ہندو راجوں کا زور ٹوٹ گیا۔

ہوڈی گرام ہوڈی گرام کا قدیم قصبہ راجہ ہوڈی کے نام پر آباد ہوا تھا۔ یہ حکمران راجہ بھیٹی کا بیٹا تھا جس کی سلطنت سوات سے اٹک تک پھیلی ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ راجہ ۲۰۰ء کے لگ بھگ ان علاقوں پہ دادِ حکومت دیتا رہا۔ بھیٹی کے بعد راجہ ہوڈی تخت نشین ہوا۔ اس نے اٹک کی پہاڑیوں میں خیرآباد کے پاس اپنے محل بنوائے۔ اس کی حکومت مضبوط تھی تاہم اس کی نواحی ریاست کے حکمران راجہ رسالو سے ٹھن گئی، دونوں راجوں کے مابین بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر راجہ ہوڈی اپنے حریف راجہ رسالو کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی سلطنت ختم ہو کر رہ گئی۔ ہوڈی گرام کوشان راجہ واسو کا صدر مقام بھی رہا ہے۔

رانی گھاٹ "تاریخ سوات" کے مؤلف کا کہنا ہے کہ خدوخیل کے علاقہ میں رانی گھاٹ کا مقام کسی زمانہ میں راجہ رام کی راجدھانی تھا۔ نوگرام کے مغرب میں "رام کنڈ" نام کا تالاب اسی راجہ نے بنوایا تھا، ہندو اسے بیحد مقدس جانتے تھے۔ مہابن کے اسی پہاڑی سلسلے میں ایک اور تالاب "سنیا کُنڈ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

گیرا کا قلعہ سرزمین سوات کا آخری غیر مسلم حکمران راجہ گیرا تھا جس کا صدر مقام ہوڈی گرام کے مشرق میں بالوزئی کے علاقے کا ایک مقام تھا۔ اس پہاڑی کو جس پہ گیرا

کا مشہور قلعہ واقع تھا۔ "گیرا کی پہاڑی" کہا جاتا ہے، سلطان محمود غزنوی کے مشہور سپہ سالار خوشاب بابا یا خوشاب غازی نے مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر اس مغرور راجہ کا مقابلہ کیا۔ راجہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا اور سرزمینِ سوات پہ اسلامی جھنڈا لہرانے لگا۔

ضلع ہزارہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں پھیلا ہوا وسیع علاقہ ہزارہ کے نام سے موسوم ہے، جو پہلے محض ایک ضلع تھا لیکن اب اس کی وسعت کے پیشِ نظر اسے ڈویژن کا درجہ دے دیا گیا ہے اور کوہستان، ایبٹ آباد اور مانسہرہ میں ضلعی دفاتر قائم کر دیئے گئے ہیں۔

ضلع ہزارہ دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات کشمیر اور پنجاب سے وابستہ رہا ہے، سکندرِ اعظم کے حملے کے وقت اس علاقے کا نام ابھیسارا تھا اور اُس میں ہزارہ کے علاوہ کشمیر، راجوری اور بھمبھر تک کے علاقے شامل تھے۔ ابھیسارا کے کافر راجہ نے سوات (اسساگا) کے راجے کی مدد کے لئے اپنی فوجیں بھیجی تھیں۔ انگریزوں کی آمد تک ضلع ہزارہ نظم ونسق کے اعتبار سے کشمیر ہی سے وابستہ تھا، بعد میں جب ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ نے سکھ دربار سے کشمیر خرید لیا تو اہلِ ہزارہ سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، تنگ آکر ڈوگرہ حکمران نے ضلع ہزارہ انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اس کے بدلے میں انگریزوں سے جموں کا ضلع خود سنبھال لیا۔

مانسہرہ کے کتبے اشوک کے زمانے میں گندھارا کی طرح پکھلی (ہزارہ) میں بھی بدھ مت اپنے پورے عروج پہ تھا، اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ اشوک نے ہزارہ اور کشمیر میں بودھ مبلغ بھیجے، شہباز گڑھ (مردان) سے وہ چٹانیں ملی ہیں جن پر اشوک نے اپنے مذہبی اصول کندہ کرائے تھے، بالکل ویسی ہی چٹانیں، مانسہرہ کے نواح سے بھی برآمد ہوئی ہیں۔ ان کتبوں سے اشوک کی حکمتِ عملی کی وضاحت ہوتی ہے، وہ امن و آشتی کا علم بردار تھا وہ اپنی رعایا کو نرمی سے اپنے مذہب کی طرف بُلاتا تھا، خود مذہب اس کے نزدیک محض چند عقیدوں کا نام نہ تھا بلکہ اخلاقی قوانین کی پابندی کا نام تھا۔

ہیون سانگ نے ہزارہ کو سلطنت وُلاشی کا نام دیا ہے۔ ولاشی کا صدر مقام اس وقت

مانگلی تھا جو مانگل نام کی ندی پر ایبٹ آباد مانسہرہ روڈ کے کنارے واقع ہے، یہ شہر اب ویران ہو چکا ہے تاہم ٹوٹی پھوٹی دیواریں، عمارتوں کی بنیادیں اور ایک تالاب کے نشان اب بھی باقی ہیں۔

ایک ہندو پنڈت کلہن نے کشمیر کے متعلق ایک کتاب "راج ترنگنی" لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی تک ہزارہ ریاست کشمیر ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ "راج ترنگنی" میں ہزارہ کو "اُرشہ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، آج کل بھی ایبٹ آباد کے میدان کو رشہ کا میدان ہی کہا جاتا ہے۔ اگرور کو اس مصنف نے "اتیگرالپور" لکھا ہے۔ ۹۰۲ء تک ہزارہ کشمیر کے تحت تھا، اس کے بعد کشمیر کے راجہ کلش نے ہزارہ پر فوج کشی کی تو ۱۰۶۳ء سے ۱۰۸۹ء تک یہ علاقہ اس ہندو راجہ کے تحت رہا، بعد میں بھی ہزارہ کا راجہ ابھیہ کشمیر کے راجہ کے دربار میں حاضری دیا کرتا تھا۔

تربیلا تربیلا جہاں آج کل دریائے سندھ پر بہت بڑا بند باندھا گیا ہے، قدیم الایام سے ایک تاریخی علاقہ رہا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر احمد حسن دانی نے تربیلا کے قریب گندگڑ کے پہاڑ پر ایک پرانے قلعہ کے آثار دریافت کئے ہیں، دانی صاحب کا کہنا ہے کہ سکندر اعظم نے اس قلعے کی تسخیر کے لئے زبردست لڑائی کی تھی۔

دوسرے مورخین بھی تربیلا کی قدامت کی تصدیق کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مشہور ہندو راجہ رسالو اپنی محبوب بیوی کوکلاں کے ساتھ تربیلا ہی میں رہا کرتا تھا۔ اس نے یہاں خوبصورت محل بنوایا تھا جسے موتی محل بھی کہا جاتا تھا اور رسالو گڑھ بھی۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ مہابھارت کے بعد ہندو راجوں نے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کرلیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر اپنی سلطنت کو بڑھانے کی فکر میں رہتا تھا، سرحدی علاقے کے ہندو راجوں میں راجہ رسالو نے بڑا نام پایا۔ وہ سیالکوٹ کے مشہور راجہ سالباہن کا بیٹا اور راجکمار پورن بھگت کا سوتیلا بھائی تھا۔ راجہ رسالو پہلے پہل محض تفریح اور شکار کی غرض سے ہزارہ کی پُر بہار وادی میں آیا۔ اس وقت صوبہ سرحد کے اس علاقے پر راجہ سری کپ کی حکومت تھی، اس نے راجہ رسالو کو ذلیل کرنے کی ٹھانی، سری کپ نے راجہ رسالو سے شطرنج کی بازی لگائی اور اپنی سلطنت کو داؤ پر لگا دیا۔ بالآخر ہوا یہ کہ سری کپ بازی ہار گیا، راجہ رسالو

نے ضلع ہزارہ اور نواحی علاقہ پر قبضہ جمایا۔ اور راجہ سری کپ کی بیٹی کو کلاں سے شادی رچالی میاں بیوی دونوں تربیلا میں رہنے لگے۔

ان دنوں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر سوات سے لے کر اٹک تک راجہ ہوڈی کا سکہ چلتا تھا، راجہ ہوڈی نے راجہ رسالو کی حکمرانی کو اپنے لئے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اس پر فوج کشی کر دی، دونوں حکمرانوں میں ٹل موہٹ کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ راجہ رسالو نے راجہ ہوڈی کو قتل کر دیا۔ لیکن اسے خود بھی فتح کی خوشی نصیب نہ ہوئی اور راجہ ہوڈی کے رشتہ داروں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب راجہ رسالو کے قتل کی خبر رانی کوکلاں کو پہنچی تو اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس نے محل سے دریائے سندھ میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

خان پور ضلع ہزارہ کے نواح میں دریافت ہونے والے پہاڑی غار جہاں سے پتھر کے زمانے کے اوزار اور دوسری چیزیں برآمد ہوئی ہیں، صوبہ سرحد کی تاریخی قدامت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تیمر گڑھ (دیر) اور منگورہ (سوات) کی حالیہ کھدائیوں سے بھی تاریخ کے کئی گوشے منظر عام پر آتے اور اہلِ علم حضرات کی رہنمائی کا باعث بنتے ہیں۔

ٹیکسلا ٹیکسلا جو ضلع ہزارہ کی دہلیز پر واقع ہے اور مدتِ مدید تک سیاسی اعتبار سے ہزارہ کے علاقے سے وابستہ رہا ہے، آثار قدیمہ کے اعتبار سے تاریخی حقیقتوں کا وسیع خزانہ ہے، لازماً ٹیکسلا کی تہذیب و ثقافت صوبہ سرحد ہی کی تہذیب و ثقافت ہے ٹیکسلا نے یونانی۔ ساکا سیتھین، پارتھین، کوشان اور ساسانی تہذیبوں کے اثرات قبول کئے۔ ان تہذیبوں کے باہمی اختلاط سے علم و فن کے نئے سوتے پھوٹے اور ایک نئی اور جاندار ثقافت وجود میں آئی۔

سنسکرت میں اس قدیم شہر کا نام "تکشلا سیلا ناگرہ" یعنی "تراشے ہوئے پتھروں کا شہر" ہے سر جان مارشل کے قیاس کے مطابق اس شہر کو چھٹی صدی قبل مسیح میں اہلِ فارس نے تعمیر کرایا۔ ان دنوں یہ شہر اُن کے ہندوستانی صوبے کا صدر مقام تھا۔ ٹیکسلا سے قدیم فارس کے سکے برآمد

ہوئے۔ مدتوں تک ٹیکسلا کے لوگوں کا دستور یہ رہا کہ وہ مُردوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے گدھوں کے آگے ڈال دیتے جو آتش پرستوں یا مجوسیوں کا طریق کار تھا۔

۳۲۶ ق۔م میں اس پر راجہ امبھی حکومت کرتا تھا جس نے سکندر اعظم سے صُلح کر لی بلکہ راجہ پورس کے خلاف غیر ملکی حملہ آوروں کی مدد بھی کی۔

سکندر اعظم کے بعد موریا خاندان برسرِ اقتدار آیا تو بھی ٹیکسلا دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ اشوک (۲۷۴ ق م تا ۲۳۲ ق م) نے اپنی ولی عہدی کے دنوں میں کافی وقت ٹیکسلا میں گزارا، یہیں پر اُسے عالم فاضل بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی جن کے زیر اثر وہ ہندومت سے بیزار ہو کر بُدھ مت کا پیروکار بن گیا۔

۱۸۹ ق۔م میں باختری یونانیوں نے ٹیکسلا کو پھر سے فتح کر لیا، یونانی اور مقامی مکاتبِ فکر کے باہمی میل جول سے مجسمہ سازی، سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں بے پناہ ترقی ہوئی اور گندھارا آرٹ وجود میں آیا۔ ۹۰ ق۔م میں یونانی دور ختم ہو کر رہ گیا۔

۲۵ء میں گنڈوفرنیز ٹیکسلا کا حکمران قرار پایا۔ اس پارتھین حکمران کے عہد میں بھی فنِ تعمیر اور آرٹ کے دوسرے شعبوں کو یونانی روایات نے پوری طرح متاثر کیا۔

ساکا خاندان کا دورِ حکومت بھی کامیاب دور تھا، اس زمانے میں ایک مہیب زلزلے کی وجہ سے ٹیکسلا تباہ ہو گیا اور اُس کی پہلی رونق ختم ہو کر رہ گئی۔

کشان لوگ پارتھین کے بعد برسرِ اقتدار آئے تو ان کے پہلے بادشاہ دیماکر فائسز نے ٹیکسلا کے نئے شہر کی بنیاد رکھی، بدھ مت کے عروج کا زمانہ ٹیکسلا کا سنہری زمانہ تھا۔ ۳۹۰ء سے ۴۶۰ء تک کوشان بادشاہوں نے حکومت کی، ان کے زوال کے بعد کچھ مدت کے لئے حکومت پھر ساسانیوں کے ہاتھ لگی۔

۴۶۰ء میں سفید ہُن حملہ آوروں نے گندھارا اور پنجاب پر یلغار کی، تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا۔ ٹیکسلا پھر سے کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا، یہ تباہی اتنی ہولناک تھی کہ ہُن فرمانروا نے ٹیکسلا کا معائنہ کیا تو خود بھی اس عظیم شہر کی ویرانی دیکھ کر کانپ اٹھا۔

۹۰۰ء کے بعد ہندو شاہیہ اور کابل شاہیہ کا دور دورہ رہا جس کا آخری حکمران ترلوچن پال تھا۔

۱۰۰۳ء میں سلطان محمود غزنوی نے ہندو شاہیہ کا خاتمہ کر کے اقتدار خود سنبھال لیا۔ اسلامی دور میں ٹیکسلا پر کوئی توجہ نہ دی گئی نہ اسے پھر سے دارالحکومت بننے کا موقع ملا۔

ٹیکسلا کے قریب "سرائے کھولا" کے مقام سے حال ہی میں پتھر کے قدیم اوزار دستیاب ہوئے ہیں جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ٹیکسلا کی تہذیب کا شمار دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا تھا۔

چترال سے ڈیرہ اسمٰعیل خان تک اور ٹیکسلا سے درّہ خیبر تک صوبہ سرحد کا گوشہ گوشہ آثارِ قدیمہ کی دولت سے مالا مال ہے، ابھی تک یہ تاریخی آثار پوری طرح دنیا کے سامنے نہیں آسکے، تحقیق و تدقیق کی مہم جاری ہے جوں جوں آثارِ قدیمہ منظرِ عام پہ آئے صوبہ سرحد کی تاریخی قدامت واضح تر ہوتی جائے گی۔ ماضی کے یہ آثار ہمارا قیمتی قومی ورثہ ہیں، اپنے باعظمت ماضی کا مطالعہ یقیناً ہمارے مستقبل کو تابندہ و درخشندہ بنانے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوگا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب

مملکتِ پاکستان ان علاقوں پر مشتمل ہے جو دریائے سندھ اور اس کے معاونوں سے سیراب ہوتے ہیں۔ دریائے سندھ کو ہماری معیشت اور معاشرت میں وہی مقام حاصل ہے جو دریائے نیل کو ملک مصر میں۔ دریائے نیل کی وادی کی طرح دریائے سندھ کی وادی بھی تاریخ انسانی میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے، اس کی قدامت مسلّمہ ہے، محققوں کے نزدیک پہلا انسان اِسی سرزمین میں پیدا ہوا، دُنیا کی قدیم ترین تہذیب یہیں پروان چڑھی اور انسان نے مِل جل کر رہنے، بستیاں بسانے، اور منظم حکومتیں قائم کرنے کا آغاز اسی سرزمین سے کیا۔ صوبہ سرحد پاکستان کا ایک حصّہ ہونے کی وجہ سے وادیٔ سندھ کی اس قدیم تہذیب کا گہوارہ رہا۔ بلکہ اپنے اہم جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے اس نے برِصغیر کی تاریخی تشکیل میں ملک کے دوسرے حصّوں سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

ہند و پاکستان کی قدیم تاریخ مرتب کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ یہاں کی قدیم قوموں نے کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں چھوڑا، البیرونی کی یہ بات بہت بڑی صداقت کی آئینہ دار ہے کہ ہندو قوم تاریخ نگاری کے فن سے ناآشنا ہے، وہ واقعات کو تاریخی ترتیب سے مدوّن نہیں کرتی اور جب اس سے سیاسی واقعات یا حکمرانوں کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ داستان گوئی سے کام لینے لگتی ہے۔

بیس پچیس برس پہلے تک ہندو اور انگریز مؤرخ برِصغیر کی تاریخ کا آغاز آریوں کی رگ ویدک تہذیب سے کرنے پر اکتفا کرتے تھے لیکن موہنجو دھارو، ہڑپہ اور کوٹ ڈیجی کے آثارِ قدیمہ کی دریافت کے بعد بہت سے اہم تاریخی حقائق منظرِ عام پر آئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی یہ پاکستانی علاقے شاندار تہذیبی و تمدنی روایات کے حامل تھے۔

جرمنی کے ماہر ہندوستانیات ڈاکٹر گستاؤ اوپرٹ نے اپنی تصنیف "ہندوستان کے اصل باشندے" میں بیان کیا ہے کہ ساڑھے تین ہزار برس ہوئے جب آریہ وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے تو انہیں شمال مغربی حصّوں میں آباد دراوڑی قبائل کا سامنا کرنا پڑا۔ دراوڑ لوگوں میں سے کچھ تو آریوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہے اور یہیں آباد رہے، بعد میں آہستہ آہستہ یہ آریہ حملہ آوروں کے ساتھ خلط ملط ہو گئے، جبکہ کچھ دراوڑ نئے حملہ آوروں کی تاب نہ لاکر جنوب کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ اس عہد میں دراوڑی قوم مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جن میں "مالا" یا غالباً "ملّا" قبیلہ کو دوسروں پر برتری حاصل تھی، یہ قوم نقل مکانی کر کے جہاں جہاں آباد ہوئی اپنے تہذیبی نقوش چھوڑتی گئی، موجودہ مارواڑ، مالوہ، مالابار، ملتان۔ مالاکنڈ اور اسی طرح جزائر شرق الہند میں ملایا اور ملاکا کے مقام اسی "مالا" (دراوڑ) قبیلے کی یاد دلاتے ہیں۔

کول اور دراوڑ ہندوستان کی قدیم قوموں میں شمار ہوتے ہیں، ان میں سے کول اور ناگا لوگ جنگلی قبائل تھے وہ کوہ ہمالیہ کے مشرقی درّوں کی راہ ہندوستان میں وارد ہوئے اور آج کل بھی بنگال کی پہاڑیوں، ناگپور، مدراس، مالابار اور آسام کے جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہیں جبکہ دراوڑ نسبتاً مہذب اور متمدّن لوگ تھے جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ آریاؤں کی آمد سے بہت پہلے پاکستان کے شمال مغربی درّوں کی راہ اس سرزمین میں وارد ہوئے پہلے پہل موجودہ صوبہ سرحد کے میدانوں میں آباد ہوئے لیکن بعد میں آریاؤں کے دباؤ کے تحت جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں بھی پھیل گئے ماہرین لسانیات کی رائے میں دراوڑی زبان اور موجودہ براہوئی قبائل کی زبان بروہی میں بیحد مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور بلوچستان کی قدیم نل پاٹری (ظروف) بھی موہنجو دھارو اور دوسرے مقامات سے نکلنے والے برتنوں کے ٹکڑوں سے ملتے جلتے ہیں۔

دراوڑ لوگوں کے متعلق مؤرخوں کا کہنا ہے کہ ان کی رنگت سیاہی مائل تھی، وہ زیادہ دراز قامت نہ تھے تاہم بڑی خوبیوں کے مالک تھے، انہوں نے آریہ حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ کھیتی باڑی کرتے اور دھاتوں کا استعمال جانتے تھے، انہیں جہاز رانی میں بڑی مہارت تھی اور تجارت ان کا محبوب پیشہ تھا وہ اچھے تاجر تھے اور ہندوستان سے مال تجارت جہازوں کے

ذریعے ایران، عراق اور عرب ممالک کو سے جایا کرتے تھے۔ وہ فنِ تعمیر کے ماہر تھے اور عمدہ شہر بسا کر اُن میں رہا کرتے تھے، عام رائے ہے کہ موہنجو دھارو سے برآمد ہونے والے آثار دراوڑ قوم کی تہذیب ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

عراق میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے دوران "اُر" کے کھنڈرات سے ایک لوح دستیاب ہوئی ہے جو سُمیری عہد سے تعلق رکھتی ہے، اس پر تخلیقِ کائنات اور طوفانِ عظیم کی داستان کندہ ہے، نیز اس میں سُمیر کے ساتھ مختلف قوموں کے تجارتی تعلقات کے بارے میں عبارت ملتی ہے۔

"سُمیر سے چاندی اور ادنیٰ اشیاء زلمون کو برآمد کی جاتی ہیں اور زلمون سے ماکان کا تانبہ اور میلوہہ کا سونا، ہاتھی دانت اور صندل سُمیر میں لائے جاتے ہیں۔"

اکثر محققین نے جن میں امریکی ماہر سُمیریات ڈاکٹر سیموئیل نوح کریمر کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ زلمون سے مراد بلوچستان کا علاقہ ہے، اسی طرح ماکان سے مراد مکران ہے اور میلوہہ سے مالوہ یا ملتان جہاں تک تانبے کا تعلق ہے موہنجو دھارو سے نکلنے والی اکثر اشیاء تانبے کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تانبہ ان دنوں یہاں عام استعمال میں آتا تھا۔ اسی طرح داریوش ثانی (۴۲۲ تا ۴۰۴ ق۔م) کے شاہی طبیب طلیاس نے اپنی یادداشت (کتاب الہند) میں لکھا ہے کہ یہاں چاندی کی کانیں کثرت سے ہیں اور سونا بھی پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایران کے مقبوضہ ہندوستانی علاقے صرف صوبہ سرحد اور ٹیکسلا وغیرہ تک ہی محدود تھے، صوبہ سرحد جنگلات کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ یہاں کے قدیم راجے جنگی ہاتھیوں کو لڑائی میں استعمال کیا کرتے تھے، اس لئے ہاتھی دانت کا یہاں سے برآمد ہونا بعید از قیاس نہیں، اسی طرح صوبہ سرحد کا قدیم نام "گندھارا" کے معنی ہی "خوشبوؤں والا" ہیں، عین ممکن ہے کہ صندل کے درختوں کی بہتات کی بناء پر اس صوبے کا یہ نام پڑ گیا ہو،

"اسٹورٹ پگٹ" نے "ہندوستان قبل از تاریخ" میں وادیٔ سندھ سے خوشبودار پاؤڈر (اُبٹن) کو برآمدات کا ایک اہم حصہ قرار دیا ہے جس میں چندن یا صندل کے استعمال کے امکانات موجود ہیں۔" دراوڑ چونکہ تاجر لوگ تھے، اس لئے بڑے بڑے شہروں میں رہنا پسند کرتے تھے اس کے برعکس آریاؤں کی تہذیب دیہاتی تھی۔ چونکہ مغربی پاکستان کے موجودہ علاقوں کا تعلق

اور روابط ایران، عراق سے تھے اس لئے موہنجو دھارو اور عراق کی قدیم تہذیبیں ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔

کوٹ دیجی کوٹ دیجی کی تہذیب موہنجو دھارو سے بھی قدیم تر ہے اور اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ آریاؤں سے بھی پہلے ایک مہذب، متمدن اور روشن خیال قوم ان پاکستانی علاقوں میں آباد تھی، یہ مالدار تاجر تھے۔ اس لئے قلعہ بند شہروں کی رہائش کو ترجیح دیتے تھے، یہ قوم زراعت سے بھی بخوبی آشنا تھی۔ زرعی آلات کا استعمال جانتی تھی، غلے کے گودام تعمیر کرتی تھی۔ خوبصورت برتن بنانا جانتی تھی، اس کے بچے کھلونوں سے دل بہلاتے تھے، عورتیں زیورات بناؤ سنگار اور عمدہ ملبوسات کی شوقین تھیں۔

دراوڑ لوگوں کا مذہب سادہ اور پرخلوص تھا، وہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے، انہیں مویشی پالنے کا بہت شوق تھا، چنانچہ ہڑپہ اور دوسرے شہروں سے نکلنے والی مہروں پر بیل کی تصویر اکثر دکھائی دیتی ہے۔ ابتداء میں دراوڑوں میں ذات پات کا امتیاز نہ تھا لیکن بعد میں آریوں کی دیکھا دیکھی اُن میں بھی بڑے چھوٹے کی تمیز شروع ہوگئی بلکہ بہت سے دراڑوں نے وقت گزرنے پر آریاؤں کے طور طریقے اور برہمنی مذہب اختیار کر لیا اور وہ ہندوؤں کے دوسرے قبیلوں میں مدغم ہو کر رہ گئے۔

ہڑپہ ابتدائی عہد کے انسان کا ڈھانچہ راولپنڈی میں دریائے سوان کے کنارے ہی سے برآمد ہوا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ترین انسانی آبادیاں اکثر دریاؤں کے کنارے ہی بسائی جاتی تھیں۔ ہڑپہ (ضلع ساہیوال پنجاب) دریائے راوی پر واقع ہے، اس شہر سے نکلنے والے آثار قدیمہ ۲۵۰۰ ق۔م سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہی وقت تھا جب بابل اور نینوا کی تہذیبیں اپنی پوری شان پر تھیں، دیکھا جائے تو ہڑپہ کی تہذیب و ثقافت بابل اور نینوا کی قدیم تہذیب و ثقافت سے کسی طرح کمتر نہیں۔ بلکہ اسے دیکھ کر مورخوں نے برملا یہ کہا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب وادی گنگا کی تہذیب سے بدرجہا قدیم تر اور تابندہ تر ہے۔

موہنجو دھارو سیاسی اعتبار سے پاکستان ایک نیا ملک ہے تاہم تاریخی اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جو پانچ ہزار سال

پہلے بھی متمدن اور مہذب انسانوں کا وطن تھی، موہنجو دھارو کے قدیم شہر کی دریافت سے پاکستان کی تاریخی قدامت کا ایک روشن ثبوت مل گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ موہنجو دھارو (بمعنی مُردوں کا ٹیلہ) جو دریائے سندھ کے کنارے وسطی سندھ میں واقع ہے۔ ۱۵۰۰ تا ۲۵۰۰ قبل مسیح کی انسانی تہذیب سے تعلق رکھتا ہے، یہ وادیٔ سندھ کا سب سے بڑا نمائندہ ہے، یہ قدیم شہر منظم شہری زندگی کی روشن مثال پیش کرتا ہے۔ چوڑی اور سیدھی سڑکیں۔ کھلی گلیاں، آب رسانی کا مناسب انتظام اس امر کا غماز ہے کہ شہر ایک عمدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں اناج کے بڑے بڑے گودام اس علاقے کی زرعی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت ہیں، شہر سے ملنے والی کانچ کی چوڑیاں موتیوں کے ہار، عمدہ چاقو اور دوسری نادر چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس دور میں بھی وادیٔ سندھ کے باشندے تہذیب و تمدن کا اعلیٰ معیار رکھتے تھے، لوگ تاجر اور خوشحال تھے، وہ آرام پسند اور متمدن تھے، بڑے بڑے مکان بناتے تھے، ہر مکان میں کنواں ہوتا تھا، نہانے کے لئے تالاب تھے، ہر مکان میں زندگی کی تمام سہولتیں لوگوں کو میسر تھیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ ایک ہزار سال تک اس شہر نے خوب خوشحالی دیکھی۔ تاہم بعد میں سیلابوں یا کسی ناگہانی حادثے کی وجہ سے شہر تباہ ہو گیا، یہاں انسانی زندگی ختم ہو گئی اور مدتوں یہ عظیم شہر زیرِ زمین دبا رہا لیکن کوئی پچاس سال پہلے کھدائی کی گئی تو وسیع اور بارونق شہر کے آثار برآمد ہوئے اور آج موہنجو دھارو دُنیا بھر کے سیاحوں اور علم دوست حضرات کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ موہنجو دھارو کے یہ آثار و نوادر دریائے سندھ کے کناروں پر بسنے والے لوگوں کی تاریخی عظمت و قدامت کا زندہ ثبوت ہیں اور ان میں تاریخ کے طالب علم کے لئے بہت سے رموز پوشیدہ ہیں۔

○

ہخامنشی دورِ حکومت

۵۵۰ ق م - ۳۳۱ ق م

ایران اور صوبہ سرحد کے روابط کی تاریخ بہت قدیم ہے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آریوں کے بعد صوبہ سرحد میں جو پہلی مہذب اور متمدن قوم برسرِ اقتدار آئی وہ ایرانی قوم ہی تھی، یوں بھی ہندوستان کے آریہ اور ایرانی ایک ہی نسل کی دو شاخیں تھیں، مدتوں یہ لوگ ایک ہی جگہ آباد رہے بعد میں آپس کی چپقلش کی وجہ سے ایک شاخ نے ایران کا راستہ لیا جبکہ دوسری شاخ ابتداء میں دریائے سندھ کی وادی میں اور بعد میں گنگا اور جمنا کے زرخیز میدانوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئی، تاہم ان دونوں شاخوں کے افراد میں باہمی میل جول، لین دین اور آمد و رفت جاری رہی چنانچہ اس امر کے کافی ثبوت ہیں کہ ساتویں صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے تجارتی تعلقات ایران اور عراق سے بہت خوشگوار تھے۔

طلوعِ اسلام سے قبل پانچ ایرانی حکمران خاندانوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے یکے بعد دیگرے دادِ حکومت دی، پہلا خاندان ماد (میڈیا) کہلاتا تھا جو تین سو سال تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس خاندان نے ایران کی سلطنت کی حدود میں توسیع کی اور ایرانی فلمرو اپنے وقت کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار ہونے لگی، کہا جاتا ہے کہ موجودہ صوبہ سرحد کے علاقے بھی اسی ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھے، ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری نے ایک فرانسیسی مؤرخ کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان دنوں ایران اور موجودہ پاکستانی علاقوں کے درمیان اتنے گہرے روابط تھے کہ خاندان ماد نے پشتو کو ایران کی سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا تھا۔

سلطنت ماد کا خاتمہ ہوا تو ایران کا تخت و تاج ہخامنشی حکمرانوں کے حصے میں آیا۔ اس خاندان کے عظیم حکمران ساریوش (کوروش یا کیخسرو) نے ایرانی سلطنت کو وہ استحکام بخشا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا اس نے پے در پے یونانیوں کو شکست دی، چنانچہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے لے کر مغرب میں بحرِ اسود اور بحیرۂ روم تک کے وسیع علاقوں پر ایرانی پرچم لہرانے لگا۔ ہندوستان میں اس وقت

مگدھ (بہار) کا راجہ بمبیسا بیحد طاقتور حکمران تھا۔ اس کی نظر گندھارا (موجودہ صوبہ سرحد) کے زرخیز علاقوں پر لگی تھی، گندھارا کا راجہ "پکوساتی" نامی ہندو تھا، جب بمبیسار نے سرحد کی طرف پیش قدمی شروع کی تو پکوساتی نے اپنے آپ کو کمزور پاکر ایرانی شہنشاہ سے امداد طلب کی، "پکوساتی" کی راجدھانی "کاپیسی" نام کا ایک شہر تھا جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ دریائے پنج شیر اور غوربند کے سنگھم پر واقع تھا۔ دارا کے زمانے میں ایرانی فوج نے ان علاقوں کا رُخ کیا اور کافی کشت وخون کے بعد ۵۵۰ ق م میں دریائے سندھ سے مغرب میں تمام علاقے پر قبضہ کرلیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایرانی مقبوضات میں توسیع ہوتی گئی اور سکندر اعظم کے حملے سے قبل موجودہ پاکستان کے قریباً سبھی علاقے ایران کے زیرِ نگین آگئے۔ ہخامنشی خاندان کے حکمران ۳۳۱ ق۔م یعنی سکندر اعظم کے حملے تک ان علاقوں میں داد حکومت دیتے رہے اور انہوں نے یہاں گہرے تہذیبی نقوش چھوڑے۔ صوبہ سرحد پر ایرانی اثر و نفوذ کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک روایت کے مطابق پشاور کی بنیاد ہخامنشی حکمران دارائے اعظم ہی کے عہد میں پڑی۔ مورخ گوپال داس کیومرث کے بیٹے ہوشنگ کو اس شہر کا بانی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ پشاور کا اصل نام "پارس پور" یا "ایرانیوں کا شہر" تھا۔

ایک اور مورخ حمد اللہ مستوفی نے اپنی تصنیف "نزہت القلوب" (تالیف ۱۳۴۰ء) میں لکھا ہے۔

"ساسانی بادشاہ شاہ پور ولد اُردشیر نے پشاور شہر آباد کیا اور اس کا نام "شاہ پور" رکھا جو بعد میں بگڑ کر "باشاپور" اور پھر پشاور بن گیا۔

ڈاکٹر احمد حسن دانی کا خیال ہے کہ پشاور کا ایک قدیم نام "پارو پاراستہ" یعنی پہاڑوں کی اوٹ کی سرزمین بھی تھا، یہ نام عیلامی اور بابلی عہد کے سرکاری نام "گندھارا" کی بجائے رکھا گیا تھا لیکن دارا یوش اور اس کے جانشینوں نے اس وادی کے لئے گندھارا ہی کا نام مناسب سمجھا جس کا مطلب ہے "خوشبوؤں کی وادی"۔ جہاں تک "گندھارا" نام کا تعلق ہے، اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نام ایک آریہ بزرگ "گندھارایا" کے نام پر رکھا گیا تھا اور قدیم ویدک ادب میں بھی موجودہ صوبہ سرحد کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے، یونانی مورخوں کا کہنا ہے کہ اس میں دریائے سندھ اور درہ خیبر کا درمیانی علاقہ اور شمال میں دیر، باجوڑ سے لیکر جنوب میں کوہاٹ ٹوئی تک کا علاقہ شامل تھا۔

ایرانی علوم وفنون نے صوبہ سرحد کی تہذیب کو پوری طرح متاثر کیا اور ایرانیوں اور اہلِ گندھارا

کے میل جول کے نتیجے میں ایک نیا رسم الخط "خروشتی" وجود میں آیا۔ اس کی لکھائی عربی اور فارسی کی طرح دائیں جانب سے بائیں جانب کو جاتی ہے اور اس کے ثبوت میں داریوش اعظم کے زمانے کا وہ کتبہ پیش کیا جا سکتا ہے جو کچھ عرصہ پہلے خدوخیل، تحصیل صوابی میں کھدائی کے دوران دستیاب ہوا۔ یہ خروشتی رسم الخط میں لکھا گیا ہے اور آج بھی لاہور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

اسلام کے دامنِ رحمت میں آنے سے پہلے اہلِ ایران کی اکثریت "زرتشتی" مذہب کی پیروکار تھی، یہ لوگ آتش پرست تھے اور اُن کے معبدوں میں دن رات آگ جلتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی کو تحقیقاتی کھدائی کے دوران بلہبت، تیمرگڑھ اور دیر کے کئی مقامات سے ایسے آتش کدوں کے کھنڈرات ملے ہیں۔ ان آتش کدوں میں ان میناروں (دخموں) کے ماڈل بھی ملے ہیں جن پر مُردوں کی لاشیں رکھ دی جاتی تھیں اور گدھ اور دوسرے پرندے انہیں کھا جاتے تھے۔

اسی طرح سوات، باجوڑ اور دیر میں ایسی پرانی قبریں بھی ملی ہیں جن میں مُردوں کی ہڈیاں برتنوں میں محفوظ کر کے دبا دی جاتی تھیں۔ ان قبروں میں ہڈیاں دفن کرتے وقت کھانے پینے کے برتن مثلاً جام و مینا بھی رکھ دیئے جاتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت مُردے ان سے اپنی بھوک پیاس بجھا سکیں۔ یہ قبریں قدیم ایرانی قبروں سے ملتی جلتی ہیں اور ایران اور ہند کے قدیم رشتوں اور رابطوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اپنے حملے کے دوران سکندرِ اعظم جب ٹیکسلا پہنچا تو اس نے شہر میں ایک بہت بڑا زرتشتی معبد دیکھا جہاں آگ کی پوجا کی جاتی تھی (آج کل بھی ٹیکسلا میں اس آتش کدہ کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں) اس زمانے کے لوگ مُردوں کو دفن کرنے کی بجائے ایک اُونچے ستون یا مینار پر (جسے دخمہ کہا جاتا ہے) رکھ دیتے تھے۔ اور گدھ اور چیلیں ان لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا جاتی تھیں۔

سلطنتِ ایران کے اس وقت کے مشرقی صوبوں میں ایریا (ہرات)، بکتریا (بلخ)، کراسمیا (خیوہ)، سگدیا (علاقہ خشک)، گندرا (گندھارا) ہندوش (ہندوستان) کے نام شامل ہیں۔ گندھارا کا ذکر ایرانی کتبوں میں ملتا ہے۔ امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی کے محققین کی ایک ٹیم نے نقشِ رستم اور دوسری شہادتوں کی بناء پر کہا ہے کہ سندھ کا علاقہ ہخامنشی سلطنت کی مشرقی سرحد تھا۔

دارائے اوّل کے مشہور کتبے میں جو ۵۲۰ یا ۵۱۸ ق۔م میں نصب کیا گیا، ایران کے زیرِ نگیں علاقوں کی فہرست میں ہندوستان کا نام کہیں دکھائی نہیں دیتا البتہ گندھارا کا نام اس میں درج ہے۔ اسی شہنشاہ

کے دوسرے دو کتبوں میں جن میں سے پہلا پرسی پولیس (PERSE POLIS) کے شاہی محل میں نصب ہے اور دوسرا نقش رستم کے نام سے اس کے مقبرے کے قریب ہے گندھارا کا نام ایرانی قلمرو کے مقبوضات میں شامل ہے۔

گندھارا کا ایرانی دور اس لحاظ سے بھی بے حد قابلِ قدر ہے کہ اسی زمانے سے صوبہ سرحد کے قدیم تاریخی حالات روشنی میں آتے ہیں۔ اس سے قبل ان پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا، دارا نے اپنے مشہور امیرالبحر سکائی لاکس کو دریائے سندھ اور اُس کے معاونوں میں جہاز رانی کے امکانات کا جائزہ لینے بھیجا پشاور سے واپسی پر سکائی لاکس نے دریائی راستہ اختیار کیا۔ کشتی میں بیٹھ کر پہلے وہ دریائے کابل سے گزرا پھر دریائے سندھ میں کشتی رانی کرتا ہوا بحیرۂ عرب تک گیا۔ بحری راہ سے بالآخر وہ مصر تک پہنچا۔ سکائی لاکس کا یہ سفر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اس آبی راستے اور نواحی علاقوں کے متعلق ایک مفصل رپورٹ دارا کو پیش کی، دارا نے اس سلسلے میں جو ذاتی دلچسپی لی اس کے پیشِ نظر قیاس کیا جاتا ہے کہ دارا خود ان دنوں گندھارا آنے کی سوچ رہا تھا کیونکہ اس کی سلطنت کا زرخیز ترین خطہ یہی تھا۔

ہیروڈوٹس نے ایرانی سلطنت کے اس حصّے یعنی گندھارا کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ یونانی مورخ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ نواحِ پشاور میں ایپے ریٹی یا آفریدی نام کا ایک قبیلہ آباد ہے جس کے افراد ہندوستان کے باقی تمام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہادر اور جنگجو ہیں۔ اس نے ان لوگوں کی مردانہ صفات کی بیحد تعریف کی ہے اور لکھا ہے لڑائی میں یہ لوگ لمبے لمبے خنجر استعمال کرتے ہیں اور بڑی جانبازی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہیروڈوٹس نے اپنی تحریروں میں گندھارا کے ان سپاہیوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ گندھارا کے ہندوستانی سپاہی دارا کی فوج میں ایرانیوں کے دوش بدوش یونانیوں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے رہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب ہم سرحدی جانبازوں کو یورپ کی سرزمین پر مصروفِ پیکار دیکھتے ہیں۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ اہلِ گندھارا رتھوں میں سوار ہو کر تیر کمان سے لڑتے ہیں، عمدہ سوتی کپڑے پہنتے ہیں اور بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں، واضح رہے کہ یونانی اور یورپی لوگ اس وقت تک سوتی کپڑوں سے ناآشنا تھے اور صرف اُونی لباس پہنا کرتے تھے، چنانچہ جب ہیروڈوٹس اور دوسرے یونانیوں کو پہلی بار گندھارا میں کپاس کا پودا دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ سفید سفید روئی کو دیکھ کر بڑے حیران ہوئے

اور انہوں نے لکھا کہ یہ عجیب سرزمین ہے جہاں اُون درختوں پر اگتی ہے۔

ہیروڈوٹس نے نہ صرف سکائی لاکس کے بحری سفر کی تفصیل دی ہے بلکہ صوبہ سرحد کے کئی موجودہ قبائل کا تذکرہ بھی کیا ہے وہ پختون کے لئے "پکتویکا" خٹک کے لئے "ساگیدی" اور اہلِ سرحد کے لئے "گندہاریو" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

یونانی مؤرخوں کے تذکروں میں پشکال وتی (موجودہ چارسدہ) کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، وجہ ظاہر ہے کہ ہخامنشی عہدِ حکومت میں یہی شہر گندہارا کا مقامی صدر مقام تھا۔ چارسدہ اب بھی ایک زرخیز وادی میں آباد ہونے کی وجہ سے بڑی شہرت کا مالک ہے لیکن اس زمانے میں اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ تھی کہ یہ اس شاہراہ کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا جو ایران کو چین سے ملاتی تھی۔ علاوہ ازیں کابل کو ہندوستان سے ملانے والی سڑک بھی اس زمانے میں درہ خیبر کی بجائے دریائے کابل کے شمال میں چارسدہ، خویشگی نوشہرہ اور ہنڈ سے گزرتی ہوئی ٹیکسلا پہنچتی تھی۔ سکندرِ اعظم کی آمد کے وقت بھی پشکال وتی ہی اس خطے کا اہم ترین شہر تھا۔ سر مورٹیمر وہیلر کا کہنا ہے کہ پشکال وتی اور ٹیکسلا کے عروج و زوال کی داستانیں ایک ہی دور سے تعلق رکھتی ہیں، حالیہ کھدائیوں سے پشکال وتی کی عظمت اور اہمیت اور بھی واضح ہو گئی ہے۔

ایران اور گندہارا کے باہمی روابط سے نہ صرف بین الاقوامی تجارت کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان علاقوں میں تہذیب و ثقافت کے ارتقاء میں بھی نمایاں مدد ملی۔ ان علاقوں میں ایرانی نظامِ حکومت کی تقلید میں منظم حکومتوں کی بنیاد پڑی، جہاں ایرانی علوم و فنون نے ان علاقوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں ایرانی فنِ تعمیر نے ہندوستانی فنِ تعمیر کو پوری طرح متاثر کیا، بعد ازاں موریا خاندان کے دور میں جو عمارات بنیں، اُن میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی طرح اشوک نے جو کتبے چھوڑے وہ بھی ایران کے حکمرانوں کے کتبوں ہی کی ایک کامیاب نقل تھی۔ ڈھائی ہزار سال پہلے ایران سے جن خوشگوار تعلقات کا آغاز ہوا تھا، ان میں آج تک متواتر استحکام اس لئے پیدا ہوتا گیا کہ غزنوی، غوری، چغتائی، افغان، درانی یا ابدالی جتنے حکمران اس سرزمین میں وارد ہوئے ان کی اکثریت زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ایرانی روایات ہی کی علمبردار تھی۔

سکندر اعظم کا حملہ

یونان کا سکندر اعظم برصغیر پاک و ہند پر حملہ کرنے والا پہلا یورپی جرنیل تھا، وہ ایک بگولے کی مانند اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے مطلعِ عالم پر چھا گیا، سکندر اعظم کا قیام یہاں بہت مختصر تھا لیکن اس عرصے میں بھی اس نے ہندوستانی سیاسیات ہی میں نہیں بلکہ ہندوستانی تمدن، ثقافت اور مذہبیات کی دنیا میں بھی ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔

دیکھا جائے تو ہندوستان، بالخصوص صوبہ سرحد کی تاریخ کا اصل آغاز سکندرِ اعظم ہی کے حملے سے ہوتا ہے، اس حملے سے پہلے کے سبھی تاریخی حالات محض روایتوں پر مبنی تھے اور ان کی صحت محلِ نظر تھی جب کہ سکندر اعظم کے جلو میں یونانی مورخوں اور عالموں کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں آئی اور انہوں نے گندھارا اور نواحی علاقوں کے متعلق مستند تحریری ریکارڈ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑا۔ یہ دانشور اپنے وقت کے اعلیٰ ترین صنمیاتی ادب اور معقولاتی فلسفے کا پیغام لے کر آئے تھے، انہوں نے اس سرزمین کے لوگوں کو نہ صرف یونانی علوم و فنون سے روشناس کرایا بلکہ مقامی آرٹ اور تخیل کو اس قوت سے متاثر کیا کہ اس کے بعد اہلِ ہند کی بُت تراشی، سکہ سازی، مصوّری، فنِ تعمیر، بود و باش، طرزِ حکومت غرضیکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ رہا جس پر یونانی افکار و خیالات کی گہری چھاپ نہ ہو۔

صوبہ سرحد میں سکندر اعظم کے عرصۂ قیام کی مشہور تاریخیں یہ ہیں :-

افغانستان سے روانگی ——— جون ۳۲۷ ق۔م

پشکال وتی (ہشتی) کی فتح ——— اگست ۳۲۷ ق۔م

اساکینوں سے مقابلہ ——— ستمبر ۳۲۷ ق۔م

مہابن کا محاصرہ ——— نومبر ۳۲۷ ق۔م

وہابن کی فتح ——— دسمبر ۳۲۷ ق۔م

ہنڈ میں آمد ——— جنوری ۳۲۷ ق۔م

آٹھ ماہ کی اس قلیل مدت میں سکندر اعظم کو ایک دن بھی یہاں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، ان سرحدی علاقوں میں اُسے دنیا کی ایک بہادر اور سخت جان قوم سے واسطہ پڑا، اُس نے دیکھا کہ اہلِ سرحد اپنی آزادی اور اپنے ناموس کے تحفظ کے لئے جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں یونانی فوج کو جس مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور اس مزاحمت کے دوران جو نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس نے یونانی فوج کے حوصلے پست کر دیئے، حملہ آور لشکر کی کمر ٹوٹ گئی، سپاہی بددل ہو گئے یہاں تک کہ وہ کھلی بغاوت پر اُتر آئے اور انہوں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اگر سکندرِ اعظم صوبہ سرحد کے قبائل کے ساتھ نہ اُلجھتا تو شاید اس کی فوجی قوت اتنی جلد کمزور نہ پڑتی۔ اور اس کے لئے ہندوستان بھر پر چھا جانا ممکن ہوتا۔ تاریخ سے آگاہی رکھنے والے جانتے ہیں کہ بعد میں سکھوں اور انگریزوں سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی۔ پنجاب میں سکھوں اور انگریزوں کو برائے نام مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن صوبہ سرحد کے لوگ اُس وقت تک اُن سے برسرِ پیکار رہے جب تک انہیں اپنے علاقوں سے نکال باہر نہ کیا۔

ہندوستان پر اس یونانی حملے کی وجہ یہ تھی کہ ہخامنشی شہنشاہوں نے یونان پر پے در پے حملے کر کے یونانیوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا، بالخصوص شہنشاہ زرکسیز (۴۸۶ - ۴۶۵ ق۔م) نے تو یونانی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، یونانی انتقام کی آگ میں جل رہے تھے، وہ ہر قیمت پر ایرانیوں سے ان مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ مقدونیہ کے حکمران فلپ نے ایران پر حملے کی مکمل تیاری کر لی تھی لیکن ۳۳۶ ق۔م میں وہ ایک یونانی کے ہاتھ سے مارا گیا تو یہ حملہ تھوڑی دیر کے لئے التوا میں پڑ گیا، بعد میں اس کام کا بیڑا فلپ کے بیٹے سکندر یونانی نے اٹھایا، وہ ایک نہایت منظم لشکر کے ساتھ ایران پر ٹوٹ پڑا۔ اربیل کے مقام پر ایرانی شہنشاہ دارا کو شکست دی اور پرسی پولس اور ایرانی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سکندر اُن معدودے چند عظیم انسانوں میں سے ایک تھا جو دُنیا بھر کے فاتح بننے کی تمنا لے کر اُٹھے تھے، ایران پر تسلط جمانے کے بعد سکندر نے ایران کے مشرقی مقبوضات، افغانستان اور صوبہ سرحد کا رُخ کیا۔ صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب کے علاقے اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھے، یہ راجے برائے نام ایران کے باج گزار تھے تاہم داخلی طور سے خود مختار

تھے۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت مشہور ریاستیں یہ تھیں :۔

۱۔ سوات میں اُڈیانہ کی ریاست، جس کا صدر مقام مساگا تھا۔

۲۔ ابھیسارا کا علاقہ جو ہزارہ، پونچھ، بھمبر اور راجوری کے اقطاع پر مشتمل تھا۔

۳۔ ٹیکسلا کی ریاست جس کا راجہ ابھی سکندر اعظم کا حلیف بن گیا تھا۔

۴۔ جہلم کی ریاست جس کے راجہ پورس نے سکندر اعظم کا بھرپور مقابلہ کیا۔

سکندر اعظم کی فوج نے ۳۳۱ ق۔م میں موصل کے قریب اربیل کے مقام پر دارا، شہنشاہ ایران، کو شکست دی تھی، شکست کے بعد دارا ہمدان کی طرف پسپا ہوا، سکندر نے اس کا پیچھا کیا، وہ وہاں سے خراسان اور بلخ کی طرف بھاگ نکلا لیکن یونانیوں نے تعاقب جاری رکھا، سکندر اعظم تیزی سے بڑھتا گیا۔ ۳۲۷ء میں اس نے قندہار (ارکوسیا) فتح کیا اور وہاں سکندریہ نام کا شہر بسایا، کچھ یونانی فوج وہاں چھوڑ کر وہ باختر کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک سکندر کی فوج میں ایرانی، خراسانی اور دوسرے سپاہی بھی شامل ہو چکے تھے اور اب اس کا لشکر ایک بین الاقوامی لشکر کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔

سکندر اعظم چونکہ ساری دُنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر اٹھا تھا۔ اس لئے وہ اپنے مقبوضہ علاقوں کے نوجوانوں کو بھی یونانی قواعد کے مطابق فوجی تربیت دینا چاہتا تھا۔ اس غرض کے لئے اس نے ایک تربیتی کیمپ قائم کر رکھا تھا۔ رات کو زیر تربیت ایرانی اور ایشیائی نوجوان سکندر اعظم کے خیمے کا پہرہ دیتے تھے چونکہ وہ یونانیوں کی غلامی کو اپنے لئے ذلت آمیز تصور کرتے تھے اس لئے ایک رات انہوں نے منصوبہ بنایا کہ سکندر اعظم کو سوتے میں قتل کر دیا جائے، اس سازش کا پتہ چل گیا جس پر بہت سے ایشیائی نوجوانوں کو مروا دیا گیا، انہی میں ایک ایرانی نوجوان ہرموس نامی تھا جو یونانی عالم کلستھینز سے فلسفہ پڑھتا تھا، چنانچہ کلستھینز پر بھی سازش میں شریک ہونے کا شبہ کیا گیا۔ اور اُسے باختر میں بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ یہ واقع ۳۲۷ قبل مسیح کا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم کا یہ دستور تھا کہ کسی پڑاؤ سے کوچ کرنے سے پہلے سبھی فالتو سامان تلف کرا دیتا تھا تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ باختر کے کوچ کے وقت بھی اس نے اسی حکمتِ عملی کو اپنایا۔ قیام الدین خادم لکھتے ہیں "سکندر اعظم جب کابل پر حملہ آور ہوا تو اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی اور بہت سا سامانِ جنگ تھا۔ بڑے خونریز معرکے کے بعد اس نے کابل پر فتح پائی۔ کچھ عرصہ

وہاں قیام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔

کابل کے بعد سکندر اعظم کی یورش کو چار مختلف مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔

اوّل ۔ پہاڑی مہم ۔ سکندر خود شمالی راہ کنڑ ۔ نواگئی سے آگے بڑھا اور دوسرے دستے کو اپنے دو جرنیلوں کی کمان میں درّہ خیبر کی راہ پشکالوتی (چارسدہ) کی جانب بھیجا۔

دوم ۔ میدانی جنگ جس میں پورس سے خونریز معرکہ پیش آیا۔

سوم ۔ بیاس تک کا سفر اور راستے میں مختلف راجوں کی تسخیر۔

چہارم ۔ واپسی ۔ ملتان میں سخت معرکہ اور سندھ اور بلوچستان کے ریگ زاروں کا صبر آزما سفر

کابل سے روانہ ہوکر سکندر اعظم نے دریائے پنجکوڑہ کے ساتھ ساتھ نواگئی کے درے سے گزر کر وہ راستہ اختیار کیا جو ننگرہار کو کابل سے ملاتا ہے۔

باجوڑ کا معرکہ قیام الدین خادم لکھتے ہیں کہ جب باجوڑ پہنچ کر سکندر اعظم کو پتہ چلا کہ پشتون قبائل حریت پسند مجاہد ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی کی پرواہ نہیں کرتے تو وہ بڑے منظم اور محتاط طریق سے آگے بڑھا، چنانچہ اس نے فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا، ایک حصّہ تو اس نے اپنے ساتھ رکھا، جب کہ دوسرے حصّے پر ہفستیان اور پرڈیگاس کو کمانڈر مقرر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ساری فوج کو ایک ہی دفعہ داؤ پر نہ لگایا جائے، دونوں کمانڈروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ درّہ خیبر کی راہ پشکالوتی کی طرف بڑھیں اور سکندر اعظم کے پہنچنے سے پہلے ہی ہنڈ کے بالمقابل دریائے سندھ پر پُل باندھ دیں تاکہ یونانی فوجوں کی ہندوستان پر حملے کے سلسلے میں تاخیر ہونے نہ پائے۔

وہ مقام جہاں پہنچ کر سکندر اعظم نے فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ نائسا یا نیاسا (NYSA) کہلاتا تھا، مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ جگہ موجودہ جلال آباد کے پاس تھی، کوچ کرنے سے پہلے سکندر نے یہاں دیوی ایتھنا (ATHENA) کے حضور قربانی پیش کی۔ یہیں پر ٹیکسلا کے راجہ امبھی اور بعض دوسرے مقامی راجے تحفے تحائف لے کر سکندر اعظم کے حضور پیش ہوئے، دوسری نادر اشیاء کے علاوہ امبھی نے یونانی حکمران کو ۲۵ ہاتھی بھی نذر گزارے۔ یونانی ہاتھیوں کو دیکھ کر بڑے محفوظ ہوئے کیونکہ اس سے قبل انہیں کبھی ہاتھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

نیسا یا نیاسا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں پہلے بھی بہت سے یونانی الاصل لوگ آباد تھے، جنہوں نے

اپنے سردار (AKULPHIS) اکل فیس کی قیادت میں سکندرِ اعظم کا خیر مقدم کیا اور اسے شاندار الفاظ میں سپاسنامہ پیش کیا، سکندرِ اعظم نے اپنے ہم وطنوں کا لحاظ کرتے ہوئے شہر والوں کو امان دی اور اُن سے حسنِ سلوک کا ثبوت دیا۔ سمتھ نے "ہسٹری آف انڈیا" جلد دوم میں لکھا ہے کہ۔

"اس آبادی نے تین سو سوار سکندرِ اعظم کے ہمراہ کر دیئے جو ساری سرحدی مہموں میں اس کے ساتھ رہے اور کہیں اکتوبر ۳۲۶ قبل مسیح میں واپس لوٹے۔"

نیاسا کے متعلق مشہور یونانی مؤرخ ایرین لکھتا ہے کہ

"یہ شہر ڈائے نے سس یا بکوس نے ہندوستان کی فتح کے وقت آباد کیا تھا۔ لیکن یہ سوال کہ یہ بکوس کون تھا اور کس وقت اور کہاں سے چل کر اس نے ہندوستان کو مسخر کیا، ایسا مشکل سوال ہے جس کا آسانی سے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔"

نیاسا کی وجہِ تاسیس جو کچھ بھی ہو، بہر حال یہی وہ مقام تھا، جہاں پہنچ کر سکندرِ اعظم نے ہندوستان پر حملے کا حتمی فیصلہ کیا، جنگی منصوبہ بندی کی اور آخری ہدایات دیں۔ چونکہ سکندرِ اعظم کو اس علاقے کے لوگوں کی جنگی صلاحیتوں کا علم ہو چکا تھا، اس لئے فوج کو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس کیا گیا، بے شمار منجنیقیں اور ساز و سامان حملہ آور فوج کے ساتھ تھا، فوج کے بڑے بڑے افسر مقدونی تھی، ایرانی امراء نے ایک رسالہ اس وقت تک تیار کر لیا تھا، چنانچہ فوج کا نصف حصہ گھڑ سواروں پر مشتمل تھا۔

اریان اور دوسرے یونانی مؤرخوں کی تحریروں سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ہفستانیس کی قیادت میں جس فوجی دستے کو سیدھے پشاور یا پشکالوتی پہنچنے کا حکم دیا تھا، اس نے دریائے کنڑ اور دریائے کابل کے مقام اتصال سے کچھ اُوپر لال پورہ (علاقہ مہمند) کے قریب دریا کو عبور کیا اور کڑپہ، گندھاب وغیرہ سے گزر کر شبقدر کے قریب وادیٔ پشاور میں داخل ہوا۔ خیبر کی سڑک بننے سے پہلے افغانستان اور ہندوستان کے مابین زیادہ آمد و رفت اسی راستے سے ہوتی تھی۔ قدیم زمانہ میں پشکالوتی اور ہنڈ کی شہرت کا راز بھی اسی بات میں تھا کہ یہ دونوں مقامات اسی شاہراہ پر واقع تھے۔

اس کے برعکس "ہندوستان پر سکندر کا حملہ" نام کی کتاب کے مطابق سکندرِ اعظم نے "ہفستان" کی قیادت میں جو فوجی دستہ خیبر کی راہ بھیجا تھا۔ اُسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جونہی یہ لشکر خیبر کی تنگ گھاٹیوں میں پہنچا، آفریدیوں نے اس پر حملہ کر دیا یونانی لشکر بُری طرح گھر گیا اور آخر جب کئی

روز کی جھڑپوں کے بعد بھی یونانی لشکر آگے بڑھنے میں ناکام رہا تو سکندر اعظم کو خود کمک لے کر وہاں پہنچنا پڑا اور اس نے سخت خونریز لڑائی کے بعد اپنے لشکر کو آفریدیوں سے چھڑایا۔

اُدھر یونانی فوج کا دوسرا حصہ، جس کی کمان خود سکندر اعظم کے ہاتھ میں تھی، پیش قدمی کرتے ہوئے درۂ کٹ گلا کی راہ دریائے پنجکوڑہ کے ساتھ ساتھ باجوڑ میں داخل ہوا۔ اُس وقت ان علاقوں میں اسپاسی (القول کیرو یوسف زئی) گورائی اور اساکنی نام کے تین بڑے بڑے طاقتور قبیلے آباد تھے۔ باجوڑ میں داخل ہوتے ہی سکندر اعظم کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اریگان (ARIGAON) کے مقام پر خونریز لڑائی ہوئی۔ مقامی باشندے انتہائی بہادری سے لڑے لیکن سکندر کی عظیم اور منظم فوج اور جدید اسلحۂ جنگ کے مقابلے میں ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ یہ پہلی لڑائی تھی جس میں سکندر اعظم خود بھی زخمی ہوا۔ انتقام کے جوش میں آکر یونانی فوجوں نے اریگان شہر کو نذرِ آتش کر دیا۔ قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سکندر کے افسر اطلاعات بطلیموس (PTOLEMY) کے بیان کے مطابق سکندر نے اس جگہ کے چالیس ہزار باشندوں کو قیدی بنالیا گیا اور دو لاکھ تیس ہزار بیل ان سے یونانی فوج نے چھین لئے، یہ بیل اتنی عمدہ نسل کے تھے کہ ان میں سے اچھے بیل چن کر یونان بھیجے گئے تاکہ اُن سے افزائشِ نسل کا کام لیا جا سکے۔ شدید لڑائی کے دوران اریگان کا قلعہ تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی کلیدی حیثیت کے پیشِ نظر سکندر نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی ہدایت کی، جو یونانی سپاہی زخمی ہو کر جنگی خدمات بجا لانے کے قابل نہ رہے تھے انہیں یہیں آباد کر دیا گیا اور کیراسیروس کی کمان میں ایک فوجی دستہ یہاں متعین کرنے کے بعد سکندر اعظم آگے بڑھا۔

مساگا کا معرکہ

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سکندر اعظم نے اس علاقے کا رُخ کیا جو ان دنوں اساکینی قوم کا مسکن تھا۔ یہ علاقہ بیحد وسیع اور زرخیز ہے اور نالاس سے لے کر دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک پھیلا ہوا ہے، اس میں سوات، بونیر اور بونیر کے شمالی پہاڑی علاقے شامل ہیں۔ ان علاقوں کے سرفروشوں نے ہمیشہ ہر حملہ آور کا جان توڑ کر مقابلہ کیا ہے اور کبھی اپنی آزادی پر آنچ نہیں آنے دی۔ اساکین قوم کے متعلق خیال ہے کہ یہ وہی قوم ہے جو آج کل "یوسف زئی" یا یوسف زئی کہلاتی ہے۔ ان جنگ آزماؤں سے سکندر اعظم کی پہلی ٹکر مساگا کے مقام پر ہوئی۔ مساگا کے بارے میں سر اولف کیرو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ بیان درۂ کٹ گلا پر صادق آتا ہے جو دیر جانے والی موجودہ

سڑک پر چکدرہ سے تقریباً آٹھ میل شمال میں تالاش اور ادین زئی کی وادیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں درّے سے بالکل نیچے پہاڑیوں کی ایک چار دیواری ہے اور ایک چشمہ بھی ہے جو اُوچ کہلاتا ہے، یہ چشمہ کرٹس کے بیان کے مطابق ہے، اس کے اِردگرد بہت سی پُرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مساگا اسی درّے کے نواح میں واقع ہوگا۔

ڈاکٹر منّور خان اور ڈاکٹر احمد حسن دانی کی تحقیق کے مطابق مساگا کی مشہور لڑائی تالاش ہی میں لڑی گئی اب بھی اس جگہ کو مچاؤ (مساگا) کہا جاتا ہے، یہیں سے بعد میں سکندر اعظم دریائے سوات کے دائیں کنارے اُدیانا اوڈی گرام کو جا نکلا۔ اور پھر وہاں سے بازیرہ یا موجودہ بری کوٹ پہنچا، سکندر نے یہ راستہ فوجی نقطہ نظر سے اختیار کیا۔ بعد ازاں وہ شاہ کوٹ کے درّے سے ہوتا ہوا سیدھا جمال گڑھی اور شہباز گڑھ کو جا نکلا، مدتوں بعد چینی سیاح ہیون سانگ بھی اسی راستے سے سفر کرتا ہوا پایا جاتا ہے، اس راستے کے دونوں طرف آثارِ قدیمہ پائے جاتے ہیں، جہاں سے پتھر کے زمانے کے اوزاروں کی برآمد اس علاقے کی تاریخی قدامت کا پتہ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں قدیم طرز کی قبروں کی دریافت بھی اس وقت کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے۔

مساگا کی لڑائی اس لحاظ سے بھی بیحد اہم ہے کہ اس میں مساگا کے حکمران کی مدد کے لئے ہمسایہ ریاستوں اوراسا اور امبھی سارا کے لشکروں نے بھی حصّہ لیا تھا، مل ملا کر مقامی فوج کی طاقت بیس ہزار سواروں، تیس ہزار پیادہ سپاہیوں اور نین سو جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی، لیکن بھی مساگا کا قلعہ ایک ایسی پہاڑی پر واقع تھا جس کے مشرق میں دریائے سوات، جنوب اور مغرب میں سنگلاخ چٹانیں اور گہری دلدلیں اور شمال میں مضبوط فصیلیں تھیں۔ قلعہ اور اس کی خندقیں اور مورچے چار میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے، سکندر اعظم کی فوج کا شمار بھی اپنے وقت کی بہترین تربیت یافتہ فوج میں ہوتا تھا۔ اس لئے طرفین میں ایک قیامت خیز مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف کے سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد ہلاک اور زخمی ہوئی، خود سکندر اعظم بھی اپنی زندگی میں دوسری بار اس شدید معرکے میں زخمی ہوا —— پہلے پہل تو اس نے زخموں کی کوئی پرواہ نہ کی لیکن بعد میں درد کی شدّت نے اسے اتنا بے قرار کر دیا کہ وہ چلّا اٹھا۔ "لوگ تو مجھے مُشتری کا بیٹا کہا کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہو رہا ہے کہ میں ایک عام انسان ہوں"۔

اساکینی سرفروش بے جگری سے لڑے لیکن بعد میں جب ان کا سردار لڑتے لڑتے مارا گیا تو لوگوں

کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ سکندر اعظم کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہو گئے۔ یونانی مورخ کیورسیس (CURIUS) یہ واقع ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

"جب مساگا کے لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ کھلے میدان میں سکندر اعظم کی فوجوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تو وہ قلعہ میں جا چھپے، طویل محاصرے کے بعد جب مزید لڑائی لڑنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا تو انہوں نے اپنے ایلچی یونانی فرمانروا کے پاس بھیجے اور معافی کے طلب گار ہوئے، جب سکندر اعظم کی طرف سے ان کے لئے عام معافی کا اعلان ہو گیا تو اپنے دستور کے مطابق ان کی ملکہ اور بڑے بڑے سرداروں کی بیگمات پہلے قلعہ سے باہر نکلیں، وہ سب کی سب سونے کے پیالوں میں مٹھی بھر اغوانی انڈھیل رہی تھیں تاکہ یونانی فرمانروا اور اس کے سرداروں کو نذرانہ پیش کر سکیں۔ ملکہ نے آگے بڑھ کر پہلے تو سکندر اعظم کو جام پیش کیا پھر اپنا شیر خوار بچہ اس کے قدموں میں ڈال دیا، وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ ساری قوم کے لئے معافی کی طالب ہوئی، ساتھ ہی اس نے یہ درخواست بھی کی کہ اس کے سابقہ اعزاز کو برقرار رکھا جائے۔ سکندر اعظم نے کمال فراخدلی سے ملکہ کی درخواست منظور کی اور اہل مساگا کو عام معافی دے دی۔ بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ سکندر اعظم ملکہ کی بے بسی سے کہیں زیادہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہوا تھا کیونکہ وہ ایک طرح دار خاتون تھی، بہر حال بعد ازاں ملکہ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سکندر رکھا گیا۔"

کہا جاتا ہے کہ مساگا کی اس تاریخی لڑائی میں دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں کے سات ہزار ہندوستانی سپاہیوں نے بھی مقامی باشندوں کے دوش بدوش یونانی فوج کا مقابلہ کیا تھا۔ مساگا کی فتح کے بعد سکندر اعظم نے انہیں اس شرط پر معافی دے دی کہ وہ یونانی لشکر میں شامل ہو کر خدمات انجام دیں گے، چنانچہ ان سپاہیوں کے لئے قلعہ سے کوئی نو میل دور خیمے نصب کر دیئے گئے۔ لیکن بعد میں سکندر اعظم کی فوج نے ان ہندوستانی سپاہیوں پر اچانک حملہ کر دیا، انہیں سنبھلنے کا موقع تک نہ دیا۔ تاہم ان جانبازوں نے ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی اور اپنی مہادرانہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک ایک سپاہی اپنی آن پر کٹ مرا لیکن شکست قبول نہ کی۔

بعض مؤرخوں نے اس واقع کو سکندر اعظم کی عہد شکنی پر محمول کیا ہے لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حالات

کیا تھے جن کے تحت یونانی سپہ سالار کو یہ کارروائی کرنی پڑی۔ ہوسکتا ہے اُن ہندوستانی سپاہیوں نے وقتی طور پر تو جان بچانے کے لئے سکندر کی شرائط قبول کر لی ہوں لیکن بعد میں اس غیر ملکی حکمران کے خلاف کسی سازش کا منصوبہ بنایا ہو۔

بازیرہ مساگا کی فتح کے بعد سکندر نے اپنے جرنیل کوئنس (KOINOS) کو بازیرہ (موجودہ بری کوٹ) بھیجا۔ سکندر کا خیال تھا کہ وہاں کے لوگ مساگا کی شکست اور تباہی کا سُن کر بد دل ہو جائیں گے اور مقابلہ نہ کریں گے لیکن اس کا یہ خیالِ خام ثابت ہوا۔ ریاست بازیرا کے لوگوں نے اپنی پہاڑی کمین گاہوں اور مورچوں میں بیٹھ کر یونانی فوج کا بھرپور مقابلہ کیا تاہم جب انہیں ان مورچوں کو چھوڑ کر کھلے میدان میں جنگ لڑنی پڑی تو وہ یونانیوں کے مدمقابل ثابت نہ ہو سکے' اس کے باوجود انہوں نے ہتھیار نہ ڈالے بلکہ بیوی بچوں اور ساز و سامان کے ساتھ اپنے دیہات خالی کر کے مہابن پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ گئے۔ جہاں تک پہنچنا کسی بیرونی حملہ آور کے لئے آسان نہ تھا۔

"اورا" یا "نورا" بازیرہ کو زیر کرنے کے بعد سکندر اعظم نے اپنے دو جرنیلوں اٹالس السیتاس (ATALUS ALCETAS) اور ڈیمٹریس (DEMETRIUS) کو وادیٔ سوات کے ایک اور شہر اورا (ORA) (موجودہ اوڈیگرام) کی طرف بھیجا۔ اورا کے لوگوں نے مساگا کی لڑائی میں یونانی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا اور اب یونانی انہیں سبق سکھانا چاہتے تھے، یہ مقام ایک اُونچی پہاڑی پر تھا۔ اور اس کی قلعہ بندیاں بیحد مضبوط تھیں، جب یونانی فوج کو کامیابی نہ ہوئی تو سکندر خود موقع پر پہنچا اور کمان اپنے ہاتھ میں لے لی، بازیرا کے محافظوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اس کے برعکس یونانی فوج بہت طاقتور تھی۔ چنانچہ جب بازیرا کو لوگوں کو اپنی شکست سامنے نظر آنے لگی اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو وہ رات کے اندھیرے میں اپنی بستیوں سے نکل کر ایک پہاڑی چوٹی پر چلے گئے جو اورناس کہلاتی تھی، کیرو کا قیاس ہے کہ یہ جگہ کانا اور غورباند سے اُوپر پیر سر کے چشمے کے پاس ہے۔

بازیرہ اور اورا کے متعلق اللہ بخش یوسفی کا خیال ہے کہ یہ دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے کے قریب واقع تھیں، ان کا خیال ہے اورا علاقہ سدوم اور رزڑ کے درمیان آباد تھا، یہ وہی جگہ ہے جس کے نواح میں "نوگرام" کی قدیم آبادی کے آثار پائے گئے ہیں، نوگرام "نورا" ہی کی بدلی ہوئی صورت دکھائی

دیتا ہے۔ اس کی قدامت اس سے بھی ظاہر ہے کہ نوگرام کے قریب ایک وسیع حوض اب بھی موجود ہے۔ اور رانی گھاٹ" کے پتھر کے وہ بلند و بالا ستون بھی دکھائی دیتے ہیں جو کسی قلعے یا دربار کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ اسی مصنف کے نزدیک بازیرا موجودہ موضع بازار ہے' ان دونوں جگہوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اورا اور بازیرہ ایک دوسرے سے پیوست دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مساگا، اورا اور بازیرہ کی لڑائیوں نے سکندر اعظم کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُسے تلخ تجربہ ہوا تھا کہ ان جنگجو پہاڑی قبائل سے لڑنا اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھے ہوئے تھا۔ چونکہ اس کا اصل مقصد ہندوستان کی تسخیر تھی اور سوات اور بونیر کی ان جنگوں میں الجھ جانے سے اُسے اس مقصد کے حصول میں تاخیر ہو رہی تھی اس لئے اورا کی مہم کے بعد اس نے ارنوس پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے سیدھا پشکال وتی کی جانب بڑھا۔ اس وقت تک اس کے دونوں جرنیل ہفاستھین اور پردیکاس بھی پشکال وتی (چارسدہ) پہنچ چکے تھے۔ جو ولایت گندھارا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس وقت پشکال وتی کا راجہ (ASTES) ہستی یا یقول پانینی ھستین) نامی ایک شخص تھا، اُسے سکندر اعظم کی فوجی قوت کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس کے باوجود اس نے شہر کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی، وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ جس پر سکندر اعظم کی فوج نے اگست ۳۲۷ ق م میں پشکال وتی اور اس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ ایک ماہ تک ڈٹا رہا لیکن بالآخر جب قلعے میں خوراک ختم ہو گئی تو وہ باہر نکلا اور دشمن کے خلاف داد شجاعت دیتا ہوا ہلاک ہو گیا۔ اس پر یونانی جرنیلوں نے شہر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، چونکہ ابھی انہیں اور فوجی مہمیں درپیش تھیں اس لئے وادئ پشاور کے اس زرخیز مقام پشکال وتی میں یونانی سپاہ کے لئے رسد رسانی کا مرکز قائم کیا گیا جس کا نگران فلپ نامی یونانی سردار مقرر ہوا۔ پشکال وتی کی فتح کے بعد یونانی لشکر کو وادئ پشاور میں کسی مزید مزاحمت سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ اس لئے فوج کا ایک حصہ دریائے کابل کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ ہنڈ روانہ کیا گیا تاکہ ہنڈ سے بالمقابل دریائے سندھ پر کشتیوں کا پُل تعمیر کیا جائے۔ چونکہ پشکال وتی کے راجہ ہستی کے ایک حریف سنجایا نامی حکمران نے سکندر اعظم کا ساتھ دیا تھا اس لئے پشکال وتی کے راجہ کے مرنے پر سنجایا کو اس کا جانشین مقرر کر دیا گیا۔

ارنوس کی مہم تاہم دریائے سندھ کو پار کر کے ہندوستان پر فوج کشی سے پہلے ابھی سکندر اعظم

کو ایک اور معرکہ سر کرنا تھا۔ یہ معرکہ ارنوس کے قلعہ کی تسخیر تھا، یہ قلعہ مہابن کے پہاڑ پر سطح سمندر سے کوئی سات ہزار فٹ بلند چوٹی پہ واقع تھا۔ اس کے ایک طرف دریائے سندھ ایک گہری گھاٹی میں بہتا تھا تو دوسری طرف خطرناک پہاڑی چٹانیں راستے کو ناقابلِ گزر بناتی تھیں۔ پھر صرف اپنے محلِ وقوع ہی کے اعتبار سے ارنوس ناقابل تسخیر نہ تھا بلکہ اس کے محافظ دنیا کے بہترین لڑاکے لوگ تھے جنہیں رام کرنا آسان کام نہ تھا۔

ان سب رکاوٹوں کے باوجود سکندر اعظم نے اپنا ارادہ نہ بدلا اور وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت ارنوس پر حملے کے ارادے سے بڑھا۔ یونانی فرمانروا نے حالات کا جائزہ لیا اور امبولینا (AMBOLINA) کے مقام کو اپنی خیمہ گاہ اور مستقر بنایا۔ امبولینا سے کئی لوگ ریاست امب مراد لیتے ہیں تاہم یوسفی مرحوم کے نزدیک یہ جگہ امبار تحصیل صوابی ہی ہو سکتی ہے۔

اس سفر کے دوران گندھارا کے دو حکمران کوفینز (COPHANS) اور اساکیٹاس (ASACETAS) بھی سکندر اعظم کے ہمرکاب تھے۔ کئی دنوں تک سکندر اعظم کو سخت پریشانی کا سامنا رہا۔ اور قلعے تک پہنچنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ قریب تھا کہ مایوس ہو کر وہ محاصرہ اٹھا لے لیکن آخر اس کی قسمت نے یاوری کی، ایک مقامی معمر اور چالاک شخص اُسے مل گیا جس نے رشوت لے کر اس غیر ملکی حکمران کو قلعے کی تسخیر کا طریقہ اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا اس شخص کی غداری نے سکندر اعظم کے لئے قلعہ ارنوس تک رسائی کو ممکن بنا دیا۔ سکندر نے تین دن رات قلعے کی فصیل کے نیچے زبردست لڑائی لڑی، منجنیقیں گولے برساتی رہیں لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ تیسرے دن جب قلعہ کی دیواروں میں شگاف پڑتے ہوئے دیکھے تو محصورین راتوں رات قلعے کو خالی کر کے کسی دوسرے محفوظ مقام کو چلے گئے۔ سکندر اعظم کے فوجی جب قلعہ میں داخل ہوئے تو انہیں ٹوٹے پھوٹے در و دیوار کے علاوہ وہاں سے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

اساکینوں سے دوسری جنگ

سکندر اعظم ان پہاڑی قبائل سے بے حد تنگ آیا، یونانی فوجوں کے آگے وہ ہتھیار ڈال دیتے لیکن ان کے پیٹھ پھیرتے ہی پھر پہاڑوں سے اتر کر اپنے علاقوں پہ قابض ہو جاتے۔ مساگا اور اورا کی لڑائیوں میں شکست کھا کر اساکینی لوگوں نے سکندر اعظم کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن بعد میں پھر یونانیوں کے خلاف بغاوت کر دی، چنانچہ سکندر اعظم نے ارنوس کی تسخیر کے بعد پھر اساکین کی سرکوبی کا ارادہ کیا، اس کا پہلا مقابلہ اس

قبیلے سے دائرتا (DYRTA) کے مقام پر ہوا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مہابن کے شمال میں واقع تھا سکندر کی فتح ہوئی لیکن اطاعت قبول کرنے کی بجائے اساکینؔ پھر پرانے طریقِ کار پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیوی بچوں اور مال واسباب سمیت بستیاں خالی کر کے پہاڑی کمین گاہوں میں روپوش ہو گئے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو دریائے سندھ پار کر کے کوہ سیاہ (ضلع ہزارہ کے شمالی علاقہ) میں جا آباد ہوئے، اس طرح سکندر منہ دیکھتا ہی رہ گیا اور ان لوگوں کو بغاوت کرنے کا مزہ نہ چکھا سکا۔ چونکہ ان پہاڑی مہموں میں کافی وقت ضائع ہو گیا تھا۔ اس لئے سکندرِ اعظم جلدی سے ہنڈ کو واپس لوٹا جہاں اس کی فوج کا باقیماندہ حصہ اس کی آمد کا منتظر تھا۔ سوات، بونیر اور مردان کے راستے جب سکندر ہنڈ پہنچا تو بڑی خوشی منائی گئی۔ اب دریائے سندھ کے مغربی علاقے پر سکندر اعظم کا تسلط قائم ہو چکا تھا، چنانچہ اس نے اپنے یونانی سالار نکانور کو اس علاقے کا گورنر مقرر کیا اور ایک مقامی سردار، مشتی گیشا کو اس کا معاون بنایا گیا، مفتوحہ علاقے کے نظم ونسق کو مستحکم بنا کر اب سکندر ٹیکسلا کی طرف متوجہ ہوا۔

اس وقت تک یونانیوں کی جغرافیائی معلومات واجبی سی تھیں، وہ دریائے سندھ کو بھی دریائے نیل کا ایک معاون سمجھتے تھے جو محض قیاس آرائی تھی۔ سکندر نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ دریائے سندھ کا منبع دریافت کیا جائے چنانچہ انہوں نے پتہ چلایا کہ اس دریا کا منبع اٹک سے سات سو میل شمال میں واقع ہے۔

ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے کہ جب سکندر اعظم مہابن کے پہاڑی قبیلوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد ہنڈ کو لوٹا تو اپنے ساتھ بے شمار درخت بھی کاٹ کر لایا تاکہ دریائے سندھ کے پل کی تختہ بندی میں آسانی ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ پل ہنڈ سے پندرہ سولہ میل شمال کی طرف دریائے سندھ پر بنایا گیا تھا۔ سکندر موسم بہار میں ہنڈ سے عازمِ ٹیکسلا ہوا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا، نظارہ بڑا دلکش تھا۔ اس کی فوج بڑے طمطراق سے قطار در قطار مارچنگ کر رہی تھی۔ اس کے خصوصی محافظ دستے کے سپاہیوں کی روپہلی ڈھالیں سورج کی شعاعوں میں چمک رہی تھیں، ہتھی سواروں نے آگے بڑھ کر اس عظیم فاتح کا استقبال کیا جلوس میں سکندر اعظم کے ساتھ ساتھ روشنک (REXONA) یا رُخسانہ کی سواری سبھی کے لئے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روشنک ایک نہایت ہی حسین وجمیل افغان دوشیزہ تھی جسے سکندر اعظم

نے اپنی ملکہ بنایا۔ ایشیائی ملکہ ہونے کی وجہ سے وہ مجلس آرائی اور دربار داری کی بیحد شوقین تھی۔ جب وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتی تو فوج کے افسر بھڑکیلی وردیوں میں ملبوس اُس کے دورویہ چلتے، شہنائیاں بجتیں اور بڑا دلربا منظر ہوتا۔ اس کروفر سے سکندر اعظم نے دریائے سندھ پار کر کے ٹیکسلا کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اب وہ ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا کیونکہ اس وقت تک ہندوستان کا نام صرف دریائے سندھ سے مشرق میں آباد علاقے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

موجودہ اٹک کے قریب شمالی ہند کے راجا بے شمار تحائف لے کر سکندر اعظم کے استقبال کے لئے موجود تھے، ہزاروں بیل اور بھیڑیں انہوں نے سکندر اعظم کی خدمت میں نذرانے کے طور پیش کیں تاکہ یہ قربانی کے لئے یا یونانی سپاہیوں کے کھانے کے لئے ذبح کی جا سکیں۔ اکثر راجے ہاتھیوں کے جلوس لئے آئے تھے، ہاتھیوں پر شوخ رنگ کی ریشمی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، سونے اور چاندی کی زنجیروں کے ساتھ گھنٹیاں اس طرح بندھی ہوئی تھیں کہ ہاتھی چلتے تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آتی رہتی۔ یونانی ہاتھیوں کے ان جلوسوں سے خاص طور پر محظوظ ہوئے خود سکندر بھی ہندوستانی راجوں کی طرف سے اس پیشوائی پر بیحد متاثر ہوا۔

سکندر اعظم ٹیکسلا پہنچا تو جشنِ فتح منایا۔ اس کے اعزاز میں مختلف کھیل تماشوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک بہت بڑی ضیافت اس یورپی فاتح اور اس کے ہمراہیوں کے لئے ترتیب دی گئی تھی، ٹیکسلا کے حکمران سے پہلے ہی دوستانہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ سکندر اعظم نے اسے اپنے منصب پر بحال رکھا اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا۔

سکندر کے یونانی مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ (ٹیکسلا کے لوگ) آریہ تھے جو وقتاً فوقتاً شمالی پہاڑوں سے نکل کر یہاں آباد ہوئے۔ ایرانیوں کی طرح اُن کا بڑا پیشہ بھی مویشی پالنا تھا۔ وہ ایک بیوی پر اکتفا کرتے۔ آگ کی پوجا کرتے اور اندر دیوتا کے سامنے جھکتے تھے، ان میں سب سے معزز لوگ مقدونیوں کی مانند جنگجو تھے جنہیں چھتری (کھشتری) کہا جاتا تھا۔ برہمن ان کے مذہبی پیشوا تھے جو عوام کو یہ تعلیم دیتے کہ کسی کی جان لینا یا دوسروں کو دھوکا دینا یا جائداد کے لئے لڑنا گناہ ہے، کورش (شاہِ ایران) کے مذہبی رہنماؤں نے بھی ایرانیوں کو یہی تعلیم دی تھی، مقصد یہ تھا کہ رعایا بدامنی نہ پھیلائے اور حکمرانوں کے ہر جائز ناجائز حکم کی اطاعت کرے۔ یونانی مؤرخوں نے نوٹ کیا کہ چھتری اور برہمن اس

سرزمین کے اصل سیاہ فام باشندوں (کول۔ دراوڑ، شودر) سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ البتہ اعلیٰ جاتیوں کے افراد کے ساتھ برابر کا برتاؤ کرتے تھے، ٹیکسلا کے راجہ امبھی کو سکندر نے اپنی فوجِ خاص کے ہمراہ رکھا اور ہر معاملے میں اس کے مشوروں پر عمل کیا۔ دوسری طرف دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے مابین علاقے کے لوگوں نے سکندر اعظم کی سیادت کو تسلیم کر لیا اور کوئی مزاحمت قطعاً نہ کی۔

ٹیکسلا کا راجہ امبھی جہلم کے راجہ پورس کا سخت مخالف تھا، وہ ہر قیمت پر پورس کو زک پہنچانا چاہتا تھا۔ سکندر اعظم نے امبھی کو قول دے رکھا تھا کہ وہ پورس کی قوت کو توڑے اور اس کے غرور کو خاک میں ملائے بغیر دم نہ لے گا۔ سکندر اعظم اس زعم میں مبتلا تھا کہ اب دُنیا کی کوئی فوج اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکے گی۔ لیکن پورس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، طویل اور خوفناک معرکے ہوئے۔ پورس ناکام ہوا، اُسے سکندر اعظم کے سامنے پیش کیا گیا، پورس کی بہادری، اس کی صاف گوئی اور حاضر جوابی نے یونانی فاتح کا دل جیت لیا۔ اس نے پورس کی بیحد قدر کی۔ اس کا علاقہ اُسے لوٹا دیا اور اُسے جہلم کا راجہ تسلیم کر لیا۔

راجہ پورس پر فتح کی یادگار کے طور پر سکندر اعظم نے دو شہر آباد کئے، ایک تو دریائے جہلم کے مغربی کنارے پر تھا، جس کے متعلق قیاس ہے کہ یہ جلالپور کیکناں کا موجودہ قصبہ ہے، سکندر نے اپنے پیارے گھوڑے کی یاد میں، جو جہلم کی لڑائی میں کام آیا تھا، اس شہر کا نام بوسیفلار کھا، دوسرا شہر یونانیوں نے دریا کے مغربی کنارے بسایا، اس کا نام نکیا یا نکایا تھا جو آج کل مونگ کہلاتا ہے۔

جہلم کی فتح کے بعد سکندر بلا روک ٹوک آگے بڑھ گیا، اس کا مقابلہ چھوٹے چھوٹے راجوں سے تھا جو اس کے سامنے ٹھہر نہ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں اب پورس کا بہادر لشکر بھی سکندر اعظم کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ تاہم بیاس پر پہنچنے کے بعد کچھ تو شدید گرمی اور کچھ طویل جنگوں سے اکتا اور تھک ہار کر یونانی سرداروں اور سپاہیوں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً سکندر اعظم کو واپسی کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ وہ دریائی راستے سے ملتان، پنجند، سکھر اور حیدر آباد سے ہوتا ہوا بلوچستان اور ایران کی جانب روانہ ہو گیا۔ پنجند میں اس نے سکندریہ نام کا شہر بسایا اور حیدر آباد سندھ میں جسے اس وقت پٹالا کہا جاتا تھا ایک بحری مرکز قائم کیا۔ تاہم موت نے دنیا کے اس عظیم فاتح کو جلد ہی اپنے پنجے میں جکڑ لیا اور ۳۲۳ ق۔م میں صرف ۳۳ برس کی عمر میں مختصر علالت کے بعد دُنیا سے چل بسا۔

سکندر اعظم کا ارادہ تھا کہ وہ صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ کو مستقل طور پر مقدونوی سلطنت میں شامل کر لے لیکن اس کی جواناں مرگی کے باعث اس ارادے کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اس کی موت کی خبر سنتے ہی ہندوستانی راجے بغاوت پر اُتر آئے۔ سوات میں صوبہ سرحد کے یونانی گورنر کو نوکر کو قتل کر دیا گیا۔ پہاڑی قبائل نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ راجہ امبھی۔ راجہ پورس اور راجہ ابھیسار سبھی نے غیر ملکی حکومت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور اس طرح یونان کی سیاسی برتری برصغیر پاک و ہند میں ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی۔

چونکہ صوبہ سرحد اور پنجاب کے مقامی حکمران سکندر اعظم سے مقابلوں کے بعد بیحد کمزور پڑ گئے تھے ملک میں طوائف الملوکی برپا ہو گئی تھی اور کوئی مضبوط نظام حکومت باقی نہ رہا تھا، اس لئے جنوبی ہندوستان کے راجہ چندر گپت موریہ کے لئے میدان صاف ہو گیا۔ اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ان سارے علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا۔

اگرچہ سکندر اعظم کو صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب میں زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ ملا، اس کا قیام یہاں بیحد مختصر ثابت ہوا تاہم اس مختصر عرصۂ قیام میں اہلِ یونان نے اس علاقے کو بہت کچھ دیا۔ اس یونانی حملے کی بدولت پہلی بار مشرق اور مغرب کے مابین تہذیبی رشتہ قائم ہوا۔ ان باہمی تعلقات کو اصل استواری تب نصیب ہوئی جب سکندر اعظم کی موت کے بعد بہت سے یونانی سردار سرحدی علاقوں اور باختر میں رہ پڑے۔ یہ لوگ مقامی باشندوں سے گھل مل گئے۔ یہ وہ دور تھا جب یونانی علم و شعور، فضل و کمال اور تہذیب و تمدن اپنے پورے عروج پہ تھا اور یونان "مادرِ علوم" کہلاتا تھا، چنانچہ یونانیوں کے زیر اثر ان علاقوں میں علمی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں۔ بعد میں یونانی اور بودھ تہذیبیں عرصے تک ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہیں اور ان دونوں کے ثقافتی ورثوں کی ہم آہنگی سے ایک نئے مکتب فکر و فن کی بنیاد پڑی جسے دُنیا "گندھارا آرٹ" کے نام سے جانتی ہے، یونانی دانش وروں نے صرف ہندوستانی آرٹ ہی کو نئی سمتیں عطا نہیں کیں بلکہ فنِ تعمیر، نقاشی، تصوراتی شعریت، افسانہ نگاری، ادب اور تواریخ نویسی سبھی تخلیقی شعبوں میں ایک خوشگوار انقلاب برپا کر دیا۔

☆☆☆

موریا خاندان

۳۲۱ ق م ــ تا ــ ۱۸۵ ق م

موریا خاندان کا عہد ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ترین اور درخشاں دور تھا، یہی وہ خاندان تھا جس نے قریباً سارے ہندوستان کو ایک نظام حکومت کے تحت متحد کیا، اس خاندان کا بانی چندر گپت بجا طور پر برصغیر پاک و ہند کا پہلا بادشاہ تھا، موجودہ دکن کے ماسوا سارا ہندوستان اور افغانستان اس کے زیر نگین تھا۔ اس سے قبل یہ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر ریاست کا راجہ مطلق العنان حکمران تھا لیکن چندر گپت نے ان ریاستوں کو ختم کر کے انہیں ایک سیاسی وحدت میں ضم کر دیا۔ اسی بادشاہ کے ایک وزیر چانکیہ یا کوتلیا نے پہلی بار فرمانرواؤں کے لئے نظام حکومت کے اصول اور قوانین مرتب کئے اور "ارتھ شاستر" لکھ کر سیاسیات کی دُنیا میں ہل چل مچا دی، موریا خاندان کے تحت جو علمی اور تہذیبی ترقیاں ہوئیں انہیں دیکھ کر مؤرخ سمتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

"موریا دَور کے آغاز سے تاریکی چھٹ جاتی ہے اور روشنی نمودار ہوتی ہے۔ یعنی برصغیر ہند و پاک کے تاریخی واقعات واضح طور پر سامنے آنے لگتے ہیں"۔

پھر اسی خاندان کے راجہ اشوک کی کوششوں سے بدھ مت کو فروغ نصیب ہوا اور ایک وقت ایسا آیا کہ گندھارا (صوبہ سرحد) کی سرزمین بودھوں کی مقدس ترین زیارت گاہ بن گئی، بودھ سیاحوں نے اس سرزمین کو بیرونی دنیا سے روشناس کرانے میں نمایاں حصّہ لیا۔

چندر گپت

جن دنوں سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا، جنوبی ہندوستان میں مگدھ کے مقام پر نندہ خاندان کے تحت ایک مضبوط حکومت قائم تھی۔ یونانی مؤرخوں کا کہنا ہے کہ نندا راجہ مہا پدما کے پاس دو لاکھ پیادے، بیس ہزار سوار، دو ہزار جنگی رتھ اور تین ہزار

جنگی ہاتھی تھے، خیال ہے کہ شاید اسی بادشاہ کی فوجی طاقت سے مرعوب ہوکر سکندر کی فوجوں کو بیاس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوسکی تھی۔

ہندوستان سے سکندر کی واپسی کے فوراً بعد نند خاندان کے خلاف سازش کی گئی اور اسی خاندان کا ایک راجکمار، جس کا نام چندر گپت تھا۔ نند خاندان کا خاتمہ کرکے خود تخت پر بیٹھ گیا، کہا جاتا ہے کہ چندر گپت کو حکومت دلانے میں اس کے ہوشیار اور زمانہ ساز دوست چانکیا کی کوششوں کو بہت دخل تھا، اس لئے بعد میں چانکیا چندر گپت کا وزیر اعظم بن گیا۔

چندر گپت کی تاج پوشی ۳۲۲ قبل مسیح میں عمل میں آئی۔ چندر گپت کی ابتدائی زندگی کے حالات دستیاب نہیں البتہ اتنا کہا جاتا ہے کہ چونکہ وہ ایک نیچ ذات کی عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے راجہ نے اسے وراثت سے محروم کر دیا تھا، چندر گپت کو یہ بات ناگوار گزری اور اس نے حکمران راجہ کو تخت سے اتار کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ اس کی ماں کا نام مورا تھا۔ اس لئے چندر گپت کے خاندان کو موریا خاندان کہا جانے لگا۔

جہاں تک صوبہ سرحد کی تاریخ کا تعلق ہے، یہ جاننا کافی ہوگا کہ سکندر اعظم کے مرتے ہی اس کے یونانی جرنیلوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی اور یونانی مقبوضات کئی ٹکڑوں میں بٹ گئے باختر (افغانستان) صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ کے علاقے سکندر اعظم کے قابل ترین جرنیل سیلوکس نکوٹار کے حصے میں آئے۔ یونانی سرداروں کی باہمی کش مکش اور ملک میں پھیلی ہوئی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر چندر گپت موریا ان علاقوں پر حملہ آور ہوا اور بغیر کسی ٹکراؤ کے ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح خلیج بنگال سے درہ خیبر تک سارے علاقے پر موریا خاندان کا پرچم لہرانے لگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ چندر گپت سوات کے مورا غر کا رہنے والا ایک سیاسی قسمت آزما تھا۔ اور سکندر کی فوج میں شامل رہا تھا۔

سیلوکس کو چندر گپت کے اس اقدام کا پتہ چلا تو اس نے پوری قوت سے موریا فوجوں پر حملہ کر دیا، وہ صوبہ سرحد کو دوبارہ حاصل کرنے کے بعد دریائے سندھ کو عبور کرکے پنجاب کی طرف بڑھا اس کا خیال تھا کہ وہ سارے ہندوستان کو زیر نگیں کرنے لگا لیکن اب کے اس کا مقابلہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سرداروں کی بجائے متحدہ ہندوستان کے فرمانروا چندر گپت سے تھا۔ چندر گپت

اس وقت تک یونانی طریق جنگ سے پوری واقفیت حاصل کر چکا تھا اس لئے سیلوکس کی کوئی پیش نہ گئی اور بالآخر اُسے چندر گپت سے صلح کرتے ہی بن پڑی، تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کی غرض سے سیلوکس نے اپنی بیٹی چندر گپت سے بیاہ دی۔ جبکہ چندر گپت نے اُسے پانچسو ہاتھی تحفے کے طور پر پیش کئے، ایک صلح نامہ طے پایا جس کی رو سے سیلوکس پنجاب، صوبہ سرحد، قندہار، ہرات اور کابل کے صوبوں سے چندر گپت کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اور موریا سلطنت کی حدیں کوہ ہندوکش تک جا پہنچیں۔ سیلوکس یونانی اور چندر گپت کے مابین جنگ ۳۰۵ ق۔م میں ہوئی۔

سیلوکس اور چندر گپت کے معاہدۂ صلح کے متعلق کئی رائے ہیں، بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ سیلوکس شکست کھانے کے بعد صلح پر مجبور ہو گیا تھا جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ لڑائی سے پہلے ہی دونوں حکمرانوں کے مابین معاہدہ ہو گیا تھا۔

جہاں تک صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب کے جنگجو قبائل کا تعلق ہے۔ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غیر ملکی حکمرانوں سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے بھرپور جدوجہد کی، سکندر اعظم کی موت کے فوراً بعد جہلم کے راجہ پورس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا یونانی سردار یوڈامیس (EUDAMOS) نے اسے دبانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ تاہم ۳۱۷ ق۔م میں یوڈامیس نے دھوکے سے پورس کو ملاقات کے لئے بلایا اور قتل کرا دیا، پورس کے جانباز انتقام پر تل آئے تو یوڈامیس اور اس کے ساتھی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور شمالی پنجاب یونانیوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔

چندر گپت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نند حکمران نے اُسے مگدھ سے جلاوطن کر کے پنجاب میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا، چنانچہ سکندر اعظم کے حملے کے وقت چندر گپت پنجاب ہی میں مقیم تھا اور ایک چھوٹی سی ریاست کا سردار تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ چندر گپت نے ٹیکسلا میں سکندر اعظم سے ملاقات کی تھی اور یونانیوں کے طریق جنگ کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ سیلوکس سے جنگ میں اس نے انہی جدید فوجی طریقوں پر عمل کر کے کامیابی حاصل کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چانکیہ سے جس کا اصل نام وشنو گپتا تھا، چندر گپت کی ملاقات ٹیکسلا ہی میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے دوران چندر گپت اس طرار برہمن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اور پھر اسی کی بتائی ہوئی چالوں پر عمل کر کے اس نے نند خاندان کا تختہ الٹ دیا اور اپنے دور کا

سب سے بڑا ہندوستانی بادشاہ بن بیٹھا، یونان کے مؤرخوں میگاستھنیز، اربن، کرٹیس، پلوٹارک اور جسٹن نے چندر گپت کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ علاوہ ازیں جین مت اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں سے بھی موریا خاندان کے بانی کے بارے کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ سٹرابو (STRBO) لکھتا ہے کہ چندر گپت اپنے شاہی فرائض بڑی باقاعدگی سے انجام دیتا تھا۔ دن کے پہلے حصے میں وہ رعیت کے مختلف وفود سے ملتا، مقدمات کے فیصلے انجام دیتا اور مالی اور سیاسی مسائل حل کرتا تھا جبکہ سہ پہر کو فوجی اور انتظامی امور پر توجہ دیتا تھا۔ اس نے حکومت کے ہر شعبے میں اصلاحات کیں نظم و نسق کو بہتر بنایا اور ایک آئینی نوعیت کی بادشاہت کو بڑی کامیابی سے چلایا۔

چوبیس سال (۳۲۱ ق م تا ۲۹۸ ق م) تک نہایت شان و شوکت سے دادِ حکومت دے کر چندر گپت اپنے منصب سے دستبردار ہو گیا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ جین مت کا پیروکار تھا۔ جین گرو بھدرا باہو نے پیش گوئی کی تھی کہ ملک میں زبردست قحط پڑے گا جو بارہ برس تک رہے گا جب یہ پیش گوئی پوری ہوتی ہوئی معلوم ہوئی تو بھدرا باہو بارہ ہزار پیروکاروں کو لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ چندر گپت موریا بھی بادشاہت چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ بھدرا باہو میسور کے قریب مر گیا لیکن چندر گپت اس کے بارہ برس بعد بھی زندہ رہا اور مرتے وقت تک گیان دھیان میں لگا رہا اس کی وفات ۲۹۸ ق م میں واقع ہوئی۔

تاہم بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ چندر گپت اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا تھا اور دستبرداری سے بارہ سال بعد تک زندہ رہا تاہم امور سلطنت سے کوئی واسطہ نہ رکھا اور ہمہ تن عبادت و ریاضت میں لگا رہا۔

ارتھ شاستر کوتلیا یا چانکیہ کی تصنیف ارتھ شاستر کو ایشیا میں وہی مقام حاصل ہے جو میکیاولی کی تصنیف 'پرنس' (PRINCE) کو یورپ میں حاصل ہوا۔ اس کتاب میں نظام سیاسیات پر محض دنیوی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، مصنف کے خیال میں بادشاہ یا حکمران کو بہر صورت اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنی چاہیئے، اس کے نزدیک اصل چیز کامیابی ہی ہے۔ کامیابی کے حصول کے لئے جو بھی ذرائع اختیار کئے جائیں جائز ہیں۔ چانکیہ روحانی اور مذہبی اقدار کی ہرگز پابندی نہیں کرتا، اخلاقی ضابطوں کا لحاظ نہیں رکھتا۔ بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ بادشاہ کو اپنا اقتدار قائم رکھنے

کے لیئے ہر جائز ناجائز حربہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ارتھ شاستر میں بادشاہ کا اہم ترین فرض یہ بتایا گیا ہے کہ ہمسایہ ممالک کے خلاف مسلسل جنگ کی جائے، اگر جنگ چھیڑنے کی کوئی وجہ نہ بھی ہو تو کسی حیلے بہانے ہی سے جنگ چھیڑ دے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ اس کی حدود سلطنت میں توسیع ہوتی رہے۔

میگستھنیز میگستھنیز ایک یونانی عالم تھا جو یونانی سفیر کی حیثیت میں ۳۰۲ قبل مسیح سے ۲۹۸ ق م تک چندر گپت موریا کے دارالحکومت پاٹلی پترا (پٹنہ) میں قیام پذیر رہا۔ اس نے اس وقت کے شمالی ہندوستان کے جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی اور سیاسی حالات اپنی کتاب "اِنڈیکا" میں لکھے ہیں۔ "انڈیکا" کی چار جلدیں تھیں لیکن صرف ایک جلد دستیاب ہوئی ہے اور وہ بھی نامکمل صورت میں۔ میگستھنیز لکھتا ہے کہ چندر گپت کی سلطنت ایک رفاہی مملکت تھی جس کے شہریوں کو ہر ممکن سہولتیں حاصل تھیں۔ میونسپل کمیٹیاں اور دوسرے جمہوری ادارے قائم تھے، حکومت کے ہر شعبے کے دستور مرتب اور منضبط تھے۔

یونانی علماء میں میگستھنیز ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے ہندوستان کے متعلق صحیح معلومات اہلِ مغرب تک پہنچائیں، اس اعتبار سے میگستھنیز کا قیام ہند بے حد مفید ثابت ہوا چنانچہ فیلقوس کا کہنا ہے کہ چندر گپت نے سیلوکس کو عمدہ عمدہ تحائف بھیجے تھے جن کے جواب میں سیلوکس نے اُسے ایک ہی تحفہ بھیجا اور وہ مشہور عالم میگستھنیز تھا جس نے اس وقت کی تاریخی واقعات کو معرضِ تحریر میں لاکر انہیں زندہ جاوید بنا دیا۔

بندوسار چندر گپت موریا کی تخت سے دستبرداری پر اس کا بیٹا بندوسار اس کا جانشین قرار پایا جس نے ۳۰۰ قبل مسیح تک ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکومت کی، کئی مورخوں نے اس کا نام مترا جیت بتایا ہے جبکہ دوسروں کا کہنا ہے۔ کہ اس کا نام تو بندوسار ہی تھا لیکن چونکہ وہ جنگ و جدل کا بے حد شائق اور دشمنوں پر انتہائی سخت تھا، اس لئے اس کا لقب مترا جیت (دشمن کو ہلاک کرنے والا) قرار پایا۔ اس کے ۲۵ سالہ دورِ حکومت کے اکثر واقعات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا عہد اہم واقعات سے خالی ہے اور اس نے محض اپنے باپ کے نظامِ سلطنت کو آگے بڑھایا ہمسایہ ممالک سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے اور یونان، مصر، شام اور ایران کے سفیر اس کے دربار میں حاضر رہا کرتے تھے۔

جہاں تک صوبہ سرحد پر بندوسار کی حکومت کا تعلق ہے پتہ چلتا ہے کہ اس کے عہد میں بھی سرحدی

قبائل اپنی آزادی کے لئے بدستور سرگرم عمل رہے، ٹیکسلا اور اس کے نواح میں بار بار بندوسار کے خلاف بغاوتیں ہوئیں، بندوسار نے اپنے بیٹے اشوک کو ان بغاوتوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے ٹیکسلا بھیجا۔ اشوک کی کوششوں سے باغی قبائل نے ہتھیار ڈال دیئے اور سرحدی علاقوں میں امن وامان قائم ہوگیا۔ بہرحال اشوک کو نوجوانی میں کافی عرصہ تک ٹیکسلا ہی میں ٹھہرنا پڑا ـــــ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سوتیلی ماں نے حسد کی آگ میں جل کر اشوک کو راجدھانی سے اتنی دور ٹیکسلا بھیج تھا تاکہ وہ ولی عہدی سے محروم رہ جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا اور بالآخر اشوک ہی وارث تخت قرار پایا۔

انہی سرحدی مہموں کے دوران اشوک کو ضلع پشاور اور مردان کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور اس نے بہت سے کتبے یہاں لگوائے۔ مردان سے تقریباً دس میل دور شہباز گڑھ میں ایک چٹان پر بھی اپنے مذہب کے اصول کندہ کرائے۔

مہاراجہ اشوک

راجہ بندوسار نے ۲۷۳ ق م میں وفات پائی تو اس کے بیٹے اشوک نے اس کی جگہ لی، تاہم اشوک کی باقاعدہ تاج پوشی چار سال بعد ۲۶۹ قبل مسیح میں عمل میں آئی۔ اس تاخیر کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اشوک بندوسار کا سب سے بڑا بیٹا نہ تھا۔ اس لئے اُسے اپنے بڑے بھائیوں سے تخت حاصل کرنے کے لئے مسلسل لڑائی لڑنا پڑی، تاہم کچھ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ اس وقت کی شاہی روایات کے مطابق حکمران کی کم سے کم عمر ۲۵ سال مقرر تھی۔ باپ کی موت کے وقت چونکہ اشوک کم عمر تھا۔ ۲۶۹ ق م میں پچیس سال کا ہوا تو تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے کہ اشوک اپنے باپ کا بیحد احترام کرتا تھا اس نے ہندو رواج کے متعلق مرنے کے چار سال بعد باپ کی برسی منائی اور ماتم ترک کیا۔ تب کہیں جاکر اس نے اپنی تاجپوشی کا اہتمام کیا۔

اشوک قدیم تاریخ ہند کے عظیم ترین فرمانرواؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی امن پسندی ایک ضرب المثل بن چکی ہے، اپنے آخری دور میں اس نے رعایا کی خوشحالی کے لئے اتنا کام کیا کہ لوگ اس کا انتہائی احترام کرنے لگے۔ وہ اپنے آپ کو ایک مذہبی خادم سمجھتا تھا چنانچہ اس نے اپنے لئے "ڈیونم پیا" اور "پیاداسی" کے القاب پسند کئے۔ بہت سے کتبوں میں اس کے اصل نام اشوک کا ذکر تک نہیں بلکہ اس نے اپنے لئے یہی لقب استعمال کرنا بہتر سمجھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اشوک چانکیہ کے "ارتھ شاستر" کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے توسیع

سلطنت کے لئے کوشاں رہا۔ اس نے ہمسایہ ریاستوں پر متواتر حملے کئے۔ اسی طرح کی ایک زبردست جنگ اُسے کالنگا (اڑیسہ) میں لڑنی پڑی، طرفین کے پاس بے پناہ فوجی قوت تھی اس لئے لڑائی نہایت خونریز اور طویل تھی، اگرچہ اشوک نے بالآخر میدان مار لیا تاہم اسے لڑائی کے نقصانات کا علم ہوا تو انتہائی نادم ہوا۔ اُسے بتایا گیا کہ اس جنگ میں ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے اور ڈیڑھ لاکھ کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ مال وجائداد کی جو تباہی ہوئی ، وہ الگ تھی۔ اس تباہ کن لڑائی نے اشوک کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے جنگوں سے توبہ کر لی اور امن پسندی کی پالیسی پر کاربند رہنے کا عہد کیا۔ بودھ مت چونکہ امن اور رواداری کا علمبردار تھا اس لئے اشوک نے گوتم بودھ کی تعلیمات پر چلنے کا ارادہ کر لیا۔

اشوک کو صوبہ سرحد کے معاملات سے کامل آگاہی تھی۔ اُسے اہلِ سرحد کے ساتھ کام کرنے کا بہت کافی موقع ملا تھا۔ عالمِ شہزادگی میں وہ کئی برسوں تک ٹیکسلا کا گورنر رہا تھا۔ اس نے کئی بار سرحدی قبائل کے خلاف مہمات کی قیادت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس نے سرحدی قبائل کے ساتھ تشدد کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے انہیں حکمتِ عملی سے رام کرنے کی کوشش کی۔ جو کام تیغ وسپاہ سے نہیں ہو سکتا ہے وہ مذہبی اور اخلاقی مبلغوں کے وعظ ونصیحت سے پورا ہو گیا، سر اولف کیرو کا کہنا ہے کہ اگرچہ اشوک نے ایک پُرامن سرحدی پالیسی پر عمل کیا اور اس کے عہد میں سرحدی جھڑپیں بہت کم ہوئیں البتہ ایک حیران کن واقع یہ دیکھنے میں آیا کہ اس وقت سے پٹھانوں کا کرلانٹری قبیلہ "گار" اور "سامل" دو طبقوں میں بٹ گیا۔

اشوک کے دور میں صوبہ سرحد کو اتنی تاریخی اہمیت حاصل ہوئی کہ یہ سرزمین دُنیا بھر کے بودھوں کے لئے متبرک ترین جگہ بن گئی، مگدھ سے مہاتما گوتم بودھ کے ذریعے جو اخلاقی اور مذہبی روشنی اٹھی تھی وہ سیالکوٹ (ساگالا) اور ٹیکسلا سے ہوتے ہوئے پشاور بلکہ کابل اور بامیان تک پہنچی، لاہور تحصیل صوابی وہ اوّلین جگہ تھی جہاں کے ایک باشندے نے صوبہ سرحد میں سب سے پہلے بدھ مت قبول کیا، یہ مقام آج ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن کسی زمانے میں ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا اور پانینی ایسا عالم جس نے سنسکرت کی گرامر مدوّن کی یہیں کا رہنے والا تھا، کہا جاتا ہے کہ اشوک کے حکم سے لاہور کے اسی قصبے میں ایک بہت بڑا بودھ معبد تعمیر کیا گیا، چینی سیاح ہیون سانگ کی آمد تک یہ معبد

موجود تھا اور ہیون سانگ نے اپنے سفر نامہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

نوجوانی میں اشوک ٹیکسلا اور اُجین کا گورنر رہ چکا تھا۔ ان دونوں مقامات پر اُن دونوں بہت بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں اس لئے اشوک کو بڑے بڑے عالموں فاضلوں کی صحبت میسر رہی۔ اس کے دل میں علمی لگن پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں اپنے دورِ حکومت میں اس نے بدھ مت کی نشر و اشاعت کے لئے بہت سی درس گاہیں قائم کیں خصوصاً صوبہ سرحد تو بودھ آثار کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔

پشاور یونیورسٹی میں ڈاکخانہ کے پاس ایک ٹیلہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک بہت بڑی بودھ یونیورسٹی کے آثار پائے گئے ہیں۔ تنہکال میں برساتی نالے (خوڑ) کے بائیں طرف اس دور کے برتنوں کے ٹکڑے ملے ہیں۔ پلوسی خوڑ کے بائیں جانب بھی دو ٹیلے ہیں جن پر بودھ سٹوپا کے آثار ملتے ہیں۔ چغرمٹی کے قریب ڈھیری داس مل، نوشہرہ کے قریب ولئی کے کھنڈرات، علی مسجد (درہ خیبر) کے قریب شوپلا سٹوپا اور کافر کوٹ سبھی بودھ دور کے یادگاریں ہیں۔ علاوہ بریں شہباز گڑھ (مردان) میں پتھر کی چٹان پر پالی زبان میں مہاراجہ اشوک کے چودہ فرمان درج ہیں، یہ فرمان زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں سے تیرھویں فرمان سے اس وقت کے تاریخی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے کیونکہ کتبے میں اشوک کے پانچ ہم عصر یونانی بادشاہوں کے نام بھی درج ہیں۔ شہباز گڑھ کا قدیم نام درشناہ پور تھا اور اس وقت ایک مشہور شہر تھا۔

پشکلاوتی (چارسدہ) کے مقام پر، جو مدتوں وادیٔ گندھارا کا صدر مقام رہا۔ مہاراجہ اشوک نے ایک بہت بڑا سٹوپا (ٹھٹھ) بنوایا تھا جس کے متعلق روایت ہے کہ وہاں مہاتما بودھ نے اپنی آنکھوں کا دان دیا تھا، مردان کے گائڈ میس میں موریہ خاندان اور خصوصاً مہاراجہ اشوک کے زمانے کے کئی نوادرات رکھے ہوئے ہیں جو انگریزی دور کی ابتدا میں فوجی افسروں نے گرد و نواح سے اکٹھے کر کے وہاں رکھے۔ بکھلی (نہرہ) میں مانسہرہ کے قریب بھی مہاراجہ اشوک کے کتبے پائے گئے ہیں، اسی طرف سوات اور باجوڑ کی سرزمین بدھ مت کا اتنا بڑا مرکز تھی کہ اسے "باغِ اشوکا" کہا جاتا تھا۔ ۶۳۰ء میں یوآن چوانگ سیاح اس علاقے میں آیا تو یہاں بودھوں کی چودہ سو خانقاہیں اور مندر موجود تھے فاہیان نے بودھ معبدوں اور یادگاروں کی تعداد پانچسو لکھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اشوک کو پوپا گپتا نامی فلسفی نے بدھ مت کی طرف راغب کیا تھا، وہ بودھ تعلیمات سے

اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کشت وخون سے توبہ کر لی، اہنسا (عدم تشدد) کو اپنا اصول بنالیا اور ایسا ضابطۂ اخلاق بنایا جس سے دنیا میں امن ونیکی کا غلغلہ ہو اور لوگ اعلیٰ روحانی قدروں کی طرف مائل رہیں۔ اشوک نے انہی اصولوں کو کتبوں اور لاٹھوں پر کندہ کرایا تاکہ ان کی وسیع پیمانے پر نشر واشاعت ہوتی رہے۔

اشوک کے کتبوں سے جہاں اس کے مذہبی عقیدوں اور اصولوں پر روشنی پڑتی ہے، وہیں یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ اس وقت تعلیم عام تھی۔ لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے، اشوک کے تخت وسیع علاقوں کی ایک مشترکہ زبان ایسی تھی۔ جسے سب جگہوں کے لوگ سمجھتے تھے۔ ان کتبوں سے موریا سلطنت کی سرحدوں کا تعین بھی ہوتا ہے اور ہم یہ جان سکتے ہیں کہ شمال میں بلخ۔ بامیان۔ کابل۔ لمغان۔ سوات اور دیر سے لے کر جنوب میں سری لنکا اور اڑیسہ تک کے وسیع علاقے موریا حکمرانوں کے زیر نگیں تھے، گویا یہ کتبے اور معبد تاریخ قدیم کے کھلے ہوئے اوراق ہیں جن سے ہمیں اس دور کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

بُدھ مت کا عروج وزوال

بُدھ مت اصل میں ہندو مذہب کے خلاف ایک احتجاجی یا اصلاحی تحریک تھی۔ ہندوؤں نے ذات پات کی تقسیم کا جو طریق رائج کیا تھا اس سے نچلے طبقوں کی تذلیل اور پامالی ہوتی تھی، انسانی مساوات پر ضرب پڑتی تھی، اسی طرح آواگون کے چکر میں ڈال کر ہندو مذہب نے انسانی سوچ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ بدھ مت نے ان فرسودہ خیالات کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے انسان کو فکر وعمل کی آزادی سے روشناس کرایا۔ ذہنوں پر پڑی ہوئی زنجیروں سے آزاد کرایا۔ بتایا کہ تمام انسان اپنی تخلیق، اپنی فطرت اور اپنی جولان گاہ عمل میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ برہمنوں کی اجارہ داری ختم کر کے بدھ مت نے انسانی زندگی کو بے حد متاثر کیا۔

پھر جہاں ہندو مذہب کی عبادات محض روایات کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھی وہیں مہاتما گوتم بدھ ایک تاریخی شخصیت بن کر ابھرے، ان کی اپنی سیرت نے عوام کے لئے باعث تقلید مثال قائم کی، ان کے گرد لوگوں کو تقدس اور امن کا ہالہ نظر آیا چنانچہ اس وقت کا ہندوستانی معاشرہ، جو کشت و خون، جنگوں اور تباہیوں سے تنگ آیا بیٹھا تھا، فوراً ہی بدھ تعلیمات کی طرف مائل ہو گیا۔

دیکھا جائے تو بدھ مت نے ایک نیا مذہب ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا بلکہ یہ ایک اخلاقی ضابطۂ حیات تھا جو انسان کی عملی زندگی میں مشعلِ راہ کا درجہ رکھتا تھا۔

مہاراجہ اشوک کے عہد سے قبل بدھ مت موجود تو تھا لیکن اُسے برہمنوں کے فلسفے کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک بدھ مت کی تعلیم ترکِ دنیا، سخت کوشی اور ریاضت شاقہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے اس قدر دشوار اور ناقابلِ عمل تھی کہ صرف چند بھکشو (راہب) ہی اسے اپنا سکتے تھے۔ نیز ہندو راجوں کی مخالفت کی وجہ سے بھی بُدھ مت پنپنے نہیں پایا تھا، جب اشوک نے ایک بدھ عالم اپاگنیا کے ہاتھ پہ بدھ مت قبول کیا تو بودھوں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی اور اُن پر تبلیغ و اشاعت کی راہیں کھل گئیں، اپنے دورِ حکومت کے بیسویں یا اکیسویں برس اشوک نے تمام بُدھ عالموں کی ایک کانفرنس طلب کر کے اس میں بُدھ مت کے پرچار کا ایک مکمل منصوبہ تیار کیا اور تمام بڑے بڑے بدھ گوروؤں کو مختلف علاقوں میں تبلیغ کا انچارج بنا دیا۔ اسی منصوبے کے تحت مدھیانتیکا نامی ایک بدھ مُبلّغ کو گندھارا (صوبہ سرحد) اور کشمیر بھیجا گیا، اس کی کوششوں سے یہاں اس مذہب کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ یہ علاقہ بدھ تہذیب و ثقافت کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اگرچہ گوتم بدھ دریائے گنگا کے کنارے پیدا ہوئے لیکن بودھوں کے لئے گندھارا سب سے مقدس اور متبرک علاقہ بن گیا۔

کئی روایات میں بتایا گیا ہے کہ مہاتما بُدھ نے موجودہ صوبہ سرحد کے علاقوں میں کئی سفر کئے لیکن یہ بات تاریخی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ تاہم کئی بدھ معبد اور سٹوپا ایسے ہیں جو مہاتما بدھ کی زندگی کے کسی واقع کی یاد دلاتے ہیں، ان بدھ یادگاروں میں پشاور میں گوتم بدھ کے کاسۂ گدائی کا سٹوپا اور گنج گیٹ پشاور کے باہر شاہ جی کی ڈھیری میں چار سو فٹ اونچا وہ بے نظیر معبد بھی تھا، جہاں ایک نہایت خوبصورت ہشت پہلو ڈبیہ میں مہاتما بودھ کے پھول (جلی ہوئی ہڈیاں) مدفون تھے۔ انگریزی عہدِ حکومت میں یہ ڈبیہ برآمد ہوئی تو مہاتما بدھ کی ہڈیاں تو انگریزوں نے تحفے کے طور پر برما کے لوگوں کو دے دیں جن کا سرکاری مذہب آجکل بھی بدھ مت ہی ہے اور وہ تواریخی ڈبیہ لندن میوزیم کو بھیج دی گئی تاہم کوئی بارہ سال ہوئے حکومتِ پاکستان نے برطانوی حکومت سے یہ ڈبیہ حاصل کر کے اسے پشاور کے عجائب خانہ کی تحویل میں دے دیا۔

پشاور کے علاوہ پشکالوتی (موجودہ چارسدہ) پلالوڈھیری، غزڈھیری، بی بی سیدہ ڈھیری، تخت بھائی ساری بہلول، جمال گڑھی، لاہور (تحصیل صوابی) مالاکنڈ، سوات، ٹیکسلا اور دوسرے سرحدی مقامات میں بدھ آثار بہت کثرت سے ہیں۔ انہی بودھ یادگاروں کی بدولت صوبہ سرحد کی سرزمین بودھوں کی سب سے بڑی زیارت گاہ کا درجہ حاصل کر گئی تھی اور دنیا کے دور دراز علاقوں کے سیاح اور زائر یہاں آیا کرتے تھے۔

مہاراجہ کنشک کے عہد میں بدھ مت کو مزید فروغ ملا۔ اس وقت سے مہاتما بدھ کے مجسمے بنانے کا آغاز ہوا تو صوبہ سرحد کے فنکاروں نے ایرانی۔یونانی اور ہندی مکاتب فکر کے امتزاج سے جنم لینے والے آرٹ (جو بعد میں گندھارا آرٹ کہلایا) کی بدولت وہ مجسمے تراشے جو آج کل صوبہ سرحد اور پاکستان بلکہ دنیا کے اکثر عجائب گھروں میں بدھ مت کے سنہری دور کی یاد دلا رہے ہیں۔

"بدھ ازم ان پاکستان" کے مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ گندھارا کسی وقت دنیا بھر میں بودھوں کا سب سے بڑا تہذیبی مرکز تھا۔" تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بودھوں کا یہ دورِ عروج ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گیا اور آج ڈھونڈے سے بھی صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں مہاتما گوتم بدھ کا ایک پیروکار دکھائی نہیں دیتا۔

اشوک کے جانشین

چالیس سال تک پوری شان و شوکت سے دادِ حکومت دینے کے بعد اشوک ۲۳۲ قبل مسیح میں فوت ہو گیا۔ بودھوں اور جینیوں کی مذہبی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ اشوک کی بہت سی بیویاں اور بہت سے بیٹے بیٹیاں تھیں لیکن وہ اتنے قابل حکمران نہ تھے کہ اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال سکتے اس لئے خانہ جنگی میں الجھ کر رہ گئے۔ ڈاکٹر ونسنٹ سمتھ کا خیال ہے کہ اشوک کی موت کے بعد سلطنت اس کے دو بیٹوں دسرتھ اور سمپارتی میں منقسم ہو گئی، اول الذکر کو مشرقی علاقوں اور موخر الذکر کو مغربی علاقوں کا اقتدار ہاتھ آیا۔ اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ موریا حکومت کا زوال صوبہ سرحد، پنجاب اور کشمیر ہی کے علاقوں سے شروع ہوا۔ اس سے قبل اشوک اور بندوسار کے عہد میں بھی ٹیکسلا کے صوبے میں کئی بار بغاوتوں کو دبا دیا گیا تھا۔ پولی بس یونانی لکھتا ہے کہ اشوک کے جانشینوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے صوبہ سرحد میں شہزادہ دیماسینا نے اپنی خود مختار ریاست قائم کر لی، اس کے جانشین سوبھاگا سینا نے اپنے آپ کو کمزور پا کر ۲۰۶ ق م

میں قندہار کے یونانی حکمران انٹاکوس سے معاہدہ امن کرلیا۔ اسی طرح راج ترنگنی کے مصنف کا بیان ہے کہ اشوک کے مرتے ہی اشوک کے ایک بیٹے جلوکا (JALUKA) نے علاقہ کشمیر میں ایک الگ ریاست قائم کرلی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشوک کی فراخدلانہ اور نرم پالیسی کی وجہ سے اکثر سرحدی قبائل نے چپ سادھ لی تھی لیکن اس کے جانشینوں کے دور میں جو طوائف الملوکی پھیلی اس سے ساری موریا سلطنت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا، عدم تشدد کی تعلیم کے نتیجے میں موریا فوج بے عمل ہو کر رہ گئی تھی اس لئے اشوک کے جانشین حالات پر قابو نہ پا سکے۔ موریا خاندان کے تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھوکا گیا جب پشیامترا نامی ایک زمانہ ساز اور چالاک برہمن سپہ سالار نے آخری موریا حکمران "برہدرتھ" کو قتل کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی، یہ برہمن سالار سنگ خاندان سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ اس کے اس اقدام سے ہندوستانی سیاست میں سنگ خاندان کی حکمرانی کی بنیاد پڑی۔

☆☆☆

باختری یونانی

۱۸۵ ق م — تا — ۹۷ ق م

سکندر اعظم کی موت کے بعد صوبہ سرحد، افغانستان، باختر، ایران اور شام کے علاقوں پر مشہور یونانی سپہ سالار سیلوکس نکوٹار کا قبضہ ہوگیا، سیلوکس نے چندرگپت موریا پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی اور بالآخر صلح پر مجبور ہوگیا، ان دونوں حکمرانوں کے مابین صلح نامہ میں موریا اور یونانی سلطنتوں کی نئی حد بندی کی گئی چنانچہ سارے صوبہ سرحد، شمالی پنجاب، افغانستان موریا حکمران کی تحویل میں دے دیئے گئے جبکہ باختر، ایران اور شام پر بدستور یونانی حکومت کرتے رہے۔ سیلوکس کا وقت زیادہ تر شام میں گزرتا تھا، اس لئے اس نے باختر پہ ایک یونانی گورنر تعین کر دیا جس کا نام یوتھاڈیماس (EUTHDEMOS) تھا۔ سیلوکس ۲۸۰ ق م میں فوت ہوگیا تو اس کا بیٹا انطوکیو (ANTICHOS) اوّل نے اس کی جگہ لی، ان دونوں یونانی فرمانرواؤں کے دور میں باختر میں امن و امان رہا۔ لیکن انطوکیو دوم کے زمانے میں ۲۵۰ قبل مسیح میں ڈیوڈوٹس (DIODOTOS) نے جو اپنے باپ یوتھاڈیموس کی جگہ گورنر مقرر ہوا تھا، باختر میں علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی۔ انطوکیو دوم اس پر بڑا سٹپٹایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ باختر کی بغاوت کو فرو کرتا۔ باختر کے ہمسایہ صوبہ پارتھیا نے بھی یونانی حکومت سے باغی ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پارتھیا (موجودہ خراسان) کے باغیوں کا سرغنہ ارساکیز نامی سردار تھا۔

انطاکیو دوم ایک سست الوجود بادشاہ تھا۔ وہ باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے قاصر رہا۔ تاہم اس کے بیٹے اور جانشین انطاکیوسوم (۲۲۳ تا ۱۸۷ ق م) نے پارتھیا اور باختر کے سرکشوں کے خلاف فوج کشی کی تو پارتھیا کا باغی لیڈر صلح کرنے پر مجبور ہوگیا۔ پارتھیا کی مہم سے فارغ ہو کر انطاکیوسوم ۲۰۸ ق م میں باختر پہنچا، طویل عرصے تک لڑائی ہوتی رہی لیکن بالآخر یونانی شہنشاہ نے

یوتھاڈیمس اور اس کے بیٹے ڈیمٹریس (DEMETRIUS) کی بہادری اور دانائی کو تسلیم کرتے ہوئے جنگ بند کر دی اور چند شرائط کے تحت ڈیمٹریس کو باختر میں اپنی خود مختار حکومت چلانے کی اجازت دے دی۔

انطاکیو قندہار اور کرمان سے ہوتا ہوا عراق اور شام کی طرف لوٹ گیا تو ڈیمٹریس نے پھر پر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ اب کے اس کی نظر ہندوستان پر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب موریا سلطنت رُو بہ زوال تھی۔ ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی مچی ہوئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیمٹریس کسی خاص مزاحمت سے دوچار ہوئے بغیر کابل، قندہار، ہرات، صوبہ سرحد اور پنجاب پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ طویل عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد یوتھاڈیمس ۱۹۰ ق م میں فوت ہو گیا۔ اس کے جانشین ڈیمٹریس نے زیادہ توجہ اپنے ہندوستانی مقبوضات کو مستحکم بنانے پر صرف کی، ڈیمٹریس کے عہد کے بہت سے سکے حالیہ کھدائیوں میں برآمد ہوئے ہیں جن پر ایک طرف یونانی اور دوسری طرف خروشتی رسم الخط میں حکمران کا نام درج ہے۔ ڈیمٹریس نے پنجاب اور صوبہ سرحد کا مقامی دارالحکومت ٹیکسلا کو قرار دیا۔ اس کا زیادہ تر وقت وہیں گزرتا تھا۔ اس کی باختر سے غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر ایک یونانی فوجی سردار یوکریٹاڈیز (EUCRATIDES) نے بغاوت کرتے ہوئے باختر کی عنان حکومت خود سنبھال لی۔ اس پر ڈیمٹریس اور یوکریٹاڈیز میں طویل جنگ چھڑ گئی۔ بالآخر ڈیمٹریس کو باختر سے دستبردار ہونا پڑا اور اس نے صوبہ سرحد اور پنجاب ہی کی حکومت پر اکتفا کر لیا۔

اُدھر یوکریٹاڈیز بھی زیادہ دنوں تک باختر میں چین سے نہ بیٹھ سکا بلکہ اُسے شمال میں ساکا قبائل کے حملوں کا جواب دینا پڑا جبکہ جنوب سے پارتھیا کے بادشاہ متھراڈیٹس (MITRADATES) نے فوج کشی کر کے اس کا قافیہ تنگ کئے رکھا، بالآخر صوبہ سرحد اور پنجاب کا علاقہ دو یونانی حکمرانوں ڈیمٹریس اور یوکریٹاڈیز میں بٹ گیا۔ دریائے جہلم سے مشرق میں ڈیمٹریس حکومت کرنے لگا۔ اس کی راجدھانی ساگالا (سیالکوٹ) قرار پائی جبکہ یوکریٹاڈیز ٹیکسلا، پشاور، کیپی سا اور کابل کے علاقوں پر حکم چلانے لگا۔

جہاں تک جنوبی پنجاب اور شمالی ہندوستان کی تاریخ کا تعلق ہے، موریا خاندان کی جگہ سنگ خاندان نے لے لی تھی۔ پشیامترا نے آخری موریا حکمران کو قتل کر دینے کے بعد ۱۴۲ ق م میں سنگ

خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ سنگ حکمران برہمنی عقیدے کے سختی سے پابند تھے، جانوروں کی قربانی کرتے تھے اور عدم تشدد (اہنسا) پر یقین نہیں رکھتے تھے، بُدھ لوگ انہیں اپنا قاتل قرار دیتے ہیں پشیامترا کا بیٹا اگنی مترا تھا، پُران نے لکھا ہے کہ سنگ خاندان نے ۱۱۲ برس تک حکومت کی، سنسکرت کا مشہور عالم پانینی (ساکن ہنڈ تحصیل صوابی) بھی سنگ خاندان کے براہمن ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔

پشیامترا نے ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کے علاوہ باختریوں کو بھی شکست دی، اس کے ہمعصر یونانی فرمانروا کا نام ڈیمیٹریس تھا، تاہم بعد میں سنگ خاندان نے یونانی حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے، سنگھا راجہ بھاگ بھدرا کے عہد میں ٹیکسلا کے یونانی حکمران انطال کیداس (ANTAL KIDAS) کی طرف سے یونانی سفیر ہیلیوڈورس (HELIODORUS) سنگ راجدھانی میں قیام پذیر تھا۔ بسانگر کے کتبوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

اب تک چالیس سے زیادہ ایسے یونانی حکمرانوں کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں جنہوں نے صوبہ سرحد اور پنجاب پر دادِ حکومت دی۔ ان میں کچھ خاتون حکمران بھی شامل ہیں۔ تاہم ان سب حکمرانوں کی تفصیل کا پتہ نہیں چلتا۔ پروفیسر ولسن (WILSON) نے یونانی سکّوں کے مطالعے کے بعد اہم یونانی حکمرانوں کے یہ نام دیئے ہیں:۔

ڈیمیٹریس	(DEMETRIUS)	۱۹۰ ق م
انطی مارکس	(ANTIMACHUS)	۱۵۰ ق م
مائی لندر	(MILANDAR)	۱۲۶ ق م
اپالوڈوٹس	(APPOLLODOTUS)	۱۱۰ ق م
ہریس	(HARAEUS)	۹۸ ق م

ہریس آخری باختری یونانی حکمران تھا جس نے ۵۰ ق م تک صوبہ سرحد اور پنجاب کے بعض حصّوں پر حکومت کی، یہاں تک کہ یوچی قبیلہ کے ایک سردار کاڈفیسز (KADPHISES) نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

ان باختری یونانی حکمرانوں میں مائی لندہ (MILANDA) یا مینندر (MANANDER) سب سے زیادہ طاقتور تھا، سٹرابو (STRABO) کا کہنا ہے کہ یہ حکمران برصغیر ہندوپاک کے ان علاقوں تک پہنچا جہاں تک

سکندر اعظم بھی پہنچ نہ سکا تھا۔ سیالکوٹ اس کا صدر مقام تھا۔ وہ عالم فاضل انسان تھا اور عالموں کا بیحد قدردان تھا، اس نے بدھ مت کے مشہور مبلغ ناگا سینا کے وعظ و نصیحت سے متاثر ہو کر بدھ مت قبول کر لیا تھا، بدھ مت کی کتابوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ بودھوں نے اس کی بڑی قدر و عزت کی اور مرنے کے بعد جب اسے نذر آتش کیا تھا تو اس کی مقدس راکھ کو مختلف بدھ خانقاہوں اور معبدوں میں تبرکاً تقسیم کر دیا گیا۔

یونانی بادشاہوں نے صوبہ سرحد اور پاکستان کے دوسرے علاقوں پر تقریباً ایک سو سال حکومت کی جبکہ باختر میں اُن کا سکہ کوئی دو سو سال تک چلتا رہا۔ صوبہ سرحد میں اپنے دور حکومت میں باختری یونانی خانہ جنگیوں میں مبتلا رہے، خراسان یا پارتھیا کا یونانی حکمران متھری ڈیٹس اوّل MITHRADATUS (۱۷۴ تا ۱۳۶ ق م) خاندان کا سب سے طاقتور حکمران تھا۔ اس نے کچھ عرصے کے لئے سارے صوبہ سرحد اور ٹیکسلا پر قبضہ کر لیا۔ تاہم بعد میں جب اس کے اپنے ملک میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں تو ان علاقوں سے دستبردار ہو کر واپس خراسان چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد باختر اور پارتھیا (خراسان) دونوں جگہوں پر ساکا پارتھین قبیلے کا اقتدار قائم ہو گیا اور یونانی حکومت ان علاقوں میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

ساکا خاندان

۹۷ ق م — ۵ء

مقدونیا اور کوشان خاندانوں کی حکومتوں کے درمیانی عرصہ میں، جو تین صدیوں پر محیط ہے، صوبہ سرحد متواتر غیر ملکی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ باختری یونانی، ساکا، ہندی پارتھین اور دوسرے قبائل نے یکے بعد دیگرے اس سرزمین پر فوج کشی کی اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے برسر حکومت رہے، باختری یونانی باہمی خانہ جنگیوں سے کمزور پڑ گئے تو اُن کے مقبوضات رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ساکا یا سنتھین وہ چرواہے تھے، جو آب و دانہ کی تلاش میں وسطی ایشیا سے نکلے اور کابل اور قندھار کی زرخیز وادیوں میں آباد ہو گئے۔ منگول اور ترک انہی کی شاخیں تھیں، چینی شہنشاہوں نے دیوار چین انہی وحشی قبائل سے بچنے کے لئے تعمیر کی تھی، کچھ مدت کے لئے انہوں نے چین پر قبضہ کر لیا لیکن ۱۴۰ قبل مسیح کے لگ بھگ چینیوں نے انہیں نکال باہر کیا تو وہ ایران کی طرف رُخ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پارتھیا (خراسان) کے یونانی فرمانرواؤں کے زمانے میں ساکا لوگ قندھار کے نواح میں آباد ہو گئے۔ جنگجو اور محنت کش تو تھے ہی، موقع ملتے ہی انہوں نے قوت حاصل کر لی۔ چنانچہ ساکا سردار موئیز اوّل باختر سے کابل تک کے علاقے کا گورنر بن گیا۔ وہ بڑے نام یونانی فرمانرواؤں کے تحت تھا لیکن یونانیوں کا پنجہ ڈھیلا ہوا تو ساکا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بعد میں وہ ارکوسیا (قندھار) سے نکل کر پہلے غزنی اور نواحی علاقوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر رفتہ رفتہ پیواڑ (کرم) ٹوچی (بنوں) اور گومل (ڈیرہ اسمٰعیل خان) کے راستوں سے صوبہ سرحد میں داخل ہو گئے۔

۹۷ ق م اور ۷۷ ق م کے درمیانی عرصہ میں ساکا قسمت آزماؤں نے اپنے سردار موئیز کی قیادت میں صوبہ سرحد پر دھاوا بول دیا۔ یہ لوگ غضب کے شہسوار تھے اور نیزوں سے لڑائی کرتے تھے۔ ان کے طوفانی حملوں کو روکنا مقامی حکمرانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے وہ بڑھتے گئے اور

تھوڑے ہی عرصہ میں ماوئیز نے سارے صوبہ سرحد اور پنجاب پر ساکا حکومت قائم کرلی، اس کی راجدھانی ٹیکسلا تھی تاہم اس نے پشکلاوتی (چارسدہ) کی آبادی اور خوشحالی پر بھی پوری توجہ دی۔ ساکا نے یہاں تک زور پکڑا کہ وہ سندھ، بلوچستان بلکہ گجرات کاٹھیاواڑ تک کے حاکم بن گئے۔

اس خاندان کے بادشاہوں نے باختری یونانیوں کی طرح سکہ سازی جاری رکھی لیکن اُن کے سکوں پر دی ہوئی تصویروں میں وہ دلکشی باقی نہ رہی جو یونانی عہد کے سکوں کا خاصہ تھی، ان کے سکوں کی تحریر خروشتی ہے اور تصویریں دیوی دیوتاؤں کی ہیں۔ ان کے ثقافتی ورثہ میں یونانی آثار نمایاں ہیں۔ صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب میں ستفین اور پارتھین عہد کے مسکوکات اور نوادر زیادہ تر ٹیکسلا اور چارسدہ کے مقامات سے برآمد ہوئے۔

سکوں سے چار ساکا حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے جن کے نام ماوئیز، آذیزاؤل۔ آذیلیسز، آذیز دوم ہیں۔ ماوئیز کو مقامی زبان میں موگا بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے نہ صرف گندھارا اور ٹیکسلا کو زیرنگین کیا بلکہ ڈیمیٹریس یونانی کے جانشینوں سے پنجاب کا بہت سا علاقہ بھی چھین لیا۔

ماویز کے بعد آذیزاؤل نے اس کی جگہ لی، اس حکمران کو وکرمی سن کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ آذیزاؤل کے بعد عنانِ حکومت آذیلیسز کے ہاتھ لگی۔ چاروں ساکا حکمرانوں میں آذیز دوم آخری بادشاہ تھا۔ ان چاروں حکمرانوں کے عہدِ حکومت میں بہت سے ساکا سردار ایسے تھے جو مختلف صوبوں کے گورنر یا ستراپ کہلاتے تھے، ان میں سے ٹیکسلا اور متھرا کے ستراپ خاندان خصوصیت سے نمایاں تھے۔ ٹیکسلا کے ساکا گورنر لائیکا کسولکا (LAIKA KASULKA) اور اس کا بیٹا پٹیکا (PATIKA) ایسے حاکم تھے جن کے نام ٹیکسلا کی قدیم تحریروں میں درج تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ پارتھین (یا پہلوی) قبیلے (جو ساکا ہی کا قرابت دار تھا) کے حکمران میتھاڈیٹس دوم نے ساکا کی حکومت کا خاتمہ کر کے صوبہ سرحد (گندھارا) اور ٹیکسلا کے علاقوں پر تسلط جمالیا، یہ واقع ۵۰ ق م کا بیان کیا جاتا ہے۔

ہندی پارتھین یا پہلوی

۶۵ء — تا — ۶۷۵ء

پارتھین یا پہلوی ساکا خاندان کے قرابت دار تھے اور پارتھیا (خراسان) کے ایرانی صوبے میں رہتے تھے۔ اُردشیر اس خاندان کا بانی تھا، خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے بڑے جفاکش اور جنگجو تھے جسٹن کا بیان ہے کہ پارتھین پرندوں کی طرح کا پتروں کا کوٹ پہنتے تھے، سونے چاندی کا استعمال نہ کرتے تھے، صرف ہتھیاروں میں ان دھاتوں کو استعمال کرتے تھے، ان کے ہاں تعدّد ازدواج کی اجازت تھی لیکن زناکاری کو بہت بڑا جُرم سمجھا جاتا تھا جس کے لئے سنگین سزا تھی، شکار کے علاوہ کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے، گھڑسواری کو بہت پسند کرتے تھے یہاں تک کہ میلوں ٹھیلوں تک مرد گھڑسواری ہی دکھائی دیتے تھے صرف غلام پیدل چلتے تھے۔ اپنے مُردوں کو کھلے میدانوں میں رکھ دیا کرتے تھے، گدھ اور چیلیں انہیں نوچ نوچ کر کھا جاتے تو بعد میں ہڈیاں دفن کر دی جاتی تھیں۔ توہم پرست لوگ تھے، دریاؤں تک سے گزرتے وقت چڑھاوے چڑھاتے تھے۔

صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے ٹیکسلا کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تھا۔ جہاں ان کے کئی آثار دریافت ہوئے ہیں۔ سرجان مارشل "رہنمائے ٹیکسلا" میں لکھتے ہیں کہ پہلوی یا پارتھین اعلیٰ درجہ کے شہسوار اور تیرانداز تھے، مہذب لوگ تھے۔ نسلاً ایرانی تھے اور ایران ہی کی ایک بولی بولتے تھے۔ ان کا ملک قدیم ایسانی اور میدی سلطنتوں کا ایک حصّہ رہ چکا تھا۔ اس لئے انہیں یونانی اور سلجوقی تہذیب و ثقافت درثے میں ملی تھی۔ شروع میں یہ لوگ باختری حکمرانوں کے تابع فرمان تھے۔ لیکن چونکہ بلا کے جنگجو تھے۔ اس لئے بہت جلد انہوں نے طاقت پکڑلی اور بالآخر باختری حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ پہلا پارتھی یا پہلوی بادشاہ جس نے موجودہ صوبہ سرحد

کو فتح کیا متھراڈیٹس اوّل (MITHRADATES) تھا۔ اس نے ٹیکسلا پر قبضہ جما لیا اور اپنے آپ کو مستحکم کر کے ہندوستان پر حملے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اسی عرصے میں ساکا قبائل اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ پارتھیا پر پے در پے حملے کرنے لگے۔ مجبوراً اس کو اپنے وطن واپس جانا پڑا تاکہ وہ ساکا حملوں کو روک سکے۔ متھراڈیٹس اوّل نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں ۱۳۸ قبل مسیح تک اپنی حکومت مستحکم کر لی تھی تاہم وقتی طور پر اس نے پارتھیا پر اپنی توجہ مرکوز کر لی۔

اس شہنشاہ کے بیٹے متھراڈاٹس دوم کے زمانے میں وسط ایشیا سے آنے والے ساکا پارتھین قبائل نے پنجاب اور صوبہ سرحد پر حملے کئے اور کسی حد تک وہ اپنی عارضی حکومت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تاہم متھراڈاٹس دوم نے ساکا لوگوں کو شکست دے کر موجودہ مغربی پاکستان پر دوبارہ اپنا تسلط قائم کر لیا۔

ایران میں پہلوی یا پارتھی حکومت کوئی پانچسو سال تک قائم رہی اور اس کے کُل ۲۶ حکمران ہوئے جن کے نام کا سکّوں سے پتہ چلتا ہے۔ یہ لوگ "شاہ شاہاں" یا "شاہنشاہ" کہلاتے تھے اور ان کے تحت مختلف پارتھی اور ساکا سردار مختلف علاقوں کے حاکم تھے۔ تاہم صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب میں پارتھین حکومت بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہی، اس علاقے کے پارتھین حکمرانوں میں (GONDOPHARES) گونڈفریز نامی بادشاہ بہت مشہور گزرا ہے۔ تخت بہائی (ضلع مردان) سے ایک کتبہ ملا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گندھارا اور شمالی پنجاب پر حکومت کرتا تھا۔ قیاس ہے کہ گونڈوفریز داخلی طور پر خود مختار تھا لیکن خارجی طور پر ایران کی ارکاسی پارتھی حکومت کی بالادستی کو تسلیم کرتا تھا۔ گنڈوفریز پارتھین قبیلے کی سورین شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا نظم و نسق مثالی اور اس کی حکومت بڑی مستحکم تھی، تاہم ۵۰ عیسوی میں ایک نیا قبیلہ کوشان وسط ایشیا سے نکل کر صوبہ سرحد اور پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ کوشان حملہ آوروں اور گنڈوفریز کے جانشینوں میں ٹیکسلا کی فصیل سے قریب خوفناک جنگ ہوئی جس میں اس خطے کا آخری پارتھین حکمران مارا گیا اور کوشان ان علاقوں کے نئے حکمران قرار پائے۔ شہر تباہ ہو گیا اور کوشان فاتحین نے یہاں کے لوگوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا۔ ٹیکسلا کے موضع سری کپ سے پارتھین بادشاہوں کے آثار کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں۔

گنڈوفریز کے زمانے میں تخت بہائی کا شہر اپنے پورے عروج پر تھا لیکن بعد میں سفید ہُن قبیلہ

کے حکمرانوں طورمان اور مہرگل نے اس عظیم شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔ فاہیان جب ۵۲۰ء میں صوبہ سرحد آیا تو تخت بہائی کی تمام عمدہ عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ گندھارا آرٹ کے نوادر تلاش کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ کھدائیاں تخت بہائی ہی میں ہوئی ہیں اور یہیں سے سنگ تراشی کے بہترین نمونے ملے ہیں۔ تخت بہائی کے حکمران گنڈوفریز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ گنڈوفریز نے ایک عالیشان محل کی تعمیر کے لئے بہت سے کاریگر ملازم رکھے تھے۔ سینٹ ٹامس نامی عیسائی مبلغ بھی انہی معماروں میں سے ایک تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں سینٹ طامس کی تبلیغی کوششوں سے گنڈوفریز بادشاہ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اور دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی مسیحیت کو اپنا دین بنا لیا۔ تاہم اس روایت کی پوری طرح تصدیق نہیں ہو سکی۔

پارتھین یا پٹھان

ہوتی مردان کے مرحوم نواب سر محمد اکبر خان ایک انگریزی کتابچہ میں لفظ "پٹھان" اور "افغان" کی تحقیق کے سلسلے میں پارتھین حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پارتھین حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی اولاد کا دوسرا نام ہے۔ سکندر اعظم کی آمد کے بعد اسی پارتھین قوم نے صوبہ سرحد کے موجودہ علاقوں پر مشتمل ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، پارتھین اور ان کے جانشینوں کے عہد میں یہ حکومت ۲۲۶ء تک برقرار رہی۔ ان کی حدود سلطنت مشرق میں ٹیکسلا اور اٹک سے لے کر مغرب میں بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھیں۔ نواب ہوتی کا خیال ہے کہ یہ قوم اوّل درجے کی اوباش۔ شراب خور اور عیش پرست تھی۔ اس کے اکثر سردار دیہات سے نوجوان لڑکیوں کو بھگا لے جاتے تھے۔ اسی لئے انہیں "پٹھ آن" یا "لڑکیاں اغواء کرنے والے" کہا جانے لگا۔ افغان بھی چونکہ بنی اسرائیل ہونے کے باعث پارتھین لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ اس لئے جب مغرب کی طرف سے وہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان اور صوبہ سرحد میں وارد ہوئے تو انہیں بھی پارتھین یا پٹھان کے نام سے پکارا جانے لگا۔

اس تحقیق سے نواب سر محمد اکبر خان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پٹھان ایک سُبک اور حقیر لفظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی پختون اپنے آپ کو "پٹھان" کی بجائے "افغان" کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

سر اولف کیرو کا خیال ہے کہ ساکا۔ پارتھین اور کشان حملہ آوروں کے زیر اثر صوبہ سرحد میں پشتو زبان نے جنم لیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایک ترقی یافتہ ادبی زبان بن گئی۔

******

کوشان حکمران

۶۰ء — تا — ۲۲۵ء

کوشان تاتار یا منگول لوگ تھے اور یوچی قبیلے کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خانہ بدوش چرواہے ابتداء میں چین کے شمال مغربی علاقوں میں آباد تھے لیکن ۱۶۵ قبل مسیح کے لگ بھگ ایک دوسرے وحشی قبیلہ ہُن سے اُلجھ پڑے، ہُن غالب رہے اور کوشان کو اپنے آبائی وطن کو چھوڑتے ہی بن پڑی۔ چین سے نکل کر صحرائے گوبی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے کوشان پہلے دریائے آمو کے کنارے آباد ہو گئے جہاں ساکا قوم پہلے سے رہ رہی تھی۔ دونوں قبیلوں میں ٹھن گئی۔ تاہم کوشان کامیاب رہے اور انہوں نے ساکا کو بھگا کر باختر میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ باختر صدیوں تک یونانی النسل حکمرانوں کے تحت رہ چکا تھا اور تہذیب و ثقافت کا ایک عظیم گہوارہ بن گیا تھا۔ کوشان خاندان نے یہاں رہ کر منظم حکومت کے طور طریقے سیکھے اور رہن سہن کے مہذب انداز اپنا لئے کوشان دراز قد، خوبصورت، گورے چٹے اور جنگجو لوگ تھے، باختر میں رہ کر انہوں نے بہت ترقی کی اور ان کا شمار اپنے وقت کی عظیم قوموں میں ہونے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ باختر میں یوچی قبیلہ کی پانچ بڑی بڑی شاخیں آباد تھیں جن میں ایک کوشان کہلاتی تھی۔ خوش قسمتی سے کوشان کو ایک ذہین رہنما کجولا کاڈ فیسز (KAJULA KADPHISES) میسر آگیا جس نے بڑی حکمت عملی سے باقی چار قبیلوں سے اپنی برتری منوالی۔ اور ایک متحدہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ واقع ۳۰ عیسوی کے لگ بھگ کا ہے۔ بعد میں یوچی کی بجائے اس قبیلہ کو کوشان کہا جانے لگا۔

کاڈفی سس اوّل | کاڈفی سس اوّل یا کجولا کاڈفی سس ایک بیدار مغز اور جرأت آزما حکمران

تھا، یوچی قبیلے میں اتحاد و تنظیم کی رُوح پھونک کر اس نے انہیں اتنا مضبوط بنا دیا کہ دوسری حکومتوں کے لئے اُن کے مقابلے میں ٹھہرنا ناممکن ہوگیا۔ اس نے کابل اور قندہار کو فتح کرنے کے علاوہ ایران کی پارتھین سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کوشان حکمران کے بہت سے سکّے برآمد ہوئے ہیں جن کے ایک رُخ پر یونانی اور دوسرے رُخ پر خروشتی رسم الخط میں اس کا نام درج ہے، سکوں پر اس نے اپنا نام "کجولا کاشار کوشان" لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور شاہی القاب و آداب کا سہارا نہیں لیا۔ تاہم ۷۸ء کے قریب جب اسی سال کی عمر میں اس نے وفات پائی تو کوشان خاندان کا تسلط بہت بڑے علاقے پر قائم ہو چکا تھا۔

کاڈفی سس دوم کجولا کے بعد اس کا بیٹا ویما کاڈفی سس (VIMA) یا کاڈفی سس دوم وارث تاج و تخت قرار پایا۔ اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور یکے بعد دیگرے بہت سے علاقے فتح کر لئے۔ صوبہ سرحد کے موجودہ علاقوں کو زیر نگیں کرنے کے بعد وہ ٹیکسلا کی طرف بڑھا جہاں ایک سا کا حاکم داد حکومت دے رہا تھا۔ ایک زبردست جنگ کے بعد اس نے ٹیکسلا پر قبضہ کر لیا، ٹیکسلا میں پاؤں جمانے کے بعد وہ اور آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ سارے پنجاب پر قابو پانے کے بعد شہنشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ ویما کاڈفی سس کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ وہ چین سے ٹکر لینے لگا۔ تاہم اس محاذ پر اُسے زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور کچھ عرصے تک وہ چینی شہنشاہوں کو خراج ادا کرتا رہا۔

کاڈفی سس دوم کے سکّے کافی تعداد میں ٹیکسلا اور ہزارہ سے برآمد ہوئے ہیں۔ بعض سکّوں پر ہندو دیوتا شیو جی کی تصویر ہے اور بعض پر بیل کی۔ مورخین کا قیاس ہے کہ اغلباً اس حکمران نے ہندو مت اختیار کر لیا تھا۔

کاڈفی سس دوم نے قریباً چالیس برس حکومت کی۔ اس کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ دریائے گنگا کے مغربی کنارے سے لے کر سندھ تک اور مغرب میں دریائے آمو کی وادی تک اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس حکمران نے ۱۳۰ عیسوی میں وفات پائی تو اس کے بعد کنشک تخت نشین ہوا جو نہ صرف کوشان خاندان کا عظیم ترین حکمران تھا بلکہ اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ طاقتور بادشاہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔

کنشک کنشک کشان خاندان کا سب سے نامور حکمران تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کاڈفی سس دوم

کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا اور نہ ہی اس کی تخت نشینی کی کوئی حتمی تاریخ متعین کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم ہندوؤں میں نہ تو تاریخ نگاری کا فن رائج تھا اور نہ ہی ان کے ہاں جغرافیہ کا کوئی واضح تصور موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مؤرخوں تک نے یہ اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کا زمانہ وہ تاریک دور تھا کہ تاریخ اور دوسرے علوم پر دیومالا کی کہانیوں کا گمان ہوتا تھا اور حقیقت روایات کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ کنشک کے حسب نسب کی طرح اس کے مذہب کے بارے میں بھی یقینی معلومات معدوم ہیں۔ مؤرخین کا قیاس ہے کہ کوشان اصل میں زردشتی عقائد کے پیروکار تھے اور آگ کی پوجا کرتے تھے لیکن بعد میں شیو دیوتا اور دوسرے ہندو دیوی دیوتاؤں کو بھی ماننے لگے۔ کنشک بھی ابتدا میں آزاد خیال سا تھا کئی باتوں میں وہ ہندومت کے قریب تھا اور کئی باتوں میں زردشتی عقائد سے متاثر نظر آتا تھا۔ بعد میں وہ بدھ مت کی تعلیمات پر کاربند ہو گیا، بدھ مت کی کتابوں میں اُسے شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس امر کے تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ اس نے بدھ مت کے فروغ و اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا اور مہاراجہ اشوک کی طرح بدھ مت کو ایک عالمگیر مذہب کا درجہ دے دیا۔ تاہم اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مہاراجہ کنشک نے فی الواقع بدھ مت قبول کر لیا تھا۔

بُدھ مت کا فروغ

مہاراجہ کنشک کے ذاتی عقائد جو کچھ بھی ہوں، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بُدھ مت کا عظیم سرپرست تھا۔ اس کی کوششوں سے اس مذہب کو نئی زندگی ملی، بُدھوں میں نیا جوش و جذبہ پیدا ہوا۔ اور اس کے عہد میں صوبہ سرحد بدھ معبدوں اور خانقاہوں کی سرزمین بن گیا۔ ساری بدھ دنیا کے زائرین ان مقدس مقامات کی زیارت کو آنے لگے چینی سیاحوں ہیون سانگ اور فاہیان کا کہنا ہے کہ وادیٔ گندھارا میں وہ جہاں جاتے بدھ معبدوں کی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتیں، یہاں کی غالب آبادی اس وقت مہاراجہ کنشک کے زیر اثر مہاتما گوتم بدھ کی حلقہ بگوش ہو چکی تھی۔ آج بھی صوبہ سرحد بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جتنی بدھ عمارتیں اور یادگاریں صوبہ سرحد میں دریافت ہوئی ہیں، اتنی کسی دوسرے ہندوستانی علاقے سے حاصل نہیں ہو سکیں۔

بُدھ مت کے فروغ و اشاعت کے ضمن میں کنشک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بُدھ

عالموں اور رشیوں کی چوتھی بین الاقوامی مجلس کبیر منعقد کرائی جو مہا سنگھ کہلاتی تھی۔ ساری بدھ دُنیا سے پانچسو کے قریب نمائندے اس مجلسِ کبیر میں شامل ہوئے۔ بعض لوگوں کے خیال میں مجلس کشمیر میں بلائی گئی تھی جبکہ بعض مورخوں نے اس کا مقام انقاد حالندھر بتایا ہے۔ چونکہ اس وقت تک بُدھ مت میں بہت سی فروعی باتیں دوسرے مذہبوں کی داخل ہو گئی تھیں اور بدھ مت کے مختلف فرقوں میں بہت سے اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ اس لئے بودھ عالموں نے کافی غور وخوض کے بعد بدھ مت کی تعلیمات اور اصولوں کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ فروعات اور بدعات کو ختم کر کے ایسے عقائد متعین کئے جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ تھے۔ بعد میں ان اصولوں کو محفوظ بنانے کی خاطر انہیں تانبے کی تختیوں پر کندہ کر دیا گیا۔ پھر ان تختیوں کو ایک پتھر کے صندوق میں بند کر کے ایک بدھ خانقاہ میں رکھ دیا گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بدھ خانقاہ کہاں تھی یا بعد میں تختیوں کا حشر کیا ہوا۔ تاہم وقتی طور پر بدھ مت کی تبلیغی مہم کو ایک نئی قوت حاصل ہوئی۔ چونکہ کنشک کی سلطنت بیحد وسیع تھی اور اس میں چین، برما، سیلون اور دوسرے علاقے بھی شامل تھے اس لئے بدھ مت ہندوستان سے نکل کر ان ملکوں میں بھی پھیل گیا۔

اس امر کا بھی امکان ہے کہ کنشک نے بدھ مت کے فروغ کی یہ سب مہم سیاسی حکمت عملی کی بناء پر چلائی ہو اور اس کا مقصد رعایا کے تالیف قلوب کے علاوہ انہیں پُرامن اور عدم تشدد کے پیروکار بنانا ہو۔ راجہ کنشک کے ذاتی عقائد اس شبہ کو اور بھی تقویت دیتے ہیں۔ اس لئے کہ بدھ مت قبول کر لینے کے باوجود کنشک نے جنگ وجدل کو ترک نہ کیا اور اہنسا (عدم تشدد) کے بنیادی بدھ عقیدے کی پیروی نہ کی۔ چونکہ بدھ مت خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش تھا بلکہ اکثر لوگ اسے ایک مذہب کی بجائے محض ایک اصلاحی تحریک اور اخلاقی تربیت کا نظام سمجھنے پر اکتفا کرتے تھے۔ اس لئے کنشک بھی مہاتما بدھ کو محض ایک اوتار مانتا تھا۔ اوتار ہونے کی حیثیت میں کنشک کے نزدیک مہاتما بدھ کے بت بنانا جائز تھا حالانکہ مہاتما بدھ نے لوگوں کو بت پرستی سے ہمیشہ باز رہنے کی تلقین کی تھی۔ اسی طرح کنشک سنسکرت زبان کو دوسری زبانوں پر ترجیح دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہندوؤں کے زیر اثر ہی ایسا کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

مہاراجہ کنشک کی طرف سے بلائی گئی مجلس کبیر کو کامیاب بنانے میں بدھ عالموں اشوا گھوش

اور وشوامتر کا بہت ہاتھ تھا۔ اس کانفرنس کے فیصلوں کے نتیجے میں بودھوں کا مہایانہ فرقہ معرضِ وجود میں آیا جو راجہ اشوک کے رائج کردہ ہنایانہ فرقے سے خاصا مختلف تھا۔ کنشک کے زمانے سے مہایانہ ہی بودھوں کا سرکاری مذہب قرار پایا۔ اس فرقے میں جدیدیت کا اصول کارفرما تھا اور یہ ہندومت اور بدھ مت کے فلسفوں کا امتزاج تھا۔ اس طرح روایتی سادگی اور سخت کوشی بھی ختم ہوگئی۔ لوگ آرام طلبی اور لذت کوشی کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک غیر مرئی معبود کی بجائے مرئی معبود کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے انہوں نے مہاتما بدھ کے بُت اور مجسمے تراشنے شروع کر دیئے۔

کنشک کے دور سے بدھ مت واضح طور پر دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہنایانہ فرقہ زیادہ تر دکنی علاقوں تک محدود ہوگیا، اس فرقے کے حامی اپنے اصولوں میں بڑے متشدد تھے۔ راہبانہ زندگی کو پسند کرتے تھے، ننگے پاؤں رہتے تھے، سورج ڈھلے کھانے پینے سے باز رہتے تھے۔ اور اہنسا (عدم تشدد) کے اصول پر سختی سے کاربند تھے یہاں تک کہ وہ فاقہ کشی سے اپنی زندگی ختم کر لینے کو کمالِ عبادت سمجھتے تھے ۔ اس کے برعکس مہایانہ فرقہ پنجاب، صوبہ سرحد اور افغانستان کے لوگوں کا مقبول فرقہ بن گیا۔ مہایانہ کے پیروکاروں کے نزدیک مذہب صرف بُت پرستی کا نام رہ گیا۔ عملی زندگی سے اس کا رابطہ کٹ گیا۔ دونوں بدھ فرقوں کے عقیدوں کی افراط و تفریط کی وجہ سے بدھ مت زوال پذیر ہونا شروع ہوگیا اور برہمنی عقیدوں کو پنپنے کا موقع مل گیا۔

فتوحات اور توسیعِ سلطنت

کنشک نے ۲۵ برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ اس کی سلطنت شمال میں بخارا سے لے کر جنوب میں کراچی تک اور مشرق میں خلیج بنگال سے لے کر مغرب میں سرزمین روم تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کاشغر، تبت اور ترکستان کے علاقے چین سے چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کر لئے تھے۔ اس کے سفیر شہنشاہ روم اور دنیا کے دوسرے بڑے بڑے درباروں میں متعین تھے۔ اس کے عہد میں برصغیر اور ایران، عرب، عراق اور روم کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارت اور لین دین ہونے لگا تھا۔ وہ فراخدل اور صلح کل انسان تھا۔ اس لئے وہ ہر قوم کی تہذیب و ثقافت کے اچھے پہلوؤں کو اپنانے کا حامی تھا۔ وہ علم و فن کا قدردان اور ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کا سرپرست تھا۔ یہی

وجہ ہے کہ اس کے زمانے میں علوم وفنون، تہذیب وثقافت، تجارت وصنعت کا عروج دیکھنے میں آتا ہے جو اس سے قبل ناپید تھا۔ اسی لئے کنشک کو ہر دور میں ایک روشن خیال اور عظیم حکمران تسلیم کیا جاتا رہے گا۔

کنشک کو فتوحات اور توسیع سلطنت کا بیحد خیال رہتا تھا۔ اس لئے دن رات جنگ وجدل میں محو رہا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے افسر اور سپاہی ان متواتر لڑائیوں سے بیزار ہو گئے اور جان چھڑانے کے لئے انہوں نے سازش کر کے ۱۷۲ عیسوی میں کنشک کو قتل کر دیا۔ خود خون میں نہایا گیا تو اس کا خون آشام دور بھی ختم ہو کر رہ گیا۔

پشاور ــــ نیا دارالحکومت صوبہ سرحد کی تاریخ وثقافت پر کوشان حکمرانوں اور بالخصوص مہاراجہ کنشک کی چھاپ اس لئے بھی گہری ہے کہ یہی وہ حکمران تھا جس نے سب سے پہلے ٹیکسلا، باختر اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر پشاور کے مرکزی اور کلیدی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ کنشک کے زمانے میں پشاور بدھوں کا ایک مرکزی تہذیبی شہر بن گیا، یونانی، آریائی، چینی، ہندی، ایرانی اور بدھ تہذیبی اور ثقافتی روایات یہاں پہنچیں تو اتنی خلط ملط ہو گئیں کہ ان کی باہمی اثر پذیری سے ایک نیا اور صحت مند کلچر گندھارا آرٹ کے نام سے وجود میں آیا۔

کنشک سے پہلے کوشان حکمران کاڈفی سس اوّل نے پشاور میں ایک پگوڈا یا مینار کی بنیاد رکھی تھی اس پگوڈا کی تکمیل کنشک کے عہد میں ہوئی۔ اس پگوڈا کی بلندی چار سو فٹ تھی۔ یہ تیرہ منزلہ عمارت تھی۔ مینار کے اوپر منقش لکڑی کا کام نہایت عمدہ تھا۔ اس کے چاروں طرف لوہے کا چمکدار جنگلہ لگا ہوا تھا۔ ونسنٹ سمتھ کا بیان ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں چینی سیاح سوانگ نے اسے دیکھا تو اس وقت تک اسے تین مرتبہ آگ لگ چکی تھی اور تینوں مرتبہ بدھ مت کے شیدائیوں نے اسے ازسرِنو تعمیر کرایا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں جب مشہور بدھ عالم ویرا دیوا یہاں آیا تو اس عمارت میں ایک بڑی درس گاہ اور خانقاہ تھی جہاں بدھ نوجوانوں کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ بھکشو یہیں رہنے اور ضبطِ نفس کی تربیت پاتے تھے، بعد میں سفید ہن حملہ آوروں کے ہاتھوں یہ عظیم عمارت تاخت وتاراج ہو کر رہ گئی۔

۱۹۰۹ء میں جب گنج گیٹ پشاور سے ڈیڑھ دو میل جنوب مشرق میں اس مقام کی کھدائی کی گئی جو "شاہ جی کی ڈھیری" کے نام سے موسوم تھی تو اس عظیم سٹوپا کے آثار برآمد ہوئے۔ اس میں سے ایک ہشت پہلو طلائی ڈبیہ برآمد ہوئی جس کے اندر شیشے کی ایک بوتل میں رکھ کر مہاتما گوتم بدھ کے پھول (جلی ہوئی ہڈیاں) محفوظ کی گئی تھیں، اسی متبرک ڈبیہ کی وجہ سے پشاور دنیا بھر کے بدھوں کا بنارس بن گیا تھا اور عقیدت مند دور دراز علاقوں سے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر یہاں پہنچتے تھے۔ برطانوی حکومت نے مہاتما بدھ کی ہڈیاں تو تحفتاً اہلِ برما کو (جو زیادہ تر اب بھی بدھ مت کے پیروکار ہیں) دے دیں لیکن یہ تاریخی ڈبیہ لندن میوزیم کے حوالے کر دی گئی۔ ڈبیہ پر خروشتی رسم الخط میں کنشک کا نام اور ڈبیہ بنانے والے کاریگر اجی سلاس (AGESILOS) کے نام تحریر ہیں۔ اور ان پر ہندو دیوتاؤں برہما اور اندرا کی تصویروں کے علاوہ مہاتما بدھ اور کنشک کی تصویریں بھی بنائی گئی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہماری حکومت نے یہ نادر ڈبیہ لندن سے منگوا کر پشاور میوزیم کی تحویل میں دے دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جی کی ڈھیری میں پیپل کا ایک قدیم اور مقدس درخت بھی تھا جو کئی سو سال کے بعد سوکھ کر ختم ہو گیا۔

مشہور محقق قاضی عبدالحلیم اثر لکھتے ہیں کہ کنشک سے پہلے وادیٔ پشاور پر جتنے ہندو راجوں نے حکومت کی ان کی مقامی راجدھانی سوات میں تھی۔ بعد میں جب سوات کا خطہ کوشان سلطنت کا ایک حصہ بنا تو بھی کنشک نے اسے بڑی اہمیت دی، یہی وجہ ہے کہ منگورہ، اوڈے گرام اور سوات کے دوسرے مقامات سے اس دور سے تعلق رکھنے والے کافی آثار برآمد ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب کا دعویٰ ہے کہ راجہ کنشک کے زمانے میں مہاتما بدھ کے جس قدر بت بھی بنائے گئے ان کے لئے ایک خاص پتھر "حجر السوآن" سوات کا پتھر" یا بزبان پشتو "شو کانرے" استعمال کیا گیا۔ یہ وہی پتھر تھا جس سے سوات میں شو یا سورج دیوتا کے بت بنائے جاتے تھے اور جو سوات کے مقام برکوٹ کے نواح سے ملتا ہے۔

پشاور کا ذکر پہلی بار ایک قدیم خروشتی کتبے سے ملتا ہے جو اٹک کے قریب اڑا کے مقام سے ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر اس دور کے کسی کنویں پر نصب کیا گیا تھا۔ چنانچہ کتبہ کی تحریر یوں ہے کہ یہ کنواں پشاور کے وشادرا نامی شخص نے اپنے والدین کی یاد میں عوام الناس کے فائدے کے لئے

کھُدوایا ہے۔ مشہور مستشرق سٹین نوف (STEN NOF) نے بھی یوچی قوم کی سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے پرشاپورہ (پشاور) ہی کو اس کا صدر مقام لکھا ہے۔ کنشک اور اس کے جانشینوں نے صوبہ سرحد میں بدھ مت کی اشاعت میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ خیبر سے اٹک تک (سوائے شہباز گڑھی کے) ساری بدھ یادگاریں کوشان ہی کے عہدِ حکومت کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب گندھارا آرٹ کا مکتبِ فن وجود میں آیا۔ مہاتما بدھ کے بت بنائے گئے۔ بعد میں اہلِ گندھارا کی تقلید میں جاپان، چین، برما اور تھائی لینڈ وغیرہ میں بھی بدھ کے مجسمے بننے لگے۔

بہرحال اشوک اور کنشک کی کوششوں سے گندھارا کا علاقہ بودھوں کے لئے مقدس ترین خطہ ارض بن گیا تھا چینی سیاح گندھارا کی سیاحت کو مگدھ دیش سے بھی اہمیت دیتے تھے حالانکہ مگدھ دیش مہاتما گوتم بدھ کی جائے ولادت تھی۔ اور گندھارا میں تو مہاتما بدھ کو کبھی آنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ تاہم مہاتما بدھ کی زندگی کے کسی ایک واقع کو تازہ رکھنے کے لئے گندھارا میں بودھ معبد بنائے گئے۔ ہشت نگر میں ایک معبد مہاتما بدھ کے اس عمل کو ظاہر کرتا ہے جب ایک بھوکے پرندے کی خاطر انہوں نے اپنے جسم سے گوشت کاٹ کر اُسے دیا۔ ایک دوسرا سٹوپا وہ ہے جو مہاتما بدھ کی یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کا دان دیا۔ بُدھ آثار صوبہ سرحد اور بالخصوص وادیٔ پشاور میں اس کثرت سے تھے کہ ہیون سانگ اس صوبے میں آیا تو یہاں ایک ہزار کے قریب بدھ سٹوپا (مٹھ) اور خانقاہیں موجود تھیں۔ چوتھی صدی میں آنے والے سیاحوں نے پشاور کا چار سو فٹ اونچا عظیم الجثہ مگوڈا بھی اپنی آنکھوں دیکھا اور پشاور کی عظمت اور اہمیت کے متعلق شہادت دی۔ پشاور کا پنج تیرتھ (جی۔ ٹی۔ روڈ) بھی بودھوں کا ایک مقدس مقام تھا۔ پشاور اس دور میں دلکش عمارتوں اور خوبصورت مندروں کا شہر شمار ہوتا تھا۔

پشکالوتی یا چارسدّہ

پشاور کے علاوہ گندھارا (صوبہ سرحد) کا شہر پشکالوتی بھی عہدِ کوشان میں انتہائی عروج پر تھا۔ یہ شہر موجودہ چارسدّہ اور پٹانگ کے درمیان آباد تھا۔ سکندرِ اعظم کی فوجوں نے جب ۲۱ دن کے محاصرے کے بعد اسے فتح کیا تو اس پر ہستی یا استیز نامی راجہ حکومت کرتا تھا، خیال ہے کہ اسی ہستی کے نام پر اس علاقے کا نام ہستی نگر یا ہشت نگر مشہور ہو گیا۔ چارسدّہ، پٹانگ، تنگی، عمرزئی، زرنگ زئی، اتمان زئی، شیرپاؤ

اور رجڑ اس علاقے کے آٹھ مشہور قصبے ہیں۔

موریا راجوں کے عہدِ حکومت میں بھی پشکلاوتی دن بدن ترقی کرتا گیا۔ لیکن کنشک کے زمانے میں اسے اور بھی زیادہ عروج نصیب ہوا۔ اگرچہ کنشک نے کسی وجہ سے پشکلاوتی کی بجائے پشاور (پرسپورہ) کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا تھا تاہم اس تبدیلی کا کوئی اثر پشکلاوتی پر پڑتے نہیں پایا تھا۔ اور پشکلاوتی کی عظمت و اہمیت بدستور برقرار تھی۔ یہ شہر ایک بہت بڑی تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ دریائی بندرگاہ بھی تھا اور دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں سے ایک (ہشنغر) میں واقع ہونے کی وجہ سے بیحد مالدار اور خوشحال قصبہ تھا۔ راجہ کنشک نے اپنے دورِ حکومت میں یہاں ایک مشہور اسٹوپ قائم کیا جو بعد میں "شاہ جی کی ڈھیری" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ساتویں صدی عیسوی میں اس سرزمین کی سیاحت پر آنے والے چینی سیاح ہیون سانگ نے پشکلاوتی کے عظیم شہر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔

"پشکلاوتی ایک آباد اور بارونق شہر ہے۔ اس کے اندرونی دروازے سرنگوں کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ مغربی دروازے کے باہر دیوا کا مندر ہے، شہر کے مشرق میں مہاراجہ اشوک کا بنوایا ہوا ایک اسٹوپ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سابقہ جنم میں مہاتما بدھ وارد ہوئے اور تمام مخلوق کو نیکی کا پیغام دیا۔ شہر کے شمالی جانب ایک پرانی عبادت گاہ ہے جو "سنگھارام" کے نام سے موسوم ہے اس کے ہال کمرے گر چکے ہیں اور جو کمرے صحیح سلامت ہیں ان میں بدھ گرو رہائش پذیر ہیں۔ اسی عبادت گاہ کے قریب اشوک راجہ کا بنوایا ہوا ایک اسٹوپ ہے جو کئی سو فٹ اونچا ہے، یہ اسٹوپ پتھر اور لکڑی سے بنایا گیا ہے، اس کے نواح میں پتھر کے بنے ہوئے دو اور اسٹوپ بھی پائے جاتے ہیں دائیں جانب والی عبارت برہما دیوا کا معبد ہے جب کہ بائیں جانب کی عمارت ساکرا (اغلباً شیوا) کا مندر ہے، یہ دونوں عمارات قیمتی پتھروں سے مرصع تھیں لیکن اب ان سے قیمتی پتھر نکال لئے گئے ہیں اور معمولی پتھر لگا دیئے گئے ہیں۔ اس کے شمال مغربی جانب دو اور اسٹوپ ہیں۔ یہ سب معبد مہاتما بدھ کی زندگی کے کسی واقع سے منسوب ہیں، دور دور کے ملکوں سے بدھ مت کے شیدائی ان آثار کی زیارت کو آتے ہیں اور یہاں رہ کر

عبادت و ریاضت کرتے ہیں۔"

خیال کیا جاتا ہے کہ ۴۶۰ عیسوی کے لگ بھگ وسطِ ایشیا کی وحشی قوم "سفید ہُن" نے گندھارا کے باقی شہروں کی طرح پشکلاوتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا اور یہ شہر ملبے میں دب کر رہ گیا تھا۔ یہاں "بالا حصار" نام کا ایک قلعہ بھی تھا جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی قلعہ تھا جس کا محاصرہ سکندر یونانی کی فوج کو کرنا پڑا۔ اور بڑی خونریز لڑائی کے بعد وہ اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ہُن حملہ آوروں نے قلعہ تباہ کر دیا تھا۔ لیکن افغانستان اور پشاور کے درّانی بادشاہ تیمور شاہ نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ سکھوں نے اس علاقے پر قبضہ کرتے وقت قلعے کو اجاڑ دیا تھا لیکن اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۱۸۳۴ء میں اسے مرمت کروایا۔ ان دنوں سکھ راجہ رنجیت سنگھ کا ایک فرانسیسی نژاد جرنیل کورٹ اس علاقے کا انچارج تھا۔ کورٹ ہی نے سب سے پہلے یہاں ایک قدیم شہر کے آثار دیکھے۔

۱۸۶۳ء میں انگریز محقق سر الیگزینڈر کننگھم نے ان ٹیلوں میں دلچسپی لی اور کھُدائی کے بعد پتہ لگایا کہ یہ پشکلاوتی ہی کا گم شدہ تاریخی شہر ہے۔ کننگھم کے بعد انگریزی فوج کے ایک علم دوست افسر لفٹننٹ مارٹن نے چند ٹیلوں پہ کھدائی کی۔ ۱۹۰۲ء میں سر جان مارشل نے کھدائی کے دوران چند عمارتوں اور قلعہ بندیوں کا پتہ چلایا۔ مارشل نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ثابت کیا کہ اس شہر کا نقشہ یونان کے قدیم تاریخی دارالسلطنت ایتھنز سے ملتا جلتا ہے۔ سر جان مارشل کو اس مقام سے بہت سی چیزیں ملیں جن میں دھات کا ایک مجسمہ خاص طور پہ قابلِ ذکر ہے۔ اس انگریونگ میں ایک شخص ایک اڑتے ہوئے راج ہنس پر سوار دکھایا گیا ہے۔ جبکہ پرندے کی گردن کے نیچے دل کا نشان بنا ہوا ہے۔ یہ تصویر اپالو (یونانی سورج دیوتا) سے ملتی جلتی ہے۔

۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان کے تعاون سے سر مارٹیمر وہیلر نے بالا حصار چارسدہ کی کھُدائی کی تو وہاں سے آٹھ ہزار سال پُرانے آثار برآمد ہوئے۔ سر مارٹیمر وہیلر کا کہنا ہے کہ پشکلاوتی اور ٹیکسلا کے عروج و زوال کی داستانیں ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۹۵۸ء کی کھدائیوں کے دوران پشکلاوتی سے کوشان دور کے مکانوں کا ایک بلاک بھی دریافت ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس قدیم شہر کے گرد ایک خندق تھی جس میں لڑائی کے وقت نواحی دریا کا پانی

چھوڑ دیا جاتا تھا۔ تاہم اب دریا نے اپنا رُخ بدل لیا ہے، کھدائی کے دوران شہر کی پچاس تہیں یا پرت دریافت ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر کئی مرتبہ بنا اور کئی مرتبہ اُجڑا۔ معلوم ہوتا ہے۔ پشکلاوتی دوسری صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی تک پورے عروج پر تھا، ماہرین آثارِ قدیمہ نے جلی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ کر پتہ چلایا ہے کہ شہر کو تیسری صدی عیسوی میں آگ لگائی گئی تھی۔ اس زمانے کے مکان یونانی طرز کے تھے جو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کئے گئے تھے، ماہرین کو راجہ کنشک کے زمانے کے دو سونا بنے کے سکے بھی ملے ہیں۔ علاوہ ازیں مٹی کے نادر قسم کے برتن بھی یہاں سے نکلے ہیں اور بدھ کا ایک مجسمہ بھی برآمد ہوا ہے۔ اس مجسمے کی ساخت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سرزمینِ گندھارا میں پایا جانے والا پہلا بودھ مجسمہ ہے اور غالباً اسے متھرا سے یہاں لایا گیا ہوگا۔

۱۹۶۳ء میں اور اس کے بعد پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ نے پشکالوتی اور اس کے نواح میں واقع تاریخی اہمیت کے جن دوسرے مقامات پر بھی کھدائیاں کی ہیں۔ ان میں سے یہ زیادت پلاٹو ڈھیری، مہربتی سہوپا، شیخانو ڈھیری اور ماماتے ڈھیری کے نام قابل ذکر ہیں۔ مردان کے دیہات جمال گڑھی، تخت بہائی، ساول ڈھیر، اسوٹا، ہنڈ وغیرہ کے آثارِ قدیمہ سے بھی کوشان اور دوسرے راجوں کے دور کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

ٹیکسلا یونیورسٹی کوشان خاندان نے صوبہ سرحد، پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں ایک سو برس کے قریب حکومت کی، تاہم کابل میں ان کا اقتدار اس کے بعد بھی قائم رہا۔ یہ حکمران علم و فن کے قدردان تھے، ان کا زمانہ روشنی کا زمانہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف بدھ مت کی تبلیغ کے لئے اپنے خرچ پر مختلف ملکوں کو مبلغ بھیجے بلکہ تعلیم کی نشر و اشاعت پر بھی خاص توجہ دی۔

کوشان خاندان نے ٹیکسلا کی بودھ یونیورسٹی کو بہت ترقی دی اور ٹیکسلا میں ایک نیا شہر بھی آباد کیا جو اب "سرسکھ" یا لنڈی کہلاتا ہے۔ اس شہر سے بدھ مت اور جین مت کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ ٹیکسلا یونیورسٹی کے متعلق ایک ہندو مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ٹیکسلا اس زمانے میں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز تھا، وہاں ایک بہت بڑی یونیورسٹی قائم تھی جہاں دور دور کے ملکوں کے نوجوان اپنی علمی پیاس بجھانے آتے تھے۔ یہ یونیورسٹی

ایک اقامتی یونیورسٹی تھی اور اس میں طلبار کی رہائش کے لئے تمام سہولتیں موجود تھیں۔
طلباء دو قسم کے تھے ایک وہ جو فیس ادا کرتے تھے اور ہمہ وقت تحصیلِ علم میں لگے رہتے تھے، دوسرے وہ جو دن بھر کوئی کام دھندا کرتے تھے اور رات کو تعلیم حاصل کرتے تھے ہر طالب علم کے لئے لازم تھا کہ کسی ایک خصوصی مضمون مثلاً تیر اندازی، شہسواری یا طب وغیرہ میں دسترس بہم پہنچائے، یہ تعلیم محض کتابی تعلیم نہ تھی بلکہ طلباء کی عملی تعلیم کا ایک حصہ تھی، بڑے درجوں کے طلبار کو ملک کے دوسرے علمی مراکز کے دوروں پر بھی بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ وہاں کے اساتذہ سے بھی فیض پا سکیں۔"

اس یونیورسٹی کے آثار اب بھی ٹیکسلا میں پائے جاتے ہیں۔ اور اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ کوشان بادشاہوں کا دور صوبہ سرحد اور برصغیر کا سنہری دور تھا۔

گندھارا آرٹ

کنشک علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ آرٹ سے اُسے گہری دلچسپی تھی۔ فنِ تعمیر میں بھی اس کے عہد میں کافی ترقیاں ہوئیں۔ کوشان دور میں سونے اور چاندی کے خوبصورت سکے ڈھالے گئے جن پر حکمرانِ وقت کی عمدہ تصویر بنی ہوتی تھی۔ ان طلائی سکوں سے بین الاقوامی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چونکہ کوشان راجوں کا عہد امن و امان میں علمی ترقیوں اور ثقافتوں کو خلط ملط ہونے کا موقع ملا۔ اس باہمی میل جول اور آزاد خیالی کی بدولت آرٹ کی دنیا میں ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد پڑی جسے گندھارا آرٹ کہا جاتا ہے۔

گندھارا وادیٔ پشاور اور اس سے ملحقہ قبائلی علاقے کا پرانا نام تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک آریہ راجہ گندھار یا نے اس علاقے میں ایک نو آبادی قائم کی۔ اسی کے نام پر اس سارے علاقے کو گندھارا کہا جانے لگا۔ مدتوں یہ علاقہ آریائی، ایرانی، یونانی، اور ہندی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ہر آنے والی قوم کی تہذیب نے یہاں اپنے اثرات چھوڑے۔ انہی تہذیبوں کے امتزاج سے یہاں ایک نئی مخلوط تہذیب و ثقافت وجود میں آئی جس نے اس مکتبِ فن کو جنم دیا جو آگے چل کر گندھارا آرٹ کہلایا۔

موضوع اور مواد کے اعتبار سے گندھارا آرٹ بدھ مت کا محتاج ہے، اگرچہ خود مہاتما بدھ نے کبھی اس سرزمین کا رُخ نہ کیا تاہم یہ فخر صوبہ سرحد ہی کو حاصل ہوا کہ بدھ کا پہلا مجسمہ اسی جگہ بنا۔

بُدھ مت کے مہایانہ فرقے کے عالموں نے کنشک کی بلائی ہوئی مجلس کبیر کے موقع پر اس ضرورت کا اظہار کیا کہ مہاتما بُدھ کے وجود کی نمائندگی محسوس اور ظاہر صورت میں کی جانی چاہیئے، اس ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے عہدِ کشان کے ان یورپین فنکاروں نے جو مکتب روما سے متاثر اور اپالو دیوتا کے مجسمے بنانے کے ماہر تھے، مہاتما بدھ کا پہلا انسانی بت بنایا۔ چونکہ یہ دور بدھ مت کے انتہائی عروج کا دور تھا اس لئے وسطِ ایشیا اور مشرقِ بعید کے فنکاروں کو بھی تخلیق کی نئی راہیں مل گئی اور لوگ بُدھ کے مجسمے بنانے میں مصروف ہو گئے۔

گندھارا آرٹ میں ہندوستانی سنگتراشی کے ابتدائی قاعدوں اور اصولوں کو بھی کسی نہ کسی حد تک عمل دخل ضرور ہے لیکن دیکھا جائے تو یہ آرٹ خالصتاً مغربی اسلوبِ فن سے متاثر ہے۔ یہ بجا ہے کہ کشان بادشاہوں نے مغربی فن کاروں کی حوصلہ افزائی ضرور کی ہوگی تاہم اس امر کا بھی امکان ہے کہ بہت سے یونانی اور ایرانی الاصل فنکاروں نے بدھ مت قبول کر لیا ہو اور چونکہ غیر ملکی فن کار زمانہ قدیم ہی سے بت تراشی کے طور طریقوں پر عمل پیرا رہے تھے اس لئے انہوں نے مہاتما بدھ کے مجسمے میں بھی وہی شانِ معبودیت پیدا کر دی جو شانِ معبودیت وہ یونانی اور رومن دیوتاؤں اور شہنشاہوں کے مجسموں میں پیدا کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے مہاتما بدھ کے مختلف جنموں کے واقعاتِ زندگی کو جُدا جُدا کہانیوں کی شکل میں سلسلہ وار تختیوں پر اس طرح پیش کیا جس طرح رومن فن کار حضرت یسوع مسیحؑ اور قدیم بادشاہانِ روم کی زندگیوں کو دیواری تصویروں اور مجسموں وغیرہ کے ذریعے سلسلہ وار پیش کیا کرتے تھے۔

گندھارا آرٹ کے ابتدائی نمونوں میں مہاتما بدھ کا پیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قدیم رومن مجسموں کا پورا چربہ ہے، اس کا ناک نقشہ البتہ یونان کے سورج دیوتا اپالو کا سا ہے اور لباس پرانے زمانے کے مذہبی عالموں جیسا (یعنی ایک بڑی سی چادر یا چُغہ) ان مجسموں کا باہر نکلا ہوا دایاں ہاتھ بھی اسی مخصوص انداز کا حامل ہے جو رومن جمہوریہ کے آخری دور کے مجسموں کا انداز تھا، اسی طرح روما کے قدیم اور ابتدائی عیسوی دور کے مجسموں کی طرح سر کی لمبائی اور قد کی لمبائی میں ایک اور پانچ کی نسبت کا تلازمہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے، گویا گندھارا آرٹ کو سلطنت روما کے آرٹ اور بالخصوص اس کے آخری دور کے علاقائی اسلوبِ فن کا مشرقی روپ کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔

آج پشاور، ٹیکسلا، تخت بہائی، سوات اور صوبہ سرحد کے عجائب گھروں میں مہاتما بدھ کے جتنے بھی مجسمے رکھے ہوئے ہیں وہ گندھارا آرٹ ہی کے نادر نمونے ہیں، یورپ، امریکہ اور مہذب دنیا کے ہر ملک کے فن کار گندھارا آرٹ کے ان فن پاروں کو بنظرِ ستائش دیکھتے ہیں اور قدیم صوبہ سرحد کی ثقافتی برتری کے دل معترف ہیں۔

کنشک کے جانشین

کئی کتبوں میں کنشک کے بڑے بیٹے وشسکا (VASISHKA) کا ذکر آتا ہے، وہ اپنے باپ کی زندگی میں متھرا کا وائسرائے (نائب الحکومت) تھا۔ تاہم وشسکا کے کوئی سکے دستیاب نہیں ہو سکے نہ ہی خود مختار حکمران کے طور اس کا تذکرہ کتابوں میں آیا ہے۔ اس سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وشسکا عالم شباب میں اپنے باپ کی ہی زندگی میں فوت ہو گیا ہوگا اور اس کے تخت نشین ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی ہوگی۔

ہوشسکا (۱۴۵ء تا ۱۹۵ء) جو کنشک کے بعد وارث تخت و تاج قرار پایا، غالباً وشسکا کا چھوٹا بھائی اور کنشک کا دوسرا بیٹا تھا، اس نے بے شمار مختلف قسم کے سکے چھوڑے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے طویل عرصے تک حکومت کی۔ اپنے باپ کی طرح مذہب کے معاملے میں وہ آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے سکوں پر مختلف یونانی، ایرانی اور ہندوستانی دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں اپنے نامور باپ کی طرح وہ بھی علوم و فنون کا دلدادہ اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا۔ متھرا میں اس نے ایک بدھ خانقاہ بنوائی اور اپنے صوبہ کشمیر میں اپنے نام پر ایک شہر ہوشکا پورہ آباد کیا۔ آج بھی یہ مقام ایک چھوٹے سے گاؤں کی صورت میں موجود ہے۔

واسو دیوا (۱۹۵ء - ۲۲۷ء) وشسکا کے بعد تخت پر بیٹھا اور تیس بتیس برس تک دادِ حکومت دی۔ اس کے عہد میں برہمن ازم ایک بار پھر زور پکڑ رہا تھا اور بدھوں کو اپنے اندر ضم کرتا جا رہا تھا۔ اس حکمران کے ہندوانہ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے بھی بدھ مت چھوڑ کر ہندو ازم اختیار کر لیا ہوگا۔ اس کے ہندو ہونے کے ثبوت میں اس کے سکے بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان سکوں پر شیوا اور نندی کی تصویریں تھیں۔

واسو دیو کنشک کے بعد کوشان خاندان کا آخری اہم حکمران تھا، اس کے بعد کوشان کی وسیع سلطنت مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی، ہر ریاست کا حکمران خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگا۔ چوتھی صدی عیسوی تک چند ایک علاقوں پر کوشان راجوں کی برائے نام حکومت کا پتہ چلتا ہے۔ بالآخر غیر ملکی حملہ آوروں کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں کوشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان کے مختلف صوبوں پر مختلف خاندانوں کے راجے حکومت کرنے لگے۔

ساسانی (دورِ اوّل)

۲۲۵ء — تا — ۳۶۵ء

کوشان خاندان کا آخری حکمران واسودیوا یا وشنودیوا ۲۲۵ء کے لگ بھگ فوت ہوگیا، اس کے مرنے کے بعد صوبہ سرحد میں کوئی مضبوط حکومت باقی نہ رہی، اگرچہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں گپتا خاندان اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کے بادشاہ چندرگپت اور سمدرگپت بہت طاقتور حکمران تھے اور ان کے دور کو بجا طور پر "ہندوؤں کا سنہری زمانہ" کہا جاتا ہے، تاہم گپتا راجوں کا تسلط دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر قائم نہ ہو سکا اور صوبہ سرحد میں طوائف الملوکی مچی رہی۔

ادھر ایران میں پہلوی یا پارتھین حکومت بھی ان دنوں رُو بہ زوال تھی اور موت کی گھڑیاں گن رہی تھیں، پہلوی حکومت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اُردشیر نامی ایک ذہین اور دلیر شخص آگے بڑھا پہلوی حکومت کا خاتمہ کر کے ساسانی خاندان کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔

اردشیر پارسیوں کے ایک مذہبی بزرگ کا بیٹا تھا، اس کا باپ "بابغ" اصطخر کے مشہور معبد کا پیشوا تھا، نسلاً یہ شخص ہخامنشی خاندان کا فرد تھا تاہم اس کی بیوی ایران کے شاہی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ اس مذہبی پیشوا نے اپنے اثر و رسوخ اور اپنی بیوی کی شاہی خاندان سے قرابت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہونہار بیٹے اُردشیر کو شاہی فوج میں افسر بنا دیا۔ اُردشیر نے پارسی حکمرانوں کی غفلت اور ملک کے دگرگوں حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پَر پُرزے نکالے اور چھوٹی سی ریاست قائم کر کے اس کا حاکم بن بیٹھا، بعد میں اس نے بڑی ہوشیاری اور حکمتِ عملی سے ایک ایک کر کے پارسی سرداروں کو ختم کر دیا اور سارے ایران پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اُردشیر کا دادا ساسان نامی ایک شخص تھا، اس لئے اس کے نام پر اس خاندان کو ساسانی خاندان کہا جانے لگا۔

۲۲۶ء میں اردشیر نے پارس کے چھوٹے سرداروں کو متحد کر کے پارتھی نسل کے آخری ارساسی حکمران ارتبانوس (اُردوان) پر غلبہ پاکر اپنی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔

۲۴۰ء میں اُردشیر کی وفات پر اس کا بیٹا شاہ پور یا شاپور اوّل تخت نشین ہوا تو صوبہ سرحد مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، یہ حکمران اندرونی طور پر خود مختار تھے لیکن برائے نام ایرانی شہنشاہوں کے باجگذار اور زیر نگین تھے۔ شاہ پور بڑا عالی دماغ اور مدبر حکمران تھا۔ اس نے کمال تدبر اور جرأت سے جہاں مغرب میں شہنشاہ روم کی شکست دے کر اس کے بہت سے علاقوں کو ایرانی عملداری میں شامل کر لیا۔ وہیں مشرقی جانب گندھارا (صوبہ سرحد) پر بھی فوج کشی کا فیصلہ کیا۔

واضح رہے کہ یہ وہی شاپور ہے جس کا کتبہ تختِ جمشید کے قریب نقش رستم کے مقام پر آتش کدہ کی دیواروں پر پایا گیا ہے، اس کتبہ میں پشکپورہ یا پشاور کو ایرانی سلطنت کی مشرقی سرحد قرار دیا گیا ہے۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ساسانیوں نے سرحدی علاقوں پر کب قبضہ کیا، تاہم قیاس ہے کہ ۲۳۰ء میں اُردشیر کی زندگی ہی میں شاپور کی کوششوں سے گندھارا کا صوبہ ایرانی قلمرو کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ حکومت کی اس تبدیلی کا ثبوت ان سکوں سے بھی ملتا ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں؛ واسودیوا کے بعد کوشان بادشاہوں کا کوئی سکہ دستیاب نہیں ہوتا بلکہ بعد کے سکوں پر ساسانی حکمرانوں کا نام دیا گیا ہے۔ ساسانی بادشاہوں نے جب کوشان سے اقتدار چھینا تو "کوشان شاہ" یا "کوشان شہنشاہ" کا لقب اختیار کر لیا۔ ایرانیوں کا نظامِ حکومت ایسا تھا کہ اگرچہ گندھارا میں ایرانی شہنشاہوں ہی کا سکہ چلتا تھا تاہم یہاں چھوٹے چھوٹے حکمران موجود تھے جو ایرانی شہنشاہیت کے باجگذار تھے، ان چھوٹے حکمرانوں کو "شاکا" کا نام دیا گیا ہے۔ ان مقامی حکمرانوں میں بہت سے ایسے تھے جن کا اپنا سکہ بھی چلتا تھا، ان سکوں پر جن حکمرانوں کے نام درج ہیں ان میں سے سایا تھا۔ سیتا، سنیا، پارا، تی، بھسری اور بھا، قابلِ ذکر ہیں۔

ایران میں ساسانی شہنشاہیت ۶۴۲ء تک قائم رہی۔ ۶۴۲ء وہ سال ہے جب نہاوند کے

مقام پہ مجاہدینِ اسلام نے آخری ایرانی شہنشاہ یزدگرد سوم کو عبرت ناک شکست دی اور روم سے لے کر ہندوستان تک ہر جگہ اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے، دریائے سندھ ساسانی سلطنت کی مشرقی سرحد کا کام دیتا تھا۔ اٹک سے اس طرف کا سارا علاقہ اور ڈیرہ جات ایرانی حکومت کے زیرِ نگین تھے، قاعدہ یہ تھا کہ ایرانی شہنشاہ کے بعد سب سے بڑا مقتدر سردار ایران کی طرف سے گندھارا اور افغانستان کا وائسرائے (نائب الحکومت) ہوا کرتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات تو ولی عہدِ سلطنت ہی کو یہ عہدہ تفویض کیا جاتا ہے۔ ساسانی خاندان کے عروج کے دنوں میں صوبہ سرحد کے امن و خوشحالی میں نمایاں اضافہ ہوا۔ تہذیب و ثقافت کے شعبوں میں ایرانی افکار نے اہلِ گندھارا کو پوری طرح متاثر کیا اور گندھارا آرٹ، فنِ تعمیر اور نظامِ حکومت پر ایرانی اثرات غالب رہے اور دونوں ملکوں کے روابط مضبوط سے مضبوط تر ہو گئے۔ تاہم ۳۶۵ء میں صوبہ سرحد سے ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور شمال مغرب سے آنے والے ہن قبیلہ کے وحشی اور جنگجو لوگوں نے صوبہ سرحد، افغانستان اور پنجاب کے مقامی راجوں کو شکست دے کر اپنا تسلط جما لیا۔

کوشانِ کوچک یا کیدارا

۳۶۵ء — تا — ۴۵۵ء

۳۶۵ء تک صوبہ سرحد کے موجودہ علاقے ایران کی ساسانی شہنشاہیت کے زیرنگین رہے، اس سال شمال مغرب سے آنے والے وحشی قبیلے سفید فام ہُن نے ان میدانی علاقوں پر تابڑ توڑ حملے کئے اور ان علاقوں میں ایرانی حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تاریخ کے آغاز ہی سے کوہ سلیمان کے درّوں کے ذریعے شمال مغربی سرحدی صوبے پر جتنے حملے ہوئے، سکندر یونانی کے حملے کے علاوہ، سبھی ایرانی قبائل کی طرف سے ہوئے۔ ساکا۔ پارتھین، کوشان سب صوبہ سرحد اور پنجاب میں آنے سے پہلے ایران ہی میں رہ رہے تھے، یہاں تک کہ باختری یونانی بھی یورپی تہذیب کی بجائے براہ راست ایرانی تہذیب و تمدن ہی کے پیروکار تھے۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی کے آخر سے صوبہ سرحد اور دوسرے ہندوستانی علاقوں پر جو حملے ہوئے وہ وسطی ایشیا کے رہنے والے وحشی قبائل کی طرف سے ہوئے سفید ہُن کا حملہ ان نئے حملوں کا نقطۂ آغاز تھا۔

سفید ہُن کو مورخوں نے ہفتالی یا ہیاطلہ کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ یہ لوگ چینی نسل سے تھے، بعض محققین کا خیال ہے کہ ہیاطلہ اور سفید ہن علیحدہ علیحدہ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میک گورن MC GOVERN ایک چینی سند کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اگرچہ ہیاطلہ اور سفید ہن میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے تاہم فی الاصل یہ دونوں یو۔چی یا ہُن قوم ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خیال ہے کہ مدتوں تک ان دونوں قبیلوں کے اختلاط سے ان کی زبان، روایات اور تہذیب و تمدن میں اتنی یکسانیت اور یگانگت پیدا ہو گئی ہو کہ ایک دوسرے کے مابین تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہو۔

سب سے قرینِ قیاس بات یہ ہو سکتی ہے کہ کیدارا یا کوشان کوچک وہ لوگ ہیں جو صوبہ سرحد اور

شمالی علاقوں میں ساسانی بادشاہوں کے ماتحت باجگذار راجا تھے لیکن بعد میں ان کی قوت میں اضافہ ہوا تو انہوں نے کیدارا نامی سردار اور اس کے بیٹے پیرو (PIRO) کے تحت اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا سکہ چلانے لگے۔ بہرحال بعد میں ساسانی فرماں روا شاپور سوم نے انہیں شکست دی تو اقتدار دوبارہ ایرانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پیرو کے بعد بھی اس لڑی سے کئی حاکم ہوئے، اُن کے سکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہندوانہ نام اختیار کر لئے تھے، ان سکوں پہ بالترتیب کریتا دیپا، سیلا دیتا، سروایاسس، بھاسوان، کوسالا اور پرکاشا راجوں کے نام درج ہیں۔

کوشان کوچک یا کیدارا خاندان کے یہ حکمران پانچویں صدی عیسوی کی ابتداء تک صوبہ سرحد پہ دادِ حکومت دیتے رہے حتیٰ کہ شمال مغرب سے آنے والے سفید ہن قبیلہ کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لاکر وہ حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

مشہور چینی سیاح فاہیان اسی خاندان کے عہدِ حکومت میں گندھارا کی سیاحت کے لئے آیا تاہم یہ امر حیرت انگیز ہے کہ جہاں اس نے کنشک کی تو دل کھول کر تعریف کی ہے۔ وہیں کوشانِ کوچک یا کیدارا کے متعلق ذکر تک نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ فاہیان چونکہ بدھ مت کے مطالعے، بدھ لوگوں سے ملاقات اور بودھ معبدوں، مندروں اور یادگاروں کی زیارت کی غرض سے برصغیر ہند کے ان علاقوں میں آیا تھا اس لئے اس نے کیدارا یا کوشان کے تذکرے کو خارج از موضوع سمجھا ہو اور اپنے سفرنامے میں ان کا ذکر نہ کیا ہو، اس سے اس شبہ کو بھی تقویت ملتی ہے کہ کوشان لوگ بدھ مت کے پیروکار نہ تھے

ڈاکٹر دانی کے خیال میں اس وقت کے سیاسی حالات کچھ عجیب سے تھے، صوبہ سرحد دو سلطنتوں کے مابین وجہ نزاع بنا ہوا تھا، مغرب میں ساسانی شہنشاہیت قائم تھی جو اسے اپنے زیر اثر رکھنا چاہتی تھی تو مشرق میں ہندوؤں کا عظیم خاندان گپتا برسرِ اقتدار تھا۔ عین ممکن ہے کہ کیدارا خاندان نے ایرانی اور ہندوستانی فرمانرواؤں کی رقابت سے فائدہ اٹھا کر اپنی اہمیت میں اضافہ کیا ہو، بہرحال سیاسی حالات نے کیدارا حکمرانوں کو گپتا راجوں کے بہت قریب کر دیا، چنانچہ اسی خاندان کے عہدِ حکومت میں یہاں ہندوستانی اثرات بڑھتے گئے اور ایرانی مفادات کو سخت دھچکا لگا۔ سکوں کے مطالعہ

سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے بڑی تبدیلی ان دنوں یہ ہوئی کہ خروشتی کی بجائے "برہمنی" "رسم الخط" نے رواج پایا۔ ہندو تہذیب غالب آگئی اور بقول ہیون سانگ ہندوانہ عقیدوں اور رسموں کو صوبہ سرحد میں ایک بار پھر پنپنا نصیب ہوا اور بدھ مت دن بدن رُو بہ زوال ہوتا گیا۔

پرسی پولس (ایران عراق) کے مشہور کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ پور دوم کو گندھارا پر کیدارا سردار کا تسلط ہرگز پسند نہ تھا، اس لئے وہ متواتر ان قبیلوں کے خلاف فوجی مہموں میں مصروف رہا، اغلباً شروع میں کیدارا نے ساسانی حملوں کی تاب نہ لاکر ایران کی سیاسی برتری اور تفوق کو تسلیم کرتے ہوئے ایران کا باجگذار بننا قبول کر لیا تھا، لیکن بعد میں خود طاقت پکڑ کر یا گپتا بادشاہوں کی امداد سے کیدارا نے ساسانیوں سے دوبارہ نجات حاصل کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۳۶۸ء کے لگ بھگ "کشن شاہ" یا "شہنشاہ" کا لقب اختیار کر کے گندھارا اور ملحقہ علاقوں پر دادِ حکومت دینے لگا۔

کیدارا عارضی طور پر گندھارا کا خود مختار حکمران بن تو گیا۔ تاہم اسے ساسانیوں کی فوج کشی کے علاوہ سفید ہُن کے حملوں کا استیصال بھی کرنا پڑا۔ شاید اسی کے دورِ حکومت میں پشاور پر بھی ہُن حملہ آور ہوئے ان جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کیدارا، اپنی جگہ اپنے بیٹے (اغلباً پیرو) کو تخت پر بٹھا کر خود ہمہ تن حملہ آوروں کے خلاف مصروفِ پیکار رہنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ سفید ہن قبیلہ سے جنگ کے دوران ہی کیدارا کابل یا اس کے گرد و نواح میں مارا گیا۔

کیدارا کے آخری دنوں میں صوبہ سرحد کو ایک طرف سے ہندو افکار و روایات نے متاثر کیا تو دوسری طرف سے ایرانی تہذیب و ثقافت بھی یہاں کے رہنے والوں میں مقبول ہونے لگی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس کی جگہ چُست لباس نے لے لی۔ سادگی کی جگہ زیب و زینت نے رواج پایا، افلاس کی بجائے مال و دولت کی نمائش عام ہو گئی اور عورتوں میں زیورات کا استعمال بہت بڑھ گیا۔ لوگ بدھ مت کو چھوڑ کر ہندو عقیدوں یا زردشتی تعلیمات کے زیرِ اثر آگئے اور اس طرح ایک بہت بڑا تہذیبی و تمدنی انقلاب رُونما ہو گیا۔

سفید ہُن

ہفتالی — یا — ہیاطلہ

۴۵۵ء تا ۵۵۰ء

پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ہُن حملہ آور ایک بلائے ناگہانی بن کر اٹھے اور انہوں نے ہندو معاشرے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یہ جنگجو، جفاکش اور وحشی قبیلہ ابتدا میں چین کے نواح میں آباد تھا منگولوں کی طرح ہُن بھی مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے سفید فام لوگ تھے، ان کی ناک بیٹھی ہوئی اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوتی تھیں۔ ڈاڑھی کے بال بہت کم تھے یا بہت سوں کے ہوتے ہی نہیں تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں بھوک اور خشک سالی سے تنگ ہو کر وہ ٹڈی دل کی طرح اپنے وطن سے نکلے اور کوہ ہندوکش کے درّوں کو عبور کر کے وادیٔ کابل میں بس گئے، جب ان کی تعداد بڑھی تو ان کی ایک شاخ نے یورپ کا رُخ کیا اور روم اور قسطنطنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، اس شاخ کا سردار اٹیلا (ATTILA) نامی شخص تھا۔

اس زمانے میں شمال مغربی صوبہ سرحد میں کوئی مضبوط حکومت قائم نہ تھی البتہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو اپنے اپنے راجوں کے زیرِ انتظام تھیں، اسی طرح ہندوستان کی گپتا سلطنت اگرچہ کسی وقت دنیا کی ایک مضبوط ترین حکومت تھی لیکن پانچویں صدی کے وسط میں باہمی خانہ جنگی نے انہیں بیحد کمزور کر دیا تھا۔ ہندوستان کا مہاراجہ سکند اگپت ان دنوں اپنے ہی سوتیلے بھائی پورا گپتا کے خلاف برسرِ پیکار تھا، اس سیاسی ابتری کو دیکھ کر ہُن رہنما تورامان بہت بڑا لشکر لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ شمال مغربی صوبہ سرحد پر تو اس نے آسانی سے قبضہ جما لیا تاہم شمالی ہندوستان میں اُسے پہلی بار سکند اگپت نے پیش قدمی کرنے سے روکا تو ہُن سردار اپنے جانبازوں سمیت واپس کابل کو چلا گیا۔

تاہم اس نے حوصلہ ہارنے کی بجائے حملوں کا سلسلہ جاری رکھا اور آخر کار گپتا سلطنت کا خاتمہ کر کے ہی دم لیا۔ سارے شمالی ہندوستان اور صوبہ سرحد کو اپنے زیر نگین کرنے کے بعد "تورمان" نے "مہاراج ادھیراج" کا لقب اختیار کیا اور سیالکوٹ کو اپنی راجدھانی بنایا۔

سفید ہُن یا افتالیوں کی ایک شاخ ۴۸۴ عیسوی کے لگ بھگ ایران پر چڑھ دوڑی۔ ان دنوں ایران پر بہرام شاہ (بہرام گور خر) کی حکومت تھی، اس نے ان وحشیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا انہیں شکست فاش دی اور ہُنوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا، کچھ عرصہ کے لئے تو ایران میں یہ فتنہ دب گیا اور ہُن خاموش ہو کر باختر میں بیٹھ گئے لیکن بعد میں ایران کے شہزادے خانہ جنگی میں پڑ گئے۔ بہرام شاہ کا پوتا فیروز حصولِ اقتدار کی خاطر اپنے ہی حقیقی بھائی سے ٹکرا گیا بلکہ اس نے یہ فاش غلطی کی کہ اپنے بھائی کو مزا چکھانے کے لئے افتھالیوں (سفید ہن) ہی سے امداد حاصل کی۔ سفید ہن کی مدد سے فیروز کامیاب تو ہو گیا لیکن یہ کامیابی ایک طرح کی ناکامی ہی ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ افتھالی زور پکڑ گئے۔ اور خود ساسانی حکمران ان سے دبنے لگے۔ ۴۸۴ء میں فیروز مارا گیا تو افتھالیوں نے حکومت خود سنبھال لی۔ ساسانیوں کا غرور خاک میں مل گیا اور بادشاہی کرنے کی بجائے وہ افتھالیوں کے باجگذار بن کر رہ گئے۔

سفید ہُن خانہ بدوش وحشی لوگ تھے، وہ کسی خاص مذہب کے پیروکار نہ تھے بلکہ اوہام پرست اور بدعقیدہ لوگ تھے، وہ تہذیب و تمدن کے دشمن تھے اور ایذا رسانی سے لطف پاتے تھے، جن دنوں وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے بدھ مت رُو بہ زوال تھا اور ہندو مت کے سنہری زمانے کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم گندھارا اور شمالی علاقوں میں بودھ مذہب کافی مقبول تھا۔ گندھارا آرٹ اپنی پوری رعنائیوں پر تھا، بے شمار خوبصورت مندر، معبد اور دوسری عمارتیں فنِ تعمیر کا نادر نمونہ تھیں۔ لیکن ہُنوں نے بلا تمیز سب عمارتوں کو ناخت و تاراج کر دیا۔ سفید ہُن کے زمانے میں سوانگ یان نامی چینی سیاح گندھارا آیا تو بودھ معبدوں اور عمارتوں کی کثیر تعداد مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔ اس سیاح نے سفید ہُن کے حکمران مہرگل سے بھی ملاقات کی۔ وہ لکھتا ہے کہ ہُن حکمران انتہائی اُجڈ، کریہہ المنظر اور بدخصلت تھا، وہ دیووں اور جنوں کو مانتا تھا، لے دے کے اس وقت شہباز گڑھ (مردان) میں ایک عظیم معبد محفوظ رہ گیا تھا جس کے میناروں پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے تھے۔ ان

کے دیکھنے سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں، ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں کشمیر کی سیاحت میں پندرہ سولہ سال گزار کر جب یہ سیاح دوبارہ صوبہ سرحد آیا تو مہرگل کے حکم سے سولہ سو کے قریب بدھ پیوندِ زمین کئے جا چکے تھے۔ گندھارا کی دو تہائی آبادی کو وحشی حملہ آوروں نے تہ تیغ کر دیا تھا۔ بچے کھچے لوگ ان ظالموں نے غلام بنا لئے تھے۔ گویا گندھارا کے علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت پر سفید ہُن کا حملہ ایک ایسا مہلک وار تھا جس کے بعد گندھارا آرٹ کبھی اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور شان حاصل نہ کر سکا۔

ساتویں صدی میں جب دوسرے چینی سیاح ہیون سانگ کا گزر ان علاقوں سے ہوا تو ہر سنگھرام اور وہاڑا (بدھ معبد) ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بودھ خانقاہوں میں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور وہ ویران ہو چکی تھی۔ ایک تو برہمن اور قدامت پسند ہندو پہلے ہی بدھ مت کے دشمن تھے۔ اس پر سفید ہُن کے وحشی لڑاکوں کے مظالم نے اور بھی کسر پوری کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی صوبہ سرحد جو بدھ مت کے پیروکاروں کے لئے مقدس ترین سرزمین سمجھی جاتی تھی اور جہاں کسی زمانے میں بودھوں کا طوطی بول رہا تھا، اس قتلِ عام کے بعد ایسا علاقہ بن گیا جہاں ڈھونڈے سے بھی مہاتما گوتم بدھ کا کوئی نام لیوا دیکھنے میں نہ آتا۔

سفید ہُن کی اصل نسل

چینی نوشتوں میں سفید ہُن کے لئے سب سے پہلے "اِپتا" (EPTA) کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہی لفظ آگے چل کر ہفتالی یا افتھالی بن گیا۔ بعد میں اسی قبیلہ کو "ہیاطلہ" اور سفید ہُن بھی کہا جانے لگا۔ بعض مؤرخوں کے نزدیک پشتون ناموں کا آخری لفظ "خان" "ہون" ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے، اسی طرح کئی ایک نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ابدالی یا اودالی افتالی یا ہفتالی ہی کا مروجہ نام ہے۔ ابراہیم ابن محمد اصطخری (۳۴۰ھ) اور محمد ابن الخوارزمی (۳۷۰ھ) کی رائے میں یہ لوگ اصلاً ترک یا تاتار تھے، ایک اور مستشرق میسن (MASON) کا کہنا ہے کہ نورستان (کافرستان) کے قدیم باشندوں کی اصطلاح میں ہفتالی (ابدالی) سے مراد مطلقاً پشتون ہی ہیں، ایک اور یورپی مستشرق مارکوارٹ "ایران شہر" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ "خلیج یا خوالج ہفتالیوں کے قبائل ہی میں سے ایک قبیلہ ہے جسے شاہی کتابوں میں "خیاز" یا خویز (KHIAS) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔" تاریخ تہذیبی وحدت" کا مصنف لکھتا ہے وسط ایشیا سے گجار (یا گوجر)

ہُن قبیلے نے شمالی مغربی ہند پر حملے شروع کر دیئے اور ۴۸۴ء میں اسی قبیلے کے ایک سردار شالبا یا سالبا ہن نے پنجاب کے ایک حصّے پر قبضہ کر کے سیالکوٹ کو اپنا صدر مقام قرار دیا۔ کتابوں میں کبھی اس قوم کو ترک، کبھی خلجی، کبھی پٹھان، اور کبھی گوجر لکھا گیا ہے جبکہ ایک نظریہ یہ ہے کہ ہُن اہلِ یمن کے اُسی عرب قبیلے کی ایک شاخ ہیں جسے عرب مورخوں نے "اہلِ قریہ" یا بدّو قرار دیا ہے ڈاکٹر سپرنگر نے عرب قدیم کے جغرافیہ میں تمامہ کے قدیمی شہر "گرہانی" یا "قریہ" کا ذکر کیا ہے اور "چین عرب تعلقات" کی ایک تاریخی روایت کا حوالہ دیا ہے جس میں سعراہ بن عبدالملک نے بصیرہ بن شرج کے مرثیہ میں ہیاطلہ کا حوالہ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بنیادی طور پر ہُن عرب ہی کا قبیلہ "اہلِ قریہ" ہو اور وہاں سے نکل کر توران وغیرہ میں آباد ہو جانے کی وجہ سے ترک خیال کیا گیا ہو۔

ہُن حملوں کے اثرات

سمتھ کے خیال میں سفید ہُن کا حملہ برصغیر ہند کا ایک اہم تاریخی موڑ ہے، وجہ یہ ہے اس حملے نے نہ صرف ہندو حکومت کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اسے کمزور کر دیا بلکہ تہذیبی اور نسلی طور پر بھی ہُنوں کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔ ہُن کے ساتھ "گجرار" یا گوجر قبیلہ کے لوگ بھی آئے اور وہ یہیں رہ پڑے، آج کل بھی کاغان، سوات، دیر، کوہستان اور مردان کے کئی علاقوں میں گوجروں کی ایک معقول تعداد آباد ہے بلکہ یوسف زائی علاقہ کا ایک اہم قصبہ گوجر گڑھی، پشاور کا میاں گوجر، پنجاب کا گجرات اور گوجرانوالہ گوجر قوم کی عظمتِ رفتہ ہی کے زندہ نشان ہیں۔ بعض اہلِ علم نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ "گوجر" یا "گجرار" ہُن نہ تھے بلکہ ہُنوں کے ساتھ ایک ذیلی اور مددگار قبیلے کے طور پر اس سرزمین میں آئے تھے۔

اسی طرح یہ خیال بھی عام ہے کہ برصغیر کا نامور راجپوت قبیلہ بھی اصل میں ہُن حملہ آوروں ہی کی اولاد ہے اور اُن میں بہادری اور شجاعت کے جو جوہر پائے جاتے ہیں وہ ہن ہی سے ورثہ میں ملے ہیں۔ علاوہ بریں رسمِ جوہر اور رسمِ ستی جیسی رسمیں بھی شاید انہی خونخوار ہنوں سے راجپوتوں کو ورثے میں ملی ہیں۔ مدتوں تک راجپوت سورماؤں کا یہ دستور تھا کہ وہ انتہائی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کرتے لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو تلواریں سونت کر نکلتے، پہلے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر دیتے تاکہ شکست کی صورت میں ان کے بیوی بچوں کو ذلت کا سامنا نہ ہو اور پھر خود دشمن پر ٹوٹ پڑتے اور لڑتے لڑتے جان دیتے۔ اسے رسمِ جوہر کہا جاتا۔ اسی طرح ہندو بیواؤں کو

چونکہ نکاح ثانی کی اجازت نہ تھی، اس لئے بیوہ عورتیں بھی اپنے مُردہ شوہروں کے ساتھ چتا پر بیٹھ کر جل مرتیں۔ یہ رسم ستی تھی جسے بعد میں مسلمان حکمرانوں نے حکماً بند کرا دیا۔

ہُن قوم قریباً ایک سو سال تک ہندوستان کے شمالی اور وسطی خطّوں پر قابض رہی، اگرچہ اس قبیلہ کے مشہور حکمران تورمان اور مہرگل ہی تھے تاہم ایک روایت یہ بھی ہے کہ مہرگل نے جب بالادیتہ راجہ کی متحدہ ہندو قوت سے شکست کھائی تو سیالکوٹ میں اُس کی گدّی اس کے بھائی نے سنبھال لی۔ نئے ہن حکمران نے ہندوؤں کا اقتدار تسلیم کر لیا اور ہندوؤں کا نائب الحکومۃ بن کر دادِ حکومت دیتا رہا۔ یہ ہُن حکمران ہندو تہذیب سے متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ ہن قبیلہ ہندو قوم ہی میں جذب ہو کر انہی کا ایک حصّہ سمجھا جانے لگا۔ اپنے زوال کے بعد ہن چھوٹی چھوٹی گڑھیاں بنا کر رہنے لگے۔ انہوں نے ہندوستان کے آریہ قبیلوں میں شادیاں کر لیں اور اس طرح ایک مخلوط نسل پیدا ہو گئی۔

ایک انگریز مؤرخ ہاول کا خیال ہے کہ ہُن قوم کا ایک طاقتور قبیلہ میر راجپوتانہ میں آباد ہو گیا۔ چنانچہ آج بھی راجپوتانہ کے مشہور مقامات اجمیر، جیسلمیر اور کومل میر وغیرہ اس ہُن قبیلے کی یاد دلاتے ہیں۔ ہندو مؤرخوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں مطلق العنان حکومتوں کی بنیاد ہُن حملہ آوروں ہی نے رکھی، وگرنہ اس سے قبل آریوں کا معاشرہ ایک جمہوری معاشرہ تھا جس میں سردار کا انتخاب اس کی صلاحیتوں اور مقبولیت کی بنا پر ہوا کرتا تھا۔

بہرحال بدھ مت کے زیرِ اثر وہ ہندو معاشرہ جو امن پسندی، سکون طلبی اور ترکِ دنیا کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی جنگی قوت کھو بیٹھا تھا، ہُن حملوں کے زیرِ اثر پھر سے فعال اور جنگجو بن گیا۔ مقامی باشندوں اور ہن لوگوں کے باہمی اختلاط سے ہندی سوسائٹی میں نیا سپاہیانہ خون داخل ہوا۔ شجاعانہ روایات پر فخر کیا جانے لگا اور راجپوت سورماؤں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

بعض عالمانِ تاریخ کے نزدیک ہُن اتنے وحشی اور سنگدل نہ تھے جتنا کہ ہندو ذرائع نے بتایا ہے۔ بدھ مت کے معابد اور آثار کی تباہی کی ساری ذمہ داری ہُن حملہ آوروں پر ڈالنا قرینِ انصاف نہیں، بلکہ بدھ مت کا زوال گپتا اور کیدار خاندانوں ہی کے دور میں شروع ہو چکا تھا، یہ وہ دور تھا جب برہمن اپنے پورے عروج پر تھے اور بودھوں سے انتقام لینے کا عزم کئے ہوئے تھے۔

انہی برہمنوں نے خروشتی رسم الخط کی جگہ برہمنی رسم الخط کو رواج دیا۔ ہندو مت کی شدت سے تبلیغ کی اور بدھ مت کی پوری مخالفت کی۔ گویا بدھ تمدن کو گپتا عہد ہی سے گھُن لگ چکا تھا۔ بعد میں ہن حملہ آور ہوئے تو بدھوں کی تباہی مکمل ہو کر رہ گئی۔ اور شمال مغربی صوبہ سرحد اور دوسرے نواحی خطّوں سے بدھ مت قریباً ختم ہو کر رہ گیا۔

بودھوں کے اس زوال سے قطع نظر ہُن، اس زمانے کے معیار کے مطابق کامیاب حکمران تھے ان کی حکومت کے طور طریقے آریاؤں سے مختلف سہی، تاہم ایک مہذب قوم کے طور طریقے تھے۔ چینی سیاح سنگ یون نے اس دور کے گندھارا کی تصویر کشی کی ہے اور بتایا ہے کہ ملک بڑا آباد تھا، پہاڑی ندی نالوں سے آب پاشی کا کام لیا جاتا تھا۔ ہر گھر کے آگے آبجو لہریں لیتی تھی، شہر قلعہ بند نہ تھے تاہم ان کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط فوج موجود تھی، ہُن چالیس ولایتوں (صوبوں) سے خراج وصول کیا کرتے تھے، حکمرانوں کے دربار داری کے طریقے، لباس اور رسم و رواج انتہائی مہذبانہ تھے، شاہی خاندان اور اونچے گھرانوں کی عورتیں عمدہ لباس پہنتی تھیں اور زیور پسند کرتی تھیں، حاشیہ بردار خادمائیں ان کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ بادشاہ ایک خوبصورت تخت پر بیٹھ کر لوگوں کو شرفِ ملاقات بخشتا تھا۔ گویا ہُن پوری آن بان سے زندگی گزارتے تھے۔

مہر گل ایک کشمیری برہمن نے "راج ترنگنی" نام کی کتاب لکھی ہے جس میں ہن حکمران مہر گل کے حالات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، وہ لکھتا ہے کہ تورمان کے بعد اس کا بیٹا مہر گل تخت نشین ہوا جو ظلم و ستم اور خونخواری میں بے مثال تھا، اس کی سلطنت دریائے گنگا کے کناروں سے کوہ ہندوکش کی بلندیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے عہد میں ہندو حکومتوں نے ایک بار پھر سنبھالا لیا اور باہم متحد ہو کر ایک دفاق قائم کر لیا۔ اس متحدہ طاقت کے ساتھ راجہ بالادیتہ کی کمان میں ہندوؤں نے مہر گل پر حملہ کر دیا۔ ۵۲۸ء میں ملتان کے قریب کہروڑ کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ چونکہ مہر گل کی ہندو رعایا بھی اس کے ظلم و ستم سے تنگ آئی ہوئی تھی، اس لئے ہندوؤں نے کھُل کر حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہر گل شکست کھا کر بھاگا اور کشمیر کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ بعد میں اس نے کشمیر کے راجہ سے پناہ طلب کی۔ راجہ نے اس پر رحم کھا کر پناہ دے دی لیکن مہر گل نے اپنی فطری غداری اور سنگدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس راجہ کو قتل کر دیا اور کشمیر کی حکومت خود سنبھال لی۔ کشمیر

پر قابض ہو کر مہر گل نے گندھارا پر حملے جاری رکھے اور بدھوں اور ہندوؤں کو بے دریغ تہ تیغ کیا۔ ہو سکتا ہے صوبہ سرحد میں بدھ عبادت گاہوں اور عمارتوں کی تباہی انہی حملوں کے دوران وقوع پذیر ہوئی ہو۔

"راج ترنگنی" میں مہر گل کے ظلم و ستم کی لرزہ خیز داستانیں بیان کی گئی ہیں، اسے آزار دینے میں ایک گونہ لذت محسوس ہوتی تھی، چنانچہ اس کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ کشمیر کی اُونچی پہاڑی چوٹیوں سے ہاتھیوں کو نیچے لڑھکا دیا کرتا تھا، ہاتھی بے بس اور زخمی ہو کر درد سے چنگھاڑتے تو مہر گل بیحد خوش ہوتا، وہ جگہ جہاں سے وہ ہاتھیوں کی موت کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ درہ پیر پنجال بیان کی جاتی ہے۔ مہر گل کے اصلی مذہب کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے سکّوں پر سُورج دیوتا۔ شیو جی مہاراج اور بیل کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، ہو سکتا ہے برائے نام اس نے ہندو مت اختیار کر لیا ہو، مہر گل کا سالِ وفات ۵۴۰ء بتایا جاتا ہے۔

ہُن حملوں کے بعد مسلمان حکمرانوں کی آمد تک شمالی ہندوستان اور صوبہ سرحد میں کوئی قابلِ ذکر مضبوط حکومت باقی نہ رہی۔ ملک طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا، ہر طرف انتشار کا دور دورہ نظر آنے لگا اور بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

ساسانی — دورِ دوم

۵۶۸ء تا ۶۴۴ء

سفید ہُن کی وسیع سلطنت کا تار پود جلد بکھر گیا۔ شمالی ہندوستان میں اسے ہندوؤں کی متحدہ طاقت کا سامنا کرنا پڑا تو باختر میں ترکوں اور ساسانیوں نے ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا، اس طرح ان سارے علاقوں پر ہُن اقتدار کمزور پڑ گیا اور سیاسی حالات نے جو رُخ اختیار کیا اس کے نتیجے میں دریائے سندھ کا مغربی علاقہ (موجودہ صوبہ سرحد) اور افغانستان ایک بار پھر ایرانی سلطنت کی جھولی میں جا پڑا۔

تفصیل اس واقعے کی یوں ہے کہ ہفتالیوں یا سفید ہن کی مرکزی حکومت رُوبہ زوال ہوئی تو ترک یا تاتار قوم وسطی ایشیا میں ان کی جگہ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ ترک یا تاتار عرصے تک وہاں کے مقتدر قبیلے "اوار یانو" کے زیر نگیں اور خدمت گزار تھے، بعد میں ترکوں نے طاقت پکڑ کر "اوار یانو" سے حکومت چھین لی اور حکمران بن بیٹھے۔ ترک سلطنت دو حصّوں میں منقسم تھی۔ کاشغر سے لے کر دریائے آمو تک کی مشرقی حکومت کا حکمران "خاقان" کہلاتا تھا جب کہ اسی قبیلے کی مغربی حکومت کا حکمران "یبغو" کے نام سے موسوم تھا۔

جس زمانے میں ترک وسطِ ایشیا میں اپنے پاؤں جما رہے تھے، ایران میں "مزدکیت" کا فتنہ زوروں پر تھا۔ مزدکیت موجودہ اشتمالیت سے ملتا جلتا دستور العمل تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں مزدکیت نے ایرانی باشندوں کے افکار میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور مزدک پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایرانی شہنشاہیت نے مزدکیت کے فتنے کو دبانے میں بڑی سختی سے کام لیا۔ دونوں فریقوں میں گھمسان کے معرکے ہوئے لیکن بالآخر مزدکیت کے حامی مغلوب ہو گئے۔

ایران پر اس وقت خسرو اوّل کی حکومت تھی، یہ وہی شہنشاہ ہے جسے نوشیروانِ عادل کے نام سے

بھی یاد کیا جاتا ہے۔ نوشیروان اپنے باپ کیقباد کی وفات پر ۵۳۱ء میں وارثِ تاج و تخت قرار پایا تھا، نوشیروان بڑا طاقتور اور مقبول حکمران تھا، اس نے پہلے تو سلطنت روما کے خلاف محاذ قائم کیا۔ کئی معرکوں میں رومیوں کو نیچا دکھایا۔ اور اس طرح ایرانی سلطنت کا کھویا ہوا وقار بحال کر دیا۔ بعد میں اس نے ہیاطلہ یا سفید ہُن قبیلے کی بیخ کنی کا عزم کیا، وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل ہیاطلہ کئی بار ایران سلطنت کو شکست دے کر اپنا لوہا منوا چکے تھے، نوشیروان نے کمال حکمتِ عملی سے کام لے کر ترکِ قوم سے اتحاد کر لیا۔ ہُن ایرانیوں اور ترکوں کی متحدہ طاقت کے سامنے ٹھہر نہ پائے، انہیں پسپائی اختیار کرتے ہی بن پڑی اور اس طرح ایرانی سلطنت ایک بار پھر دنیا کی عظیم طاقتوں میں شمار ہونے لگی۔

نوشیروان نے ہیاطلہ یا سفید ہُن پر یہ عظیم فتح سال ۵۶۸ء میں حاصل کی، اس کامیابی کے بعد سارا مشرقی ایلبن، افغانستان اور صوبہ سرحد دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک کے سارے علاقے ایک بار پھر ساسانی سلطنت کے حصے بن گئے۔ تاریخ اس معاملے میں خاموش ہے کہ آیا اس وقت کے صوبہ سرحد پر براہِ راست ایرانی حاکم مقرر تھے یا یہ کہ ایران کے باجگذار حکمران یہاں برسرِ اقتدار تھے تاہم اتنا ضرور ہے کہ صوبہ سرحد ان دنوں ساسانی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور ایرانی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ "شاہنامہ" میں فردوسی نے بھی ہیاطلہ یا "سفید ہُن" کا ذکر کیا ہے۔

نوشیروان کی وفات کے بعد ۵۹۰ء میں اس کا بیٹا خسرو پرویز ایران کا شہنشاہ قرار پایا۔ اپنے نامور باپ کی طرح وہ ایک مقتدر حکمران تھا اس کے عہدِ حکومت میں ایرانی فوجوں نے پیش قدمی جاری رکھی خصوصاً سلطنت روما پر پے در پے حملے کر کے اس سے شام، حمص، فلسطین اور مصر کے ملک چھین لئے تاہم اس سے ایک سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ یروشلم یا بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد وہ وہاں سے عیسائیوں کی مقدس صلیب بھی اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ اس واقع سے ساری دنیائے عیسائیت کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے، ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر مسیحی طاقتوں نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا اور ایرانیوں کے خلاف فوج کشی کر دی۔ ادھر ان دنوں ترک بھی جو ایرانی شہنشاہ سے کسی بات پر خفا ہو گئے تھے بازنطینی مسیحی بادشاہ کے طرفدار بن گئے۔ خسرو پرویز نے اس کے باوجود بہادری سے مقابلہ جاری رکھا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے ہی ایک بیٹے کے ہاتھوں جس کی ماں ایک بازنطینی شہزادی تھی، قتل ہو گیا۔

اِس طرح ایرانی سلطنت پر پھر ادبار چھا گیا۔ خسرو پرویز کے جانشین کمزور لوگ تھے اس لئے وہ تھوڑا تھوڑا عرصہ حکومت کر نیکے بعد چل بسے۔ ان میں سے آخری حکمران یزدگرد سوم تھا جسے مسلمانوں نے قادسیہ کے میدان میں شکست دی اور ایران پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس امر کے آثار موجود ہیں کہ ان دنوں صوبہ سرحد کے اکثر علاقے ساسانی قلمرو میں شامل تھے، ایران کی تہذیب و ثقافت اس دور میں پورے عروج پر تھی۔ اس نے صوبہ سرحد کی تہذیب پر بھی نمایاں اثر کیا، چنانچہ آج بھی یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے سبھی علاقوں سے بڑھ کر جو علاقہ ایرانی تہذیب و تمدن کے زیر اثر آیا وہ موجودہ صوبہ سرحد ہی ہے۔

تین چینی سیّاح

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا اصل آغاز تبھی ہوتا ہے جب مسلمانوں نے اس سرزمین پہ قدم رکھا، اُن سے پہلے ہندوستان میں تاریخ نگاری کا شعور بیدار نہ ہوا تھا۔ واقعات کو تاریخی ترتیب سے قلمبند کرنے کا رواج نہیں تھا۔ اُس دور کی تاریخ کے ماخذ دیومالائی اور نیم مذہبی اور نیم تاریخی کتابیں ہیں یا پتھر کے کتبے اور دوسرے آثارِ قدیمہ، ایک محقق کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ ہندوستان میں تواریخ نگاری کا آغاز اسی وقت سے ہوا جب ہندوستانی قوم کا واسطہ غیر ملکی لوگوں سے پڑا۔ جہاں سکندر یونانی کے جلو میں آنے والے عالموں، باختری یونانی حکومت کے سفیر متعینہ پاٹلی پتر میگستھنیز نے پہلی بار ہندوستان کو یورپی دُنیا سے متعارف کرایا۔ وہیں چینی سیاحوں فاہیان، سنگ یون اور ہیون سانگ کی تحریروں کی بدولت بھی ہمیں اس دور کے واقعات سے آگاہی ہوئی۔ چینی سفرناموں سے تاریخ کا وہ پردہ اٹھ گیا جو ہندوستان کی قدیم تاریخ پر پڑا ہوا تھا۔

فاہیان چینی سیاحوں میں سب سے پہلے فاہیان برصغیر کے ان علاقوں میں وارد ہوا۔ کیرو نے اس کی سیاحت کا زمانہ ۳۹۹ء سے ۴۱۴ء تک قرار دیا ہے۔ فاہیان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اہم بودھ مرکزوں کا معائنہ کرے اور بودھ نوشتوں اور فرمانوں کو نقل کر کے ساتھ لے جائے۔ وہ زیادہ تر اسی مذہبی اور علمی کام میں محو رہا لہٰذا اس نے ہندوستان کے سیاسی حالات سے واقفیت کو محض ثانوی حیثیت دی۔

فاہیان چین سے چل کر صحرائے گوبی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ باختر اور کابل کی سیاحت کے بعد وہ کرّم کے راستے صوبہ سرحد میں داخل ہوا اور ٹل سے ہوتا ہوا ٹیکسلا پہنچا۔ اُس کا گزر پشاور اور پشکلاوتی سے بھی ہوا جو اُن دنوں بدھ تہذیب کے بہت بڑے مرکز تھے۔ فاہیان نے پشاور اور گندھارا کے علاقوں

کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ اس کے خیال میں گندھارا پشکال وتی اور اس کے گرد و نواح (مردان، سوات بونیر اور مالاکنڈ) کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ پشاور اس کے نزدیک کوئی دوسرا علاقہ تھا، بہرحال وہ پشاور کو گندھارا کا صدر مقام تسلیم نہیں کرتا۔

فاہیان کی آمد کے وقت صوبہ سرحد اور پنجاب میں بدھ مت پورے عروج پر تھا۔ اس نے یہاں کے بدھوں کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ لوگ نہ تو جانور ذبح کرتے ہیں۔ نہ لہسن پیاز کھاتے ہیں۔ البتہ نیچ قوموں کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بدھ راجوں کے متعلق فاہیان کا تاثر ہے کہ وہ بڑے منصف مزاج اور رحم دل تھے۔ مجرموں کو اکثر جرمانے کی سزا دی جاتی تھی۔ البتہ جو لوگ قتل ایسی وارداتوں کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ان کا دایاں ہاتھ کٹوا دیا جاتا تھا۔ ملک میں جا بجا بدھ معبد اور خانقاہیں تھیں جن میں ہزاروں راہب مرد اور عورتیں رہا کرتے تھے جنہیں بھکشو (مرد یا عورت) کہا جاتا تھا۔ ان تارک الدنیا لوگوں کے کھانے پینے اور رہائش کے انتظامات حکومت کے ذمہ تھے۔ شفاخانے عام تھے جن میں عوام کا علاج مفت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جانوروں کے علاج کے لئے بھی ہسپتال موجود تھے۔

فاہیان نے لکھا ہے کہ سوات اور مہابن بودھوں کے مقامات مقدسہ تھے اس نے سوات کو "سوہوتو" اور مہابن کو "مہانقانہ" لکھا ہے، یہ وہ علاقے ہیں جہاں اب بھی بدھ مت کے آثارِ قدیمہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فاہیان نے پشاور کو "فولین شا" لکھا ہے اور اس وادی کی زرخیزی اور شادابی کی وجہ سے اسے "باغِ ہند" کے نام سے یاد کیا ہے، فاہیان نے پشکال وتی (چارسدہ) کے مشہور بدھ تیرتھوں اور بڑے مندر کی بھی زیارت کی۔ وہ پاٹلی پتر (پٹنہ) تک گیا۔ اُسے یہاں کا طریقِ حکومت اور نظامِ معیشت بہت پسند آیا۔ علاقے خوشحال اور پُرامن تھے، تجارت زوروں پر تھی اور لوگ آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

فاہیان چھ سال تک ہندوستان کے علاقوں کی سیاحت کرنے کے بعد ۴۱۴ عیسوی میں چین واپس پہنچ گیا۔

سوانگ یُن

سوانگ یُن دوسرا چینی سیاح تھا جو ۶۲۰ء میں صوبہ سرحد اور دوسرے علاقوں کی سیاحت کو آیا۔ اس کی آمد کے وقت ان علاقوں پر ہُن قبیلہ کی حکومت تھی۔ سوانگ یُن نے ہُن قوم کی حکومت اور ہندوستان کے حالات اپنے سفرنامے میں درج کئے ہیں۔ اس سیاح نے صوبہ سرحد

کے دارالحکومت پشاور کا ذکر کیا ہے اور کنشک کے تعمیر کردہ شہرہ آفاق سٹوپا (موجودہ شاہ جی کی ڈھیری) کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے گندھارا کے راجہ کی کابل کے راجہ کے ساتھ جنگ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہُن قوم کی مختلف شاخیں حصولِ اقتدار کے آپس میں برسرِ پیکار رہا کرتی تھیں۔

سوانگ یُن آیا تو ہندوستان میں سیاسی افراتفری مچی ہوئی تھی، یہ وہ وقت تھا جب بدھ مت کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ہندو مت پھر زور شور سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "میں نے ہندو دھرم اور بدھ مت دونوں کو یکساں ترقی کرتے دیکھا ہے۔ ہر شخص اپنے مذہبی خیالات میں آزاد ہے۔ رعایا آسودہ ہے اور دونوں مذہبوں کے عالموں کی عزت ہوتی ہے۔" اس چینی سیاح نے ہندوستانی آرٹ اور فنِ تعمیر کو بھی سراہا ہے اور ہندوؤں کے رسم و رواج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ہیون سانگ

چینی سیاح ہیون سانگ کا سفر نامہ بھی اس دور کے اہم تاریخی ماخذوں میں ہے۔ فاہیان اور سنگ یون کی طرح ہیون سانگ کے دورے کے بھی تین مقاصد تھے:۔

۱ ـــــ مقدس مقامات کی زیارت۔

۲ ـــــ بودھ خانقاہوں اور درس گاہوں میں رہ کر علم حاصل کرنا۔

۳ ـــــ بدھ مت کی کتابیں اور تبرکات اپنے ساتھ چین لے جانا۔

ہیون سانگ ۶۲۹ء میں اپنے وطن سے روانہ ہوا۔ ترکستان کے راستے سے تاشقند، سمرقند اور کابل کی سیاحت کرتا ہوا گندھارا (صوبہ سرحد) میں داخل ہوا۔ صوبہ سرحد سے وہ ہندوستان روانہ ہو گیا، جہاں نہ صرف شمالی ہندوستان کے متعدد مقامات بلکہ دکن تک کا سفر اختیار کیا۔ پندرہ سال بعد وہ اسی راستے سے چین لوٹ گیا۔

ہیون سانگ نے اپنا سفر نامہ ڈائری کی صورت میں لکھا ہے، واقعات میں ترتیب اور تسلسل کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر مستند اور قابلِ اعتبار ہے اور تاریخ کی تدوین میں اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنے کمالِ علمی کی بنا پر ہیون سانگ کو چینی سیاحوں کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ وہ مہاراجہ ہرش کا دوست بن گیا اور مہاراجہ نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی۔ اپنے مذہبی جوش اور جذبے کے اعتبار سے ہیون سانگ بجا طور پر بدھ مت کا شیدائی کہلاتا ہے۔

ہیون سانگ صرف سیاح ہی نہ تھا بلکہ بہت بڑا عالم اور ادیب بھی تھا، مذہب کی طرف بچپن ہی

سے وہ مائل تھا۔ چنانچہ کم عمری ہی میں جوگی یا بھکشو بن گیا اس نے بدھ مت کا گہرا مطالعہ کیا اور بدھ مت کی بہت سی کتابیں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔

وہ ۶۲۷ء میں چین سے روانہ ہوا اور ۶۴۵ء میں وطن واپس گیا۔ اُنیس سال تک اس نے ترجمے اور سیاحت کا کام کیا۔ وسطِ ایشیا سے ہوکر وہ موجودہ افغانستان پہنچا۔ جہاں نواحِ کابل میں بامیاں کے مشہور مندر میں اس نے اونچا لمبا بُت دیکھا اور اس کے آگے سیس نوایا۔

۶۳۰ء میں وہ گندھارا (صوبہ سرحد) پہنچا۔ پشاور میں اس نے گنج دروازے کے باہر بودھوں کا مشہور سٹوپا دیکھا۔ اسی سٹوپا سے بعد میں وہ ہشت پہلو ڈبیہ برآمد ہوئی جسے بدھ مت کے آثار و نوادر میں اہم مقام حاصل ہے۔ دھات کی بنی ہوئی اس ڈبیہ کے ڈھکنے کے اوپر مہاتما بدھ کی مورتی ہے جس کے دائیں بائیں دو بدھسٹو ہیں، ڈھکنے کے بالائی حصے پر ابھری ہوئی مرغابیاں بنی ہیں جو شاید روحانی ارتقاء کی علامت یا سمبل ہیں ڈھکنے کے اوپر خروشتی زبان میں مہاراجہ کنشک کا نام کندہ ہے' اس ڈبیہ کے اندر بلور کی ایک خوبصورت ہشت پہلو ڈبیہ یا بوتل تھی، اس پر مہاراجہ کنشک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ بلور کی اس ڈبیہ میں مہاتما بدھ کے ہڈیوں کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔

اس بدھ یادگار کی بلندی ۵۵۰ فٹ تھی۔ کلس اس کے علاوہ تھا۔ جو تانبے کے پچیس تھالوں کا بنا ہوا تھا اور ایسا چمکتا تھا کہ آنکھ اس پر جم نہیں سکتی تھی۔ اس کا طرزِ تعمیر وہی تھا جو دوسرے مقامات پر بودھ مندروں اور خانقاہوں کا مخصوص فنِ تعمیر ہے۔ بعد میں ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر سپونر نے یہ ڈبیہ دریافت کی۔ آج کل اسے پشاور کے عجائب خانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پشاور دیکھ لینے کے بعد ہیون سانگ ۶۳۰ء میں پشکال وتی (چارسدہ) پہنچا۔ وہ ایک بڑے دریا کو عبور کر کے شہر میں داخل ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ شہر کے غربی دروازے پر ایک بہت بڑا بُت ہے جبکہ شہر کے مشرق میں اشوک کا تعمیر کردہ معبد ہے جہاں چار بدھ گورو وقتاً فوقتاً درس دیتے رہے' سارے گندھارا بلکہ وسطی ہند تک کے بدھ بھکشو تعلیم پانے یہاں آیا کرتے تھے' شہر سے کچھ فاصلے پر بودھوں کی ایک اور عبادت گاہ ہے جس میں ایک مقدس راہب قیام پذیر ہے' اس معبد کے پاس اشوک کا بنایا ہوا ایک اور سٹوپا ہے جس کی کرسی سوفٹ اونچی ہے۔ پتھر اور لکڑی کا کام نہایت عمدہ ہے اور غیر ملکی کاریگروں کی محنت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے' ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ اسی مقام پر مہاتما بدھ نے بادشاہ کے رُوپ میں ہزار مرتبہ جنم لیا تھا،

اشوک کے اس معبد سے تھوڑے فاصلے پر مشرقی جانب پتھر کے بنے ہوئے دو اور مندر ہیں جن کے متعلق روایت ہے کہ انہیں برہما دیوتا اور اندر دیوتا نے بنوایا۔ شمال مغرب میں ایک اور معبد تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں مہاتما بدھ نے نندا دیوی کو رام کیا تھا اور اُسے مجبور کر دیا تھا کہ مردم کشی سے باز رہے۔ ہیون سانگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ پشکلاوتی کے دورانِ قیام وشوامتر نے ایک کتاب تحریر کی تھی جسے اب محققین نے "ابھی دھرم پرکرم پکل شاستر" کے نام سے شناخت کیا ہے۔

پشکال وتی سے ہیون سانگ ہنڈ پہنچا جو قدیم قصبہ تھا اور جہاں کا قلعہ بڑا مضبوط تھا۔ عام راستہ ان دنوں یہی تھا کہ پشاور سے میاں گوجر کے گھاٹ کو عبور کر کے سرد دریاب کے پُل پر سے ہوتے ہوئے لوگ پشکال وتی یا چارسدہ جاتے تھے۔ وہاں سے ہنڈ جاتے اور موجودہ مقام اٹک سے کچھ میل اوپر دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعے پار کرتے۔ ہیون سانگ نے ٹیکسلا اور حسن ابدال بھی دیکھا۔ حسن ابدال ان دنوں بھی چشموں کا شہر تھا اور بُدھ مت کا ایک مقدس مقام تھا۔ "ناگا الاپترا" کی روایت اس سے منسوب تھی۔

دورانِ سیاحت ہیون سانگ ہزارہ اور کشمیر بھی گیا۔ ہزارہ اس وقت "ولاشی" کہلاتا تھا اور قلمرو کشمیر کا ایک حصہ تھا۔ ولاشی کا صدر مقام اس وقت مانگلی تھا جو مانگل نام کی ندی پر ایبٹ آباد سے مانسہرہ جانے والی سڑک کے پاس واقع ہے یہ شہر اب برباد ہو گیا ہے تاہم اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور تالاب کے نشان اب بھی باقی ہیں۔

راج ترنگنی کے مصنف نے ہزارہ کا نام اَرش یا رَش لکھا ہے۔ اگر درکو اتیگرا پور بیان کیا ہے۔ رَش کا میدان اب بھی اسی نام سے موسوم ہے اور اتیگرا پور آج کل اگرور کہلاتا ہے۔

ہیون سانگ لکھتا ہے کہ ان دنوں بُدھ مت صوبہ سرحد میں رُو بہ تنزل تھا اور ہندو مت طاقت پکڑ رہا تھا۔ ہیون سانگ نے راجہ ہرش کے دارالحکومت قنوج کی بھی سیر کی۔ وہ کافی عرصہ تک راجدھانی میں جو دریائے گنگا کے کنارے واقع تھی، قیام پذیر رہا۔ شہر میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مکانات وسیع اور آراستہ تھے، رعایا خوشحال تھی تعلیم عام تھی۔ یہاں تک کہ اونچے طبقے کی عورتیں بھی تعلیم حاصل کرنے میں مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔ نالندہ یونیورسٹی ایک بہت بڑا تدریسی مرکز تھا جہاں دس ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے اور ڈیڑھ ہزار اساتذہ مصروفِ تدریس تھے۔ یونیورسٹی مذہبی تعلیم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون بھی پڑھائے جاتے تھے۔ ہندو سوسائٹی میں ذات پات کی تمیز کی جاتی تھی۔ بدھ مت کے علاوہ ہندو دھرم اور جین مت بھی رائج تھے۔

ہندوستان سے جاتے وقت ہیون سانگ نادر قلمی نسخے، مورتیاں اور مذہبی تبرکات بھی چین لے گیا۔ ہیون سانگ ۶۶۸ء میں فوت ہوا۔ اس کی تیرہ سو سالہ برسی پچھلے دنوں چین میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔

کابل شاہی حکمران

۶۵۰ء — تا — ۸۷۰ء

سفید ہُن کی تاخت و تاراج کے بعد ایک عرصے تک صوبہ سرحد اور افغانستان میں کوئی قابلِ ذکر مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی، جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں جن کے متعلق کوئی مستند تاریخی ریکارڈ دستیاب نہیں ہوتا۔ اتنا ضرور ہے کہ سفید ہُن کا اقتدار کمزور پڑتے ہی بالخصوص ترک یا تاتار قوم کی بالادستی قائم ہو گئی۔ دائرہ معارف اسلامیہ کے مطابق "ساتویں صدی میلادی میں جب آفتابِ اسلام افقِ بطحا سے طلوع ہو رہا تھا مملکت افغانستان (اور دریائے سندھ کا مغربی علاقہ) دو سیاستوں اور دو مذہبوں سے متاثر تھی۔ مغربی حصے یعنی سیستان۔ ہرات اور خراسان میں ایرانی ساسانیوں کا سیاسی، مذہبی اور ادبی اقتدار قائم تھا۔ جن کا مذہب زردشتی تھا اور زبان پہلوی، مشرقی حصے یعنی گندھارا (صوبہ سرحد) سے کابل اور قندہار تک بدھ اور برہمنی مذاہب رائج تھے۔ مشہور چینی سیاحوں ہیون سانگ (۶۳۰ء) وانگ ہیون سی (۷۵۷ء) کی سیاحت کے وقت ولایت، گندھارا، (صوبہ سرحد) لمپا (لمغان) اور نگرہارا (ننگرہار) آریائی کشتری خاندان کے کابل شاہیوں کے زیرِ اقتدار تھیں۔ ان کا مرکز کاپسیا (موجودہ بگرام، کابل کے شمال میں) تھا۔ انہیں اسلامی مؤرخین نے رتبیل، زنبیل یا زتبیل لکھا ہے (تازہ ترین تحقیقات کے مطابق یہ دراصل ژندہ پیل بمعنی فیل ژیاں تھا) ان ہندو راجوں کی حکومت ٹیکسلا اور دیہند (ہنڈ تحصیل صوابی) یعنی دڑہ مارگلہ سے کابل، رنجح، بُست اور سیستان تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے لقب تگین اور تجن تھے، اس سلسلے کا بانی بُہ لگین تھا اور آخری حکمران لکہ تُورمن (پشتو میں بمعنی شمشیر زن)

اس خاندان کے علاوہ بعض مقامی امراء و رؤسا کا اقتدار پہاڑی درّوں میں قائم تھا، جو کوشانو ہفتلی کے بچے کھچے افراد تھے۔ افغانستان کے جس حکمران خاندان نے عرب مجاہدوں کا مقابلہ کیا وہ برہمن شاہی

یارایانِ کابل کا خاندان تھا۔ یہ خاندان پہلے وزارت کے منصب پر فائز تھا اور اس کی بنیاد ساتویں صدی میلادی کے نصف اوّل میں کلر (نیز موسوم بہ للیہ) نے ڈالی۔

البیرونی پہلا مسلمان مؤرخ تھا جس نے اس حکمران خاندان کا ذکر کیا۔ تاہم وہ خود ہندو دور کی تاریخ لکھنے وقت خاصا پریشان تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ "بدقسمتی سے ہندو واقعات کی تاریخی ترتیب پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ وہ اپنے بادشاہوں کا عہدِ حکومت بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں اور جب بامرِ مجبوری انہیں کچھ بتانا پڑے تو داستان گوئی کا سہارا لے لیتے ہیں" البیرونی کے ہاں کابل شاہی حکمرانوں میں سے حسبِ ذیل کے نام ملتے ہیں۔ سامند (سامنتہ دیوا) کملو، بھیم (بھیما دیوا) جے پال۔ انندپال۔ اور ترلوچن پال۔ علاوہ ازیں افغانستان، صوبہ سرحد اور پنجاب سے دستیاب ہونے والے سکوں سے چار دوسرے حکمرانوں کے نام سے بھی آگاہی ہوتی ہے جن کے نام سپالا پتی۔ پدمہ، خود دیکہ اور ونکہ دیوہ ہیں"۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ کابل شاہی اور ہندو شاہی حکمران ایک ہی تھے، حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے جے پال، انندپال اور اس کے جانشینوں کا دارالحکومت ہنڈ تھا، اور پال خاندان کے یہ حکمران ہندو شاہیہ کہلاتے تھے۔

بہرحال ظہورِ اسلام کے وقت تک صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے مختلف چھوٹے چھوٹے حکمرانوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور یہاں پشتو، پہلوی، مغولی نیز سنسکرت کی پراکرتیں رائج تھیں۔ افغانستان کے مغربی علاقے زردشتی مذہب کے پیروکار تھے جبکہ مشرقی افغانستان اور سارے صوبہ سرحد میں بدھ مت، برہمنی دھرم اور شومت کے نام لیوا آباد تھے، گویا سرزمین گندھارا میں یونانی، ہندی، مغل اور ایرانی عناصر کا ایک مخلوط تمدن ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

۶۴۴ء میں ایک اسلامی لشکر سیستان سے مشرق کی جانب بڑھا۔ اس کی ٹکر ارغنداب میں زنبیل کے لشکر کے ساتھ ہوئی، اس معرکے میں زنبیل مارا گیا۔ البلاذری نے اسے ہیاطلہ کی مملکت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ سلطنت ہرات تک پھیلی ہوئی تھی۔

خلافتِ عثمانی کے دوران عبداللہ بن عامر نے شدید محاصرے اور جنگ کے بعد کابل فتح کر لیا۔ لیکن عربوں کے پیٹھ پھیرتے ہی کابل کے غیر مسلم پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مزید پانچ سال کے لئے وہاں مقامی فرمانرواؤں کی حکومت قائم ہو گئی۔

بعض لوگ صوبہ سرحد کے ہندو شاہیہ کو کابل کے ترک شاہیہ یا کابل شاہیہ کی شاخ قرار دیتے ہیں، ہو سکتا ہے عرب حملوں کی تاب نہ لاکر انہی راجوں کی ایک شاخ صوبہ سرحد میں جا بسی ہو، بہرحال اغلب خیال یہی ہے کہ کابل شاہیہ کوشان خاندان کے لوگ تھے، ممکن ہے جب ساسانیوں اور ترکوں کے ہاتھوں ہن قوم کا اقتدار ختم ہوا تو اس افراتفری سے فائدہ اٹھاکر کوشان ہی کی کوئی شاخ کابل پر قابض ہو گئی ہو، زابلستان (غزنی) سے پائے جانے والے ایک کتبے میں جو ۶۸۲ء کو تحریر کیا گیا، اس خاندان کے راجوں کو "کھوجان پترا" یا "کوشان پترا" یعنی کوشان کا اخلاف قرار دیا گیا ہے۔ ہیون سانگ نے کاپسیا (کابل) کے جس کھشتری حکمران خاندان کا ذکر کیا ہے وہ یہی تبیل یا رتن پال تھا جس نے عربوں سے شکست کھائی۔ ہیون سانگ کے سفر نامہ میں اس بادشاہ کو کابل، پشاور اور ہنوں کا حاکم ظاہر کیا گیا ہے جس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ پشاور اور ہنوں تک کے علاقہ پر کابل شاہیہ کی حکومت ہو جبکہ مردان۔ ہزارہ اور ٹیکسلا پر ہندو شاہیہ راجے برسر اقتدار رہے ہوں جن کی راجدھانی ہنڈ تھی، یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ ہند کی ہندو شاہیہ حکومت کابل میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد وجود میں آئی ہو، بہرحال کوئی وجہ ضرور تھی جس سے صوبہ سرحد کا دارالحکومت پشاور سے ہنڈ تبدیل ہو گیا وہ وجہ کیا تھی، اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

❀❀❀

صفاری ایرانی

۸۶۱ء — تا — ۹۰۰ء

اسلام کا مہر عالمتاب طلوع ہوتے ہی دنیا ایک نئے تمدن اور صحت مند اخلاقی نظام کی روشنی سے منور ہوئی۔ تعلیماتِ اسلام اپنی صداقت، اپنی افادیت اور اپنی عالمگیر خوبیوں کی بدولت ہر باشعور انسان کے دل میں گھر کرتی گئیں اور اسلام کے روحانی پیغام نے ساری دنیا بالخصوص ایشیا اور افریقہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ لوگ دھڑا دھڑ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

تاہم جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے، افغانستان اور صوبہ سرحد کے علاقوں میں اسلامی اقتدار قائم ہونے میں بہت دیر لگی۔ مدتوں مسلمان مجاہد ان علاقوں کے لوگوں سے برسرپیکار رہے، چونکہ یہ علاقے جنگجو اور جفاکش قبائل کے مسکن تھے اس لئے عربوں کو یہاں جلد کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

پہلا مسلمان قبیلہ جس نے افغانستان، صوبہ سرحد اور سندھ و مکران کے بعض علاقوں سے بودھ اور ہندو اقتدار کا خاتمہ کر کے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی وہ سیستان کا صفاری خاندان تھا۔

عہدِ صفاریاں کے بارے میں "دائرہ معارف اسلامیہ" کا کہنا ہے کہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہد میں سیستان ہمیشہ سیاسی تحریکوں خصوصاً خوارج کا مرکز رہا۔ تیسری صدی ہجری میں یہاں "اہلِ فتوحات" نے زور پکڑا جو موجودہ سیاسی جماعتوں کی طرح ایک جمعیت تھی، اس کے ایک رکن یعقوب نے جو سیستان کے ایک گاؤں قرنین کے ایک ٹھٹھیرے لیث کا بیٹا تھا اپنے بھائی عمرو بن لیث کی معیت میں صالح بن نصر، حاکم سیستان کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اور سیستان کے نائب حاکم درہم بن نصر کے ہاں سپہ سالاری کے عہدے پر جا پہنچا۔ ۸۶۱ء میں اس نے درہم اور خوارج کو شکست دے کر اہلِ سیستان سے بیعت لے لی۔ صالح نے کابل شاہ زنبیل سے مدد چاہی تو یعقوب نے اسے بھی شکست فاش دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد ازاں زابل اور رُبست پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے صالح کو پہلے قید خانے میں ڈالا اور پھر چپکے سے اسے مروا دیا۔ ۸۷۱ء میں یعقوب نے فارس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو

اس کی توجہ ہٹانے کے لئے خلیفہ نے اُسے بلخ، طخارستان اور سندھ کے وسیع علاقے جاگیر میں دے دیئے۔ ۸۷۱ء تک اُس نے افغانستان کے قریباً سبھی اہم شہروں پہ قبضہ کر لیا۔ ۸۷۲ء سے ۸۷۶ء تک اس نے ملتان، سندھ، مکران اور صوبہ سرحد پہ بھی اپنا تسلط جما لیا، وہ بغداد پر بھی حملہ آور ہوا لیکن پسپا ہو کر ۹ رجون ۸۷۸ء کو فوت ہو گیا۔ اس نے سلطنت کو بہت استحکام بخشا، لشکر کی تعداد بڑھائی اس کی وفات کے وقت سیستان کے خزانے میں پانچ کروڑ درہم اور آٹھ کروڑ دینار تھے"۔

یعقوب کا جانشین اس کا بھائی عمرو بن لیث تھا۔ خلیفہ نے اُسے خراسان، سیستان، سندھ اور سرحد وغیرہ کا حاکم تسلیم کر لیا۔ ۹۰۰ء میں عمرو بلخ میں اسمٰعیل بن احمد سامانی سے لڑتا ہوا گرفتار ہوا۔ اسے بغداد لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ عمرو بن لیث کے جانشینوں نے کافی عرصے تک سیستان، مشرقی افغانستان اور نواحی علاقوں پہ حکومت کی۔ بالآخر سلطان محمود غزنوی کی آمد پہ اُن کا دور دورہ ختم ہو گیا۔ وہ اس علاقہ کے پہلے مسلمان بادشاہ تھے جنہوں نے سلطنت کو دینی اور سیاسی وحدت کا رنگ دیا۔ انہی کے عہد میں فارسی کو درباری اور ادبی زبان کا مقام ملا۔ صفاری خاندان کے آخری ایام میں سلطنت بہت کمزور پڑ گئی۔ جہاں صفاریوں کو ایران کے سامانی خاندان سے ٹکر لینی پڑی، وہیں سرحد کے ہندو راجوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ ہندو راجوں نے صفاریوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ننگرہار اور لوگر (لوئے غر) پر دوبارہ قبضہ کر لیا، بلکہ عین ممکن ہے کہ ان دنوں کابل بھی صفاری حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں پہلے پہل اسلام صفاری حکمرانوں کی کوششوں ہی سے پھیلا، صوبہ سرحد پہ صفاری اقتدار کا ایک اہم نشان ۱۹۰۷ء میں وادیٔ لوچی (بنوں) سے ملا ہے یہ کتبہ ہے جو آج کل بھی پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، یہ کتبہ کسی ایسی عمارت (یا مسجد) پہ لگا ہوا تھا جسے ایک ایسے شخص نے بنوایا جس کا نام عربی رسم الخط میں تحریر ہے ناہم نام سے وہ عرب معلوم نہیں ہوتا، کتبے کے ایک طرف کی تحریر عربی میں ہے جب کہ دوسری طرف سنسکرت میں یہ کتبہ سٹورٹ پیٹرز کو ہاتھ لگا، جو ان دنوں لوچی کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتبہ صفاری خاندان ہی کے عہدِ حکومت میں لگایا گیا تھا اور یہ کہ اس وقت صوبہ سرحد میں عربی اور سنسکرت دونوں زبانیں سمجھی جاتی تھیں۔

❀❀❀

ہندو شاہیہ

۶۸۷۰ء — تا — ۱۰۲۱ء

اگرچہ محمد بن قاسم کا اسلامی لشکر ۷۱۱ء ہی میں کفر زار ہند کے صوبہ سندھ کو فتح کر چکا تھا اور ۷۱۳ء تک سارے سندھ کے علاوہ بہاولپور اور ملتان تک پر اسلام کا رحمت آفرین پرچم لہرا رہا تھا تاہم کوئی مسلمان فاتح اس وقت تک صوبہ سرحد کے موجودہ علاقوں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ کابل اور گندھارا کی وادیاں دسویں صدی عیسوی تک بدستور غیر مسلمان حکمرانوں کے زیر اقتدار رہیں، ہیون سانگ جن دنوں ان علاقوں کی سیاحت میں مصروف تھا۔ یہ سارا علاقہ کاپسیا یعنی کابل کے حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ اگرچہ ان دنوں مسلمان مبلغ ان علاقوں تک دینِ حق کا پیغام لے کر پہنچ چکے تھے تاہم ہیون سانگ نے اپنے سفر نامہ میں اسلام کی ان علاقوں میں آمد کے متعلق قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا نہ ہی اس نے اُس ہندو شاہی خاندان کا ذکر کیا ہے جن کا صدر مقام ہنڈ تحصیل صوابی تھا، یہ بات بھی واضح نہیں کہ ہنڈ کے ہندو شاہیہ کابل شاہیہ ہی کی شاخ تھے یا کوئی الگ لوگ تھے۔ تاریخ افغانستان جلد دوم کے مصنف نے "جوامع الحکایات" (قلمی) کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ کہ صفاری خاندان کے حملوں سے جب کابل کی ہندو حکومت کمزور ہو گئی تو غالباً اس نے کابل کو غیر محفوظ پا کر اپنا دارالحکومت ہنڈ میں تبدیل کر لیا ہو، اس قلمی نسخے میں ایک ہندو راجہ کملو کا ذکر ہے جو عمرو بن لیث صفاری کا معاصر تھا اور عمرو کا زمانہ ۸۷۹ء سے ۹۰۰ء تک بیان کیا جاتا ہے، ڈاکٹر ناظم کا کہنا ہے کہ ہندو شاہیہ راجے دریائے چناب سے لے کر لغمان تک اور جنوبی کشمیر سے ملتان تک پر قابض تھے اسی وجہ سے محمد عوفی انہیں "رائے ہندوستان" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

البیرونی جس کا زمانہ اس خاندان سے زیادہ قریب ہے، واضح طور پر لکھتا ہے کہ ہنڈ میں ہندو شاہیہ حکمران برسر اقتدار تھے، ہیون سانگ نے کشمیر، ٹیکسلا، صوبہ سرحد اور بنوں وغیرہ پر ایک کھشتری حکمران

خاندان کا ذکر کیا ہے، بہرحال اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے حملۂ ہند کے وقت ہنڈ میں راجہ جے پال کی حکومت تھی جو ہندوؤں کے ساہنی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اس سے قبل بُدھ اور آریہ راجے تو صوبہ سرحد میں برسرِاقتدار رہ چکے تھے لیکن ہندوؤں کا یہ واحد خاندان تھا۔ جس نے صوبہ سرحد کے علاقوں پر حکومت کی۔

اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں "دسویں صدی عیسوی میں ہندو شاہیہ کا اقتدار موجودہ صوبہ سرحد کے علاوہ سوات اور لغمان تک پھیل چکا تھا۔ چنانچہ بریکوٹ (ریاست سوات) سے ایک کتبہ دستیاب ہوا جس پر بزبانِ سنسکرت تحریر تھا کہ

"عہدِ فرماں روائے اعلیٰ، بلند مرتبہ شاہ شاہاں اور مختار اعلیٰ جے پالا دیوا"

جے پالا دیوا سے مراد راجہ جے پال ہے جس نے سلطان محمود کے ہاتھوں شکست کھائی۔

بعض تاریخوں میں جے پال کو لاہور کا راجہ کہا گیا ہے تاہم یہ لاہور (موجودہ دارالحکومت پنجاب) وہ نہیں جو دریائے راوی پر واقع ہے بلکہ اس سے لاہور تحصیل صوابی ضلع مردان مراد ہے جو ہنڈ کے بالکل نواح میں ہے، اس جگہ کے متعلق خیال ہے کہ یہ ہندو شاہیہ کی راجدھانی تھا، اور اسی جگہ سلطان محمود غزنوی نے راجہ جے پال کو گرفتار کیا تھا۔

مشہور مؤرخ بلاذری نے لاہور کو الاہوار اور یعقوب الحموی نے معجم البلدان میں ولاہوار لکھا ہے۔ سلطان محمود غزنوی سے بہت پہلے ابو مہلب بن ابی صفرہ کی قیادت میں ایک اسلامی لشکر ان علاقوں کو آیا تھا جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ بنہ اور الاہوار تک پہنچا تھا۔ ہو سکتا ہے اس سے مراد صوبہ سرحد کے موجودہ مقامات بنوں اور لاہور تحصیل صوابی ہی ہوں۔

جو کچھ بھی ہو لاہور اور ہنڈ کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ مقام کابل سے ہندوستان جانے والی شاہراہ پر دریائے سندھ کے بائیں کنارے واقع ہیں اور قدیم الایام سے بیحد اہمیت کے حامل ہیں، سکندر اعظم نے یہیں قیام کیا تھا اور یہیں سے دریائے سندھ کو پار کر کے ٹیکسلا کی طرف کوچ کیا تھا، بودھوں کے مہایانہ فرقے کا مذہبی مرکز یہی تھا اور یہیں ایک تاریخی بدھ سٹوپا تعمیر کیا گیا تھا۔ سنسکرت کا مشہور عالم اور صرف ونحو کا ماہر پانینی (PANINI) ۳۵۰ ق م میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ علامہ سلیمان ندوی نے "عرب و ہند کے تعلقات" میں لکھا ہے "جب کابل شاہ کو قوت حاصل ہوئی تو اس نے اوہند اور پشاور پر قبضہ کر لیا۔ اور کابل اور قندہار تک اپنی حکومت وسیع کر لی"۔

اگرچہ ہنڈ اور لاہور آجکل چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں اور انہیں دیکھ کر عقل تسلیم نہیں کرتی کہ یہ کسی وقت ایک بڑی حکومت کا صدر مقام رہ چکے ہوں گے تاہم عین ممکن ہے کہ بعد میں دریائے سندھ میں آنے والے سیلابوں نے قدیم شہر کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ یوسفی صاحب کے کہنے کے مطابق لاہور کی تعمیر ایک قدیم شہر کے کھنڈروں پر کی گئی تھی جسے "سلاطورہ" کہا جاتا تھا، ماہر آثار قدیمہ سر الیگزینڈر کننگھم کی رائے میں سلاطورہ کا نام بگڑ کر پہلے الاطورا یا جلاطورا بنا پھر الاہوار یا لاہور بن گیا۔ اس جگہ پانینی کی یاد میں ایک کتبہ بھی نصب کیا گیا تھا جس کی شہادت ساتویں صدی عیسوی میں ان علاقوں کی سیاحت کو آنیوالے چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی دی ہے۔

چترال میں دریائے مستوج کے کنارے واقع ایک گاؤں سے ایک قدیم کتبہ دستیاب ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۰ء میں چترال راجہ جے پال کے ماتحت تھا اور اس وقت چترال کے باشندوں کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی۔

ہندو شاہیہ کے مشہور راجے بھیم، جے پال، انند پال، ترلوچن پال اور بھیم پال تھے، بھیم پال آخری ہندو راجہ تھا۔ جو سلطان محمود کے ——— سپاہیوں کے ہاتھوں ۱۰۲۶ء میں کشمیر میں مارا گیا اور اس طرح اس حکمران خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ ان حکمرانوں کا مفصل ذکر سلطان محمود کے حالات لکھتے وقت کیا جائے گا۔

اس زمانہ کی تحریروں کے مطابق گکھڑ قبیلہ اس علاقے کا ایک نہایت بااثر اور طاقتور قبیلہ تھا، علاوہ بریں اکثر پشتون قبائل بھی اس وقت صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ کے مختلف مقامات میں آباد ہو چکے تھے سلطان محمود کا مقابلہ ہندو راجوں سے ہوا تو یہ قبائل بھی جنگوں میں شریک رہے۔ مورخ فرشتہ رقمطراز ہے کہ "جب آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں افغان قبیلوں کی آبادی بڑھی۔ تو اپنے پہاڑی ٹھکانوں سے نکل کر انہوں نے وادی گرم، وادی پشاور اور شاوڈی (ہنگو اور کوہاٹ) پر قبضہ کر لیا، لاہور (تحصیل صوابی سردان) کے ہندو راجے نے جو اجمیر کے راجہ کا قریبی رشتہ دار تھا، اپنے ایک ہزار گکھڑ سواروں کو افغانوں (پختونوں) کے مقابلے کے لئے بھیجا، لیکن افغانوں نے ان میں سے اکثر ہندوؤں کو تہ تیغ کر دیا۔" فرشتہ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی کے آخر تک صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں پر بھی پختون قبائل کا تسلط قائم ہو چکا تھا، شاید اسی وجہ سے ہندوؤں کو مجبوراً اپنی راجدھانی پشاور سے ہنڈ منتقل کرنی پڑی ہو۔ فرشتہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ترک شاہی، کابل شاہی (یا ہندو شاہی) اپنے آپ کو کوشان کے اخلاف قرار دیتے تھے۔ ان کا زمانہ پرامن تھا اور لوگ تہذیب و تمدن سے بہرہ ور تھے۔ ۱۰۲۶ء میں بھیم پال مارا گیا تو البیرونی نے لکھا کہ

"اب اس خاندان کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنے عروج اور شکوہ کے زمانے میں یہ لوگ ہمیشہ راست گفتاری اور نیکی کی جانب مائل رہے اور یہ کہ یہ لوگ شریفانہ جذبات کے حامل تھے اور عالی ہمتی اور فراخدلی کے اوصاف سے متصف تھے۔"

ہندو شاہیہ کا عہد حکومت کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو یہ بات ضرور قابل افسوس ہے کہ اس دور کے صحیح حالات و واقعات سے آگاہی نہیں ہوتی اس لئے کہ کوئی تاریخی سرمایہ اس دور کا موجود نہیں، ان کے حالات پر سے تاریکی کا پردہ بھی اٹھتا ہے جب مسلمان علماء اور مؤرخ تاریخ نگاری کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔

اِسلامی عہدِ حکومت

سُلطان محمود غزنوی

۹۵۴ عیسوی کا سال تھا اور وسطی ایشیا کا ایک شہر ـــــ ایک بارہ سالہ ہونہار لڑکا غلام کے طور پر بازار میں بک رہا تھا، ایک نیک دل رئیس حاجی نصر نے لڑکے کو خریدا اور اپنے بچوں کی طرح اس کی پرورش کی، لڑکا نہ صرف پڑھنے لکھنے میں بلکہ سپاہ گری میں بھی اپنے ہم عمروں سے کہیں آگے تھا، حاجی نصر اس اُمید پر کہ دارالحکومت میں غلام کی قیمت زیادہ پڑے گی اسے بخارا لے گیا اور شاہی دربار کے ایک افسر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دربار میں ایک مرتبہ بادشاہِ وقت الپتگین کی نظر اس ہونہار غلام پر پڑی تو اس نے نوجوان کو اپنی خدمت کے لئے پسند کر لیا ـــــ تین بار فروخت ہونے والا یہ غلام سبکتگین تھا، جسے آگے چل کر تاریخ عالم میں اہم کردار نبھانا تھا۔

یہ وہ دَور تھا جب افغانستان اور صوبہ سرحد کے طول و عرض میں اشاعتِ اسلام کا مقدس کام شروع ہو چکا تھا، دینِ حق کی خوبیاں لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی تھیں اور پختون قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس صورتِ حال کو دیکھ کر کابل کے ہندو راجے کا ماتھا ٹھنکا، اس نے اپنا دارالحکومت کابل سے ہنڈ (تحصیل صوابی) میں منتقل کر لیا۔ تاکہ مسلمان مجاہدین کی دسترس سے بچا رہے۔

الپتگین کی وفات تک سبکتگین اپنے لئے اعلیٰ مقام پیدا کر چکا تھا۔ لوگ اس کے گرویدہ تھے۔ الپتگین کی جانشینی کے مسئلے پر اختلاف رونما ہوئے تو اگرچہ سبکتگین کے لئے حکومت سنبھالنے کے لئے حالات بیحد سازگار تھے تاہم اس نے بلند اخلاقی، غیر جانبداری اور عالی ظرفی کا ثبوت دیا ـــــ دارالحکومت سے نکل آیا اور غزنی میں وہاں کے حاکم کو شکست دے کر زابلستان کا بادشاہ بن گیا۔ مملکتِ افغانستان ان دنوں کابل و زابل کے دو حصوں میں منقسم تھی۔ اس طرح آدھے افغانستان پر سبکتگین کا سکہ چلنے لگا۔ سبکتگین نرم مزاج اور ملنسار شخص تھا۔ پختون قبائل اس کے گرد جمع ہوتے گئے۔ اس نے اپنی مملکت

کی سرحدوں کو مضبوط بنانے اور داخلی امن و امان قائم رکھنے کے لئے سرحدی مقامات پر قلعوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندو شاہیہ کے حکمران راجہ جے پال نے جو اپنے آپ کو دریائے چناب سے لے کر لمغان اور کابل تک کے سارے علاقے کا فرمانروا سمجھتا تھا۔ سبکتگین کے اس اقدام کو اپنے خلاف ایک چیلنج سمجھا اور ننگرہار اور لمغان پر فوج کشی کر دی، ہندو راجہ نے فوجی تیاریاں اندر ہی اندر شروع کر رکھی تھیں وہ تیزی سے لمغان پہنچا اور سبکتگین کی سپاہ پر حملہ کر دیا۔ ہندو لشکر میں ہزاروں، گھڑسواروں، تیر اندازوں اور شمشیر آزماؤں کے علاوہ جنگی ہاتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ سبکتگین کے لئے ہندو لشکر سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ جے پال کی قوت کو دیکھ کر مرعوب تو ہوا لیکن اللہ کا نام لے کر اس لشکرِ جرار کے سامنے صف آرا ہو گیا۔ اس معرکے میں اس کا بیٹا محمود بھی اس کے ہمراہ تھا جس کی عمر اس وقت صرف پندرہ برس تھی۔

لمغان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مقابلہ سخت تھا۔ ہندو راجہ کو اپنی فتح کا پختہ یقین تھا تاہم اللہ نے مدد کی اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ ہوا یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے باد و باراں کا طوفان آ گیا، برف باری ہونے لگی۔ یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ ہندوستان کے لشکر نے یہ موسم پہلا کب دیکھا تھا۔ وہ لحاف تلاش کرنے لگے اور سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ راجہ جے پال پکڑا گیا۔ اُسے امیر سبکتگین کے سامنے لایا گیا تو اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے بڑی خطا ہوئی۔ اس مرتبہ میرا قصور معاف کر دیں۔ میں آئندہ ہمیشہ کے لئے فرمانبردار رہوں گا اور پنجاب پہنچ کر بہت سا سونا اور چاندی ہرجانہ کے طور پہ آپ کے پاس بھیجوں گا۔" (آئینہ حقیقت نما ص ۱۴۰)

راجہ نے اس وقت بھی بہت سا مال و دولت سبکتگین کے قدموں پہ ڈھیر کر دیا اور وفاداری کا یقین دلایا۔ سبکتگین کے سرداروں بلکہ خود محمود غزنوی نے مشورہ دیا کہ قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑنا دانشمندی نہیں لیکن سبکتگین نے ایک سچے مسلمان کی طرح فراخدلی کا ثبوت دیا اور صلح کی پیشکش قبول کر لی۔ راجہ جے پال نے تاوانِ جنگ کے طور پہ دس لاکھ درہم، پچاس جنگی ہاتھی اور بہت سے قلعے اور شہر مسلمان فرمانروا کو دینے کی شرط قبول کی اور اپنے ایک نامور درباری دولت رائے کو ضمانت کے طور پہ سلطان کے دربار میں چھوڑا کہ وہ اس وقت تک غزنی میں رہے گا جب تک تاوان وصول نہیں

ہو جانا۔ راجہ جے پال نے امیر سبکتگین سے کہا کہ کچھ مسلمان سپاہیوں کو میرے ساتھ بھیجا جائے تاکہ جنگی ہاتھی اور تاوانِ جنگ ان کے ہاتھ ارسال کئے جائیں۔ سلطان نے ساری باتیں منظور کرلیں، جے پال کی نیت لاہور پہنچتے ہی خراب ہوگئی، اس نے مسلمان فرمانروا کے قاصدوں کو قید کر دیا اور لکھ بھیجا کہ جب تک دولت رائے کو رہا کر کے بھیجا نہ جائے گا مسلمان قیدی رہا نہ کئے جائیں گے۔

راجہ جے پال کی اس بدعہدی پر سبکتگین بہت برہم ہوا۔ اس نے ہندو راجہ کو اس بدعہدی کا مزا چکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ راجہ جے پال بھی بے خبر نہ تھا۔ اس نے مذہب کا واسطہ دے کر کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے ہندو راجوں سے مدد مانگی اور ایک لاکھ سپاہیوں کا لشکرِ جرار لے کر مسلمانوں کے مقابلے کو نکلا غزنوی فوجیں درہ کرم کی طرف بڑھیں۔ ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر امیر سبکتگین نے دشمن کے لاؤلشکر کا جائزہ لیا تو اس کا دل ڈوبنے لگا، تاہم اس نے توکل اور حوصلے کا دامن نہ چھوڑا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستانی لشکر میں نظم و ضبط کا فقدان ہے، اس نے دشمن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنے سواروں کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کر کے ان پر ایک معتمد اور تجربہ کار افسر مقرر کیا۔ جنگ ہوئی۔ تو مسلمان سواروں کے یہ دستے باری باری دشمن پر حملہ کر کے کاری ضرب لگاتے اور پیچھے ہٹ جاتے، ہندی فوج سارا دن لڑتے رہنے سے بے دم ہوگئی جب کہ مسلمان شہسوار بدستور تازہ دم رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سپاہی حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمان مجاہدوں نے ان کا پُرزور تعاقب کیا، بہت سا مال و متاع مجاہدوں کے ہاتھ لگا۔ ہزاروں دشمنوں کو قیدی بنا لیا گیا، سبکتگین نے پیش قدمی جاری رکھی اور پشاور پہنچ کر شہر پر ہلالی پرچم لہرا دیا، اس دن کے بعد کسی ہندو حاکم کو اٹک کے اس پار آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سبکتگین نے دس ہزار سواروں کے ساتھ اپنے ایک نائب ابوعلی کو پشاور میں چھوڑا اور خود فتح کے شادیانے بجاتا واپس غزنی روانہ ہوگیا۔ یوں پرچم اسلام پہلی بار پشاور کی فضاؤں میں لہرایا اور صوبہ سرحد اسلام کا ایک مضبوط مرکز بن گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مسلمان فوج دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی، ہندو راجہ کے پاس بہت سے جنگی ہاتھی بھی تھے، ہندوستانیوں کو اپنی فتح کا پورا یقین تھا لیکن جب وہ شکست کھا کر بھاگے تو سارا ہندوستان حسرت کدہ بن گیا۔

اس معرکے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اگست ۹۹۷ء کو امیر سبکتگین وفات پا گیا۔ اس نے بیس سال تک بڑی دانائی اور تدبر سے حکومت کی اور ایک بہت بڑی سلطنت اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

سبکتگین کی وفات کے وقت سلطان محمود خراسان کا گورنر تھا۔ وہ ہرات میں مقیم تھا جبکہ اس کا بھائی اسمٰعیل غزنی میں تھا۔ اسمٰعیل نے جلد بازی سے کام لے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ محمود نے اس کا مقابلہ کیا اور بالآخر اکتوبر ۹۹۷ء میں سلطان محمود کو سلطنت غزنی کا فرمان روا تسلیم کر لیا گیا۔ سلطان محمود کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں خلیفہ بغداد القادر باللہ نے اسے یمین الدولہ، امین الملت اور سلطان کے خطابات سے نوازا اور یوں یہ عظیم حکمران دیکھتے ہی دیکھتے آفتابِ عالمتاب بن کر مطلعِ سیاست پہ چمکنے لگا۔

سلطان محمود مسندِ حکومت پر بیٹھا تو راجہ جے پال نے ایک بار پھر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کا خیال تھا کہ محمود ناتجربہ کار نوجوان ہے، اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے گا۔ سلطان محمود بھی ہندو راجہ کی چالوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے صوبہ سرحد کے کلیدی مقامات اور سرحدی قلعوں اور شہروں پہ حملے جاری رکھے۔ سوات، باجوڑ اور دیر کے علاقے پر اُن دنوں راجہ گیرا کی حکومت تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے ایک سالار شکر پیر خوشاب بابا غازی نے اسے شکست دی، اس ہندو راجہ کا صدر مقام اوڈیگرام تھا جہاں اس کے قلعے کے آثار اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے میں تبلیغ اسلام کا مقدس کام شروع ہوا اور لوگ دھڑا دھڑ پرچم اسلام کے نیچے جمع ہوتے گئے۔

سوات کی مہم میں سلطان محمود کا ساتھ دینے والوں میں سواتی اور دلازاک قبائل پیش پیش تھے۔ سلطان نے اس علاقے کو تسخیر کرنے کے بعد ان دونوں قبیلوں کو سوات میں آباد کر دیا، چند سال بعد دونوں قبیلوں میں اختلافات نے سر اٹھایا۔ حتیٰ کہ سواتیوں نے دلازاکوں کو سوات سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ وہاں سے نکل کر ضلع پشاور اور مردان کے دیہات میں جا بسے جبکہ سواتی پندرھویں صدی عیسوی تک سوات پہ قابض رہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں یوسف زئی اپنے سردار ملک احمد اور ایک نامور عالم شیخ ملی کی سرکردگی میں افغانستان سے ترک سکونت کر کے صوبہ سرحد میں وارد ہوئے۔ پہلے پہل انہوں نے پشاور سے دلازاک لوگوں کو مار بھگایا، بعد میں سوات کی طرف توجہ دی اور کئی سالوں کی مسلسل لڑائیوں کے بعد سواتیوں کے پاؤں اکھیڑ دیئے۔ سوات، باجوڑ اور بونیر پر اس وقت سے یوسف زئی قبیلہ کا تسلط ہو گیا۔ جب کہ سواتی دریائے سندھ کو پار کر کے ہزارہ کے پہاڑی اور رَش کے میدانی علاقوں میں جا بسے۔

یہ سلطان محمود ہی کا دور تھا کہ پختون قبائل کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور پہلی بار ان کا تذکرہ تاریخ عالم کے اوراق پر ہونے لگا۔ غزنوی دور کے مؤرخوں عتبی اور البیرونی نے پختون قبائل کی دل کھول کر تعریف کی، سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی کی فوج زیادہ تر انہی مردانِ تیغ آزما پر مشتمل ہوتی تھی، یوں تو یہ سرحدی لوگ شروع ہی سے جنگ آزماء اور بہادر تھے تاہم اسلام نے ان کو نیا جوش اور جذبہ عطا کیا۔ وہ موت کے خوف سے بے نیاز، شہادت کے طلبگار بن کر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ سلطان محمود کی قیادت نے انہیں نیا ولولہ دیا اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ تک اہل سرحد تاریخ ساز لوگ قرار پائے اور سیاست کے ہر موڑ میں انہوں نے بیحد اہم کردار انجام دیا۔

تخت نشینی کے وقت سلطان محمود غزنوی کی عمر تیس سال کی تھی۔ وہ بادشاہ بننے سے پہلے بھی ایک تجربہ کار قائد اور ایک آزمودہ کار سپہ سالار تھا۔ وہ عالموں، فاضلوں کا بیحد قدردان، فراخدل اور سخی انسان تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اسلام کا سچا شیدائی ہونے کی وجہ سے عوام میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بدولت اس نے اتنی وسیع اور طاقتور سلطنت قائم کی جو خلافتِ راشدہ کے دور کے بعد کوئی مسلمان حکمران قائم نہ کر سکا تھا۔

سلطان محمود کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو ظالم اور مطلق العنان راجوں کے پنجے سے چھڑا کر اسلامی عدل و مساوات کے سائے میں لے آئے۔ چنانچہ اس نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے سترہ بار اہلِ کفر کی طاقت سے ٹکر لی اور بالآخر شمالی ہند کے کونے کونے تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے سترہ تاریخی معرکوں کی تفصیل یہ ہے :۔

پہلا معرکہ سلطان محمود ایک صاحبِ تدبر جرنیل تھا۔ ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے اس نے اپنی سرحدوں کو مستحکم بنانے پر توجہ دی، درہ خیبر اور کوہ سلیمان کے دوسرے دروں کے ساتھ ساتھ قلعوں اور چوکیوں پر حملے کئے۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے نئے قلعے اور چوکیاں کلیدی مقامات پہ قائم کیں اور اس طرح ہر وہ تدبیر کی جس سے ان سرحدوں کی طرف سے دشمن کے حملے کا خدشہ نہ رہے اور اگر حملہ ہو تو اس کی مؤثر مزاحمت کی جا سکے۔

دوسرا معرکہ دو بار سبکتگین سے شکست کھانے اور صلح کا معاہدہ کرنے کے باوجود راجہ جے پال کا دل صاف نہ ہوا تھا، وہ اندر ہی اندر جنگی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ اسے یقین

تھا کہ سلطان محمود اُسکی تاب نہ لا سکے گا۔ لہٰذا ایک بار پھر اس نے سارے شمالی ہند کے ہندو سورماؤں کو غیرت دلا کر ایک لشکرِ جرار تیار کیا اور حملے کی غرض سے پشاور کا رُخ کیا۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ کوئی پچاس ہزار پیادہ سپاہیوں کے علاوہ راجہ جے پال کے پاس اس حملے میں بارہ ہزار سوار اور تین سو جنگی ہاتھی بھی تھے جبکہ سلطان محمود کا لشکر دس ہزار مجاہدینِ اسلام پر مشتمل تھا، ۲۸ نومبر ۱۰۰۱ء کو پشاور کے قریب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ مقامِ جنگ پشاور یونیورسٹی کے نواح میں ریگی پلوسی کا خوڑ (برساتی نالہ) تھا۔ ہندو سورما بھی انتہائی بہادری سے لڑ رہے تھے، اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ مسلمان مجاہدوں کے پاؤں اکھڑتے نظر آتے۔ خود سلطان محمود گھوڑے سے اتر کر اللہ کے حضور سربسجود ہو کر فتح کی دعا مانگتا۔ انتہائی فیصلہ کن معرکہ تھا۔ تاہم قدرت نے شیدائیانِ اسلام کا ساتھ دیا۔ ہندو لشکر سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ ان کے پانچ ہزار سے زیادہ سورما میدانِ جنگ میں کام آ چکے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملے ابھی جاری تھے۔ بالآخر ان کے دل ٹوٹ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ راجہ جے پال اپنے پندرہ بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور بہت سا سامانِ جنگ مسلمان مجاہدوں کے ہاتھ لگا۔ سلطان محمود نے بھاگتے ہوئے دشمن کا تعاقب جاری رکھا۔ پشاور اور نوشہرہ سے بھاگنے کے بعد ہندوؤں نے ایک بار پھر اپنی رہی سہی فوج کو اکٹھا کیا اور لڑائی کے لئے مورچے قائم کر لئے۔ ہنڈ کے مقام پر جو مدتوں ہندو شاہیہ راجوں کا صدر مقام رہ چکا تھا، دوبارہ معرکہ پڑا۔ ہنڈ کا قلعہ اور فصیل بھی ہندو لشکر کو تباہی سے بچا نہ سکے۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، راجہ جے پال اور دوسرے قیدیوں کو فاتح سلطان محمود غزنوی کے سامنے پیش کیا گیا۔ اگرچہ کئی بار راجہ جے پال عہد شکنی کر چکا تھا اور اس پر اعتبار کرنا سراسر حماقت کا کام تھا۔ تاہم سلطان محمود نے راجہ جے پال کو اس کے بڑھاپے کی وجہ سے معافی دے دی، دوسرے قیدیوں کو بھی جزیہ ادا کرنے پر رہا کر دیا گیا۔

راجہ جے پال اس شکست پر بیحد نادم تھا۔ لاہور پہنچا تو اس نے تاج و تخت اپنے بیٹے انند پال کے حوالے کر دیا اور خود چتا پر جل کر مر گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ راجہ کے اس اقدام کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو رسم و رواج کے مطابق دو بار دشمن سے شکست کھانے کے بعد کوئی شخص حکمرانی کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

تیسرا معرکہ اس کے بعد دو سال تک محمود سیستان کی مہموں اور غزنی کے معاملات طے کرنے میں مصروف رہا۔ ۱۰۰۳ء کے موسم سرما میں وہ پھر غزنی سے روانہ ہوا۔ دریائے کرم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ راہ میں کوہاٹ اور بنوں کے بُت پرستوں کی سرکوبی کرتا گیا۔ بنوں کے قدیم قصبہ اکرہ کے نواح میں جھڑپوں کے نتیجے میں سارا علاقہ کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہوگیا دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد غزنوی لشکر بھیرہ پہنچا جو ملتان جانے والی سڑک پر ان دنوں سب سے مشہور شہر تھا۔ بھیرہ کا راجہ باجی رائے سبکتگین کی دوستی کا دم بھرا کرتا تھا لیکن سلطان محمود برسر اقتدار آیا تو اس نے سابقہ تعلقات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے راجہ جے پال کا ساتھ دیا۔ اس پر سلطان محمود نے راجہ کو اس بدعہدی کی سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ بھیرہ کا راجہ اپنی فوجی طاقت پر بے حد نازاں تھا۔ اس کے ہاتھیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ نکلا اور مسلمانوں کے مقابل ڈٹ گیا۔ پہلے پہل چار دن تک ہندو راجہ کا پلہ بھاری رہا۔ پانچویں دن سلطان محمود غزنوی بنفس نفیس میدان میں اُترا۔ ایک پُرجوش تقریر میں اپنے جانباز ساتھیوں کے جذبۂ شہادت کو ابھارا۔ چنانچہ وہ سب کے سب نعرۂ تکبیر بلند کرتے دشمن پر ٹوٹ پڑے، راجہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور اپنے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ مسلمان سپاہیوں نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرے نے طول پکڑا تو ایک رات راجہ قلعے سے نکل بھاگا۔ لیکن مسلمان سپاہیوں نے اُسے گرفتار کرلیا جس پر اس نے اپنے ہی زہر آلود خنجر سے خودکشی کرلی۔

چوتھا معرکہ سال ۱۰۰۵ء، ۱۰۰۶ء میں سلطان محمود نے پھر بھیرہ کی راہ لی۔ اس بار اس کا مقصد ملتان کے حاکم ابوالفتح داؤد سے پنجہ لڑانا تھا۔ یہ شخص نام کا مسلمان تھا لیکن اس کا تعلق بدعقیدہ قرامطی گروہ سے تھا۔ اس نے بھیرہ کی جنگ میں سلطان محمود کے مخالف ہندو راجہ باجی رائے کا ساتھ دیا تھا۔ سلطان محمود قرامطہ یا ملاحدہ کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے ملتان پر حملہ کرکے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بہت سے ملحدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس طرح قرامطی گروہ کی طاقت پاش پاش ہوکر رہ گئی۔

پانچواں معرکہ جے پال کی موت کے بعد انند پال تخت نشین ہوا۔ وہ شمالی ہند کا سب سے بااثر حکمران تھا۔ اس نے ہندو راجوں کا ایک وفاق بنانے کی کوشش کی تاکہ سارے

ہندو راجہ متحد ہو کر سلطان محمود غزنوی کے خلاف فوجی کارروائی کریں۔ سلطان محمود کو دشمن کی ان تیاریوں کی خبر ملی تو قبل اس کے کہ ہندو راجے پیش قدمی کر سکیں۔ وہ غازیانِ اسلام کا ایک بہت بڑا لشکر لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ یہ ۴۰۱ھ کا ذکر ہے، ہندوؤں نے اس جنگ کو بہت اہمیت دی، اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی، اور اجمیر کے ہندو راجوں نے دل کھول کر انند پال کی فوجوں اور اسلحہ سے امداد کی۔ ہندوؤں میں مذہبی جوش کا یہ عالم تھا کہ ہندو عورتوں نے اپنے زیور تک جنگی اخراجات کے لئے دے دیئے۔ شمالی پنجاب کا مشہور جنگجو قبیلہ گکھڑ اس وقت تک مسلمان نہ ہوا تھا۔ اس قبیلہ کے ہزاروں نوجوانوں نے بھی راجہ انند پال کا ساتھ دیا۔ سلطان محمود بھی اپنے جانبازوں کو ساتھ لے کر سرد ھڑکی بازی لگانے نکلا۔ ضلع اٹک کے موضع حضرو کے نواحی میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ سلطان محمود کو دشمن کی زبردست تیاریوں اور خطرناک ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے بھی ہر ممکن احتیاطی تدابیر اختیار کی۔ اپنی خیمہ گاہ کے اردگرد خندقیں کھدوائیں اور پہرہ سخت کر دیا۔ چالیس دن تک سلطان محمود اس انتظار میں رہا کہ حملے کی پہل ہندو راجہ ہی کی طرف سے ہو۔ اس عرصہ میں ہندوؤں کو روز بروز کمک پہنچ رہی تھی۔ تازہ دم ہندو سورما سارے ہندوستان سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس پر سلطان محمود کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے تاخیر مناسب نہ سمجھی اور ایک ہزار تیرانداز بھیج کر ہندوؤں کو آزمانا چاہا۔ سخت معرکہ تھا، دیکھتے ہی دیکھتے تیس ہزار گکھڑ ایک ہزار مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان ڈٹ کر لڑے لیکن دشمن کے اس انبوہِ کثیر کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی، آناً فاناً ڈھائی تین ہزار مسلمان مجاہد جامِ شہادت نوش کر گئے۔ یہ حال دیکھ کر بہادر سلطان خود آگے بڑھا۔ اپنے مجاہد ساتھیوں کو للکارا، جوش میں بھرے ہوئے مسلمان مجاہد ایک دفعہ پھر مڑے اور دشمن پہ پوری قوت سے ہلہ بول دیا۔ عین نازک موقع پر اللہ نے مسلمانوں کو غیبی امداد بھیجی، راجہ انند پال کا ہاتھی شور و غوغا سے ایسا بدکا کہ اپنے سوار سمیت اپنے ہی لشکر کو کچلتا ہوا پیچھے کو بھاگ نکلا، ہندو لڑاکوں نے راجہ کو یوں بھاگتے دیکھا تو دل چھوڑ بیٹھے، بس پھر کیا تھا ان کا ہر آدمی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ دو دن رات تک سلطان محمود غزنوی اور اس کے ساتھی گھوڑوں کی پیٹھ سے نہ اترے اور بھاگتے ہوئے دشمن کا برابر تعاقب کرتے رہے۔ کم و بیش دس ہزار ہندوؤں کی لاشیں میدانِ جنگ اور اس کے اردگرد شمار کی گئیں واپسی پر دریائے سندھ کو کشتیوں کے پل سے عبور کر کے مسلمان فرمانروا نے ہنڈ کے مشہور تاریخی قلعہ

پر بھی قبضہ کر لیا۔ ہندو راجا اپنے اس دارالحکومت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔ کہا جاتا ہے۔ اُس بار سلطان محمود غزنوی کچھ دنوں کے لئے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ چارسدہ میں بھی مقیم رہا۔ سلطان کے ایک ساتھی مؤرخ کا کہنا ہے کہ "اس فتح کے بعد ہم شمال مشرق میں ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں دریا کے کنارے کھجوروں کے اُونچے اُونچے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ یہاں ایک وسیع و عریض میدان تھا جہاں قریبی گاؤں "منگلا" کے لوگ اپنے مردے دفن کیا کرتے تھے"۔ پتہ چلا ہے کہ ۱۲۰۰ء تک دریا کی شاخ جینڈے کے کنارے قاضی خیل کا موجودہ قصبہ منگلا کہلاتا تھا۔

چھٹا معرکہ

دریائے اٹک کے کنارے پر ہند لشکر نے شکست کھائی تو محمود نے فیصلہ کیا کہ بھاگتے ہوئے دشمن کو دم نہ لینے دیا جائے، چنانچہ مسلمان لشکر نے ان کا تعاقب جاری رکھا دشمن نے نگرکوٹ (کانگڑہ) میں جو دریائے بیاس کے کنارے ایک مضبوط پہاڑی قلعہ تھا۔ پناہ لینی چاہی۔ قلعہ کے پاس ایک مشہور مندر بھی تھا۔ راجپوت سردار ابھی ہنڈ اور حضرو میں کھائے ہوئے زخموں کو سہلا ہی رہے تھے کہ سلطان محمود کسی خاص مزاحمت کے بغیر ان کے سر پر جا پہنچا۔ ہندو سورماؤں نے کچھ دیر تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن اپنے آپ کو بے بس اور کمزور پا کر قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ اُدھر مندر کے پنڈتوں اور پروہتوں نے بھی مندر کی چابیاں سلطان محمود کے حوالے کر دیں۔ صرف اسی ایک مقام سے سات لاکھ اشرفیاں، ستر من سونا، دو ہزار من چاندی، اور بیس من ہیرے جواہرات سلطان محمود کے ہاتھ لگے۔ مسلمان غازیوں کو پہلی بار علم ہوا کہ ہندوستان واقعی سونے کی چڑیا ہے اور اس کے قلعوں اور مندروں میں بے اندازہ دولت جمع ہے۔ اس پر اُن کا شوقِ فتح اور بھی تیز ہو گیا اور وہ قریب قریب ہر سال ہزاروں میل کا سفر کر کے ہندوستان کے مختلف مقامات پر حملے کرنے لگے۔

ساتواں معرکہ

۱۰۰۹ء تا ۱۰۱۰ء میں سلطان محمود اور اس کے مہم باز مجاہدوں نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا، وجہ یہ تھی کہ ہنڈ اور حضرو کی شرمناک شکست کے بعد راجہ انند پال کی شہرت کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ پھر سے جنگ کی تیاری کر کے اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرے۔ سلطان محمود کا منشا تھا کہ دشمن کو تیاری کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ سلطان محمود نے یہ ظاہر کیا کہ وہ گجرات کا ٹھیاواڑ پر حملے کے ارادے سے نکلا ہے، اس مقصد کے

لئے اس نے انند پال سے راستہ طلب کیا۔ جہاں کہیں کسی نے سلطان محمود کے لشکر کی مزاحمت کی۔ اس نے سختی سے کچل دیا۔ ہندو راجوں کو سلطان نے موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنی طاقت مجتمع کر سکیں۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ انند پال گھبرا گیا اور سلطان محمود کے دربار میں قاصد بھیج کر صلح کا طالب ہوا، فریقین میں صلح کی شرائط طے پائیں۔ انند پال نے اپنے دو ہزار سپاہی سلطان کی خدمت میں بھیجے اور خراج کے طور پر ہر سال تیس ہاتھی دینے کا وعدہ کیا۔ انند پال کی حکومت کے کمزور پڑتے ہی سلطان محمود غزنوی اور اس کے مجاہدوں پر ہندوستان کے دروازے کھل گئے۔ وہ جہاں چاہتے بلا توقف اور بلا مزاحمت جا پہنچتے۔

۱۰۰۹ء کے آخر میں سلطان محمود کو غوری قبائل کی ایک بغاوت کو بھی کچلنا پڑا۔

آٹھواں معرکہ ۱۰۱۰ء کے موسم سرما میں سلطان محمود غزنوی نے پھر سے ملتان پر حملہ کیا، شہر کو تاخت و تاراج کرنے کے علاوہ قرامطہ اور ملاحدہ کی بہت بڑی تعداد کو مزاحمت کرنے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

نواں معرکہ محمود کی ملتان سے واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد ہندو راجہ انند پال فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا ترلوچن پال لاہور میں اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ ترلوچن پال کی خواہش تھی کہ مسلمانوں سے صلح کی پالیسی پر کاربند رہے تاہم اس کا بیٹا بھیم پال جو بہت ضدی اور متعصب انسان تھا کسی قیمت پر بھی مسلمانوں سے مصالحت کا روادار نہ تھا۔ اس نے مصالحانہ روش کو چھوڑ کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، سلطان محمود کو لاہور کے راجے کے ارادوں کا پتہ چلا تو ۱۰۱۳ء کے موسم سرما میں غزنی سے روانہ ہوا۔ اس بار چونکہ سرحدی علاقوں میں برف باری اپنے وقت سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے سلطان محمود کے لشکر کو کافی دیر رکنا پڑا۔ بہار کے موسم میں سلطان محمود اور اس کے مجاہد صوبہ سرحد سے گزر کر دریائے سندھ کو پار کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف بڑھے، اُدھر سے راجکمار بھیم پال پوری تیاری کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ ٹیکسلا کے قریب مارگلہ کے درّے میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ سخت معرکہ پڑا۔ بالآخر بھیم شکست کھا کر بھاگا تو اس نے ضلع جہلم میں چواسیدن شاہ کے قریب نندانا کے مضبوط پہاڑی قلعے میں پناہ لی اور دوبارہ لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔ سلطان محمود اس کے تعاقب میں نندانا تک پہنچ گیا، اور زبردست قربانی اور جد و جہد کے بعد اس

قلعے پر قبضہ کر لیا تاہم راجکمار بھیم پال اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ رات کی تاریکی میں کسی خفیہ راستے سے بھاگا اور دریائے جہلم کو پار کر کے کشمیر کے پہاڑوں میں جا چھپا۔

نندانہ کا قلعہ کوہستانِ نمک کے علاقے میں مضبوط ترین قلعہ تھا۔ اس کے پاس ہی پہاڑ کی چوٹی پر ماہرین آثارِ قدیمہ نے غزنوی دور کی قبریں دریافت کی ہیں۔ نندانہ کے قریب بھاگن والا کے مقام پر مشہور دانش ور البیرونی نے زمین کی مساحت کا کام مکمل کیا تھا۔ نندانہ کے نواح میں کٹاس کے آس پاس ان قدیم معبدوں کے آثار بھی ملے ہیں جن کا ذکر ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔

دسواں معرکہ

۱۰۱۵-۱۶ء کے موسم سرما میں محمود پھر راجہ بھیم پال کے خلاف بڑھا۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے دریائے جہلم کو عبور کر کے کشمیر جا پہنچا۔ راجہ بھیم ان دنوں لوہ کوٹ کے قلعے میں مقیم تھا۔ یہ قلعہ اتنا مضبوط تھا اور اس تک پہنچنے کا راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ بار بار حملوں کے باوجود سلطان محمود غزنوی کو کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہ ہوئی۔ کشمیر میں اس سال غیر معمولی برفباری کی وجہ سے سردی اتنی شدید تھی کہ حملہ آور فوج واپسی پر مجبور ہو گئی۔ واپسی سفر کے دوران دریائے جہلم میں اچانک طغیانی آجانے سے سلطان محمود غزنوی کی فوج کے بہت سے سپاہی جاں بحق ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان غازی کو بغیر کسی کامیابی کے واپس غزنی لوٹنا پڑا۔

گیارھواں معرکہ

۱۰۱۸ء کے موسم برسات کے ختم ہوتے ہی سلطان محمود پھر غزنی سے نکل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ وہ وادیٔ گنگا تک پہنچنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ ایک لاکھ باقاعدہ فوجیوں کے علاوہ سرحدی قبائل کے بیس ہزار رضا کار بھی اس جہاد میں اس کے ہمرکاب تھے۔ راجہ بھیم پال نے اتنے عظیم الشان لشکر سے مقابلے کی ہمت نہ پا کر چپ سادھ لی۔ وہ سامنے ہی نہ آیا۔ کشمیر کے راجہ سانگی یا سالباہن نے سلطان محمود کے اس عظیم لشکر کا سنتا لڑائی سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ سلطان محمود کا فتح مند لشکر سارے پنجاب کو روندتا ہوا۔ دہلی جا پہنچا۔

۲۔ دسمبر ۱۰۱۸ء کو مسلمان مجاہد دریائے جمنا کو پار کر کے بلند شہر کی طرف بڑھے، بلند شہر کے لوگ وہاں کے ظالم راجہ سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ شہر کی تمام آبادی نے شہر سے باہر نکل کر سلطان محمود غزنوی کے لشکر کا استقبال کیا اور سب نے بخوشی تمام اسلام قبول کر لیا۔

بارھواں معرکہ سلطان محمود اس طرف سے فارغ ہو کر متھرا اور مہابن کی طرف بڑھا۔ جہاں کے راجہ کول چند کی بہادری کی سارے علاقے پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بہت بڑی فوج جمع کی لیکن سلطان محمود کے لشکر جرار کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ راجہ آخر تک بے جگری سے لڑتا رہا اور جب اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے ہاتھوں قتل کرنے کے بعد خودکشی کر لی۔

اس سے قبل سلطان محمود غزنوی تھانیسر کے مشہور شہر کو بھی فتح کر چکا تھا۔ تھانیسر کا راجہ مسلمان لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی شہر کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور شہر کی تمام دولت فتح مند فوج کے ہاتھ لگی اسی طرح قنوج، کالنجر اور بنارس تک کے شہر سلطان محمود کی دست برد سے بچ نہ سکے، وادیٔ گنگا کا سب سے بااثر حکمران راجہ چاندرائے تھا جو اپنے خزانوں اور ہاتھیوں کو لے کر پہاڑوں کو بھاگ گیا لیکن سلطان محمود نے فرشتۂ اجل بن کر وہاں بھی اس کا پیچھا کیا اور اسے شکست فاش دے کر تمام سامانِ حرب اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی کے کمالات کے آگے شاہ نامہ اور سکندر نامہ کے ہیروؤں کے کمالات، ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے سے بڑا لشکر غزنوی مجاہدوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اتنا مال و دولت فاتحین کے ہاتھ لگا کہ بغداد کے بعد غزنی دنیا کا سب سے مالدار اور خوبصورت شہر بن گیا۔

تیرھواں معرکہ اب سارے ہندوستان میں سلطان محمود کے صرف دو حریف باقی تھے انند پال کا پوتا بھیم پال جو شکست کھا کر چھپتا چھپاتا ہر ہندو راجہ کے پاس جا کر اسے شرارت پر اکسا رہا تھا اور دوسرا گوالیار کا حاکم راجپال۔ وادیٔ گنگا کے ہندو راجوں نے اپنی ساری طاقت مجتمع کر کے ایک بہت بڑا لشکر سلطان محمود کے مقابلے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ اس لاؤ لشکر کو دیکھ کر خود سلطان محمود بھی حیرت زدہ رہ گیا اور سخت گھبرایا۔ تاہم اس کی دھاک ہندوستانی سپاہیوں کے دلوں پر اس طرح بیٹھ چکی تھی کہ وہ مقابلے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ راجہ خود راتوں رات بھاگ کھڑا ہوا۔ مال غنیمت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف اس ایک معرکے میں ۵۸۰ ہاتھی سلطان محمود کے ہاتھ لگے۔ غزنی کے لوگوں نے ہاتھی کبھی دیکھا تک نہ تھا لیکن سلطان محمود کے پاس اتنے ہاتھی جمع ہو گئے کہ قندھار کے نواح میں اسے ان ہاتھیوں کے لئے الگ چھاؤنی آباد کرنی پڑی۔

چودھواں معرکہ سلطان محمود نے ہندوستان پر اتنے پے در پے حملے کئے کہ اُسے ان مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت مستحکم کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ تاہم اس نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں مستقل حکومت قائم کرنے پر بھرپور توجہ دی۔ ۱۰۲۱ء میں وہ ہزاروں معمار، بنجار، کاریگر اور مزدور ساتھ لے کر غزنی سے اس نیت سے نکلا کہ صوبہ سرحد اور پنجاب کے کلیدی مقامات میں قلعے اور چھاؤنیاں تعمیر کر کے اپنی حکومت کو مستحکم بنائے۔ اس وقت تک سوات، باجوڑ، کافرستان اور وزیرستان کے لوگوں کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی۔ سلطان محمود کے بھیجے ہوئے مبلغوں نے انہیں اسلام کے دائرے میں داخل کیا۔ سلطان نے دریائے کابل اور کنڑ کے ساتھ ساتھ قلعے اور فوجی چوکیاں قائم کیں۔ یہاں سے وہ کشمیر کی طرف بڑھا اور اسی کی کوششوں کے نتیجے میں پہلی بار ان علاقوں میں اشاعت اسلام کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ لاہور کو سلطان نے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ چنانچہ غزنوی سلاطین نے بارہ نسلوں تک پنجاب اور صوبہ سرحد میں دارِ حکومت دی۔ مسلمان صوفیائے کرام مجاہدوں کے قافلوں میں شامل ہو کر برصغیر میں وارد ہوئے اور یہاں کے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔ سید علی ہجویری عرف حضرت داتا صاحبؒ، حضرت حسین زنجانیؒ اور دوسرے نامور مبلغین اسلام غزنوی عہد ہی میں وارد ہند ہوئے۔

پندرھواں معرکہ ۱۰۲۱ء میں راجہ بھیم پال پنجاب سے بھاگ کر اجمیر کے قریب پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ وہ سلطان کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں مصروف تھا کہ موت نے آن لیا۔ اور اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ اب سلطان کا صرف ایک ہی بڑا حریف تھا اور وہ تھا گوالیار کا راجہ۔ سلطان نے ۱۰۲۲ء میں اس پر فوج کشی کی لیکن راجہ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ سلطان سے صلح کر لے۔ سلطان نے اس کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا اور اس طرح سلطان کے خلاف پورے ہندوستان میں مزاحمت کا خاتمہ ہو گیا۔

سولھواں معرکہ سترہ اکتوبر ۱۰۲۵ء کو سلطان محمود غزنوی ایک بار پھر پوری شان و شوکت کے ساتھ عازمِ ہند ہوا۔ اس کے اپنے لشکر کے علاوہ تیس ہزار رضا کار اور مجاہد بھی اس کے ساتھ تھے۔ اب کے سلطان کا ارادہ بحرِ ہند کے کنارے پر واقع سومنات کے شہر اور مندر کی تسخیر کا تھا۔ مندر کیا تھا ایک بہت بڑا قلعہ تھا جس میں ملک بھر کے ہندو راجوں نے دولت

جمع کر رکھی تھی۔ مندر میں سونے کا بنا ہوا بہت بڑا بُت تھا۔ صرف مندر کی گھنٹیاں ہی بیس من وزنی سونے کی زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں۔ سلطان محمود کے حملے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان بھر کے ہندو راجوں کا پندار ٹوٹ جائے اور سارے برصغیر تک اسلام کی روشنی پہنچا دی جائے۔ تاہم ہزاروں میل کا یہ سفر کوئی آسان کام نہ تھا۔ راہ میں سندھ، جیسلمیر اور راجپوتانے کے لق و دق صحرا پڑتے تھے۔ محمود نے صحرا کو عبور کرنے سے پہلے گھوڑوں اور سپاہیوں کو کے لئے خوراک اور پانی کا وافر ذخیرہ ساتھ لیا۔ تیس ہزار اونٹوں پر پانی اور غلّہ لادا گیا اور اس طرح منزل بہ منزل سفر طے کرتے ہوئے لشکرِ اسلام ۶ دسمبر ۱۰۲۵ء کو سومنات جا پہنچا۔ کئی دن تک دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوتا رہا۔ ہر طرف خون ہی خون نظر آتا تھا اور ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے تاہم اللہ نے سلطان محمود غزنوی کو اس معرکے میں بھی سرخرو کیا۔ مخالف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اپریل ۱۰۲۶ء میں سلطان محمود فتح کے شادیانے بجاتا سندھ، ملتان اور بھکر کے راستے غزنی جا پہنچا۔ ان کی فتوحات کے نتیجے میں اہلِ غزنی کی ثروت مندی کا یہ حال تھا کہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے پھرتے تھے، لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو۔

سومنات سے واپسی پر سندھ کے جاٹوں نے سلطان محمود غزنوی کے لشکر کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اس لئے اس نے ان جاٹوں کو ان کی شرارت کا مزا چکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

سترھواں معرکہ ۱۰۲۷ء میں سلطان محمود غزنوی کا آخری حملہ ان جاٹوں پر تھا جنہوں نے سلطان کے لشکر سے تعرض کیا تھا۔ اب کے یہ معرکہ خشکی کی بجائے دریا میں وقوع پذیر ہوا۔ ملتان پہنچ کر سلطان محمود نے چودہ سو کشتیاں تیار کرائیں۔ ان جنگی کشتیوں کے دونوں طرف لوہے کی چادریں لگی تھیں۔ جن کی وجہ سے دشمن کے تیر ان پر اثر نہ کر سکتے تھے۔ جاٹوں نے اس مقابلے میں چار ہزار کشتیاں دریا میں اتاریں۔ دریائے سندھ میں زبردست جنگ ہوئی۔ جاٹوں کی کشتیاں شاہی کشتیوں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹتی گئیں۔ سلطان محمود کے تیر اندازوں اور آتش باروں نے نہایت جرأت اور استقلال کا ثبوت دیا اور جاٹ بالآخر اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔

سندھ سے واپسی کے دوران سلطان محمود کو ملیریا ہو گیا۔ بخار اتنا شدید تھا کہ موت تک اس نے سلطان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چار برس تک بیمار رہنے کے بعد دنیائے اسلام کی یہ نامور شخصیت اور سرحدی

قبائل کا یہ محبوب قائد ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

سلطان محمود غزنوی کی اولاد میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس میں اس عظیم رہنما کی سی صلاحیتیں ہوں، لہٰذا، بہت جلد غزنوی حکمران خانہ جنگی کا شکار ہو کر اپنا اقتدار کھو بیٹھے، سلطان محمود کے جانشینوں کے نام اور مدتِ حکومت کی تفصیل یہ ہے :-

۱	سلطان مسعود اوّل	(۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۱ء)
۲	سلطان مودود	(۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۹ء)
۳	ابوالحسن بن مسعود	(۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء)
۴	سلطان عبدالرشید بن سلطان محمود	(۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۲ء)
۵	سلطان ابراہیم بن مسعود	(۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء)
۶	مسعود دوم بن ابراہیم	(۱۰۹۹ء تا ۱۱۱۷ء)
۷	ارسلان شاہ بن مسعود دوم	(۱۱۱۷ء تا ۱۱۲۰ء)
۸	بہرام شاہ بن مسعود دوم	(۱۱۲۰ء تا ۱۱۵۲ء)
۹	خسرو شاہ بن بہرام شاہ	(۱۱۵۲ء تا ۱۱۶۰ء)
۱۰	خسرو ملک بن خسرو شاہ	(۱۱۶۰ء تا ۱۱۸۶ء)

سلطان شہاب الدین محمد غوری نے غزنوی خاندان کے آخری حکمران کو لاہور میں ۱۱۸۶ء میں شکست دے کر اس خاندان کی سیادت کا خاتمہ کر دیا۔

غزنوی حکمران اور صوبہ سرحد

اگرچہ صفاری بادشاہوں کے دور ہی سے صوبہ سرحد میں اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی اور بہت سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم سلطان محمود کے زمانے میں اہلِ سرحد تیزی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے ان سرحدی جنگ آزماؤں کے مسلمان ہونے سے برصغیر میں اسلام کو بڑی تقویت ملی، لوگ اسلامی تعلیمات کی صداقت کو دیکھ کر دھڑا دھڑ غزنوی حاکموں کا ساتھ دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزنوی دور میں قبائل سرحد کی اکثریت مسلمان ہو چکی تھی اور غیر مسلموں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔

غزنوی دور کا مورخ عتبی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ سبکتگین اور سلطان محمود کے سپاہیوں کی

اکثریت خلجی اور غوری لوگوں (پختونوں) پر مشتمل تھی۔ سبکتگین بے حد خلیق اور ملنسار شخص تھا۔ وہ پختونوں کی دلی قدر کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف پختون عوام نے اس کا دل کھول کر ساتھ دیا۔ بلکہ جے پال کی جانب سے مقرر شدہ خطۂ پشاور کے مسلمان حاکم شیخ حمید لودھی نے بھی جذبۂ اخوت اسلامی کے تحت امیر سبکتگین ہی کا ساتھ دیا۔ سلطان محمود نے بھی سرحدی جنگ آزماؤں کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ اس کی ہر مہم میں سرحدی جانباز پیش پیش رہے، سومنات کے جہاد میں ہزاروں پختون باقاعدہ فوجیوں کے طور شریک تھے لیکن ان کے علاوہ محض جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے ہزاروں سرحدی رضاکاروں نے بھی بڑی قربانی دی۔ یہ رضاکار اپنے اپنے قبائلی سردار کی سرکردگی میں کفر و اسلام کے مابین ہونے والی اس تاریخی لڑائی میں شامل ہوئے، ان سرحدی سرداروں میں ملک عارف، ملک داؤد، ملک محمود، ملک یحییٰ، ملک غازی، ملک شاہو۔ ملک خانو، ملک مامو ملک احمد کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مورخ عتبی ان پختون مجاہدوں کی شجاعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "وہ ہندوؤں کے لئے پیغامِ مرگ تھے۔ وہ برق رفتاری سے ہندوؤں کی فوجوں میں جا گھستے اور اپنے پیش قبضوں (خنجروں) سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ وہ سیلاب کی طرح پہاڑوں سے اتر کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے، ہرنوں کی طرح پیش قدمی کرتے اور بھوکے شیروں کی طرح دشمن پر حملہ آور ہو کر اسے تہس نہس کر دیتے"

غزنوی دور میں شہر غزنی تہذیبِ اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، بڑے بڑے عالمانِ دین نے یہاں اپنے مکتب قائم کئے اور علم کی روشنی پھیلائی۔ غزنی کا شہر پختون قبائل کا سب سے بڑا شہر تھا جس نے سارے کے سارے سرحدی علاقوں کو متاثر کیا اور سب کے سب لوگ ایک نئے رنگ میں رنگے گئے۔ دربار غزنی میں جہاں البیرونی جیسا مورخ اور دانشور موجود تھا تو بیہقی جیسے عظیم شاعر بھی۔ عتبی جیسے عظیم مورخ بھی تو شہرۂ آفاق معمار اور فنکار بھی، اگرچہ سلطان محمود کا زیادہ وقت جنگی مہموں میں صرف ہوا۔ تاہم وہ صوبہ سرحد اور شمالی پنجاب کے علاقوں میں نظم و نسق کی بحالی کے فریضہ سے بھی غافل نہ رہا۔ اس نے اپنے سب سے معتمد اور باصلاحیت غلام ایاز کو پشاور اور مردان کے اضلاع کا نگران مقرر کیا۔ ایاز کا مقبرہ نواں کلی مردان کے مقام غنڈی میں واقع ہے اور یہ رائے کہ ایاز کا مقبرہ لاہور کے چوک رنگ محل کے ایک کوچہ میں ہے محض غلط فہمی پر مبنی ہے، اصل

میں لاہور میں جس ایاز کا مقبرہ ہے وہ ملک ایاز تھا جو سلطان محمود کے پوتے سلطان مسعود کے عہدِ حکومت میں ۱۰۴۳ء میں لاہور کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔

اسی طرح اس امر کی بھی شہادت ملتی ہے کہ حضرو (اٹک) کے قریب جب سلطان محمود غزنوی نے ہندو راجاؤں کی متحدہ جمعیت کو شکست دی تو راولپنڈی اور نواحی علاقہ گکھڑ سردار سلطان کیگوہر کے سپرد کر دیا۔ اس سردار کو گکھڑ شاہ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ سلطان کیگوہر نے راولپنڈی سے اٹھارہ میل دور پھروالہ کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کی اولاد کئی صدیوں تک پوٹھوہار کی سرزمین پر حکومت کرتی رہی۔

گکھڑ اب عام طور پر کیانی کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ ہزارہ کے علاقہ خان پور کا مشہور راجہ خاندان بھی گکھڑ یا کیانی سرداروں ہی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ضلع گوجرانوالہ میں گکھڑ منڈی بھی اسی خاندان کی ایک ریاست کا صدر مقام تھا۔ گکھڑ منڈی کے مسلمان سرداروں نے سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بڑی جانی قربانیاں دیں۔

❁❁❁❁

شہاب الدین محمد غوری

معز الدین محمد بن سام جسے تاریخ میں شہاب الدین محمد غوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ایک نہایت مدبر، پر وقار اور غیور مسلمان رہنما تھا۔ ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا اسی کے سر ہے، مؤرخوں نے سلطان محمود غزنوی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطان محمود ایک عظیم تر جرنیل اور مردِ مجاہد تھا۔ لیکن شہاب الدین محمد غوری سیاسی تدبر اور سوجھ بوجھ میں اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔

غور اس پہاڑی علاقے کو کہا جاتا ہے جو غزنی اور ہرات کے درمیانی پھیلتا چلا گیا ہے، آج کل اس کے اکثر حصے کو ہزارہ جات کہا جاتا ہے۔ غور کے حکمران خاندان کے بانی کا نام شنسب تھا۔ اس لئے اہلِ غور کو کبھی کبھی آلِ شنسب بھی لکھا جاتا ہے۔

۱۱۰۱ء میں سلطان محمود غزنوی نے غور کے علاقے پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا۔ تو غوری سرداروں نے سلطان محمود کی اطاعت اختیار کر لی۔ اور غزنوی دربار کے باجگذار بن کر امن و آرام سے رہنے لگے۔ غزنوی اور غوری خاندانوں میں مدتوں تک اچھے تعلقات رہے یہاں تک کہ سلطان محمود کے جانشینوں میں سے بہرام شاہ نے اپنی بیٹی غوری شہزادے قطب الدین سے بیاہ دی۔ لیکن بعد میں دونوں خاندانوں میں ناچاقی ہو گئی۔ دشمنی یہاں تک بڑھی کہ بہرام شاہ نے اپنے داماد قطب الدین کو زہر دلوا کر مروا دیا۔ قطب الدین کی موت پر اس کا بھائی سیف الدین غوری آتشِ غضب سے بھڑک اٹھا اور ہر قیمت پر اپنے بھائی کی موت کا انتقام لینے پر تل گیا۔ سیف الدین غوری نے بہت بڑی فوج جمع کی اور غزنی پر ہلہ بول دیا، بہرام شاہ حملے کی تاب نہ لا سکا اور غزنی چھوڑ کر بھاگ نکلا، سیف الدین اب غور کے علاوہ غزنی کا بھی فرمانروا بن گیا۔ تاہم چونکہ افغانستان کے

باقی علاقے، صوبہ سرحد اور پنجاب ابھی غزنوی حکمرانوں کے تسلط میں تھے۔ اس لئے بہرام شاہ کو وہاں سے بڑی مدد ملی۔ اس نے بہت بڑا لشکر ترتیب دیا اور اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لئے غزنی پر ٹوٹ پڑا۔ سیف الدین غوری نے مقابلہ کیا لیکن اس کی کچھ پیش نہ گئی، خود سیف الدین اور اس کا ایک وزیر، جو سادات کے ایک معزز گھرانے کا فرد تھا۔ گرفتار ہوئے۔ انہیں ایک مریل اونٹ پر بٹھا کر شہر غزنی کی گلیوں میں پھرایا گیا۔ پھر ان کے سر قلم کر کے دریائے غزنی کے پل سے باندھ کر لاشوں کو الٹا لٹکائے رکھا۔ اس وحشیانہ مظالم کو دیکھ کر اہلِ غور جوشِ انتقام سے اندھے ہو گئے اور انہوں نے غزنی پر حملے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

۱۱۵۰ء میں موقع ملتے ہی مقتول سیف الدین کے بھائی علاؤالدین نے اہلِ غور کی ایک بڑی تعداد کو لے کر غزنی پر حملہ کر دیا۔ بہرام شاہ کو شکست ہوئی۔ وہ بھاگ نکلا اور شہر غزنی پر غوریوں کا قبضہ ہو گیا۔ علاؤالدین نے اہلِ غزنی سے دل کھول کر بدلہ لیا۔ مسلسل کئی دن تک قتلِ عام کا بازار گرم رہا۔ ایک اندازے کے مطابق ستر ہزار آدمی قتل ہوئے، غزنی کے خوبصورت محل اور عمارتیں یہاں تک کہ شہر کے باغ کئی دن تک جلتے رہے۔ کئی دن رات شعلوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ علاؤالدین غوری نے سلطان محمود، مسعود اور مودود غزنوی کے سوا باقی تمام غزنوی حکمرانوں کی قبریں کھدوا کر ان کی ہڈیوں تک کو جلا دیا۔ اس طرح غزنی جو بغداد کے بعد اپنے وقت کا سب سے بڑا اور خوبصورت اسلامی دارالحکومت تھا۔ مکمل طور پر کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔ علاؤالدین غوری کا نام اس پر "جہان سوز" پڑ گیا۔ اب تک تاریخ عالم میں وہ اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علاؤالدین جہان سوز کی وفات پر اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ لیکن جلد ہی اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس پر غور اور غزنی کی حکومت "جہان سوز" کے دو بھتیجوں غیاث الدین اور معزّ الدین کے ہاتھ آئی۔ معزّ الدین شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اپنے بھائی کا اتنا ادب کرتا تھا کہ غیاث الدین کی زندگی میں کبھی اس نے سلطان کہلانا پسند نہ کیا۔ بلکہ فتح ہند کے بعد بھی اپنے آپ کو غیاث الدین کا نائب ہی بتاتا رہا۔

محمد غوری نے ہندوستان پر پے در پے گیارہ حملے کئے ان حملوں کے نتیجے میں نہ صرف برصغیر کے دارالحکومت دہلی پر اس کا پرچم لہرانے لگا بلکہ بنگال اور بہار تک کے علاقے میں مسلمانوں کی ایک

مستقل سلطنت قائم ہوگئی۔

۱۱۷۵ء میں شہاب الدین محمد غوری نے اپنے بھائی غیاث الدین کی ہدایت پر ملتان کے قرامطی لوگوں پر حملہ کیا۔ چند روز تک زبردست معرکہ پڑا، قرامطی اپنے قلعہ میں محصور ہوکر بیٹھ گئے تاہم محمد غوری کے مجاہد ساتھیوں نے سر دھڑ کی بازی لگاکر قلعہ تسخیر کرلیا۔ قرامطیوں نے اسے خراج ادا کرتے رہنے کا یقین دلایا مگر شہاب الدین محمد غوری نے ان کی پیشکش ٹھکرادی اور علی کرماج نامی امیر کو وہاں اپنا نائب سلطنت مقرر کردیا۔ اس طرح ملتان غوری سلطنت کا ایک اہم جزو بن گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پختون قبائل کی بہت بڑی تعداد ملتان میں آباد ہوگئی۔ سکھوں اور انگریزوں کی آمد تک یہ لوگ ملتان کی سیاسی زندگی پر چھائے رہے چنانچہ اب بھی ملتان میں پختون خاصی تعداد میں آباد ہیں۔

اُچ ملتان کی فتح کے بعد شہاب الدین غوری نے اُچ کا رُخ کیا اور ۱۱۷۶ء میں اس پر فوج کشی کی۔ اُچ کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور پنجند کے پاس واقع تھا۔ اس سارے علاقے پر ان دنوں بھٹی راجپوتوں کا قبضہ تھا۔ بھٹی یا بھاٹیہ بڑی بہادری سے لڑے لیکن سخت جان غوریوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ شہاب الدین نے اُچ کی حکومت بھی اپنے سردار کرماج کے سپرد کردی اور خود واپس غزنی لوٹ گیا۔

سندھ اور گجرات کی تسخیر ۱۱۷۸ء میں شہاب الدین محمد غوری نے وادیٔ سندھ کے زیریں علاقوں پر فوج کشی کی اور بحرِ ہند تک اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سارے علاقے کو فتح کرنے کے بعد محمد غوری گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اس مقصد کے لئے کچھ کا راستہ اختیار کیا جو نہایت دشوار گزار دلدلی علاقے سے ہوکر گزرتا ہے۔ راستے میں سلطان کی فوجوں کا آمنا سامنا نہروالا یا انہلواڑہ کے ہندو راجہ مول راج (جسے بعض مورخوں نے بھیم دیو بھی لکھا ہے) سے ہوا۔ اس معرکہ میں راجپوت اس بہادری سے لڑے کہ انہوں نے حملہ آوروں کے چھکے چھڑا دیئے تاہم شہاب الدین غوری بڑی ہوشیاری سے اپنی فوجیں وہاں سے نکال لایا اور بچتا بچاتا غزنی جا پہنچا۔ اس معرکے میں غوری فوج کو اتنا نقصان پہنچا کہ سلطان نے پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کیا۔

پشاور بابر کی طرح محمد غوری کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ دہلی پہنچنے کے لئے پہلے لاہور پر قبضہ کیا

جائے۔ اس وقت تک غزنوی سلطان خسرو ملک لاہور پر دادِ حکومت دے رہا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی محمد غوری اس نتیجے پر بھی پہنچا تھا کہ پشاور اور نواحی سرحدی علاقے کو تسخیر کئے بغیر لاہور کی فتح ناممکن ہے۔ وجہ یہ تھی کہ غزنوی بادشاہ کو سرحدی جانبازوں کی جانب سے کمک پہنچ سکتی تھی، چنانچہ محمد غوری نے ۱۱۷۹ء میں پشاور پر فوج کشی کی، اردگرد کے سرحدی قبیلوں کے نوجوان اپنے لشکر میں بھرتی کئے پشاور کو ایک اہم فوجی چھاؤنی بنایا تاکہ ضرورت کے وقت یہاں سے اُسے کمک پہنچ سکے۔ صوبہ سرحد کے معاملات کو درست کرنے کے بعد محمد غوری لاہور پر حملے کے منصوبے بنانے لگا۔

لاہور پشاور کی فتح کے دوسرے سال بعد ۱۱۸۰ء میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر حملہ کیا۔ غزنوی حکمران خسرو ملک مقابلے کی تاب نہ لاکر قلعہ بند ہوگیا۔ جب محاصرے نے طول پکڑا تو غزنوی بادشاہ نے صلح کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا، صلح نامہ کی رُو سے خسرو ملک نے باقاعدگی کے ساتھ سالانہ خراج دینا منظور کر لیا اور یہ یغمال کے طور پر اپنا چار سالہ بیٹا ملک شاہ غوری بادشاہ کے ہمراہ غزنی بھیج دیا۔ صلح نامہ طے پا جانے کے باوجود تین سال بعد خسرو ملک نے خراج دینا بند کر دیا۔

سیالکوٹ ۱۱۸۴ء میں لاہور کے بادشاہ کو بدعہدی کا مزا چکھانے کے لئے محمد غوری نے پھر پنجاب کا رُخ کیا۔ اس بار اس نے سیالکوٹ کو فتح کر کے وہاں ایک فوجی چھاؤنی کی بنیاد رکھی اور ایک سردار حسین خرمیلی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا کہ علاقے میں نظم و نسق قائم کرے۔ چونکہ محمد غوری کو اطلاع مل چکی تھی کہ غزنوی بادشاہ نے اس وقت تک کافی فوج جمع کر رکھی ہے اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس بار غزنی واپس چلا جائے اور دوسرے سال مزید تیاری کے بعد لاہور کا رُخ کرے۔

لاہور کی تسخیر سلطان محمد غوری کے پیٹھ پھیرتے ہی غزنوی حکمران ملک خسرو نے پھر پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ اس نے گکھڑوں کے ساتھ مل کر سیالکوٹ پر دھاوا بول دیا تاہم اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جب خسرو ملک کی اس جرأت رندانہ کی خبر شہاب الدین محمد غوری کو ملی ۱۱۸۶ء میں اس نے پوری قوت سے لاہور پر حملہ کر دیا۔ اس بار غوری لشکر بائیس ہزار سواروں پر مشتمل تھا، تاہم جنگ آزمائی کی بجائے محمد غوری نے ایک سیاسی چال چلی۔ اُس نے

خسرو ملک کو پھر صلح کی پیشکش کی اور یقین دہانی کے لئے اس کے بیٹے ملک شاہ غزنوی کو بھی رہا کر دیا غوری کے دوستانہ رویے سے متاثر ہو کر خسرو ملک قلعے سے نکلا اور غوری حکمران سے ملاقات کی، غوری نے وقت ضائع بغیر اُسے گرفتار کر کے اپنے بڑے بھائی غیاث الدین کے پاس غزنی بھیج دیا۔ جہاں ۱۱۹۲ء میں خوارزم شاہ کے ساتھ مل کر غوری خاندان کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں اسے مروا دیا گیا اور اس طرح غزنوی حکمران خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد غوری نے علی کرماج کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور خود غزنی روانہ ہو گیا۔

سلطان محمد غوری نے صوبہ سرحد اور پنجاب کے غیر مسلموں کو مائل بہ اسلام کرنے کے لئے مبلغ بھیجے جس سے ان علاقوں میں لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہونے لگے۔ علاوہ بریں۔ مقامی لوگوں کی تسخیر قلوب کے لئے اُنہی میں سے ان کے حاکم مقرر کئے۔ چنانچہ ایک کھوکھر سردار کو اٹک اور راولپنڈی کے درمیانی علاقہ پر حاکم بنا دیا۔

ترائن کی پہلی لڑائی

جوں جوں محمد غوری صوبہ سرحد اور پنجاب میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ توں توں ہندو راجے خوفزدہ ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت دہلی اور اجمیر پر پرتھوی راج کی حکومت تھی جو سب ہندو راجوں میں سب سے طاقتور شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ ہندو حکمرانوں نے پرتھوی راج کی قیادت میں ہندو ریاستوں کا ایک وفاق قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ شہاب الدین غوری کو پتہ چلا تو وہ ان راجوں کی حوصلہ شکنی کے لئے غزنی سے نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں سرہند کا شہر فوجی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ پرتھوی راج اور اس کے ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ سرہند پر فوری قبضہ کر لیں، تاہم محمد غوری بجلی کی تیزی کے ساتھ ۱۱۹۰ء میں سرہند پر پہنچا۔ شہر کو فتح کرنے کے بعد اپنے ایک امیر ضیاء الدین تولک کو وہاں کا حاکم بنا دیا اور خود غزنی روانہ ہو گیا۔ شہاب الدین محمد غوری ابھی وطن پہنچا بھی نہ تھا کہ اسے خبر ملی کہ دہلی کا راجا پرتھوی راج اور اس کے ساتھی دو لاکھ تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر جرار لے کر سرہند کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سلطان محمد غوری کے پاس اس وقت کل چودہ ہزار جانباز تھے اور وہ بھی سفر سے تھکے ہارے، تاہم وہ پلٹا اور پرتھوی راج سے دو دو ہاتھ کرنے ترائن (تراوڑی) پہنچ گیا۔ دریائے سرسوتی کے کنارے ۱۱۹۱ء میں دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ راجپوتوں نے بیحد شدید

حملہ کر کے غوری فوج کے میمنہ اور میسرہ کو بُری طرح متاثر کیا۔ یہ دیکھ کر سلطان محمود غوری اپنے خصوصی دستہ کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے اپنا گھوڑا ہندو کمانڈر کھانڈے راؤ (جو پرتھوی راج کا بھائی تھا) کے ہاتھی پر چڑھا دیا۔ اور نیزے سے اسے شدید زخمی کر دیا۔ تاہم کھانڈے راؤ کی تلوار کے وار سے محمد غوری خود بھی شدید زخمی ہوا۔ اس کے باڈی گارڈ نے اسے سنبھالا دیا۔ اور میدانِ جنگ سے نکال کر لے گیا۔ اس طرح اس مرتبہ میدان پرتھوی راج اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھ رہا۔

محمد غوری نے چند ہفتے لاہور میں قیام کیا اور صحت یاب ہونے پر پھر غزنی روانہ ہو گیا۔

ترائن کی دوسری لڑائی

سلطان محمد غوری کو اس ناکامی کا شدت سے احساس تھا اس نے اس شکست کا بدلہ لینے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ سال بھر نہ تو وہ چارپائی پر سویا، نہ حرم سرا میں گیا۔ نہ لباس تبدیل کیا اور نہ ہی خوشی کی کسی محفل میں شریک ہوا۔ اس نے اپنے سرداروں کو جنہوں نے میدانِ جنگ میں غفلت برتی تھی، سخت سرزنش کی، چنانچہ ان سب نے ایک نئے عزم اور ارادے سے جہاد کی تیاری شروع کر دی۔

۱۱۹۲ء کے موسمِ سرما میں سلطان محمد غوری ایک لاکھ ستّر ہزار مردانِ مجاہد کو ساتھ لے کر غزنی سے نکلا۔ اس کے سپاہیوں کی اکثریت خلجی اور غوری نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ راہ میں بھی مسلمان غازی شوقِ شہادت سے سرشار لشکرِ اسلام میں شامل ہوتے گئے۔ مؤلف طبقات ناصری کا کہنا ہے کہ شہاب الدین غوری ۵۸۷ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں رائے پتھورا (پرتھوی راج) سے جنگ کے ارادے سے نکلا تو کافی عرصہ درۂ خیبر اور پشاور میں مقیم رہا۔ اس نے خیبری اور سرحدی جوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ اور پوری تیاری کے بعد دریائے سندھ کو عبور کر کے عازمِ دہلی ہو گیا۔

سلطان نے جنگ سے پہلے اپنا ایک معتمد رائے پتھورا کے پاس بھیجا۔ اسے دعوتِ اسلام دی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ تاہم رائے پتھورا اور اس کے ساتھی کامیابی کے نشہ میں بدمست تھے۔ ہندوؤں نے محمد غوری کی اس پیشکش کو اس کی کمزوری پر محمول کیا اور توجہ نہ دی، اُدھر محمد غوری نے راتوں رات لشکر کو ترتیب دیا۔ فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ ہر حصّہ

باری باری حملہ کرے، خود سلطان نے بارہ ہزار آزمودہ کار جانبازوں کا ایک دستہ محفوظ کے طور اپنے ساتھ رکھا۔ علی الصبح مسلمان مجاہد دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اس بار پرتھوی راج کے ساتھ ڈیڑھ سو راجے تھے اور اس کا لشکر تین لاکھ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ تاہم ہندو لشکر غیر منظم تھا وہ ایک بھیڑ کی طرح اکٹھا ہو کر لڑتا۔ عصر تک ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رائے پتھورا نے راہ فرار اختیار کی لیکن گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ وہاں سے سلطان محمد غوری نے دہلی اور اجمیر کی طرف پیش قدمی کی۔ جہاں کے ہندو راجوں نے اطاعت قبول کرنے ہی میں بہتری سمجھی۔ دہلی کے دارالحکومت پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔ محمد غوری نے اپنے معتمد امیر قطب الدین ایبک کو وہاں کا حاکم مقرر کیا جس نے تھوڑے عرصہ بعد میرٹھ۔ کول (علی گڑھ) گوالیار اور بداؤں کے علاقے فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لئے۔ اس فتح سے ہندوستان میں ایک مستقل مسلمان حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔

قنوج کی فتح

۱۱۹۴ء میں سلطان محمد غوری نے قنوج اور بنارس پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ یہ دونوں مقامات ہندوؤں کے مضبوط سیاسی مرکز تھے، دشمن کی شدید مزاحمت کے باوجود دونوں محاذوں پر مسلمان لشکر کو کامیابی نصیب ہوئی۔

۱۲۰۳ء میں محمد غوری کو غزنی اور ملتان میں ان بغاوتوں کو دبانا پڑا جو اس کے اپنے ہی مقرر کردہ حاکموں نے کھڑی کر دی تھیں۔

آخری معرکہ

اس سے اگلے سال پنجاب اور ہزارہ کے گکھڑ قبائل نے سر اٹھایا۔ ہر طرف لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم ہو گیا اور راستے غیر محفوظ ہو گئے۔ سلطان شہاب الدین نے اس بغاوت کو کامیابی سے فرو کیا۔ گکھڑوں کی طاقت پاش پاش ہو گئی، بے شمار قتل اور گرفتار ہوئے۔ اس فتح کے بعد سلطان لاہور گیا جہاں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ اس جشن کے موقع پر سلطان نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا وائسرائے (نائب السلطنت) مقرر کیا۔

ان مہمات سے فارغ ہو کر سلطان محمد غوری غزنی کو جا رہا تھا کہ گکھڑوں کے ایک گروہ نے، جو بظاہر سلطان کی وفاداری کا دم بھرتا تھا اور اس کے محافظ دستے میں شمار ہوتا تھا، رات کے وقت سلطان کے خیمے میں داخل ہو کر اسے سوتے میں قتل کر دیا۔ سلطان محمد غوری کی شہادت کا یہ

واقع ۱۵ رجون ۱۲۰۵ء کو پیش آیا۔ سلطان اس وقت دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر رہتاس کے قریب خیمہ زن تھا۔ حال ہی میں بعض ڈرائیو نے شاہراہ پاکستان کے قریب سوہاوہ کے پاس سلطان شہید کی قبر کی نشان دہی کی ہے جبکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری جامع مسجد ہرات میں مدفون ہیں۔ ان کی آرام گاہ کے ساتھ دوسرے مجاہدوں اور شہیدوں کے مزارات بھی ہیں۔ تیمور کے لئے قبر پر تربوز جتنا بڑا سبز رنگ کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ بعض مورخوں نے سلطان کے قاتلوں کو قرامطی فرقہ کے افراد بتایا ہے۔

سلطان محمد غوری کا کوئی بیٹا نہ تھا، تاہم اس نے چند ماتحتوں کو بیٹوں کی طرح پالا تھا اور امور سلطنت میں ان کی عمدہ تربیت کی تھی۔ سلطان کی وفات کے بعد انہی معتمدوں میں سے قطب الدین ایبک کو دہلی کی حکومت ملی جب کہ تاج الدین یلدوز غزنی اور صوبہ سرحد کے علاقوں کا حاکم قرار پایا۔ یلدوز نے ایبک کے خلاف لشکر کشی کی لیکن شکست کھائی۔ بالآخر صلح ہوگئی تو ایبک نے اپنی بیٹی یلدوز سے بیاہ دی، دونوں فریقوں میں اس کے بعد امن وامان قائم رہا۔ سرحدی معاملات اور سیاست کا تعلق زیادہ تر یلدوز ہی کے ساتھ تھا۔

سلطان محمد غوری برصغیر کے مسلمانوں کے نزدیک وہ قابلِ احترام ہستی ہیں۔ جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

❋❋❋

چنگیزی حملے

سلطان محمود غزنوی کے دور سے لے کر مغل شہنشاہ بابر کے زمانے تک سرحدی قبائل یا پختون برصغیر کی سیاست پر چھائے رہے بلکہ کافی عرصہ تک دہلی کا تخت اُنہی کے زیرِ نگین رہا۔ تاہم یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ جہاں برصغیر کے باقی علاقوں میں ان تاریخ ساز لوگوں نے بے حد مضبوط اور مستحکم حکومتوں قائم کیں اور لاکھوں مربع میل کے علاقے میں نظم و نسق اور امن و امان بحال کیا وہیں ان کا اصل وطن (صوبہ سرحد اور ملحقہ علاقہ) کسی منظم حکومت کی برکات سے محروم رہا۔ سرحدی علاقوں میں قبائلی نظام ہی بحال رہا۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے سرداروں کی قیادت میں اپنے مفاد کے لئے سرگرمِ عمل رہا۔ ان پانچ صدیوں میں وسطی ایشیا اور افغانستان سے سرحدی قبائل کی آمد کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ہر قبیلے کی یہ کوشش رہی کہ صوبہ سرحد کے زرخیز میدانی علاقوں سے پہلے سے آباد شدہ قبیلے کو نکال باہر کرے اور خود ان زرخیز علاقوں پہ قابض ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ سرحدی علاقوں میں خانہ جنگی کا بازار گرم رہا، فتنہ و فساد کی اس آگ کو چنگیز خان اور اس کے جانشین منگول سرداروں کے حملے نے اور بھی بھڑکا دیا۔

ہوا یہ کہ تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدا میں غوری سلطنت کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوا۔ تو افغانستان اور نواحی علاقوں پر سلطان محمد خوارزم شاہ کا جھنڈا لہرانے لگا، اگرچہ خوارزم شاہ بہت وسیع و عریض سلطنت کا مالک بن چکا تھا تاہم اسے سیر چشمی میسر نہ ہوئی، توسیع ملک کے لالچ نے اسے بے چین رکھا۔ یہاں تک کہ ۱۲۱۸ء میں اس نے بغداد پر حملہ کر دیا۔ فتح و ظفر کے پھریرے لہراتے وہ بغداد جا پہنچا۔ لیکن ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ اسے خبر ملی کہ خیوہ، غزنی اور دوسرے علاقوں پر چنگیز خان نے حملہ کر دیا ہے۔

چنگیز خان منگول قبیلے کا سردار تھا۔ منگول لوگوں کو بعض مورخوں نے تاتاری بھی لکھا ہے اور مغول بھی۔ چنگیز کا اصل نام تموجن تھا اور وہ ۱۱۶۲ء میں ایک خانہ بدوش گھرانے میں پیدا ہوا۔ تاہم اس نے اپنے زورِ بازو سے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تو چنگیز کے نام سے پکارا جانے لگا۔ چنگیز کے معنی "کامل سپاہی" کے ہیں، منگول وحشی لوگ تھے۔ جنگوں میں وہ وحشت و بربریت کے ایسے ایسے کام کرتے تھے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ جائے۔ تمام منگول قبیلوں کو زیر کرنے کے بعد چنگیز خان نے خوارزم شاہ پر حملہ کر دیا۔ خوارزم شاہ عراق سے واپس لوٹا لیکن کسی جگہ بھی جم کر چنگیزی لشکر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہرات، بلخ، بامیان اور غزنی کے بڑے بڑے شہروں کو لوٹنے کے بعد منگولوں نے انہیں نذرِ آتش کر دیا۔ سارے افغانستان اور صوبہ سرحد میں انہوں نے قتلِ عام کا وہ بازار گرم کیا کہ چھوٹے بڑے مرد عورت، بچے بوڑھے کسی میں کوئی تمیز روا نہ رکھی جو سامنے آیا تہِ تیغ کر دیا گیا۔ بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، منگولوں کا یہ حملہ ایشیا کی تاریخ کا سب سے بڑا حملہ تھا۔ اس حملے میں جانی اور مالی تباہ کاری کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کو بھی سخت دھچکا لگا۔ عالموں فاضلوں کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ مسجدیں اور مدرسے ڈھا دیئے گئے۔ کتابیں جلا دی گئیں، عمارات مسمار کر دی گئیں۔ اس قیامت خیز طوفان نے غزنوی اور غوری عہد کی تمام ترقیوں پر پانی پھیر دیا۔ بلکہ دیکھا جائے تو چنگیزی حملوں کے بعد افغانستان صوبہ سرحد اور پنجاب کی تاریخ یکسر بدل گئی۔ پرانے آثار مٹ گئے اور نئے سر سے تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی۔

اپنے ملک میں شکست کھانے کے بعد خوارزم شاہ نے بحیرہ کیسپین کے ایک جزیرے میں پناہ لی۔ اسے چنگیز خان سے ٹکر لینے کی جرأت بھی نہ ہوئی اور اسی گمنامی کی حالت میں ۱۲۲۰ء میں فوت ہو گیا۔

تاہم محمد شاہ خوارزم کا بیٹا جلال الدین خوارزم شاہ اپنے باپ کے برعکس ایک بہادر اور جرأت مند شخص تھا۔ اس نے چنگیز خان کو نیچا دکھانے پر کمر باندھ لی۔ پختون قبائل نے اس کا ساتھ دیا۔ چنگیز خان کو خبر ملی تو وہ ۱۲۲۱ء کے موسمِ خزاں میں وسطِ ایشیا سے نکلا اور اس نے افغانستان کے مشہور تاریخی شہر بامیان کا محاصرہ کر لیا۔ چنگیز نے اپنی فوج کا ایک حصہ جلال الدین کے مقابلے

میں بھیجا۔ تاہم اس موقع پر ترکوں اور پختونوں کی مشترکہ فوج نے چنگیزی لشکر کو شکست فاش دی اُدھر بامیان کے محاصرے نے طول کھینچا۔ ان واقعات سے چنگیز خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے نہ صرف بامیان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ خود جلال الدین کی فوج پر حملہ کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ بامیان کے معرکے میں چنگیز خان کا ایک پوتا بھی مارا گیا تھا جس کی موت کا بدلہ لینے کے لئے چنگیز نے قسم کھائی۔ چنانچہ جب بامیان منگولوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے کسی مقامی باشندے کو زندہ نہ چھوڑا۔ شہر میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔

بامیان کی فتح کے بعد چنگیز خان غزنی کی طرف بڑھا۔ اب کے چنگیز خان نے ایسا انتظام کیا کہ کوئی پختون خوارزم شاہ کی مدد کو پہنچ نہ سکے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلال الدین شکست کھا کر بھاگا۔ اس کا ارادہ ہندوستان پہنچ کر شمس الدین التمش سے امداد حاصل کرنے کا تھا۔ چنانچہ اس نے وزیرستان سے گزر کر دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان کا رُخ کیا تاہم چنگیز نے اس تیز رفتاری سے اس کا تعاقب کیا کہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے اسے جالیا۔ وزیرستان کی پہاڑیوں میں تینوں اطراف سے منگولوں نے جلال الدین خوارزم شاہ کی فوج کو گھیر لیا۔ خوارزم شاہ کے جان نثار ساتھیوں نے پوری پامردی سے منگولوں کا مقابلہ کیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے مخلص دوست، عزیز یہاں تک کہ اس کے بیوی بچے بھی ایک ایک کر کے مارے گئے۔ تاہم جلال الدین نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اس نے دریائے سندھ میں گھوڑا ڈال دیا۔ پانی کا بہاؤ بے حد تیز تھا، بچنا مشکل تھا، تاہم خوارزم شاہ نے ہمت سے کام لے کر دریائے سندھ کو پار کر لیا، کہا جاتا ہے کہ جس جگہ جلال الدین خوارزم شاہ نے گھوڑا دریا میں ڈالا تھا۔ وہاں کنارہ آٹھ دس فٹ اُونچا تھا۔ کئی لوگوں کے نزدیک خوارزم شاہ نے موجودہ قصبہ خوشحال گڑھ سے جنوب کی سمت دریا پار کیا تھا۔ بادشاہ کو دریا پار کرتے ہوئے دیکھ کر اس کے کئی ساتھی بھی دریا میں کود پڑے اور جوں توں کر کے دریا کے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔

جلال الدین خوارزم شاہ نے التمش (شاہ دہلی) سے پناہ کی درخواست کی۔ لیکن شمس الدین التمش جانتا تھا کہ خوارزم شاہ کو پناہ دینے کا مطلب منگولوں کو حملے کی دعوت دینا ہوگا۔ اس لئے التمش نے بڑی خوبصورتی سے خوارزم شاہ کو ٹال دیا کہ ہندوستان کی آب و ہوا اُسے موافق نہ آئے گی۔ اس

پر جلال الدین خوارزم شاہ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ سندھ کے راستے ایران چلا جائے۔

چنگیز خان کو سخت صدمہ تھا کہ سلطان جلال الدین خوارزم شاہ اس کے ہاتھ سے بچ نکلا تھا، تاہم اس نے سرحدی باشندوں سے بدلہ لینا چاہا جنہوں نے اخوتِ اسلامی کے جذبے کے تحت خوارزم شاہ کا ساتھ دیا تھا۔ تین ماہ تک چنگیز خان نے پشاور، چترال، کرّم اور صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں میں جی بھر کر قتلِ عام اور لوٹ مار کی۔ پھر وہ اپنے دو بیٹوں گدائی خان اور چغتائی خان کو صوبہ سرحد کے لوگوں کی سرکوبی کے لئے چھوڑ کر وطن واپس روانہ ہو گیا۔ بعد میں چغتائی خان کے ہاتھوں سندھ، مکران کرّم اور وزیرستان کے شہر اور قریے کھنڈرات میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔

اگست ۱۲۲۷ء عیسوی میں چنگیز خان چل بسا اور اس کی موت سے دنیا کو ایک بہت بڑے عذاب سے نجات مل گئی۔ مرتے وقت اس کی سلطنت کی حدود مغرب میں دریائے والگا، مشرق میں بحرالکاہل شمال میں سائبیریا اور جنوب میں خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے رعب داب اور طاقت کا یہ حال تھا کہ دنیا اس کے نام سے کانپ اٹھتی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش نے بڑی حکمتِ عملی سے پنجاب اور سرحد میں منگولوں کی یلغار کو روکا۔ اس کی ان خدمات کے اعتراف میں ۱۲۲۹ء میں دارالخلافت بغداد سے بہت سے تحائف اور خلعت بھیجی گئی۔ اس سال ۱۸ فروری کو خلیفۃ المسلمین کا ایلچی توثیق نامہ لے کر دہلی پہنچا، جہاں اس کا انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ کئی روز تک جشن جاری رہا۔ ایک خاص تقریب میں خلیفہ کا خط پڑھا گیا اور التمش نے خلیفہ کی ارسال کردہ خلعت زیبِ تن کی۔

دسمبر ۱۲۴۱ء میں منگولوں نے اپنے سردار مانگو کی قیادت میں صوبہ سرحد کو روندتے ہوئے ملتان پر پھر حملہ کر دیا۔ دہلی کے حکمران بہرام شاہ نے سالار نظام الملک کو حاکم ملتان کی مدد کے لئے بھیجا۔ منگولوں کو اس کمک کے آنے کا پتہ چلا تو انہوں نے ملتان کا محاصرہ اٹھا کر لاہور کو گھیر لیا۔ لاہور کے مسلمان حاکم قراکش نے ان کا مقدور بھر مقابلہ کیا لیکن کچھ بن نہ آئی، وحشی منگولوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور کئی دنوں تک لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۲۴۵ء میں پھر منگولوں نے دریائے سندھ کو پار کر کے اُچ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ان دنوں دہلی دربار نے غیاث الدین بلبن کی ماتحتی میں ایک زبردست فوج منگولوں کے مقابلہ کے لئے بھیجی

جس نے اُن وحشیوں کو مار بھگایا۔

بلبن تخت نشین ہوا تو منگول دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سارے علاقہ پر قبضہ جما چکے تھے۔ یہاں تک کہ لاہور بھی ان کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ بلبن نے بڑی دانشمندی سے منگولوں کی روک تھام کے لئے ایک سرحدی پالیسی وضع کی۔ اس نے سندھ، پنجاب، اور صوبہ سرحد کو ایک وحدت بنا کر اس پر اپنے چچازاد بھائی شیر خان کو گورنر مقرر کر دیا۔ جب کبھی منگول حملہ کرتے لاہور، ملتان، اُچ اور پشاور کی فوجیں مل کر ان کا مقابلہ کرتیں۔ شیر خان نے سرحدوں پر جا بجا فوجی قلعے اور چھاؤنیاں قائم کیں۔ جن کی وجہ سے نہ صرف اندرونِ ملک امن وامان بحال ہو گیا بلکہ ملک منگولوں کی تاخت و تاراج سے بھی محفوظ رہا۔ ان دنوں پنجاب کے شمالی علاقوں میں کھوکھر لوگوں نے بڑی شورش مچا رکھی تھی۔ ان کی وجہ سے راستے محفوظ نہ تھے، علاوہ بریں جب بھی منگول حملہ کرتے کھوکھر ان کا ساتھ دیتے اور دونوں مل کر لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ شیر خان نے کھوکھروں کی سرکوبی پر بڑی توجہ دی۔ اس طرح سرحدی علاقے میں امن وامان بحال ہو گیا۔ اس مشترکہ فوجی کمان کی وجہ سے منگولوں کو کئی بار ناکام وطن لوٹنا پڑا۔ بالآخر ان کے سردار ہلاکو خان نے دہلی میں اپنا سفیر بھیجا اور دہلی دربار سے صلح کر کے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔

تمام مورخوں نے غیاث الدین بلبن کی سرحدی پالیسی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان دنوں منگول یا تو درہ خیبر اور پشاور سے گزر کر پنجاب پر حملہ آور ہوتے تھے یا کرّم۔ ٹوچی اور گومل کی راہ سے ملتان اور سندھ کی جانب رُخ کرتے تھے۔ بلبن نے ان دونوں راستوں پر قلعے بنوا کر ان میں کافی فوج متعین کی۔ ہر دستے پر وفادار اور آزمودہ کار سالار مقرر کئے۔ اگر منگول حملہ آور ہوتے تو انہیں چپّہ چپّہ پر شاہی فوجوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ ایک ریزرو فوج بھی مرکز میں تیار رہتی جو سرحدی فوج کی مدد کو پہنچ جاتی۔ شیر خان نے زندگی بھر اپنے فرائض اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ اسے "محافظ سرحد" کا لقب دیا گیا۔ اس مدبّر جرنیل کی زندگی میں منگول حملہ آوروں کو کبھی کوئی کامیابی ہونے نہ پائی۔

شیر خان کی وفات پر بادشاہ نے اس اہم منصب پر اپنے لائق اور بہادر بیٹے شہزادہ محمد کو مقرر کیا اور اسے "قآن الملک" کا خطاب دیا۔ شہزادہ محمد کے محافظ سرحد بنائے جانے کے بعد ۱۲۷۶ء میں منگولوں نے بہت بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ حملہ آوروں کی تعداد اور طاقت اس قدر زیادہ

تھی کہ انہوں نے نہایت آسانی سے دریائے ستلج بھی پار کر لیا۔ اور دہلی کے قریب جا پہنچے۔ تاہم شہزادہ محمد اور سرحدی فوج کے دستوں نے جان پر کھیل کر منگولوں کا مقابلہ کیا۔ اور انہیں مار بھگایا۔

۱۲۸۵ء میں منگولوں کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا۔ اس مرتبہ ان کا سپہ سالار تمر خان تھا جو خراسان کا حاکم اور بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تمر خان کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار کے قریب تھی، اس نے سرحد کو پار کر کے پنجاب میں لوٹ مار مچادی اور تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا دیپالپور (ساہیوال) جا پہنچا۔ جہاں شہزادہ محمد کی فوج نے بہادری سے مقابلہ کیا اور منگولوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ فتح کے بعد شاہی فوجوں نے منگولوں کا تعاقب جاری رکھا تاہم شہزادہ محمد نے اس موقع پر کچھ زیادہ خود اعتمادی دکھائی اور وہ دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بہت آگے نکل گیا جہاں منگولوں نے اسے گھیر کر قتل کر دیا۔ شہزادہ کے قتل کے بعد شاہی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور منگول جاتے جاتے بہت سے سرکردہ مسلمان رہنماؤں کو جن میں امیر خسرو بھی شامل تھے ساتھ لے گئے۔ ان حملوں میں لاکھوں کی تعداد میں منگول مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ بلبن نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو بنگال سے بلا کر سرحدی فوجوں کا کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا۔ شہزادہ محمد بے حد ہر دلعزیز اور بہادر انسان تھا۔ اس کی شہادت سے بلبن کے بڑھاپے کا آسرا جاتا رہا۔ اور اسے شہزادہ محمد کی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ چند ہی مہینوں میں بیٹے کے غم میں گھل گھل کر مر گیا اور باپ بیٹے دونوں کو پہلو بہ پہلو قطب مینار سے تھوڑی دور دفن کیا گیا۔

جلال الدین خلجی کی حکومت کے دوران ۱۲۹۲ء میں منگولوں نے الغو خان کی قیادت میں پھر جوش و خروش سے ہندوستان پر حملہ کیا، اس مرتبہ شمشیر آزمائی کی بجائے خلجی خاندان کے بزرگ بادشاہ نے گفت و شنید سے منگولوں کے ساتھ معاملات طے کرنے چاہے۔ منگول اس فیاضانہ سلوک سے انتہائی خوش ہوئے۔ ان کے کوئی تین ہزار افراد مسلمان ہو گئے اور ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ سلطان جلال الدین خلجی نے انہیں دہلی کے قریب ایک نئی بستی میں آباد کیا۔ جس کا نام ان منگولوں کی وجہ سے مغل پورہ پڑ گیا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے تخت نشین ہونے کے بعد منگولوں نے پے در پے ہندوستان پر چھ حملے کئے۔

۱۲۹۶ء میں امیر داؤد کی قیادت میں دو لاکھ تاتاریوں کا لشکرِ جرار پنجاب اور سندھ کی فتح کے ارادے سے آیا۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے بھائی الپ خان کو ان کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ لاہور کے قریب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا اور ایک ہلاکت خیز لڑائی کے بعد منگول بارہ ہزار لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ مرنے والوں میں ان کے کئی اعلیٰ افسر بھی شامل تھے۔

۱۲۹۸ء میں دو لاکھ منگولوں کا ٹڈی دل لشکر اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے پھر نئی سج دھج سے روانہ ہوا۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد انہوں نے اٹک پار کیا اور گکھڑوں کے دیہات (ہزارہ اور اٹک کے اضلاع) کو لوٹا، بعد میں پنجاب میں تباہی مچاتے ہوئے یہ لوگ دہلی کی طرف بڑھے، راہ میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان وحشیوں کو روکتا۔ علاؤالدین خلجی نے ان حملہ آوروں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ایک لشکر بھیجا۔ شاہی لشکر کی کمان بادشاہ کے بھائی الغ بیگ اور معتمد سپہ سالار ظفر خان کر رہے تھے۔ شاہی فوج نے جان پر کھیل کر منگولوں کے اس عظیم لشکر کا مقابلہ کیا۔ جالندھر کے قریب دونوں فوجوں کی ٹکر ہوئی جس میں منگولوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ بیس ہزار منگول لڑائی میں کام آئے۔ ان کے بہت سے سردار زندہ گرفتار ہوئے جنہیں دردناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ الغ بیگ نے منگول قیدیوں کی کافی تعداد اور مقتولوں کی کھوپڑیاں فتح کی خوشخبری کے ساتھ دہلی کے شاہی دربار کو بھیجیں۔ اس عظیم فتح سے سارے برصغیر میں سلطان علاؤالدین خلجی کی دھاک بیٹھ گئی۔

۱۲۹۹ء میں جب الغ بیگ اور نصرت خان گجرات کا ٹھیاواڑ کے انتظامی امور میں مصروف تھے منگولوں نے اپنے سردار (SALDI) صلدی خان کی کمان میں شمال مغربی سرحدی علاقوں پر پھر دھاوا بول دیا۔ بلکہ سیوستان کے علاقے پر قبضہ بھی کر لیا۔ یہ دیکھ کر سلطان علاؤالدین خلجی نے ظفر خان کو پوری سرعت اور تیاری کے ساتھ ان علاقوں کی طرف بھیجا اور کچھ توپیں (منجنیقیں) بھی اس کے ساتھ کیں، تاہم ان توپوں کے استعمال کی نوبت ہی آنے نہ پائی اور ظفر خان نے محض تیروں اور تلواروں سے دشمن پر غلبہ پا لیا۔ بہت سے منگول قیدی دہلی بھیجے۔ ظفر خان کی ان کامیابیوں کی بدولت بادشاہ علاؤالدین اور اس کا بھائی الغ بیگ بہت متاثر ہوئے بلکہ الغ بیگ تو ظفر خان کو اپنا ایک طرح کا حریف سمجھنے لگا۔

دوسرے سال بھی منگول لشکر کے غیظ و غضب کا وہی عالم تھا۔ ان کے دو لاکھ سواروں نے اپنے نامور جرنیل قتلغ خان کی سرکردگی میں پھر ہندوستان کا رُخ کیا۔ منگول اس بار خلجی بادشاہ سے اپنی شکست کا بدلہ لینے اور اُسے سبق سکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ راہ میں بستیاں اُجاڑنے میں اپنی طاقت ضائع کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ سیدھے دہلی پہنچ کر دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے۔ سارے علاقے میں منگولوں کے اس حملے سے اتنا خوف و ہراس پھیل گیا کہ عوام بھاگ بھاگ کر دہلی پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ دارالحکومت میں روزمرّہ کی ضروریات کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ باہر سے تجارتی قافلوں کی آمد رسد کی وجہ سے پہلے ہی بند تھی۔ اس لئے لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

منگول حملے کی خبر پاکر بادشاہ علاؤالدین خلجی نے چاروں طرف قاصد دوڑائے کہ ہر صوبہ دار زیادہ سے زیادہ فوج دہلی بھیجے تاکہ منگولوں کو عبرت ناک شکست دی جا سکے۔ یہ موقع اتنا نازک تھا کہ اکثر امراء بھی اس رائے کا اظہار کر رہے تھے کہ صلح صفائی کر کے منگولوں سے جان چھڑائی جائے اور لڑائی مول نہ لی جائے۔ تاہم خلجی بادشاہ نے ذرا بھر کمزوری نہ دکھائی۔ وہ دہلی سے نکلا۔ دریائے جمنا کے کنارے اپنی صفیں ترتیب دیں، اس کی سکیم بڑی کامیاب تھی۔ ایک طرف دریائے جمنا تھا، دوسری طرف گھنا جنگل۔ شہنشاہ خود بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلب لشکر میں تھا۔ وہ خود ہی کمان کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک خونریز معرکے کے بعد تاتاری بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ علاؤالدین کے بہادر جرنیل ظفر خان نے بھاگتے ہوئے منگولوں کا دور تک تعاقب کیا جس سے دشمن کا کافی نقصان ہوا تاہم خود ظفر خان بھی مارا گیا۔

۱۳۰۱ء میں جب سلطان علاؤالدین خلجی راجپوتانے اور رنتھمبور کی مہموں میں مصروف تھا منگول لشکر نے جو ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا اپنے سردار طرغی خان کی قیادت میں پھر دہلی پر حملہ کر دیا۔ دہلی میں اس وقت فوج بہت تھوڑی تھی۔ بادشاہ نے اِدھر اُدھر قاصد دوڑائے، لوگ بڑے گھبرائے ہوئے تھے لیکن اس بار امدادی دستے پہنچنے سے پہلے ہی منگولوں پر کچھ ایسی وحشت طاری ہوئی کہ وہ خود ہی اچانک محاصرہ اٹھا کر چلتے بنے۔

عام عقیدہ یہ ہے کہ اپنی کمزوری دیکھ کر لوگ حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمتہ کے پاس فریاد لے کر گئے اور دعا کی درخواست کی، یہ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ اس بار منگول بغیر لڑے واپس

ہو گئے ورنہ جنگ کی صورت میں اس دفعہ شاہی فوجوں کی فتح کے امکان بہت کم تھے۔

۱۳۰۴ء میں منگول علی بیگ اور خواجہ تاش کی سرکردگی میں پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ اس بار منگول دریائے جمنا کو پار کر کے دوآبہ (موجودہ یو۔پی) کے زرخیز علاقے تک جا پہنچے اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ شاہی فوجوں نے تعاقب کر کے امروہہ کے قریب منگولوں کو شکست دی اور ان کے دونوں جرنیلوں کو گرفتار کر لیا۔ منگول سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا گیا۔ بادشاہ کے حکم سے ان قیدیوں کو برسرِ عام قتل کر دیا گیا۔

۱۳۰۶ء کے اوائل میں منگول سردار امیر کابک نے پھر چڑھائی کی لیکن منہ کی کھائی۔

اسی سال کے آخر میں منگولوں کا آخری حملہ سردار اقبال مندہ کی قیادت میں ہوا۔ ملک تغلق نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور منگولوں کو عبرت ناک شکست دی۔ اس معرکے میں ایک لاکھ کے قریب منگول قتل ہوئے۔ اُن کے سرداروں کو مست ہاتھیوں کے پاؤں تلے روند دیا گیا۔ ضیاء الدین برنی کے قول کے مطابق اس بار دہلی کے نواح میں آباد نومسلم منگولوں نے بھی اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا تھا اس لئے ان سے بھی نمٹا گیا۔ علاؤالدین خلجی نے منگولوں کے ان آئے دن کے حملوں سے پریشان ہو کر اس فتنے کا مستقل تدارک ضروری سمجھا اور یہ تدابیر اختیار کیں۔

۱۔ بلبن کی سرحدی پالیسی کو اپنایا گیا۔

۲۔ پرانے سرحدی قلعوں کی از سرِ نو مرمت کرا کے وہاں فوج متعین کی گئی۔

۳۔ سرحدی علاقوں کو مستحکم بنانے کے لئے اہم مقامات پر چھاؤنیاں بنائی گئیں۔

۴۔ جہاں مناسب سمجھا گیا نئے قلعے تعمیر کرائے گئے۔

۵۔ فوج کو مضبوط بنانے کی غرض سے اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کئے گئے

۶۔ سرحدوں پر خصوصی تربیت یافتہ فوج مقرر کی گئی۔

۷۔ سرحدوں کے دفاع کے لئے خاص افسر کو "محافظِ سرحدات" کے اہم عہدے پر مقرر کیا گیا۔

منگول وحشیوں کے ان حملوں کے دوران تیرہویں صدی عیسوی کا سارا عرصہ شمال مغربی صوبہ سرحد افراتفری کا شکار رہا۔ لوگ حملہ آوروں کی لوٹ مار کے ڈر سے دُور افتادہ پہاڑی مقامات میں جا آباد ہوئے۔ صوبہ اقتصادی بدحالی اور سیاسی ابتری کا شکار رہا اور کوئی منظم یا مضبوط حکومتی نظام صوبے میں قائم نہ ہو سکا۔

تیمور لنگ

سلطان محمد غوری کی وفات (۱۲۰۶ء) سے لے کر ظہیر الدین بابر کے حملۂ ہند (۱۵۲۶ء) تک دہلی کا تخت و تاج مسلمانوں ہی کے تصرّف میں رہا اور ہندوستان کے اکثر علاقوں پر مسلمان حاکم ہی دادِ حکومت دیتے رہے۔ سلاطین ہند کے ان پانچ خانوادوں میں سے کئی ایسے بھی تھے۔ جو افغان نسل سے ہونے کے دعویدار تھے تاہم جہاں تک صُوبہ سرحد کا تعلق ہے ان سلاطین کے دَور میں یہاں کوئی قابلِ ذکر سیاسی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ مرکزی حکومت سے صوبہ سرحد کی وابستگی تو ضرور تھی لیکن یہ وابستگی محض برائے نام تھی۔ حقیقت میں صوبہ سرحد اور مُلحقہ علاقوں پر سلطنت دہلی کی گرفت زیادہ مضبوط نہ تھی اور مختلف علاقوں میں مختلف جاگیردار برسرِ اقتدار تھے یا ہر قبیلے کا سردار اپنی جگہ ایک خود مختار حکمران تصوّر کیا جاتا تھا۔

اس عرصے میں جن پانچ شاہی خاندانوں نے ہندوستان پر حکومت کی۔ ان کے نام اور عرصۂ حکومت کی تفصیل یہ ہے :-

۱ ———	خاندانِ غلامان	۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک
۲ ———	خاندانِ خلجی	۱۲۹۰ء سے ۱۳۱۹ء تک
۳ ———	خاندانِ تغلق	۱۳۲۱ء سے ۱۴۱۲ء تک
۴ ———	سیّد خاندان	۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۰ء تک
۵ ———	خاندان لودھی	۱۴۵۰ء سے ۱۵۲۶ء تک

کئی مؤرخوں نے ان پانچوں خاندانوں کے عرصۂ حکومت کو "دورِ افغاناں" ہی شمار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے لوگ افغانستان ہی سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے مرکزِ اعلیٰ

چونکہ غزنی، قندھار اور کابل ہی کے علاقے تھے اس لئے انہیں افغان ہی کا مشترکہ نام دیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ خاندانِ غلاماں اور تغلق کے اکثر بادشاہ حسب و نسب کے اعتبار سے ترک تھے تاہم صدیوں سے افغان یا پختون لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ انہی کا ایک جزو لاینفک بن گئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کے دائرے میں آنے کے بعد وہ سب مساوات و اخوت کے رشتے سے ایک ہی خاندان کے افراد بن چکے تھے۔ اسلام رنگ و نسل، زبان و بیان اور اُونچ نیچ کی تفریق کے یوں بھی خلاف ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے، خواہ وہ کسی بھی قبیلے یا ذات سے ہو۔ رشتہ ناطہ کر سکتا ہے، اس طرح وہ سب کے سب ایک ہی قوم کے افراد تصور ہوتے ہیں۔ بروئے قرآن قوم، قبیلہ محض ایک پہچان کا ذریعہ ہیں نہ کہ وجہِ فضیلت۔ ہندوستان کے لوگ افغانی علاقوں سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں کو افغان ہی کے نام سے یاد کرتے تھے، علاوہ بریں ان سب سلاطین کے دور میں فوج کی اکثریت پختون سپاہیوں اور افسروں پر ہی مشتمل تھی اور دوسرے ریاستی اور سیاسی امور میں بھی پختون سرداروں کا کردار بے حد نمایاں اور روشن تھا۔ اس لئے بھی اسے "دورِ افغانان" ہی کا نام دیا گیا۔

محمد غوری کے بعد خاندان غلاماں کی حکومت اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ حکومت اور سیادت بلکہ ہر کمال و فضیلت کے لئے شرط ذاتی صلاحیت ہے نہ کہ خاندانی وجاہت، قطب الدین ایبک شمس الدین التمش، غیاث الدین بلبن یوں تو ترک غلام تھے تاہم اپنے ذاتی کمالات و اوصاف کی بدولت بادشاہت کے اعلیٰ منصب پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، یہ اسلامی عدل و مساوات کا منہ بولتا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے کہ سلطان محمد غوری نے جس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اپنا جانشین کسی غوری شہزادے کو قرار نہ دیا بلکہ ایک ترک غلام قطب الدین ایبک کو اپنا بیٹا سمجھ کر وارثِ تاج و تخت قرار دیا۔ قطب الدین ایبک اور خاندان غلاماں کے اکثر بادشاہوں کی فوجیں زیادہ تر پختون مجاہدوں ہی پر مشتمل تھیں۔ بڑے بڑے عمائدین سلطنت بھی زیادہ تر یہی لوگ تھے، قطب الدین ایبک کے دور میں بختیار خلجی وہ پہلا قابلِ ذکر پختون قائد تھا جس نے بنگال اور بہار میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بختیار خلجی کا اصل نام اختیار الدین تھا اور وہ محمد غوری کی ہمرکابی میں ہندوستان آنے سے پہلے غزنی میں خلجی یا غلجی قبائل کا بھرتی کا افسر رہ چکا تھا۔ بختیار خلجی

کی کمان میں مسلمان لشکر نے بہار اور بنگال کی طرف پیش قدمی کی اور اپنی شجاعت اور فراست سے سارے علاقے کو اسلامی قلمرو میں داخل کیا۔ بختیار خلجی کا یہ کارنامہ اور یہ اولیت سب کی نگاہوں میں قابلِ قدر اقدام تھا تاہم "تربور ولی" یا خاندانی عناد سے وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ اور اپنے ہی ایک بھائی بند علی مردان خلجی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ بعد میں علی مردان خلجی کو امیر عوض خلجی نامی ایک سردار نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ وہی امیر عوض ہے جو بعد میں غیاث الدین خلجی کے نام سے ہندوستان کا حکمران قرار پایا۔

شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں بھی پختون افسر بڑے بڑے اہم عہدوں پر فائز تھے، انہی میں سے ایک جلال الدین خلجی بھی تھا جو مشرقی پنجاب (پٹیالہ) کا حاکم تھا۔ یہ وہی جلال الدین خلجی ہے جس نے ترکوں اور خلجیوں کے مابین ہونے والی حصولِ اقتدار کی جنگ میں شہرت حاصل کی اور کیقباد کے بعد جو خاندان غلاماں کا آخری لیکن کمزور حکمران تھا۔ دہلی کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

علاؤالدین خلجی ایک نامور اور مدبر حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں بھی زمامِ اقتدار زیادہ تر پختون لوگوں ہی کے ہاتھ میں تھی چنانچہ مالوہ کے صوبہ میں دلاور خان غوری اور گجرات میں محمود خلجی گورنر یا صوبہ دار کے اہم عہدوں پر متمکن تھے۔

خلجی کو بعض لوگ ترک قرار دیتے ہیں تاہم مورخ فرشتہ کے نزدیک خلجی افغان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ونسنٹ سمتھ بھی خلجی کو افغان تصور کرتا ہے، بعض محققین کے نزدیک خلجی اور غلجی ایک ہی لفظ کی دو صوتی صورتیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس قبیلہ کا نام پشتو اور فارسی میں خلجی ہے جبکہ ترکی میں غلجی۔ البتہ قدیم مورخوں میں سے غلجی کے لئے غلزئی کا لفظ کسی نے استعمال نہیں کیا۔

اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ لودھی پختون لوگ ہیں۔ اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ لودھی سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان آنے سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، چنانچہ راجہ جے پال کی طرف سے شیخ حمید لودھی ملتان اور لمغان کا صوبہ دار تھا۔ راجہ جے پال کے کہنے پر اس نے پہلے پہل سبکتگین کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لیا لیکن بعد میں اپنے مسلمان بھائیوں ہی

کا ساتھ دیا۔ سبکتگین نے اسے بدستور ملتان کی گورنری پر بحال رکھا۔ شیخ حمید کے بعد اس کا بیٹا شیخ نصر لودھی ملتان کا گورنر قرار پایا۔ لیکن چونکہ اس کا رجحان قرامطی فرقے کی جانب تھا اس لئے سلطان محمود غزنوی نے اسے اس عہدے سے برطرف کر دیا۔

تاریخ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کے سلاطین ہنگامی حالات میں صوبہ سرحد اور غزنی سے نئی فوج بھرتی کیا کرتے تھے چنانچہ بہلول لودھی جب چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر گیا اور اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پایا تو "روہ" (پختونخواہ) کے قبائل سے امداد کی اپیل کی، انہی مردانِ جنگ آزما کی بدولت وہ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ اس سے قبل محمود شاہ شرقی نامی سردار نے عرصۂ دراز سے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ بہلول لودھی اور دوسرے سلاطینِ دہلی نے پشتونوں کو کافی مراعات دیں، مختلف علاقوں میں انہیں جاگیریں دی گئیں۔ اور اس طرح ہندوستان کے تمام مفتوحہ صوبوں میں پختون کافی تعداد میں آباد ہوتے گئے یہ اسی آبادکاری کا نتیجہ ہے کہ برصغیر کے قریباً ہر مقام پر سرحدی لوگ آباد نظر آتے ہیں۔

گو سرحدی قبائل کی اندرونی آزادی میں کسی حکمران نے کوئی دخل نہ دیا۔ تاہم وقتاً فوقتاً وہ سرحدی پالیسی پر خصوصی توجہ دیتے رہے بالخصوص منگول قوم کے حملوں کے دوران سرحدی امور نے بڑی اہمیت اختیار کر لی۔ غیاث الدین بلبن بادشاہ بنا تو دریائے سندھ سے مغرب کے سارے علاقوں پر منگول چھا چکے تھے۔ بلبن نے ملتان، لاہور اور پشاور میں خصوصی فوجی دستے تعین کئے۔ ان تینوں مقامات کو ایک فوجی کمانڈ کے تحت کر دیا گیا۔ مشہور فوجی رہنما شیر خان کو "محافظِ سرحد" مقرر کر کے سرحدوں کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بادشاہ خود بھی وقتاً فوقتاً ان علاقوں میں جاتا اور انتظامی امور انجام دیتا۔ اٹک اور جہلم کے درمیانی علاقہ کے گکھڑ اکثر منگول حملہ آوروں کا ساتھ دیتے تھے۔ بادشاہ نے ان کی سرکوبی کی اور انہیں اطاعت پر مجبور کر دیا۔ صوبہ سرحد کے کلیدی مقامات پر اور دہلی جانے والی شاہراہ پر قلعے اور فوجی چوکیاں تعمیر کی گئیں۔

علاؤالدین خلجی کے عہدِ حکومت میں بھی اس سرحدی پالیسی پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ ان دنوں ظفر خان نامی نامور جرنیل "محافظِ سرحد" کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا دلیر ترین انسان تھا۔ منگول اس کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ ہر لڑائی میں وہ خود پیش پیش رہتا اور اپنے سپاہیوں کے حوصلے

بڑھاتا، اس نے منگولوں کے خلاف لڑتے ہوئے وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا مقبرہ جالندھر میں گورنمنٹ ہائی سکول کے پاس اب بھی موجود ہے۔

منگول لشکر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ لوگ ان کے ڈر سے جنگل کو بھاگ جاتے۔ وہ شہروں اور دیہات کو تباہ کر دیا کرتے تھے لیکن سلاطینِ دہلی کی کامیاب سرحدی پالیسی کی بدولت وحشی منگول اپنے ارادوں میں بُری طرح ناکام ہو گئے اور ان کے حملوں کا سلسلہ رُک گیا۔

تاہم جہاں سلطنتِ دہلی کو وحشی منگولوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑا وہیں ہوسِ اقتدار میں مبتلا امیروں کی باہمی خانہ جنگیاں بھی بڑی تباہ کُن ثابت ہوئیں، ۱۳۹۰ء میں تغلق خاندان برسرِ اقتدار آیا تو حکمرانوں کی کمزور اور نرم روش سے حکومت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا، باہمی اختلافات اتنے بڑھے کہ خود دارالسلطنت دہلی میں بیک وقت دو افراد کی حکومت قائم ہو گئی۔ بادشاہ محمود تغلق دہلی میں دربار لگاتا اس کا حریف نصرت خان پاس ہی فیروز آباد میں دادِ حکومت دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمائدینِ سلطنت نے (جن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی) شاہی احکام کی بجا آوری سے صاف انکار کر دیا۔ سلطنتِ ہند کی اس کمزوری نے امیر تیمور کو حملہ کرنے کی جرأت دلائی۔

فاتحِ ایشیا تیمور ۸ اپریل ۱۳۳۶ء کو وسطی ایشیا کے علاقہ ماوراء النہر میں پیدا ہوا وہ ایک معمولی سردار طراغی کا بیٹا تھا تاہم کم عمری ہی میں اپنی ذہانت، شجاعت اور پیش بینی کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ بڑا ہوا تو اس نے ایران، عراق، ترکی، روس تک کے ملکوں کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ بعد میں اس نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔

تیمور نے اپنے حملۂ ہند کی وجہ بتاتے ہوئے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ وہ اس دور کے مسلمان حکمرانوں سے شاکی تھا کہ مدتوں تک ہندوستان پر حکومت کرنے کے باوجود انہوں نے اشاعتِ اسلام کے لئے کوئی ٹھوس کام نہ کیا تھا۔ اس کے خیال میں ہندوستان کے مسلمان فرمانروا کمزور پالیسی پر عمل پیرا تھے اور انہوں نے زرِ مال کے حصول کے لئے غیر مسلموں کو ناجائز مراعات دے کر سر پر چڑھا رکھا تھا۔ تیمور کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی جانب پیش قدمی کرنے سے پہلے میں نے قرآن حکیم سے فال نکالی تو یہ مضمون نکلا کہ "اے پیغمبر! کافروں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔" اس پر امیر تیمور نے اپنے پوتے شہزادہ پیر محمد جہانگیر کو جوان

دنوں کابل، غزنی اور قندھار کا گورنر تھا۔ ملتان پر فوج کشی کی ہدایت کی۔ پیر محمد اس مقصد میں کامیاب رہا اور اس نے ملتان اور نواحی علاقے پر قبضہ کر لیا۔

خود تیمور لنگ ۲۷۔ مارچ ۱۳۹۸ء کو تسخیر ہند کے ارادے سے سمرقند سے روانہ ہوا۔ راہ میں سرحدی قبائل اس سے ملنے گئے، مشہور پختون رہنماؤں ملک حبیب سڑبنی، ملک خضر سروانڑی ملک بہاء الدین نیازی، ملک یوسف سروانڑی اور دوسرے لوگوں نے اسے اپنی خدمات پیش کیں۔ سرحدی قبائل نے بڑھ چڑھ کر اس جہاد میں حصہ لیا۔ ۱۵ اگست کو تیمور کابل پہنچا جہاں سے اس نے کافرستان کے علاقے پر چڑھائی کی۔ کافرستان کے لوگ اکثر مسلمان ہمسایوں پر چھاپہ مار کرتے تھے۔ تیمور نے ان سیہ پوش کافروں کو سبق سکھانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ وہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے اس علاقے کو فتح کیا۔ کافرستان کے وسطی علاقہ میں ایک قلعۂ کلم ہے اس کے دروازے پر امیر تیمور کا نصب کردہ کتبہ لگا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں جب امیر افغانستان عبدالرحمٰن خان کافروں کو مسخر کرنے کے ارادہ سے وہاں گیا تو اس نے یہ کتبہ دیکھا، امیر موصوف نے اس تحریر کے نیچے اپنا نام بھی کندہ کرا دیا۔

تیمور نے دشوار گزار پہاڑی راستوں کو طے کر کے چترال کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ چترال ان دنوں "کٹور" کہلاتا تھا۔ اسی مہم کے دوران تیمور نے دریائے غوربند سے علاقے کی شادابی کے لئے ایک نہر بھی نکالی۔

کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل تو امیر تیمور اور اس کے ہمراہی علماء کے سمجھانے پر سیاہ پوش کافروں نے اسلام قبول کر لیا تھا جس پر تیمور نے ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا تھا لیکن اسی رات کو انہوں نے دھوکے سے پوری طاقت سے مسلمان لشکر پر ہلہ بول دیا اور بہت نقصان پہنچایا۔ اس پر تیمور بھی غصہ میں آگیا اور انہیں سختی سے کچل دینے کا حکم دے دیا۔ سارے کافرستان کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد تیمور نے اہم مقامات پر قلعے تعمیر کرائے اور اپنا لشکر وہاں چھوڑ کر آگے کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں پشاور کے سرحدی قبائل کو مطیع بنانے کے بعد تیمور آگے بڑھا۔ اُس نے
۱۳۹۸
کالا باغ کے پاس کشتیوں کے ایک پُل کے ذریعے سے نیلاب (دریائے سندھ) پار کیا اور ۲۴ ستمبر ۶

کو دریا کے بائیں کنارے پر پہنچا۔

جب امیر تیمور دیپال پور (ساہیوال) پہنچا جو اس وقت ایک صوبے کا دارالحکومت تھا تو وہاں کے لوگوں نے شہزادہ پیر محمد کی جانب سے مقرر شدہ حاکم مسافر قبول کو قتل کر دیا اور خود ڈر کے مارے بھاگ کر بھٹنیر (بھٹ نیر) کے قلعے میں جو اس وقت ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا تھا محصور ہو گئے، تیمور کے سپہ سالاروں نے چاروں طرف سے اس قلعہ پر زور دار حملہ کیا اور آخر اسے فتح کر کے ہی دم لیا۔ بھٹ نیر کے ہندو راجہ نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن امیر تیمور نے بھٹ نیر کے قلعے کو مسمار کرا دیا۔ عمارتوں کو تباہ کر دیا اور لوگوں میں سے جو اس کے ہاتھ آیا اُسے تہ تیغ کر دیا۔

بھٹ نیر سے تیمور نے سرسوتی کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ قلعہ آسانی سے ہاتھ آگیا۔ بعد میں وہ کیتھل پہنچا جو دہلی سے چند منزل کے فاصلے پر ہے۔ کیتھل میں قیام کر کے تیمور نے دہلی پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ تیموری لشکر جدھر کا رخ کرتا لوگ گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے اور سب سامان اور غلہ تیموریوں کے ہاتھ آجاتا۔ بالآخر تیمور "جہاں نما" نامی شاہی محل کے قریب پہنچا جو دہلی سے چھ میل دور تھا اور فوجوں کی تیاری کا حکم دیا۔ اس وقت تک راستے کے قلعے اور شہروں سے تیمور نے جو لوگ گرفتار کئے تھے اُن کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ دہلی کے بادشاہ کی طرف سے کوئی مقابلے کو نہ نکلا۔ اس پر تیمور نے ایک دستہ سواروں کا لے کر خود دہلی کا رخ کیا تاکہ دشمن کی طاقت کا پتہ چلائے۔ جب تیمور اور یہ دستہ دہلی شہر پہنچا تو محمود تغلق اور اس کے سرداروں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ اور خاصا نقصان پہنچایا، ہندو قیدیوں نے تیموری لشکر کو مصیبت میں مبتلا دیکھا تو دل ہی دل میں خوش ہوئے اور خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ یہ نعرے اُن کو مہنگے پڑے۔ تیمور سمجھ گیا کہ بڑی لڑائی ہوئی تو لازماً یہ ایک لاکھ قیدی اپنے اہلِ وطن کا ساتھ دیں گے۔ اس پر اُس نے اُن کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ ایک آدمی بھی زندہ نہ چھوڑا گیا۔

دہلی کے بادشاہ محمود تغلق اور اس کے وزیرِ اعظم اقبال خان ملہو نے مشکل سے دس ہزار سواروں، چالیس ہزار پیادوں اور ۱۲۵ جنگی ہاتھیوں پر ایک فوج جمع کی اور تیمور کے مقابلے کو نکلے۔ شدید لڑائی ہوئی تاہم محمود تغلق اور اس کے وزیرِ اعظم کو بھاگتے ہی بن پڑی اور دہلی پر امیر تیمور کا قبضہ ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ دہلی کے علماء اور مشائخ پر مشتمل ایک وفد سلطان تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سے درخواست کی کہ ناوانِ جنگ سے کو انہیں معافی دے دی جائے اور شہر کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

تیمور نے یہ شرط منظور کر لیا اور کوئی دو ہفتے تک دہلی میں قیام پذیر رہا۔ تاہم نادانِ جنگ کی وصولی کے دوران کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اہلِ شہر اور تیموری سپاہیوں میں لڑائی چھڑ گئی جس پر تیموری لشکر کے سرداروں نے قتلِ عام اور لوٹ مار کا حکم دے دیا۔ پس پھر کیا تھا جو ہاتھ آیا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ہزاروں لوگوں کو قیدی بنا لیا گیا۔ ان میں سے جو لوگ معمار، نجار یا فنکار تھے انہیں تیمور اپنے ساتھ سمرقند لے گیا تاکہ وہاں ان سے خوبصورت عمارتیں بنوانے کا کام لیا جائے۔ باقی سب کو مروا دیا گیا۔

فتح دہلی کے بعد تیمور مزید آگے بڑھا۔ میرٹھ اور ہردوار کے علاقوں کو زیر کیا۔ واپسی پر اس نے کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہندو ریاستوں پر چڑھائی کی۔ شوالک کے ہندو راجہ نے گرفتار ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ ان مالدار ریاستوں سے بے شمار مال و دولت حملہ آوروں کے ہاتھ لگا۔

واپسی سفر کے دوران تیموری لشکر نے جموں کے قلعہ پر بھی حملہ کیا۔ شہر مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور راجے کو قیدی بنا لیا گیا۔

وطن لوٹتے ہوئے تیمور نے ملتان، دیپال پور اور لاہور پر سید خضر خان کو حاکم مقرر کیا۔ سید خضر خان نے شہزادہ پیر محمد اور امیر تیمور کی حمایت کی تھی۔ اس لئے اسے انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

تیموری حملے کے بعد دہلی میں قحط اور وبا پھوٹ پڑی جس نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور یہ خوبصورت شہر بالکل بے آباد ہو کر رہ گیا۔ مفرور تغلق بادشاہ دو سال بعد دہلی آیا لیکن اب عملاً اس کی حکومت کا خاتمہ ہو کر رہ گیا۔

۹ مارچ ۱۳۹۹ء کو تیمور نے دریائے سندھ کو پار کیا اور نمکوں کے راستے پہلے کابل اور پھر سمرقند پہنچ گیا۔

اس حملے کے نتیجے میں صوبہ سرحد، پنجاب اور نواحی علاقے تیموری سلطنت کا ایک حصہ قرار پائے، ہزارہ پر امیر تیمور نے قراغ کو حاکم مقرر کر دیا اور قندھار کے گورنر شیخ علی بیگ کو

سارے صوبے کی نگرانی تفویض کی گئی۔

۱۴۰۵ء میں تیمور کی وفات پر اس کے بیٹے شاہ رُخ میرزا اور پوتے سلطان حسین بائقرا نے یکے بعد دیگرے افغانستان اور صوبہ سرحد کے ان علاقوں پر حکومت کی، تاہم ان کا عہد تیمور کے برعکس مہذب، متمدن اور پُرامن عہد تھا۔ دارالحکومت ہرات علماء، فضلاء اور دانش وروں کا ایک بڑے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

تیمور کے معنی "فولاد" کے ہیں، تیمور لنگ واقعی فولادی عزم کا مالک تھا وہ بگولے کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایشیا کا عظیم ترین فاتح بن گیا۔

❁❁❁

ظہیر الدّین بابر

بابر تاریخِ عالم کے نہایت دلآویز کرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ عظیم القدر سپاہی، عظیم الشان فاتح اور ایک بہت بڑی اور مستقل سلطنت کا بانی تھا، اس کی ذات میں ایک بہادر جنگ جُو، ایک ذی علم فرماں روا، ایک صاحبِ عزم طالع آزما اور ایک عالی دماغ ادیب اور مصنّف کی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں بلکہ کئی لحاظ سے وہ دنیا کے تاجداروں میں ایک یگانہ حیثیت کا مالک تھا۔

بابر کی خودنوشت سوانح حیات "توزک بابری" کا مطالعہ بے حد دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔ یہ کتاب سفرنامہ بھی ہے اور سوانحِ حیات بھی۔ تاریخی واقعات کا ایک مرقع بھی اور ایک عظیم شخصیت کا اعتراف نامۂ گناہ بھی، بابر بارہ برس کا تھا جب اس نے یہ سفرنامہ لکھنا شروع کیا۔ اس لئے اس کی تحریروں میں صاف گوئی اور بے ساختہ پن ہے۔ صداقتِ بیان اس کا جوہر ہے جسے ادبی چاشنی نے اور بھی دلکشی عطا کر دی ہے۔

بابر کا عہد شمال مغربی سرحدی صوبے کی تاریخ میں اس لئے بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے کہ یہ ظہیر الدین بابر ہی ہے جو پہلی بار موجودہ قبائل سرحد اور ان کے رہن سہن کے متعلق ہمیں قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کی آمد سے قبل تاریخِ سرحد پہ تاریکی کے پردے پڑے ہوئے تھے لیکن بابر کے آنے کے بعد اس علاقہ کی تاریخ کے نقوش روشن تر اور واضح تر صورت میں سامنے آنے لگے، پھر یہ بابر بادشاہ ہی تھا جس کے ہاتھوں نہ صرف موجودہ صوبہ سرحد بلکہ سارے برصغیر ہندوستان میں ایک منظم اور متمدن نظامِ حکومت کی بنیاد پڑی، تین ساڑھے تین سو سال تک بابر کی اولاد نے جس خوبی اور جس شان و شوکت سے برصغیر پر حکومت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مغلیہ سلطنت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں سارا افغانستان اور پورا ہندوستان شامل تھا۔

اس سے قبل اتنی مستحکم اور اتنی وسیع و عریض حکومت ایشیا کے ان علاقوں میں کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔

ظہیر الدین بابر جمعہ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء کو وسطی ایشیا کے مقام فرغانہ میں پیدا ہوا۔ اس کا شجرہ نسب باپ کی طرف سے پانچویں پشت میں شہنشاہ تیمور سے اور ماں کی طرف سے گیارہویں پشت میں مشہور فاتح چنگیز خان سے جا ملتا ہے۔ بابر بچپن ہی سے نہایت ذہین اور تیز تھا۔ اس کی تربیت میں اس کی نانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسے ترکی اور فارسی زبانوں پر پورا عبور تھا۔ وہ ان دونوں زبانوں میں نثر اور نظم میں اپنے خیالات کے اظہار کی پوری قدرت رکھتا تھا۔ ابھی وہ گیارہ برس کا تھا کہ اس کا باپ ایک حادثے میں فوت ہو گیا اور بابر کو امیرِ فرغانہ کے طور پر اس کا جانشین مقرر کر دیا گیا۔

اس چھوٹی عمر ہی میں بابر چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے کئی بار ان حریفوں سے شکست کھائی۔ تاہم اس کے عزم و استقلال میں فرق آنے نہ پایا۔ کئی بار اسے بے گھر ہو کر خانہ بدوشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ تاہم جون ۱۵۰۴ء کو وہ اپنی شجاعت اور تدبر کی بدولت کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کابل میں کچھ سال پہلے تک اس کے چچا الغ بیگ کی حکومت تھی لیکن بعد میں اسے ہرات کے ارغون خان نے اس پر قبضہ جما رکھا تھا۔ چونکہ بابر کے عروج کا اوّلین زینہ کابل ہی تھا اس لئے اس شہر سے اُسے ہمیشہ عشق رہا۔ چنانچہ ۱۵۳۰ء میں اُسے اس کی وصیت کے مطابق کابل ہی کے ایک پُر فضا مقام پر دفن کیا گیا۔ کابل میں پاؤں جمانے کے بعد بابر کی نظریں متواتر ہندوستان کی دولت اور زرخیزی پر لگی رہیں۔ تیمور کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستان کو اپنی موروثی جاگیر سمجھتا تھا اور ہر قیمت پر اس پر قابض ہونے کا خواہش مند تھا۔ تاہم ایک زیرک اور مدبر رہنما کی طرح وہ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے اپنا یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی تسخیر کا ایک مرحلہ وار پروگرام اپنایا۔

چونکہ بابر کی سرگرمیوں کا مرکز کابل تھا اس لئے محمود غزنوی اور محمد غوری کے برعکس اس نے ہندوستان پر جب بھی پیش قدمی کی درہ خیبر کے راستے کی، بابر نے اپنی مہمات کا آغاز ۱۵۰۵ء میں کیا۔ اس کی سرحدی مہمات محض مطالعاتی تھیں یا اُن سے بابر کا مقصد راستے کے سرحدی قبائل کی سرکوبی تھا تاکہ ہندوستان پر بڑا حملہ کرتے وقت ان کی طرف سے مزاحمت کا خدشہ نہ رہے، ۱۵۰۹ء میں بابر اپنے لشکر کے ہمراہ درہ خیبر پہنچا تو آفریدی اور شنواری قبائل نے اس کی مزاحمت کی۔ یہاں

پہنچ کر بابر کو معلوم ہوا کہ کسی راہنما کے بغیر درہ خیبر کے پُر پیچ راستوں اور خطرناک گھاٹیوں سے گزرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے لگمانی قبیلہ کے ایک سردار کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس گائیڈ کی مدد سے بابر کا لشکر چشمہ علی مسجد اور جمرود سے ہوتا ہوا پشاور پہنچا جو اُن دنوں بگرام کہلاتا تھا۔ بابر نے اپنے سفرنامہ میں پشاور کی سیر کی پوری تفصیل دی ہے، اسی ضمن میں وہ گورکھٹڑی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ سادھوؤں اور تارک الدنیا جوگیوں کا مسکن ہے' بڑے دروازے سے گزر کر جوگیوں کے چلہ خانوں تک پہنچنے کے لئے غار نما راستے ہیں جن میں سے پیٹ کے بل گھسٹ کر گزرنا پڑتا ہے۔ ان راستوں میں وہ گھُپ اندھیرا ہے کہ دن کو بھی چراغ کے بغیر گزر مشکل ہے۔ جوگی تیاگ لینے سے پہلے سر منڈا دیتے ہیں۔ چنانچہ گورکھٹڑی کے ایک کونے میں ان بالوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔ عمارت کے چاروں طرف سادھوؤں کی کوٹھڑیاں ہیں جہاں وہ تعلیم بھی پاتے ہیں اور رہتے بھی ہیں"۔

اس اوّلین مہم میں بابر نے ہندوستان کی جانب پیش قدمی کی بجائے صوبہ سرحد کے راستوں اور لوگوں سے واقفیت ہی کو اپنا مقصدِ اُولیٰ قرار دیا۔ چنانچہ پشاور سے کوہاٹ جانے کے لئے اس نے باڑہ کا دریا عبور کر کے تپہ مہند کے دیہات اور درّہ آدم خیل کا راستہ اختیار کیا۔ رات کوتل میں گزاری اور صبح سویرے کوہاٹ کی زرخیز اور سرسبز و شاداب وادی میں داخل ہوا۔ کئی دن تک کوہاٹ میں قیام کرنے کے بعد مغل شہنشاہ نے ہنگو کا قصد کیا۔ لیکن بنگش قبیلہ کے لوگوں نے اس کا راستہ روکا جس کے نتیجہ میں اُستر زئی اور رئیسان کے مابین ایک تنگ گھاٹی میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ بنگش نے انتہائی بہادری کا ثبوت دیا۔ لیکن بابر کی منظم فوج کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پایا۔ فتح کے بعد ہنگو اور ٹل ہوتے ہوئے بابر دریائے کُرّم کے ساتھ ساتھ بنوں کی طرف بڑھا۔ بنوچیوں نے مقدور بھر مغل فوجوں کی مزاحمت کی۔ لیکن ان کی تعداد حملہ آوروں کے مقابلے میں بہت تھوڑی تھی۔ صورتحال کی نزاکت کو دیکھ کر بنوچی سردار شادی خان' بابر بادشاہ سے معافی کا طلب گار ہوا چنانچہ بابر نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ بنوں کے متعلق بابر نے توزک میں لکھا ہے کہ یہ ایک ہموار اور زرخیز علاقہ ہے جس کی شمالی جانب بنجر پہاڑ ہیں، دریائے کُرّم اس میدان کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ بابر بنوں کے قبائل شیتک، کرلانڑی، نیازی اور عیسیٰ خیل کا بھی ذکر کرتا ہے۔

بنوں کے بعد بابر اور اُس کا لشکر ڈیرہ اسمٰعیل خان سے گزر کر ڈیرہ غازی خان تک گیا۔ پھر یہ لوگ کوہ سلیمان کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھے اور ڈھکی (موجودہ لورالائی) تک پہنچے، بابر کی فوج کا ایک حصّہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے سخی سرور کے مزار تک گیا۔ کچھ عرصہ اس سرزمین میں قیام کے بعد بابر واپس کابل چلا گیا۔

اس سفر کے دوران بابر نے کوہ سلیمان کے دامن میں واقع قدرتی جھیل "آبِ ایستادہ" کے کنارے بھی قیام کیا۔ بابر مناظرِ فطرت کا شیدائی تو تھا ہی۔ اُسے اس بے آب وگیاہ خطّے میں صاف شفاف پانی کی اس جھیل کو دیکھ کر بڑی فرحت ہوئی۔ جھیل میں قسما قسم پرندے بھی تھے اور کناروں پر رنگ برنگے پھول بھی۔ بابر کو یہ چیزیں بڑی پسند آئیں۔ خصوصاً رات کے وقت جب چاند ستاروں کا عکس جھیل کے نیلگوں پانی میں نظر آتا تو نظارہ اور بھی دلفریب ہو جاتا۔ بابر کی فطرت میں تجسّس اور تلاش کا مادہ تھا۔ وہ کافی دن وہاں ٹھہرا اور معلوم کیا کہ پانی کہاں سے آکر جھیل میں جمع ہوتا ہے۔ سارے علاقے کا جائزہ لینے کے بعد بابر واپس کابل چلا گیا۔

۱۵۰۵ء کی اس مہم کے بعد سے بابر کی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں چلتا، تزکِ بابری بھی ۱۵۱۸ء تک کے واقعات کے متعلق خاموش ہے۔

بہرحال فتح کابل کے بعد ہندوستان کی تسخیر کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی بابر کے ذہن سے فراموش ہونے نہ پایا۔ اس سارے عرصے میں بابر کی یہ کوشش رہی کہ سرحدی قبیلوں کو زیر کیا جائے تاکہ ہندوستان پر فوج کشی کے دوران ان کی طرف سے نقصان پہنچنے کا خدشہ نہ رہے، اس زمانے میں پشاور۔ مردان۔ سوات اور باجوڑ کے علاقوں میں دو قبیلوں کا طوطی بول رہا تھا۔ پشاور کے میدانی علاقوں میں دلازاک برسرِاقتدار تھے جب کہ مردان اور سوات میں یوسف زئی قبیلہ اپنے سردار ملک احمد خان کی قیادت میں قابض اور متصرف تھا۔ دلازاک یوسف زئی سے کھُل کر مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے تاہم اندر ہی اندر ایسی سازشوں میں مصروف رہتے تھے جن کی بدولت یوسف زئی کو نیچا دکھا سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ دلازاک سردار کابل جا کر بابر کو اکثر یوسف زئی لوگوں کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے اور ملک احمد کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے تاکہ بابر کو اس کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو جائے۔ ایک آدھ بار یوسف زئی سردار ملک احمد بھی کابل گیا

اور بابر کو اپنے قبیلے کی دوستی کا یقین دلایا۔ لیکن پھر دلناک نے یوسف زئی سردار کے خلاف بابر کے کان بھرے، اخون درویزہؒ بیان کرتے ہیں کہ دوسری مرتبہ جب بابر نے ملک احمد کو طلب کیا تو وہ خود کابل نہ گیا بلکہ اپنی جانب سے شاہ منصور کو بادشاہ کے دربار میں بھیج دیا۔ جس پر بابر کا مزاج برہم ہوگیا اور اس نے علاقہ یوسف زئی پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۵۰۹ء میں بابر اس حملے کی نیت سے روانہ ہوا لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اُسے اپنے مقبوضہ علاقوں سے بغاوت کی خبریں ملیں۔ اس لئے راستے ہی سے واپس ہوگیا۔ اس مہم کے سلسلے میں بابر لمغان اور درہ خورد پہنچا ہی تھا کہ خضر خیل، شموخیل، غلزئی اور خوگیانی قبیلے اس کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور کافی نقصان پہنچایا۔ تاہم بابر لڑتے بھڑتے اوینہ پور (جلال آباد) پہنچا تو اُسے قندھار سے بغاوت کی خبریں ملیں۔ بابر نے مختلف سرداروں کو مختلف باقی قبائل کی سرکوبی کے لئے بھیجا ان بغاوتوں کے فرو ہونے پر بابر نے کابل میں ایک شاہانہ جشن منایا اور پہلی بار اپنے لئے بادشاہ کا لقب پسند کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے مغل فرمانروا اپنے لئے صرف میرزا کہلانا پسند کیا کرتے تھے۔

۱۵۱۹ء میں جب بابر کو ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو وہ پھر ہندوستان کی مہم پر چل پڑا۔ اس بار وہ باجوڑ اور سوات کے یوسف زئی قبائل کو مطیع بنانے پر تلا ہوا تھا۔

یوسف زئی بڑا منظم اور بہادر قبیلہ تھا جو اس وقت مردان۔ مالاکنڈ۔ سوات اور باجوڑ کے سبھی علاقوں پر قابض تھا۔ یہ سارے علاقے بڑے زرخیز اور آباد تھے، باجوڑ پر ان دنوں ملک حیدر علی حکمران تھا۔ اس کا قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا جسے ناقابلِ تسخیر بیان کیا جاتا تھا۔ یکم محرم الحرام کو بابر نے اپنے حملے کا آغاز کیا پہلے پہل اہلِ باجوڑ نے بابر کی پیش قدمی کی کوئی پرواہ نہ کی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ بابر کی فوج توڑے دار بندوقوں (میچ لاکس) سے مسلح تھی۔ باجوڑ والوں نے اس وقت تک بندوق نہ دیکھی تھی۔ چنانچہ وہ بابر کے سپاہیوں کا مذاق اڑاتے رہے لیکن جب مقابلے کے دوران چھ سات آدمی بندوق کی گولی سے ہلاک ہوئے تو اہلِ باجوڑ کا ماتھا ٹھنکا۔ کئی دن تک چھوٹی موٹی جھڑپیں جاری رہیں آخر ۹ محرم الحرام تک مقابلہ جاری رہا۔ جس کا تذکرہ "توزک بابری" میں یوں کیا گیا ہے :-

جمعرات ۴ محرم (۶ جنوری ۱۵۱۹ء) کو سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ زرہ بکتر پہن لیں، ہتھیار سجالیں۔

اور کارروائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ فوج کے بائیں بازو کو ہدایت کی گئی کہ دریا کو پار کر کے قلعۂ باجوڑ کی شمالی جانب پہنچ جائے، قلب لشکر کو کہا گیا کہ دریا کو پار کر کے قلعہ کے شمال کی جانب پہاڑی میں مورچے سنبھال لیں۔ جب کہ دائیں بازو کو قلعے کے مغربی دروازے کی جانب سے حملہ آور ہونے کا حکم دیا گیا۔

جب بائیں بازو کے سپاہیوں نے اپنے سردار دوست بیگ کی کمان میں دریا کو پار کر کے قلعے پر حملہ کیا تو باجوڑ کے سو ڈیڑھ سو تیر اندازوں نے ان کی مزاحمت کی، بابر کے دستے نے تیر اندازوں کا تعاقب کرتے ہوئے انہیں قلعے کے اندر دھکیل دیا۔ اس موقع پر مولا عبدالملک، جو خوست کا رہنے والا تھا۔ اس قدر جوش میں تھا کہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سمیت فصیل کو پھلانگ گیا۔ اگر اس موقع پر حملہ آوروں کے پاس سیڑھیاں اور کمند ہوتے تو قلعہ کا دروازہ کھول دیا جاتا اور فتح ان کے قدم چومتی۔ چونکہ اہل باجوڑ کو بندوقوں کی تباہ کاری کا اندازہ نہ تھا اس لئے وہ بابر کے لشکر کے سر پر جا پہنچے، اس پر توپ خانے کے امیر استاد علی قلی نے پانچ کوا در دلی کا ظم نامی مغل سردار نے دو باجوڑیوں کو گولیوں سے ٹھنڈا کر دیا۔ اس سے محصورین پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ کسی کو فصیل سے سر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اتنے میں شام ہو گئی تھی۔ اس لئے حملہ صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

جمعہ کو پو پھوٹتے ہی بابر کا لشکر دوبارہ قلعے پر حملہ آور ہوا۔ اب کے وہ سیڑھیاں اور کمند بھی ساتھ لائے تھے۔ دوست بیگ اور اس کے سپاہی قلعے میں داخل ہو گئے اور سرنگ لگانے لگے استاد علی قلی کی بندوقوں اور توپوں نے اپنا کام کیا، دوسری جانب سے ملک قطب علی بھی فصیل پھلانگ کر قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس طرح دست بدست لڑائی چھڑ گئی۔ تلواروں اور خنجروں سے مسلح سپاہی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اس اثناء میں مغل لشکر نے قلعے کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ بابر اور اس کا لشکر اب قلعے میں داخل ہو چکا تھا۔ اہل باجوڑ نے قلعے کی مضبوط برجوں سے جان توڑ مقابلہ کیا لیکن شام ہوئی تو سارے قلعے اور حاکم باجوڑ کے رہائشی محلات پر حملہ آور فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔

جنگ باجوڑ کے متعلق بابر خود لکھتا ہے :-

"چونکہ اہلِ باجوڑ اسلام کے باغی تھے اور بغاوت اور مخالفت کرنے کے علاوہ کافرانہ رسم و رواج پر عمل پیرا تھے اس وجہ سے انہیں کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ تین ہزار سے زیادہ افراد کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور میں نے حکم دیا کہ ایک اونچی پہاڑی پر مقتولوں کی کھوپڑیوں سے "کلہ مینار" بنایا ـــــ رات بھر فتح کا جشن منایا گیا دوسرے دن میں نے قلعہ کے برجوں اور فصیل کا معائنہ کیا اور سوار ہو کر اپنی خیمہ گاہ کو واپس پہنچا۔"

بابر کی اس سخت گیر پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارے علاقے پر اس کی دھاک بیٹھ گئی اور کسی کو اس سے مقابلے کی جرأت نہ ہوئی۔ باجوڑ سے بابر نے اپنے لشکر کے لئے کافی غلہ اور سامانِ رسد حاصل کیا اور پھر یہ علاقہ اپنے ایک سردار خواجہ کلاں کے سپرد کر کے وہ عازم سوات ہو گیا۔ بابر غاخئی اور ناوا (نواگئی) کے راستے باجوڑ میں وارد ہوا تھا۔ اب اس نے جندول سے ہوتے ہوئے دریائے پنجکوڑہ کو اس مقام سے عبور کیا جہاں وہ دریائے باجوڑ سے ملتا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ جگہ تیمر گڑھ کے قریب وہی مقام ہے جہاں آج کل دریا پر پُل موجود ہے ـــــ سوات میں ان دنوں ولیس خان کی حکومت تھی تاہم اس نے بغیر لڑے ہی بابر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

کہا جاتا ہے کہ باجوڑ کی تسخیر کے بعد یوسف زئی قبیلے کا ایک جرگہ ملک شاہ منصور ابن ملک سلیمان خان کی سرکردگی میں بابر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جرگہ نے بابر کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ بابر چونکہ یوسف زئی قبیلے کی طاقت اور شجاعت سے واقف تھا اس لئے اس نے صلح پسندی کی راہ اختیار کی اور اس طرح علاقہ یوسف زئی سے جنگ کے بادل چھٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ صلح کے بعد باہمی تعلقات کو مزید تقویت دینے کے لئے بابر بادشاہ نے ملک شاہ منصور کی بیٹی "بی بی مبارکہ" سے شادی کر لی تھی اور اس رشتے سے بابر یوسف زئی کا حلیف بن گیا تھا۔

بی بی مبارکہ سے بابر کی شادی کے متعلق ایک اور روایت یوں ہے کہ جب بابر نے یوسف زئی پر حملہ کیا تو کاٹلنگ کے قریب ایک پہاڑی قلعے پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یہ قلعہ کسی طرح بابر سے تسخیر نہیں ہو رہا تھا جس پر بابر حالات کا جائزہ لینے اور دشمن کی ٹوہ لگانے کے لئے خود فقیروں کا بھیس بدل کر نکلا، ہوتے ہوتے وہ ملک شاہ منصور کے حرم کے خیموں تک جا پہنچا، اس نے

روٹی مانگنے کے لئے فقیروں کی طرح صدا لگائی۔ ایک دوشیزہ روٹی دینے اپنے خیمے سے باہر آئی۔ بابر نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا تو دل ہار بیٹھا ـــــ چنانچہ اس نے خود اپنے سرداروں کو بھیج کر یوسف زئی سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور اس دوشیزہ (بی بی مبارکہ) کے رشتے کا طالب ہوا۔ چونکہ اس سے قبل بابر کا چچا الغ بیگ اور دوسرے مغل سردار بھی یوسف زئی لڑکیوں سے شادی کر چکے تھے اس لئے یوسف زئی جرگے نے اس شادی کی اجازت دے دی اور اس طرح جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ صلح کے بعد بابر نے یوسف زئی علاقہ کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ صرف یہ شرط عائد کی کہ یوسف زئی سردار مغل فوجوں کا راستہ نہیں روکیں گے۔ سڑکوں پر لوٹ مار نہیں کریں گے اور ہر سال چھ ہزار بوری غلہ بابر کے لشکر کے لئے بھیجتے رہیں گے۔

بابر اور بی بی مبارکہ کی شادی جمعرات ۲۷ جنوری ۱۵۱۹ء کو ہوئی۔ ملک شاہ منصور کے چھوٹے بھائی طاؤس خانی نے دلہن کے وکیل کے فرائض انجام دیئے۔ بتایا جاتا ہے کہ بی بی مبارکہ سے بابر کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اسی لئے توزک میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مشہور اہلِ قلم سید بہادر شاہ ظفر کا کہنا ہے کہ بی بی مبارکہ اکبر کے عہدِ حکومت تک زندہ تھی۔ اور مغل بیگمات میں "افغانی بیگم" کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ شادی کے بعد بھی بی بی مبارکہ علاقہ یوسف زئی (باجوڑ) میں مقیم رہیں ـــــ غاخئی کنڈاؤ سے چند میل دور "بادسمور" کی بستی کے پاس ایک قبر ہے۔ جس پر لکڑی کے منقش تختے لگے ہیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ملکہ بی بی مبارکہ ہی کی قبر ہے۔

باجوڑ، سوات اور یوسف زئی کی تسخیر کے بعد بابر نے کچھ دیر تک پشاور میں قیام کیا، بتایا جاتا ہے کہ اس نے پشاور کے مشہور قلعہ بالاحصار کی بنیاد اسی مہم کے دوران رکھی۔ قیامِ پشاور کے متعلق بابر لکھتا ہے کہ دلازاک سرداروں ملک بوخان اور ملک موسیٰ نے اس سے قیامِ پشاور ہی کے دوران ملاقات کی اور علی مسجد (خیبر) کے یعقوب خیل قبیلے کا دلازاک سردار میرے لئے تحائف لے کر آیا۔

بابر کا اصل مقصد چونکہ فتح ہندوستان تھا۔ اس لئے سرحدی علاقوں میں تھوڑی دیر قیام کے بعد اس نے کوہستانِ نمک کے علاقے کا رُخ کیا۔ ان دنوں اٹک سے جہلم تک کے علاقے پر کھوکھر اور گکھڑ قبیلوں کا تسلط قائم تھا۔ ان قبیلوں کو زیر کئے بغیر دہلی کی جانب پیش قدمی ناممکن تھی۔

اس لئے بابر نے اس طرف توجہ دینی ضروری سمجھی، بابر نے ۱۷ فروری ۱۵۱۹ء کو ہنڈ کے بالمقابل دریائے سندھ کو عبور کیا۔ ان دنوں دریا میں پانی کم تھا۔ اس لئے اسے کوئی دقت پیش نہ آئی، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں بابر نے لکھا ہے کہ "بعض نیلابی آئے اور مجھے گذر (دریائے اٹک کے معبر) کے پاس ملے۔ انہوں نے ایک گھوڑا بمعہ زین اور تین سو شاہ رخیاں (روپے) مجھے نذر گزارے"۔ قیاس ہے کہ بابر نے نیلابی کا لفظ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر بسنے والے خٹکوں کے متعلق ہی استعمال کیا ہے۔

بابر نے راستے کے تمام حریفوں کو شکست دینے کے بعد کلر کہار کے راستے بھیرہ تک کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا۔ آخر کار ان سب حکمرانوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ واپسی پر کلر کہار سے آکر ۱۵ مارچ ۱۵۱۹ء کو اس نے راولپنڈی کے نواح میں پھروالہ کے مشہور ٹیلے پر قبضہ کر لیا۔ یہ قلعہ سلطان محمود کے زمانے میں گکھڑ سردار سلطان کیگوہر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد سے بابر اور مغل حکمرانوں کے ساتھ گکھڑوں کے تعلقات بڑے دوستانہ رہے۔ شہنشاہ ہمایوں نے ایران اور کابل سے واپسی پر کئی دن تک پھروالہ میں قیام کیا۔ اور میرزا کامران کی آنکھیں نکالنے کا حکم یہیں سے دیا تھا۔ گکھڑ بعد میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی فوجوں میں بھی شامل رہے۔

چونکہ بابر نے اپنی فوج کا کچھ حصہ باجوڑ، سوات اور علاقہ یوسف زئی کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا اس لئے بھیرہ کی تسخیر کے وقت اگرچہ اس کے سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ تاہم آتشیں اسلحہ کی وجہ سے وہ دشمنوں پر فوقیت رکھتا تھا اس لئے اسے اس مہم میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اسے کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور بھیرہ، خوشاب بلکہ دریائے چناب تک پھیلا ہوا سارا علاقہ بابر کے زیر نگیں آگیا۔ چونکہ اس سے قبل تیموریہ سارے علاقے فتح کر چکا تھا۔ اس لئے بابر اس کا وارث ہونے کی حیثیت سے برصغیر کے اس حصے کی حکمرانی اپنا استحقاق سمجھتا تھا۔

بھیرہ کی مہم سے واپسی پر بابر نے پشاور کے زرخیز میدانی علاقے ہشت نگر (تحصیل چارسدہ) میں بھی اپنے افسر بھیجے، جس پر ان لوگوں نے شاہی لشکر کے لئے ہر سال کچھ غلہ دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

بابر نے چوتھی بار ۱۵۲۰ء میں ہندوستان پر فوج کشی کی۔ اس مہم کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ اس

سے پیشتر بابر نے مفتوحہ علاقوں میں اپنے افسر مقرر کر دیئے تھے لیکن بابر کے واپس ہوتے ہی مقامی لوگوں نے پھر بغاوت کر دی تھی۔ اور مغلیہ حکومت کے افسروں کو نکال دیا تھا۔ شہنشاہ بابر ان باغیوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے جھیلم کے گکھڑوں اور کوہستانِ نمک کے قبیلوں کو زیر کرنے کے بعد سیالکوٹ تک پیش قدمی کی جہاں کے حاکم نے بغیر لڑے ہی بابر کی اطاعت قبول کر لی۔ بابر چاہتا تو تھا کہ اور آگے بڑھے لیکن سیالکوٹ ہی میں اسے خبر ملی کہ قندھار کے علاقے میں بغاوت ہو گئی ہے اور لوگ مغل حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس لئے بابر کو فوراً کابل واپس جانا پڑا۔ ۱۵۲۲ء تک بابر افغانستان میں بغاوتیں فرو کرنے اور امن و امان بحال کرنے کی کوششوں میں مصروف رہا۔

پانی پت کی پہلی لڑائی

قندھار کی مہم سے فارغ ہو کر بابر کو کابل پہنچے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ہندوستان کے بادشاہ ابراہیم لودھی کا چچا علاؤالدین اس کی خدمت میں حاضر ہوا ـــــ وہ لودھی بادشاہ کے ڈر سے بھاگ آیا تھا۔ اور بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دینا چاہتا تھا۔ انہی دنوں لودھی دربار کی جانب سے مقرر کردہ گورنر پنجاب دولت خان نے بھی بادشاہ دہلی کے خلاف بغاوت کر دی۔ بادشاہ نے دولت خان کی سرکوبی کے لئے شاہی لشکر بھیجا۔ چنانچہ دولت خان بھی بابر سے امداد کا طالب ہوا۔

بابر تو بیس برس سے موقع کی تلاش میں تھا کہ حالات سازگار ہوں تو دہلی پر حملہ کرے۔ ان بیس سالوں میں وہ متواتر فوجی مہموں میں مصروف رہا۔ اس نے قریب قریب سبھی سرحدی قبائل کو مطیع کیا یا دوستانہ طور پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ اب بابر کو راستے کے کسی قبیلہ سے کوئی خدشہ قطعاً نہ رہا۔

بابر کے پاس اس وقت کل دس ہزار سوار تھے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ شاہ دہلی سلطان ابراہیم لودھی کے سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ ہے اور اس کے پاس ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی ہیں، علاوہ ازیں دہلی کا بادشاہ مال و دولت کے لحاظ سے بھی بابر سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ بابر کے بعض سرداروں نے شاہ دہلی پر حملے کی مخالفت بھی کی۔ تاہم بابر کے عزم و استقلال میں کوئی فرق آنے نہ پایا۔

بابر نے اس مہم میں شرکت کے لئے اپنے سارے عزیزوں اور قابلِ اعتماد ساتھیوں کو دعوت دی۔ چنانچہ شہزادہ ہمایوں بدخشاں سے اور خواجہ کلاں غزنی سے کابل پہنچے۔ بابر کے قریبی عزیزوں میں سے سلطان محمد میرزا اور سلطان حسین میرزا نے بھی اپنی خدمات اس تاریخی مہم کے لئے پیش کیں۔

جمعہ، ۱۷ر نومبر ۱۵۲۵ء کو بابر اس فیصلہ کن معرکے کے لئے کابل سے روانہ ہوا۔ اس نے نہایت تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنے لشکر کو چار دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کو مختلف راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ ایک دستہ لغمان، دوسرا درّہ خیبر، تیسرا درّہ کرم اور چوتھا نغر یا درّہ ٹوچی کے راستے روانہ ہوا۔ خود بادشاہ بابر نے اسی شاہراہ کو اختیار کیا جو آج کل کابل سے پشاور کو جاتی ہے۔

سارے لشکر نے رات دیہہ یعقوب کی ندی کے کنارے گزاری۔ وہاں سے چل کر درہ خورد کو عبور کرنا تھا۔ کابل اور جلال آباد کے درمیان دشوار گزار پہاڑیاں ہیں جنہیں موسم سرما میں پار کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، پانچ دن رات میں فوج نے یہ راستہ طے کیا۔ لشکر میں آفریدی، شنواری، غلجی، ہزارہ، بلوچ اور عرب سبھی لوگ شامل تھے۔ تاجر اور نوکر پیشہ لوگ بھی سینکڑوں کی تعداد میں ساتھ تھے۔

۲۲ر نومبر کو درّہ خورد طے ہوا۔ گرد و نواح کے قبائل کو جب بابر کے عزائم کا پتہ چلا تو وہ دھڑا دھڑ آکر اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔ اس وقت تک صوبہ سرحد اور افغانستان کے لوگوں کی اکثریت اسلام قبول کر چکی تھی۔ انہوں نے کفر زارِ ہند کے خلاف اس حملے میں شرکت کو خدمتِ اسلام سمجھتے ہوئے جوش و خروش سے اس میں حصّہ لیا۔ علاوہ بریں اس وقت تک بابر صوبہ سرحد کے زیادہ تر قبائل سے دوستانہ تعلقات استوار کر چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بڑھ چڑھ کر بابر کا ساتھ دیا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بابر کی فوجوں کے روحِ رواں سرحدی قبائل ہی تھے چنانچہ خوشحال خان خٹک نے بھی اپنے کلام میں بابر کے فتح ہند کے کارنامے کو سرحدی لوگوں ہی کا مرہونِ منّت قرار دیا ہے۔

۲۴ر نومبر ۱۵۲۵ء کو بابر کی فوج گندمک پہنچ چکی تھی۔ بعد میں آدینہ پور (جلال آباد) پہنچ کر آٹھ دن تک بابر نے پڑاؤ کیا۔ وہ یہاں لشکر کی پھر تنظیم نو کرنا چاہتا تھا۔ جلال آباد ایک زرخیز علاقہ

ہے، بابر نے وہاں بہت سے باغات لگوائے تھے۔ وہاں ان دنوں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جس میں صوبہ ننگرہار کا گورنر رہا کرتا تھا۔

جلال آباد سے چھ دسمبر کو کوچ ہوا۔ بابر زندہ دل اور خوش مزاج شخص تھا، مہم جوئی اس کی فطرت میں ودیعت تھی۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے جدت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ خود اس نے تھوڑے سے ہمراہیوں کے ساتھ لکڑی کی شہتیروں کے گٹھے پر بیٹھ کر دریائے کابل سے پشاور جانے کا قصد کیا جب کہ باقی فوج کو ہمایوں کی کمان میں سڑک کے ذریعے آگے بڑھنے کا حکم ہوا۔ یہ سڑک کوئی سولہ میل تک دریائے کابل کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ بابر کا اندازہ تھا کہ وہ دریا کی تیز رفتاری کی وجہ سے پندرہ گھنٹوں میں پشاور تک جا پہنچے گا لیکن دریا میں خطرناک چٹانیں تھیں اور ہلاکت آفرین بھنور پڑتے تھے لہٰذا سفر کافی صبر آزما تھا۔ بادشاہ اور اس کے ہمراہیوں کے پاس مشکیزے بھی تھے تاکہ خطرے کی صورت میں تیر کر جان بچائی جا سکے ـــ شام تک بابر گرم چشمہ پہنچا جو درّہ خیبر کے مغرب میں واقع ہے وہاں اس نے دریا سے نکل کر خیمے میں رات گزاری۔

بابر عالی ظرف اور بلند ہمت انسان تھا۔ اُسے دیکھ کر سپاہیوں میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ اپنے ماتحتوں سے اس کے حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا کہ اس سفر میں ایک بار اچانک زبردست برف باری شروع ہوگئی۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی تاہم چند لوگوں نے ایک غار تلاش کیا اور بابر سے درخواست کی کہ وہ غار میں چلا جائے لیکن بابر نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ خود تو مزے سے رات کاٹے اور سپاہی کھلے میدان میں آسمان کے نیچے پڑے رہیں۔ چنانچہ اس نے سپاہیوں ہی کے ساتھ رات گزاری حالانکہ اس کا کہنا ہے کہ "صبح تک میرے سر پر کوئی چار انچ برف پڑی ہوئی تھی اور میرے کان تو اتنے یخ بستہ ہو گئے تھے کہ کئی دن بعد تک درد نہ گیا۔"

سات دسمبر کو بابر نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ درہ خیبر پار کیا۔ اس بار اس علاقے میں اُسے کسی مزاحمت کا سامنا کرنا نہ پڑا بلکہ خیبری قبائل کے نوجوانوں نے بھی بابر کی فوج میں بھرتی ہو کر اس کا ساتھ دیا۔

درّہ خیبر کی وہ ایک رات جو بابر نے علی مسجد کے پاس گزاری۔ کتنی لطف انگیز اور یادگار تھی۔ بابر نے توزک میں اسے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ بابر کا خیمہ ایک اُونچی پہاڑی پر نصب تھا۔

دوسرے خیمے ادھر اُدھر نشیب و فراز میں لگے تھے۔ رات کے وقت ان میں جلتی ہوئی آگ اور روشنی بڑا دلکش منظر پیش کرتی تھی، بابر نے اسے کہکشاں سے تشبیہہ دی ہے۔

دس دسمبر ۱۵۲۵ء کو بابر اور اس کا لشکر پشاور پہنچا۔ جہاں دنوں بگرام کہلاتا تھا۔ یہاں اس سے قبل بابر ایک قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ تاہم اب کے بابر نے پشاور کی سیر کا کچھ زیادہ ہی لطف اٹھایا۔ اس نے پشاور کے قریب ندی کے کنارے گینڈے کا شکار کیا۔ اس ندی کو بابر نے "سیہ آب" لکھا ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ بڈھنی ندی ہوگی جس کا پانی واقعی بیحد سیاہی مائل ہے اور جس کے کنارے سرکنڈے اور کائی کثرت سے ہوتی ہے، بابر کا اپنا مشاہدہ یوں ہے:۔

"پشاور پہنچتے ہی ایک نئی دنیا میرے سامنے تھی، گھاس اور فصلیں نئی تھیں، درخت، پودے اور پھل پھول نئے تھے، پرندے نئے تھے اور ان کے رنگ نئے، شکار کئے جانے والے جانور نئے، لوگوں کے طور طریقے الگ اور زبان الگ، جس پر میری حیرانی بجا تھی۔"

بابر کچھ دن تک پشاور میں ٹھہرا اور تیاریوں میں مصروف رہا۔ ۱۲ دسمبر کو اس نے تمام امراء اور سرداروں کا ایک اجلاس پشاور میں طلب کیا۔ اسی اجلاس کے فیصلے کے مطابق چھ سات افسروں کو اس امر پر متعین کیا گیا کہ اٹک پار کرنے کے بعد فوج کے ہر سپاہی اور افسر کا نام اور کوائف لکھیں۔

۱۶ دسمبر کو بابر نے دریائے سندھ کو اٹک کے مقام سے کچھ اُوپر پار کیا۔ اس وقت اس کے ساتھ کل بارہ ہزار افراد تھے۔ اس نے اب فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کی کمان بابر کے اپنے پاس تھی، دوسرے کی ہمایوں کے پاس اور تیسرے کی امیر خواجہ کلاں کے پاس رسالے کا سب سے بڑا افسر عبدالعزیز تھا۔ جب کہ استاد علی قلی خراسانی اور مصطفیٰ خان توپ خانہ کے انچارج تھے۔ بابر ہندوستان کا پہلا حملہ آور تھا جس نے توپ خانے سے کام لیا۔ توزک بابری میں جا بجا بڑی "فرنگی" توپوں کا ذکر آتا ہے جنہیں استاد علی قلی خان نے ڈھالا تھا۔ نومبر ۱۵۲۶ء میں کابل سے روانہ ہونے سے پہلے ایک ایسی ہی توپ ڈھالی جا رہی تھی۔ آٹھ بھٹیاں تیار کی گئی تھیں جن کے نیچے سے پگھلا ہوا لوہا گزر کر سانچے میں جاتا تھا۔ بابر کی موجودگی میں بھٹیوں کا منہ کھولا گیا۔ سیال لوہا نالیوں کے نیچے سے بہتا ہوا سانچے تک پہنچا۔ جونہی سانچہ بھر گیا۔ مزید

پگھلا ہوا لوہا جانا بند ہو گیا۔ اس موقع پر کسی فروگزاشت کے باعث قریب تھا کہ استاد علی قلی گرم گرم پگھلے ہوئے لوہے میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تاہم وہ سنبھل گیا اور اس کی جان بچ گئی۔ اس بہادری اور ہوشیاری پر بابر نے اسے انعام اور خلعت سے نوازا۔

اٹک پار کرنے کے بعد بابر نے کسی خاص مزاحمت کے بغیر اپنی پیش قدمی جاری رکھی، آجکل پنجاب پاکستان کا سب سے آباد اور مالدار صوبہ ہے لیکن ان دنوں یہ حال نہ تھا۔ منگولوں، تیمور اور دوسرے حملہ آوروں کے خوف سے لوگ یہاں آباد ہونا نہ چاہتے تھے۔ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کی بے وقعتی کا ان دنوں یہ عالم تھا کہ رائے رام دیو بھٹی حاکم ٹپیالہ نے لاہور کے مسلمان صوبہ دار سے سارا پنجاب ۹۰۰ ٹکوں (قریباً تیس ہزار روپیہ) کے عوض سالانہ اجارہ پر لے رکھا تھا۔

بابر اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ یوسف زئی اور دوسرے سرحدی قبائل نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا۔ پنجاب میں آباد پختونوں کی بہت بڑی تعداد بھی بابر کے ساتھ گئی، فتح کے بعد بابر نے ان کی بڑی قدر کی۔ مثلاً خویشگی پٹھانوں اور قصور بہ پٹھانوں کو اُس نے دریائے ستلج کے دونوں کناروں کے زرخیز علاقے جاگیر کے طور پر دیئے۔ قصور کا شہر اور مہدوٹ کی ریاست اسی زمانے سے آباد ہونی شروع ہوئی۔

۳۰ دسمبر کو بابر کا لشکر پسرور پہنچا، جہاں سے اس نے روپڑ اور سرہند کا قصد کیا۔ تھانیسر کے قریب گھاگرا دریا کے کنارے پہنچنے پر انہیں مخبر نے بتایا کہ سلطان ابراہیم لودھی مقابلے کے لئے بالکل تیار ہے۔

۲۵ فروری کو مغلیہ لشکر انبالہ پہنچا۔ وہاں کے حاکم نے سرکشی کی جس پر شہزادہ ہمایوں کو فوج دیکر اس کے خلاف بھیجا گیا۔ ہمایوں نے بڑی آسانی سے حاکم انبالہ کو ہرا دیا۔ بابر اس فتح پر سجدۂ شکر بجالایا اور ہمایوں کو خلعت سے نوازا۔ ہمایوں انبالہ سے ایک سو کے قریب قیدی اور آٹھ دس جنگی ہاتھی پکڑ کر لایا تھا۔ ۵ مارچ کو توپوں کی آزمائش کرنے کے لئے ان سب کو توپ دم کر دیا گیا۔

۱۲ اپریل کو بابر کا توپ خانہ اور بندوقچی دہلی سے پچاس میل دور پانی پت سے دو منزل کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ادھر سے سلطان ابراہیم ایک لاکھ سپاہی اور ایک ہزار جنگی ہاتھی لئے ہوئے بڑی ٹھاٹھ سے مقابلے کے لئے نکلا۔ وہ ایک ناتجربہ کار اور خود رائے بادشاہ تھا۔ کسی سے مشورہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا یہاں تک کہ اپنے بزرگوں اور رشتہ داروں تک کو خاطر

میں نہ لانا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس سے کوئی راضی نہ تھا۔ بہرحال اپنی فوجی قوت کی بنا پر اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آرہی تھی۔ بابر ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ جنگی مہارت میں بے مثل تھا اس نے اپنے دفاع کے لئے لکڑی کے بڑے بڑے گول برج ہموار کھے تھے جو مورچوں کا کام دیتے تھے اور جن میں رہ کر بندوقچی آسانی سے دشمن کو شکار کر سکتے تھے۔ ان برجوں کو "طورہ" کہتے تھے۔ بابر نے اپنی فوج کو کمال ہوشیاری سے ترتیب دیا۔ اس نے توپوں اور سامان لے جانے والی گاڑیوں کو تھوڑی تھوڑی دور کھڑا کر کے انہیں چمڑے کی مضبوط رسیوں سے باندھ دیا۔ ان کے پیچھے بندوقچیوں کو کھڑا کیا۔ اس کی فوج کے داہنی طرف پانی پت کا شہر تھا اور بائیں جانب ایک گہری خندق تھی جس میں اس نے بڑے بڑے درخت کٹا کر پھینک رکھے تھے۔ گویا بابر کی فوج ہر طرف سے محفوظ تھی۔

۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو تاریخ عالم کی یہ مشہور جنگ لڑی گئی جسے پانی پت کی پہلی لڑائی کہا جاتا ہے۔ صبح سورج طلوع ہوتے ہی لڑائی چھڑ گئی اور دوپہر تک دشمن کی فوج شکست کھا کر تتر بتر ہو گئی۔ سلطان ابراہیم لودھی مارا گیا اور اس کے پندرہ ہزار سپاہی جنگ میں کام آئے۔ لڑائی ختم ہوتے ہی بابر نے فوراً فوجی دستے بھیج کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ ۲۷ اپریل ۱۵۲۶ء کو ساری مسجدوں میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بابر محض حملہ آور نہ تھا وہ ہندوستان میں ایک مستقل سلطنت کے قیام کا خواہاں تھا۔ اس کے اکثر سردار واپس جانے کے جلدی میں تھے لیکن سب کو جمع کر کے بابر نے ایک زبردست تقریر کی جس کے آخر میں کہا ــــ "جو شخص میرا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے واپس جانے کا لفظ زبان سے نہ نکالے۔ جو میرا ساتھ دینا نہیں چاہتا ابھی واپس چلا جائے۔" تقریر مؤثر ثابت ہوئی کسی ایک نے بھی جانے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو بابر نے میواڑ کے رانا سانگا کو شکست دے کر راجپوتوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ۱۵۲۹ء میں ابراہیم لودھی کا بھائی محمود لودھی (حاکم بنگال) ایک لاکھ سپاہیوں سے بابر کی فوجوں سے نبرد آزما ہوا لیکن منہ کی کھائی اور بھاگ گیا ــــ اس طرح اب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے قیام کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر نے وفات پائی۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو کابل لے جایا گیا جہاں اُسے دفن کیا گیا۔

بابر تاریخ عالم کی مشہور شخصیت تھا۔ اس نے اپنے تدبر، ہمت، دلیری اور استقلال کی بدولت اتنی ترقی کی کہ اسے دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

ہُمایوں

۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات پر اس کا بیٹا نصیرالدین ہمایوں تخت نشین ہوا، قیام دہلی کے چار سالوں میں بابر کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اس کے شب و روز میدانِ جنگ ہی میں گزرتے تھے اس لئے ہمایوں کی تخت نشینی کے وقت ملک میں کوئی مستحکم سیاسی نظام موجود نہ تھا۔ بابر کامیاب فاتح اور جرنیل تو تھا لیکن بقول مؤرخ "رشبروک ولیمز" اس نے سلطنت کو استحکام بخشنے کی بجائے ہمایوں کو ایک نظامِ حکومت ورثے میں دیا جو جنگ کے ایام میں بیشک کام آسکتا تھا لیکن امن کے دنوں میں ناکارہ اور بودا تھا"

بابر کی جنگی کامیابیاں زیادہ تر پختون شمشیر آزماؤں کے تعاون کا نتیجہ تھیں۔ اگرچہ پانی پت کے میدان میں سلطان ابراہیم لودھی مغلوں سے شکست کھا چکا تھا تاہم اس کا بھائی محمود لودھی اپنی کھوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک دوسرا پٹھان جرنیل عالم خان لودھی بھاگ کر والئی گجرات بہادر شاہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اور والئی گجرات کو ہمایوں کے خلاف اکسا رہا تھا۔ بنگال کا حاکم نصرت شاہ بھی افغان سپاہیوں کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ تاہم ان سب سے زیادہ خطرناک شیر شاہ سوری تھا۔ جو اپنے حسنِ تدبر اور کمالِ سیاست سے ہندوستان کے تمام افغان باشندوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر رہا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ہمایوں نے زمامِ سلطنت سنبھالی۔ ہمایوں ایک بلند اخلاق اور عالم فاضل انسان تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ انتہائی فیاضانہ سلوک کیا اور بابر کی وصیت کے مطابق سلطنت چاروں بھائیوں میں تقسیم کر دی۔ کامران کو کابل اور صوبہ سرحد، عسکری کو سنبھل کا علاقہ اور مرزا ہندال کو الور کی جاگیر بخشی جب کہ دہلی کا مرکزی مقام اور حکومت اپنے

پاس رکھی۔ بظاہر ہمایوں کا یہ اقدام مبنی بر انصاف تھا لیکن اصل میں یہی امر اس کے لئے تمام مصائب کا پیش خیمہ بن گیا۔ صوبہ سرحد، کابل، قندہار اور غزنی ہی وہ علاقے تھے جہاں کے مردانِ جنگ آزما کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ علاقے ہمایوں کے تصرف سے نکل گئے۔ اُدھر اس کے بھائی بھی برادرانِ یوسف ثابت ہوئے اور احسان فراموشی کی روش پر چل کر ہمایوں کے لئے وبالِ جان بن گئے۔

جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے بقول کیرو حالات یہ تھے کہ

"پٹھانوں کے میدانی یا پہاڑی علاقوں پر بابر، کامران یا ہمایوں کے زمانہ میں کوئی مغل حکومت قائم نہ تھی، یہ حکمران زیادہ سے زیادہ شاہراہوں کی حفاظت کا انتظام کرتے یا مختلف سرحدی قبائل کی حمایت اس وجہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ اُن کے باہمی خاندانی تنازعوں میں کام آسکیں"۔

سلطنت کی اس تقسیم کے بعد کامران کا صوبہ سرحد کی سیاست سے قریبی تعلق قائم ہوگیا وہ ہر قیمت پر سرحدی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا تاکہ ان کی مدد سے ہمایوں کو ہرا کر ساری سلطنتِ ہند پر قبضہ کرسکے۔ اُن دنوں پشاور کے میدانی علاقوں میں زیادہ تر دلازاک قبیلہ کے لوگ آباد تھے، اس قبیلے کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ ہمایوں کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ یہ بات کامران کو کھٹکی۔ چنانچہ اس نے دلازاک کو مجبور کیا کہ وہ پشاور کو چھوڑ کر چھچھ اور ہزارہ کی طرف کوچ کر جائیں اور اُن کی جگہ اپنے حلیف غوریا خیل قبیلوں خلیل، مہمند اور داؤد زئی کو وادیٔ پشاور کے زرخیز علاقوں میں بسا دیا۔

مردان، سوات اور باجوڑ کے علاقوں پر اس وقت تک یوسف زئی اپنے قدم جما چکے تھے، وہ بھی دلازاک کو پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکتے تھے اور کاٹلنگ (مردان) اور گل بیلہ (پشاور) میں ایک دوسرے سے دو دو ہاتھ کر چکے تھے، اب یوسف زئی غوریا خیلوں کو اپنا حریف سمجھنے لگے چنانچہ دریائے شاہ عالم کے کنارے ان دونوں گروہوں میں لڑائی ہوئی جس میں میدان یوسف زئی کے ہاتھ رہا۔ اس معرکے میں یوسف زئی کی کمان ملک گجو خان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اغلباً یہ جنگ ۱۵۵۰ء میں لڑی گئی۔

ادھر بادشاہ بننے کے بعد سے ہمایوں متواتر جنگوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ۱۵۳۱ء میں اس نے بندھیل کھنڈ کے مشہور قلعے کالنجر کو فتح کیا جہاں کا راجہ مغلوں کے سیاسی حریفوں افغانوں کا دوست اور بہی خواہ تھا۔ اگست ۱۵۳۲ء میں اس نے دوراہہ کے مقام پر محمود لودھی کو شکست دی ستمبر ۱۵۳۲ء میں ہمایوں نے آگے بڑھ کر چنار کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ اس وقت شیر شاہ سوری کے قبضے میں تھا۔ چار ماہ کے محاصرہ کے بعد ہمایوں نے شیر شاہ سوری کی صلح کی درخواست منظور کر لی حالانکہ اس کے سرداروں نے اس صلح کی مخالفت کی تھی۔ بعد میں واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ صلح بھی ہمایوں کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی، ۱۵۳۷ء تک ہمایوں گجرات، مالوہ، اور چتوڑ میں مصروفِ جنگ رہا۔ اس عرصہ میں شیر شاہ سوری نے پھر سارے بنگال اور بہار پر قبضہ جما لیا تھا۔ آٹھ ماہ تک ہمایوں نے چنار کے قلعے کا محاصرہ کئے رکھا۔ پھر وہ گوڑ کو فتح کرتا ہوا بنگال کی طرف بڑھا۔ ہمایوں نے ان جنگوں میں اپنے بھائیوں کامران اور ہندال سے امداد طلب کی لیکن دونوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ ہمایوں کی فوج بنگال پہنچی تو برسات کا موسم تھا۔ اس کے ساتھی ایسے موسم کے عادی نہ تھے، اکثر بیمار پڑ گئے۔ شیر شاہ سوری نے موقع غنیمت سمجھا اور ۲۶ جون ۱۵۳۹ء کو اچانک حملہ کر دیا۔ مغل سپاہی بھاگ اٹھے۔ خود ہمایوں نے دریائے گنگا میں گھوڑا ڈال دیا۔ قریب تھا کہ وہ ڈوب جائے لیکن نظام سقہ نامی ایک شخص نے اُسے بچا لیا اور دریا کے پار اتارا۔ جولائی ۱۵۳۹ء میں ہمایوں تھکا ہارا دارالحکومت آگرہ پہنچا۔

۱۷ مئی ۱۵۴۰ء کو قنوج کے مقام پر شیر شاہ سوری اور ہمایوں میں پھر فیصلہ کن معرکہ پڑا جس کے نتیجے میں ہمایوں سے برصغیر کی سلطنت چھن گئی اور جلاوطنی کا دور شروع ہو گیا۔

شکست کے صدمے سے دوچار ہونے کے بعد ہمایوں پشاور پہنچ کر مرزا کامران کی مدد سے پھر شیر شاہ پر چڑھائی کرنا چاہتا تھا لیکن کامران ایک بے وفا بھائی ثابت ہوا۔ اس نے ہر طرح ہمایوں کی راہ روکنا چاہی نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر یا صوبہ سرحد پہنچنے کی بجائے ہمایوں اپنے اہل خاندان اور چند ایک وفادار ہمراہیوں کیساتھ عازم سندھ ہو گیا۔ اسی دربدری کے عالم میں عمر کوٹ (سندھ) کے مقام پر اس کے ہاں ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو جلال الدین اکبر تولد ہوا۔ کچھ دن سندھ میں گذار کر ہمایوں نے قندھار کا رُخ کیا لیکن اس کے بھائی مرزا عسکری نے جو اُن دنوں کامران کی جانب سے قندھار

کا گورنر تھا۔ ہمایوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ ہمایوں اور اس کے ساتھی تو موقع پاکر عسکری سے نکل بھاگے البتہ کم سن بیٹا اکبر اپنے چچا کے ہاتھ لگ گیا جس نے اسے قیدی بنا کر کابل بھیج دیا۔ یہ واقعہ مستونگ (بلوچستان) میں پیش آیا۔

بچتے بچاتے ہمایوں ایران پہنچا اور وہاں کے شاہ طہماسپ صفوی کا مہمان بن گیا۔ وہ کافی عرصہ تک ایرانی دارالحکومت میں ٹھہرا رہا۔ بالآخر ۱۵۴۵ء میں ایرانی شہنشاہ نے ہمایوں کو چودہ ہزار ایرانی سپاہی دیئے اور یہ وعدہ لیا کہ وہ قندہار اپنے بھائی عسکری سے چھین کر ایران کے حوالے کرے گا۔

ایرانی فوج کی مدد سے ۱۶ مارچ ۱۵۴۵ء کو عسکری کی فوجوں کو شکست دے کر قندہار پر قبضہ کر لیا۔ میرزا عسکری نے ہمایوں کے سامنے پیش ہو کر معافی مانگ لی۔ ہمایوں نے اُسے معافی دے دی۔ راہ میں غزنی کو فتح کرتا ہوا۔ نومبر ۱۵۴۵ء کو ہمایوں کابل پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ شہر فتح ہو گیا لیکن دو سال تک کامران نے اسے چین نہ لینے دیا۔ آئے روز کابل پر حملے کرتا رہتا۔ آخری بار شکست کھانے کے بعد کامران فرار ہو کر پہلے صوبہ سرحد کے مختلف قبائل کے پاس مقیم رہا۔ اور بالآخر گکھڑ قبیلہ کے سردار آدم (یا ادھم) خان کے پاس پہنچ گیا۔

ہمایوں سرحدی قبائل کے خوف سے براہِ راست پشاور آنا نہ چاہتا تھا۔ بلکہ پہلے چھوٹے چھوٹے حملے کر کے حالات کو سازگار بنانے کا متمنی تھا۔ ایک دن نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد وہ اپنے لشکر، امیر ابوالمعالی اور شہزادہ اکبر کے ہمراہ کابل سے روانہ ہوا۔ اس نے درّہ خیبر کی بجائے کُرّم پاڑہ چنار کے راستے سے پیش قدمی کی۔ بنگش قبیلے نے شاہی لشکر کا راستہ روکا چنانچہ درسمند کے قصبہ کے پاس دونوں فریقوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ہنگو پہنچنے پر بادشاہ ہمایوں کو معلوم ہوا کہ ایک شخص بایزید انصاری لوگوں میں عجیب و غریب عقائد پھیلا کر انہیں گمراہ کر رہا ہے۔ ہمایوں نے اپنے سردار قراچہ خان کو اس کی گوشمالی کے لئے تیراہ روانہ کیا جہاں بایزید انصاری مقیم تھا۔ شاہی لشکر نے اس کے تمام اہل و عیال کو گرفتار کر لیا مگر وہ بذاتِ خود ہاتھ نہ آیا۔ بلکہ دھنکوٹ کی طرف فرار ہو گیا۔

ہمایوں ابھی علاقہ بنگش ہی میں مقیم تھا کہ گکھڑ راجہ سلطان آدم نے اپنے ایلچی بھیج کر اُسے بتایا کہ میرزا کامران اس (گکھڑ سردار) کے پاس پہنچ چکا تھا اور بادشاہ ہمایوں سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اس پر ہمایوں اور اس کے ساتھی دریائے سندھ (نیلاب) کو عبور کرنے کے بعد

سلطان آدم کے ملک میں داخل ہوا ۔ ۲۹ ۔ دسمبر ۱۵۵۱ء کو ہمایوں اور میرزا کامران کی ملاقات ایک ندی کے کنارے ہوئی جہاں ہمایوں اس وقت خیمہ زن تھا ۔ کامران اپنی غلطیوں پر ندامت ظاہر کرتے ہوئے بھائی سے معافی کا طلب گار ہوا ۔ قریب تھا کہ ہمایوں اپنی نرم مزاجی کی بنا پر ایک بار پھر اسے معافی دے دیتا لیکن تمام سرداروں نے یہی رائے دی کہ آزمودہ را آزمودن خطاست ۔ اب کے میرزا کامران سے کوئی رعایت نہ برتی جائے ۔ ہمایوں طبعاً سہت نرم دل تھا لیکن صورتحال اتنی نازک تھی کہ اس موقع پر امرائے لشکر کے مشورے کو بھی رد نہ کر سکتا تھا ۔ تاہم اس نے قتل کا حکم دینے کی بجائے اتنی رعایت برتی کہ کامران کی آنکھیں میں سلائی پھیر دی جائے ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ کامران کے فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے ہمایوں نے اسے اس کی وفادار بیوی ماہ چوچک بیگم کے ہمراہ مکہ معظمہ بھیج دیا جہاں چار سال بعد اس کا انتقال ہو گیا ۔ سات آٹھ ماہ بعد اس کی بیوی بھی وہیں فوت ہو گئی ۔

اب ہمایوں کامران کو تو شکست دے چکا تھا تاہم ابھی اپنے اندر اتنی ہمت نہ پاتا تھا کہ ہندوستان کے سوری حکمران کا مقابلہ کر سکے ، اتفاق سے انہی دنوں شیر شاہ سوری کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے جانشین اتنے صاحب تدبیر نہ تھے جتنا شیر شاہ ۔ لہٰذا ہمایوں نے یہی مناسب سمجھا کہ کابل واپس جا کر پوری طرح تیاری کرے اور اس کے بعد ہندوستان کی طرف متوجہ ہو ۔ اس غرض کے لئے علاقہ گکھڑ (نزد حسن ابدال) سے واپس ہوا اور دریائے سندھ کو پار کر کے پشاور پہنچا ۔ پشاور میں اس نے قلعہ بالاحصار کی تعمیر نو کرائی ۔ اسے مستحکم بنایا ۔ اس میں کافی مقدار میں غلہ ذخیرہ کیا ۔ اور ایک جرار لشکر کو سکندر خان ازبک کی ماتحتی میں قلعہ بالاحصار میں متعین کر کے خود کابل کی راہ لی ۔

بادشاہ ہمایوں کے پیٹھ پھیرتے ہی یوسف زئی قبیلہ کے سردار گجر خان نے پشاور پر کئی حملے کئے ۔ اس نے شاہی فوج کو سخت نقصان پہنچایا ۔ تاہم چونکہ گجر خان کے پاس توپخانہ نہ تھا ۔ اس لئے قلعے پر اس کا مکمل قبضہ ہونے نہ پایا ۔

ہمایوں کی ہندوستان میں آمد سے کچھ عرصہ پہلے اس کا دوسرا بھائی ہندال ایک افغان کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا ۔

۱۵۵۴ء کے آخر میں ہمایوں پوری تیاری کے بعد ہندوستان کی تسخیر کے ارادے سے نکلا ، اپنے

لشکر کے ہمراہ کابل سے جلال آباد پہنچنے کے بعد اس نے اپنی فوج کو تو درّہ خیبر کی راہ پشاور کی جانب بھیجا جبکہ خود لکڑیوں کے ایک گٹھے پر بیٹھ کر دریائے کابل کے ذریعے پشاور پہنچا۔ پشاور سے اس نے گکھڑ سردار سلطان آدم کو اطلاع دی کہ وہ اسے تسخیرِ ہندوستان کے ارادے سے بہت جلد اُسکے پاس پہنچ رہا ہے۔ اٹک کے مقام پر اس نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور بلا روک ٹوک آگے بڑھتا گیا۔

شیر شاہ سوری کا دورِ حکومت چونکہ زیادہ طویل نہ تھا اس لئے اُسے شمالی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی علاقوں کی طرف زیادہ توجہ دینے کا وقت نہ ملا۔ البتہ ایک بار وہ دریائے جہلم کو عبور کر کے کوہستانِ نمک اور پوٹھوہار کے قبیلوں کی سرکوبی کو آیا تھا۔ اسی مختصر دورے میں اس نے دریائے جہلم کے دائیں کنارے رہتاس کے کلیدی مقام پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ فنِ تعمیر کا کمال ہے۔ دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ اتنے مختصر عرصہ میں اتنا بڑا اور مضبوط قلعہ کیسے تیار ہو گیا۔ بہرحال سوری حکمران رہتاس ہی کو اپنی آخری سرحد سمجھتے تھے۔ جب ہمایوں نے اس قلعے پر حملہ کیا تو وہاں کے افغان قلعہ دار تاتار شاہ نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا لیکن اُسے چونکہ اپنی حکومت کی جانب سے کمک پہنچنے کی اُمید نہ تھی اس لئے رات کی تاریکی میں بھاگ کھڑا ہوا اور قلعہ رہتاس پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔

رہتاس کی فتح کے بعد ہمایوں کوچ کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ معمولی جھڑپوں کے بعد ۲۴ فروری ۱۵۵۵ء کو لاہور پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ ان دنوں دیپال پور کا شہر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ لاہور میں پاؤں جمانے کے بعد ہمایوں نے ادھر کا رُخ کیا۔ جہاں شہباز خان اور ناصر خان سوری بادشاہوں کی جانب سے جرنیل کے طور متعین تھے۔ لڑائی ہوئی تاہم دونوں جرنیل دِل چھوڑ بیٹھے اور میدان سے فرار ہو گئے۔

لاہور سے دہلی جاتے ہوئے ۱۲ مئی ۱۵۵۵ء کو ماچھی واڑہ کے مقام پر ہمایوں اور سکندر شاہ سوری کی فوجوں کی ٹکر ہوئی۔ افغان فوج تیس ہزار جنگ آزماؤں پر مشتمل تھی اور تاتار خان، ناصر خان اور ہیبت خان ایسے سالار ان کی کمان کر رہے تھے۔ تاہم ہمایوں کی فوج نے آسانی سے انہیں ہرا دیا۔

ماچھی واڑہ کی شکست کی اطلاع دہلی میں سکندر شاہ سُوری کو ملی تو بڑے جوش میں آیا۔ اس نے اسّی ہزار سپاہی جمع کئے اور ہمایوں کے مقابلے کو نکلا۔ لشکر کی قیادت وہ خود کر رہا تھا۔ سرہند کے مشہور تاریخی قصبے کے پاس دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ سُوری لشکر مُغلوں کی فوج سے چار گنا بڑا تھا اور سُوری سپاہی بڑی بہادری کے جوہر دکھاتے رہے تاہم فتح ہمایوں ہی کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی اس لئے بالآخر وہی کامیاب رہا۔ یہ لڑائی فیصلہ کُن ثابت ہوئی اور بالآخر ۲۰ جولائی ۱۵۵۵ء کو ہمایوں متواتر پندرہ سال کی خانہ بدوشی اور دربدری کے بعد دہلی کی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہمایوں کی ساری زندگی مصائب و آلام اور جدوجہد میں بسر ہوئی۔ شہزادگی کے عالم میں بھی وہ اپنے باپ بابر کے ساتھ مختلف جنگی مہموں میں شریک رہا۔ بادشاہ بننے کے بعد دن رات اُسے مختلف دشمنوں سے لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ آخر میں ہندوستان کی سلطنت دوبارہ ملی تو بھی اسے آرام کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ فتح دہلی کے چند ہی ماہ بعد ۲۸ جنوری ۱۵۵۶ء کو وہ اپنے کُتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔ تاریخِ وفات یہ ہے :-

"اُسے وائے بادشاہ از بام اُفتاد"

شیر شاہ سُوری

شیر شاہ سُوری برصغیر پاک و ہند کا وہ نامور حکمران تھا جس نے محض اپنے تدبر، ذاتی کمالات اور زورِ کردار کی بنا پر ایک بے حد وسیع و عریض سلطنت قائم کی، ملک کو ایک مستقل نظام حکومت عطا کیا اور معاشی اور معاشرتی اصلاحات کی بنیاد رکھی۔

شیر شاہ کا اصل نام فرید الدین تھا اور وہ افغانوں کے قبیلہ سُور کے حسن خان کا بیٹا تھا۔ جسے سکندر لودھی نے صوبہ بہار کے ضلع سہسرام میں جاگیر عطا کی تھی۔ جوانی میں تن تنہا شیر کا شکار کرنے کے باعث اسے شیر خان کہا جانے لگا اور بعد میں حکمران بننے پر شیر شاہ کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

مرحوم اللہ بخش یوسفی کا کہنا ہے کہ شیر شاہ یوسف زئی منڈڑ کی شاخ کمال زئی سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے مسکن "سوڑے" کی نسبت سے سوری کہلاتا تھا۔ لیکن یہ بیان زیادہ مستند نہیں، بعض لوگوں نے اُسے سُورانی قبیلہ کا فرد قرار دیا ہے جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ شیر شاہ ان پختونوں کی اولاد تھا جو گھوڑوں کا لین دین کرتے تھے اور سوار یا سُور کہلاتے تھے، ایک اور ضعیف روایت کے مطابق وہ ضلع پشاور کے مقام "سوڑیزئی" سے تعلق رکھتا تھا لیکن عرصۂ دراز سے سہسرام میں مقیم تھا۔ شیر شاہ کا مقبرہ اس کی وصیت کے مطابق سہسرام ہی میں ہے کیونکہ یہی مقام اس کی تمام تر ترقیوں کی جولان گاہ اور پہلا زینہ تھا، جو کچھ بھی ہو۔ یہ بات مسلّمہ ہے کہ اسے عظیم ترین پختون حکمران کہا جا سکتا ہے۔

شیر شاہ نے جونپور میں تعلیم پائی جو ان دنوں علم و ادب کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام علومِ متداولہ پر عبور حاصل کر لیا۔ اس نے

رفتہ رفتہ بہار کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر ۲۶ جون ۱۵۳۹ء کو دریائے گنگا کے مقام "چونسہ" پر بادشاہ ہمایوں کو شکست دے کر سارے ہندوستان کا فرمانروا بن گیا۔

۱۵۴۴ء میں اس نے جودھپور کے راجہ کو شکست دی۔ ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو اس نے کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا کہ ایک گولہ اس کے قریب آ کر گرا جس سے گولہ بارود کے ذخیرے نے آگ پکڑ لی اور شیر شاہ سوری جاں بحق ہو گیا۔

صوبہ سرحد کے لوگوں کو شیر شاہ سوری کی حکومت سے بہت تقویت ملی۔ سرحدی لوگ جوق در جوق اس کی فوجوں میں بھرتی ہوئے۔ اس نے پختون نوجوانوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور انہیں جاگیریں عطا کیں۔ تاہم جہاں تک صوبہ سرحد کی سیاست کا تعلق ہے شیر شاہ سوری اس سے الگ تھلگ ہی رہا کیونکہ وہ قبائلی خانہ جنگی میں الجھنا نہ چاہتا تھا۔ البتہ بنوں کا کچھ علاقہ اور میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل اس کے تصرف میں رہی۔ اس کے مشہور سپہ سالار حیبت خان کا تعلق نیازی قبیلہ سے تھا۔ اسی طرح اس کی فوج کے دوسرے عہدہ دار بھی زیادہ تر پختون ہی تھے، عملاً اس کے دور میں بھی صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے شہنشاہ بابر کے بیٹے مرزا کامران ہی کے زیر انتظام رہے۔

اپنے مختصر دورِ حکومت میں شیر شاہ کو فرصت ہی نہ ملی کہ وہ صوبہ سرحد کے معاملات کی طرف توجہ دیتا۔ زندگی میں ایک بار وہ مارگلہ (راولپنڈی) تک آیا۔ اس نے کوہستانِ نمک اور دریائے جہلم کے کنارے راجپوتوں کو مطیع کیا اور نندنہ کے پہاڑی سلسلے میں ایک کلیدی مقام پر رہتاس کا مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ اس قلعے کا نام اس نے اپنے ہندوستانی قلعے کا نام پر رہتاس تجویز کیا اور سب سے بڑی اور طاقتور فوج وہیں رکھی جو پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

اسی دور سے کے دوران جب شیر شاہ سوری دریائے جہلم کے کنارے خوشاب کے مقام پر خیمہ زن تھا تو صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے ہزاروں پختون (جن میں بڑے بڑے زعماء اور علماء بھی شامل تھے) اسے ملنے کے لئے گئے، ان میں نامور بزرگ شیخ قتال کے فرزند شیخ بایزید سروانی بھی تھے۔ شیر شاہ نے سبھی کی بڑی قدر و منزلت کی۔

خوشاب ہی میں بلوچوں کے ہوت قبیلہ کے تین سرداروں اسمٰعیل خان، فتح خان اور غازی خان نے شیر شاہ سوری کے حضور حاضری دی۔ چنانچہ ان کی درخواست پر شیر شاہ نے ان کے مقبوضات

کی توثیق کر دی۔ اپنی سرداروں کے نام پر ڈیرہ اسمٰعیل خان، فتح جنگ اور ڈیرہ غازی خان کے شہر آباد ہوئے۔

شیر شاہ سوری ایک مثالی فرماں روا تھا جس نے دین اور دنیا دونوں کے اعتبار سے ایک قابلِ فخر زندگی گزارنے کی عملی مثال پیش کی۔ اس کا مقولہ تھا۔ کہ "دنیا کے کاموں کو عبادت سمجھ کر انجام دو"۔ اس کی سیاست اور نظامِ حکومت کا محور عدل تھا۔ مسٹر کین (KEENE) کا کہنا ہے کہ "کسی حکومت حتیٰ کہ برطانوی حکومت نے بھی اتنی دانشمندی کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا اس پٹھان بادشاہ (شیر شاہ) نے کیا"۔ مارشمین کے نزدیک شیر شاہ دنیا کا پہلا حکمران تھا جس نے ڈاک کا موجودہ نظام قائم کیا۔ اپنے پیشروؤں کے برعکس وہ جبر کی بجائے خدمت کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ وہ ملک کو ایک نیلائی ریاست بنانے کا انصب العین رکھتا تھا۔ خود ایک پاکباز اور تہجد گزار انسان تھا لیکن اس کی دینداری فراخدلی پر مبنی تھی نہ کہ تعصب پر، وہ اسلام کو محض عقیدوں یا عقیدت تک محدود نہ سمجھتا تھا۔ بلکہ اس کے عملی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ جہاد اسلام کی رُوح ہے، مسلمان وہی ہے جو ہر وقت باطل کے مقابل سینہ سپر رہے چنانچہ اسلام کی سپاہیانہ زندگی کو عملاً رائج کرنے کے لئے اس نے حکم دے رکھا تھا کہ نمازِ ظہر کے وقت ہر مسجد میں امام اور مقتدی کم سے کم دس تیر اپنے ہاتھوں سے چلائیں ـــــ اس کے ایک معتمد امیر سید رفیع الدین نے مارواڑ کی فتح کے بعد باقی عمر حرمین الشریفین میں گزارنے کی اجازت چاہی تو شیر شاہ نے اسے باز رکھا کہ وہ رہبانیت کی بجائے خدمتِ خلق کو پسند کرتا تھا۔ اس کی دین داری ہر بات سے عیاں تھی۔ چنانچہ اس کے سکہ کے ایک طرف ناگری حروف میں اس کا نام کندہ تھا تو دوسری طرف کلمہ طیبہ اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ کے کلمات فارسی میں کندہ تھے، گویا شیر شاہ افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ پر چلنے والا تھا۔

"دائرہ معارف اسلامیہ" نے شیر شاہ سوری کی صلاحیتوں اور عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :-

"شیر شاہ سوری نے پانچ برس کے لگ بھگ حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں اس نے عظیم جنگی کارنامے سرانجام دیئے۔ ایک زبردست مرکزی حکومت قائم کی۔ نظم و نسق کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کیں جن کا نتیجہ ملکی امن و امان،

خوشحالی اور ترقی کی صورت میں نکلا۔"

اس نے ملکی نظم و نسق کو سائنٹیفک اصولوں پر چلانے کی خاطر اپنے ممالک محروسہ کو سنتالیس قسمتوں (سرکاروں) اور ایک لاکھ سولہ ہزار پرگنوں (تحصیلوں) میں تقسیم کیا۔ ہر پرگنے میں مندرجہ ذیل عہدہ دار مقرر کئے

۱۔ عامل ۲۔ شقہ دار ۳۔ خزانچی (خزانچی)

۴۔ کارکن فارسی نویس ۵۔ کارکن ہندی نویس ۶۔ چودھری

(۷) قانون گو اور ۸۔ امین (زمین کی پیمائش کرنے والا)

اس نے زرعی اصلاحات کی طرف خصوصی توجہ دی۔

شیر شاہ کا جو کارنامہ اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے وہ شاہراہ پاکستان یا جی۔ ٹی روڈ ہے۔ یہ عظیم سڑک پشاور سے کلکتہ کو ملاتی ہے۔ شیر شاہ کے دور میں اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرائیں بنائی گئی تھیں۔ جہاں کے ملازم مسافروں کی خدمت کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرتے سڑک کے ساتھ کنویں (باؤلیاں) بنائی گئی تھیں۔ سڑک کے دو رویہ سایہ دار اور پھلدار درخت لگائے گئے تھے۔ یورپی سیاح ولیم فنچ (WILLIAM FINCH) نے ۱۶۰۸ء میں اور ٹریورنر (TRAVERNER) نے ۱۶۴۰ء میں اس سڑک کے ذریعے سفر کیا اور اسے یورپ کی سڑکوں کے برابر قرار دیا۔ جابجا ندی نالوں پر پل بنائے گئے تھے۔ اس سڑک کو بادشاہی سڑک یا شاہراہ شیر شاہ کہا جاتا تھا۔ سکھوں کے زمانے میں سڑک ٹوٹ پھوٹ گئی۔ لیکن انگریزوں نے زمام حکومت سنبھالتے ہی ۱۸۵۵ء میں کرنل سیج (SAGE) سپرنٹنڈنگ انجینئر کو سڑک کا جائزہ لینے اور اسے ترقی دینے کا کام سپرد کیا۔

اگرچہ شیر شاہ سوری خود صوبہ سرحد نہیں آیا۔ تاہم اس کی فیاضی سے پختون بہرہ ور ہوا۔ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ اس کے عہد میں کوئی "پختون" بھی نادار نہ رہا ـــــ وہ "ہر پختون" کو نقد امداد دینے سے بھی گریز نہ کرتا ـــــ بیواؤں اور یتیموں پر خاص طور پر مہربان تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ "پختون" روایات کو بے حد عزیز رکھتا تھا۔ ہر ایک سے برابری کا سلوک کرتا تھا اور اپنے آپ کو عوام سے بالاتر ہرگز خیال نہ کرتا تھا۔

عیسیٰ خان مسند عالی شیر شاہ کے خاص امراء میں سے تھا۔ ہمایوں کو شکست دینے کے بعد جب

اس نے اشارتاً شیر شاہ کو تختِ حکومت سنبھالنے کو کہا تو شیر شاہ نے کمال انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ حضرات نے افغانوں کے ناموس کی خاطر میرا ساتھ دے کر مجھے سرفراز کیا ہے، اب یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ میں تخت پر بیٹھوں اور آپ دست بستہ میرے سامنے کھڑے ہوں"۔

اس پر عیسیٰ خان مسندِ عالی نے جواب میں کہا :-

"ملک کسی کی میراث نہیں۔ جو کوئی اپنی ہمت سے اسے حاصل کرے وہ اس کا مالک ہے۔ اور ملک اسی کے پاس رہتا ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔ آپ نے بادشاہِ وقت کو شکست دی ہے۔ آپ جامع اخلاقِ حمیدہ ہیں، اللہ تعالےٰ کی نصرت آپ کے شاملِ حال ہے جس طرف آپ حملہ کرتے ہیں فتح آپ کے قدم چومتی ہے ہم آپ کے وفادار ساتھی ہیں۔ آپ کے سامنے ہمارا کھڑا ہونا باعثِ توہین نہیں بلکہ باعثِ فخر ہے"۔

ایلیٹ (ELLIOT) نے شیر شاہ کی جمہور پسندی اور عوام دوستی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اُس (شیر شاہ) کا رُعب اور وقار اس درجہ تھا کہ سلطنت کا کمزور سے کمزور آدمی رستم سے بھی نہیں ڈرتا تھا"۔

پختون قبائل کا بہبود اور ان کی آبادکاری کا خیال شیر شاہ کو اپنی جان سے بھی عزیز تھا۔ اس سلسلے میں گورنر سر اولف کیرو نے یہ واقع لکھا ہے کہ

"ایک روز وہ (شیر شاہ) ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور بار بار سسکیاں لے رہا تھا۔ اس پر ایک مصاحب نے کہا: "آپ نے اتنے مختصر عرصے میں سلطنت، خزانہ، فوج، رعایا اور امن و امان سے متعلق تمام معاملات اور امور کو سلجھا دیا ہے، ایسے کہ اس سے پہلے کوئی حکمران ایسا نہیں کر سکا۔ پھر آخر آپ کیوں رنجیدہ ہیں؟" شیر شاہ نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب مصاحبوں کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو، مجھے سب کچھ ملا لیکن میری چار خواہشیں ایسی ہیں جو پوری نہ ہو سکیں اور جنہیں میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا"۔ مصاحبوں کے دریافت کرنے پر شیر شاہ نے کہا کہ پہلی خواہش تو یہ تھی کہ میں روہ (صوبہ سرحد اور وادیٔ کابل) کے علاقہ کو اجاڑ دیتا اور اس کے باشندوں کو نیلاب (دریائے سندھ) اور لاہور کے درمیان میدانی علاقوں میں آباد کر دیتا تاکہ مغلوں کی طرف سے کوئی حملہ ہوتا تو وہ اسے روکتے اور اس طرح ایک تو شمال مغرب سے کوئی حملہ آور ہندوستان

میں داخل نہ ہو سکتا، دوسرے میدانی زرخیز علاقوں میں آباد ہو جانے سے پہاڑی باشندے مہذب اور متمدن زندگی سے لذت آشنا ہو جاتے ـــــ میری دوسری خواہش یہ تھی کہ میں لاہور کو اجاڑ دینا کہ شمال مغربی جانب سے کوئی حملہ آور اتنے بڑے شہر میں داخل ہو کر اپنی ضروریات کو پورا نہ کر سکتا ـــــ تیسرے بڑے عرصہ سے میری یہ تمنا رہی ہے کہ میں مکہ معظمہ کے راستے میں پچاس مضبوط چوکیاں بنواتا تاکہ حاجی لوگ اطمینان سے سفرِ حج کر سکتے ـــــ میری چوتھی اور آخری خواہش یہ تھی کہ پانی پت میں سلطان ابراہیم لودھی کا ایک عظیم مقبرہ بنواتا اور اس کے پاس ہی مغل بادشاہ بابر کا بھی ویسا ہی مقبرہ تعمیر کراتا تاکہ میرے اس کام کی دوست دشمن یکساں تعریف کرتے اور میرا نام قیامت تک زندہ رہتا ـــــ مجھے یہ تمنائیں بہت عزیز تھیں لیکن افسوس کہ پوری ہونے نہ پائیں"۔

"تاریخ شیر شاہی" کا مؤلف عباس خان لکھتا ہے کہ فرید خان (شیر شاہ) کو شروع ہی سے قدیم بادشاہوں کے تذکرے پڑھنے کا بہت شوق تھا ـــــ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں عنقریب مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا اس لئے کہ مغل لڑائی میں افغانیوں پر فوقیت نہیں رکھتے ـــــ البتہ افغانیوں کے ہاتھ سے سلطنت ان کے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے نکل گئی ہے۔ چنانچہ اس نے افغانوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ جب اُسے اقتدار حاصل ہوا تو جو افغان فوج میں بھرتی سے انکار کرتا اس کے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی۔ اس طرح افغان دھڑا دھڑ شیر شاہ کی فوج میں بھرتی کے لئے آنے لگے۔

شیر شاہ کی فراست اور حاضر دماغی کا یہ حال تھا کہ رہتاس کے قلعے کی تعمیر کے درمیان خدشہ تھا کہ گکھڑ اس کی تعمیر میں خلل ڈالیں گے۔ قلعہ کی تعمیر کی ذمہ داری ایک ہندو ٹوڈرمل کے سپرد تھی وہ علاقہ کے لوگوں سے جبری مزدوری کرانا چاہتا تھا لیکن شیر شاہ تک بات پہنچی تو اس نے کہا قلعے کی تعمیر میں جو ایک اینٹ لگائے گا اسے ایک روپیہ دیا جائے گا ـــــ اس زمانے کے اعتبار سے ایک روپیہ فی اینٹ بہت بڑی اُجرت تھی۔ چنانچہ تمام گکھڑ خود بخود مزدوری پر لگ گئے اور قلعہ اتنی تھوڑی مدت میں تیار ہو گیا کہ جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔

❋❋❋

شہنشاہ اکبر

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر چودہ سال کا نوجوان تھا، تاہم وہ شروع ہی سے امورِ سلطنت سے وابستہ چلا آرہا تھا۔ باپ کی موت کے وقت وہ پنجاب کا گورنر تھا اور اپنے اتالیق بیرم خان کی نگرانی میں سرکاری فرائض انجام دے رہا تھا۔ بیرم خان بڑا جہاندیدہ شخص تھا۔ ہمایوں کی موت کی اطلاع ملتے ہی اس نے کلانور (مشرقی پنجاب) میں اکبر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ ۱۴ر فروری ۱۵۵۶ء کو رسم تاجپوشی انجام پائی۔ تاہم سلطنت کی باگ ڈور زیادہ تر بیرم خان کی ہاتھ میں رہی۔

اکبر کی تخت نشینی کے وقت حالات پرسکون نہ تھے۔ مغلوں کے قدم ابھی جمنے نہ پائے تھے اور پختون (سُوری) لوگوں کا زور ابھی ٹوٹا نہ تھا۔ سُوری بادشاہ عادل شاہ کھوئے ہوئے اقتدار کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس نے اپنے ہندو وزیر ہیمو بقال کو سیاہ وسفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ ہمایوں کے مرتے ہی ہیمو بقال نے پیش قدمی کر کے دہلی اور آگرہ پر قبضہ جما لیا۔ اور دہلی کے مغل گورنر تردی بیگ کو مار بھگایا۔ ہیمو اس کامیابی سے اتنا مست ہوا کہ عادل شاہ کو فراموش کر کے اس نے دہلی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر کے فرماں روا بن بیٹھا۔

یہ دیکھ کر بیرم خان آگے بڑھا۔ اس وقت تک اکثر مغل سردار بددل ہو چکے تھے، وہ ہندوستان میں قیام پر خوش نہ تھے اور واپس وطن جانے کے خواہشمند تھے، بیرم خان نے انہیں خاموش کرنے کے لئے سخت گیرانہ پالیسی اختیار کی اور سب کے سامنے تردی بیگ (گورنر دہلی) کو بزدلی دکھانے کی پاداش میں سُولی پر لٹکا دیا۔ اس کا حشر دیکھ کر باقی مغلیہ سرداروں نے چُپ سادھ لی۔ پھر بیرم خان نوج اکٹھی کر کے ہیمو بقال سے مقابلے کے لئے نکلا۔ پانی پت کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔

بالآخر اکبر اور بیرم خان کو فتح حاصل ہوئی۔ اور دہلی پر ایک بار پھر مغلوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

بیرم خان اس کامیابی پر آپے سے باہر ہو گیا اور اپنی من مانی کرنے لگا۔ چند سال تک اکبر نے اس کی زیادتیاں برداشت کیں لیکن ۱۵۵۹ء میں اسے معزول کر دیا، بعد میں بھی اکبر کو مختلف ریاستوں کے پختون اور اُزبک سرداروں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ علاوہ بریں اسے راجپوت راجوں کی بغاوتیں فرو کرنے میں بھی بڑا وقت لگا۔

ان کارروائیوں سے فارغ ہوتے ہی شہنشاہ اکبر نے سب سے زیادہ توجہ سرحدی علاقوں کی طرف دینی شروع کی۔ اکبر کی سلطنت کابل اور قندہار تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک شمال مغربی سرحدی علاقے کے قبائل اس کا ساتھ نہ دیں گے۔ افغانستان تک پہنچنا اور اس پر اقتدار قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔ ساتھ ہی اکبر کو یہ علم بھی تھا کہ ملک کی افواج میں زیادہ تر لوگ انہی سرحدی پہاڑی علاقوں سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ اگر یہ علاقے ہاتھ سے نکل گئے تو فوج کمزور ہو کر رہ جائے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان دنوں مغلیہ سلطنت کے سب سے بڑے حریف پختون لوگ ہی تھے اور اکبر کی حکومت کو سب سے بڑا خطرہ اُنہی سے لاحق ہو سکتا تھا۔ ان سبھی حقائق کو سامنے رکھ کر اکبر نے ایک واضح اور ٹھوس سرحدی پالیسی اختیار کی اور آخری دم تک اس پر عمل پیرا رہا۔

سرحدی علاقوں اور افغانستان کے متعلق جو مشکل ہمایوں کو پیش آئی تھی۔ شہنشاہ اکبر بھی اسی مشکل سے دوچار تھا۔ ہمایوں نے اپنی دریا دلی کی بنا پر کابل، قندہار اور غزنی کی حکومت اپنے بھائیوں کے سپرد کر دی تھی۔ جنہوں نے اس کا ساتھ دینے کی بجائے ہمیشہ اس کی راہ میں کانٹے بچھائے۔ اکبر تخت نشین ہوا تو اسے بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا تھا۔ کابل کی حکومت اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم کے سپرد تھی۔ وہ ایک نوعمر، ناتجربہ کار اور عیاش شخص تھا اسلیئے اس کی باگ ڈور اس کے ماموں فریدون کے ہاتھ میں تھی۔ فریدون کو ہوسِ اقتدار نے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ اکبر سے سارے ہندوستان کی حکومت چھین لینے کے منصوبے بنانے لگا۔

اکبر کی تخت نشینی کے چند سال بعد تک سرحدی علاقوں کے امور منعم خان کے ہاتھ میں تھے۔ بعد میں ضرورت کے تحت اسے دہلی بلا لیا گیا۔ تو میرزا حکیم کا ماموں فریدون سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ ۱۵۸۰ء کے موسم سرما میں حکیم خان نے صوبہ سرحد اور پنجاب پر کابل سے دو بار حملے کئے، دراصل

فریدون خان نے میرزا حکیم کو یہ تاثر دیا تھا کہ چونکہ "دین الٰہی" اختیار کر کے اکبر نے الحاد کی راہ اختیار کر لی ہے اس لئے رعایا اس سے تنگ آئی ہوئی ہے جونہی میرزا حکیم لاہور پہنچے گا لوگ اس کے استقبال کو نکلیں گے اور اکبر جیسے ملحد کی بجائے اس کا ساتھ دیں گے۔ پہلی مہم میں فریدون اکیلا ایک لشکر لے کر درۂ خیبر کی راہ پشاور سے ہوتا ہوا اٹک تک گیا، چونکہ اس بار اُس کی زیادہ مزاحمت نہ ہوئی۔ اس لئے کچھ عرصے بعد وہ پوری تیاری کے بعد تسخیر ہندوستان کے ارادے سے حملہ آور ہوا۔ اب کے لشکر کی قیادت خود میرزا حکیم کر رہا تھا۔ اٹک کو پار کرنے کے بعد میرزا حکیم نے رہتاس کے قلعہ پر حملہ کیا۔ قلعہ کو ناقابلِ تسخیر دیکھ کر اس نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ کسی نہ کسی طرح لالچ دے کر قلعہ دار کو اپنے ساتھ ملا لے تاہم قلعہ دار ڈٹا رہا اور اس نے اکبر بادشاہ سے غداری کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر میرزا حکیم رہتاس سے محاصرہ اٹھا کر لاہور کی طرف چل دیا، وہ لاہور کے باہر ایک باغ میں کئی دن مقیم رہا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ خود آ کر اس کے ساتھ مل جائیں گے۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے لاہور کے صوبہ دار مان سنگھ پر دورے ڈالنے شروع کر دیئے، مان سنگھ اکبر کا انتہائی وفادار تھا۔ وہ مقابلے پر ڈٹا رہا۔

ادھر جب میرزا حکیم کے اس حملے کی خبر اکبر کو ملی تو وہ بنگال میں باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اگرچہ وہاں کے باغیوں کی سرکوبی بھی سلطنت کے استحکام کے لئے بیحد لازم تھی تاہم اکبر نے شمال مغربی سرحدی علاقوں کو زیرِ نگیں رکھنے کی طرف اوّلین توجہ دی اور فوراً لاہور کی طرف چل پڑا۔ میرزا حکیم بزدل تو تھا ہی جونہی اسے اکبر کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بوریا بستر اُٹھا کر لاہور سے کابل کو چل پڑا ـــــ تاہم اکبر نے اس کا تعاقب ضروری سمجھا اور اس کی گوشمالی کا پکا ارادہ کر لیا۔

فروری ۱۵۸۱ء کو اکبر ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ فتح پور سیکری سے کابل جانے کے ارادہ سے نکلا۔ سرہند شریف پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ میرزا حکیم پسپا ہو چکا ہے تاہم اکبر نے یہی فیصلہ کیا کہ پیش قدمی جاری رکھی جائے، لاہور میں چند دن ٹھہر کر اکبر جمعہ ۱۵۸۱ء کو دریائے سندھ کے کنارے اٹک کے مقام پر پہنچا۔ گرمی ان دنوں اپنے جوبن پر تھی اور دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُسے ان دنوں پار کرنا موت کو دعوت دینا تھا چنانچہ شہنشاہ اکبر کو پچاس دن تک وہیں رُکنا پڑا۔ اٹک کی کلیدی حیثیت کے مدِنظر اس نے وہاں دریا کے کنارے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور راجہ بیربل کو اس

تعمیری منصوبے کا انچارج مقرر کر دیا۔

اٹک کے قیام کے دوران اکثر سرداروں نے بادشاہ کو یہی رائے دی کہ مہم کا مقصد چونکہ پورا ہو چکا ہے اس لئے واپسی کا سفر اختیار کرنا بہتر ہوگا۔ تاہم اکبر ہر قیمت پر کابل پہنچنے پر تلا ہوا تھا۔ دریا کا پانی کچھ کم ہوا تو شاہی فوج کے چیف انجینئر قاسم خان نے اس پر کشتیوں کا پل باندھا۔ چنانچہ فوج نے اسی پل کے ذریعے دریا کو پار کیا ـــــ اکبر نے مصلحتاً راجہ مان سنگھ کو فوج دے کر آگے بھیجا کہ راہ کی رکاوٹیں دور کرے۔ مان سنگھ پشاور پہنچا تو میرزا حکیم شہر کو خالی کر چکا تھا بلکہ خالی کرنے سے پہلے شہر کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ کچھ دن پشاور میں رہ کر مان سنگھ نے درہ خیبر کی راہ لی۔ شہزادہ مراد بھی اس مہم میں اس کے ہمراہ تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب درہ خیبر میں ایسی سڑک بنائی گئی جس پر گاڑیاں گزر سکتی تھیں۔ راستہ بڑا دشوار گزار اور چٹانوں سے اٹا ہوا تھا تاہم شاہی فوج کے چیف انجینئر نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک عمدہ سڑک تعمیر کر دی۔ شہنشاہ اکبر قاسم خان کے اس کارنامہ سے اتنا خوش ہوا کہ بعد میں اسے ترقی دے کر کابل کا گورنر بنا دیا۔ درہ خیبر سے گزرتے وقت شاہی فوج کو مقامی قبائل کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت بایزید انصاری (پیر روشن یا پیر تاریک) کے جانشین نے اپنے بہت سے پیروکاروں کے ساتھ منسلیہ لشکر کے خلاف کارروائی کی تاہم شاہی فوج کی کثیر تعداد کی وجہ سے ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ لیکن بعد میں انہوں نے مغلوں سے بدلہ لے ہی لیا۔

درہ خیبر اور جلال آباد سے ہوتا ہوا اکبری لشکر کابل کی طرف بڑھا تو میرزا حکیم کے ماموں فریدون کی کمان میں اس پر دو حملے کئے گئے تاہم شاہی سپہ سالار مان سنگھ نے نہ صرف ان حملوں کو پسپا کر دیا بلکہ آگے بڑھ کر شہر کابل بھی فتح کر لیا۔ فریدون اور میرزا حکیم بھاگ نکلے اور پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ادھر سے شہنشاہ اکبر بھی پوری شان سے کابل پہنچا اور ۹ اگست ۱۵۸۱ء کو فتح کے شادیانے بجاتا شہر میں داخل ہو گیا ـــــ میرزا حکیم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اکبر بادشاہ کے سامنے پیش ہو کر معافی کا خواستگار ہوا۔ اکبر نے فراخدلی سے اسے معاف کر دیا اور کابل کے صوبے کا الحاق سلطنت دہلی سے ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر اکبر نے اپنے روایتی تدبر اور فراست سے کام لیا۔ اسے معلوم ہو چکا

تھا کہ کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے میرزا حکیم کا کام تمام ہو چکا ہے اور وہ چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس لئے اس کا خون اپنے سر لینا خلافِ مصلحت ہوگا۔ اکبر کی پیش بینی درست ثابت ہوئی اور فی الواقع میرزا حکیم چند سال بعد اپنی موت مر گیا اور کابل کا صوبہ مکمل طور پر اکبر کی تحویل میں آگیا۔

اس سارے عرصے میں اکبر بادشاہ کو چونکہ بنگال، بہار اور دوسرے ہندوستانی علاقوں کی طرف سے متواتر تشویش لاحق تھی اس لئے کُل سات دن تک کابل میں قیام کرنے کے بعد وہ واپس چل پڑا۔ واپسی سفر کے دوران اس نے پشاور میں مختصر قیام کیا اور قلعہ بالاحصار کی مرمت کا حکم دیا۔ اٹک پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ قاسم خان نے کشتیوں کے پُل کی تعمیر کا کام مکمل کر لیا تھا اور قلعے کے تعمیراتی منصوبے پر بھی کام تسلی بخش طریق سے جاری تھا، متواتر کوچ کرتے ہوئے اکبری لشکر دسمبر ۱۵۸۶ء کو واپس آگرہ (دارالحکومت) جا پہنچا۔

شاہی لشکر کے جاتے ہی پیر روشان کے مُریدوں نے پھر سر اٹھایا اور اپنے قائد جلالہ (جلال الدین) کی سرکردگی میں متحد ہو کر پشاور کے قلعہ پر ہلہ بول دیا۔ اب کے ان کا حملہ اتنا شدید تھا کہ قلعہ دار سیّد حامد کو جس نے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا چاہا تھا۔ قبائلی لشکر نے قتل کر دیا اور شاہی فوجوں کو سخت نقصان پہنچایا۔

جب یہ خبر کابل کے مغل گورنر راجہ مان سنگھ کو پہنچی تو وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ کابل سے چل پڑا۔ اُدھر قلعہ اٹک کی فوج بھی حرکت میں آگئی۔ پروگرام یہ تھا کہ دونوں فوجیں خیبر کے پاس ایک دوسرے سے مل جائیں اور متحد ہو کر سرحدی قبائل کے خلاف کارروائی میں حصّہ لیں تاہم کابل سے آتے ہوئے راجہ مان سنگھ ننگرہار کے مقام بولاق میں بیمار پڑ گیا جس سے فوجی کارروائی میں تاخیر واقع ہو گئی۔ اُدھر اس تاخیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشاور کے مہمند اور خلیل قبیلے جو قلعہ دار سیّد حامد پر فتح پا چکے تھے اور بھی دلیر ہو گئے۔ انہوں نے درّہ خیبر پہنچ کر وہاں خندقیں کھود لیں اور مورچہ بندیاں قائم کر لیں۔ اس طرح انہوں نے درّے کا راستہ بالکل مسدود کر دیا۔

راجہ مان سنگھ کو ان کارروائیوں کا پتہ چلا تو وہ سمجھ گیا کہ درّہ خیبر کے راستے پیش قدمی مشکل ہو گی اس لئے اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وادیٔ باناری کی راہ آفریدی علاقہ میں داخل ہو کر تاریکیوں کے مرکزِ اعلیٰ تیراہ پر حملہ آور ہو۔ جلالہ نے کافی تیاری کر رکھی تھی۔ اس کے پیروکار دائیں بائیں ہر طرف سے مغل

لشکر پر حملے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ علی مسجد کے پاس تو مان سنگھ کا لشکر پوری طرح ان کے گھیرے میں آگیا۔ تاہم مان سنگھ نے ہمت نہ ہاری اور وہ نقصان اٹھانے کے باوجود درۂ خیبر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا، جلالہ کو اس کامیابی پر اور بھی شہرت حاصل ہوگئی اور اس نے "شاہِ افغان" کا لقب اختیار کر کے صوبہ سرحد پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے کوششیں تیز تر کر دیں۔

جہاں تک صوبہ سرحد کی سیاسی صورتِ حال کا تعلق ہے اکبر کے عہدِ حکومت میں پشاور اور مردان کے زرخیز علاقوں میں یوسف زئی سب سے طاقتور قبیلہ شمار کیا جاتا تھا۔ دوسرے قبائل ان کی اس بالادستی سے خائف تھے اور اندر ہی اندر حکومت وقت کو ان کے خلاف شکائتیں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں شہنشاہ اکبر اٹک کے مقام پر فروکش تھا، خلیل اور مہمند قبائل کا ایک جرگہ اس کے سامنے پیش ہوا اور اسے بتایا کہ شاہی سڑک پر آئے دن جو ڈاکے پڑتے رہتے ہیں۔ ان کا الزام پشاور کے نواحی قبیلوں (خلیل، مہمند اور دلاناک) پر عائد کیا جاتا ہے تاہم اصل میں یہ کام دریائے کابل سے شمال کو بسنے والے یوسف زئی اور مندانڑ کرتے ہیں۔ تاہم چونکہ وہ لوگ زیادہ طاقتور اور بارسوخ ہیں۔ کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔ خیال ہے کہ خلیل اور مہمند اس طرح سیاست سے کام لے کر اکبر بادشاہ کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانا چاہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اکسا کر یوسف زئی کے خلاف جنگ میں الجھانا چاہتے تھے۔

بہرحال اکبر نے سرحدی پالیسی کے سلسلے میں بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اس نے اٹک سے پشاور تک شاہراہ اعظم (جی۔ ٹی۔ روڈ) کی مؤثر حفاظت کے لئے قبیلہ حسن خیل خٹک کے ملک درویش محمد عرف ملک چنجو کے بیٹے ملک اکوڑ خان کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ ملک اکوڑ نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ یہ سڑک مسافروں اور شاہی فوجوں کے لئے کھلی رکھے گا۔ اس خدمت کے معاوضے میں بادشاہ اکبر نے خیر آباد سے نوشہرہ تک کا تمام علاقہ بطور جاگیر ملک اکوڑ کو دے دیا۔ اسی ملک اکوڑ کے نام پر اس کے گاؤں کو پہلے "ملک پورہ" اور بعد میں اکوڑہ خٹک کہا جانے لگا۔ مشہور دانشور اور صاحب سیف و قلم سردار خوشحال خان خٹک اسی ملک اکوڑ کا پوتا تھا۔

دوسری طرف یوسف زئی قبیلہ کو ساتھ ملانے کی خاطر اکبر نے اس کے سرداروں سے رسم و راہ بڑھائی ــــ "آئینِ اکبری" کے مطابق اکبر یوسف زئی سردار کالو خان کو اپنے ہمراہ آگرہ لے گیا جہاں

اسے بہت عزت و احترام سے رکھا۔ تاہم جانے کیا بات ہوئی کہ کالو خان وہاں سے بھاگ آیا۔ لیکن اٹک پہنچنے پر بادشاہ اکبر کے ایک عہدہ دار شمس الدین خوافی نے اسے پہچان لیا اور گرفتار کر کے واپس آگرہ بھیج دیا۔ بادشاہ نے دوبارہ بھی اس کی بڑی خاطر مدارات کی لیکن کالو خان کو مغل دربار میں رہنا پسند نہ تھا اس لئے پھر وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور وطن واپس آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سردار کالو خان نے یوسف زئی قبیلہ کو مغلوں کے خلاف جنگ پر اکسایا جس کے نتیجے میں ہزاروں آدمی مارے گئے اور بڑا مالی نقصان ہوا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیر بایزید انصاری کے کچھ ساتھی یوسف زئی قبیلہ کی حمایت حاصل کرنے ان کے علاقہ میں گئے تھے جس سے مغلوں کو یوسف زئی پر حملے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ ۱۵۸۶ء کے ابتدائی دنوں میں مغل دربار کی طرف سے ایک بہت بڑے لشکر کو زین خان کوکہ کی کمان میں یوسفزئی کے مرکزی علاقہ (سوات، باجوڑ اور بُنیر) کی طرف بھیجا گیا۔ لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ چکدرہ کی راہ سے، دوسرا سدوم کی جانب سے اور تیسرا صوابی سلیم خان کے مواضعات کی طرف سے پیش قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ راجہ مان سنگھ کے بعد زین خان کو سب سے بڑا سالار خیال کیا جاتا تھا۔ وہ یوسف زئی کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا۔ تاہم یوسف زئی نے اس پر سخت دباؤ ڈالے رکھا۔ مجبور ہو کر زین خان نے مغل دربار سے مزید کمک طلب کی، اس نے بتایا کہ وہ باجوڑ میں داخل تو ہو گیا ہے تاہم مزید کمک حاصل کئے بغیر سوات کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتا۔ اس نے مغل دربار کو یہ تجویز بھی بھیجی کہ آنے والی فوجوں کو چاہیئے کہ وہ سمہ (ضلع مردان) میں مندڑ قبیلے کی بستیوں کو تباہ کرتی آئیں تاکہ وہاں کے لوگ اپنے پہاڑوں میں بسنے والے بھائی بندوں کی مدد نہ کر سکیں۔ اکبر نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور دو فوجی دستے کمک کے طور روانہ کئے ان میں ایک دستے کی قیادت اکبر کا چہیتا مصاحب بیربل کر رہا تھا جب کہ دوسرے کی کمان اکبر کے ایک اور رتن حکیم ابوالفتح کے سپرد تھی۔ راجہ بیربل اپنی بذلہ سنجی اور مجلس آرائی کی وجہ سے اکبر سے بے تکلف تھا۔ فوجی اور جنگی منصوبہ بندی اس کا کام نہ تھا۔ حکیم ابوالفتح تجربہ کار شخص تھا۔ بنگال کا گورنر رہ چکا تھا لیکن جہاں تک پہاڑی لڑائیوں کا تعلق تھا وہ بھی بالکل کورا تھا۔ لے دے کے تینوں کمانڈروں میں سے زین خان ایک بہادر اور مہم جو شخص تھا۔

زین خان نے دانائی دکھائی۔ میدانی قبائل سے اُلجھنے کی بجائے اس نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ نالاش کے راستے سوات پہنچا اور چکدرہ کے مقام پر (جہاں آجکل دریا پر پُل بنا ہوا ہے)۔ مورچے بنانے میں کامیاب ہوگیا، اسی مرکز سے اس نے درّہ مالاکنڈ پر بھی قبضہ جما لیا۔ اس درّہ پر کنٹرول کی وجہ سے بیربل اور حکیم ابوالفتح کی فوجیں بھی علاقہ سوات پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں — اس طرح ایک ایک کرکے تینوں فوجی دستے چکدرہ کے مقام پر اکٹھے ہوگئے — بدقسمتی سے تینوں کمانڈروں کی رائے مختلف تھی، وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل ان میں ناپید تھی۔ زین خان نے بیربل کو جو بھی مشورہ دیا اس نے اس پر کان نہ دھرا، بالآخر یہی طے پایا کہ شاہی فوج کے تینوں دستے اپنے اپنے امیر کے تحت درّہ کڑاکڑ کے راستے بونیر کی طرف بڑھیں اور وہاں پہنچ کر قبائل کی سرکوبی کریں۔

چکدرہ سے روانہ ہونے کے ۲ دن بعد جب مغل لشکر بیرکوٹ سے گزر کر درہ کڑاکڑ کے شمالی جانب پہنچا تو یوسف زئی بہادروں نے سخت مزاحمت کی۔ زین خان مشاق شخص تھا۔ اس نے یوسف زئی جوانوں کے حملوں کو نہایت دلیری سے پسپا کر دیا بلکہ چار قبائلی سرداروں کو بندوق سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بھٹنی قبیلے کا ایک بہادر نوجوان حسن خان زین خان کے محافظ دستے کا سالار تھا۔ وہ پہاڑی اور قبائلی گوریلا جنگ کی تکنیک سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کی اس واقفیت سے بڑا فائدہ ہوا۔ اور زین خان لڑتے بھڑتے اپنے لشکر سمیت پہاڑ کو پار کرکے بونیر پہنچ گیا تاہم اسے بخوبی علم تھا کہ کڑپہ اور ملندری کی چڑھائیاں ابھی سخت تھیں۔ شاہی فوج ڈگر کے جنوب میں کڑپہ کی چوٹی پر پہنچ کر کچھ مطمئن ہوگئی لیکن بعد میں جب انہیں پتہ چلا کہ آگے ملندری کا درّہ اور بھی تنگ اور خطرناک گھاٹی سے ہوکر گزرتا ہے تو انہیں سخت مایوسی کا سامنا ہوا۔ پہاڑی چوٹیوں پر یوسف زئی جنگ آزما مورچے سنبھالے بیٹھے تھے، جونہی بادشاہی لشکر گھاٹی میں داخل ہوا ہر چٹان اور ہر چوٹی سے پتھراؤ شروع ہوگیا۔ جس کسی کو پتھر آکر لگتا وہیں ڈھیر ہو جاتا، سارے لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ گھوڑوں، ہاتھیوں اور سپاہیوں کی لاشوں سے راستہ اٹ گیا، آگے بڑھنے کا راستہ نہ پاکر مغل سپاہی کھڈوں میں گرنے لگے، زین خان کا ہراول دستہ تو قدرے محفوظ رہا لیکن بیربل اور ابوالفتح کے دستوں کا بُرا حال تھا۔ انہوں نے ایسی لڑائیاں بھلا کب دیکھی تھیں؟

مغلوں کا خیال تھا کہ شام ہوتے ہی لڑائی تھم جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا یوسف زئی لڑاکے اندھیرے میں بھی بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے۔ اسی عالم میں بیربل پر حملہ ہوا اور وہ مارا گیا۔ اس کی لاش تک نہ مل سکی۔ حسن خان بھٹنی بھی لڑتے لڑتے ہلاک ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ اس ایک معرکے میں مغلوں کے آٹھ ہزار سپاہی جان سے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

زین خان اور حکیم ابوالفتح ملندرئے کی چوٹی پر پہنچے اور رات وہیں گزاری، ان کا خیال تھا کہ صبح ہوتے ہی پھر لڑائی چھڑ جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ یوسف زئی چھاپہ مار چونکہ جی بھر کر قتل و غارت گری کر چکے تھے، بہت سا مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا تھا۔ اس لئے صبح ہونے ہی مال و دولت سمیٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

زین خان اور حکیم ابوالفتح بچے کھچے لشکر کو لے کر واپس ہوئے اور اس واقع کے تیسرے دن بعد اٹک پہنچے، بادشاہ اکبر اس وقت اٹک ہی میں مقیم تھا اسے اس شکست اور خاص طور پر بیربل کی موت سے اتنا صدمہ پہنچا کہ دو روز تک اس نے زین خان اور ابوالفتح کو ملاقات کی اجازت نہ دی، تیسرے روز خبر آئی کہ یوسف زئی اور مندانڑ کے لشکر اٹک کی طرف بڑھ رہے ہیں تب کہیں جا کر بادشاہ نے دونوں سرداروں کو ملاقات اور بات چیت کے لئے بلایا۔ یہی طے پایا کہ زین خان اور ابوالفتح شہزادہ مراد کے ہمراہ پھر لشکر لے کر جائیں اور یوسف زئی حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ اب کے مقابلہ میدانی علاقے میں ہوا اور یوسف زئی اکبر کی منظم فوجوں کے مقابلے میں جم کر نہ لڑ سکے، اکبر نے اب احتیاطی تدابیر کی طرف توجہ دی اور ضلع مردان کے مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں اور قلعے قائم کر دیئے، اس طرح کی ایک چوکی ہوتی مردان سے چھ میل دور گڑھی کپورہ میں قائم کی گئی۔ دوسری طور دہ کے قریب ننگرکوٹ کے مقام پر اور تیسری چوکی دریائے سندھ کے گھاٹ (مَنبر) ہنڈ میں بنائی گئی۔

اس جنگ میں رزڑ قبیلے کا سردار مردان خان و جلال خان ولد ولی بیگ بھی شہید ہوا۔ اس کا مزار پنجتار سے کوئی ایک میل کے فاصلہ پر ہے، دوسرا قابلِ ذکر شہید خضر زئی کا سلیمان خان ولد ماما خان تھا جس کی یاد میں ایک تالاب سلیمان بابا ڈھنڈ اب بھی مشہور ہے۔

۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۲ء تک باجوڑ، سوات، بونیر اور یوسف زئی کے دوسرے علاقوں پر اکبر

کی فوجوں نے کئی بار حملے کئے تاہم انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ سوات۔ باجوڑ اور بونیر پر مغلوں کا تسلط عملاً کبھی قائم ہونے نہ پایا اور نہ ان علاقوں کے لوگوں نے مغل شہنشاہ کو کبھی کوئی ٹیکس ادا کیا ـــــ بنوں۔ ڈیرہ اور عیسیٰ خیل کے علاقے بھی برائے نام تو مغلیہ قلمرو میں شامل تھے لیکن اندرونی طور پر بالکل آزاد تھے اور کوئی ان سے مالیہ یا دوسرے واجبات وصول نہ کر سکتا تھا۔

اُدھر بایزید انصاری کے پیروکاروں نے پھر زور پکڑ لیا۔ ان کی ہمت اتنی بڑھی کہ ایک بار انہوں نے پشاور پہنچ کر وہاں کے قلعہ دار کا گھیراؤ کر لیا، اٹک سے زین خان فوج لے کر آیا تب کہیں پشاور کے قلعے کو واپس لینے میں کامیاب ہو سکا۔

تنگ آکر ۱۵۹۲ء میں اکبر نے "تاریکیوں" کے خلاف ایک آخری مُہم بھیجی، یہ مُہم مغلیہ نقطہ نظر سے بڑی کامیاب رہی، چودہ ہزار "تاریکی" گرفتار کر لئے گئے، گرفتار ہونے والوں میں فرقہ کے قائد جلالہ کے بیوی بچے بھی تھے تاہم جلالہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اب اپنی سرگرمیوں کا رُخ غزنی کی طرف موڑ دیا۔ بنوں۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور وزیرستان سے بھاری جمعیت لے کر اس نے غزنی پر حملہ کیا اور وہاں کے مغل گورنر شریف خان کو نکال باہر کیا۔ بہت سا مالِ غنیمت جلالہ اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ لگا۔ جلالہ اپنے مذہبی تقدس کی بنا پر سارا مالِ غنیمت خود رکھنا چاہتا تھا لیکن مہم میں شریک باقی قبائل اس سے اپنا حصہ طلب کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں جلالہ کے پیروکاروں اور ہزارہ قبائل کے گوریلوں میں جھڑپ ہو گئی اور جلالہ گولی لگنے سے فوت ہو گیا۔ اس پر اس کی جگہ احداد (اغلباً عبدالاحد) نے "تاریکیوں" کی کمان سنبھال لی۔

ان فوجی مہموں سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ بادشاہ بننے کے ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر اکبر متواتر صوبہ سرحد کے قبائل کو رام کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا تاہم اُسے اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی ـــــ بہر حال اکبر نے سرحدی پالیسی کو اپنے دور کا اہم ترین مسئلہ سمجھ کر اس کی جانب پوری توجہ دی، یہاں تک کہ ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۹ء تک سولہ سال کا عرصہ اس نے آگرہ کی بجائے لاہور ہی میں گزارا، تاکہ ذاتی طور پر سرحد کے خلاف فوجی مہموں کی نگرانی کر سکے۔ شمالی پنجاب کے قبائل بھی مغل شہنشاہ کے لئے دردِ سر بنے رہے چنانچہ آدم خان (سلطان گکھڑ) نے لاہور کے دربار میں حاضر ہو کر اکبر سے سند سلطانی حاصل کی، بعد میں حبیب کمال خان

نے بھی ان علاقوں پر دعویٰ کیا تو بادشاہ نے آدھا آدھا ملک تقسیم کرنے کا حکم جاری فرمایا لیکن آدم خان نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بادشاہ نے سارے کا سارا علاقہ کمال خان کے حوالے کر دیا اور گکھڑ سردار آدم خان کو نظر بند کر دیا گیا۔

اکبر پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے کشمیر کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیا، ابوالفضل نے کشمیر کی اس مہم کا تفصیلی ذکر کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ کشمیر کے سفر میں ایک جگہ برف باری شروع ہو گئی۔ اکثر ہندی سپاہیوں کے لئے برف گرتے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لئے اگرچہ انہیں سردی کا تکلیف تو اٹھانی پڑی تاہم اس نظارے سے خوب محظوظ ہوئے۔ مغلوں کے زمانے میں بلکہ انگریزوں کی آمد تک ہزارہ کا علاقہ ولایت کشمیر سے ملحق تھا۔ چنانچہ اکبری لشکر ہزارہ ہی کے راستے واپس آیا۔ اس سلسلے میں ابوالفضل نے دھمتوڑ، پکھلی، حسن ابدال اور دوسرے مقامات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

حسن ابدال کا مقام اپنے خوبصورت باغات، صاف شفاف پانی کے چشموں اور وسیع میدانوں کی وجہ سے اکبر کو بہت پسند تھا۔ اکثر مغل شہنشاہ لاہور سے کابل یا پشاور آتے جاتے ہوئے حسن ابدال پر پڑاؤ کرتے۔ فتح کشمیر کے بعد بھی مغل فرمانروا نے یہاں کافی دن قیام کیا۔ اس کے دو مقرب مصاحبین حکیم ابوالفتح گیلانی اور حکیم ہمام حسن ابدال ۱۵۸۹ء اور ۱۵۹۵ء میں یہاں مدفون ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ شمس الدین گورنر لاہور نے حسن ابدال کے پُرفضا مقام پر ایک تالاب بنوایا تھا۔ اس کے پاس ہی اس نے ایک عمدہ جگہ دیکھ کر ایک قبر اپنے لئے بنوائی تھی لیکن کشمیر سے واپسی پر جب یہ معزز درباری وفات پا گئے تو شہنشاہ کے حکم سے انہیں حسن ابدال کے اسی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ حسن ابدال میں ایک باغ لالہ رُخ ہے جس کے بارے میں یہ داستان مشہور ہے کہ لالہ رُخ شاہ جہان کی ایک چہیتی کنیز تھی جو یہاں فوت ہو گئی اس کے مرنے پر بادشاہ نے اسے باغ دلکشاء میں دفن کرایا اور اس کی قبر پر مقبرہ بنوا دیا۔ تاہم اس قصے کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کو قابو میں رکھنے اور سرحدی قبائل کی پیش قدمی روکنے کے لئے اکبر کی طرف سے ایک اہم اقدام اٹک کے مقام پر قلعہ کی تعمیر تھی، ۱۵۸۰ء میں جب اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم نے کابل میں بغاوت کر دی اور اکبر اس کی سرکوبی کے سلسلے میں حسن ابدال سے کوچ

کر کے اٹک پہنچا تو دریائے سندھ پوری طغیانی پر تھا۔ اس لئے پچاس دن تک شاہی فوجوں کو یہاں اٹکنا پڑا۔ شاید تبھی سے اس مقام کا نام اٹک پڑ گیا۔ اس وقت دریا کو عبور کرنے کے لئے اکبر کے چیف انجینئر قاسم خان نے کشتیوں کا پل تعمیر کر دیا۔ علاوہ ازیں بادشاہ کے حکم سے بہت سے ملاح لاکر قلعہ کے پاس آباد کر دیئے گئے، ملاحوں کی وجہ سے یہ بستی "ملاحی ٹولہ" کہلانے لگی۔ اکبر نے ان مشاق ملاحوں کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔ یہ گاؤں اب بھی دریا کے بائیں کنارے پر موجود ہے۔

اس کے ساتھ ہی شہنشاہ نے اٹک کے مقام پر ایک مضبوط قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ شروع میں راجہ بیربل قلعے کی تعمیر کا انچارج تھا لیکن بعد میں قلعہ خواجہ شمس الدین خوافی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ جسے بعد میں اس خدمت سے خوش ہو کر پنجاب کا دیوان بنا دیا گیا۔ اکبری عہد کے مشہور مؤرخ بدایونی کا کہنا ہے کہ اس سے قبل شہنشاہ اکبر نے اڑیسہ میں ایک عظیم قلعہ تعمیر کرایا تھا جسے کٹک بنارس کہتے تھے۔ اب جو یہاں قلعہ بنا تو اسے اٹک بنارس کا نام دیا گیا۔ فارسی کی اکثر کتابوں میں اسے اٹک بنارس ہی لکھا گیا ہے۔ بعد میں افغانستان اور صوبہ سرحد کی فوجی مہموں کے سلسلے میں اس قلعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

قلعہ اٹک کافی وسیع ہے اور دریا کے کنارے پھیلتا چلا گیا ہے۔ قلعہ کافی بلندی پر ہے اور اس کے گرد اگرد فصیل ہے جس میں جنگ کے وقت پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لاہور اور دہلی کے قلعوں میں حکمرانوں کے محل بھی ہوا کرتے تھے لیکن اس کے برعکس قلعہ اٹک میں رہائشی انتظامات نہیں، فصیل کافی مضبوط ہے جس کے ساتھ ساتھ اندر کو تنگ گیلری ہے جہاں محافظ گشت کر سکتے ہیں۔ شمال کی طرف ایک برج اور ایک بارہ دری بنائی گئی ہے، قلعے کے پرانے دروازے اب استعمال نہیں کئے جاتے تاہم تین دروازوں کے آثار باقی ہیں۔ شمال کے رخ دہلی دروازہ تھا۔ جنوب میں کابلی دروازہ اور مغرب کی جانب بڑا دروازہ تھا جسے پانی والا دروازہ کہتے تھے۔ ملاحی ٹولہ کی جانب بھی ایک دروازہ کھلتا تھا۔ قلعہ کا موجودہ صدر دروازہ موری گیٹ کہلاتا تھا۔ یہ انیسویں صدی کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے علاوہ ازیں قلعے میں کچھ تہہ خانے بھی تھے جو اب استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ کہا جاتا ہے کہ قلعے سے ایک سرنگ پانی کے نیچے سے خیر آباد تک بنائی گئی تھی جو ہنگامی حالات میں کام آتی تھی۔ میرزا ابراہیم بیگ اٹک کا پہلا گورنر تھا۔

قلعہ کے پاس شمال کو ایک چوکور عمارت کے آثار ہیں جسے "بیگم سرائے" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ شاہی لشکر کوچ کرتا تو بیگمات کے خیمے یہاں نصب کئے جاتے تھے۔ قلعہ اٹک کے آس پاس سکھ دور کی کچھ عمارتوں کے آثار بھی ہیں اور ایک گورا قبرستان بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ مغلوں کے دور سے اب تک اس قلعہ کو سیاسی قید خانے کے طور بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

قلعے کے شمال کو دریا کے عین کنارے حضرت جی علیہ الرحمتہ کا مزار ہے، یہ بزرگ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد سے تھے اور ان کا نام نامی شیخ محمد یحییٰؒ تھا۔ سڑک سے دائیں طرف سخی سلطانؒ نامی بزرگ کا مقبرہ بھی ہے۔ آج کل قلعے میں خوبصورت سی مسجد بنا دی گئی ہے جس کا اکلوتا مخروطی مینار بہت بھلا دکھائی دیتا ہے۔ قلعے میں اب پاکستان کی دفاعی فوج کے دستے متعین ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ اکبر شروع ہی سے پختون قبائل کی جنگی صلاحیتوں کا دلی قائل تھا۔ اس لئے اُس نے انہیں اہم عہدے دے رکھے تھے اس کے حلقہ امراء میں ملک مصطفیٰ خان (باز بہادر کا بھائی) فتح خان مسند عالی، حسن خان بھٹنی، حاجی خان۔ سید خان کرلانڑی، شہباز خان نیازی، ابراہیم خان میانہ، ابراہیم خان کاکڑ، محمود خان نیازی، حبیب اللہ سوری، فتح خان سوری، دولت خان لودھی جیسے پختون اکابر شامل تھے۔ تاہم بعد میں جب اکبر نے "دینِ الٰہی" کے نام سے ایک خود ساختہ مذہب بنا ڈالا تو پختون لوگ (جو سب کے سب پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے) اُسکے دشمن بن گئے، یہاں تک کہ یوسف زئی اور دوسرے سرحدی قبائل اکبر کے خلاف لڑائیوں کو جہاد سمجھتے ہوئے اس میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

جہانگیر کے زمانے میں بھی جن لوگوں نے مغل فرمانرواؤں کی بے راہ روی کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک کا ساتھ دیا۔ وہ زیادہ تر پختون ہی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختون مغل دشمنی بڑھتی ہی گئی اور اکبر کے جانشینوں جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب کا زیادہ وقت بھی سرحدی قبائل کی شورشوں کو دبانے میں گزرا۔

پیر روشن یا پیرِ تاریک

سولہویں صدی عیسوی کے رُبع آخر اور سترھویں صدی میں ایک مذہبی اور سیاسی تحریک نے تاریخ صوبہ سرحد کے اوراق پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس تحریک کے بانی بایزید انصاری بڑی پُراسرار لیکن بااثر شخصیت کے مالک تھے ان کے مختلف لوگوں کے محاکموں میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے سید علی ترمذی (پیر بابا) اور حضرت اخوند درویزہؒ کے نزدیک بایزید ملحدانہ خیالات کا علمبردار تھا۔ پیر بابا کے پیروکاروں کے نزدیک بایزید "پیر تاریک" تھا اور اُن کے ساتھی تاریکی۔ جب کہ دوسرا گروہ اُسے بڑا صاحب کرامت بزرگ تصور کرتا۔ اور اسے "پیر روشن" کے لقب سے پکارتا تھا۔ ان کے نزدیک بایزید کے متبعین "روشنائیہ" یا روشنی پھیلانے والے ہیں۔

مشہور دانشور سرفراز خان خٹک ایڈووکیٹ "تاریخ خٹک" میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "پیر روشان (بایزید انصاری) اصلاً اسمٰعیلی (سبعی، باطنی) مذہب کا ماننے والا تھا۔ بنگشوں آفریدیوں اور توریوں میں اب جو لوگ اہل تشیع عقائد رکھتے ہیں وہ پہلے پیر روشان کے مرید تھے لیکن بعد میں شیعہ مبلغین کی کوششوں سے اثناعشری عقیدہ اختیار کر گئے"

عقاب صاحب کے نزدیک "باطنی عقیدے کا علمبردار ہونے کے علاوہ بایزید انصاری وحدت الوجود کا بھی قائل تھا بلکہ اس کا وحدت الوجود کا نظریہ اشتمالیت کی حدوں کو چھوتا تھا، وہ زر، زن اور زمین کو سبھی کی مشترکہ ملکیت سمجھتا تھا۔ اپنے مریدوں کو اس کا حکم تھا کہ جو تمہیں مال و زر نہ دے اس سے زبردستی چھین لو، اس کا کہنا تھا کہ عورتیں پھولوں کی طرح ہیں جنہیں ہر کوئی توڑ کر سونگھ سکتا ہے —— اس کے مریدوں میں عورتیں بھی شامل تھیں، جو بلا روک ٹوک مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اس قسم کی آزادی اور نظریات کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بخوشی اس گروہ میں شمولیت اختیار

کر لیتے تھے۔"

عقاب خٹک کا بیان ہے کہ "خٹک کبھی بایزید انصاری (پیر روشن یا پیر تاریک) کے ارادتمند نہیں رہے البتہ بنگش، آفریدی، اورک زئی، تورى اور دوسرے چند قبیلوں کے لوگوں نے اس کا ساتھ ضرور دیا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ یوسف زئی، محمد زئی، خلیل اور مہمند بھی اس کے ہم نوا تھے۔"

"اخوند درویزہؒ کے "تذکرۃ الابرار والاشرار" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر روشان کے اکثر مریدوں کو کشفِ جبنوفی حاصل تھا۔"

مفسرِ قرآن حافظ محمد ادریس مرحوم (صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی) کا کہنا ہے کہ

"بایزید اپنے خیالات کے لحاظ سے بے حد انتہا پسند تھے۔ جن دنوں ریاضت میں منہمک ہوتے بقول حضرت اخون درویزہؒ راہ چلتے ہوئے اس بات تک کا خیال رکھتے کہ کوئی چیونٹی ان کے پاؤں تلے آکر ماری نہ جائے ـــــ لیکن جب اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے تو اسی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سب لوگوں کو مشرک کہنے لگے اور علماء و مشائخ کے اقوال و اعمال پر زبردست تنقید کرنے لگے۔ اسی لئے اُن کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ بعد میں انہوں نے نامور بزرگ سید علی ترمذی (پیر باباؒ) کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا جس سے ان کی قوت اور شہرت کو بہت نقصان پہنچا۔ بالآخر سیاسی بغاوتوں کے نتیجے میں مغلیہ حکومت کی مادی طاقت اور اخون درویزہؒ کے علمی استدلال نے ان کی (بایزید انصاری) مذہبی اور سیاسی دونوں تحریکوں کو کچل کر رکھ دیا۔"

(مقدمہ صراط التوحید)

صوبہ سرحد کے مشہور صحافی اللہ بخش یوسفی (مرحوم) ۱۹ نومبر ۱۹۶۶ء کے "آوازِ پختون" میں بایزید انصاری کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ پختونوں نے بحیثیت قوم اتحاد اور اتفاق کر لیا تھا، انہوں نے اپنے تمام خاندانی، علاقائی اور نسلی حتیٰ کہ مذہبی عقائد کو بھی ایک طرف رکھتے ہوئے اتحاد کا دامن تھام لیا تھا ـــــ بایزید نے انہیں یہی سبق دیا تھا کہ پختون آزاد ہے اور اُسے آزاد رہنا چاہیئے۔ وہ کسی بیرونی طاقت کا طوقِ غلامی اپنی گردن میں برداشت نہیں کر سکتا ـــــ اس

طرح یہ تحریک مذہبی اور سیاسی عقائد کا ایک ملغوبہ تھی ـــــ مغل حکمرانوں نے اس کے خلاف پہلے تو الحاد اور زندقہ کے فتوے لگوائے پھر خانہ جنگی پیدا کرادی۔"

جہاں تک بایزید انصاری کے حالات کا تعلق ہے، وہ وزیرستان کے مقام کانی گرام کے اُڈمڑ قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد کا نام قاضی عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ تھا، باپ دادا گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اس لئے ہندوستان کے کئی شہروں میں بھی اُن کا آنا جانا تھا۔ اغلباً ننھیال کے اعتبار سے بایزید کا تعلق جالندھر سے تھا، چنانچہ اس کی ولادت جالندھر ہی میں ہوئی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ انصاری لکھتا ہے۔ تاہم اس کا تعلق مدینہ منورہ کے اُن لوگوں کے ساتھ ہرگز ثابت نہیں ہوتا جنہوں نے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتھیوں کی مدد کی تھی اور اسی بنا پر انصار کہلاتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ بایزید اس زمانے میں پیدا ہوا جب بابر نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا سالِ ولادت ۱۵۲۵ء یا ۱۵۲۶ء ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قاضی عبداللہ کا سلوک اپنی بیوی (بایزید کی والدہ) سے اچھا نہ تھا۔ اور اس نے بعد میں اسے طلاق دے دی تھی، یہی وجہ ہے کہ بایزید اپنی تصانیف میں اپنے باپ کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کرتا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ والد اُسے ظاہری علوم اسلامی کی تعلیم دلا کر اعلیٰ پایہ کا عالم بنانا چاہتا تھا جب کہ بایزید طبعاً مجاہدوں، مراقبوں اور تصوف کی طرف مائل تھا۔ "صراط التوحید" بایزید کی مشہور تصنیف ہے جس سے اس کے عقائد پر روشنی پڑتی ہے، اس کتاب میں وہ بتاتا ہے کہ وہ ہمیشہ معرفتِ حق کا متلاشی رہا۔ اس نے مرشدِ کامل کی تلاش میں بہت وقت صرف کیا لیکن بالآخر اُسے خواب میں خواجہ خضر علیہ السلام کا دیدار ہوا جن سے اس نے روحانی مدارج طے کئے، بایزید انصاری کے نزدیک سلوک کی آٹھ منزلیں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، قربت، وصلت، وحدت اور سکونت ہیں۔

اپنی خود نوشت سوانح حیات میں بایزید انصاری نے بتایا ہے کہ وہ مدتوں پیرِ کامل کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس کا دل دنیا سے بالکل اُچاٹ ہو گیا۔ چنانچہ وہ پانچ سال تک گوشہ نشین رہا۔ اسی چلہ خانے میں یا خلوت کدہ میں اس نے اپنی کتاب "صراط التوحید" لکھی۔ اس کی روحانیت کا شہرہ ہوا تو لوگ دور و نزدیک سے آکر اس کے مرید ہونے لگے، پہلے اس نے کانی گرام (وزیرستان)

میں تبلیغ شروع کی۔ پھر ننگرہار اور مہمند کے علاقے کا دورہ کیا، وہ اس تبلیغی سفر کے دوران بنگش اورک زئی اور تیراہ بھی گیا۔ اور پشاور اور ہشت نگر کے لوگوں کے سامنے بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ہشنغر اور مردان میں وہ کافی عرصہ مقیم رہا۔ یہاں ایک مشہور عالم دین ملّا دولت اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا جس سے اسکے مشن کو بڑی تقویت پہنچی۔ یہیں سے اس نے "صراط التوحید" کے نسخے اپنے خلفاء کے ذریعے بادشاہ اکبر، سید علی ترمذی (پیر بابا) اور دوسرے علماء اور امراء کے پاس بھیجے، "حالنامہ" کے مطابق بایزید کا قیام کلہ ڈھیر (غلباً غلہ ڈھیر) میں رہا۔

اسی دوران قبیلہ محمد زئی کے ساتھ بایزید کے مراسم بڑھے، ہشنغر کے دو خان تھے ایک کا نام پائندہ خان تھا دوسرے کا نام بہار خان۔ وہ دونوں بایزید انصاری کے بے انتہا عقیدتمند تھے، بایزید نے باہمی تعلقات کو مزید استوار کرنے کی غرض سے اپنی بیٹی بی بی کمالہ کا عقد پائندہ خان کے بیٹے علی خان سے کر دیا اور اپنے بیٹے عمر کی شادی بہار خان کی بیٹی سے کی۔ اس کے دوسرے بیٹے جلال الدین عرف جلالہ کی شادی بھی محمد زئی کے ایک سرکردہ خان محمد خان کی بیٹی سے ہوئی۔ خود بایزید نے ہشنغر کی ایک خاتون دتلی سے شادی کر لی۔ بایزید کا ایک اور مقتدر خلیفہ مودودی (یا ادائی) تھا جو بلوچستان، سندھ اور قلات تک گیا اور ہر جگہ اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ دوسرے خلیفہ ملّا دولت کو اکبر بادشاہ کے ہاں بھیجا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اکبر بادشاہ نے بایزید انصاری کے عقائد کے بارے میں کوئی گرفت یا مخالفت نہ کی اور ایک روحانی رہنما سمجھتے ہوئے اسے قابلِ احترام سمجھا لیکن بایزید انصاری اور مغل حکمرانوں کے مابین تعلقات کی خوشگواری زیادہ عرصہ تک قائم رہنے نہ پائی۔

مخالفت اور مناقشت کا آغاز یوں ہوا کہ بایزید انصاری کے کئی مرید بہت متشدد اور انتہا پسند تھے وہ ہر وقت ذکر و فکر میں لگے رہتے اور کسی دُنیوی شخصیت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ یہ مجذوب قسم کے لوگ تھے۔ ایک بار ہندوستان سے سوداگروں کا ایک قافلہ کابل جا رہا تھا کسی بات پر اہلِ قافلہ کا جھگڑا اُن بایزیدی مجذوبوں سے ہو گیا۔ مجذوبوں نے نہ صرف انہیں مارا پیٹا بلکہ ان کا مال و اسباب بھی چھین لیا۔ کابل پہنچنے پر اُن سوداگروں نے اس واقعہ کی اطلاع فرمانروائے کابل میرزا حکیم (اکبر بادشاہ کے سوتیلے بھائی) کو دی۔ ان لوگوں نے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہا کہ

بایزید انصاری مغلوں کا دشمن ہے اس کا رسوخ صوبہ سرحد اور آزاد قبائل میں بڑھ رہا ہے۔ اگر بروقت مواخذہ نہ کیا جائے تو باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اس پر میرزا حکیم نے پشاور کے قلعہ دار معصوم خان کو حکم بھیجا کہ بایزید کو گرفتار کر کے کابل بھیجا جائے۔ اتفاق سے جس وقت میرزا حکیم کا یہ پیغام حاکم پشاور کے پاس پہنچا، بایزید کا مقرب مرید پائندہ خان (اشنغری) بھی مجلس میں موجود تھا۔ اس نے فوراً بایزید کو اس حکمنامہ سے مطلع کر دیا تبروقت اطلاع مل جانے پر بایزید انصاری اپنے گھر والوں سمیت ہشت نگر سے نکل کر علاقہ مہمند کو چلا گیا۔ پھر وہاں سے خیبر، تیراہ اور بنگش کے علاقہ میں دورہ کر کے اہل سرحد کو مغل حکومت کے خلاف اکساتا رہا یہ مخالفت اتنی بڑھی کہ ایک بار اکبر کا ایک فوجی سردار میرزا سلیمان درہ خیبر سے گزر رہا تھا کہ آفریدیوں نے حملہ کر کے اس کا مال و متاع لوٹ لیا۔ یہ خبر پشاور پہنچی تو پشاور کے مغل حاکم نے تیراہ پر ہلہ بول دیا۔ تیراہیوں اور اورک زئی لوگوں نے مغلوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ بہت سے مغل لشکری مارے گئے۔ یہ حال دیکھ کر مغل دربار کی جانب سے راجہ مان سنگھ کو ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ کابل کے مغل صوبہ دار محسن خان نے سید علی ترمذی (پیر بابا) اور حضرت اخون درویزہؒ کی مدد سے بایزید انصاری پر پُرزور حملہ کیا۔ دس سال تک لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر بایزید کو گرفتار کر کے کابل کے جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد کسی نہ کسی طرح سے بایزید انصاری کابل کے قید خانہ سے نکل بھاگا۔ اور رہا ہوتے ہی سیدھا ننگرہار پہنچا۔ کچھ عرصہ راجپور کے مقام پہ قیام کرنے اور بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنانے کے بعد بالآخر بایزید انصاری نے تیراہ کو اپنا مرکز اعلیٰ قرار دیا۔ مغل صوبہ دار محسن خان نے تیراہ پر چڑھائی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اس طرح تیراہ کے علاقے پہ مکمل طور پہ پیر روشن یا پیر تاریک کا قبضہ ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ تیراہ کے معرکوں میں بایزید کے ۳۲۰ ساتھی مارے گئے۔

اس فتح سے بایزید انصاری کے حوصلے اتنے بڑھے کہ اس نے بہت سا لشکر جمع کر کے ننگرہار کے راستے کابل پہ فوج کشی کر دی۔ بایزید کا قیام موضع بڑوبیں تھا جب کہ محسن خان جلال آباد سے کچھ سوار لا کر اس کے مقابلے میں صف آرا تھا۔ شنواریوں کے علاقے میں تورا غہ کے مقام پر

دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا اور بالآخر بایزید کو پسپا ہوتے ہی بن پڑی۔ اس ہولناک جنگ کے نتیجے میں بایزید انصاری مارے گئے۔ موت کے متعلق دو مختلف روائتیں ہیں پہلی تو یہ کہ بایزید مغل صوبہ دار محسن خان کے ہاتھوں قتل ہوئے اور انہیں ہشنغر میں دفن کیا گیا اور دوسری یہ کہ تو راغہ سے شکست کے بعد بایزید گرمی اور پیاس کی شدت کے جان بحق ہوئے اور انہیں کلپانی کے قریب دفن کیا گیا۔ لیکن بعد میں ان کے وارث تابوت نکال کر ساتھ لے گئے۔ بایزید کا سالِ وفات ۹۹۳ ہجری ہے۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر نے "تذکرۃ الانصار" کے حوالے سے لکھا ہے کہ بایزید انصاری کے پانچ بیٹے تھے۔ شیخ عمر، کمال الدین، شیخ نورالدین، شیخ خیرالدین اور شیخ جلال الدین۔

بایزید انصاری کی وفات کے بعد بڑا بیٹا شیخ عمر جانشین قرار پایا۔ اس نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور مردان اور ہشنغر کے بہت سے لوگوں کو ساتھ ملا لیا تاہم یوسف زئی کے ذیلی قبیلہ اکوزئی کا سربراہ حمزہ خان ان لوگوں کی اطاعت کو خلافِ دین و ایمان سمجھتے ہوئے ان کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ اس سلسلے میں یوسف زئی اور انصاری کے حامیوں میں پہلا معرکہ سرکادے میں ہوا۔ جس میں شیخ عمر کا پلہ بھاری رہا۔ اور اس کے ساتھی حمزہ خان اکوزئی کے بہت سے مویشی بھگا کر لے گئے۔ دوسرا معرکہ میتی میں ہوا اس میں بھی میدان شیخ محمد عمر کے ہاتھ رہا۔ تیسرا اور آخری معرکہ باڑہ تنول کے مقام پر ٹوپی کے قریب دریائے سندھ کے کنارے پر ہوا جس میں حمزہ خان اکوزئی کو فتح کامل نصیب ہوئی۔ شیخ عمر اور اس کا بھائی خیرالدین لڑائی میں مارے گئے۔ نورالدین بھاگ کر محمد زئی کے ہاں پناہ گزین ہوا لیکن وہیں کسی نے موقع پاکر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بایزید کے پیروکار ہر وقت پیر روشن کے تابوت کو ساتھ پھراتے تھے۔ اس جنگ کے بعد جب انہوں نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار دیکھا تو تابوت توڑ کر دریائے سندھ کی لہروں کی نذر کر دیا۔

مقامی روایات کے مطابق بایزید انصاری کا بیٹا موضع جھنڈا اور میتی کے درمیان مارا گیا تھا۔ اس جگہ کو اب بھی "جلال درہ" کہا جاتا ہے، اس مقام کے قریب ہی فتح کی یادگار کے طور پر ایک جھنڈا نصب کیا گیا تھا۔ بعد میں اس مقام پر کچھ مکان بن گئے تو گاؤں کا نام بھی جھنڈا پڑ

گیا، ۱۸۸۷ء تک یہاں صرف چودہ مکان تھے جو پینے کا پانی چار میل دور سے لایا کرتے تھے۔

بایزید انصاری کے باقی بیٹے تو لڑائی میں کام آئے لیکن سب سے چھوٹا بیٹا جلال الدین عرف جلالہ بچ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں زخمی ہونے کے باوجود وہ دریائے سندھ میں کود گیا تھا اور مشکیزے پر دریا پار کر کے قبیلہ امان زئی سے پناہ کا طالب ہوا تھا۔ چونکہ وہ نہایت ہی شکیل و وجیہہ نوجوان تھا۔ لوگوں نے اسے قتل کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ اٹک لے جا کر شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کر دیا۔ اکبر بھی اس کی مسحور کن شخصیت سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے اُسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ رکھا۔ لیکن موقع ملتے ہی جلالہ قید سے نکل بھاگا اور تیراہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تیراہ پہنچتے ہی بہت بڑا لشکر منظم کیا اور غزنی پر حملہ کر دیا۔ غزنی کا مغل حاکم مقابلے میں ٹھہر نہ سکا اور بھاگ نکلا، جلالہ کے حکم پر اس کے ساتھیوں نے غزنی کو تاخت و تاراج کر دیا اور بہت سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تاہم غزنی سے واپسی کے وقت ہزارہ قبائل کے جنگ آزما ان پر ٹوٹ پڑے، جلالہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس کا سر کابل کے مغل حاکم کو بھیج دیا گیا اور دھڑ کو دو ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑا شہر کے ایک دروازے پر اور دوسرا دوسرے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں بلکہ ۱۵۸۵ء سے ۱۵۸۷ء تک جلال الدین عرف جلالہ آفریدی اور اورک زئی بہادروں کی مدد سے علی مسجد، جمرود اور تیراہ کے مختلف مقامات پر مغل فوجوں سے نبرد آزما رہا۔ تیراہ کی ایک جنگ میں اسے بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بہت سے ساتھی قیدی بنا لئے گئے اور وہ بھاگ کر کافرستان چلا گیا، وہاں سے واپسی پر فوت ہو گیا۔

اُدھر اکبر کی موت کے بعد جہانگیر شہنشاہ بنا وہ نرم مزاج شخص تھا۔ اس نے ۱۶۰۷ء میں کابل جاتے وقت شاہ بیگ کوجی (فاتح قندہار) کو "خانِ دوران" کا لقب دے کر روشنائیہ قرقے سے نپٹنے کا حکم دیا۔ اس عرصے میں جلالہ کی موت کے بعد اس کا بھتیجا عبدالواحد یا احداد اس کے جانشین کے طور مغلوں کے خلاف سرگرم عمل تھا۔ اس نے جلالہ کی بیٹی بی بی علائی سے شادی کر رکھی تھی جو نہ صرف حسن و جمال میں بلکہ فہم و تدبر اور جرأت و عزیمت میں اپنے دور کی عظیم خاتون تھی۔ شاہ بیگ نے احداد کے خلاف کئی مہمیں بھیجیں لیکن کامیابی نہ ہوئی، آخر ۱۶۲۰ء میں مہابت خان

کو پشاور اور کابل کا گورنر مقرر کیا گیا جس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اس نے کوہاٹ میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور روشنائیہ فرقے سے تعلق رکھنے والے سرکردہ افراد کو اس میں شمولیت کی دعوت دی۔ جب یہ لوگ ضیافت کے لئے جمع ہوئے تو انہیں قتل کرا دیا گیا۔ مقتولوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ احداد ان دنوں تیراہ کی وادئ مستورہ گیا ہوا تھا۔ وہ ضیافت میں شریک نہ ہوا اور بچ گیا۔ مہابت خان نے اس کو گرفتاری اور سرکوبی کے لئے غیرت خان کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی لیکن جنگ میں غیرت خان کی کچھ پیش نہ گئی۔ تیراہیوں نے سخت مقابلہ کیا جس میں غیرت خان اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

بہرحال "روشنائیوں" کے خلاف مہم جاری رہی۔ چھ سال بعد ۱۶۲۶ء میں مغلوں کا ایک اور لشکر مظفر خان کی قیادت میں بھیجا گیا۔ اس بار بھی سخت مقابلہ ہوا جس میں احداد مارا گیا اور اس کی مُہر سیادت اور عصاء شہنشاہ جہانگیر کو اس وقت پیش کیا گیا جب وہ کابل جاتے ہوئے درّہ خیبر سے گزر رہا تھا۔ احداد کی موت سے بھی "روشنائیوں" کی سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں۔ اس کے مرنے پر بی بی علائی خود میدان میں آگئی اور اس نے اپنے نوعمر بیٹے عبدالقادر کو اپنے فرقے کا سردار منوالیا۔

شاہ جہان کے دورِ حکومت میں بھی "روشنائیہ" کے پیروکاروں نے مغلوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے رکھا۔ بی بی علائی خود گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی اور اپنے لڑاکوں کی کمان کرتی۔ اس نے دوبارہ بہت طاقت جمع کر لی، ایک بار مغل لشکر مظفر خان کی قیادت میں ایک مہم پر پشاور سے کابل جا رہا تھا کہ درہ خیبر میں اچانک ہزاروں آفریدی اور اورک زئی نعرے لگاتے ہوئے نکلے اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ اس اچانک حملے سے مغلوں میں بڑی بھگدڑ مچ گئی۔ شاہی لشکر کو بڑا نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ خود مظفر خان کے حرم کے خواتین بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ صرف اس کی ایک بیوی کو بصد مشکل سید خان حاکم کوہاٹ نے بہت سا زرِ فدیہ دے کر چھڑایا۔

۱۲۔ جون ۱۶۳۰ء کو خیبر کی قبائل کا ایک بہت بڑا اجتماع دریائے ہاڑہ کے قریب اِلم گوڈر کے مقام پر ہوا۔ اب کے قبائلیوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے پشاور پر حملے کا منصوبہ

بنایا، پشاور کے مغل حاکموں نے بمشکل تمام بالاحصار میں پناہ لے کر جان بچائی۔ شہر کو تباہ و غارت کر دیا گیا۔ جب پشاور پر اس حملے کی اطلاع کوہاٹ کے مغل حاکم سید خان کو ملی تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر پشاور کی مغلیہ فوج کو کمک پہنچانے نکلا۔ درہ کوہاٹ میں اس کا سامنا ایک قبائلی لشکر سے ہوا لیکن مغلوں کی خوش قسمتی سے اس وقت قبائلی سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ سید خان نے پشاور پہنچ کر قبائلی لشکر پر کاری ضربیں لگائیں، جس سے "روشنائیہ" لشکر کو شکستِ فاش ہوئی اور صوبہ سرحد میں اقتدار دوبارہ مضبوط و مستحکم ہو گیا۔

سید خان نہ صرف جنگی امور میں مہارت رکھتا تھا بلکہ سیاسی داؤ پیچ میں بھی بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے بی بی علائی سے نامہ و پیام جاری رکھا، بی بی علائی پر بھی یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ آپس کی ناچاقی کے باعث اب وہ مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس نے بھی مصلحت اسی میں دیکھی کہ باعزت طریق سے مغل دربار سے صلح ہو جائے۔ آخر کار بی بی علائی اور اس کا بیٹا عبدالقادر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد عبدالقادر تو مختصر علالت کے بعد راہی ملک بقاء ہوا لیکن بی بی علائی اپنے ایک بھائی رشید خان کے ساتھ دہلی میں مغل شہنشاہ شاہ جہان کے حضور پیش کی گئی۔ شاہجہان نے فرخ آباد (یو۔پی) میں اسے بہت بڑی جاگیر دے دی اور وہ سکون کی زندگی گزارنے لگے۔ ۱۶۴۷ء میں رشید خان کے فوت ہونے پر روشنائیہ تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

صوبہ سرحد کے سیاسی افق پر یہ تحریک آندھی کی طرح اٹھی تھی اور بگولے کی مانند بیٹھ گئی۔ کئی سیاسی حلقے اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اسے ایک وطنی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم دوسرے نقطۂ نظر کے حامل اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے مثلاً مردان کے مشہور عالم مولانا مدرار اللہ اس تحریک کے بارے میں "جہاد" مورخہ ۱۳ جولائی ۷۶ء میں یہ رائے دیتے ہیں کہ

"اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ بایزید یا اس کے جانشین پختونوں کی خود مختار

حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اس لئے مُغل ان کے خلاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بایزید اور اس کے پیروکار خود یوسف زئی اور دوسرے پختون قبائل سے برسرِپیکار رہے ــــ اصل بات یہ ہے کہ روشانیوں نے کابل جانے والے ایک تجارتی قافلے کو لوٹ لیا تھا جس سے حکومتِ وقت اور ان کے درمیان مخاصمت چل نکلی اور کابل کے مغل گورنر میرزا حکیم کو، حاکم پشاور معصوم خان کو اُن کی سرکوبی کے لئے ہدایت دینی پڑی"۔

روشنائیہ تحریک کے عروج کے دنوں میں سرحد کے کئی مذہبی رہنما بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور انہوں نے بایزید کی ارادت مندی قبول کرلی۔ ان لوگوں میں ملّا ارزانی، ملّا عمر، ملّا علی محمد مخلص۔ ملّا میرو، ملّا پائندہ، ملّا دولت اکوزئی، ملّا دولت محمد زئی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جہانگیر

جہانگیر ۲۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو تخت پر بیٹھا اور ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء تک برصغیر پاک و ہند پر دادِ حکومت دیتا رہا۔ اس کی سلطنت کابل اور قندہار سے بنگال اور راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے باپ اکبر کے برعکس وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ وہ کچھ بُری عادتوں میں گرفتار ضرور تھا۔ تاہم خدا ترسی اور نیک دلی کی وجہ سے عوام میں بڑا مقبول تھا۔ مذہبی بے راہ روی کی بجائے وہ محتاط طریق کار پہ کاربند رہا۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ اور دوسرے دینی رہنماؤں نے جہانگیر کی دینی محبت کی تعریف کی ہے۔

نورالدین جہانگیر کئی لحاظ سے ظہیرالدین بابر سے ملتا جلتا تھا۔ وہ فطرت کا شیدائی اور علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ بڑی تیز تھی۔ اور اس کی خودنوشت سوانح حیات "توزک جہانگیری" میں اس عہد کی معاشرتی زندگی کی اعلیٰ تصویر کشی کی گئی ہے۔ عدل و انصاف کے اعتبار سے اس کا عہدِ حکومت مثالی تھا چنانچہ اس نے محل کے باہر بہت بڑی زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ جو فریادی داد کا طالب ہوتا زنجیر کو کھینچتا جس پہ محل کے اندر گھنٹیاں بجنے لگتیں اور شہنشاہ خود باہر آکر فریادی کی دادرسی کرتا۔

جہاں تک مغلوں کی سرحدی پالیسی کا تعلق ہے جہانگیر کے دور میں اس میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہ آئی۔ وہ اکبرِ اعظم کی پالیسی ہی پہ گامزن رہا۔ اکبر کے عہد میں مغلوں اور پیر بایزید انصاری کے مُریدوں (روشنائیوں) میں جو جھگڑا چل رہا تھا وہ جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اسی طرح قندہار کی ملکیت اور حکومت کے بارے میں ایرانیوں اور مغلوں کے درمیان کشمکش نہ صرف اسی طرح جاری رہی بلکہ اس میں اور بھی شدت اور تیزی پیدا ہو گئی۔

شہزادگی کے عالم میں جہانگیر پہلی بار اس وقت صوبہ سرحد آیا تھا جب مغل حکمرانوں اور یوسف زئی کے درمیان مخاصمت اپنے پورے عروج پر تھی۔ معلوم ہوتا ہے جہانگیر کے کہنے پر احمد بیگ گورنر کابل کو تبدیل کر کے شیر خان افغان کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر جب نوشہرہ پہنچا تو حاکم پشاور نے صوبہ سرحد کے مختلف قبائلی سرداروں کو اس کے سامنے پیش کیا تھا۔

بادشاہ بننے کے بعد جہانگیر ۱۶۰۷ء میں پہلی بار صوبہ سرحد کے دورے پر آیا۔ اٹک اور پشاور میں مختصر قیام کے بعد وہ کابل پہنچا۔ جہاں اس نے اپنے پردادا بابر کے مزار پر مقبرہ تعمیر کیا، انہی دنوں سرحدی امور کو سلجھانے کے لئے جہانگیر نے شاہ بیگ کو کابل، تیراہ بنگش، سوات اور باجوڑ کے علاقوں پر گورنر مقرر کیا۔ اور اسے "خانِ دوران" کے خطاب سے بھی نوازا۔ شاہ بیگ دورِ اکبری کا ایک مشہور اور بارسوخ حاکم تھا۔ جہانگیر کے خیال میں شاہ بیگ اس امر کی بخوبی صلاحیت رکھتا تھا کہ "روشنائیوں" کا قلع قمع کر سکے۔

شاہ بیگ ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ "روشنائیوں" کو بات چیت سے قائل کیا جائے اور انہیں مغلوں کا حلیف بنا لیا جائے۔ تاہم معاملہ اس طرح سلجھ نہ سکا اور "روشنائیوں" یا بالفاظِ دیگر "تاریکیوں" کی سرگرمیاں زیادہ زور پکڑ گئیں۔ اس پر شاہ بیگ نے یہ چال چلی کہ اورک زئی کی شاخ دولت زئی کے سرکردہ افراد کو جو پیر روشن کے مریدوں میں پیش پیش تھے ایک دعوت پر کوہاٹ میں بلایا، قریباً تین سو اورک زئی دعوت میں شریک ہوئے، شاہ بیگ نے انتہائی دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے ان سب کو قتل کرا دیا۔ بعد میں مغل گورنر نے غیرت خان کو بہت بڑی فوج دے کر احداد کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ روشنائی لیڈر احداد ان دنوں مستورہ کی وادی میں مقیم تھا۔ مغل فوجیں کوہاٹ سے روانہ ہوئیں اور خانکی وادی اور سمپگا کے درے سے گزر کر تیراہ میں داخل ہو گئیں۔ یہ جگہ سمانا کے صحت افزا مقام کے قریب ہی واقع ہے، تنگ گھاٹیوں سے گزر کر یہ راستہ پہاڑ کی چوٹی کو جاتا ہے جس کی بلندی ۶ ہزار فٹ بیان کی جاتی ہے، جہانگیر نے اپنی "توزک" میں اس جگہ کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اور خوشحال خان خٹک نے بھی اس لڑائی کا حال بیان کیا ہے۔ آفریدی اور اورک زئی جنگ آزماؤں

نے پہاڑ کی چوٹی پر مورچے جما رکھے تھے۔ آفریدیوں کی کمان احمد آد کے ہاتھ میں تھی جب کہ اورک زئی اپنے کمانڈر ملک طور یا طوری کی نگرانی میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ جب مغلیہ لشکر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو دست بدست لڑائی شروع ہوگئی۔ مغل سپاہی چڑھائی چڑھنے کی وجہ سے نیم جان ہو چکے تھے جب کہ آفریدی اور اورک زئی جوان تازہ دم تھے، سخت معرکہ پڑا۔ دونوں طرفوں نے بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دی۔ لڑتے لڑتے دونوں لشکر ایک دوسرے کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ بعض سپاہی تو آپس میں گتھم گتھا نظر آنے لگے۔ اورک زئی کے قبیلہ فیروز خیل کا ایک ملک پنجو نامی تھا۔ وہ غیرت خان سے دست بدست میں اُلجھ پڑا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو پکارا اور کہا "دیکھتے کیا ہو، میری بھی پرواہ نہ کرو۔ تلواریں لے کر ٹوٹ پڑو، کیا ہوا جو دشمن کے ساتھ میں بھی مارا جاؤں"۔ تم پرواہ نہ کرو"۔ غیرت خان اس مقابلے میں تو بچ گیا۔ تاہم وہ گرم مزاج شخص تھا اس نے مصلحت سے کام نہ لیتے ہوئے اس نازک موقع پر عام حملے کا حکم دے دیا اور خود گھوڑا دوڑاتے آگے بڑھا۔ آفریدی اور اورک زئی جنگجوؤں نے ہر طرف سے اُسے آن گھیرا۔ اسے گھوڑے سے اتارا اور مار دیا۔ اس معرکے میں گکھڑ سردار جلال الدین بھی غیرت خان کے ساتھ تھا۔ جلال خان گکھڑ متواتر تحمل کا مشورہ دیتا رہا لیکن غیرت خان نے حملے میں جلد بازی دکھائی۔ جلال خان نے باقی ماندہ سپاہیوں کو جمع کیا اور کوتل سے واپس پسپائی اختیار کی لیکن اس موقع پر قبائلی بہادر متواتر مغلوں پر پتھراؤ کرتے رہے جس کی وجہ سے بہت سے سپاہیوں کے علاوہ سردار جلال خان گکھڑ بھی ہلاک ہوگیا۔ بچی کھچی مغل فوج بصد مشکل کوہاٹ پہنچی اور شاہی دربار سے مزید کمک کی طلبگار ہوئی اس طرح احمد اور اس کی "روشنائیوں" نے کوہاٹ کے قتلِ عام کا بدلہ لے لیا۔

تیراہ میں کامیابی کے بعد روشنائیوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے بلکہ اہلِ تیراہ (آفریدی اور اورک زئی) کے اس بہادرانہ اقدام کی وجہ سے آج تک کسی بیرونی حملہ آور کو تیراہ پر فوج کشی کرنے کی جرأت نہ ہو سکی اور اس علاقے کے لوگوں کی آزادی برقرار رہی۔

جہانگیر کو اس واقعہ کی خبر ملی تو اس نے جلال خان کے چھوٹے بھائی اکبر قلی کو جو اس وقت کانگڑہ کی کسی مہم میں مصروف تھا۔ بلایا اور اُسے پنج ہزاری منصب عطا کر کے روشنائیوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا اکبر قلی بھی اپنے بھائی جلال خان کی طرح بڑا تجربہ کار اور دلاور سالار تھا۔ جہانگیر نے جلال خان کی

موت کے بعد اُس کی آبائی جاگیر بھی اکبر قلی کے نام کر دی۔ گورنر مہابت خان نے بھی ایک امدادی لشکر عاقل خان کی سربراہی میں روشنائیوں کے خلاف بھیجا۔

روشنائی تحریک کے امیر احداد نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس کے حامیوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور وہ مغلوں کے لشکر اور ان کے علاقوں پر پہلے سے بھی بڑھ کر زبردست حملے کرتا رہا۔ ۱۶۲۶ء میں جب جہانگیر کابل میں مقیم تھا۔ احداد کی سرگرمیاں اور شدت اختیار کر گئیں۔ کوہاٹ کے قریب "لواغر" کے مقام پر مغلوں اور احداد کے پیروکاروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ احداد بہادری سے دشمن پر ضرب لگاتا رہا۔ لیکن عین اس وقت جب وہ ایک "سنگڑ" (مورچے) سے نکل کر دوسرے "سنگڑ" کو جا رہا تھا۔ مغل سالار ظفر خان نے اسے تاڑ لیا۔ ظفر خان تیزی سے بڑھا اور احداد پر ٹوٹ پڑا۔ احداد کی اس کے سامنے کچھ پیش نہ گئی اور وہ لڑتے ہوئے ظفر خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ سربراہ کے مرتے ہی روشنائی لشکر کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان سے بھاگ نکلا۔

احداد کا سر کاٹ کر ایک مغل امیر افتخار خان ولد احمد بیگ خان کابلی کے ہاتھ جہانگیر کو کابل بھیجا گیا۔ اس کے ساتھ ہی احداد کی مُہر اقتدار، عصا اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔ مغلوں نے اس زبردست دشمن سے نجات پانے پر بڑی خوشی منائی۔ اچھی کارکردگی دکھانے والے سرداروں اور سپاہیوں کو انعامات سے نوازا گیا تاہم احداد کی موت سے بھی روشنائی تحریک ختم نہ ہو سکی، احداد کی بیوہ بی بی علائی نے تحریک کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ وہ بلا کی ذہین، ہوشیار اور خوبصورت اور بقول خوشحال خان خٹک سبھی "تاریکیوں" کی منظورِ نظر تھی۔ اس نے اپنے بیٹے عبدالقادر کی سرداری سب سے تسلیم کرالی اور مغلوں کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھی۔ احداد کی موت کے ایک سال بعد ۱۶۲۷ء میں جہانگیر بھی فوت ہو گیا۔

روشنائی تحریک کے پیروکاروں سے مقابلہ کے علاوہ مغلوں کو قندہار کے بارے میں بھی بڑی تشویش لاحق رہی۔ قندہار بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ چودہ ہزار اونٹوں پر بار ہونیوالا سامانِ تجارت ہر سال ہندوستان سے قندہار جاتا تھا، ایران اور ہندوستان کے مابین ساری تجارت بھی قندہار ہی کے راستے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے فرمانروا ہر قیمت پر قندہار کو اپنے پاس

رکھنے کے خواہشمند تھے جبکہ ہندوستان کے مغل بادشاہ کسی قیمت پر قندہار کو کسی دوسری حکومت کے ہاتھ میں دینے پر تیار نہ تھے۔

۱۵۲۲ء میں بابر نے اپنے عزیز میرزا حسین بائقرا کی موت پر قندہار پر قبضہ کر لیا تھا۔

۱۵۴۵ء میں ہمایوں کو شاہ طہماسپ صفوی نے ہندوستان کی دوبارہ تسخیر کے لئے امدادی لشکر دیا تو یہ شرط لگا دی کہ ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی میں کامیاب ہو گیا تو قندہار ایران کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۱۵۹۵ء میں شہنشاہ اکبر نے زور پکڑا تو ایرانیوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قندہار پر قبضہ کر لیا۔

جہانگیر بادشاہ بنا تو ایران میں شاہ عباس ثانی کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے دوستانہ وفود جہانگیر کے دربار میں بھیجے اور اپنی دوستی کا یقین دلایا تاہم اندر ہی اندر وہ فوجی تیاریوں میں لگا رہا ــــ بالآخر ۱۶۲۲ء میں ایرانی فرمانروا نے دوبارہ قندہار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جہانگیر نے قندہار کو واپس لینے کی بہت کوشش کی۔ کئی مہمات بھیجیں لیکن کامیاب ہونے نہ پایا۔ تاہم ۱۶۳۸ء میں شاہ جہان کے عہدِ حکومت میں قندہار کا ایرانی گورنر علی مردان خان مغلوں سے مل گیا۔ اور قندہار پر پھر سے فرمانروایانِ ہند کا تسلط قائم ہو گیا۔

۱۶۴۹ء میں ایرانیوں نے پھر زور پکڑا اور قندہار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۷۰۸ء تک قندہار ایرانی قلمرو کا ایک صوبہ رہا لیکن اس وقت سے آج تک یہ افغانستان کا ایک شہر شمار ہوتا ہے۔

جہاں تک سرحد کے پختون قبائل کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے جہانگیر نے اپنے باپ اکبر سے بالکل مختلف حکمت عملی اختیار کی۔ دینِ الٰہی کا علمبردار ہونے کی وجہ سے اکبر کو سرحد کا ہر گز پسند نہ کرتے تھے۔ سرحدی پختون زیادہ تر حنفی العقیدہ تھے، وہ اکبر کی بدعات اور آزادہ روی کے مخالف تھے، یہی وجہ ہے کہ اکبر بھی پختون سرداروں پر زیادہ اعتماد نہ کرتا تھا۔ اس نے تمام بڑے بڑے عہدے راجپوتوں اور دوسرے لوگوں کو دے رکھے تھے اور پختون بالکل کسمپرسی کے عالم میں تھے لیکن جہانگیر ایک صحیح العقیدہ شخص تھا۔ علاوہ ازیں وہ پختون قوم کی جنگی صلاحیتوں کا بھی معترف تھا۔ اس لئے برسر اقتدار آتے ہی اس نے پختون امراء کو اہم منصبوں پر مقرر کیا۔ اس کے زمانے میں ۲۶ بڑے بڑے اہم عہدے

پختون عمائدین کے پاس تھے، ان امراء میں چار ہزاری منصب والے بھی تھے اور پنج ہزاری والے بھی بلکہ خان جہاں لودھی ہفت ہزاری تھا۔

پنجاب کے اہم صوبے میں جہانگیر کی طرف سے دلاور خان کاکڑ گورنری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا اصل نام ابراہیم خان تھا لیکن بہادری کے کسی کارنامے پر خوش ہو کر جہانگیر نے اسے دلاور خان کا خطاب دے رکھا تھا۔ بعد میں وہ کشمیر کا گورنر بھی رہا اور اس نے کشمیر کے دور دراز پہاڑی علاقے فتح کر کے مغلیہ قلمرو میں داخل کئے۔

پشاور میں شیر خان روہیلہ حاکم تھا۔ جبکہ ٹھٹھہ (سندھ) کا گورنر بھی ایک معزز پختون تاج خان تھا۔ اسی طرح حصار کی فوجداری مبارک خان سروانڑی کے پاس تھی اور خان جہان لودھی نہ صرف ملتان اور دکن کا گورنر رہ چکا تھا بلکہ جہانگیر کے معتمد ترین مصاحبوں میں شمار ہوتا تھا۔

تزک بابری کی طرح تزک جہانگیری بھی اس دور کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ اور ایک دلچسپ کتاب ہے جس سے مختلف واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ حسن ابدال کے متعلق جہانگیر کا کہنا ہے کہ اس نے حسن ابدال میں مختلف عمارتیں اور ایک نالے پر پل بنانے کا حکم دیا جب اس سے اخراجات کی رقم کی منظوری کے لئے کہا گیا تو اس نے عام تخمینے سے بھی پانچ ہزار روپے زیادہ دیئے اور ہدایت کی کہ عمارتیں خوبصورت اور پختہ ہوں۔

نوشہرہ کے قیام کے دوران جہانگیر اپنی ڈائری میں یہ اندراج کرتا ہے۔

"نوشہرہ کا قلعہ دریائے لنڈہ (کابل) کے کنارے سرائے بارو کے بالمقابل واقع ہے۔ زین خان نے کابل کی صوبہ داری کے دوران پچاس ہزار روپیہ کی لاگت سے اس وقت بنوایا تھا جب وہ یوسف زئی قبائل کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اس زمانے میں علاقہ یوسف زئی کا فوجدار اس قلعہ میں رہا کرتا تھا۔ اسی دوران اس قلعے کا نام نوشہرہ رکھا گیا تھا۔ ایک بار اکبر بادشاہ نے یہاں پڑاؤ کیا اور شیر کا شکار بھی کھیلا تھا،

قلعۂ نوشہرہ میں پشاور کے جاگیردار احمد بیگ کابلی نے یوسف زئی اور غوریانخیل ملکوں کو بھی میرے سامنے پیش کیا تھا چونکہ میں اس علاقے میں احمد بیگ کی کارگزاری سے مطمئن نہ تھا۔ اس لئے پشاور کا انتظام شیر خان افغان کے حوالے کر دیا گیا۔" تزک ہی سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ ۱۶۱۲ء میں اس سارے علاقے میں وبائی طاعون پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ جو کوئی طاعون سے مرنے والی لاش کو ہاتھ لگاتا وہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر مر جاتا۔ لوگ اس خوفناک وبا کے ہاتھوں بھاگ کر جنگلوں اور ویرانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

شاہجہان

جہانگیر نے اکتوبر ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔ شاہ جہان اس وقت دکن میں تھا۔ اس لئے کچھ دنوں تک تخت و تاج کے مختلف امیدواروں میں رسہ کشی جاری رہی، بالآخر ۱۶۲۸ء میں شاہ جہان نے آگرے میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور اپنے حریفوں کو منظرِ عام سے ہٹا دیا۔

شاہ جہان کے دور تک مغلوں کی سلطنت وسیع بھی ہو چکی تھی اور مستحکم بھی ـــــ اس لئے اس کا دور آسودگی کا دور تھا، مورلینڈ (MORLAND) نے اپنی کتاب "ہندوستان کے معاشی حالات" میں بتایا ہے کہ "شاہ جہان کے زمانے میں سلطنت کی مال گزاری عہدِ اکبری کی نسبت دُگنی سے زیادہ ہو گئی تھی، حالانکہ اجناس کے نرخ ویسے ہی ارزاں تھے ـــــ" اسی مصنف کا کہنا ہے کہ شاہجہانی دور ختم ہوا تو بیش بہا زیورات، ملبوسات اور تختِ طاؤس جیسے گراں بہا سامان کے علاوہ خزانہ شاہی سے ۳۴ کروڑ نقد اور قریباً ۱۶ کروڑ روپے کا سونا، چاندی اور جواہرات برآمد ہوئے۔ جن کی قیمت آج کے سکّے میں ارب ہا ارب روپے تک پہنچتی ہے"۔

شاہ جہان کا عہد گویا تعمیر و ترقی کا عہد تھا۔ اس نے تاج محل آگرہ، جامع مسجد دہلی، لال قلعہ اور دوسری عمارتیں بنوائیں جن کی نظیر روئے ارض پر ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح شاہ جہان کے دور میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی پورے عروج پر تھیں۔

جہاں تک صوبہ سرحد کے متعلق شاہ جہان کی پالیسی کا تعلق ہے۔ ابتدا میں اس میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہ آئی۔ اس نے اپنے باپ جہانگیر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سرحدی قبائل کے ساتھ دوستانہ سلوک روا رکھا۔ علاوہ ازیں اس کے زمانے میں قندھار، بلخ اور بدخشان پر مسلسل فوج کشی ہوتی رہی، مغلوں کے بڑے بڑے لشکر صوبہ سرحد سے گزر کر ان مہموں پر جاتے رہے جس کا

ایک نتیجہ یہ ہوا کہ سرحدی لوگوں پر مغلوں کی طاقت کا رعب چھایا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ شاہجہانی میں صوبہ سرحد نسبتاً پرامن اور پرسکون رہا۔

شاہ جہان بادشاہ بنا تو ملک میں نخبتون اُمرا بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جن میں خان جہان لودھی، دریا خان روہیلہ، شیر خان سبھلول خان۔ مبارز خان، شہباز خان تانڑی اور خلیل خان کاکڑ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب نخبتون امراء میں خان جہان لودھی سب سے زیادہ سربلند تھا۔ وہ شاہجہان کی تخت نشینی کے وقت دکن کا وائسرائے یا نائب الحکومتہ تھا۔ تاہم کسی مصلحت کی بنا پر شاہ جہان نے اسے دکن سے تبدیل کیا تو وہ بگڑ بیٹھا اور علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ۱۷ فروری ۱۶۳۱ء کو شاہی فوجوں اور باغیوں میں زبردست جنگ ہوئی جس میں خان جہان لودھی اور اس کے بیٹے کے علاوہ دریا خان بھی مارا گیا اس واقع سے شاہ جہان بدظن ہو گیا اور مغل دربار میں نخبتون زعماء کا رسوخ کم ہوتا گیا۔

ادھر جہانگیر کے دور میں شیر خان افغان کو پشاور کا حاکم بنایا گیا تھا تو اس نے بڑی ثابت قدمی سے روشنائیوں کے خلاف مہموں میں حصہ لیا تھا۔ مغل فرمانروا شیر خان کی ان وفادارانہ خدمات پر بہت خوش تھے۔ لیکن بعد میں جانے حالات نے کیا کروٹ لی کہ اسی شیر خان کا بیٹا کمال الدین مغل دربار سے بگڑ بیٹھا۔ اس نے اعلانیہ علمِ بغاوت بلند کیا اور روشنائیوں کے سربراہ عبدالقادر کے ساتھ مل کر مغلوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگا۔

عہدِ شاہ جہانی میں سرحدی پالیسی میں ایک اور تبدیلی بھی آئی، مغلوں اور یوسف زئی کے مابین جو مخاصمت اکبر بادشاہ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی اس میں بہت کمی واقع ہو گئی اور تعلقات رفتہ رفتہ بہتر ہونے لگے۔

اکبر نے یوسف زئی کے خلاف جو مہم بھیجی تھی وہ نہ صرف بُری طرح ناکام ہوئی بلکہ اس میں اکبر کا چہیتا مصاحب بیربل ہلاک ہو گیا تھا جس پر مغلیہ دربار نے یوسف زئی کے خلاف سرگرمیاں تیز تر کر دی تھیں، تاہم انہی دنوں جب نیلی سڑک کی حفاظت قبیلہ خٹک کے سپرد کی گئی تھی، خٹکوں نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا تو مغلوں کی نگاہ میں ان کی عزت بڑھ گئی۔ اپنے اس تقرب سے فائدہ اٹھا کر خٹک آئے دن یوسف زئی کے خلاف نبرد آزما رہتے۔ شاہ جہان اقتدار سنبھالنے کے بعد صوبہ سرحد آیا تو خٹک قبیلہ کی سربراہی پر خوشحال خان فائز تھا۔ خوشحال خان نے بادشاہ کا ساتھ دیا۔ کابل

اور بدخشاں کے سفر میں خوشحال خان مغل فرمانروا کا ہمرکاب رہا ـــــ درّہ خیبر سے گزرتے وقت بھی اس نے مغلوں کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی ۔ بادشاہ سے خوشحال خان کے یہ دوستانہ تعلقات یوسف زئی زعماء پرگراں گزرتے ، یوسف زئی کی سرداری کا فخر ان دنوں بہاکو خان خدوخیل کو حاصل تھا ۔ بہاکو خان نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ مغلوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے چنانچہ وہ دہلی گیا اور داراشکوہ کی وساطت سے شاہ جہان سے ملاقی ہوا ۔ اس نے بادشاہ کو اپنی دوستی اور خیر سگالی کا یقین دلایا ۔ شاہ جہان نے بھی یوسف زئی سے صلح کا ہاتھ بڑھانے ہی کو قرینِ عقل سمجھا ۔ اس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے بہاکو خان کی سرداری کی توثیق کر دی ۔ انہی دنوں بہاکو خان نے سوات کے نواح میں ایک کافر قبیلے کے مقبوضہ علاقے ڈوما پر چڑھائی کر کے اسے فتح کیا تو وہاں کے لوگ رفتہ رفتہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے ۔ اس طرح بہاکو خان کی طاقت اور ناموری میں بہت اضافہ ہو گیا ۔ یوسف زئی لوگوں کی سیادت خوشحال خان کو نہ بھاتی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں اور خٹکوں کی خانہ جنگی طویل عرصے تک جاری رہی ۔ شاہ جہان کی موت کے بعد جب تخت نشینی کے لئے مختلف شہزادوں میں کشمکش چل نکلی تو بہاکو خان یوسف زئی نے داراشکوہ کا ساتھ دیا جبکہ خوشحال خان خٹک اور اس کے پیروکار اورنگ زیب کو بادشاہ بنانے کے لئے سرگرم رہے ۔ بالآخر اورنگ زیب بادشاہ بنا تو اس کا دل یوسف زئی کی طرف سے میلا ہو گیا ۔ اُدھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اورنگ زیب اور خوشحال خان میں اختلافات بڑھتے گئے اور سارا صوبہ سرحد کشت و خون کی وارداتوں کی آماج گاہ بن گیا ۔

شاہ جہان ہی کے عہد میں روشنائیہ تحریک کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ اس تحریک نے اکبر بادشاہ کے زمانے ہی سے صوبہ سرحد میں بڑی سیاسی ہل چل مچا رکھی تھی ، مذہبی قیادت کی آڑ میں بایزید انصاری کے ارادت مند اپنے سیاسی مقاصد کو بھی بروئے کار لانے لگے تھے ، چونکہ یہ تحریک صوبہ سرحد ہی میں پیدا ہوئی تھی ۔ یہیں پروان چڑھی تھی ۔ اس کی قیادت یہیں کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اس کے پیروکار بھی سب کے سب پختونخواہ کے باشندے تھے اس لئے قدرتاً اس تحریک نے کچھ نہ کچھ نسلی اور وطنی رنگ اختیار کر لیا تھا اس لئے اسے دبانے میں مغلوں کو سخت مشکل پیش آ رہی تھی ۔

روشنائیہ پیر احداد ۱۶۲۶ء میں مارا گیا تھا، ۱۶۲۸ء میں شاہ جہان بادشاہ بنا تو اس نے احداد کے قاتل مغل سردار ظفر خان کی بڑی قدر افزائی کی اور اُسے اس خدمت کے صلے میں کابل کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔

اُدھر احداد کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بی بی علائی نے اپنے فرقہ کی قیادت خود سنبھال لی، وہ بڑی معاملہ فہم، مدبر اور صاحب اثر خاتون تھی۔ تاہم بعض لوگ عورت کی قیادت کو دل ہی دل میں اچھا نہ سمجھتے تھے۔ بی بی علائی کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ارادتمندوں سے اپنے بیٹے عبدالقادر کو قائد تسلیم کرالیا۔ انہی دنوں صوبہ سرحد کے ایک سابق مغل گورنر شیر خان کا بیٹا کمال الدین مغلوں سے باغی ہو کر "روشنائیوں" سے جا ملا اور ان کے ساتھ اتنا گھل مل گیا۔ کہ عبدالقادر اور کمال الدین یک جان دو قالب ہو کر رہ گئے۔ کمال الدین کو "کمالہ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ عوام اسے جلالہ (بایزید پیر روشن کے بیٹے جلال الدین) کا بھائی بناتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ دریائے سندھ میں اٹک کے مقام پر دو سیاہ چٹانیں ہیں۔ جنہیں "جلالہ" اور "کمالہ" کہا جاتا ہے، یہ چٹانیں انہی دو افراد کے نام سے منسوب ہیں۔ عبدالقادر اور کمال الدین کے اتحاد نے روشنائیہ تحریک میں نئی جان ڈال دی اور وہ ایک بار پھر مغلوں پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔

ادھر کابل کا گورنر بننے کے بعد ظفر خان اپنے اہل و عیال اور محافظ دستے کے ساتھ درہ خیبر کی راہ عازم جلال آباد ہوا تو راہ میں آفریدی، اورک زئی اور منگش کے ایک بہت بڑے "روشنائی" لشکر نے انہیں تہتر ڑہ کی پہاڑیوں میں گھیر لیا۔ ظفر خان خود تو گر تا پڑتا۔ چھپتا چھپاتا کابل پہنچ گیا۔ تاہم اس کا سارا ساز و سامان قبائل کے ہاتھ لگا۔ یہاں تک کہ اس کے حرم کی خواتین بھی "روشنائیہ" لوگوں نے گرفتار کر لیا۔ بعد میں بڑی مشکل سے سید خان حاکم کوہاٹ نے ان میں سے صرف ایک خاتون کو زر فدیہ دے کر رہا کرایا۔

اس کامیابی سے "روشنائی" تحریک میں جان پڑ گئی ـــــ آفریدی، منگش، اورک زئی، طوری ترا تری، شیتک، لوہانڑی اور محمد زئی دھڑا دھڑ بایزید انصاری کے حلقے میں شامل ہو گئے، صرف خلیل، مہمند اور خٹک اس تحریک سے علیحدہ رہے۔ جب روشنائیوں نے اپنی طاقت بڑھتی ہوئی

دیکھی تو جون ۱۶۳۰ء میں خیبر ایجنسی میں دریائے باڑہ کے قریب "الم گدڑ" کے مقام پر ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کیا۔ اس اجتماع میں سارے صوبے پر اقتدار جمانے کے منصوبے بنائے گئے اور فیصلہ ہوا کہ پشاور شہر پر حملہ کر کے قلعہ بالاحصار کو فتح کر لیا جائے۔ پشاور میں ان دنوں مغلوں کی فوج زیادہ تعداد میں نہ تھی۔ اس لئے بالاحصار کے قلعہ دار کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ محصور ہو کر بیٹھ گیا اور "یاغیوں" نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ خبر مغل دربار میں پہنچی تو فوری طور پر پشاور کو کمک بھیجنے کا فرمان جاری ہوا۔ چنانچہ کشمیر سے جلال خان کاکڑ اور کوہاٹ سے سید خان اپنے اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر عازمِ پشاور ہو گئے۔

سید خان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نہ صرف مردِ میدان تھا بلکہ سیاسی آثار چڑھاؤ کا ماہر بھی۔ اس نے بی بی علائی کے لشکر میں آدمی بھیج کر گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا اور کچھ روشنائی سردار کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ علاوہ ازیں چونکہ بی بی علائی کا لشکر مختلف قبیلوں پر مشتمل تھا اور ان میں وحدتِ فکر و عمل ناپید تھی، اس لئے ہر ایک یہی کوشش کرنے لگا کہ اس جنگی مہم کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اسی کے ہم قبیلہ لوگوں کو ملے۔ آپس میں نااتفاقی اور بے اعتمادی کی یہ خبریں پیر عبدالقادر تک پہنچیں تو سخت گھبرایا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر عین موقع پر کوئی قبیلہ ساتھ چھوڑ گیا اور مغل غالب آ گئے تو وہ "روشنائیوں" سے دل کھول کر انتقام لیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی عبدالقادر راتوں رات تیراہ کو بھاگ گیا جو نسبتاً محفوظ علاقہ تھا اور جہاں تک مغلوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تھا ـــــ صبح ہوتے ہی حملہ آور لشکر کے دوسرے دستوں کو اپنے قائد کے فرار کی خبر ملی تو وہ سکتے میں آ گئے۔ اُدھر سید خان ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے جوانوں کو ساتھ لے کر پشاور پہنچا اور "روشنائیوں" پر اچانک حملہ کر دیا۔ وہ لوگ اس غیر متوقع اور اچانک وار سے حواس باختہ ہو گئے اور ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ سید خان کے لشکر نے بھاگنے والوں کا تعاقب کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ بہت سے بھاگنے والوں کو شہر کے کوچہ و بازار میں پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ اس قتل و غارت کے بعد مغلوں کا کھویا ہوا وقار پشاور میں بحال ہو گیا اور لوگ "روشنائی" تحریک سے برگشتہ اور بیزار ہو گئے۔

شاہ جہان نے اس کامیابی پر سید خان کو گورنر کے عہدہ پر ترقی دے دی، بہت سے انعام و اکرام

کے علاوہ اسے پنجہزاری منصب عطا کیا گیا ـــــ سید خان کی جگہ راجہ جگت سنگھ کو کوہاٹ اور کرم کا حاکم مقرر کیا گیا جس نے بہت کامیابی سے اپنے فرائض منصبی ادا کئے۔

گورنر بننے کے بعد سید خان نے روشنائی فرقہ کے خلاف جارحانہ کارروائی ختم کر دی اس کے برعکس سیاسی گفت وشنید کے ذریعے بی بی علائی اور عبدالقادر کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اس نے انہیں ضمانت دی کہ اگر وہ اپنی کارروائیاں بند کر دیں تو شاہی دربار کی طرف سے ان کی ہر ممکن عزت اور قدر کی جائے گی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بی بی علائی کا ایک بھائی اللہ داد تھا۔ اس زمانے سے جب بایزید انصاری نے مہابت خان سے شکست کھائی۔ اللہ داد نے جہانگیر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ عین ممکن ہے کہ مغلیہ حکومت نے اسی اللہ داد کے ذریعے بی بی علائی اور عبدالقادر کو رام کرنے کی کوشش کی ہو یا دباؤ ڈالا ہو، بہرحال جن دنوں صلح کی گفت وشنید جاری تھی عبدالقادر بیمار ہو کر طبعی موت مر گیا اور معاہدے کے مطابق بی بی علائی اور اس کے اہل خانہ کو اللہ داد کے ہمراہ دہلی بھیج دیا گیا۔

دہلی پہنچنے پر شاہجہان نے بی بی علائی اور اس کے ہمراہیوں سے بیحد عمدہ سلوک کیا انہیں ہر طرح کا آرام دیا گیا۔ اللہ داد کو مغل دربار سے رشید خان کا خطاب عطا ہوا۔ ان لوگوں کو فرخ آباد میں بہت بڑی جاگیر دی گئی۔ رشید خان وہیں پر ۱۶۴۷ء میں فوت ہو گیا۔ البتہ بی بی علائی بعد میں بھی کئی سالوں تک زندہ رہی۔

پشتو زبان کا مشہور ادیب اور شاعر مرزا خان انصاری (جو پیر روشن کا پوتا تھا) بھی اسی قافلے میں دہلی گیا تھا۔ اسے شاہ جہان کی طرف سے فوج میں بہت بڑا منصب دیا گیا اور وہ دکن میں ایک جنگ کے دوران مغلوں کی طرف سے لڑتا ہوا ۱۶۳۶ء میں فوت ہو گیا، اس طرح روشنائیہ تحریک اس طرح ختم ہو گئی کہ آج اس کا کوئی نام لیوا تک صوبہ سرحد میں نہیں ملتا۔

شاہ جہان کے عہد میں قندہار میں ایران اور مغلیہ حکومت ہند کے مابین فوجی کارروائیاں متواتر جاری رہیں، ۱۶۳۸ء میں مغلیہ فوج نے قندہار کا محاصرہ کیا۔ ان دنوں علی مردان خان نامی حاکم وہاں ایران کی جانب سے گورنر تھا ـــــ حکومت ایران سے اس کے شدید اختلافات تھے، اس لئے وہ درپردہ شاہ جہان کے درباریوں سے مل گیا اور قندہار مغلوں کے حوالے کر دیا۔ شاہ جہان

نے علی مردان خان کی بہت قدر و منزلت کی۔ اسے پنجاب اور دکن کا گورنر بنایا گیا۔ شالامار باغ لاہور اُسی نے بنوایا تھا۔ پشاور کی مشہور مسجد کا بانی مہابت خان اسی علی مردان خان کا بیٹا تھا۔ اس طرح ۱۶۳۸ء میں تو قندہار مغلوں کے زیرِ نگین آگیا۔ لیکن ۱۶۴۹ء میں ایران کے صفوی بادشاہ نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس پر شاہ جہان نے فوجی مہم بھیجی جو ناکام رہی، ۱۶۵۲ء اور ۱۶۵۳ء میں پھر شہزادہ اورنگ زیب کی کمان میں قندہار فتح کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ان مہمات پر بیس کروڑ روپیہ خرچ ہوا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سمتھ کا قول ہے کہ ان ناکامیوں سے مغلیہ سلطنت کا رُعب اٹھ گیا اور سارے مقبوضات میں بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ چل پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مغلوں کی ہوا اکھڑ گئی۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے عہد میں اس زوال کا اثر زیادہ نمایاں طور پر سامنے نہ آیا لیکن بعد میں حکومت کی یہ کمزوری اس حد تک پہنچ گئی کہ ساری سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی اور ہر علاقے کا حاکم خود مختار ہو کر رہ گیا۔ گویا سلطنت مغلیہ کا جو زوال شاہ جہانی دَور سے شروع ہوا تھا۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں انتہا کو پہنچ گیا اور مغلوں کی حکومت کے ساتھ ہی برصغیر پر مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر رہ گیا۔

اورنگ زیب

آخری عمر میں شاہ جہان ایک موذی مرض کا شکار ہو کر کافی عرصہ تک صاحب فراش رہا اس کے بیٹوں نے یہ حال دیکھ کر تاج و تخت پر قابض ہونے کی کوششیں شروع کر دیں، خانہ جنگی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ بالآخر ۱۶۵۸ء میں شہزادہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کامیاب ہو کر مغلیہ سلطنت کا تاجدار قرار پایا۔

شاہ جہان کے زمانے میں قندہار کی فوجی مہمات بُری طرح ناکام ہوئی تھیں، ان مہموں پر نہ صرف کروڑوں روپیہ خرچ ہوا بلکہ مغلیہ فوج کے بہترین سپاہیوں کے مارے جانے سے فوجی طاقت میں بھی کمزوری آگئی۔ اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی قندہار کی مہمات سے ہاتھ اٹھا لینے کا دانش مندانہ فیصلہ کیا اور ساری توجہ دکن اور دوسرے علاقوں کی شورشیں فرو کرنے پر مبذول کر دی، تاہم وہ صوبہ سرحد کی طرف سے بھی غافل رہنے نہ پایا اور اس کے عہدِ حکومت میں سرحدی علاقوں میں سیاسی سرگرمیاں پورے عروج پر رہیں۔

شاہ جہان کے بیٹوں کی جنگ تخت نشینی کے دوران یوسف زئی قبیلہ نے اپنے سردار بہاکو خان کی قیادت میں شہزادہ داراشکوہ کا ساتھ دیا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ جب داراشکوہ کا حریف اورنگ زیب بادشاہ بنا تو لازماً اس کا دل سرحد کے یوسف زئیوں سے میلا تھا اور وہ ہر قیمت پر ان سے نمٹنا چاہتا تھا۔

اس جنگِ تخت نشینی میں جہاں یوسف زئی داراشکوہ کی حمایت کر رہے تھے۔ وہیں خوشحال خان خٹک اور اس کا قبیلہ اورنگ زیب عالمگیر کا طرفدار تھا، ایک موقع پر یوسف زئی نے دریائے اٹک کی کشتیوں پر قبضہ کر لیا تاکہ داراشکوہ کے لئے راستہ کھلا رکھا جائے لیکن خوشحال خان کے

چچا فیروز خان نے یوسف زئی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں بہا کو خان خود زخمی ہوا اور اس کے بھائی سید خان مارا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بادشاہ بننے سے خوش حال خان خٹک کے مقاصد کو تقویت پہنچی، اس نے یوسف زئی پر بڑھ چڑھ کر حملے شروع کر دیئے، ۲۷ اگست ۱۶۶۱ء سے ۱۵ اگست ۱۶۶۲ء تک دونوں قبیلوں میں کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ ان معرکوں میں ملک جانم امانزئی (یوسف زئی) مارا گیا اور پیر کمال گرفتار ہوا۔ خٹکوں نے دریائے کابل کے بائیں کنارے کے کئی یوسف زئی دیہات پر قبضہ کر لیا۔ خٹکوں کی طاقت بڑھی تو انہوں نے ضلع کوہاٹ کی طرف بھی پیش قدمی کی اور کالا باغ کے علاقے تک قبضہ کر لیا۔

۱۶۶۱ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے چند مصلحتوں کی بنا پر مہابت خان لہراسپ گورنر پشاور اور اس کے نائب میر یعقوب کا تبادلہ کر کے ان کی جگہ سید امیر خان کو گورنر اور عبدالرحیم کو نائب مقرر کر دیا۔ اس وقت تک مغل دربار کا دستور یہ تھا کہ پشاور اور کابل کا علاقہ ایک ہی گورنر کے ماتحت ہوتا۔ یہ گورنر سال کا کچھ عرصہ پشاور میں گزارتا اور کچھ کابل میں، جب کہ اس کا نائب مستقلاً پشاور میں قیام پذیر رہتا۔

بتایا جاتا ہے کہ گورنر مہابت خان اور خوشحال خان خٹک کے تعلقات انتہائی دوستانہ تھے لیکن نیا گورنر بالخصوص اس کا نائب عبدالرحیم خٹکوں کی بجائے یوسف زئی پر زیادہ مائل بہ کرم تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی موقع پر خوشحال خان خٹک نے بادشاہ سے شکایت کی تھی کہ سید امیر خان تو سارا وقت نشے میں مست رہتا ہے، اس کے ماتحت سیر و شکار سے دل بہلاتے رہتے ہیں اس لئے وہ یوسف زئی کے معاملات کو سلجھا نہیں سکتے، اس پر مغل گورنر اور اس کا نائب اس ٹوہ میں رہے کہ خوشحال خان کو گزند پہنچائیں۔ چنانچہ جہاں عبدالرحیم نے بہا کو خان سے تعلقات بڑھائے وہیں وہ راہداری محصول بھی معاف کر دیا جو ہر مسافر کو اٹک سے دریائے سندھ پار کرتے وقت ادا کرنا پڑتا تھا۔ یوں تو اورنگ زیب نے بادشاہ بنتے ہی ایسے محصول معاف کر دیئے تھے تاہم صوبہ سرحد کے مخصوص حالات کے تحت اس معافی کا اطلاق یہاں نہ کیا تھا۔ عبدالرحیم نے از خود راہداری کی معافی کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس معافی کی زد براہ راست خٹک قبیلہ پر پڑتی تھی کیونکہ

اٹک سے جو محصول راہداری وصول کیا جاتا وہ انہی کو ملتا تھا۔ مغل حاکموں کے اس روّیے پر خوشحال خان کی برہمی بالکل بجا تھی۔ اس لئے وہ کھچا کھچا رہنے لگا۔ ادھر ۱۶۶۴ء میں گورنر سید امیر خان نے کسی بہانے خوشحال خان کو پشاور کے قلعہ بالاحصار میں بلایا اور دھوکے سے گرفتار کر لیا۔ اس وقت خانِ خٹک کی عمر ۵۱ سال تھی۔ گرفتاری کے بعد اسے دہلی بھیجا گیا۔ جہاں سے اُسے قید کی سزا سُنا کر گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔

خوشحال خان خٹک شاہی عتاب کی زد میں آیا تو یوسف زئی سردار بہا کو خان نے پھر زور پکڑا۔ اس نے بہت بڑی جمعیت کے ساتھ اٹک پار کر کے چھچھ پر حملہ کر دیا۔ وہ چھچھ اور ہزارہ کے میدانی علاقے پر قابض ہونے کا متمنی تھا لیکن یہ علاقہ قلعۂ اٹک کے فوجدار شادمان خان اور مغلیہ حکومت کے دوسرے افسروں کی جاگیر تھا۔ ان لوگوں نے بہا کو خان کی ان زیادتیوں کے خلاف شاہی دربار میں احتجاج کیا۔ اس پر شہنشاہ اورنگ زیب نے یوسف زئی قبائل کے خلاف حملے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ قلعۂ اٹک کا کمانڈر فوجدار خان ایک زبردست لشکر کے ساتھ دریائے سندھ کو پار کر کے ہنڈ پہنچا۔ ادھر پشاور سے راجہ مان سنگھ بھی ایک لشکر لے کر یکم اپریل ۱۶۶۷ء کو اُن سے آن ملا۔ ایک ماہ تک مغلیہ فوج اور یوسف زئی لڑاکے ایک دوسرے کے بالمقابل خیمے لگائے پڑے رہے۔ مغلوں کو یوسف زئی پر حملے کی ہمت نہ پڑتی تھی حتیٰ کہ ۲ مئی کو شمشیر خان کی قیادت میں کابل کے فوجی دستے بھی شاہی لشکر کی مدد کو پہنچ گئے۔ ہنڈ کے قریب فریقین میں گھمسان کا رَن پڑا۔ کئی دن تک مقابلہ ہوتا رہا۔ لڑائی کو طول پکڑتے دیکھ کر مغل سالار شمشیر خان نے یوسف زئی کی توجہ ہٹانے کے لئے پنج پیر شاہ منصور اور مرغز پر بھی حملے شروع کر دیئے۔ فصلیں تباہ ہو گئیں اور بستیاں پیوند زمین کر دی گئیں یہ حال دیکھ کر یوسف زائی نے بھی اِدھر اُدھر قاصد دوڑائے اور اہلِ سوات اور اہل تیراہ سے امداد کے طالب ہوئے۔ آفریدیوں اور اکوزئی کی آمد سے پہلے پہل تو مغلوں کے پاؤں اکھڑتے معلوم ہوئے لیکن بعد میں وہ سنبھلے اور ۲۸ جون ۱۶۶۷ء کو شاہ منصور کے مورچوں پر شاہی لشکر کا قبضہ ہو گیا۔

جُوں جُوں یُوسف زئی کا دباؤ بڑھ رہا تھا شاہی فوج کو مزید کمک پہنچتی جا رہی تھی۔ بالآخر ۲۲ اگست کو محمد امین خان گورنر کابل تازہ دم فوج لے کر میدانِ جنگ میں آن وارد ہوا۔ امین خان

نے نہ صرف فوجی کارروائیوں کو تیز تر کر دیا بلکہ سیاسی چالبازیوں سے بھی کام لیا اور انعام واکرام کا لالچ دے کر اتمان زئی کے ایک لشکر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یوسف زئی کی طاقت کے کمزور پڑتے ہی مغل لشکر آگے بڑھا اور ۲۵ راگست کو اس نے شہباز گڑھ کے قصبہ کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیا۔ اس جگہ سے چھ ہزار مویشی شاہی فوج کے سپاہی ہانک کر لے گئے۔

اس کامیابی کے بعد محمد امین خان کے لشکر نے باجوڑ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ مغل یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ سارے یوسف زئی قبائل کو زیر نگین کر کے ہی دم لیں گے تاہم راجہ بیربل کے لشکر کا حشر بھی ان کے سامنے تھا۔ اس لئے میدانی علاقوں ہی کے لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے بعد انہوں نے واپسی اختیار کر لی اور ۶ راکتوبر کو ہنڈ میں اپنے لشکر کے باقی ماندہ حصے سے جا ملے۔ اب پورے لشکر کی کمان پھر شمشیر خان کے ہاتھ میں آ گئی ـــــ کچھ عرصہ تک تادیبی کارروائیوں میں مصروف رہنے کے بعد مغل لشکر اپنی اپنی چھاؤنیوں کو واپس چلا گیا۔

آفریدی قبائل کو قابو میں رکھنے کے لئے انہی دنوں مغل دربار کی طرف سے راجہ جسونت سنگھ کو جمرود کا حاکم مقرر کیا گیا۔

چونکہ سید امیر خان گورنر پشاور صوبہ سرحد کے سیاسی مسائل کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا اس لئے ۱۶۶۸ء میں بادشاہ اورنگ زیب نے دوبارہ مہابت خان کو حضور کا گورنر بنا کر پشاور بھیج دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مہابت خان ہی کی سفارش پر خان خوشحال خان خٹک کو قید سے رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے کچھ وقت دہلی دربار میں گذارا۔ پھر وہاں سے چل کر اکوڑہ خٹک پہنچ گئے اپنی غیر حاضری میں خوشحال خان نے اپنے بیٹے اشرف خان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ قید سے واپسی پر بھی اسے ہی اپنے قبیلے کی سرداری اور جاگیر پر بحال رہنے دیا اور خود آزادانہ کر سیاست میں حصہ لینے لگے۔

۱۶۷۰ء میں پھر شاہی فرمان کے مطابق مہابت خان کو ہٹا کر اس کی جگہ امین خان کو جو اس سے قبل لاہور کا گورنر رہ چکا تھا صوبہ سرحد کا گورنر بنا کر پشاور میں تعین کر دیا گیا۔ امین خان مشہور مغل سردار میر جملہ کا بیٹا تھا اور اورنگ زیب کا بڑا معتمد علیہ تھا۔ خوشحال خان اور امین خان کے تعلقات ابتداء میں خوشگوار رہے کیونکہ خوشحال خان کی قید کے دوران امین خان نے اس کی

رہائی کے لئے مخلصانہ کوششیں کی تھیں۔ تاہم بعد میں امین خان اور اس کے کارندوں سے کچھ ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے سارے صوبہ سرحد میں شورشیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ایک بار مغل گورنر جمرود میں مقیم تھا کہ پشتون قبائل کے سربرآوردہ افراد کا ایک جرگہ اس سے ملاقات کو آیا۔ کہا جاتا ہے گورنر اس وقت نشے میں دھت تھا اس لئے ارکانِ جرگہ کنٹر کے مغل حاکم فوجدار حسین بیگ خان سے ملے جس نے ان بزرگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ یہ بات پختون سرداروں کے دلوں میں بیٹھ گئی اور وہ مغلوں سے اور بھی زیادہ نفرت کرنے لگے۔

اسی طرح صافی قبیلے کے کچھ لوگ خرید و فروخت کی غرض سے جاتے ہوئے مغلوں کی ایک فوجی چوکی کے سامنے خیمہ زن ہوئے تو حسین بیگ خان فوجدار کنٹر کے کچھ سپاہیوں نے ایک صافی دوشیزہ سے بدسلوکی کی۔ اس پر مقامی رواج کے مطابق صافیوں نے اُن سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور خود فرار ہو گئے۔ حسین بیگ خان کو یہ خبر پہنچی تو اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے صافی ملکوں کو طلب کیا۔ اور ان سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں کو اس کے حوالے کیا جائے۔ صافی ملکوں کے انکار پر حسین بیگ خان نے اپنے حلیف قبائل کا ایک لشکر جمع کر کے صافی علاقے پر دھاوا بول دیا اور صافی مہمندوں کو سخت نقصان پہنچایا ـــــ جنگ ختم ہوئی تو صافی ملک ہر ایک قبیلے کے پاس گئے اور انہیں صافی دوشیزہ کی آبروریزی کا واقعہ سُنا کر قومی ننگ و ناموس کا واسطہ دیا۔ اس پر خیبر اور مہمند علاقوں کے سارے قبیلے مغلوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور موقع کی تلاش میں رہے کہ مغلوں سے انتقام لیں۔

اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ مغل گورنر موسم گرما کابل میں گزارا کرتا اور موسم سرما پشاور میں۔ تاہم اس کا ایک نائب الحکومۃ مستقلاً پشاور میں رہا کرتا۔ ۱۶۷۲ء میں جب گورنر امین خان نے کابل کا عزم کیا تو حسین بیگ خان نے اسے قبائل میں پھیلے ہوئے غیظ و غضب سے آگاہ کیا تو اس نے احتیاطاً کافی فوج اپنے ساتھ لے لی تاکہ لڑائی کی صورت میں اپنا اور شاہی خزانے کا بچاؤ کر سکے۔ اس موقع پر تپہ مہمند کے ارباب مستجاب خان اور خوشحال خان خٹک بھی محمد امین خان کے ہمراہ تھے۔ جمرود پہنچنے پر امین خان کو معلوم ہوا کہ راستہ بند ہے اور درّہ خیبر پر آفریدی نوجوان مورچے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اس پر اس نے مہمند ارباب کو جرگہ کا سربراہ بنا کر آفریدیوں کے ساتھ گفت و شنید

کے لئے بھیجا تاہم قبائلی مغلوں کی کوئی بات سُننے کے روادار نہ ہوئے اور جرگہ بے نیل ومرام واپس آگیا۔
مغل گورنر کے لئے اب کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ پیچھے ہٹنا اپنی شکست کو تسلیم کرنا تھا، اس لئے مجبوراً اس نے پیش قدمی ہی کا فیصلہ کیا۔ خوشحال خان خٹک کے بیان کے مطابق مغل گورنر کے پاس اس وقت چالیس ہزار سپاہی اور بہت سے جنگی ہاتھی تھے، امین خان ایک مالدار حاکم تھا اس لئے اس کا ذاتی اثاثہ اور بیگمات بھی ساتھ تھیں۔ مغل فوج کی پیش قدمی پہلے پہل تو کامیابی سے جاری رہی، جمرود۔ علی مسجد اور لنڈی کوتل تک پہنچنے میں اسے کامیابی حاصل ہوئی لیکن لنڈی کوتل سے لنڈی خانہ تک آفریدی شنواری۔ صافی۔ مہمند اور ملاگوری قبیلوں پر مشتمل ہزاروں افراد راستے کے دونوں طرف پہاڑیوں پر مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ مغل فوج نے جنگی ہاتھیوں کی مدد سے آگے بڑھنے اور راستہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مغل توپ خانہ بے دریغ گولے برساتا رہا۔ اُدھر پختون قبائل نے سنگروں سے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ سنگ باری اتنی شدید تھی کہ جنگی ہاتھی چنگھاڑتے چیختے ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ مغل سپاہی مکمل طور پر قبائلیوں کے نرغے میں آگئے۔ ان کی صفوں میں ایسی افراتفری مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ خود امین خان اپنے ایک وفادار پختون ملازم کے راستہ دکھانے پر علی مسجد کی راہ بھاگ کر پشاور پہنچا۔ ایسی تباہی مچی کہ چالیس ہزار میں سے مغلوں کے صرف چار سپاہی جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ خود مغل گورنر کے حرم کی خواتین تک قبائلیوں کی قید میں چلی گئیں ـــــ بعد میں کوہاٹ کے مغل حاکم نے بمشکل تمام امین خان کی ایک بیوی کو بہت سا زرِ فدیہ دے کر چھڑایا۔ سارا مال واسباب، خزانہ اور اسلحہ قبائلیوں کے ہاتھ لگا۔ اس مالِ غنیمت سے ہر قبائلی نے ہاتھ رنگے اور ہر شخص کچھ دنوں کے لئے مالدار بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقعے پر قبائلی لشکر کی کمان ایمل خان اور دریا خان کر رہے تھے۔ خوشحال خان خٹک کے بارے میں خیال یہ ہے کہ اس نے محض ذاتی دوستی کی بنا پر امین خان کا ساتھ دیا تھا ورنہ وہ دل ہی دل میں مغلوں کی حکومت سے بھرا بیٹھا تھا۔

درہ خیبر کا یہ حادثہ ۸ مئی ۱۶۷۲ء کو پیش آیا۔ مغلوں کے لئے یہ شکستِ فاش موت کا پیغام ثابت ہوئی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے خبر ملتے ہی لاہور کے گورنر فدائی خان کو ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ امین خان کی مدد کے لئے پشاور بھیجا۔ فدائی خان نے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا

کہ اس سانحے میں لازماً ارباب مستجاب خان کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ اس نے ارباب مستجاب خان کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ خوشحال خان خٹک نے اس موقع پر مصلحت سے کام لیا اور اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو اکوڑہ خٹک سے نظام پور منتقل کر لیا تاکہ مغل لشکر کی دسترس سے محفوظ رہے، خٹک خان کی یہ پالیسی کامیاب رہی۔ فدائی خان ضروری انتظامات کرنے کے بعد لاہور واپس روانہ ہو گیا۔ ادھر شہنشاہ اورنگ زیب نے محمد امین خان کو پشاور کی گورنری سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ دوبارہ مہابت خان صوبہ سرحد کی گورنری پر فائز ہو گیا۔

مہابت خان سے خوشحال خان خٹک کے تعلقات بڑے دوستانہ نوعیت کے تھے۔ اس لئے مہابت خان نے آتے ہی خان خٹک کا تعاون حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ تاہم خوشحال خان مہمند ارباب مستجاب خان کا حشر دیکھ چکا تھا وہ کسی طرح بھی مغلوں سے تعاون پہ تیار نہ ہوا۔ یہ حال دیکھ کر مہابت خان نے سیاسی چالبازیاں شروع کیں۔ خوشحال خان خٹک کی گرفتاری کے بعد ——— خٹک قبیلہ کی سربراہی اور منصب داری اس کے بیٹے اشرف خان کو تفویض ہوئی تھی لیکن اشرف خان کا بھائی بہرام خان اس فیصلے سے ناخوش تھا۔ مغل گورنر نے بہرام خان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اشرف خان کو معزول اور قید کر کے خانی بہرام خان کے سپرد کر دی۔ بدقسمتی سے بہرام خان نے اپنے والد سے بھی حسن سلوک کا مظاہرہ نہ کیا اور اس طرح خوش حال خان خٹک خانہ جنگی کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

اس طرح حالات نے خوشحال خان خٹک کو مغلوں کے خلاف ہتھیار سنبھالنے پہ مجبور کر دیا۔ خوشحال خان اور دریا خان آفریدی نے مل کر کوہاٹ پہ حملہ کر دیا اور مغلوں کو خاصا نقصان پہنچایا یہ حال دیکھ کر شہنشاہ اورنگ زیب نے شجاعت خان اور مہاراجہ جسونت سنگھ (حاکم جمرود) کو بہت بڑی فوج دے کر مخالفوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا، یہ دونوں جرنیل اپنے اپنے لشکر کے ساتھ پشاور پہنچے اور درہ خیبر کا خطرناک راستہ اختیار کرنے کی بجائے علاقہ مہمند کے راستے کابل کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ جب مغل لشکر شبقدر اور گندہاب سے گزر کر درہ کڑپہ پہنچا تو ان کا سامنا قبائلی مجاہدوں سے ہوا۔ سخت سردی کے دن تھے۔ مغل لشکر اس درہ میں مقیم تھا کہ رات کے اندھیرے میں قبائلیوں نے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔ گولیوں اور پتھروں کی وہ بے پناہ بارش

ہوئی کہ مغلوں کے پاؤں اکھڑ گئے انہیں راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت نہ تھی۔ اس لئے جدھر کسی کو راستہ ملا اُدھر بھاگ اٹھا۔ کافی نقصان ہوا۔ ابھی مغل لشکر اس صدمے سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ پو پھٹتے ہی قبائلیوں نے ایک اور بہت بڑا حملہ کر دیا۔ دست بدست لڑائی شروع ہو گئی جس میں شجاعت خان لڑتے ہوئے مارا گیا اور جسونت سنگھ گرتا پڑتا بچے کھچے سپاہیوں کو ساتھ لے کر پشاور پہنچا۔

کڑپہ کا سانحہ مغلوں پر بجلی بن کر گرا۔ چنانچہ جب اس تباہی کی خبر شہنشاہ اورنگ زیب کو پہنچی تو اس نے یہی فیصلہ کیا کہ خود موقع پر پہنچ کر حالات پر قابو پائے ——— وہ ۶ اپریل ۱۶۷۴ء کو دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ جون ۱۶۷۴ء کو حسن ابدال پہنچا۔ شہنشاہ نے یہاں ٹھہر کر مختلف اطراف کو لشکر بھیجا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ نے مختلف سرحدی زعماء کو ساتھ ملانے کی کوششیں بھی تیز تر کر دیں۔ چنانچہ اس نے جمرود کے حاکم جسونت سنگھ کی وساطت سے خوشحال خان خٹک کو بھی ملاقات کے لئے بلایا لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ یہ بدگمانی اتنی بڑھ چکی تھی کہ دونوں فریقوں کے دل ایک دوسرے سے صاف نہ ہو سکے بلکہ خوشحال خان خٹک اب یہ کوشش کرنے لگا کہ سارے پختون قبائل کو ساتھ ملا کر مغلوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرے۔ مگر اسے اس سلسلے میں مطلوبہ کامیابی حاصل ہونے نہ پائی۔

حالات کا جائزہ لینے کے بعد اورنگ زیب نے کڑپہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایک لشکر نواب مکرّم خان اور شمشیر خان ایسے جہاندیدہ سرداروں کی کمان میں علاقہ مہمند کو بھیجا۔ مکرّم خان نے پہلے پہل کامیابی سے پیش قدمی جاری رکھی اور کڑپہ فتح کر لیا۔ تاہم جب کڑپہ سے گزر کر وہ شمال میں خاپش کے درّہ میں پہنچا تو وہاں امیل خان اور دریا خان کو اپنا لشکر لئے مقابلے کے لئے تیار پایا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ قبائلیوں نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ مغل سپاہی ان کے تعاقب میں آگے بڑھے تو ایک گھاٹی میں قبائلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ان پر پتھر برسانے لگے۔ جس پر مغلوں کے لئے جم کر لڑنا ناممکن ہو گیا۔ بہت سے مغل سپاہی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ خود مکرم خان سخت زخمی ہوا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر باجوڑ پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔ مکرم خان کا بھائی شمشیر خان اور بہت سے مغل کمانڈر مارے گئے۔ اس معرکے میں باجوڑ کے ترکلانڑی قبیلے نے بھی مہمندوں اور آفریدیوں کو ساتھ دیا اور اس طرح خاپش میں مغلوں کو وہ شرمناک شکست ہوئی کہ وہ کڑپہ کے

واقع کو بھی بھول گئے۔

جہاں تک یوسف زئی کا تعلق ہے انہوں نے کھُل کر اورنگ زیب کی مخالفت ہرگز نہ کی شہنشاہ نے بھی اسی کو غنیمت جانا کہ یوسف زئی خاموش رہیں۔

۱۶۷۵ء میں جنوبی ہندوستان میں مرہٹوں اور دوسرے مقامی سرداروں کی شورشوں کے پیش نظر اورنگ زیب کو واپس جانا پڑا۔

سال ۱۶۷۶ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے ولی عہد شہزادہ معظم کو "شاہ عالم" کا خطاب دے کر سرحدی مہمات کی کمان اس کے سپرد کر دی، شہزادہ معظم کی درخواست پر میر خان "میر میران" کو امیر خان کا خطاب دے کر صوبہ سرحد کا گورنر بنا دیا گیا۔ شہزادہ اور امیر خان کوچ کرتے ہوئے اٹک پہنچے، شہزادہ کے تعلقات خوشحال خان سے بہت اچھے تھے، اسی اعتماد کی بنا پر اس نے خوشحال خان خٹک کو ملاقات کے لئے بُلا بھیجا لیکن اپنے بیٹوں کی خانہ جنگی اور مختلف قبیلوں کی بے اتفاقی دیکھ کر خان خٹک کا دل سیاست سے بھر چکا تھا، لہٰذا وہ ملاقات کے لئے نہ گیا ـــــ شہزادہ اٹک سے چل کر کچھ عرصہ پشاور میں مقیم رہا۔ جہاں تک ہو سکا اس نے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی۔ اپنے قیام پشاور کے دوران بھی وہ خوشحال خان کے پاس جرگے بھیجتا رہا۔ بالآخر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ خوشحال خان گورنر امیر خان کی ملاقات کو پشاور گیا تو اسے معلوم ہوا کہ امیر خان شہزادہ کی کابل سے واپسی پر استقبال کی غرض سے لنڈی کوتل گیا ہوا ہے، خوشحال خان بھی وہیں پہنچا۔ شہزادہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اسے اپنا منصب اور سرداری پیش کی۔ یہ خبر اورنگ زیب عالمگیر تک پہنچی تو اس نے شہزادے کو ہدایت کی کہ ہر قیمت پر خوشحال خان خٹک کی خوشنودی حاصل کرے لیکن خوشحال خان اس پر آمادہ نہ ہوا۔

مغلوں اور خٹک سرداروں میں یہ خوشگوار دینی تک قائم رہنے نہ پائی۔ امیر خان نے اپنی گورنری کے زمانے میں مختلف پختون قبیلوں کو اپنے ساتھ ملانے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کی یہ پالیسی بھی کامیاب رہی۔ جہاں تک خٹک قبیلہ کا تعلق تھا۔ امیر خان نے اشرف خان کی بجائے بہرام خان کی پیٹھ ٹھونکی، ۱۰۹۲ء میں کسی بہانے اشرف خان کو پشاور بلا کر گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اسے دہلی بھیج دیا گیا، چودہ سال تک گوالیار کے قلعے میں قید رہ کر بالآخر ۱۱۰۶ء میں اشرف خان

وہیں انتقال کر گیا۔ اس کی غیر حاضری میں قبیلہ خٹک کی سربراہی اور منصب بہرام خان خٹک کے ہاتھ لگا۔ مرد شمشیر آزما خوش حال خان خٹک ۱۶۸۹ء میں وفات پا گیا، اورنگ زیب عالمگیر بھی ۱۷۰۷ء کو راہی ملک بقا رہوا۔ اورنگ زیب کے زمانہ اقتدار کے آخری دس سال صوبہ سرحد میں نسبتاً پرسکون رہے۔ کوئی بڑا معرکہ پیش نہ آنے پایا یا خود مغلوں نے بھی پختون قبیلوں سے پنجہ لڑانے میں پہل نہ کی۔ تاہم اس دوران مغلوں کا رعب داب صوبہ سرحد میں ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار اور مطلق العنان تھا، برائے نام مغلوں کی برتری قائم تھی۔

مغلوں اور سرحدی قبائل کی باہمی چپقلش مجموعی طور پر ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے بڑی نقصان رساں ثابت ہوئی۔ اس سے جہاں مغلوں کی حکومت کمزور ہونے لگی وہیں مرہٹوں، بندہ بیراگیوں اور سکھوں کو بھی پر پرزے نکالنے کی جرأت ہوئی۔ ان بغاوتوں، شورشوں اور فتنہ و فساد سے مغلوں کا رعب و وقار ختم ہو گیا اور اورنگ زیب عالمگیر کے فوت ہوتے ہی مغل اقتدار کی بنیادیں کمزور پڑ گئیں۔ ادھر مغلوں سے متواتر برسرپیکار رہنے سے اہل سرحد کو بھی سخت مالی اور جانی نقصان پہنچا۔ ہر طرف بدامنی کا دور دورہ رہنے لگا۔ اقتصادی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی، لوگ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کی بجائے ہر وقت اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بستیاں تباہ ہو گئیں، قحط اور بیماریاں پھوٹ پڑیں اور اہل سرحد کی زبوں حالی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

خوشحال خان خٹک

خوشحال خان خٹک تاریخ صوبہ سرحد کی ایک نامور ہستی ہے وہ ایک جامع الحیثیات انسان تھا اور بے پناہ صلاحیتوں کا مالک، وہ بیک وقت صاحب سیف وقلم تھا۔ میدانِ سیاست کا مردِ میدان بھی تو بزم شعر وادب کا قافلہ سالار بھی۔ اس کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "خوشحال خان وہ مایۂ ناز شاعر ہے جو پٹھانوں کو بیرونی دنیا سے اور بیرونی دنیا کو پٹھانوں سے متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ہے"۔

خوشحال خان خٹک اپنے قبیلہ کے سب سے مشہور سردار ہوئے ہیں۔ ان کا قبیلہ کئی پشتون سے اکوڑہ خٹک کے نواح کا جاگیردار اور مغل دربار میں منصبدار چلا آرہا تھا۔ خٹک قبیلہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جناب عقاب خٹک ایڈووکیٹ رقمطراز ہیں کہ

"۱۵۸۱ء میں اکبر بادشاہ اپنے سوتیلے بھائی مرزا حکیم خان والیٔ کابل کی سرکوبی کو نکلا۔ اٹک پہنچا تو اس کلیدی مقام پر ایک قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہی سڑک کی حفاظت ہو سکے اور رسد رسانی کے کام میں خلل واقع نہ ہو۔ پشاور پہنچ کر اکبر نے علاقے کے تمام معززین کو بلایا اور ان سے شاہی سڑک کی حفاظت کی ضمانت لینا چاہی۔ اس موقع پر ضلع پشاور کے خلیل اور مومند سرداروں نے اکبر سے کہا کہ لوٹ مار تو دریائے کابل کے کناروں پر بسنے والے یوسف زئی اور مندانڑ کرتے ہیں اور بدنام ہم ہو جاتے ہیں۔ اس پر اکبر نے یوسف زئی قبیلے کی سرکوبی کے لئے مہم بھیجی۔ علاوہ بریں سرکردہ لوگوں کے مشورے سے ملک اکوڑ خان خٹک کو اٹک سے نوشہرہ تک سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی۔ اس ذمہ داری کے معاوضے کے طور اسے اکوڑہ کی جاگیرداری اور اٹک کے گھاٹ سے دریائے سندھ عبور کرنے والوں سے راہداری یا ٹول ٹیکس وصول کرنے کا اختیار نامہ بھی عطا کیا۔ اس طرح اکوڑہ کے خٹک سارے علاقے

کے سردار قرار پائے۔ بعد میں کئی نسلوں تک یہ سلسلہ برقرار رہا۔

ملک اکوڑے کی وفات پر اس کا بیٹا ملک یحییٰ خان خٹک اور پوتا خان شہباز خان خٹک اس علاقے کے سردار بنے۔ خوشحال خان اسی شہباز خان خٹک کا نامور بیٹا تھا جو ۱۶۱۳ء میں جہانگیر کے عہد میں پیدا ہوا۔

خٹک اور یوسف زئی قبیلوں کی باہمی چپقلش کی داستان بڑی طویل ہے۔ دونوں کے مابین جنگوں کا سلسلہ ایسا چلا کہ سینکڑوں لوگ اس کی نذر ہو گئے۔ ۱۰۴۷ ہجری میں شاہ جہان بادشاہ نے یوسف زئی کا کچھ علاقہ بارہ ہزار روپے سالانہ ٹھیکے پر شہباز خان خٹک کو دے دیا جس پر دشمنی کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ خوشحال خان خٹک چھوٹی عمر میں سپاہ گری کے فن میں طاق تھا۔ ابھی تیرہ سال کا تھا کہ خٹکوں کو یوسف زئی اور مندانڑ کے خلاف جہانگیرہ کے مقام پر جنگ لڑنی پڑی۔ اس معرکے میں خٹک شکست کھا گئے خود خوشحال خان، اُس کے بھائی اور والد شہباز خان مشکل سے جان بچانے کے قابل ہوئے۔ بعد میں موقع ملنے پر خٹکوں نے یوسف زئی سے انتقام لے کر دل ٹھنڈا کر لیا۔

جنوری ۱۶۴۱ء میں بلڑ نالہ ضلع مردان میں ایک بار پھر خٹک یوسف زئی کے مقابلے میں صف آراء ہوئے، یوسف زئی کو عددی برتری حاصل تھی اس لئے وہاں بھی ان کا پلہ بھاری رہا۔ اسی جنگ کے دوران ایک تیر خان شہباز خان کی کنپٹی پر لگا جس سے وہ زخمی ہو کر چند دنوں بعد راہی ملک بقاء ہوا۔ یہ لڑائی ۱۲ جنوری، جمعہ کو ہوئی تھی اور شہباز خان کی وفات ۱۸ جنوری ۱۶۴۱ء کو واقع ہوئی۔

باپ کی وفات کے بعد سارے قبیلے نے متفقہ طور پر خوشحال خان خٹک کو اپنا سردار منتخب کیا۔ اُس وقت اس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ خٹک قبیلہ چونکہ مغلوں کا حلیف تھا، اس لئے مغلوں کی طرف سے خوشحال خان خٹک نے کئی مہموں میں حصہ لیا۔ کانگڑہ اور تارا گڑھ کی تسخیر میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے جس پر بادشاہ نے خانِ خٹک کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا اور اس کے منصب میں اضافہ کر دیا۔

فروری ۱۶۴۴ء میں شہنشاہ شاہجہان نے شہزادہ مراد بخش کو پچاس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج دے کر بلخ اور بدخشان کی تسخیر کے لئے لاہور سے روانہ کیا۔ پشاور پہنچنے پر مغل شہزادے نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حکم دیا کہ لشکر کا کچھ حصہ درہ خیبر کے راستے سے اور کچھ علاقہ بنگش (ہنگو، پاڑہ چنار) کی راہ جائے اور کابل پہنچ کر دونوں لشکر آپس میں مل جائیں۔

قیام پشاور کے دوران شہزادے نے خلیل، مہمند، گگیانی، آفریدی، اورک زئی اور بنگش قبیلوں کو بھی فراہمیٔ لشکر کا حکم دیا اور خوشحال خان خٹک سے بھی ایک ہزار سپاہی مہیا کرنے کو کہا گیا اور مصارف کے لئے اُسے نو ہزار روپیہ بھی ادا کیا۔ خود شہنشاہ مہم کی نگرانی کے لئے اپریل ۱۶۴۶ء کو بہ نفسِ نفیس حسن ابدال تک آیا۔ شہزادہ مراد بیس دن تک پشاور میں مقیم رہا اور پھر امیر الامراء علی مردان خان کے ساتھ عازمِ کابل ہوگیا۔ اس سفر میں خوشحال خان بھی مغل فوج کے ہمراہ تھا۔ لشکر کو اس دوران بڑی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں تاہم بلخ پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ شہزادہ مُراد نرم مزاج شخص تھا۔ اس نے اتنی سختیاں کبھی دیکھی نہ تھیں۔ اس نے بادشاہ کو خط لکھ کر دہلی واپس جانے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے شہزادہ کے اس خط کو اس کی کمزوری پر محمول کیا اور اسے معزول کر دیا۔ بلخ کی پاسبانی اور صوبہ داری بہادر خان کو تفویض کر دی گئی۔

جنوری ۱۶۴۹ء میں شاہ جہان کو پتہ چلا کہ شاہِ ایران نے قندہار پر حملہ کر دیا ہے۔ اس پر اُس نے ایک فوج شہزادہ اورنگ زیب کی کمان میں قندہار کی مہم کے لئے بھیجی۔ جملۃ الملک سعد اللہ خان اور خوشحال خان کے مہربان دوست بہادر خان بھی لشکر کے ساتھ تھے۔ بہادر خان اپنے سپاہیوں سمیت اکوڑہ خٹک میں خوشحال خان کا مہمان ہوا۔ بعد میں اس نے شیخ رحمکار (حضرت کاکا صاحب) کی خدمت میں حاضر ہو کر تین ہزار روپیہ نذرانہ پیش کیا اور دعا کی درخواست کی۔

شاہ جہان اپریل ۱۶۴۹ء میں اٹک کو عبور کر کے صوبہ سرحد میں وارد ہوا۔ خوشحال خان خٹک نے اس سے ملاقات کی اور بادشاہ کو علاقے کی سیاسی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ شاہ جہان نے اُس سے خٹکوں اور یوسف زئی کی باہمی رقابت کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ خوشحال خان خٹک شاہ جہان کی رکاب میں رہا۔ اور درّہ خیبر سے گزر کر ڈکّہ (سرحد افغانستان) تک اسے وداع کر کے واپس اکوڑہ خٹک پہنچا۔

خوش حال خان خٹک کے مراسم شیخ رحمکار المعروف حضرت کاکا صاحب سے انتہائی نیاز مندانہ تھے۔ جون ۱۶۵۳ء میں کاکا صاحب نے وفات پائی اور خوشحال خان ان کی تجہیز و تکفین میں شامل رہا۔

دسمبر ۱۶۵۲ء میں قبیلہ خٹک کو کوہاٹ کے بنگش سردار شیر محمد خان سے لڑنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ شیر محمد خان علاقہ بولاق اور تری کی جاگیر بادشاہ سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ خٹکوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔

خوشحال خان نے اپنے تایا بہادر خان کی کمان میں ایک لشکر کوہاٹ کی طرف بھیجا۔ خوشحال خان کا بیٹا اشرف خان بھی لشکر کے ہمراہ تھا۔ کوہاٹ کے نواح میں شیر محمد خان بنگش اپنے جانبازوں کو لے کر مقابلے کے لئے نکلا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی بنگش سردار کا چچا (جس کا نام بھی بہادر خان تھا) گولی لگنے سے مارا گیا۔ اس پر بنگشوں کے حوصلے پست ہو گئے اور میدان خٹکوں کے ہاتھ رہا۔ بعد میں کئی مقامات پر خٹک اور بنگش قبیلوں کی مٹھ بھیڑ ہوئی لیکن ان تمام معرکوں میں خٹک ہی کامیاب ہوتے رہے بنگش قبیلہ کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور اس کے تین سو آدمی لڑائیوں میں کام آئے۔

شاہ جہان کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے بڑے خونی جھگڑے ہوئے۔ اس خانہ جنگی میں خوشحال خان خٹک نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا جبکہ یوسف زئی داراشکوہ کی طرفداری کرتے رہے۔ بالآخر اورنگ زیب تختِ حکومت حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور اس طرح خٹک قبیلہ کو اور بھی تقویت مل گئی۔

انہی دنوں یوسف زئی کی شاخوں امازئی اور کمال زئی سے خٹکوں کے کئی معرکے ہوئے۔ اس دوران مہابت خان صوبہ سرحد اور کابل کا گورنر تھا۔ ۱۵۷۰ء۔ ۱۶۵۹ء میں تیراہ کے آفریدی اور ادرکئی مغلوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ صوبہ دار مہابت خان کی طرف سے پشاور کے دیوان (نائب الحکومتہ) میر یعقوب کو ایک فوج دے کر باغیوں کی سرکوبی کے لئے تیراہ بھیجا گیا۔ خوشحال خان خٹک بھی اس مہم میں بادشاہی فوجوں کے ہمراہ تھا۔ مغلوں کو مہم میں کامیابی ہوئی۔ جب خوشحال خان خٹک اس مہم کے بعد واپس اکوڑہ خٹک جاتے ہوئے کوہاٹ پہنچا تو بنگش سردار شیر محمد خان کی والدہ بی بی دور نے جو بیٹے کی غیر حاضری میں قبیلے کی سرداری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس کی دعوت کی۔ خود شیر محمد خان ان دنوں ہندوستان کے کسی مقام پر مغلوں کی جانب سے خدمات انجام دے رہا تھا۔

مہم تیراہ کے خاتمے پر یوسف زئی قبیلے سے خوشحال خان خٹک کا ایک اور معرکہ ہوا۔ اس جنگ میں اس کے بیٹے اشرف خان نے پہلی بار باپ کی کمان میں لڑائی میں شرکت کی، ۲۷ اگست ۱۶۶۱ء سے ۱۵ اگست ۱۶۶۲ء تک دونوں قبیلوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں اگرچہ یوسف زئی سردار بہا کو خان نے اس مرتبہ بڑی تیاری کر رکھی تھی تاہم فتح خوشحال خان ہی کو حاصل ہوئی۔ دونوں قبیلوں کے مابین

یہ معرکہ بھی فیصلہ کن ثابت نہ ہوا اور دو سال بعد تک فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔

جنوری ۱۶۶۴ء میں مہابت خان کی جگہ سید امیر خوانی کو کابل اور صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مہابت خان کی نظروں میں خوشحال خان خٹک کی بڑی وقعت تھی لیکن اس کے برعکس سید امیر خوانی یہ جبر سارے قبائلی سرداروں کو قابو میں رکھنے کا خواہاں تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ جب تک کچھ سرکردہ خان خوانین کو گرفتار نہ کیا جائے گا۔ لوگ مالیہ دینے پر آمادہ نہ ہوں گے، بتایا جاتا ہے کہ سید امیر کو یہ پٹی اس کے نائب الحکومتہ مقیم پشاور میرزا عبدالرحیم نے پڑھائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ عبدالرحیم کا جھگڑا ڈیوسف زئی سردار بہاکو خان کی طرف تھا اور وہ خوشحال خان سے کینہ رکھتا تھا۔ پشاور پہنچنے پر گورنر سید امیر نے اسے کسی ضروری مشورے کے بہانے بلوایا اور بالاحصار پہنچنے پر اُسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ خوشحال خان خٹک کے چچا اور بعض عزیز بھی اس سازش میں مغل صوبہ دار کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ دو ماہ تک خان خٹک کو پشاور میں قید رکھنے کے بعد اسے ہندوستان بھیج دیا۔ چونکہ مغل حاکم کو خدشہ تھا کہ ہندوستان جاتے ہوئے خٹک راہ میں مزاحمت کریں گے۔ اس لئے اس نے مغل سپاہیوں کے علاوہ خوشحال خان پر سرحدی لوگوں کا ایک حفاظتی دستہ بھی متعین کر دیا۔ اس دستے میں شامل محب خیل مہمندوں کے سربراہ مستجاب خان مہمند تھے جب کہ داؤدزئی کی قیادت مصری خان کر رہے تھے۔

اگرچہ یوسف زئی خوشحال خان اور اس کے قبیلہ کے جانی دشمن تھے تاہم جب خٹکوں پر مصیبت آئی تو پشتون روایات کے عین مطابق یوسف زئی نے اپنی دشمنی فراموش کر دی اور فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے عتاب میں آئے ہوئے خٹک لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دی۔

خوشحال خان خٹک کوئی ڈھائی برس تک مغلوں کی قید میں رہا۔ اس عرصہ میں اسے پشاور، دہلی اور رنتھمبور کے قلعوں میں رکھا گیا۔ آخر ایک مغل سردار محمد امین خان کی کوششوں سے اسے آگرہ لایا گیا اور وہاں سے رہائی کا حکم دے دیا گیا۔ خوش حال خان خٹک کی رہائی مئی ۱۶۶۶ء کے لگ بھگ عمل میں آئی۔

اب خوشحال خان تو رہا ہو گیا لیکن مغلوں کا دل یوسف زئی سے میلا ہو گیا۔ وہ ہر حال میں انہیں سبق سکھانا چاہتے تھے۔ گورنر مہابت خان نے یوسف زئی کے خلاف خوشحال خان کا تعاون حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔

لیکن اب خوشحال خان کی آنکھیں کھل چکی تھیں وہ اس برادر کشی پہ تیار نہ ہوا ـــــ بالآخر مغلوں نے ایک بہت بڑا لشکر شمشیر خان ترین کی قیادت میں یوسف زئی کے خلاف بھیجا۔ اس لشکر نے پہاڑی علاقوں کا رُخ کرنے کی بجائے صرف میدانی دیہات ہی کو تختہ مشق بنایا۔ یوسف زئی کے مشہور قصبوں ہنڈ، شاہ منصور، پنج پیر اور مرغز کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ یہ جولائی ۱۶۶۷ء کا واقعہ ہے بعد میں میر بخشی محمد امین خان نے سوات پر بھی لشکر کشی کی اور یوسف زئی کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ بالآخر اکتوبر ۱۶۶۷ء تک یہ شورش مکمل طور پر فرو ہو گئی۔

۱۶۶۸ء میں سید امیر خوانی کی جگہ مہابت خان کو دوبارہ کابل اور پشاور کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ مہابت خان خوشحال خان کا بہت قدر دان تھا۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ خوشحال خان خٹک کو بھی اس کے ساتھ روانہ کر دیا جائے چنانچہ اگست ۱۶۶۸ء کو خوشحال خان وطن واپس پہنچا۔

مہابت خان نے صوبہ سرحد پہنچ کر مختلف اقدامات کئے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یوسف زئی کو قابو میں رکھنے کے لئے لنگر کوٹ (موجودہ گڑھی کپورہ) میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا۔

ہندوستان سے واپسی پر خوشحال خان اکثر بیمار رہنے لگا۔ اس کی بڑی بی بی بھی فوت ہو چکی تھی اور بیٹوں کے ساتھ اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے۔

مئی ۱۶۷۰ء میں خوشحال خان خٹک کے محسن محمد امین خان کو مہابت خان کی جگہ کابل اور صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا۔ امین خان اگست ۱۶۷۰ء میں پشاور پہنچا۔ وہ بے حد دولت مند، متکبر اور جلد باز انسان تھا۔ بادشاہ کا بڑا منہ چڑھا تھا۔ اس لئے من مانی کارروائیاں کرتا تھا۔ وادئ خیبر کے لوگ اس کے رویے سے بالخصوص نالاں تھے۔ ۱۶۷۲ء کے موسم سرما میں اس نے پشاور سے کابل کو کوچ کا ارادہ کیا، خوشحال خان نے امین خان کے مخلص دوست کی حیثیت میں خیر سگالی کے جذبے سے اُسے سفر پہ جانے سے منع کیا اور سمجھایا کہ اس وقت سفر اچھا نہ رہے گا۔ لیکن امین خان اپنی ہی ضد پہ اڑا رہا اور روانہ ہو گیا۔ پشاور سے روانہ ہوتے وقت خوشحال خان خٹک بھی بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ ارباب منتجاب خان مہمند (کوٹلہ محسن خان پشاور) بھی امین خان کے ہمرکاب تھا اور شاہی لشکر کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جمرود اور علی مسجد تک تو خیر گزری لیکن جب چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل یہ لشکر لنڈی کوتل اور لنڈی خانہ کے درمیان پہنچا تو آفریدیوں، شنواریوں اور مہمندوں کے ایک بہت

بڑے لشکر نے اہیل خان کی قیادت میں ہر طرف سے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ قبائلی اپنی پہاڑی کمین گاہوں میں محفوظ تھے جب کہ مغل لشکر اُن کی سنگ باری کی زد میں تھا۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ مغل لشکر کے محمود خان خویشگی دائیں طرف سے ہاتھیوں کو لے کر آگے بڑھے تو بائیں طرف سے مبارز خان نے توپ خانہ سے حملہ کر دیا۔ لیکن ان دشوار گزار پہاڑی گھاٹیوں میں نہ ہاتھی کام دے سکتے تھے نہ توپ خانہ، چٹانوں کی اوٹ سے خیبری قبائلیوں نے وہ سنگِ باری کی کہ مغل فوج کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خوشحال خان جمرود ہی سے واپس ہو گئے تھے جب کہ مغلوں کے طرفدار افغانوں نے دل سے لڑائی میں حصّہ ہی نہ لیا۔ بادشاہی فوج نے بھاگتے ہوئے لنڈی کوتل سے جانبِ شمال وہ راستہ اختیار کیا جو شنواریوں، شلمانیوں اور ملاگوریوں کے علاقوں سے ہوتا ہوا، علی مسجد کے مقام پر بڑی سڑک سے مِل جاتا ہے۔ جب مغلوں کی بچی کھچی فوج تہنترہ کی پہاڑیوں سے گزری تو ملاگوریوں نے ان پر وہ پتھراؤ کیا کہ پناہ بخدا ـــــ ہزاروں سپاہی مارے گئے اور بے شمار مالِ غنیمت خیبری قبائل کے ہاتھ لگا۔

اس خونریز لڑائی میں محمد امین خان کی کمسن بیٹی، بہن، والدہ اور دوسری رشتہ دار خواتین کو بھی قبائلیوں نے گرفتار کر لیا اور بعد میں زرِ کثیر لے کر رہا کیا۔ محمد امین خان کی بیوی کے علاوہ اس کا بیٹا عبداللہ اور بہنوئی مرزا سلطان کربلائی بھی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ارباب مستجاب خان اور بعض روایات کے مطابق) خوشحال خان خٹک بھی تہنترہ کی پہاڑیوں سے گزر کر بمشکل تمام پشاور پہنچے۔ یہ واقع محرم ۱۰۸۳ھ (مطابق ۳۰ اپریل ۱۶۷۲ء) کو پیش آیا۔

جب اس تباہی کی خبر مغل شہنشاہ کو پہنچی تو اس نے لاہور کے گورنر فدائی خان کو فوج لے کر پشاور جانے کا حکم دیا۔ جب فدائی خان اٹک پار کر کے صوبہ سرحد میں وارد ہوا تو خوشحال خان اُن دنوں نظام پور میں مقیم تھا۔ بعض لوگوں نے اسے حملہ کر کے فدائی خان کا خزانہ لوٹنے کا مشورہ دیا لیکن اس نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ جب فدائی خان خیرآباد پہنچا تو خوشحال خان کے صاحبزادے اشرف خان نے اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ پھر جب گورنر محمد امین خان کو ہندوستان واپس بلانے کا حکم نامہ پہنچا تو خوشحال خان نے شاہی باغ پشاور میں اس سے ملاقات کی اور اُسے مشورہ دیا کہ مغل حکومت کو سرحدی علاقوں میں مزید فوجی کارروائیوں سے باز رکھے لیکن مغل گورنر نے سُنی ان سُنی

ایک کردی۔ محمد امین خان کی تبدیلی پر مہابت خان کو، جو پہلے بھی تین بار ان علاقوں میں گورنری کے عہدے پر رہ چکا تھا۔ کابل اور پشاور کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مہابت خان، خوشحال خان کا بہت قدردان تھا۔ اس نے خوشحال خان کا تعاون حاصل کرنے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن خوشحال خان کا دل مغلوں کی خدمت سے بھر چکا تھا۔ اس لئے اس نے بات نہ مانی۔

مہابت خان بڑا سیاسی شاطر تھا۔ خوشحال خان نے تعاون سے انکار کیا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اس کے بیٹے بہرام خان کو ساتھ ملالیا۔ اس پر خوشحال خان بہت بگڑا۔ چنانچہ مارچ ۱۶۷۳ء میں خوشحال خان اور بہرام خان میں چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ تاہم اب خٹکوں کی اکثریت مغلوں کی مخالف ہو چکی تھی اور ایک بار تو انہوں نے حملہ کر کے خیر آباد کے مغل قلعے کو تباہ و غارت بھی کر دیا۔

بہرام خان نے مغلیہ فوج کو لے کر ایک بار پھر اپنے والد خوشحال خان پر چراٹ کے قریب حملہ کیا۔ تاہم اس معرکے میں بھی خوشحال خان کامیاب رہا۔ اس نے کوشش کی کہ کوہاٹ اور چونترہ تک کا دورہ کر کے اپنی طاقت بڑھائے۔ چنانچہ وہ چار ہزار خٹکوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ زیارت کاکا صاحب کے قریب پہاڑیوں میں پھر باپ بیٹے کا آمنا سامنا ہوا۔ وہاں بھی بہرام خان باپ کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ ان مہمات میں آفریدیوں اور مہمندوں نے خوشحال خان کی بہت مدد کی۔

نوشہرہ پر حملہ

اب آفریدیوں کے تعاون سے خٹک لشکر کی طاقت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ دونوں لشکروں نے مل کر نوشہرہ کے قلعہ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ ثوا کئی اور حسن خیل آفریدیوں نے تاتار خان کی کمان میں خوشحال خان کا ساتھ دیا۔ دونوں لشکروں میں مل ملا کر آٹھ ہزار سپاہی تھے۔ رات کے وقت یہ چھاپہ مار ڈاگ اسمٰعیل خیل میں اکٹھے ہوئے اور وہاں سے چل کر چلوزئی۔ اضاخیل اور پیر پیائی کو لوٹنے کے بعد نوشہرہ کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مغلوں کو زبردست نقصان پہنچانے کے بعد یہ لشکر پھر چراٹ کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔

اپریل ۱۶۷۳ء میں گورنر مہابت خان پشاور سے عازم کابل ہو گیا۔ مغلوں نے اب سرحدی علاقوں کے لئے ایک لشکر شجاعت خان کی قیادت میں روانہ کیا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور والئی جودھپور نے جو اُن دنوں جمرود (خیبر ایجنسی) کا قلعہ دار تھا، شجاعت خان کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ شجاعت خان

نے پہلے تو گفت و شنید اور صلح صفائی سے خوشحال خان کو ساتھ ملانے کی کوشش کی اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو اعلانیہ اس کی مخالفت میں فوجی کارروائی پر اُتر آیا۔

جنگِ کڑپہ شجاعت خان نے اپنے لشکر کے ساتھ کچھ عرصہ توپ اور میں قیام کیا۔ پھر کابل جانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لئے اس نے درّہ خیبر کی راہ اختیار کرنے کی بجائے دریائے کابل کے بائیں کنارے علاقہ مہمند اور ننگرہار سے گزر کر کابل پہنچنا چاہا۔ فروری ۱۶۷۴ء میں جب مہمند کی ولوئی گندہاب سے گزر کر بادشاہی لشکر کڑپہ کے کوتل کو عبور کر رہا تھا۔ اجمل خان نے زبردست طاقت کے ساتھ اس پر شبخون مارا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے اور بلا کی سردی میں ہندوستانی فوج کے لئے قبائلی لشکر کے سامنے ٹھہرنا محال ہو گیا۔ ہندوستانی سپاہی ایسے موسم کے عادی نہ تھے، نہ ہی انہیں پہاڑی راستوں سے واقفیت تھی۔ جب ان پر ہر طرف سے گولیاں اور پتھر برسنے لگے تو بیحد نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹے اور نسبتاً محفوظ جگہ پر رات گزاری، علی الصبح قبائلیوں نے پھر یک بارگی حملہ کر دیا۔ سپہ سالار شجاعت خان دادِ شجاعت دیتا ہوا۔ میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ شاہی لشکر چاروں طرف سے پوری طرح قبائلیوں کے نرغہ میں آگیا۔ یہ حال دیکھ کر مہاراجہ جسونت سنگھ نے پانچ سو راٹھوروں کو توپیں دے کر بھیجا۔ راجپوت توپوں کی مدد سے قبائلیوں کا نرغہ توڑنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن واپس آئے تو پانچ سو میں سے صرف دو سو زندہ بچے تھے۔ صرف اس ایک جنگ میں مغلوں کے ہزاروں سپاہی مارے گئے اور بے حد مالی نقصان ہوا۔

کوہاٹ کا معرکہ مہابت خان کے گورنر بننے پر شیر خان بنگش کو بھی ہندوستان سے کوہاٹ آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ خوشحال خان سے پہلے ہی جلا بیٹھا تھا۔ اس لئے اندر ہی اندر خٹکوں کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُدھر خوشحال خان بھی غافل نہ تھا۔ اس نے دریا خان آفریدی سے مل کر منصوبہ بنایا کہ آفریدی اور خٹک لشکر پوری تیاریاں کے ساتھ متحد ہو کر عیدالاضحیٰ کے روز کوہاٹ پر حملہ کر دیں، تاہم اس موقع پر دریا خان نے کچھ جلد بازی کی۔ شاید وہ کوہاٹ کی فتح کا اعزاز اکیلے حاصل کرنے کا خواہاں ہو۔ چنانچہ اس نے مقررہ وقت سے پہلے ہی آفریدیوں کو لے کر کوہاٹ پر ہلہ بول دیا۔ شیر محمد خان بنگش نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آفریدیوں کے ایک سو سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ خود دریا خان کا بھائی تاتار خان آفریدی لڑائی میں کام آیا، اس پر آفریدیوں کے لئے

پسپائی کے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا اور بنگش فتح مند ہوئے۔ اس کامیابی پر مغلوں کے نزدیک شیر محمد خان بنگش کی توقیر بہت بڑھ گئی۔ حکومت کی طرف سے اسے ایک خلعت، ایک گھوڑا اور ایک لاکھ روپے نقد کا انعام دیا گیا۔

اورنگ زیب کی آمد شہنشاہ اورنگ زیب کو خیبر اور کڑپہ میں مغل فوج کی ہزیمت کا سخت صدمہ تھا وہ خود موقع پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپریل ۱۶۷۴ء میں پایۂ تخت سے حسن ابدال کی طرف کوچ کیا۔ بادشاہ کی طرف سے آغر خان پیر محمد کو جو پہلے بھی سرحدی لڑائیوں میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ جمرود اور خیبر کے قبائلیوں کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا۔ پشاور کے قریب قبیلہ مہمند کے بعض سرداروں نے آغر خان پر شب خون مارا لیکن مغلوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ تین سو کے قریب مہمند قتل ہوئے اور دو ہزار کو قیدی بنا لیا گیا۔ اس کامیابی پر بادشاہ نے آغر خان کو انعام و اکرام سے نوازا۔

خوشحال خان کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ خود اس کا بیٹا بہرام خان مغلوں سے ملا ہوا تھا، بہرام خان اور مغلوں کی متحدہ طاقت کو ختم کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ خوشحال خان نے تیراہ، مہمند اور دوسرے قبائلی علاقوں کا دورہ کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے شہزادہ محمد اکبر کو افغانوں کے خلاف مہم کا انچارج بنا کر اسد خان کے ہمراہ کابل روانہ کیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی کہ وہ خیبر کا خطرناک راستہ اختیار کرنے کی بجائے کوہاٹ کی راہ کابل روانہ ہوں، ستمبر ۱۶۷۴ء میں وہ دونوں عازم کابل ہو گئے۔

اکتوبر ۱۶۷۴ء میں فدائی خان کی جگہ مہابت خان کو کابل کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔ فدائی خان نے کابل سے واپسی پر چند مہینے جمرود اور اِلم گڈر میں گذارے، اسی مقام سے اس نے کچھ لشکر دے کر خوشحال خان خٹک کے بیٹے اشرف خان کو آدم خیل آفریدیوں پر حملے کے لئے بھیجا۔ لیکن اشرف خان کو کامیابی نہ ہوئی بلکہ بہت سے مغل اور خٹک مارے گئے۔ فدائی خان نے جمرود میں ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا جس میں مغلوں کے علاوہ سرحدی لوگ بھی بادشاہی لشکر کا ساتھ دے رہے تھے۔ آفریدی درہ خیبر کی جانب سے آنے والے راستے پر متعین تھے۔ اس معرکے میں بقول خوشحال خان میدان

آفریدیوں کے ہاتھ رہا جب کہ مغل مورخوں نے اسے مغل کمانڈر آغر خان کی کامیابی قرار دیا۔ فدائی خان نے آغر خان کو علاقے کے انتظام کا انچارج بنا دیا۔

جنگِ خاپش جون ۱۶۷۵ء میں مکرم خان، میر محمد اسحٰق اور شمشیر خان پسران شیخ میر (بہادر زادگان سید امیر خوانی) کو بہت بڑی فوج دے کر بھیجا گیا کہ وہ کڑپہ کی راہ سے کونل خاپش (یا خانچ) پر جو گندہاب سے شمال مغرب کو واقع ہے، حملہ کریں اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔ اُدھر مخالفوں نے بھی بہت بڑا قبائلی لشکر اسمٰعیل خان اور دریا خان کی کمان میں جمع کیا اور شاہی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ بادشاہی فوج کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ خود شمشیر خان دریا خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اکثر مغل سپاہی لڑائی میں جان بحق ہوئے جو بچ گئے انہیں کابل جاتے ہوئے پہاڑی راستوں میں مہمندوں نے آن لیا۔ شہنشاہ کو اس شکست کا حال معلوم ہوا تو سخت رنجیدہ ہوا۔

دسمبر ۱۶۷۵ء میں اورنگ زیب کو حسن ابدال سے واپس پایۂ تخت جانا پڑا۔ قیام حسن ابدال کے دوران شہنشاہ عالمگیر نے ہزارہ کے کچھ سیاسی مسائل بھی نمٹائے۔ سب سے پہلے گوجر سردار دولت بیگ نے حسن ابدال پہنچ کر شہنشاہ کا خیر مقدم کیا اور اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تو بادشاہ نے خوش ہو کر اسے مقدم کا خطاب عطا کیا۔ پھر ترین قبیلہ کا سردار گدائی خان بادشاہ کے سلام کو پہنچا، دلاناک اور ترک قبیلے بھی حاضرِ دربار ہوئے۔ اس وقت میدان ہزارہ میں کل ۸۴ دیہات تھے چنانچہ ان کو ۲۱-۲ دیہات پر مشتمل چار پٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پٹی ترین کا صدر مقام درویش قرار پایا۔ جب کہ گوجر، دلاناک اور ترک بھی اپنی اپنی پٹی کے مالک قرار پائے۔

جنگِ گمبٹ چونکہ کوہاٹ کا بنگش سردار شیر محمد خان مغلوں کا طرفدار تھا۔ اس لئے خوشحال خان خٹک ہر وقت اُسے نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا تھا۔ چنانچہ خوش حال خان خٹک نے اس غرض کے لئے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور کنڈیالہ سے گزر کر علاقہ کوہاٹ میں جا وارد ہوا۔ کوہاٹ سے چودہ میل دور گمبٹ کے مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا ــــ شروع شروع میں خوشحال خان کے بیٹے عابد خان نے شیر محمد بنگش کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرا دیا۔ تاہم خٹکوں نے بے پرواہی سے کام لیا اور شیر محمد خان کے نیچے گرتے ہی میدان چھوڑ کر واپسی اختیار کر لی۔ بنگش لڑاکوں نے ان کی اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس طرح خٹک اپنی

جیتی ہوئی بازی ہار گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر کوہاٹ کے سینی خٹکوں نے بنگش کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ خوشحال خان نے اپنے کلام میں ان کے اس رویّہ کی مذمت کی ہے۔ اس لڑائی میں خود خوشحال خان خٹک بھی زخمی ہوا۔

۲۵ اگست ۱۶۷۶ء کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد معظم کو شاہ عالم بہادر کا خطاب دے کر بہت بڑے لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ کابل بھیجا — اس مہم میں امیر خان نامی مغل سردار بھی شہزادے کے ہم رکاب تھا۔ یہ امیر خان خوشحال خان کے محسن و مربّی اصالت خان میر عبدالہادی کا بھتیجا تھا۔ اس نے نرمی سے کام لیتے ہوئے خوش حال خان کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ انعام و اکرام سے نوازا اور خود شہزادہ شاہ عالم بہادر سے بھی اس کی ملاقات کرا دی۔ شاہ عالم نے امیر خان کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ہر قیمت پر خوشحال خان کو راضی کیا جائے۔ چنانچہ امیر خان نے خوشحال خان کو دو ہزاری منصب تک کی پیش کش کی لیکن خوشحال خان نے اورنگ زیب کی نوکری کو اپنی غیرت کے خلاف قدم قرار دیتے ہوئے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ اس پر امیر خان نے خوشحال خان خٹک کو فتح آباد (موجودہ جلال آباد) سے واپس کر دیا البتہ اس کے بیٹے سکندر خان کو اپنے ساتھ کابل لے گیا۔ شہزادہ شاہ عالم بہادر ۲۵ اگست ۱۶۷۷ء کو کابل پہنچا اور ۳ جنوری ۱۶۷۸ء تک قیام کرنے کے بعد واپس دہلی چلا گیا۔

جنگِ ڈوڈہ گمبٹ میں بنگش کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد خٹک نچلے نہ بیٹھے اور بنگشوں پر چھوٹے موٹے حملے کرتے رہے، لیکن خوشحال خان خٹک کی آتشِ انتقام ٹھنڈی ہونے نہ پائی۔ ۱۰۹۱ ہجری میں خوشحال خان نے چھ سات ہزار خٹکوں پر مشتمل لشکر تیار کیا جس کے ایک دستہ کی کمان خوشحال خان کے نوجوان پوتے افضل خان بن اشرف خان کے ہاتھ میں تھی۔ افضل خان نے پہلے شادی پور میں جو کوہاٹ کے شمال مشرق میں ہے قیام کیا پھر علاقۂ بنگش کی طرف پیش قدمی کر کے ایک گاؤں شادی خیل پر حملہ کر دیا۔ شادی خیل کوہاٹ سے جنوب مشرق کو کوئی گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر ہے، افضل خان نے بنگشوں کے تین قلعوں کو مسمار کر دیا۔ بہت سے افراد کو قتل کیا اور کافی تعداد کو قیدی بنا لیا۔ جو بچ رہے وہ ڈوڈہ کے قلعے میں پناہ گزین ہو گئے، ڈوڈہ شادی خیل کے قریب ہی کوہاٹ کے جنوب مشرق میں نو دس میل کے فاصلے پر ہے، ڈوڈہ کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور محفوظ جگہ پر واقع تھا۔ خٹکوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین نے بندوقوں سے اُن پر

زبردست آگ برسائی تاہم خٹک غالب رہے، ایک سو ساٹھ سنگش لڑائی میں مارے گئے، باقی کو قیدی بنالیا گیا اور بہت سامالِ غنیمت خٹکوں کے ہاتھ لگا۔ اس لڑائی میں خوشحال خان کے بیٹے عابد خان نے بھی بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی۔

وفات بڑھاپے میں خوشحال خان خٹک کو نہ صرف مغلوں کا مقابلہ کرنا پڑا بلکہ اپنے بیٹوں سے بھی اختلافات پیدا ہو گئے، حالات یہاں تک بگڑ گئے کہ باپ اور بیٹوں میں باقاعدہ لڑائیاں ہونے لگیں، انہی خانہ جنگیوں کی وجہ سے خٹک لشکر انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس طرح خوش حال خان خٹک کی زندگی کے آخری دن بڑی تلخیوں میں کٹے۔

آخر خوشحال خان کو ۲ر فروری ۱۶۸۹ء کو جب وہ ڈنبرہ (آفریدی علاقہ) میں پناہ گزین تھا موت کا بلاوا آگیا اور وہ ۸۰ سال کی عمر میں راہی مُلک بقا ہوا ـــــ آفریدیوں کے علاقہ سے لاکر اسے اکوڑہ خٹک سے تھوڑی دور اسوڑی بالا میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں خود خان خٹک کی وصیت بھی یہ تھی کہ ؎

کہوں تجھ سے اے ہم نشین دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
اُڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

اپنے سپاہیانہ اور شجاعانہ کارناموں اور عظیم علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے خوشحال خان خٹک کا نام تاریخِ عالم میں زندہ جاوید رہے گا۔

نادر شاہ

۱۷۰۷ء - ۱۷۰۸ء کے سال برصغیر اور افغانستان کی تاریخ میں بڑے انقلابی سال تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی۔ اسی سال سکھوں کے دسویں سربراہ گورو گوبند سنگھ حیدر آباد دکن میں ایک پختون کے ہاتھوں مارے گئے۔ ادھر ۱۷۰۸ء میں ایک ہوتک سردار میر ویس خان نے ایرانیوں سے قندہار آزاد کرا کے افغانستان میں ایک قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کی شمال مغربی سرحد کبھی پُرامن نہ رہ سکی۔ ہر وقت کسی نہ کسی شورش کی خبر سُننے میں آتی۔ آئے روز سرحدی قبائل مغلوں پر چھاپے مارتے رہتے، شہنشاہ اکبر نے سرحدی علاقوں پہ بہت توجہ دی۔ چودہ برس تک وہ لاہور میں مقیم رہا تاکہ وہاں بیٹھ کر سرحدی علاقوں میں بھیجی جانے والی مہموں کی براہِ راست نگرانی کر سکے۔ اکبر کے عہد میں مغلیہ سلطنت راس کماری سے کابل غزنی اور قندہار تک پھیل ہوئی تھی۔ اکبر بارہا قندہار اور کابل پہنچا اور اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کوشش کرتا رہا۔ تاہم اکبر کے جانشین جہانگیر کے زمانے میں قندہار کو ایرانیوں سے واگذار کرانے کیلئے جدوجہد کی۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے دَور میں یکے بعد دیگرے کئی مہمیں بھیجی گئیں۔ مغلوں کا خزانہ خالی ہو گیا۔ ان کے ہزاروں آزمودہ کار جنگ آزما مارے گئے۔ تاہم قندہار فتح نہ ہو سکا۔ دیکھا جائے تو یہی سرحدی مُہمیں مغلوں کے زوال کا پیش خیمہ بن گئیں، اگر مغل ان سرحدی فوجی مہمات کی بجائے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے استحکام پہ توجہ دیتے تو ان کی سلطنت محفوظ اور مضبوط رہتی اور اسے کوئی گزند نہ پہنچ سکتا۔

اورنگ زیب عالمگیر جب زندگی میں آخری مرتبہ بیمار پڑا تو ولی عہد شہزادہ معظم اپنے لاؤ لشکر سمیت سرحدی مہموں کے سلسلے میں جمرود کے نواح میں خیمہ زن تھا۔ وہ فوراً لاہور پہنچا۔ جہاں کے

گورنر منعم خان نے اس سے پورا تعاون کیا اور آخر مارچ ۱۷۰۷ء میں اس نے شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اسے باہمی خانہ جنگیوں اور پنجاب کے سکھوں کی سرکشی سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ سرحدی علاقوں کا رُخ کرتا۔ یہی حال شاہ عالم کے دوسرے جانشینوں کا بھی تھا۔ اپنے ہی مسائل میں وہ اتنے اُلجھ گئے کہ اٹک سے اس طرف دھیان ہی دینے نہ پائے۔

اُدھر قندہار میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ہوتک قبیلہ کے سردار میرویس خان نے جو قندہار کا "کلانتر" یا حاکمِ شہر تھا۔ ایرانی گورنر گرگین کے خلاف بغاوت کر دی۔ لڑائی ہوئی تو ایرانیوں کو مُنہ کی کھانی پڑی اور قندہار میں میرویس خان کی خود مختار حکومت قائم ہو گئی، اپنی وفات (۱۷۱۵ء) تک میرویس خان نے دادِ حکومت دی۔

میرویس خان کے جانشین محمود نے اور قدم آگے بڑھائے اور ۱۷۲۲ء میں بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر ایران کے دارالحکومت اصفہان پر حملہ کر دیا، چھ ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر ایران کے بادشاہ شاہ حسین صفوی کو ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی اور محمود شاہِ ایران بن گیا۔ اس نے اپنا دارالحکومت بھی اصفہان تبدیل کر دیا۔ شاہ محمود کے بعد اس کا بیٹا شاہ اشرف تخت نشین ہوا۔ اسی اثناء میں ایران کا ایک مہم جُو نادر قُلی منظرِ عام پر آیا اور شہر بہ شہر فتح کرتا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے طُوس (مشہد) اور ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اشرف اپنے افغانی لشکر کو لے کر نادر قلی (جواب نادر شاہ بن چکا تھا) کے مقابلے پر آیا۔ ۲ اکتوبر ۱۷۲۹ء کو دامغان کے نواح میں گھمسان کا رَن پڑا جس میں شاہ اشرف کو شکست فاش ہوئی۔ وہ بھاگ کر قندہار پہنچنا چاہتا تھا لیکن راستے میں ایک بلوچ سردار نے انعام کے لالچ میں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب تو سارے ایران پر نادر شاہ کا سکّہ چلنے لگا۔

۱۷۳۷ء میں نادر شاہ قندہار کی تسخیر کے ارادے سے ایران سے نکلا اور مارچ ۱۷۳۸ء تک اُسے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

اِن دنوں ہندوستان میں مغل بادشاہ محمد شاہ (رنگیلا) برسرِ اقتدار تھا، نادر شاہ نے اُسے لکھا کہ ایران اور افغانستان کے بھگوڑوں کو ہندوستان میں پناہ نہ دی جائے لیکن محمد شاہ نے اس پر کان نہ دھرا۔ اسے عیش و نشاط کی محفلوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ ناراض ہو کر نادر شاہ افشار نے اپنے ایک افسر محمد شاہ افشار کو دہلی روانہ کیا۔ نادر شاہ کا یہ ایلچی ایک سال دربارِ دہلی میں رہا لیکن محمد شاہ بادشاہ

نے اُسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اس پر نادر شاہ نے دوسرے ایلچی بھی بھیجے لیکن شاہِ دہلی نے انہیں بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ آخر کار نادر شاہ نے مغلیہ مقبوضات پر پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۲۱ مئی ۱۷۳۸ء کو وہ قندھار سے نکلا اور گیارہ جون کو غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اب نادر شاہ کی فوجیں کابل فتح کرنے کا عزم لے کر آگے بڑھیں۔ ابھی نادر شاہ کابل سے دو منزل پرے تھا کہ معززین کابل کے ایک وفد نے اس سے ملاقات کر کے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ کابل کے مغل قلعہ دار شرزہ خان نے کچھ مدافعت کی۔ لیکن بے سود ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ کابل ہمیشہ کے لئے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۲۲ دن تک نادر شاہ اور اس کا لشکر کابل میں ٹھہرا رہا۔ اور پھر پوری تیاری کر کے ہندوستان کی تسخیر کے ارادے سے آگے بڑھا۔

جلال آباد پہنچ کر نادر شاہ افشار نے اپنے لشکر کو نئی ترتیب دی۔ بارہ ہزار سپاہیوں کو ہراول دستے کے طور پر منتخب کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ قلبِ لشکر سے دو منزل آگے آگے روانہ ہوں۔

کابل، قندھار اور صوبہ سرحد میں اُن دنوں مغلیہ سلطنت کی جانب سے نواب ناصر خان گورنر تھا جس کا صدر مقام پشاور تھا۔ یہ وہی ناصر خان ہے جس کے نام پر پشاور کا ایک علاقہ اب بھی چوک ناصر خان کے نام سے موسوم ہے۔ ناصر خان ایک مدبر حکمران تھا۔ اس کا دور صوبہ سرحد میں نسبتاً امن اور خوشحالی کا دور تھا۔ نواب ناصر خان نے تمام نواحی علاقوں سے مدد مانگی اور بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر اکٹھا کر لیا۔ اس نے یہ ساری فوج درّہ خیبر کے دہانے جمرود کے نواح میں جمع کر دی تاکہ نادر شاہ کے پیش قدمی کو مؤثر طور پر روک سکے۔ جب مغل حاکم کی جانب سے ان تیاریوں کی خبر نادر شاہ افشار کو ملی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ درہ خیبر کا راستہ چھوڑ کر کسی متبادل راستے سے فوج کشی کرے اور اچانک مغل لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ چنانچہ اس نے بازار کی وادی اور چغرہ کے مقام کو عبور کر کے جمرود کے قریب آن سر نکالا۔ ناصر خان کو خیال تک نہ تھا کہ حملہ آور فوج اتنا کٹھن اور دشوار گزار راستہ اختیار کرے گی۔ نادر شاہ کے اس اچانک حملے نے مغل فوج کو حواس باختہ کر دیا۔ جمرود اور پشاور یونیورسٹی کے مابین خشک پہاڑی نالے میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا جس میں بہت سے مغل سپاہی مارے گئے اور ناصر خان اور اس کے کئی سردار ایرانیوں کے قیدی بن گئے۔

اس فتح کے بعد تین روز تک نادر شاہ میدانِ جنگ ہی میں ٹھہرا رہا۔ اسے اپنے باقی ماندہ لشکر

اور ساز و سامان کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ لشکر اور سامان کے پہنچتے ہی وہ فتح کے شادیانے بجاتا شہر پشاور میں داخل ہوا۔ نادر شاہ کے لشکر نے کئی دنوں تک پشاور میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا اور جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا لے کر چلتا بنا۔ اس حملے سے پشاور کو بہت نقصان پہنچا۔

"واقعات درانی" کے مؤلف منشی عبدالکریم کا کہنا ہے کہ درہ خیبر کو پار کرنے کے لئے نادر شاہ نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جو اپنے حملۂ ہند کے وقت امیر تیمور نے پسند کیا تھا۔ اس کتاب کے مطابق نادر شاہ کو ایک ماہ تک تورخم پر رکنا پڑا تھا اور جس شخص نے اس کی راہ نمائی کے فرائض انجام دیئے تھے اس کا نام سرور خان اورک زئی تھا۔

نادر شاہ افشار نواب ناصر خان کی جرأت و دیانت اور قابلیت سے بڑا متاثر ہوا۔ اس لئے فتح پشاور کے بعد اس نے پشاور کی گورنری اسی کے سپرد کر دی۔ بتایا جاتا ہے کہ نواب ناصر خان نے بادشاہ دہلی کو بار بار نادری حملے کے خطرے سے آگاہ کیا تھا اور اس سے مدد مانگی تھی۔ لیکن شاہِ دہلی نے غفلت کی اور کوئی کمک نہ بھیجی۔ بصورت دیگر نادر شاہ کی فتح محال تھی۔

"تاریخ نادری" کے مطابق نادر شاہ نے کوئی ایک ماہ تک پشاور میں قیام کیا۔ اسی قیام پشاور کے دوران اسے اپنے بھائی ابراہیم خان کی وفات کی خبر ملی۔

"تاریخ بنوں اور وزیرستان" (پشتو) کا کہنا ہے کہ نادر شاہ افشار کے لشکر کا ایک حصہ درہ ٹوچی کی راہ وادیٔ دَدَر سے ہوتا ہوا بنوں پہنچا۔ جہاں کے چند دیہات کے لوگوں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا تاہم ہتھے عوام نادری لشکر کے سامنے ٹھہر نہ سکے، انہیں ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔ اس پر نادر شاہ کے افسروں نے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ گھروں کو آگ لگا دی اور فصلیں تباہ کر دیں۔ ان دیہات میں تور کئی، کڑی اور دلی خیل مندان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اپنے قیام پشاور ہی کے دوران نادر شاہ نے اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ اٹک روانہ کر دیا تھا، مقصد یہ تھا کہ وہ راستے میں سارے علاقہ کو اپنے زیرِ نگین کرے۔ اور دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل تیار کرے یہ اطلاع ملنے پر کہ مذکورہ پل تیار ہو گیا ہے نادر شاہ ساٹھ ہزار کے لشکرِ جرار کو لے کر ۲۷ دسمبر ۱۷۳۸ء کو پشاور سے روانہ ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ شاہِ دہلی محمد شاہ چالیس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر اٹک میں خیمہ زن تھا لیکن نادری لشکر کو دیکھتے ہی وہ بغیر لڑے واپس روانہ ہو گیا۔

پنجاب میں داخل ہوتے ہی نادرشاہ نے حکم دیا کہ راہ میں جو مقام آئے تباہ کر دیا جائے۔ لہٰذا، ایرانیوں نے قتلِ عام اور لوٹ مار کا بازار خوب گرم کیا۔ ایرانی لشکر نے بغیر کسی مزاحمت کے دریائے سندھ، دریائے جہلم اور دریائے چناب کو عبور کیا۔ وزیر آباد کے قریب قلندر خان کی کمان میں پانچ چھ ہزار سپاہیوں نے نادری لشکر کا راستہ روکا لیکن بے سود۔ نادرشاہ نے وزیر آباد اور امین آباد کو لوٹا اور آگے بڑھتا گیا۔

لاہور کا مغل گورنر ذکریا خان بیحد دلیر اور مدبر شخص تھا۔ اس نے پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ نادرشاہ کے لشکر کو کافی دیر تک روکے رکھا لیکن دہلی سے اُسے کوئی کمک نہ پہنچ سکی۔ بالآخر اُس نے نادرشاہ سے امان طلب کی۔ شالامار باغ میں نادرشاہ اور ذکریا خان کی ملاقات ہوئی۔ نادرشاہ نے ذکریا خان کی بڑی قدر و منزلت کی اور دونوں فریقوں میں صلح نامہ طے پا گیا۔ نادرشاہ نے ذکریا خان ہی کو پنجاب کی گورنری پر بحال رکھا۔

کرنال کے قریب محمد شاہ رنگیلا نے نادرشاہی لشکر کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ محمد شاہ نے ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد ۱۸ مارچ ۱۷۳۹ء کو دونوں بادشاہ دہلی میں وارد ہوئے۔ نادرشاہی لشکر ابھی دہلی ہی میں تھا کہ عید کا تہوار آن پہنچا۔ اس موقع پر کسی نے بے پر کی اُڑا دی کہ نادرشاہ قتل ہو گیا ہے اس پر بڑی گڑبڑ مچی۔ نادرشاہ نے یہ دیکھ کر قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ بڑی تباہی مچی ـــــ بالآخر ۱۲ مئی ۱۷۳۹ء کو ایک دربارِ عام منعقد ہوا۔ جس میں شاہ دہلی نے مشہور ہیرا "کوہِ نور" نادرشاہ کو پیش کیا، جاتے ہوئے نادرشاہ، شاہجہان کا بنایا ہوا کروڑوں روپے کی مالیت کا تختِ طاؤس بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔

نادرشاہ کے حملے نے مغلیہ حکومت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا اور اس کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے رُوبہ انحطاط ہونے لگی۔

دہلی کے دربارِ عام کے معاہدے کے مطابق اٹک سے اس طرف کا سارا سرحدی علاقہ کابل، غزنی، قندھار اور ہرات ایرانی سلطنت کی تحویل میں دے دیئے گئے اور دہلی دربار سے صوبہ سرحد کا برائے نام تعلق بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ ناصر خان بدستور پشاور اور کابل کا گورنر رہا لیکن اب وہ شاہِ دہلی کی بجائے نادرشاہ افشار کے سامنے جواب دہ تھا۔ ناصر خان کی پالیسی صلح کل تھی، وہ سرحدی قبائل کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا حامی نہ تھا۔ میدانی علاقوں کے لوگوں سے مالیہ وغیرہ کی وصولی کے لئے اس نے مقامی سرداروں اور خوانین کو مقرر کیا جس سے اچھے نتائج برآمد ہوئے اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔

۱۷۴۷ء (نادر شاہ کی وفات تک) صوبہ سرحد میں نامر خان ہی حاکم اعلیٰ رہا۔

دہلی سے واپسی پر نادر شاہ جب درۂ خیبر پہنچا تو اس کا ارادہ تھا کہ ان آفریدی قبائل کو قرار واقعی سزا دے جنہوں نے حملے کے وقت اس کا راستہ روکا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس ایسا کرنے کی فرصت نہ تھی تاہم اس نے تیراہ کے علاقہ بازار کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کا منشا تھا کہ اس طرح وہ آفریدیوں کو میدانی علاقوں میں آنے سے روک سکیگا اور جب چاہے گا ان پر رسد رسانی بند کر دے گا۔ لیکن بتایا جاتا ہے کہ ایک یا رملک دین خیل قبیلہ کا سردار دریا خان بادشاہ نادر شاہ سے ملاقات کو آیا تو اپنے ساتھ مزری اور دوسرے پودوں کی کڑوی جڑیں بھی لایا۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ اس کا قبیلہ جنگلی پودوں کی جڑیں کھا کر گزارہ کر رہا ہے۔ نادر شاہ سمجھ گیا کہ جو قوم اتنی سخت جان ہے کہ ان کڑوی جڑی بوٹیوں پر گزر اوقات کر سکتی ہے اس سے لڑنا اور اس پر خوراک بند کرنا بے کار ہے، اس پر نادر شاہ نے پابندیاں اٹھالیں اور قبائل سے صلح کا طریق اختیار کر لیا۔

تاریخ سندھ حصہ دوم مؤلفہ قدوسی کے مطابق دہلی کی لوٹ مار اور قتل عام کے بعد نادر شاہ ہندوستان سے واپسی پر ۲۱ نومبر ۱۷۳۹ء کو کابل پہنچا۔ وہاں سے اس نے حاکم سندھ میاں نور محمد کو حکم نامہ بھیجا کہ کابل پہنچ کر اس سے ملے۔ حاکم سندھ نے تعمیل نہ کی تو نادر شاہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ موسم سرما میں وہ کابل سے روانہ ہوا اور ۲۵ دسمبر ۱۷۳۹ء کو ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے نادر شاہ نے اپنی فوج کا بڑا حصہ کشتیوں میں سوار کر کے ڈیرہ غازی خان بھیج دیا۔ اور پھر وہاں سے لاڑکانہ جانے کے لئے روانہ ہوا۔ دریں اثناء اس نے حاکم لاہور زکریا خان کو بھی ہدایت کی کہ ملتان اور جنوبی پنجاب کے دفاع کا خاص خیال رکھے میاں نور محمد خدا باد (دار الحکومت) چھوڑ کر عمر کوٹ چلا گیا لیکن بعد میں اس نے ایک کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ دے کر نادر شاہ سے صلح کر لی۔

نادر شاہ کی عمر کا آخری حصہ بہت بے آرامی سے گزرا، بتایا جاتا ہے کہ اسے دماغی عارضہ ہو گیا جس پر اس کا بھتیجا اور دوسرے عزیز سازشوں میں لگ گئے، ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ وہی نادر شاہ کا جانشین بنے۔ اس کش مکش میں نادر شاہ کبھی ایک جگہ منتقل ہوتا کبھی دوسری جگہ۔ ۱۷۴۷ء میں وہ مشہد کی طرف جا رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ اس شہر کو اپنا مستقل دار الحکومت بنالے لیکن رات کو اُسے سوتے ہوئے اپنے خیمے میں قتل کر دیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی

۱۷۴۷ء تا ۱۷۷۳ء

نادر شاہ افشار کی یلغار ہندوستان کی زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ مغل حکمرانوں کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا اور ملک انتشار اور افراتفری کی آجگاہ بن کر رہ گیا۔ ایرانی حملہ آور جاتے وقت نہ صرف ستر کروڑ روپیہ کی مالیت کا سونا، جواہرات، تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا ساتھ لے گئے بلکہ سارا صوبہ سرحد، سندھ اور قبائلی علاقہ بھی ان کے تسلط میں چلا گیا۔ پنجاب کے بارے میں طے پایا کہ اس کا صوبیدار ہر سال بیس لاکھ روپیہ حکومتِ ایران کو ادا کرتا رہے گا۔

نادر شاہ کے پیٹھ پھیرتے ہی مرہٹوں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ مغل وزیر صفدر جنگ کے بلانے پر مرہٹہ فوج دارالحکومت دہلی میں داخل ہوئی اور شہر کو خوب لوٹا۔ مرہٹوں کے حوصلے بڑھے تو انہوں نے آگے بڑھ کر سارے پنجاب بلکہ بعض روایات کے مطابق پشاور تک پر قبضہ کر لیا اور جبراً لوگوں سے "چوتھ" اور "سردیش مکھی" قسم کے محصولات وصول کرنے لگے۔

سکھوں نے بھی موقع غنیمت سمجھا اور مشرقی پنجاب میں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ کانگڑہ اور نواحی پہاڑیوں میں انہوں نے قلعے بنا لئے۔ جہاں سے موقع بموقع وہ میدانی علاقوں پر حملے کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کرتے۔ اسی طرح راجپوت راجوں نے بھی اپنی اپنی الگ خود مختار ریاستیں بنا لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت جس میں قندھار اور ہرات سے لے کر رنگون اور راس کماری تک کے سبھی علاقے شامل تھے۔ بیسیوں ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی۔ مسلمانانِ ہند کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ ایسے میں اگر مردِ مجاہد غازی احمد شاہ ابدالی کا جذبۂ حریت آڑے نہ آتا تو شاید برِصغیر کے فرزندانِ توحید کبھی سنبھل نہ سکتے۔

احمد شاہ ابدالی اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک عظیم مسلمان رہنما تھے، وہ نہ صرف ایک سیاسی مدبر، ایک عاشقِ ملت، ایک مردِ غیور اور ایک عظیم شاعر تھے بلکہ بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور انتہائی کامیاب جنگی جرنیل بھی تھے۔ انہیں موجودہ سلطنتِ افغانستان کا بانی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کی عظمت کا نقش مسلمانوں کے دلوں سے کبھی محو ہونے نہ پائے گا۔

غازی احمد شاہ ابدالی ۱۷۲۴ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ جہاں اب تک ایک سڑک ان کے نام پر ابدالی روڈ کہلاتی ہے ان کی رہائش کڑی شاہ حسین میں تھی۔ سات سال کی عمر تک وہ وہیں رہے بعد میں اپنے والد زمان خان کے ساتھ ملتان سے ہرات چلے گئے۔ ان دنوں ہرات کے پٹھان قبائل اہلِ ایران کے خلاف نبرد آزما تھے کیونکہ ایرانی ہرات پر قبضہ کرنے کے لئے متواتر حملے کر رہے تھے۔ بالآخر نادر شاہ افشار نے ان قبائل سے متعلق اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کی اور محاذ آرائی کو ترک کر کے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ ۱۷۲۸ء میں ابدالی قبائل نے نادر شاہ کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن کسی وجہ سے احمد شاہ کے بھائی ذوالفقار خان کی قیادت میں قبائل نے پھر بغاوت کر دی جو کامیاب ہونے نہ پائی۔ ۱۷۳۱ء میں ہرات مکمل طور پر ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

نادر شاہ افشار ابدالی قبائل کی جنگی صلاحیتوں سے آگاہ تھا۔ اس لئے اس نے انہیں دھڑا دھڑ اپنی فوج میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ اس نے غلزئی پر ابدالیوں کو ترجیح دیتے ہوئے انہیں قندھار میں آباد کر دیا، احمد خان ابدالی نے نادر شاہ کی ملازمت میں نمایاں خدمات انجام دیں اور معمولی "یساول" (ذاتی ملازم) سے ترقی کرتے کرتے ابدالیوں کے دستۂ فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ احمد خان کی کوششوں کی بدولت ابدالیوں کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ نادر شاہ کی ایرانی فوج کے سردار حسد کرنے لگے۔ انہوں نے نادر شاہ کو اس "حق تلفی" کی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن نادر شاہ نے ان کی بات پر کان نہ دھرے، اس پر ایرانی سپاہی دل ہی دل میں نادر شاہ سے پرخاش رکھنے لگے، جون ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ قندھار سے ایران جاتے ہوئے کوچان کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ قزلباشوں کا ایک گروہ اس کے خیمے میں داخل ہو گیا اور سوتے میں اُسے قتل کر دیا۔ احمد خان نے اس موقع پر بھی نادر شاہ کے خاندان سے پوری وفاداری کا اظہار کیا۔ اس کے اہلِ حرم کو اپنی حفاظت میں لے کر محفوظ مقامات میں پہنچایا، جس پر نادر شاہ کی بیگمات نے خوش ہو کر "کوہِ نور" ہیرا احمد خان کو تحفے میں دیا۔ احمد خان

نادر شاہ کا اس حد تک منظورِ نظر تھا کہ اپنی زندگی ہی میں نادر شاہ اسے اپنا جانشین منتخب کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ پٹھان قبائل بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ نادر شاہ کے بعد احمد خان ہی سب سے موزوں اور مقبول شخصیت ہے جو حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکتا ہے۔ احمد خان نے انتہائی فراست سے کام لیتے ہوئے برسرِ اقتدار آنے کے لئے جمہوری طریق کار اختیار کیا اور پختونوں کی روایات کے مطابق نواحِ قندہار کے تمام قبیلوں کا جرگہ مزار شیخ سُرخ متصل قلعہ نادر آباد میں بُلایا ان دنوں اس علاقے میں تین طاقتور قبائل تھے، علی زئی جن کا سردار نور محمد خان تھا۔ محمد زئی یا بارکزئی جن کی قیادت حاجی جمال خان کے ہاتھ میں تھی اور سدوزئی جن کا سربراہ خود احمد خان تھا، علاوہ بریں محبت خان رئیس پوپلزئی۔ نصراللہ خان رئیس نورزئی اور موسیٰ جان خان جیسے عمائدین بھی شریک جرگہ تھے، خوش قسمتی سے اس موقع پر حاجی جمال خان نے جو سب سے طاقتور قبیلے کے سردار اور معتبر شخصیت تھے، مقابلے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ جس پر احمد خان کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ جرگہ ابھی کسی فیصلے پر پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک درویش محمد صابر باباؒ نے گندم کے خوشوں کا ایک تاج بنایا اور احمد خان ابدالی کے سر پر رکھ دیا چونکہ صابر باباؒ سبھی کے نزدیک قابلِ احترام شخصیت تھے، اس لئے کسی نے بھی ان کے فیصلے سے سرتابی نہ کی اور احمد خان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اکتوبر ۱۷۴۷ء میں احمد خان کی باقاعدہ تخت نشینی کی رسم قندہار میں انجام دی گئی۔ اس نے احمد شاہ کا نام اور "دُرِ دوران" کا لقب اختیار کیا چنانچہ بعد میں احمد شاہ ابدالی کا سارا قبیلہ درانی کہلانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ بزرگ مذہبی پیشوا صابر باباؒ کا اصل نام رضا شاہ تھا اور ان کا مزار شاہی قلعہ لاہور کی بیرونی فصیل کے پاس ہے، ان کے ایک بھائی سید باقر شاہ تھے جو پشاور میں آباد ہو گئے پشاور کا ایک علاقہ اُنہی کے نام پر محلہ باقر شاہ کہلاتا ہے۔

تخت نشینی کے وقت احمد شاہ درانی کی عمر صرف چوبیس سال تھی۔ تاہم وہ ہر اعتبار سے ایک خوش بخت انسان تھا۔ نہ صرف سارے پختون قبائل نے اس کا ساتھ دیا بلکہ تخت نشینی کے فوراً بعد اُسے غیر متوقع طور پر بیش بہا مالی امداد بھی حاصل ہو گئی۔ ہوا یہ کہ مقتول فرمانروا نادر شاہ افشار کا افسرِ محصولات سندھ اور پنجاب کے مفتوحہ علاقوں سے تیرہ لاکھ ساٹھ ہزار (۱۳۶۰۰۰۰) روپیہ کی رقم وصول کر کے ایران جا رہا تھا کہ اسے بادشاہ تک پہنچائے، جب وہ قندہار کے نواح میں پہنچا اور اسے نادر شاہ کے قتل کی خبر ملی تو

چند دن وہیں ٹھہر گیا۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے جو ہر لحاظ سے اپنے آپ کو نادر شاہ کا جانشین سمجھتا تھا۔ افسرِ محصولات سے ساری رقم لے لی۔ یہ ایک طرح سے غیبی امداد تھی کیونکہ اس وقت احمد شاہ کو اپنے سپاہیوں کو تنخواہ دینے اور دوسرے انتظامی معاملات چلانے کے لئے سخت مالی دشواریوں کا سامنا تھا۔

احمد شاہ ابدالی سرحدی قبائل کا مزاج داں تھا وہ ان کی رسوم و روایات کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہر قبیلے کو اعتماد میں لیا۔ ان پر انہی کی مرضی کے مطابق سردار مقرر کئے اور ہر علاقے کو اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنے اور حکومت چلانے کی آزادی دے دی۔ نادر شاہ کے اتباع میں اس نے ایک خصوصی لشکر ترتیب دیا۔ جس میں یوں تو تمام پٹھان قبیلوں کے جنگ آزما شامل تھے تاہم اہم عہدے درانیوں ہی کے پاس تھے۔ اس لشکر کی مدد سے احمد شاہ بابا نے غزنی، کابل اور دوسرے نواحی علاقوں پر اپنا تسلط مضبوط کر لیا۔ کابل اس وقت تک مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ مغلوں کی طرف سے نواب ناصر خان کابل، پشاور اور دوسرے سرحدی علاقوں کا گورنر تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ناصر خان کو کئی پیغام بھیجے کہ چونکہ نادر شاہ کے بعد وہ ان علاقوں کا جائز دعویدار ہے اس لئے یہ علاقے قندہار کی تحویل میں دے دے۔ تاہم ناصر خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ناصر خان کو توقع تھی کہ دہلی یا لاہور کے مغل حاکم اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے لیکن انہیں خانہ جنگیوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ ناصر خان نے ہزارہ اور قزلباش سپاہیوں کو لے کر کابل میں احمد شاہ ابدالی کا راستہ روکا، لیکن معمولی مقابلے کے بعد پشاور کی طرف بھاگ نکلا۔

کابل کی فتح کے بعد احمد شاہ درانی پشاور کی طرف بڑھا، اس نے قبائل سرحد کے اندرونی معاملات میں بہت کم دخل دیا۔ درہ خیبر میں اس نے شنواری اور آفریدی ملکوں کی راہداری وصول کرنے کی اجازت بحال رکھی۔ اسی طرح باقی قبیلوں سے بھی حسنِ سلوک روا رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوات سے بلوچستان تک کے سارے سرحدی علاقے پر احمد شاہ درانی کا سکہ چلنے لگا۔ ایلفنسٹن نے احمد شاہ ابدالی کی قابلیت مردم شناسی اور ہر سرحدی قبیلے سے مساویانہ سلوک کی بڑی تعریف کی ہے۔ دسمبر ۱۷۴۷ء تک سارا صوبہ سرحد درانیوں کے زیر نگیں آچکا تھا۔

مغل حکومت سے معاہدے کے مطابق یوں تو پنجاب کے صوبے کا مالیہ بھی نادر شاہ کو وصول کرنے کا حق دیا گیا تھا تاہم ایرانی فرماں روا کے مرتے ہی پنجاب کا مغل صوبہ دار پھر خود مختاری کا دعویدار بن بیٹھا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں دہلی دربار کی طرف سے عبدالصمد خان پنجاب کا صوبہ دار تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا ذکریا خان اس کا جانشین بنا ـــــ ذکریا خان کے مرنے پر اس کے بیٹوں یحییٰ خان اور شاہنواز خان میں اقتدار کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ شاہ نواز خان نے مقابلے کی تاب نہ دیکھی تو احمد شاہ درّانی کو لاہور پر حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔

احمد شاہ ۱۰ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور پہنچا اور شالامار باغ میں خیمہ زن ہو گیا۔ نوابان لاہور مزاحمت نہ کر پائے اور بے شمار اسلحۂ جنگ چھوڑ کر دہلی کو فرار ہو گئے۔ فروری ۱۷۴۸ء میں پوری تیاری کے بعد درّانی لشکر پھر آگے بڑھا اور مارچ میں سرہند کے قلعہ پر قابض ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی دلّی کی طرف پیش قدمی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن مغل فوج نے شہزادہ احمد شاہ، قمرالدین صفدر جنگ اور الیشوری سنگھ کی کمان میں دوبارہ جنگ چھیڑ دی۔ دورانِ جنگ قمرالدین بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا لیکن اس نے اپنے بیٹے معین الملک عرف میر منّو کو ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنے کی وصیت کی۔ میر منّو نے پوری طاقت سے بھرپور حملہ کیا، توپ خانہ کی گولہ باری سے احمد شاہ ابدالی کے گولہ بارود کے ذخیرے نے آگ پکڑ لی جس پر افغان لشکر کو میدان چھوڑتے ہی بن پڑی، تاہم مغلوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ افغانوں کا تعاقب کرتے۔

واپسی پر احمد شاہ ابدالی نے کچھ وقت صوبہ سرحد میں گزارا اور ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان، شکارپور، ملتان، اٹک اور پشاور میں اپنی جانب سے حاکم مقرر کئے۔ تاہم ہرات سے بغاوت کی خبریں آ رہی تھیں۔ اس لئے درانی فرمانروا کو جلد قندہار لوٹنا پڑا۔ ہرات میں تورمحمد خان علی زئی کی بغاوت کو دبانے کے بعد وہ پھر لاہور کو چل پڑا ـــــ دسمبر ۱۷۴۹ء میں دریائے سندھ کو پار کیا۔ اور پنجاب میں داخل ہو گیا۔ حاکم پنجاب میر منّو کو نادر شاہ کی فوجی طاقت کا پتہ چلا تو اس نے فوراً صلح کی شرائط پیش کر دیں، آخر طے پایا کہ "حاکم پنجاب پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ فوراً ادا کرے گا اور اس کے علاوہ چار ضلعوں پسرور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات کا لگان اور آبیانہ ہر سال بصورت خراج درّانی بادشاہ کو ادا کرتا رہے گا ـــ" میر منّو کی درخواست پر کچھ افغان

فوج بھی پنجاب میں تعین کر دی گئی۔

میر منو حاکم پنجاب نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر احمد شاہ ابدالی سے صلح کر لی تھی۔ لیکن دہلی دربار سے اُسے اس پر بڑی سرزنش ہو رہی تھی اور اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ احمد شاہ ابدالی کو لگان یا آبیانہ ادا نہ کرے، اُدھر موعودہ رقم نہ ملنے پر ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ درانی نے پھر فوج کشی کر دی۔ حاکم پنجاب میر منو کو شکست ہوئی لیکن اب شہنشاہ دہلی نے ملتان اور لاہور کے دونوں صوبے باضابطہ طور پر احمد شاہ ابدالی کی تحویل میں دے دیئے۔ اسی مہم میں کشمیر کے صوبے کا الحاق بھی درانی سلطنت سے کر دیا گیا۔ کشمیر کو جانے والی سڑک چونکہ وادیٔ ہزارہ سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس لئے اقوام ہزارہ سے بھی ابدالی بادشاہ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ شاہراہ کشمیر کی حفاظت اہلِ ہزارہ کے سپرد کی گئی اور اس خدمت کے صلے میں اہلِ ہزارہ سے مالیہ اور دوسرے ٹیکسوں کی وصولی میں بے حد رعایت برتی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہزارہ کے طول و عرض میں پٹھان قبیلوں کو عروج نصیب ہوا اور دوسرے قبیلوں کی اہمیت کم ہو کر رہ گئی۔ گکھڑ سردار نوازش علی نے متھرا کی مہم میں درانی لشکر کا ساتھ دیا تھا جس کے صلے میں درانی بادشاہ نے راولپنڈی خانپور اور دوسرے علاقے گکھڑوں کو جاگیر کے طور پر دے دیئے۔

۱۷۵۲ء میں جب میر منو موعودہ رقم درانی بادشاہ کو نہ پہنچا سکا تو صلح کی بات چیت پھر کھٹائی میں پڑ گئی۔ احمد شاہ نے اپنے قاصد رقم کی وصولی کے لئے بھیجے تو میر منو نے جواب دیا کہ ملک میں بدامنی اور خشک سالی کی وجہ سے زمینداروں سے مالیہ کی رقم وصول نہیں ہو سکی۔ اس لئے مہلت دی جائے۔ درانی بادشاہ نے اسے بغاوت کا بہانہ سمجھتے ہوئے فوج کشی کر دی۔ بادشاہ نے سوہدرہ نزد وزیر آباد میں پڑاؤ کیا۔ پھر دریائے راوی کو پار کر کے لاہور جا پہنچا۔ چھ ماہ تک دونوں فوجوں میں زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ بالآخر میر منو نے پھر سے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ شالامار باغ لاہور میں دونوں عمائدین کی ملاقات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی میر منو (معین الملک) کی خوش سیرتی اور خوش صورتی سے بے حد متاثر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا "تم پہلے اتنی دیر کہاں تھے جو اپنے آقا کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے؟" جس پر میر منو نے جواب دیا "میرا ایک اور آقا بھی ہے، میں اب تک اس کی خدمت میں تھا۔" احمد شاہ ابدالی نے پھر سوال کیا "تو تمہارے آقا نے تمہیں اس

عظیم تباہی سے کیوں نہ بچایا ؟" میر منّو نے بڑے تحمّل اور جرأت سے جواب دیا "میرے آقا کو یقین تھا کہ میرا خادم اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے ۔" اس پر احمد شاہ ابدالی نے پھر سوال کیا "فرض کرو اگر میں گرفتار ہو کر تمہارے سامنے پیش کیا جاتا تو تم میرے بارے میں کیا حکم صادر کرتے ؟" میر منّو نے بہادرانہ لہجے میں جواب دیا "میں تمہیں لوہے کے پنجرے میں بند کر کے اپنے آقا کے پاس بھیج دیتا ۔" احمد شاہ ابدالی نے آخر میں پھر پوچھا "اب جب تم میرے رحم و کرم پر ہو، تم مجھ پر کس قسم کے سلوک کی اُمید رکھتے ہو ؟" نوجوان میر منّو نے پھر اسی بہادری اور دلیری سے جواب دیا "اگر تم سوداگر ہو تو مجھے بیچ دو، اگر جلّاد ہو تو مجھے قتل کر دو۔ اگر بادشاہ ہو تو فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دو۔"

احمد شاہ ابدالی اس جواب پر بہت خوش ہوا۔ اس نے میر منّو کو گلے لگایا۔ اور اسے اپنی جانب سے پھر پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا ۔ پچاس لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ وصول کرنے اور سرہند تک کا سارا علاقہ ابدالی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس وطن روانہ ہو گیا ۔

اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پنجاب کا گورنر میر معین الدین عرف میر منّو فوت ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس کی موت کی خبر ملی تو بے ساختہ پکار اٹھا "آج ایران، توران اور ہندوستان کا سب سے بہترین جرنیل چل بسا ۔" ابدالی فرماں روا نے میر منّو کی جگہ اس کے کمسن بیٹے امین الدین خان کو پنجاب کا گورنر بنا دیا۔

ان دنوں برصغیر پاک و ہند میں عجیب سیاسی ابتری کا عالم تھا، دہلی کا شہنشاہ دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا تھا۔ اصل طاقت سپہ سالار غازی الدین حیدر کے ہاتھ میں تھی، وہ جسے چاہتا تخت پر بٹھاتا جسے چاہتا معزول کر دیتا۔ ادھر پنجاب میں سکھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ غازی الدین حیدر لاہور کے معاملات میں اکثر مداخلت کرتا۔ یہاں تک کہ اس نے میر منّو کی بیٹی سے زبردستی شادی رچالی اور میر منّو کی بیوہ مغلانی بیگم کو قید میں ڈال دیا۔ آخر مغلانی بیگم کی فریاد پر احمد شاہ ابدالی ایک لشکرِ جرار کے ساتھ دارالحکومت دہلی پہنچا، افواجِ دہلی میں لڑنے کی ہمت کہاں تھی۔ سپہ سالار نے تاوانِ جنگ دے کر جان چھڑانی چاہی چنانچہ نوے لاکھ روپیہ تاوانِ جنگ مقرر ہوا۔ حاکمانِ دہلی نے عذر پیش کیا کہ اتنی بڑی رقم خزانے میں موجود نہیں۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے بڑے بڑے امراء اور عمائدینِ سلطنت کے گھروں کی تلاشی کا حکم دے دیا۔ ان کی مزاحمت پر درانی سپاہیوں نے

قتلِ عام شروع کر دیا۔ ابدالی دو ماہ تک دہلی میں رہا۔ دارالحکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور سے طلب کر کے اسے سارے مفتوحہ علاقے پر حاکم بنا دیا۔ تیمور شاہ کی شادی شاہ عالمگیر ثانی کی بیٹی سے کر دی اور خود احمد شاہ ابدالی نے محمد شاہ (رنگیلا) کی بیوی سے نکاح کر لیا۔

اس بار احمد شاہ ابدالی نے کافی عرصہ تک برصغیر میں قیام کیا اور ملک کا نظم و نسق بہتر بنانے کے لئے اہم تقرریاں کیں۔ شہزادہ تیمور شاہ کو لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کر کے سردار جہان خان کو اس کا مددگار بنا دیا گیا۔ سرہند کی حکومت عبدالصمد خان محمد زئی کو تفویض کی گئی۔ جالندھر دوآب پہ سرفراز خان کو اور کشمیر میں سربلند خان کو گورنر مقرر کیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی میں قیادت کے تمام اوصاف موجود تھے اور اُسے موقع ملتا تو برصغیر پاک و ہند میں ایک پائیدار حکومت قائم کر سکتا تھا لیکن افغانستان، ایران اور خراسان میں آئے دن اس کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں جن کی وجہ سے وہ جلد واپس ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اب کے بھی جونہی احمد شاہ ابدالی نے پیٹھ موڑی آدینہ بیگ نے سکھوں کی مدد سے شہزادہ تیمور شاہ پر حملہ کر دیا۔ سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور شہزادہ تیمور شاہ اور اس کے ساتھیوں نے بمشکل بھاگ کر جان بچائی۔

اُدھر آدینہ بیگ کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کہ سکھ اس کا ساتھ دیں گے، جونہی سکھوں کو موقع ملا، انہوں نے آدینہ بیگ کو نکال باہر کیا اور اس کی جگہ جسّا سنگھ کلال کو لاہور کا راجہ بنا دیا۔

آدینہ بیگ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا، بالآخر اس نے مرہٹوں سے سیاسی سودا بازی کی اور مرہٹہ سردار رگھوناتھ راؤ کو ایک لاکھ روپیہ روزانہ اور دورانِ قیام پچاس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کر کے اسے سکھوں پر حملے کی دعوت دی۔ مرہٹوں نے سارے پنجاب کو روند ڈالا، انہوں نے تیمور شاہ کا اٹک تک پیچھا کیا۔ ملتان، ڈیرہ جات اور تمام جنوبی علاقوں پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہزاروں، افغان سپاہی ان لڑائیوں میں کام آئے۔ گرانٹ ڈف (GRANT DUFF) نے "مرہٹوں کی تاریخ" میں اس امر کی شہادت دی ہے کہ مرہٹے چند ماہ تک پشاور پر بھی قابض رہے۔

۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی کو چوتھی بار پھر ہندوستان آنا پڑا۔ وہ مرہٹوں کو ان کی سرکشی کا مزا

چکھانا چاہتا تھا لیکن اس اثناء میں اسے فلات کے برا ہوئی سردار نصیر خان کی بغاوت کی خبر ملی تو وہ اُدھر متوجہ ہوگیا۔ نصیر خان نے معمولی طاقت آزمائی کے بعد احمد شاہ ابدالی کی سیادت تسلیم کر لی، اُدھر سے فراغت پاتے ہی احمد شاہ بابا نے پنجاب کا رُخ کیا۔ افغان لشکر کی آمد کا سنتے ہی مرہٹوں نے پنجاب کے اکثر علاقے خالی کر دیئے اور اپنی ساری طاقت دہلی میں جمع کر دی۔ ۲۲ر جولائی ۱۷۶۰ء کو دہلی پوری طرح مرہٹوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ غازی الدین حیدر نے عالمگیر ثانی بادشاہ کو بھی قتل کرا دیا اور خود مطلق العنان حاکم بن بیٹھا، کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر مشہور عالم دین حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ اور بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان کو کفار کے چنگل سے نجات دلائے ۱۷۵۹ء کا سارا سال احمد شاہ ابدالی حالات کا جائزہ لے کر جنگی تیاریاں کرتا رہا۔ اس جہاد میں صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں کے قریباً تمام مسلمانوں نے اس مردِ مجاہد کا ساتھ دیا۔ ایک ذریعے کے مطابق وزیرستان سے تیس ہزار احمد زئی سرفروشوں، اتمان زئی وزیر کے تیس ہزار جانبازوں، محسود کے اٹھارہ ہزار، بھٹنی کے بارہ ہزار اور دوڑ کے بارہ ہزار مجاہدوں نے اس موقع پر اپنی خدمات احمد شاہ بابا کو پیش کیں پشاور کے خلیل، مہمند اور درہ خیبر کے آفریدیوں نے بھی بڑی تعداد میں افغان فوج کا ساتھ دیا۔ احمد شاہ کے دیوانِ افواج میں بھی ان کا نام آتا ہے آفریدی دستہ ۱۹ ہزار جوانوں پر مشتمل تھا۔ قبیلہ یوسف زئی نے بھی اس عظیم جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔ یوسف زئی سردار فتح خان احمد شاہ بابا کے شانہ بشانہ دادِ شجاعت دیتے رہے انہوں نے راؤ بہادر جیسے مشہور ہندو جرنیل کا سر قلم کر کے احمد شاہ ابدالی کے حضور پیش کیا جس پر بادشاہ نے خوش ہو کر خان فتح خان کو ایک خصوصی سند عطا کی۔ یہ سند اور وہ تلوار جس سے مرہٹہ سردار راؤ بہادر کو قتل کیا گیا تھا۔ اب تک خان فتح خان کے خانوادہ میں محفوظ ہے (الحاج خان محمد علی خان آف ہوتی اب اس گھرانے کے سربراہ ہیں)

قاضی نور محمد آبوی کی تصنیف جنگ نامہ منظوم سے پتہ چلتا ہے کہ افغان قبائل کے علاوہ بلوچوں نے بھی اس جہاد میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ ان دنوں نصیر خان بلوچوں کے "خانِ اعظم" تھے۔ وہ بذاتِ خود بارہ ہزار مجاہدوں کو ساتھ لے کر شریکِ جہاد ہوئے، راستے میں ڈیرہ غازی خان کے رئیس سردار غازی خان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دونوں لشکر مل کر چنیوٹ پہنچے، جہاں احمد شاہ ابدالی ان دنوں خیمہ زن تھے، بعد میں نواح لاہور میں جب افغان لشکر کا سامنا سکھوں سے ہوا تو ان بلوچ مجاہدوں

نے زبردست بہادری کا ثبوت دیا۔ بلوچوں کے حملے بڑے پُرجوش تھے اس پر احمد شاہ بابا نے انہیں بتایا کہ جوش اور عجلت کی بجائے لڑائی میں تنظیم اور تدبیر سے کام لینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اس مہم کے دوران خانِ اعظم نے احمد شاہ ابدالی کی تربیت سے کافی فوجی مہارت حاصل کرلی۔

بنوں اور لکی کے مروت جوان بھی بہت بڑا لشکر لے کر اپنے سردار بیگو خان مروت کی قیادت میں احمد شاہ ابدالی کی حملہ آور فوج میں شامل رہے اور زبردست قربانی دے کر دادِ تحسین حاصل کی۔

احمد شاہ بابا صرف دنیوی بادشاہ ہی نہ تھے بلکہ روحانی اعتبار سے بھی بہت بلند مرتبے پر فائز تھے وہ صلحاء و علماء اسلام کی بڑی قدر کرتے تھے، کہا جاتا ہے جب وہ مرہٹوں کے خلاف جہاد کو جاتے ہوئے پشاور پہنچے تو کئی ماہ تک شہر میں قیام کیا۔ اس دوران وہ کئی مرتبہ حضرت میاں محمد عمر صاحب نقشبندی کی خدمت میں چمکنی میں حاضر ہوئے۔ بعض ذرائع کے مطابق وہ حضرت میاں صاحبؒ کے حلقۂ ارادت میں بھی شامل تھے۔ میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے نہ صرف احمد شاہ ابدالی کی کامیابی کے لئے دعا فرمائی بلکہ ان کی ہدایت پر ان کے ستر ہزار مریدوں کا ایک لشکر بھی احمد شاہ بابا کے ساتھ شریک جہاد ہوا۔ اس لشکر میں میاں محمد عمر صاحب کے چھوٹے صاحبزادے میاں گل عبید اللہ بھی شامل تھے۔ اور ان کے خلفاء اخوند محمد یوسف، اخوند جان محمد کلاں اور اخوند محمد اکرم بھی۔ بتایا جاتا ہے کہ پانی پت کی فتح کے بعد واپسی پر احمد شاہ بادشاہ نے حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کا شکریہ ادا کیا اور بہت سی جاگیر ان کی خانقاہ اور مدرسہ کے لئے وقف کردی۔

احمد شاہ ابدالی اپنے لشکر کے ہمراہ دہلی کی سمت روانہ تھا لیکن اس کی آمد کی خبر سنتے ہی غازی الدین حیدر نے راہِ فرار اختیار کی اور مرہٹے بھی بھاگ کھڑے ہوئے مرہٹوں نے جنوبی ہند سے اپنے تمام بھائی بند اکٹھے کئے اور وسطی ہند کی راجپوت ریاستوں نے بھی ان کو بڑی مدد دی۔ یہاں تک کہ مرہٹہ سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ تک جا پہنچی۔ مرہٹہ لشکر میں ستر ہزار سوار تھے۔ بیس بڑی اور دو سو سفری توپیں۔ مرہٹہ لشکر مقابلے کے لئے دہلی کی جانب بڑھا۔ اُدھر احمد شاہ ابدالی ان کا راستہ روکنے کے لئے جمنا پار کر کے آگے بڑھا۔ یہاں سردار نجیب الدولہ، سعد اللہ خان روہیلہ، حافظ رحمت خان شجاع الدولہ اور فرخ آباد کا بنگش نواب اپنے سپاہیوں کو لے کر احمد شاہ ابدالی سے آملے۔ اس طرح

مسلمان لشکر کی تعداد ساٹھ ہزار تک جا پہنچی ، سہارن پور کے قریب مرہٹوں نے ابدالی کے ہراول دستے پر حملہ کر دیا۔ یہ ہراول دستہ حافظ رحمت خان اور نجیب الدولہ کی قیادت میں تھا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے مرہٹوں کے ٹڈی دل نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ روہیلوں نے انتہائی پامردی سے مقابلہ کیا اور چند ہی گھنٹوں میں ان کے چھ ہزار سپاہی شہید ہو گئے ۔ قریب تھا کہ روہیلوں کے پاؤں اکھڑ جاتے کہ نواب احمد خان بنگش اپنے توپخانہ سمیت موقع پر پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اونٹوں پر لدا تھا۔ اسی گشتی توپ خانے نے اس شدت سے مرہٹوں پر گولہ باری کی کہ مرہٹوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور وہ تھوڑی ہی دیر میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ اس ایک معرکہ میں مرہٹوں کی فوج کے اسی ہزار گھوڑے ہلاک ہو گئے ۔ مرہٹوں کا سپہ سالار راؤ دتہ جی سندھیا بھی قتل ہوا جبکہ دوسرے سردار بھی مارے گئے ۔ صرف ایک مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہلکر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔ مرہٹوں کا بھاری توپخانہ بھی ابدالیوں کے ہاتھ لگا۔ اس معرکے کے بعد کچھ دنوں کے لئے احمد شاہ ابدالی پھر دہلی آیا جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی ، نواب سراج الدولہ بنگال ، نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ غازی الدین حیدر وزیر اعظم اور جے پور اور مارواڑ کے راجوں اور نمائندوں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غیر جانبداری کا یقین دلایا اور اس کی خدمت میں نذرانے گزارے ۔

اس عرصہ میں مرہٹوں نے پھر اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش کی ۔ ان کے سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ۔ بالآخر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے تاریخی مقام پہ دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا ـــــ احمد شاہ ابدالی نے اپنی فوج کو مختلف دستوں میں بانٹ کر ہر دستے کو اپنا فرض سونپا ۔ اس کے سالاروں میں سردار جہان خان ۔ شاہ ولی خان ۔ عبدالصمد خان ـــــ شاہ پسند خان ، میر نصیر خان بلوچ ، نواب نجیب الدولہ ، حافظ رحمت خان ، عنایت خان فرزند حافظ رحمت خان ، احمد خان بنگش ، نواب فیض اللہ خان اور دوندے خان جیسے آزمودہ کار لوگ شامل تھے شروع میں مرہٹے میدان پر چھائے رہے لیکن بالآخر اللہ تعالےٰ نے احمد شاہ ابدالی اور اس کے مجاہد ساتھیوں کو فتح مبین عطا کی ۔ اس جنگ میں مرہٹوں کے دو لاکھ سپاہی کام آئے ۔ ہزاروں گھوڑے اور سینکڑوں توپیں مسلمان مجاہدوں کے ہاتھ لگیں اور بقول مؤرخ جادو ناتھ سرکار " اس شکست سے ساری ہندو قوم میں صفِ ماتم بچھ گئی ۔ سارے ملک میں ہندوؤں کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی فرد

اس لڑائی میں ہلاک نہ ہوگیا ہو۔" الفنسٹن کا کہنا ہے کہ "پانی پت میں مرہٹوں کو جو شکست ہوئی وہ انتہائی تباہ کن اور انتہائی شرمناک تھی۔ کوئی مرہٹہ ایسا نہ تھا جو لڑائی کے بعد اپنے رشتہ داروں کا ماتم نہ کر رہا ہو۔" بعض انگریز تاریخ نگاروں نے اسے ہندوؤں کی سب سے بڑی اور مہلک ترین ہزیمت قرار دیا ہے۔ خود بالاجی راؤ کا جوان سال بیٹا مارا گیا۔ لشکر کا سپہ سالار بلکہ مرہٹہ حکومت کا مختار کار بھاؤ ہلاک ہوا۔ پیشوا کا بازو ٹوٹ گیا اور اسی غم نے چند مہینے کے اندر اس کا کام تمام کر دیا۔

تاہم مرہٹوں کی یہ شکست عارضی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کا مقصد چونکہ ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کرنا نہ تھا۔ اس لئے اس نے دہلی کا تخت پھر مغل شہزادوں کو سونپ دیا جن میں امور سلطنت چلانے کی اہلیت تھی نہ اپنے دفاع کی ہمت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال بعد مرہٹوں نے پھر طاقت پکڑ لی اور وہ آزادی سے دہلی اور دوسرے شہروں میں دندناتے پھرنے لگے۔

پانی پت کی اس تیسری لڑائی کا ایک دوسرا خراب پہلو یہ نکلا کہ برصغیر کے ہندو مسلمان سبھی کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ اپنا بچاؤ کرنے کے قابل نہ رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کو کھلی چھٹی مل گئی اور بہت جلد سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحویل میں چلا گیا۔

پانی پت کا معرکہ سر کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی بمشکل لاہور سے کابل پہنچا تھا کہ پنجاب سے گڑبڑ کی خبریں آنے لگیں۔ اب کے شورش سکھوں کی طرف سے تھی۔ سکھوں نے زور پکڑا تو پہلے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ لاہور کے افغان حاکم کی مدد کے لئے احمد شاہ ابدالی نے سردار نورالدین خان کو بھیجا تو اس کے پاؤں بھی سکھوں کے حملوں کے مقابل جم نہ سکے۔ مالیر کوٹلہ کے مسلمان نواب اور دوسرے بہت سے زعماء کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس پر ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی کو پھر پنجاب کا رُخ کرنا پڑا۔

ستلج دریا کے پار بنالے کے قریب سکھوں نے ڈیڑھ لاکھ کا لشکر اکٹھا کر لیا۔ سکھ سپاہی انتہائی مذہبی جنون سے لڑے تاہم مسلمان مجاہد بھی اپنے روایتی جوش و خروش سے صف آرا ہوئے، دونوں طرف کے لڑاکوں نے جرأت اور بہادری کی مثالیں قائم کر دیں تاہم تائید ایزدی سے کامیابی اور کامرانی مسلمانوں ہی کے حصے میں آئی۔ جنگ میں اندازاً پچیس ہزار سکھ مارے گئے۔ سکھوں کی کتابوں میں اس لڑائی کو "گلو گھاٹا" یا نہایت خونریز لڑائی قرار دیا گیا ہے۔

اس معرکے کے بعد پٹیالہ کے سکھ سردار آلا سنگھ کو احمد شاہ ابدالی کے سامنے پیش کیا گیا۔

بادشاہ آلا سنگھ کے قد و قامت، مردانہ اوصاف اور جرأت مندی سے اتنا متاثر ہوا کہ معمولی پیش کش کے وعدے پر ضلع سرہند کی حکومت سونپ دی۔ یہی آلا سنگھ ریاست پٹیالہ کا بانی تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی سکھ کو ایک مسلمان بادشاہ کی طرف سے عمل داری کی باقاعدہ اجازت حاصل ہوئی۔

اگرچہ احمد شاہ ابدالی نے سکھوں سے بڑا فراخدلانہ سلوک کیا تھا۔ لیکن سکھ اس کے نہ بن سکے۔ سکھوں کی ان زیادتیوں کو روکنے کے لئے احمد شاہ ابدالی جنوری ۱۷۶۴ء میں پھر پنجاب پہنچا۔ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی تمام سکھ کالکڑہ اور شملہ کی پہاڑیوں میں جا چھپے۔ احمد شاہ بابا سرہند تک گیا لیکن کسی جگہ بھی کوئی سکھ دیکھنے میں نہ آیا۔ سرہند، مالیر کوٹلہ اور قصور کی تباہی کو دیکھ کر بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے افغان فوج کو حکم دیا کہ سکھوں کے دیہات تباہ کر دیئے جائیں اور جہاں کہیں کوئی سکھ ملے زندہ گرفتار کر لیا جائے۔

احمد شاہ ابدالی ابھی ان تادیبی کارروائیوں میں مصروف تھا کہ افغانستان کے متعلق پریشان کن خبریں آنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ جلد وطن لوٹ گیا۔

افغان فوج کی واپسی کے بعد سکھ پھر اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہ گجرات، جہلم اور رہتاس کی طرف بڑھے جہاں کے افغان حاکم جہان خان نے انتہائی جرأت سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پنجاب کے اکثر علاقوں پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا اور انہوں نے وہاں کی مسلم آبادی پر وہ ستم توڑے کہ پناہ بخدا!

اگرچہ احمد شاہ ابدالی شب و روز کی کوفت اور سفر سے بہت تھک چکا تھا اور اسے ناک کے سرطان کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ تاہم پنجاب کے مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کا سن کر اس سے رہا نہ گیا اور ۱۷۶۷ء میں آٹھویں اور آخری بار پھر اپنے لشکر کو لے کر پنجاب پہنچا۔ سکھوں نے پھر اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ مشہور روہیلے سردار نجیب الدولہ کو پنجاب کا حاکم بنا دے لیکن نجیب الدولہ نے کسی وجہ سے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے مولوی عبید اللہ خان کو لاہور کا گورنر اور داؤد خان افغان کو نائب گورنر مقرر کیا۔ سرفراز خان کو گجرات اور رہتاس کی سرداری عطا کی۔ ساتھ ہی آلا سنگھ کی جگہ جو فوت ہو چکا تھا اس کے بیٹے امر سنگھ کو پٹیالہ کی ریاست بخش دی اور نواحِ لاہور کا علاقہ سردار لہنا سنگھ کو دے دیا۔ احمد شاہ ابدالی

کے ان اقدامات سے سکھوں کو پنجاب میں اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے خاتمے تک پنجاب پر سکھوں کا اور ہندوستان کے باقی حصوں پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

احمد شاہ کا مرض دن بدن بڑھتا گیا، اپنے آخری دنوں میں وہ دارالسلطنت قندہار کے پاس ایک صحت افزا مقام مرغاب میں قیام پذیر تھا کہ موت کا پیغام آن پہنچا اور ۱۷ اکتوبر ۱۷۷۲ء کو یہ عظیم انسان اپنے خالق کے حضور جا پہنچا۔

احمد شاہ ابدالی کے ۲۶ سالہ عہدِ حکومت میں پنجاب اور دہلی سیاسی ابتری کا شکار اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنے رہے۔ ان علاقوں میں مستقل اور مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی تاہم جہاں تک صوبہ سرحد اور کشمیر کا تعلق ہے، ابدالی بادشاہ کا دور نسبتاً پرسکون رہا۔ ان علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جو احمد شاہ جیسے مردِ مجاہد کی خوبیوں کے دلی قدردان تھے، یوں بھی احمد شاہ جمہوری روایات کے مطابق حکومت کرتا تھا۔ اپنی وفات پر بھی اس نے نو افراد پر مشتمل جرگہ مقرر کیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ تمام امور اسی جرگے کی رائے سے طے ہوں۔

احمد شاہ کی سلطنت پورے افغانستان، خراسان، سیستان، سندھ، کشمیر، ڈیرہ جات، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے پر مشتمل تھی اس کا دارالحکومت قندہار تھا جہاں اس نے ایک نیا شہر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت آباد کیا۔ کابل میں ایک جنگی قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کی فوج ایک لاکھ لڑاکا جوانوں پر مشتمل تھی اور سالانہ آمدنی تین کروڑ دس لاکھ تھی۔ اس بادشاہ نے حکومت کے ہر شعبے کی تنظیم کی اور اسے صحت مند بنیادوں پر استوار کیا۔ پشاور میں احمد شاہ کا نائب الحکومۃ متعین تھا، خود اس کا بیٹا اور ولی عہد تیمور شاہ پشاور کی وادئ مینو سواد اور سرزمین لالہ و گل کا بڑا شیدائی تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے عہد میں بہت سے خاندانی لوگ ایران، ہرات اور قندہار سے آکر پشاور میں آباد ہو گئے، صوبہ سرحد میں ایک باقاعدہ حکومت کی پہلی بار بنیاد پڑی اور دیدہ زیب عمارتیں اور باغ شہر کی رونق بڑھانے لگے۔

کوہاٹ میں بھی درانی سردار خٹک اور بنگش خوانین کے تعاون سے داد حکومت دیتے رہے احمد شاہ ابدالی کے جانشینوں کے دور میں ٹیری میں خٹک خوانین کی ریاست قائم ہو گئی۔

لہ دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ۹۹۵/۲

۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کی فوج کا ایک دستہ بنوں وارد ہوا۔ اور گکھڑوں کو جو اس وقت تک علاقہ بنوں پر قابض تھے نکال باہر کیا۔ بعد میں احمد شاہ کی فوج کو مالیہ کی وصولی کے لئے دو تین بار بنوں کے دیہات پر فوج کشی کرنی پڑی، تاہم وہ وہاں ایک منظم حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں احمد شاہ ابدالی نے بلوچ حکمرانوں کی جگہ درّانی سردار مقرر کئے، قبائلی علاقوں میں امن ہونے کی وجہ سے شہر ڈیرہ میں وزیریوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

"تاریخ یوسف زئی" کے مطابق مردان، مالاکنڈ اور سوات کے لوگوں نے اپنا ہم قوم ہونے کے خیال سے احمد شاہ بابا سے پورا تعاون کیا، تاہم اکثر قبائل نے عملاً اس کی اطاعت قبول نہ کی اور آزادانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ میدانی علاقہ کے یوسف زائیوں نے اپنے سرداروں کے توسط سے بادشاہ کو محصولات ادا کئے لیکن پہاڑوں میں بسنے والے اس پر بھی رضامند نہ ہوئے۔"

"تاریخِ خٹک" کا بیان ہے کہ

"احمد شاہ بادشاہ نے پہاڑوں کے کرلانڑی قبیلوں کو مطیع کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی البتہ مرہٹوں کے خلاف جہاد میں خٹکوں نے اس کی مدد کی اور فتح پانے پر اس نے بھی خٹکوں کو نوازا۔"

"تاریخ ہزارہ" کے مؤلف محمد ارشاد خان لکھتے ہیں کہ

"درّانیوں کی ہزارہ میں آمد کا سلسلہ تو ۱۷۲۹ء ہی سے شروع ہو چکا تھا لیکن احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد اس علاقے پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ ۵۲-۱۷۵۰ء کے درمیانی عرصے میں احمد شاہ ابدالی نے ہزارہ، پکھلی سرکار اور کشمیر پر قبضہ کر لیا ـــــ درّانیوں کو ہزارہ قارلق اور پکھلی سرکار سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ شاہراہ کشمیر اس علاقے سے ہو کر گزرتی تھی۔ اس لئے انتظامی طور پر انہوں نے پکھلی سرکار کو کشمیر کے ساتھ ملحق کر دیا اور پرگنہ ہزارہ قارلق کو بدستور اٹک کے ساتھ شامل رکھا۔ یہاں براہِ راست حکومت کرنے کی بجائے درّانیوں نے مقامی بااثر خوانین ہی کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلانا مناسب سمجھا۔

ہزارہ کے ترکوں نے سلطان بے نام المعروف بے ناماں راجہ کی قیادت میں درّانیوں کا راستہ روکنے کی ناکام کوشش کی جس کی پاداش میں درّانیوں نے علاقہ سلطان پور اور مانکرائے پر حملہ کر دیا۔ ترکوں کو شکست ہوئی اور مگرّی کے مقام پر ان کا سردار سلطان بے نام جان بحق ہوا۔ ہزارہ کے اکثر قبائل نے درّانیوں کی اطاعت ہی میں اپنی خیریت دیکھی۔"

"درّانیوں نے ہزارہ کے جن عمائدین کو اپنی حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے اپنا عامل منتخب کیا۔ ان میں نجیب اللہ خان ترین، زبردست خان المعروف صوبہ خان تنولی اور سعادت خان آف گڑھی حبیب اللہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نجیب اللہ خان ترین نے تھوڑے ہی عرصہ میں پٹی گوجری اور پٹی دلاناک کے بیشتر دیہات پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح وہ ہزارہ کے میدانی علاقوں کا سب سے زیادہ معتبر اور باوقار سردار بن گیا۔"

تیمور شاہ

۱۷۷۳ء ــ تا ــ ۱۷۹۳ء

احمد شاہ ابدالی کی وفات پر اس کا دوسرا بیٹا تیمور مرزا، تیمور شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے باپ کی زندگی ہی میں لاہور اور ملتان کے علاقوں کا گورنر رہ چکا تھا، اس لئے صوبہ سرحد اور پنجاب کی سیاست سے پوری طرح باخبر تھا۔

احمد شاہ کے آٹھ بیٹے تھے، سلیمان مرزا، تیمور مرزا، شہاب مرزا، منجر مرزا، یزدان بخش مرزا، سکندر مرزا، دراب مرزا، اور پرویز مرزا، اگرچہ تیمور شاہ ان سب میں زیادہ قابل اور بہادر تھا تاہم کچھ ارکانِ حکومت نے سلیمان مرزا کو بادشاہ بنا دیا۔ اس پر تیمور شاہ کو اپنے بھائی کے خلاف شدید لڑائی لڑنی پڑی، سلیمان مرزا کو مشہور سرداروں شاہ ولی خان اور سردار جہان خان کی حمایت حاصل تھی جو نواحِ قندہار میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے، تیمور شاہ اپنے باپ کی وفات کے وقت ہرات میں تھا۔ اس نے اردگرد کے قبائل سے ایک مضبوط فوج جمع کی اور قندہار پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک قندہار میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے بعد تیمور شاہ کابل پہنچا اور اس نے قندہار کی بجائے کابل کو اپنا دارالحکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ تیمور شاہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قندہار کے اردگرد درانی قبائل آباد تھے جنہیں قابو میں رکھنا مشکل تھا، اس کے برعکس نواحِ کابل کے لوگوں کی اکثریت ہزارہ قوم کی ہے جو اطاعت گزار اور منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے تیمور شاہ کے لئے کسی خطرے کا باعث نہ بن سکتے تھے اس طرح جہاں احمد شاہ ابدالی کو سلطنت افغانستان کا بانی ہونے کا فخر حاصل ہے وہیں کابل کو پہلی بار دارالسلطنت بنانے کا اعزاز تیمور شاہ کے حصے میں آیا۔

تیمور شاہ دسمبر ۱۷۴۶ء کو ایران کے شہر مشہد میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت خالص ایرانی ماحول میں ہوئی۔ اس کی والدہ بھی ایرانی نژاد تھی۔ وہ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں سے زیادہ مانوس نہ تھا۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی وہ ایرانی حکمرانوں سے ملتا جلتا تھا۔ باپ کی زندگی میں بھی اس کا زیادہ وقت لاہور، ملتان اور دوسرے پاکستانی شہروں میں گزرا تھا۔ جہاں مغل حکمران بڑی ٹھاٹھ سے دادِ حکومت دے چکے تھے۔ علاوہ بریں اس کے حرم میں بھی مغل شہزادیاں زیادہ تھیں لہٰذا اس میں کوہستانی جنگجو قبائل والی کرختگی اور سادگی ناپید تھی۔ وہ ظہیر الدین بابر کی طرح کابل کی آب و ہوا پر فریفتہ تھا۔ اسے پشاور کی بہار بھی بڑی دل پسند تھی۔ وہ گرمی کا موسم اکثر کابل میں گزارتا اور سردی شروع ہوتے ہی اپنے سرمائی دارالحکومت پشاور چلا آتا۔ تیمور پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے پشاور کو اپنی مستقل فرودگاہ بنایا۔ اس کے اس اقدام سے تمام رونقیں پشاور میں سمٹ آئیں۔ شہر پر نیا جوبن آگیا۔ اس نے قلعہ بالاحصار کے اندر اور سامنے خوبصورت باغ لگوائے جن میں شاندار محل تیار کئے۔ شہر میں ہر طرف خوبصورت عمارتیں ہونے لگیں۔ تاہم ۱۸۲۳ء میں یہ سب عمارتیں سکھوں نے تباہ و برباد کر دیں۔ ۱۸۳۲ء میں جب انگریز سفیر برنیز (BURNESE) پشاور آیا تو یہ شاندار محل اور عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

تیمور شاہ کے عہد میں پشاور کی رونق اور اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔ بادشاہ شہر میں ہوتا تو بڑے بڑے شاہانہ دربار منعقد ہوتے جس میں دور دراز کے سردار اور خوانین شرکت کرتے۔ اس کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اس نے کئی شادیاں کیں۔ قریب قریب ہر سرحدی قبیلے کی خاتون اس کے حرم میں داخل تھی۔ اس کے بیٹوں کی تعداد ۲۳ تھی اور بیٹیوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ۔ وہ نرم مزاج شخص تھا اور معاملاتِ حکومت میں دوسروں پر بھروسہ کرنے کا عادی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی نرم روی کی بناء پر ہر جگہ بغاوتیں ہونے لگیں، بادشاہ چونکہ علم و ادب کا قدردان تھا۔ اس لئے علمی خانوادوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں پشاور کے قاضی خیل لوگوں کو بڑی اہمیت ملی۔ دربار میں ان کا بڑا عمل دخل تھا۔ چنانچہ اس دور میں قاضی سعد اللہ جان اور قاضی غلام قادر نے بڑا نام پایا۔ تیمور شاہ درانی کا خصوصی مشیر کار قاضی فیض اللہ (دولت شاہی) بھی بڑا مقتدر اور با اختیار شخص تھا۔ تیمور شاہ کے دوسرے ارکانِ سلطنت میں پائندہ خان (پدر حاجی جمال خان بارکزئی)

سردار دلاور خان، نور محمد خان اور التفات خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تیمور شاہ نے "غلام شاہی" کے نام سے بارہ ہزار افراد پر مشتمل اپنا ذاتی باڈی گارڈ یا محافظ دستہ بنایا جن میں اکثریت اسحٰق زئی اور قزلباشوں کی تھی۔ یہ تنخواہ دار سپاہی ہر وقت دارالحکومت میں رہتے اور بادشاہ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے۔ تیمور شاہ نے سلطنت کے انتظام و انصرام کو بہتر بنانے پر بڑی توجہ دی، مالیہ کی وصولی باقاعدگی سے ہونے لگی، فوج کو بروقت تنخواہ ملنے لگی جس سے ہر طرف امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ نظر آنے لگا۔

بادشاہ طبعاً نرم مزاج اور صلح پسند تھا تاہم حاسدوں نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ پہلے پہل خراسان میں بغاوتیں ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۷۷۵ء میں تیمور شاہ کے ایک عزیز عبدالخالق خان نے درانی اور غلزئی قبائل کو ساتھ ملا کر علمِ بغاوت بلند کیا لیکن وہ تیمور شاہ کی منظم فوج کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ گرفتار ہوا اور اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔

۱۷۷۹ء میں پشاور میں بادشاہ تیمور شاہ کے قتل کی سازش ہوئی اور بڑا ہنگامہ مچا تاہم اس آزمائش میں بھی تیمور شاہ مسرح رُو رہا۔ ہوا یہ کہ نوح پشاور کے کئی قبائلی سردار تیمور شاہ کے طور طریقوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ بالخصوص وہ اس کی عیاشیوں کو برداشت نہ کر سکتے تھے اس لئے اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ موقع ملے تو تیمور شاہ کو ہٹا کر اس کے بھائی سکندر مرزا کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیں۔ تہکال کے ارباب فیض اللہ خان اور مہمند سردار ارسلا خان اس مہم میں پیش پیش تھے۔ اتفاق سے انہیں چمکنی کے مشہور بزرگ حضرت میاں عمر صاحبؒ کے صاحبزادے کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ چمکنی کے صاحبزادہ نے مذہبی اعتبار سے تیمور شاہ کی مخالفت شروع کر دی۔ بادشاہ نے اُن سے نپٹنا چاہا لیکن چونکہ تیمور شاہ کے والد احمد شاہ بابا میاں عمر صاحبؒ چمکنی کے دلی ارادت مند تھے اور علاقہ پشاور کے مسلمانوں کی کثیر تعداد میاں صاحب چمکنی کی ہم نوا تھی، اس لئے عمائدینِ سلطنت نے تیمور شاہ کو درگذر سے کام لینے کا مشورہ دیا جو اس نے قبول کر لیا۔ اُدھر فیض اللہ خان ارباب نے بادشاہ سے یہ کہہ کر فوج بنانے کی اجازت لے لی کہ وہ پنجاب کے سکھوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا تھا۔ اس لشکر کے سپاہیوں کی اکثریت آفریدی اور شنواری لوگوں کی تھی جو اصل صورتِ حال سے بے خبر تھے اور محض جہاد کے نام پر فیض اللہ خان کا ساتھ دے رہے تھے۔ مہمند سردار ارسلا خان بھی اس منصوبے

میں ارباب فیض اللہ خان کا دست راست بنا ہوا تھا۔ ایک دن عین دوپہر کو فیض اللہ خان اپنا سارا لشکر لے کر قلعہ بالا حصار میں داخل ہو گیا۔ اس نے پہرہ داروں کو بتایا کہ وہ اپنے لشکر کو بادشاہ تیمور شاہ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ جونہی یہ لشکر قلعہ میں داخل ہوا انہوں نے سنتریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تیمور شاہ کو قتل کرنے کے لئے محل کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تیمور شاہ سویا ہوا نہ تھا۔ اس نے قلعے کے عقب سے اپنے خاص حفاظتی دستے کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا جنہوں نے بروقت کارروائی کر کے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ارباب فیض اللہ خان نے بادشاہ کے قتل کا منصوبہ بنانے میں اتنی رازداری سے کام لیا تھا کہ خود اس کے سپاہیوں اور ساتھیوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ انہیں کس غرض سے بالا حصار لے جا رہا ہے' چنانچہ سازش کا علم ہوتے ہی اکثر آفریدی اور شنواری ارباب صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے بلکہ خود ارباب صاحب کے بھتیجے نے بھی اس سازش میں چچا کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا جس پر چچا نے اپنے ہاتھ سے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بادشاہ کے محافظ دستے نے باہر سے حملہ کر کے ارباب فیض اللہ خان کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ دست بدست لڑائی میں طرفین کے بہت سے لوگ مارے گئے۔ ارباب فیض اللہ خان اور اس کا بیٹا گرفتار ہوئے۔ جنہیں بعد میں بادشاہ کے حکم پر مروا دیا گیا۔ ارسلا خان مہمند گرفتاری سے بچ گیا اور چھپتے چھپاتے بالا حصار سے نکل کر اپنے وطن پہنچ گیا۔ بعد میں بادشاہ نے اُسے جان بخشی کا یقین دلا کر اپنے دربار میں بلا بھیجا کچھ عرصہ اُسے بڑی عزت و احترام سے اپنے پاس رکھا۔ لیکن بعد میں اسے مہمند قبیلہ کے ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا جو اس کے خون کے پیاسے تھے چنانچہ انہوں اپنا ذاتی انتقام لینے کے لئے ارسلا خان کو قتل کر دیا۔ ادھر چکیئنی کے صاحبزادہ صاحب اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھ کر اپنا گھر بار چھوڑ کر مالاکنڈ ایجنسی میں پناہ کے طالب ہوئے، یوسف زئی قبیلہ نے انہیں پناہ دی، چنانچہ جس جگہ صاحبزادہ صاحب نے امان لی تھی اسے "امان درہ" کہا جانے لگا۔ کافی عرصہ بعد یہ لوگ دوبارہ وطن آ گئے تاہم خانوادے کے کئی لوگ مستقلاً قبائلی علاقہ میں آباد ہو گئے۔

تیمور شاہ کے عہد حکومت تک سرہند سے لے کر اٹک تک پنجاب کا سارا علاقہ، سندھ اور بلوچستان درانی سلطنت کا حصہ تھے۔ تاہم پنجاب میں سکھوں کی طاقت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ لوگ گوریلا طرز کی جنگ لڑتے۔ جونہی کوئی منظم فوج سامنے آتی بھاگ کر پہاڑوں کو چلے جاتے، فوج کے

بیٹھ پھیرتے ہی پھر پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقوں پر حملے کرنے لگتے اور لوٹ مار مچاتے، ۱۷۸۱ء میں سکھوں کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے ملتان کے درانی گورنر کو شکست دے کر علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تیمور شاہ کو اس واقع کی خبر ملی تو فوراً ملتان کا رُخ کیا۔ تاہم احتیاطاً اس نے سواروں کا ایک ہراول دستہ روانہ کیا کہ وہ ملتان پہنچ کر اچانک سکھوں پر دھاوا بول دے، اس دستے کے ناگہانی حملے سے سکھ لشکر ششدر رہ گیا اور حوصلہ چھوڑ بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کو شکست ہوئی اور ملتان پر پھر سے درانی حکومت کا پرچم لہرانے لگا۔

تیمور شاہ کو خانہ جنگیوں اور مہموں میں مصروف پا کر سندھ کے لوگوں نے سر اٹھایا اور درانی گورنر کو نکال باہر کیا۔ اب کے سندھ میں تالپور خاندان پیش پیش تھا۔ انہوں نے کلہوڑا رئیسوں کو شکست دے کر سندھ کی زمام اختیار سنبھال لی تھی، تیمور شاہ نے مدد خان کی قیادت میں ایک لشکر تالپوریوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اس لشکر کے پہنچتے ہی سندھی مُہم باز پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف چلے گئے۔ میدان خالی پا کر مدد خان نے سارے علاقے کو لوٹا۔ اہلِ سندھ کی آبادیاں اور فصلیں جلا ڈالیں اور جو سامنے آیا۔ اسے خوب سزا دی۔ تاہم مدد خان سندھ سے روانہ ہو کر ابھی قندھار پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اہلِ سندھ اپنے سردار میر فتح علی خان تالپور کی قیادت میں پھر میدانی علاقوں میں پہنچ گیا اور درانی حاکم کو بھگا کر خود سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔

۱۷۸۶ء میں اہلِ سندھ کو سبق سکھانے کے لئے تیمور شاہ نے ایک اور لشکر احمد خان نورزئی کی قیادت میں بھیجا۔ لیکن اس وقت تک تالپور بہت زور پکڑ چکے تھے۔ انہوں نے احمد خان کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ جس کی تاب نہ لا کر احمد خان میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ بعد میں تالپور حکمران نے اپنا قاصد تحفے تحائف دے کر بادشاہ تیمور شاہ کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی درخواست کی جس پر تیمور شاہ نے میر فتح علی خان کو فرمان شاہی دے کر سندھ کا گورنر بنا دیا۔

سندھ کی بغاوت کے فرو ہونے کے تھوڑا ہی عرصہ بعد کشمیر میں آزاد خان نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ تیمور شاہ کی طرف سے مدد خان اور پائندہ خان نے بڑی جرأت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا، آزاد خان کی بغاوت کو مکمل طور پر فرو کر دیا۔ اس کی ان خدمات سے تیمور شاہ بیحد خوش ہوا نہ طرف اسے انعام و اکرام سے نوازا بلکہ ایک فوج دے کر بلوچستان (وادیٔ شال) سے مالیئے کی وصولی کے لئے بھیج دیا۔ بہ فرض پائندہ خان نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

۱۷۸۸ء میں بہادل خان نے بغاوت کر دی، پائندہ خان نے اسے شکست دی اور اپنا باجگذار بنالیا۔

اسی سال تیمور شاہ کو بلخ اور بخارا سے بھی فساد کی خبریں آنے لگیں، بخارا کے اُزبک بادشاہ شاہ مُراد نے بہت سی فوج جمع کی اور دریائے جیحون کو پار کر کے افغانستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، تیمور شاہ نے اوّل اوّل اسے خط لکھ کر راہِ راست پر لانا چاہا۔ حالانکہ اس وقت حملہ کر دیتا تو یقیناً کامیابی اس کے قدم چومتی۔ صلح کی گفت و شنید میں کافی وقت لگا۔ اور شاہ بخارا کو پوری تیاری کا موقعہ مل گیا۔

۱۷۸۹ء کے موسمِ بہار میں تیمور شاہ ایک لاکھ سپاہیوں کو لے کر کابل سے عازمِ قندز ہوا۔ افغان فوج کی ہیبت سے شاہِ مراد کا دماغ ٹھکانے لگا اور اس نے تیمور شاہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ شاہ مراد کا بیٹا بہت سے تحفے تحائف لے کر تیمور شاہ کے کیمپ میں پہنچا۔ تیمور شاہ نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اور بڑے عزت و احترام سے واپس کیا۔ اس دوران موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ انتہائی سرد موسم اور برف باری کی وجہ سے تیمور شاہ کو اپنا توپ خانہ بھی بلخ میں چھوڑنا پڑا اور اس کے سپاہیوں کی کثیر تعداد بھی سردی کی تاب نہ لاکر راہیٔ ملک بقا ہوئی۔ اس مہم نے تیمور شاہ کی فوجی طاقت کو بُری طرح متاثر کیا اور اس کے بعد اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔

بلخ بخارا کی اس مہم سے واپسی پر تیمور شاہ کا زیادہ وقت پشاور ہی میں گزرا، ۱۷۹۳ء کے موسمِ بہار میں وہ پشاور سے کابل جا رہا تھا کہ راستے میں بیمار پڑ گیا۔ بعض مؤرخوں کے نزدیک اُسے زہر دے دیا گیا تھا۔ بہرحال ۲۰ مئی ۱۷۹۳ء کو تیمور شاہ وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ اب بھی چار باغ کابل میں موجود ہے۔

تیمور شاہ بہادری، مستقل مزاجی اور نفیس طبعی کی بدولت مشہور تھا۔ اُس کے انہیں اوصاف کی بناء پر احمد شاہ ابدالی اس کی بڑی قدر کرتا تھا اور اسے اپنے دوسرے بیٹوں پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ درست ہے کہ تیمور شاہ کے عہد میں فارسی زبان اور دربار داری کے ایرانی طور طریقوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی پشتو دوستی کا ثبوت اس کا وہ پشتو کلام ہے جو "پختانہ شعراء" جلد اوّل میں ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیمور شاہ اپنے عظیم باپ کا سچا جانشین تھا اور اس کا بیس سالہ عہدِ حکومت کئی لحاظ سے صوبہ سرحد اور افغانستان کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

شاہ زمان

۱۷۹۳ء ــــ تا ــــ ۱۸۰۰ء

تیمور شاہ کی اچانک موت کے ساتھ ہی اس کے ۲۳ بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے کش مکش شروع ہوگئی۔ چونکہ شاہ تیمور نے اپنے جانشین کے بارے میں کوئی وصیت نہ چھوڑی تھی۔ اس لئے خانہ جنگی نے اور بھی شدت اختیار کرلی۔ ابھی بادشاہ کی میت محل میں پڑی تھی کہ شہزادے اور بڑے بڑے قبائلی سردار پرہ جنبہ میں لگ گئے۔ یہ حال دیکھ کر تمام قبیلوں کے بزرگوں کا جرگہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جانشین کا اعلان تیمور شاہ کی تجہیز و تکفین کے بعد ہوگا۔

۲۳ درانی شہزادوں میں سب سے بڑا ہمایوں مرزا تھا۔ جس کی ماں سدوزئی گھرانے کی تھی، ہمایوں مرزا ان دنوں قندہار کا گورنر تھا وہ باپ کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔ تیمور شاہ کا دوسرا بیٹا جو ایک پوپل زئی خاتون کے بطن سے تھا۔ ہرات کا گورنر تھا۔ وہ بھی بروقت کابل نہ پہنچ سکا۔ چوتھا بیٹا عباس مرزا، باپ کی زندگی میں پشاور کا حاکم تھا لیکن وہ کمزور سا انسان تھا۔ لے دے کے جرگے کی نگاہِ انتخاب اٹھتی تھی تو زمان مرزا کی طرف اٹھتی تھی وہ اور شجاع الملک مرزا ایک یوسفزئی خاتون کے بیٹے تھے جو اپنی سیرت و صورت کی بدولت تیمور شاہ کی محبوب ترین ملکہ تھی۔ قبائلی سرداروں میں اس وقت سب سے زیادہ بااختیار، دانش مند اور بارسوخ پائندہ خان بارک زئی تھا، پائندہ خان نے اپنی فراست سے شاہ زمان اور شاہ شجاع کی والدہ کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا تھا، چنانچہ کافی بحث و تمحیص کے بعد شاہ زمان کو بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔

شاہ زمان نے تخت نشینی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے سبھی بھائیوں کو کابل کے قلعہ بالاحصار میں نظر بند کر دیا۔ صرف محمود اور ہمایوں جو دارالحکومت میں موجود نہ تھے، آزاد رہ گئے۔ شاہ زمان کے اس اقدام سے خانہ جنگی کا وہ فتنہ شروع ہوا جس سے کبھی اہلِ کابل جان نہ چھڑا سکے۔

شاہ زمان خان نے دوسرا کام یہ کیا کہ بڑے بڑے قبائلی سرداروں سے ان کے اختیارات چھین لئے اس کا خیال تھا کہ اپنی نرم روی کی وجہ سے اس کا والد تیمور شاہ مصائب میں ہمیشہ گرفتار رہا تھا لہٰذا۔ اس نے سخت گیری کو اپنا اصول بنایا۔ ذرا ذرا سی بات پر سرداروں کو معزول کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے پائندہ خان سے بھی جس کی بدولت وہ بادشاہ بنا تھا، اختیارات واپس لے لئے اور وہ بے بس ہو کر رہ گیا۔ شاہ زمان کے اس اقدام سے ہر طرف بے چینی پھیل گئی اور سلطنت کے طول و عرض میں اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ ادھر وفادار خان (اصل نام رحمت اللہ خان) ایسا سردار تھا جو سلطنت کے تمام امور میں مختارِ کُل بن بیٹھا تھا۔ وہ خوشامدی اور رشوت خور شخص تھا اور اس کا مقصد یہی تھا کہ بادشاہ کا دل پائندہ خان اور دوسرے تمام عمائدین سلطنت سے کھٹا کر دے تاکہ خود من مانی کر سکے۔ سوءِ اتفاق سے بادشاہ اسی کے اشاروں پر ناچنے لگا۔

شاہ زمان کی تاجپوشی کی خبر سنتے ہی ہمایوں مرزا نے بغاوت کر دی اور محمود مرزا بھی فوجیں اکٹھی کرنے لگا۔ زمان شاہ ان دونوں کے ارادوں سے باخبر تھا۔ اس لئے فوراً ان کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ قلات غزنی کے قریب اس کا مقابلہ ہمایوں کی فوجوں سے ہوا ـــــ ہمایوں شکست کھا کر بلوچستان کی طرف بھاگ گیا۔ محمود کو بھی ناکامی کا سامنا ہوا تو وہ ایران پہنچ کر پناہ کا طالب ہوا۔

اُدھر سے فراغت ملی تو شاہ زمان نے برصغیر پاک و ہند کی طرف توجہ کی، اس وقت جنوبی ہند میں مرہٹوں نے اُودھم مچا رکھا تھا۔ بنگال سے دہلی تک انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا اور پنجاب میں سکھوں نے تباہی مچا رکھی تھی۔ مسلمان حکمرانوں میں سلطان ٹیپو واحد حکمران تھا جو غیر ملکی استعمار کے خلاف پوری ہمت سے ڈٹا ہوا تھا۔ سلطان ٹیپو اپنی مدد کے لئے شاہ زمان اور نپولین سے امداد کا طلبگار ہوا ـــــ انگریز جانتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کا بہادر پوتا دہلی یا میسور پہنچ گیا تو فرنگیوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے گی۔ اس لئے انہوں نے شاہِ ایران کو اپنے سانچے میں ڈھالا۔ اسے اپنی پوری امداد کا یقین دلایا اور یہ وعدہ لیا کہ شاہ زمان کے حملۂ ہند کی صورت میں وہ اس کے بھائی محمود کو فوجی مدد دے کر قندہار اور کابل پر حملہ کرا دیں تاکہ شاہ زمان اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ انگریز کی یہ چال بڑی کامیاب رہی۔ چنانچہ ابھی ہندوستان پر حملے کی نیت سے شاہ زمان پشاور پہنچا ہی تھا کہ اسے خبر ملی کہ ہمایوں نے سندھ کے لوگوں کی مدد سے قندہار پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی شاہ زمان نے فوراً

قندہار کا رُخ کیا۔ اس کی آمد کا سُنتے ہی ہمایوں مرزا بھاگ کر پھر سندھ کو چلا گیا۔ شاہ زمان نے ایک لشکر سندھ بھیجا تو ہمایوں ہرات کی طرف بھاگ نکلا تاکہ اپنے بھائی محمود سے مل کر علمِ بغاوت بلند کرے۔ تاہم اُسے راستے میں چند زمینداروں نے گرفتار کر کے شاہ زمان کے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور ساری عمر کے لئے قید خانے میں ڈال دیا۔

چونکہ اہلِ سندھ نے اس بغاوت میں ہمایوں کی مدد کی تھی۔ اس لئے ان کی سرکوبی کے لئے شاہ زمان نے سندھ پر فوج کشی کر دی تاہم حاکم سندھ میر فتح علی خان تالپور نے تین لاکھ پونڈ تاوانِ جنگ کے طور ادا کر کے شاہ زمان سے صلح کر لی اور شاہ زمان نے میر فتح علی خان کو سندھ کی گورنری پر بحال کر دیا اپنے بھائی محمود کو بغاوت کا مزا چکھانے کے لئے شاہ زمان نے ہرات پر بھی فوج کشی کی لیکن محمود کے اطاعت کا یقین دلانے پر ہرات کی حکومت اسی کے سپرد کر کے واپس چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد یوں نظر آتا تھا گویا شاہ زمان تمام شورشوں کو فرو کرنے کے بعد ایک پُرامن اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے ـــــ امن و سکون کی بحالی کے فوراً بعد اس نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا اور سکھوں کو جنہوں نے پنجاب کے درّانی حکومت کے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کیفر کردار تک پہنچانے کے ارادے سے ایک کثیر لشکر کے ہمراہ پشاور پہنچا۔ ۱۷۹۵ء کے آخر میں اس نے اٹک کے مقام پر دریائے سندھ پر کشتیوں کا پُل باندھا اور وارد پنجاب ہوا ـــــ حسن ابدال پہنچ کر بادشاہ نے اپنے ایک معتمد سردار احمد خان کو ایک لشکر دے کر رہتاس کے قلعے کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ اس موقع پر شمالی پنجاب کے مسلمان قبیلوں نے بھی افغان لشکر کا ساتھ دیا اور اس متحدہ لشکر نے بڑی آسانی کے ساتھ رہتاس کا قلعہ فتح کر لیا۔ حسبِ عادت سکھ سپاہی پہاڑی علاقوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور کسی جگہ بھی انہوں نے ڈٹ کر حملہ آور فوج کا مقابلہ نہ کیا ـــــ بادشاہ ابھی حسن ابدال ہی میں تھا کہ ایران سے سیاسی شورش کی خبریں آنے لگیں۔ اب کے ایران کے قاچار بادشاہ آغا محمد نے ایرانی خراسان پر حملہ کر دیا تھا۔ شاہ زمان یہ خبر سُنتے ہی حسن ابدال سے روانہ ہوا اور ۳ر جنوری ۱۷۹۶ء کو واپس پشاور پہنچا۔ اسی اثنا میں ایران سے صلح ہو جانے کی خبر مل گئی۔ تو شاہ زمان تیس ہزار مجاہدوں کے ہمراہ پھر عازم لاہور ہو گیا۔ ابھی وہ لاہور پہنچا ہی تھا کہ پتہ چلا کہ ہرات میں پھر محمود بغاوت پر اتر آیا ہے۔ شاہ زمان سیدھا قندہار پہنچا۔ ۸ ستمبر ۱۷۹۷ء کو اس نے محمود کو دوبارہ شکست

دی، اس مرتبہ اس نے اپنے بیٹے قیصر مرزا کو ہرات کا گورنر اور زمان خان پوپل زئی کو اس کا وزیر مقرر کر دیا۔

اُدھر سے فراغت ہوئی تو شاہ زمان نے ۲۵ اکتوبر ۱۷۹۸ء کو آخری بار پھر لاہور کی طرف کوچ کیا۔ اس کی آمد کا مقصد سلطان ٹیپو سے کئے گئے وعدے کو پورا کرنا تھا۔ راستے میں وہ سکھ باغیوں سے بھی نپٹنا چاہتا تھا تاکہ اس کا عقب محفوظ رہ سکے۔ ان دنوں لاہور پر بھنگی مسل کے سکھ سردار قابض تھے وہ بادشاہ کی آمد کی خبر سنتے ہی پسپا ہو گئے اور زیادہ مزاحمت کے بغیر ہی شاہ زمان لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس نے رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کو یقین دلایا کہ اس کے حملے کا مقصد سکھوں کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ ارضِ ہند کو غیر ملکی حکمرانوں کے تسلط سے پاک کرنا ہے۔

شاہ زمان ابھی لاہور میں جنوبی ہند کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ اُسے خبر ملی کہ اس کے ناعاقبت اندیش چھوٹے بھائی محمود نے شاہ ایران کی مدد سے ہرات پر حملہ کر دیا ہے اور اس کا مقصد کابل اور قندہار پر تسلط جما کر شاہ زمان کی حکومت ختم کر دینے کا ہے۔ اس پریشان کن اطلاع کے ملتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ واپسی کا یہ سفر اتنی افراتفری سے طے ہوا کہ دریائے جہلم کو جو اس وقت طغیانی میں تھا۔ پار کرتے ہوئے اس کی کچھ توپیں غرقاب ہو گئیں۔ ان توپوں کو اسی حال میں چھوڑ کر وہ آگے بڑھا۔ بعد میں یہ توپیں سردار رنجیت سنگھ نے نکلوا کر شاہ زمان کو بھجوا دیں۔ چنانچہ پشاور پہنچنے پر شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کے اس دوستانہ اقدام کے اعتراف میں بہت سے قیمتی تحائف بھیجنے کے علاوہ لاہور کی حاکمیت کا پروانہ بھی لکھ بھیجا اور اسی استحقاق کی بنا پر رنجیت سنگھ لاہور کا باقاعدہ حاکم بن بیٹھا۔

انگریز کی چال بہت کامیاب رہی، سلطان ٹیپو کو کوئی بیرونی امداد بروقت نہ مل سکی تاہم وہ اکیلے ہی فرنگیوں کے خلاف ڈٹا رہا۔ بالآخر وہ بطلِ حُریّت لڑتے لڑتے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جامِ شہادت نوش کر گیا۔ انگریزوں کی راہ سے یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور انہوں نے تیزی سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو بھی ہتھیا لیا۔

آخری مرتبہ واپسی کے اس سفر میں شاہ زمان ۳۰ جنوری ۱۷۹۹ء کو پشاور پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے تمام حالات کا جائزہ لیا۔ افغانستان اور ایران میں انگریز کی ریشہ دوانیوں اور قبائلی سرداروں

کی باہمی چپقلش سے حالات اتنے ابتر ہو چکے تھے اور محمود کو ہوسِ اقتدار نے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں اور شاہ ایران کی مدد سے ہرات پر قابض ہونے کی نیت سے حملہ آور ہوا۔ شاہ زمان کے بیٹے قیصر مرزا نے حتی الامکان اپنے چچا کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ محمود عارضی طور پر کامیاب ہو گیا۔ ادھر پائندہ خان بارک زئی کے بیٹے فتح خان نے بھی محمود کا پورا ساتھ دیا۔ ہرات پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے قندہار بھی ہتھیا لیا۔ شاہ زمان نے باغیوں کے خلاف فوج کشی کی، وہ محمود کے مقابلے کو آگے بڑھا لیکن مقابلے سے پہلے ہی اس کے سپہ سالار احمد خان نورزئی نے شاہ محمود اور فتح خان سے ساز باز کر لی۔ وہ باغیوں سے مل گیا۔ زمان شاہ کے لئے اب کوئی چارہ کار نہ رہا۔ وہ جان بچانے کے لئے کابل پہنچا لیکن وہاں بھی حالات کو ناسازگار پا کر پشاور کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ ایک شنواری ملک ملا عاشق کے قلعے میں ٹھہرا۔ ملا عاشق شاہ زمان کا انتہائی قابلِ اعتماد دوست تھا لیکن اس مشکل میں وہ بھی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ گیا۔ انعام و اکرام کے لالچ میں اس نے فوراً ایک تیز رفتار قاصد کابل بھجوایا اور پیغام بھیجا کہ شاہ زمان اس کے قلعے میں پناہ گزین ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی وزیر فتح خان نے اپنے بھائی اسد خان کو شاہ زمان کی گرفتاری کے لئے بھیجا۔ شاہ زمان گرفتار ہوا اور کابل لے جایا گیا۔ جہاں شاہ محمود کے حکم سے اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں اور اسے قلعہ بالاحصار میں قید کر دیا گیا۔ محمود کی حکومت کے خاتمہ تک وہ قید ہی میں رہا لیکن ۱۸۰۳ء میں اس کا بھائی شاہ شجاع برسر اقتدار آیا تو اسے قید خانہ سے نکالا۔

اس واقعہ کے بعد کابل کی خانہ جنگیوں اور محلاتی سازشوں نے اور بھی زور پکڑا۔ پوری انیسویں صدی عیسوی میں افغانستان میں کوئی مستحکم حکومت قائم ہونے نہ پائی۔ بادشاہ گردی اور برادر کشی کا دور دورہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افغانستان ایک کمزور اور غیر معروف علاقہ بن کر رہ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جس وقت شاہ زمان ملا عاشق شنواری کے قلعہ میں پناہ گزین ہوا۔ کوہِ نور ہیرا بھی اس کے پاس تھا جسے گرفتاری کے وقت اس نے وہیں کسی دیوار میں گاڑ دیا تھا۔ بعد میں جب اس کا بھائی شاہ شجاع برسر اقتدار آیا تو اس نے شاہ زمان کی نشان دہی پر کوہِ نور برآمد کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا۔

آئے روز کی ان خانہ جنگیوں کا اثر صوبہ سرحد پر بھی ہوا ـــــ ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ نظر آنے لگا۔ درانی حکومت کو کمزور پاکر ہر قبائلی سردار اپنی من مانی کرنے لگا اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ہزارہ میں سواتی سردار سعادت خان نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اپنے بیٹے کے نام پر گڑھی حبیب اللہ کا قصبہ آباد کیا اور حکمران بن بیٹھا۔ جعفر خان نے خانپور کے گکھڑوں کی مدد سے اپنی ریاست بنالی۔ ہری پور کے نواح میں ترین سردار نجیب اللہ خان دادِ حکومت دینے لگا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور نواحی علاقے میں نواب محمد خان سدوزئی نے اپنا تسلط جما لیا۔ ٹانک کے حاکم سرور خان کٹی خیل نے اپنی نوابی کا اعلان کر دیا، مدتوں نواب محمد خان اور سرور خان آف ٹانک میں لڑائی ہوتی رہی جس میں طرفین کا کافی نقصان ہوا۔

شاہ محمود اور شاہ شجاع

۱۸۰۰ء — تا — ۱۸۱۰ء

شاہ زمان کے مقابلے میں شاہ محمود ایک نااہل اور خود بین شخص تھا۔ اس نے باپ دادا کے جمع کئے ہوئے خزانے کو بے دردی سے لٹایا اور امورِ سلطنت پر کوئی توجہ نہ دی، وہ برائے نام بادشاہ تھا اور اصل طاقت سب کی سب وزیر فتح خان بارک زئی کے ہاتھ میں تھی۔ فتح خان صحیح معنوں میں بادشاہ گر تھا۔ کبھی محمود کا ساتھ دیتا کبھی شاہ شجاع کا اور کبھی شہزادہ قیصر کا — اختیار ملتے ہی فتح خان نے اپنے حریفوں سے انتقام لینے کی ٹھانی — اس وقت اس کا سب سے بڑا حریف اکرم خان علی زئی تھا۔ اس نے ہر طرح اسے دبانا اور تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس پر اکرم خان اور اس کے ہم نوا غلزئی قبائل نے اعلانیہ شاہ محمود اور فتح خان وزیر کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

ادھر شاہ زمان کی طرف سے پشاور کی گورنری شاہ شجاع کو عطا کی گئی تھی۔ کابل میں شاہ محمود کو حکومت ملی تو شاہ شجاع نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شاہ زمان کا خزانہ اور مال و اسباب سب اسی کے قبضے میں تھے، یوں بھی وہ یوسف زئی ماں کے بطن سے ہونے کی وجہ سے پشاور اور صوبہ سرحد کے قبائل میں بہت مقبول تھا۔ شاہ زمان کا حقیقی بھائی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے زعم میں سلطنت پر زیادہ استحقاق رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً جنگی تیاریاں شروع کر دیں تاکہ شاہ محمود سے اقتدار چھین کر خود سارے صوبہ سرحد اور افغانستان کا بادشاہ بن سکے۔

اُدھر شاہ محمود اپنی عارضی کامیابی پر نازاں تھا۔ اس نے سردار فتح خان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے "شاہ دوست خان" کا خطاب دیا اور فتح خان کے ساتھیوں میں سے شیر محمد خان

(فرزند شاہ ولی خان) کو "مختار الدولہ" کے خطاب سے نوازا۔ سردار عبداللہ خان الیکوزئی کو جسے شاہ زمان نے قلعہ بالاحصار میں قید کر رکھا تھا۔ آزاد کر کے کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اسی طرح ہر جگہ اپنی پسند کے گورنر تعین کرنے کے علاوہ اکرم خان علی زئی کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

پشاور کا گورنر شجاع الملک اس عرصے میں جنگی تیاریوں میں لگا رہا۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ شاہ محمود سے کابل کا تخت چھین کر رہے گا۔ چنانچہ دس ستمبر ۱۸۰۱ء کو وہ اپنی فوج کے ساتھ پشاور سے عازم کابل ہوا۔ اس کے سپاہیوں کی تعداد دس ہزار تھی تاہم اس لشکر میں اکثریت ناتجربہ کار اور قسمت آزما لوگوں کی تھی۔ شاہ محمود کی جانب سے تین ہزار تربیت یافتہ فوج فتح خان کی کمان میں مقابلے کے لئے بھیجی گئی، کابل اور درہ خیبر کے درمیان آشپان کے مقام پہ دونوں بھائیوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ پہلے پہل شجاع الملک کی فوج میدان پر چھائی رہی۔ ایک موقع پر وہ فتح سے ہم کنار ہونے ہی والا تھا۔ کہ اس کے کچھ سپاہی لوٹ مار میں لگ گئے، فتح خان نے پشاوری لشکر کی اس بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آزمودہ کار سپاہیوں کو لے کر زبردست حملہ کیا تو شاہ شجاع کو بھاگتے ہی بن پڑی۔ وہ فرار ہو کر تیراہ میں جا چھپا۔ اب کے پشاور بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اگرچہ اسے کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تاہم ہوس اقتدار نے اسے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے بعد وہ پھر کابل پہ حملے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

شاہ شجاع کچھ عرصہ تک تیراہ کے مقام خوڑہ میں آفریدیوں کے پاس مقیم رہا۔ وہ عالی ہمت انسان تھا۔ اس کی ساری عمر کش مکش میں گزر گئی تاہم اس نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ قیام تیراہ کے دوران شاہ شجاع کی حالت سخت ابتر تھی۔ شاہ محمود کے خلاف جنگ کے وقت وہ اپنا خزانہ اور اپنے اہل وعیال بھی ہمراہ لے گیا تھا۔ شکست کا سامنا ہوا تو اس خزانے سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ سارا مال واسباب وزیر فتح خان کے ہاتھ لگا۔ فتح خان اب سارے علاقہ پشاور پہ قابض ہو گیا۔ پشاور پہنچ کر اس نے اہل شہر سے دل کھول کر انتقام لیا۔ سدوزئی خاندان کے حامیوں کو خوب سزائیں دیں۔ ان پر بھاری جرمانے عائد کئے، پشاور سے فتح خان نے کوہاٹ، ہنگو، ٹل اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی طرف پیش قدمی کی۔ ٹل اور بنوں کے مابین اُسے وزیریوں کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ صوبہ سرحد میں مستقل نوعیت کی حکومت قائم نہ کر سکا۔ البتہ

اس نے پشاور شہر کے جنوب میں وزیر باغ بنوایا جو اب تک موجود ہے۔ یہ باغ نہایت عمدہ طریق سے لگایا گیا۔ اس میں تالاب اور فوارے لگائے گئے اور شاندار اور خوبصورت ایوان تعمیر کرائے۔ بعد میں فتح خان کے چھوٹے بھائی سلطان محمد خان نے وزیر باغ ہی کو اپنی مستقل رہائش گاہ بنالیا۔ اس کے بیوی بچے اور عزیز اسی پُر فضا مقام میں رہتے۔ یہیں قبائل کے جرگے منعقد ہوتے اور امورِ سلطنت انجام پاتے۔

ادھر فتح خان پشاور کو اپنا مستقل دارالحکومت بنانے کی تدبیروں میں لگا تھا۔ اُدھر شاہ شجاع پھر سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ آفریدی اور یوسف زئی قبیلے ہمیشہ سدوزئی حکمرانوں کا ساتھ دیتے رہے تھے خصوصاً شاہ شجاع کے ساتھ ان کی وفاداری ضرب المثل کا درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ ان دو قبائل کی مدد سے شاہ شجاع نے ۱۸۰۲ء کے موسم بہار میں ایک بار پھر پشاور پر چڑھائی کی۔ اب کے اس کے سپاہیوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ پشاور سے سرکاری لشکر اس کے مقابلے میں نکلا۔ سخت لڑائی ہوئی دونوں طرفوں کے جانباز پوری بہادری سے لڑے، تاہم شاہ شجاع نے شکست کھائی اور دوبارہ تیراہ کے مقام چورہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ آفریدیوں نے اس کسمپرسی کے عالم میں بھی اس کا پورا ساتھ دیا۔ تاہم فتح خان وزیر کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر شاہ شجاع نے تیراہ میں قیام مناسب نہ سمجھا۔ وہ بنوں۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ژوب کی راہ وادیٔ شال (بلوچستان) کو کوچ کر گیا۔ بلوچستان کے ملک گلستان نے اس کا پورا ساتھ دیا اور تھوڑی ہی مدت میں شاہ شجاع کو کئی ہزار لڑاکا نوجوانوں کی حمایت حاصل ہو گئی۔

اُدھر شاہ محمود کے خلاف غلزئی قبائل کھلی بغاوت پر اتر آئے۔ انہوں نے پچاس ہزار کا لشکر جمع کر کے غزنی۔ قندہار اور کابل پر کئی حملے کئے اور خوب لوٹ مار کی۔ اگرچہ غلزئی کسی میدان میں جم کر نہ لڑ سکے تاہم ان کے بار بار حملوں کی وجہ سے شاہ محمود کی حکومت کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کا رُعب اُٹھ گیا اور وہ افغان عوام کی نظروں سے گر گیا۔

شاہ شجاع تو موقع کی تاڑ میں تھا ہی۔ وہ وادیٔ شال (کوئٹہ) سے اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلا۔ وزیرستان پہنچا تو وزیری اور خوست وال قبائل نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ایک درّانی لشکر، جو اپنے سردار مختار الدولہ کی قیادت میں تھا بھی شاہ شجاع سے آن ملا۔ شاہ شجاع اور مختار الدولہ نے کابل پہنچ کر

قلعہ بالاحصار کا محاصرہ کر لیا۔ شاہ محمود بھی اپنے اہل و عیال سمیت اسی قلعے میں قیام پذیر تھا ـــــ اس محاصرے کو توڑنے کے لئے وزیر فتح خان دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر لے کر پہنچا۔ پہلے پہل تو اس نے شاہ شجاع اور حملہ آور فوج پر پورا دباؤ ڈالا اور اسے سخت نقصان پہنچایا لیکن شاہ محمود سے لوگ انتہائی متنفر ہو چکے تھے۔ اس لئے عوام نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتح خان بارک زئی کے لشکر کو پسپائی اختیار کرنی پڑی ـــــ دوسرے دن شاہ شجاع، ایک بار پھر، افغانستان کا تاجدار بن چکا تھا۔ شاہ محمود کو قیدی بنا کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تاہم اس نے فراخدلی کا ثبوت دیا اور شاہ محمود کی آنکھیں نکلوائیں نہ کوئی اور اذیت دی ـــــ اس نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ شاہ شجاع کا ساتھ دینے لگے۔ اس وقت تک شاہ شجاع کا حقیقی بھائی اور معزول حکمران شاہ زمان قلعہ بالاحصار میں اسیری کے دن گزار رہا تھا۔ شاہ محمود نے اسے رہا کرایا۔ شاہ زمان کو قید کرانے میں ملا عاشق شنواری نے انتہائی غیر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اب شاہ محمود اور شاہ زمان برسر اقتدار آئے تو انہوں نے ملا عاشق سے پورا بدلہ لیا اور اسے دردناک سزا دی تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

کہنے کو تو شاہ شجاع حکمران بن گیا تاہم اصل طاقت اب بھی درانی سرداروں کے ہاتھ میں تھی فتح خان وزیر شاہ محمود کا حلیف تھا تو اس کا سیاسی رقیب مختار الدولہ شاہ شجاع کا طرفدار بن چکا تھا۔ شاہ شجاع نے درانی سرداروں کو جاگیریں عطا کیں کہ وہ اس کا ساتھ دیتے رہیں۔ اسی طرح وادئ پشاور کا مالیہ آفریدیوں کو بخش دیا کیونکہ آفریدیوں نے شاہ شجاع کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد قندہار میں وزیر فتح خان بھی شاہ شجاع کے دربار میں آیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ شاہ شجاع اس طاقت ور سردار کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اسے انعام و اکرام سے نوازتا اور خطابات دے کر اس کی عزت افزائی کرتا لیکن مشکل یہ تھی کہ درانی قوم اب دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک گروہ کا سردار فتح خان تھا تو دوسرے کا اکرم خان عرف مختار الدولہ، بادشاہ ایک کی طرف جھکتا تو دوسرا فریق ناراض ہو جاتا۔ ادھر چونکہ افغانستان فتح کرنے میں اکرم خان یا مختار الدولہ نے شروع سے شاہ شجاع کا ساتھ دیا تھا۔ بادشاہ اسے بھی نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ فتح خان کو نوازنے کا مطلب

مختار الدولہ کی ناراضگی اور دشمنی مول لینا تھی۔ اس لئے شاہ شجاع فتح خان کی طرف زیادہ جھک نہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح خان اندر ہی اندر پھر شاہ شجاع کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔

کابل پر تو شاہ شجاع کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن قندہار ابھی تک شاہ محمود کے بیٹے کامران مرزا کی تحویل میں تھا۔ شاہ شجاع نے اپنے بھتیجے اور شاہ زمان کے بیٹے قیصر مرزا کو ایک لشکر دے کر قندہار کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ ابھی قیصر مرزا قندہار پہنچنے نہ پایا تھا کہ اُسے خبر ملی کہ قندہار کے عوام نے کامران مرزا کے خلاف بغاوت کر کے اسے شہر سے نکال دیا ہے۔ اس پر قیصر مرزا بغیر کسی مزاحمت کے قندہار پر قابض ہو گیا۔ کامران مرزا بھاگ کر افغانستان کے مغربی علاقے فرح کو چلا گیا تاکہ موقع ملے تو پھر اپنا کھویا ہوا ملک حاصل کر سکے۔

جنوری ۱۸۰۴ء میں شاہ شجاع نے پشاور میں تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کی تاکہ سندھ اور کشمیر میں امن قائم کرے، یہ فوج روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھی کہ قندہار سے خبر ملی کہ شاہ شجاع کے بھتیجے قیصر مرزا نے اپنے چچا کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ شاہ شجاع نے ادھر کا رُخ کیا۔ اس بغاوت کو فرو کیا۔ قیصر مرزا نے بادشاہ سے معافی مانگ کر جان چھڑالی۔ ادھر سے فارغ ہو کر شاہ شجاع نے سندھ کے تالپور حکمرانوں پر یلہ بول دیا تاہم کسی لڑائی سے پہلے ہی تالپوری سرداروں نے اپنے وزیر ولی محمد خان کو بادشاہ کی خدمت میں صلح کی غرض سے بھیج دیا۔ اور تین لاکھ بیس ہزار روپیہ تاوان دے کر جان چھڑالی۔ تاوان وصول کرنے کے بعد شاہ شجاع کابل کو چل دیا۔ جہاں شمالی قبائل بغاوت پر اتر آئے تھے۔

اُدھر سے فراغت ہوئی تو شاہ شجاع پھر پشاور پہنچا اور کشمیر پر لشکر کشی کی تیاریاں کرنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ کشمیر پر اس وقت عبداللہ خان کی حکومت تھی جسے شاہ محمود نے حاکم مقرر کیا تھا۔ عبداللہ خان نے شاہ شجاع کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بالآخر مختار الدولہ کی کمان میں دس ہزار افغانی سپاہی پشاور سے عازمِ کشمیر ہوئے۔ مظفر آباد کے قریب دونوں فوجوں میں آمنا سامنا ہوا۔ عبداللہ خان کی فوج کا ایک دستہ ایک کلیدی مقام پر متعین تھا۔ اس نے مختار الدولہ کے لشکر کو بڑا نقصان پہنچایا تاہم کسی نہ کسی طرح مختار الدولہ اسے پسپا کرنے پر کامیاب ہو گیا۔ شاہ شجاع کے جانباز آگے بڑھتے ہوئے دریائے جہلم تک جا پہنچے۔ کافی دنوں تک یہ عالم رہا کہ عبداللہ خان کی

فوجیں دریا کے مشرقی کنارے پر تھیں تو مختار الدولہ کی مغربی کنارے پر ـــــ بالآخر ایک دن راتوں رات دریا پر پُل بنا کر عبداللہ خان نے مختار الدولہ کی فوج پر ہلّہ بول دیا۔ اس وقت مختار الدولہ کی فوج اِدھر اُدھر گئی ہوئی تھی۔ تاہم وہ اپنے چند سو سپاہیوں کو لے کر ڈٹ گیا۔ اس نے حملہ آوروں کے قدم روک دیئے۔ رفتہ رفتہ اس کے باقی ماندہ سپاہی بھی اس سے آملے اور انہوں نے زوردار حملہ کر کے عبداللہ خان کی فوج کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس افراتفری میں عبداللہ خان کے بہت سے سپاہی دریائے جہلم میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے اور اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اب موسم سرما شروع ہو گیا تھا۔ ایسے میں کشمیر میں جنگ جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ دونوں فوجیں اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکی رہیں۔ لیکن موسمِ بہار کے شروع ہوتے ہی مختار الدولہ نے پھر سے مخالف فریق پر حملہ کر دیا۔ اس اثنا میں عبداللہ خان فوت ہو چکا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک اس کی فوج نے جنگ جاری رکھی۔ آخر فریقین میں صلح ہو گئی۔ عبداللہ خان کے اہل و عیال کو نہایت عزت و احترام سے پشاور بھیج دیا گیا اور کشمیر کا صوبہ شاہ شجاع کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

شخصی عداوتوں نے اسلامی حکومتوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان دشمن کی طرف سے کبھی نہیں پہنچا، دربارِ کابل تو بالخصوص اس پیہ جنبہ اور ذاتی عناد کی آماجگاہ رہا ہے۔ چنانچہ جب مختار الدولہ انتہائی وفاداری سے کشمیر میں شاہ شجاع کی طرف سے جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے مخالف متواتر شاہ شجاع کے کان بھرتے رہے، یہاں تک کہ بادشاہ کا دل مختار الدولہ سے کھٹا ہو گیا۔ اُدھر فتح خان نے قندہار پر قبضہ کرنے کے بعد کامران کو ترغیب دی کہ وہ کابل فتح کرنے کے بعد اپنی بادشاہی کا اعلان کر دے۔ اِدھر مختار الدولہ شہزادہ قیصر سے جا ملا اور کابل میں اسے بادشاہ بنا دیا۔ کابل کا تخت سنبھالنے کے بعد قیصر نے مختار الدولہ کی مدد سے پشاور پر بھی قبضہ جما لیا۔ شاہ شجاع ان دنوں سندھ کی مُہم پر گیا ہوا تھا۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی پشاور کا رُخ کیا۔ بادشاہ مارچ ۱۸۰۸ء کو پشاور پہنچا۔ تہکال کے قریب شاہ شجاع اور قیصر کی فوجوں کی جنگ ہوئی۔ قیصر اور مختار الدولہ کے پاس بارہ ہزار سپاہی تھے۔ شروع شروع میں ان کی فتح یقینی نظر آتی تھی لیکن ایک موقع پر مختار الدولہ شاہ شجاع کو ختم کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تو بادشاہ کے ذاتی محافظوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایک گولی مختار الدولہ کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مختار الدولہ کے مرتے ہی اس کی فوج دِل

چھوڑ بیٹھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ شجاع کو فتح نصیب ہوئی اور وہ خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا پشاور شہر میں اس عالم میں داخل ہوا کہ مختار الدولہ کا سر نیزے کی نوک پر بلند کئے ہوئے ایک سپاہی آگے آگے تھا اور شاہی فوج اس کے پیچھے پیچھے۔

شاہ شجاع نے پشاور تو فتح کر لیا لیکن کشمیر، کابل اور قندہار پر ابھی تک شہزادہ قیصر کے حامی سردار ہی کا قبضہ تھا۔ کابل سے پشاور آتے وقت شہزادہ قیصر میر واعظ کو وہاں کی عنانِ حکومت سونپ آیا تھا۔ شاہ شجاع نے کابل کا رُخ کیا تو پہلے پہلے میر واعظ نے بہت بڑا لشکر مقابلے کے لئے تیار کیا لیکن جونہی بادشاہ کابل کے قریب پہنچا، میر واعظ اور اس کے ساتھی بھاگ کر کوہستان میں روپوش ہو گئے اور وہاں رہ کر کافی عرصہ تک بادشاہ کے خلاف گوریلا جنگ کرتے رہے۔

ادھر شاہ شجاع اور اس کے بھتیجے میں ٹھنی ہوئی تھی۔ اُدھر شاہ محمود جو کابل کے قلعہ بالاحصار میں قید تھا اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ چند قزلباش محافظوں کی مدد سے جیل میں سُرنگ نکال کر وہ وہاں سے جنوبی افغانستان کی طرف بھاگ نکلا اور قندہار پہنچ کر وزیر فتح خان سے جا ملا۔ دونوں نے بڑی آسانی سے پہلے تو قندہار پر قبضہ کر لیا پھر کابل پر حملے کی غرض سے چل پڑے، لڑائی میں شاہ شجاع نے آگے بڑھ کر قندہار پر قبضہ کر لیا اور پھر ہرات پر بھی فوج کشی کی۔ تاہم ہرات کے حاکم حاجی فیروز الدین نے لگان دینے کا وعدہ کر کے صلح کی درخواست کی جسے شاہ شجاع نے قبول کر لیا۔

اُدھر سے فراغت پاتے ہی شاہ شجاع عازمِ سندھ ہونا چاہتا تھا کیونکہ تالپوری حکمرانوں نے کافی عرصہ سے خراج ادا نہ کیا تھا۔ تاہم قندہار پر شاہ شجاع کی کامیابی کی خبر سنتے ہی سندھ کے رئیسوں نے فوراً خراج کی رقم ارسال کر دی۔ اس پر شاہ شجاع نے سندھ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور پشاور کی راہ لی۔

۱۰ جنوری ۱۸۰۹ء کو شاہ شجاع پشاور پہنچا۔ اب کے اُسے ایک اور سیاسی محاذ پر توجہ دینی پڑی۔ برصغیر ہند میں ان دنوں بہت سرعت سے سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ انگریز جنوبی اور وسطی ہند میں قدم جما چکے تھے۔ اب اُن کی نظریں شمالی ہند اور افغانستان پر تھیں، پنجاب میں رنجیت سنگھ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ انگریز گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ طے کیا جس کی رُو سے دریائے ستلج کے مشرق کا سارا علاقہ انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا تھا۔ ان دنوں روس کی جانب

سے ایران اور افغانستان پر پیش قدمی کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا، ظاہر ہے کہ انگریز روسی اقتدار کے اس پھیلاؤ کے سخت مخالف تھے۔ لہٰذا انہوں نے روس کے خلاف سیاسی چالبازیاں شروع کر دیں۔ شاہِ ایران کو مالی اور فوجی مدد دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا اور ادھر شاہ شجاع والیٔ افغانستان سے رسم و راہ بڑھانی شروع کی، چنانچہ سر ماؤنٹ سٹوورٹ الفنسٹن کی سرکردگی میں ایک سیاسی مشن شاہِ کابل کے دربار میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا ـــــ یہ وفد ۱۸۰۸ء کے آخر میں راجپوتانہ، بہاولپور اور ملتان کے راستے روانہ ہوا ـــــ پہلے پہل وفد کا ارادہ قندہار جانے کا تھا کیونکہ دسمبر ۱۸۰۸ء تک شاہ شجاع قندہار ہی میں مقیم تھا تاہم بعد میں جب شاہ شجاع اپنے سرمائی دارالحکومت پشاور آ گیا تو انگریزی وفد نے بھی راستہ بدل لیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خان، بنوں اور کوہاٹ سے ہوا عازمِ پشاور ہوا۔

شاہ شجاع کو اس سفارتی وفد کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا ایک نمائندہ ملا جعفر سر الفنسٹن کی پیشوائی اور رہنمائی کے لئے ڈیرہ اسمٰعیل خان بھیجا۔ ملا جعفر کی ملاقات انگریز سفارت کار سے اس وقت ہوئی جب وہ پہاڑپور میں مقیم تھا۔ وہاں سے ملا جعفر اور سر الفنسٹن کوچ کر کے پنیالہ پہنچے، پنیالہ کا نخلستان انگریز قافلہ و وفد کو بہت پسند آیا اور وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی سے بھی وہ بہت متاثر ہوا۔ پنیالہ سے روانہ ہو کر وہ کالا باغ پہنچے جو ان دنوں لوہے کی صنعت کا ایک مشہور مرکز تھا۔ منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے ڈوڈہ کی راہ یہ وفد وارد کوہاٹ ہوا۔ کوہاٹ کی دلکش وادی، پُرفضا باغ اور گنگناتے چشمے دیکھ کر انگریز قاصد بے حد خوش ہوا اور کئی روز تک وہاں ٹھہرا رہا۔ اس کا زیادہ تر وقت کوہاٹ کے باغوں اور جنگلی جیل کے چشموں کے کنارے درختوں کے سائے میں گزرتا۔ وہ سیر و شکار کا بڑا شوقین تھا۔ اس نے وہاں بلبل، تلیتر اور مرغِ زرین کا شکار کیا۔

کوہاٹ سے یہ قافلہ کوتل پہنچا، جہاں اس کی ضیافت ایک بنگش سردار نے کی جس کا تذکرہ الفنسٹن نے بڑے مزے لے لے کر کیا ہے۔ کوتل کے پُرپیچ راستے سے سفر کو الفنسٹن نے اپنی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ قرار دیا ہے۔

الفنسٹن کی نظر بڑی دور بین اور قوتِ مشاہدہ بہت گہری تھی۔ اس کا سفر نامہ ایک بے حد دلچسپ تصنیف ہے جس میں ہر مقام اور ہر قریے کا صحیح تعین ہے، شہنشاہ بابر کی طرح وہ ہر نظارے سے لطف اندوز ہوتا ہے اور پھر اسے مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، فطرت کی عکاسی اور ماحول کی ترجمانی میں اُسے

کمال حاصل ہے، وہ انسانی نفسیات کا بھی ماہر معلوم ہوتا ہے، پٹھانوں کے کردار کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ

"اُن میں انتقام، حسد، کینہ، اور سرتیزی جیسی خامیاں ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ لوگ انتہائی حریت پسند، خوش خلق، مہمان نواز، مہم باز، سخت کوش اور زیرک ہیں، جو بات انہیں اپنی ہمسایہ قوموں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ذہن جھوٹ، ریاکاری، فریب اور سازش سے بالکل پاک ہیں"

الفنسٹن نے چھ ماہ کا عرصہ صوبہ سرحد میں گزارا، جن میں سے چار ماہ اس کا قیام پشاور میں رہا۔ لیکن اتنی قلیل مدت میں اس نے سرحدی سیاسیات، معاشرت اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل کیں اور انہیں اپنی کتاب میں محفوظ کیا، اگرچہ وہ کابل نہ جا سکا تاہم اس نے کابل کے بارے میں پشاور ہی میں رہ کر صحیح صحیح معلومات حاصل کیں۔ الفنسٹن اپنے قیام کلکتہ کے دوران سنسکرت اور فارسی زبانیں سیکھ چکا تھا، وہ ایک فاضل انسان تھا۔ خیال ہے کہ پشاور میں رہ کر اس نے پشتو بھی ضرور سیکھی ہوگی۔ اپنی انہی صلاحیتوں کی بدولت اس نے تھوڑے عرصے میں اس علاقہ کے متعلق کافی معلومات حاصل کر لیں اور ان معلومات کو نہایت دلچسپ انداز میں قلم بند کیا وہ واحد انگریز نمائندہ تھا جو درانی حکمرانوں کے عہد میں پشاور آیا۔ اس وقت تک یورپی لوگوں کو صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے متعلق تفصیلاً کچھ علم نہ تھا۔

الفنسٹن ۲۵ فروری ۱۸۰۹ء کو وارد پشاور ہوا تو شاہ شجاع نے بمع نفیس بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ بادشاہ اُن دنوں قلعہ بالا حصار میں دربار لگاتا تھا۔ یہیں اس کے محلات تھے قلعہ کے سامنے خوبصورت باغات تھے۔ پشاور ہر اعتبار سے ایک خوبصورت دارالحکومت کا منظر پیش کرتا تھا۔ برطانوی وفد کا قائد شاہ شجاع سے اپنی ملاقات کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ

"چاؤش باشی کو پہلے تو ہمارے نام یاد کرنے ہی میں بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ اس کے لئے ہمارے ناموں کا تلفظ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ پھر اس نے ہمیں دربار داری کے طریقے سکھائے پھر ایک شاندار دروازے اور ڈیوڑھی سے گزر کر ہم دربار ہال میں داخل ہوئے جہاں بادشاہ ایک اونچے چبوترے پر واقع تخت پر جلوہ افروز تھا۔

دربار کے در و دیوار منقش تھے ۔ ہر چیز سے رعب و جلال ٹپکتا تھا۔ جگہ جگہ شاہی محافظ اور افسر اپنی زرق برق وردیوں میں ملبوس باادب کھڑے تھے ۔ ان سب کے پاس سے گزر کرتے ہوئے وفد آگے بڑھا جہاں بادشاہ سونے کے تخت پر بیٹھا تھا ۔ بادشاہ کے چہرے سے عظمت و جلال آشکار تھی ۔ وہ بے حد وجیہہ و شکیل اور پُر وقار شخصیت کا مالک تھا ۔ اس کے تاجِ شاہی میں ہیرے جواہرات جگمگ جگمگ کر رہے تھے ، انہی میں "کوہِ نور" ہیرا بھی تھا جسے دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا سمجھا جاتا ہے بادشاہ نے سبز رنگ کی قبا زیب تن کر رکھی تھی جس پر سنہری کام ہوا تھا ۔ سارے فرش پر بیش قیمت قالین بچھے تھے جن کے کناروں پر ریشمی کپڑے کا حاشیہ تھا ۔ جہاں بڑے بڑے خان خوانین اور عہدہ دار کھڑے تھے ، بادشاہ کو دیکھتے ہی الفنسٹن اور اس کے ساتھی زمین بوس ہو کر آداب بجالائے ۔ چاؤش باشی نے ان کے نام لے کر تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ وفد یورپ سے شاہ شجاع کی خدمت میں باریاب ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے ۔ بادشاہ نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے ارکانِ وفد کو خوش آمدید کہا جس پر ارکانِ وفد نے ہاتھ اٹھا کر بادشاہ کی صحت و سلامتی کی دعا کی ۔

یہ برطانوی وفد ۲۵ فروری سے ۱۴ جون تک شاہ شجاع کا مہمان رہا ۔ فریقین میں اس دوران مذاکرات جاری رہے ۔ ابھی یہ وفد پشاور ہی میں تھا کہ شاہ محمود نے ، جو کابل پر قابض ہو چکا تھا ۔ پشاور پر حملہ کر کے شاہ شجاع سے اقتدار چھین لیا ۔ ۱۵ جون کو برطانوی وفد پشاور سے راولپنڈی روانہ ہوا ۔ ابھی یہ لوگ حسن ابدال ہی میں تھے کہ انہیں شاہ شجاع کی شکست اور شاہ محمود کی دوبارہ تخت نشینی کی خبر ملی ۔ راولپنڈی پہنچنے پر الفنسٹن اور اس کے ساتھیوں نے شاہ زمان سے بھی ملاقات کی جو شاہ شجاع کا حقیقی بھائی اور سابق شاہ افغانستان تھا ۔ لیکن بعد میں شاہ محمود نے اس کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور مجبوراً شاہ زمان انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا تھا ۔ برطانوی وفد شاہ زمان کی شخصیت سے بھی بے حد متاثر ہوا ۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں تاہم اس کا چہرہ روشن ، پُر وقار اور بے حد دلکش تھا ۔ اس کی بات چیت سے رعب اور تمکنت ٹپکتی تھی اور اس کے بشرے سے ذہانت آشکار تھی ۔

الفنسٹن نے اپنی کتاب میں پشاور کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے ، فروری کے آخر میں جب وہ وارد پشاور ہوا تو نواحی پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں جبکہ وادیٔ پشاور میں ہر طرف

سبزہ ہی سبزہ تھا۔ شہر کے اردگرد باغوں اور سبزہ گاہوں کی اتنی بہتات تھی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی انسان کی طبیعت اکتانے نہ پاتی تھی۔ پھل پھول کثرت سے تھے۔ باڑہ، شیخ کا کٹھہ، جوئے زرداد اور دریائے کابل کی نہریں اراضی کو سیراب کرتی تھیں۔ دیہات صاف ستھرے اور زرخیز تھے ہر طرف خوشحالی اور شادابی تھی۔ شہر کے شمال میں کھجوروں کے جھنڈ تھے اور باغوں میں سرو صنوبر اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ آب و ہوا اتنی عمدہ تھی کہ الفنسٹن کا دل چاہتا تھا کہ ساری عمر یہیں گزار دے۔

شہر کے لوگ خوش پوش، خوش خوراک اور خوش ذوق تھے۔ ان کے مکان تین تین چار چار منزلہ تھے جن میں لکڑی کا استعمال بہت زیادہ تھا، گلیاں تنگ تھیں اور بارش کے دنوں میں کیچڑ بہت ہوتا تھا۔ شہر کے اندر باڑہ کی نہریں بہتی تھیں جن کے کنارے شہتوت اور بید کے درخت لگے ہوئے تھے۔ لوگ گرمیوں میں ان درختوں کی چھاؤں میں بیٹھتے، خوش گپیاں ہوتیں اور چائے اور قہوہ کا دور چلتا تھا۔

شہر کے بازار سامانِ تجارت سے بھرے ہوئے تھے۔ جہاں صوبہ سرحد اور افغانستان کے ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے مخصوص لباس میں چلتے پھرتے تو رنگا رنگی کا ایک عجیب منظر دیکھنے میں آتا۔

دکانوں پر خشک پھل، دیسی جڑی بوٹیاں، کھانے پینے کی چیزیں، جوتے اور پیزار، کلاہ اور لنگی کپڑا، تانبے اور پیتل کے برتن، پوستین، قالین اور کتابیں قرینے سے سجی ہوئی ملتیں۔ میوہ جات کی دکانیں خصوصاً بہت عمدگی سے سجائی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے بازاروں میں وسیع سرائیں تھیں جن میں ہر طرف سے اونٹوں اور گھوڑوں پر سامانِ تجارت لے کر قافلے آتے اور فروکش ہوتے، شام کو لوگ اپنے اپنے کام سے فارغ ہو کر عمدہ لباس پہنے بازار کی سیر کو نکلتے اور قہوہ خانوں میں چائے کی پیالی سے دل بہلاتے تو شہر ایک الف لیلائی منظر پیش کرتا۔

الفنسٹن کو پشاور اتنا پسند تھا کہ جاتے ہوئے بھی اسے مڑ مڑ کر دیکھتا —— تو شہرہ پہنچا تو دریائے کابل کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں فروکش ہوا اور دل کھول کر نظارے سے جی بہلاتا رہا۔ ایک ہفتہ بعد حسن ابدال پہنچا تو وہاں کے چشموں، باغوں اور سبزہ و گل نے اس کا دامنِ دل کھینچا۔ چنانچہ ایک ہفتہ تک وہ اس پُر فضا مقام میں قیام پذیر رہا۔

سیاسی لحاظ سے الفنسٹن کے وفد کو کوئی نمایاں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ اس نے انگریزوں کی جانب سے شاہ شجاع سے جو عہد و پیمان کئے تھے یا جو مراعات حاصل کی تھیں اُن پر عمل درآمد کی نوبت ہی نہ آئی۔

ایک طرف انگریز اپنے سیاسی استحکام اور اقتدار کی خاطر پیش بینی سے کام لے رہے تھے اور روس اور نپولین کی پیش قدمی کو روکنے میں کوشاں تھے دوسری طرف افغانستان میں عجیب افراتفری اور نااتفاقی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ بادشاہ کے خلاف، سردار سردار کے خلاف اور بھائی بھائی کے خلاف مصروفِ سازش تھا۔ ابھی شاہ شجاع سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس پر نئی افتاد آن پڑی۔ فتح خان بارک زئی نے پھر سے شاہ محمود سے دوستانہ تعلقات بڑھالئے اور کافی فوج جمع کر کے پہلے قندہار پھر پشاور اور پھر کابل پر قبضہ کر لیا۔

شاہ محمود دوبارہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس نے صرف افغانستان کی حکومت پر قناعت نہ کی بلکہ پشاور کی جانب بھی فوج کشی کر دی۔ انگریز قاصد الفنسٹن ابھی پشاور ہی میں تھا کہ شاہ شجاع کو شاہ محمود کے مقابلے میں لڑائی کے لئے نکلنا پڑا۔ اس عرصے میں اکرم خان بھی کشمیر سے اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ تھکے ہارے آفریدی اور غلزئی جنگجو بھی تھے جو کئی ماہ تک کشمیر میں مصروفِ جنگ رہے تھے۔ اس وقت شاہ شجاع کا خزانہ خالی تھا۔ نئی فوج کیسے بھرتی کرتا۔ بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ اکرم خان کافی مال و دولت لے کر آیا تھا تاہم طبعاً بخیل ہونے کی وجہ سے مال خرچ کرنے پر تیار نہ تھا۔ جون ۱۸۰۹ء میں شاہ شجاع اپنے بھائی کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے پشاور سے نکلا۔ ادھر سے فتح خان اور شاہ محمود بھی پوری تیاری سے مقابلے کو آئے۔ گندمک کے پاس نملہ کے مقام پر دونوں بھائیوں کی فوجوں کا سامنا ہوا۔ شاہ شجاع کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ پیچھے ہٹا لیکن اکرم خان نے پیچھے مڑ کر دوبارہ فتح خان کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے مار بھگاتا لیکن ایک مرحلہ پر دشمنوں میں گھر گیا اور بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ شاہ شجاع شکست کھانے کے بعد افغانستان کے جنوبی حصے کی طرف بھاگ گیا۔ کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد اس نے قندہار فتح کر لیا لیکن یہ فتح محض عارضی ثابت ہوئی، ایک بار پھر شاہ شجاع دشت نوردی کرتے ہوئے راولپنڈی پہنچا اور سکھ راجہ رنجیت سنگھ سے امداد کا طالب

ہوا۔ رنجیت سنگھ ان دنوں خوشاب میں مقیم تھا۔ چنانچہ ۱۳ فروری ۱۸۱۰ء کو دونوں حکمرانوں میں ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ نے شاہ شجاع کا شاہانہ خیر مقدم کیا۔ اور بڑی ڈھارس بندھائی۔ فریقین میں مذاکرات ہوئے تاہم مہاراجہ نے شاہ شجاع کو امداد دینے کی کوئی واضح یقین دہانی نہ کرائی، مایوس ہو کر شاہ شجاع کوئی دوسرا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو گیا۔ کشمیر اور ہزارہ میں ان دنوں عطا محمد خان کی حکومت تھی جو شاہ شجاع کے ایک سابق وزیرِ اعظم کا بیٹا تھا۔ چنانچہ ان پرانے تعلقات کے بھروسہ پر اس نے عطا محمد خان سے امداد مانگی۔ عطا محمد خان نے جواب دیا کہ "آپ کے پاس جو ہیرے جواہرات ہیں وہ بطور رہن میرے پاس رکھ دیں تو میں آپ کو تیس لاکھ روپے بھیج دوں گا۔" کہا جاتا ہے کہ مجبوراً شاہ شجاع نے اپنے ہیرے اور جواہرات عطا محمد خان کے حوالے کر دیئے، اس پر بھی عطا محمد خان نے پندرہ لاکھ روپے دیئے اور باقی رقم بعد میں بھجوانے کا وعدہ کیا۔

شاہ شجاع نے رقم ملتے ہی پھر پشاور کو واپس لینے کی تیاریاں شروع کر دیں، دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعے پار کر کے شاہ شجاع آگے بڑھا اور زبردست حملہ کر کے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر شاہ محمود نے اپنے وزیر فتح خان کے بھائی عظیم خان بارک زئی کو فوج دے کر بھیجا۔ ستمبر ۱۸۱۰ء میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا ـــــ شاہ شجاع ناکام رہا اور بھاگ کر اٹک کے قلعہ میں پناہ لی جہاں اس کے دوست عطا محمد خان کا بھائی جہاں داد خان حاکم تھا۔

دسمبر ۱۸۱۱ء میں شاہ شجاع نے پشاور کو فتح کرنے کی آخری کوشش کی۔ اس میں بھی اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ اکوڑہ خٹک کے قریب معرکہ کارزار گرم ہوا۔ شاہ شجاع جان بچا کر بھاگا اور اٹک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت تک اٹک کے قلعہ دار جہاں داد خان اور شاہ شجاع میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ دوسرے جہاں داد کی نظر "کوہِ نور" ہیرے پر تھی، چنانچہ شاہ شجاع پر بڑی سختی شروع کر دی، کبھی اسے آنکھوں میں سلائی پھروا دینے کی دھمکی دی، کبھی دریا میں پھینک دینے کا حکم دیا لیکن شاہ شجاع "کوہِ نور" دینے سے مسلسل انکار کرتا رہا۔ ان دنوں عطا محمد خان بھی اپنے بھائی جہانداد خان سے ملنے اٹک آیا ہوا تھا۔ وہ شاہ شجاع کو آہنی پنجرے میں قید کر کے اپنے ساتھ کشمیر لے گیا۔

اِدھر شاہ شجاع کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا۔ اُدھر اس کا بڑا بھائی، سابق شاہِ افغانستان شاہ زمان

(جسے شاہ محمود نے آنکھوں میں سلائی پھیر کر بصارت سے محروم کر دیا تھا) راولپنڈی میں پنجاب کے سکھ فرمانروا رنجیت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ مہاراجہ نے اس سے فیاضانہ سلوک کیا۔ شاہ زمان کے دو پرانے درباری دیوان بھوانی داس اور دیوان دیوی داس اُن دنوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ مہاراجہ نے ان دونوں کو شاہ زمان کی مہمان داری کے انتظامات پر مقرر کر دیا۔ معزول شاہ افغانستان شاہ زمان کے لئے سکھ دربار کی طرف سے ماہانہ الاؤنس مقرر کر دیا۔ ۱۸۱۱ء کے آخر میں شاہ زمان راولپنڈی سے سکھ دارالحکومت لاہور چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی رہائش کے لئے عمدہ انتظام کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ شجاع کے بیوی بچے بھی لاہور پہنچ گئے اور سب مل جل کر گزر بسر کرنے لگے۔

کابل میں شاہ محمود کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد بارک زئی خاندان کو بڑا عروج ہوا۔ شاہ محمود تو برائے نام حکمران تھا، اصل طاقت سب کی سب وزیر فتح خان کے ہاتھ میں تھی۔ فتح خان نے اپنے بھائیوں کو مختلف صوبوں کا گورنر بنا دیا۔ فتح خان ہر قیمت پر پشاور اور کشمیر کے درانی مقبوضات پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتا تھا تاہم افغان سرداروں کی خانہ جنگیوں کے باعث ملک سے باہر نکل کر خود فوجی مہمات میں حصہ نہ لے سکتا تھا، وہ سیاسی جوڑ توڑ کا بھی ماہر تھا اور اندازہ لگا چکا تھا کہ سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ابھرتی ہوئی طاقت سے تعاون ناگزیر ہے۔ اس لئے اس نے گوڑھ مل نامی مدبر کو اپنا قاصد بنا کر رنجیت سنگھ کے دربار میں بھیجا۔ افغانستان کے حکمرانوں کا یہ قاصد دسمبر ۱۸۱۱ء کو لاہور پہنچا اور بیش بہا تحفے سکھ مہاراجہ کے حضور پیش کئے۔ اس قاصد نے اپنی آمد کا مقصد یہ بتایا کہ افغان حکمران کی دلی خواہش ہے کہ مہاراجہ کے تعاون سے کشمیر کو زیر نگین کیا جائے۔ مہاراجہ نے تجویز پسند کی لیکن اپنی کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے اس پر فوری عمل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

"تاریخ پنجاب" کے مؤلف اقبال صلاح الدین کے مطابق مہاراجہ خود بھی چاہتا تھا کہ کشمیر فتح کرے تاہم درانی تلوار سے ڈرتا تھا۔ اب اُسے ایک بہادر فوج کی اعانت حاصل ہو رہی تھی تو اس نے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ جانتا تھا کہ درانی سردار ذاتی انتقام لینے کی وجہ سے فوجی کارروائیوں میں پیش پیش ہوں گے۔ اس لئے زیادہ نقصان انہی کا ہوگا۔ پہلی بار کشمیر پر فوج کشی

سے سکھ لشکر ضروری معلومات حاصل کر سکے گا تو بعد میں مہاراجہ کے لئے تن تنہا کشمیر پر قبضہ کرنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ تمام عواقب کو سوچنے کے بعد رنجیت سنگھ نے کشمیر کی مہم کے لئے راجکمار کھڑک سنگھ کی قیادت میں ایک فوج تیار کی۔ بھائی رام سنگھ اس فوج کا سپہ سالار تھا۔ چونکہ ان دنوں ہزارہ یا بارہ مولہ کے راستے فوج کشی مشکل تھی اس لئے بھمبر اور اکھنور کی جانب سے کشمیر پر یلغار کا فیصلہ ہوا۔ سکھ لشکر نے حملہ کیا تو بھمبر کے مسلمان حاکم سلطان خان اور راجوڑی کے حاکم اکبر خان نے بڑی بے جگری سے اس کا مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کے قدم روک دیئے۔ جس پر سکھ راجہ نے دیوان محکم چند کو کمک دے کر بھیجا۔ دیوان نے جاکر ان دونوں مسلمان ریاستوں کو سکھ سلطنت میں شامل کر لیا۔

سکھ دربار اور شاہ کابل میں نامہ و پیام جاری تھا۔ فتح خان وزیر نے سکھ راجہ سے یہ معاہدہ طے کر لیا تھا کہ اگر وہ کشمیر اور پشاور پر قبضہ کرنے میں مدد دیں تو کابلی حکمران سکھوں کو آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ معاہدے کے مطابق وزیر فتح خان اپنے لاؤ لشکر سمیت نومبر ۱۸۱۲ء میں کابل سے روانہ ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کشمیر پر حملے کی نگرانی خود کر رہا تھا۔ اور اُن دنوں دریائے جہلم کے مغرب میں رہتاس کے قلعہ میں مقیم تھا۔ فتح خان نے وہیں اس سے ملاقات کی اور حملے کی تفصیلات طے کی گئیں، چونکہ برف باری کی وجہ سے مظفر آباد کا راستہ ناقابلِ عبور تھا۔ اس لئے بھمبر ہی کے راستے پیش قدمی کا فیصلہ ہوا۔ سکھوں نے بارہ ہزار منتخب فوجوں کا لشکر اس مہم کے لئے بھیجا۔ دیوان محکم چند اس دستے کا کمانڈر تھا۔ افغان اور سکھ فوج نے یکم دسمبر ۱۸۱۲ء کو جہلم سے کوچ کیا۔ دونوں فوجیں نہایت سرعت کے ساتھ پیش قدمی کرتی رہیں۔ تاہم افغانی فوج جو پہاڑی سفر کی عادی تھی۔ سکھ فوج سے کافی آگے نکل گئی۔ دیوان محکم چند کو حکم مل چکا تھا۔ کہ جیسے بھی ہو وہ اپنی فوج کو لے کر وادیٔ کشمیر میں افغانی فوج سے پہلے داخل ہو ـــــ اس حکم میں ایک مصلحت کارفرما تھی اور وہ یہ کہ جب لاہور میں شاہ شجاع کی ملکہ وفا بیگم کو کشمیر پر شاہ محمود کے حملے کی اطلاع ملی تو وہ بہت گھبرائی۔ شاہ شجاع ان دنوں کشمیر میں قید تھا، وہ جانتی تھی کہ اگر شاہ شجاع افغان فوج کے ہاتھوں میں چلا گیا تو اس کی جان نہیں بچ سکے گی۔ ملکہ اور اس کے اہل و عیال شاہ محمود کی سفاکی سے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ

اس سے پہلے شاہ زمان کی آنکھیں نکلوا چکا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ملکہ وفا بیگم بیحد ذہین اور معاملہ فہم خاتون تھی، اُسے رنجیت سنگھ کی ہوسِ زر کا بھی علم تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ شاہ شجاع کو کشمیر سے رہائی دلا دے تو وہ کوہِ نور ہیرا مہاراجہ کے حوالے کر دے گی۔ ملکہ کی یہ چال بڑی کامیاب رہی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے سپہ سالار کو حکم بھیجا کہ جیسے بھی ہو پوری سرعت سے کشمیر پہنچے اور شاہ شجاع کو دربارِ لاہور میں بھجوا دے۔ دیوان محکم چند کے لئے راجہ کی اطاعت کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اگر وہ پیچھے رہ جاتا تو شاہ شجاع فتح خان کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ لہٰذا، اس نے مقامی راجوں کو جاگیروں اور انعام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور ان سے کہا کہ وہ کشمیر پہنچنے کا کوئی قریبی راستہ بتا دیں تاکہ وہ افغان فوج سے پہلے وہاں پہنچ سکے۔ چنانچہ ان لوگوں کی رہبری کی بدولت سکھ لشکر افغانی فوج سے پہلے کشمیر جا پہنچا۔

کشمیر کے حاکم عطا محمد خان کو اس حملے کی اطلاع ملی تو اس نے دفاع کی ہر امکانی کوشش کی۔ پہاڑی راستوں اور دروں کو تہہ و بالا کر بند کرا دیا اور خود شیر گڑھ کے قلعے میں محصور ہو کر مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن سکھ اور افغانی فوج نے تمام رکاوٹوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کشمیری فوج نے اپنی بساط کے مطابق پوری مزاحمت کی لیکن بالآخر قلعہ فتح ہو گیا۔ دیوان محکم چند نے قلعے میں داخل ہوتے ہی جو پہلا کام کیا۔ وہ شاہ شجاع کی تلاش تھی، وہ قید خانے کے ایک حصے میں زنجیروں میں جکڑا ہوا مل گیا۔ سکھ کمانڈر نے فوراً اُسے آزاد کر کے اپنے کیمپ میں بھیج دیا اور اس پر کڑا پہرہ بٹھا دیا۔

افغان سرداروں نے ہر چند شاہ شجاع کو تلاش کیا وہ مل نہ سکا۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ شاہ شجاع تو دیوانِ محکم چند کی تحویل میں ہے، اس پر افغان وزیر اعظم فتح خان نے سختی سے مطالبہ کیا کہ ہر قیمت پر شاہ شجاع اس کے حوالے کیا جائے لیکن سکھ سپہ سالار دیوانِ محکم چند نے اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور دیوانِ محکم چند اپنی فوج، لوٹ مار کا مال اور شاہ شجاع کو لے کر واپس چل پڑا۔ وزیر آباد پہنچ کر اس نے خط کے ذریعے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تمام امور سے خبردار کیا۔ رنجیت سنگھ خط ملنے پر بہت خوش ہوا۔ لاہور پہنچنے پر اس نے شاہ شجاع کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور افغان حکمران کو اکبری دروازے کے اندر "مبارک حویلی" میں ٹھہرایا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مہاراجہ نے "کوہِ نور" کے لئے تقاضا کیا۔ لیکن شاہ شجاع ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس پر مہاراجہ نے اپنے وزیروں فقیر عزیز الدین اور بھائی رام سنگھ کے ذریعے "کوہ نور" کا سختی سے مطالبہ کیا جس کے جواب میں ملکہ وفا بیگم نے مہاراجہ کو کہلا بھیجا کہ "کوہِ نور اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے، وہ چھ کروڑ روپیہ کے عوض قندہار کے ایک تاجر کے پاس رہن رکھا ہوا ہے۔ یہ رقم شاہ شجاع اپنے تاج و تخت کی بازیابی کے لئے خرچ کر چکا ہے"۔ اس جواب سے مہاراجہ کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے افغان شاہی خاندان کی قیام گاہ پر پہرہ بٹھا دیا۔ نہ کوئی حویلی میں داخل ہو سکتا تھا نہ باہر آ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے افراد کئی دن تک فاقے سے رہے۔ اس کے علاوہ بھی سکھ راجہ نے شاہ شجاع کے خاندان کو بڑی ذہنی اذیتیں دیں۔ مجبوراً شاہ شجاع نے وعدہ کیا کہ وہ پچاس دن کے اندر اندر "کوہِ نور" مہاراجہ کو منگوا دے گا۔ یہ مدت ختم ہوتے ہی مہاراجہ خود شاہ شجاع کی قیام گاہ پر جا پہنچا، شاہ شجاع نے اس کا استقبال کیا اور بادلِ ناخواستہ "کوہِ نور" سکھ حکمران کے حوالے کر دیا۔

شاہ شجاع مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فطرت کو سمجھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سکھ حکمران اسے اپنی اغراض کے لئے استعمال کرے گا۔ اس لئے اس نے خیر اسی میں سمجھی کہ لاہور سے چلا جائے۔ نومبر ۱۸۱۴ء میں شاہ شجاع کے اہل و عیال چند ہندو ساہوکاروں کی مدد سے بھیس بدل کر لاہور سے نکلے اور دریائے ستلج عبور کرنے کے بعد انگریزوں کے پاس لدھیانہ میں پناہ گزین ہو گئے ـــــ اس واقع کے بعد رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع کی زیادہ سختی سے نگرانی شروع کر دی۔ لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح شاہ شجاع وہاں سے نکل بھاگا اور گرتا پڑتا لدھیانہ میں اپنے عزیز و اقارب سے جا ملا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے فتح خان وزیر اعظم افغانستان کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو اعلیٰ عہدے دے رکھے تھے۔ بلوچستان کا گورنر رحمدل خان تھا۔ جس کا دارالحکومت شکارپور تھا۔ پوردل خان قندہار کا حاکم تھا اور شیر دل خان غزنی کا۔ کہن دل خان بامیان کا حاکم تھا تو سلطان محمد خان پشاور کا۔ محمد عظیم خان۔ جبار خان اور نواب اسد اللہ خان کو فتح خان ہمیشہ اپنے ہمراہ رکھتا تھا جب کہ دوست محمد خان جو سب بھائیوں سے کم عمر تھا۔ مختلف مقامات پر

فوجی خدمات انجام دیتا تھا۔ اب کشمیر فتح ہوا تو فتح خان نے محمد عظیم خان کو جو باقی کے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ عطا محمد خان کی جگہ وہاں کا گورنر بنا دیا۔ فتح خان بڑا مدبر انسان تھا اس نے معزول گورنر عطا محمد خان اور اس کے اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا۔ تاہم اٹک کا حاکم جہانداد خان جو عطا محمد خان کا بھائی تھا۔ دل ہی دل میں ڈرنے لگا کہ اب اس کی باری آنے والی ہے ـــــ شاہ محمود کے انتقام سے بچنے کے لئے اس نے راجہ رنجیت سنگھ سے رسم و راہ بڑھانی شروع کی۔ سکھ حکمران تو یہی کچھ چاہتا تھا اس نے جہاں داد خان کی پیش کش کا خیر مقدم کیا اور دوستانہ مذاکرات کے لئے ایک وفد اس کے پاس اٹک بھیجا۔ فقیر عزیز الدین اس وفد کا قائد تھا۔ وہ بے حد ہوشیار اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس نے جہانداد کو اس امر پہ راضی کر لیا کہ وہ اٹک کا سرکاری قلعہ سکھوں کے حوالے کر دے جس کے معاوضے میں سکھ دربار کی طرف سے اُسے وزیر آباد میں جاگیر دے دی جائے گی اور وہ افغان بادشاہ کی دسترس سے باہر ہو جائے گا۔

یہ گفتگو بڑی رازداری سے ہوئی تھی اور خود قلعہ اٹک کے افغان سپاہی بھی اس سے بے خبر تھے۔ چنانچہ ایک دن اچانک سکھ فوج کا ایک دستہ سردار دیا سنگھ کی کمان میں اٹک پہنچ گیا۔ اس پہ افغان فوج بڑی سٹپٹائی۔ بدامنی اور سیاسی ابتری کی وجہ سے افغان سپاہیوں کو کئی مہینوں سے تنخواہ بھی نہ ملی تھی۔ انہوں نے تنخواہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ سکھ نمائندے نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر فوراً تمام افغان سپاہیوں کو بقایا تنخواہ ادا کر دی۔ تنخواہ ملتے ہی افغان سپاہی قلعہ خالی کر گئے اور سکھ فوج نے مارچ ۱۸۱۳ء میں قلعے پہ قبضہ کر لیا۔

حکومتِ افغانستان اتنی بے خبر تھی کہ اُسے اس واقع کی اس وقت اطلاع ہوئی جب اٹک کے قلعے پہ سکھوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے معاہدہ کابلی حکمرانوں کو ہر اعتبار سے مہنگا پڑا۔ ایک تو شاہ شجاع سکھوں کا قیدی بن گیا اور سکھ حکمرانوں نے اُس کے اور اُس کے اہل و عیال کے ساتھ انتہائی گرا ہوا سلوک کیا جس سے شاہ محمود کی خاندانی رگِ حمیت پھڑکی۔ دوسرے اٹک کا قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لے دے کے کشمیر افغانی قبضے میں رہ گیا۔ جس پہ وزیر فتح خان نے اپنے بھائی محمد عظیم خان کو گورنر بنا دیا۔ قلعۂ اٹک کے انخلاء پہ وزیر فتح خان نے جہاں اپنے بھائی محمد عظیم خان پہ خفگی کا اظہار

کیا وہیں ایک قاصد بھیج کر مہاراجہ رنجیت سنگھ سے مطالبہ کیا کہ وہ اٹک کا قلعہ اور نواحی علاقہ فوراً افغانوں کو واپس کر دے۔ بارک زئی رہنما نے رنجیت سنگھ کو یہ یقین بھی دلایا کہ اس صورت میں اُسے کشمیر کی فتح میں برابر کا شریک سمجھا جائے گا۔ اور دریار کابل موعودہ خراج بھی ادا کرتا رہے گا۔ تاہم مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کابلی سرداروں کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا جس پر دونوں طرف سے جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سکھ حکمران نے قلعۂ اٹک میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لئے پہلے تو حکیم عزیزالدین اور دیوان دیوی داس کو فوج دے کر بھیجا بعد میں دیوان محکم چند کو سپہ سالار بنا کر کمک کے ساتھ اٹک روانہ کیا۔ ادھر وزیر فتح خان بارک زئی ایک بہت بڑا لشکر جمع کر کے اٹک پر حملے کے لئے پہنچ گیا۔ اس مہم میں اس کا چھوٹا بھائی دوست محمد خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔

سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ لاہور سے آنے والا سکھ لشکر کافی دنوں تک بُرہان کے پاس ہر فندی کے کنارے خیمہ زن رہا۔ اس عرصے میں افغان لشکر نے اٹک پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ افغان دباؤ کی وجہ سے سکھ لشکر کا ناطقہ بند ہو گیا تو انہوں نے ایک فوجی چال چلی۔ انہوں نے افغان سرداروں کو یقین دلایا کہ وہ قلعہ خالی کر کے چھچھ کی طرف چلے جائیں گے اور مقابلے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ افغان دھوکہ میں آ گئے۔ بظاہر سکھ فوجیوں کا قلعے سے انخلاء شروع ہو گیا۔ لیکن اصل میں سکھوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ کھلے میدان میں لڑائی کریں۔ جہاں افغان فوج کو شکست دینا نسبتاً آسان تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ تین ماہ تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے۔ کوئی بھی آگے بڑھنے اور پہل کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا، افغان فوج کے دستے سردار دوست محمد خان کی کمان میں تھے وہ اس انتظار میں تھا کہ کابل سے فتح خان وزیر مزید فوج لے کر پہنچے تو دونوں ایک ساتھ حملہ کریں۔ تاہم ۱۲ جولائی ۱۸۱۳ء کو سکھ فوج کا ایک دستہ افغان کیمپ کے نواح میں گشت کر کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا تو دوست محمد خان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ نوجوانی اور ناتجربہ کاری کی بناء پر اس نے لڑائی چھیڑ دی، دیوان محکم چند جانتا تھا کہ افغان فوج اس وقت کم طاقت ہے لہٰذا، اس نے اپنا پورا دباؤ ڈالا۔ افغان فوج کو نسبتاً زیادہ نقصان پہنچا اور اس کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ شام تک معرکۂ کارزار جاری رہا۔ اندھیرا ہو جانے پر لڑائی کو دوسرے دن

پر پلٹنوی کر دیا گیا۔

۱۳ جولائی کو جنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ دیوان محکم چند نے اپنی فوج کو بہتر طور پر صف آراء کیا۔ دوست محمد خان اپنے جانبازوں کے ساتھ چٹان کی طرح ڈٹا رہا۔ تاہم سکھوں نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ افغان فوج نے اسے اپنی کامیابی پر محمول کرتے ہوئے سکھوں کا تعاقب جاری رکھا، جب افغان فوج اس کھلے میدان میں پہنچی جہاں دیوان محکم چند نے اپنی توپیں نصب کر رکھی تھی۔ تو سکھوں نے بے دریغ گولہ باری شروع کر دی۔ دھوپ اور پیاس سے تنگ آئے ہوئے مسلمان سپاہی بڑی بے جگری سے لڑے لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی، اس وقت تک فتح خان اپنی فوج کے ساتھ اٹک پہنچ چکا تھا لیکن اسے خبر ملی کہ دوست محمد خان کا دستہ شکست کھا چکا ہے تو وہ وہیں رُک گیا۔ دوست محمد خان نے اس موقع پر عقلمندی کی اور اپنی فوج کے بچے کھچے سپاہیوں کو میدان سے نکال کر لے گیا۔ بعد میں اس نے تربیلا اور غازی کے مقابل کشتیوں کے ذریعہ اپنے مجاہدوں کو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پہنچا دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید اس کا کوئی سپاہی بھی زندہ نہ بچتا۔

سکھوں اور افغانوں کے درمیان یہ پہلا تصادم تھا، تاریخ میں اسے "جنگِ حضرو" کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ جنگ ضلع اٹک کے قصبے حضرو کے نواح اور موجودہ مانسر کیمپ کے پاس لڑی گئی۔ سکھوں کو بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا جس میں سات ہلکی توپیں بھی تھیں۔ اس جنگ میں کامیابی سے جہاں سکھوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہیں افغان سپاہیوں پر اُن کا رُعب طاری ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارک زئی سردار نہ صرف اٹک سے مشرق کا سارا علاقہ گنوا بیٹھے بلکہ رفتہ رفتہ کشمیر اور صوبہ سرحد بھی اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اصل میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج بیحد منظم تھی۔ اس نے فرانسیسی اور انگریز جرنیلوں سے حربی تربیت پائی تھی اور وہ جدید جنگی تکنیک میں مہارت رکھتی تھی، اس کے برعکس افغان فوج محض جوشیلے اور قسمت آزما جوانوں پر مشتمل تھی۔

اس فتح کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اٹک کے قلعے کی اہمیت کے پیشِ نظر وہاں اپنی فوجی طاقت بڑھانے پر پوری توجہ دی، اپنے نامور فوجی افسروں گورمکھ سنگھ، سردھا سنگھ، دیوان سنگھ اور سربلند خان کو وہاں تعین کیا اور سپاہیوں کی نفری بھی بڑھا دی۔

"جنگ حضرو" میں کابلی فوجوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور کافی علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تاہم وزیر فتح خان ایک صاحب تدبیر انسان تھا۔ حوصلہ ہارنے کی بجائے اس نے کشمیر میں اپنی طاقت کو مستحکم بنانے پر توجہ دی اور اپنے بھائی محمد عظیم خان حاکم کشمیر کو کمک پہنچا دی۔ رنجیت سنگھ بھی حالات پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ محمد عظیم خان کے کشمیر میں قدم جمانے سے پہلے ہی اس علاقے کو ہتھیا لے۔ چنانچہ وہ پوری تیاری کر کے کشمیر پر حملے کی غرض سے اکتوبر ۱۸۱۳ء میں سیالکوٹ پہنچ گیا۔ ابھی وہ سیالکوٹ ہی میں تھا کہ اسے خبر ملی کہ وزیر فتح خان اپنے لشکر سمیت کابل سے روانہ ہو کر اٹک کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ لہٰذا سکھ مہاراجہ وہیں رُکا رہا۔ تاہم درانی لشکر صرف ڈیرہ جات اور پشاور تک ہی پہنچ پایا اور دریائے سندھ کو پار نہ کر سکا۔ اس اثناء میں شدید برف باری کی وجہ سے کشمیر کو جانے والے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۱۳ء کے آخر میں مہاراجہ کشمیر پر حملہ ملتوی کر کے واپس لاہور پہنچ گیا۔

کچھ عرصہ لاہور میں قیام کرنے کے بعد جونہی موسم خوشگوار ہوا رنجیت سنگھ نے پھر سے کشمیر پر حملے کی تیاری کر لی۔ اپریل ۱۸۱۴ء میں اس نے حملے کا فیصلہ کیا اور سارے فوجی دستوں کو وزیر آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ ۳ رجون تک سکھ لشکر اور باج گذار راجوں کی سپاہ وزیر آباد پہنچ چکی تھی۔ یہاں سے کوچ کر کے گجرات اور بھمبر کی راہ سے ۱۱ رجون کو یہ لشکر راجوڑی پہنچا۔ اس جگہ تمام انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔ بھاری توپ خانہ وہیں چھوڑ دیا گیا اور صرف ہلکی توپیں اونٹوں پر لاد کر آگے بھیجی گئیں۔ سکھ حکمران نے اپنی فوج کو مصلحتاً دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے پر دیوان رام دیال کو کمانڈر مقرر کیا اور دوسرے دستے کی قیادت خود سنبھالی۔ دیوان رام دیال تیزی سے بڑھا اور پیر پنجال اور آماد پور وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ ۲۴ رجون کو میر پور کے نواح میں مسلمان اور سکھ سپاہیوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں اپنی عددی برتری کی وجہ سے سکھ فوج کامیاب رہی۔ افغان فوج پسپا ہوئی تو سکھ لشکر نے تعاقب جاری رکھا۔ بالآخر شوپیان کے مقام پر محمد عظیم خان اور سکھ فوج میں پھر ایک فیصلہ کن معرکہ ہوا۔ مسلمان فوج محمد شکور خان کی قیادت میں جانفشانی سے لڑی۔ اس خونریز معرکے میں سکھ سردار جیون مل اور جرنیل مٹھہ سنگھ بھرانیہ ہلاک ہو گئے جس پر سکھ فوج دل چھوڑ بیٹھی۔ اُدھر شدید بارشوں اور برف باری نے سکھوں کے اوسان خطا کر دیئے۔ وہ پسپا ہو کر سری نگر کی طرف

بڑھے اور وہاں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی گھری ہوئی فوج کو بچانے کے لئے بھائی رام سنگھ کے تحت کمک بھیجی لیکن وہ کمک بروقت سری نگر نہ پہنچ سکی۔ اس اقدام کو بھائی رام سنگھ کی غفلت اور نااہلی پر محمول قرار دیتے ہوئے سکھ راجہ نے اسے اپنے عہدے سے معزول کر دیا۔

ادھر سکھ فوج کا دوسرا دستہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذاتی کمان میں پونچھ پہنچا تو وہاں کے مسلمان حاکم رُوح اللہ خان نے نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا۔ مہاراجہ نے راستہ بدل کر درہ نوشہ سے آگے بڑھنا چاہا تو مسلمان سپاہیوں نے چھاپہ مار گرمیاں شروع کر دیں۔ مجاہدین پہاڑی چوٹیوں سے نمودار ہوتے اور سکھ فوج پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے پیچھے ہٹ جاتے۔ سکھ فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا ـــــ زچ ہو کر مہاراجہ نے پیش قدمی کا خیال ترک کر دیا اور واپسی کی راہ اختیار کی ـــــ اگست ۱۸۱۴ء تک سکھ فوج کافی نقصان اٹھانے کے بعد لاہور پہنچ چکی تھی۔ مہاراجہ اب کشمیر پر حملے کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔ بالآخر وہ موقع اسے وزیر فتح خان کی وفات کے بعد ۱۸۱۹ء میں ہاتھ آگیا۔

سکھ فوج کو شکست دینے کے بعد کشمیر میں محمد عظیم خان کی پوزیشن مضبوط ہو گئی تھی اور وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے ایک خود مختار حکمران تصور کرنے لگا تھا۔ یہاں تک اس نے وزیر فتح خان کو بیس لاکھ روپیہ کا وہ خراج دینے سے بھی انکار کر دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا تھا۔ اس پر بارک زئی بھائیوں میں آپس ہی میں ٹھن گئی ـــــ ۱۸۱۶ء کے موسم بہار میں وزیر فتح خان اپنے بھائی دوست محمد خان کے ہمراہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر پشاور پہنچا۔ اس نے پشاور کے خوانین سے مالیہ وصول کر کے تجوریاں بھریں۔ پھر اپنے بھائی نواب اسد خان کو فوج دے کر عظیم خان کے خلاف کشمیر پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ کابلی لشکر کے آنے پر محمد عظیم خان پہلے تو مظفر آباد کے قلعے میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن بعد میں اس نے صلح کر لی اور وزیر فتح خان کو تیرہ لاکھ روپیہ بطور خراج دینے کا وعدہ کیا۔ محمد عظیم خان نے دو ہفتہ تک کابلی لشکر کی شاہانہ ضیافت کی جس سے مطمئن ہو کر لشکر واپس روانہ ہو گیا۔

افغان فوج کا ارادہ تھا کہ اٹک کے قلعہ پر بھی حملہ کرے لیکن خالصہ دربار کے زیر ہدایت دیوان رام دیال قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اور اس وقت تک باہر نہ نکلا۔ جب تک افغان لشکر اٹک کو پار کر کے وادیٔ پشاور میں داخل نہ ہو گیا۔

۱۸۱۶ء میں ایک اہم تاریخی واقع تو یہ ہوا کہ سابق افغان بادشاہ شاہ شجاع رنجیت سنگھ کی بدسلوکی سے بیزار ہو کر لدھیانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرنگیوں کے ہاں پناہ کا طالب ہوا اور دوسرے افغانستان کے مردِ آہن فتح خان بارک زئی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

ہوا یہ کہ شاہ محمود والیٔ افغانستان کی طرف سے اس کا حقیقی بھائی حاجی فیروز دین ہرات کا گورنر تھا۔ وہ نرم مزاج اور اعتدال پسند شخص تھا۔ اس لئے سولہ سال تک ہرات کا (قریب قریب خود مختار) حاکم رہا۔ تاہم ۱۸۱۶ء میں ایران کے فتح علی شاہ قاچار نے اپنے بیٹے حسن علی مرزا کو ہرات کی تسخیر کے لئے فوج دے کر بھیجا۔ حاجی فیروز دین نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر اپنے بھائی شاہ کابل شاہ محمود سے امداد طلب کی۔ اس نے فتح خان وزیر کو فوج دے کر بھیجا۔ شاہ محمود اصل میں اسی بہانے ہرات پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اُدھر شاہ محمود کا بیٹا کامران فتح خان اور اس کے بھائیوں کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو برداشت نہیں کرتا تھا اور بدلہ لینے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ ہرات پہنچنے سے پہلے ہی ایک معرکہ میں فتح خان زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے بھائی دوست محمد خان کو حاکمِ ہرات حاجی فیروز دین کا خزانہ لوٹنے کے لئے بھیجا۔ دوست محمد خان نے ضرورت سے زیادہ جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے شاہی خاندان کی خواتین سے زیور تک چھین لئے۔ یہاں تک کہ اس کے ڈر سے کچھ شہزادیاں غسل خانہ میں جا چھپیں تو اس نے انہیں وہاں سے نکال کر تلاشی لی۔ ایک معمر خاتون (جو شاہ کابل کی پھوپھی تھیں) کا ازار بند اس لئے نکال لیا گیا کہ اس کے سرے پر ہیروں اور موتیوں کا گچھا تھا ـــــ شاہی خاندان کی خواتین کی اس بے عزتی سے کامران بگڑ بیٹھا۔ اس نے بہانے سے فتح خان کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ حاضر ہوا تو اس کی مشکیں کس کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی اور اس کے ایک بھائی کو گرفتار کر کے دونوں کو قید خانے میں ڈال دیا۔ اور پھر کچھ مدت بعد وہاں سے غزنی بھیج دیا جہاں ان دنوں شاہ محمود مقیم تھا۔ مؤرخوں کا کہنا ہے کہ فتح خان اتنا غیور اور بہادر تھا کہ اُس نے اس مصیبت میں بھی نہ تو شاہ محمود سے رحم کی درخواست کی، نہ کوئی

گلہ گزاری کی۔

وزیر اعظم فتح خان سے اس غدارانہ سلوک پر سارا افغانستان سدوزئی بادشاہ شاہ محمود کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ـــــ خود وزیر فتح خان کے اٹھارہ بھائی تھے جو اہم اور کلیدی عہدوں پر فائز تھے، وہ سب کے سب انتقام لینے پر اُتر آئے۔ ان بھائیوں کے نام یہ ہیں، فتح خان محمد عظیم خان۔ تیمور خان جو نصرت خیل قبیلے کی عورت کے بطن سے تھے، پور دل خان۔ شیر دل خان، کہن دل خان، رحم دل خان اور میر دل خان جو دوسری ماں سے تھے۔ دوست محمد خان امیر محمد خان اور جبال خان جو ایک ماں کے بیٹے تھے۔ سلطان محمد خان۔ یار محمد خان۔ پیر محمد خان سید محمد خان جو ماں کی طرف سے حقیقی بھائی تھے اور سرداران پشاور کے نام سے مشہور ہوئے اور نواب اسد خان، نواب صمد خان اور نواب جبار خان جو ایک ماں سے تھے اور جمعہ خان جو ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔

فتح محمد خان کے بعد سردار محمد عظیم خان سب بھائیوں سے بڑا تھا، وہ اس وقت کشمیر کا گورنر تھا۔ دوست محمد خان جس نے حاجی فیروز دین کے گھر سے جواہرات لوٹے تھے اور واپس کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ شاہی حکم کے تحت گرفتار کر کے کشمیر میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب وزیر فتح خان کے اندھا ہونے کے واقع کی خبر ملی تو دوست محمد خان کو رہا کر دیا گیا۔ عظیم خان ان دنوں بیمار تھا۔ اس لئے اس نے دوست محمد خان کو فوج اور خزانہ دے کر کابل بھیجا کہ شاہ محمود کے خلاف بغاوت بپا کرے۔ دوست محمد خان کے پہنچتے ہی لوگ شاہ محمود کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جس پر شاہ محمود اپنے پوتے جہانگیر مرزا کو کابل میں چھوڑ کر خود غزنی کے قلعے میں جا پہنچا اور قندھار سے کامران کو بھی وہیں بلا بھیجا تاکہ ساری طاقت جمع کر کے دوست محمد خان کا مقابلہ کرے۔ اس اثنار میں دوست محمد خان نے جہانگیر کی شاہی فوج کو شکست دی۔ جہانگیر خود تو بھاگ کر غزنی چلا گیا لیکن اس کا وزیر عطا محمد خان پکڑا گیا اور دوست محمد خان نے سر بازار اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دادی، اُدھر محمد عظیم خان بھی صحت یاب ہوتے ہی اپنے لشکر سمیت کابل آن دھمکا اور اپنے بھائی کی بے عزتی کا بدلہ لینے پڑ گیا۔

یہ حال دیکھ کر غزنی میں شہزادہ کامران نے فتح خان وزیر کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بھائیوں کو بغاوت سے باز رکھے۔ فتح خان نے نہایت تحمل سے جواب دیا کہ "وہ اندھا ہے، بھائیوں

کو کیسے روک سکتا ہے؟ اس پر کامران مزاطبیش میں آگیا۔ وہ خود اور اس کے ہمراہی فتح خان پر ٹوٹ پڑے اور اُسے تکا بوٹی کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اتنے سنگدلانہ مظالم پر بھی فتح خان کے مُنہ سے آہ تک نہ نکلی۔ یہ واقع ۱۸۱۸ء میں پیش آیا۔

وزیر فتح خان کا قتل افغانستان کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ہر جگہ کے عوام شاہ محمود سے متنفر ہو گئے۔ بالآخر سدوزئی حکمران کابل سے بھاگ کر جان بچانے پر مجبور ہو گیا۔ پہلے قندہار پہنچ کر قسمت آزمائی کی مٹھائی لیکن کامیابی نہ ہوئی تو ہرات چلا گیا۔ جہاں اس کا بیٹا کامران حکومت کرتا تھا، ۱۸۲۹ء میں شاہ محمود کی لاش محل کے غسل خانہ سے ملی۔ خیال ہے کہ اُسے اُس کے بیٹے کامران نے زہر دلوا دیا تھا۔

کابل پہنچ کر عظیم خان اور دوست محمد خان نے پہلے تو ایک سدوزئی شہزادے ایوب خان کو مسندِ حکومت پر بٹھایا لیکن بعد میں رفتہ رفتہ خود ہی حکمران بن بیٹھے اور سدوزئی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

بارک زئی حکمران

۱۸۱۸ء صوبہ سرحد کی تاریخ کا بڑا اہم سال تھا۔ یہ وہ سال تھا جب افغانستان اور صوبہ سرحد میں سدوزئی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور بارک زئی قبیلہ کے سرداروں نے اقتدار سنبھالا ـــــ سدوزئی اور بارک زئی سرداروں کی نااتفاقی اور خانہ جنگی کی وجہ سے ایک ایک کرکے بہت سے علاقے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور ان کا دائرہ اختیار صرف کابل اور قندہار تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ادھر مسلمان حکمرانوں کی باہمی چپقلش اور کمزوری کی وجہ سے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کو موقع مل گیا کہ وہ کشمیر صوبہ سرحد، شمالی پنجاب اور ملتان پر قبضہ کرلے۔ یہی وہ دَور تھا جب تحریکِ مجاہدین کی داغ بیل پڑی جسے ہر طرح برِصغیر کی پہلی اسلامی تحریک کہا جاسکتا ہے ـــــ مختصراً انیسویں صدی عیسوی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں صوبہ سرحد کے موجودہ علاقے تین طاقتوں ـــــ بارک زئی ـــــ مجاہدین اور سکھ راج ـــــ کی باہمی کشمکش کا اکھاڑہ بنے ہوئے تھے۔ اہلِ سرحد کے لئے یہ دَور بڑا ہنگامہ خیز دَور تھا۔

سدوزئی حکمران شاہ محمود اور اس کے بیٹے شہزادہ کامران کے ہاتھوں وزیر فتح خان کا قتل ایک طوفان کا پیش خیمہ بن گیا، وزیر فتح خان کے بیس بھائی تھے جو مختلف علاقوں میں ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ وہ سب کے سب سدوزئی بادشاہت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ملک کے طول و عرض میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ سردار محمد عظیم خان نے کشمیر سے ایک لشکرِ جرّار اپنے چھوٹے بھائی دوست خان کی کمان میں کابل روانہ کیا۔ شاہ محمود کو مقابلے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ بھاگ کر پہلے قندہار اور بالآخر ہرات پہنچ گیا۔ اس کے فرار ہوتے ہی دوست محمد خان نے کابل فتح کر لیا۔ اس طرح سارا اقتدار بارک زئی برادران کے ہاتھ میں آگیا تاہم افغان عوام چونکہ سدوزئی ہی کو

حکمران خاندان سمجھتے تھے اس لئے دوست محمد خان نے تیمور شاہ درانی کے ایک بیٹے ایوب خان کو تخت پر بٹھا کر اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ کابل میں حالات پر قابو پانے کے بعد محمد عظیم خان جو بارک زئی برادران میں سب سے بڑا تھا خود بھی کشمیر سے چل کر کابل پہنچ گیا۔ آتے ہوئے اس نے اپنے بھائی نواب جبار خان کو کشمیر کا قائم مقام گورنر بنا دیا۔ محمد عظیم خان نے کابل کا انتظام سنبھالا تو دوست محمد خان غزنی پر قابض ہو گیا۔ اسی طرح ایک بھائی پوردل خان قندہار کا حکمران تھا تو دوسرا کندل خان (یا کہن دل خان) سندھ یا شکارپور میں ـــــ پشاور میں یار محمد خان کا سکہ چلتا تھا تو نواحی علاقوں میں سلطان محمد خان اور دوسرے بھائیوں کا۔ تاہم افسوسناک بات یہ تھی کہ خود ان بھائیوں میں بھی یک رنگی اور یک دلی مفقود تھی، کوئی کچھ چاہتا تھا کوئی کچھ ـــــ چنانچہ پوردل خان اور کہن دل خان اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ شاہ شجاع ہی بادشاہت کے لئے موزوں ترین شخص ہے۔ وہ شاہ شجاع کو لے کر پشاور پہنچے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ خود محمد عظیم خان بھی اس جرگے میں شمولیت کے لئے کابل سے پشاور آیا۔ شاہ شجاع اور بارک زئی سرداروں کے درمیان تقسیم اختیارات کے بارے میں بات چیت ہوئی لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ بارک زئی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے اور برائے نام شاہ شجاع کو تاجدار بنانا چاہتے تھے۔ جب کہ شاہ شجاع صرف اس صورت میں افغانستان کی بادشاہت سنبھالنے پر رضامند تھا۔ جب سارے اختیار اس کے ہاتھ میں ہوں اور بارک زئی اُسے غیر مشروط طور پر اپنا حکمران تسلیم کریں۔ شاہ شجاع کے برعکس شہزادہ ایوب خان بارک زئی کی ہر بات ماننے کو تیار تھا۔ چنانچہ وقتی طور پر شہزادہ ایوب خان سدوزئی ہی کو کابل کا بادشاہ قرار دیا گیا، بظاہر تو شہزادہ ایوب بارک زئی سرداروں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا لیکن درپردہ وہ اس ٹوہ میں لگا رہا کہ موقع ملتے ہی پھر سے حکومت سدوزئی کے ہاتھ میں آجائے۔

شہزادہ ایوب کے دو بھائی قندہار میں تھے سلطان علی اور مراد علی۔ انہوں نے شہزادہ ایوب خان کی ایماء پر شاہ محمود اور شاہ شجاع کو خفیہ خط لکھے اور انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ اتفاق سے یہ خط بارک زئی برادران کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے سلطان علی اور مراد علی کو تو قتل کرا دیا۔ البتہ ایوب خان کو کچھ کہنے کی بجائے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اس طرح محمد عظیم خان سارے ملک کا مختار کُل بن گیا۔

افغانستان میں آئے دن کی خانہ جنگیوں نے ایک نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی کو جنم دیا ـــــ

مسلمان کمزور ہوئے تو راجہ رنجیت سنگھ کی بن آئی ۔ وہ کھلے بندوں میدان میں نکل آیا اور مسلمان اقتدار کی بچی کھچی نشانیوں کو ختم کر دینے پر تُل گیا ۔ پہلے اس نے جھنگ کے سردار احمد خان سیال سے پنجہ آزمائی کی بہادر سردار بڑی دلیری سے تین دن تک سکھوں کے عظیم لشکر سے لڑتا رہا ۔ لیکن آخر کار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شہر کے چند ہندو ساہوکاروں کو ساتھ ملا لیا جن کی سازش سے سکھ فوجیں جھنگ شہر پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئیں ۔

جھنگ فتح کرنے کے بعد سکھ لشکر کا حوصلہ بڑھا اور مہاراجہ نے آگے بڑھ کر نواب مظفر خان درانی والیٔ ملتان پر حملہ کر دیا ۔ سدوزئی حاکم نے اپنی روایتی شجاعت کا ثبوت دیا ۔ سکھ توپ خانہ کی گولہ باری سے ملتان کے قلعے کی دیواروں میں شگاف پڑتے تو نواب مظفر خان کے جانباز ساتھی فوراً اس شگاف کو بھر دیتے ۔ کئی دن تک یہی عالم رہا ۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں بھی پختون نواب نے انتہائی جرأت و استقامت کا مظاہرہ کیا ۔ اس کے تمام جانباز دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پا گئے ۔ بعد میں نواب اپنے بیٹوں سمیت سکھوں سے جہاد کرتا ہوا اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا ـــــ خود نواب کی ایک صاحبزادی بھی شمشیر بدست دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئی ۔ اس بہادر جرنیل کے سارے گھرانے سے صرف ایک چھوٹے بیٹے سرفراز خان کے علاوہ کوئی بھی زندہ نہ رہا ۔ نواب صاحب کا ایک وفادار ہندو ملازم اسے خیریت سے نکال کر لے گیا ۔ بعد میں اس لڑکے کو قیدی بنا کر لاہور کے سکھ دربار میں بھیج دیا گیا اور اس کے گزارے کے لئے پنشن مقرر کر دی گئی ۔ نواب مظفر خان کا خزانہ اور سارا مال و اسباب سکھوں کے ہاتھ لگا ۔ اس شاندار فتح پر لاہور کے سکھ دربار میں کئی روز تک فتح کا جشن منایا جاتا رہا ۔

پشاور پر حملہ جھنگ اور ملتان کی کامیابیوں سے سکھ حکمران کا حوصلہ بڑھا تو وہ پشاور کی تسخیر کی طرف متوجہ ہوا ۔ اس سے قبل وہ ایک قلعہ دار کی غداری کی وجہ سے اٹک کے قلعہ پر تو قبضہ کر ہی چکا تھا ۔ اب اس کی نظریں پشاور اور دوسرے سرحدی علاقوں پر تھیں چنانچہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود قلعہ اٹک کے نواحی میدان میں خیمہ زن ہوا ۔ کچھ عرصہ تک حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے لشکر کا ایک حصہ خیر آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا ۔ دریائے سندھ (اباسین) کو پار کر کے جونہی یہ لشکر وادیٔ پشاور میں داخل ہوا ۔ سارے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ـــــ سب لوگ جوشِ جہاد سے سرشار سکھوں کے مقابلے کو نکل پڑے ۔

قبیلہ خٹک نے اس موقع پر اپنی روایتی بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے سات ہزار جانباز میدانِ جہاد میں اتار دیئے۔ سکھ لشکر کو آتے دیکھ کر ان سرفروشوں نے قسم اٹھائی کہ یا تو سکھوں کی پیش قدمی روک دیں گے یا اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ خٹک مجاہد پہاڑیوں میں مورچے بنا کر بیٹھ گئے جونہی سکھ لشکر پہاڑیوں کے درمیان پہنچا مجاہدوں نے اُسے نرغے میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سکھ سپاہیوں کو ڈھیر کر دیا۔ اتنے بڑے لشکر سے صرف تھوڑے سے سکھ سپاہی بھاگ کر جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ باقی سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنے لشکر کی اس تباہی کی خبر ملی تو غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے فوراً دریا کو پار کر کے حملہ کا حکم دے دیا۔ چونکہ سارے لشکر کے کشتیوں کے ذریعے دریا پار کرنے میں دیر لگتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملاحوں کو بُلا کر حکم دیا کہ وہ اس جگہ کی نشاندہی کریں جہاں سے دریا پار کرنا آسان تھا۔ راجہ نے سونے کی اشرفیوں کا بھرا ہوا ایک تھال خواجہ خضر کی منت کے طور دریا کی لہروں کی نذر کیا اور اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اس کے ماتحتوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ سرحدی مجاہدینِ اسلام نے بڑی دلیری سے سکھ لشکر کا مقابلہ کیا لیکن اپنی عددی برتری اور بہتر اسلحہ کی بدولت سکھ غالب ہو کر رہے ـــــ انہوں نے خیر آباد اور جہانگیرہ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا ـــــ پشاور کے بارک زئی سردار مقابلے کے لئے فوج لے کر نکلے لیکن سکھ لشکر کی کثرتِ تعداد کا سُنتے ہی میدان چھوڑ کر ہشت نگر اور شبقدر کے علاقے کی طرف فرار کر گئے۔ سکھ راجہ فتح کے شادیانے بجاتا پشاور میں داخل ہوا بلکہ جمرود تک پہنچا۔ کچھ دن تک پشاور میں قیام کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ سردار جہانداد خان درّانی کو پشاور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد واپسِ عازمِ لاہور ہو گیا۔

جہاں داد خان وہی شخص تھا جس نے غدّاری کرتے ہوئے اٹک کا قلعہ سکھوں کے حوالے کر دیا تھا۔ سکھوں نے اسی "خدمت" کے معاوضے میں اسے پشاور اور علاقہ سرحد کا نائب الحکومتہ بنا دیا۔

تاہم سکھ لشکر کے پیٹھ پھیرتے ہی یار محمد خان اور اس کے ساتھی پھر علاقہ مہمند اور ہشت نگر سے پشاور پہنچے اور انہوں نے سکھ دربار کی طرف سے مقررہ کردہ حاکم کو نکال کر صوبائی دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن خیر آباد اور جہانگیرہ کے قلعے سکھوں ہی کے قبضے میں رہے اور اس طرح صوبہ سرحد سے ان کا رابطہ قائم رہا۔

جب سردار محمد عظیم خان کو کابل میں سکھوں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اُسے بڑا طیش آیا۔ چنانچہ وہ اپنی فوج کو لے کر پشاور آیا۔ اس کی آمد سے یار محمد خان اور اس کے بھائی بڑے پریشان ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو آپس میں بھی ایک دوسرے پر اعتماد نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عظیم خان پشاور پر قابض ہو گیا تو انہیں اقتدار سے محروم کر دے گا۔ بہرحال جونہی محمد عظیم خان پشاور پہنچا اُسے کابل سے گڑبڑ کی خبریں ملنے لگیں۔ اس لئے وہ جلد کابل لوٹ گیا۔ محمد عظیم خان کے رخصت ہوتے ہی یار محمد خان اور اس کے بھائی پھر پشاور آن دھمکے، اس نے اپنے دو معتمد کارکنوں دیوان دامودر مل اور حافظ رحم اللہ خان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ اگر اسے پشاور میں نائب الحکومت مقرر کر دیا جائے تو وہ سکھ راجہ کا وفادار رہے گا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔ سکھ حکمران چونکہ گھوڑوں اور جواہرات کا شوقین تھا۔ اس لئے بارکزئی سردار نے اُسے تحفے کے طور پر کچھ گھوڑیاں اور ہیرے بھی بھیجے۔ چونکہ ان دنوں مہاراجہ پنجاب اور کشمیر کی مہمات میں مصروف تھا۔ اس لئے اس نے پشاور کا علاقہ یار محمد خان کو جاگیر کے طور دینا منظور کر لیا۔

ہزارہ اور کشمیر

وزیر فتح خان کے ظالمانہ قتل کے بعد کشمیر کا قدرانی گورنر محمد عظیم خان کابل چلا گیا تھا اور اپنی جگہ اپنے بھائی نواب جبار خان کو چھوڑ گیا تھا۔ رنجیت سنگھ اس سے پہلے بھی کشمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں تھا۔ بالآخر ۱۸۱۹ء میں عظیم خان کی غیر حاضری میں اسے یہ موقع مل گیا۔ مئی ۱۸۱۶ء میں مہاراجہ ایک بہت بڑا لشکر لے کر لاہور سے نکلا۔ وزیر آباد پہنچ کر اس نے اپنے لشکر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ ہراول دستہ سردار شام سنگھ اٹاری والا اور مصر دیوان چند کی کمان میں تھا۔ دوسرا دستہ ولی عہد شہزادہ کھڑک سنگھ کی قیادت میں جبکہ تیسرے دستے کی سربراہی خود مہاراجہ کے سپرد تھی۔ مہاراجہ نے اب کے ایک اور حربہ استعمال کیا جو بہت کامیاب رہا۔ وہ یہ کہ بھمبر کا معزول حکمران راجہ سلطان خان سات برس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قید میں تھا۔ مہاراجہ نے اُسے آزاد کر کے اپنے اعتماد میں لیا اور اس لشکر کے ساتھ بھیج دیا۔ سلطان خان چونکہ تمام راستوں اور پہاڑی جنگ کے حربوں سے واقف تھا اس لئے اس کی خدمات بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ پیر پنجال کے درّہ کے قریب سکھوں اور افغانوں میں شدید جنگ ہوئی۔ چونکہ سردار عظیم خان اپنی

بہت سی فوج اپنے ساتھ کابل لے گیا تھا۔ اس لئے مسلمان سپاہی تعداد میں بہت کم تھے، وہ سکھوں کے لشکرِ جرار کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ ۳۰ جولائی کو سرائے علیہ آباد کے قریب جبار خان نے بارہ ہزار مجاہدوں کے ساتھ سکھوں پر بھرپور حملے کئے اور انہیں عارضی طور پر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تاہم شدید نقصان اٹھانے کے بعد سکھوں نے اپنی قوت کو پھر سے مجتمع کیا۔ اکالی پھولا سنگھ کے نہنگ دستے نے اپنی جانیں داؤ پر لگا دیں۔ بالآخر سکھوں کو کامیابی نصیب ہوئی اور ان کا لشکر فتح کے شادیانے بجاتا ۴ جولائی ۱۸۱۹ء کو سری نگر میں داخل ہو گیا۔ سکھ دربار کی طرف سے دیوان موتی رام کو بیس ہزار فوج دے کر کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ نواب جبار خان اپنے بچے کھچے ہمراہیوں کے ساتھ پشاور چلا گیا اور اس طرح کشمیر کا شاداب اور حسین علاقہ جو ۱۳۴۱ء سے مسلمان حکمرانوں کے قبضے میں تھا، سکھوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

اس وقت تک ہزارہ ڈویژن کا سارا علاقہ کشمیر ہی میں شامل تھا۔ ہزارہ مسلمان مجاہدین کا مسکن تھا۔ وہ مردانِ آزاد ایک غیر مسلم طاقت کی غلامی قبول کرنے پر ہرگز تیار نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا اور انہیں سخت نقصان پہنچایا۔

سکھوں کی جانب سے سردار حکم سنگھ پہلا شخص تھا جو ہزارہ اور اٹک کے علاقوں پر حاکم مقرر کیا گیا۔ حکم سنگھ ایک جابر اور ظالم حاکم تھا، وہ بنوکِ شمشیر حکومت کرنے کا عادی تھا۔ اس لئے اس نے ہزارہ کے مسلمان خوانین پر بڑے مظالم ڈھائے۔ حاکم بنتے ہی اس نے ایک مسلمان سردار سید خان مشوانی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس سے ہزارہ کے سبھی قبائل میں اشتعال پھیل گیا۔ لوگوں نے سکھ فوجیوں پر حملے شروع کر دیئے اور بڑا نقصان پہنچایا جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو حاکم سنگھ کو واپس بلانے ہی میں بن پڑی اور اس کی جگہ دیوان رام دیال کو ہزارہ کا حاکم بنا دیا گیا۔

دیوان رام دیال بڑا مدبر شخص تھا لیکن وہ بھی اہلِ ہزارہ کے جوشِ جہاد کو دبا نہ سکا۔ اس نے فوراً لاہور دربار سے مزید فوجی کمک طلب کی، چنانچہ کنور شیر سنگھ اور فتح سنگھ اہلووالیہ کی کمان میں سکھوں کا ایک لشکرِ عظیم اور توپ خانہ ہزارہ پہنچا، اس عرصے میں مسلمان مجاہدین نے بھی گندگڑھ کے پہاڑ پر اپنے مورچے اور "سنگر" قائم کر لئے تھے، سکھ لشکر کے آتے ہی میدانِ کارزار گرم ہو گیا، سارا دن گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ شام کو سکھ لشکر تھک ہار کر اپنے خیموں کو واپس ہوا۔ سکھ سپاہی

ہتھیار کھول کر آرام کی غرض سے بیٹھے ہی تھے کہ تنولی، ترین اور مشوانی بہادروں نے پہاڑوں سے نکل کر آناً فاناً انہیں گھیرے میں لے لیا۔ یہ حملہ اتنا شدید اور ناگہانی تھا کہ سکھوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی غازیوں نے سکھ گورنر دیوان رام دیال اور دوسرے بڑے بڑے سکھ افسروں کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سکھوں کو جب اپنے گورنر کی ہلاکت کا پتہ چلا تو حوصلہ ہار بیٹھے اور صبح ہوتے ہی اپنا ساز و سامان اٹھا کر چلتے بنے۔ تاہم اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سکھوں نے بڑے مظالم ڈھائے۔ راستے میں جو گاؤں بھی آیا اسے آگ لگا دی۔ نہتے اور بے گناہ شہریوں کو تہ تیغ کر دیا۔ مقتول رام دیال کی بجائے خالصہ دربار نے اب کے سردار امر سنگھ مجیٹھہ کو ہزارہ کا گورنر بنا کر بھیجا، تاہم نئے سکھ گورنر کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے پیش رووں کا ہو چکا تھا۔ ایک دن بھی سکھوں کو ہزارہ یا صوبہ سرحد کے کسی دوسرے مقام پر چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بلکہ سیاسی اعتبار سے سکھوں کی سب سے بڑی غلطی بھی سرحدی مسائل میں اُلجھنا تھا۔ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کی حکومت پر اکتفا کرتا تو سکھ راج زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتا تھا لیکن سرحدی مہموں پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے اور ہزاروں آدمی مروانے کے باوجود ان علاقوں میں سکھ اقتدار کو کبھی استحکام نصیب نہ ہو سکا (تفصیل "سکھ دور حکومت" کے باب میں بیان ہوگی)۔

پیر سباک کا جہاد

کابل حکمران چونکہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے اس لئے سکھوں کو ہر جگہ کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، ۱۸۱۸ کے آخر میں انہوں نے ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازیخان کی طرف بھی قدم بڑھائے اور وہاں کے درانی جاگیرداروں کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ سردار محمد عظیم خان سکھوں کی ان زیادتیوں پر بہت کُڑھا۔ چنانچہ ۱۸۲۲ء میں وہ کابل سے سکھوں کے خلاف جہاد کے ارادے سے روانہ ہوا تاہم افغانستان کے داخلی انتشار کی وجہ سے بغیر کسی کارروائی کے وطن لوٹ گیا۔

دسمبر ۱۸۲۲ء میں رنجیت سنگھ نے ایک لشکر اپنے وزیر فقیر عزیز الدین کی سرکردگی میں خراج کی وصولی کے لئے پشاور بھیجا۔ یار محمد خان نے کئی سالوں سے سکھ دربار کو خراج ادا نہ کیا تھا لیکن اب اس لشکر کی آمد کی خبر سن کر اُس کے کان کھڑے ہوئے۔ ابھی سکھ لشکر راولپنڈی ہی میں مقیم تھا کہ یار محمد خان نے خراج کی رقم اور بہت سی گھوڑیاں اور دوسرے تحائف بھیج کر سکھ دربار سے

معذرت طلب کرلی، چنانچہ وقتی طور پر سکھ لشکر لاہور واپس روانہ ہوگیا۔

محمد عظیم خان کو جب اپنے بھائی یار محمد خان کی اس کمزوری اور بزدلی کا پتہ چلا تو سخت جزبز ہوا۔ وہ دشمنانِ اسلام سے کسی مفاہمت کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ وہ سرحدی علاقوں کو سکھوں سے آزاد کرانے کا عزم بالجزم کرکے جلال آباد سے چلا اور ۲۷ جنوری ۱۸۲۳ء کو پشاور آن پہنچا۔ یار محمد خان اپنے بڑے بھائی کی سخت گیری سے ڈرتا تھا۔ اس لئے اس کی آمد سے پہلے ہی اپنے بال بچوں اور مال و متاع کو لے کر علاقہ یوسف زئی کی طرف فرار ہوگیا۔ سردار عظیم خان نے پشاور پر قبضہ کرنے کے بعد قبائلی جرگے منعقد کئے اور عوام کو جہاد کے لئے ابھارا۔ علماء اور مشائخ نے بھی حمیتِ اسلام کے پیشِ نظر اس کا ساتھ دیا چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا صوبہ سرحد سکھوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جہاد کے لئے تیار ہوگیا۔ سردار محمد عظیم خان کے بھائیوں میں سے دوست محمد خان نے، جو اس وقت غزنی کا حاکم تھا، اس جہاد میں پُرجوش حصہ لیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو محمد عظیم خان کے ورودِ پشاور کا پتہ چلا تو اس نے فوری طور پر شہزادہ شیر سنگھ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ ہراول کے طور بھیجا۔ دیوان کرپارام، سردار عطر سنگھ، سردار دھنا سنگھ اور دوسرے آزمودہ کار جرنیل بھی اس دستے میں شامل تھے۔ تھوڑے دنوں بعد سکھ حکمران نے ایک اور لشکر تیار کیا اور اُسے مشہور جنگ آزما سردار ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں پشاور کی طرف بھیجا۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی اقدامات پر اکتفا نہ کیا بلکہ خود بھی ایک کثیر فوج کے ہمراہ لاہور سے کوچ کرتے ہوئے اٹک آن پہنچا۔ سکھوں کے شہرۂ آفاق تیغ آزما اکالی پھولا سنگھ، سردار دیسا سنگھ مجیٹھہ اور سردار فتح سنگھ اہلووالیہ بھی مہاراجہ کے ہم رکاب تھے۔ جب مہاراجہ اٹک پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ کنور شیر سنگھ اور ہری سنگھ نلوہ جہانگیرہ کا قلعہ فتح کر چکے تھے تاہم سکھوں کی اس پیش قدمی سے سارے یوسف زئی اور خٹک مجاہد بڑے طیش میں تھے۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر سکھوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے مضطرب تھے۔ ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار مجاہد پیر سباک کی پہاڑیوں میں جمع ہو چکے تھے۔ بارک زئی سرداروں کے لئے یہ شاندار موقع تھا کہ اتنے عظیم عوامی لشکر کی مدد سے سکھوں پر کاری ضرب لگاتے لیکن آپس کی نااتفاقی اور سازشوں کی وجہ سے انہوں نے یہ موقع بھی گنوا دیا۔

سکھ فوج نے جہانگیرہ کا قلعہ فتح کیا تو اُس وقت تک محمد عظیم خان پشاور ہی میں قیام پذیر تھا۔ اس معرکے کے بعد اُس نے سکھوں کی مزید پیش قدمی کو روکنے کے لئے اپنے بھائیوں دوست محمد خان اور جبار خان کو فوج دے کر نوشہرہ بھیجا، خود اس نے اپنا خزانہ اور اپنے بال بچے مچنی کے قلعہ میں پہنچا دیئے تاکہ وہ سکھوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، بارک زئی سرداروں نے جہانگیرہ پہنچ کر اپنی صفیں آراستہ کیں، ایک دو بار دونوں فوجوں میں معمولی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ جن میں افغان مجاہدوں کا پلہ بھاری رہا۔ بلکہ ایک بار بارک زئی سردار محمد زمان خان نے آگے بڑھ کر کشتیوں کا وہ پُل بھی توڑ دیا جس سے گزر کر سکھ فوج وادیٔ پشاور میں داخل ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ سکھ لشکر کو مزید کمک نہ پہنچ سکے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اٹک میں مسلمانوں کی ان کامیابیوں کی خبر ملی تو اس نے فوراً دریا پر نئے پُل کی تعمیر کا حکم دیا۔ تاہم وقت چونکہ تنگ تھا اور جہانگیرہ میں سکھ لشکر پر مسلمان مجاہدوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس لئے سکھ راجہ نے دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ اتفاق سے اس سال بارشیں کم ہوئی تھیں اور دریا میں پانی تھوڑا تھا۔ اس لئے سکھ لشکر زیادہ نقصان کے بغیر دریا کو پار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سکھ فوج نے ہنڈ کے قریب دریا کو پار کر کے علاقہ یوسف زئی پر قدم رکھا تو جگہ جگہ اُسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تاہم قبائلی لشکر غیر منظم اور بے سروسامان تھا۔ جبکہ سکھ فوج الارڈ، وینچورا، ایوٹبیل جیسے یورپی جرنیلوں سے تربیت یافتہ اور بہترین ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ مہاراجہ نے دریا پار کرنے کے بعد اپنی فوج کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ پہلے دستے کے آٹھ سو سوار اور سات سو پیادہ سپاہی سردار پھولا سنگھ اکالی کی کمان میں دیئے۔ یہ سردار ملتان کی فتح اور دوسری مہموں میں اپنی بہادری کی وجہ سے نام پیدا کر چکا تھا۔ حملے کا آغاز اسی دستے کو کرنا تھا۔ سکھ فوج کے دوسرے حصّے پر سردار ویسا سنگھ مجیٹھہ اور سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کماندار تھے۔ اس دستے کا کام یہ تھا کہ جب پہلا دستہ جنگ کا آغاز کرے تو یہ اُسے مدد دیں تاکہ لڑائی میں شدّت پیدا ہو۔ فوج کے یہ دونوں دستے دریائے کابل کے بائیں (شمالی) کنارے پر متعین تھے جبکہ فوج کا بڑا اور تیسرا حصّہ شہزادہ کھڑک سنگھ، سردار ہری سنگھ نلوہ، جنرل الارڈ اور جنرل وینچورا جیسے تجربہ کار سپہ سالاروں کے تحت اس غرض کے لئے متعین تھا کہ وہ عظیم خان کی پیش قدمی کو روکیں تاکہ وہ دریا عبور کر کے میدانِ جنگ تک نہ پہنچ سکے۔

اُدھر سردار محمد عظیم خان پشاور سے اپنے لشکر اور توپ خانہ کے ساتھ روانہ ہوا اور نوشہرہ چھاؤنی کے موجودہ مقام سے تین میل مشرق میں پہنچ کر خیمہ زن ہوگیا۔ کابلی لشکر کے ساتھ ایک سکھ فوجی افسر بھی تھا جس کا نام جے سنگھ اٹاری والا تھا۔ یہ افسر کچھ عرصہ قبل مہاراجہ رنجیت سنگھ سے کسی بات پر خفا ہوکر افغانستان چلا گیا تھا۔ اور وہاں کی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا، ہرات میں شاہی خاندان کی خواتین سے بدسلوکی کرنے اور خزانہ لوٹنے کے جس الزام میں دوست محمد خان کو کشمیر میں قید کیا گیا اور جسے فتح خان وذیر کی آنکھیں نکلوانے اور قتل کرنے کا بہانہ بنایا گیا۔ اس میں یہ سکھ سردار جے سنگھ بھی ملوث تھا۔ اصل میں اُسی کے کہنے اور ساتھ دینے پر دوست محمد خان نے شاہی خاندان کی بیگمات سے زیور چھینے تھے، یہ سکھ افسر کابلی حکمرانوں کا معتمد علیہ تھا لیکن نوشہرہ پہنچنے پر وہ رات کی تاریکی میں افغان لشکر سے بھاگ کر سکھ لشکر سے جا ملا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تدبر سے کام لیتے ہوئے اس کی خطا معاف کر دی۔ اور اُسے اپنے عہدے پر بحال کر دیا۔

اب میدانِ جنگ کی پوزیشن یہ تھی۔ مسلمان لشکر کا وہ حصہ جو سب کا سب یوسف زئی اور خٹک مجاہدوں اور رضاکاروں پر مشتمل تھا۔ دریائے کابل کے بائیں (شمالی) کنارے پر رسالپور کے مشرق میں پیر سباک اور ترکئی کی پہاڑیوں پر مورچے سنبھالے ہوئے تھا۔ جب کہ محمد عظیم خان دوست محمد خان اور دوسرے بارک زئی حکمران اپنی سرکاری فوجوں کے ساتھ جی۔ ٹی روڈ پر نوشہرہ اور اکوڑہ کے مابین خیمہ زن تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اسے اصل خطرہ یوسف زئی اور خٹک مجاہدوں کی طرف سے لاحق تھا۔ کیونکہ وہ جوشِ جہاد میں اپنی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھی اسلام کے مقدس نام پر اپنی جانیں قربان کرنے کا عزم لے کر اللہ کی راہ میں نکلے تھے۔ ان مجاہدوں اور رضاکاروں کی کمان ستھانہ کے مشہور مذہبی رہنما پیر سید اکبر شاہ کے ہاتھ میں تھی۔ سکھ حکمران کو کابلی سرداروں کی باہمی رقابتوں اور کمزوریوں کا بھی علم تھا، وہ جانتا تھا کہ انہیں لالچ دے کر شیشے میں اتارا جاسکتا تھا۔ اس لئے مہاراجہ نے مزید وقت ضائع کئے بغیر فوراً اپنی فوج کو پیر سباک کے مجاہدوں پر حملے کا حکم دے دیا۔ اکالی پھولا سنگھ اور اس کے نہنگ بجلی بن کر مسلمان غازیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پھولا سنگھ کئی معرکے سر کر چکا تھا۔ اس لئے وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھا۔ تاہم ابھی تک اُسے سرحدی شمشیر آزماؤں سے واسطہ نہ پڑا تھا۔

غازیوں نے اس شان سے اُسے تلواروں پر لیا کہ دست بدست لڑائی میں سکھ سپاہی گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ خود اکالی پھولا سنگھ بھی مارا گیا۔ سکھوں کے قدم اکھڑتے دیکھے تو غازیوں نے اور بھی زیادہ جوش سے حملے کئے۔ بہت سے سکھ فوجی جان بچا کر بھاگے تاہم ایک گورکھا رجمنٹ چٹان کی طرح ڈٹی رہی۔ اس نے مجاہدوں کو آگے بڑھنے سے روکا۔ اُدھر سکھ توپخانہ دھڑا دھڑ غازیوں پر آگ برسانے لگا۔ اس موقع پر اگر دریا کو پار کر کے عظیم خان کا لشکر غازیوں کی امداد کو پہنچ جاتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان کامیاب نہ ہوتے لیکن وہاں تو رنجیت سنگھ کی سازش کام کر چکی تھی۔ یار محمد خان نے اپنے بھائیوں سے بڑی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے محمد عظیم خان کو پیغام بھیج دیا تھا کہ سکھ فوج کا ایک دستہ دریائے کابل کے شمال میں مچنی کی طرف بڑھ رہا ہے اور عظیم خان کے گھر والوں اور اس کے خزانے کو بڑا خطرہ لاحق ہے۔ اپنے خزانے کو بچانے کی فکر میں محمد عظیم خان چپکے سے پڑا رہا۔ اُدھر جنرل الارڈ اور ونٹورا توپ خانہ سے گولہ باری کر کے محمد عظیم خان کو برابر ہراساں اور خوفزدہ کرتے رہے، اصل میں رنجیت سنگھ نے یار محمد خان کو درپردہ یقین دلایا تھا کہ اگر وہ عظیم خان کو حملے سے باز رکھے گا، اور سکھ لشکر کامیاب ہو جائے گا تو پشاور کی سرداری مستقل طور پر اُسے (یار محمد خان) کو دے دی جائے گی۔

غازی چونکہ اللہ کی راہ میں لڑ رہے تھے۔ اس لئے وہ رنجیت سنگھ کی توپوں تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سکھوں نے اپنی پوری قوت سے تین بار پیر سباک کا پہاڑی مورچہ چھیننے کے لئے حملے کئے لیکن ہر بار مجاہدین نے ان کے دانت کھٹے کر دیئے اور سکھوں کو واپس ہٹنا پڑا۔ چوتھی مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود فوج کی کمان سنبھالی۔ وہ ہاتھی پر بیٹھ کر آیا۔ سکھ سورماؤں کو قسم دے کر جوش دلایا اور مسلمانوں کے مورچوں پر ٹوٹ پڑا۔ سکھ سپاہی میدانی لڑائی کے ماہر تھے لیکن پہاڑی لڑائی میں جم کر لڑ نہ سکے۔ صرف پہاڑی گورکھوں نے ثابت قدمی دکھائی اور شام کے قریب چوتھے حملے کے نتیجے میں پیر سباک کی پہاڑی پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس پسپائی کے باوجود غازیانِ دین کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ قریبی علاقے کے ہر گاؤں کے بالغ مرد بھر تلواریں لہراتے سکھوں کے خلاف میدان میں نکل آئے تاہم چونکہ محمد عظیم خان کا لشکر دریا کے جنوبی کنارے سے راتوں رات خیمے اُکھاڑ کر چل دیا تھا۔ اس لئے مجاہدین کے

دل ٹوٹ گئے اور اُن کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

پیر سباک کی یہ جنگ مسلمانانِ سرحد کی اسلامی حمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، جب کبھی اسلام کے مقدس نام پر ان مردانِ حُر کو بلایا گیا۔ انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ علاقہ یوسف زئی کا کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں کے بہادروں نے اس غزا میں حصّہ نہ لیا ہو۔ ہزاروں نے آخر دم تک بہادری سے کافروں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

اُدھر سکھ لشکر کو جتنا جانی نقصان اس معرکے میں پہنچا کسی دوسرے موقع پر ہرگز نہ پہنچا تھا۔ ہلاک ہونے والے سکھ سپاہیوں کی تعداد مسلمان شہداء سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سب سے زیادہ صدمہ سردار پھولا سنگھ اکالی کی موت پر ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ اکالی لیڈر کی سمادھ پیر سباک ہی میں بنائی جائے اور اس پر ایک گوردوارہ تعمیر کیا جائے۔ اس گوردوارے کے اخراجات کے لئے مہاراجہ نے بہت بڑی جاگیر وقف کر دی۔ آج تک یہ اراضی اکالی پھولا سنگھ کی سمادھی کے لئے وقف چلی آ رہی ہے۔

اس کامیابی کے بعد سکھ لشکر بے خوف و خطر پشاور کی طرف بڑھا۔ راستے کے سرسبز و شاداب دیہات تباہ کر دیئے گئے۔ منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۷ مارچ ۱۸۲۴ء کو بڑے طمطراق کے ساتھ پشاور شہر میں داخل ہوا۔ لوگ سکھ فوجوں کی پریڈ دیکھنے سڑکوں پر نکل آئے۔ کچھ دنوں بعد سکھ راجہ نے پشاور کے قلعہ بالاحصار میں دربار لگایا جس میں علاقے کے کچھ دوسرے عمائدین کے علاوہ بارکزئی سردار یار محمد خان اور اس کے بھائیوں نے بھی حاضر ہو کر رنجیت سنگھ کو اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلایا۔ انہوں نے اس موقع پچاس گھوڑے اور دوسرے تحائف بھی نذرانے کے طور مہاراجہ کے حضور پیش کئے، ان گھوڑوں میں مہاراجہ کا مطلوبہ اور پسندیدہ گھوڑا "گُہر بار" بھی شامل تھا۔ سکھ فرمانروا کو چونکہ سرحدی مجاہدوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور وہ صوبہ سرحد پر براہِ راست حکومت کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کو جانتا تھا۔ اس لئے اس نے یار محمد خان کے سابقہ طرزِ عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر سے اُسے حاکم پشاور مقرر کر دیا۔ طے پایا کہ بارک زئی سردار ایک لاکھ دس ہزار روپیہ سالانہ بطور خراج سکھ

حکومت کو اداکرنا ہے گا۔ پشاور کے انتظامات درست کرنیکے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ وہ ۲۷ اپریل ۱۸۲۴ء کو لاہور پہنچا۔ اس موقع پر لاہور میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ فتح پشاور کا جشن منعقد ہوا۔ چراغاں کیا گیا اور اس مہم میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو انعام اور خلعت دیئے گئے

سکھوں کے ہاتھوں پشاور کی فتح تاریخ میں ایک عجیب واقع تھا۔ اب تک یہی ہوتا رہا تھا کہ شمال سے آنیوالے لوگ فتح کے شادیانے بجاتے جنوب کو جایا کرتے تھے لیکن اب کے پہلی بار جنوب سے حملہ آور آکر شمال کے علاقوں کو مسخر کرنے لگے۔ پیر سباک کی شکست اور اپنے بھائیوں کی غداری کی وجہ سے محمد عظیم خان کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ پشاور سے کابل جاتے ہوئے وہ اتنا بیمار اور کمزور ہو گیا کہ راستے ہی میں لتہ بند کے مقام پر فوت ہو گیا۔" دلپینتو تاریخ" کے مؤلف قاضی عطاء اللہ خان کے خیال میں عظیم خان نہ تو عالی دماغ تھا نہ مستقل مزاج۔ اکثر شراب کے نشہ میں مخمور رہتا تھا تاہم ظاہر اُبڑا خوش اخلاق اور نیک دل انسان تھا۔ اُسے پیر سباک میں اپنی غلطیوں کا پورا احساس تھا۔ اس لئے اس نے مرنے سے پہلے اپنے بڑے بیٹے حبیب اللہ کو وصیت کی کہ میرے خزانے کی تمام رقم (جو ۲۷ لاکھ پونڈ بنتی تھی) سکھوں کے خلاف جنگی تیاریوں میں صرف کی جائے۔ اس وصیت پر عمل درآمد کی نوبت تو نہ آئی تاہم اس سے عظیم خان کی اخلاقی بلندی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

سکھ لشکر نے پشاور پر قبضے کے بعد سخت تباہی مچائی۔ خوبصورت عمارتیں ڈھا دی گئیں۔ باغ اجاڑ دیئے۔ مسجد مہابت خان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اور اس طرح علاقے کی تجارت اور معیشت کو سخت دھچکا لگا۔

پیر سباک کے جہاد کے کچھ عرصہ بعد یوسف زئی سرفروشوں نے پھر ایک لشکر سکھوں سے جہاد کے لئے تیار کیا۔ یہ لشکر بھی سید اکبر شاہ آف ستھانہ کی کمان میں تھا۔ ان مجاہدوں کی سرکوبی کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار ہری سنگھ نلوہ کو مامور کیا جو اس کے سب جرنیلوں سے سفاک اور جابر تھا۔ ناڑہ کے مقام پر سرحدی مجاہدوں اور سکھ فوج میں خونریز مقابلہ ہوا جس میں ہری سنگھ نلوہ سخت زخمی ہوا۔ بعد میں اس نے دریائے سندھ کے مشرقی علاقے پر اپنا کنٹرول مضبوط کرنے کے لئے ہری پور کے قصبہ میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔

امیر دوست محمد خان

۱۸۲۶ء — تا — ۱۸۳۹ء

محمد عظیم خان کی وفات پر اس کا بیٹا حبیب اللہ باپ کا جانشین بنا، تاہم کابل کی بادشاہت بدستور شہزادہ ایوب خان کے پاس رہی، بارک زئی برادران کی پوزیشن اس وقت یہ تھی کہ غزنی پر امیر دوست محمد خان، قندہار پر پوردل خان، شیر دل خان، رحم دل خان اور کہن دل خان اور پشاور میں یار محمد خان، سلطان محمد خان۔ پیر محمد خان اور سید محمد خان حاکم تھے۔ ان بھائیوں میں خانہ جنگی کے نتیجے میں پہلے تو دوست محمد خان کو شکست دے کر شیر دل خان کابل کا حکمران بن بیٹھا۔ لیکن بعد سرداران پشاور اور دوست محمد خان نے مل کر کابل کی سرداری شیر دل سے چھین کر سلطان محمد خان کے حوالے کر دی۔ کچھ عرصہ بعد دوست محمد خان نے جو اس وقت غزنی کا حاکم تھا۔ اپنے بڑے بھائی پر حملہ کر کے کابل کی گدی چھین لی، بعد میں بھائیوں کے ایک جرگہ میں طے پایا کہ سلطان محمد خان کو پشاور کی حکومت دے دیجائے اور کابل پر دوست محمد خان کا قبضہ تسلیم کر لیا جائے چنانچہ سدوزئی کی بادشاہت ختم ہو گئی۔

۱۸۲۶ء میں دوست محمد خان کو کابل کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ اُسے بارک زئی حکومت کا بانی ہونے کا فخر حاصل ہے۔

بارک زئی یا محمد زئی قندہار کے درانی قبیلہ کی ایک چھوٹی سی شاخ ہے یہ محمد نامی ایک شخص سے منسوب ہے جو ابدالی یا درانی قبائل کے سردار ملک سدو (سعد اللہ خان) کا ہم عصر تھا۔ اس کے اخلاف میں سے حاجی جمال خان نے بہت نام پایا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کا قابلِ اعتماد ساتھی تھا، حاجی جمال کے بیٹے پائندہ خان نے تیمور شاہ کی سلطنت کے استحکام کے لئے قابلِ قدر کوششیں کیں اور وزارت

کے منصب تک پہنچا ۔ ۱۸۰۰ء میں پائندہ خان کی وفات پر اس کا بیٹا فتح خان منصبِ وزارت پر فائز ہوا، ۱۸۱۸ء میں فتح خان کو شاہ محمود کے حکم پر مروا دیا گیا ۔ دوست محمد خان اسی فتح خان کا سب سے چھوٹا لیکن سب سے مہم باز، جرأت مند اور معاملہ فہم بھائی تھا ۔

دوست محمد خان کے بادشاہ بننے سے پہلے درّانی سلطنت کے اکثر حصّے کابلی حکومت کے تسلط سے آزاد ہو چکے تھے ۔ اس لئے دوست محمد خان کو کابل، غزنی اور قندہار میں اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کا موقع مل گیا ۔ اس نے پہلی بار ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۹ء اور دوسری بار ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۳ء تک حکومت کی ۔

دوست محمد خان چونکہ پشاور اور کشمیر میں اہم ذمہ داریاں انجام دے چکا تھا اس لئے سرحدی معاملات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا ۔ اسے مسلمان آبادی پر سکھوں کا تسلط ایک آنکھ نہ بھاتا تھا ۔ وادیٔ پشاور چونکہ درانی سلطنت کا زرخیز ترین اور مالدار ترین علاقہ تھا ۔ اس لئے دوست محمد خان ہر صورت اسے حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ یہاں تک کہ اس نے انگریزوں سے معاہدہ کرتے وقت بھی یہ شرط پیش کی کہ اُسے فوجی مدد دی جائے تاکہ وہ پشاور کو اپنے قبضے میں رکھ سکے ۔

پیر سباک کی جنگ کے بعد عظیم خان اتنا دل شکستہ ہو گیا تھا کہ کابل پہنچنے سے پہلے ہی دُنیا سے کُوچ کر گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے بہت بڑا خزانہ چھوڑا اور اپنے بیٹے حبیب اللہ خان کو وصیت کی کہ وہ یہ ساری رقم صرف کر کے سکھوں سے بدلہ لے تاہم حبیب اللہ خان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سکھوں سے ٹکر لے سکے، یہاں تک کہ وہ کابل پر بھی اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکا اور ۱۸۲۶ء میں دوست محمد خان کابل پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ پشاور کی حکومت دوست محمد خان کے چار بھائیوں یار محمد خان، سلطان محمد خان، پیر محمد خان اور سید محمد خان کے ہاتھوں میں تھی، یہ لوگ "سردارانِ پشاور" کے نام سے مشہور ہوئے ۔ تاہم ان کا اقتدار برائے نام تھا ۔ اصل میں وہ سکھوں کے باجگذار تھے ۔ سردارانِ پشاور میں سے یار محمد خان پشاور پر، سلطان محمد خان کوہاٹ پر ۔ سید محمد خان ہشت نگر پر حکومت کرتا تھا ۔ جب کہ ان کا بھائی پیر محمد خان فوجی معاملات کا نگران تھا ۔ رنجیت سنگھ آئے دن ان لوگوں سے گھوڑیاں اور تحفے طلب کرتا، مالیہ وصول کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً سکھ فوج مختلف علاقوں پر دھاوا بولتی اور جو ہاتھ آتا لے کر چلتی بنتی ۔۔۔ کوئی

مضبوط اور مستحکم حکومت صوبہ سرحد میں نہ تھی۔ جگہ جگہ کے خان خوانین اور رئیس ہی اپنے اپنے علاقے میں مطلق العنان حاکم بنے بیٹھے تھے۔ پشاور اور گرد و نواح کے باغات اور شاہی عمارتیں سکھوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی۔ آئے دن کی بدامنی کی وجہ سے اکثر لوگ ان علاقوں سے ترک سکونت کر چکے تھے۔

سردارانِ پشاور نہ تو دوست محمد خان کو ترقی کرتے دیکھ سکتے تھے نہ ہی خود اتنے طاقتور تھے کہ سکھوں سے ٹکر لیتے۔ بلکہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے وہ ہر حربہ اختیار کرنے پر اتر آئے۔ ۱۸۲۶ء میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی پشاور پہنچے اور مسلمانانِ علاقہ جوق در جوق اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے تو سردارانِ پشاور بھی مجاہدین کے ساتھ ہو لئے۔ وہ سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ پشاور سے چمکنی ہوتے ہوئے مجاہدین چارسدہ پہنچے تو سید محمد خان نے ان کے لئے ضیافت ترتیب دی اور بڑی آؤ بھگت کی۔ یار محمد خان اور سید محمد خان اپنے آپ کو سید صاحب کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اگرچہ سید صاحب کو بہت سے لوگوں نے سمجھایا کہ وہ سردارانِ پشاور پر زیادہ اعتماد نہ کریں کہ جو لوگ اپنے ہی بھائیوں کے نہ بن سکے کسی اور کے وفا شعار کیسے بنیں گے تاہم سید احمد بریلوی فقیر منش انسان تھے۔ انہوں نے کسی مسلمان پر بداعتمادی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

سردارانِ پشاور کے خصائل کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر کا کہنا ہے کہ

"یار محمد خان کے متعلق اہلِ سرحد کی رائے میری معلومات کے مطابق درست تھی، سلطان محمد خان یقیناً اس سے زیادہ مخلص تھا لیکن وہ عزم و ہمت کا مالک نہ تھا۔ جو لوگ اُس سے ملے وہ لکھتے ہیں کہ وہ خوش پوشی، خوش نوشی اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا.....

پیر محمد خان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ اُسے فوجی امور سے خاص دلچسپی تھی اور عسکری صلاحیت کے اعتبار سے سب بھائیوں میں ممتاز تھا۔ سید محمد خان کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔"

"ظفر نامہ" میں دیوان امرناتھ لکھتا ہے کہ

"یار محمد خان نے جب دیکھا کہ لوگ پروانہ وار سید صاحب کی طرف دوڑے جا رہے ہیں

اور ملک میں خرابی پیدا ہو رہی ہے تو مصلحتاً خود بھی مرید بن گیا۔"

(MASON) میسن کہتا ہے کہ

"یوسف زئیوں کو میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرنے میں سید صاحب کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے سردارانِ پشاور کو سید صاحب کے ساتھ مذاکرات اور خط و کتابت پر راغب کر دیا۔"

اکوڑہ خٹک کے معرکے میں مجاہدینِ اسلام کی کامیابی کے بعد شیدو کی جنگ سے قبل سردارانِ پشاور نے نوشہرہ میں سید صاحب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران خان فتح خان پنجتاری، خان اشرف خان رئیس زیدہ، خان خانے خان رئیس ہنڈ اور ایک جلیل القدر پیر زادہ "گودڑی شہزادہ" بھی سید صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس ملاقات میں فیصلہ ہوا کہ متحدہ قوت سے سکھوں کا مقابلہ کیا جائے اور عوام کو جہاد کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ پختون خوانین نے تو اپنا عہد نبھایا لیکن کابلی سردار ایک مرتبہ پھر تذبذب کا شکار ہو گئے۔

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یار محمد خان نے جنگِ شیدو سے قبل سید احمد بریلوی کو کھانے میں زہر دلوا دیا تھا اور خود رنجیت سنگھ سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اسے پشاور کا باجگذار حاکم رہنے دیا جائے تو وہ اپنے لشکر اور توپ خانہ کو میدانِ جنگ سے نکال کر لے جائے گا۔ تاہم سلطان محمد خان نے سید خان سے خط و کتابت اور اظہارِ عقیدت کا سلسلہ جاری رکھا۔ جنگِ شیدو کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ یار محمد خان کے فرزند محمد حسن خان کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا۔ جسے چند ماہ بعد آزاد کر دیا گیا۔ تاہم سکھ مسلسل یار محمد خان پر دباؤ ڈالتے رہے، کبھی اس پر خراج کی رقم بڑھا دی جاتی، کبھی "لیلیٰ" نام کی گھوڑی کے لئے پشاور پر چڑھائی کر دی جاتی۔ کبھی "باڑے" کے چاول اُن سے منگوائے جاتے، یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن یار محمد خان جس طرح بھی ہو سکا سکھ راجہ کا ساتھ دیتا رہا۔

جنگِ زیدہ سے قبل بھی سید احمد بریلوی نے یار محمد خان سے اپیل کی تھی کہ وہ سب بھائیوں کو متفق کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کریں تاکہ دینِ اسلام ترقی کرے"۔ بتایا جاتا ہے کہ یار محمد خان نے سید صاحب کے پیغامِ مصالحت کا نہایت درشت جواب دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ اگر اب کوئی شخص

صلح کا پیغام لایا تو اس کا سر اُڑا دوں گا۔

اس جنگ کے نتیجے میں یار محمد خان کو ایک کاری زخم لگا۔ اسے بمشکل گھوڑے پر سوار کر کے میدان سے باہر لے جایا گیا لیکن مواضعات ہریانہ اور دوڈھیر کے مابین لہاور کے آس پاس وہ فوت ہو گیا۔ اس کی میت کو پشاور لے جا کر دفنایا گیا۔ اس یورش میں یار محمد خان کے تین سو ساتھی مارے گئے جن میں سات بڑے بڑے سرکردہ سردار بھی شامل تھے۔ بہت سے گھوڑے اور مال و اسباب مجاہدین کے ہاتھ لگا۔ انہی میں "سبھ کہار" نامی وہ گھوڑا بھی تھا جس پر خود یار محمد خان سوار تھا۔ افسر انفری مچی تو یہ گھوڑا قبیلہ خٹک کے ایک شخص بخت خان کے ہاتھ لگا۔ وہ اسے میدانِ جنگ سے نکال کر لے گیا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ اس کا بہت آرزومند ہے، اس لئے بڑی قیمت لے کر یہ گھوڑا اٹک بھیج دیا۔

اگرچہ سلطان محمد خان بظاہر سیّد احمد بریلوی کا ارادت مند تھا۔ تاہم یار محمد خان کے قتل کے بعد وہ بھائی کے قتل کا بدلہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی والدہ اور دوسرے اہلِ خاندان روزانہ اسے یار محمد خان کا انتقام لینے پر اکساتے تھے۔ بالآخر سلطان محمد خان نے اچانک ہنڈ کے قلعہ پر، جہاں مجاہدین کی تعداد زیادہ نہ تھی، حملہ کر دیا اور بہت سے غازیوں کو قیدی بنا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان قیدیوں کو پشاور لے جا کر اپنے بھائی کی قبر پر ذبح کرے۔ لیکن ابھی چارسدہ ہی پہنچا تھا کہ غازی کسی نہ کسی طرح رات کو قید سے فرار ہو گئے۔

سلطان محمد خان نے مردان اور دوسرے مقامات کے خوانین کو ساتھ ملا کر مایار کے قریب مجاہدین سے ایک اور جنگ لڑی۔ لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر مجاہدین نے پیش قدمی کرتے ہوئے پشاور بھی فتح کر لیا ـــــ مجاہدین کے پشاور میں ورود سے قبل سردارانِ پشاور نے اپنے اہل و عیال کو کوہاٹ بھیج دیا۔ اور خود علاقہ مہمند کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ بعد میں سلطان محمد خان کی جانب سے ارباب فیض اللہ خان ساکن ہزار خوانی صلح کا پیغام لے کر سید احمد بریلوی کی خدمت میں آیا۔ امیر المجاہدین کو ان سرداروں کی بدعہدیوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اور ارباب بہرام خان اور دوسرے رفقاء نے بھی انہیں خبردار کیا تھا کہ دوبارہ ان لوگوں پر

بھروسہ نہ کریں تاہم سید صاحب کا مقصود چونکہ دنیوی حکومت نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے خراج کی رقم مقرر کر کے پشاور کی حکومت دوبارہ سردار سلطان محمد خان کے حوالے کر دی۔

تاہم اب کے بھی وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ مجاہدین کے رخصت ہوتے ہی سرداران پشاور اور خوانین نے اپنی سازشیں تیز تر کر دیں۔ انہوں نے کچھ علماء کو بھی ساتھ ملا لیا۔ جنہوں نے مجاہدین پر "بدعقیدگی" کا فتویٰ صادر کر دیا۔ بالآخر یہ سازش کامیاب ہوئی۔ مجاہدین کو چُن چُن کر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور سید احمد بریلوی اور ان کے بچے کھچے ساتھی ہزارہ کے بالائی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

اگرچہ اپنی زندگی میں تو سلطان محمد خان اور اس کے بھائی کابل کا تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تاہم بعد میں حالات نے پلٹا کھایا تو افغانستان کی حکومت سردار سلطان محمد خان ہی کی اولاد کے حصے میں آئی۔ کابل کا آخری بادشاہ ظاہر شاہ سلطان محمد خان ہی کی نسل سے تھا۔

جہاں تک امیر دوست محمد خان کا تعلق ہے، اس نے پورے تدبر اور کوشش سے کام لیتے ہوئے بارک زئی حکومت کو مستحکم بنایا۔ وہ ۱۸۲۶ء میں کابل کا فرمانروا بنا تھا۔ ۱۸۳۴ء میں اس نے امیر کا لقب اختیار کیا اور افغان عوام اور سرحدی قبائل کو آمادہ جہاد کر کے ایک بار پھر پشاور کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ اس وقت تک رنجیت سنگھ مکمل طور پر صوبہ سرحد کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور "سرداران پشاور" پشاور چھوڑ چکے تھے، تاہم سکھوں کی منظم فوج کے آگے امیر کابل کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اب کے امیر دوست محمد خان نے انگریزوں کی طرف صلح اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس کی خواہش تھی کہ انگریزوں کی مدد سے صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں کو دوبارہ اپنی سلطنت میں شامل کرے لیکن انگریزوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

آخر میں امیر دوست محمد خان نے پھر پلٹا کھایا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں اور سکھوں میں لڑائی چھڑی تو امیر دوست محمد خان نے اس شرط پر سکھوں کا ساتھ دیا کہ فتح کی صورت میں وہ صوبہ سرحد کے علاقے اس کے حوالے کر دیں گے۔ اس مقصد کے لئے اس نے بارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج اپنے بیٹے کی کمان میں سکھوں کی مدد کے لئے پنجاب روانہ کی۔ لیکن ابھی یہ فوج گجرات پہنچنے

بھی نہ پائی تھی کہ سکھوں کو آخری شکست اٹھانی پڑی۔ افغان فوج شکست کا سُن کر اُلٹے پاؤں پشاور کو بھاگی۔ انگریز سپہ سالار لارڈ گف نے درّہ خیبر تک اس بھاگتی ہوئی فوج کا تعاقب کیا۔ اس واقع کے بعد صوبہ سرحد سکھوں کی غلامی سے نکل کر انگریز کی غلامی میں پھنس گیا۔ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی سے کچھ عرصہ پہلے امیر دوست محمد خان نے انگریزوں سے دوستی کا عہد نامہ کیا جس پر وہ آخر تک قائم رہا۔

امیر دوست محمد خان نے ۹ جون ۱۸۶۳ء کو وفات پائی۔ اس کی ایک بیوی کریم کے بنگش قبیلہ کی تھی جس کے بطن سے محمد افضل خان، محمد اعظم خان اور ولی محمد خان پیدا ہوئے۔ باقی اولاد پوپلزئی خاتون سے تھی۔ جن میں سے مجاہد کبیر محمد اکبر خان اور امیر شیر علی خان زیادہ مشہور ہیں۔ مجموعی طور پر دوست محمد خان کا عہد افغانستان کے داخلی استحکام کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔

تحریکِ مجاہدین

تحریکِ مجاہدین ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے بجا طور پر برِصغیر میں احیائے اسلام کی اوّلین کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی کے نزدیک "یہ ہندو پاکستان کی ملّت اسلامیہ کی زندگی میں سب سے پہلا اجتماعی اقدام اور مسلمانوں کی پہلی قومی نوعیت کی تحریک ہے" ـــــ سید مسعود عالم ندوی اسے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" قرار دیتے ہیں۔ اس تحریک کے ایثار پیشہ رہنماؤں کی کوششوں سے ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے نیا جوش اور جذبہ پایا، سینوں میں جہاد کی تڑپ اور حرارت پیدا ہوئی اور بنگال سے لے کر ہندوکش کی چوٹیوں تک ہر جگہ کے مسلمان اپنی مذہبی اور سیاسی اقدار کی آزادی کے لئے شمشیر بکف اُٹھ کھڑے ہوئے ـــــ تحریکِ مجاہدین کے اثرات محض وقتی اور عارضی نہ تھے بلکہ پوری ایک صدی تک اس تحریک کے زیرِ اثر فرزندانِ اسلام کو بڑی سے بڑی قربانی دینے کا حوصلہ اور بڑے سے بڑے دشمن سے ٹکرا جانے کا ولولہ نصیب ہوا۔ یوں تو یہ تحریک جنوبی اور وسطی ہند سے اٹھی تاہم اس کی سرگرمیوں کی اصل جولان گاہ صوبہ سرحد ہی کی سرزمین تھی۔ سرحد کے حریت کیش مردانِ مجاہد یوں تو صدیوں سے کفر و طاغوت کے خلاف سینہ سپر چلے آرہے تھے تاہم اس تحریک نے ان کی سرگرمیوں کا رُخ متعین کر دیا۔ قبائلِ سرحد کو ایک وسیع تر نصب العین عطا کیا اور انہیں اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دینے کی طرف متوجہ کر دیا۔

غور کیا جائے تو ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کو سب سے بڑا خطرہ متحدہ قومیّت و ثقافت سے تھا۔ ہندو تہذیب اتنی لچکدار واقع ہوئی ہے کہ وہ متعدّد تہذیبوں، مذہبوں اور قومیتوں کو اپنے اندر جذب کر کے ان کا وجود ختم کر چکی ہے۔ صوبہ سرحد میں جہاں کہیں بھی جائیں بودھ مت کے آثار موجود

ہیں۔ ایک دور ایسا بھی تھا جب تمام سرحدی علاقوں کشمیر، چین اور افغانستان میں بودھ مت انتہائی عروج پر تھا لیکن آج ان میں سے اکثر خطوں میں اس مذہب کا ایک پیروکار بھی موجود نہیں۔ وہ بودھ لوگ کیا ہوئے؟ ـــــ یہ نہیں کہ ہندو نے اُن کا قتلِ عام کیا بلکہ کیا تو یہی کیا کہ انہیں ہندو مت میں جذب کر کے ان کا علیحدہ وجود مٹا کر رکھ دیا۔ سکھ مذہب کی بنیاد توحیدِ الٰہی کے مرکزی عقیدے پر قائم تھی۔ لیکن ہندوؤں نے ایسا جال بچھایا کہ سکھ ہندو قومیت ہی کا ایک جزو بن کر رہ گئے ـــــ لے دے کے اسلام ہی ایک ایسا دین تھا جسے برہمن کی عیاری ختم نہ کر سکی اور مسلمان نے اپنا الگ قومی تشخص ہمیشہ برقرار رکھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا یہ محاکمہ بڑا ٹھوس اور جامع ہے کہ "پاکستان اُسی دن عالمِ وجود میں آگیا تھا جب برصغیر کے پہلے غیر مسلم نے اسلام قبول کیا۔ کیونکہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہی انسان ایک نئی قومیت اختیار کر لیتا ہے۔"

یہ بجا کہ مسلمانوں نے نو سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی تاہم ان شخصی حکمرانوں میں سے بہت کم کو تبلیغ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی اثرات کے تحت دین کی صحیح صورت نگاہوں سے اوجھل ہوتی گئی ـــــ شہنشاہ اکبر کے دور میں صلح کل کے پُرفریب پروگرام کے تحت غیروں کی ثقافتی یلغار تیز تر ہو گئی ـــــ ایسے میں اگر حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ بروقت مسلمانوں کو بیدار نہ کرتے تو برصغیر سے اسلامی نقوش کبھی کے مٹ گئے ہوتے ـــــ دیکھا جائے تو تجدیدِ دین کی ان کوششوں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ہم نوا زیادہ تر پختون امراء اور سرکاری منصب دار ہی تھے، بعد میں غلبۂ اسلام کے حصول اور ہندی مسلمانوں کو مرہٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کا کام شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کے گھرانے نے سنبھالا تو بھی اُن کی آواز پر لبیک کہنے والے احمد شاہ درانی اور اُن کے افغان جانباز ہی تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب جنوبی سمت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرنگی فوجیوں اور شمالی ہند میں سکھ سورماؤں نے برصغیر سے مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کر دینے کی مہم چلائی اور اس کے ردِ عمل کے طور پر سید احمد بریلوی نے تحریکِ مجاہدین کا آغاز کیا تو ان کا ساتھ دینے والوں میں بھی ہندوستان میں آباد سرحدی قبائل کے لوگ، روہیلے اور افغان ہی سب سے پیش پیش تھے، اپنے طویل تجربے

اور کامل غور و خوض کے بعد سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل نے جس سرزمین کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز و محور بنانے کا فیصلہ کیا وہ صوبہ سرحد ہی کی حریت پرور سرزمین تھی۔

صوبہ سرحد کو مرکز جہاد بنانے کے فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ

"سید صاحب کو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد کی ہوگی۔ کہ افغانوں کی جواں مردی۔ سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و تہور کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی۔ جو افغان ہندوستان کے مختلف حصوں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی فوج کا بڑا حصہ ان پٹھانوں پر مشتمل تھا جو سرحد سے آئے تھے یا اُن کے قریبی مورث وہاں سے منتقل ہوئے تھے۔ شاہ اودھ کی فوج انہیں پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ نواب فقیر خان آفریدی۔ عبدالباقی خان قندہاری۔ میندڑ خان رسالدار یہ سب افغانی الاصل اور سرحدی پٹھان تھے۔ خود نواب امیر خان (والئی ٹونک) اور اس کے اکثر سردار اور رفقائے کار پٹھان تھے۔ روہیل کھنڈ، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اور دینی حمیت کا بڑا مخزن تھا اور وقتاً فوقتاً دہلی کو بھی تازہ خون اور نئی طاقت عطا کرتا رہا تھا، افغانوں سے آباد تھا۔ خود سید صاحب کے ارادت مندوں میں ایک کثیر تعداد افغانوں کی موجود تھی۔ ہندوستان میں بسنے والے اُن پٹھانوں کے تعلقات اور رشتہ داریاں افغانستان اور سرحد کے افغانی قبائل میں تھیں۔ انہوں نے بھی سید صاحب کو اپنے وطن یعنی شمال مغربی صوبہ سرحد کو اپنی دعوتِ جہاد کا مرکز دینے کا مشورہ دیا ہوگا اور اپنے اعزہ اور اہلِ تعلق سے امداد کی اُمید دلائی ہوگی۔"

عبداللہ ملک اس سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

"تحریکوں کے اجراء کے لئے تاریخی تسلسل اور ماضی کے واقعات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ـــــ سید احمدؒ اور اُن کے رفقاء کی مرکزِ جہاد کی تلاش میں برِصغیر کی تاریخ نے بڑی مدد کی کیونکہ ہندوستان پر کوئی حملہ آور بھی ایسا نہ تھا جو درّہ خیبر کی

راہ سے نہ آیا ہو (اس میں صرف دو مستثنیات ہیں، محمد بن قاسم اور برطانوی لوگ)
سیّد احمدؒ نے بھی ضروری سمجھا کہ ملک کی شمال مغربی سرحد پر ایک آزاد مرکز ایسا قائم ہو،
جہاں پیچھے سے بھی امداد پہنچتی رہے اور جہاں کے لوگ مجاہد پیشہ اور سپاہیانہ صفات
کے حامل ہوں۔"

پنجتار (ضلع مردان) میں علماء اور رؤسائے سرحد کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے
ہوئے امیر المجاہدین سیّد احمد بریلویؒ نے اپنے مقصد کی وضاحت یوں کی تھی کہ

"میں نے خیال کیا کہ ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ مامون ہو جہاں مسلمانوں کو لے جاؤں
اور جہاد کی تدبیر کروں، باوجود اس وسعت کے سارے ہندوستان میں کوئی جگہ ہجرت
کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کئی لوگوں نے صلاح دی کہ ہندوستان ہی میں رہ کر جہاد کرو، جو
کچھ مال، خزانہ، اسلحہ وغیرہ درکار ہوگا، ہم دیں گے۔ مگر مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لئے
کہ جہاد سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ بلوہ کرنا منظور نہیں، تمہارے خطّے (صوبہ
سرحد) کے ولایتی بھائی بھی حاضر تھے۔ انہوں نے کہا، ہمارا ملک جہاد کے واسطے
خوب ہے، اگر وہاں چل کر قیام کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ
کا ساتھ دیں گے۔"

سردار یار محمد خان حاکمِ پشاور کو اپنے مقصدِ جہاد کے سلسلے میں سیّد احمدؒ نے لکھا:۔

"اس تمام جد و جہد سے فقیر کا مقصد صرف یہ ہے کہ اہلِ کفر و ضلالت سے جنگ کرنے
کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں اور فرمانِ خداوندی جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ
وَأَنْفُسِكُمْ (جہاد کرو اپنے مال اور جان سے) کی تعمیل کی صورت پیدا ہو، فرمانبردار
بندے کے لئے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے بغیر چارہ کار نہیں۔"

سردار سلطان محمد خان اور سیّد محمد خان کو لکھا:۔

"میرا اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے اس کے سوا کوئی مقصود نہیں کہ
جہاد کو شرعی طریقے سے قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو،
اس کے سوا کوئی دوسری نفسانی غرض مثلاً روپے پیسے، خزانے یا حصولِ سلطنت یا

اہلِ حکومت و صاحبِ اقتدار لوگوں کی تذلیل یا اپنے ہمسروں پر اپنے احکام کا اجراء یا اپنے ہمعصروں پر فوقیت و امتیاز قطعاً شامل نہیں۔"

سید احمد بریلویؒ نے جہاد کے لئے مسلمانانِ برصغیر کو دعوت دیتے ہوئے جو اعلان نامہ جاری کیا، اس میں کہا گیا تھا کہ

"سکھ قوم عرصے سے لاہور اور دوسری جگہوں پر قابض ہے اور اُن کے ظلم کی کوئی حد نہیں رہی۔ انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو بلا قصور شہید کر دیا ہے۔ ہزاروں کو ذلیل کیا ہے مسجدوں میں نماز کے لئے اذان دینے کی اجازت نہیں اور ذبیحہ گاؤ کی قطعی ممانعت ہے، جب سکھ ظلم و ستم ناقابلِ برداشت ہو گیا تو حضرت سید احمد ایدہ اللہ بنصرہٖ نے خالصتاً حفاظتِ دین کے لئے کئی مسلمانوں کو کابل اور پشاور کے دوران خوابِ غفلت سے جگایا اور انہیں جرأت دلا کر آمادۂ عمل کیا، الحمد للہ! ان کی دعوت پر ہزارہا مسلمان راہِ خدا میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کفار کے خلاف ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد شروع کر دیا جائے گا۔"

سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل دہلوی دونوں یک جان دو قالب تھے، وہ شاہ ولی اللہؒ کی فکری تحریک سے پوری طرح متاثر تھے۔ شیخ محمد اکرم "موجِ کوثر" میں رقمطراز ہیں کہ "میں ان دونوں حضرات کو مستقل بالذات مجدد نہیں بلکہ شاہ ولی اللہؒ کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں"۔ جن حالات میں ان بزرگوں نے علمِ جہاد بلند کیا، وہ بے حد مایوس کن تھے، للہیت اس درجہ کم یاب تھی کہ عام لوگ جہاد فی سبیل اللہ کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جہاد ایک اسلامی فریضہ ہے اور اس پر عمل درآمد اسی طرح ضروری ہے جس طرح نماز اور روزے پر، اسلام میں جہاد کی ہر صورت (بشمول قتال) عبادت قرار دی گئی ہے۔" دائرہ معارف اسلامی کے نزدیک اصطلاح میں جہاد کے معنی وہ محنت اور کوشش ہے جو اللہ کے لئے، اللہ کی راہ میں، اسلام کے لئے، نظامِ ملت کے لئے یا اس کے استحکام کے لئے کی جائے خواہ وہ مال سے ہو، جان سے ہو یا کسی اور طور طریقے سے ۔۔۔ گویا استحکامِ ملت کی ہر کوشش کو جہاد قرار دیا جا سکتا ہے۔"

ابوالکلام آزاد نے "مسئلہ خلافت" اور "قولِ فیصل" میں غلامی سے نکلنے کی جدوجہد کو فرض

قرار دیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر کے نزدیک شریعت کی اصطلاح میں جہاد کی تعریف یہ ہے ــــ "دشمن کے حملے کی روک تھام کے لئے اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ ظاہراً و باطناً نکلنا"

ہر مسلمان اللہ کا سپاہی اور اس کا اطاعت گزار بندہ ہے، وہ اللہ کی سرزمین پر اللہ کے احکام نافذ کرنے کو اپنا حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ سید احمد بریلوی اور اُن کے جانباز ساتھی یہی مقصد لے کر اٹھے تھے، ایک جگہ سید صاحب لکھتے ہیں ــــ "اگر اسلامی ممالک آزاد ہو جائیں اور ریاست و سیاست اور قضا و عدالت میں شرعی قوانین کو مدارِ عمل بنا لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا"

سید احمد بریلوی سادات کے ایک معزز اور مشہور خانوادے میں ۶ صفر ۱۲۰۱ھ ہجری مطابق ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا مقامِ ولادت رائے بریلی تھا۔ ان کا گھرانا اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت ہر جگہ عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر ایک باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ شروع ہی سے انہیں مردانہ کھیلوں اور فنِ سپاہ گری کا بہت شوق تھا۔ یہاں تک کہ بچپن میں زیادہ وقت تعلیم کے لئے نہ دے سکے۔ جوانی میں وہ ریاست ٹونک سے وابستہ رہے جہاں کا نواب امیر خان ایک بہادر اور مدبر انسان تھا اور انگریزی استعمار کی مخالفت میں پیش پیش رہتا تھا۔ سید احمد ریاستی فوج اور عوام میں اپنے زہد و تقوے کی بدولت بڑے ہر دلعزیز اور مقبول تھے۔ تاہم وہ جلد ہی ریاستی ملازمت کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی تکمیل کے لئے دہلی چلے گئے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز محدث کے بھائی شاہ عبدالقادر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس زمانے میں بھی انہیں طاعات و عبادات میں قابلِ رشک شہرت حاصل تھی۔ ۱۸۰۷ء میں شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت سلوک کی۔

سید احمدؒ ایک حساس مسلمان تھے وہ اس وقت کے بگڑے ہوئے معاشرے کی حالت کو دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتے، ہندوستان میں اس وقت اسلام کلمہ پڑھنے، اسلامی نام رکھ لینے یا گائے کا گوشت کھانے تک محدود ہو گیا تھا۔ سچی اسلامی رُوح ناپید تھی، ہندوؤں کے رسم و رواج نے اسلامی معاشرے کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ نکاحِ بیوگان کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا۔ ذات پات

اور برادری کے بتوں کی پرستش ہوتی۔ جہالت کی وجہ سے کئی غیر اسلامی عقیدے مسلمانوں میں در آئے تھے اور اسلام کی اصل صورت نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بحالی اور شرعی نظام کا اجرا سید صاحب کا محبوب ترین نصب العین بن گیا۔ وہ اسلامی معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لئے جہاد کو لازم قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں ایک مستقل تنظیم قائم کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ لوگ سید صاحب کے خلوص اور جذبے سے متاثر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ خود شاہ ولی اللہؒ کے خانوادے کے دو ممتاز اور مشہور عالم مولانا شاہ اسمٰعیل (شاہ عبدالعزیزؒ کے بھتیجے) اور (ان کے داماد) مولانا عبدالحئی بھی اُن کے رفیقِ کار بن گئے، کچھ عرصے تک یہ حضرات ہندوستان کے مختلف شہروں میں تبلیغ جہاد اور اصلاح المسلمین کے کام میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے غیر اسلامی رسوم کے خاتمے پر زور دیا۔

۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء کو سید صاحب اپنے چار سو رفیقوں کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے جہاں جاتے تبلیغِ دین کا فریضہ انجام دیتے۔ کلکتہ میں وہ تین ماہ تک مقیم رہے۔ اس عرصے میں لاکھوں مسلمان اُن کے فیضانِ صحبت اور مواعظ حسنہ سے فیض یاب ہوئے، اور وہ سچی اسلامی زندگی گزارنے لگے۔ ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو سرزمینِ حجاز سے واپس وطن پہنچے اور ہمہ تن جہاد کی تیاریوں میں لگ گئے۔

۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو سید صاحب اور اُن کے جان نثار ساتھیوں نے دارالحرب ہند سے ہجرت کی اور اجمیر، سندھ، کوئٹہ، قندہار اور غزنی سے ہوتے ہوئے ۲ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو کابل پہنچے، اپنے قیام کابل کے دوران انہوں نے پوری کوشش کی کہ امیر دوست محمد خان اور اُن کے بھائی باہمی تنازعات ختم کر کے دشمنانِ اسلام کے خلاف متحدہ قوت سے جہاد کریں لیکن ان کی یہ کوششیں بارور نہ ہو سکیں۔ بالآخر ۱۵ یا ۱۶ نومبر کو کابل سے چل کر پانچ چھ دن میں پشاور میں وارد ہوئے پشاور تین دن تک ٹھہرے، پھر چمکنی گئے، جہاں میاں محمد عمر صاحب علیہ الرحمۃ کے خانوادے نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی اور حقِ مہماں داری ادا کیا۔ چمکنی سے سید صاحب نے ہشت نگر (چارسدہ) کا عزم کیا۔ مسلمان عوام جو خود سر حکمرانوں اور سکھ سپاہیوں کے مظالم سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ جوق در جوق سید صاحبؒ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ

"سیرت احمد شہید" کے مؤلف سید ابوالحسن ندوی بیان کرتے ہیں کہ

"آج چمکنی سے کوچ فرما کر دریائے لنڈہ پار کرنے کے بعد چارسدہ (علاقہ ہشت نگر) میں تشریف فرما ہوئے۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر اس مقام کے تمام مرد مور و ملخ کی طرح آپ کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے، اطراف و جوانب سے عورتیں بھی مجتمع ہو گئیں، آپؒ اس وقت اُونٹ پر سوار تھے، اُونٹ کی زین پوش کی جھالر کو عورتوں نے تبرک کے طور پر توڑ لیا، اُونٹ کی دم کے بال تک نوچ لئے۔ اُونٹ کے پیروں کے نیچے کی خاک بھی تبرک سمجھ کر کوئی عورت اپنی آنکھوں سے لگاتی، کوئی منہ پر ملتی تھی۔ کسی نے گھر لے جانے کے لئے وہ خاک اپنے کپڑے میں باندھ لی۔ سب لوگوں نے لے جا کر بستی کے کنارے آپ کا خیمہ نصب کیا اور سب قافلہ وہیں اترا۔" (ص ۳۹۳)

چند روز تک مجاہدین کے اس سرفروش قافلے نے چارسدہ میں قیام کیا اور وہاں کے اہلِ ایمان کو اقامتِ جہاد اور ازالۂ کفر و فساد کی دعوت دی۔ لوگ دھڑا دھڑ مجاہدوں میں نام لکھوا کر شاملِ جہاد ہوتے گئے۔ چارسدہ سے چل کر موضع خوشگی ہوتے ہوئے سید صاحب نوشہرہ کلاں پہنچے اور وہاں چند روز تک قیام کا ارادہ کیا۔ اس اثناء میں خبر ملی کہ سکھوں کا ایک لشکر جو سات ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھا۔ سردار بدھ سنگھ کی کمان میں اکوڑہ خٹک پہنچ گیا ہے۔ سید صاحبؒ کو اُن کے ساتھیوں نے یہی مشورہ دیا کہ سکھ لشکر پر شبخون مارا جائے تاکہ تیاری سے پہلے ہی اُسے دبوچا جا سکے۔ مجاہدین میں سے نو سو افراد کا انتخاب کیا گیا اور اللہ بخش خان مورانوی کو سالار مقرر کیا گیا حالت یہ تھی کہ مجاہدین نوشہرہ کے پاس دریائے کابل (لنڈا) کے شمالی کنارے پر تھے اور سکھ لشکر اکوڑہ میں دریائے کابل کے جنوبی کنارے پر، آدھی رات ہوئی تو مجاہدین نے دریا کو عبور کر کے سکھ لشکر کی فرودگاہ پر دھاوا بول دیا، سکھ لشکر اس اچانک حملے سے حواس باختہ ہو گیا۔ مجاہدینِ تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے، ایک سکھ پہرہ دار نے گھبرا کر بندوق سر کی۔ اس کی گولی مولوی باقر علی عظیم آبادی کو لگی۔ سید صاحب کے جاں بازوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہیں شہادت کا درجہ ملا۔ غازیوں میں سے ایک ایک نے آٹھ آٹھ دس دس دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ عبدالمجید خان آفریدی نے کمزوری کے باوجود چودہ دشمنوں کو ہلاک کیا۔

سکھ فوجیوں کا خیال تھا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن جب انہوں نے روشنی کے گولے چھوڑے تو صرف تھوڑے سے غازی میدانِ جنگ میں باقی تھے۔ باقی لوگ مالِ غنیمت لے کر چل دیئے تھے، چنانچہ بدھ سنگھ نے اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دے دیا۔ پَو پھٹنے تک لڑائی جاری رہی۔ اس معرکے میں ۳۶ ہندوستانی غازی اور ۴۶ قندھاری شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد تیس چالیس سے زیادہ نہ تھی، اس کے مقابلے میں سکھوں کے قریباً سات سو آدمی ہلاکت کو پہنچے۔ مجاہدین کا رعب سکھ لشکر پر اتنا غالب تھا کہ کسی کو ان کے تعاقب کی جرأت نہ ہوئی۔ دشمن کے ایک ہزار گھوڑے اور بہت سا جنگی سامان مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

حضرو کا معرکہ مسلمان اس وقت تک سکھوں کی منظم قوت سے دبے ہوئے تھے۔ اس کامیابی نے اس کا احساسِ کمتری رفع کر دیا اور وہ دھڑا دھڑ لشکر مجاہدین میں شامل ہونے لگے، سید صاحب نوشہرہ سے چل کر ہنڈ کے مقام پر پہنچے، ہنڈ کے رئیس خادی خان نے مجاہدین کا والہانہ استقبال کیا اور سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔

اس عرصے میں خبر ملی کہ سکھوں کا بہت بڑا لشکر دریائے سندھ سے مشرق میں حضرو کے نواح میں جمع ہو رہا ہے۔ چنانچہ کچھ مجاہدین نے راتوں رات دریائے سندھ کو عبور کر کے حضرو پر شبخون مارا۔ حضرو اس علاقے کی سب سے بڑی اور مالدار تجارتی منڈی تھی، مجاہدین کو اس چھاپے میں بھی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی۔ انہوں نے بہت سے دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ بہت سوں کو گرفتار کر لیا اور اتنا مالِ غنیمت ہاتھ لگا جس کا اندازہ لاکھوں روپے تک پہنچتا ہے، بدھ سنگھ کے لشکر نے دو بار مسلمان غازیوں کا جوش و خروش اور جذبۂ جہاد دیکھا تو مرعوب ہو کر رہ گیا۔

اب تک مجاہدین کا لشکر بے ترتیب اور غیر منظم حالت میں تھا۔ اس میں نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ مالِ غنیمت بھی شرعی طریقے کے مطابق تقسیم نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے ایک امام جہاد کا تقرر ضروری تھا تاکہ جہاد کی سب کارروائیاں شرعی اور مسنون طریقے پر انجام پا سکیں، چنانچہ علماء و مشائخ، سادات کرام، رؤسائے علاقہ اور عوام الناس کا ایک بہت بڑا اجتماع منعقد ہوا جس میں حضرت سید احمد کو امام منتخب کر لیا گیا —— ۱۲ جمادی الآخر ۱۲۴۲ ھجری مطابق ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو تمام لوگوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی اور جمعہ کا خطبہ بھی انہی کے نام پر پڑھا

سید صاحب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پشاور کے بارکزئی سردار یار محمد خان، سلطان محمد خان، سید محمد خان اور پیر محمد خان نے بھی عریضہ بھیج کر سید صاحب پہ کامل اعتماد کا اظہار کیا اور بیعت کی درخواست کی۔ چنانچہ یار محمد خان اور سلطان محمد خان نے حاضر ہو کر باقاعدہ طور پہ بیعت امامت کی اور سید صاحب کے ارادت مندوں میں شمولیت کا اعلان کیا، تاہم سرحدی خوانین ارباب بہرام خان، خان خادی خان، اشرف خان، فتح خان اور سعادت خان سبھی جانتے تھے کہ یار محمد خان نے محض دنیا داری کی بات کی ہے اور اس کی بیعت اور اطاعت محض دکھاوے کی ہے، چنانچہ بعد میں ایسا ہی ثابت ہوا۔

بیعتِ امامت کے بعد کم و بیش دو مہینوں میں اسّی ہزار سرحدی جانباز سید صاحب کے پرچم جہاد کے نیچے جمع ہو گئے، سردارانِ پشاور کا لشکر اس کے علاوہ تھا جو ۲۰ ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ اور اس کے پاس آٹھ توپیں بھی تھیں۔ اس وقت تک سردارانِ پشاور بظاہر سید صاحب کے ساتھ تھے۔

اکوڑہ اور حضرو کے معرکوں کے بعد سکھ فوج کو مزید کمک پہنچ چکی تھی۔ اب بدھ سنگھ کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی تعداد ۳۵ ہزار سے ہرگز کم نہ تھی، اس کے پاس جنگی ساز و سامان کی بھی کمی نہ تھی، نئی فوج راجا سوچیت سنگھ اور راجا گلاب سنگھ جیسے آزمودہ کار جرنیلوں کی کمان میں تھی۔

یار محمد خان اپنے لشکر اور توپ خانہ کے ہمراہ دریائے کابل کے دائیں کنارے پر مقیم تھا، وہ سید صاحب کا اعتماد حاصل کرنے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ اُن کے لئے کھانا بھی شاہی باورچی خانے سے بھیجتا تھا۔ جس دن شیدو کی جنگ ہونی تھی، اس رات کو کھانا کھاتے ہی سید صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ اُن پر بے ہوشی طاری ہو گئی، یہاں تک کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ میدانِ جنگ کو روانہ ہوئے۔ مسلمان سرداروں نے حملہ کیا اور بہت سے سکھوں کو ہلاک کر دیا۔ زیادہ تر سکھ سپاہی مارے گئے اور مسلمانوں کی فتح یقینی نظر آنے لگی۔ اس دوران یار محمد خان چُپ چاپ کھڑا رہا۔ بعد میں ایک دم "شکست، شکست" کے آوازے بلند کرتے ہوئے وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے خفیہ طور پر سکھوں سے ساز باز کر رکھی تھی۔

سکھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اپنی کامیابی کی صورت میں وہ صوبہ سرحد کی حکومت یار محمد خان کے حوالے کردیں گے اور خود اٹک سے اس پار چلے جائیں گے۔

انگریز مؤرخ میسن (MASON) لکھتا ہے کہ "جب یار محمد خان نے دیکھا کہ سید احمد بریلوی حاکمانہ حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں تو اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے اور اس نے سکھوں سے نامہ وپیام شروع کردیا تھا۔" دیوان امر ناتھ جنگ شیدو کے مقتول غازیوں کی تعداد چھ ہزار بتاتا ہے۔ غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ "یہ پاک اور قیمتی خون صرف یار محمد خان کی خیانت کی بھینٹ چڑھ گیا۔"

چونکہ سید صاحب کو زہر دیا گیا تھا، اس لئے انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ بونیر اور سوات کی طرف چلے گئے اور چنگلئی، کوگا، تختہ بند، بری کوٹ، اوچ اور دوسری جگہوں میں قیام کیا۔ جہاں بھی وہ گئے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، مسلمان سلاطین، فرمانرواؤں اور رئیسوں کے نام خط لکھ کر ان کی اسلامی حمیت کو بیدار کیا، لوگوں کو دین کی باتیں بتانے کے لئے داعیانِ اسلام کا تقرر کیا۔ اسی دوران انہوں نے مسلمانانِ ہزارہ کی مدد کے لئے، جو سکھ سرداروں سے تنگ آچکے تھے۔ عملی اقدام کئے۔ مختلف مقاماتِ ہزارہ میں سکھوں سے پنجہ آزمائی کی۔ ڈمگلہ شنکیاری میں سکھ فوجیوں پہ شب خون مارا، اس اثناء میں ہندوستان سے غازیوں کے مزید قافلے بھی ان سے آن ملے۔ جنگ شیدو کے بعد سردارانِ پشاور اعلانیہ سید صاحب اور مجاہدین کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے ایک لشکر اس غرض سے جمع کر رکھا تھا کہ سید صاحب کو صوبہ سرحد سے نکال باہر کیا جائے۔ اس غرض سے بارک زئی سردار ایک لشکر لے کر اُتمان زئی (ہشتنگر) پہنچ چکے تھے، سید صاحب نہیں چاہتے تھے کہ اپنے ہی ہم مذہبوں سے الجھ کر اپنی قوت کھو بیٹھیں، تاہم ان کے اکثر رفقائے کار اور سرکردہ علمائے سرحد نے فیصلہ دیا کہ بارکزئی برادران کی فتنہ پردازیوں کا قلع قمع ناگزیر ہے۔ مئی ۱۸۲۸ء میں اتمان زئی کے مقام پہ بارک زئی لشکر اور مجاہدینِ اسلام میں زبردست مقابلہ ہوا جس میں مجاہدین سرخرو اور کامیاب رہے۔ اس کے باوجود بارک زئی سردار راہِ راست پہ نہ آئے بلکہ انہوں نے اور کئی خوانین کو بھی مجاہدین سے برگشتہ کردیا۔ ہنڈ میں خادی خان اور مجاہدین کی جھڑپ میں خان خادی خان مارا گیا۔ بعد میں زیدہ کے

مقام پر ایک اور جھڑپ میں یار محمد خان اور اس کے تین سو ساتھی مارے گئے جس سے کچھ عرصہ کے لئے وہ دب گئے تاہم اندر ہی اندر انہوں نے اپنی ریشہ دوانیاں جاری رکھیں۔ اس دوران مجاہدین نے مسلمانانِ ہزارہ کی خاطر تربیلہ اور دوسرے مقامات پر سکھوں پر شبخون مار کر ان کا رعب ختم کر دیا سکھ ایک طرف مجاہدین کے سامنے آتے ہوئے گھبراتے وہیں مسلمان رئیسوں اور سرداروں کو ترغیب اور تحریص دے کر اپنے ساتھ ملانے میں کوشاں رہتے۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جہاں اپنی فوجی تیاریاں جاری رکھیں اور کنور شیر سنگھ، جنرل ایلارڈ اور جنرل وینٹورہ کی سرکردگی میں بہت بڑا لشکر سرحد کو بھیجا وہیں ایک سفارتی وفد سید صاحب کی خدمت میں بھیجا، جو اس وقت امب میں مقیم تھے۔ اور سردار وزیر سنگھ اور فقیر عزیز الدین کے ذریعے یہ پیغام بھیجا کہ مہاراجہ دریائے سندھ کا تمام مغربی علاقہ سید صاحب کے حوالے کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ اسی پر قناعت کی جائے اور دریا کے مشرقی اور جنوبی کناروں پر حملے ترک کر دیئے جائیں۔ جواب میں سید صاحب نے بھی مولانا خیر الدین شیر کوٹی اور حاجی بہادر شاہ خان کو سفیر صلح بنا کر جنرل وینٹورا اور شہزادہ شیر سنگھ کے پاس بھیجا لیکن بات چیت کسی فیصلہ کن مرحلے تک نہ پہنچ سکی۔

مجاہدین محض اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر صوبہ سرحد میں وارد ہوئے تھے۔ انہوں نے بار بار اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کا مقصد صرف سکھ راج سے اہلِ اسلام کو نجات دلانا ہے لیکن یہاں آکر انہیں دُہری بلکہ تہری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر مجاہدین کا مقابلہ صرف سکھوں سے ہوتا تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتے لیکن ان دنوں صوبہ سرحد میں دو عملی بلکہ سہ عملی مچی ہوئی تھی۔ سکھ اپنے آپ کو صوبہ سرحد کا بلا شرکت غیرے مالک اور حاکم سمجھتے تھے جبکہ بارکزئی سردار بزعم خود اس علاقے کو اپنی جاگیر سمجھے بیٹھے تھے۔ پھر ان دنوں کسی مضبوط حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہر علاقے کے خان خوانین خود مختار حکمران بنے بیٹھے تھے، وہ نہ سکھوں کو مالیہ ادا کرتے تھے نہ بارکزئی سرداروں کو، اگر ان میں سے کسی کا لشکر آکر بزور ان سے واجبات وصول کر لیتا تو اور بات تھی ورنہ کوئی ان سے اپنی بات منوانے والا نہ تھا۔ سید احمد بریلوی کو ان تینوں محاذوں پر لڑنا پڑا۔ سکھوں نے بارکزئی سرداروں کی پیٹھ ٹھونکی، ان کو ہر ممکن امداد دینے کا یقین دلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود تو کچھ عرصے کے لئے تماشائی بن کر بیٹھ گئے اور مسلمانوں

ہی کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے خلاف رزم آرا رہے ہیں۔

پھر مجاہدین کے سامنے اصل مقصد صرف دنیوی حکومت کا حصول نہ تھا بلکہ ان کا مقصود حقیقی شرعِ محمدی کا نفاذ تھا۔ اس سلسلے میں جب سید احمد بریلوی نے اپنے قاضیانِ شرع اور عاملوں کے ذریعے عُشر کی وصولی کا کام شروع کیا اور لوگوں کو غیر اسلامی رسوم ترک کرنے پر مجبور کیا تو اکثر خان خوانین بھی ان سختیوں کی تاب نہ لاکر دل ہی دل میں مجاہدین کی مخالفت پر اتر آئے مردان کا علاقہ وادیٔ پشاور کا زرخیز ترین علاقہ تھا۔ جب مردان کے دیہات میں نفاذِ شریعت کا آغاز ہوا اور علماء کا ایک وفد علاقے کے سرکردہ رئیس نواب احمد خان کمال زئی کے پاس بھیجا گیا تو وہ ملاقات پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ مردان کا نظم و نسق اپنے بھائی رسول خان کے سپرد کر کے خود پشاور چلے گئے تاکہ بارک زئی سردار سلطان محمد خان کی فوجی مدد سے مجاہدین کا مقابلہ کر سکیں۔

اب مجاہدین کے لئے مردان پر فوری حملے کے بغیر چارۂ کار نہ رہا۔ انہوں نے قاضی سید محمد جبان اور مولوی مظہر علی کی قیادت میں ایک لشکر مردان بھیجا۔ اہلِ مردان نے زبردست مقابلہ کیا۔ مجاہدین میں سے قاضی سید محمد جبان اور بہت سے دوسرے لوگ شہید ہوئے تاہم انہیں مردان پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا۔

جنگِ مردان کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ نواب ہوتی خان احمد خان کمال زئی، بارک زئی سرداروں سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ سلطان محمد خان، اس کے بھائیوں سید محمد خان اور پیر محمد خان نے نیز اس کے بھتیجے حبیب اللہ خان (پسر عظیم خان) نے متفقہ طور پر ایک بہت بڑا لشکر فراہم کیا اور نواب احمد خان ہوتی کی مدد کے لئے مردان پہنچ گئے۔

سید احمد ان دنوں پنجتار میں مقیم تھے، انہوں نے خان فتح خان پنجتاری، حاجی بہادر شاہ خان اور دوسرے مقربوں سے مشورہ کیا اور ایک نہایت درد بھرا خط سلطان محمد خان کو لکھ کر اُسے یقین دلایا کہ مجاہدین کا مقصد مسلمانوں سے اُلجھنا ہرگز نہیں، یار محمد خان ہم پر خود حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی موت کی ذمہ داری مجاہدین پر عائد نہیں ہوتی۔ سلطان محمد خان پر اس خط کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ لڑائی کے ارادے سے برابر آگے بڑھتا رہا۔

مجاہدین کا جیش اس وقت طور و پہنچ چکا تھا۔ جب بارک زئی لشکر مردان سے طور و کی طرف

بڑھا تو مجاہدین نے بھی دریائے کنہار کو پار کر کے موضع مایار میں مورچے بنا لئے۔ سید ہاشمی فرید آبادی کے نزدیک زمانۂ جہاد کا سب سے فیصلہ کن معرکہ مایار ہی کا معرکہ تھا، یہ معرکہ ۱۸۳۰ء میں پیش آیا۔ بارک زئی لشکر کو توپ خانے کی امداد بھی حاصل تھی۔ انہوں نے سارے پشاور، ہشت نگر اور مردان سے لڑاکا لوگ جمع کر رکھے تھے۔ جب کہ مجاہدین غریب الوطن اور بے سہارا لوگ تھے۔ درانی سواروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ حملہ کرتے تو مجاہدین کو بار بار پیچھے ہٹنا پڑتا۔ درانی لشکر کے مختلف دستے پے در پے حملے کرتے رہے، بہت سے مجاہدین مارے گئے۔ خود شاہ اسمٰعیل بھی زخمی ہوئے۔ کئی گھنٹوں تک قیامت خیز رن پڑا ـــــ تاہم اس زبردست معرکے میں بھی مجاہدین کا پلہ بھاری رہا اور بارک زئی سردار اور ان کے حلیف پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ اس دن ۲۸ غازی لڑائی میں کام آئے جب کہ درانی لشکریوں کی اسی لاشیں شمار کی گئیں۔ سب مقتولوں کو طور ڈھیر میں دفن کر دیا گیا۔

بارک زئی سرداروں پر اس معرکے کے بعد بددلی اور مایوسی چھا گئی۔ کسی جگہ بھی انہیں ٹھہرنے اور مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی ـــــ مجاہدین پیش قدمی کرتے ہوئے مردان، چارسدہ، تنگی اور شبقدر ہوتے ہوئے مچنی پہنچے، درانی لشکر جاتے ہوئے دریائے کابل پر کشتیوں کے تمام پل توڑ گیا تھا۔ مچنی سے ناگمان کو کشتیوں سے عبور کیا گیا۔ خدشہ تھا کہ دریا کے جنوبی کنارے پر سردارانِ پشاور پھر جنگ چھیڑیں گے لیکن انہیں ایسا کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ دریا پار کرنے کے بعد سید احمدؒ اور ان کے ساتھیوں نے موضع ریگی میں قیام کیا جو ارباب بہرام خان کی قوم (خلیل) کی ملکیت تھا، ارباب جمعہ خان (برادر ارباب بہرام خان) وہاں استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے امیر المجاہدین کو خبر دی کہ بارک زئی سرداروں نے اپنے اہل و عیال کو کوہاٹ بھیج دیا ہے اور خود بھی پشاور کو خالی کر کے پہاڑوں میں روپوش ہو چکے ہیں، ریگی پہنچنے کے دوسرے تیسرے دن ہزارخوانی پشاور کا خان فیض اللہ خان مہمند (جو سید صاحب کا ارادت مند تھا) سلطان محمد خان بارک زئی کی جانب سے صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا۔ اس روز کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور ارباب فیض اللہ خان واپس چلا گیا دوسرے روز غازی تہکال پہنچے تو دوبارہ ارباب فیض اللہ خان صلح کی شرائط طے کرنے آن پہنچا اس پر سید صاحب نے فرمایا:۔

"جائیے! میں نے ملک اُسے دے دیا، شرط یہ ہے کہ وہ اپنے سابقہ افعال سے خلوص کے ساتھ توبہ کرے، غیر مسلموں کی اعانت سے دست کش ہو جائے اور جب غیر مسلموں سے مقابلے کی نوبت آئے تو جان و مال اور لشکر سے ہمارا ساتھ دے"۔

بتایا جاتا ہے کہ سلطان محمد خان نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے سید احمد کا باجگذار بننا منظور کر لیا تھا۔ تاہم وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجاہدین پشاور میں داخل ہوں۔ اسے خدشہ تھا کہ ایک بار مجاہدین پشاور میں داخل ہو گئے تو پھر انہیں شہر سے کون نکالے گا۔ اس پر سید صاحب نے اسے یقین دلایا کہ وہ چند دن کے لئے بطورِ مہمان پشاور جائیں گے، چنانچہ تہکال میں تین دن ٹھہرنے کے بعد مجاہدین کا فاتحانہ لشکر ظہر کی نماز کے بعد پشاور شہر میں داخل ہوا۔ پیادے سب سے آگے آگے تھے اور سوار سب سے پیچھے۔ سید صاحب پیادوں کے ساتھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار تھے، ہر جماعت کے ساتھ اس کا نشان تھا۔ روانگی سے پیشتر سید صاحب نے انتہائی عاجزی سے دعا مانگی اور اپنی کامیابی پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا۔ عصر اور مغرب کی نمازیں راستہ میں ادا ہوئیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد سید صاحب کا لشکر کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہوا اور قصہ خوانی اور بازار کلاں سے ہوتا ہوا گورکھٹڑی (تحصیل) پر ختم ہوا۔ اس عمارت کے ایک دالان میں سید صاحب کو ٹھہرایا گیا، دوسرے کمروں میں شاہ اسمٰعیلؒ، ارباب بہرام خان، خان فتح خان (پنجتاری) خان فتح خان (زیدہ) ابراہیم خان (کھلابٹ) منصور خان (چارگلئی) اسمٰعیل خان (اسمٰعیلہ) مشکار خان اور انند خان (شیوہ) سردار خان (امازئی) اور دوسرے سرداروں کو ٹھہرایا گیا۔ مجاہدین کو اس شام بھوکا رہنا پڑا لیکن کسی نے حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ دوسرے دن ارباب بہرام خان خلیل نے خوراک کا بندوبست کرا دیا۔ قیامِ پشاور کے دوران سردار سلطان محمد خان اور ارباب فیض اللہ خان نے سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی ضیافت کا اہتمام بھی کیا۔

جب پشاور کی حکومت بارک زئی سرداروں کے حوالے کرنے کا سوال پیش ہوا تو سید صاحب کے کئی رفقاء نے اس کی مخالفت کی، اپنے تجربے کی بناء پر وہ جانتے تھے کہ بارکزئی سردار جب اپنے بھائیوں کے ساتھ مخلص نہیں تو کسی اور کے وفادار کب ہوں گے؟ انہیں خدشہ تھا کہ اپنا مطلب نکالنے کے لئے سلطان محمد خان اور اس کے بھائی ہر طرح کا وعدہ کر لیں گے لیکن اُن سے ایفائے عہد

ہو نہیں سکے گا۔

ایک روایت ہے کہ کسی اور شخص کی وساطت سے ارباب بہرام خان (تہکال بالا) نے سید صاحب سے درخواست کی تھی کہ اگر صوبہ سرحد کا علاقہ کسی کو دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں :-

۱۔ میں اس کی حفاظت کروں گا، سردار لشکر لے کر آئے تو ان کا مقابلہ کروں گا، میری قوم خاصی بڑی ہے اس کی امداد میرے لئے کافی ہوگی۔

۲۔ چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہم رکاب رہوں گا، ان کا سارا خرچ میرے ذمہ ہوگا۔

۳۔ میں اس اعزاز کو دینی خدمت کا ذریعہ بناؤں گا نہ کہ دنیاوی عیش کا۔

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ارباب بہرام خانؒ مقامی سیاست اور معاشرت سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اس لئے پشاور کی حکومت چلانا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ تاہم سید صاحب ان شرائط کو سن کر مسکرا دیئے اور کہا کہ "ہمارے اور ارباب کے درمیان قطعاً مغائرت نہیں۔ ملک کو ارباب صاحب کے حوالے کرنے کا مطلب البتہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس پر ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا۔" اکثر مورخوں کا کہنا ہے کہ سید صاحب کا مقصد یہ تھا کہ صوبہ سرحد سے فراغت پانے کے بعد وہ ہمہ تن تسخیر پنجاب کی طرف متوجہ ہوں، اس لئے انہوں نے پشاور کی حکومت اپنے پاس رکھنی گوارا نہ کی۔ اس کے برعکس دوسرے دانش ور اور اہلِ فکر پشاور کو دوبارہ سلطان محمد خان کے حوالے کرنے کے فیصلے پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سید صاحب کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی کہ وہ پھر سردارانِ پشاور پر اعتماد کرنے لگے۔

بہرحال سید صاحب نے سردار سلطان محمد خان کے وعدے کو ایک تو یہ گا مسلمان کا وعدہ سمجھتے ہوئے اس پر اعتماد کیا اور پشاور کی حکومت بدستور سلطان محمد خان کے خاندان کے پاس رہی۔

سید صاحب نے موضع ہزار خوانی میں سردار سلطان محمد خان سے ملاقات بھی کی، اس ملاقات میں سید صاحب کے ہمراہ ارباب بہرام خانؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ تھے جبکہ سلطان محمد خان کے ہمراہ ارباب فیض اللہ خان اور مردان علی آئے تھے۔

اپنے قیام پشاور کے دوران سید صاحب نے نمازِ جمعہ شہر کی تاریخی مسجد مہابت خان میں ادا کیا۔ مولوی مظہر علی عظیم آبادی نے خطبہ دیا اور سورۂ صف کی تفسیر بیان کی، اہلِ پشاور نے ان کا وعظ

بہت پسند کیا چنانچہ بعد میں قاضی شہر کے تقرر کا مسئلہ سامنے آیا تو لوگوں کی اکثریت نے مولوی مظہر علی کے تقرر کی حمایت کی۔

قیامِ پشاور کے دوران خٹک سردار خواص خان اپنے پانچسو مجاہدوں کے ساتھ آیا اور بتایا کہ سکھ قوم نے ہمارے علاقہ پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ اگر علاقہ خٹک مجھے جاگیر کے طور دے دیا جائے تو میں سکھوں کے روکنے کا ذمہ لیتا ہوں ـــــ سید صاحب نے اس کے مطالبہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

مختصر سے قیام کے بعد سید احمد اور ان کے ساتھی عازمِ پنجتار ہو گئے، راہ میں حضرت شیخ عمرؓ کے اہلِ خاندان نے ان کی ضیافت کی، چمکنی سے روانہ ہو کر دریائے کابل کو کشتیوں کے ذریعے عبور کر کے سید صاحب چارسدہ پہنچ گئے۔

سید صاحب اور مجاہدین کے پشاور سے رخصت ہوتے ہی سردارانِ پشاور پھر کھل کھیلنے لگے انہوں نے "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" کے مصداق سید صاحب کی مذہبی تحریک کا مقابلہ مذہبی رنگ میں کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے حامی علماء سے فتوے حاصل کر لئے کہ سید صاحب اور ان کے ساتھی بدعقیدگی پھیلا رہے ہیں اور دین کے پردے میں دنیوی اغراض پوری کرنے کے خواہاں ہیں۔ دنیادار سرداروں نے ارباب فیض اللہ خان کی نصیحتوں پر بھی کان نہ دھرے حالانکہ اسی شخص نے سلطان محمد خان کو حکومت اور اقتدار سید صاحب سے واپس دلایا تھا، اسے محسن کشی کہا جائے یا سیاسی مصلحت"۔ بہرحال یہ کوئی اچھا اقدام نہ تھا ـــــ ارباب فیض اللہ خان کے قتل کے بعد سلطان محمد خان نے ایک روز مولانا مظہر علی کو مشورے کے بہانے سے بلایا وہ کمرے میں داخل ہوئے تو کئی تلواریں ان پر ٹوٹ پڑیں اور وہ بے جان ہو کر گر پڑے ـــــ بعد ازاں ایک دن مقرر کیا گیا اور جہاں کہیں بھی جماعت مجاہدین کا کوئی فرد نظر آیا قتل کر دیا گیا۔

سید صاحب ان دنوں پنجتار میں مقیم تھے، انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ بچے کھچے غازیوں کو لے کر ہزارہ کی طرف نکل جائیں، چنانچہ دریائے سندھ کو پار کر کے وہ پکھلی پہنچ گئے۔ سید صاحب اور ان کے غازیوں کا دادئ پشاور سے نکلنا تھا کہ سکھوں نے پھر سنبھالا لیا۔ انہیں اگر ڈر تھا تو مجاہدین کا ـــــ اس ڈر کے دور ہوتے ہی انہوں نے اہلِ پشاور پر جو ظلم ہو سکتا تھا ڈھایا، سکھ ہزارہ

کے مختلف علاقوں پر چڑھ دوڑے، دیہات کو لوٹا اور مال مویشی لے کر اپنی راہ لی۔

۶ مارچ ۱۸۳۱ء کو سید صاحب راج دواری کے گاؤں سے روانہ ہو کر شارکول پہنچے، جہاں ارباب بہرام خان مقیم تھے۔ ۸ مارچ کو سچوں پہنچے، یہیں پر کاغان کی ایک سرکردہ شخصیت سید رضا شاہ، سید صاحب کی زیارت کے لئے آیا اور ان کے ارادت مندوں میں شامل ہو گیا۔ جب سکھوں کو پتہ چلا کہ سید صاحب اور اُن کے غازی ہزارہ کو چلے گئے ہیں تو انہوں نے شہزادہ شیر سنگھ کی ماتحتی میں ایک بہت بڑا لشکر گرمھی حبیب اللہ کی جانب روانہ کیا۔ سید صاحب نے کچھ ساتھی اس لشکر کا پتہ چلانے کے لئے بھیجے، ۱۷ اپریل ۱۸۳۱ء (اتوار) کو سید صاحب سچوں سے بالاکوٹ روانہ ہوئے۔ یہ اُن کے سفرِ جہاد بلکہ سفرِ حیات کی آخری منزل تھی ـــــ بالاکوٹ میں سید صاحب کا قیام ایک مسجد میں تھا۔ اُن کے ساتھ اب بہت تھوڑے لوگ رہ گئے تھے۔ تاہم وہ اللہ تعالےٰ کی رضا پر راضی اپنا آخری فرض ادا کرنے پر تلے ہوئے تھے ـــــ ایک بیان کے مطابق غازیوں کی کل تعداد تین سو سے زائد نہ تھی۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کی قیامت خیز صبح کو مٹی کوٹ سے اتر کر سکھ لشکر بالاکوٹ پر ٹوٹ پڑا ـــــ گھروں کو آگ لگا دی اور جو شخص سامنے آیا اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجاہدین نے پوری طاقت سے سکھ لشکر کا مقابلہ کیا۔ دو تین بار سکھ رجمنٹوں کو پیچھے ہٹایا۔ لیکن مجاہدوں کے مقابلے میں سکھ لشکر کی تعداد پچاس گنا زیادہ تھی۔ وہ تھے بھی اونچے مقام پر۔ دیر تک تلواریں چلتی رہیں اور بندوقیں آگ اگلتی رہیں۔ جب دشمن بہت قریب آ پہنچا تو سید صاحب اور ان کے ساتھی تکبیر کے نعرے لگاتے اور تلواریں لہراتے سکھوں پر ٹوٹ پڑے اور انتہائی دادِ شجاعت دیتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ سید احمد شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل کی آخری آرام گاہیں اب بھی بالاکوٹ میں موجود ہیں۔

اُن کے لہو نے پھول کھلائے چمن چمن

سید احمد بریلویؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے سرفروش ساتھیوں نے غلبۂ اسلام کی خاطر جس جدوجہد کا آغاز کیا تھا اس کے نتائج نہایت دور رس تھے۔ صدیوں سے مسلمانوں نے جہاد کا فریضہ پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ سید احمد کی تحریک اور اُن کی شہادت نے برِصغیر میں بیداری کی لہر دوڑا دی، مسلمان

اللہ کی راہ میں جان دینے کو عین سعادت سمجھنے لگے۔ ملک کے طول و عرض میں مسلمان اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے ـــــ رنجیت سنگھ کی تلوار نے مجاہدین کی جسمانی زندگی ختم کر دی لیکن اس روحِ جہاد کو ختم نہ کر سکی جس کی طرح ان سرفروشوں نے ڈالی تھی۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مدتِ دراز تک لوگ جہاد کی نیت سے صوبہ سرحد پہنچتے رہے کم از کم ۱۸۶۴ء تک اس سلسلے میں کوئی فرق نہ آیا ـــــ مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں بہنے والے اسلامی خون نے سکھ سلطنت کی بنیاد ہلا کر رکھ دی، واقعہ شہادت کے پندرہ سال بعد سکھا شاہی کا چراغ گل ہو گیا لیکن مجاہدین کی جد و جہد پھر بھی جاری رہی، فرق صرف اتنا ہوا کہ اب مجاہدین کی بندوقوں کا رُخ سکھ غاصبوں کی بجائے انگریز استعمار پسندوں کی طرف پھر گیا۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور مولانا عنایت علی عظیم آبادی نے جہاد کا علم بلند کئے رکھا، مولانا ولایت علی عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک رئیس اور صاحبِ علم و فضل خاندان کے چشم و چراغ تھے، اسی خاندان کے ارکان اور ان کے وابستگان کی تبلیغی کوششوں سے تحریکِ مجاہدین میں جان پڑی، مالی امداد کے علاوہ تحریک کے رنگروٹ کار بھیجے جاتے رہے، ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر اپنی تصنیف "ہندوستانی مسلمان" میں تسلیم کرتا ہے کہ "۱۸۳۰ء میں جب مجاہدینِ سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو تیطو میاں (نثار خان) بنگال میں اس قدر بے دھڑک ہو گیا کہ اس نے اپنی مذہبی اصلاح کی) نقاب اتار پھینکی اور ان معمولی معمولی سختیوں کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے وہ کسانوں کی پُرجوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا"۔ دیکھا جائے تو بنگال میں کسانوں کی جد و جہد اور فرائضی تحریک اصل میں تحریک مجاہدین ہی کا تتمہ تھے، ہنٹر کا کہنا ہے کہ اپنے افلاس کے باوجود ہندوستان بھر کے مسلمان مجاہدین کی امداد کو ایک دینی فریضہ سمجھنے لگے تھے۔ حالت یہ تھی کہ ہر مسلمان گھرانے میں ایک برتن رکھا رہتا تھا۔ جب کھانا پکانے کے لئے آٹا گوندھا جاتا تو ایک دو مٹھی آٹا اس برتن میں ڈال دیا جاتا پھر یہ جمع کیا ہوا آٹا بیچ کر اس کی رقم مجاہدین کو ارسال کر دی جاتی، یہ تو عام مسلمانوں کا حال تھا، آسودہ حال اور متمول مسلمان سونا چاندی اور اشرفیاں راہِ خدا میں لٹانے لگے، یہاں تک کہ مسلمان عورتیں اپنا زیور جہاد فی سبیل اللہ کے علمبرداروں کی نذر کر دیتیں، بچے اپنا جیب خرچ مجاہدین کے فنڈ میں پیش کرتے۔

دہلی کے شاہ نصیر الدین اور ان کا خانوادہ مجاہدین کی امداد پر ہمیشہ کمربستہ نظر آتا۔ ۱۸۳۹ء میں اُن کی وفات کے ساتھ تحریکِ جہاد کا ایک دَور ختم ہوا تو شاہ محمد اسحٰق نے اُن کی جگہ سنبھال لی۔ پندرہ سال تک مسلسل تحریکِ مجاہدین میں سرگرم حصّہ لینے کے بعد جب بظاہر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو دل برداشتہ ہو کر شاہ صاحب اپنے اہلِ خاندان سمیت دارالحرب ہند سے ہجرت کر کے مستقلاً مکّہ معظمہ کو نقل مکانی کر گئے۔ شاہ محمد اسحاق اور ان کے بھائی شاہ محمد یعقوب اپنی پوری زندگیاں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر چکے تھے اور انہی قربانیوں کے پیشِ نظر "دستارِ خلافت" کے حقدار قرار پائے تھے۔

سیّد احمد شہید کی رحلت کے بعد مجاہدین کو جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس سے عہدہ برآ ہونا مولانا ولایت علی عظیم آبادی جیسے کوہ استقلال ہی کا کام تھا، شاہ صاحب فطرتاً معلّم اور مبلّغ اور اعتدال پسند انسان تھے۔ وہ بلاوجہ کشت وخون کے حق میں نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ زور تزکیۂ نفس پر دیتے اور عوام کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے میں زیادہ وقت گزارتے۔ تاہم جماعت مجاہدین کا انتہا پسند طبقہ "قتال" کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس طبقے کے ترجمان مولانا ولایت علی کے بھائی مولانا عنایت علی تھے، مولانا عنایت علی نے تحریک کا کاروبار سنبھالا تو انگریز صوبہ سرحد میں قدم جما چکے تھے۔ انہوں نے ان دخیل کاروں سے ملک کو چھڑانے کی پُرزور مہم چلائی اور چنبئی (صوبہ سرحد) کے مقام پر انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا ـــــ ۱۸۶۳ء میں جہاد امبیلہ کے وقت مولوی محمد عبداللہ امیر المجاہدین تھے۔ یہ مجاہدین ہی کی تبلیغ واشاعتِ دین کا نتیجہ تھا کہ صوبہ سرحد کے سارے قبائل نے متفقہ طور پر فرنگی حکمرانوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور ان سامراجیوں پر وقتاً فوقتاً کاری ضربیں لگائیں۔ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے میں مجاہدین کی سرگرمیاں کسی نہ کسی رنگ میں قیامِ پاکستان تک جاری رہیں، انہوں نے ہر اُس تحریک کا ساتھ دیا جو برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنی قومی آزادی اور احیائے دین کے لئے منظم کی۔ مجاہدین کی ان کوششوں کا ذکر آئندہ صفحات میں مناسب موقعوں پر آئے گا۔

۱۸۳۱ء کے حادثۂ بالاکوٹ کے بعد جو مجاہدین زندہ بچے، ان کی امداد واعانت میں صوبہ سرحد کے دو اکابر نے شاندار کردار انجام دیئے۔ ان میں سے ایک تو کاغان کے سیّد ضامن شاہ

تھے جنہوں نے اس مشکل وقت میں ان بے گھر لوگوں کو پناہ دی اور ہر طرح ان کی خاطر مدارت کی۔ دوسرا گھرانا جس نے مجاہدین کی جانی اور مالی امداد میں کوئی دریغ نہ کیا، سادات ستھانہ کا گھرانا تھا۔ سادات ستھانہ سید علی ترمذی المعروف پیر بابا علیہ الرحمۃ کی اولاد ہونے کی وجہ سے سارے صوبہ سرحد میں بڑی قدر و منزلت کے مالک ہیں۔

پیر بابا کا روضہ بونیر میں ہے۔ ہر دور میں اس خاندان میں عظیم شخصیتوں نے جنم لیا۔ سید جمال الدین افغانی جیسا انقلابی رہنما بھی اسی گھرانے کا ایک فرد تھا۔ یہ گھرانا جہاں اپنے زہد و اتقا اور علم و فضل کی وجہ سے مشہور ہے وہیں ان کی قومی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص سید اکبر شاہ نے ۱۸۲۳ء میں یوسف زئی قبائل کے متحدہ لشکر کے ہمراہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زبردست اور تربیت یافتہ فوج کو جو نقصان پہنچایا، اس سے اسلام دشمن طاقتوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، یوسف زئی اور خٹک سرفروشوں کی یہ قربانی تاریخ صوبہ سرحد کا ایک روشن باب ہے اور اگر اس مرحلے پر بارکزئی سردار یار محمد خان ثابت قدم رہتا تو مسلمانوں کی فتح یقینی تھی مجاہدین صوبہ سرحد کی کمان اس وقت بطلِ حریت سید اکبر شاہ اور اُن کے عزیز و اقارب تحریکِ مجاہدین کا پورا ساتھ دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس خانوادہ کے ایک رُکن سید عمر شاہ تحریک مجاہدین کے خزانچی کے عہدے پر فائز رہے۔

بارک زئی سرداروں کی ناعاقبت اندیشی اور باہمی نفاق اور خانہ جنگی کی بدولت صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور سکھوں اور انگریزوں کی جانب سے علاقے کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوا تو اخون صاحب سوات علیہ الرحمۃ اور دوسرے سرکردہ قبائل زعما کی تجویز پر سید اکبر شاہ کو متفقہ طور پر علاقہ سوات کا بادشاہ چن لیا گیا۔ سید اکبر شاہ نے اپنی فراست کی بنا پر تمام قبائل کو اپنے اختلافات بھلا کر ایک صف میں لا کھڑا کیا۔

۱۸۵۷ء میں عین اس دن جب جنگِ آزادی کے شروع ہونے کی خبر پشاور پہنچی، سید اکبر شاہ وفات پا گئے۔ انگریز نے اُن کے انتقال پر سکھ کا سانس لیا، انگریز نے یہ امر تسلیم کیا ہے کہ اگر مجاہدین کے سربراہ سید اکبر شاہ زندہ ہوتے تو یقیناً اہلِ سرحد فرنگی تسلط سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور انگریز کو نکال باہر کرتے۔ سید اکبر شاہ ترمذی کے بعد سید مبارک شاہ اُن کے

جانشین قرار پائے تو انہوں نے بھی سکھوں اور فرنگیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔

۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک مجاہدین نے سکھوں کے اقتدار کے خلاف اپنی مجاہدانہ کوششیں جاری رکھیں بالخصوص ہزارہ کے مختلف مقامات پر سکھ لشکر پر کاری ضربیں لگائیں۔ یہ سرحدی مجاہدوں اور سید احمد بریلوی کی ——— جماعت کے رضا کاروں ہی کی قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ سکھ صوبہ سرحد میں مسلسل حالتِ جنگ کی زندگی گزارتے رہے اور انہیں ایک پل کے لئے بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے سکھوں کو نکال کر اقتدار پر قبضہ کیا تو بھی مجاہدین بے خوف و خطر ان غیر ملکیوں پر حملے کرتے رہے، انگریزی دورِ حکومت کے ابتدائی آٹھ برسوں میں ان مجاہدین کے خلاف انگریزوں کو سولہ مرتبہ فوج کشی کرنی پڑی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک مجاہدین کے خلاف فرنگی حکمرانوں نے بیس مہمات بھیجیں اور فرنگیوں کے ساٹھ ہزار تربیت یافتہ سپاہی ان مہمات میں مجاہدین کے خلاف لڑتے رہے، ۱۸۵۲ء میں مجاہدین نے راولپنڈی چھاؤنی میں مقیم چوتھی دیسی رجمنٹ میں تبلیغی سرگرمیوں کی بدولت انگریزی افواج کے سپاہیوں کو اتنا متاثر کیا کہ اگر بروقت پتہ نہ چلتا تو ساری رجمنٹ فرنگی اقتدار کے خلاف بغاوت کر دیتی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں قریب تھا کہ سارے یوسف زئی قبائل متحد ہو کر انگریز پر ٹوٹ پڑتے لیکن امیرِ کابل کی غیر دانشمندانہ پالیسی اور بعض مطلب پرست مسلمانوں کی بدولت ان کی صفوں میں انتشار رونما ہو گیا اور مطلوبہ مقصد پورا نہ ہو سکا۔

بعد میں فرنگیوں نے اپنے جرنیل سر سڈنی کاٹن کے تحت پانچ ہزار کا لشکر ستھانہ بھیجا اور مجاہدین کی بستی کو تباہ کر دیا تو مجاہدین مہابن کے علاقے میں ملکا کے گاؤں کو نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مجاہدین کا مقصد نہ صرف اہلِ وطن کو غیروں کی غلامی سے چھڑانا تھا بلکہ وہ نفاذِ اسلام کے مقدس نصب العین کے حصول کو اپنا حاصلِ زندگی سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے زکوٰۃ اور عُشر کا شرعی نظام نافذ کیا اور ہر اس طاقت کا مقابلہ کیا جو اس راہ میں حائل ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایک مانع عشر گروہ سے مقابلہ کرتے ہوئے مجاہدین کا ایک معزز رہنما سید عمر شاہ آف ستھانہ شہادت پا گیا۔ ۱۸۶۳ء کے جہاد امبیلہ میں (جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا) مجاہدین نے جرأت و ایثار اور شجاعت و قربانی کی وہ داستان رقم کی جسے صوبہ سرحد اور پاکستان کی تاریخ آزادی کا درخشاں باب قرار دیا جا سکتا ہے بالآخر جب محض

اپنی سیاسی ریشہ دوانیوں اور پُرفریب حربوں کے بعد انگریز کو اس معرکے میں کچھ کامیابی ہوئی تو اس نے مجاہدین کو زیادہ سختی سے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ انتقامی جذبے کی تسکین کے لئے انگریزی حکومت نے مجاہدین کے خلاف فرضی مقدمے قائم کئے، انہیں موت اور کالا پانی کی سزائیں دیں، اُن کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط کرلیں اور مجاہدینِ اسلام پر "وہابی" کا لیبل لگاکر انہیں عامۃ المسلمین کی نظروں میں گرانے تک کی کوششیں کیں۔ تحریک مجاہدین کا اثر زائل کرنے کے لئے اُن ناپاک فرقوں کی کمر ٹھونکی گئی جو اسلام کے علمبردار ہونے کے باوجود مسلمانوں کو جہاد وقتال کے فریضے سے روکنا چاہتے تھے اور یوں ہندی مسلمانوں کی گردنوں میں فرنگی غلامی کا جوا مضبوط کس دینے کے حامی تھے۔ مسلمانوں میں ایسے نام نہاد علماء کی پشت پناہی کی گئی جو جہاد کی تیاری کی بجائے مسلمانوں کو محض انجمن سازی اور نعرہ بازی میں مگن رکھنا چاہتے تھے۔ ایک سو سال تک "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرکے انگریز بزعم خود اپنی سلطنت کے استحکام میں کوشاں رہے لیکن یہ بات بھول گئے کہ اسلام اپنی اشاعت میں کسی طاقت کا مرہونِ منت یا سرکاری تعاون کا محتاج نہیں، جہاد ہر مسلمان پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز اور روزہ ـــــ اور سچا مومن وہی ہے جو دین کی سربلندی کے لئے ہر وقت تیار اور سربکف رہے۔

تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو "تحریک مجاہدین" ہمارے ہاں کی ایک عدیم النظیر، پُرجوش اور بڑی نتیجہ خیز تحریک تھی، عصرِ حاضر کا نامور مؤرخ ٹائن بی (TOYN BEE) اسے برصغیر کو انگریز اور اس کے حلیفوں ہندوؤں اور سکھوں کے تسلط سے نجات دلانے کی اوّلین کوشش اور حصولِ پاکستان کی جانب بنیادی قدم قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مطلق العنان مغل حکمرانوں کے عہد میں مسلمان بظاہر ضرور مطمئن تھے تاہم انہیں دینی اقدار کو اجاگر کرنے اور جوشِ جہاد پیدا کرنے کے لئے احیائے اسلام کی کوئی عوامی تحریک چلانے کی سعادت کبھی حاصل نہ ہوئی (اور نہ ہی انہوں نے اس کی ضرورت سمجھی)۔ یہ تحریک شروع ہوئی تو فرنگی اور سکھ کے ذہنی غلبے سے پیدا ہونے والی ذہنی مرعوبیت کے ردِعمل کے طور پر شروع ہوئی۔ اس کی بدولت بنگال سے لے کر چترال تک کے مسلمانوں کے لئے اشتراکِ عمل کی صورت آشکار ہوئی۔ ایک مشترکہ نصب العین کے پیشِ نظر فکری وحدت نے ذہنوں کو جھنجوڑا، اسی تحریک کے نتیجے میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمان برصغیر نے زیادہ سے زیادہ حصّہ لیا اور اسی خالص اسلامی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں میں خلافت اور ہجرت کی تحریکیں خوب پھلی پھولیں ـــــ اسی طرح

اس تحریک کی بدولت مسلمانوں میں اپنا الگ قومی تشخص برقرار رکھنے اور دین کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کا ولولہ پیدا ہوا۔

"سوانح احمدی" کے مطابق حضرت سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر تیس لاکھ مسلمان بیعت ہوئے اور تقریباً چالیس ہزار ہندو ایمان لائے ۔۔۔ بہار اور بنگال میں اہلِ ارادت کی یہ کثرت تھی کہ بارہا آپ کا عمامہ یا چادر پھیلا دی جاتی، بیک وقت بیسیوں آدمی اسے ہاتھ میں لیتے، توبہ کرتے اور بیعت کے حلقے میں آجاتے تھے۔ سید صاحب سے کمال ارادت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے نامور علماء اُن کی مریدی پر فخر کرتے تھے۔

سید احمد بریلوی نے بارہا تصریح کی کہ ان کا اور اُن کے رفقاء کا منشا صرف خدمتِ اسلام ہے چنانچہ وہ سکھوں کے خلاف بھی اُسی بہادری سے لڑے جس طرح انگریزوں سے، پنجاب اور کشمیر کے مسلمانوں کو آزادی دلانے کے لئے بھی قربانیاں دیں تو بقول ہنٹر کابل کی پہلی جنگ میں انگریز لشکر نے غزنی کا بڑا دروازہ سرنگ لگا کر اُڑایا تو اہلِ قلعہ کے کثیر نقصان میں تین سو لاشیں صرف یاغستانی مجاہدوں کی شمار ہوئیں۔

جہاں تک مسلمانوں کے قلوب کو ایمانی حرارت عطا کرنے اور ان میں ملّی حمیت کا جذبہ بیدار کرنے کا تعلق ہے، تحریکِ مجاہدین انتہائی کامیاب اور بامراد رہی ۔۔۔ تاہم ان لوگوں کے نزدیک جو کسی فرد یا جماعت کی کامیابی کو محض ظاہر کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ مجاہدین سے بہت سی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی بنا پر کامیابی ناکامی میں بدل گئی۔ پشاور میں شاندار فتح حاصل کرنے کے تھوڑے عرصے بعد مجاہدین کا قتلِ عام اور فرار کی راہ ڈھونڈنے پر مجبور ہونا عجیب سی بات لگتی ہے، اہلِ سرحد میں جس سرعت سے یہ تحریک مقبول ہوئی اُسی سرعت سے اس کا زوال دیکھنے میں آیا۔ ایک تو یہ حال کہ لوگ اپنا جان و مال سید صاحب پر نچھاور کرنے کو باعثِ فخر سمجھیں اور یا یہ حال کہ اُن کے اور اُن کے رُفقاء کے خون تک کے پیاسے ہو جائیں۔

ان حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی کے خیال میں سید صاحب کو اپنی امامت کا اعلان نہیں کرنا چاہیئے تھا بلکہ اہلِ سرحد پر کوئی سرحدی ہی امام بنانا چاہیئے تھا۔ ایک نجتون مؤرخ سید بہادر شاہ ظفر کا کہنا ہے کہ اگرچہ سید صاحب کے مقاصد بڑے نیک

اور اعلیٰ تھے، لوگ ان پر جان چھڑکتے تھے، اسی مقبولیت کی بنا پر انہیں فتوحات نصیب ہوئیں تاہم انہوں نے اہلِ سرحد کے مزاج، ان کے رسم و رواج اور طور طریقوں کو سمجھنے میں دور اندیشی کی بجائے جلد بازی سے کام لیا ـــــ ان کے نزدیک سیّد صاحب میدانِ جنگ میں تو کامیاب رہے۔ لیکن میدانِ سیاست میں ہار گئے۔ انہوں نے باک زئی سرداروں پر اور کئی خود غرض خوانین پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا حالانکہ وہ لوگ قابلِ اعتماد ہرگز نہ تھے۔

یہ بات درست ہے کہ صدیوں سے بگڑے ہوئے معاشرے کو راتوں رات درست کرنا انسانی بس کا روگ نہیں ہوتا، ہر کوئی یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس وقت کے پختون معاشرے میں بہت سی فضول باتیں گھر کر چکی تھیں، ان کی اصلاح ضروری تھی۔ تاہم اس اصلاح کے لئے مناسب وقت اور صبر چاہیئے تھا نہ کہ عجلت بازی۔

بعض لوگ اس تحریک کی ناکامی کا ایک بڑا سبب خلافِ شریعت معاشرتی رسوم کی روک تھام میں سخت گیرانہ پالیسی تھی، مثال کے طور پر لڑکیوں کو گھر بٹھائے رکھنا اور ان کا نکاح نہ کرنا بہت بُری رسم تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس کے استیصال پر زور دیا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے بھی اس طرف توجہ دی مگر بقول عبید اللہ سندھی :۔

"خرابی یہ ہوئی کہ امیر شہید کے دعوئ خلافت کی اشاعت کرنے والے ہندوستانی اپنی حاکمانہ قوت دکھا کر یہ جبر مقامی لڑکیوں سے شادی کرنے لگے"۔

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۹۶)

"حیاتِ طیبہ" میں مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ

"مولویوں نے دیہات میں بڑا اُودھم مچایا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سخت مواخذہ کرتے اور لڑکیوں کو زبردستی اپنے نکاح میں لے آتے تھے۔ مولوی مظہر علی (قاضیٔ پشاور) نے سیّد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی تصدیق سے ایک فتویٰ جاری کیا تھا کہ تین دن کے اندر اندر بیوہ عورتوں کا عقدِ ثانی کر دیا جائے"۔ (ص ۱۹۴)

"سیارہ ڈائجسٹ" میں میاں عبدالرشید سید احمد بریلوی کی مخالفت کی وجوہ کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ذرا ذرا سی غلطیوں پر لوگوں کو سخت شرعی سزائیں دی جاتی تھیں۔ تارک صلوٰۃ کے لئے تازیانے کی سزا مقرر تھی حالانکہ اسلام میں تبلیغ سختی سے نہیں کی جاتی"

آگے چل کر وہ مجاہدین پر انتظامی صلاحیتوں کے فقدان کا الزام بھی لگاتے ہیں اور کہتے ہیں :-

"اس تحریک کی ناکامی کا ایک اور سبب یہ تھا کہ شرعی حکومت قائم ہو جانے کے بعد مجاہدین انتظامی امور اور بالخصوص دشمنوں کی جانب سے غافل ہو گئے تھے۔ ایک خیر خواہ نے بروقت سید صاحبؒ کو اطلاع دی تھی کہ ایک منصوبہ کے تحت رات کو اُن کے سبھی پیروکاروں کو مقامی لوگ قتل کر دیں گے لیکن انہوں نے کوئی تحقیقات نہ کرائی"

"موجِ کوثر" میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ

"کئی ایسی رسمیں تھیں جو قبائل کو عزیز تھیں لیکن مجاہدین کے نزدیک کفر تھیں۔ مجاہد قرنِ اوّل کے مخلص مسلمانوں کی طرح فی الفور احکام نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے یہ مطلق خیال نہ کیا کہ وہ قوم قرنِ اوّل کی قوم نہ تھی" صـ۳۱

"سیرت احمد شہیدؒ" کے مؤلف حضرت مولانا ابوالحسن ندوی کا کہنا ہے کہ

"اکثر غازی درشت مزاج اور لاابالی پن کا شکار تھے، ان سے کہیں کہیں بدعنوانیوں اور تعدی کے واقعات رونما ہوئے" (صـ۳۲۲)

یہ سب کچھ بجا سہی لیکن سید صاحب اور اُن کے رُفقاء کو بدنام کرنے کا سب سے بڑا محرک سردار سلطان محمد خان بارک زئی تھا۔ وہ اُن حکمرانوں میں سے تھا جو اپنی گدی کو بچانے کے لئے ناجائز کام کو بھی جائز سمجھتے ہیں، جو شخص خود اپنے بھائیوں سے مکر و فریب کا ریکارڈ قائم کر چکا ہو وہ اَوروں سے کیا کچھ نہ کرے گا۔ بارکزئی سردار مجاہدین کی نسبت اہلِ سرحد کا زیادہ مزاج دان تھا، وہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنا جانتا تھا، اُسے ایک تو اپنی خود مختارانہ حیثیت ختم ہو جانے کا قلق تھا دوسرے وہ اپنے بھائی یار محمد خان کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی والدہ بار بار اُسے یار محمد خان کے قتل کا بدلہ لینے پر اکسا چکی تھی ـــــ وہ سید صاحبؒ کی نسبت سیاسی اتار چڑھاؤ کا زیادہ ماہر تھا۔ اس لئے اس نے سید صاحب جیسے دینی رہنما کا توڑ مذہبی طریق ہی سے کرنا مناسب سمجھا اور اپنے مطلب کے علماء سے فتویٰ حاصل کر لیا جس میں سید صاحبؒ پر بدعقیدہ (وہابی) ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔

اہلِ سرحد کی واضح اکثریت چونکہ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے گہری عقیدت رکھتی ہے اس لئے اس فتوے نے وہ کام کیا جو توپ و تفنگ سے بھی ممکن نہ تھا۔ شیخ محمد اکرام نے "موجِ کوثر" میں اس نکتے کی نشان دہی یوں کرائی ہے کہ

"شاید مصلحین کی عاجلانہ کوششیں بھی اس قدر مہلک ثابت نہ ہوتیں اگر سردارانِ پشاور کی مسلسل اور مکارانہ مخالفت منفیانہ قوتوں کو یکجا نہ کر لیتی۔ ان کا سید صاحبؒ سے معاہدہ ایک فریب تھا۔ جب انہیں پشاور واپس مل گیا تو سلطان محمد خان نے اپنے بھائی یار محمد خان کا انتقام لینے کے لئے سازشوں کے جال پھیلانا شروع کر دیئے۔ قبائلی اور مقامی علماء اپنا عشر کھونے سے پہلے ہی خفا تھے، بعض مخلص قدیم الخیال ہستیوں کو بھی سید صاحبؒ کے بعض ساتھیوں کے طور طریقے بلکہ عقائد بھی کھٹکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سردارانِ پشاور اور مقامی علماء نے مجاہدین کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا اور مجاہدین کے خارج از اسلام ہونے کے فتوے دے دیئے گئے۔" (ص ۳۱)

بعض حلقوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مجاہدین کے قتلِ عام کے بعد سید صاحبؒ نے بالکل حوصلہ ہار دیا اور علاقہ خالی کر کے بالاکوٹ کو چلے گئے۔ اس علاقے کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی۔ ایسے لوگوں کے نزدیک جنگ اور سیاست میں جوش اور انہماک کا ترک کرنا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

بالاکوٹ میں اپنی زندگی کے آخری معرکے میں بھی سید صاحب کا وقت سے پہلے ہی کسی کو بتائے بغیر حملہ کر دینا سمجھ سے بالاتر بات ہے، ایسا اقدام ایک با تدبیر اور بہادر جرنیل کی طرف سے ہونا بیحد تعجب انگیز ہے۔

یہ اور ایسی کئی باتیں ہیں جو تحریکِ مجاہدین کی ناکامی کا باعث ٹھہرائی جا سکتی ہیں، تاہم جب ہم سید احمد بریلوی اور اُن کے جاں فروش ساتھیوں کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی اور خلوصِ نیت کو دیکھتے ہیں تو ان کی عظمت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ سیاسی مفادات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سید احمدؒ اپنے دور کے بہت عظیم اور بیحد مخلص دینی رہنما نظر آتے ہیں۔ انہوں نے باطل سے کھل کر ٹکر لی اور اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دیا۔

سِکھ راج

٥٣٦

سکھ راج

سکھ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ ہے جس کے بانی گورو نانک پندرھویں صدی میں پیدا ہوئے۔ یہ لوگ بت پرستی کی بجائے عقیدۂ توحید پر یقین رکھتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں جب اسلام ایک انقلابی طاقت بن کر ابھرا تو دنیا بھر کے انسان اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ اور ہندوؤں میں سکھ پنتھ کئی خصوصیات کے اعتبار سے مسلمانوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں مغلیہ حکومت کے انتشار کی وجہ سے سکھوں کو ابھرنے کے مواقع میسر آئے اور وہ شمالی ہندوستان (پنجاب اور سرحد) کی ایک بہت بڑی سیاسی طاقت بن گئے۔ صوبہ سرحد کی تاریخ میں پہلی بار سکھوں کا نام انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں منظرِ عام پر آیا۔ سرحد کے سرفروش لوگوں کے لئے جو سلطان محمود کے وقت سے لے کر ۱۸۲۰ء تک خود برسرِ اقتدار رہے تھے سکھوں کی غلامی میں چلے جانا ایک شرمناک واقع تھا تاہم یہ روزِ بد آپس ہی کی ناچاقیوں اور چپقلشوں کی بدولت دیکھنا پڑا۔

جمعیتِ عالیہ مجاہدین چمرقند کے رہنما مولانا ابو سعید فضل الٰہی ایک کتابچے "غلطی ہائے عدیم المثال" میں اس کی نشان دہی یوں کرتے ہیں کہ

"انیسویں صدی عیسوی کی عدیم المثال غلطیوں میں سے وہ غلطی سب سے بڑی ہے جو سردار پائندہ خان بارک زئی (محمد زئی) مرحوم کی اولاد سے سرزد ہوئی۔ اس کی اولاد تین حصوں میں بٹ کر علیحدہ علیحدہ کابل، قندہار اور پشاور کے مرکزوں میں منقسم ہو گئی اور ایک دوسرے کے خلاف ہی نبرد آزما رہی۔ ان کے اس باہمی کشت وخون اور نفاق سے ان کی قوت

کمزور پڑ گئی اور رنجیت سنگھ جیسے دشمنِ اسلام کو موقع مل گیا کہ وہ کسی خاص مزاحمت کے بغیر ملتان ۔ ڈیرہ جات ، کشمیر ، ہزارہ ، پشاور ، کوہاٹ ، بنوں اور ٹوچی ایسے زرخیز افغانی علاقوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا ، رنجیت سنگھ کا یہ مقصد بہت جلد پورا ہو جاتا اگر سید احمد بریلوی کے مجاہدین آڑے نہ آتے ۔

اگر سردارانِ پشاور (یار محمد خان ، سلطان محمد خان وغیرہ) رنجیت سنگھ کے دھوکہ میں آکر سید موصوف سے بدعہدی نہ کرتے تو یقیناً یہاں کا نقشہ کچھ اور ہوتا ۔ لیکن سردارانِ پشاور اپنے کابلی بھائیوں کی رقابت سے اس قدر مغلوب الحال تھے کہ وہ راجہ رنجیت سنگھ کے اس وعدہ پر کہ وہ اُن کی فوجی مدد کرے انہیں کابل دلوا دے گا ۔ دھوکہ میں آ گئے ۔ اس چالاکی سے رنجیت سنگھ نے پہلے مجاہدین کی طاقت کو ختم کیا پھر پشاوری سرداروں کی ایک ایک کر کے خبر لی ، گویا دونوں مسلمان قوتوں کو ختم کر دیا ۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء تک سکھوں کے ہاتھوں بارک زئی سردارانِ پشاور کو کئی مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور اُن کی غیر دانش مندانہ پالیسی کی وجہ سے سارے صوبہ سرحد کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی ۔"

۱۷۹۹ء میں اسی قسم کی غلطی شاہ زمان سدوزئی سے ہوئی ، وہ پنجاب کی یلغار سے فارغ ہو کر واپس کابل جا رہا تھا کہ اس کی کچھ توپیں دریائے جہلم میں گر گئیں ، دریا طغیانی پر تھا اور شاہ زمان کو اپنے بھائی کی بغاوت کو دبانے کے لئے جلد کابل پہنچنا تھا اس لئے وہ توپوں کو وہیں چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گیا ، گوجرانوالہ کے نوجوان سکھ حاکم سردار رنجیت سنگھ نے ان میں سے کچھ توپیں نکلوا کر کابل بھیج دیں ۔ اس پر شاہ زمان نے خوش ہو کر رنجیت سنگھ کو سارے پنجاب (بشمول صوبہ سرحد) کی حکمرانی کا پروانہ لکھ دیا ـــــ رنجیت سنگھ کے لئے اس طرح ان علاقوں پر تاخت و تاراج کرنے کا جواز پیدا ہو گیا ۔

سکھ اسلامی حکومت اور سطوت کی مخالفت میں پیش پیش تھے ، وہ برِصغیر سے مسلمانوں کی عظمت کا ہر نقش مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے ۔ چنانچہ ۱۸۰۹ء میں سکھوں کو مذہبی اور سیاسی ضرورتوں کے لئے عمارتیں تعمیر کرنی پڑیں تو انہوں نے مسلمانوں کی تاریخی عمارتوں کو ویران کر کے ان کے پتھر تک اکھاڑ لئے ۔ اس طرح سینکڑوں تاریخی عمارتوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔

سرحدی علاقوں سے سکھ فوج کو پہلی بار اُس وقت واسطہ پڑا جب کابلی حکمرانوں کے اشتراک سے انہوں نے کشمیر پر حملہ کیا، اس حملے میں تو سکھ راجہ رنجیت سنگھ کو محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا لیکن بعد میں اس نے از خود کشمیر اور اٹک کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح وہ بارک زئی سرداروں کے مقابلے میں آکھڑا ہوا۔ (ان واقعات کا تذکرہ پہلے ابواب میں ہو چکا ہے)

ہزارہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہزارہ ڈویژن کے موجودہ علاقے کشمیر کے صوبے میں شامل تھے۔ ۱۸۱۸ء میں کشمیر فتح ہوا تو سکھ ہزارہ کو بھی اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ تاہم ہزارہ کے جنگجو اور سرفروش لوگوں نے سکھوں کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۱۹ء میں ہزارہ کے بعض خوانین باہمی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ہوا یہ کہ مانکرائے کے ترک سردار ہاشم خان نے اپنے ساتھی سردار کمال خان کو قتل کر ڈالا۔ مشہور ترین سردار محمد خان، کمال خان مقتول کا حلیف تھا۔ اس نے ہاشم خان سے اس قتل کا بدلہ لینا چاہا۔ ہاشم خان مقابلے کی تاب نہ رکھتا تھا اس لئے وہ سکھوں سے جا ملا۔ سکھوں کا صوبہ دار مکھن سنگھ ان دنوں راولپنڈی میں رہا کرتا تھا۔ مکھن سنگھ نے موقع غنیمت سمجھا اور زیرین ہزارہ پر حملہ کر دیا، سرائے صالح میں ایک قلعہ بنا کر وہ ہزارہ کے میدانی دیہات سے مالیہ وصول کرنے لگا۔ مکھن سنگھ کے قدم مضبوط ہوئے تو اس نے ترین اور ڈھونڈ قبیلوں سے بھی مالیہ لینا چاہا۔ وہ لوگ سردار مکھن سنگھ کے آگے جھکنے والے کہاں تھے۔ تلواریں سونت کر مقابلے پر نکل آئے۔ دریائے دوڑ کے کنارے موضع شاہ محمد کے قریب دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا، مسلمان سرخرو رہے اور مکھن سنگھ قتل کر دیا گیا۔ اگلے دن سرائے صالح کی سکھ فوج بھی بھاگ نکلی اور اُس نے اٹک پہنچ کر دم لیا، اس پر حکم سنگھ صوبہ دار اٹک نے اہلِ ہزارہ سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ وہ نالہ ہرو کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا، مجاہدین ہزارہ بھی ہر طرف سے جوق در جوق جمع ہونے لگے۔ صوبیدار تاڑ گیا کہ اس کی فوج ہزارہ سر کرنے کے لئے ناکافی ہے چنانچہ اس نے لاہور کے سکھ دربار کو مزید امداد بھیجنے کے لئے لکھا۔ چنانچہ وہاں سے دیوان رام دیال اور کرنل الٰہی بخش کافی کمک لے کر آن پہنچے انہوں نے ہزارہ کے کچھ دیہات فتح کر لئے لیکن ترین سردار محمد خان بھی دبنے والا نہ تھا۔ اس نے سید خانی، مشوانی، ترین اور دوسرے مسلمان قبیلوں کی مدد سے سکھوں کا راستہ روکا، نارہ کے قریب زبردست لڑائی ہوئی جس میں دیوان رام دیال مارا گیا۔ (اس کی سمادھ کچھ عرصہ پہلے تک

کھلابٹ میں موجود تھی۔)

اب تو سارے ہزارہ میں محمد خان ترین کا طوطی بولنے لگا۔ اس کی شجاعت کا چرچا دُور دور تک پھیل گیا۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے آزمودہ کار رفیق سردار امر سنگھ مجیٹھہ کو ہزارہ بھیجا۔ یہ سردار پرانا گھاگ تھا۔ اس نے آتے ہی لڑائی چھیڑنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے کام لیا۔ کافی عرصے تک کوٹ نجیب اللہ میں ڈیرے ڈالے پڑا رہا۔ وہ زورِ بازو آزمانے سے پہلے سیاسی داؤ پیچ استعمال کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ہزارہ کے بہت سے رئیسوں کو شیشے میں اتار لیا اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ اس کامیابی کے بعد وہ محمد خان ترین کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اسے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن محمد خان بات کو ٹال گیا۔ ترین سردار بھی بڑے نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھا اس نے امر سنگھ کو ایسا موقع نہ دیا کہ وہ ناراض ہو سکے۔ اسی اثناء میں کسی نے امر سنگھ کو یہ پٹی پڑھائی کہ جب تک ناڑہ کا مشوانی سردار حسن علی خان ہار نہیں مانتا بات بنے گی نہیں۔ امر سنگھ مجیٹھہ اس پر سکھ لشکر اور اپنے حامی سرداروں کی طاقت کے ساتھ ناڑہ پر حملہ آور ہوا۔ تاہم حسن علی خان اور اس کے ساتھی اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے اور سردار امر سنگھ کے ہاتھ نہ آ سکے، سکھ سردار نے اُن کا سارا سامان اُٹھوا کر اپنے کیمپ میں بھیج دیا۔ ابھی سکھ لشکر لُوٹ مار ہی میں لگا تھا کہ حسن علی خان نے پھر سنبھالا لیا اور مقامی لوگوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ سکھوں پر ہلّہ بول دیا۔ یہ حملہ اتنا ناگہانی تھا کہ سکھ لشکر کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ مسلمان مجاہد سکھ سپاہیوں کو گاجر مُولی کی طرح کاٹنے لگے۔ سکھ لشکر بُری طرح پسپا ہوا اور امر سنگھ مجیٹھہ اور اس کا بھائی ہری سنگھ لڑائی میں مارے گئے۔ یہ معرکہ دریائے ہرو کے پاس سمندر کٹھہ کے مقام پر پیش آیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یہ خبر ملی تو بڑا جز بز ہوا۔ وہ خود ہزارہ پہنچنا چاہتا تھا لیکن کنور شیر سنگھ اور رانی سدا کور سے جھگڑوں کی وجہ سے دارالحکومت چھوڑ نہ سکا۔ چنانچہ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد کرنیل الٰہی بخش کو بھاری توپ خانہ دے کر ہزارہ بھیجا۔

کرنیل الٰہی بخش حضرو کے راستے آگے بڑھا اور تربیلہ کے مقام پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرنے کے بعد باقی مقامات کی تسخیر کا عزم کیا۔ اس موقع پر سردار محمد خان ترین نے مصلحت اندیشی سے کام لیا اور اس مسلمان کرنیل سے صلح صفائی کر لی، الٰہی بخش نے بھی ترین سردار کی زبانی

اطاعت کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے مزید تعرض نہ کیا اور واپس لاہور روانہ ہوگیا۔ سکھ لشکر کے پیٹھ پھیرتے ہی ہزارہ کے خوانین پھر خود مختاری پر اُتر آئے اور اپنی من مانی کرنے لگے۔

اس واقعے کے بعد کچھ عرصہ تک دیوان موتی رام گجا ہی کشمیر میں سکھوں کا گورنر رہا۔ اس کو اس عہدے پر دو سال گزرے تھے کہ سکھ دربار نے اُسے واپس بُلا لیا اور اس کی جگہ سردار ہری سنگھ نلوہ کو کشمیر کی حکومت تفویض کی گئی، ایک موقع پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کسی سلسلے میں ہری سنگھ کی مدد کی ضرورت تھی، اس نے اُسے جلد کشمیر سے لاہور پہنچنے کا حکم دیا۔ ان دنوں برف باری کی وجہ سے سری نگر جموں روڈ پر آمد و رفت معطل تھی۔ مجبوراً ہری سنگھ نلوہ کو مظفر آباد اور پکھلی کا راستہ اختیار کرنا پڑا، جب سردار ہری سنگھ اور اس کے سکھ سپاہی ایبٹ آباد کے نواح میں پہنچے تو محمد خان ترین نے ہزارہ کے خوانین کو ساتھ ملا کر اس کا راستہ روکا، ہری سنگھ کو چونکہ جلد لاہور پہنچنا تھا اس لئے وہ اُس وقت لڑائی پر آمادہ نہ تھا بلکہ سردارانِ ہزارہ کو کچھ دے دلا کر بات کو ٹالنا چاہتا تھا۔ تاہم ہزارہ کے خوانین ڈٹے رہے، انہوں نے ہری سنگھ نلوہ کی ہر بات سننے سے انکار کر دیا۔ بالآخر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا مانگل کے مقام پر ہوا، اس موقع پر ہری سنگھ نلوہ کے پاس سات ہزار مسلح سپاہی تھے جبکہ ہزارہ کے مسلمان سرداروں کے سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ تاہم انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کئی سو مجاہدوں نے شہادت پائی ـــــ بالآخر قبیلہ جدون نے تاوانِ جنگ ادا کر کے صُلح کا ہاتھ بڑھایا ـــــ ہری سنگھ نلوہ نے نواں شہر میں اپنا قلعہ اور فوجی چھاؤنی قائم کی اور اپنے لشکر کا ایک حصّہ مالیہ اور جرمانہ کی وصولی کے لئے وہاں چھوڑ دیا بتایا جاتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے طلبی کسی ناراضگی کے سبب عمل میں آئی تھی تاہم اسی لڑائی میں فتح پانے کی وجہ سے رنجیت سنگھ کا دل اس کی طرف سے صاف ہوگیا، دوسرے ہری سنگھ نلوہ کشمیر سے سکھ راجہ کے لئے بہت عمدہ تحفے لایا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ مہاراجہ نے ہری سنگھ کی خطا معاف کرتے ہوئے اسے کشمیر کی گورنری پر بحال رکھا۔

جن دنوں ہری سنگھ کشمیر میں تھا سکھوں کا ایک اور لشکر ہزارہ کے "سرکش" سرداروں کی سرکوبی کے لئے لاہور سے بھیجا گیا تھا، لشکر کے ہمراہ مہارانی سدا کور بھی آئی تھی۔ اس نے سیاسی چال چلتے ہوئے سردار محمد خان ترین کو اپنا مُنہ بولا بیٹا بنا لیا۔ مائی سدا کور ہی کی سفارش پر رنجیت سنگھ نے نہ صرف

محمد خان کی خطا معاف کر دی بلکہ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر کی منظوری بھی دے دی۔

مانگل کے معرکے میں کامیابی کے بعد ہری سنگھ نلوہ نے محمد خان ترین کے مسکن موضع درویش کا رُخ کیا، ۱۸۲۲ء میں ہزارہ کے قبائل نے سارتی کے مقام پر سکھ لشکر کو روکنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہوئے اور سری کوٹ کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ـــــ کہا جاتا ہے کہ محمد خان ترین نے سری کوٹ سے اپنے بھتیجے بوستان خان کو عذر خواہی کے لئے ہری سنگھ کے پاس بھیجا لیکن سکھ سردار بوستان خان کو اپنے ساتھ یرغمالی بنا کر اپنے ساتھ لاہور لے گیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کر دیا۔

اس مہم کے دوران مقدم مشرف کے کہنے پر سردار ہری سنگھ نلوہ نے ہری پور شہر اور قلعے کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہری پور کو مرکز بنا کر نواحی مسلمان قبائل پر قابو پائے تاہم ابھی ہری پور شہر کی تعمیر کا کام جاری ہی تھا کہ ایک مہم کے سلسلے میں اُسے ڈیرہ جات جانے کا حکم ہوا۔ اس کے جاتے ہی ترین سردار پھر پہاڑیوں سے اُتر آیا۔ اس نے ہری سنگھ نلوہ کے قائم مقام اور نائب کا ناطقہ بند کر دیا۔ شہر کو لوٹا اور مسمار کر دیا۔ اس پر ہزارہ کے خوانین ایک بار پھر سکھوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جنگ کی آگ بھڑک اٹھی، تنولی قلعہ در بند پر، سواتی شنکیاری پر اور جدون نواں شہر کے قلعے پر چڑھ دوڑے۔ یہ خبر سُن کر ہری سنگھ اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر پھر ہزارہ پہنچا اور جدون قبیلہ کو شکست دے کر نواں شہر پر پھر قابض ہو گیا ـــــ نواں شہر سے فارغ ہو کر ہری سنگھ مانسہرہ پہنچا اور وہاں بھی ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ اب کے کچھ عرصہ تک سکھ لشکر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب ہری سنگھ نلوہ نے سواتی قبائل کو غافل پایا تو ان پر فوری حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا وحشیانہ اور ہیبت ناک تھا کہ سواتیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ہری سنگھ نے اگرور، ٹکڑی، اور تندھیار پر قبضہ کر لیا، جو سواتی اس کے ہاتھ آیا قتل کر دیا گیا، ہزاروں افراد کے بے رحمانہ قتل کے علاوہ ہری سنگھ ایک ہزار سواتی عورتوں اور بچوں کو بھی قیدی بنا کر ساتھ لے آیا اور مدتوں اُنہیں قید رکھا تاکہ سواتی مجاہد ڈٹ کر سر نہ اٹھا سکیں۔ شنکیاری اور شیر گڑھ کے قلعوں کی مرمت کرانے اور انہیں ہر طرح مضبوط بنانے کے بعد ہری سنگھ واپس مانسہرہ پہنچا۔ اب ہری سنگھ کا ارادہ سربلند خان چیف آف پلال پر حملہ کرنے اور اُس کے گاؤں شنگڑی کو لوٹنے اور جلانے کا تھا، سربلند خان مقابلے

کونکلا، دروازہ (موجودہ بانڈہ لوہاران) کے پاس اس کی جھڑپ سکھ لشکر سے ہوئی۔ اس معرکے میں سربلند خان کا بڑا بیٹا شیر محمد شہید ہو گیا اور وہ خود محمد خان ترین کے پاس سری کوٹ چلا گیا۔

سری کوٹ اس وقت تک بہت سے خوانین ہزارہ کا مسکن بن چکا تھا۔ یہ لوگ موقع پاتے ہی سری کوٹ سے نکلتے اور میدانی علاقہ کے سکھ قلعوں اور کیمپوں پر دھاوا بول دیتے۔ سری کوٹ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے سکھ ادھر کا رُخ کرنے سے ہچکچاتے تھے، خاص طور پر محمد خان ترین کا نام سنتے ہی ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا، اس سے پہلے سکھ فوج کا ایک آزمودہ کار سپہ سالار رام دیال بھی ترین اور مشوانی غازیوں کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ تاہم ہری سنگھ نلوہ کو یہ بھی علم تھا کہ جب تک سری کوٹ کو فتح نہ کیا جائے گا۔ ہزارہ میں سکھ راج کی بنیادیں مضبوط نہ ہوں گی۔ چنانچہ ہری سنگھ سری کوٹ پر چڑھائی کرنے کی پوری تیاری میں لگ گیا۔ اب کی بار اُس نے سات ہزار سوار اور پیادے، ایک سو زنبورکیں اور متعدد توپیں جمع کیں اور ارد گرد کے تمام سکھ سرداروں کو اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ اسفوج ۱۸۸۱ء بکرمی کو یہ فوج قلعہ ہرکشن گڑھ (ہری پور) سے نکل کر سری کوٹ کی طرف بڑھی، دوسرے دن یہ ہیبت ناک سکھ لشکر ناڑہ سید خانیاں پہنچا تو علاقے کے سبھی لوگ گاؤں خالی کر کے پہاڑی چوٹیوں پر چڑھ گئے ـــــ دن چڑھتے ہی مقابلہ شروع ہوا۔ دن بھر دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ اس کے باوجود سکھ فوج پیش قدمی نہ کر پائی۔ پچھلے پہر ہری سنگھ نلوہ نے تمام سردارانِ لشکر کو بلا کر غیرت دلائی کہ اگر سات ہزار کا سکھ لشکر بھی سری کوٹ فتح نہ کر سکا تو ہم سکھ مہاراجہ کو کیا منہ دکھائیں گے اور خالصہ پنتھ کو کیا جواب دیں گے۔ اس پر سکھ فوج نے زیادہ جوش سے حملے شروع کر دیئے، ہر چند وہ بڑھ بڑھ کر حملہ کرتے چٹانوں کے پیچھے چھپے ہوئے مجاہدینِ اسلام کا کچھ بگاڑ نہ سکتے۔ شام ہو گئی۔ اندھیرا چھانے لگا تو سردار ہری سنگھ، سردار مہاں سنگھ اپنے ساتھیوں سمیت ناڑہ گاؤں کے ایک مکان میں شب بسری کے لئے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ غازی اپنے اپنے مورچوں سے نکل کر آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارے مکانوں کو گھیرے میں لے لیا، جن مکانوں میں سکھ جرنیل اور سردار پناہ لئے ہوئے تھے، اُن کے دروازے کلہاڑیوں سے توڑ دیئے۔ چھتوں میں سوراخ کر دیئے اور سوراخوں

سے سکھ سرداروں پر گولیاں برسانے لگے، اس دست بدست لڑائی میں بہت سے سکھ سردار مارے گئے، جو بچ رہے وہ بھاگ نکلے، ہری سنگھ نلوہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ جس مکان میں وہ چھپا ہوا تھا اُسے آگ لگا دی گئی ہے تو باہر نکل کر جان بچانے کی سوچنے لگا۔ پہلے اس نے مہاں سنگھ کے چھوٹے بھائی کشن سنگھ کو حالات کا جائزہ لینے باہر بھیجا۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ غازی اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کا تکا بوٹی کر دیا۔ بعد میں سردار ہری سنگھ نلوہ اور سردار مہاں سنگھ باہر نکلے، دونوں نے زرہ پہن رکھی تھی اس لئے مجاہدین کی تلواریں اُن پر کارگر ثابت نہ ہوتی تھیں۔ بالآخر غازیوں نے دونوں پر پتھر برسانے شروع کر دیئے، ہری سنگھ سخت زخمی ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا پہاڑی سے نیچے ایک کھڈ میں گر گیا۔ مہاں سنگھ سمجھا کہ ہری سنگھ اپنے ڈیرے کی طرف چلا گیا ہے لیکن جب ڈیرے پر گیا تو اُسے موجود نہ پایا۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی اور یہ خبر عام ہو گئی کہ ہری سنگھ مارا گیا ہے اُدھر سکھ مقتولوں کی لاشوں میں سے ایک مسلمان غازی کو ایک لاش پہ ہری سنگھ کی میت کا گمان ہوا۔ اس نے اس کا سر کاٹ کر اپنے سرداروں کو بھیج دیا۔ وہ سکھ مقتول ہری سنگھ نلوہ سے اتنا مشابہ تھا کہ سب کو اس پر ہری سنگھ کا گمان ہوا ـــــ اس طرح اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ نلوہ مارا جا چکا ہے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ہری سنگھ نلوہ زخموں سے چُور کھڈ میں پڑا تھا۔ شور اس لئے نہیں کرتا تھا کہ کوئی مسلمان دیکھے گا تو اُسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ آخر کار ایک سکھ سپاہی کا گزر اُدھر سے ہوا تو ہری سنگھ نے اس کا دامن پکڑ کر کھینچا، اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا ـــــ "میں ہری سنگھ نلوہ ہوں، مجھے یہاں سے نکالو اور ہری پور پہنچاؤ ـــــ" بڑی مشکل سے سکھوں نے اپنے سپہ سالار کو ہری پور کے قلعے میں پہنچایا۔ وہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ زخموں سے چُور بستر پہ پڑا رہا۔ تاہم اُس کی جان بچ گئی۔

اس معرکے میں سکھ فوج کی شکست کی خبر پھیلتے ہی ایسی افراتفری مچی کہ سینکڑوں سکھ سورما لاپتہ ہو گئے، سینکڑوں اِدھر اُدھر چھپ کر جان بچانے کی کوششوں میں مارے گئے۔ سکھ افسروں میں سے سردار جمعیت سنگھ اور بہت سے دوسرے بڑے بڑے کارپرداز مارے گئے یا زخمی ہوئے اس بار بھی قدرت نے سردار محمد خان ترین اور سربلند خان کو سربلندی عطا کی۔

جب سکھ لشکر کی اس تباہی کی خبر لاہور پہنچی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ بنفسِ نفیس ایک بہت بڑی

فوج کے ساتھ ہزارہ کو چل پڑا۔ اُدھر صحت یاب ہوتے ہی ہری سنگھ نلوہ نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کارروائیاں جاری رکھیں، ایک دن اس نے سکھ لشکر کے ایک منتخب دستے کو لے کر بگڑہ پر شب خون مارا۔ بگڑہ میں اس وقت سکھوں سے لوٹا ہوا بہت سا سامان موجود تھا، وہ سارا سامان پھر سے سکھوں کے ہاتھ لگا۔ اِردگرد کی مسلمان آبادی کو پتہ چل گیا کہ ہری سنگھ نلوہ ابھی زندہ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ منزل بمنزل سفر کرتا ہوا ہزارہ پہنچا اور گندگڑ پہاڑ کے دامن میں موضع جاگل میں فروکش ہوا، مہاراجہ نے ہر طرف پیادے دوڑا کر ہزارہ کے مختلف خوانین کو طلب کیا۔ اس طلبی پر محمد خان ترین، سربلند خان اور صالح محمد خان تو حاضر ہوئے لیکن باقی لوگ اپنے بیوی بچوں اور مال واسباب کو لے کر دریائے سندھ کو عبور کر کے علاقہ یوسف زئی (ضلع مردان) کی طرف چلے گئے ـــــ اس پر مہاراجہ نے اپنی فوج کو سری کوٹ پر حملہ کرنے کا فرمان دیا۔ اُس وقت محمد خان ترین اور سربلند خان تنولی تو مہاراجہ کے مہمان تھے۔ سکھوں کا مقابلہ بھلا کون کرتا ـــــ جلد ہی سارے علاقے پر سکھوں کا سکہ چلنے لگا۔ اس فتح کی خبر سُن کر مہاراجہ رنجیت سنگھ خوشی خوشی سری کوٹ گیا اور دو دن تک وہاں مقیم رہا۔ اس نے ہری سنگھ کو سری کوٹ کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کرنے اور سکھ فوج کا ایک دستہ وہاں تعین کرنے کا حکم دیا۔ لعل جی لال اور ہرسہائے کو سری کوٹ کا تھانہ دار مقرر کیا گیا۔

دوسرے روز سکھ مہاراجہ سیر وسیاحت کی غرض سے غازی اور ترپیلا گیا اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ لگا کر پکنک منانے لگا۔ سکھ فوج فتح کی خوشی میں نعرے لگاتی جسے سُن کر دریا کے مغربی کنارے پر بسنے والے یوسف زئی اور ہزارہ سے نکالے ہوئے مسلمان جمع ہو گئے اور نعروں کا جواب نعروں سے دینے لگے۔ سکھوں نے اُن کا منہ چڑانا شروع کیا تو چند من چلے مسلمان نوجوانوں نے دریا کے مغربی کنارے پر چند گائیں ذبح کر دیں اور ان کا گوشت بھون کر کھانے لگے۔ سکھ یہ دیکھتے تو دل مسوس کر رہ جاتے۔ دریا بیچ میں حائل تھا اس لئے مسلمانوں کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ جب اس بات کی خبر مہاراجہ کو ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ تیر کر دریا پار کریں اور مسلمانوں کو اس "گستاخی" کی سزا دیں۔ سردی کے دن تھے، دریا

میں پانی زیادہ نہ تھا۔ سکھ فوج کے سپاہی جو اپنے راجہ کے غلط سے غلط حکم پر عمل کرنا بھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ دریا میں کود پڑے اور انہوں نے کیا اور کھبل کے گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے یہ بھی غنیمت تھا کہ وہاں کے لوگ پہلے ہی سے اپنا مال و اسباب نکال کر مہابن پہاڑ کی طرف جا چکے تھے، دوسرے دن سکھ حکمران اور لشکر نے دریائے سندھ کو اس مقام سے پار کیا جہاں اب تربیلا ڈیم بنایا گیا ہے، جونہی سکھ مہاراجہ نے علاقہ یوسف زئی میں پڑاؤ کیا۔ خان پائندہ خان تنولی والیٔ امب نے پیغامِ صلح بھیج کر سکھ دربار کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ مہاراجہ نے سردار مہاں سنگھ کو مزید گفت و شنید کے لئے امب بھیجا۔ نواب امب نے دوستی کی یقین دہانی کے طور پر اپنا ایک بیٹا مہاں سنگھ کے ہمراہ سکھ حکمران کی خدمت میں بھیج دیا۔

وہاں سے کوچ کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سرائے کالا (اغلباً جہانگیرہ) میں قیام کیا تو محمد خان ترین اور سربلند خان نے مہاراجہ سے رخصت طلب کی۔ تاہم مہاراجہ جانتا تھا کہ ایک بار محمد خان آزاد ہوا تو ضلع ہزارہ میں سکھ اقتدار کو خطرہ لاحق ہو جائے گا، اس لئے اس نے محمد خان ترین کو قیدی بنا کر ہری سنگھ نلوہ کے حوالے کر دیا اور ہدایت کی کہ محمد خان کو اسی حال میں رہا کیا جائے جب وہ ایک لاکھ روپیہ تاوان ادا کرے، ہری سنگھ نلوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فطرت کو اچھی طرح جانتا تھا، اسے معلوم تھا کہ مہاراجہ صرف روپوں کا بھوکا ہے۔ اُسے اس امر کا بھی خدشہ تھا کہ اگر محمد خان ترین ایک لاکھ روپیہ ادا کر کے رہا ہو گیا تو ہری سنگھ نلوہ کے لئے ایک مصیبت کھڑی کر دے گا۔ اس لئے اس نے فوراً ہی محمد خان ترین کو واپس مہاراجہ کے پاس بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ ایک لاکھ روپیہ اس علاقے سے وصول ہونا ناممکن ہے۔ اس پر مہاراجہ نے محمد خان ترین کو روزانہ الاؤنس مقرر کر دیا اور اُسے اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔

ہری سنگھ نے سری کوٹ میں قلعہ تعمیر کرنے کے بعد کرڑال کا علاقہ فتح کیا، وہ سجکوٹ پہنچا تو حسن علی خان نے آگر اس سے ملاقات کی۔ ہری سنگھ نے احتیاطاً حسن علی خان کے ایک بیٹے کو اپنے ساتھ رکھا، اب چونکہ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اس لئے ہری سنگھ نے مزید پیش قدمی کی ضرورت نہ سمجھی۔ مہاں سنگھ کو سرداری کا خطاب دے کر اس نے اسے ضلع ہزارہ کا انتظام سپرد کر دیا اور خود لاہور چلا گیا۔

ان دنوں ضلع ہزارہ کے سکھ حاکموں کی علاقہ وار حالت یہ تھی :۔

۱۔ گلاب سنگھ ، علاقہ پکھلی و شنکیاری ۲۔ سردار دل سنگھ پکھلی پایاں

۳۔ بھائی حکم سنگھ ، مانسہرہ ۴۔ منشی بھوانی داس ، علاقہ تناول

۵۔ حسن شاہ سید ، علاقہ ماڑہ نلوں ۶۔ فتح سنگھ تھانیدار ، تربیلا

۷۔ مول سنگھ ، سرائے صالح

کاغان ۔ اگر ور اور بھوگڑ منگ کے علاقے تیس ہزار روپیہ سالانہ اجارہ پر گڑھی کے حبیب اللہ خان کے سپرد تھے لیکن جب وہ مقررہ رقم ادا نہ کر سکا تو حبیب اللہ خان کے ایک بھائی اور ایک بھتیجے کو ہری پور کے قلعے میں قید کر دیا گیا ۔ اسی اثنا میں اگر ور پر خان پائندہ خان والئی امب قبضہ جما چکا تھا۔

سردار مہاں سنگھ حاکم ہزارہ بنا تو اس نے خوب من مانی کی اور تمام علاقوں پر اپنے ہی رشتہ داروں اور دوستوں کو افسر مقرر کر دیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دستور تھا کہ ہر سال دسہرہ کا تہوار بڑی دھوم دھام سے مناتا ۔ اس موقع پر ایک خصوصی دربار لگاتا جس میں مملکت کے ہر حصے سے سرکردہ سردار حاضری دیتے ، چنانچہ اس سال جب سردار ہری سنگھ نلوہ دسہرہ کے موقع پر لاہور پہنچا تو اُسے راولپنڈی اور گردونواح کے علاقے پر حاکم بنا دیا گیا ، ساتھ ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے محمد خان ترین کو پچپن ہزار روپیہ کے عوض سردار ہری سنگھ نلوہ کی تحویل میں دے دیا اور اُسے اختیار دیا کہ پچپن ہزار روپیہ وصول کرنے کے بعد چاہے تو محمد خان سے یہ رقم بطور جرمانہ وصول کرے ، چاہے تو اسے زندہ چھوڑ دے اور چاہے تو قتل کر دے ، لاہور سے رخصت ہو کر سردار ہری سنگھ نلوہ اپنے قیدی محمد خان ترین کو ساتھ لے کر راولپنڈی پہنچا ، جہاں ہزارہ کا سکھ حاکم سردار مہاں سنگھ اور نواحی علاقے کے باقی سردار بھی اس کے استقبال کو آئے ہوئے تھے۔

محمد خان ترین کی ہری پور سے غیر حاضری کے دوران علاقے کی سرداری اس کے بھتیجے بوستان خان کے ہاتھ میں تھی ۔ اسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے خاص جاگیر عطا ہوئی تھی ۔ اس لئے سردار مہاں سنگھ دل ہی دل میں اس سے جلتا تھا لیکن کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ، بوستان خان درپردہ مسلمانوں

کو سکھوں کے خلاف آمادۂ جہاد بھی کرتا رہتا تھا چنانچہ اس کے کہنے پر مشوانی مجاہد کئی بار سکھوں کے قلعوں اور چوکیوں پر حملہ آور ہو چکے تھے، مشوانی قبیلے کے خلاف مہم ضروری تھی لیکن مہاں سنگھ اکیلا اس قابل نہ تھا کہ سری کوٹ پر حملہ کرے، اتفاق سے ان دنوں سکھوں کی ایک فوج فرانسیسی نژاد جرنیل ونطورہ کی کمان میں خراج کی وصولی کے لئے پشاور جا رہی تھی، جب یہ فوج حسن ابدال پہنچی تو ہری سنگھ اور مہاں سنگھ نے منت سماجت کر کے ونطورہ کو اس امر پر راضی کر لیا کہ پشاور کی طرف کوچ کرنے سے پہلے سری کوٹ پر حملے کے سلسلے میں ان کی مدد کرے ـــــ ونطورہ نے کچھ دن تک علاقے میں جا کر حالات کا جائزہ لیا اور سکھ سرداروں پر یہ بات واضح کی کہ خود سری کوٹ کے باشندوں کی یہ مجال نہیں کہ وہ سکھوں کی مخالفت کریں، جو بغاوت ہوتی ہے وہ اصل میں ہری پور کے میدانی علاقوں کے مسلمان سرداروں کی شہ پر ہوتی ہے اس لئے سری کوٹ پر حملے سے پہلے ان خوانین کی خبر لینی ضروری ہے، چنانچہ ونطورہ کے کہنے پر بوستان خان ترین کو جاگل سے، جلال خان دلازاک کو سرائے صالح سے اور راجہ ہاشم خان کو مانکرائے سے گرفتار کر کے ہری پور کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ سرداروں کے قید میں چلے جانے سے مسلمان آبادی کے حوصلے پست ہو گئے اور ونطورا نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے آسانی سے سری کوٹ کو فتح کر لیا۔ یہ سکھوں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ سری کوٹ کی فتح کے بعد ونطورہ تو اپنے لشکر کے ساتھ براستہ غازی عازمِ پشاور ہو گیا لیکن اس دشمنِ اسلام کے سکھانے پڑھانے سے حاکمِ ہزارہ سردار مہاں سنگھ نے کسی بہانے باقی کے سرکردہ خوانین کو بھی ہری پور کے قلعے میں بلا بھیجا اور پھر انتہائی مکاری اور سنگدلی سے بوستان ناں ترین، جلال خان، دلازاک، سخی خان جدون سالار، پائندہ خان، نلوکر کے بشیر محمد، صالح محمد اور سلیم شاہ مشوانی کو توپ دم کرا دیا۔

جب سری کوٹ کی مہم سے فراغت اور مسلمان سرداروں کو توپ دم کرانے کے بعد سردار ہری سنگھ نلوہ راولپنڈی پہنچا تو محمد خان ترین کو اپنے حضور طلب کیا اور کہا ـــــ "میں نے تمہارا سر پچپن ہزار روپیہ کے عوض مہاراجہ سے خریدا ہے تم اپنے گھر سے یا اپنے علاقہ سے یہ روپیہ مجھے دلواؤ۔ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہ ہو گی" محمد خان ترین نے جواب دیا ـــــ "میں اس وقت پابزنجیر قیدی ہوں، میرا کیا اختیار ؟ البتہ اگر مجھے رہا کیا جائے تو شاید مطلوبہ رقم ادا کر سکوں ـــــ"

محمد خان ترین کی بات معقول تھی لیکن ہری سنگھ نلوہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار محمد خان ترین ساشیر پنجرے سے نکل گیا تو دوبارہ اسے پنجرے میں ڈالنے والا کہاں سے آئے گا"۔ اس لئے سکھ سردار تلخ کلامی پر اُتر آیا اور حکم دے دیا کہ محمد خان ترین کو کٹڑ کہار کے قلعہ میں قید کر دیا جائے اور قلعہ دار کو ہدایت کی کہ اُسے روزانہ آدھ پاؤ آٹا کی روٹی ایک پاؤ نمک ڈال کر کھلائی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی خوراک اُسے ملنے نہ پائے"۔ ہزارہ کا نامور فرزند بطلِ حریت محمد خان ترین اس مصیبت کو قبول کرنے پر راضی ہوگیا، وہ سکھوں کی ہر سختی برداشت کرتا رہا لیکن سکھ حکومت نے اسی اذیت رسانی پر بس نہ کی بلکہ (جیسا کہ عام مشہور ہے) ہری سنگھ کے اشارے سے اسے کھانے میں زہر دے دیا گیا اور یہ عظیم سرفروش شہادت کا درجہ پا گیا۔

ہری سنگھ نلوہ، محمد خان ترین سے انتقام لے کر اپنا دل ٹھنڈا کر چکا تھا لیکن اسے پچپن ہزار روپیہ کی وہ رقم ابھی وصول نہ ہوئی تھی جو وہ محمد خان کے عوض سکھ مہاراجہ کو ادا کر چکا تھا۔ اس نے حاکم ہزارہ سردار مہاں سنگھ کو بلایا اور سمجھایا کہ اس نے پچپن ہزار روپیہ نقد ادا کرنے کے بعد سکھ حکمران سے محمد خان ترین کو خریدنے کی یہ مصیبت اس لئے اٹھائی تھی کہ ضلع ہزارہ میں سکھ حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔ اب جیسے بھی ہو پچپن ہزار کی یہ رقم اہلِ ہزارہ سے وصول کر کے مجھے دو ـــــ چنانچہ نلوہ کے کہنے پر سردار مہاں سنگھ نے سارے ضلع پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا، ہر گھر سے ڈھائی روپے کی رقم جبراً وصول کی جانے لگی، کساد بازاری اور سیاسی حالات کی ابتری کے باعث لوگ اتنی رقم ادا کرنے کے بھی متحمل نہ تھے۔ اس لئے کئی لوگوں کے مال مویشی نیلام کر دیئے گئے۔ کئی ایک کی زمینیں قُرق کر لی گئیں۔ کئی ایک کے گھریلو برتن اور دوسری چیزیں فروخت کی گئیں تب کہیں جا کر پچپن ہزار روپیہ کی یہ رقم پوری ہوئی۔ مہاں سنگھ نے یہ رقم ہری سنگھ نلوہ کو ادا کی تو اس کی جان میں جان آئی۔

محمد خان ترین اور دوسرے مسلمان رئیسوں کے مروانے کے بعد لوگ کچھ دب گئے تو سکھ حاکموں نے اور بھی کھل کر مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ سکھ دربار کے ایک حکم کے تحت مشوانی سیدوں کو سری کوٹ سے اس پاداش میں نکال دیا گیا کہ انہوں نے سکھ مظالم کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیا تھا، پورے پانچ سال تک مشوانی اپنے اہل وعیال سمیت مارے مارے پھرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے امن قائم رکھنے کی تحریری یقین دہانی کرائی تو ہری سنگھ نلوہ نے انہیں اپنے علاقوں کو واپس جانے

کی اجازت دے دی ۔

ان حربوں سے سکھوں نے بظاہر لوگوں کو دبا دیا لیکن دِل ہی دل میں لوگ سکھوں کے مظالم کو کوستے رہے، امب کے نواب پائندہ خان نے سکھ حکومت کے خلاف مسلسل جہاد کیا، سکھ اُسے امب کا نواب تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے تھے اور اس کے حریف کرپلیاں اور لالو گلی کے شیر محمد خان کی کھل کر حمایت کرتے تھے، جب شیر محمد خان سمجھ گیا کہ سکھ اُسے اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں تو وہ سکھوں سے جان چھڑا کر امب چلا گیا، پائندہ خان نے ایک موقع پر کچھ سکھ سپاہیوں کو قتل کرا دیا۔ تاہم کچھ عرصہ گزرنے کے بعد پھر مہاں سنگھ سے صلح صفائی کر لی اور اُسے تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ اسی اثنا میں پائندہ خان کے ہاں شادی کی ایک تقریب تھی۔ اُس نے اس سلسلے میں سرائے صالح سے چند طوائفوں کو بُلا بھیجا۔ طوائفیں امب جانے سے انکاری تھیں، آخر کار وہ ہر پور پہنچیں اور سردار مہاں سنگھ کی ضمانت چاہی، مہاں سنگھ نے پائندہ خان کی دوستی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی ضمانت پر طوائفوں کو امب بھیج دیا۔ طوائفیں کچھ دن وہاں رہیں، رقص و سرود کی محفلیں جمتی رہیں۔ لیکن اس دوران پائندہ خان کے بھائی مدد خان اور دوسرے تین چار رشتہ داروں نے بزور ان طوائفوں سے شادی رچالی۔ ان میں سے ایک طوائف (منکوحہ مدد خان) کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مہاں سنگھ کی داشتہ تھی۔ مہاں سنگھ نے اس واقع کا بُرا منایا۔ اس نے والیٔ امب کو بار بار تاکید کی کہ طوائفیں واپس کی جائیں لیکن امب والوں نے بات نہ مانی ـــــ مہاں سنگھ کے دل میں عناد تو تھا ہی۔ ایک دن جب پائندہ خان کے مقبوضہ علاقے کے کچھ آدمی سودا سلف کے لئے ہری پور آئے تو ان میں سے چار سرکردہ افراد کو مہاں سنگھ نے گرفتار کر لیا۔ پائندہ خان اس معاملے سے باخبر ہوا تو فوج لے کر نکلا اور دریائے سندھ کو پار کر کے کرپلیاں اور قادر آباد کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور چالیس سکھوں کو قیدی بنا لیا۔ یہ سکھ قیدی امب لے جائے گئے۔ ایک رات ان قیدیوں نے اپنے پہرہ داروں کو غافل پا کر انہی کے ہتھیار چھین کر پائندہ خان پر حملہ کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا تاہم اس کے کافی آدمی مارے گئے۔ اس کے باوجود پائندہ خان نے حوصلہ نہ ہارا اور سکھوں کے تین قلعوں در بند۔ گلی اور گڑھی کا محاصرہ کر لیا تاہم اس وقت تک چونکہ سکھوں نے کافی فوج ان قلعوں میں پہنچا دی تھی اس لئے پائندہ خان ان قلعوں کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۲۸ء کے آغاز میں جب ہری سنگھ نلوہ مظفر آباد کشمیر میں کسی مہم کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ سید احمد بریلوی کے مجاہدین نے دریائے سندھ کو پار کر کے تربیلا کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے سے ہزارہ میں مجاہدین کا اثر و رسوخ خاصا بڑھ گیا۔ یہ حال دیکھ کر ہری سنگھ نلوہ جلد ہی مجاہدین کے خلاف سرگرم عمل ہو گیا، دریائے سندھ کے دائیں کنارے پھلڑہ کے قریب سکھ لشکر اور مجاہدین میں آمنا سامنا ہوا۔ مجاہدین کی تعداد کل ساٹھ تھی البتہ کچھ قبائلی بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے، مجاہدین اپنے سالار سید احمد علی شاہ کی کمان میں ڈٹ کر لڑے۔ مقابلہ سخت تھا اس کے باوجود ایک ایک مجاہد اور اُن کا قائد دادِ شجاعت دیتا ہوا اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر گیا۔ ان کا ایک بھی فرد زندہ نہ بچا تاہم انہوں نے باطل کے سامنے سر نہ جھکایا۔

پائندہ خان نواب امب اس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا اس کے علاقے میں ایک طرف تو مجاہدین کے قدم مضبوط ہو رہے تھے دوسری طرف سکھوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ عوام لازماً مسلمان مجاہدین سے تعاون کرنے کے حامی تھے، نواب امب اس عوامی رائے کے مقابلے کی تاب نہ لا کر اگرور چلا گیا۔ جہاں سے اس نے اپنے بیٹے جہانداد کو ہری سنگھ کے پاس مانسہرہ بھیج کر اس سے امداد طلب کی۔ چنانچہ پائندہ خان سکھ فوج کی مدد سے مجاہدین سے اپنے قلعے واپس لینے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اب سکھوں کے آگے سر نہ اٹھا سکتا تھا۔ سکھ اس کے بیٹے جہاں داد کو یرغمالی بنا کر لاہور لے گئے، مقصد یہ تھا کہ پائندہ خان دوبارہ مجاہدین کی طرف رجوع نہ کرے۔

اسی سال کے آخر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور جاتے ہوئے اپنا ایک قاصد سعد اللہ خان نواب امب پائندہ خان کے پاس بھیجا، راجہ کا مطلب یہ تھا کہ نواب امب کو مجاہدین کے خلاف بھڑکایا جائے تاہم سکھ حکمران کی چال اُلٹی پڑی۔ بجائے اس کے کہ پائندہ خان سکھ دربار میں حاضری دیتا۔ اس نے سکھ وکیل یا قاصد ہی کو گرفتار کر لیا اور سکھ راجہ کو پیغام بھیجا کہ جب تک اس کے لڑکے جہانداد خان کو واپس نہ کیا جائے گا سکھ وکیل بھی ریاست امب کی حراست میں رہے گا۔ یہ تیر نشانے پر لگا اور جہانداد خان کو رہا کر دیا گیا، بیٹے کی آزادی کے بعد پائندہ خان نے چپ سادھ لی اور کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیا۔

۱۸۳۱ء میں ہری سنگھ نلوہ نے اس بنا پر کہ گکھڑ راجوں نے نذرانے کی کافی رقم دبا رکھی ہے خانپور کے

علاقے پر حملہ کر دیا۔ گکھڑ سکھ فوج کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے، خانپور میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کے بعد وہاں سکھ فوج متعین کر دی گئی اور متواتر چھ برس تک گکھڑ راجے اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے، آخر ۱۸۳۷ء میں ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رُو سے سکھ دربار نے گکھڑوں کو ان کا سارا علاقہ اجارے پر دے دیا۔

اگلے سال ہری سنگھ نے ماندڑ گکھڑوں کے سردار شاہ ولی خان پر بغاوت کا الزام لگا کر حملہ کر دیا اور علاقہ دنّا پر قبضہ کر کے وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ چار سو مسلح سکھ سپاہیوں کا ایک دستہ قلعہ میں رہنے لگا اور لوگ اُن کے خوف سے چُپ ہو رہے۔

۱۸۳۶ء میں کچھ کرڑال سرداروں نے بھی سکھوں کے خلاف سر اٹھایا لیکن مہاں سنگھ نے انہیں جلد ہی دبا دیا۔

۱۸۳۷ء میں ہری سنگھ نلوہ جمرود کے قریب ایک لڑائی میں مارا گیا تو مہاں سنگھ کے (جو اس لڑائی میں ہری سنگھ کے ہمراہ تھا) کان کھڑے ہوئے وہ فوراً ہزارہ پہنچ گیا تاکہ مسلمان قبائل کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ ہری سنگھ کے مرنے پر سکھ دربار میں ہزارہ کی گورنری کے مسئلے پر کافی لے دے ہوئی۔ بالآخر سردار تیجا سنگھ کو ہزارہ کا گورنر بنا دیا گیا۔

۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۱ء تک کے چار سال ہزارہ کے حالات نسبتاً بہتر رہے لیکن اس کے بعد پھر ایک بلا آن نازل ہوئی۔ ۱۸۴۱ء میں سردار تیجا سنگھ نے اپنی طرف سے پیارا مل کو ہزارہ کا کاردار (ریونیو آفیسر) مقرر کیا۔ اس شخص نے از سرِ نو زمینوں کے اجارے نیلام کرنے شروع کر دیئے۔ اس سال اجناس کا نرخ اُونچا تھا چنانچہ اجارہ کی رقم چار لاکھ تک جا پہنچی لیکن فصل عمدہ ہوئی تو غلّے کا نرخ گر گیا۔ یہاں تک کہ لوگ اجارہ کی رقم بھی پوری نہ کر سکے، انہوں نے بار بار سکھ دربار سے دیہ اجارہ پر نظرِ ثانی کی درخواستیں کیں لیکن حکومت پر کچھ اثر نہ ہوا اور پیارہ مل نے بزورِ اجارہ کی رقم کی ایک ایک پائی لوگوں سے وصول کی۔

جولائی ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا۔ لیکن ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو وہ بھی چل بسا جس پر ۱۴ جنوری ۱۸۴۱ء کو سردار شیر سنگھ پنجاب اور صوبہ سرحد کا حاکم بنا۔

سکھوں کا نظامِ حکومت کچھ عجیب سا تھا وہ ہر علاقے کے مالیہ کا اجارہ نیلام کرتے جو شخص بڑھ چڑھ

کر بولی دینا، اجارہ دار بن جاتا۔ پھر یہ بات اس کی مرضی پر ہوتی کہ وہ عوام سے کتنا اور کس طرح روپیہ وصول کرے۔ استحصال بالجبر سے کام لیا جاتا۔ سکھ فوج اجارہ دار کو تحفظ فراہم کرتی۔ جو شخص مالیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا اس کے مال مویشی اور سامان قرق کر لیا جاتا ـــــ یہاں تک کہ مختلف علاقوں کی افسری کے لئے بھی یہی اصول کارفرما تھا جو شخص مہاراجہ کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ نذرانہ پیش کرتا اسے حاکم بنا دیا جاتا جو مطلوبہ رقم ادا نہ کر سکتا اسے عہدے سے معزول کر دیا جاتا ـــــ گھوڑوں سہیروں اور زر و دولت سے جو عشق مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تھا۔ شاید ہی دنیا کے کسی حکمران کو کبھی ہوا ہو۔ معزول شاہِ افغانستان شجاع الملک سے کوہِ نور حاصل کرنے کے لئے سکھ مہاراجہ نے بادشاہ اور اس کے اہل و عیال پر جو مظالم روا رکھے اس کی نظیر ملنی محال ہے خود اپنے ساتھیوں سے بھی رنجیت سنگھ کا یہی سلوک تھا، ہری سنگھ نلوہ کی موت کے بعد حاکم ہزارہ سردار مہاں سنگھ کو مہاراجہ نے لاہور طلب کیا تو اُس سے گھوڑوں، خچروں، بازوں وغیرہ کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ نقد طلب کیا گیا۔ جب مہاں سنگھ اتنی بڑی رقم ادا نہ کر سکا تو مہاراجہ ناراض ہو گیا اور اسے ہزارہ کی سرداری سے ہٹا کر سردار تیجا سنگھ کو اس کی جگہ حاکم مقرر کر دیا ـــــ بعد میں ہری سنگھ نلوہ کے اہلِ خاندان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ ہری سنگھ کی موت کے بعد اس کا اکثر اثاثہ سکھ حکمران نے ضبط کر لیا۔

ہزارہ کے پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر میجر جیمس ایبٹ نے سکھ طرزِ حکومت کے متعلق ایسی ہی رائے دی ہے کہ

"ملک کے داخلی انتظام و امن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی، مختلف قبیلوں، علاقوں اور افراد کی خانہ جنگیوں کو روکنے کے لئے کوئی اقدام کبھی نہ کیا جاتا اور اگر کیا جاتا تو یہی کہ جھگڑنے والے فریقوں پر بھاری جرمانہ لگا کر اس کی رقم سکھوں کے خزانے میں جمع کرا دی جاتی۔ ڈاکہ زنی اور دیہات کو لوٹنے کی وارداتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ مجبور و امیدانی دیہات کے خان خوانین اور ارباب مجرموں کے خلاف نکلتے تو حکومت بھی برائے نام ان کی حمایت کرتی ـــــ"

سردار تیجا سنگھ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۳ء تک دو سال ہزارہ کا حاکم رہا۔ ان دنوں پائندہ خان آف امب سے سکھوں کی جھڑپیں جاری رہیں، پائندہ خان جانتا تھا کہ سکھوں کی منظم اور مسلح فوج سے مقابلہ محال ہے۔ اس لئے وہ گوریلا طرز کی جنگ کو اپنائے ہوئے تھا۔ جب بھی موقع دیکھتا سکھوں پر ضرب لگاتا اور

غائب ہو جاتا۔ سکھ کاردار پیارا مل کشمیری اکثر مالیہ کی وصولی کے لئے دیہات کو جاتا تو وہاں سنگھ اور بدری ناتھ کی کمان میں دو پلٹن فوج ساتھ رکھتا، ایک دن وہ دریائے سندھ کے کنارے کے دیہات کلائی اور بدھنگ میں مالیہ کی وصولی کے لئے گیا ہوا تھا کہ پائندہ خان آف امب نے کرپلیاں سے نکل کر سکھوں پر حملہ کر دیا۔ حملہ اتنی شدت سے تھا کہ سکھ فوج گھیرے میں آگئی۔ انہوں نے سکھ دربار سے مزید کمک بھیجنے کی درخواست کی، اتفاق سے سردار شام سنگھ اٹاری والا اور میاں اربیل سنگھ ان دنوں فوج لے کر پشاور کی طرف جا رہے تھے۔ چھچھ پہنچنے پر انہیں پیغام ملا کہ سکھ لشکر گھر گیا ہے اور اس کی حالت نازک ہے اس پر یہ دونوں سکھ سردار اپنے سپاہیوں کو لے کر اُدھر بڑھے اور نواب امب کے غازیوں کے بالمقابل خیمہ زن ہو گئے۔ اس دفعہ دریائے سندھ میں خلاف معمول پانی کم تھا، اس لئے سکھ لشکر نے عین دریا کی گزرگاہ میں ڈیرہ لگا رکھا تھا ـــــ ۲ر جون ۱۸۴۱ء کا دن تھا ـــــ ناگاہ لوگوں نے شمال سے کوئی سیاہ چیز دریا میں بڑھتی ہوئی دیکھی۔ ساتھ ہی ایک مہیب گرج سنائی دی، ابھی لوگ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اتنا زبردست سیلاب آیا جس نے میلوں تک سارے علاقے کو پانی سے ڈھانپ لیا۔ سکھ لشکر کے کچھ سپاہیوں نے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچائی۔ باقی تمام سپاہی، ساز و سامان اور جانور دریا برد ہو گئے امب کی فوج کو اس سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔

اس سیلاب کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کئی سالوں سے گلگت کے نواح میں ایک برفانی تودہ اگلیشیر) دریا کی گزرگاہ میں گر پڑا تھا جس سے دریا میں پانی کا بہاؤ رک گیا تھا، پہاڑ پر سے لکڑی، پتھر مٹی اور کنکر جو کچھ بھی آتا وہیں رک جاتا۔ اس رات اچانک وہ برفانی تودہ پھٹ گیا، ایک مہیب آواز آئی۔ کالے سیاہ پانی کا ریلہ ایسا آیا جو راستے کی ہر چیز کو بہا کر لے گیا۔

چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ پہلے لکڑیاں بہتی ہوئی آئیں، پھر سانپ، شیر، چیتے اور دوسرے جنگلی جانور لڑھکنیاں کھاتے آئے، پھر پتھروں کا ریلا آیا اور سب سے آخر میں میلا، سیاہ، بدبودار پانی بندوق کی گولی کی سی تیزی کے ساتھ آیا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمام آبادیاں ویرانوں میں تبدیل کر دیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر دُور دُور تک ایک مکان بھی اس سیلاب سے محفوظ نہ رہا۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے فصلیں دریا برد ہو گئیں۔ زمین زیر آب آگئی۔ سارا کنارہ پتھروں سے اَٹ گیا، امب کا پورا علاقہ ایک جھیل بن گیا ـــــ پائندہ خان کو سب سے زیادہ غم اپنے بیٹے جہاں داد کا تھا، جو سکھ کیمپ میں پرغمالی کے

طور پر نظر بند تھا۔ جب پانی اترا تو اس نے بہت سا انعام و اکرام دے کر ایک مشاق ملاح کو دوسرے کنارے پر بھیجا اور کہا کہ اگر جہاں داد خان کو زندہ پائے تو بندوق چلا کر اطلاع دے، ملاح پہنچا تو جہانداد خان زندہ سلامت تھا۔ اس نے بندوق سر کی تو پائندہ خان کی جان میں جان آئی —— بتایا جاتا ہے کہ اس سیلاب کے باعث پانی کی سطح اتنی بلند ہو گئی تھی کہ دریائے سندھ نے دریائے کابل (لنڈا) کا پانی قبول کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر دریائے کابل الٹا بہنے لگا جس سے نوشہرہ، کلان، نوشہرہ چھاؤنی اور دوسرے گاؤں زیرِ آب آ گئے۔ اکوڑہ، جہانگیرہ، خیر آباد اور نوشہرہ میں سکھوں کے بنائے ہوئے قلعے مسمار ہو گئے۔ اسی طرح اباسین (دریائے سندھ) کے کنارے تربیلہ، دربند اور گڑھی کے قلعے بھی زمین سے پیوست ہو گئے۔ دریا کے کناروں کی آبادی میں سے جو لوگ بچ رہے وہ سالہا سال تک ایسے بے گھر اور پریشان حال تھے کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ اس قیامتِ صغریٰ کو اللہ کا قہر سمجھتے ہوئے دونوں طرف کے لشکر اپنے اپنے ٹکانوں کو واپس ہو گئے اور کچھ عرصے کے لئے لڑائی بند ہو گئی۔

اس سیلاب کے چند مہینے بعد راجہ پرتاب سنگھ (جسے اس کے باپ مہاراجہ شیر سنگھ نے کشمیر اور ہزارہ کا علاقہ جاگیر کے طور دے رکھا تھا) ہزارہ آیا اور شنکیاری میں اترا۔ اس نے اپنی طرف سے گلاب سنگھ کو کشمیر کا گورنر مقرر کر رکھا تھا۔ پرتاب سنگھ کا ارادہ تھا کہ پائندہ خان آف امب سے ملاقات کرے لیکن پائندہ خان نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس حکم عدولی پر غصے میں آ کر پرتاب سنگھ نے دریائے سندھ (اباسین) کا تمام مشرقی علاقہ پائندہ خان کی بجائے اس کے بھائی مدد خان کو دے دیا اور پائندہ خان دریا کے مغربی کنارے پر صرف تھوڑی سی زمین کا مالک رہ گیا۔ یہ انتظام کر کے شہزادہ پرتاب سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ تو لاہور چلے گئے البتہ اربیل سنگھ کو ہزارہ کا حاکم بنا کر چھوڑ گئے —— پائندہ خان اسی سال کے آخر میں وفات پا گیا۔

اس دوران مہاراجہ رنجیت سنگھ اس عالمِ فانی سے کوچ کر گیا تھا اور لاہور کا سکھ دربار سازشوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ شیر سنگھ اور اس کا بیٹا پرتاپ سنگھ لاہور میں قتل کر دیئے گئے اور کنور دلیپ سنگھ کو (جو ابھی بچہ ہی تھا) گدی پر بٹھا دیا گیا۔ نئے سکھ حکمران نے سردار اربیل سنگھ کو ہزارہ سے لاہور بلا لیا اور اس کی جگہ دیوان مولراج کو ناظم ہزارہ

مقرر کر دیا گیا۔ (یہ مولراج ملتان کا دیوان مولراج نہ تھا بلکہ دوسرا شخص تھا) مولراج نسبتاً مدبر اور باحوصلہ انسان تھا، اس نے مسلمانانِ ہزارہ سے نرمی اور رواداری کا سلوک کیا۔ اس نے مالئے کی شرح کم کر دی اور اس طرح اہلِ علاقہ اطمینان کا سانس لینے لگے۔ لیکن دیوان مولراج کی یہ کوششیں بے وقت ثابت ہوئیں۔ باہمی خانہ جنگیوں اور سازشوں سے سکھوں کی حکومت کمزور اور بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔ زوال اس کا مقدر بن چکا تھا۔ کوئی تدبیر بھی اب اس زوال کو ٹال نہ سکتی تھی۔

جون ۱۸۴۴ء میں کشمیر کے گورنر راجہ گلاب سنگھ نے جموں کے دیوان ابراہیم کو کچھ فوج دے کر چلاس فتح کرنے کو بھیجا، جب یہ فوج کا خان پہنچی تو سید احمد شہید کے مجاہدین کا خان کے سیدوں اور بالاکوٹ کے سواتیوں نے اسے روکا۔ دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہوئی جس میں سکھوں کو شکست کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

۴۶-۱۸۴۵ء میں سکھوں کی طاقت مزید کمزور ہو گئی۔ انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد وہ اپنے زخم چاٹ رہے تھے کہ سارے محروسہ ممالک سے بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ ہزارہ کے مسلمان سرداروں نے بھی ایک ایک کر کے سکھوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ دیوان مولراج نے ان شورشوں کو دبانے کی پوری کوشش کی تاہم ان مقابلوں میں سے اکثر میں سکھ فوج کو منہ کی کھانی پڑی ۱۸۴۶ء شروع ہوا تو سارے ہزارہ سے سکھوں کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ لے دے کے اب ہری پور ہی ان کا آخری مضبوط مورچہ رہ گیا تھا۔ لیکن اس سال ۷ مارچ کو مسلمان مجاہدین نے ہری پور پر بھی دھاوا بول دیا۔ مجاہدین آزادی اور مسلمان عوام کئی دنوں تک شہر کو لوٹتے اور جلاتے رہے۔ ترین سردار غلام خان نے سکھوں کو شکست دے کر ہری پور کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ کرڑال، جدون، دلانا ک طاہر خیلی اور سواتی قبیلے بھی اپنے اپنے علاقوں کی بازیابی میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں کسی کے سینگ سمائے اپنی حکومت قائم کر بیٹھا۔ حسن علی خان کرڑال نے گڑھی کا قلعہ سکھوں سے چھین لیا۔ مجاہدین نے کئی دیہات سکھ تسلط سے آزاد کرا لئے۔ اگرور اور امب کے خوانین بھی اپنے علاقے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔ مشوانی سیدوں نے سری کوٹ کے قلعے پر، راجہ حیدر بخش نے خان پور گکھڑاں پر، نواب خان تنولی نے شیروان پر، جدون قوم نے بگڑہ پر اور غلام خان ترین نے جاگل پر قبضہ جما لیا۔ لے دے کے اب ہری پور کا شہر اور قلعہ سکھوں کے پاس رہ گیا تھا، دیوان مولراج نے اِدھر اُدھر سے

فوج منگوا کر قلعے کو مستحکم بنایا۔ شہر ہری پور کے لوگ لڑائی سے بچنے کے لئے اپنے مکان اور دکانیں خالی کر کے محفوظ مقامات کو جانے لگے تو سکھوں نے شہر کے دروازوں پر اپنے فوجی پہرہ دار بٹھا دیئے، لوگوں کے لئے اب "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والا معاملہ بن گیا۔ غازیوں نے آگے بڑھ کر ہری پور شہر کا محاصرہ کر لیا اور قلعے کی طرف جانے والی پانی کی نہر بند کر دی، بارہ دن تک تو سکھ قلعے کے تالابوں کا پانی پیتے رہے لیکن جب وہ پانی بھی ختم ہو گیا تو مرتا کیا نہ کرتا۔ بادلِ ناخواستہ مقابلے کے لئے باہر نکلے، دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئیں۔ غازیوں کی کمان اس وقت غلام خان ترین، خانی زمان خان طاہر خیلی اور امیر المجاہدین مولوی ولایت علی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جوش سے لڑے کہ مخالفوں کے چھکے چھوٹ گئے، تاہم سکھوں کی خوش قسمتی کہ عین اس موقع پر انہیں پشاور سے کمک پہنچ گئی، سکھ لشکر کے توپ خانہ نے اندھا دھند نواحی دیہات پر گولہ باری کر کے انہیں تہس نہس کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر غازی گنڈ گڑھ پہاڑ کے مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، سکھ فوج نے نہر (کٹھ) پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور وہ آگے بڑھتی ہوئی سرائے صالح تک پہنچ گئی۔ نئی آنے والی فوج کے سردار کاہن سنگھ نے نواحی دیہات کے لوگوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور جو مسلمان ہاتھ آیا تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

سکھوں کو بظاہر تو عارضی کامیابی حاصل ہو گئی تاہم دیوان مولراج بھانپ گیا کہ مسلمانوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرنا اب اس کے بس کی بات نہیں، مجاہدین دوبارہ لشکر کو ترتیب دے رہے تھے لہٰذا متوقع حملے سے پہلے ہی دیوان مولراج نے قلعے کو خالی کر کے ہزارہ سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بالآخر ۱۶ اپریل ۱۸۴۶ء کو تمام سکھ فوج ہری پور سے نکل کر حسن ابدال پہنچ گئی۔ اس کے جاتے ہی غلام خان ترین فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے ہری پور میں داخل ہوا۔

سید احمد بریلوی نے ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو راہِ حق میں لڑتے ہوئے شہادت پائی تھی، اس کے پندرہ سال کے اندر اندر سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تحریکِ مجاہدین نے لوگوں میں اسلامی جذبۂ جہاد اُجاگر کرنے میں نمایاں کام کیا، اب اس کامیابی کے بعد لوگوں نے عزم صمیم کر لیا کہ ملک میں مکمل طور پر شرعی نظام قائم کیا جائے۔ وہ مسلمان خواتین کی مطلق العنان حکومتیں بھی دیکھ چکے تھے اور سکھا شاہی کے مظالم بھی برداشت کر چکے تھے، دنیوی نظاموں سے اکتا کر اب مسلمان

عوام اسلام کے عدل پر مبنی نظام کے سائے تلے آنے کے متمنی تھے، سکھوں کے چلے جانے کے بعد تمام قبیلوں کے سربراہوں اور سرکردہ شخصیتوں کا نمائندہ اجتماع (جرگہ) منعقد ہوا جس میں اتفاق رائے سے سیّد اکبر شاہ ساکن ستھانہ کو علاقے کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا، غلام خان ترین اور نواب خان تنولی کو وزیر مقرر کیا گیا۔ شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا اور ساری قوم نے عشر دینا منظور کر لیا، انگریزی حکومت کے قیام تک یہ شرعی نظام قائم رہا۔ تاہم اس اسلامی حکومت کو کام کرنے کا بہت تھوڑا عرصہ ملا تھا، اس لئے لوگ اس مبارک دور کو "لنڈی مسلمانی" (مختصر عرصہ کی اسلامی حکومت) کہہ کر پکارتے ہیں۔

اُدھر پنجاب کی سکھ حکومت اب آخری سانس لے رہی تھی، سبھراؤں اور فیروزپور میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد سکھوں کا خزانہ خالی ہو چکا تھا، اتنا بھی نہ تھا کہ وہ انگریز کی طرف سے عائد کردہ تاوانِ جنگ کی رقم ہی ادا کر سکتے۔ چنانچہ تاوانِ جنگ کی رقم (دو کروڑ) پوری کرنے کے لئے سکھ دربار نے کشمیر اور جموں کی ریاست ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے عوض راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کو "مہاراجہ" کا خطاب دیا اور اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانے تک ہزارہ ڈویژن کے موجودہ علاقے انتظامی طور پر صوبہ کشمیر ہی سے وابستہ تھے اس لئے ہزارہ بھی گلاب سنگھ ڈوگرہ کی عملداری میں چلا گیا۔ ڈوگرہ حکمران نے دیوان کرم چند کو پچھلی اور بالائی ہزارہ اور دیوان ہری چند کو زیرین ہزارہ کا حاکم بنا کر مالیے کی وصولی کے لئے بھیجا۔ ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء کو ہری چند خان پور کے راستے ہری پور آیا لیکن آتے ہی بیمار پڑ گیا۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اہلِ ہزارہ سے مالیہ کی وصولی قریب قریب ناممکن بات تھی۔ چنانچہ بیماری کا بہانہ کر کے وہ قاضی نادر علی کو اپنی جگہ حاکم مقرر کرنے کے بعد جموں واپس چلا گیا۔ چند مہینے بعد جموں دربار کی طرف سے دیوان جوالا سہائے کو ہزارہ کے معاملات کی چھان بین کے لئے بھیجا گیا۔ وہ کافی دنوں تک ہزارہ کے مختلف مقامات میں مقیم رہا اور حالات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد جان گیا کہ ضلع ہزارہ سکھوں کے لئے ہمیشہ کو دردِ سر بنا رہے گا۔ اس لئے وہ ڈوگرہ فوج اور قاضی نادر علی کو اپنے ساتھ واپس جموں لے گیا اور راجہ گلاب سنگھ کو مشورہ دیا کہ جیسے بھی ہو ہزارہ سے پیچھا چھڑائے۔

اس وقت تک لاہور کے سکھ دربار میں انگریز ریذیڈنٹ کا تقرر عمل میں آچکا تھا جس نے تمام سیاسی اور سرکاری امور سنبھال لئے تھے اور مختلف علاقوں میں سکھ افسروں کی مدد کے لئے انگریز افسروں کو بھی مقرر کیا جا چکا تھا۔ لاہور دربار کی طرف سے ہزارہ میں میجر جیمز ایبٹ کو مقرر کیا گیا تھا تاکہ وہ بندوبست مال اور حد بندی وغیرہ کے فرائض انجام دے، میجر جیمز کے مشورے سے انگریزوں نے ضلع ہزارہ خود لے لیا اور اس کے بدلے میں جموں کا کچھ علاقہ ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ کو دے دیا۔ خیال ہے کہ میجر جیمز کی نظر ہزارہ کے صحت افزا مقامات اور خوشگوار آب و ہوا پر تھی جبکہ گلاب سنگھ کو یہ پورا احساس تھا کہ مسلمان مجاہدین کی اس سرزمین پر اُسے ہرگز قابو حاصل نہ ہو سکے گا۔ دونوں فریق اس نئے انتظام پر دل ہی دل میں خوش تھے اس لئے اسے فوراً قبول کر لیا۔

اس سے قبل راجہ گلاب سنگھ نے پوری کوشش کی تھی کہ ہزارہ پر اس کا تسلط قائم رہے، وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا۔ ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء کو اس کا مقرر کردہ کاردار ہری چند ہری پور پہنچا تو گکھڑ سردار راجہ حیدر بخش نے اسے مالیہ کی ادائیگی شروع کر دی، کئی دوسرے علاقوں کے خان بھی سکھوں کے زیر نگین آ گئے۔ دیوان ہری چند نے امب کے جہاں داد خان کو اس صلے میں کہ اس نے سکھ قیدیوں سے اچھا سلوک کیا تھا۔ کُلائی اور بند ناک کے علاقے بھی جاگیر کے طور دے دیئے۔

جس زمانے میں انگریز ریذیڈنٹ نے لاہور کے سکھ دربار کا چارج سنبھالا، کشمیر پر سکھوں کی جانب سے شیخ امام الدین گورنری کے عہدے پہ فائز تھا۔ اس نے راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو (جس نے ریاست ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے عوض خریدی تھی) کشمیر کا چارج دینے سے انکار کر دیا، جس پر سکھ دربار کی طرف سے دیوان کرم چند، مسٹر ایگنیو (AGNEW) اور لفٹیننٹ لمسڈن کی قیادت میں مظفر آباد کے راستے ایک سکھ لشکر گڑھی بھیجا، ۶ جنوری ۱۸۴۷ء کو جب یہ سکھ لشکر گڑھی حبیب اللہ کے قریب درّے سے گزرا تو سید احمد شہید کے مجاہدین نے اس کا راستہ روکا۔ مجاہدین یقیناً کامیاب ہو جاتے لیکن بعض سواتی خوانین نے درپردہ سکھوں سے ساز باز کر لی، جس کے صلے میں سکھوں نے انہیں مستقل جاگیر عطا کر دی۔

سکھوں کی گرفت کمزور پڑتے ہی سارے صوبہ سرحد اور پنجاب میں طوائف الملوکی مچ گئی۔ کابل کے حکمران بھی اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں کرنے لگے، چنانچہ ان کے ایک لشکر نے پشاور سے ہوتے ہوئے ۳ر جنوری ۱۸۴۸ء کو اٹک کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کلیدی مقام پر قبضے سے امیرِ کابل کا حوصلہ بڑھا تو اس نے اپنے ایک بیٹے غلام حیدر خان کو کچھ فوج دے کر ہزارہ کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ سکھوں کی طرف سے ان دنوں میجر جیمس ایبٹ ہزارہ کا ناظم تھا۔ افغان حملے کا سُن کر اس نے شیرگڑھ کے قلعہ میں کافی فوج جمع کر لی تاکہ ضرورت پڑنے پر کابلیوں کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ تاہم اس کی نوبت آنے نہ پائی۔

اُدھر ۱۹ر اپریل ۱۸۴۸ء کو سکھوں اور انگریزوں کے مابین دوسری بار جنگ چھڑ گئی۔ ملتان کا سکھ حاکم باغی ہو گیا اور اس نے انگریزوں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ہزارہ میں متعین فوج اس صورتِ حال کے پیشِ نظر عازمِ ملتان ہو گئی۔ سکھوں میں انگریزوں کے خلاف اتنی نفرت پیدا ہو چکی تھی کہ وہ کسی یورپی افسر کی بات ماننے کو تیار نہ تھے، چنانچہ ہری پور کے سکھ تو پخانہ کے یورپین کمانڈر کو خود اس کے سپاہیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس وقت تک کیپٹن جیمز ہزارہ میں قدم جما چکا تھا۔ اس نے بہت سے مسلمان سرداروں کو ساتھ ملا لیا تھا۔ مسلمان جو پہلے ہی سکھ مظالم سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ سکھوں کے مقابلے میں انگریز کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

۲۱ر فروری ۱۸۴۹ء کو گجرات میں سکھوں کو وہ شکست ہوئی جس سے سکھ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، اس لڑائی میں کابلی فوجیوں نے سکھوں کی مدد کی تھی۔ وہ اُن کی طرف سے انگریزوں سے لڑے بھی تھے لیکن سکھوں کی شکست کے بعد وہ اٹک سے بوریا بستر لپیٹ کر ایسے فرار ہوئے کہ کابل پہنچ کر ہی دم لیا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان ڈیرہ اسمٰعیل خان صوبہ سرحد کا انتہائی جنوبی ضلع ہے، پندرھویں صدی عیسوی میں اس کی بنیاد سردار ملک سہراب کے ہاتھوں پڑی جس نے اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل خان کے نام اس کا نام ڈیرہ اسمٰعیل خان رکھا۔ احمد شاہ ابدالی کے بعد مدتوں ملتان کے علاقے ان کی اولاد کے تسلط میں رہے، سکھ راج کے آغاز پر ملتان پر نواب مظفر خان سدوزئی برسرِ اقتدار تھے، اس وقت تک ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان اور نواحی علاقے ملتان ہی کے

صوبے میں شامل تھے۔ ۱۷۹۵ء میں نواب مظفر خان نے منڈا، لیہ اور منکیرہ کے علاقے نواب محمد خان کی تحویل میں دے دیئے، نواب منکیرہ نے بعد میں اپنی طرف سے دیوان مانک رائے کو ڈیرہ اسمٰعیل خان کا ناظم مقرر کر دیا، یہ ہندو دیوان اتنا خود سر ہو گیا کہ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ڈیرہ اور نواحی علاقوں پر حملہ کرنے اور سکھ سلطنت میں شامل کر لینے کی ترغیب دی۔

سکھوں کی حکومت شروع ہوئی تو ڈیرہ اسمٰعیل خان پر سدوزئی ملتانی پٹھانوں کے سردار نواب حافظ احمد خان کی حکومت تھی جو نواب منکیرہ محمد خان کے داماد تھے جبکہ منکیرہ میں نواب محمد خان کے جانشین شیر محمد خان حکمران تھے، اپریل ۱۸۱۷ء میں مہاراجہ نے منکیرہ پر پیش قدمی کی، نواب منکیرہ نے اپنی کمزوری دیکھتے ہوئے مذاکرات شروع کئے۔ مہاراجہ نے اس سے ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ زرِ اجارہ کا مطالبہ کیا۔ تاہم پچاس ہزار روپیہ پر بات طے ہو گئی۔

ستمبر ۱۸۱۷ء میں مہاراجہ منکیرہ جا دھمکا اور بزورِ خراج کی رقم وصول کی، ۱۸۲۱ء میں سکھ حکمران نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ ان علاقوں پر حملہ کیا اور بہت سے قلعے فتح کر لئے۔ سکھ فوج نے منکیرہ کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم بعد میں نواب سے صلح کی شرائط طے ہو گئیں سکھ حکمران نے منکیرہ کے سارے علاقہ کو سکھ سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس علاقے کی آمدنی تقریباً دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی، نواب کو گزارے کے لئے ڈیرہ اسمٰعیل خان کی حکومت بطور جاگیر دے دی گئی۔

نواب احمد خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا شاہ خرچ انسان تھا، سکھوں کے ڈر سے اس نے بہت بڑی فوج بھرتی کر رکھی تھی۔ اتنی فوج کا گزارہ مشکل ہو گیا تو اس نے تاجروں پر ٹیکس بڑھا دیئے اور لوگوں سے زیادہ شرح پر مالیہ وصول کیا جانے لگا، اس ابتری کو دیکھ کر ٹانک کے نواب سرور خان کٹی خیل نے سیاسی فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ قبائل کا ایک بہت بڑا لشکر اپنے بیٹے اللہ داد خان کے تحت ڈیرہ روانہ کر دیا۔ نواب حافظ احمد خان اسے روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ سرور خان کی فوج کو شکست ہوئی، نواب ڈیرہ نے آگے بڑھ کر ٹانک کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم دونوں مسلمان سرداروں میں صلح ہو گئی۔ حافظ احمد خان ۱۸۲۵ء میں وفات پا گئے۔

حافظ احمد خان کی وفات کے بعد ان کے جانشین نواب شیر محمد خان کو بڑی مشکلات کا سامنا

کرنا پڑا، سکھوں کے مطالبات بڑھتے ہی گئے۔ نواب ڈیرہ یہ مطالبات پورے کرنے سے عاجز آگیا۔ بالآخر ۱۸۳۶ء میں سکھوں نے ڈیرہ اسمٰعیل خان کا انتظام مکمل طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اپنا ایک کاردار لکھی مل وہاں مقرر کر دیا۔ اور نواب ڈیرہ کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ لکھی مل ۱۸۴۳ء تک ڈیرہ کا دیوان رہا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا دیوان دولت رائے اس کا جانشین قرار پایا۔

۱۸۴۷ء میں سکھ دربار کی جانب سے ہربرٹ ایڈورڈز ڈیرہ اور بنوں کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو عوام نے دیوان دولت رام کے مظالم کے خلاف اس سے شکایت کی۔ چنانچہ اس نے دیوان دولت رائے کو معزول کر کے جنرل وان کورٹ لینڈ کو اس کی جگہ کاردار مقرر کر دیا ـــــ ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو تمام سکھ مقبوضات کی طرح ڈیرہ اسمٰعیل خان پر بھی برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔

بنوں بنوں ایک میدانی علاقہ ہے جسے دریائے کرم کی نہریں سیراب کرتی ہیں، ۱۷۸۸ء میں اسے نادر شاہ نے فتح کیا، بعد میں احمد شاہ ابدالی کی فوجیں ہندوستان پر حملہ آور ہوتے وقت تین چار مرتبہ ادھر سے گزریں، تاہم احمد شاہ بابا کے جانشینوں کا برائے نام تسلط اس علاقہ پر قائم رہا۔ وہ کبھی کبھی آتے اور لگان کی جو رقم وصول ہوتی لے کر چلتے بنتے ۱۸۱۸ء میں منکیرہ کے نواب نے بنوں کے علاقہ مروت کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تاہم نواب کا یہ قبضہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اسے خود سکھوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ ۱۸۲۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ دریائے سندھ کو پار کر کے پہلی بار سرزمین بنوں پر وارد ہوا۔ وہ عیسیٰ خیل اور مروت سے گزرتا ہوا بنوں پہنچا۔ نواب منکیرہ نے سکھ حکومت کا باجگذار بننا منظور کر لیا۔ بارہ تیرہ سال تک دونوں مشترکہ طور پر دادِ حکومت دیتے رہے۔ ۱۸۳۶ء میں سکھوں نے باقاعدہ حملہ کر کے علاقے کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ مروت کئی وجوہ کی بناء پر مقابلے پر نہ آئے۔ اس کے بعد اہلِ بنوں سے باقاعدہ "قلنگ" یا مالیہ وصول کیا جانے لگا، وہ بھی اس طرح کہ دوسرے تیسرے سال سکھ فوج بنوں کے دیہات کا رُخ کرتی۔ مالیہ کی جتنی رقم وصول کر سکتی وصول کرتی۔ دیہات کو لوٹتی اور رخصت ہو جاتی ـــ ان دنوں بنوں کے ہر قابلِ ذکر گاؤں میں قلعہ موجود تھا۔ اندازاً سارے ضلع میں چار سو چھوٹے چھوٹے قلعے تھے۔ اہلِ بنوں انہیں میں قلعہ بند ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔ اگر کسی کسان سے مالیہ وصول نہ ہوتا تو سکھ فوجی اس کے مویشی بلکہ بعض اوقات عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں تک ساتھ لے جاتے اور انہیں بیچ کر

مالیہ کی رقم پوری کرتے، بعض اوقات لوگوں کے گھر جلا دیے جاتے۔ جب تک سکھ سرحدی علاقوں میں موجود رہتے نہ وہ کسی کو اذان دینے کی اجازت دیتے نہ باجماعت نماز پڑھنے کی۔ گائے بھینس ذبح کرنا تو بہت بڑا جرم شمار ہوتا تھا۔ ایک ہمعصر نے سکھ جرنیل سوچیت سنگھ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ انتہائی متعصب انسان تھا، ایک بار جب وہ ضلع بنوں آیا ہوا تھا۔ موضع اللہ دادی تپہ مندخیل میں کسی مسلمان نے بچھڑا ذبح کر دیا۔ سکھ جرنیل کو پتہ چلا تو فوج لے کر گاؤں پر چڑھ دوڑا۔ بستی کی تمام مسلمان آبادی کو قتل کر دیا، جو قتل ہونے سے بچ گیا اس کے ہاتھ اور ناک کاٹ دیئے گئے۔

بہت کم مسلمان ایسے تھے جو سکھوں کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کرتے، ان جانبازوں میں غازی دلاسہ خان کا نام اہلِ بنوں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ۱۸۲۶ء میں کنور کھڑک سنگھ اپنے سپہ سالار فتح سنگھ کے ساتھ بنوں آیا اور اس جگہ ڈیرہ لگایا جہاں اب قلعہ دلیپ گڑھ ہے۔ غازی دلاسہ خان نے سکھ حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان پر کاری ضربیں لگائیں۔ تاہم چونکہ اس کے پاس آدمی بہت تھوڑے تھے جب کوئی پیش نہ گئی تو قبیلہ دوڑ کی پہاڑیوں میں جا کر روپوش ہو گیا۔

۱۸۳۴ء میں سکھ کاردار تارا چند مالیے کی وصولی کے لئے بنوں آیا۔ پہلے اس نے علاقہ مروت کے لوگوں کو لوٹا اور قتل کیا۔ پھر بنوں آیا اور موضع کیکی بھرت کے پاس اکرہ میں خیمہ زن ہوا۔ اسے پتہ چلا کہ غازی دلاسہ خان کسی طرح سکھوں کی اطاعت کا دم بھرنے اور مالیہ دینے کو تیار نہیں۔ اس لئے اس کو مزہ چکھانا ضروری ہے۔ اکرہ سے چل کر اس نے ممش خیل میں پڑاؤ کیا۔ پھر صبح سویرے غازی دلاسہ خان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ دلاسہ خان اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سکھ لشکر نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور فصیل پر بے پناہ گولہ باری کی۔ جونہی گولہ گرنے سے فصیل میں شگاف پڑتا غازی کوئی درخت کاٹ کر وہاں ڈال دیتے اور شگاف بند کر دیتے۔ جب سکھ لشکر قریب آ گیا تو غازیوں نے جان پر کھیل کر سکھ توپچیوں پر حملہ کر دیا۔ بہت سے توپچی مارے گئے اور توپیں بے کار ہو گئیں۔ یہ حال دیکھ کر سکھوں کی ساری پیدل فوج غازیوں پر ٹوٹ پڑی۔ غازیوں نے ایک ایک سکھ کو بندوق کی گولی کا نشانہ بنایا اور جب گولیاں ختم ہو گئیں تو تلواریں نکال کر دست بدست لڑائی شروع کر دی۔ گاؤں کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ جہاں سے ماہر نشانہ باز گولیاں برساتے رہے اور سکھ زخمی ہو ہو کر گرتے رہے بالآخر سکھ میدان چھوڑ کر بھاگ

بسلسلہ :۔ تاہم ان پر غازیوں کا خوف اس بُری طرح مُسلط تھا کہ انہوں نے کیمپ کے اردگرد خندقیں کھود لیں۔ بیس دن تک سکھ لشکر وہیں کا وہیں پڑا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ موقع ملے تو اہلِ بنوں پر حملہ کرے لیکن غازی مورچوں میں ڈٹے رہے، آخر کار سکھ لشکر جدھر سے آیا تھا اُدھر چلا گیا۔ اس بار تارا چند کاردار کو صرف ٹیکی اور منداٹر کے دیہات سے تھوڑا سا مالیہ وصول ہوا۔ بنوں کے باقی سبھی دیہات مالیہ دینے سے انکاری رہے، اس کاردار کے ساتھ ۔ آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تھی جس کے پاس بارہ توپیں بھی تھیں۔ سکھ لشکر کی کمان فرانسیسی افسر کورٹ کے ہاتھ میں تھی۔ تارا چند نے لاہور پہنچ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سارا ماجرا بتایا تو اس نے بنوں کے تمام ملکوں کو لاہور طلب کر لیا۔ اور لکھ بھیجا کہ جو لاہور نہیں پہنچے گا۔ باغی تصور ہوگا۔ اس طلبی پر بنوں کے ملکوں میں سے ملک دکس خان، ملک میر ہوس خان، جعفر خان اور جنگی خان لاہور گئے لیکن غازی دلاسہ خان نے خود حاضر ہونے کی بجائے اپنے ہندو وکیل مگیھا رام کو بھیج دیا۔ یہ وفد امرتسر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا، رنجیت سنگھ نے ان سے مالیہ نہ دینے کی وجہ پوچھی تو ملک دکس خان نے بتایا کہ مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں ضلع بنوں کا مالیہ بارہ ہزار تھا جبکہ سکھ سرداروں سردار کھڑک سنگھ اور نتھ سنگھ نے سالانہ مالیہ ایک لاکھ روپیہ مقرر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ غریب علاقے کے لوگ اتنی رقم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تارا چند نے مالیے کی وصولی میں ناجائز سختی کی اور لوگوں سے جنگ پر اتر آیا۔ اسی لئے مالیہ وصول نہ ہوا ـــــ ملک دکس خان کی یہ تقریر سن کر رنجیت سنگھ نے الٹا تارا چند کاردار کو لعنت ملامت کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

۱۸۳۴ء میں رنجیت سنگھ نے اپنے ایک ہندو وکیل (مختار) کو مالیے کی وصولی کے لئے بنوں بھیجا لیکن بنوں کے تمام ملکوں نے اتفاق رائے کر لیا اور مالیہ ادا نہ کیا۔ اس پر ۱۸۳۶ء میں کنور نونہال سنگھ اور راجہ سچیت سنگھ بہت بڑی فوج لے کر بنوں پر چڑھ آئے۔ وہ جانتے تھے کہ دلاسہ خان کی زندگی میں سکھوں کا دبدبہ قائم نہیں رہ سکتا اس لئے انہوں نے آتے ہی دلاسہ خان کے ٹاؤن کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول پکڑا اور دلاسہ خان کے پاس غلے کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ دوسرے بنوچی ملک جو اس کی امداد کو آئے تھے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے، بالآخر میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس بار اُن کے سپاہی دس ہزار سے بھی زیادہ تھے۔

بنوں کے پہلے انگریز حاکم ہربرٹ ایڈورڈز نے دلاسہ خان کے متعلق لکھا ہے کہ
"سکھ بنوں کو آتے تو دلاسہ خان کا خوف لے کر اور جب جاتے تو اپنی نفرت بھری یادیں دے کر ــــ"

۱۸۴۶ء میں جب سکھوں اور انگریزوں کے مابین معاہدۂ صلح ہوا تو سر ہنری لارنس کو لاہور کے سکھ دربار میں ریذیڈنٹ کا عہدہ ملا۔ اس نے انگریز افسروں کو مختلف علاقوں پر متعین کر دیا۔ ہربرٹ ایڈورڈز کو بنوں بھیجا گیا تاکہ نظم ونسق قائم رکھنے میں سکھوں کی مدد کرے۔ سکھ فوج انگریز کمانڈروں کے تحت بنوں کے دیہات پر یلغار کرتی اور مالیہ وصول کرتی۔ چھ ماہ تک بنوں میں اپنے فرائض انجام دینے کے بعد ایڈورڈز مئی ۱۸۴۷ء میں واپس لاہور چلا گیا۔ اسی سال موسم سرما میں وہ پھر بنوں آیا۔ اسی دوران پشاور سے تبدیل ہو کر لفٹیننٹ ٹیلر (TAYLOR) بھی بنوں پہنچ چکا تھا۔ دونوں نے بنوں کے عوام کو زیر کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ ایڈورڈز بے حد ہوشیار اور چالاک شخص تھا، وہ ہر ایک سے اس کے دل کی بات کرتا۔ اس نے بنوں کے مسلمان زمینداروں کو یقین دلایا کہ اگر وہ اپنے دیہاتی قلعے مسمار کر دیں تو سکھ اُن پر حملے کرنے چھوڑ دیں گے، اس طرح اس نے تمام قلعے مسمار کرا دیئے۔ اُدھر اس نے سکھوں سے کہا کہ دریائے کرم سے نکلنے والی نہروں کی حفاظت کے لئے بنوں میں ایک مضبوط قلعہ بنانا ضروری ہے ورنہ مسلمان خوانین انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ چنانچہ اس نے سکھ حکمران دلیپ سنگھ کے نام پر بنوں میں ایک مضبوط قلعہ دلیپ گڑھ تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ ایسے مقام پر تھا جہاں سے نہروں کی بخوبی حفاظت ہو سکتی تھی۔ ایڈورڈز نے بنوں کے حالات دلچسپ پیرایہ میں لکھے ہیں کہ بنوں کے ملک بہت سادہ تھے۔ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے اس لئے ہمیشہ ہندو منشیوں پر بھروسہ کرتے تھے جو اکثر انہیں دھوکا دیا کرتے تھے۔ ہندو اگرچہ مالدار تھے تاہم وہ بڑے دبے ہوئے تھے۔ انہیں پگڑی باندھنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی ہندو کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو مسلمان ملک کے مسلح آدمی ان کے محافظ کے طور پر ساتھ جاتے تھے۔

۸ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ایڈورڈز دوبارہ بنوں آیا تو اس نے ملک دلاسہ خان کو قبائلی علاقہ سے بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ دلاسہ خان نے انتہائی کوشش کی کہ پھر سے لشکر جمع کر کے سکھوں سے برسرپیکار

ہو لیکن سرمایے کی کمی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا، اس نے بارہا کابلی حکمران سردار دوست محمد خان سے امداد چاہی لیکن کابلی حکومت نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ حالت یہ تھی کہ ہندو درپردہ سکھوں کی مخبری کرتے۔ بازار احمد خان کا ایک ہندو دیوان اور قبائلی علاقے میں مقیم ایک سکھ گرو بابا اُتم سنگھ کے نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

ایڈورڈز کے بعد میجر ٹیلر بنوں کا اسسٹنٹ ریذیڈنٹ بنا تو اس نے نمازی دلاسہ خان سے نرم روی کی پالیسی اختیار کی، اُسے اپنے وطن آنے کی اجازت دے دی، آزادی کا علمبردار، پیکرِ حریت دلاسہ خان واپس آیا تو اس حال میں کہ چارپائی سے لگا ہوا تھا۔ اٹھنے یا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ دلاسہ خان کا مزار اپنے علاقہ کے مشہور قبرستان خواجہ عبداللہ بابا میں واقع ہے۔

ٹیلر بنوں ہی میں تھا کہ اُسے خبر ملی کہ ملتان کے سکھ گورنر دیوان مُولراج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور دو انگریز افسروں اگنیو (VAN AGNEW) اور اینڈرسن (ANDERSON) کو قتل کر دیا ہے۔ ٹیلر نے اپنی جگہ فتح خان ٹوانہ کو بنوں کا قلعدار مقرر کرنے کے بعد وفادار فوجیوں کو ساتھ لے کر ملتان کی طرف کُوچ کیا۔ قلعہ کے باہر کچھ سکھ فوج رہتی تھی۔ اس نے جوش میں آ کر قلعہ دلیپ گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ فتح خان ٹوانہ کافی دنوں تک ڈٹا رہا لیکن بالآخر شمشیر بدست قلعے سے باہر آیا اور بہادری سے سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ سارا اسلحہ اور گولہ بارود سکھوں کے ہاتھ لگا وہ اپنے سپاہیوں اور مقامی حامیوں کو لے کر جہلم کی طرف چل پڑے تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کریں تاہم گجرات کے مقام پر سکھ کا منہ دیکھنا پڑا اور سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

سکھوں کے انخلاء کے بعد بنوں اور نواحی علاقے میں جو سیاسی خلاء اور ابتری پیدا ہوئی اس سے امیر دوست محمد خان نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ امیر کا بیٹا اعظم خان بنوں پہنچ گیا۔ اس اثناء میں بنوں اور لکی مروت کے قلعوں پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا ـــــ جلد ہی انگریزوں نے سکھ گورنر ملتان دیوان مولراج کی بغاوت دبا دی۔ ٹیلر ملتان سے فارغ ہو کر بنوں پہنچا تو اس کے آتے ہی شہزادہ اعظم خان کابل کو کُوچ کر گیا۔ اب بنوں مکمل طور پر انگریزوں کے تسلط میں آ گیا۔ انہوں نے بنوں

کو ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز کا درجہ دیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کو اس ڈویژن کا ایک ضلع قرار دیا۔

کوہاٹ سکھوں کی آمد کے موقع پر ضلع کوہاٹ کا موجودہ علاقہ دو حصوں پر منقسم تھا، ہنگو اور میراں زئی کے زرخیز علاقوں پر بنگش قوم کا تسلط تھا جب کہ جنوبی اور مشرقی خشک علاقے قبیلہ خٹک کے تصرف میں تھے۔ سکھ حکمران کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان جانباز قبائل کو قابو میں رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اس لئے اس نے ان علاقوں کا اجارہ سردار سلطان محمد خان بارک زئی کے سپرد کر دیا۔ سلطان محمد خان خود تو پشاور میں مقیم تھا البتہ اس کا بیٹا خواجہ محمد خان بارک زئی کوہاٹ میں رہتا تھا۔ خراج کی سالانہ رقم ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی عائد کی گئی تھی کہ جب سکھوں کو کسی فوجی مہم کے سلسلے میں ضرورت پیش آئے تو بارک زئی سردار دو سو سوار فراہم کریں گے، چنانچہ جب سکھوں اور انگریزوں کے متحدہ لشکر نے ہربرٹ ایڈورڈز کی کمان میں پشاور سے بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی طرف کوچ کیا۔ بارک زئی فوج نے جو گیارہ سو سواروں پر مشتمل تھی اس لشکر کو ہر طرف کا تحفظ اور سہولت بہم پہنچائی۔ یہ دستہ خواجہ محمد خان بارک زئی کی قیادت میں تھا۔ ۹ دسمبر ۱۸۴۸ء کو جب یہ فوج کوہاٹ سے ہوتے ہوئے بنوں پہنچی تو سلطان محمد خان نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا، تمام انگریز افسروں میں کابل سے آئے ہوئے پھل اور میوہ جات تقسیم کئے اور سپاہیوں کو بھی پُرتکلف کھانا دیا۔ ایڈورڈز کا کہنا ہے کہ بارک زئی سرداروں کا رسالہ پنجاب اور دوسرے علاقے کے رسالوں سے کہیں زیادہ منظم اور بارعب تھا۔

بعد میں رینل ٹیلر اپنے فوجی دستہ کو لے کر عازم بنوں ہوا تو بارک زئی سردار یحییٰ خان نے اُسے ڈھائی سو سواروں پر مشتمل حفاظتی دستہ فراہم کیا۔ چنانچہ ٹیلر بخیریت تمام بنوں پہنچ گیا۔

بظاہر بارک زئی سردار سکھوں اور ان کے حلیف انگریزوں کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن جہاں کہیں ان کا بس چلتا ان پر وار کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں جب ایڈورڈز بنوں میں متعین تھا علاقہ ڈوڈہ اور خوست کے لوگوں نے سکھ دربار کے خلاف بغاوت کر دی۔ ایڈورڈز کا خیال تھا کہ اس بغاوت میں بارک زئی سرداروں ہی کا ہاتھ تھا۔ بعد ازاں جب انگریزوں اور سکھوں کی ٹھن گئی اور سکھ فوج کے سپاہی اپنے انگریز افسروں کے خون کے پیاسے ہو گئے تو ایک انگریز میجر جارج لارنس اور اس کی بیوی نے بارک زئی سرداروں کے پاس پناہ لی، بظاہر بارک زئی نے انگریز افسر اور اُس کی

بیوی کی بہت خاطر تواضع کی لیکن در پردہ سکھوں کو ان کی آمد سے خبر کر دیا۔ جب سکھوں نے بارک زئی کو گانٹھا تو انہوں نے انگریز میجر اور اس کی بیوی کو مہمانداری کے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سکھوں کے حوالے کر دیا۔

۱۹ فروری ۱۸۴۹ء کو حالات نے پلٹا کھایا اور انگریزوں نے سکھوں کو شکست فاش دی، تو بارک زئی سرداروں نے مستقبل کے حکمرانوں کو اپنا پورا تعاون پیش کیا۔ چنانچہ بارک زئی سردار خواجہ محمد خان کوہاٹ سے ایک فوج لے کر بنوں کے انگریزوں کی مدد کو پہنچا، بارک زئی اس فوج کے سپاہیوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے لیکن انگریزوں کو معلوم تھا کہ فوج کی تعداد بہت ہی کم ہے، جب ایڈورڈز نے لفٹیننٹ ٹیلر کو افغان لشکر کی پڑتال پہ مقرر کیا تو فی الواقع سپاہیوں کی تعداد بہت کم پائی گئی تاہم بارک زئی سرداروں نے یہ کہہ کر انگریزوں کی تسلی کر دی کہ باقی ماندہ سپاہی ضرورتاً پیغامات دے کر پشاور اور کوہاٹ بھیجے جا چکے ہیں۔

ہربرٹ ایڈورڈز نے بارک زئی سرداروں کی نجی زندگی پہ بھی اپنی کتاب میں روشنی ڈالی ہے وہ لکھتا ہے کہ "اس وقت بارک زئی سرداروں میں سب سے بڑا سردار سلطان محمد خان ہے۔ اس کے دن رات زنان خانے میں گزرتے ہیں۔ اس کی بیویوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے اور بچوں کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ان بچوں میں سے وہ خود بھی بہت کم کو پہچانتا تھا اور اسے ان میں سے چند ایک ہی کے نام معلوم تھے۔ ایک بار جب سردار سلطان محمد خان انگریز کمانڈر ان چیف لارڈ گف (GOUGH) سے ملاقات کرنے لاہور گیا تو اسے شاہدرہ کے باغات میں ٹھہرایا گیا۔ جب کبھی وہ سیر کو نکلتا تین ہاتھیوں پر سوار اس کے بیٹے اس کے ہمراہ ہوتے۔ جب اس سے کسی نے ازراہِ تفنن بیٹوں کی تعداد اور اُن کے نام دریافت کئے تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا مجھے ان میں تیس چالیس بڑوں اور ایک دو چھوٹوں کے نام آتے ہیں۔ باقی کے نام معلوم نہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب سردارانِ پشاور سے پشاور اور کوہاٹ کی جاگیر بھی چھین لی گئی اور وہ صرف کابلی سرکار کے وظیفہ خوار رہ گئے تو ان لاتعداد شہزادوں کا کیا حشر ہوا ہوگا تاہم اب تک ان میں سے اکثر کی اولاد اپنے "شہزادہ" کہلانے پہ فخر کرتی ہے ـــــ سردار سلطان محمد خان کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد سے کابل کی حکومت مستقل اس کی اولاد کے ہاتھ میں رہی یہاں تک کہ کابل کا آخری شاہی خاندان بھی اسی سردار (سردار طلائی) کی نسل سے تھا اور اپنے جدِ امجد

کے نام پر بچیانی خیل کہلاتا تھا۔

ایڈورڈز کے بیان کے مطابق پشاور میں اُن دنوں سکھ فوج آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، باقی علاقوں میں بھی بہت سی سکھ فوج متعین تھی اس کے باوجود قریباً ہر سال لاہور کے سکھ دربار سے سکھ لشکر مالیئے کی وصولی کی مہم پر آیا کرتا تھا۔

بنوں اور نواحی علاقے کی مہموں کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ایک بار خود مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی بنوں آیا تھا لیکن اُسے کوئی خاص رقم وصول نہ ہوئی۔ پھر شہزادہ کھڑک سنگھ نے بہت بڑے لشکر کے ساتھ سارے علاقے کو تاخت و تاراج کیا تو بھی اُسے مالی طور پر کوئی فائدہ نہ ہوا — پانچ چھ سال بعد پوری تیاری سے مہاراجہ کھڑک سنگھ دوبارہ اپنے توپ خانے اور رسالے کے ہمراہ بنوں پہنچا اور بنوک شمشیر لوگوں سے ساٹھ ہزار روپیہ وصول کیا تاہم یہ رقم اتنی بھی نہ تھی کہ فوجی مہم کے اخراجات کی کفیل ہو سکتی۔

اس کے دو سال بعد دیوان تاراچند کو آٹھ ہزار سپاہی اور بارہ توپیں دے کر مالیہ کی وصولی کے لئے بنوں بھیجا گیا۔ اس لشکر نے صرف چالیس ہزار روپے وصول کئے اور وہ بھی بڑے ظلم و ستم سے۔ ان مظالم کے ردِ عمل کے طور اہلِ بنوں سکھوں کے خلاف متحد ہو گئے اور جان توڑ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک فیصلہ کن معرکے میں سکھوں کا ایک اہم جرنیل سردار جے سنگھ اٹاری والا اور دو سو سکھ سپاہی مارے گئے۔ سکھ زخمیوں کی تعداد پانچ سو سے بھی زیادہ تھی۔ آخر سکھ لشکر کو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی — بعد میں اس شکست کا انتقام لینے کے لئے شہزادہ نونہال سنگھ کی سرکردگی میں پچاس ہزار سپاہیوں اور توپ خانے پر مشتمل ایک لشکر بھیجا گیا جس نے بنوں کے کئی دیہات کو لوٹا اور لوٹنے کے بعد آگ لگا دی۔ ہر سال دو سال کے بعد سکھوں کو صوبہ سرحد میں اسی طرح کی فوجی مہموں کا سہارا لینا پڑتا۔

انگریزوں سے پہلی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد ۱۶ فروری ۱۸۴۶ء کو اس بات پر تصفیہ ہوا کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں حکومت کا نظم مؤثر طور پر چلانے کے لئے سرکردہ سکھ سرداروں پر مشتمل ایک انتظامی کونسل بنائی جائے جو برطانوی حکومت کے نمائندوں اور سرکردہ انگریز افسروں کی نگرانی میں سارے امورِ حکومت انجام دے۔ چنانچہ سردار تیج سنگھ، شیر سنگھ اٹاری والا، دیوان دینا ناتھ

فقیر نورالدین، سردار رنجور سنگھ مجیٹھہ، بھائی ندھان سنگھ، سردار اتر سنگھ کالی والیہ اور سردار شمشیر سنگھ سندھاں والیہ پر مشتمل کونسل تشکیل پائی۔ اس کونسل کو سکھوں نے "دربار" کا نام دیا۔ برطانیہ کی طرف سے سر ہنری لارنس کو لاہور دربار کا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ دیوان دینا ناتھ وزیر مالیات تھا۔ اسی کی سفارش پر کرنل لارنس کو بنوں، ٹانک اور نواحی سرحدی علاقوں کا انتظامی افسر مقرر کیا گیا۔ بعد میں ہربرٹ ایڈورڈز نے یہ عہدہ سنبھالا قابل بنوں پر مالیہ کے پونے دو لاکھ روپے واجب الوصول تھے جس میں سے مشکل پچاس ہزار روپے وصول ہو سکے۔

سکھوں کے برسر اقتدار آنے پر ضلع کوہاٹ کے علاقہ خٹک کا سب سے مشہور مقام ٹیری تھا، یہ جگہ کوہاٹ سے ۳۴ میل کے فاصلے پر کوہاٹ بنوں روڈ سے کوئی پانچ میل ہٹ کر ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ ۱۷۰۷ء سے مغربی خٹکوں کا سردار یہیں رہتا ہے۔ پہلا خان سعد اللہ خان تھا۔ سکھوں کی آمد کے وقت رسول خان یہاں کا چیف تھا۔ ۱۸۴۳ء میں اس کی وفات پر خواجہ محمد خان خٹک اس کا جانشین قرار پایا۔ سکھوں اور انگریزوں کی کشمکش میں نواب خواجہ محمد خان نے انگریزوں کی طرفداری کی۔ جس پر برطانوی حکومت نے ٹیری کو خواجہ محمد خان کی جاگیر قرار دے دیا۔ ۱۸۷۲ء میں انگریزوں نے خواجہ محمد خان کو "نواب" کا خطاب عطا کیا۔ خواجہ محمد خان نے ۱۸۸۹ء میں وفات پائی تو اس کے بیٹے خان بہادر عبدالغفور خان کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا۔ دسمبر ۱۸۹۵ء میں انگریزی حکومت کی طرف سے اسے "نوابی" کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں نوابی پر عبدالرحمان خان اور ۱۹۱۹ء میں باز محمد خان فائز رہے۔ انگریزوں نے ٹیری تحصیل نواب صاحب کو اٹھارہ ہزار روپیہ سالانہ کے اجارہ پر دے رکھی تھی اس علاقے میں چونکہ نمک کی کانیں واقع ہیں اس لئے نمک کا معاوضہ دس ہزار روپیہ سالانہ بھی نواب ٹیری کو دیا جاتا تھا۔

مردان مردان کا علاقہ ۱۹۳۰ء تک ضلع پشاور ہی میں شامل تھا۔ تاہم سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے اسے ہر دور میں کافی اہمیت حاصل رہی ہے، یہ یوسف زئی خوانین کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور یہیں سے سوات، دیر، باجوڑ، بونیر اور چملہ کو راستے نکلتے ہیں۔ ۱۸۲۳ء میں سکھوں کو پہلی بار یوسف زئی کی تلوار کی کاٹ دیکھنے کا موقع ہیر سباک (نوشہرہ) کی جنگ میں ملا۔ اس کے بعد زیدہ، پنجتار اور اس علاقہ کے کئی مقامات پر سکھوں اور سید احمد بریلوی کے مجاہدین میں زبردست معرکے ہوئے۔

(جن کا بیان گزشتہ صفحات میں آچکا ہے) مجاہدین کی سرگرمیوں کی سب سے بڑی جولان گاہ سرزمین یوسف زئی ہی تھی۔ یوسف زئی کے اکثر علاقے ہر بیرونی حملہ آور سے اکثر و بیشتر محفوظ رہے۔ سکھوں کے مقابلے میں مجاہدین یوسف زئی نے ہمیشہ اسلامی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "اسلامی ہند میں بنائے تجدید کی ابتدا حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ کے ہاتھوں سے ہوئی مگر خاک و خون میں کھیلنا تتمہ دودمان ولی اللہی مولانا اسمٰعیل شہید کے لئے مقدر کیا گیا تھا۔" شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے مخلص رفقائے کار کا خون رنگ لایا اور ان کی شہادت کے بعد بھی اپنے ملی اور سیاسی بقاء کے لئے صوبہ سرحد اور بالخصوص یوسف زئی سرفروشوں نے شاندار قربانیاں دیں۔ ۱۸۶۳ء کی "جنگ امبیلہ" اس کی ایک روشن مثال ہے، اس جہاد میں نہتے اور بے سروسامان مجاہدین نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت برطانوی حکومت کے دانت کھٹے کر دیئے۔ شاید مجاہدین یوسف زئی کے عزم و استحکام سے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کامل آگاہی ہی کا اثر تھا کہ سکھوں کو سردان کے علاقے میں کھل کھیلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ پہلی سکھ جنگ کے بعد سکھوں اور انگریزوں کا اشتراک عمل منظر عام پر آیا تو سردان میں ایک ایسی فوج کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا جو فی الفور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکے اور لوگوں سے بزور مالیہ وصول کر سکے۔ ۱۸۴۶ء میں اس خیال کے آتے ہی "گائیڈ" نامی رسالہ بھرتی کیا گیا اور ہیری لمسڈن (HARY LUMSDON) کو اس کا کمانڈر مقرر کیا گیا، لمسڈن اس سے قبل ہزارہ اور کشمیر کے مسلمان مجاہدوں کے خلاف اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ وہ ایک نڈر سپاہی تھا اور ہر وقت جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ ابتداء میں رسالہ میں صرف ایک پلٹن اور پیادوں کی دو کمپنیاں تھیں بعد میں اسے ترقی دی گئی اور گائیڈ سنائیس انگریز افسروں اور چودہ سو جوانوں پر مشتمل ایک پھرتیلی فوج بن گئی۔ "گائیڈ" کا ہیڈ کوارٹر مردان تھا۔ اس فوج کے سپاہیوں کی وردی نمائشی اور بھڑکیلی نہ تھی بلکہ عام خاکی وردی تھی۔ اسے دن رات فوجی تربیت دے کر اس قابل بنایا گیا تھا کہ جہاں ضرورت ہو یہ فی الفور وہاں پہنچ کر کارروائی کر سکے۔ بھرتی کے سات ہی مہینے بعد "گائیڈ" یوسف زئی کے مقام کالو خان میں خیمہ زن تھی کہ دفعتاً رات کو کوچ کا حکم ملا۔ مقصد یہ تھا کہ پنجتار کی پہاڑیوں میں موگدرہ نام کے گاؤں پر ہلہ بولا جائے کیونکہ ان لوگوں نے سکھوں کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا تھا، گائیڈ کے اچانک چھاپہ سے گاؤں کے لوگ سراسیمہ ہو گئے۔ وہاں کے

سردار کو گرفتار کر لیا گیا اور تین سو مویشی ہاتھ آئے جسے فوج ہانک کر لے گئی۔ اس چھاپے سے لمسڈن اور گائیڈز کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔

پھر جو گاؤں بھی سکھوں کو مالیہ دینے سے انکار کرتا۔ گائیڈز رسالہ اس پر چڑھ دوڑتا۔ کرنل جارج ایرنس اس زمانے میں پشاور میں متعین تھا، وہ سکھوں کا ایک بریگیڈ لے کر علاقہ یوسف زئی کو گیا۔ لمسڈن بھی اس کی مدد کے لئے موجود تھا۔ لوند خوڑ کے علاقہ کے ایک گاؤں بالوزئی کے لوگ مالیہ ادا نہیں کرتے تھے۔ راتوں رات حملہ کیا گیا لیکن گاؤں والے بھی بیدار ہو کر سنبھل گئے، مقابلہ شروع ہوا یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی اور روشنی نمودار ہو گئی۔ گائیڈ کا ایک دفعدار فتح خان بہت سر پھرا انسان تھا۔ وہ دشمن پر اکیلے ہی ٹوٹ پڑا۔ ایک قوی ہیکل مجاہد اس سے پنجہ آزمانے کے لئے بڑھا۔ دفعدار نے بڑھ چڑھ کر اس پر وار کئے۔ مجاہد کی بغل میں بارود سے بھری ہوئی مشک تھی۔ فتح خان کی سنگین سے اس میں سوراخ ہو گیا۔ بارود گرا، چنگاری بھڑک اٹھی اور دفعدار اور مجاہد دونوں ہلاک ہو گئے۔ انگریزوں نے گاؤں والوں سے مالیہ ضرور وصول کر لیا خواہ اس کے لئے انہیں کتنی ہی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

پشاور ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو سید احمد بریلویؒ، شاہ اسمٰعیلؒ، ارباب بہرام خانؒ اور ان کے مخلص جان نثار آخری دم تک لڑتے ہوئے سکھ تلواروں کی بھینٹ چڑھ گئے، ان کی شہادت سے سکھ حکمرانوں اور بارک زئی سرداروں نے بظاہر سکھ کا سانس لیا لیکن فی الاصل ان کی شہادت سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں کے اقتدار پر آخری وار ثابت ہوئی۔ سکھوں کے حوصلے بڑھے تو انہوں نے مستقل اور مکمل طور پر صوبہ سرحد کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رفتہ رفتہ اٹک سے مغرب میں قدم جمانے شروع کر دیئے۔

۱۸۲۶ء سے کابل کا تخت و تاج امیر دوست محمد خان کے قبضہ میں تھا۔ وہ مدبر انسان تھا۔ رفتہ رفتہ اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کی فکر میں تھا، بالخصوص اس کی نظریں پشاور اور کوہاٹ کے زرخیز میدانوں پر لگی تھیں، وہ یہ قطعاً برداشت نہ کر سکتا تھا کہ ان علاقوں پر سکھ حکمرانی کریں نہ ہی اسے یہ بات پسند تھی کہ اس کے بھائی بند (سلطان محمد خان وغیرہ) سکھوں کے کاسہ لیس اور طفیلی کی حیثیت سے وہاں مقیم رہیں ـــــ وہ پشاور کی بازیابی کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار تھا۔ اس نے بارہا انگریزوں کی طرف رجوع کیا کہ وہ اس سلسلے میں اس کی مدد کریں لیکن جب

انگریزوں نے ٹال مٹول سے کام لیا تو اس کا جھکاؤ روسیوں کی طرف ہو گیا۔ اس طرح صوبہ سرحد اور افغانستان کی سرزمین برطانیہ، روس، سکھ راج، بارکزئی سرداروں اور امیر دوست محمد خان کے مابین سیاسی کشمکش کا ایک اکھاڑہ بن گیا۔

انگریزوں نے افغانستان کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے سر الیگزینڈر برنیز کی قیادت میں ایک وفد کابل بھیجا۔ ۱۸۳۲ء میں یہ وفد پشاور میں وارد ہوا۔ بارکزئی سردار سلطان محمد خان کے بارے میں برنیز نے اپنے سفرنامہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "سلطان محمد خان کی حکومت صرف پشاور اور کوہاٹ کے میدانی علاقوں تک محدود ہے۔ اس کا ایک بھائی ہشتنغر اور دوسرا کوہاٹ میں رہ رہا ہے۔ سلطان محمد خان بارک زئی مقررہ سالانہ خراج کے علاوہ سکھوں کو سو گھوڑے اور باڑہ کے اعلیٰ قسم کے چاول بھی بھیجتا ہے۔ بارک زئی برادران میں سخت نااتفاقی ہے، قندہار پر قابض بھائی (شیر دل، کہن دل اور رحمدل) پشاوری سرداروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور کابلی حکمران دوست محمد خان کے سخت مخالف ہیں۔"

برنیز نے امیر دوست محمد خان کے حسن اخلاق اور وجاہت کی بھی تعریف کی ہے، اس نے اس کے علاقوں کے نظم و نسق اور امن و امان کو سراہا ہے۔

انہی دنوں ایک امریکی دانش ور میسن (MASON) نے بھی صوبہ سرحد اور افغانستان کا دورہ کر کے اپنے تاثرات کتابی صورت میں مرتب کئے، میسن اور اس کے ساتھی فیریئر (FERRIER) نے پشتو زبان سیکھی اور افغانی مسافروں کے بھیس میں بلوچستان، صوبہ سرحد اور افغانستان کا دورہ کیا۔ میسن کا سفر ۱۸۲۶ء کے موسم سرما میں شروع ہوا وہ پشاور پہنچنے والا پہلا امریکی سیاح تھا۔ دوسرے یورپی سیاحوں کے برعکس وہ غیر سرکاری حیثیت میں یہاں آیا اس نے صرف حکمرانوں کے درباروں اور مجلسوں تک اپنے مشاہدات کو محدود نہ رکھا۔ اس کا طریق کار یہ رہا کہ عوام کے ساتھ گھل مل کر زندگی گزارے اور ان کی معاشرت کا نہایت قریب سے مشاہدہ کرے۔ پشاور کے بارے میں میسن لکھتا ہے کہ "اس وقت علاقے پر چار بارک زئی سرداروں (سلطان محمد خان، یار محمد خان، پیر محمد خان اور سید محمد خان) کی حکومت ہے، تاہم یہ لوگ کمزور اور نااہل ہیں، عملاً اس علاقے میں سکھ راج ہی نافذ ہے۔"

میسن کی سیاحت پشاور کے وقت صوبہ سرحد میں سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد پورے زوروں

پر تھی۔ سکھوں اور مجاہدوں کے مابین معرکے جاری تھے، اُن دنوں پشاور کی آبادی پچاس ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، میسن نے اہلِ شہر کی خوش خلقی اور مہمان نوازی کی تعریف کی ہے۔ میسن ہر تقریب اور میلے ٹھیلے میں شرکت کرتا اور عوام کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ادا کا بھی بغور مشاہدہ کرتا۔ قیام پشاور کے دوران اس کی دوستی ایک مقامی پٹھان سے ہوگئی جس نے افغانستان کی سیاحت کے دوران میسن کی رفاقت قبول کرلی۔ دونوں دوست پٹھانوں کے لباس میں ایک قافلے کے ہمراہ درّہ خیبر کی راہ کابل روانہ ہوئے۔ میسن کے پاس صرف چند روپے اور ایک کتاب تھی تاہم اس کا ساتھی خنجر وغیرہ سے مسلح تھا، ابھی وہ علی مسجد ہی پہنچے تھے کہ ان کی مٹھ بھیڑ بیس پچیس آفریدیوں کی ایک جماعت سے ہو گئی۔ وہ لوگ بھانپ گئے کہ میسن "فرنگی" ہے نہ کہ پٹھان ـــــ اس موقع پر میسن نے ڈاکٹر بن کر جان بچائی اور لوگوں میں دوائیں تقسیم کرنی شروع کر دیں۔ میسن لوگوں سے کھُل کر باتیں کرتا۔ اہلِ سرحد اس وقت تک نہ جانتے تھے کہ انگریز الگ قوم ہیں اور امریکی الگ۔ وہ دونوں کو ایک ہی قوم گردانتے تھے۔ میسن نے کچھ وقت کابل میں گزارا، پھر غزنی جاکر امیر دوست محمد خان سے ملاقات کی۔ میسن کی رائے میں دوست محمد خان بڑا صاحب فراست اور مدبر انسان تھا اور ایک کامیاب حکمران بھی۔ غزنی سے واپسی پر وہ جُون ۱۸۳۲ء میں کابل پہنچا۔

اُدھر جونہی پشاور پر مجاہدین کا قبضہ ہوا، افغانستان کے معزول سدوزئی حکمران شاہ شجاع کے دل میں پھر سے اپنے علاقے واپس لینے کی اُمید پیدا ہوگئی۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملا اور اس سے اپنے بھائیوں کے خلاف امداد لینی چاہی، رنجیت سنگھ اسے قسما قسم شرائط پیش کرتا رہا۔ وہ یہاں تک تیار ہوگیا کہ اگر کابل کا تخت حاصل کرنے میں سکھ مہاراجہ اس کی مدد کرے تو وہ پشاور ہزارہ، ڈیرہ، کوہاٹ، بنوں، سندھ، ملتان سبھی علاقوں پر اپنی دعویداری سے دستبردار ہو جائے گا۔ سکھ راجہ نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور غنیمت سمجھا کہ سدوزئی حکمران ان علاقوں کی حکومت سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو رہا ہے۔ شاہ شجاع نے امیرانِ سندھ سے بھی بات طے کرلی تھی تاہم بعد میں وہ اپنے وعدوں پر قائم نہ رہے، ۱۸۳۳ء میں سندھ کے امیروں سے بزور راستہ لینے کے بعد شاہ شجاع قندہار پہنچا اور آسانی سے قندہار پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگیا ـــــ تاہم امیر دوست محمد اس صورتِ حال پر خاموش رہنے والا کہاں تھا وہ کابل سے لشکر لے کر آیا۔ شاہ شجاع کے

خلاف جنگ کی اور جولائی ۱۸۳۴ء میں اُسے شکست دے کر دوبارہ قندہار پر قبضہ جما لیا۔ دل شکستہ ہو کر شاہ شجاع ۱۸۳۵ء میں واپس انگریزوں کے پاس لدھیانہ پہنچ گیا۔

سکھ فوج کا پشاور میں ورود

سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کابلی حکمرانوں کی باہمی بے اتفاقی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو برائے نام امداد دے کر اس نے شاہ شجاع سدوزئی سے پشاور اور سرحدی مقبوضات سے دستبرداری کا اعلان لکھوا دیا۔ دوسری طرف یہ دیکھ کر دوست محمد خان اپنے پورے لاؤ لشکر کے ہمراہ شاہ شجاع کے خلاف قندہار میں لڑائی لڑ رہا ہے اور چاہے بھی تو سردارانِ پشاور کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اُدھر بالاکوٹ کے واقع شہادت کے بعد مجاہدین کا ڈر بھی نہ رہا تھا۔ اس لئے پوری تیاری کے ساتھ اس نے اپنا لشکر پشاور کی طرف روانہ کیا، مقصد یہ تھا کہ سکھ براہِ راست صوبہ سرحد کا کنٹرول سنبھال لیں اور کابلی سرداروں پر انحصار ختم کر دیا جائے۔

اس مقصد کے لئے مشہور سکھ جنرل ہری سنگھ نلوہ کی کمان میں خیر آباد کے قلعے سے فوج پشاور کی طرف بڑھی۔ اگرچہ لاہور سے شہزادہ نونہال سنگھ بھی نگران کے طور پر اس فوج کے ہمراہ آیا تھا۔ لیکن وہ اٹک ہی میں ٹھہرا رہا۔ ہری سنگھ نلوہ نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سردارانِ پشاور سے سالانہ خراج وصول کرنے آیا ہے۔ اس پر سردارانِ پشاور خوابِ غفلت میں پڑے رہے۔ انہوں نے خراج کی موعودہ رقم فوراً ادا کر دی تاہم ہری سنگھ نلوہ اپنے قیامِ پشاور کو طول دیتا گیا۔ جب کافی دن گزر گئے تو اس نے بہانہ کیا کہ شہزادہ نونہال سنگھ کی خواہش ہے کہ پشاور کی سیر کرے، اس نے سردارانِ پشاور سے کہا کہ وہ اپنے اہل و عیال سمیت کچھ دنوں کے لئے علی مردان کے باغ (فیروز باغ) کو چلے جائیں۔ سکھ شہزادہ اور اس کی فوج چند دن تک پشاور کی سیر کرنے کے بعد واپس اٹک چلی جائے تو دوبارہ شہر کو آجائیں۔ سردار سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں کے لئے سکھ جنرل کی بات ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ بہ رضا و رغبت پشاور شہر کو خالی کر گئے تاہم کچھ غیور مسلمان سردار عبدالغیاث خان کی ہمراہی میں شہر ہی میں مقیم رہے اور انہوں نے شہر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ امریکی سیاح مسٹر میسن (MASON) سکھ فوج کی پشاور میں آمد کا نظارہ ایک اونچے مکان کی چھت سے کرتا رہا۔ وہ لکھتا ہے سکھ فوج بڑی سج دھج کے ساتھ وارد پشاور ہوئی شہزادہ

نونہال سنگھ ہاتھی پر سوار سب سے آگے آگے تھا۔ جنرل ہری سنگھ نلوہ اور دوسرے سکھ حمائدین اس کی جلو میں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کے پیچھے سکھوں کا منظم رسالہ تھا اور سب سے آخر میں سکھ پلٹنیں اپنے اپنے بینڈ باجوں کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے آرہی تھیں۔ مسلمان نوجوان اپنے شہر میں سکھوں کا وجود کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ وہ باغوں اور مکانوں کی اوٹ سے اکا دکا فائرنگ کرتے رہے۔ ایک مسلمان سردار حاجی خان نے جب دیکھا کہ سکھ لشکر سلطان محمد خان کے حرم اور نجی اقامت گاہ کا رُخ کر رہا ہے تو اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے سکھ لشکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اُسے اُدھر بڑھنے سے روک دیا ورنہ وہ سلطان محمد خان کا خزانہ اور ذاتی سامان لوٹ لینے سے بھی باز نہ رہتے۔ حاجی خان کا بھائی خان محمد خان ان جھڑپوں میں شدید زخمی ہوا۔ پٹھان اس موقع پر اپنی روایتی بہادری سے لڑے۔ صرف ایک مسلمان نوجوان نے دیکھتے ہی دیکھتے چھ سکھوں کو ڈھیر کر دیا۔ شہر کا چکر لگانے کے بعد سکھوں کا فاتحانہ جلوس بالا حصار پہنچ گیا۔ سلطان محمد خان اور اس کے لواحقین نے پہلے تہکال میں پناہ لی پھر قلعہ باڑہ کے قریب موضع شیخاں کو چلے گئے یہ مقام نسبتاً زیادہ محفوظ اور آفریدی علاقے کے پاس ہے جس کی وجہ سے کابلی سرداروں نے اسے پناہ گاہ بنانا پسند کیا۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں نے سکھ لشکر کی ذرہ بھر مزاحمت نہ کی۔ انہیں صرف اپنا خزانہ بچانے کی فکر دامنگیر تھی، صرف تین لاکھ روپیہ کی رقم بچانے کی غرض سے انہوں نے اتنی کمزوری دکھائی اور شہر اور اہلِ شہر کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ایک بارک زئی سردار پیر محمد خان نے تو اور بھی کمال کیا۔ اس بدنظمی اور ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر وہ سیدھا کوہاٹ جا پہنچا اور لوگوں سے لگان کی جتنی رقم وصول کر سکتا تھا کر لی۔

سلطان محمد خان اور اس کے بھائی اب بھی سکھوں کے باجگذار بن کر رہنے کے لئے تیار تھے لیکن سکھوں نے عزم صمیم کر لیا تھا کہ صوبہ سرحد کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیں۔

اب پشاور کے بارک زئی برادران کے لئے اور کوئی راہِ نجات نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ کابل میں اپنے چھوٹے بھائی دوست محمد خان کے پاس پہنچ جائیں اور عزت سے زندگی گزاریں۔ تاہم ان کے دلوں میں اب بھی میل تھا۔ یہ لوگ جلال آباد جا کر رُک گئے بلکہ سلطان محمد خان نے فوج کی بھرتی بھی

شروع کر دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ دوست محمد خان (جو شاہ شجاع سے لڑنے گیا ہوا تھا) قندہار کی لڑائی میں ہار گیا تو سلطان محمد خان جلال آباد سے کوچ کر کے کابل پر حملہ کر دے گا اور کابل پر حکمرانی کرنے لگا اور اگر شاہ شجاع قندہار میں ہار گیا اور دوست محمد قندہار خالی کر کے واپس آگیا تو سردارانِ پشاور قندہار پہنچ کر اس پر قبضہ جما لیں گے۔ تاہم ان کی تمنا پوری نہ ہو سکی، دوست محمد خان قندہار کو شاہ شجاع سے آزاد کرانے کے بعد کابل پہنچا تو ان تینوں بھائیوں نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ دوست محمد خان اپنے ان بھائیوں کی نیت سے بخوبی آگاہ تھا، اس کے باوجود اس نے ان سے فیاضانہ سلوک کیا، اُن کی بڑی قدر و منزلت کی اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔

کوئی مسلمان یہ بات برداشت نہ کر سکتا تھا کہ پشاور ایسے اہم اسلامی شہر پر سکھوں کا جھنڈا لہرا رہا ہو۔ بالخصوص امیر دوست محمد خان کو ایک لمحہ کے لئے بھی غیر مسلموں کا یہ غلبہ دیکھ نہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے پشاور پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ اُسے یقین تھا کہ کامیابی تبھی نصیب ہو گی جب پوری قوم اس کا ساتھ دے، چنانچہ علماء سے جہاد کا فتویٰ حاصل کیا گیا۔ ایک بہت بڑا قبائلی جرگہ بُلایا گیا جس میں لوگوں کو اسلام دشمن قوتوں کے ارادوں سے باخبر کیا گیا۔ اس پر سبھی عوام نے اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے پیش کر دیا۔ تاہم ضروری تھا کہ مسلمانوں کا کوئی متفقہ قائد منتخب کیا جائے جس کے تحت تمام لوگ کام کریں، سب حاضرین نے اس کام کے لئے دوست محمد خان ہی کو چُنا۔ اُسے "امیر المومنین" کا لقب دیا اور اس طرح ساری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔

چند ہی دنوں میں مجاہدین کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس ہزار تک پہنچ گئی، ۱۸۳۵ء کو امیر کابل نے اپنے بڑے بھائی سلطان محمد خان کو اس فوج کا سالار مقرر کیا۔ اور پشاور پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ اس فوج کی آمد کا سُن کر سکھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ دوست محمد خان کی صلاحیتوں اور مقبولیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ خود مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک بہت بھاری فوج لے کر مقابلے کے لئے پشاور پہنچا۔ بظاہر تو دونوں فوجیں جنگی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ لیکن بباطن رنجیت سنگھ سیاسی چالوں سے حریف کو مات دینے میں کوشاں رہا۔ سکھ حکمران سردار سلطان محمد خان

کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسے آسانی سے خریدا جا سکتا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے ذاتی مفاد کے سامنے سلطان محمد خان اپنے بھائی سے کیا ہوا وعدہ ہرگز ایفا نہ کرے گا۔ چنانچہ راجہ رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین اور جنرل ہارلان کو سلطان محمد خان کے پاس بھیجا۔ سکھ وفد کا مطلب یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن اصل میں وہ سلطان محمد خان کو سیاسی رشوت دے کر اپنے بھائیوں سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ کئی دنوں تک یہ گفت و شنید جاری رہی۔ دونوں لشکر بے کار ایک دوسرے کے سامنے پڑے رہے۔ یہ حال دیکھ کر امیر دوست محمد خان خود کابل سے روانہ ہو کر جمرود پہنچا لیکن جب اسے سکھ لشکر کی تعداد اور طاقت اور اپنے بھائیوں کی بزدلی اور کمزوری کا پتہ چلا تو اس نے یہی بہتر سمجھا کہ سلامتی سے اپنا لشکر نکال کر لے جائے اور مزید تیاری کے ساتھ دوبارہ سکھوں کے مقابلے کے لئے آئے۔ چنانچہ وہ صوبہ سرحد سے روانہ ہو کر ۱۱ مئی ۱۸۳۵ء کو کابل واپس پہنچ گیا۔

اب سلطان محمد خان کو یہ حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ دوست محمد خان کے پاس جاتا، وہ سکھ حکمران کے رحم و کرم پر زندگی کے دن گزارنے لگا۔ سکھ راجہ سلطان محمد خان کو اپنے ہمراہ لے گیا اور قلعہ رہتاس کا گورنر مقرر کر دیا۔

جنرل ہارلان (HARLAN) اپنی اس کامیابی پر فخر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ہم بارک زئی حکمران بھائیوں میں بے اتفاقی کے بیج بونے میں کامیاب ہو گئے"۔ رات کو سلطان محمد خان اپنے سپاہیوں کے ساتھ افغان لشکر سے جدا ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی باقی لشکریوں نے حوصلہ ہار دیا اور افغان کیمپ جہاں شام تک پچاس ہزار مجاہد اور دس ہزار گھوڑے موجود تھے، صبح تک ویران اور خالی نظر آنے لگا۔

جنگِ جمرود

سلطان محمد خان کو توقع تھی کہ اس کی "خدمات" سے خوش ہو کر سکھ اُسے دوبارہ پشاور کی حکومت دے دیں گے لیکن مطلب نکل جانے کے بعد سکھ مہاراجہ نے آنکھیں پھیر لیں اور معمولی جاگیر کے علاوہ سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں کو کچھ بھی نہ دیا۔

اُدھر امیر دوست محمد خان بڑی اُلجھن میں تھا۔ اس نے جہادِ اسلامی کے نام پر لوگوں کو سکھوں کے خلاف اکٹھا کیا تھا، اب اپنے ہی بھائیوں کی غداری کی وجہ سے واپس جانا پڑا تو وہ مسلمان عوام کو

منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ لوگ اتنے جوش میں تھے کہ وہ کابلی لشکر کا سامان لوٹنے پر اُتر آئے اتنی بڑی سپاہ کے لئے دوست محمد خان کے پاس رقم نہ تھی کہ تنخواہیں ادا کرتا اس لئے اُسے اور بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

اُدھر اپنی اس کامیابی سے سکھوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ سکھ جرنیل سردار ہری سنگھ نلوہ نے پشاور کے گرد و نواح میں کئی قلعے بنا رکھے تھے۔ باڑہ میں منگل سنگھ رام گڑھیا نے اس مقام پر قلعہ تعمیر کرایا تھا جہاں دریائے باڑہ سے علاقہ خلیل۔ علاقہ مہمند اور پشاور شہر کو سیراب کرنے والی نہریں نکلتی ہیں۔ نوشہرہ میں ۱۸۳۴ء کے لگ بھگ ایک قلعہ ہری سنگھ نلوہ نے بنوایا تھا۔ اکوڑہ کا پُرانا قلعہ دریائے کابل کی طغیانی کی نذر ہو گیا تھا۔ بعد میں سردار لہنا سنگھ نے اُسے دوبارہ تعمیر کرایا اور احمد خان کو وہاں کا قلعہ دار مقرر کر دیا۔ خیر آباد میں سردار کھڑک سنگھ نے قلعہ بنوایا تھا۔ وہ سیلاب میں بہہ گیا تو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس اثنار میں اٹک کے مقام پر پُل بھی بن گیا تھا۔ چمنی کے قریب شنگر گڑھ یا شبقدر کا قلعہ سردار لہنا سنگھ سندھانوالہ کے حکم پر طوطا رام دیوان کی نگرانی میں بنوایا گیا۔ اُسوقت طوطا رام بے اولاد تھا، قلعہ کی تعمیر ہی کے دوران اس کے ہاں بیٹا ہوا جس کا نام شنکر داس رکھا گیا۔ اسی بچے کے نام پر قلعہ کا نام بھی شنگر گڑھ رکھ دیا گیا۔ ۱۸۳۴ء میں سکھوں نے پشاور کے قلعہ بالاحصار کی مرمت کرائی اور اس کا نام "سمیر گڑھ" رکھا۔ قلعہ کچی اینٹوں سے بنا تھا۔ اس کے صدر دروازے میں ایک جگہ اب بھی تختی نصیب ہے جس پر سالِ تعمیر کے علاوہ تحریر ہے "بفضلِ سری اکال مہاراجہ رنجیت سنگھ بنا نمود"۔ اب ہری سنگھ نلوہ نے درہ خیبر کے دہانے پر جمرود کے مقام پر پشاور کے بالاحصار کے نمونے پر ایک مضبوط قلعے کی تعمیر شروع کرائی اور اس کا نام قلعہ "فتح گڑھ" رکھا۔

یہ قلعہ شاہ راہ خیبر پر جمرود سرائے سے بجانب شمال موجودہ ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے یہ جنگی بحری جہاز سے ملتا جلتا ہے۔ قلعہ کی دیواریں بہت موٹی لیکن کچی ہیں جن کے اُوپر لپائی کی گئی ہے۔ صدر دروازہ مشرقی جانب ہے۔ دروازے میں موٹے موٹے آہنی کواڑ ہیں، صدر دروازہ سے راستہ پیچ کھاتا ہوا اوپر کو جاتا ہے۔ قلعہ دو منزلہ ہے۔ نچلی منزل میں سنتری خانہ ہے جہاں سے مسلح سپاہی پیرامیٹر (غلام گردش) کا چکر لگاتے ہیں۔ قلعہ کے

اوپر مورچے بنے ہیں، قلعے کے کمروں میں سے ایک کمرہ وہ تھا جسے سکھ گردوارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ آب رسانی کے لئے قلعہ میں کنواں بھی کھدوایا گیا تھا۔

۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خان کے حملہ آور لشکر کو پسپائی اختیار کرنی پڑی تو ۱۸۳۶ء میں ہری سنگھ نلوہ نے اس کلیدی مقام پر قلعے کی تعمیر شروع کر دی۔ اس طرح اس نے جانباز آفریدیوں کے سینے میں میخ گاڑنے کی ٹھانی۔

۱۸۳۵ء میں مسلمان مجاہدین کی ناکامی محض سردار سلطان محمد خان اور اس کے ساتھیوں کی نا سمجھی اور کمزوری کا نتیجہ تھی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان کامیاب نہ ہوتے۔ امیر دوست محمد خان اس حقیقت سے باخبر تھا۔ اس لئے وہ فتح پشاور سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہونے نہ پایا۔ اس سلسلے میں اس نے انگریزوں سے بھی امداد چاہی۔ لیکن انگریز امیر کابل کو مدد دے کر اپنے حلیف سکھوں کی ناراضگی مول لینے سے ڈرتے تھے۔ جب پشاور اور صوبہ سرحد کے علاقوں پر سکھوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے۔ تیراہ اور لنڈی کے ارباب صاحبان بھی مالیہ کی مقررہ رقم سکھ دربار کو ادا نہ کر سکے۔ تو درہ خیبر اور آدم خیل کے آفریدیوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور اسی طرح دوسرے لوگ بھی جرگے لے جا کر امیر کابل کو آمادۂ جہاد کرنے لگے تو ۱۸۳۷ء کے موسم بہار میں امیر دوست محمد خان نے پشاور کی طرف فوج کشی کا حکم دیا۔ انگریز مورخ سر لیپل گریفن کے مطابق امیر کی فوج سات ہزار دو سو بندوقچیوں اور اٹھارہ توپوں پر مشتمل تھی۔ امیر کا جانباز بیٹا شہزادہ اکبر خان اس فوج کا سالار تھا۔ اپریل ۱۸۳۷ء میں یہ لوگ وادیٔ خیبر میں پہنچے تو بیس ہزار مسلمان رضاکار بھی شریکِ جہاد ہو گئے۔ ان دنوں جمرود کے قلعے میں صرف آٹھ سو سکھ سپاہی تھے۔ خود ہری سنگھ نلوہ پشاور میں بخار کے باعث چارپائی پر پڑا تھا۔ اس لئے قلعہ جمرود کی سکھ فوج نے کوئی نقل و حرکت نہ کی۔ مسلمان فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کی گولہ باری سے قلعہ کی دیواروں میں اتنے بڑے بڑے شگاف پڑ گئے کہ سواروں کا پورا دستہ اس میں سے گزر سکتا تھا۔ جب قلعہ والوں کو بالکل مایوسی ہو گئی کہ وہ اپنا دفاع نہ کر سکیں گے تو انہوں نے پشاور خبر بھیجی۔ اس پر ہری سنگھ نلوہ جمرود کے قلعے کی طرف چل دیا۔ اس وقت اُس کی فوج چھ ہزار پیادہ سپاہیوں، ایک ہزار باقاعدہ اور تین ہزار بے قاعدہ فوج پر مشتمل تھی۔

کچھ عرصہ تک مخالف فوجیں آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑی رہیں۔ کوئی فریق بھی لڑائی میں پہل کرنا نہ چاہتا تھا۔ بالآخر ہری سنگھ نے ایک بھرپور حملہ کیا۔ سکھوں کی منظم فوج جدھر بڑھتی پرے کے پرے الٹ کر رکھ دیتی۔ یہاں تک کہ سکھوں کو اپنی فتح کے آثار دکھائی دینے لگے اور انہوں نے موقع پاکر مسلمان غازیوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ تاہم اچانک بھاگتے ہوئے غازی پلٹے اور انہوں نے شمس الدین خان کی سرکردگی میں اس سکھ دستے کو گھیرے میں لے لیا جس میں ہری سنگھ نلوہ خود داد شجاعت دے رہا تھا۔ سخت معرکہ تھا۔ کبھی مسلمان غازی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے کبھی سکھوں کے قدم اکھڑتے دکھائی دیتے۔ مسلمان تکبیر کے نعرے بلند کرتے آگے بڑھتے اور پروانہ وار جانیں قربان کرتے۔ اس دوران ہری سنگھ نلوہ ایک غازی کی زد میں آگیا جس نے اس پر بندوق سیدھی کر دی دو گولیاں ہری سنگھ کے پیٹ اور پسلیوں میں لگیں اور وہ زخمی ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔ تو اس کے ساتھی مہاں سنگھ (حاکم ہزارہ) نے اُسے سنبھالا دیا اور نلوہ کو نکال کر جمرود کے قلعے میں پہنچا دیا۔ زخم اتنے کاری تھے کہ ایک بیان کے مطابق گرتے ہی ہری سنگھ کی جان نکل گئی۔ تاہم دوسری روایت یہ ہے کہ جمرود میں اس کا علاج کیا گیا لیکن وہ بچ نہ سکا۔ جس مقام پر ہری سنگھ زخمی ہو کر گرا تھا وہ پشاور یونیورسٹی کے پاس (موجودہ تہکال تھانہ کی عمارت) ہے، آج تک اُسے بُرج ہری سنگھ کہا جاتا ہے۔ ہری سنگھ نلوہ کی سمادھ جمرود کے اسی قلعے میں بنی جو اُس نے اپنی گورنری کے دوران تعمیر کرایا تھا۔ یہ واقعہ مئی ۱۸۳۷ء کو پیش آیا۔

جمرود پر حملے اور ہری سنگھ نلوہ کی موت کی خبر لاہور پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ ان دنوں وہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی کا جشن بپا تھا اور سارے ملک کی فوجیں موجود تھیں۔ اس لئے اطلاع پاتے ہی سکھ ولی عہد راجہ کھڑک سنگھ، شہزادہ نونہال سنگھ، جنرل وینٹورہ جمعدار خوشحال سنگھ اور دوسرے سکھ افسر ایک لشکرِ جرار اور توپ خانہ لے کر پشاور کو چل دیئے۔ یہ لشکر اتنا بڑا اور پُرہیبت تھا کہ اس کا مقابلہ کرنا محال سمجھ کر شہزادہ اکبر خان اور اس کے ساتھی بغیر مقابلہ کئے جلال آباد کو چل دیئے۔ اس معرکے سے سکھوں کے وقار پر کاری ضرب پڑی تھی۔ ان میں یہ ہمت بھی نہ تھی کہ وہ پسپا ہونے والے مسلمان مجاہدوں کا تعاقب کر سکیں تاہم جمرود کے قلعہ اور صوبہ سرحد کے علاقوں پر بدستور سکھوں ہی کا تسلط قائم رہا۔

بتایا جاتا ہے کہ ہری سنگھ نلوہ نے مسلمان علاقوں کو لوٹ کر غرب دولت جمع کی تھی۔ اس کی زندگی میں تو سکھ مہاراجہ خاموش رہا لیکن ہری سنگھ نلوہ کی موت کے بعد اُس کے گھر کی تلاشی لی گئی، تمام سامان ضبط کر لیا گیا بلکہ اُسے جمرود کی شکست کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس پر جرمانہ بھی عائد کیا گیا اور مدتوں اس کے بال بچے دربدر اور خاک بسر مارے مارے پھرتے رہے۔

جنگِ جمرود میں طرفین کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تقریباً سات ہزار آدمی مارے گئے تھے جن میں امیر دوست محمد خان کا ایک بیٹا بھی شامل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس معرکہ میں سب سے زیادہ قربانی آفریدی مجاہدوں نے دی۔ "تاریخ ہزارہ" مؤلفہ محمد اعظم بیگ کا کہنا ہے کہ اس موقع پر شاید ہی کوئی بالغ آفریدی ایسا ہوگا جو جہاد میں شریک نہ ہو۔ جمرود کے قلعے سے سودا سلف خریدنے جو سکھ نکلتا۔ آفریدی اُس کا کام تمام کر دیتے تھے، بیسیوں سکھ اس طرح مارے گئے۔ شہزادہ محمد اکبر خان کا اہلِ خیبر سے وعدہ تھا کہ توپوں کی مدد سے قلعہ جمرود کی دیواریں وہ (شاہی فوج کے سپاہی) توڑیں گے لیکن دیوار میں شگاف پڑنے کے بعد قلعہ کو مسخر کرنا اہلِ خیبر کے ذمہ ہوگا۔ ایک موقع پہ دیوار میں شگاف تو پڑ گیا لیکن اہلِ خیبر اس موقع پر اتنی تعداد میں نہ تھے کہ قلعے پر قبضہ کر سکتے۔ بات دوسرے دن پر اُٹھا رکھی گئی لیکن صبح تک سکھوں کو پشاور سے مزید کمک پہنچ چکی تھی۔

کابل کے توپخانہ کے بارے میں اسی مؤلف کا کہنا ہے کہ "قلعے کے سامنے پہاڑی پر امیرِ کابل کی چھ توپیں نصب تھیں تاہم ان کے گولہ انداز سب کے سب ہندو تھے۔ ہری سنگھ کے پہنچتے ہی انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے توپیں اس کے حوالے کر دیں بلکہ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر اُن کی جان بخشی کی جائے تو وہ اُنہی توپوں سے اپنی (مسلمان) فوج پر گولے پھینکنا شروع کر دیں گے ـــــ مسلمانوں کے باقی ماندہ سپاہی اور توپچی البتہ ڈٹے رہے اور انہوں نے سکھوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ شہزادہ اکبر خان کا یہ دعویٰ بجا تھا کہ اُسے جمرود کے جہاد میں فتح نصیب ہوئی۔ تاہم وہ پشاور میں اپنی مستقل حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوا ـــــ لاہور سے سکھ افواج کے آتے ہی اکبر خان شیخان اور باڑہ سے ہوتا ہوا واپس کابل کو چل دیا۔ اس معرکے کے نتیجے میں سکھا شاہی ختم نہ ہو سکی بلکہ اپنے آخری دور میں مسلمانانِ سرحد پر سکھوں کے مظالم میں اور اضافہ ہو گیا۔

کوٹلہ محسن خان (پشاور) کے ارباب حیدر خان مہمند نے (جو خود بھی اس جہاد میں شریک تھے)

ایک طویل پشتو نظم میں جہاں غازی اکبر خان کی جرأت و شہامت کی تعریف کی ہے وہیں اُن لوگوں کے نام بھی دیئے ہیں، جو جنگِ جمرود میں سکھوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ ان میں سے خان جبار خان شمس الدین خان (خواہرزادہ امیر دوست محمد خان) افضل خان اور ارباب محمد خان خلیل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس تحریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ سرحد اسلام کے نام پر لڑے جانیوالی ہر جنگ میں کس جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔

ابوطبیلہ ہری سنگھ نلوہ قتل ہوا تو اس کی جگہ سردار تیجا سنگھ کو صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا تاہم وہ ابھی چند ماہ اس منصب پر گزار نے پایا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے یورپی فوجی افسر ابوٹیبل (AVITABILE) کو صوبہ سرحد کی حکومت سپرد کر دی۔ صوبہ سرحد کے عوام اسے ابوطبیلہ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس جابر اور ظالم انسان کا گورنری کا زمانہ ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۲ء تک ہے۔ سکھوں کا یہ جرنیل اطالوی الاصل تھا۔ جوانی میں نپولین کی فوج کا معمولی افسر تھا۔ واٹرلو کی شکست کے بعد پہلے اس نے ایران میں طالع آزمائی کی، پھر ۱۸۲۷ء میں لاہور پہنچ کر سکھوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ مسلمان دشمنی میں یہ شخص سکھوں سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اس نے ایذا رسانی اور دہشت انگیزی کے وہ انوکھے طریقے ایجاد کئے کہ لوگ اس کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے، وہ لوگوں سے انتہائی وحشیانہ سلوک کرتا اور بے کس اور بے بس لوگوں کو ستانے میں خاص خوشی محسوس کرتا۔

سردار خوش وقت سنگھ نے اپنی کتاب (مطبوعہ لندن) میں ابوطبیلہ کی کہانی اُسی کی زبانی یوں بیان کی ہے :-

"پشاور پہنچنے سے قبل میں نے لکڑی کے بہت سے کھمبے وہاں بھیج دیئے تھے، جسے میرے آدمیوں نے شہر کی فصیل کے ساتھ ساتھ گاڑ دیا تھا۔ لوگ ان کھمبوں کو دیکھ کر ہنستے رہتے چند دنوں بعد ان کھمبوں پر رسیاں لپیٹ دی گئیں تو پٹھان حیران ہوئے کہ حکومت تو توپ و لفنگ سے کی جانی چاہیئے نہ کہ کھمبوں اور رسیوں سے ایک صبح لوگ جاگے تو انہوں نے شہر کے پچاس سرکردہ بدمعاشوں کی لاشیں ان کھمبوں پر لٹکتی دیکھیں پھر روزانہ یہی عمل دہرایا جانے لگا حتیٰ کہ تمام سرکش لوگ ختم ہو کر رہ گئے۔

پھر مجھے افواہیں پھیلانے والوں سے نمٹنا پڑا۔ میرا طریقہ کار یہ تھا کہ اُن کی زبانیں

کاٹ دی جاتیں، شہر میں ایک معالج تھا جس کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کٹی ہوئی زبانوں کو پھر جوڑ دیتا ہے۔ اس پر میں نے اس معالج کو بُلایا اور اس کی زبان بھی کاٹ دی۔ پھر تو سارے شہر میں ایسا امن ہوا کہ چھ ماہ تک کسی جُرم کے ارتکاب کی خبر نہ مل سکی۔"

ابوطبیلہ کے ظلم وستم کی داستانیں اب تک پشاور میں مشہور ہیں، آئے دن وہ لوگوں پر مالیہ کی شرح بڑھا دیتا۔ اس نے افغانی کرنسی کی جگہ پشاور میں سکھوں کا سکّہ "نانک شاہی" رائج کیا۔ اس کے عہد میں پشاور کے ضلع کا مالیہ نو لاکھ روپیہ تک جا پہنچا، اس نے محصولات کی وصولی کا پُرانا طریقہ بحال رہنے دیا۔ سرکردہ خان خوانین اور جاگیردار ایک مقرر رقم پر ایک علاقہ یا تپہ کا اجارہ لے لیتے اور پھر لوگوں سے اپنی من مانی کارروائی سے رقم وصول کرتے، اکثر اوقات جب ان اجارہ داروں سے حکومتِ وقت رقم طلب کرتی تو وہ قبائلی علاقے کو چلے جاتے اور ان سے کچھ بھی وصول نہ ہونے پاتا۔

تہکال کے ارباب خاندان کے بارے میں منشی گوپال داس "تاریخ پشاور" میں لکھتا ہے کہ "سردار خان کی وفات پر منصب و مواجب ارباب بہرام خان (سید احمد شہید کے رفیقِ کار) کو حاصل ہوا، اس نے سلطان محمد خان اور پیر محمد خان کی بجائے مجاہدین کا ساتھ دیا اور جمرود میں جا مقیم ہوا۔ چنانچہ اس کی جگہ ارباب جمعہ خان کا تقرر عمل میں آیا۔ جب بارک زئی سردار اس سے بھی ناخوش ہو گئے تو یہ منصب گوجر خان کو عطا ہوا۔ گوجر خان کا جانشین عابد خان تھا، عابد خان کے بعد اس کے فرزند زاہد خان نے اُس کی جگہ لی۔ سکھوں کے دور میں سردار ہری سنگھ نلوہ سے تنگ آکر چاروں ارباب تہکال کو چھوڑ کر خیبر کو چلے گئے اور مالیہ بھی ادا نہ کیا، بعد میں یہ ارباب امیر دوست محمد خان کے پاس جا پہنچے اور چار پانچ سال وہاں رہے۔ اس پر ہری سنگھ نلوہ نے محمد خان ولد معاذ خان کو جو بہرام خان کے ساتھ جمرود چلا گیا تھا۔ طلب کر کے کُل تپہ خلیل کا ارباب مقرر کیا اور اسے "نوابی" کا خطاب دیا۔ بعد میں تپہ دوآبہ بھی اُسی کو اجارے پر دے دیا گیا۔ ایک برس تک وہ اس عہدہ پر فائز رہا۔ لیکن جب قلعہ باڑہ کے قریب موضع سنگو میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور امیر دوست محمد خان کے مابین لڑائی ہوئی تو محمد خان نے اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دیا ـــــ سردار تیجا سنگھ

سکھوں کی جانب سے صوبہ سرحد کا گورنر بنا تو اس کے بلانے پر گوجر خان، عبدالحمید خان برادر زاہد خان اور محمد امیر خان پسر حسن خان پشاور آئے، اب کے عہدہ ارباب تین حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا اور گوجر خان کو ارباب بہرام خان کی جگہ، محمد امیر خان کو نصر اللہ خان کی جگہ اور عبدالحمید خان کو زاہد خان کی جگہ ارباب ملی۔"

اسی طرح تپہ بہمند کے ارباب کو اس علاقہ کے مالیہ کا اجارہ ملا ہوا تھا۔ ۱۸۳۷ء میں سکھوں نے اس سے مالیہ ادا کرنے کا سختی سے مطالبہ کیا گیا تو وہ آدم خیل آفریدیوں کی پناہ میں چلا گیا۔ چار سال تک اس نے وہیں گزارے، اس اثنا میں اس تپہ کے حالات اور بھی ابتر ہوتے دیکھے تو ۱۸۴۰ء میں گورنر ابوطبیلہ نے اُسے واپس بلا بھیجا اور اُسے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر دینے کا یقین دلایا۔ بعد میں سردار تیجا سنگھ اور سردار شیر سنگھ کے دَور میں یہ جاگیر ساڑھے سات ہزار روپیہ سالانہ تک جا پہنچی۔

"پشاور ڈسٹرکٹ گزیٹیر" کے مطابق سکھ راج میں اندرونی امن و امان اور استحکام بالکل ناپید تھا۔ ہر جگہ کا "خان" فی الحقیقت وہاں کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، سکھ سزائیں دیتے تو وہ سزائیں بھی عجیب ہوتیں۔ مثال کے طور پر چکینی کے خان کمال خان کو جاگیر اس شرط پر دی گئی تھی کہ وہ ہر سال مقررہ زرِ اجارہ کے علاوہ بیس آفریدیوں کے سر کاٹ کر سکھ سرکار کو پیش کیا کرے گا۔ اس عجیب و غریب شرط کو پورا کرنے کے لئے کمال الدین خان کو طرح طرح کے حربے استعمال کرنے پڑتے تھے۔

اپنے سارے دورِ حکومت میں سکھوں کا تسلط صرف صوبہ سرحد کے میدانی دیہات اور علاقوں تک محدود رہا۔ قبائلی اور پہاڑی علاقوں پر اُن کی کوئی گرفت نہ تھی، جب بہمند اربابوں سے نپٹنے کے لئے انہوں نے آدم خیل آفریدیوں پر دباؤ ڈالا تو آدم خیل نے اُن کی بات سُننے سے انکار کر دیا۔ اتمان خیل کے علاقہ میں پنڈیالی کے خلاف مہم بھیجی گئی تو چار پانچسو آدمی مروانے کے بعد سکھ صرف چند ایک جھونپڑوں کو نذرِ آتش کر سکے اور اُن سے کچھ بھی بن نہ آیا۔ ۱۸۴۱ء میں کیپٹن میکسن (بعد میں کمشنر پشاور) نے ابوطبیلہ سے ایک فوجی مہم کے لئے دو ہزار کی نفری مانگی تو وہ یہ نفری بھی پوری نہ کر سکا۔

جہاں جنرل ابوطبیلہ لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا بہت بڑا علمبردار بنا ہوا تھا وہیں اس کی ذاتی زندگی انتہائی گھناؤنی تھی۔ وہ گورکھٹری پشاور کی ایک آراستہ پیراستہ عمارت میں رہتا۔

ہر وقت ناچنے گانے والی لڑکیوں سے گھرا رہتا ـــــ بیک وقت کئی کئی عورتوں سے تعلقات رکھتا۔ انہی فاحشہ عورتوں میں سے کسی ایک کے بطن سے اس کی ایک بیٹی تھی، جب وہ پشاور کی گورنری سے سبکدوش ہوا تو ان رقاصاؤں میں سے ہر ایک کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا اور اپنی اس بیٹی کو اپنے باورچی کے نکاح میں دے دیا۔ اس نے وہ لوٹ مار مچا رکھی تھی کہ واپس یورپ گیا تو اس کے پاس پچاس ہزار پونڈ رقم موجود تھی۔ اٹلی پہنچنے پر اس نے ایک آوارہ عورت سے شادی رچالی جس کی حرکتوں کے باعث اس کی انتہائی رسوائی ہوئی۔

ابوطبیلہ صوبہ سرحد کا سکھ گورنر بھی تھا اور فوجی کمانڈر بھی۔ اس نے کئی بار خیبر اور نواحی علاقوں پر چڑھائی کی لیکن آفریدی مجاہدوں کے ہاتھوں ہر بار خفت اٹھانی پڑی بلکہ ایک بار تو خیبر کی ایک لڑائی میں وہ زخمی بھی ہوا۔ وہ جنگی قیدیوں اور عام لوگوں پر اتنا ستم ڈھاتا کہ بعض اوقات بعض لوگوں کو مسجد ہبابت خان کے بلند و بالا میناروں سے نیچے پھینک کر مار دیتا۔ لیکن ایسی تمام سختیاں روا رکھنے کے باوجود ابوطبیلہ سرحد کے حریت پیشہ لوگوں کو دبا نہ سکا۔

سرحدی حریت پسندوں نے سکھوں کے خلاف اپنی جدوجہد ہمیشہ جاری رکھی۔ ۱۸۳۶ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے راجہ شیر سنگھ اور لال پورہ (مہمند) کے لوگوں میں زبردست رن پڑا۔ دونوں طرف بہت سے لوگ مارے گئے یا زخمی ہوئے۔

جون ۱۸۳۶ء میں قزلباش اور غلزئی قبیلوں میں ٹھن گئی۔ سکھوں نے کنور نونہال سنگھ کے تحت غلزئی کا ساتھ دیا لیکن اس جنگ میں سکھوں کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ وقتی طور پر خاموش ہو کر رہ گئے۔

جنرل الارڈ ۲۳ جنوری ۱۸۳۸ء کو پشاور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک یورپی جرنیل الارڈ انتقال کر گیا۔ یہ جرنیل بھی وینٹورا اور ابوطبیلہ کی طرح سکھ فوج کی تنظیم نو میں اہم حصہ لے چکا تھا، اس لئے مہاراجہ کو اس کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔

الارڈ کا پورا نام (JEAN FRACOIS ALLARD) تھا۔ وہ فرانسیسی نژاد مہم باز تھا۔ اور نپولین بوناپارٹ کے تحت جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ واٹرلو کی شکست سے دل برداشتہ ہو کر اس نے وطن کو خیرباد کہہ دیا۔ اور پھرتا پھراتا ۱۸۲۲ء میں لاہور پہنچا، رنجیت سنگھ اس سے حسن سلوک

سے پیش آیا اور اپنی فوج کو تربیت دینے کا کام اس کے سپرد کیا۔ اس نے سکھ فوج کو جدید معیار پر تربیت دی، اس کی وردی، نظم و نسق اور جنگی مہارت پر بڑی توجہ دی۔ الارڈ نے پنجاب کے پہاڑی علاقہ چمبہ کی ایک شہزادی سے شادی کی جس کا نام بالو پیری دئی تھا۔ صوبہ سرحد کے اکثر معرکوں میں الارڈ اور ونٹورہ مہاراجہ کی فوج میں پیش پیش رہے۔ ایک بار مہاراجہ یوسف زئی مجاہدوں کے خلاف ایک مہم پر تھا۔ وہ اٹک پہنچا تو کشتیوں کا پل موجود نہ تھا۔ سکھ حکمران فوری طور پر دریا پار کر کے یوسف زئی پر ضرب لگانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ آخر جوشِ انتقام میں اس سے رہا نہ گیا تو اس نے سکھ رسالے کو حکم دیا کہ تیر کر دریا پار کیا جائے۔ رسالہ جنرل الارڈ کی کمان میں تھا۔ اس نے بگل بجا کر رسالے کو تیاری کا حکم دیا اور گھوڑے دریا میں ڈال دیئے، زیادہ نقصان بھی نہ ہوا۔ صرف تین سوار اور گھوڑے دریا برد ہوئے۔ سید احمد بریلوی کے مجاہدین سے جھڑپوں میں بھی الارڈ اور ونٹورا نے نمایاں حصہ لیا۔

الارڈ اگرچہ پشاور میں فوت ہوا تاہم اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش لاہور لے جائی گئی۔ جہاں اس کو اپنے انارکلی کے بنگلے کے سبزہ زار میں اپنی بیٹی میری شارلٹ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی بیوی اس سے قبل فرانس میں انتقال کر چکی تھی اور وہیں مدفون تھی۔

پہلی اینگلو افغان جنگ

"معرکۂ جمرود" کے نتیجے میں امیر دوست محمد خان پشاور پر قابض نہ ہو سکا اور اُسے واپس کابل جانا پڑا تاہم ایک لمحے کے لئے بھی وہ پشاور کو بھول نہ سکا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ پشاور اور دوسرے زرخیز علاقے سکھوں کے پاس رہیں نہ ہی ان علاقوں پر اپنے بھائیوں سلطان محمد خان وغیرہ کا تسلط برداشت کر سکتا تھا، ان دنوں افغانستان میں سیاسی حالات نیا رنگ اختیار کر رہے تھے، روس قدم آگے بڑھا رہا تھا اور اس نے افغانستان، ایران اور امیر بخارا کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایرانیوں کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا کہ وہ افغانستان کے جنوبی صوبے ہرات پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو ایرانی فوج ہرات میں داخل ہو گئی۔ افغانوں نے ایک سال سے زیادہ حملہ آوروں کو روکے رکھا۔ آخر کار ۸ ستمبر ۱۸۳۸ء کو شاہِ ایران بے بس ہو کر اپنی فوجوں کو وہاں سے نکال کر واپس تہران لے گیا۔ اس جنگ کی وجہ سے افغانستان کے لوگوں کو بڑے مصائب برداشت کرنے پڑے اور

سارے علاقہ کو قحط سالی کا سامنا رہا۔

رُوس کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر انگریزوں کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے امیر دوست محمد خان سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنا نمائندہ کیپٹن الیگزینڈر برنیز کابل بھیجا۔ برنیز کے مشن کا مقصد تو دونوں ملکوں کے مابین تجارتی تعلقات کا فروغ تھا تاہم اصل میں مشن کی نوعیت خالص سیاسی تھی، ۱۸۳۷ء میں برنیز کا وفد (جو میجر لیچ (LEECH) لفٹیننٹ وُڈ (WOOD) ڈاکٹر لارڈ (LORD) اور میر منشی موہن لال پر مشتمل تھا) پشاور سے ہوتا ہوا درّہ خیبر کی راہ کابل روانہ ہوا۔ جونہی یہ وفد درّہ خیبر میں داخل ہوا امیر کابل کی طرف سے نتاء خاسی گل، مرزا آغا جان اور سعادت خان ہندو نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور توپوں سے اس کی سلامی اتاری ـــــ جلال آباد کے نواح میں شہزادہ محمد اکبر خان اپنے رسالے سمیت انگریزی وفد کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۷ء کو برنیز نے امیر دوست محمد خان سے کابل کے دربارِ عام میں ملاقات کی اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کا خصوصی خط اسے پیش کیا۔ کافی مدت تک برنیز اور حکومت افغانستان کے نمائندوں میں گفت و شنید جاری رہی۔ امیر کابل کا سارا زور اس مطالبے پر تھا کہ انگریز پشاور اور صوبہ سرحد کے میدانی علاقے اپنے حلیف سکھوں سے اسے واپس دلائیں۔ اُدھر انگریز مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ناراضگی مول لینے پر کسی صُورت تیار نہ ہوتے تھے، خود برنیز بھی آکن لینڈ پر زور دے رہا تھا کہ ہر صورت میں انگریز امیر کابل سے صلح نامہ کر لیں ورنہ لازماً اس کا جھکاؤ روس کی جانب ہو جائے گا۔ آخر برنیز ۲۶ اپریل ۱۸۳۸ء کو ناکام ہو کر کابل سے واپس پشاور آگیا۔ انہی دنوں روس کا نمائندہ ویکوویچ بھی کابل پہنچ چکا تھا اور سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ برطانوی وفد نے پشاور کی حکومت کے متعلق ایک متبادل تجویز یہ پیش کی تھی کہ صوبہ سرحد کی حکومت نہ سکھوں کے پاس رہے نہ امیر کابل کے پاس۔ البتہ انگریزی حکومت یہ کوشش کرے گی کہ یہ علاقہ سلطان محمد خان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تاہم امیر کابل کو اپنے بھائیوں پر بھی کوئی بھروسہ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔

جب برطانوی ہند کا گورنر جنرل روس کے خلاف کسی صورت امیر دوست محمد خان کا تعاون

حاصل نہ کر سکا تو اُس نے ایک اور چال چلی، اور شاہ شجاع کو آلۂ کار بنایا۔ انگریز حاکم جانتا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۸۳۴ء میں شاہ شجاع کی حمایت کا اعلان کر چکا تھا۔ اب دوبارہ اس نے سکھوں کو یقین دلایا کہ انگریز اور سکھ دونوں مل کر شاہ شجاع کو افغانستان کی حکومت واپس دلانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ ۲۵ جون ۱۸۳۸ء کو شملہ کے مقام پر سکھوں، انگریزوں اور شاہ شجاع کے مابین ایک سہ فریقی معاہدہ طے پا گیا، جس کی پہلی شق یہی تھی کہ شاہ شجاع اور اس کے ہم قوم سدوزئی کشمیر۔ اٹک، چھچھ، ہزارہ، کھبل، امب، پشاور، علاقہ یوسف زئی، علاقہ خٹک ہشت نگر، مچنی، کوہاٹ، ہنگو، درہ خیبر، بنوں، وزیرستان، وادیٔ دوڑ، ٹانک، کالا باغ، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، ملتان اور بالائی سندھ پر اپنے دعویٔ اقتدار سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ سہ فریقی معاہدے کی اصل غایت یہی تھی کہ صوبہ سرحد پر مستقلاً سکھوں یا انگریزوں کی بالادستی تسلیم کر لی جائے۔ معاہدے کی باقی شرطیں مضحکہ خیز تھیں۔ معاہدے کی رُو سے طے پایا تھا کہ شاہ شجاع ہر سال سکھ مہاراجہ کو ۵۵ عمدہ گھوڑے نذر کیا کرے گا جب کہ اس کے بدلے سکھ حکمران اسے ۵۵ قیمتی دوشالوں کا تحفہ بھیجے گا۔ کابل کا امیرِ افغانستان کے بہترین سرمے سکھ دربار کو بھیجا کرے گا جبکہ پشاور کا سکھ حاکم باڑہ کے عمدہ اور خوشبودار چاول کی ۵۵ بوریاں ہر سال کابلی سرداروں کی نذر کیا کرے گا۔

۱۸۳۸ء کے آخر میں فیروزپور میں سکھ اور برطانوی فوج کا ایک پُرجلال اجتماع ہوا۔ ۲۷ نومبر کو لارڈ آک لینڈ (گورنر جنرل) بڑی ٹھاٹھ باٹ سے اس میں شریک ہوا۔ لاہور سے سکھ مہاراجہ بھی پوری شان و شوکت سے پریڈ کے معائنہ کے لئے پہنچا۔ دونوں سربراہوں کی ملاقات ہوئی جس میں طے پایا کہ ایک بہت بڑی فوج شکارپور اور کوئٹہ کی راہ افغانستان کی طرف پیش قدمی کرے اور شاہ شجاع کو وہاں کی حکومت واپس دلائے۔ سکھ حکمران اگرچہ انگریزوں کا حلیف تھا۔ تاہم وہ پشاور کی راہ فوج کی پیش قدمی کی اجازت دینے پر تیار نہ تھا۔ وہ انگریزوں کی فطرت سے آگاہ تھا اور اسے خدشہ تھا کہ اگر ایک بار انگریز فوج پنجاب اور صوبہ سرحد کے سکھ علاقوں میں داخل ہو گئی تو اسے وہاں سے نکالنا محال ہو گا۔

انگریزی فوج کو چونکہ اس سے پہلے بلوچستان اور سرحد کے جنگجو قبائل سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ اس لئے وہ اس شان سے درّہ بولان کی راہ قندہار کو روانہ ہوئے گویا پکنک (تفریحی دورے) پر نکلے ہوں۔ مسلح سپاہیوں کی تعداد ساڑھے نو ہزار تھی جب کہ ان کے خدمت گار اڑتیس ہزار تھے اور ان کی خوراک تیس ہزار اونٹوں پر لدی تھی، خدمت گار تیز رفتاری سے نہ چل سکتے تھے۔ لہٰذا پیچھے رہ جاتے تو پہاڑی قبائل ان پر حملہ کرتے اور سامان لوٹ کر لے جاتے۔ گرتے پڑتے، کٹتے مرتے انگریز فوجی اپریل ۱۸۳۹ء میں قندہار پہنچے اور وہاں شاہ شجاع کی رسم تاجپوشی ادا کی۔ انگریز سفیر میکناٹن اور دوسرے فوجی افسر شاہی جلوس میں بادشاہ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

۲۷ جون کو یہ لشکر قندہار سے غزنی کی طرف روانہ ہوا ـــــ اور ۲۱ جولائی کو انتہائی مشکل سے غزنی کے قلعہ پر قابض ہو گیا۔ وہاں سے لشکر نے پیش قدمی جاری رکھی اور اگست ۱۸۳۹ء میں کابل پر قبضہ کر کے شاہ شجاع کو تخت نشین کر دیا گیا۔ دوست محمد خان نے حالات کو مخالف پا کر امیر بخارا نصر اللہ خان کے پاس پناہ لی۔ اب انگریز پوری طرح افغانستان کے سیاہ و سفید کے مالک بن چکے تھے تاہم نواحِ کابل کے حریت پسند قبائل نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ دوست محمد خان نے ان مجاہدوں کی مدد سے ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۲ نومبر ۱۸۴۰ء کو پروان درّہ (جبل السراج) کے پاس ایک خونریز جنگ ہوئی۔ انگریزوں کی طرف سے جنرل سیل (SALE) نے سپہ سالار کے فرائض انجام دیئے، دوست محمد خان نے بڑی شجاعت دکھائی تاہم گرفتار ہوا اور انگریزوں نے اسے قیدی بنا کر ہندوستان بھیج دیا۔

اپنے قیام کابل کے دوران انگریز فوجی افسروں نے نہایت غیر ذمہ دارانہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ کئی ایک نے افغان لڑکیوں سے شادیاں رچالیں۔ ان کا رویّہ عوام سے نہایت سخت رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ان کے خلاف بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے انگریزوں کو گھیرے میں لے لیا، اس پر انگریز سفیر نے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۱ء تک کابل سے نکل جانے کا وعدہ کیا لیکن اس وعدے کی پابندی کی بجائے ٹال مٹول کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا۔ آخر افغان عوام شہزادہ اکبر خان کی قیادت میں متحد ہو گئے۔ ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو انگریزی فوج کے تمام سپاہیوں اور ملازموں کو جن کی تعداد ساڑھے سولہ ہزار تھی۔ کابل سے نکال دیا گیا۔ راہ میں شدید برف باری اور غلزئی قبائل کے حملوں کی تاب نہ لا کر

یہ سب لوگ ہلاک ہو گئے۔ ۱۳ جنوری کو ڈاکٹر برائیڈن واحد شخص تھا، جو نیم مُردہ حالت میں جلال آباد پہنچا اور اس تباہی کی خبر اپنے ساتھیوں کو دی۔

شہزادہ تیمور پشاور میں

بتایا جا چکا ہے کہ "سہ فریقی معاہدے" کے تحت انگریزوں، سکھوں اور شاہ شجاع کا متحدہ لشکر کوئٹہ، قندھار کی راہ عازم کابل ہوا تھا تاہم کرنل ویڈ (WADE) کے تحت انگریزی فوج کا ایک دستہ شہزادہ تیمور (ابنِ شاہ شجاع) سدوزئی کے ہمراہ پشاور بھی آیا۔ سدوزئی شہزادہ کی آمد کا مقصد سرحدی قبائل کا تعاون حاصل کرنا تھا، یوسف زئی قبیلے اور آفریدی لوگ اس سے پہلے ہمیشہ سدوزئی حکمرانوں کا ساتھ دیتے رہے تھے اس لئے شہزادہ تیمور کو اُمید تھی کہ اس کی صوبہ سرحد میں بڑی آؤ بھگت کی جائے گی۔ تاہم شاہ شجاع کی تیس سالہ جلاوطنی کے دوران اب صورت حال کافی بدل چکی تھی۔ دوسرے لوگ شہزادہ تیمور سے ناآشنا تھے بلکہ شہزادہ بھی آدابِ شاہی اور رسومِ درباداری تک سے ناآشنا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ شہزادہ تیمور کے ساتھ سکھ فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی تاہم اس فوج کی باگ ڈور سر کلاڈ ویڈ (WADE) پولیٹیکل ایجنٹ لُدھیانہ کے ہاتھ میں تھی۔ شہزادہ تیمور کی لدھیانہ سے روانگی سے پہلے ہی فرنگیوں کی جانب سے لارڈ (LORD) نامی افسر انتظامات کی غرض سے پولیٹیکل ایجنٹ بنا کر پشاور بھیجا گیا تھا۔ اس کا مقصد سرحدی قبائل سے شاہ شجاع کے لئے تعاون حاصل کرنا تھا، اس غرض کے لئے اس افسر کو بہت سا روپیہ اور وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ پشاور پہنچ کر کلاڈ ویڈ نے اپنے ماتحتوں کو مختلف وفود کی شکل میں مختلف علاقوں کی طرف بھیجا۔ چنانچہ لفٹیننٹ مکسین (بعد میں کمشنر پشاور) کو کوہاٹ اور کرم روانہ کیا گیا۔ جب ان افسروں نے اپنی دانست میں فضا کو سازگار بنا لیا تو ۲۹ مارچ ۱۸۳۹ء کو پشاور میں ایک دربار عام منعقد کیا۔ سب قبائلی سرداروں کو اس میں شرکت کے لئے بُلایا گیا تاہم دربار میں شرکا کی اکثریت اُنہی لوگوں کی تھی جو امیرِ کابل دوست محمد خان سے ذاتی پرخاش رکھتے تھے یا سکھ دربار میں عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ پشاور کا گورنر جنرل ابوطبیلہ اور سردار شام سنگھ اٹاری والا بھی شریک دربار تھے۔ شاہ شجاع کا ایک سوتیلا بھائی سردار محمد ہاشم خان سدوزئی (جو سکھ دربار

کے وظیفہ خوار کے طور پشاور میں رہتا تھا) اپنے تینوں بیٹوں کے ہمراہ دربار میں حاضر تھا۔ اور شہزادہ تیمور کا بھتیجا بھی اجلاس میں موجود تھا۔

شہزادہ تیمور بڑی شان و شوکت سے ایک آراستہ پیراستہ تخت پر تشریف فرما ہوا تو دو فرانسیسی جرنیلوں نے اُسے سلامی پیش کی۔ پھر لفٹیننٹ بار اور ایک دوسرے افسر نے برطانوی سرکار کی طرف سے سلامی دی، اکیس توپیں سر کی گئیں۔ بعد میں مختلف قبائلی سرداروں اور معززین میں شہزادے نے اپنے ہاتھوں خلعت، دوشالے اور ولایتی بندوقیں تقسیم کیں۔

دربار کے بعد شہزادہ بڑی کروفر کے ساتھ لشکر کے معائنے کو نکلا۔ قبائلی لشکر کے سرداروں میں سے باجوڑ کے خان میر عالم خان کا فرزند تیراہ کا سید رضا، سعادت خان مہمند کے عمزاد، تورہ باز خان، بنگش کے میاں بدرالدین موسیٰ زئی اور دوسرے متعدد زعماء نے آگے بڑھ کر سدوزئی شہزادہ سے مصافحہ کیا اور اُسے اپنے تعاون اور حمایت کا یقین دلایا۔

اِدھر انگریز اور اُن کے حلیف قبائل کا تعاون حاصل کرنے میں کوشاں تھے اُدھر امیر دوست محمد خان کا بیٹا شہزادہ محمد اکبر خان بھی اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی حمایت حاصل کرنے میں سرگرم تھا اس نے تاتڑہ اور آب خلنے کے راستے کی حفاظت پر سعادت خان اور خالو خان مہمند کو مقرر کیا تھا۔ تہکال کے غلام محمد خان لپسر ارباب بہرام خان، محمد امیر خان، گوجر خان اور عبدالحمید خان کو درّہ خیبر اور علی مسجد کا نگران بنایا تھا۔ اسی طرح باجوڑ کے امیر عالم خان، سوات کے عنایت اللہ خان، دیر کے غزن خان اور فرید خان بھی شہزادہ اکبر خان بارک زئی کا ساتھ دے رہے تھے۔

چونکہ شہزادہ تیمور کی ہمراہی فوج کو درّہ خیبر کی راہ آگے بڑھنا تھا۔ اس لئے سر کلاڈ وید نے عبدالرحمٰن خان کوکی خیل، خان بہادر خان ملک دین خیل، سلیم خان سپہ، اللہ داد خان ذخا خیل، سنگڑ خان شنواری، غالب خان شنواری اور دوسرے آفریدی معززین سے بھی رابطہ قائم کیا۔ علی مسجد کا قلعہ اس وقت تک امیر دوست محمد خان کی فوج کے قبضہ میں تھا۔ کوہاٹ سے رحمت خان اور کرنئی تیراہ کے سید احمد شاہ اور دوسرے سرداروں نے بھی شہزادہ تیمور کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ چونکہ یہ فوج ایک مسلمان بادشاہ کو اس کا کھویا ہوا تخت و تاج واپس دلانے کے لئے ایک اسلامی ملک کو جا رہی تھی اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ سکھوں کی امدادی فوج کے سوائے کے سارے سپاہی مسلمان ہوں گے۔

اوران کی کمان بھی مسلمان سرداروں کے ہاتھ میں ہوگی۔

۸ رمئی کو انگریزی کیمپ تہکال بالا کو منتقل ہوگیا۔ چند روز بعد لشکر نے درّہ خیبر کی طرف پیش قدمی کی، علی مسجد میں اکبر خان خود موجود تھا۔ اس نے جگہ جگہ اپنے بندوقچی متعین کر رکھے تھے۔ آفریدی قبیلوں نے بھی سکھوں کے لشکر پہ پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ سخت نقصان اٹھانے کے بعد بمشکل تمام یہ لشکر ۲۱ جولائی کو علی مسجد پر قبضہ کرنے کے قابل ہوا۔

اس اثنار میں شہزادہ اکبر خان چونکہ کابل کے دفاع کے انتظامات کے سلسلے میں واپس جا چکا تھا۔ اس لئے حملہ آور فوج کو مزید مزاحمت کا سامنا کرنا نہ پڑا۔ ڈکّہ پہنچنے پر سکھ حکومت اور انگریز افسروں کی طرف سے تمام سپاہیوں میں انعامات تقسیم کئے گئے۔

۱۲ راگست کو کلاڈ ویڈ اور شہزادہ تیمور ڈکّہ سے کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ میر ابوالحسن خان اور ملا شکور (جو شہزادہ تیمور کے وزرا رتھے) لشکر سے آگے آگے جاتے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتے۔

۳ ر ستمبر کو منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے یہ متحدہ لشکر دارالحکومت کابل پہنچا۔ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی شاہ شجاع اپنا تختِ حکومت تیس سال کے بعد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بادشاہ اور انگریز سفیر میکناٹن کی طرف سے فوج کا ایک دستہ شہزادہ تیمور اور اس کے ہمراہیوں کے استقبال کے لئے بھیجا گیا۔ انگریزی توپ خانے نے ان کی سلامی اتاری اور بڑی دھوم دھام سے شہزادہ تیمور سدوزئی فاتحانہ قلعہ بالاحصار میں داخل ہوا۔ بادشاہ بیٹے سے ملاقات پر انتہائی مسرور ہوا۔ تاہم شاہ شجاع اور اس کے عزیزوں کی یہ خوشی محض عارضی تھی۔ جوں جوں افغان عوام کو یقین ہوتا گیا کہ شاہ شجاع کی واپسی اور کامیابی محض انگریز کی سنگینوں کے باعث عمل میں آئی تھی۔ فضا سدوزئی حکمران کے خلاف ہوتی گئی۔ ہم عصر مورخ مارشمین (MARSHMAN) گواہی دیتا ہے کہ "انگریزی فوجوں نے جس قدر زیادہ سفاکی سے مسلمان عوام کو دبانا چاہا۔ اُن میں سرفروشی کا جذبہ اُسی قدر بیدار ہوتا گیا اور بچہ بچہ انگریزوں کا دشمن بن گیا۔ شاہ شجاع اور انگریزی فوج کی تباہی کے سب سے بڑے ذمہ دار الیگزینڈر برنیز اور ولیم میکناٹن تھے، مارشمین کے مطابق "برنیز کا اصل کام جاسوسی تھا۔ کابل میں سیاسی اقتدار کی بدمستی نے اسے ادیاشوں کا سرخیل بنا دیا تھا"

اسی لئے عوام نے غضب ناک ہو کر اس کے گھر کو گھیر لیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔"

ولیم میکناٹن کے کردار کے بارے میں سر ڈیوڈ رینڈ اور جنرل ہیوے لاک بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ "دھوکہ اور فریب کا پتلا تھا"۔ "وہ حکومتِ ہند کو غلط اطلاعیں دیتا اور دھوکے میں ڈالتا رہا" — اکبر خان سے کابل کے انخلاء کا وعدہ کرنے کے بعد بھی وہ قبائل سے نامہ و پیام کر کے سازشوں میں مصروف رہا۔

پہلی جنگِ افغانستان کے نتائج

انگریزوں نے بلا جواز افغانستان پر حملہ کر کے "بھڑوں کے چھتہ" میں ہاتھ ڈالا۔ یہ جنگ ان کی "مکمل ناکامی" کی شہادت دے رہی ہے۔ بیس ہزار آدمی مروانے اور ڈیڑھ کروڑ پونڈ کی رقم لٹانے کے بعد بھی کچھ ان کے ہاتھ نہ آیا۔ شاہ شجاع قتل ہو گیا تو مجبوراً ۱۸۴۳ء میں انگریزوں کو دوبارہ اپنے پرانے حریف دوست محمد خان کو پھر سے افغانستان کا حاکم بنانا پڑا — افغانستان کی ایک انچ زمین پر بھی انگریز کا قبضہ ہونے نہ پایا۔ سر جان کے (KAYE) نے تسلیم کیا ہے کہ "اس سے بڑی ناکامی اور تباہی تاریخ میں اور کہیں ناپید ہے۔ اس جنگ کے تباہ کن اخراجات نے ہندوستان کی مینشت کا دیوالہ نکال دیا۔ مدتوں ملک قحط اور افلاس کا شکار رہا"۔ ڈیوک آف ولنگٹن اور دوسرے انگریز مدبروں نے اسے گورنر جنرل آک لینڈ کی "سب سے فاش سیاسی غلطی" قرار دیا — اس وقت تک اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ پر اتنی کثیر رقم خرچ ہوئی کہ کمپنی کے ڈائرکٹر چیخ اٹھے اور انہوں نے اوک لینڈ کو لکھا کہ "ہمیں صاف صاف اپنی ناکامی تسلیم کر کے افغانستان کو بالکل چھوڑ دینا چاہیئے"۔ ہر طرف سے لارڈ آک لینڈ پر الزامات کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ اسے استعفیٰ دیتے ہی بن پڑی اور اس کی جگہ لارڈ ایلن برا کا تقرر عمل میں آیا۔

صوبہ سرحد اور قبائل علاقے کی سیاست پر اس جنگ کی ناکامی کا اثر بڑا دور رس ثابت ہوا۔ قبائل کو انگریزی سپاہ کے خلاف دو دو ہاتھ کرنے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ اپنی کامیابی نے انہیں اعتماد کا جذبہ عطا کیا اور بعد میں وہ مدتوں انگریزوں کی بندوقوں کے سامنے سینہ سپر کیئے ہوئے مصروفِ جہاد رہے۔ اس کے برعکس اس پہلی ہی جھڑپ میں ناکامی سے اس خطۂ زمین کے رہنے والوں کے دلوں سے انگریز کا خوف اور رعب ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا — بعد ازاں ہر موقع پر

اہلِ سرحد نے نرنگیوں کے دانت کھٹے کئے۔ انگریز کا رُعب صرف اس وقت بحال ہوا جب ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد جنگوں میں ہوائی جہازوں کا استعمال شروع ہوا۔

انتقامی کارروائی اس جنگ کی ناکامی کی اطلاع پاتے ہی لارڈ آک لینڈ نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے اور ہر جگہ سے انگریز سپاہی پشاور میں جمع ہونے لگے، بریگیڈیر وائلڈ (WILDE) کو اس فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ تاہم فوج کی تعداد اتنی نہ تھی کہ انگریز پیش قدمی کی جرأت کرتے۔ آک لینڈ تو دل کی حسرت دل میں لے کر انگلستان روانہ ہو گیا البتہ اس کے جانشین امین برآنے ۲۸ فروری ۱۸۴۲ء کو ہندوستان پہنچتے ہی فوجی مہم کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت تک جلال آباد میں انگریز جرنیل سیل (SALE) اور قندھار میں جنرل ناٹ (KNOTT) باقی ماندہ فوج کے ساتھ موجود تھے۔ اب نئی فوج کو جنرل پولاک (POLLOK) کی کمان میں درّہ خیبر کی راہ کابل پر چڑھائی کا حکم دیا گیا۔ پولاک اپریل ۱۸۴۲ء میں پشاور پہنچا۔ درّہ خیبر پہنچ کر اس نے حالات کا بغور معائنہ کیا۔ ہر پہاڑی چوٹی پر اس نے حفاظتی دستے متعین کئے اور جدید تکنیک آزمانے کے بعد وہ درّہ خیبر سے گزرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُدھر قندھار اور جلال آباد کی انگریز فوجیں بھی آگے بڑھیں اور اگست ۱۸۴۲ء میں کابل پھر انگریزوں کے زیرِ نگین آ گیا۔ اس پر انگریزوں نے وہاں کے لوگوں سے وہ وحشیانہ انتقام لیا کہ الامان! کابل کا مشہور چہار چھنہ بازار جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ بازار شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں بنا تھا، ۶۰۰ فٹ لمبا اور ۳۰ فٹ چوڑا تھا۔ اور فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھا۔ استالف نامی گاؤں کے ہر ذی نفس کو خواہ وہ مرد تھا یا عورت، بچہ تھا یا بوڑھا، مریض تھا کہ معذور، بیحد اذیت دے کر قتل کیا گیا کہ وہیں سے انگریزوں پر گولی چلنے کا آغاز ہوا تھا۔ یوں انگریزوں کا دل ٹھنڈا ہو گیا، مارش مین لکھتا ہے "مہم کا مقصد پورا ہو گیا افغانستان کو ہم نے دوبارہ مغلوب کیا۔ اپنے قیدی چھڑا لئے اور ہماری جنگی شہرت میں پھر وہی آب و تاب آ گئی ــــ" تاہم واپسی کے وقت پائے تخت کابل میں انتقام کی یادگار چھوڑنی ضروری تھی اس لئے مسقف بازار کو (جو وسط ایشیا میں اپنی طرز کی سب سے شاندار عمارت تھی) بارودی سرنگوں سے اڑا دیا گیا۔ "پہلی اینگلو افغان جنگ" اس طرح ختم ہوئی تاہم اب کے انگریز کا کوئی ارادہ کابل میں مستقل قیام کا نہ تھا۔ لارڈ امین برا نے جولائی ۱۸۴۲ء میں اعلان کیا کہ "آئندہ

برطانوی حکومت ہر اس حکمران کو تسلیم کرے گی جسے عوام کی تائید حاصل ہو اور جو ہمسایہ حکومتوں سے دوستانہ تعلقات اور امن کی فضا قائم رکھنا چاہتا ہو۔ انگریزوں کی واپسی کے وقت عارضی طور پر ایک سدوزئی شہزادہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا ہم جنوری ۱۸۴۳ء میں امیر دوست محمد خان کو کلکتہ میں سیاسی نظربندی سے رہا کر کے کابل بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے حکومت کی باگ ڈور پھر سنبھال لی اور ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۳ء تک نسبتاً بڑی کامیابی سے حکومت کی۔

سکھ حکومت کا زوال

۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو سکھ راج کا بانی مبانی مہاراجہ رنجیت سنگھ انتقال کر گیا۔ اس کے مرتے ہی سکھ دربار باہمی نفاق اور خانہ جنگیوں کا شکار ہو گیا۔ تاہم چونکہ "سہ فریقی معاہدے" کے تحت سکھوں نے انگریزوں کا حلیف بننا اور کابل پر حملہ کرنا منظور کر لیا تھا۔ اس لئے جب کرنل کلاڈ وید کے تحت شہزادہ تیمور کی ہمراہی میں انگریز فوج پشاور آئی تو سکھ لشکر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ سکھ لشکر کی کمان ونٹورہ کے ہاتھ میں تھی جو گیارہ اپریل ۱۸۳۹ء کو لاہور سے پشاور آیا۔ بعد میں ۲۶ اپریل کو شہزادہ نونہال سنگھ بھی پشاور پہنچا۔ انگریزوں اور سکھوں کا متحدہ لشکر ۲۲ جولائی ۱۸۳۹ء کو جمرود سے روانہ ہوا جو بڑی مشکل سے درہ خیبر کو پار کر سکا۔ علی مسجد اور لال چینہ میں اپنی حفاظتی فوج چھوڑنے کے بعد جب انگریز آگے چلے گئے تو چھ ہزار آفریدیوں نے لال چینہ پر ہلہ بول دیا تاہم مخالفوں نے اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آفریدی مجاہدوں کے ہاتھوں انگریزی فوج کے چار سو سپاہی مارے گئے اور اُن کی بندوقیں اور دوسرا سامان آفریدیوں کے ہاتھ لگا۔

پہلی افغان جنگ میں شکست کے بعد جب ۱۸۴۲ء میں بریگیڈیر وائلڈ (WILDE) کمک لے کر جمرود سے عازم علی مسجد ہوا تو ۱۹ فروری کو اس کا مقابلہ آفریدیوں سے ہوا۔ سکھ توپ خانہ بھی اس مرحلے پر ناکام ثابت ہوا۔ مجبور ہو کر وائلڈ اپنی فوج کے ہمراہ واپس جمرود لوٹ آیا۔

بریگیڈیر وائلڈ پشاور آیا تو سکھ فوج انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ راجہ گلاب سنگھ اور سردار پرتاب سنگھ کی کمان میں جو فوج لاہور کے سکھ دربار نے اس مہم کے لئے بھیجی تھی، وہ پشاور پہنچ چکی تھی۔ تاہم سکھ سپاہیوں کی خودسری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے افسروں تک کا حکم ماننے پر تیار نہ تھے۔ بریگیڈیر وائلڈ نے درہ خیبر کو عبور کرنے کے لئے سکھ گورنر ابوطیلہ سے کچھ توپیں مانگیں لیکن اس نے

توپیں مستعار دینے سے معذوری ظاہر کی۔

۸ رجنوری ۱۸۴۲ء کو اپنے ایک مکتوب میں بریگیڈیر وائلڈ نے لکھا کہ سکھ سپاہی اُن دنوں بے حد غیر منظم تھے۔ ہر کوئی اپنی من مانی کرتا تھا۔ پشاور کے گورنر ابو طبیلہ کو خالصہ دربار کا واضح حکم تھا کہ انگریزوں سے تعاون کیا جائے لیکن جب پشاور میں مقیم درسکھ رجمنٹوں کو جمرود کی طرف پیش قدمی کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اعلانیہ حکم عدولی کی، بعد میں ابو طبیلہ نے تین توپیں انگریز کمانڈر کو دینی چاہیں تب بھی سکھ سپاہی آڑے آئے بلکہ ایک توپ انہوں نے کہیں چھپا دی۔ بڑی مشکل سے بریگیڈیر وائلڈ نے اُن سے دو توپیں حاصل کیں۔ اسی طرح سکھوں کی چار رجمنٹوں کو علی مسجد اور درہ خیبر کی طرف پیش قدمی کرنے پر راضی تو کیا گیا لیکن وہ راستے ہی سے انگریز کمانڈر کا ساتھ چھوڑ کر واپس آگئیں۔ سکھ فوج کی اس پسپائی کے بعد وائلڈ کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا بلکہ بھاری جانی اور مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ بعد میں جنرل پولاک کمک لے کر پہنچا تو بمشکل تمام انگریز فوج درہ خیبر سے گزر کر افغانستان پہنچ سکی۔

جنرل پولاک نے بھی اس رائے کا اظہار کیا کہ سکھ افسروں اور سرداروں کا رویہ نسبتاً معقول تھا لیکن سپاہی سب کے سب گستاخ اور نافرمان تھے، بعد دشواری پولاک نے گلاب سنگھ کی فوج کو اس امر پر راضی کیا کہ وہ علی مسجد تک درہ خیبر کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرے۔

ایک بات میں سکھ حکمرانوں میں البتہ بڑی لچک اور رواداری دکھائی۔ وہ یوں کہ ۱۸۴۳ء میں جب امیر دوست محمد خان کلکتہ سے انگریزوں کی سیاسی نظر بندی سے رہا ہو کر کابل کو جا رہا تھا تو لاہور پہنچنے پر راجہ شیر سنگھ نے اس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ اگر دوست محمد خان کا اختیار ہوتا تو وہ اپنے قدیم دشمنوں سے ہرگز نہ ملتا تاہم اب اُسے انگریزی حکمتِ عملی کو بھی مدِ نظر رکھنا تھا۔ چنانچہ ایک ماہ تک امیرِ کابل سکھ مہاراجہ کا مہمان رہا۔ اس دوران مہاراجہ نے ہر طرح اس کی پذیرائی کی۔ اس طویل قیام اور گفت و شنید کے بعد اُن دونوں میں یہ معاہدہ طے پا گیا کہ صوبہ سرحد کا علاقہ خراج کی برائے نام رقم کے عوض دوست محمد خان کے حوالے کر دیا جائے گا اور دونوں فریق خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کریں گے۔

اسی سال پشاور کے سکھ گورنر ابو طبیلہ نے خرابی صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا

ادرا۔ اپنے وطن واپس جانے کی درخواست کی۔ ابوطبیلہ کی جگہ سردار تیج سنگھ کو پٹ ورکا گورنر بنا دیا گیا۔

اس اثنا میں لداخ کے حریت پسندوں نے سکھوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی تو پشاور کے سکھ کمانڈر گلاب سنگھ کو کشمیر جانا پڑا۔ اس کے جاتے ہی پشاور میں مقیم سکھ سپاہیوں میں بے چینی کے اثرات اور بھی نمایاں ہو گئے اور انہوں نے سارے علاقے میں لوٹ مار شروع کر دی۔ کشمیر کے سکھ حاکم کی جانب سے دیوان ابراہیم کو لداخ میں امن قائم کرنے بھیجا گیا تھا۔ جب وہ کاغان پہنچا تو مجاہدین اور مقامی لوگوں نے سید رضا من شاہ، آف کوائی کی قیادت میں دیوان پر چھاپہ مارا اور اس کے ایک ایک سپاہی کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا، خود دیوان ابراہیم بھی ہلاک ہوا۔ یہ جگہ اب بھی "دیوان بیلہ" کہلاتی ہے یعنی وہ جگہ جہاں دیوان ابراہیم نے شکست کھائی۔

بتایا جاتا ہے کہ سید رضا من شاہ نے مولانا ولایت علی کو (جو ان دنوں بنگال کے تبلیغی دورے پر تھے) پیغام بھیجا تھا کہ فضا اب سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے سازگار ہے، چنانچہ انہوں نے دو ہزار مجاہدین کو اپنے بھائی مولانا عنایت علی کی قیادت میں وہاں سے بھیجا تھا۔ یہ مجاہد چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں پنجاب سے گزر کر جولائی ۱۸۴۳ء میں کاغان پہنچے اور سکھوں کو بالاکوٹ سے نکال باہر کیا۔

بالاکوٹ پر قبضہ کرنے کے بعد مولانا عنایت علی کو امیر جہاد مان لیا گیا تو انہوں نے فوج کی باقاعدہ تنظیم کی۔ محرم ۱۲۶۲ھ کو مجاہدین نے گڑھی حبیب اللہ کو مسخر کر لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد فتح گڑھ پر دھاوا بولا جو سکھوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ یہ قلعہ بھی مجاہدین کے ہاتھ لگا تو انہوں نے کھیلی، دھمتوڑ، رشن اور تناول کا علاقہ بھی سکھوں سے آزاد کرا لیا۔ مجاہدین کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہفتے عشرے میں بیس بائیس مقامات کو سکھوں سے آزاد کرا لیا۔ قلعہ فتح گڑھ کا معرکہ تو اتنا خونریز تھا کہ دس کوس تک مقتولوں کی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک ایک کر کے اکثر سرحدی علاقوں سے سکھوں کے قدم اکھڑتے گئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جانشین

رنجیت سنگھ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو فوت ہوا تو اس کے بیٹے شہزادہ کھڑک سنگھ کو جانشین مقرر کیا گیا

وہ انتظامی صلاحیتوں سے محروم ہونے کے علاوہ ہر وقت شراب اور افیون کے نشہ میں دھت رہتا تھا۔ سکھ سرداروں نے اس کا تختہ الٹ دیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے نونہال سنگھ کو مہاراجہ بنا دیا۔ نونہال سنگھ ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو اپنے باپ کھڑک سنگھ کی آخری رسوم ادا کر کے گھر کی طرف آرہا تھا کہ ایک بوسیدہ عمارت گرنے سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گویا باپ اور بیٹا ایک ہی دن دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ نونہال سنگھ کے مرنے پر رانی چاند کور نے اپنی حاکمیت کا اعلان کر دیا تاہم سکھ سرداروں نے رنجیت کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو بٹالہ سے بُلا کر ۱۸ جنوری ۱۸۴۱ء کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ اپنے پیش روؤں سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ مملکت کا اندرونی نظام تو پہلے ہی ابتر تھا اب فوج بھی کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ سپاہیوں نے اپنے کئی یورپی افسروں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ وینٹورہ اور ایلارڈ بھاگ گئے۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو شیر سنگھ کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ باغیوں نے شیر سنگھ کے وزیر اعظم دھیان سنگھ اور اس کے کمسن بیٹے پرتاپ سنگھ کو بھی ہلاک کر دیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ہیرا سنگھ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس نے رنجیت سنگھ کے باقی ماندہ دو بیٹوں کشمیرا سنگھ اور پشاورا سنگھ کو بھی موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء کو ہیرا سنگھ بھی قتل کر دیا گیا۔ سکھ فوج اتنی سرکش ہو گئی تھی کہ وہ کسی کے کہے میں نہ رہی تھی۔ اس سے جان چھڑانے کے لئے رانی اور سرداروں نے انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی۔ مدکی۔ فیروز پور اور سبھراؤں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سکھوں کو شکست ہوئی۔ لاہور کے دربار میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہو گیا۔ سکھوں سے بھاری تاوانِ جنگ وصول کیا گیا۔ عملاً سارا اقتدار انگریز افسروں کے ہاتھ میں آگیا۔ اس شکست کے بعد بھی سکھوں کو چین نہ آیا۔ ۱۸۴۹ء کے آغاز میں انہوں نے پھر انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی، رام نگر، چیلیانوالہ کے بعد بالآخر گجرات کی لڑائی میں سکھوں کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو راجہ شیر سنگھ نے مانکیالہ نزد راولپنڈی میں انگریز جنرل گلبرٹ کے سامنے حاضر ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح صُوبہ سرحد اور پنجاب میں سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۹ مارچ کو لاہور میں ایک دربارِ عام منعقد ہوا۔ دربار میں کمسن سکھ مہاراجہ دلیپ سنگھ اور انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کی نشستیں ساتھ ساتھ رکھی گئی تھیں۔ سکھ راجہ نے تخت سے دستبرداری

کا اعلان کرتے ہوئے مشہورِ عالم ہیرا کوہِ نور لارڈ ڈلہوزی کو پیش کیا۔ انگریزوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو بی۔ پی بھیج دیا اور اس کی تعلیم کے لئے اتالیق مقرر کر دیا۔ اس انگریز اتالیق کے کہنے پر دلیپ سنگھ نے سکھ مذہب ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی۔ بعد میں اُسے انگلستان بھیج دیا۔ جہاں اس نے ایک یورپی لڑکی سے شادی رچالی۔

دلیپ سنگھ کی ماں رانی جنداں کو پہلے بنارس میں قید کیا گیا لیکن وہ موقع پاکر قید سے فرار ہو کر نیپال جا پہنچی ـــــ ۱۸۶۱ء میں اُسے بھی انگلستان بھیج دیا جہاں دو سال بعد وہ اس دُنیا سے چل بسی۔

دوست محمد خان کا پشاور پر قبضہ

۱۸۳۴ء سے پشاور مکمل طور پر سکھوں کے زیرِ تسلط تھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ پشاور آیا تو سردار سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ کافی عرصہ تک بارکزئی سردار سکھوں کی حفاظت میں رہا لیکن جب پہلی اینگلو سکھ جنگ کے بعد ہنری لارنس نے لاہور کے سکھ دربار میں ریذیڈنٹ کا عہدہ سنبھالا تو اُس نے سلطان محمد خان اور اس کے بھائیوں کو آزاد کر دیا اور انہیں ان کی خواہش پر پشاور بھیج دیا۔ یہ لوگ واپس آکر اپنی وزیر باغ والی رہائش گاہ میں قیام پذیر ہو گئے۔

۱۸۴۸ء میں دوسری بار سکھوں اور انگریزوں میں جنگ چھڑی اور ہر جگہ سکھوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو امیر دوست محمد خان نے اس ابتری اور طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک زبردست فوج کے ساتھ پشاور پر حملہ کیا۔ سکھوں میں مدافعت کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے امیرِ کابل کو پشاور پر قبضہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اپنے بھانجے کو پشاور کا گورنر مقرر کرنے کے بعد دوست محمد خان مزید آگے بڑھا اور خیر آباد پر قبضہ کر لیا ـــــ بجائے اس کے کہ سکھ بارکزئی حریف کا مقابلہ کرتے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ دوست محمد خان سے صلح کر لی جائے اور اپنی ساری طاقت فرنگیوں کے خلاف خرچ کی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر سکھ جرنیل چتر سنگھ اور دوست محمد خان میں ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رُو سے سکھوں نے صوبہ سرحد سے دستبرداری

اختیار کر لی۔ اس کے بدلے میں امیر دوست محمد خان نے سکھوں کی مدد کے لئے دو ہزار سواروں پر مشتمل ایک رسالہ اپنے بیٹے کی کمان میں سکھوں کے لئے روانہ کیا۔ یہ رسالہ گجرات اور چیلیانوالہ کی لڑائیوں میں شریک ہوا اور اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا۔ تاہم جب سکھوں کو شکست اٹھانی پڑی تو افغانی رسالہ کو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ انگریز کمانڈر جان گلبرٹ بھاگنے والے کا تعاقب کرتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۸۴۹ء کو پشاور پہنچا۔ بلکہ درّہ خیبر کے مقام شادی بگھیار تک بھاگنے والوں کا تعاقب کیا لیکن افغان لشکر نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور جلال آباد پہنچ کر ہی دم لیا۔ اس طرح صوبہ سرحد میں پہلی بار انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی اور کلکتہ سے لے کر درّہ خیبر تک سارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کے قبضہ میں چلا گیا۔

پہلی سکھ جنگ کے بعد انگریز اور سکھ حاکم مشترکہ طور پر نظامِ حکومت چلا رہے تھے چنانچہ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء امیر دوست محمد خان کے قبضہ پشاور تک صوبہ سرحد پر راجہ گلاب سنگھ اور جارج لارنس گورنری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

صوبہ سرحد پر سکھوں کی یلغاریوں تو ۱۸۱۸ء ہی سے شروع ہو گئی تھی تاہم ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۹ء تک پندرہ سال انہوں نے یہاں بلا شرکتِ غیرے حکومت کی، اس عرصے میں انہیں ایک دن کے لئے بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، مسلمان مجاہدین متواتر ان کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ سرحد کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع نہ مل سکا۔ ملک میں ہر طرف بدامنی اور لوٹ مار مچی رہی۔ ڈاکوؤں اور قاتلوں نے سر اٹھایا۔ کوئی مضبوط مرکزی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ خود مختار خوانین اور سردار اپنی من مانی کرتے رہے، یہی وجہ تھی کہ انگریزی حکومت کو یہاں کے لوگوں نے کم "خطرناک" (LESSER EVIL) کے طور پر قبول کر لیا۔ اگر سکھوں کی کمزوری سے صوبہ سرحد میں سیاسی خلاء پیدا نہ ہوتا تو انگریز کبھی یہاں قدم نہ جما سکتے۔

دوسری طرف غور کیا جائے تو سرحدی مہمات سکھ حکومت کو لے ڈوبیں۔ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین پنجاب ہی کی حکومت پر قناعت کرتے اور کشمیر، ہزارہ اور صوبہ سرحد کے مسلمان مجاہدین کے منہ نہ آتے تو ان کی طاقت محفوظ رہتی جس طرح مغلیہ خاندان کے آخری

بادشاہوں نے قندہار اور دوسرے سرحدی علاقوں کی تسخیر کے لئے اپنی سپاہ ہلاک کرائی اور اپنا خزانہ لٹایا۔ اسی طرح سکھوں نے بھی تاریخ سے کوئی سبق نہ لیتے ہوئے اپنے آپ کو سرحدی مہمات کے لامتناہی سلسلے میں اُلجھالیا۔ اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ سکھوں کی طاقت کمزور پڑ گئی۔ ہزارہا سکھ سپاہیوں کو مروانے اور بے پناہ دولت خرچ کرنے کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ بلکہ حالات اُن کے قابو اور بس سے باہر ہوتے گئے اور ہزارہ، کشمیر اور صوبہ سرحد سکھ فوجوں کا قبرستان بن کر رہ گئے۔

انگریزی دورِ حکومت

انگریز کا دَور

بسا اوقات معمولی معمولی واقعات بھی بہت بڑے تاریخی انقلابوں کا پیش خیمہ بن جایا کرتے ہیں۔
۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء کو لندن میں ایک ایسا ہی واقع رُونما ہوا۔ مرچ مصالحہ کی تجارت پر اُن دنوں ولندیزی تاجروں کی اجارہ داری تھی۔ ایک بار انہوں نے نرخ میں پانچ شلنگ کا اضافہ کر دیا۔ اس اضافے پر انگریز تاجر سیخ پا ہو گئے۔ ساری تاجر برادری لندن کی ایک منڈی میں جمع ہوئی ولندیزیوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار ہوا اور ولندیزیوں کے مقابلے میں ۷۲ ہزار پونڈ کے سرمائے سے ایسٹ انڈیا ٹریڈنگ کمپنی قائم کر دی گئی۔ یہی کمپنی آگے چل کر ہندوستان کی حکمران بن بیٹھی اور انگریز تاجر تاجدار کہلانے لگے۔

۲۴ اگست ۱۶۰۰ء کو انگریزی جہاز کا کپتان ولیم ہاکنز بمبئی کے ساحل پر اُترا اور پچاس پٹھان محافظوں کو ہمراہ لے کر شہنشاہ جہانگیر کے دربار آگرہ میں حاضر ہوا۔ مُغل حکمران اس زمانے میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ سے سینکڑوں گُنا مالدار اور طاقتور تھا۔ برطانوی سفیر سر طامس رو نے اس شہنشاہ سے تجارت کا اجازت نامہ حاصل کیا اور جنوبی ہند میں منڈیاں قائم کر دیں۔ فرانسیسی اور پرتگیزی قسمت آزماؤں سے انگریز کمپنی کے کارپردازوں کے کئی معرکے ہوئے۔ ستارہ عروج پر تھا۔ انگریز آگے بڑھتے گئے۔ ۱۷۵۷ء تک وہ اتنے دیدہ دلیر ہو چکے تھے کہ نواب سراج الدولہ جیسے انسان کی سیاست ان کے سامنے ماند پڑ گئی۔ اس کے ایک سو سال بعد (۱۸۵۷ء) میں اپنے خون میں نہا کر اور اپنے بیوی بچوں کو خاک میں تڑپا کر پُورے ہندوستان سے ٹکر لی تو بھی اپنے وسائل کے بل بوتے پر سرخرو رہے۔ ۱۲ اگست ۱۸۵۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے اقتدارِ برطانوی حکومت نے سنبھال لیا۔ کابل کے بازاروں، غزنی کی فصیلوں، امبیلہ کی چٹانوں، ستلج کے کناروں، خلیج بنگال کے پانیوں

میسور کے جنگلوں، سندھ اور راجپوتانہ کے صحراؤں کے چپّے چپّے پر اس پُرجوش اور منظّم قوم کے افراد نے اپنا خُون بہایا اور اپنے آپ کو حکمرانی کا اہل ثابت کر دکھایا۔ صوبہ سرحد کے معرکوں میں جان دینے والوں میں سے پہلا انگریز، جس کی قبر یہاں موجود ہے۔ معرکۂ امبیلہ ۱۸۶۳ء کا جنگ آزما لفٹیننٹ جارج مچل رچمنڈ (RICHMOND) نامی شخص تھا۔ انگریز کے سو سالہ دورِ حکومت نے ہمارے ہاں کی سیاسی ثقافتی، تعلیمی، سائنسی اور مذہبی زندگی پر ایسے نقوش چھوڑے جن کے اثرات صدیوں تک محو نہیں ہو سکیں گے۔

یوں تو صوبہ سرحد پر انگریزی عمل داری سکھ حکومت کے خاتمے کے دن (۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء) سے شروع ہوئی لیکن اس سے قبل بہت سے قابل انگریز سکھوں کے معاون کے طور پر مختلف علاقوں میں کام کر کے بہت قیمتی تجربات سمیٹ چکے تھے۔ ہربرٹ ایڈورڈز، تھانیٹن اور رینالڈ ٹیلر بنّوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے تو جارج لارنس، میکسن اور ہوڈسن پشاور کے مسائل کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے۔ میجر جیمس ایبٹ اور جان نکلسن ہزارہ کی پہاڑیوں میں اپنی قوم کی ترقی اور سربلندی کے لئے سرگرمِ عمل تھے تو لسٹن مردان اور بونیر کی سرحدوں پر دادِ شجاعت دے رہا تھا۔

ان انگریز افسروں کا تقرر انگریزوں اور سکھوں کے مابین اس معاہدے کی رُو سے عمل میں آیا تھا جس پر ۱۶ دسمبر ۱۸۴۶ء کو دستخط ہوئے۔ معاہدے میں کہا گیا تھا کہ برطانوی ہند کا گورنر جنرل لاہور میں اپنا ایک نمائندہ (ریذیڈنٹ) رکھنے کا مجاز ہو گا جو اپنی سہولت کے مختلف علاقوں میں معاون مقرر کرے گا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک سکھ حکمران مہاراجہ دلیپ سنگھ بلوغت کو نہیں پہنچتا (بلوغت کی تاریخ ۴ ستمبر ۱۸۵۴ء بنتی تھی لیکن اس کے حکمران بننے کی نوبت ہی نہ آئی) گورنر جنرل کو اختیار تھا کہ سکھ مقبوضات (صوبہ پنجاب اور سرحد) میں جہاں چاہے اپنی فوج تعین کرے گا جس کے لئے سکھ دربار کو ۲۲ لاکھ سالانہ رقم دینا ہو گی۔

پنجاب میں ان دنوں لارنس برادران کا طوطی بول رہا تھا۔ بڑا بھائی ہنری لارنس سکھ دربار میں ریذیڈنٹ کے منصب پر فائز ہوا۔ (بعد میں ترقی کرتے کرتے چیف کمشنر اور گورنر جنرل کے عہدے تک پہنچا) اس کا ایک بھائی جان لارنس کشمیر اور ہزارہ میں خدمات بجا لاتا رہا جبکہ تیسرا بھائی

جارج لارنس پشاور کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ ۱۸۴۷ء کے آخر میں میجر ہربرٹ ایڈورڈز کو سکھ دربار کی طرف سے بنوں اور ڈیرہ جات کا انتظامی افسر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے بڑی چالاکی سے وہاں کے مسلمان قبائل کو اپنا دوست بنا کر انگریزی اقتدار کے قیام کے لئے زمین ہموار کی۔ بنوں کے لوگوں کو نرمی سے رام کرنے کے بعد اس نے بنوں کا قلعہ دلیپ گڑھ تعمیر کرایا۔ یہ ایسے کلیدی مقام پر واقع تھا جہاں سے دریائے کرم سے نکلنے والی نہروں کی بخوبی حفاظت ہو سکتی تھی۔ بعد میں بندوبست کے بہانے اس نے دیہاتی قلعوں کو مسمار کر کے مقامی آبادی کو بے بس بنا دیا۔ ایڈورڈز ایک دلیر سپاہی۔ مدبر افسر، کامیاب ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ عیسائیت کا زبردست پرچارک تھا۔ بعد میں وہ پشاور کا کمشنر بنا تو پشاور شہر میں گرجا تعمیر کرایا اور ایڈورڈز مشن ہائی سکول اور ایڈورڈز مشن کالج قائم کرایا۔ پشاور میں وہ مال روڈ کے اسی بنگلہ میں رہا کرتا تھا جو آج کل بھی کمشنر پشاور ڈویژن کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔

ملتان کی جنگ

راجہ ہیرا سنگھ کے زمانے سے سکھوں کی جانب سے دیوان مولراج ملتان کا حاکم چلا آرہا تھا۔ جب خانہ جنگیوں کی وجہ سے سکھ حکومت کمزور پڑی تو اس نے لاہور والوں کو خراج اور نذرانے دینا بند کر دیا۔ ۱۸۴۶ء میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہوا تو اس نے دیوان مولراج کو لاہور طلب کیا اور اُس سے حساب کتاب مانگا۔ مول راج نے اس طلبی پر بُرا منایا اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا جس پر انگریز ریذیڈنٹ کی جانب سے مسٹر ولن اگنیو (VAN AGNEW) اور لفٹیننٹ اینڈرسن (ANDERSEN) کو کچھ فوج دے کر ملتان بھیجا گیا کہ مُول راج سے حساب کتاب سمجھ لیں اور قلعہ خالی کرالیں، ملتان پہنچنے پر دونوں انگریز افسروں کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع صوبہ سرحد میں سب سے پہلے ایڈورڈز کو ملی۔ رینال ٹیلر بھی اس وقت بنوں میں مقیم تھا، ٹیلر (TAYLOR) فتح خان ٹوانہ کو بنوں کا قلعہ دار مقرر کر کے خود اپنی وفادار فوج کے ساتھ عازمِ ملتان ہو گیا۔ بعد میں قلعہ بنوں کی سکھ فوج نے بغاوت کر دی ٹوانہ اور اس کے مسلمان ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود سکھ فوج کی حمایت کے لئے جہلم روانہ ہو گئی۔

ایڈورڈز نے ان تمام مسلمان سرداروں کو، جو سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ ساتھ ملا کر اُن سے مدد مانگی، کچھ نئی فوج بھرتی کی، ڈیرہ اسماعیل خان پہنچنے پر اُس نے سردار

فوجدار خان علی زئی کی سرکردگی میں ـــــ ملتانی پٹھانوں، گنڈہ پور، بلوچ اور دوسرے مسلمان قبائل پر مشتمل ایک رسالہ تیار کیا۔ اور ملتان کی طرف بڑھا۔ اتنے میں شیخ امام الدین سابق صوبہ دار کشمیر بھی اپنی چار ہزار فوج لے کر انگریزوں کی مدد کو پہنچ گیا۔ اُدھر ہزارہ سے جیمز ایبٹ اور دوسرے انگریز بھی اپنے حامی سپاہیوں کے ساتھ ملتان پہنچے اور اس طرح ایڈورڈسن نے مانگے تانگے کی اٹھارہ ہزار فوج اور بائیس توپوں کے ساتھ مول راج کو سدوسین کے مقام پر شکست دی۔ اس ناکامی کے بعد مُول راج قلعہ ملتان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ کافی عرصے تک قلعہ کا محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر مُول راج ہار گیا اور اُسے قیدی بنا کر لاہور بھیجدیا گیا جہاں وہ حالتِ قید ہی میں دُنیا سے چل بسا۔

ہزارہ سکھ راج کے آخری دنوں میں ضلع ہزارہ کا حاکم راجہ چتر سنگھ بھی سکھ دربار کے معتبر افسروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیٹی کی منگنی ولی عہد حکومت سے قرار پا چکی تھی۔ راجہ چتر سنگھ کی معاونت کے لئے کیپٹن جیمز ایبٹ پولیٹیکل اسسٹنٹ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بندوبست اراضی کا کام بھی اُسی کے سپرد تھا۔ یہ کام اس نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ جس کی وجہ سے وہ ہزارہ کے عوام میں بڑا مقبول ہو گیا۔ ہر طبقے کے لوگ اس کی قدر کرنے لگے۔ مسلمان قبائل بھی جو سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ایبٹ کا ساتھ دینے لگے۔

جب ملتان میں دیوان مول راج اور سکھ فوج نے انگریزوں کا خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تو ہزارہ کے سکھ حکمران نے بھی مول راج کا ساتھ دیا۔

سردار چتر سنگھ کا بیٹا راجہ شیر سنگھ بڑا فتنہ پرور اور جذباتی شخص تھا۔ وہ شروع ہی سے انگریزوں سے بدلہ لینے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے سکھوں کی فوج مقیم ہزارہ (کچھلی بریگیڈ) کو کوچ کا حکم دے دیا۔ جاتے جاتے سکھ فوجی راستے کے دیہات کو لُوٹنے اور جلانے لگے، لوگوں کا جو مال اُن کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے سمیٹنا شروع کر دیا۔ راجہ شیر سنگھ نے ایبٹ کو اپنے اعتماد میں لینا گوارا نہ کیا۔ اس پر ایبٹ نے مشوانی سرداروں کے ہاں پناہ لے لی، اور اس کوشش میں لگ گیا کہ سکھ بریگیڈ ہری پور سے ملتان کی طرف کوچ نہ کر سکے۔ چتر سنگھ کو ایبٹ کی سرگرمیوں کا پتہ چلا تو اس نے ہزارہ کے تمام مقامات کی سکھ فوج کو ہری پور میں جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ تاہم ہزارہ

کے سکھ توپخانے کے امریکی کمانڈر (CANORA) نے سکھ سردار کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ وہ ایبٹ کی رضامندی کے بغیر توپ خانہ سے کام نہیں لے گا۔ سکھ راجہ نے اُسے زیادہ ڈرایا دھمکایا تو کنورا نے کچھ توپوں میں گولے ڈال دیئے۔ دیا سلائی لے کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اگر اس پر بے جا سختی کی گئی تو وہ انہی توپوں سے سکھ لشکریوں کو اڑا دے گا۔ تاہم کنورا کے سکھ توپچیوں نے اپنے کمانڈر سے بغاوت کر دی، وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ کرنل کنورا کے مرتے ہی چتر سنگھ نے پنجاب کی دوسری سکھ چھاؤنیوں سے کمک منگوا بھیجی۔ ایبٹ نے حوصلہ نہ ہارا اور ہزارہ کے مسلمان قبائل سے مہم بازوں کی بھرتی جاری رکھی۔ ساتھ ہی اس نے پشاور کے انگریز حاکم کو بھی تمام صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ میجر لارنس۔ نے فی الفور جان نکلسن کی سرکردگی میں ایک لشکر اٹک روانہ کر دیا تاکہ اس کلیدی مقام کو مضبوط بنا کر سکھ لشکر کی پشاور کی طرف پیش قدمی ناممکن بنا دی جائے۔ نکلسن کو یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ اٹک کو مضبوط بنانے کے بعد وہ حسن ابدال پہنچ جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر اسے ہزارہ پہنچنے میں آسانی ہو۔

کرنل کنورا کا قتل ۴ راگست کو عمل میں آیا تھا۔ تاہم چتر سنگھ کو کافی عرصہ تک آگے بڑھنے اور نقل و حرکت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس اثنا میں ایبٹ نے لاہور کے ریذیڈنٹ کو بھی خبر بھیج دی۔ انگریز ریذیڈنٹ نے احتیاطاً سردار چتر سنگھ کے ایک بہترین دوست جھنڈا سنگھ کو بھی ہزارہ روانہ کیا تاکہ چتر سنگھ کو ایسے اقدام سے باز رکھے۔ لیکن ہزارہ پہنچنے پر چتر سنگھ کو سمجھانا تو درکنار جھنڈا سنگھ خود بھی انگریزوں کے خلاف سازش میں شریک ہو گیا۔

۲۸ راگست کو سارے انتظامات مکمل کر کے چتر سنگھ نے فوج کو حسن ابدال کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ چتر سنگھ اور سکھ سرداروں نے اس موقع پر امیر کابل دوست محمد خان کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ اس نازک موقع پر سکھوں کی حمایت کرے تو سکھ اٹک اور صوبہ سرحد کے سارے علاقے اس کی تحویل میں دے دیں گے۔ چنانچہ دوست محمد خان نے واقعی سکھوں کو امداد دی اور اپنے بیٹے شہزادہ اکرم خان کی سرکردگی میں ایک رسالہ پنجاب بھیجا (تفصیل پہلے آچکی ہے) چونکہ ابھی انگریزوں کے قدم پوری طرح جمنے نہ پائے تھے اس لئے وہ سکھوں یا افغانوں سے جنگ کے حق میں نہ تھے اور ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

ستمبر ۱۸۴۸ء تک نکلسن اپنے سپاہیوں سمیت حسن ابدال پہنچ چکا تھا، اُدھر سے ایبٹ بھی ہزارہ کے جنگجو قبائل سے ہمدردی کئے ہوئے دستے کے ساتھ اس سے آملا تھا۔ دونوں نے یہ طے کیا تھا کہ آگے بڑھ کر مارگلہ کے درّے کو بند کر دیا جائے تاکہ راولپنڈی کی جانب سے سکھ فوج کو مزید مدد نہ مل سکے نکلسن کے بعد چتر سنگھ حسن ابدال پہنچا تو اس نے وہ سارے گاؤں جلا دیئے جنہوں نے نکلسن کی فوج کو کسی طرح کی امداد دی تھی۔ اُدھر ہنّوں میں مقیم سکھ فوج نے اپنے افسر جان ہومز (JOHN - HOLMS) اور قلعدار فتح خان ٹوانہ کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے بعد بغاوت کر دی یہ سکھ فوج چار پیادہ رجمنٹوں کے علاوہ پانچسو سواروں اور توپ خانہ پر مشتمل تھی۔ اس فوج کی کوشش تھی کہ جیسے بھی ہو راجہ شیر سنگھ کی فوج سے جا ملے۔

جان نکلسن مارگلہ کے درّہ پر مورچے بنا کر کافی عرصہ ڈٹا رہا اور دست بدست لڑائی میں شدید زخمی بھی ہوا ـــــ بعد میں وہ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے لڑتا ہوا کالا خان نامی مجاہد کی گولی کا نشانہ بنا۔ اس کی یادگار مارگلہ میں جرنیلی سڑک کے کنارے اب بھی موجود ہے۔

اُدھر چتر سنگھ نے ہری پور سے روانہ ہونے کے بعد ملتان کی بجائے پشاور کا رُخ کیا۔ جان لارنس (حاکمِ پشاور) نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر بار بار لاہور اور شملہ سے کمک بھیجنے کی درخواست کی لیکن کوئی کمک نہ آئی۔ حالات دن بدن نازک ہوتے گئے۔ تاہم جان نکلسن نے اچانک حملہ کر کے اٹک کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ـــــ قلعہ پر اس وقت تک اس کی حامی فوج کا قبضہ تھا۔ یہ معرکہ جان نکلسن نے کمال جذبۂ سرفروشی سے جیتا تھا۔ نکلسن ساٹھ پٹھان سواروں کے ہمراہ راتوں رات سفر کر کے صبح سویرے اٹک جا پہنچا۔ ابھی وہاں کے سکھ فوجی نیند سے جاگے بھی نہ تھے کہ اس نے دربانوں کو دبوچ لیا اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ قلعے پر قبضہ کر لینے کے بعد انگریز کو گو نہ اطمینان ہوا کہ صوبہ سرحد میں داخل ہونے کا دروازہ تو اس کے ہاتھ میں تھا۔

اُدھر چتر سنگھ کا لشکر ہری پور سے چل کر عازمِ پشاور ہو گیا۔ یہ لشکر اٹک پہنچا تو نکلسن قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا چونکہ چتر سنگھ پشاور پہنچنے کی جلدی میں تھا اس نے اٹک پر رُکنا اور جنگ چھیڑنا مناسب نہ سمجھا بالآخر اکتوبر ۱۸۴۸ء کو چتر سنگھ کا لشکر پشاور میں داخل ہو گیا۔ انگریز مقاومت کے ناقابل تھے، اس لئے سکھوں نے حملہ کر کے ۲۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو ریذیڈنسی کو گھیرے میں لے لیا۔ گنتی کے انگریز افسر

اور چند ایک "وفادار" ہندوستانی سپاہی گولی کا جواب گولی سے دینے لگے۔ بڑا نقصان ہوا۔ رات ہوئی تو پشاور کا سکھ گورنر گھبرایا ہوا آیا اور انگریز ریذیڈنٹ کو سمجھایا کہ باغیوں کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ وہ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ انگریز افسروں اور اُن کے بال بچوں کو ریذیڈنسی سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ اس موقع پر سردار سلطان محمد خان بارک زئی نے عجیب چال چلی۔ حال یہ تھا کہ جن دنوں سردار سلطان محمد خان لاہور کے سکھ دربار میں نظر بند تھا تو میجر جارج لارنس اور اس کے بھائیوں نے اس سے بڑے حسنِ سلوک کا ثبوت دیا۔ اگرچہ سلطان محمد خان کو لاہور شہر سے باہر جانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ تاہم جارج لارنس کو پشاور کا حاکم بنایا گیا تو اس نے اپنی ضمانت پر سلطان محمد خان کو آزادی دلائی اور اپنے ساتھ پشاور لے آیا۔ اُسے اپنے اہل و عیال سمیت وزیر باغ میں رہنے کی اجازت دے دی، اور جاگیر بھی بحال کر دی جب کبھی سلطان محمد خان میجر لارنس سے ملتا۔ اس کے قصیدے پڑھتا نہ تھکتا۔ اب جارج لارنس پر مصیبت آئی تو سلطان محمد خان اس کے پاس پہنچا اور پیش کش کی کہ اگر لارنس اپنے بچوں کو اس کے ہمراہ کوہاٹ بھیج دے تو وہ بالکل محفوظ رہیں گے اور اُن پر کوئی آنچ آنے نہ پائے گی۔ جارج لارنس نے اس پر بھروسہ کرتے ہوئے بال بچے اور سامان اس کی حفاظت میں دے دیا تو سلطان محمد خان نے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ سکھوں سے سودا بازی کرنے لگا۔ اور ان سے معاملہ طے کیا کہ اگر اسے پشاور کی سرداری واپس دے دی جائے تو وہ جارج لارنس کے بال بچے سکھوں کے حوالے کرنے کو تیار ہے سکھوں نے اُس کی بات مان لی تو فی الواقعہ اس نے جارج لارنس کے بیوی بچے سکھوں کی تحویل میں دے دیئے سکھ تو چند دن کے مہمان تھے۔ جب ان کی حکومت ختم ہوئی اور جارج لارنس پشاور کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا تو سلطان محمد خان کو اپنی فکر لاحق ہوئی۔ اب پشاور میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً اسے کابل جا کر اپنے بھائی دوست محمد خان سے بھی پناہ کی درخواست کرنی پڑی، خود دوست محمد خان نے بھی سلطان محمد خان کی اس حرکت کو پختون روایات مہمان نوازی کے منافی قرار دیتے ہوئے اس کی سخت مذمت کی۔ جارج لارنس سلطان محمد خان سے پناہ لینے کوہاٹ پہنچا تو اُسے بھی سکھوں نے قیدی بنا لیا۔ اور بعد میں اٹک سے جان نکلسن کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

سردار چتر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی انگریزوں کے خلاف بغاوت صوبہ سرحد میں خاصی کامیاب رہی

اور کچھ عرصہ کے لئے انگریزی اقتدار یہاں بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ تاہم چونکہ سکھ سردار کو یہ بھی معلوم تھا کہ صوبہ سرحد کو قابو میں رکھنا آسان کام نہیں اس لئے اس نے حسبِ وعدہ سارے علاقے امیر دوست محمد خان کے حوالے کر دیئے۔ دسمبر ۱۸۴۸ء میں امیر خود پشاور آیا اور ان علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔

پنجاب اور صوبہ سرحد میں سکھوں کی سرکشی کو بہانہ بنا کر انگریزوں نے پوری طاقت سے جنگ چھیڑ دی۔ کئی مقامات پر برطانوی اور سکھ فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی تاہم ایک ایک کر کے سب علاقے سکھوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ اور ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کے اعلان کے مطابق ہر جگہ انگریز کا تسلط قائم ہو گیا۔

"گائیڈز" کا قیام

جونہی صوبہ سرحد میں انگریز افسروں کا تقرر عمل میں آیا انہوں نے ہر شعبے پر قابو پانے کی کوششیں شروع کر دیں، اگرچہ اس وقت تک حکومت سکھوں کی تھی تاہم اصل اختیارات کے مالک انگریز افسر ہی تھے۔ انہوں نے سکھ فوج کے متوازی فوج بھرتی کرنی شروع کر دی۔ صوبہ سرحد کے مخصوص حالات کے مطابق ۱۸۴۷ء میں "گائیڈز" کے نام سے ایک ایسا رسالہ تیار کیا گیا جو فوری طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی وردی بھی سکھ یا ہندوستانی سپاہیوں کی نمائشی وردی کی بجائے سادہ تھی اور خاکی رنگ کی۔ وہ جانتے تھے کہ صوبہ سرحد کا ہر بالغ مرد گوریلا طرزِ جنگ کا ماہر ہے اس لئے اس فوج کی تربیت میں "گوریلا" طرزِ جنگ ہی کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ نئی فوج کا کمانڈر ہیری لمسڈن کو مقرر کیا گیا۔ جو اس سے قبل ہالاکوٹ اور کشمیر کی مہموں میں مسلمان مجاہدوں کے خلاف شجاعت کا ثبوت دے چکا تھا۔

گائیڈز کا مرکز مردان تھا اور اس کی تربیت بھی زیادہ تر یوسف زئی علاقہ میں ہوئی تھی۔ اپنے قیام کے بعد ایک بار یہ رسالہ موضع کالو خان (یوسف زئی) میں مقیم تھا کہ دفعتاً رات کو کوچ کا حکم ملا۔ حملے کا مقصد پنجتار کی پہاڑیوں میں موگدرہ نامی گاؤں پر حملہ کر کے اسے فتح کرنا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہاں کے باشندے مالیہ دینے سے انکاری ہیں۔ راتوں رات اس پھرتی سے حملہ کیا گیا کہ گاؤں کا خان اور کئی دوسرے لوگ گرفتار ہو گئے۔ تین سو مویشی "گائیڈز" کے ہاتھ لگے اور "گائیڈز" کی خوب شہرت ہوئی۔

سکھوں کا یہ دستور تھا کہ ہر سال فصل کے موقع پر مختلف مقامات کو فوجی دستے بھیجتے جو دیہاتیوں کو ہراساں کر کے اُن سے مالیہ وصول کیا کرتے تھے تاہم اکثر اوقات بعض دیہات کے لوگ مالیہ دینے سے انکار کر دیتے۔ ۱۸۴۷ء میں کرنیل جارج لارنس پشاور سے سکھ فوج کا ایک بریگیڈ لے کر یوسف زئی کے علاقہ میں مالیہ کی وصولی کے لئے گیا ہوا تھا۔ گائیڈز کا ایک دستہ بھی لمسڈن کی کمان میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ وادی لوند خوڑ کے مقام بابوزئی پر رات کے وقت حملہ کیا گیا۔ راستہ طویل تھا اس لئے گاؤں پہنچنے پر پو پھٹ رہی تھی، گائیڈز کا دفعدار فتح خان اکیلے ہی دیہاتیوں سے لڑنے لگا۔ اس دوران ایک قوی ہیکل مجاہد آگے بڑھا اور دفعدار پر کاری وار کئے۔ فتح خان سنگین تانے آگے بڑھا۔ اتفاق سے مجاہد کی بغل میں بارود سے بھری ہوئی مشک تھی۔ دفعدار کی سنگین سے مشکیزہ پھٹ گیا۔ بارود زمین پر گر گیا۔ چنگاری بھڑک اٹھی اور دفعدار اور مجاہد دونوں ہلاک ہو گئے۔

خٹک نیلاب کا علاقہ دریائے سندھ کے کنارے مندوزئی اور جبئی وغیرہ دیہات پر مشتمل ہے۔ سکھوں کی آمد کے وقت یہاں کا خان جعفر خان خٹک تھا۔ سکھوں نے پشاور فتح کیا تو اُسے نیلاب کا حاکم تسلیم کر لیا۔ سکھ گورنر ابوطبیلہ نے نیلاب کا مالیہ پانچ ہزار روپیہ مقرر کیا۔

سکھوں کی دوسری جنگ ۴۹-۱۸۴۸ء میں جعفر خان نے انگریز کی مخالفت اور سکھوں کی حمایت کی تھی جس کا بدلہ انگریزوں نے یوں لیا کہ جعفر خان کو اس کے اکثر علاقوں سے محروم کر دیا جعفر خان کی جاگیر کے تین گاؤں (سوجندہ رتبہ اور باغ جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے) ضلع راولپنڈی کو منتقل کر دیئے۔ ٹیری اور دوسرے مقامات کے خٹکوں کے ساتھ بھی انگریز کا یہی رویہ رہا۔ البتہ ۱۸۵۷ء کو جعفر خان نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جعفر خان ۱۰ جنوری ۱۸۸۳ء کو فوت ہوا تو اس کے بیٹے فتح محمد خان کو جاگیردار تسلیم کر لیا گیا۔

مجاہدینِ سیّد احمد شہید سکھوں نے ۱۸۴۶ء میں انگریز سے شکست کھائی تو انہیں ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ کے طور فاتحین کو ادا کرنا پڑا۔ سکھوں کے خزانے میں اتنی رقم کہاں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جموں اور کشمیر کی ریاست ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کرنی پڑی۔ ان دنوں کشمیر کا گورنر شیخ امام الدین تھا۔ وہ سکھ

وزیرِ اعظم لال سنگھ کا دوست تھا۔ لال سنگھ نے اسے ہدایت کی کہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کو کشمیر کا قبضہ ہرگز نہ دے۔ مسلمان گورنر کافی عرصہ تک ڈٹا رہا۔ آخر معاملہ انگریز ریذیڈنٹ کے پاس پہنچا جس نے ایک تو جیمز ابیٹ کو ہزارہ پر حاکم بنا کر بھیج دیا۔ دوسرے ڈوگرہ راجہ کو قبضہ دلانے کے لئے خود جموں پہنچا۔ ہربرٹ ایڈورڈز اور ملک فتح خان ٹوانہ بھی اس کے ہمراہ تھے مشکل تمام شیخ امام الدین نے کشمیر کا قبضہ انگریز حاکموں کو دے دیا۔

"ہزارہ گزٹیئر" کا کہنا ہے کہ شیخ امام الدین کے قبضہ دے دینے کے بعد ایک سکھ فوج جو دس رجمنٹوں پر مشتمل تھی۔ سری نگر سے مظفر آباد کی راہ بالائی ہزارہ پہنچی۔ دیوان کرم چند اس فوج کا کمانڈر تھا۔ اور دو انگریز افسر ایگنیو اور لمسڈن بھی اس کے ہمراہ تھے، ۶ جنوری ۱۸۴۷ء کو جب یہ لشکر مظفر آباد اور گڑھی حبیب اللہ کے مابین درّہ دُب سے گزر رہا تھا کہ مجاہدین اور سواتیوں کے ایک دستے نے اس پر ہلہ بول دیا۔ تاہم چونکہ سکھ سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مسلمان مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ بعد میں سواتیوں نے تو گورنرِ کشمیر کی اطاعت قبول کر لی جب کہ ہندوستانی مجاہد اِدھر اُدھر کے علاقوں میں روپوش ہو گئے۔ بہت سے معرکے ہوئے لیکن بعد میں اوکنلے کے مطابق مجاہدین کی پوری فوج نے ہری پور میں مسٹر ایگنیو (AGNEW) کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، صرف میر اولاد علی مستثنیٰ رہے اور تھوڑے سے ہمراہیوں کو لے کر ستھانہ چلے گئے۔ مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی کو انگریز فوجیوں کی نگرانی میں عظیم آباد (پٹنہ) بھیج دیا گیا اور وہاں اُن سے دس دس ہزار روپے کے مچلکے لئے گئے کہ چار سال تک اس شہر سے باہر نہ جائیں گے۔

ہزارہ اس وقت تک ولایتِ کشمیر میں شامل تھا۔ اگرچہ انگریز کی سنگینوں کے سہارے گلاب سنگھ ڈوگرہ اس پر قابض ہو گیا۔ تاہم چند ہی ماہ میں اس پر یہ بات روشن ہو گئی کہ مسلمان قبائل کے ہاتھوں وہ وہاں چین سے نہیں رہ سکے گا۔ لہٰذا، اس نے مارچ ۱۸۴۷ء کو انگریزوں سے باضابطہ درخواست کی کہ بالائی ہزارہ کا علاقہ اس سے لے لیا جائے اور اس کے بدلے میں جموں کا علاقہ دے دیا جائے۔ اگرچہ سکھ دربار نے اس تبادلے کی مخالفت کی تاہم ریذیڈنٹ سر ہنری لارنس کی سفارش پر یہ درخواست منظور کر لی گئی اور ہزارہ کا الحاق صوبہ سرحد سے ہو گیا۔

"لمسڈن" کا سوانح نگار تسلیم کرتا ہے کہ ۱۰ جنوری ۱۸۴۷ء کو کاغان کے سید اور ستھانہ کے مجاہد

انگریزوں کی شدید مزاحمت کر رہے تھے انگریزی فوج دریائے مین سکھ کے پاس مقیم تھی۔ جب کہ مسلمان مجاہدوں نے پہاڑوں پر مورچے جما رکھے تھے۔ کافی دنوں تک مقابلہ رہا۔ آخر لمسڈن نے چالاکی سے کام لیا۔ اس نے خود بھی گوجروں کا لباس پہن لیا اور اپنے چند ساتھیوں کو بھی وہی لباس پہنا دیا۔ پھر وہ بندوقیں لے کر ان چشموں کے پاس مورچہ بند ہو گئے جہاں مجاہدین وضو کرنے اور پانی پینے آتے تھے۔ جونہی مجاہدین انگریزوں کی زد میں آئے ان پر دھڑا دھڑ فائرنگ کی گئی جس سے بہت سے مجاہد شہادت پا گئے۔ لمسڈن اس وقت نو سالہ تجربہ کار لفٹیننٹ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مجاہدین کے ساتھ یہ چالاکی ہی اس کی ترقی کا پیش خیمہ بنی اور جلد ہی اسے نئے قائم ہونے والے رسالے "گائیڈز" کا کمانڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔

دوسرے سال ۲۸ جولائی ۱۸۴۸ء کو "گائیڈز" کے ایک دستہ کو جس کی کمان صوبیدار رسول خان .... (برادر فتح خان خٹک) کے ہاتھ میں تھی حکم دیا گیا کہ وہ فوراً امرتسر جائیں جہاں گوبند گڑھ کے قلعے پر باغی سکھوں کی ایک پلٹن قابض تھی۔ گائیڈز کی یہ پلٹن جس میں کمانڈر کے علاوہ چار افسر، ۲۸ جونیئر افسر اور ۱۱۸ جوان تھے۔ پوری سرعت کے ساتھ وہاں پہنچی اور شدید گولہ باری کے بعد سکھوں سے قلعہ کا قبضہ چھین لیا۔ رسول خان کو اس کارنامہ پر ایک ہزار روپیہ انعام دیا گیا اور دستے کے ہر فرد کو نقد رقم دی گئی۔

ہزارہ کے ترک سرداروں فتح خان اور حیات خان نے انگریزوں کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کیا تو میجر ایبٹ نے انہیں قید میں ڈال دیا۔ میجر ایبٹ کی آمد پر ضلعی مرکز شیروان میں تھا۔ ایبٹ نے رش کے میدان میں نیا شہر آباد کیا جو اس کے نام پر ایبٹ آباد کہلایا اور اسے ضلع اور اب ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ نتھیا گلی اور گھوڑا گلی کے صحت افزا مقامات بھی سب سے پہلے ایبٹ ہی نے دریافت کئے۔ نتھیا گلی بعد میں سرحد کی صوبائی حکومت کا گرمائی صدر مقام قرار پایا۔

۱۸۴۹ء

۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہندوستان نے ایک اعلان کے ذریعے سکھ حکومت کے تمام مقبوضہ علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دیئے جانے کا بتایا جاتا ہے کہ اس اعلان سے پیشتر انگریز حکام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر اس امر پر سنجیدگی سے غور کرتے رہے کہ سرحدی علاقوں کا انگریزی مملکت میں شامل کرنا مناسب ہوگا یا نہ؟ سر جان لارنس

ان علاقوں کو اپنی تحویل میں لینے پر آمادہ نہ تھا۔ پہلی افغان جنگ اور دوسری سرحدی مہمات میں ہونے والے مالی اور جانی نقصانات اس کے سامنے تھے۔ صرف ایک جنگ میں انگریز نے بیس ہزار افراد مروائے اور دو کروڑ پونڈ روپیہ خرچ کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ڈائریکٹر بھی سرحدی علاقوں پر انگریزی اقتدار کے قیام کو گھاٹے کا سودا قرار دیتے تھے۔ تاہم جب معاملہ لارڈ ڈلہوزی کے سامنے پیش ہوا۔ تو اس نے ان علاقوں کے الحاق کی حمایت کی اور اس طرح صوبہ سرحد پر "یونین جیک" لہرانے لگا اس وقت صوبہ سرحد میں دو انتظامی ڈویژن بنائے گئے۔ پشاور اور ڈیرہ جات۔ پشاور میں کمشنر کے عہدے (MACKSON) پر میکسن کا تقرر عمل میں آیا جب کہ جارج لارنس پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان، بنوں، کوہاٹ، پشاور اور ہزارہ کے اضلاع قائم کئے گئے جو اس وقت تک پنجاب ہی کی صوبائی حکومت کے تحت تھے۔ کولن کیمبل نامی ایک تجربہ کار جرنیل کو صوبہ سرحد کا فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا۔ اسی افسر نے موجودہ پشاور چھاؤنی کی بنیاد رکھی۔ اپنی رہائش اور دفتر کے لئے اس نے موجودہ کور ہیڈ کوارٹر کو منتخب کیا۔ جو اس سے قبل علی مردان خان کے باغ سے موسوم تھا اور جس میں اب بھی پرانی طرز کی ایک عمارت باقی ہے، کیمبل ہی نے مال روڈ پر خوبصورت باغ لگایا جسے کمپنی باغ یا میکسن گارڈن کہا جاتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں کمشنر میکسن اپنے بنگلے میں دفتری کام انجام دے رہا تھا کہ کنٹر کے ایک شخص عبداللہ نے ایک درخواست اسے پیش کی۔ ابھی میکسن وہ درخواست پڑھ ہی رہا تھا کہ عبداللہ نے پیش قبض سے پے در پے وار کر کے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ میکسن کے قتل پر گورنر جنرل ڈلہوزی تک نے سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ڈلہوزی نے اُسے شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا، کمپنی باغ میں مدتوں میکسن کی یادگار کے طور ایک لاٹھ کھڑی تھی جس میں اس کی خدمات کندہ تھیں۔ آزادیٔ وطن کے بعد دورِ غلامی کی یہ یادگار ہٹا دی گئی اور اس باغ کو "خالد بن ولید گارڈن" کا نام دیا گیا۔ اس زمانے میں پشاور پر آفریدی قبائل حملہ آور ہوتے رہتے تھے اس لئے کیمبل نے پشاور چھاؤنی اس انداز سے بنوائی کہ فوج کی بیرکیں پشاور کے شمال مغرب کو واقع ہیں تاکہ خیبر کی طرف سے آنے والے ہر حملہ آور کو روکا جا سکے۔

انگریزوں کے سامنے اب فوری کام یہ تھا کہ حکومت کے نظم و نسق میں بہتری پیدا کی جائے۔ سکھوں کے دور تک ہر علاقے کا مالیہ نیلام ہوتا تھا۔ بڑے بڑے بارسوخ خان اور ارباب اجارہ حاصل کر

لیتے تھے اور لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق مالیہ وصول کرتے تھے۔ انگریز سرکار ان لوگوں کے اختیارات ختم کرنا چاہتی تھی اور تمام انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے فرض شناس اور مستعد افسروں اور کارکنوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "گائیڈز" ہی کی طرز پر "پنجاب فرانٹیئر فورس" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ یہ تنظیم فوجی نوعیت کی تھی۔ اور سارے پنجاب کی شمال مغربی سرحدات کی حفاظت اس کے ذمے تھی۔ عرفِ عام میں اس رجمنٹ کو (PIFFERS) "پفرز" کہا جاتا تھا۔ اور اس کے سپاہیوں اور افسروں کی تعداد گیارہ ہزار تھی ـــــ اس نئی فوجی تنظیم کے قیام کے ساتھ "گائیڈز" کی نفری بھی بڑھا دی گئی ۱۹ر جون ۱۸۴۹ء کو ایک پلٹن کی جگہ "گائیڈز" کی چار پلٹنیں اور دو کمپنیوں کی جگہ چھ کمپنیاں بن گئیں۔ لمسڈن کے علاوہ لفٹیننٹ ہارڈنگ اور لفٹیننٹ ملر (MILLER) بھی گائیڈز کے افسر بنا دیئے گئے۔

لمسڈن فوجی کمانڈر بھی تھا۔ اور یوسف زئی مردان کا اسسٹنٹ کمشنر بھی۔ وہ جارج لارنس ڈپٹی کمشنر پشاور کے تحت کام کرتا تھا۔ لارنس نے لمسڈن کو ایک معلوماتی دورے پر روانہ کیا تاکہ تمام سرکردہ خوانین اور زمینداروں سے رابطہ قائم کرے اور انہیں مالئے کی ادائیگی کی ترغیب دے۔ لمسڈن نے بیس پٹھان نوجوان اپنے محافظوں کے طور ساتھ لئے۔ اس زمانے کا صوبہ سرحد آج سے بہت مختلف تھا۔ ہر کاشت کار زمین میں ہل چلاتا تو تلوار اس کے پہلو میں لٹک رہی ہوتی۔ تو ڑے دار بندوق پاس ہی رکھی ہوتی۔ گو بکی آگ کھیت میں سلگتی رہتی کہ بندوق داغنے کے لئے آگ کی تلاش نہ کرنی پڑے۔ ایسے لوگوں سے مالیہ کی وصولی کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس مقصد کے لئے انگریز افسر فوج کے ہمراہ گاؤں گاؤں جاتے اور لوگوں سے رقم وصول کرتے۔ ایسے ہی ایک دورے میں میجر لارنس بائیزئی کے علاقہ میں پہنچا تو اس پہ فائرنگ کی گئی۔ گاؤں کے خوانین کو متوجہ کیا گیا۔ لیکن وہ مجرموں کو گرفتار کرانے یا انہیں سزا دینے میں ناکام رہے۔ اس پر دسمبر ۱۸۴۹ء میں ایک مہم بائیزئی کو جو دریائے سوات کے مشرق میں واقع ہے۔ روانہ کی گئی۔ لفٹیننٹ جنرل بریڈشا (BRAD SHAW) اس کی قیادت کر رہا تھا ـــــ بابوزئی اور پلائی کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے یہ دیہات ویسے تو یوسف زئی خوانین کی ملکیت تھے۔ تاہم ان کے مزارعین زیادہ تر خٹک، لودھی، مشوانی اور شلمانی وغیرہ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں نے حملہ کیا تو یہ لوگ پہاڑوں میں

روپوش ہو گئے تاہم بعد میں انہوں نے مالیہ دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

انگریزی حکومت کو ان مشکلات کا بخوبی احساس تھا۔ جو صوبہ سرحد کے جنگجو قبائل کی وجہ سے اُسے درپیش تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ برطانوی پالیسی بہت محتاط تھی۔ انگریزی تسلط صرف میدانی علاقوں تک محدود تھا۔ قبائلی اور پہاڑی علاقوں کی طرف پیش قدمی کی جرأت نہ کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کی محتاط پالیسی کو برطانوی حکومت نے "MASTERLY INACTIVITY" کی حکمت عملی قرار دیا ہے تاہم انتہائی احتیاط کے باوجود بھی ان سات برسوں میں انگریزوں کو مختلف سرحدی قبیلوں کے خلاف ۳۷ فوجی مہمات بھیجنی پڑیں۔ اور برطانیہ کے نامور فوجی افسر کولن کیمبل، نیول چیمبرلین اور جان جیکب، جان کوک اور رابرٹ سنڈیمن سبھی ان سرحدی مہموں میں حصّہ لیتے رہے۔

کوہاٹ ۱۸۴۹ء تک کوہاٹ میں صرف ایک ہی انگریز افسر مقیم تھا۔ اور وہ تھا لفٹیننٹ پولاک (جو بعد میں سر جیمز پولاک کہلایا) پولاک وہاں کا فوجی کمانڈر بھی تھا اور ڈپٹی کمشنر بھی۔ یوں نام کو وہ حاکم پشاور جارج لارنس کے تحت تھا لیکن دونوں افسروں میں رابطہ کا کوئی انتظام موجود نہ تھا۔ اس لئے دونوں کو اپنی اپنی صوابدید سے کام چلانا پڑتا تھا۔ درّہ کوہاٹ کو عبور کرنا اُس زمانے میں کسی انگریز کے بس کا روگ نہ تھا۔ ٹیلی فون کا انتظام تھا نہ تار کا۔ پولیس موجود تھی نہ نظم و نسق چلانے کی کوئی مشینری یا ادارہ۔ اس وقت تک کوہاٹ چھاؤنی میں تھوڑی سی سکھ فوج رہتی تھی جس کی باگ ڈور سردار لاہورا سنگھ کے ہاتھ میں تھی یا ملتانی پٹھانوں کے کچھ دستے تھے۔

پولاک ان دنوں سردار سلطان محمد خان کی کوہاٹ والی قیام گاہ میں رہتا تھا۔ قلعہ کے قریب ان دنوں سڑک تعمیر ہو رہی تھی۔ رات کو بارود سے پتھروں کو توڑا جا رہا تھا کہ اندھیرے میں کچھ چیز پولاک کے قریب آ کر گری۔ لالٹین لا کر دیکھا گیا تو وہ کسی انسان کی ران کی ہڈیاں تھیں۔ اصل میں جہاں سڑک بن رہی تھی وہ سب مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ وہیں سے ہڈی اُڑ کر آئی تھی، غنیمت تھا کہ رات کا وقت تھا کہ اس ہڈی پر کسی مسلمان کی نظر نہ پڑی ورنہ مذہبی اشتعال کا پیدا ہونا ضروری تھا اور ایک دفعہ اگر مسلمان اُٹھ کھڑے ہوتے تو پولاک کی خیر نہ تھی۔

پولاک فرض شناس افسر تھا۔ سر ہنری لارنس اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ وہ بائیس تیئیس سالہ نوجوان تھا۔ پہلے ملتان میں سکھوں کے خلاف نبرد آزما رہا بعد میں تھوڑی سی فوج دے کر لکی مروت میں تعین کیا گیا جہاں اس نے میجر ٹیلر کے تحت کام کیا۔ تاہم پولاک بڑا زیرک اور چالباز تھا۔ اس نے اپنی اسی چالاکی سے کام لے کر امیر دوست محمد خان کے دوسرے بیٹے سردار محمد عظیم کو بنوں سے نکال باہر کیا اور کابلی شہزادہ کرم پاڑہ چنار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

انگریز کی حکمتِ عملی شروع میں یہ تھی کہ نئے شہر ایسی منصوبہ بندی کے تحت بسائے جائیں کہ وہ قلعہ کی دُور مار توپوں کی زد میں رہیں اور وہاں کے لوگوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ کوہاٹ کے موجودہ شہر کے متعلق کوہاٹ ڈسٹرکٹ گزیٹر (۱۹۳۳ء) لکھتا ہے کہ کوہاٹ کا قدیم شہر جسے دولت خان ولد بائی خان ولد اسمٰعیل خان نے بسایا تھا۔ اور اس کی حفاظت کے لئے قلعے کو مضبوط بنایا گیا۔

بنوں کا بھی یہی حال ہے پہلے انگریزوں نے وہاں دلیپ گڑھ کا قلعہ بنوایا۔ پھر بنوں شہر آباد کیا جو قلعہ سے ایک ہزار قدم دور تھا اور انگریزی توپوں کی زد میں آتا تھا۔ بنوچیوں کے پاس چونکہ دیسی بندوقیں (جزیلچیں) ہوتی تھیں جو دو سو گز سے آگے مار نہ کر سکتی تھیں اس لئے وہ چاہتے بھی تو قلعہ میں مقیم فوج کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکتے تھے۔

انگریز شروع ہی سے کم آمیز اور الگ تھلگ رہا۔ اُس نے اس ملک کے عوام کے ہجوم میں اپنی شخصیت اور ذات کو گم نہیں کیا بلکہ اپنا علیحدہ تشخص اور وجود قائم رکھا۔ عوام سے کچھ فاصلے پر رہنے اور رکھ رکھاؤ کی پالیسی اپنانے کی وجہ سے اس کا رُعب داب قائم رہا۔ انگریز افسروں نے اپنی پسند کے بنگلے کھلی فضاؤں میں تعمیر کئے۔ ایڈورڈز اور نکلسن نے بنوں میں اپنے ذوق کے مطابق انگریزی طرز کے بنگلے تعمیر کئے۔ پشاور اور دوسرے شہروں میں بھی انگریز افسروں کی قیام گاہیں شہروں کے پُرشور ماحول سے دُور بنائی گئیں۔ انگریزوں نے ہر جگہ کلب بنائے جہاں وہ شام کے فارغ اوقات میں مل بیٹھتے۔ کھیل کھیلتے۔ تاش کی بازی لگاتے۔ کھاتے پیتے۔ انگریزی اخبار رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ ناچ رنگ سے دل بہلاتے اور آپس میں نظمِ حکومت چلانے کے متعلق ضروری مشورے کرتے۔ ان میں سے اکثر کلب صرف انگریزوں کو رکنیت عطا کرتے۔ ہندوستانی افسروں

کو، خواہ وہ بڑے سے بڑے عہدے پہ فائز ہوں۔ آفیسر کلب کا ممبر نہ بنایا جاتا۔ یہ کلب انگریزوں میں ہمیشہ قومیت کا احساس تازہ رکھتے اور ان کی بدولت انگریز افسر پشاور، بنوں اور کوہاٹ میں رہتے ہوئے یورپی فضا اور یورپی ماحول سے فیض یاب ہوتے۔

۱۸۵۰ء

بیں جارج لارنس بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے اُسے موسم گرما شملہ میں گزارنے کا مشورہ دیا۔ کچھ عرصے کے لئے چھٹی پہ گیا تو اس کی جگہ لمسڈن ڈپٹی کمشنر پشاور کے طور کام کرتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ "گائیڈز" کے کمانڈر کے طور پہ بھی اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔

ان دنوں گورا فوج گورگھٹڑی اور بالاحصار میں رہا کرتی تھی۔ البتہ لمسڈن چھاؤنی میں ایک بُرج میں رہا کرتا تھا۔ بُرج کے چاروں طرف گائیڈز کے سپاہیوں کے خیمے تھے۔ بُرج اُونچا اور مٹی کا بنا ہوا ہونے کی وجہ سے نسبتاً ٹھنڈا تھا۔ رات کو سیڑھی لگا کر بُرج میں جاتے تو سیڑھی اٹھالی جاتی تھی تاکہ باہر کا کوئی آدمی بُرج میں داخل نہ ہو سکے۔ لمسڈن اس بُرج میں لفٹیننٹ پولاک (اسسٹنٹ کمشنر) کے ساتھ رہتا۔ تھوڑے عرصے کے لئے اس کا بھائی بھی اس کے پاس مقیم رہا۔ اُن دنوں انگریز افسروں کو سختی سے ہدایت تھی کہ وہ دن ہو، رات مسلح اور باوردی رہیں۔ وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں ہر شخص مسلح دکھائی دیتا تھا اور عزت بھی مسلح شخص کی جاتی تھی۔ غیر مسلح شخص کو کوئی بھی افسر ماننے کو تیار نہ تھا۔

لمسڈن اپنے بُرج میں لوگوں سے ملاقات کیا کرتا اور قبائل سے متعلق اطلاعات حاصل کرتا۔ اس سے ملاقات کو آنے والوں میں رحمت خان نامی اورکزئی ملک بھی تھا جسے انگریزوں نے درّہ آدم خیل میں امن بحال رکھنے کی خدمت تفویض کر رکھی تھی۔ لمسڈن اکثر اوقات بیرونی علاقوں کی گشت پہ بھی جایا کرتا تھا۔ ایک بار گشت کے دوران اس نے "رضا" نامی ایک مشہور ڈاکو کو بھی گرفتار کر لیا۔ جو شہر کے ہندو سیٹھوں پہ ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔

ان دنوں ذخا خیل آفریدی چھاؤنی کے گرد منڈلاتے رہتے اور جونہی انہیں موقع ملتا فوجی گھوڑے یا بندوقیں لے کر چلتے بنتے۔ ۱۸۵۰ء میں جی۔ ٹی روڈ کی تعمیر کا کام شروع تھا جس کے نگران لفٹیننٹ الیگزینڈر ٹیلر تھے۔ پشاور سے راولپنڈی تک ریل گاڑی نہ تھی۔ لوگ پیادہ یا گھوڑے پہ سفر کرتے۔ بڑے بڑے افسر گھوڑا گاڑی میں آتے جاتے۔ فوج ایک جگہ

سے دوسری جگہ جاتے ہوئے پڑاؤ کرتی تو رات کو گردونواح کے لوگ ان کی رائفلیں اٹھا کر لے جاتے۔

۱۸۵۰ء کے آخر میں شمالی علاقوں کا فوجی کمانڈر کولن کیمبل دورے پر پشاور آیا۔ دونوں نے ذخاخیل آفریدیوں سے جان چھڑانے کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ تاہم لمسڈن نے کسی مہم کا مشورہ اس لئے نہ دیا کہ آفریدی حملے کی صورت میں اپنے پہاڑی ٹھکانوں پر چلے جاتے تھے اور حملہ آوروں کو سوائے شرمندگی کے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا تھا۔

درّہ آدم خیل کی مہم

۱۸۵۰ء میں انگریز کمانڈر ان چیف جنرل سر چارلس نیپئر (NAPIER) خود پشاور آیا اور درّہ آدم خیل کے قبائل کے خلاف مہم بھیجی۔ میجر لارنس پولیٹیکل آفیسر کے طور اس کے ہمراہ تھا اور پشاور کا کمشنر ہربرٹ ایڈورڈز بھی مشوروں میں شامل تھا۔

واقعات یوں تھے کہ پشاور سے کوہاٹ جانے والی سڑک درّہ آدم خیل سے ہو کر گزرتی ہے اس درّے میں آفریدیوں کے مختلف قبیلے آباد ہیں۔ سکھوں کا بھی یہ دستور تھا کہ سڑک کی حفاظت کے معاوضے کے طور ہر سال کچھ رقم آدم خیل آفریدیوں کو ادا جاتی تھی۔ انگریز آئے تو انہوں نے بھی اس دستور پر عمل جاری رکھا۔ ۲ر فروری ۱۸۵۰ء کو سڑک کی مرمت کی جا رہی تھی کہ اچانک آفریدیوں نے مزدوروں اور کارکنوں کو کام سے روک دیا اور دھمکیاں دیں۔ صوبہ سرحد میں انگریزی اقتدار کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اس لئے انگریز سختی سے ایسی وارداتوں کو دبانا چاہتے تھے چنانچہ بریگیڈیر جنرل سر کولن کیمبل کی کمان میں ایک فوج تیار کی گئی۔

۹ر فروری ۱۸۵۰ء کو یہ فوج پشاور سے روانہ ہوئی تو کمانڈر ان چیف چارلس نیپئر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ۱۰ فروری کو مختصر سی لڑائی کے بعد انگریزوں نے آخور کے گاؤں پر قبضہ کر لیا جو درّہ کوہاٹ کے شمالی نقطۂ آغاز پر واقع ہے، کچھ فوج یہاں چھوڑ کر برطانوی لشکر نے کوہاٹ کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ سڑک کے کنارے بہت سے دیہات کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ۱۱ر فروری کو برطانوی سپاہی کوتل کے پاس جا پہنچے۔ آفریدیوں نے کوتل پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہر چٹان کے پیچھے سے انگریزوں پر گولیاں برسنے لگیں۔ سخت نقصان اٹھانے کے باوجود انگریزوں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

انگریزوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ تب پیدا ہوا جب بارڈر پولیس اور پنجاب فرانٹیئر فورس (پفرز) کے سپاہیوں نے اپنے مسلمان بھائیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اکثر سپاہی لڑائی میں حصہ بھی لے رہے تھے تو بڑی بے دلی سے، صرف ملک دین خیل آفریدیوں پر مشتمل بارڈر پولیس کے ایک دستے نے اپنے کمانڈر فتح خان کی کمان میں پوری بہادری دکھائی۔ اس پر کمانڈر ان چیف نے اُن کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اُن کے افسروں کو ہاتھی پر بٹھا کر پشاور لایا گیا۔

اس کے دو ہفتے بعد قبائلیوں نے کوتل کی پولیس پوسٹ پر ہلہ بول دیا۔ محصور سپاہیوں پر سخت وقت آن پڑا تاہم بروقت کمک پہنچ جانے سے زیادہ نقصان نہ ہونے پایا۔ کوہاٹ سے بھی فوج اُن کی مدد کو پہنچ گئی۔ اس کے باوجود کوتل کا بُرج مسمار کر دیا گیا۔

بالآخر سیاسی گفت و شنید کا سہارا لینا پڑا۔ صُلح کی شرائط طے پا گئیں جن کی رُو سے آدم خیل کو دیئے جانے والے مواجب کی رقم بڑھا دی گئی اور پشاور اور درّہ کوہاٹ کے درمیان انگریزوں نے فورٹ میکسن کے نام سے ایک اور قلعہ تعمیر کر لیا۔

بہادر خیل کے معرکے

کوہاٹ سے بنوں جانے والی شاہراہ پہلے فری پانوس اور کرک سے ہو کر گزرتی تھی لیکن بہادر خیل کی نمک کی کانوں پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے نئی سڑک بنائی جو بہادر خیل اور سور ڈاگ سے ہو کر نکلتی تھی۔ نئی سڑک کے اخراجات پورے کرنے کے لئے انگریزوں نے عوام پر نمک کا محصول بھی بڑھا دیا۔ اس طرح لوگوں میں اُن کے خلاف نفرت پھیل گئی۔

فروری ۱۸۵۰ء میں ژواکئی آفریدیوں پر فوج کشی کی گئی تو علاقہ خٹک میں بھی غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ انگریزی استبداد کی اعلانیہ مخالفت کرنے لگے۔ اس پر انگریزوں نے لفٹیننٹ پولاک کے تحت ایک فوج اور توپخانہ خٹکوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ خٹک بھی دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے پولاک اور اس کے سپاہیوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور وہ لتمبر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ فائرنگ اپریل ۱۸۵۰ء تک جاری رہی۔ بالآخر انگریز نے نمک کے محصول میں بھاری کمی کر کے اپنی جان چھڑائی۔

اکتوبر ۱۸۵۰ء میں بہادر خیلیوں کی رگِ حمیت پھر پھڑکی تو انہوں نے طوطلکئی کے نواح میں

انگریز لیوی کے دستوں کو شکست دے کر بہادر خیل کی نمک کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر کپتان کوک اور لفٹیننٹ پولاک نے بہت بڑی طاقت کے ساتھ اُن پر چڑھائی کی۔ خٹکوں کو پسپا ہوتے ہی بن پڑی۔ اب کے انگریزوں نے بہادر خیل میں ایک حفاظتی قلعے کی تعمیر شروع کر دی۔ جہاں سے نمک کی کانوں کی دیکھ بھال مؤثر طریقے سے ہو سکتی تھی۔ بعد میں ۱۸۵۲ء کے موسم گرما میں ایک بار پھر خٹک فرنگیوں کے خلاف جہاد پر تُل گئے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں ترسی اور لتمبر میں فوجی چوکیاں قائم کر لی تھیں اور رانی زئی پر بھی حملہ کر رکھا تھا۔ اس جہاد میں بہادر خیل کرک اور لیوغر کے خٹک جانبازوں نے حصّہ لیا اور ایسی دادِ شجاعت دی کہ انگریزوں کو ہرانے کے بعد ایک بار پھر بہادر خیل کی نمک کی کانوں پر قبضہ کر لیا۔

کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے یہ سُنا تو رانی نویوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود فرسٹ پنجاب کی پوری رجمنٹ، پیادہ فوج اور رسالے کے چار سکوارڈن لے کر ۴ جون ۱۸۵۲ء کو بہادر خیل پہنچ گیا۔ بہادر خیلوں نے پھر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جنگ طول پکڑ گئی تو مجاہدین کے پاس گولہ بارود ختم ہو گیا۔ جس پر بہادر خیل کا قبضہ پھر انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔ انہوں نے انتقام کی آگ میں اندھے ہو کر سارے گاؤں کو مسمار کر دیا۔ اور بچّہ بوڑھا جو اُن کے ہاتھ لگا قتل کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ فرنگی نے عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ اب بہادر خیل تو خاموش ہو گئے لیکن لیوغر کے مردانِ کُہستان ۱۸۵۳ء تک مصروفِ پیکار رہے۔ رفتہ رفتہ بہادر خیل کا گاؤں دوبارہ آباد ہو گیا۔ انگریز نے ان علاقوں میں لتمبر کا تھانہ، ۱۸۴۹ء میں، بہادر خیل کا ۱۸۵۲ء میں اور کرک کا تھانہ ۱۸۸۰ء میں تعمیر کرایا۔

گائیڈز جنوبی اضلاع میں تو انگریزی استعماریوں پاؤں پھیلا رہا تھا جب کہ شمالی علاقوں بالخصوص یوسف زئی قبائل کو قابو میں رکھنے کے لئے لمسڈن اور دوسرے حکامِ بالا "گائیڈز" کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنا رہے تھے۔ لمسڈن نے یہ پالیسی اپنا رکھی تھی کہ "گائیڈز" میں مہم جو اور تجربہ کار پٹھان نوجوانوں کو بھرتی کیا جائے جنہیں مقامی حالات کا علم ہو۔ سکھا شاہی کے مظالم اور بدنظمی کے نتیجے میں سارے صوبہ سرحد میں کساد بازاری، بے روزگاری اور اقتصادی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لوگ بڑی تعداد میں بھرتی کے لئے

آتے تاہم لمسڈن صرف انہی نوجوان کا انتخاب کرتا جو نشانہ بازی اور سپاہیانہ فنون میں مہارت رکھتے۔ ان دنوں ستمبہ اور گردونواح میں دلاور خان نامی ڈاکو کا بہت چرچا تھا۔ اس کی گرفتاری کے لئے دو ہزار روپیہ انعام کا اعلان بھی حکومت کی طرف سے کیا جا چکا تھا۔ یہ شخص قتل اور غارتگری میں یگانۂ روزگار تھا۔ لوگ اس کا نام سُن کر ہی کان پکڑتے۔ لمسڈن کو خیال آیا کیوں نہ ایسے دلیر اور مُہم باز کی خدمات حاصل کی جائیں۔ چنانچہ اس نے ایک قاصد بھیجا اور دلاور خان کو اپنے پاس بُلا بھیجا۔ ساتھ ہی لمسڈن نے "راہ داری" کا پروانہ بھی بھیج دیا اور اسے یقین دلایا کہ اسے کسی قسم کا ضرر پہنچنے نہیں پائے گا۔

دلاور خان ذہین اور تیز طرار شخص تھا۔ وہ جہانگیرہ کے ایک خٹک گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ پہلے پہل دینی تعلیم بھی حاصل کرتا رہا تھا۔ بعد میں غلط لوگوں کی سوسائٹی میں پڑ کر بگڑ گیا تھا اور قتل، ڈاکہ اور غارت گری کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ انگریزوں کی آمد کے وقت اس نے سارے علاقہ میں ہراس پھیلا رکھا تھا۔ لمسڈن کے کہنے پر وہ اس کے پاس آیا۔ اس نے اسے گائیڈ میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی اور بتایا کہ وہاں اُسے معقول تنخواہ اور پنشن ملے گی۔ اُسے افسر بنا دیا جائے گا اور ساتھ ہی بہادری اور شجاعت دکھانے کے مواقع بھی ملتے رہیں گے۔ دلاور خان نے سب باتیں غور سے سُنیں۔ اُسے لمسڈن کا بے باکانہ اور کھرا کھرا لہجہ پسند نہ آیا تاہم وہ ہنس کر چلا گیا۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔

ڈیڑھ ماہ کے بعد ایک دن وہ خود بخود لمسڈن سے ملنے آیا اور گائیڈز میں بھرتی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لمسڈن کی باتوں میں وہ جادو تھا کہ دلاور خان نہ صرف انگریزوں کا مداح بن گیا بلکہ اس نے اس کے کہنے پر عیسائیت بھی قبول کر لی ــــ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے محاصرہ میں دلاور خان نے اپنے جوہر دکھائے اور اسے ترقی دے دی گئی۔ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے اسے چترال کے حالات کا جائزہ لینے بھیجا۔ اس موقع پر اُس نے عیسائی مشنری کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور اپنے دورے کا مقصد تبلیغ قرار دیتا تھا۔ تاہم وہ چترال سے واپس نہ آسکا یا تو کسی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا اور یا واپسی پر برف میں دب کر مر گیا۔

پشاور ۱۸۵۰ء میں

کرنل لارنس نے ۱۸۴۷ء میں پشاور میں اپنی ڈیوٹی سنبھالی۔ اس وقت تک سکھ حکومت برسر اقتدار تھی۔ تاہم یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ سکھ نوک شمشیر صوبہ سرحد پر حکومت کرتے تھے۔ لارنس کے کہنے کے مطابق پشاور میں اس وقت اتنی زیادہ سکھ فوج مقیم تھی جو سکھوں کی مجموعی فوج کے ایک تہائی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کے باوجود دیہات کے لوگ مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دیتے۔ ۱۸۴۷ء میں ماشوخیل ماشوگگر اور تپہ مہند (پشاور) کے کئی دیہات کے خلاف فوج کشی کر کے مالیہ وصول کیا گیا۔ سکھ حکومت کے خاتمے پر کرنل لارنس دوبارہ اپریل ۱۸۴۹ء میں پشاور آیا اور ڈپٹی کمشنر کا عہدہ سنبھالا۔

سر ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا ہے کہ "اس دور کا پشاور سرکشوں اور جنگجو لوگوں کا مسکن ہے۔ ہر کس و ناکس بندوق، تلوار اور خنجر سے مسلح نظر آتا ہے دن دہاڑے کمشنر پشاور (میکین) کے قتل کے بعد پشاور میں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ انگریز افسر اور سپاہی دن رات مسلح اور باوردی زندگی گزارتے تھے۔"

ایک انگریز سیاح مورکرافٹ لکھتا تھا "پشاور ایک بہت بڑا تجارتی مرکز ہے اور یہی بات اس کی اہمیت کا باعث ہے"۔ مورکرافٹ دریائے سندھ کے راستے اس امر کا جائزہ لینے آیا تھا کہ کیا پشاور سے کراچی تک دریائی راستے سے سفر ممکن ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق دریائی سفر کے امکانات روشن تھے۔

وار برٹن نے (جسے خیبر کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ ہونے کا فخر حاصل ہے) پشاور کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہاں چوری چکاری کا ہر وقت خدشہ رہتا ہے۔ یہاں تک کہ فوجی کیمپوں میں سپاہیوں کے گھوڑے اور بندوقیں تک محفوظ نہیں ہیں۔ باغات میں گھرا ہوا ہونے اور نشیبی اور دلدلی زمین کے باعث پشاور میں موسمی بخار اور ہیضہ کی وجہ سے ہزاروں لوگ بیمار پڑ جاتے ہیں۔"

راورٹی نے ۱۸۵۰ء کے شہر پشاور کا حال نہایت دلچسپ پیرائے میں مفصل طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان دنوں پشاور شہر قریباً آٹھ ہزار مکانوں پر مشتمل تھا۔ اور آبادی کا اندازہ پچاس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ شہر میں تاجر پیشہ اور دستکار لوگوں کی اکثریت تھی۔

مکان لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ جو گرمی سردی ہر موسم کے لئے موزوں تھے۔ قریب قریب ہر اچھے مکان میں تہہ خانہ ضرور ہوتا تھا۔ شہر کے کئی دروازے تھے جو سرِ شام بند کر دیئے جاتے تھے۔ شہر سرسبز باغات سے گھرا ہوا تھا۔ لوگ خوش مزاج، خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے۔

۱۸۵۱ء

مارچ ۱۸۵۱ء میں ہندوستان کا انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی حالات کا جائزہ لینے خود پشاور آیا۔ گورنر جنرل نے "گائیڈز" کا معائنہ کیا۔ سلامی لی اور پریڈ دیکھی۔ وہ اس نئی فوجی تنظیم کو دیکھ کر بیحد خوش ہوا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اس سے بہتر، چست و چالاک اور منظم فوج اس نے نہیں دیکھی تھی۔ اس موقعہ پر فوج کمانڈر سر کولن کیمبل بھی موجود تھا۔ اس نے بھی سرحدی امور کے متعلق تفصیلی رپورٹ گورنر جنرل کو پیش کی۔ چنانچہ گورنر جنرل نے حکم دیا کہ "گائیڈز کو مزید مضبوط اور مستحکم بنایا جائے۔ چونکہ سب سے زیادہ مالیہ وصول ہونے کی توقع یوسف زئی کے علاقہ سے ہے اس لئے گائیڈز کا ہیڈ کوارٹر مردان منتقل کر دیا جائے تاہم اس کے کچھ دستے نواحی قبائل سے نپٹنے کے لئے پشاور میں رہنے دیئے جائیں۔ ہزارہ، کوہاٹ اور باقی اضلاع کے انتظامی اور حفاظتی امور پنجاب فرنٹیئر فورس کی ذمہ داری قرار دیئے گئے۔"

۲۲ مارچ ۱۸۵۰ء کو لارڈ ڈلہوزی نے واپس جاتے ہوئے اکوڑہ خٹک میں گائیڈز رسالے کا معائنہ کیا۔ اظہارِ خوشنودی کے طور اس نے گائیڈ کے رسالدار فتح خان خٹک کو "خان بہادر" کے خطاب سے نوازا اور سند عطا کی۔

مہمندوں کا جذبۂ جہاد

مہمند ایک مجاہد قبیلہ ہے جس نے غیر ملکی استبداد کے خلاف ہمیشہ سرگرمی دکھائی ہے۔ پہلی جنگِ افغانستان (۴۲-۱۸۳۸ء) کے دوران بھی مہمند قوم نے فرنگیوں پہ تابڑ توڑ حملے کئے تھے، ۱۸۵۱ء میں پھر مہمندوں کے انگریز کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔

مہمند قوم کئی قبیلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ترک زئی سب سے بڑا قبیلہ اور "خان خیل" ہے، مچنی اور پنڈیالی بھی اسی قبیلے کی شاخیں ہیں۔ ترک زئی کی شاخ "مورچہ خیلی" پشت ہا پشت سے مہمندوں کی سربراہ تھی۔ لال پورا اس کا مسکن تھا۔ اور انگریزوں کی آمد سے پہلے سعد اللہ خان اس کا "چیف" تھا۔ سعد اللہ خان کے چار بھائی تھے۔ وہ "خانی" کے دعویدار تھے۔ لیکن سعد اللہ خان

کے بیٹے سعادت خان نے انہیں اپنی راہ سے ہٹا کر باپ کی مسند سنبھالی۔ ۱۸۴۱ء میں امیر دوست محمد خان کی حمایت سے معز اللہ خان کا بیٹا "طورہ باز خان" مہمندوں کا سردار بنایا گیا۔ لیکن سعادت خان نے جلال آباد کے حاکم محمد اکبر خان کی مدد سے طورہ باز کو ہٹا کر قبیلے کی سرداری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ طورہ باز کو شیر گڑھ میں جاگیر دے دی گئی۔ ۱۸۵۱ء میں سعادت خان کے کہنے پر مہمندوں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ اُن دنوں "گائیڈز" رسالہ کی ایک رجمنٹ مٹہ مغل خیل میں مقیم تھی۔ مہمند دریائے کابل کو پار کر کے گائیڈز پر حملے کرتے رہتے۔ گائیڈز کے افسر ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے۔ مچنی اور پنڈیالی خیل مہمند علی الاعلان آتے اور پشاور کے دیہات کو لوٹ لیتے۔ لارڈ ڈلہوزی پشاور آیا تو اس نے مقامی افسروں کے کہنے پر حکم دے دیا کہ علاقہ دوآبہ کے مالیہ میں سے مہمندوں کو کوئی حصہ نہ دیا جائے اور ضلع پشاور کی شمالی حدود کے ساتھ ساتھ فوجی چوکیاں اور مورچے تعمیر کئے جائیں۔

۲۵ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو سر کولن کیمبل ڈھائی ہزار سپاہی لے کر دوآبہ کی طرف بڑھا۔ اس اثناء میں گائیڈز کا صدر دفتر مردان منتقل ہو چکا تھا۔ تاہم لمسڈن ڈھائی تین سو سپاہیوں کے ساتھ مہمندوں کے خلاف کارروائیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ اس وقت تک شبقدر میں سکھوں کا بنایا ہوا قلعہ (شنکر گڑھ) موجود تھا۔ اور شبقدر تک فوجی نقل و حرکت کے لئے سڑک بھی بن چکی تھی۔ دریائے نالگمان پر ان دنوں کشتیوں کا ایک پُل تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ سر کیمبل کولن کا اصل مقصد اس مہم سے یہ تھا کہ مہمندوں کے حملوں کو بہانہ بنا کر شبقدر سے چھ میل اِدھر مچنی کے مقام پر بھی ایک حفاظتی قلعہ بنایا جائے اور وہاں انگریزی فوج متعین کر دی جائے۔ تاکہ مہمندوں کے حملوں کا خدشہ مٹ جائے۔ کئی مہینوں تک انگریزی فوج مہمندوں کے مقابلے میں مورچے سنبھالے پڑی رہی لیکن اُسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ دن رات انگریزی فوج کے دستے میدانی علاقے کے دیہات کا پہرہ دیتے، جب سعادت خان نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے حملوں کا کوئی فائدہ نہیں تو اس نے ۸ دسمبر کو ایک بہت بڑا لشکر لے کر خود مٹہ پر دھاوا بول دیا۔ سخت لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سے کافی جانی اور مالی نقصان ہوا۔ تاہم اس وقت تک انگریزوں کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔ مچنی کا نیا قلعہ مکمل ہو گیا تھا اور انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ

سرکولن کیمبل ایک بہت بڑا لشکر لے کر نکلا اور مہمند دیہات کے قلعے اور برج مسمار کرنے شروع کر دیئے یہ قلعے یا تو ہاتھیوں کے ذریعے پیوند زمین کر دیئے جاتے یا بارودی سرنگوں سے اُڑا دیئے جاتے۔

۱۵ اپریل ۱۸۵۲ء کو جب انگریزی فوجیں وانیزئی کے خلاف مُہم میں مصروف تھیں۔ سعادت خان مہمند نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے شبقدر کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ کولن کیمبل فوراً پشاور پہنچا۔ اور بہت بڑی پیادہ اور سوار فوج اور توپ خانہ لے کر دفاعی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ پنج پاؤ کے قریب دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ قبائلی مجاہد بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دیتے رہے لیکن انگریزی توپوں کی گولہ باری کی تاب نہ لا سکے تو واپس اپنے پہاڑی مورچوں کو چلے گئے

انگریزی فوجیں اپنی ہی رعایا اور اپنے ہی لوگوں کے خلاف اس طرح تیار ہو کر نکلتی تھیں گویا کسی غیر ملکی طاقت سے لڑنے جا رہی ہوں۔ گورا سپاہی فرعونیت کا مظاہرہ کرنے میں پیش پیش نظر آتے۔ لازماً فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کے دلوں میں ان غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ جنگِ مہمند میں بھی ایک ایسا ہی واقع رونما ہوا۔ صبح سویرے انگریزی فوج کے کیپٹن واکر (WALKER) اور لفٹیننٹ ٹولٹن ہیم (TOLTEN HM) رسالے کا دستہ لے کر مہمندوں کو نکلے اور مجاہدین کے پہاڑی مورچوں پر ٹوٹ پڑے تو ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز افسر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ہرگز اپنے بھائی بندوں پر گولی نہ چلائیں گے۔ صرف ایک دیسی صوبہ دار، ایک حوالدار اور ایک بگلچی نے انگریز افسروں کا ساتھ دیا۔ یقیناً اس جذبۂ حبُ الوطنی سے انگریزوں کی آنکھیں کھُل گئی ہوں گی۔

میران زئی

انگریزوں کی آمد پر کوہاٹ کا علاقہ سلطان محمد خان بارک زئی کی تحویل میں تھا۔ ۱۸۴۷ء میں انگریز افسروں نے امیر دوست محمد خان کے بیٹے عظیم خان کو بنوں سے نکال باہر کیا۔ تو وہ کرم پاڑہ چنار پہنچ گیا۔ اگست ۱۸۵۱ء میں ایک اعلان کے ذریعے انگریزوں نے اس علاقے کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ ایک مہم اس مقصد کے لئے بھیجی گئی۔ بلند خیل کے نزدیک کچھ وزیریوں نے اس سے جھڑپ لی۔ باقی آبادی خاموش رہی تاہم میران زئی قبائل کو نہ تو کابلی امیروں کی بالادستی منظور تھی اور نہ ہی انگریزوں کی غلامی، وہ

الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے اور اب بھی الگ تھلگ رہ کر اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

۱۸۵۲ء

جنوری ۱۸۵۲ء کے شروع میں کرنل میکسن کو پشاور کا کمشنر مقرر کیا گیا۔ اس نے لمسڈن سے چارج لیا۔ سر جان لارنس ان دنوں پشاور اور مردان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس نے انتظامی امور پر بات چیت کی اور گائیڈ رجمنٹ کی کارکردگی دیکھی۔ انہی دنوں میجر جیمز کو پشاور اور مردان کے سرحدے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جب میجر جیمز گوجر گڑھی (مردان) پہنچا تو سوات کے ۱۸۰ اوٹاکوں کے ایک دستہ نے اپنے سردار مکرم خان کی قیادت میں انگریزی کیمپ پر شب خون مارا۔ گائیڈز کا رسالہ (جو حفاظتی فرائض انجام دے رہا تھا) اپنے افسر فتح خان خٹک کی کمان میں اس کے مقابلے کو آیا۔ نیزوں اور سنگینوں سے دست بدست لڑائی ہوئی جسمیں انگریزوں کے چار پانچ آدمی مارے گئے اور چند ایک زخمی ہوئے تاہم زیادہ نقصان نہ ہونے پایا۔

رانی زئی کی مہم

گوجر گڑھی کے حملے کا بدلہ لینے کے لئے انگریزوں نے مکرم خان کے علاقہ رانی زئی (سوات) پر حملے کا پروگرام بنایا۔ سر کولن کیمبل کی کمان میں ایک فوج سام رانی زئی کو روانہ کی گئی۔ مکرم خان نے ہتھیار ڈال دیئے اور پانچ ہزار روپیہ کا تاوانِ جنگ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ بتایا جاتا ہے۔ کہ بریگیڈیر کولن کیمبل ۱۱ مارچ ۱۸۵۲ء کو پشاور سے روانہ ہوا تھا۔ اور کمشنر پشاور لفٹیننٹ کرنل میکسن بھی اس کے ہمراہ تھا تاکہ جہاں فوج کشی ناکام ہو وہاں سیاسی حکمتِ عملی سے کام لیا جائے۔ مردان سے لمسڈن بھی اپنے رسالے گائیڈز کو لے کر کولن کیمبل سے جاملا۔ رانی زئی کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اتنی بڑی اور مسلح فوج کے سامنے اُن کی کچھ پیش نہ گئی تو انہوں نے اپنی پرانی پالیسی کو اپناتے ہوئے اپنے گاؤں خالی کر دیئے اور بیوی بچوں اور مال مویشی سمیت پہاڑی کمین گاہوں کو چلے گئے۔ دونوں طرف سے صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو رانی زئی نے پانچ ہزار روپیہ جرمانہ دینا قبول کر لیا۔ اور ان کے دس سرکردہ ملکوں کو بھی بطور ضمانت انگریز ساتھ لے گئے۔

ادھر سے انگریزوں کو کچھ اطمینان ہوا تو ۲۰ اپریل ۱۸۵۲ء کو تنگئی (یوسف زئی) کے اجون خان نے سر اٹھایا اور ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ آمادۂ جہاد ہو گیا۔ اجون خان اتمان خیل اور سوات میں بڑا ہر دلعزیز تھا اس لئے لوگوں نے ابتدا میں اس کا پورا ساتھ دیا۔ اس

نے چارسدہ کے قصبے پر شب خون مارا اور وہاں کے تحصیلدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مکرم خان اور اجون خان دونوں کو سید اکبر شاہ آف ستھانہ کی حمایت حاصل تھی اور یہ سب کارروائی اسی کی ایماء پر ہوئی تھی۔ سید اکبر شاہ نے قبائل پر زور دیا تھا۔ کہ وہ جرمانہ کی رقم انگریزوں کو ادا نہ کریں۔ اس کے برعکس اخون صاحب سوات اس امر کے حامی تھے کہ معاہدے کی پوری پابندی کرنی چاہیئے۔ اور جرمانہ ادا کرنا چاہیئے۔

جرمانہ کی وصولی کے لئے سر کولن کیمبل اور کرنل لارنس (پولیٹیکل افسر) کے تحت ایک مہم اتمان خیل کی طرف بھیجی گئی۔ یہ فوج درگئی تک گئی اور اس نے نواڈھنڈ۔ گنڈپری۔ اور پراندر کے دیہات جلا کر راکھ کر دیئے تاہم اجون خان ان کے ہاتھ نہ لگا۔ وہ جلال آباد کی راہ کابل کو چلا گیا۔

اسی سال مئی کے مہینے میں سر کولن کیمبل اور کمشنر میکسن کی قیادت میں سوات اور رانی زئی کی تسخیر کے لئے ایک بہت بڑی فوج انگریزوں کی جانب سے بھیجی گئی۔ سواتیوں نے بھی چار ہزار جوانوں پر مشتمل لشکر مقابلے کے لئے جمع کر لیا۔ اخون صاحب سوات اور سید اکبر شاہ خود اس جہاد کا منظر دیکھنے مالاکنڈ کی چوٹی پر موجود تھے۔ انگریزی فوج نے سخاکوٹ۔ درگئی۔ مہیروی دوبندی، ورٹیر، عثمانی خیل گڑھی۔ موسیٰ مینا اور ہیروشاہ کے دیہات جلا ڈالے۔ انگریزی فوج کی ان کارروائیوں کو دیکھ کر سارے سواتی رہنماؤں کا ماتھا ٹھنکا وہ جان گئے کہ انگریزوں کے منظم اور جدید اسلحہ سے آراستہ لشکر سے ٹکر لینا اب خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔

انگریزوں نے اس بار اسی پر اکتفا کیا، البتہ اندر ہی اندر سوات کے اندرونی علاقوں کے خلاف نادیدہ مہم بھیجنے کی تیاریوں میں لگ گئے۔

انگریز کی قبائلی پالیسی

جہاں تک صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کا تعلق ہے۔ شروع ہی سے انگریز افسر دوگروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جب لیوسفرئی کے علاقے میں مالیئے کی وصولی کی ایک مہم کے دوران ایک گاؤں کو جلایا گیا۔ تو انگریز کمانڈر ان چیف سر چارلس نیپئر نے مہم کے کمانڈر لفٹیننٹ کرنل بریڈشا کو بڑی جلی کٹی سنائیں۔ نیپئر نے بریڈشا اور اس کے سپاہیوں کی اس درندگی کی سخت مذمت کی۔ کہ انہوں نے عورتوں اور

بے گناہ بچوں تک کو اپنے انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے تہ تیغ کر دیا۔ اس الزام کے جواب میں بریڈشا نے صاف بتایا کہ اس نے از خود یہ سختی نہیں کی بلکہ پولیٹیکل افسر کے حکم پر ایسا کیا۔ اُن دنوں تک اصل اختیارات پولیٹیکل حکام کے پاس تھے۔ جب کہ اکثر فوجی لوگوں کا خیال تھا کہ صوبہ سرحد کے جنگجو قبائل سے نپٹنا صرف فوج ہی کا کام ہے اس لئے پولیٹیکل حکام یا سول حکام کی بالادستی ختم ہونی چاہیئے۔ رانی زئی کی مہم کے دوران بھی ایسا ہی واقع پیش آیا۔ فوجی کمانڈر سر کولن کیمبل آگے بڑھ کر سوات کے اندرونی علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کرنا چاہتا تھا اور مسکین (کمشنر) پر زور دیتا تھا کہ اس مقصد کے لئے فوجی قوت میں اضافہ کرنا اور مزید کمک منگوانا ضروری ہے۔ جب کہ کمشنر میکسن قبائل سے بلا وجہ اُلجھنا اور معاملے کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں افسروں میں تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی جس کے نتیجے میں اس مہم کے فوراً بعد جون ۱۸۵۲ء میں سر کولن کیمبل نے پشاور ڈویژن کی فوجی کمانڈ سے استعفیٰ دیدیا جو منظور نہ ہوا۔ بعد میں کولن کیمبل کچھ عرصے کے لئے ہندوستان کی افواج کا کمانڈر ان چیف بھی رہا۔

سول اور فوجی حکام کی یہ کشمکش صوبہ سرحد میں اس وقت تک جاری رہی جب تک اسے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات اور اصلاحات عطا نہ ہوئیں۔ اس سے قبل "مخصوص حالات" کا بہانہ بنا کر ایک مدت تک فرنگی سامراج نے اس صوبے کے لوگوں کو اصلاحات اور مراعات سے محروم رکھا۔

وزیرستان وزیری بنوں، میران زئی اور وادیٔ گومل کی ایک سو چالیس میل لمبی سرحد پر آباد ہیں اور صوبہ سرحد کا ایک طاقتور اور بہت بڑا قبیلہ خیال کئے جاتے ہیں۔ اس قوم کی دو بڑی بڑی شاخیں درویش خیل وزیر اور محسود ہیں۔ انگریزی دور حکومت کے آغاز میں یہ لوگ پوری طرح متحد تھے، وزیر اُس زمانے میں شہسواری کے بہت شوقین تھے۔ اُن کے گھوڑے قد کے چھوٹے لیکن بڑے چست ہوتے تھے اور پہاڑی لڑائیوں میں بڑے فائدہ مند ثابت ہوتے تھے۔

۱۸۴۹ء ہی سے وزیری انگریزی استبداد کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ اس پر ۱۸۵۲ء میں بنوں کے ڈپٹی کمشنر جان نکلسن کے کہنے پر وزیریوں کے خلاف فوج کشی

کی گئی۔ پریڈ کے بہانے انگریز فوجیں بنوں اور لتمبر میں جمع ہونی شروع ہوگئیں۔ ساری کارروائی اس طرح صیغۂ راز میں رکھی گئی کہ خود مہمت سے فوجیوں کو بھی اس کا علم نہ تھا پھر ۲۱/۲۰ دسمبر کی درمیانی رات کو بیک وقت تینوں اطراف سے انگریز فوجیں وزیرستان پر چڑھ دوڑیں۔ پہلا دستہ گمتی کے درّے سے ہوتا ہوا گڑنگ کی طرف بڑھا۔ دوسرا لتمبر سے روانہ ہوکر چھپری پر حملہ آور ہوا۔ جب کہ تیسرا دستہ بنوں سے کرم جانے والی سڑک پر مارچ کرتا ہوا وزیری علاقے میں داخل ہوگیا۔ چونکہ وزیری جوابی کارروائی کے لئے بالکل تیار نہ تھے اس لئے کسی جگہ بھی جم کر فرنگی لشکر کا مقابلہ نہ کرسکے تاہم انہوں نے انگریزی فوج کے عقبی دستوں پر پے بہ پے حملے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک دستہ کے ۲۳ گورا سپاہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ بعدازاں سیاسی بات چیت چھڑی اور انگریزوں اور وزیروں کے مابین صلح کی شرائط طے پاگئیں۔

کوہاٹ میں بہادر خیل کی نمک کی کانوں کے علاقے میں جوکش مکش انگریزوں اور خٹک قبیلے کے مجاہدوں میں ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس سال بھی جاری رہی، اور اکّا دکّا وارداتیں ہوتی رہیں۔

مجاہدین ۱۸۴۷ء میں انگریزی حکومت نے امیرالمجاہدین مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو چار سال کے لئے نظربند کردیا تھا۔ یہ مدت پوری ہوئی تو ضعیف العمری کے باوجود مولانا موصوف صوبہ سرحد آن پہنچے۔ ۱۰ فروری ۱۸۵۱ء کو وہ ستھانہ پہنچے۔ اس کے آٹھ دن بعد ان کے اہل وعیال بھی وہیں پر اُن سے آملے۔

انگریزوں کی آمد پر ریاست امب کی سرداری پر جہاں داد خان فائز تھا۔ انگریزوں نے اسے "نواب" کا خطاب دے کر امب کی جاگیر بحال کردی۔ چونکہ امب کے کچھ قلعے مجاہدین سید احمد کے پاس تھے۔ نواب امب نے ان کی بازیابی کے لئے انگریزوں سے دوستانہ گانٹھا اور مجاہدین کی بیخ کنی کے لئے انگریزوں کو ہر ممکن امداد دینے کا وعدہ کیا۔ نواب صاحب کی یہ بات مجاہدین کو بڑی کھٹکی۔ مولانا ولایت علی اعتدال پسند انسان تھے۔ وہ تو نواب امب کے خلاف کسی کارروائی کے حق میں نہ تھے۔ البتہ اُن کے پیش رو اور بھائی مولانا عنایت علی اپنی انتہا پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھے اور کسی مسلمان کے غیر مسلموں کے ساتھ تعاون کرنے کو معیوب اور قابلِ مواخذہ قرار دیتے تھے۔ اس مسئلہ پر دونوں بھائیوں میں اختلافِ رائے رونما ہوگیا۔

۵ نومبر ۱۸۵۲ء کو مولانا ولایت علی وفات پا گئے اور مجاہدین کی امارت مولانا عنایت علی کے پاس آگئی۔ کاغان کے سید چونکہ مجاہدین کا ساتھ دیتے تھے اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں مصروف تھے اس لئے فرنگی حکومت سے کسی قسم کا تعاون کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ہزارہ کے پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر ایبٹ نے مالیہ لگایا تو سادات کاغان نے اس کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ سید وادیٔ کاغان میں زمیندار ہیں اور گوجران کے مزارعین گوجران کی مخالفت میں پیش پیش رہتے اور ایبٹ صاحب کو سیدوں کے خلاف اکساتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایبٹ نے کاغان پر فوجی حملہ کر دیا۔ انگریز سپاہی بالاکوٹ، بھوگڑ منگ اور کشمیر تینوں اطراف سے سیدوں پر ٹوٹ پڑے۔ مٹھی بھر سید کب تک ان کا مقابلہ کرتے۔ ہار گئے تو ایبٹ نے سب سرکردہ سیدوں کو گرفتار کر کے بفہ میں نظر بند کر دیا۔

ہزارہ میں نمک پنجاب سے لایا جاتا تھا۔ پہلے اس پر محصول مقرر نہ تھا۔ اب انگریزوں نے بھاری محصول لگا دیا۔ اکسائز ڈیوٹی کی وصولی کے لئے انگریز افسروں کو تعین کر دیا گیا۔ دو انگریز ایکسائز افسر مسٹر کارن (CARNE) اور مسٹر ٹیپ (TAPP) ٹیکس کی وصولی کے لئے حسن زئی کے آزاد علاقے میں جا داخل ہوئے تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ شروع شروع میں انگریزوں نے اس قتل کو والیٔ امب کی کارستانی قرار دیا۔ اور نواب امب سے مطالبہ کیا کہ قبیلہ حسن زئی کے جتنے لوگ امب میں آباد ہیں۔ انہیں انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے۔ نواب صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنی دانست میں اپنی برئیت کا ثبوت فراہم کر دیا۔ تاہم اس کے اس اقدام سے حسن زئی اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ چنانچہ حسن زئی نے بہت بڑی جمعیت کے ساتھ امب پر حملے شروع کر دیئے۔ انہوں نے امب کے بہت سے سرحدی دیہات کو جلا ڈالا اور نواب امب کے دو قلعوں چمبیری اور شنگائی پر قبضہ کر لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس موقع پر جمعیت مجاہدین نے بھی حسن زئی مجاہدوں کا ساتھ دیا اور مردانہ وار آگے بڑھتے ہوئے امب کے قلعہ کوٹلہ پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ نواب امب ان دنوں انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس لئے انگریز پوری تیاری کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچے انہوں نے دسمبر ۱۸۵۲ء میں ایک تادیبی مہم کرنل میکسن کمشنر پشاور کی قیادت میں بھیجی۔ اس لشکر میں گائیڈ اور پولیس کے دستوں کے علاوہ سکھوں اور ڈوگروں کی رجمنٹیں بھی تھیں اور پہاڑوں میں

کام دینے والی جدید قسم کی توپیں تھیں۔ والیٔ امب کا صدر مقام شیر گڑھ فوج کا مرکز قرار پایا۔ یہاں پر ساری فوج جمع ہوئی تو اسے تین حصّوں میں تقسیم کر کے حسن زئی کے علاقے پر حملے کا حکم دیا گیا۔ قبیلہ حسن زئی یوسف زئی کی ایک چھوٹی سی شاخ ہے۔ اس کے پاس اپنے دفاع کا سامان کہاں تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بہت سے دیہات تباہ کر دیئے گئے۔ غلّے کے ذخیرے جلا دیئے گئے بہت سے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر کے یرغمال بنا لیا گیا۔ لوگ چونکہ اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے تھے اس لئے جانی نقصان البتہ کم ہوا۔ انگریزی لشکر نے اسی تادیبی کارروائی کو کافی سمجھا اور جنوری ۱۸۵۳ء میں حملہ آور فوج واپس آ گئی۔

مجاہدین نے چونکہ حسن زئی کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے ساتھ مل کر کوٹلہ اور عشرہ کے قلعوں پر قبضہ جما لیا تھا۔ (جو ستھانہ اور امب کے مابین مستحکم قلعے شمار کئے جاتے تھے) اس لئے اب انگریز مجاہدین کو اس جرأت کی سزا دینا چاہتے تھے۔ ۵ جنوری کو انگریزوں کی فوج اور والیٔ امب کے دستے شمالی سمت کے پہاڑیوں کی طرف بڑھے اور عشرہ اور کوٹلہ کے گرد مورچے جمانے میں کامیاب ہو گئے۔

۶ جنوری کو باقی ماندہ انگریزی فوج کرپلیاں کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کر کے اس درّے کی جانب بڑھنے لگی۔ جو عشرہ اور کوٹلہ سے مجاہدین کے مرکز ستھانہ جانے والے راستے میں ہے۔ انگریز سپاہی دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ مورچے بنا کر اس لئے بیٹھ گئے کہ ادھر سے مجاہدین کو کوئی کمک یا رسد نہ پہنچ سکے۔ یہ انتظام مکمل کر کے گورا فوج نے توپوں کے منہ کھول دیئے اور دھڑا دھڑ مجاہدین کے مرکز ستھانہ پر گولے برسانے لگے۔ مجاہدین کی تعداد اس وقت دو تین سو کے قریب تھی۔ وہ بہادری سے مقابلہ کرتے رہے لیکن جب اُن کی پیش نہ گئی تو قلعہ چھوڑ کر پہاڑوں کی جانب نکل گئے۔ گورا سپاہیوں کو تو ان کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہ ہوا البتہ نواب امب کے آدمیوں نے جو راستوں وغیرہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا۔ امب کے محافظوں سے جھڑپوں کے دوران تیس سے زیادہ مجاہدین شہید ہو گئے جب کہ باقی ماندہ جان بچا کر نکل گئے۔

"ہزارہ گزٹیئر" کے مطابق جب جمعیت مجاہدین کوٹلہ اور عشرہ کے علاوہ اپنے مرکز ستھانہ سے

بھی نکلنا پڑا تو انہوں نے قبیلہ خدوخیل کے ایک مشہور مستحکم اور کلیدی مقام منگل تھانہ کو اپنا مستقر بنالیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی مجاہدین کی سرگرمیوں کا رخ بھی ہزارہ کی بجائے پشاور اور مردان کے علاقوں کی طرف ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی سیاست سوات، بونیر اور چملہ کی سیاست سے وابستہ ہوگئی۔ اس وقت مجاہدین کے سب سے بڑے سرحدی سرپرست سید اکبر شاہ تھے۔ جنہیں سوات کے لوگ اپنا بادشاہ تسلیم کرچکے تھے۔ وہ دینی اور سیاسی دونوں لحاظ سے ایک عظیم شخصیت تھے اور سوات بونیر اور سرحدی قبائل میں بڑے رسوخ کے مالک حضرت پیر بابا کی اولاد ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی بہت عزت و تکریم کرتے تھے۔ سرحدی سیاسیات میں انہوں نے شاندار کردار انجام دیا۔ جمعیت مجاہدین کو اُن سے بھرپور امداد ملنے کی توقع تھی۔ لیکن عین اس دن جب ہندوستان سے جنگِ آزادی کی خبر پشاور پہنچی۔ سید اکبر شاہ وفات پاگئے۔ یہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کا تاریخی دن تھا۔

۱۸۵۳ء

۱۸۵۳ء کا سال سات سمندر پار سے آئی ہوئی قوم کی نئی نویلی حکومت کے لئے اور بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ فرنگی استبداد سے نجات پانے کی جدوجہد نے ڈیرہ اسمٰعیل خان کے قبائلی علاقے شیرانی تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شیرانی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مغرب میں، درّہ گومل کی جنوبی سمت، تختِ سلیمان کے نواح میں آباد ہیں۔ اگرچہ یہ چھوٹا سا قبیلہ ہے۔ تاہم انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں بڑے قبیلوں سے پیچھے رہنے نہ پایا۔ یہ لوگ انگریزی علاقے پر چھاپے مارتے۔ انگریزوں کی چوکیوں کو لوٹتے اور اسلحہ اٹھا کر لے جاتے۔

میجر جان نکلسن ڈپٹی کمشنر ڈیرہ کی قیادت میں ایک فوجی مہم شیرانی کے خلاف بھیجی گئی۔ دربان کے قریب شیرانیوں نے حملہ آور فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اگرچہ ان لوگوں کی تعداد قلیل تھی۔ تاہم انہوں نے دشمن پر کاری ضربیں لگاکر اسے سخت نقصان پہنچایا۔ انگریزی لشکر مزید کمک طلب کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ کمک کرنل ہاجسن (HODGSON) کی قیادت میں شیخ حیدر کے درّے کی راہ بھیجی گئی اور بیک وقت دونوں فوجوں نے شیرانی پر ہلہ بول دیا۔ اس اثنا میں جرگہ بھیجا گیا۔ اور دونوں فریقوں میں صلح کی شرطیں طے ہوگئیں۔

درّہ کوہاٹ

۱۸۵۰ء میں کولن کیمبل نے درّہ آدم خیل کے آفریدی قبائل کے خلاف فوج کشی کی تھی۔ جس کے نتیجے میں آفریدیوں سے صلح نامہ طے پاگیا تھا اور انگریزوں کو

فورٹ میکسن (قلعہ) کی تعمیر کی اجازت مل گئی تھی۔ تاہم اس کے بعد بھی آدم خیل آفریدی چین سے نہ بیٹھے۔ وہ انگریزی چھاؤنیوں اور چوکیوں پر مسلسل حملے کرتے رہے۔ مجبوراً برطانوی حکومت نے نومبر ۱۸۵۳ء میں ان کے خلاف فوجی مہم بھیجی۔ اب کے بوری کی وادی مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اس وادی تک پہنچنے کے لئے دو راستے ہیں۔ سرغاسہ کا درّہ اور کنداؤ کا راستہ۔ انگریز نے اپنی توپیں ہاتھیوں پر لاد کر درّہ میں پہنچائیں اور کرنل بائیلو (BOILEAU) کی کمان میں اپنے بہترین لڑاکا دستے آفریدیوں کے مقابلے کو بھیجے۔ آفریدیوں نے پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ انگریز میدانِ جنگ میں تو آفریدی مجاہدوں کے سامنے آتے ڈرتے تھے۔ البتہ شہری آبادی پر خوب غصہ نکالتے تھے۔ جو گاؤں راستہ میں پڑتا توپوں سے اڑا دیا جاتا۔ یہ حال دیکھ کر آفریدیوں نے اپنا جرگہ بھیجا اور شرائط صلح پیش کیں چنانچہ ۲۴ فروری ۱۸۵۴ء کو ایک معاہدہ دونوں فریقوں میں طے پا گیا۔

کمشنر میکسن کا قتل

جب سے انگریز نے سرزمینِ سرحد پر قدم رکھا تھا، مسلمان حریت پسندوں کا خوف اُن کے دلوں سے محو ہونے نہیں پاتا تھا۔ وہ مال روڈ کے بنگلوں میں الگ تھلگ رہتے اور حفاظتی دستوں کے بغیر باہر نہ نکل سکتے۔ ایسا دور بھی آیا کہ بغیر خاص اجازت نامہ کے کسی وطنی شخص کو مال روڈ یا دوسری سڑکوں پر گھومنے پھرنے کی آزادی نہ تھی۔ انگریز افسر لو پو کھیلنے جاتے یا شکار کرتے تو بھی وردی پہن کر اور پورے ہتھیار لگا کر جاتے۔ میس (MESS) میں کھانا کھاتے بیٹھتے تو رائفل میز پر دھری رہتی۔ ان سب حفاظتی انتظامات کے باوجود سرفروش جان سے ہاتھ دھو کر آتے اور انہیں نشانہ بنا کر کھسک جاتے۔ پشاور کا کمشنر کرنل میکسن ایک دن اپنے دفتر کے برآمدہ میں بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان ایک درخواست لئے ہوئے آیا۔ میکسن اُس سے درخواست لے کر پڑھنے لگا تو اس نے قمیض کے نیچے سے خنجر نکال کر اس پر پے بہ پے وار کئے۔ میکسن سخت زخمی ہوا۔ اور چار دن بعد ۴ ستمبر ۱۸۵۳ء کو دنیا سے چل بسا۔ قاتل کنڈکار رہنے والا ایک پٹھان نوجوان تھا۔ جس کا والد انگریزوں کی فوج کشی کے دوران شہید ہوا تھا۔ نوجوان نے باپ کی موت کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کا دل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس لئے اب اسے پھانسی کا ڈر تھا نہ عمر قید کا خوف۔

۱۸۵۴ء

جہاں تک صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کا تعلق ہے۔ انگریز نے ۱۸۵۲ء میں دو نمایاں کامیابیاں حاصل کیں، سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر جان جیکب جیسا دور بین انگریز افسر خان آف قلات سے دوستانہ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیکب نے بھانپ لیا تھا کہ افغانستان سے قندہار اور کوئٹہ کے راستے ہندوستان پر حملہ نسبتاً آسان کام ہے یہی وجہ ہے کہ درہ بولان کی حفاظت اور اس کے دفاع کے لئے اس نے کوئٹہ میں چھاؤنی بنانے پر زور دیا۔

ادھر پشاور کا کمشنر ہربرٹ ایڈورڈز بھی انگریزوں کی سیاسی پوزیشن مستحکم بنانے کے لئے امیر کابل سے دوستانہ معاہدہ کرنے کا حامی تھا۔ بالآخر اس کی کوششیں پھل لائیں اور ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو دربار کابل سے امیر دوست محمد خان کا ایک نمائندہ پشاور پہنچا۔ اس وقت پنجاب اور صوبہ سرحد کا ریذیڈنٹ اور چیف کمشنر سر جان لارنس ایبٹ آباد آیا ہوا تھا۔ اس لئے کابلی نمائندے کو بھی ایبٹ آباد بھیجا گیا۔ جہاں اس نے امیر کابل کا خصوصی مراسلہ سر جان کے حوالے کیا۔ امیر کو ان دنوں ایران کی طرف سے حملے کا خطرہ تھا۔ اس خطرے کے پیش نظر افغان امیر برطانوی ہند سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ امیر نے یہ بھی لکھا تھا کہ قندہار میں فی الفور کسی انگریز نمائندے کو بھیجا جائے جو صورت حال پر کڑی نظر رکھ سکے۔ چنانچہ انگریزوں نے ہیری لمسڈن کو چند باڈی گارڈوں کے ہمراہ وہاں بھیجا۔ امیر دوست محمد خان نے اپنے مراسلہ میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ خود برطانوی حکام سے مل کر تمام متعلقہ معاملات پر کھل کر بات چیت کرنا چاہتا تھا کہ دونوں حکومتوں میں مفاہمت کا بہتر ماحول قائم ہو سکے۔

برطانوی افسروں نے باہمی صلاح مشورے کے بعد یہ تجویز قبول کر لی اور امیر دوست محمد خان کو لکھ بھیجا کہ وہ پشاور آ کر متعلقہ انگریز افسروں سے گفت و شنید کریں۔

امیر دوست محمد خان دسمبر ۱۸۵۶ء کو کابل سے عازم پشاور ہوا اور منزل بمنزل سفر کرتے ہوئے یکم جنوری ۱۸۵۷ء کو درہ خیبر میں وارد ہوا۔ ادھر لاہور سے چیف کمشنر سر جان لارنس بھی بڑی شان و شوکت سے سفر طے کرتا ہوا پشاور پہنچا اور تہکال (موجودہ پشاور یونیورسٹی کے قریب برج ہری سنگھ) میں اترا۔ انگریز چیف کمشنر اور اس کے تین سو ساتھی امیر افغانستان کی آمد

کے منتظر تھے اور انہوں نے امیر کے استقبال کی شاندار تیاریاں کر رکھی تھیں۔ امیر افغانستان کے دو بیٹے چند دن پہلے ہی پشاور پہنچ چکے تھے، جمرود پہنچنے پر امیر دوست محمد خان نے پیغام بھیجا کہ سر جان لارنس ہربرٹ ایڈورڈ اور دونوں کابلی شہزادے جمرود پہنچ کر اس کا استقبال کریں۔ درہ خیبر اس وقت تک برائے نام افغان حکومت کے زیر انتظام تھا۔ اس لئے انگریز افسروں کے لئے جمرود جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ تاہم سر جان لارنس نے دعوت نامہ منظور کر لیا۔ البتہ اس نے فوجی کمانڈر سٹنی کاٹن کو چکنا رہنے کی ہدایت کر دی۔

جمرود میں امیر افغانستان کا شاندار استقبال ہوا۔ اور توپوں سے سلامی اتاری گئی۔ برطانوی افسروں اور افغان نمائندوں میں طویل ملاقاتیں ہوئیں جس کے نتیجے میں ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء کو برطانوی حکومت اور امیر افغانستان کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا۔ معاہدہ صلح پر دستخط کرنے کے بعد امیر دوست محمد خان نے زبانی بھی انگریزوں سے دوستی نبھانے کے عزم کا اظہار کیا۔

اس معاہدے کی رو سے انگریزوں نے ہرات کی مہم کے دوران امیر دوست محمد خان کو ایک لاکھ روپیہ ماہانہ زر امداد دینا منظور کر لیا۔ انہوں نے امیر کو دیگر ہر طرح کے تعاون کا یقین بھی دلایا۔

معاہدہ پر دستخط کرنے کے سلسلے میں ایک عظیم دربار منعقد ہوا جس میں طرفین کے ذمہ دار نمائندوں نے شرکت کی، دربار میں معاہدے کی شرائط باآواز بلند پڑھ کر سنائی گئیں۔

بعد میں چیف کمشنر سر جان لارنس نے معاہدے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ تین برطانوی افسر کرم اور پیواڑ کوتل کی راہ قندہار جائیں تاکہ اس امر کی دیکھ بھال کر سکیں کہ زر امداد کا استعمال ٹھیک طور پر ہو رہا ہے یا نہیں۔ ۱۴ مارچ کو یہ دستہ پشاور سے روانہ ہوا۔ اور کوہاٹ سے ہوتا ہوا ٹل پہنچا۔ جہاں اُن کا استقبال کرم کے افغان حاکم سردار محمد عظیم خان کے نائب غلام جان کی طرف سے کیا گیا۔ ۲۳ مارچ کو یہ لوگ کرم پہنچے تو سردار محمد عظیم خان کے بیٹے سردار محمد سرور خان نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا۔ افغان سرداروں نے ایک حفاظتی دستہ انگریز وفد کے ہمراہ کر دیا۔ تاہم راستے میں جاجی اور طوری قبیلوں نے ان کی زبردست مزاحمت کی اور بمشکل تمام یہ دستہ غزنی پہنچا۔

مہمندوں سے ٹکر ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۲ء میں مہمندوں کو انگریزوں سے ٹکر لینی پڑی تھی جس میں ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے ان پر بھاری جرمانہ عائد کر دیا تھا۔ اس وقت تو مہمندوں نے جرمانہ دینے کی شرط قبول کر لی۔ لیکن بعد میں انہوں نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر کمشنر پشاور نے مہمند سردار رحیم داد خان کو اپنے ہاں طلب کیا۔ مہمند سردار اس طلبی کا مطلب سمجھتا تھا چنانچہ وہ پشاور جانے کی بجائے بالائی مہمند کو چل دیا۔ (انگریزی حکومت نے اسے اپنے اقتدار کے لئے ایک چیلنج قرار دیتے ہوئے مہمندوں پر چڑھائی کا منصوبہ بنایا۔ ۳۱ اگست ۱۸۵۴ء کو مچنی کے قلعے سے کرنل کاٹن (COTTON) کی کمان میں ایک فوجی مہم بھیجی گئی۔ مہمندوں نے ان فوجیوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے چپ سادھ لی۔ چنانچہ انگریز لشکر چند مہمند دیہات کو تباہ کرنے کے بعد واپس چلا آیا۔)

مہمندوں نے اس فوج کشی کا برا مناتے ہوئے میدانی علاقوں پر اور بھی شدت سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ ان حملوں سے انگریزی حکومت اور ضلع پشاور کے لوگ بڑے پریشان ہوئے۔

ان دنوں سیاسی حالات ایسے تھے کہ انگریز کسی فوجی مہم کے حق میں نہ تھے۔ اس لئے چیف کمشنر کی طرف سے ہدایت جاری ہوئی کہ معاملے کو بات چیت ہی کے ذریعے نپٹانے کی کوشش کی جائے۔ گفت و شنید شروع ہوئی تو مہمندوں نے یہ شرط پیش کی کہ ان سے ہرجانہ بالکل نہ لیا جائے اور وادیٔ پشاور میں ان کا جو علاقہ چھین لیا گیا ہے اس کے معاوضے میں انہیں جاگیر دی جائے۔ پشاور کے کمشنر سر برٹ ایڈورڈز کی یقین دہانی پر کہ وہ حکومت ہند سے مہمندوں کے مطالبات منوانے کی کوشش کریں گے لڑائی بند ہو گئی۔ حکومت ہند نے اس اقدام کو پشاور کے نظم و نسق اور امن و امان کے منافی سمجھا کہ میدانی علاقہ میں مہمندوں کو جاگیر دی جائے۔ اس لئے بعد میں کوئی جاگیر یا زمین انہیں نہ دی گئی۔

آفریدی ۱۸۳۹ء میں جب پہلی افغان جنگ جاری تھی۔ انگریزوں نے درہ خیبر سے فوجیں گزارنے کی اجازت دینے پر خیبری آفریدیوں کو الاؤنس دینا منظور کر لیا تھا۔ چنانچہ ۱۵ سال تک آفریدیوں نے انگریز سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ اکاخیل کا حصہ اس الاؤنس میں بہت قلیل تھا۔ وہ صورتِ حال سے مطمئن نہ تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۵۴ء میں اکاخیل

نے الاؤنس میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ اسی پر انگریزوں نے اُن کے خلاف ایک فوجی مہم بھیجی اور اکاخیل کے علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ اکاخیل بوریا بستر سمیٹ کر اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے انگریزوں نے ایسا گھیرا ڈالا کہ اکاخیل کو کھانے پینے کی ہر چیز ملنی بند ہو گئی۔ تنگ آ کر اکاخیل نے صلح کے لئے وفد بھیجا اور جرمانہ ادا کرنا قبول کر لیا۔ چونکہ اس موقع پر دوسرے قبائل نے اکاخیل کا کوئی ساتھ نہ دیا تھا اور انہیں بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا اس لئے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں آفریدی بالکل چپ سادھے رہے۔ اُدھر امیر دوست محمد خان بھی انگریزوں سے کئے گئے صلح نامہ کی شرائط کو نباہتا رہا اور حریت پسندوں کا کوئی ساتھ نہ دیا۔ اس جنگ کی سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک آفریدی سرفروش رجب خان نے انگریز کمانڈر کرنل جیمز کو چیلنج دیا تھا۔ کہ وہ اُسے زندہ گرفتار کرے گا فی الواقع رجب خان کرنل جیمز کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کرنل کو کافی دن تک اپنے پاس رکھا۔ بڑی خاطر مدارت کی اور بعد میں یہ کہہ کر دیا کہ "جاؤ ـــــ انگریز سے کہہ دو ہمارے ملک سے نکل جائیں ورنہ اُن کا حشر خراب ہو گا"۔ انگریزوں نے اپنا دائرہ اقتدار ان علاقوں پر بھی بڑھانا شروع کر دیا۔

اورک زئی اورک زئی قبیلہ تحصیل ہنگو (کوہاٹ) کی سرحدات اور میران زئی کی وادی میں آباد ہے۔ یہ بہت بڑا قبیلہ نہیں۔ آج کل اورک زئی میں پولیٹیکل ایجنسی کام کر رہی ہے اور سڑکیں، ہسپتال اور سکول بھی تعمیر ہو گئے ہیں تاہم ۱۸۵۵ء تک کبھی اس قبیلے کا نام بھی سُننے میں نہ آیا تھا۔ اپنی توسیع پسندی کی پالیسی کے تحت انگریزوں نے اس سال اورک زئی کی طرف قدم بڑھایا تو انہوں نے ان غیر ملکیوں کو مُنہ توڑ جواب دیا انگریزی حکومت نے یہ الزام لگا کر کہ اورک زئی سرکاری علاقے پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے خلاف فوجی مہم کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۲۵ اگست ۱۸۵۵ء کو بریگیڈیر جنرل سر ہنول چیمبرلین کی قیادت میں انگریزی فوجیں ہنگو میں جمع ہونے لگیں ـــــ انگریز نے تاسین، سنگھر اور کاتاش کے اورک زئی مرکز تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ مقام چونکہ پہاڑی چوٹیوں پر واقع ہیں۔ اس لئے بڑی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں۔ انگریزی فوج کے دستے عموماً رات کو نکلتے اور چپکے سے دیہات پر گھیرا ڈال لیتے۔ لوگ

صبح نیند سے بیدار ہوتے تو اپنے آپ کو محصور پاتے۔ اورک زئی غریب لوگ تھے۔ ان کے پاس دُور مار بندوقیں تھیں نہ بچاؤ کا کوئی اور سامان۔ اپنے دیہات کو بچا نہ سکے۔ گورا سپاہیوں نے ان کی فصلوں کو آگ لگا دی۔ مال مویشی پر قبضہ کر لیا۔ اور غلّہ اٹھا کر لے گئے۔ جب اورک زئی فرنگی فوج کا اعلانیہ مقابلہ نہ کر سکے تو چپکے سے پہاڑوں کو نکل گئے اور مورچے قائم کر لئے۔ اپنے زعم میں کامیابی سے ہم کنار ہونے کے بعد جب برطانوی فوج واپس ہنگو جا رہی تھی۔ تو راستے میں ایک کلیدی مقام سے اورک زئی ان پر حملہ آور ہوئے۔ سیکنڈ پنجاب انفنٹری کا ایک دستہ اورک زئی مجاہدوں کی زد میں آگیا۔ انہوں نے اس دستے پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ قریب تھا کہ اس دستے کے سب افسر اور سپاہی ختم ہو جاتے کہ انگریزوں نے کمک بھیج کر بڑی مشکل سے باقی ماندہ سپاہیوں کو بچتے سے نکالا۔ بعد میں صلح کی شرائط طے پا گئیں اور جنرل چیمبرلین ۷ اکتوبر ۱۸۵۵ء کو واپس کوہاٹ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

میسران زئی اور کرّم

۱۸۴۹ء کے بعد وادیٔ کرّم اور میسران زئی پر افغان فوجیں قابض تھیں۔ وہاں کے اکثر عوام بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان حکومت کے تحت رہیں اور فرنگی مشرکوں کے مظالم سے بچے رہیں۔ تاہم مختلف قبیلوں کی نااتفاقی اور خانہ جنگی نے کھیل بگاڑ دیا۔ طوری اس علاقے کا ایک قبیلہ ہے جس کے لوگ اثنا عشری عقائد کے پیروکار ہیں۔ اردگرد کے سنّی قبائل سے ان کا اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ جب طوری نے دیکھا کہ وہ اکیلے ان سب سے قبیلوں سے لڑ نہیں سکتے تو انہوں نے انگریزوں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور وادی کرّم کا نظم و نسق سنبھال لیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وزیری بھڑک اٹھے اور انہوں نے میسران زئی پر حملے شروع کر دیئے۔ ان حملوں کو بہانہ بنا کر انگریز نے ایک فوجی مہم ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو کیپٹن جان کوک کی کمان میں میسران زئی کو روانہ کی۔ ٹل تک تو کوک کسی مزاحمت کے بغیر بڑھتا چلا گیا لیکن ٹل میں اس کے کیمپ پر قبائلی مجاہدوں نے چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ اس پر انگریز نے تمام دیہات میں ڈھنڈورہ پٹوا دیا کہ جو شخص انگریزی فوج پر حملہ آور ہو گا اُس کا گاؤں جلا دیا جائے گا۔ بعد میں فی الواقع ایسا ہی کیا گیا۔ بہت سے گاؤں جلا دیئے گئے اس پر حملوں کا سلسلہ رُک گیا اور انگریزوں کی فوج ۱۲ نومبر کو واپس کوہاٹ پہنچ گئی۔

تین سال تو جوں توں گزر گئے لیکن ۱۸۵۵ء کے آغاز سے حالات خراب سے خراب تر ہو گئے میران زئی کے لوگوں نے انگریزی فوجوں اور چوکیوں پر بڑھ چڑھ کر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ اس پر ۱۸۵۵ء کے اوائل میں بریگیڈیر جنرل سر نیول چیمبرلین کی سربراہی میں انگریزوں کی فوجیں پھر کوہاٹ میں جمع ہونے لگیں۔ چار اپریل کو اس فوج نے کوہاٹ سے کوچ کیا۔ ۲۸ اپریل کو دوسمند میں خیمے لگا دیئے۔ اکثر لوگوں نے خوفزدہ ہو کر انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔ تاہم مجاہدوں کے کچھ دستے ڈٹے رہے اور انہوں نے انگریزی فوج کا ناک میں دم کر دیا۔ بڑی مشکل سے رسالے اور فوج کی مدد سے انگریزوں نے ان آزادی پسندوں پر قابو پایا۔ تاہم اس بار انہیں ٹل سے آگے جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اور ۲۱ مئی کو انگریز لشکر واپس کوہاٹ پہنچ گیا۔

انگریز کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ پنجاب رجمنٹ میں اُس وقت زیادہ تر سپاہی میران زئی کے رہنے والے تھے۔ وہ لوگ اپنے قوم قبیلے کے خلاف کیسے لڑتے؟ سر ہربرٹ ایڈورڈز نے اس پر فوجی افسروں کو ہدایت کی کہ اُن سپاہیوں کی خدمات کے صلے میں اُن کے خاندان والوں سے مواخذہ نہ کیا جائے۔

بعد میں انگریز نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور کسی ایک علاقے یا قبیلے سے فوج بھرتی کرنے کی بجائے ہر رجمنٹ میں مختلف علاقوں اور مختلف ذاتوں کے لوگ بھرتی کئے جانے لگے۔

اس فوج کے واپس جاتے ہی میران زئی کے لوگوں نے پھر فرنگی استعمار کے خلاف سر اٹھایا چنانچہ سر نیول چیمبرلین کو پھر فوجی مہم ترتیب دینے کی تکلیف گوارا کرنی پڑی۔ اب کے پہلے سے بھی زیادہ لاؤ لشکر جمع کیا گیا۔ پانچ ہزار سپاہیوں، گھڑسوار دستوں اور چودہ توپوں پر مشتمل یہ لشکر ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۶ء کو کوہاٹ سے روانہ ہوا۔ اس بار انگریزی فوج نے طور اوڑی کو اپنا مستقر بنایا۔ فوج پہلے پہل نریاب میں اُتری۔ دوسرے دن منہ اندھیرے ہی کوچ کا بگل بجا۔ کائی سے طور اوڑی نو میل کا فاصلہ ہے۔ سڑک بھی اچھی ہے۔ طور اوڑی سے کچھ اِدھر فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ انگریز اب کے اتنے غصّے میں تھے کہ ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کیپٹن ہنڈرسن (HENDERSON) اور کمشنر پشاور لفٹیننٹ کرنل ہربرٹ ایڈورڈز خود فوج کے ایک ایک دستے کی کمان سنبھالے ہوئے تھے راتوں رات ان لوگوں نے کئی دیہات کو گھیرے میں لے لیا۔ بعد میں زائی مشت قبیلہ کے اکابر کے

ساتھ صلح کی گفتگو چل پڑی۔ انگریزوں نے بڑی کڑی شرطیں پیش کیں۔ تاوانِ جنگ کا مطالبہ کرنے کے علاوہ اُن سفرداروں کو بھی گرفتار کرنا چاہا جو انگریز دشمن سرگرمیوں کی بنا پر سرکاری علاقہ چھوڑ زائی مشت کے پاس پناہ لے چکے تھے۔ اس اثنا میں پشاور سے مزید فوجی کمک اور توپیں پہنچ گئیں۔ قبائلی ملکوں کو انگریزوں نے صرف آدھ گھنٹہ کی مہلت دی اور کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ توپوں سے گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔ توپوں کے سامنے بھی قبائلی مجاہد اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے اور ذرا بھر خائف نہ ہوئے۔ اس پر توپوں نے خالی فائر شروع کر دیئے کہ لوگ ڈر کر بھاگ جائیں لیکن قبائل کا بچہ بچہ سینہ سپر کئے ڈٹا رہا۔ اس پر انگریزوں نے سچ مچ کی گولہ باری شروع کر دی۔ مکان روئی کے گالوں کی طرح اُڑ گئے۔ ہر طرف گرد و غبار کے بادل چھا گئے۔ کئی ایک حریت پسندوں کی بوٹیاں اُڑ اُڑ کر فضاؤں میں بکھر گئیں لیکن پھر بھی کوئی مردِ میدان ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سفید جھنڈے لہراتیں قرآن شریف ہاتھ میں لئے باہر آئیں۔ اور گولہ باری بند کرنے کی اپیل کی۔ تاہم انگریزی کمانڈر اکڑے رہے اور جواب دیا کہ گولہ باری تبھی بند ہوگی جب تمام مرد ہتھیار ڈال دیں اس پر مردوں نے ایک پہاڑی ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے خنجر، تلواریں اور پستول نیچے پھینک دیئے۔ زائی مشت غریب لوگ تھے۔ رائفلیں خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے ان تھوڑے سے ہتھیاروں کو دیکھ کر انگریزوں کو یقین نہ ہوا کہ سارے ہتھیار پھینک چکے ہیں۔ انہوں نے فوج کو خانہ تلاشی کا حکم دیا۔

خانہ تلاشی پر بھی گاؤں سے کچھ برآمد نہ ہوا۔ انگریز کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اس نے گاؤں کو آگ لگوا دی۔ خرمن اور کھلیان نذرِ آتش کر دیئے۔ پھینکے ہوئے سارے ہتھیار (۹۰ توڑے دار بندوقیں، ۷۹ تلواریں، ۱۱ خنجر اور ۲۹ ڈھالیں) اٹھائے اور ایک سو غازیوں کو یرغمال بنا کر ساتھ لے گئے۔

۶ اور ۷ نومبر کو انگریزی لشکر ٹل کے مقام پر دریائے کرم کے کنارے خیمہ زن ہوا ــــ کیمپ کے اردگرد خندقیں کھودنے اور اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے بعد چمبرلین نے ایک فوجی مہم کرم پاڑہ چنار کو روانہ کی۔ منادی کرا دی گئی تھی۔ کہ جس گاؤں کے لوگوں نے مزاحمت کی، اس کی خیر نہ ہوگی۔ اس لئے مزاحمت نہ ہوئی۔ اس پر پیواڑ کوتل تک کے سارے علاقے کا

سربسے کیا گیا۔

ٹل کے نواح میں وزیریوں کے چند دیہات پر حملے کئے گئے۔ غریب وزیریوں کے پاس اسلحہ کہاں تھا کہ مقابلہ کرتے، چپ ہو رہے۔ دسمبر ۱۸۵۶ء کو جنرل چیمبرلین ابھی کوہاٹ پہنچا ہی تھا کہ اُسے خبر ملی کہ ڈیرہ غازی خان کے مجاہد قبائلیوں نے غاصب اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اپنی جدوجہد آزادی تیز کر دی ہے۔ چنانچہ بغیر دم لئے چیمبرلین کو اُدھر کا رُخ کرنا پڑا۔

اس مُہم کے دوران طوری قبیلہ انگریزوں کا طرف دار بن گیا۔ جس کی وجہ سے کرم پاڑہ چنار پر انہیں قبضے کا موقع مل گیا۔

۱۸۵۶ء کا سارا سال صوبہ سرحد کے انگریز حاکموں کو میران زئی، وزیری اور دوسرے قبائل سے نمٹنے اور سیاسی گتھیاں سلجھانے ہی میں لگ گئے۔ وقتی طور پر انہوں نے امیر افغانستان کو بھی ساتھ ملا لیا تاہم عوام میں فرنگی سامراج سے نفرت کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ اور ۱۸۵۶ء میں فضا کی بظاہر خاموشی ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن گئی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے بالخصوص مسلمان کبھی غیر اللہ کا غلام رہ نہیں سکتا۔ قضارا اگر وہ غلامی کے بندھن میں جکڑا بھی جائے تو آزادی کی بازیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ برصغیر کے رہنے والوں نے ۱۸۵۷ء میں غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک ایسی ہی کوشش کی۔ اس وقت کچھ کج فہم اور تنگ نظر لوگوں نے اسے "غدر" اور "سپاہیوں کی بغاوت" کا نام دے کر مجاہدینِ آزادی کے کردار کو مسخ کرنا چاہا۔ لیکن آج حقائق کے منظرِ عام پر آجانے سے اہلِ ہند کی سچائی اور مظلومی اور انگریزی سامراج کے ظلم و ستم کی تصویر واضح طور پر سامنے آچکی ہے۔ اور ہر حقیقت پسند مورخ اسے "ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی" کا نام دینے میں پوری طرح حق بجانب ہے۔

مجاہدینِ آزادی کی سرگرمیوں کا سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ جنگِ آزادی کی ابتداء میرٹھ سے ہوئی تھی۔ جہاں دیسی فوجی سپاہیوں نے اُن نئے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا۔ جن پر چربی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کی چربی سؤر اور گائے کی چربی ہے۔ ۹ مئی کو ایسے ۸۵ فوجی سپاہیوں کو ان کی وردی اتار کر اور ہتھکڑی لگا کر جیلخانے بھیج دیا گیا۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ سب انگریز گرجا گئے ہوئے تھے۔ کہ اسی دیسی رسالے اور دو پیادہ پلٹن والوں۔ نے جیل کا دروازہ توڑ کر اپنے ساتھیوں کو رہا کرا لیا۔ جو انگریز ہاتھ آیا۔ اسے قتل کر دیا اُن کے بنگلوں کو آگ لگا دی۔ اور انگریزی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ بعد کو دیسی فوجوں کے جن سپاہیوں نے علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ وہ دہلی میں جمع ہو گئے۔ اور بہادر شاہ ظفر کو اپنی

خدمات پیش کر دیں۔ ایک روہیلہ جان باز جنرل بخت خان نے حریت پسندوں کی کمان سنبھال لی۔ اور ہر جگہ لوگ فرنگی استبداد کو ختم کرنے کے عزم سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے۔ یہاں کے عوام اور دیسی سپاہیوں نے بھی حریت پسندوں کا ساتھ دیا۔ بڑی قربانیاں دیں۔ اور ہر جگہ فرنگی توپوں اور سنگینوں کا مقابلہ کیا۔

تاہم ایک تو یہاں انگریز کو اقتدار سنبھالے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ دوسرے ابلاغِ عامہ کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے لوگ سیاسی حالات اور قومی تقاضوں سے پوری طرح باخبر نہ تھے اور تیسرے حریت پسندوں نے جذبات کی رَو میں بہہ کر ایک دم انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ تو کر دیا تھا۔ لیکن اس کے لئے کوئی منصوبہ بندی، تیاری، تنظیم اور مختلف علاقوں کو متحد اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہ کی گئی تھی۔ اس لئے عوام کی جدوجہد اور قربانی اتنی بامقصد اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس جنگِ آزادی کے بعد انگریز کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی فرعونیت اور جبر و استبداد میں نمایاں کمی ہوگئی اور اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاجِ برطانیہ کو منتقل ہوگیا۔

انگریز مؤرخوں نے ۱۸۵۷ء کی "جنگِ آزادی" کو "ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت" کہہ کر حقیقت کا منہ چڑانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فی الاصل اس تحریک کی تہہ میں آزادی کا جذبہ کار فرما تھا۔ بقول ڈزرائیلی "فوجی درپردہ ملک کی سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے" حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو آٹھ سو برس تک ہندوستان کے حکمران رہ چکے تھے۔ انگریز نے اتنے مظالم ڈھائے تھے کہ اب وہ ہر قیمت پر اپنی کھوئی ہوئی آزادی کی بازیابی کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان میں اُتر آئے تھے۔ سوچا جائے تو مسلمان ہی اس تحریکِ آزادی کے بانی، پشت پناہ اور روحِ رواں تھے۔ اس سے قبل شاہ اسماعیلؒ اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد نے مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا تھا۔ ہندوستانی مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز و محور صوبہ سرحد تھا۔ جہاں اپنے سربراہ (سیّد احمد) کی شہادت کے بعد بھی اُن کے جان نثار پیروکار جہاد کا پرچم بلند رکھے ہوئے تھے۔ وہ انگریزوں کے "کفارِ حربی" ہونے کا فتویٰ دے چکے تھے۔ بعد میں علامہ فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین اور ملک کے دوسرے نامور علمائے اسلام بھی ہندوستان

کو "دارالحرب" قرار دے کر انگریز کے خلاف "جہاد" کا فتویٰ جاری کر چکے تھے۔ سرحدی مسلمانوں کو "جہاد" پر اُبھارنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین انگریز کی دیسی فوجوں میں بھی تبلیغی فرائض انجام دے رہے تھے۔ بقول ولیم ہنٹر اس زمانے میں چند خطوط راول پنڈی میں پکڑے گئے تھے جن میں ہندوستانی فوج کے مسلمانوں کو مجاہدین کے ساتھ مل کر انگریز کا خاتمہ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ "بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو انگریز نے "مجاہدین" کے ساتھ خط و کتابت کے جرم میں سزا بھی دی تھی۔ سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جہاد کرنے میں بھی مجاہدین ستھانہ نے شاندار کردار انجام دیا تھا۔ مجاہدین اور ہندوستانی فوجیوں میں گہرا رابطہ موجود ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ نوشہرہ، مردان اور صوبہ سرحد کی فوجی چھاؤنیوں میں انگریز کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے والے زیادہ تر سپاہیوں نے سوات ہی کا رُخ کیا۔ تاکہ وہاں پہنچ کر مجاہدین کے اشتراک سے فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کا آغاز کر سکیں۔

چنانچہ ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء کو کمشنر پشاور سر ہربرٹ ایڈورڈز نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا۔ کہ "حالات روز بروز بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ اور اب راولپنڈی کی کونسل میں تو ہم صاف طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ "غدر" (جنگِ آزادی) کا محرک خواہ کچھ بھی ہو۔ اب تو اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ آچکی تھی۔ اور مغلیہ دارالحکومت دہلی کے مرکزِ جہاد قرار پانے کے بعد اس نے حصولِ آزادی کی جنگ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اسباب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے کئی وجوہ تھے۔ انگریز نے اقتدار سنبھالتے ہی مسلمان قوم کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے اس کے خلاف "انتقامی رویّہ" اختیار کر رکھا تھا۔

مسلمان اب تک حکمران قوم ہونے کے پندار میں تھے۔ انگریز چاہتا تھا۔ کہ مسلمان اس پندارِ برتری اور فخر کو فراموش کر دیں۔ چنانچہ ہر معاملے میں مسلمانوں کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جا رہا تھا۔ انگریز تاجروں کی روپ میں برصغیر میں وارد ہوئے تھے۔ اُن کا بنیادی مقصد صرف مال سمیٹنا تھا۔ اس لئے وہ ہر زیادتی۔ بدعہدی، ناانصافی اور بدسلوکی کو روا رکھتے تھے۔ اسلامی تمدن اور ثقافت کو ختم کرنے کی ہر کوشش ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کا صدیوں سے قائم شدہ نظامِ تعلیم درہم برہم ہو گیا تھا۔ سرکاری سرپرستی بند ہو جانے سے اکثر دینی مدارس اور دارالعلوم دم توڑ چکے تھے۔

انگریزی سکولوں میں اعلانیہ مغربی اور نصرانی خیالات کا پرچار ہوتا تھا۔ عیسائی مشنریوں کو یہاں تک مراعات دی گئی تھیں کہ وہ دیہات میں تبلیغ کو جاتے تو تھانے کے سپاہی ان کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے۔ مسلمان رؤسا کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ درباری زبان فارسی کی بجائے ہندوستانی (اُردو) قرار پانے کی وجہ سے مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کلیدی عہدوں اور ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دیسی فوجی سپاہی کی تنخواہ گورا سپاہی کی تنخواہ کا دسواں حصہ بھی نہ تھی۔ انگریز افسر کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ "حکم" کا درجہ رکھتا تھا۔ جس کے خلاف کوئی اپیل قابلِ سماعت نہ تھی۔ صوبہ سرحد پنجاب، سندھ، بلوچستان اور مسلم آبادی کے دوسرے علاقوں کے لئے جابرانہ اور مطلق العنانہ قوانین بنائے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر علاقوں پر ایسے افسر متعین تھے جو فوجی کارروائیوں کے ماہر اور سخت گیر لوگ تھے۔ وہ عوام کی نفسیات سے بے خبر تھے۔ اور صرف بنوکِ شمشیر حکومت کرنا چاہتے تھے۔

پشاور کی صورتِ حال

جنگِ آزادی کے دنوں میں پشاور کا کمشنر ہربرٹ ایڈورڈز تھا۔ اور ڈپٹی کمشنر جان نکلسن جب کہ سرحدی اضلاع میں متعینہ فوج کی کمان سر سڈنی کاٹن کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک انگریز اپنی فوج کی تعداد اور طاقت میں نمایاں اضافہ کر چکا تھا۔ ملک بھر میں فوجیوں کی کل تعداد دو لاکھ اڑتیس ہزار نفوس کی تھی۔ جن میں سے یورپین اڑتیس ہزار تھے۔ فوج کا سب سے بڑا حصہ بنگال آرمی کے نام سے موسوم تھا۔ جس کے ڈیڑھ لاکھ فوجیوں میں سے ۲۳ ہزار انگریز تھے۔ جنگِ آزادی میں بنگال آرمی پیش پیش تھی۔ سرحدی اضلاع میں متعینہ فوج اٹھائیس سو گوروں اور آٹھ ہزار دیسی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے پاس اٹھارہ میدانی توپیں تھیں اور ایک مکمل پہاڑی توپ خانہ تھا۔ ذمہ دار فوجی افسر تمام کے تمام انگریز تھے۔ البتہ جونیئر افسروں میں دیسی لوگ بھی شامل تھے۔ توپ خانہ مکمل طور پر انگریزوں کی تحویل میں تھا۔

شروع ہی سے پشاور کا بریگیڈیر جنرل سر سڈنی کاٹن اور دوسرے ذمہ دار افسر یہ رائے رکھتے تھے کہ قریباً تین ہزار گورا سپاہیوں کی موجودگی میں دیسی فوجوں کو قابو میں رکھنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ البتہ پشاور اور نواحی قبائلی مجاہدوں کے میدان میں نکل آنے کی صورت میں انگریزی

اقتدار کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

عوام کی جانب سے انگریز کو دو طرف سے مشکلات پیش آنے کا خدشہ تھا۔ مجاہدین سید احمد کا خوف انگریز پر مسلط تھا۔ مجاہدین کی تمام تر بھاگ دوڑ اور علاقہ سوات کا مکمل سیاسی اقتدار اس وقت تک ستھانہ کے مشہور بزرگ سید اکبر شاہ کے ہاتھ میں تھا۔ "بادشاہ صاحب" کے ایک اشارے پر یوسف زئی کا سارا علاقہ میدانِ جہاد میں اُترنے پر تیار تھا۔ لیکن انگریز کی خوش قسمتی اور مجاہدین کی شومئی تقدیر سے عین اسی دن جب میرٹھ کی جنگِ آزادی کی خبر پشاور پہنچی۔ سید اکبر شاہ وفات پا گئے۔ اس طرح گیارہ مئی ۱۸۵۷ء کو اس جانب سے انگریز کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔

امیرِ کابل کا کردار

صوبہ سرحد میں فرنگی سامراج کا دوسرا اور سب سے بڑا خطرہ کابل کے امیر دوست محمد خان کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ انگریز یہاں بھی خوش قسمت نکلے۔ ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء کو امیر دوست محمد خان اپنے بیٹے محمد عظیم خان اور دوسرے ارکانِ حکومت کے ساتھ خود پشاور آیا تھا۔ اور انگریزوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جنگ اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔ سیاست میں مفاد کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے نہ کہ اصول پرستی اور امانت و دیانت کو، مفاد کا تقاضا تو یہی تھا۔ کہ دوست محمد خان اس نازک صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتا۔ زخمی دشمن پر وار کر کے اُسے ختم کر دیتا۔ وہ ہمیشہ سے پشاور۔ مردان۔ کوہاٹ اور بنوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کا متمنی تھا۔ اور اس مقصد کے لئے بارہا اپنے بھائیوں (سردارانِ پشاور) سے لڑائی مول لے چکا تھا۔ بلکہ پشاور کی حکومت کے لالچ میں ایک دفعہ سکھوں کا ساتھ دینے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔ تاہم ۱۸۵۷ء میں نہ جانے کس مصلحت نے دوست محمد خان کو میدانِ جنگ میں کودنے اور پشاور سے انگریزوں کو نکال کر اپنا تسلط قائم کرنے سے روکے رکھا۔ مسلمان بادشاہ کی اس خاموشی کو دیکھ کر پشاور کے عوام بھی چپکے ہو رہے۔ ورنہ وہ اعلانِ جہاد کرتا تو سارے صوبہ سرحد کے مسلمان یقیناً اس کا ساتھ دیتے۔

مسلمانانِ سرحد یوں بھی انگریز کی چیرہ دستیوں سے تنگ آئے بیٹھے تھے۔ کیونکہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک فرنگی حکمران ستّر مرتبہ قبائل کے خلاف فوجی مہمیں بھیج چکے تھے۔ جن کے نتیجے میں لوگوں کو شدید جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

بہت بڑی غلطی

جمعیت عالیہ مجاہدین چمرقند کے امیر مولانا فضل الٰہی نے ایک کتابچہ میں امیر دوست محمد خان کے اس اقدام کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"انیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی غلطی امیر دوست محمد خان والیٔ کابل سے سرزد ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں سارا ہندوستان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آزادی پسندوں نے شاندار قربانیاں دی تھیں۔ اور کئی جگہ انگریز کا قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ قریب تھا کہ ان کی قوت ختم ہو کر رہ جاتی ـــــ انگریز یہاں تک مجبور ہو گئے تھے کہ گورنر جنرل نے متعلقہ انگریز منصب داروں کو واضح ہدایت کر دی تھی کہ وہ صوبہ سرحد امیر دوست محمد خان کو واپس کر دیں اور خود ساری فوج کی قوت ہمراہ لیکر دہلی پہنچ جائیں جس پر حریت پسندوں نے اُس وقت پورا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ لیکن اس وقت امیر دوست محمد خان نے سیاسی بصیرت کا ثبوت نہ دیا اور موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ انگریزوں سے کئے گئے صلح نامہ کی پوری پابندی کی۔ مجاہدین کی طرف سے مولانا نور اللہ کی قیادت میں دربار کابل کو ایک وفد بھیجا گیا۔ لیکن امیر نے ان لوگوں کی بھی نہ سنی۔ اگر امیر دوست محمد خان اس وقت علم جہاد بلند کرتے تو نہ صرف صوبہ سرحد انگریز کے تسلط سے نجات حاصل کر لیتا۔ بلکہ پورے ہندوستان کی تحریک آزادی کو بڑی تقویت ملتی۔"

امیر دوست محمد خان اور انگریزوں کے مابین طے شدہ صلح نامہ کی رو سے تین برطانوی فوجی افسروں پر مشتمل ایک فوجی وفد ۱۸۵۷ء کے اوائل میں قندھار بھیجا جا چکا تھا۔ جس میں میجر ہیری لمسڈن (کمانڈنٹ گائیڈز) لفٹیننٹ پی۔ لمسڈن اور ڈاکٹر بیلو (BELLEW) شامل تھے۔ خدشہ تھا کہ کہیں افغان حکومت انہیں یرغمالی نہ بنا لے۔ اور ان کی رہائی کے بدلے میں انگریز سے کوئی شرائط نہ منوا لے۔ اُدھر ایران کی فوجیں برطانوی حکومت کے معاہدے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہرات کے افغانی شہر پر قبضہ کر چکی تھیں۔ امیر افغانستان اس صورت حال سے بھی خفا تھے۔ یہ سب باتیں انگریزی استعمار کے خلاف جا سکتی تھیں۔

افغانستان سے پشاور آنے والی شاہراہیں درہ خیبر اور مہمند کے علاقے سے گزرتی ہیں۔

۱۸۵۷ء میں خیبری آفریدیوں بالخصوص ملک دین خیل اور ذخاخیل سے بھی انگریزوں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ ملک دین خیل پر ایک پولیس افسر کے قتل کا الزام تھا۔ کمکی خیل پر ایک انگریز فوجی افسر

کو ہلاک کرنے کا اور ذخا خیل پر میدانی علاقوں پر ڈاکے ڈالنے کا۔ اسی طرح مچنی اور پنڈیالی مہمندوں پر بھی انگریزی علاقہ کے مفروروں کو پناہ دینے کا الزام عائد تھا۔ یہ سب حقائق انگریز کے حق میں نہ تھے۔ اس کے برعکس کابل کی حکومت ان سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں تھی عوام متعجب تھے۔ کہ امیر افغانستان ان مواقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھا رہا۔

سرکاری رپورٹوں اور انگریز مصنفوں کی تحریروں سے ۱۸۵۷ء کی داستانِ جہاد کے جو پہلو سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :۔

۱۱ر مئی جنگِ آزادی کی اطلاع ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ڈپٹی کمشنر پشاور جان نکلسن کو دہلی سے موصول ہوئی جس میں بتایا گیا تھا۔ کہ "ہندوستانی سپاہی میرٹھ سے دہلی پہنچ گئے ہیں۔ وہ لوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتوں میں مصروف ہیں۔ مسٹر ٹاڈ (TODD) اور بہت سے انگریز افسر مارے جا چکے ہیں۔ ہمیں پوری رازداری سے کام لینا چاہیئے"۔

نکلسن کو ایڈورڈز کی واپسی کا انتظار تھا۔ مؤخر الذکر پشاور سے باہر درے پر گیا ہوا تھا۔ تاہم اس کی واپسی تک نکلسن نے وقت ضائع نہ کیا۔ اور ایک ایسا منصوبہ بنا لیا۔ جس سے پنجاب اور صوبہ سرحد کو بچایا جا سکتا تھا۔ اس نے نہایت قابلِ اعتماد اور دلیر فوجی سپاہیوں پر مشتمل ایک گھڑ سوار دستہ مرتب کر لیا تھا۔ جو جہاں بھی ضرورت ہو۔ پوری سرعت سے جائے۔ اور فتنہ پردازوں سے نپٹ سکے۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ملتانی سواروں پر مشتمل جنوبی اضلاع سے ایسا لشکر بھرتی کیا جائے۔ جو خود اس کی کمان میں دہلی روانہ ہو سکے۔

۱۲ر مئی ۱۲ مئی کی صبح کو میرٹھ سے آنے والے ایک ٹیلیگرام سے بھی اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ دیسی سپاہیوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی تھی۔ اور یورپی افسروں کی جانیں خطرہ میں تھیں۔ اس آنے والے طوفان کو روکنے کے لئے فوری اقدام کئے گئے۔ اسی دن نوشہرہ چھاؤنی کی ۵۵ دیسی پلٹن کو حکمنامہ بھیجا گیا کہ فی الفور مردان پہنچ کر گائیڈز رسالہ سے چارج لے۔ گائیڈز رسالے کو ہدایت کی گئی کہ مردان سے فوراً نوشہرہ آئے اور ۲۷ ویں گورا پلٹن سے مل کر دہلی کی جانب کوچ کے لئے تیار ہو جائے۔ ڈاکخانوں پر سنسر لگا دیا گیا۔ تاکہ مشکوک خط و کتابت کو روکا جا سکے۔ نیز جنگِ آزادی کی خبروں کی تشہیر نہ ہونے دی جائے۔ اُس وقت تک ملک سے بہت

سے اخبار بھی شائع ہو رہے تھے۔ انہوں نے جنگِ آزادی کی خبریں شائع کر دی تھیں۔ ایسے تمام اجتماعات قبضہ میں کر لئے گئے۔ اور عوام تک پہنچنے نہ پائے۔

ڈپٹی کمشنر جان نکلسن خود گھوڑے پر سوار ہو کر ایک ایک انگریز افسر کے پاس پہنچا۔ اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے رازداری سے کام لینے کو کہا۔ فوج کا ڈویژنل کمانڈر جنرل ریڈ (REED) بھی شام تک پشاور پہنچ گیا۔ اور اس نے ۱۳ مئی کو صبح کو اہم افسروں کا اجلاس اپنے ہاں بلا لیا۔

۱۳ مئی ۱۳ مئی کو صبح سویرے جنرل ریڈ (REED) کی صدارت میں جنگی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں بریگیڈیر سڈنی کاٹن، بریگیڈیر نیول چیمبرلین، کرنل نکلسن اور کرنل ہربرٹ ایڈورڈز نے شمولیت کی۔ اجلاس میں یہ فیصلے عمل میں آئے۔

۱۔ پنجاب میں تمام سول اور فوجی اختیارات جنرل ریڈ کو تفویض کر دیئے جائیں۔

۲۔ باغی ہندوستانی سپاہیوں سے اسلحہ چھیننے کی غرض سے ایک گشتی فوج قائم کی جائے۔

۳۔ اٹک کی موجودہ مشتبہ گیریژن کی جگہ قابلِ اعتماد گیریژن بھیجا جائے۔

۴۔ فتح خان خٹک کی سرکردگی میں ایک سو پٹھان سواروں پر مشتمل دستہ بنایا جائے۔ جو اٹک کی حفاظت کرے۔

۵۔ بریگیڈیر چیمبرلین کو فوری مشورے کے لئے چیف کمشنر سر جان لارنس کے پاس بھیجا جائے۔ جو صوبہ سرحد کی نزاکتِ حال کے پیشِ نظر راولپنڈی میں قیام پذیر تھا۔

۶۔ انگریزی خزانے کی جس میں ۲۴ لاکھ روپیہ موجود تھا۔ بالاحصار کو منتقلی۔

اسی دن گائیڈز رجمنٹ (حکم ملنے کے صرف چھ گھنٹے بعد) پورے ساز و سامان سے لیس، جوش و خروش کے ساتھ مردان سے اٹک کو روانہ ہو گئی۔ چودہ مئی کی صبح کو گائیڈ رسالہ اٹک پہنچ چکا تھا۔ کرنل ایڈورڈز کا کہنا ہے کہ گورا سپاہیوں کا یہ تیز ترین کوچ تھا۔

رسالے نے ایک لمحہ آرام کئے بغیر سخت گرمی میں تیز رفتاری سے سفر کیا۔ گائیڈ رجمنٹ اس سے پہلے کئی موقعوں پر طوفانی حملوں کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ اب کے اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ بغیر کہیں رکے سیدھی دہلی پہنچے۔ اور وہاں جنرل انسن (ANSON) کو کمک بہم پہنچائے۔ تاکہ دہلی پر دوبارہ قبضہ

کیا جا سکے۔

۵۸۰ میل کا یہ طویل سفر، جو عام حالات میں پچاس دن لیتا۔ ان پُرجوش سپاہیوں نے صرف اکیس دن میں طے کیا۔ ۹ جون کو یہ فوج دہلی پہنچی۔ اور صرف تین گھنٹے کے آرام کے بعد جنگ کے شعلوں میں کود پڑی۔ اور اتنی بہادری سے لڑی کہ اس کا کوئی سپاہی اور افسر ایسا نہ تھا جو کم سے کم دو بار زخمی نہ ہوا ہو۔

دہلی پر انگریزوں کی فتح کا سہرا بھی صوبہ سرحد میں متعین ایک انگریز افسر کے سر بندھا۔ وہ افسر جان نکلسن تھا۔ جس کی یادگار اب بھی ٹیکسلا اور راولپنڈی کے مابین دھرمسالہ کی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ جان نکلسن پنجاب اور صوبہ سرحد کے فوجی دستوں کو لے کر ستمبر میں دہلی پہنچا۔ اس وقت تک جنرل انسن اور جنرل پرنارڈ مارے جا چکے تھے۔ اور جنرل ولسن انگریز دستوں کی کمان کر رہا تھا۔

جان نکلسن نے پہنچتے ہی ایک پُرجوش حملہ کیا اور اپنے سپاہیوں کو غیرت دلائی کہ فتح حاصل کئے بغیر قدم پیچھے نہ ہٹائیں۔

۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کالا خان نامی ہندوستانی مجاہد نے کشمیری گیٹ کی فصیل سے کودتے وقت نکلسن کو گولی کا نشانہ بنایا۔ نکلسن زخمی ہو کر گر پڑا تاہم مرنے سے پہلے اُس نے خبر سن لی کہ دہلی پر انگریز کا قبضہ ہو چکا ہے۔

نوشہرہ کے ۵۵ ویں رجمنٹ اور گائیڈ رسالہ (مردان) کے معاملات سلجھانے کے بعد انگریزوں کو سب سے زیادہ خدشہ پشاور کی ۶۴ دیسی پلٹن کی طرف سے تھا۔ اس پلٹن کو فوراً تین حصوں میں تقسیم کر کے مختلف سمتوں کو بھیج دیا گیا۔ بظاہر ان سپاہیوں کو یہ بتایا گیا کہ مہندوں کی طرف سے حملے کو روکنے کے لئے یہ کارروائی کی جا رہی ہے۔

۱۶ مئی ۱۶ مئی کو چیف کمشنر جان لارنس نے پشاور کے کمشنر ایڈورڈز کو بھی ضروری صلاح مشورے کے لئے راولپنڈی بلا بھیجا۔ تاہم جانے سے پہلے ایڈورڈز نے دو ہزار ملتانی پٹھانوں پر مشتمل ایک امدادی فوج بھرتی کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

ایک ہفتے کی ان کارروائیوں کے دوران کسی جگہ سے بھی کوئی شر انگیز خبر نہ ملنے پر انگریز افسروں

نے یہ سمجھ لیا کہ بلا ٹل گئی ہے لیکن ۲۰ مئی کو ایک مقامی اخبار ــــ "مرتضائی" ــــ میں خبر چھپی کہ پہاڑی علاقوں میں متعینہ سپاہی باغی ہو گئے ہیں۔ اس اخبار کے ایرانی نژاد ایڈیٹر کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ اسی دن ایک فقیر کو چھاؤنی میں مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ اس کے قبضے سے ایک خط برآمد ہوا جس میں ہندوستانی سپاہیوں کو بتایا گیا تھا کہ ۲۶ مئی کو اپنے افسروں کو قتل کر کے پشاور میں جمع ہو جائیں۔ اس فقیر کو موت کی سزا دے دی گئی۔ اسی دوران سرکاری خزانہ چھاؤنی سے قلعہ بالاحصار میں منتقل کر کے اس پر گورا فوج کا پہرہ لگا دیا گیا۔ علاوہ بریں بریگیڈیر کاٹن نے بھی اپنا ہیڈ کوارٹر ایک بنگلے سے کسی مرکزی عمارت میں منتقل کر لیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ خطرے کی صورت میں تمام یورپین مرد، عورتیں اور بچے وہاں جمع ہو جائیں۔ پشاور چھاؤنی کی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان پر دو انگریز کرنیلوں کو نگراں بنا دیا گیا۔ ہر حصے کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا۔ جو گورا فوج کی تحویل میں دے دیا گیا۔ دریائے سندھ اور دریائے کابل کی مختلف آبی گزرگاہوں پر بھی پہرہ بٹھا دیا گیا۔

۲۱ مئی ۲۱ مئی کو کرنل ایڈورڈز راولپنڈی میں چیف کمشنر سر جان لارنس سے ہدایات حاصل کرنے کے بعد پشاور آیا تو حالات کی سنگینی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایسے خطوط پکڑے گئے تھے جو پٹنہ اور تھانیسر کے مسلمانوں نے ۶۴ ویں پلٹن کے جوانوں کو بھیجے تھے۔ اور جن میں نہتے مسلمان عوام۔ عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں پر گورا سپاہیوں کے مظالم نہایت دردناک انداز میں بیان کرنے کے بعد اُن سے اللہ اور رسولؐ کے نام پر اپیل کی گئی تھی کہ فرنگی کافروں سے ان مظالم کا بدلہ لیا جائے۔ خطوں سے پتہ چلتا تھا کہ اس دیسی پلٹن اور ستھانہ اور سوات کے مجاہدوں میں بھی نامہ و پیام جاری تھا۔ ان خطوں میں مبینہ طور پر اس امر کی بھی ترغیب دی گئی تھی کہ مردان اور نوشہرہ کی دیسی پلٹنیں ۲۱ مئی کو پشاور پہنچ جائیں۔ تاکہ سب وطنی سپاہی اکٹھے ہو کر کوئی اقدام کریں۔ ۶۴ ویں دیسی رجمنٹ کے سپاہیوں نے یہ خط اپنے افسروں کے حوالے کر دیے۔ کہ انگریز ان کو اُن کی وفاداری کا یقین ہو سکے۔ لیکن انگریز کسی کو معاف کرنے والے کہاں تھے۔؟

کرنل نکلسن نے ان متوقع حالات کے پیشِ نظر خیبر اور نواحِ پشاور سے فوج بھرتی کرنی چاہی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ آخر کمشنر پشاور نے کوہاٹ کے حاکم کیپٹن ہینڈرسن کو بھرتی کے لئے لکھا۔ اس

نے بنگش سردار بہادر خان کی سربراہی میں سو آدمیوں کا ایک دستہ پشاور بھیجا۔ درۂ کوہاٹ سے گزرتے ہوئے پچاس آفریدی طالع آزما بھی اس دستے میں شریک ہو گئے۔

اس وقت تک انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا مظاہرے ہونے لگے تھے۔ اٹک پل پر ۵۵ ویں دیسی پلٹن کا ایک دستہ متعین تھا۔ اس نے اعلانِ جہاد کر کے نوشہرہ کی طرف کوچ کر دیا۔ ان لوگوں کی نفری چالیس پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ نوشہرہ کے قریب پہنچے تو انگریز کی وفادار دسویں رجمنٹ کے سواروں نے انہیں روکا اور قیدی بنا کر اُن سے ہتھیار رکھوا لئے۔

جونہی نوشہرہ میں مقیم ۵۵ ویں دیسی رجمنٹ کی باقی یونٹوں کو اس بات کا پتہ چلا۔ انہوں نے دسویں رجمنٹ کے سواروں پر حملہ کر کے اپنے ساتھیوں کو آزاد کرا لیا۔ اب ان سرفروشوں کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی تھی۔ اُن لوگوں نے نوشہرہ چھاؤنی کے گولہ بارود کے ذخیرے پر قبضہ کر لیا۔ اور مسلح ہو کر کشتیوں کے پل کے راستے مردان کو چل پڑے۔ کشتیوں کے پل کے نگراں ایگزیکٹو انجینئر لفٹیننٹ ٹیلر (F.S.TAYLOR) نے سپاہیوں کی آمد کا سُن کر کشتیوں کا پل توڑ دیا۔ مجبوراً سپاہیوں نے چھوٹی چھوٹی دیسی کشتیوں کے ذریعہ دریا پار کیا۔ کچھ سرفروش اس دوران میں کشتی ڈوبنے سے جاں بحق بھی ہو گئے۔

نوشہرہ کے اس ہنگامے کی اطلاع آدھی رات کو پشاور پہنچی۔ تو بڑے بڑے فوجی افسروں کا ایک ہنگامی اجلاس فوراً بلایا گیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ دوسرے ہی دن علی الصبح پشاور چھاؤنی کے تمام دیسی سپاہیوں سے ہتھیار رکھوا لیے جائیں۔ کئی پلٹنوں کے کمانڈروں نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ تاہم کمشنر ایڈورڈز نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ بریگیڈیئر جنرل کاٹن کے حکم سے سرتابی نہ کریں۔

۲۲ مئی ۲۲ مئی کی صبح کو اس فیصلے کے مطابق ایک جنرل پریڈ بلائی گئی۔ جب دیسی پلٹنوں کے جوان رائفلیں لئے پریڈ گراؤنڈ میں آئے۔ تو ان کے دونوں طرف گورا پلٹنیں کھڑی کر دی گئیں۔ جب پریڈ کر کے تمام دستے الگ الگ کھڑے ہو گئے تو انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم اتنا ناگہانی تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے صلاح مشورے کا موقع ہی نہ ملا اور سپاہی چکرا کر رہ گئے کوئی اکیلا دستہ انکار کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں دیسی سپاہیوں کو گزشتہ روز کے نوشہرہ کے واقع کا بھی علم نہ تھا۔ جب ایک ایک کر کے تمام دیسی سپاہیوں نے ہتھیار رکھ دیئے

تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پشاور میں یہ ان کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس اقدام سے انگریزوں کا وقار بحال ہو گیا اور لوگ دھڑا دھڑ فوجی بھرتی کے لئے آنے لگے۔

کسی سپاہی سے ہتھیار لے لینا اس کی بہت بڑی شکست تصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی رات ۲۵۰ کے قریب ہندوستانی سپاہی کیمپ سے باہر بھاگ نکلے۔ اس وقت تک انگریزوں نے اپنے جاسوس اِدھر اُدھر چھوڑ رکھے تھے اور بہت سے جی حضوریئے خان خوانین بھی انگریز کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس لئے سب کے سب سپاہی گرفتار کر کے واپس چھاؤنی پہنچا دیئے گئے۔

وحشیانہ سزائیں انگریز نے ان بے بس سپاہیوں سے جس طرح انتقام لیا۔ وہ بربریت کی بدترین مثال ہے۔ صبح سویرے تمام دیسی سپاہیوں کی پریڈ طلب کی گئی۔ اور عین ان کی آنکھوں کے سامنے اُن کے سربراہ صوبیدار میجر کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ اُس کی بوٹیاں فضا میں بکھر گئیں۔ وہ پہلا شخص تھا۔ جسے "بغاوت" کے جرم میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

بعد میں انہی سپاہیوں میں سے دوسرے ایک سو بیس افراد کو بھی موت کی سزا سنائی گئی۔ لیکن چیف کمشنر نے اتنی زیادہ تعداد کو بیک وقت سزا دینے کی مخالفت کی۔ اور ہدایت کی کہ چالیس سے زیادہ افراد کو موت کی سزا نہ دی جائے۔

۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو پھر پشاور چھاؤنی کی فضاؤں نے سنگدل گوروں کی وحشت کی انتہا دیکھی۔ پھر سے دیسی سپاہیوں کو پریڈ گراؤنڈ میں جمع کیا گیا۔ پھر چالیس بدقسمت انسانوں کو جلوس کی صورت میں ان کے درمیان ٹھہرایا گیا۔ میدان کے ایک طرف چالیس توپیں کھڑی تھیں۔ ان بیچاروں کو زبردستی توپوں کے منہ پر باندھا گیا۔ اشارہ پاتے ہی ایک ساتھ توپیں داغی گئیں۔ اور اُن آزادی کے پروانوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میدان میں بکھر گئے۔ یہ وہی لوگ تھے۔ جنہوں نے انگریزی اقتدار کے استحکام کے لئے سالہا سال تک اپنی جانیں لڑائی تھیں۔

مردان نوشہرہ اور مردان میں متعین دسویں رسالہ اور ۵۵ ویں پلٹن کی جانب سے انگریزوں کو مسلسل خدشہ لگا رہتا تھا۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ اُن سے بھی اسلحہ واپس لے لیا جائے۔ انگریزوں کی جانب سے الزام لگایا جاتا تھا کہ ۵۵ دیسی پلٹن نے اپنے گورا افسروں کو قتل کی دھمکی دے دی تھی۔ جب کہ ۸ رسالہ کے "کشنوں" نے لفٹیننٹ ہارن (HORNE) کو زندہ جلا دینے کے عزم کا

اظہار کیا تھا، اس پر اٹک میں متعینہ ۲۷ ویں گورا پلٹن کے کمانڈنٹ میجر واہان (VAUGHAN) کو حکم دیا گیا۔ کہ وہ مردان پہنچ کر انگریز افسروں کی حفاظت کا فوری انتظام کرے۔ ادھر پشاور میں حالات پر قابو پانے کے بعد ۲۳ مئی کی رات کو گیارہ بجے آٹھ سو گورا سپاہی اور رسالہ کے ۲۵۰ گھڑ سوار، آٹھ بڑی توپیں لے کر مردان کی سمت چل پڑے۔ سپاہیوں کی کمان کرنل شوٹ (CHUTE) کے ہاتھ میں تھی جب کہ ان کی رہنمائی کے لئے کرنل لمکلسن بھی ان کے ہمراہ تھے۔ نوشہرہ پہنچنے پر اٹک سے آنے والا میجر واہان کا دستہ بھی اُن سے آن ملا۔

دونوں لشکر رات کو کوچ کرتے ہوئے ۲۵ مئی کی صبح کو مردان چھاؤنی جا پہنچے۔ انگریزی فوج کا مردان پہنچنا تھا۔ کہ انتقام کے ڈر سے ۵۵ ویں دیسی پلٹن کے تمام سپاہی (سوائے ۱۲۰ نفری کے) مردان سے بونیر اور سوات کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گئے۔

گورا پلٹنوں اور رسالے نے ان کا تعاقب کیا۔ جو ہاتھ لگا۔ اُسے قتل کر دیا گیا۔ بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۵۵ ویں دیسی پلٹن سے اس بدسلوکی کا اس کے کرنل کمانڈنٹ سپاٹس وُڈ (SPOTTIS WOOD) پر اتنا بُرا اثر ہوا کہ اس سانحہ کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے اُس نے خودکشی کر لی۔

انہی دنوں علاقہ مہمند کے مشہور سرفروش اجون خان نے فرنگی سامراج پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ قبائلی علاقوں سے اپنے لڑاکے لے کر قلعہ اباذئی میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کی امداد کے سلسلے میں پڑانگ آ پہنچا۔ انگریز کو خدشہ تھا کہ اجون خان کے مجاہد ۵۵ پلٹن کے سرکشوں سے مل کر اباذئی کے قلعہ پر قابض ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے فوری طور پر کرنل شوٹ کو مقابلے کے لئے بھیجا۔ اس پر اجون خان اور ساتھی واپس اپنی پہاڑی کمین گاہوں کو چلے گئے۔ تاہم گورا فوج احتیاطاً کافی عرصے تک قلعہ اباذئی کی حفاظت پر متعین رہی۔

انگریز کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی بدنام زمانہ پالیسی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے حریت پسندوں ——— کے خلاف بھی انہوں نے یہی حربہ استعمال کیا۔ کمشنر پشاور ڈوبٹن نے تمام دیہات میں منادی کرا دی کہ جو شخص دیسی فوج کے کسی بھگوڑے سپاہی کو قتل کرے گا۔ اسے مقتول کا سارا اسلحہ اور سامان دے دیا جائے گا۔

یہ شہ پاتے ہی حالت یہ ہوگئی کہ دیہاتی مفرور فوجیوں کی ٹوہ میں لگے رہتے۔ اور جہاں کہیں انہیں پاتے۔ اسلحہ اور نقدی کے لالچ میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ پچاس پوربی سپاہیوں کو جو دریائے اٹک پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دیہاتیوں نے حملہ کر کے قتل کر دیا۔ اُدھر غریب اور افلاس زدہ علاقوں (ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان وغیرہ) سے انگریزی فوج میں بھرتی ہونے والے رنگروٹ بھی دھڑا دھڑ پشاور پہنچنے لگے۔ انہیں دیکھ کر مقامی آبادی کو انگریزوں کی کامیابی کا یقین ہوگیا۔ اور وہ بھی انگریزوں سے تعاون پہ آمادہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ ۳۰۰ افراد پہ مشتمل ملک دین خیل آفریدیوں کی ایک جمعیت بھی پشاور پہنچی۔ اور انہیں بھرتی کر کے ایک نئی پنجاب رجمنٹ کھڑی کر دی گئی۔ حریت پسندوں پہ اُن کے دباؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔

جنرل کاٹن بھی اس دوران بڑا سرگرم رہا۔ اس نے گورا سپاہیوں کی نگرانی میں "پشاور لائٹ ہارس" (LIGHT HORSE) کے نام سے ایک نیا رسالہ بھرتی کیا۔ اور ہندوستانی رجمنٹوں سے وفادار سکھ اور دوسرے جوانوں کو منتخب کر کے ایک نئی پلٹن بنائی۔ کچھ توپیں بھی ان پلٹنوں کے لئے مہیا کی گئیں۔ یہ دونوں سکیمیں بڑی کامیاب رہیں۔ اسی طرح دیسی سواروں پہ مشتمل رسالے کو توڑ کر اُن کی جگہ گورا سواروں کو لیا گیا۔ اس پیادہ فوج کو جس میں فراخ پشاور کے پٹھان جوان بھرتی کئے گئے۔ اسے پنجاب انفنٹری کی اٹھارویں رجمنٹ کا نام دیا گیا۔ علاوہ ازیں حفاظتی فوج کی دو پلٹنیں بھی کھڑی کی گئیں۔ گویا اپنے تدبر اور فراست سے کام لے کر صوبہ سرحد کے انگریز افسروں نے اپنے اقتدار کو کافی مستحکم بنا لیا۔

بیل گاڑیوں کا قافلہ جنرل کاٹن نے ایک اور مفید سکیم بھی شروع کی۔ وہ یہ کہ بیل گاڑیوں پر مشتمل ایک بہت بڑے فوجی قافلے کا اہتمام کیا گیا۔ ہر بیل گاڑی میں سولہ سپاہی ہوتے تھے۔ جن کے ساتھ بارود کا کافی ذخیرہ بھی رکھا جاتا تھا۔ بوقت ضرورت ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان اور رسد پہنچانے میں یہ قافلہ بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ بلکہ انہی دنوں جب سارے خطہ پشاور میں "زرد بخار" کی وبا پھوٹ پڑی تو بیمار گورا سپاہیوں کو "آفت زدہ علاقہ" سے نکالنے میں اس قافلے نے بڑا اہم کردار انجام دیا۔ اکثر بیمار گورا سپاہیوں کو راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ جہاں آب و ہوا کی تبدیلی کے علاوہ انھیں ہر قسم کی طبی سہولت بھی آسانی سے مل سکتی تھی۔

سوات اور بونیر بتایا جا چکا ہے کہ سوات اور بونیر کے مشہور مجاہد سید اکبر شاہ جنہیں تمام یوسفزئی

قبائل نے بالاتفاق اپنا "بادشاہ" تسلیم کر رکھا تھا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو وفات پا گئے۔ چونکہ ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک اُن کی جانشینی کے سوال پر قبائل میں اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ اس لئے انگریزوں کے خلاف کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی۔ تاہم سنھانہ کے نواحی قبیلوں اور جمعیت مجاہدین کے ارکان نے مرحوم سید اکبر شاہ کے فرزند سید مبارک شاہ کا ساتھ دیا۔ اور انہیں اپنا امیر تسلیم کیا۔ مردان چھاؤنی سے ہندوستانی فوج جن کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی بھی سید مبارک شاہ کے پاس چلے گئے۔ اور ان کی طرف سے اُن کے مخالفین سے لڑتے رہے۔ جب مہینہ ختم ہوا اور انہوں نے تنخواہ طلب کی تو مبارک شاہ بادشاہ کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ آخر انہی فوجیوں کے سرداروں سے قرض لے کر ایک ماہ کی تنخواہ ادا کر دی گئی۔ لیکن دوسرے ماہ کے خاتمے پر پھر وہی مشکل پیش آئی۔ اس عرصے میں قبائل کی اکثریت اخون صاحب سوات کے ساتھ مل گئی تھی۔ جو اس موقع پر انگریز سے جنگ چھیڑ کر اپنی مشکلات میں اضافہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے سید مبارک شاہ اور ان کے ساتھیوں نے (جن میں یہ دیسی سپاہی بھی شامل تھے) اپنے علاقے سے نکال کر دریائے سندھ کی دوسری طرف دھکیل دیا۔ یوسف زئی سرحد سے ان فوجی بھگوڑوں کے نکل جانے کے بعد کرنل نکلسن اور مردان کے انگریز افسروں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چنانچہ نکلسن دوبارہ پشاور پہنچ گیا۔

ادھر سوات سے نکالے جانے کے بعد سید مبارک شاہ اور ۵۵ ویں پلٹن کی یورپی سپاہیوں نے کشمیر اور کاغان کا رُخ کیا۔ لیکن ان میں سے اکثر سردی، بھوک اور سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئے۔ باقی ماندہ سپاہیوں کو لے کر سید مبارک شاہ پنجتار چلے گئے۔ پنجتار کے یوسف زئی خوانین کا دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے کوہستانی علاقوں میں بڑا رسوخ تھا۔ چنانچہ انہی کی مدد سے سید احمد بریلویؒ کے بچے کھچے مجاہدین اور یورپی فوجیوں نے وہیں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اُن دنوں مجاہدین کے امیر مولوی عنایت علی تھے۔ پنجتار کے یوسف زئی خانوں میں سے خان میر باز خان نے ان دنوں مجاہدین کا پوری طرح ساتھ دیا۔ بارہا انہوں نے انگریز کی فوجی چوکیوں پر حملے کئے۔ اور تحصیلی دورے کر کے لوگوں کو انگریز سے کسی قسم کا تعاون کرنے سے منع کیا۔ اس پر مردان چھاؤنی کے انگریز کمانڈر میجر (VAUGHAN) نے چار سو سواروں اور دو بڑی توپوں کو لے کر مجاہدین

پر چڑھائی کر دی۔ خان میر باز خان بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ جمعیت مجاہدین کے ایک روہیلہ سردار اور کئی ایک مجاہد پکڑے گئے۔ جنہیں فرنگی حکومت نے فی الفور پھانسی دے دی۔ غازیوں کے دو دیہات جلا کر خاک کر دیئے گئے اور دوسرے نواحی دیہات پر بھاری جرمانہ عائد کیا گیا۔

بزعم خود تو انگریز اس کارروائی سے مطمئن ہو گیا۔ تاہم غازیوں کے حوصلے بلند رہے۔ سخت سے سخت مشکلات بھی اُن کے عزم جہاد کو متاثر نہ کر سکیں۔ مجاہدین کو کئی کئی دنوں تک درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔ ان پر دنیا تنگ ہو گئی۔ تاہم جہاں پٹنہ میں مولوی احمد اللہ خان آزادیٔ وطن کی جنگ میں پیش پیش رہے۔ وہیں بونیر اور سوات کی سرحد پر اسی خانوادے کا ایک فرد مولوی عنایت علی پرچم جہاد کو بلند کئے رہا۔

۲ر جولائی کو انگریزی فوج شیخ جانہ کے گاؤں پر حملہ آور ہوئی۔ ایک چھوٹا سا گاؤں اتنی بڑی اور منظم فوج کا مقابلہ کیا کرتا۔ لوگ اپنا سامان اور بیوی بچے نکال کر پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے اور حملہ آوروں نے چند جھونپڑے نذر آتش کر کے دل کے پھپھولے پھوڑے اور دنیا پر ظاہر کر دیا کہ انتقام انگریز قوم سے کیا کچھ نہیں کرا سکتا۔

شیخ جانہ سے پیٹھ پھیرتے ہی یوسف زئی بہادر اور جمعیت عالیہ مجاہدین کے سرفروش پھر انگریزی سامراج کی فوجوں کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔ اب کے دونوں طاقتوں کا معرکہ نارنجی کے گاؤں میں پڑا۔ انگریزی حکمت عملی ایک دو دھاری تلوار تھی۔ وہ بندوقوں سے بھی کام لیتے۔ اور مکر و فریب کا جال بھی بچھاتے۔ انگریز صوبہ سرحد کی قبائلی سیاست اور مختلف قبائل کی باہمی آویزش سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ نارنجی کی مہم سے قبل بھی انہوں نے ایسی ہی چال چلی۔ اور موضع سلیم خان کے لوگوں کو جو پنجتار اور طوطالی کے خوانین کے مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ سلیم خان میں فوجیں اور سامان جمع کرنے کے بعد انگریزی لشکر نارنجی کے گاؤں کی طرف بڑھا۔ یہ ۲۱ر جولائی ۱۸۵۷ء کا واقع ہے۔

نارنجی کا گاؤں ایک پہاڑی چوٹی پر واقع ہے۔ اُن دنوں اس کی کل آبادی چار سو نفوس پر مشتمل تھی تاہم جذبۂ جہاد سے سرشار یہ لوگ ہر بڑی سے بڑی اسلام دشمن طاقت سے ٹکر لینے کو تیار تھے۔

۲۱ر جولائی کو انگریز لشکر نے جو آٹھ سو سواروں پر مشتمل تھا۔ توپ خانے کی مدد سے نارنجی کی زیریں آبادی پر حملہ کر دیا۔ خود ڈپٹی کمشنر جیمز بھی لشکر کے ہمراہ تھا۔ غازی مثالی بہادری سے لڑے اُن میں پچاس ساٹھ جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اتنے بڑے لشکر کو انہوں نے کافی دیر تک روکا۔ تاہم انگریزوں نے بارودی سرنگوں سے مکانوں کو اڑانا شروع کیا۔ اور ساری آبادی کو تاخت وتاراج کر دیا۔ یہ دیکھ کر مجاہدین اور غازی نارنجی کے بالائی حصے کو منتقل ہو گئے۔ انگریز نے ہر چند وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اُس کی پیش نہ گئی۔ ۳ر اگست تک انگریز مزید کمک کے انتظار میں وہیں پڑے رہے۔ اس عرصہ میں غازیوں نے بھی اپنے مورچوں کو حتی الامکان مضبوط بنا لیا۔ ۳ر اگست کو چودہ سو سواروں کے ساتھ انگریز کمانڈر گاؤں پر ٹوٹ پڑا۔ کافی دن تک غازی انہیں روکے رہے۔ لیکن اس اثنا میں لفٹیننٹ ہوسٹ (HOSTE) کی کمان میں گورا فوج کا ایک دستہ ایک عقبی پہاڑی راستے سے غازیوں کے مورچے تک جا پہنچا۔ زبردست معرکہ پڑا۔ تیس سے زیادہ غازی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جب کہ باقی ماندہ زخمی ہو گئے۔ اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ غازیوں میں بریلی کا ایک مجاہد رہنما بھی تھا۔ جس کا جسم اسی وقت انگریز کی سنگینوں نے چھلنی کر دیا۔۔۔ اور وہ جامِ شہادت نوش کر گیا۔ گاؤں کو ہاتھیوں کی مدد سے ڈھا دیا گیا۔ انگریز فوجی انجینیروں نے غازیوں کے ایک ایک مورچے کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد گورا فوج واپس مردان روانہ ہو گئی۔

قرضے کی اپیل

دہلی کے محاصرے کے دوران انگریز کو بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے بہترین فوجی افسر ایک ایک کر کے مرتے گئے تو ان کی جگہ دوسرے افسروں کو ترقی دی گئی۔

ڈپٹی کمشنر پشاور کرنل نکلسن کو ترقی دے کر جیمبرلین کی جگہ بریگیڈیر جنرل بنا دیا گیا جبکہ جیمبرلین کو افواجِ ہند کا ایڈجوٹنٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ کرنل نکلسن کی جگہ چیف کمشنر پنجاب کے سیکرٹری کرنل جیمز پشاور کے ڈپٹی کمشنر بنائے گئے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس ضلع کے حاکم رہ چکے تھے۔ اس لئے یہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ نئے ڈپٹی کمشنر نے دیکھا کہ جنگ کے طول پکڑ جانے سے خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ تو اس نے ضلع کے صاحبِ حیثیت لوگوں کو خط لکھ کر اُن سے قرض مانگا۔ جس پر چھ فی صد سود دینے کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن لوگ تھے۔

کا نہیں انگریزی حکومت پر اعتماد ہی نہ رہا تھا۔ کوئی شخص بھی قرض دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ بالآخر شہر کے رؤسا اور ہندو سیٹھوں کو عام اجلاس میں بلایا گیا۔ اس اجلاس کا حال کرنل ایڈورڈز ہی کے الفاظ میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "وقتِ مقررہ کے کوئی دو گھنٹہ بعد شہر کے معززین بادلِ ناخواستہ اجلاس میں آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پہلی صفوں میں بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ ہر کوئی کونا کھدرا ڈھونڈھ رہا تھا۔ حالانکہ یہ وہی لوگ تھے۔ جو ہر اتوار اور ہر تقریب پر پھلوں کے ٹوکرے اور مٹھائی کے تھال اٹھائے ہمارے ہاں حاضری دیا کرتے تھے۔ لیکن اب ان کی ساری ہمدردیاں عنقا ہو چکی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت انگریزوں کی زندگی یا موت کا سوال تھا۔ اس لئے قرض دینا لازم تھا۔ لیکن کیا مجال کہ بر ضا و رغبت کوئی شخص ایک پائی دینے کو بھی تیار ہوا ہو۔"

یہ دیکھ کر کرنل ایڈورڈز آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے پہلے تو بغیر کسی تمہید کے تمام "معززین" کو دیر سے "دربار" میں حاضر ہونے پر جھڑکنے کی سزا سنائی۔ اور بعد میں حاضرین سے پوچھا کہ وہ کتنی رقم قرض دینے پر آمادہ ہوں گے۔

آدھ گھنٹے کے صلاح مشورے کے بعد اہلِ پشاور نے پندرہ ہزار روپیہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کساد بازاری اور بدامنی کی وجہ سے یہ رقم بھی کہیں مہینوں میں جا کر اکٹھی ہوگی۔ اس پر کمشنر ایڈورڈز کو جلال آنا ضروری تھا۔ اُن کے سامنے انگریزی حکومت کے وقار کا سوال تھا۔ انہوں نے حاضرین کو صاف کہہ دیا۔ کہ اُنہیں پانچ لاکھ روپیہ سرکاری قرضے میں دینا ہوگا۔ اور وہ بھی فی الفور۔ اس سے ایک پائی کم پر بھی وہ راضی نہ تھے۔ رہا یہ سوال کہ ہر گھرانے پر رقم کا تعین کیسے ہو تو کمشنر صاحب نے پہلے تو یہ بات حاضرین کے صوابدید پر چھوڑ دی۔ لیکن جب سوچا کہ اس طرح لوگ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرنے لگیں۔ تو سرکاری خزانچی لالہ مان مل کی ڈیوٹی لگا دی گئی۔ کہ ہر مکان اور ہر دکان کے لئے رقم کا تعین وہ خود کریں۔ مان مل نے یہ کام انگریز آقاؤں کی مرضی کے مطابق انجام دیا جس پر کمشنر صاحب کی طرف سے اُس کی بڑی تعریف ہوئی۔ اس طرح جوں توں کر کے چار لاکھ روپیہ جمع ہو گیا۔ اُدھر جنگ کے دوران تو قرضے کے تمسکات کی قیمت گر کر ۲۵۔۲۶ فیصد رہ گئی۔ لیکن حالات درست ہونے پر پوری رقم ملنے لگی۔ تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ساہوکار بھی ان تمسکات کو بخوشی قبول کرنے لگے۔

اب انگریز کو ملیشیا کی دسویں رجمنٹ سے نپٹنا تھا۔ اس پلٹن کا ایک حصہ پشاور میں متعین تھا تو دوسرا نوشہرہ میں۔ دونوں سے بیک وقت ایک جیسا سلوک روا رکھا گیا۔ ۲۶ جون ۱۸۵۷ء کو صبح سویرے ان دونوں دستوں کا اسلحہ، گھوڑے اور سارا ساز و سامان ضبط کر لیا گیا۔ اُن کے انگریز کمانڈنٹ انہیں مارچنگ کراتے ہوئے اٹک تک لے گئے۔ جہاں ہر سپاہی کی ہتھیلی پر دو دو روپے رکھ دیئے گئے۔ اور انہیں نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ دو روپے کی یہ رقم ایسی تھی کہ وہ بیچارے اپنے اپنے گھروں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بعد میں ان کی پنشن تک ضبط کر لی گئی یا چند ایک کو محض گزارہ الاؤنس دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ضلع پشاور میں باڑہ فورٹ اور مکین فورٹ سے پرانے پوربی سپاہیوں کو نکال کر ان کی جگہ چوبیسویں فوج کے دستے متعین کر دیئے گئے۔ یہ کارروائی محض اس افواہ کی بنا پر کی گئی کہ یہ پوربی سپاہی آفریدیوں سے ساز باز کر رہے تھے۔ کہ وہ انہیں کسی پہاڑی راستے سے اٹک پہنچا دیں۔ ان سپاہیوں کو سبق سکھانے کے لئے اُن کے سرغنہ کو ان کی آنکھوں کے سامنے توپ دم کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو مختلف چھاؤنیوں میں بھیج دیا گیا۔ اور اُن قلعوں میں نئے بھرتی شدہ ملتانی پٹھانوں کے دستے متعین کر دیئے گئے۔

بمشکل تمام انگریز ان پلٹنوں سے گلو خلاصی کرانے پائے تھے کہ ۹ جولائی کو سپاہ قبیلے کے دو آفریدی موقع پا کر اٹھارویں سرحدی رسالے میں گھس آئے۔ اور ایک خط سواروں کے حوالہ کیا۔ اس خط میں جو سپاہ قبیلے کے سربراہ ملک سراج الدین کی طرف سے لکھا گیا تھا حریت پیشہ ہندوستانی سپاہیوں کو اس امر کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ جو دیسی سپاہی انگریزوں سے بغاوت کر کے علاقہ تیراہ میں پناہ لینا چاہے گا۔ آفریدی اس کو پورا تحفظ فراہم کریں گے۔ سواروں نے وہ دونوں خط اور دونوں قاصد اپنے کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کر دیئے۔ ملک سراج الدین آفریدی سے برطانوی حکومت نے جواب طلبی کی۔ تو اس نے تسلیم کر لیا۔ کہ خط اسی نے بھیجے تھے۔ لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس طرح جو ہندوستانی سپاہی تیراہ میں آئے اسے گرفتار کر کے انگریزوں کے سپرد کر دے گا اور انعام پائے گا۔ ۲۷ جولائی کو دہلی میں صورتِ حال مزید نازک ہو گئی تو انگریزوں نے جو تھی رجمنٹ کو بھی دلی روانہ کر دیا جس پر پشاور کی فوجی نفری میں کافی کمی آ گئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مزید بھرتی کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے ان واقعات کے دوران انگریزوں نے اپنی سرحدی پالیسی کافی

نرم کر دی تاکہ قبائل کی طرف سے مخالفت ہونے نہ پائے ۔

اُس سال عید قربان یکم اگست کو پڑتی تھی ۔ لیکن اس سے پہلے ہی یہ افواہ عام ہوگئی کہ انگریز دریائے سندھ کا سارا مغربی علاقہ امیر کابل کے حوالے کر کے خود پوری طاقت کے ساتھ دہلی پر یلغار کے لئے جا رہے ہیں ۔ اس پر ہر جگہ سخت بے اطمینانی پھیل گئی ۔ اور خدشہ ہو گیا کہ عید قربان پر کوئی نہ کوئی فساد ضرور کھڑا ہوگا ۔ تاہم احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہ خطرہ ٹل گیا ۔ ۱۵ اگست کو البتہ درۂ خیبر میں ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی ۔ کنڑ کے حکمران سید خاندان کا ایک فرد سید امیر شاہ جو اپنے علم و فضل اور زہد و تقدس کی بدولت بڑی شہرت کا مالک تھا اور تھوڑا عرصہ پہلے ہی حج بیت اللہ اور ممالکِ اسلامیہ کے مقدس مقامات کی زیارت کر کے وطن آیا تھا ۔ درۂ خیبر میں نمودار ہوا ۔

جب اس نے انگریزوں کے مظالم کی داستان سُنی تو اُن کے خلاف عَلَمِ جہاد بلند کیا ۔ گرگُری کے مقام پر سبز پرچم گاڑ کر اس نے اصلاح و تبلیغ کی مہم شروع کر دی ۔ اس پر انگریز کمشنر نے آدمی بھیج کر کُکی خیل آفریدیوں کو بُلا کر انہیں انعام و اکرام سے نوازا ۔ اور وعدہ لے لیا کہ پانچ دن کے اندر وہ سید امیر شاہ کو اپنے علاقے سے نکال دیں گے ۔

سید صاحب نے مختلف ہندوستانی پلٹنوں کے مسلمانوں کو خط ارسال کئے اور اُن پر زور دیا کہ اپنے دین کے تحفظ اور اپنے ملک کی آزادی کی خاطر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیں ورنہ اللہ کے نزدیک قابلِ مواخذہ ہوں گے ۔

کُکی خیل آفریدیوں نے اُنہیں اپنے علاقے سے نکالا تو وہ مچنی کے مہمندوں کے پاس گئے ۔ چند ہی روز میں سینکڑوں مجاہدان کے گرد جمع ہو گئے ۔ مچنی قبیلہ پہلے بھی انگریز سے بھرا بیٹھا تھا ۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو انگریز نے ان لوگوں کا داخلہ حدود پشاور میں ممنوع قرار دے رکھا تھا اور دوسرے اُن کا مواجب بند کر دیا تھا ۔ انہوں نے پشاور کی دیسی پلٹنوں کو نہ صرف جہاد پر اکسایا بلکہ اسلحہ بھی مہیا کیا ۔ جب انگریز حکام کو معلوم ہوا کہ ان سپاہیوں کو جنہیں انہوں نے غیر مسلح کر رکھا ہے ۔ پھر سے اسلحہ ہاتھ لگ گیا ہے ۔ تو فوراً سپاہیوں کی تلاشی شروع کر دی گئی ۔

قربانی کی شاندار مثال ۲۸ اگست کو جنرل کاٹن نے سب غیر مسلح دیسی سپاہیوں کو اپنے اپنے خیموں میں جانے کا حکم دیا ۔ جب وہ سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے ۔

تو گورا پلٹنوں اور نئے بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ بیک وقت پرانے سپاہیوں کی تلاشی لینا شروع کر دیں۔ سپاہیوں کو اس پر تحقیر سلوک پر بڑا غصہ آیا۔ یہ بجا ہے کہ انہوں نے اسلحہ حاصل کیا تھا لیکن وہ اسلحہ صرف اپنے بچاؤ اور عزتِ نفس کے تحفظ کے لئے تھا کیونکہ وہ اس سے پہلے غیر مسلح کئے جانے والے ہندوستانی سپاہیوں کا حشر دیکھ چکے تھے۔ دوسری یہ بات بھی بڑی توہین آمیز تھی۔ کہ پرانے اور آزمودہ کار کارکنوں کی تلاشی جمعہ جمعہ آٹھ دن کے بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کے ہاتھوں ہو۔

چنانچہ اس رجمنٹ کے جوانوں کے ایک دستے نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور اپنی رجمنٹ کے اسلحہ خانہ پر ہلہ بول دیا۔ رنگروٹوں اور گورا سپاہیوں نے اُن پر قابو پانا چاہا لیکن ان کی پیش نہ گئی۔ اسلحہ ہاتھ آنے پر آزمودہ کار سپاہیوں نے آفریدی اور ڈیرہ جاتی رنگروٹوں کو خوب سبق سکھایا۔ تاہم وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو مزید کمک پہنچ جانے کی صورت میں وہ مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو جمرود کے قبائلی علاقہ میں پہنچ جائیں۔ اور پھر وہاں سے جدھر سینگ سمائیں۔ چلے جائیں۔ کمال جواں مردی سے یہ لوگ لڑتے بھڑتے پشاور چھاؤنی سے روانہ ہو کر جمرود جا پہنچے۔ جنرل کاٹن نے تمام اہم ناکوں پر پورے حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔ اور ہر فوجی اور سول افسر کو اس بات کی تربیت دی جا چکی تھی کہ خطرے کی صورت میں ہر جگہ سے بیک وقت کارروائی شروع کر دی جائے۔ چنانچہ پشاور چھاؤنی میں خطرے کا الارم بجتے ہی انگریزی فوج اور پولیس کے ہزاروں سپاہی اپنے اپنے افسروں کی کمان میں اُن حریت پرور سپاہیوں کے تعاقب میں نکل پڑے۔ وہ شیر دل بھی زندگی سے ہاتھ دھوئے ہوئے تھے۔ کمال بہادری سے ہر حملے کو روکتے ہوئے جمرود کی جانب بڑھنے لگے۔

ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دے دی۔ انہیں موت قبول تھی لیکن دشمنوں کے ہاتھ گرفتاری منظور نہ تھی۔ چنانچہ ۱۷۸ مجاہدوں میں سے صرف ساٹھ ستر سپاہی جمرود پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ باقی سب نے لڑتے لڑتے شہادت قبول کی۔ چند سپاہی جنہیں زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ فوجی عدالتوں میں پیش کئے گئے اور انہیں اس بُری طرح اذیت دی گئی کہ کافی عرصے تک کسی ہندوستانی سپاہی کو انگریزوں کے سامنے سر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔

مہمندوں کا جہاد

اس واقع کے کوئی دو ہفتے بعد سید امیر شاہ نے ۵۱ ویں دیسی پلٹن سے بھاگے ہوئے پچاس ساٹھ ہندوستانی سپاہیوں اور مہمند مجاہدوں کی ایک جماعت لے کر مچنی کے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس وقت مچنی "قلات غزنی" رجمنٹ کا ایک ہندوستانی دستہ تعین تھا۔ انگریز کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں وہ لوگ متحد ہو کر مجاہدین سے نہ مل جائیں۔ اس لیے فی الفور آفریدی سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج قلعہ میں پہنچائی گئی۔

تاہم ۵۱ ویں دیسی رجمنٹ کے سپاہی بڑے تجربہ کار اور گھاگ تھے۔ ان کے سامنے آفریدی رنگروٹ دم نہ مار سکے۔

اُدھر مہمندوں میں بھی بڑا جوش و خروش تھا۔ جب حالات نازک ہو گئے تو انگریز کمشنر ایبٹ نے پھر سیاسی حربے استعمال کئے۔ اس نے دم دلاسہ دے کر مہمند ملکوں کو بُلا بھیجا۔ اور مخالفت کی وجہ دریافت کی۔ مہمند سرداروں نے نہایت صاف گوئی سے کہہ دیا کہ وہ سب کچھ انتقاماً کر رہے ہیں۔ کہ انگریزوں نے اُن پر اپنی حدود میں داخلہ بند کر رکھا ہے اور مواجب کی ادائیگی روک دی ہے اس پر کمشنر نے مواجب کی رقم فوراً ادا کر دی۔ اور سرکاری علاقے میں مہمندوں کے داخلے سے بھی پابندی اٹھالی۔ تاہم اس کے بدلے میں مہمند سرداروں سے یہ وعدہ لیا کہ وہ سید امیر شاہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اور ہندوستانی (پوربی) سپاہیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں گے۔ اس طرح انگریز نے نہایت مکاری سے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کو اس جہاد سے دور رکھا۔ ورنہ صورتِ حال اس کے قابو سے باہر ہو جاتی۔

انگریز کی کامیابی اور تحریک جہاد کی ناکامی کے کئی اسباب تھے۔ انگریز پوری طرح منظم تھے۔ اور زمانہ حاضرہ کے تمام وسائل ان کے پاس موجود تھے۔ انگریز کی آمد سے قبل صوبہ سرحد کے لوگ سکھوں کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے۔ لہٰذا وہ انگریز سے تعاون کرنے پر تیار ہو گئے۔

نصف صدی تک سکھوں، بارک زئی سرداروں اور اُن کے مالیہ وصول کرنے والے اجارہ داروں نے سرحدی عوام پر وہ لوٹ کھسوٹ روا رکھی تھی کہ ملک بھر میں قحط سالی اور ناداری سائے ڈالے ہوئے تھی۔ بھوکے لوگ، مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق معمولی لالچ اور معمولی تنخواہ پر انگریز کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ سرحدی عوام اس وقت تک باہمی خانہ جنگیوں اور "تربور دلی" میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں قومیت

کا شعور بیدار ہی نہیں ہوا تھا۔ ہر شخص اور ہر قبیلہ صرف اپنے مفاد سے واسطہ رکھتا تھا۔ قومی ہمدردی کا احساس پیدا ہونے ہی نہ پایا تھا۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے عوام قبائلی وحدتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کوئی مشترکہ مقصد اور مفاد اُن کے پیشِ نظر نہ تھا۔ وہ اپنے علماء اور قبائلی سربراہوں سے اندھی عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ انگریز سے مرعوب اور خائف تھے۔ پٹھان اسلام کے شیدائی ہیں۔ اور "جہاد" اور "غزا" کے نام پر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ لیکن ان قربانیوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ تبھی برآمد ہو سکتا ہے جب قیادت مخلص ہو۔ ایڈورڈز نے خود تسلیم کیا ہے کہ "اگر سوات میں شرعی حکومت ہوتی اور جنگجو قبائل کا سربراہ سیّد اکبر شاہ زندہ ہوتا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔"

جہاں ایک طرف مسلمان مخلص قیادت سے محروم تھے وہیں صوبہ سرحد میں ایسے تجربہ کار فعال اور مدبر انگریز افسر متعین تھے جنہیں سرحدی سیاست سے پوری طرح آگاہی تھی۔ ہربرٹ ایڈورڈز، ہیری لمسڈن، جان نکلسن۔ سڈنی کاٹن۔ جان لارنس اور نیول چیمبرلین سرحدی عوام کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ اس بلاخیز طوفان میں بھی فرنگی حکومت کی کشتی کو سلامتی سے کنارے پر پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک وہ وقت تھا جب چیف کمشنر لارنس مایوس ہو کر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ صوبہ سرحد کو افغان حکومت کے حوالہ کر کے خود تسخیر دہلی پر ساری توجہ مرکوز کر دے۔ اور یا یہ حال کہ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی انگریز کے ہاتھ لگا۔ تو شہر کے لوگ مسٹر ہربرٹ ایڈورڈز کی رہائش گاہ پر جوق در جوق اکٹھے ہو کر مبارک دینے حاضر ہوئے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے نمٹنے کے لئے انگریز نے پشاور اور دوسرے سرحدی اضلاع سے ۵۶۶۷ جوانوں کو برطانوی فوج میں بھرتی کیا۔ نکلسن، لمسڈن اور دوسرے افسروں نے دن رات ایک کر کے اُن کو تربیت دی۔ اور پھر اُن میں سے اکثر کو دہلی کی انگریزی فوج سے تعاون کرنے بھیج دیا۔ انگریز کی بے پناہ بہادری اور استقلال کے مقابلے میں ملکی عوام اور دیسی سپاہیوں نے بھی قربانی کا کم تر مظاہرہ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے جو مظالم فرنگی حکمرانوں کے ہاتھوں برداشت کئے۔ ان کی فہرست بڑی طویل اور حد درجہ رنجیدہ ہے۔ اور تو اور صرف صوبہ سرحد میں کمشنر ایڈورڈز کے بیان کے مطابق ۵۲۳ ہندوستانی سپاہیوں کو "بغاوت" اور "سرکشی" کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔ ان میں سے بتیس کو پھانسی

دی گئی ۔ چالیس کو توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا ۔ اور باقی ماندہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ۔ ایک اندازے کے مطابق ہر انگریز کے عوض ایک ہزار ہندوستانی مارے گئے ۔ یہ تعداد صرف حریت پسند فوجیوں کی ہے ۔ شہری لوگ بچارے کس شمار میں ہیں ۔ ہزاروں ایسے ہیں جنہیں جرمِ آزادی کی پاداش میں موت کی نیند سُلا دیا گیا ۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے اور جائدادیں ضبط کر لی گئیں ۔ ان ایثار پیشہ ۔ محبِ الوطن اور غیور شہریوں کے برعکس ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس نے اس مرحلہ پر بھی خود غرضی ، مفاد پرستی اور ذاتی منفعت کی ذلیل ترین مثالیں پیش کیں اور چاندی کے چند سکّوں ۔ جاگیروں ۔ عہدوں اور سندوں کے لالچ میں قوم فروشی اور ابن الوقتی کا ثبوت دیا ۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی "وطن فروشوں" کے اس گروہ کا کوئی محاسبہ ہوا ۔ نہ ہی مجاہدینِ آزادی اور حریت پرور ، جان نثاروں کی کوئی فہرست سامنے آئی ۔ اُن کی قربانیاں فراموش کر دی گئیں ۔ اور آزادیٔ وطن کے لئے اُن کی گراں مایہ کوششیں ماضی کا افسانہ بن کر رہ گئیں ۔

ایک بہت بڑا ظلم یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے حریت پسندوں کے عظیم کارناموں کے بارے میں تمام حقائق مسخ ہو گئے ۔ انگریزوں نے اپنے دور میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی پر کچھ لکھنا جرم قرار دے دیا ۔ چنانچہ سادر کر کی کتاب جو جنگِ آزادی کے صحیح واقعات کی آئینہ دار تھی ۔ حکومت نے ضبط کر لیا ۔ لے دے کے انگریز افسروں اور سیاست دانوں کی تحریریں رہ گئیں ۔ جن میں سے اکثر میں تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا گیا ہے ۔ اور جنگِ آزادی کو "غدر" کا نام دے کر دنیا کو دھوکا دیا گیا ہے ..... البتہ کسی کسی انگریز اہلِ قلم کی تحریروں میں کہیں کہیں حقیقت کی جھلکیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں ۔ اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انگریز کو جو کچھ کاٹنا پڑا ۔ وہ اس کا اپنا ہی بویا ہوا تھا ۔ نفرت کے جو کانٹے انہوں نے بکھیرے تھے ۔ اُن سے اُن کے اپنے دامن بھی تار تار ہوئے ۔ اور دوسروں کے پاؤں بھی زخمی ہوئے بغیر نہ رہے ۔ ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب میں پیش گوئی کی تھی کہ "وقت آئے گا ۔ جب لوگ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ جن واقعات کو "غدر" اور "بغاوت" قرار دیا جا رہا ہے ۔ وہ اصل میں حصولِ آزادی کی جدوجہد کا آغاز اور پیش خیمہ ہیں ۔"

۱۹۵۷ء میں جنگِ آزادی کی سو سالہ یاد منائی گئی ۔ تو کچھ اچھی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں ۔ جو ملّتِ پاکستان کیلئے درسِ عبرت ہیں ۔ اور اسے لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہیں ۔

اصل میں مؤرخ کا کام واقعات کا صحیح اظہار ہے؛ ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا یا نہ کرنا قوم کا کام ہے۔

ہزارہ بتایا جا چکا ہے کہ سردار چھاؤنی سے انگریز کی ملازمت پر لات مار کر آزادی پسندوں کا ساتھ دینے والے ہندوستانی فوجی پہلے بونیر کی سرحد پر سید مبارک شاہ اور مجاہدین کے ساتھ مل کر انگریزی استعمار کے خلاف سینہ سپر تھے۔ لیکن بعد میں اخون صاحب اور اہلِ سوات کے دباؤ کے تحت انہیں دریائے سندھ کے مشرق میں ہزارہ کی بالائی وادیوں کو اپنا مسکن بنانا پڑا۔ ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر (BEECHES) نے اپنی رپورٹ میں سوات سے کاغان اور کشمیر کا رُخ کرنے والے اُن مجاہدین کی رُوداد یوں بیان کی ہے۔ کہ ۲۳ر جون (۱۸۵۷ء) کو وادیٔ کوش کے ایک رئیس ملک محمد خان نے ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو ایک خط میں لکھا کہ فوج سے بھاگ کر آئے ہوئے چھ سو ہندوستانی سپاہی پروانۂ راہداری کے خواہاں ہیں یہ لوگ الائی کے جرگہ اور مشر جمال خان کے گاؤں میں ایک ندی کے پاس مقیم ہیں۔ اس سے قبل جمال خان بھی ان بھگوڑے سپاہیوں کی آمد کی اطلاع ڈپٹی کمشنر کو دے چکا تھا۔ اس اطلاع کے ملتے ہی پروانہ راہداری دینے کی بجائے ڈپٹی کمشنر بیچر نے اُن مجاہدوں کے خلاف ایک فوجی مہم بھیج دی۔ جاسوس اسے اطلاع دے چکے تھے۔ کہ اُن حریت پسندوں کے پاس بندوقیں تو ضرور ہیں لیکن پیٹ بھرنے کو نہ خوراک ہے نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ بیچر کو اُن کی اس بے بسی اور بے سروسامانی پر بھی رحم نہ آیا۔ بلکہ اس نے مختلف حیلوں اور طریقوں سے ان مجاہدینِ آزادی کو گھیرے میں لے لیا۔ اپنے آپ کو محصور دیکھ کر اُن سپاہیوں کے جمعدار نے انہیں رائے دی کہ بے مقصد پھرنے اور بھوک پیاس سے بِلک بِلک کر مرنے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم انگریز سے لڑتے لڑتے اپنی جانیں دے دیں۔ تاہم سپاہیوں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ جمعدار نے اس نافرمانی کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے خودکشی کر لی۔

۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو یہ لوگ اس ندی کے کنارے مقیم تھے۔ جو زیرین کاغان میں جھیل "لولوسر" سے کچھ دور بسال کے قریب دریائے کنہار میں جا ملتی ہے۔ اس ندی کو اب بھی اُن ہندوستانی سپاہیوں کی یاد میں "پوربی کھٹہ" کہا جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس وقت انگریز اپنی مصیبت میں گرفتار تھا۔ ایبٹ آباد سے ساری فوج دہلی جا

چکی تھی۔ کل ۳۴۱ سپاہی باقی تھے۔ اگر ہزارہ کے مقامی رئیس اور عوام ان کا ساتھ دیتے تو ایبٹ آباد اور ہزارہ کے دوسرے مقامات پہ مجاہدین کا قبضہ ہونا مشکل نہ تھا۔ لیکن لوگ بالکل بے خبر تھے وہ الٹا ان حریت پسندوں کے خلاف سرگرم کار تھے جو پوربی سپاہی سامانِ خوراک حاصل کرنے کسی گاؤں جاتا۔ اُسے فوراً پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیا جاتا۔ ۴۵ کو گرفتار کر کے بالاکوٹ لے جایا گیا۔ باقی یا تو جنگ میں لڑتے لڑتے مارے گئے۔ یا زخمی ہو کر قید ہو گئے۔ قیدیوں میں سے تیرہ ۱۳ کو شنکیاری لایا گیا۔ اور ایک اُونچے ٹیلے پہ انہیں پھانسی دے دی گئی۔ مرنے سے پیشتر اُن کی صرف ایک درخواست تھی کہ پھانسی کی بجائے انہیں توپ سے اُڑیا جائے۔ لیکن ان کی اس خواہش کا بھی احترام نہ کیا گیا۔

جو فوجی انگریزی دستوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ جھیل لولوسر کے پاس گوری نالہ کے مقام پہ پہنچے۔ لیکن مقامی لوگوں نے انہیں وہاں بھی آرام نہ لینے دیا۔ اُن پہ حملہ کر دیا۔ کچھ مارے گئے۔ باقی سب کو گرفتار کر کے ہزارہ کے مختلف مقامات پہ پھانسی دے دی گئی۔

تھوڑے تھوڑے آزادی پسندوں کو مختلف جگہوں پہ لے جا کر پھانسی دینے کا مقصد یہ تھا کہ ہر جگہ کے لوگ اُن سے عبرت حاصل کرتے ہوئے دبے رہیں۔ اور انگریزوں کے خلاف سر نہ اٹھائیں۔

۴۵ ہندوستانی فوجی جو کسی طرح کاغان سے جان بچا کر حدودِ کشمیر میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں مہاراجہ کشمیر کے آدمیوں نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اُن کا جو حشر ہوا ہو گا۔ ظاہر ہی ہے۔ یہ ہے مردان چھاؤنی کی ۵۵ ویں دیسی رجمنٹ کی داستان خونچکاں!

ڈیرہ اسماعیل خان

ہزارہ کے اس واقع کی ذمہ داری مقامی لوگوں پہ ڈالنا اس لئے مشکل ہے کہ اس دور میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا پختہ نہ تھا۔ مسلمان حکمرانوں۔ رئیسوں اور مذہبی راہنماؤں نے اُن کی ملی حس کو کبھی بیدار کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ یہ لوگ اُلٹا اپنی جاگیریں اور گدیوں کے بچاؤ کی فکر میں تھے۔ اس لئے ہر ابھرتی ہوئی طاقت کا ساتھ دینے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے قریباً دو سو جاگیرداروں نے بڑھ چڑھ کر انگریزوں کی مدد کی۔ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اپنے ہی بھائیوں کا دامن کھینچتے رہے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے جاگیرداروں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ ۱۸۴۸ء میں ملتان میں انگریزوں پہ آن پڑی تو ڈیرہ کے نواب نوجدار خان علی زئی نے ایڈورڈز کا پورا ساتھ دیا۔ اس کے لئے لشکر فراہم کیا۔

یہ ڈیرہ جات کے ملتانی پٹھان ہی تھے جن کی مدد سے انگریزوں نے دیوان مولراج کو شکست دے کر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ ان خدمات کے اعتراف میں انہیں ہزاروں کی مستقل جاگیر چار ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ اور دوسری مراعات عطا ہوئیں۔

۱۸۵۷ء میں بھی انہوں نے فرنگی حکمرانوں کو ہر ممکن تحفظ فراہم کیا۔ ڈیرہ اور بنوں میں صرف ملیشیا فوج کے دستے متعین تھے۔ دیسی یا پوربی سپاہیوں پر مشتمل باقاعدہ فوج نہ تھی۔ اس لئے انگریز مطمئن رہے۔ مقامی لوگ اپنے خانوں اور نوابوں کے زیر اثر تھے۔ وہ بھی سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی استعمار کی بنیادیں صوبہ سرحد اور دوسرے علاقوں میں مضبوط ہوتی چلی گئیں۔ ۱۸۵۷ء میں علی زئی نوابوں کو امیر افغانستان کے پاس بھیجا گیا تاکہ اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر امیر کو باغیوں کا ساتھ دینے سے روکیں۔ واقعتاً امیر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اور اس نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں پائی جانے والی بے چینی سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھایا۔

ان خدمات کے صلے میں نواب ڈیرہ کو سند عطا ہوئی۔ جاگیر مستقل کر دی گئی۔ اور ان کے لئے تاحیات پنشن مقرر کر دی گئی۔

سیلاب ۱۸۵۷ء کی جنگ کا طوفان ابھی تھمنے نہ پایا تھا کہ ۲۶ اگست ۱۸۵۷ء کو دریائے سندھ میں تباہ کن طغیانی آگئی۔ بتایا جاتا ہے کہ شمالی علاقے میں دریا کے منبع کے قریب کوئی گلیشیر (برفانی) تودہ دریا میں آن گرا تھا۔ جس کی وجہ سے پانی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

ایک رات پہلے ایک مہیب شور سنائی دیا۔ اغلباً یہ گلیشیر کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ گلیشیر کے ٹوٹتے ہی پانی کا ریلہ انتہائی تیز رفتاری سے آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اس موقع پر دریائے سندھ (اباسین) کی سطح اتنی بلند ہو گئی کہ اس نے دریائے کابل کا پانی قبول کرنا چھوڑ دیا۔ بلکہ سطح آب بلند ہونے کے ساتھ ہی دریائے سندھ کا پانی دریائے کابل (لنڈے) میں داخل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یہ دریا الٹا بہنے لگا۔ نوشہرہ کلاں اور دریا کے کنارے کے دوسرے دیہات اور آبادیاں زیر آب آگئیں۔ ہزاروں لوگ اور مویشی مارے گئے اور خیر آباد۔ جہانگیرہ اور نوشہرہ میں سکھوں کے بنائے ہوئے قلعے بھی پیوند زمین ہو گئے۔

جہادِ مبیلہ ۱۸۶۳ء

۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں کی کامیابی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ ۸ جولائی کو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اعلان کیا کہ ملک بھر میں امن بحال ہو گیا ہے اور اب کسی جگہ بھی کسی طرح کی کوئی شورش نہیں۔

یکم نومبر ۱۸۵۹ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ کر دیا گیا اور تمام اختیارات برطانوی حکومت نے خود سنبھال لئے۔ الٰہ آباد میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں "قیصرۂ ہند" کا یہ اعلان سنایا گیا۔ اس اعلان میں رعیت کے تمام طبقوں کے ساتھ بلا امتیاز مذہب و ملت مساوی سلوک کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ اور سرکاری ملازمت کا دروازہ سب کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ یہی وہ دن تھا جس سے حصولِ آزادی کے لئے جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ عوام نے آئینی طریقوں پر بھی عملدرآمد شروع کر دیا۔ اور اس طرح ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔

اہلِ ہند آزادی کے حصول میں ناکام رہے تھے۔ تاہم اُن کے حوصلے بلند تھے۔ انہوں نے اس کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی۔ بلکہ جنگ کے بعد انگریز نے نہتے عوام سے جس بھونڈے پن سے انتقام لیا۔ اس سے فرنگی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اور شدت اختیار کر گیا اور ہندوستانی عوام نے حصولِ آزادی کی کوششیں تیز تر کر دیں۔ جنگ کی آگ سرد پڑ جانے کے بعد گورا سپاہی راہ چلتے لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔ دیہات کو آگ لگا دیتے۔ اور ذرا ذرا سی بات پر مخالفوں کو پھانسی پر چڑھا دیتے۔ جنگ کے دوران سات ہزار انگریز مارے گئے تھے اس کے برعکس برصغیر کے پانچ لاکھ لوگ انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بن کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

جنگِ آزادی میں ہماری ناکامی کے بہت سے اسباب تھے۔ لیکن اس کا بڑا سبب پاک و ہند کا زوال پذیر معاشرہ اور قومی کردار کی پستی تھی۔ ظاہر ہے کہ قومی کردار کی تعمیر کے بغیر عظمت و سرفرازی کی منزل تک پہنچنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

سرحدی پالیسی اگرچہ انگریز نے جنگ جیت لی تھی تاہم صوبہ سرحد کے متعلق اس کی تشویش میں کوئی کمی آنے نہ پائی تھی۔

۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک سارے سرحدی علاقوں میں "انگریز دشمنی" کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جسے دبانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ سینکڑوں گورا سپاہی مارے گئے تھے۔ اور ہزاروں بیمار یا زخمی ہو کر بددل ہو چکے تھے۔ لاکھوں روپے کی رقم سرحدی مہموں کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں آمدن کا یہ حال تھا۔ کہ اکثر لوگ مالیہ تک ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے۔

چیف کمشنر سر جان لارنس اپنے وسیع تلخ تجربات کی بناء پر اسی نتیجہ پر پہنچا تھا کہ سرحد سے مکمل دستبرداری ہی فرنگی کے حق میں سب سے مفید اقدام ہے۔ ۱۸۵۸ء اور ۱۸۵۹ء میں وہ کئی بار برطانوی حکومت کو لکھ چکا تھا کہ جیسے بھی ہو۔ سرحدی علاقے امیر دوست محمد خان کے حوالے کر کے انگریز اپنی گلو خلاصی کرائے۔ اس نے وزیر اعظم برطانیہ پر واضح کر دیا تھا کہ ہر انگریز کی جان سرحدی علاقوں میں مستقل خطرے میں ہے۔ آدھے سے زیادہ گورا سپاہی زخمی یا بیمار ہو کر ہسپتالوں میں پڑے ہیں۔ پچھتر لاکھ روپیہ سالانہ کا خرچ کر کے بھی فرنگی حکومت کو یہاں سے کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ چیف کمشنر نے یہاں تک لکھ دیا تھا کہ صوبہ سرحد سے دستبردار ہو جانے کی صورت میں افغانستان یا روس سے کسی براہِ راست جھڑپ کا خدشہ بھی نہیں رہے گا۔ سر جان لارنس جانتا تھا کہ اس کے بعض سیاسی حریف سرحد سے اس دستبرداری کو برطانوی پالیسی کی کمزوری قرار دیں گے۔ تاہم اس کا کہنا تھا کہ اخلاقی جرأت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیا جائے۔

بعد ازاں ایک موقع پر جب میجر لمسڈن نے اپنی حکومت کو کرم اور خوست پر قبضہ کر لینے کا مشورہ دیا تو جان لارنس نے اس کی تجویز کو یکسر مسترد کرتے ہوئے لکھا کہ "پٹھان غربت و افلاس اور زندگی کی ہر سختی برداشت کرے گا۔ لیکن کسی غیر کی غلامی ہرگز قبول نہ کرے گا"۔

قبائلی علاقوں اور افغانستان کی طرف پیش قدمی کے بارے میں اس نے رائے دی کہ "پٹھان ہمیں

پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے علاقے میں وہ ہماری شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں۔"

تاہم برطانوی حکومت نے سرجان لارنس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ اور صوبہ سرحد سے دستبرداری کو اپنے وقار کے خلاف سمجھتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے اس پر اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کا فیصلہ کیا۔ مختلف سرکردہ حکام سے اس سلسلے میں رائے طلب کی گئی۔ تو سر ہنری ڈیورینڈ نے جسے سرحدی معاملات کا وسیع تجربہ تھا۔ یہ مشورہ دیا کہ ریلوے کے نظام کو فوری طور پر صوبہ سرحد کے تمام مرکزوں تک پہنچانے میں کوئی تاخیر نہ کی جائے۔

۱۸۵۸ء دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے میں صوبہ سرحد میں متعین انگریزی فوج کے دستوں نے شاندار کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ بالخصوص مردان کے انگریزی رسالہ "گائیڈز" اور ڈیرہ جات سے بھرتی ہونے والے ملتانی پٹھانوں اور ملیشیا کے آفریدی جوانوں نے حیرت انگیز مستعدی، فرض شناسی اور کارگزاری ظاہر کی تھی۔ بہت سے انگریز مصنفوں کے نزدیک دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کا سہرا سرجان نکلسن اور اس کے سرحدی فوجیوں ہی کے سر تھا۔

یہی وجہ ہے کہ سارے برطانوی مقبوضات کے اخباروں نے اس فوجی دستے کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انہیں تمغوں اور اعزازات سے نوازا گیا۔ اور ان کی بڑی قدر افزائی اور پذیرائی ہوئی۔

۱۸۵۸ء میں جب یہ فوجی دہلی سے پشاور پہنچے تو ان کا بہت بڑے پیمانے پر استقبال کیا گیا۔

میجر جنرل سڈنی کاٹن نے تمام فوجوں کو سڑک کے دو رویہ کھڑے ہو کر ان جوانوں کو خوش آمدید کہنے کی ہدایت کی۔ توپ خانہ نے انہیں شاہی سلامی دی۔ پیدل اور سوار فوج کے ہر دستے نے ان کی سلامی اتاری۔ پھر سب بینڈ باجے کے ساتھ مارچنگ کرتے اور فتح کا پرچم لہراتے پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہوئے تو جنرل کاٹن نے سب کے سامنے ان جانبازوں کو انتہائی شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

جب یہ لوگ دہلی روانہ ہوئے تھے تو ان کی تعداد چھ سو تھی۔ جب واپس آئے تو ان میں ۳۵۰ ہلاک یا شدید زخمی ہو گئے۔ دہلی کے محاصرہ کے دوران اس فوج کے سب انگریز افسر یا تو ہلاک ہو گئے یا شدید زخمی ہوئے۔ کوئی گورا سپاہی یا افسر ایسا نہ تھا۔ جو دہلی کے معرکوں کے دوران کم سے کم دو بار زخمی نہ ہوا ہو۔ اس دستے کے کمانڈر نے کشمیری گیٹ دہلی میں اپنی جان نذر کر کے شہر کی فصیل کو توڑنے میں کامیابی

حاصل کی تھی ۔ تقریر کے خاتمے پر جرنیل نے تین بار "شُرا" (شاباش) بلند کیا۔ اکیس توپوں سے آنے والوں کی سلامی اتاری ۔ تمام سپاہیوں نے بندوقیں سر کر کے خراجِ عقیدت اُنہیں پیش کیا۔ اس کے بعد "فاتح" سپاہی سب سے آگے آگے مارچنگ کرتے ہوئے بارکوں میں چلے گئے ۔ جہاں کئی دن تک اُن کی ضیافتیں ہوتی رہیں ۔

جمعیّت مجاہدین ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی جمعیتِ مجاہدین نے "ستھانہ" کے کلیدی مقام پر اپنا مرکز قائم کر لیا تھا۔ اگرچہ بعض سرحدی قبائل بھی مجاہدین کے حامی تھے ۔ تاہم مجاہدین کو ملنے والی تمام مالی امداد اور سامان بہار، بنگال اور دوسرے ہندوستانی صوبوں سے آتی تھی ۔ ۱۸۵۷ء میں جب جنگ اور بدامنی کی وجہ سے تمام راستے مسدود ہو گئے ۔ اور امداد پہنچنے کا سلسلہ بند ہو گیا تو مجاہدوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ فاقہ کشی پر نوبت آگئی ۔ درختوں کی کونپلوں اور پتیوں پر اصحابِ صُفّہ کی سُنّت ادا ہونے لگی ۔ مسلسل کئی ماہ تک غلّے پر نظر تک نہ پڑی ۔ یہاں تک کہ احابتیں خون آلود ہونے لگیں ۔

یہی لیل و نہار تھے ۔ کہ ہندوستان میں حالات پر قابو پاتے ہی جنرل سر سڈنی کاٹن نے سب سے پہلے مجاہدین کی سرکوبی کی طرف توجہ دی ۔ اصل میں انگریز اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جب تک سرحدِ آزاد پر مجاہدین کا کیمپ قائم رہے گا اور اُن کے مبلّغ سرحدی عوام میں تبلیغِ جہاد کرتے رہیں گے ۔ انگریز کے لئے ان علاقوں پر قابو پانا ناممکن ہو گا۔ اُدھر مجاہدین انتہائی بے سروسامانی کے باوجود غلامی سے نجات پانے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے اور موقعہ ملنے پر انگریزی اقتدار پر کاری ضرب لگاتے رہتے تھے ۔ انگریز اس سے قبل نارنجی میں مجاہدین پر فوج کشی کر چکے تھے ۔ تاہم مجاہدین کے حوصلے بلند تھے ۔ اپریل کے اوائل میں مجاہدوں نے یوسف زئی کے علاقہ میں شیخ جانہ کے گاؤں پر چھاپہ مارا ۔ جہاں وہ انگریز اسسٹنٹ کمشنر پٹاوڈ ڈالے ہوا تھا ۔ جو مجاہدوں پر حملے کی ابتدائی تیاری کے سلسلے میں "سروے" کے کام پر متعین تھا۔ اس چھاپہ میں مجاہدین نے انگریزوں کو کافی نقصان پہنچایا ۔ چنانچہ اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لئے مجاہدین کے خلاف فوری فوجی مہم روانہ کی گئی ۔ جنرل سڈنی کاٹن چھ ہزار فوج لے کر موضع سلیم خان پہنچ گیا ۔ اور پوری تیاری کے بعد ۲۶ اپریل کو درۂ "داران" کی راہ مجاہدین کے مرکز جنگئی پر حملہ آور ہوا ۔ مجاہدین اس اچانک حملے کی تاب

نہ لا سکے۔ جس پر چنگلی کو تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ ایک بھی مکان سلامت نہ چھوڑا گیا۔ بہت سے مکانوں کی دیواریں ہاتھیوں سے مسمار کرا دی گئیں۔

جنرل کاٹن کا اس مہم سے اصل مقصد چملہ سے بونیر جانے والے دروں اور راستوں کا جائزہ لینا تھا۔ جس مقصد میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

نارنجی کی جنگ سے قبل مجاہدین اپنی قلتِ تعداد کے باعث زیادہ تر گوریلا طرز کی جنگ کا سہارا لینے پر مجبور تھے۔ چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو انہوں نے ٹوپی کے انگریزی کیمپ پر شب خون مارا تھا۔ جس میں دشمن کو کافی نقصان پہنچا اور اُس کے بہت سے فوجی مارے گئے۔ مجاہدین نے بھی اس موقع پر بڑی بہادری دکھائی اور ان کے ۷ جانباز مجیب الرحمٰن، حافظ پیر محمد، منشی محسن، قاضی خان محمد، نور خان اور حاجی عبدالرحمٰن نے شہادت کا اعزاز حاصل کیا۔ شیخ جانہ کے معرکے میں انگریزی فوج کے چالیس "بھگوڑا" سپاہی تھے اور ان کا سالار شفیع محمد تھا۔

نواں کلی پر شب خون مارنے والے دستے میں دو سو مجاہدین تھے اور ایک سو بیس سوار، یہ لوگ سالار مرزا محمد آفریدی کی کمان میں تھے۔ آفریدی جانباز نے انتہائی پامردی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ زخمی ہونے پر انگریز کے ہاتھوں قید ہوا تو اُسے پھانسی دے دی گئی۔

اب نارنجی کے معرکے میں انگریز فوج اور توپ خانے نے زیادہ سے زیادہ طاقت مجاہدین کے خلاف استعمال کی۔ چنگلی کو تباہ کرنے کے بعد انگریز کا ارادہ تھا کہ امیر المجاہدین مولوی عنایت علی کو زندہ گرفتار کر لیں۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح نکل کر ایک محفوظ مقام کو نکل گئے۔

انہی دنوں مولانا عنایت علی طویل بیماری اور مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے (اپریل ۱۸۵۸ء) وفات پا گئے۔ اُن کی شہادت کے بعد مجاہدین پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تاہم اللہ کے یہ سپاہی انتہائی ثابت قدمی سے کفار کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ مجاہدین کے سب سے بڑے سرحدی سرپرست سید اکبر شاہ آف ستھانہ ۱۱ مئی کو وفات پا چکے تھے۔ ان کی جگہ سید مبارک شاہ "بادشاہ" چنے گئے۔ لیکن انہیں سوات اور بونیر کے تمام قبائل کی حمایت حاصل نہ تھی۔ تاہم انہوں نے اور اُن کے خانوادہ نے آخر تک مجاہدین کا ساتھ دیا۔ بلکہ اسلام کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے تمام مشکلات برداشت کیں۔

چھوٹے چھوٹے معرکے سر کرنے کے بعد جنرل سڈنی کاٹن نے ستھانہ پر مکمل قبضے اور مجاہدین کے مکمل

خاتمے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر بیچر کو لکھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ فوج لے کر دریائے سندھ کے بائیں کنارے کی جانب سے بڑھے۔ اُدھر خود کاٹن اپنی فوج اور توپ خانے کو لے کر دریا کے دائیں کنارے کھیل میں فروکش ہوا۔ دونوں طرف سے دونوں فوجیں بیک وقت ستھانہ کی طرف بڑھیں اور چارمئی کو مجاہدین پر ٹوٹ پڑیں۔ مجاہدین نے اس موقع پر جس سرفروشانہ جذبۂ جہاد کا اظہار کیا۔ اس کی تعریف دشمن تک نے کی۔ ایک ایک مجاہد بندوق یا تلوار لئے میدان میں اُترتا۔ اور لڑتے لڑتے راہِ خدا میں جان دے دیتا۔ کسی ایک مجاہد نے بھی میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ پھیری۔ ساداتِ ستھانہ نے بھی مجاہدین کی سرپرستی کا وعدہ نبھایا۔ سید اکبر شاہ مرحوم کے بھائی سید عمر شاہ آخری سانس تک کفار سے جنگ کرتے رہے اور آخر شہادت پا گئے۔ خود بادشاہ مبارک شاہ بھی لڑتے لڑتے زخمی ہوئے۔ بے ہوش ہونے پر اُن کے جاں نثار انہیں میدانِ جنگ سے اٹھا کر کسی محفوظ مقام کو لے گئے۔ مجاہدین کا تاریخی قلعہ جہاں سے انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لشکر کو مار بھگایا تھا۔ اب انگریز جرنیل کے رحم و کرم پر تھا۔ فرنگیوں نے ستھانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مجاہدین کا سب سامان لوٹ لیا۔

خود سرکاری رپورٹوں میں مجاہدین کی سرفروشی کا منظر یوں بیان کیا گیا ہے کہ مجاہدین انگریزوں کے لشکر کے سامنے انتہائی اطمینان سے آتے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف و ہراس کی بجائے طمانیت جھلکتی تھی۔ انہوں نے سفید اُجلا لباس پہن رکھا تھا کہ انہیں یقین تھا وہی لباس شہادت کے بعد اُن کے کفن کا کام دے گا۔ چند سربرآوردہ مجاہدین البتہ مخمل کے چغے اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ شہادت پا کر جنت میں پہنچنے کے لئے مضطرب تھے۔"

جب بزعم خود انگریز مجاہدین کو بالکل ختم کر چکے تو خدوخیل اور گدون قبیلوں کی طرف متوجہ ہوئے انہوں نے اُن پر پورا فوجی دباؤ ڈالا۔ اور اُن سے ایک معاہدے پر پابند رہنے کو کہا جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی قبیلہ اب مجاہدین کو اپنے ہاں پناہ نہیں دے گا اور نہ ہی اُن کی کوئی مدد کرے گا۔ انگریز نے اپنی دانست میں مجاہدین کی قوت پاش پاش کر دی۔ اس علاقے سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اُتنا ہی یہ اُبھرے گا۔ جتنا کہ دبا دیں گے

مجاہدین پر توڑے گئے ظلم و ستم سے تمام نواحی قبائل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، اور وہ سب کے سب شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر انگریز کے خلاف میدانِ جہاد میں نکل آئے۔

وزیرستان ۱۸۵۲ء تک بہادر خیل کی نمک کی کانوں کے قریب خشک اور وزیری قبیلوں نے انگریز کی بھرپور مخالفت کی تھی اور اس سلسلے میں دونوں فریقوں میں کئی جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں۔

چند سال خاموشی سے گزر گئے۔ لیکن مسلمان قبائل کی فرنگ دشمنی کا جذبہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ نومبر ۱۸۵۹ء میں کابل خیل وزیریوں نے ایک انگریزی کیمپ پر ہلہ بول کر ایک انگریز افسر کو ہلاک کر دیا۔ اس پر بریگیڈیر جنرل چیمبرلین کو ایک فوجی مہم کے ساتھ وزیریوں کے خلاف بھیجا گیا۔ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو یہ فوج کوہاٹ چھاؤنی سے نکلی۔ ۲۰ر دسمبر کو دریائے کُرم کے دائیں کنارے پر پڑاؤ کیا۔ یہاں پر خبر ملی کہ انگریزی پڑاؤ بلند خیل سے کوئی آٹھ میل دور میدانی کے مقام پر وزیریوں نے مورچے سنبھال رکھے ہیں۔ ۲۱ر دسمبر کو انگریزوں نے توپ خانے کی مدد سے زبردست حملہ کر کے میدانی کی عقبی پہاڑیوں تک رسائی حاصل کر لی۔ چیمبرلین کی فوج بڑی تعداد میں تھی۔ جب کہ وزیری اس کے مقابل بہت ہی تھوڑے تھے۔ تاہم انگریز مؤرخ خود معترف ہیں کہ جس جانفروشی اور شجاعت کا مظاہرہ انہوں نے کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وزیریوں کے پاس تھوڑے سے گھڑ سوار تھے۔ یہ لوگ کبھی گھاٹیوں میں کود پڑتے۔ کبھی بے دریغ چٹانوں پر گھوڑے چڑھا دیتے۔ جدھر جاتے صفوں کی صفیں الٹ دیتے۔ صرف بارہ وزیریوں کے ایک دستے نے ایک چٹان کی آڑ لے کر کئی گھنٹے تک انگریزی فوج کی ایک پوری کمپنی کو روکے رکھا۔ اور انہیں ایسا سبق سکھایا، جو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے جب لڑتے لڑتے ان بارہ مجاہدوں کا گولی بارود ختم ہو گیا تو وہ پتھر برسانے لگے۔ یہ پتھر بھی توپ کے گولے سے کچھ کم نہ تھے۔ جس گورا سپاہی کو پتھر لگتا وہ سنبھلنے نہ پاتا۔

میدانی کو اپنے زعم میں فتح کرنے اور تاخت و تاراج کرنے کے بعد جنرل چیمبرلین کو اتنا حوصلہ بھی نہ ہوا کہ ایک رات تو وہاں گزارتا۔ فوراً اس نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ وہ جاتے جاتے غریب وزیریوں کا مال اور بھیڑ بکریاں ہانک کر لے گئے اور ان بچاروں کو اپنی رہی سہی پونجی سے بھی محروم کر دیا۔ ۲۴ر دسمبر

کو جنرل چیمبرلین بلند خیل سے دس میل کے فاصلے پر شیوہ میں کیمپ لگائے ہوئے تھا کہ قبائلی جرگہ ملاقات کو آیا۔ عارضی صلح کی شرائط طے ہوگئیں۔ چند دن تک مذاکرات ہوتے رہے۔ اس مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز انجینئروں نے علاقے کا سروے مکمل کر لیا۔ یہ کارنامہ انجام دے کر ۱۴ جنوری ۱۸۶۰ء کو چیمبرلین اپنے لاؤلشکر سمیت کوہاٹ چھاؤنی واپس پہنچ گیا۔

چیمبرلین کو اس جنگ سے اور قبائل کے خلاف دوسرے معرکوں سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ سرحدی سرفروشوں سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ امبیلہ میں جب اُسے کمان سپرد کی گئی تو پہلے پہل تو اُس نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جب حکومت کے دباؤ کے تحت امبیلہ جانا قبول کیا تو بھی بہت سی شرطیں منوا کر۔

محسود صوبہ سرحد میں وارد ہونے کے بعد جب انگریز کو محسود قبائل سے واسطہ پڑا تو وہ جان گئے کہ ان حریت پسندوں کو دبانا اُن کے بس کی بات نہیں۔ وزیر اور محسود بار بار انگریزی کیمپوں پہ دھاوے بولتے۔ انگریز افسروں کو پکڑ کر لے جاتے۔ سڑک پر ان کا گزرنا محال کر دیتے لیکن انگریز منہ دیکھتے رہ جاتے۔

۱۸۵۹ء کے آخر میں کابل خیل وزیریوں سے انگریزوں نے جھڑپ لی تو محسود نے بُرا منایا اور وہ انگریز سے بدلہ لینے کے لئے موقع کی تاک میں رہنے لگا۔ ۱۳ مارچ ۱۸۶۰ء کو خبر ملی کہ تین ہزار محسود سرباز ٹانک کے نواح میں جمع ہو چکے ہیں۔ اور ٹانک کے شہر پہ حملہ کرنے والے ہیں۔ نواب ٹانک نے قلعہ ٹانک کی انگریزی فوج کے کمانڈر رسالدار سعادت خان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس افسر نے اِدھر اُدھر کی چوکیوں سے سپاہی منگوا بھیجے۔ نواب ٹانک کے سواروں کو بھی ساتھ لیا۔ اور محسود لشکر کو روکنے ٹانک زام کی طرف چل دیا۔ وزیریوں نے انگریزی فوج کے سپاہیوں کو دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔

رسالدار سعادت خان چونکہ گھر کا بھیدی ہونے کی وجہ سے علاقے کے چپہ چپہ سے واقف تھا مصلحتاً پیچھے پیچھے ہٹتا گیا محسود لشکر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ جب محسود پہاڑوں سے نکل کر ٹانک شہر کے قریب پہنچے۔ تو رسالدار نے اپنے گھوڑے واپس کر کے اُن پر گھیرا ڈال دیا۔ اور پسپائی کا راستہ اُن پر بند کر دیا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ محسود محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ اس لئے انہیں بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔

انگریز افسروں کے مطابق محسود کے تین سو افراد مارے گئے جن میں اُن کا سربراہ اور پانچ دوسرے بڑے بڑے ملک بھی شامل تھے۔

جنرل چیمبرلین نے جب دیکھا کہ رسالدار نے محسود کی کمر توڑ دی ہے اور اب اُن پر مزید کاری ضرب لگانے کا اچھا موقع ہے۔ تو تمام انگریزی چھاؤنیوں سے بہت بڑی فوج جمع کر کے ۱۷ اپریل ۱۸۶۱ء کو علاقہ محسود پر ہلّہ بول دیا۔ محسود اب کے خبردار ہو چکے تھے۔ وہ دیہات خالی کر کے اُونچے پہاڑوں کو چلے گئے۔ ۲۶ اپریل کو جب انگریزی لشکر بڑھتے ہوئے پلوسین کی گھاٹی میں پہنچے تو دیکھا۔ کہ پتھروں سے درّے کو پاٹ دیا گیا ہے اور دونوں طرف پہاڑیوں پر محسود نے "سنگھڑ" (مورچے) قائم کر رکھے ہیں۔

اب کے انگریز گھیرے میں آ گئے۔ محسود نے اچانک پُرزور حملہ کیا۔ دو سو سے زیادہ فوجی ہلاک ہوئے۔ زخمی اور لاپتہ ہونے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ چار پانچ دن کے آرام کے بعد پھر چیمبرلین صاحب کو پیش قدمی کی سوجھی۔ اب کے ڈرہ براڑی میں گھر گئے۔ محسود دستے باری باری اُن پر حملے کرتے۔ پہاڑیوں سے پتھر برساتے اور فوجی سپاہیوں کو سخت نقصان پہنچاتے۔ بالآخر توپ خانہ سے اندھا دھند گولہ باری شروع کی گئی۔ محسود کے کئی سنگھڑ ٹوٹ کر گر گئے۔ وہ مورچے خالی کر کے پہاڑی کمین گاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں کے اب کے بھی دو ڈھائی سو سپاہی ہلاک ہوئے۔ اتنا نقصان اٹھانے کے بعد چیمبرلین نے شمالی راستہ اختیار کیا اور محسود علاقے کے مشہور مرکز کانی گرام تک گیا۔ کانی گرام سے منزل بمنزل انگریزی فوج بنوں کو نکل گئی۔ راستے کے سب دیہات فرنگیوں نے تباہ کر دیئے۔ فصلیں اجاڑ دیں۔ اور جو ہاتھ لگا۔ اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بالآخر علاقے کے معززین کی مداخلت پر جون ۱۸۶۱ء میں صلح کی شرائط طے پا گئیں۔ اس کے بعد انگریز ایسے ٹھنڈے ہوئے کہ ۲۰ ۔ ۲۲ سال تک محسود کے علاقے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جہادِ اُمبیلہ مغربی سامراج اسلام کا ازلی دشمن ہے۔ دُنیا بھر میں جہاں کہیں احیائے اسلام کی کوئی تحریک اٹھی۔ یہ سامراجی اُسے دبانے پر تُل گئے۔ ہندوستان آنے پر یوں نو مرہٹوں نے بھی انگریز حملہ آوروں کی مخالفت کی اور سکھوں اور گورکھوں نے بھی۔ انگریز اُن کے

خلاف لڑے بھی۔ تاہم انہوں نے زیادہ عرصہ تک اُن غیر مسلموں سے عناد نہ رکھا۔ لیکن جب مسلمانانِ ہند کی پہلی قومی اور اسلامی تحریک "جمعیت مجاہدین" میدانِ عمل میں اُتری تو فرنگی استبداد کی نیند حرام ہوگئی اور وہ ہر قیمت پر ان اللہ کے بندوں کو مٹانے پر کمربستہ ہوگیا۔

۱۸۵۷ء تک انگریز اپنے ہی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔

جب اُدھر سے قدرے فراغت ہوئی تو تحریک مجاہدین کے استیصال کیلئے منصوبہ بندی شروع ہوگئی۔ اس سے قبل کئی فوجی مہموں کے دوران انگریز مجاہدین کی طاقت کا جائزہ لے چکے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کی تعداد۔ مالی استعداد اور اسلحہ وغیرہ کے بارے میں بھی پوری معلومات جمع کرلی تھیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سید اکبر شاہ اور سید عمر شاہ کی شہادت اور سید مبارک شاہ کے زخمی ہونے اور ستھانہ کا مضبوط قلعہ اُن کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد مجاہدین میں پہلے سا دم خم نہیں رہا تھا۔

انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ستھانہ سے نکالے جانے کے بعد اپنے نئے مرکز بٹکا میں ابھی مجاہدین سنبھل کر بیٹھنے نہیں پائے تھے۔ اسلئے اُن پر ضرب لگانا پہلے کی نسبت آسان ہوگا۔ اس لئے گورنر جنرل ہندوستان، چیف کمشنر اور کمانڈر ان چیف سب کے سب مجاہدین کے خلاف ایک بہت بڑی فوجی مہم بھیجنے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ چونکہ انگریز مجاہدین کے ہاتھ دیکھے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اس فوجی مہم کی سربراہی کے لئے بھی کسی ایسے جرنیل کو منتخب کرنا چاہتے تھے۔ جو ہر اعتبار سے اس کٹھن کام کو بجالانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ چنانچہ قرعۂ فال جنرل نیول چیمبرلین کے نام پڑا۔ یہ ۴۳ سالہ جنگ آزما افغانستان کی پہلی جنگ میں بھی حصہ لے چکا تھا۔ سکھوں کے خلاف جنگوں میں اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بھی اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ اور سرحدی قبیلوں کے خلاف فوج کشی کا پورا تجربہ بھی رکھتا تھا۔ سالہا سال سے صوبہ سرحد میں خدمات بجالانے کی وجہ سے وہ یہاں کی سیاست سے بخوبی واقف بھی تھا۔ اور اس سرزمین کے چپے چپے سے باخبر بھی۔ پھر وہ آزمودہ کار سپاہی بھی تھا۔ اور سیاسی پیچ وخم کا ماہر بھی، ایک عمدہ وقائع نگار اور ادیب بھی تھا۔ اور ماہر کشتی ران بھی۔

(تاہم جب مجاہدین اور یوسف زائی جانبازوں کے خلاف پنجہ لڑانے کا وقت آیا تو اس نے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اور کانٹوں کا یہ تاج سر پر سجانا نہ چاہا۔ اس پر وائسرائے

لارڈ ایلگن کو اُسے راضی کرنے کے لئے بڑا زور لگانا پڑا۔]

درویشانِ خدامست

چونکہ انگریزی حکومت ہر قیمت پر مجاہدین کے خلاف اس مہم کو کامیاب بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے بڑی رازداری سے کام لیا جا رہا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۳ء ہی سے سارا ضلع مردان فوجی سرگرمیوں کی جولان گاہ بن گیا۔ کبھی جنگی مشق کی آڑ میں فوجوں کی نقل و حرکت دیکھنے میں آتی۔ کبھی شکار کے بہانے انگریز میجر اور کرنل رستم اور سُدوم سے بھی پرے "سورکا دئی" کے پہاڑوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے۔ سارے شمالی ہندوستان کی پیادہ فوجیں، رسالہ، توپ خانہ اور انجینئر اکتوبر کے مہینے میں مردان پہنچنے شروع ہو گئے۔ انہیں ایک جگہ جمع کرنے کی بجائے سارے ضلع میں پھیلا دیا گیا تاکہ مہم کا اصل مقصد لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے۔ مجاہدین کا مرکز ان دنوں مہابن پہاڑ کی ڈھلوان پر "ملکا" کے مقام پر تھا۔ مردان کے میدانوں سے ملکا پہنچنے کے تین درّے تھے جن میں سے دو درّوں داران اور امبیلہ کا سروے کیا جا چکا تھا۔ امبیلہ چملا کی وادی میں واقع تھا۔ جہاں کے باشندے انگریزوں کے زیادہ مخالف نہ تھے۔ اس لئے طے یہی پایا تھا کہ فوج اسی راستے سے ملکا کو کوچ کرے۔ تاہم حربی چال کے طور ظاہر یہ کیا جا رہا تھا۔ کہ انگریزی دستے حسبِ سابق (کیونکہ سڈنی کاٹن ۱۸۵۸ء میں یہ راستہ طے کر چکا تھا) داران کے راہ سے آگے بڑھیں گے۔

انگریز لشکر کے افسر اپنی چالبازیوں میں لگے تھے۔ اتنی بڑی فوج اب تک کسی سرحدی لڑائی یا مہم میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ تا حدِ نگاہ سپاہی ہی سپاہی نظر آتے تھے۔ گویا انگریز کو پورے ملک کے وسائل مہیا تھے۔

دوسری طرف اُن کے مقابلے میں مٹھی بھر مجاہدینِ اسلام تھے۔ جن کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں یا تلواریں۔ بلکہ بعض تو برچھیوں اور لاٹھیوں ہی پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ نہ ان کے پاس توپیں تھیں۔ نہ ہاتھی۔ نہ خوراک کا ذخیرہ تھا نہ نقد سرمایہ ..... البتہ اُن کا ایمانِ کامل تھا۔ اور بھروسہ محض اللہ کی نصرت اور تائید پر تھا۔ وہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر گھر بار چھوڑ چٹیل پہاڑیوں پر پڑے تھے۔ لیکن اُنہیں یقین تھا کہ وہ حق پہ ہیں۔ اور اللہ ہمیشہ اہلِ حق کی مدد کرتا ہے۔ اُنہیں دیکھ کر ایک بار پھر قرنِ اوّل کے جان نثار عربوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اُن دنوں جمعیتِ مجاہدین کے امیر مولوی محمد عبداللہ تھے۔ اللہ نے انہیں بصیرت دی تھی۔ اپنی اس مومنانہ بصیرت سے وہ

تاڑ گئے کہ انگریز چالبازوں کا مقصد اتنی بڑی مہم سے صرف مجاہدین کے مرکز "ملکا" کی تباہی نہیں بلکہ سوات اور بونیر کی مکمل تسخیر ہے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئے۔ کہ انگریز پیش قدمی کے لئے صرف اور صرف امبیلہ کا راستہ اختیار کریں گے۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر انہوں نے مجاہدین کو علاقے کے ہر گاؤں میں تبلیغی مہم پر بھیجا کہ وہ سادہ لوح عوام کو انگریز کی چالبازیوں سے آگاہ کریں۔ اور انہیں اپنے وطن کی آزادی اور اسلامی شعار کے تحفظ کے لئے میدانِ جہاد میں اترنے کی دعوت دیں۔ خود امیر المجاہدین نے سارے علاقہ یوسف زئی کے خان خوانین اور سرکردہ شخصیتوں کو خط لکھ کر دردبھری اپیل کی۔ وہ آپس کے چھوٹے چھوٹے اختلافات بالائے طاق رکھ کر اسلام کے پرچم کو بلند رکھنے کے لئے متحد ہو جائیں۔

جنگ امبیلہ اس اعتبار سے ایک عجیب مقابلہ تھا جس میں ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت تھی اور دوسری طرف درویشانِ خدامست کی ایک چھوٹی سی جمعیت! ـــــ ـــــ جن کے متعلق انگریز اہلِ قلم ڈاکٹر ہیلیو نے "حالاتِ یوسف زئی" میں تسلیم کیا ہے کہ "مجاہدین بیس بیس، پچیس پچیس افراد کی دس جماعتوں پر مشتمل تھے"۔

سیاسی حربے

بتایا جا چکا ہے کہ انگریز پر مجاہدینِ اسلام اور یوسف زئی جانبازوں کا رُعب اس بُری طرح مسلط تھا کہ حملے کی یہ ساری سکیم انتہائی خفیہ رکھی گئی۔

وائسرائے لارڈ ایلگن اور گورنر رابرٹ منٹگمری نے کمانڈر ان چیف سر روز (ROSE) تک سے بھی مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ چنانچہ بعد میں اُس نے اس سکیم کی مخالفت بھی کی۔ فوجیں بھیجنے کے ساتھ ساتھ سیاسی چالبازیوں سے بھی کام لیا گیا۔ پشاور کے اس وقت کے کمشنر سر اینل ٹیلر (TAYLER) نے مردان کے دیہات کا دورہ کر کے خوانین کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ بے دریغ روپیہ تقسیم کیا گیا۔ اور اپنے مطلب کے ہر آدمی کو خریدنے کی کوشش کی گئی۔ گدون قبیلے سے انگریزوں نے اجازت لینے کی کوشش کی کہ اپنے علاقہ سے ملکا پہنچنے کا راستہ دیں۔ لیکن گدون مسلمانوں کے مقابلے میں کسی غیر مسلم طاقت سے تعاون پر تیار نہ ہوئے۔

کمشنر ایک دن کھبل کے معائنے پر بھی گیا۔ تاکہ لوگوں کی توجہ ملکا سے ہٹائی جا سکے۔ تاہم انگریز کی اصل منزل ملکا ہی تھی۔

اباسین (دریائے سندھ) سے درہ مالاکنڈ کے نیچے تک فوجیں ہی فوجیں نظر آتی تھیں فوج کو دو کالموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہزارہ کالم جس کا مقصد دریائے سندھ کی طرف سے حفاظتی اور جنگی اقدام کرنا تھا۔ اور پشاور کالم جس کی کمان جنرل چیمبرلین کے پاس تھی۔ اور جسے امبیلہ کے راستے ملکا پر چڑھائی کرنی تھی۔

۱۳ اکتوبر سے انگریزی فوج کے دستے صوابی کے دیہات میں جمع ہونے لگے۔ کمشنر نے اپنی مُہرہ بازیاں جاری رکھیں۔ ٹوپی کے رئیس مغل خان اتمان زئی پر ڈورے ڈالے۔ اسے جرگہ میں بلایا گیا لیکن اس نے صاف کہہ دیا۔ "آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہو کر غریب کاشت کاروں کے خلاف پہاڑوں میں کیوں دوڑتے پھرتے ہیں"۔

گدون رئیسوں کے انکار پر انگریز کمشنر بڑا برہم ہوا۔

اور حملے کی دھمکی دی۔ سید عبدالجبار بادشاہ نے لکھا ہے کہ "انگریزی فوجیں تیار ہو کر گدون دیہات کی طرف بڑھیں۔ لیکن عین آخری وقت واپس ہو گئیں۔ اس لئے کہ گدون مقابلے پر تلے ہوئے تھے اور انگریز کے نزدیک یہ بات مصلحت کے خلاف تھی کہ تیس پینتیس میل کا پہاڑی راستہ جس میں مسلسل چڑھائی ہے۔ لڑتے بھڑتے طے کر کے ملکا کو بڑھیں"۔

بعد ازاں ٹوپی کی بجائے صوابی کو مرکز بنایا گیا۔ انگریزوں کا ارادہ تھا کہ چنگلئی، کن گلئی، کوتل اور اشرف کنڈاؤ سے ہوتے ہوئے ملکا پہنچیں۔ اس مقصد کے لئے چنگلئی میں غلہ کے گودام بھی قائم کر لئے گئے۔ اور سڑک کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔ لیکن مجاہدین اور یوسف زئی جوانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ کہ جتنی سڑک بنتی، موقعہ ملتے ہی اسے توڑ ڈالتے۔ جب خدوخیل کا یہ راستہ بھی مشکل نظر آیا تو وادئ چملہ کی راہ چڑھائی کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لئے ہوتی مردان، طورو، زیدہ مرغز، صوابی، مانیری، سلیم خان وغیرہ کے سرکردہ خوانین کو ساتھ ملایا گیا اور اہل بونیر کو اپنی راہ پر لانے کے لئے سدم کے رئیس اعظم عجب خان سے سلسلہ جنبانی کی گئی۔

عجب خان کا چھوٹا بھائی عزیز خان ڈگر کے خان شادی خان کا بہنوئی تھا۔ ڈگر والے اس کی بات ٹال نہ سکتے تھے اور ڈگر کا خان ہی بونیر کا سب سے بڑا رئیس تھا۔ اس کے کہنے پر زید اللہ خان، حبیب خان عظیم خان، احمد خان ناسوزئی اور خان بگڑہ کو یہ کہہ کر ساتھ ملا لیا گیا۔ کہ انگریز صرف ملکا پر چڑھائی

کرنا چاہتے ہیں۔ باقی قبائل سے وہ کوئی تعرض نہ کریں گے۔ آپ اور کچھ نہیں تو صرف خاموشی اختیار کیئے رہیں۔ خوانین کو راضی کرنے کے لیئے ہزاروں روپے کی رقم تقسیم کی گئی۔

اسی طرح انگریزوں نے خدوخیل۔ گدون، اکازائی۔ مدہ خیل اور بونیر کے تمام قبیلوں کو ایک گشتی مراسلہ بھیج کر یقین دلایا کہ اُن کا مقصود صرف ملکا پر حملہ تھا نہ کہ اُن قبائل سے جنگ کرنا۔

انگریز کمشنر کے اس مراسلے کے جواب میں امیر المجاہدین مولوی محمد عبداللہ اور سید عمران شاہ ستھانوی کی طرف سے تمام یوسف زئی قبائل کے نام ایک اپیل جاری کی گئی جس میں اُن پر جہاد کی اہمیت واضح کی گئی۔ اور اُن پر زور دیا گیا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے ملک کی آزادی کا تحفظ کریں۔ ورنہ انگریز اُن کے علاقوں پر قابض ہو جائیں گے۔

ملکا مئی ۱۸۵۸ء (ستھانہ کی تباہی) کے بعد سے مجاہدین ملکا میں سادات کے مہمان رہے۔ ہندوستان سے مجاہدین کے اور دستے بھی آ گئے۔ ان کے لیئے بارکیں اور عمارتیں بنائی گئیں جن میں تین ہزار مجاہدین کے قیام کی گنجائش تھی۔ مولانا ولایت علی کے فرزند محمد عبداللہ ان دنوں پٹنہ میں تھے جب انہیں پتہ چلا کہ سرحدی علاقوں کے حالات اچھے نہیں تو ۱۹ نومبر ۱۸۵۹ء کو اپنے اہل وعیال سمیت پٹنہ سے ہجرت کر کے ملکا پہنچ گئے۔ یہاں وہ امیر منتخب ہوئے اور چالیس سال تک مجاہدین کی کمان ان کے ہاتھ میں رہی۔

اس اثناء میں مجاہدین کے سرپرست شہزادہ مبارک شاہ نے انگریزوں کے خلاف بہت سے اقدام کیئے۔ ایک محفوظ مقام "سری" میں ایک "برج" تعمیر کرایا۔ پھر اتمان زئی سے ستھانہ کی کچھ املاک بھی حاصل کر لی۔ ۱۸۶۱ء میں انگریزوں نے فوج کشی کر کے "سری" کا برج مسمار کر دیا۔

مختصراً جنگِ امبیلہ شروع ہونے کے اصل سبب یہ تھے۔ کہ

۱۔ سید مبارک شاہ اور ہندوستانی مجاہدین نے والیٔ امب کو خط لکھا تھا۔ کہ وہ غیر مسلموں کا ساتھ چھوڑ کر مسلمان بھائیوں کا ساتھ دے اور دین کے احیاء کے لیئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیئے آمادہ رہے۔

۲۔ ۳ ستمبر ۱۸۶۳ء کو مجاہدین نے ٹوپی کے انگریزی کیمپ پر چھاپہ مارنے کی کوشش کی تھی جس میں ملک عیسیٰ خان جدون بھی اُن کے ساتھ تھا۔ چونکہ انگریز کو بروقت اس چھاپہ کا پتہ نہ چل سکا۔ اس لیئے ان کا بہت نقصان ہوا۔

۳۔ ستھانہ اور ملکا میں مجاہدین کے فوجی مستقر کی موجودگی جسے انگریز اپنے وقار کے منافی قرار دیتے تھے

امبیلہ امبیلہ کا گاؤں چملہ کی سرسبز و شاداب وادی کا ایک اہم مقام ہے۔ نواحی درہ جس سے گزر کر انگریزی فوج کو حملہ کرنا تھا۔ بھی امبیلہ ہی کہلاتا ہے۔ یہ وادی چودہ پندرہ میل لمبی اور چار پانچ میل چوڑی ہے۔ بیچ میں ندی بہتی ہے جس کا نام بھی چملہ ہے۔ یہ ایک برساتی نالہ ہے جو اکثر خشک رہتا ہے۔ یہ ندی مغرب سے مشرق کو بہتی ہوئی بڑنددی سے جا ملتی ہے اور انجام کار دونوں دریائے سندھ میں جا گرتی ہیں۔

درہ امبیلہ کے دونوں طرف پہاڑی سلسلے ہیں۔ لیکن یہ پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں۔ درے میں سے گزرنے والا راستہ برساتی نالہ (نخوڑ) کی گزرگاہ ہے جو بڑے بڑے پتھروں سے اٹا ہوا ہے۔ نو میل لمبے درے کو پار کرنا آسان کام اس لئے نہیں کہ پہاڑیوں میں ایسے مورچے ہیں۔ جہاں بیٹھے ہوئے چند مسلح افراد بھی پورے لشکر کو روک سکتے ہیں۔ درہ امبیلہ کو پار کرنے کے بعد مہابن کا وہ پہاڑ ہے۔ جس کی ڈھلوان پر ملکا کا گاؤں تھا۔ انگریز اسی گاؤں کو تباہ کرنے کے درپے تو تھا۔ وادی میں کل ۲۲ گاؤں تھے۔ جن میں یوسف زئی قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ ان میں سے امبیلہ۔ سور پٹی۔ لالو کوگا وغیرہ مشہور ہیں۔ جب کبھی ان دیہات کے لوگوں کو کوئی خطرہ پیش آتا۔ وہ اپنا سامان اور بال بچے نکال کر پہاڑوں کو چلے جاتے۔ پھر خطرہ ٹلتے ہی واپس اپنے گھروں کو آجاتے۔

آغازِ کار انگریزی فوجیں ۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء ہی سے میدان کے مختلف مقامات پر جمع ہو رہی تھیں۔ تاہم فوجی افسر ابھی مزید کمک کے انتظار میں تھے۔ اس لئے سترہ اکتوبر تک وہ امبیلہ کا رُخ نہ کر سکے۔ اس سے بونیر، سوات، ملحقہ علاقوں کے قبائل کو تیاری کا وقت مل گیا انہوں نے اپنے اپنے رضا کار انگریز کے خلاف جہاد کے لئے بھیجنے شروع کر دیئے۔

پہلے فوج کے ہراول دستے درہ امبیلہ میں داخل ہوئے۔ ۱۸ اکتوبر کو فوج کا بڑا دستہ جو صوابی میں مقیم تھا۔ جنرل چیمبرلین کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے مطابق اس میں ۵۱۵۰ پیادہ سپاہی، دو سو سوار اور توپ خانہ کے ۲۸۰ افراد شامل تھے۔ تیرہ توپیں قلبِ لشکر کے ہمراہ تھیں۔

علاوہ ازیں کمشنر ٹیلر کے پاس بھی ایک ہزار افراد کا جیش موجود تھا۔ ۱۹ اکتوبر کو جنرل چیمبرلین اپنے

بیس کیمپ (BASE CAMP) میں پہنچا۔ تو اسے معلوم ہوا۔ کہ اسوقت تک نہ تو پیں وہاں پہنچی تھیں نہ باربرداری کے جانور۔ یہ پہلی بدشگونی تھی۔ فوراً ہی چیمبرلین ٹھٹکا کہ کام شروع ہی سے بگڑ گیا۔

دوسرے دن کمشنر کرنل ٹیلر اور رابرٹ سنڈیمین (پولیٹیکل افسر) فوج کے ایک دستے کو ساتھ لے کر حالات کا جائزہ لینے نکلے جب یہ دستہ بونیر جانے والے کوتل پر پہنچا۔ انہیں چند قبائلی سرفروش نظر آئے۔ جو درّہ کے دونوں طرف مورچے بنا رہے تھے۔ فوجی دستے کے کمانڈر لفٹیننٹ کرنل پروبین (PROBYN) انہیں دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گیا اور ان پر حملے کا حکم دے دیا۔ قبائلی مجاہد انہیں بڑھتے دیکھ کر پہاڑی کمین گاہوں کو چلے گئے اور انہیں زیادہ نقصان پہنچنے نہ پایا۔

تاہم انگریز کی جانب سے بغیر کسی اشتعال کے اس جارحانہ کارروائی سے نواحی قبائل میں بڑا جوش پھیل گیا۔ انہیں مجاہدین نے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ اس دفعہ انگریز کا مقصد صرف ہندوستانی مجاہدوں کو ختم کرنا نہیں۔ بلکہ بونیر اور سوات کے علاقوں پر مکمل قبضہ کرنا ہے۔

اس کارروائی سے قبائلیوں کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا اور ہر قبیلہ دھڑا دھڑ اپنے سرفروش اس جہاد کی خاطر بھیجنے لگا۔

اسی رات ہزاروں قبائلی مجاہدوں اور سید احمد شہیدؒ کے پیروکاروں نے انگریزی کیمپ پر زبردست شب خون مارا اور دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔ یہ شب خون اتنا خلافِ توقع تھا کہ بڑے بڑے فوجی افسروں کے ہوش گم ہو گئے۔ اور جنرل چیمبرلین نے بھی اندازہ لگا لیا کہ بغیر مزید کمک کے درّہ امبیلا کو پار کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔ صبح سویرے ہی انگریز کو اپنے مورچے مضبوط بناتے دیکھا گیا۔ دو زبردست فوجی چوکیاں قائم کی گئیں۔ "انگل نیسٹ" اور "کریگ نیسٹ"۔ کرنل واہان اور کرنل وائلڈ کو ان پر انچارج مقرر کیا گیا۔ اب چیمبرلین کو توپوں کے پہنچنے کا انتظار تھا۔

۲۵ اکتوبر کو توپیں بھی پہنچ گئیں اور انگریزی فوج اب پوری طرح مسلح ہو گئی۔

اس وقت تک قبائلی رضاکار اور مجاہدین کے گروہ جوق در جوق، ڈھول پیٹتے، نعرے لگاتے درّہ امبیلہ کے نواح میں جمع ہونے لگے۔ ہر طرف جھنڈے ہی جھنڈے نظر آتے تھے۔ بیس بیس پچیس پچیس مجاہدوں کے گروہ جھنڈے لہراتے آتے۔ اور میدانِ کارزار میں حاضری دیتے۔ انگریز کے محکمہ خبر رسائی اور انگریز اہلِ قلم کے تحریروں کے مطابق مجاہدین کا لشکر پندرہ سے بیس ہزار تک سرفروشوں پر مشتمل تھا۔

انگریز جنرل اتنی بڑی تعداد میں ان مجاہدین کو اتنے جوش و خروش سے آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور حکومت ہند کو تار دیئے کہ فوری طور پر زیادہ سے زیادہ کمک بھیجی جائے۔ ہنڑ کے کہنے کے مطابق حالت یہ ہو گئی تھی کہ شمالی ہند کو سب چھاؤنیوں سے پوری پوری پلٹنیں امبیلہ کی مہم کو روانہ کر دی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ لاہور چھاؤنی میں اتنے سپاہی بھی مشکل سے باقی تھے جو پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر کی قیام گاہ پر پہرہ دے سکتے۔

تاہم انگریزی کیمپ میں صفِ ماتم اس دن بچھی جب انہیں معلوم ہوا کہ امیر المجاہدین، مولوی محمد عبداللہ سید مبارک شاہ اور عیسیٰ خان جدون کے علاوہ حضرت اخون صاحب سوات (عبدالغفور باباؒ) بھی مجاہدین کی قیادت کے لئے میدانِ کارزار میں پہنچ گئے ہیں۔ مسلمان اللہ کا سپاہی ہے۔ اس میں جوش اور جذبے کا فقدان نہیں۔ وہ ہر وقت اللہ اور اس کے رسولؐ اور اپنے مقدس دین کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے۔ اگر کمی ہے تو صرف مخلص قیادت کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی مخلص قیادت میسر آئی۔ مسلمانوں نے وہ انقلاب آفرین کارنامے انجام دیئے کہ آسمان حیرت سے تکنے لگا۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ جہادِ امبیلہ میں انہیں مطلوبہ قیادت مل گئی۔

گو حضرت اخون صاحبِ سوات کے مجاہدین سے معمولی اختلافات رکھتے تھے۔ اور اگرچہ سادات متھانہ سے بھی وہ پوری طرح متفق نہ تھے۔ تاہم جب اسلامی غیرت اور حالات کی نزاکت نے پکارا تو اپنی ضعیف العمری میں بھی بابائے سوات شمشیر بکف آمادہ جہاد ہو گئے۔ اخون صاحب کے آتے ہی دریائے سندھ اور دریائے کابل کے مابین پھیلا ہوا سارا قبائلی علاقہ جوشِ جہاد سے سرشار ہو گیا۔ ہر جگہ کے مجاہد سروں پر کفن باندھے آتے۔ اور گودر اور امبیلہ کی پہاڑیوں پر جھنڈے گاڑ دیتے۔

دیر، سوات، بونیر اور دوسرے نواحی علاقوں کے مجاہد جنگ کو ہمیشہ ایک "جشن" سمجھتے رہے ہیں۔ وہ چھپ کر اور چھپکے سے حملے کے قائل نہیں۔ بلکہ ڈھول بجاتے، نعرے لگاتے دوڑتے ہوئے آتے اور کاری ضرب لگاتے ہیں۔ گولیوں کی بارش میں بھی وہ لیٹ کر یا رینگ رینگ کر جان بچانے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔

اخون صاحبؒ کے محاذِ جنگ پر پہنچتے ہی جنرل چیمبرلین نے حکومتِ ہند کو فوری پیغام بھیجا۔

"اخون صاحب میدان میں آ گئے ہیں ـــــ دیر، سوات۔ باجوڑ اور بونیر سے اُن کے ہزاروں

پیروکار ہمراہ ہیں ۔ مجاہد اپنے سارے اختلافات بھلا کر متحد ہو چکے ہیں ۔ اس لئے میں موجودہ فوج کے ساتھ پیش قدمی کرنے کے قابل ہرگز نہیں ۔"

چیمبرلین کا مؤقف یہ تھا ۔ اُسے تو چند ہندوستانی مجاہدین کے خلاف کارروائی کر کے ان کا مرکز ملکا تباہ کرنے کو کہا گیا تھا ۔ اُسے ابتدا سے یہ معلوم تو نہ تھا کہ اُسے ہزاروں آزمودہ کار یوسف زئی جنگ آزماؤں سے نپٹنا پڑے گا ۔

اب ایک تو اس امید پر کہ مزید کمک آجانے پر فوجی کارروائی کی جائے گی اور ایک اس خیال سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قبائلیوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا ۔ اور وہ واپس چلے جائیں گے ۔ انگریز جنگ کو طول دیتے گئے ۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے سیاسی چالبازیاں ، جوڑ توڑ اور گفت و شنید کا بھی سہارا لیا ۔ اپنے حامی خوانین جن میں زید اللہ خان (بونیر) اور احمد خان (بونیر وال) شامل تھے مشورے کے لئے بلائے ـــــ جرگہ بازی سے کام لینا چاہا اور روپے کا لالچ دے کر قبائلی لشکر میں پھوٹ ڈالنی چاہی ۔ لیکن اُن کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی ۔ انگریز فوجی افسروں نے خود اعتراف کیا ہے کہ قبائلی مجاہد کس جرأتِ ایمانی کے مالک تھے ۔ وہ انگریزی توپوں اور گولہ باری کے دوران بھی بے خوف آگے بڑھتے رہتے ۔ حملہ کرتے تو شوقِ شہادت سے سرشار جشنِ مسرت مناتے ہوئے آگے بڑھتے ۔ گولیوں کے پٹنے لگ جاتے ۔ لیکن وہ بے دھڑک کھڑے رہتے ۔ انگریزوں نے تین چار کلیدی مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں ۔

اُن کے گرد جو خوفناک معرکے ہوئے ۔ اس کی مثال تاریخِ عالم کے صفحات میں کم ملے گی ـــــ ان پہاڑی مورچوں "آشیانہ عقاب" (EAGLE NEST) اور "چٹان والے مورچے" (CRAG NEST) پر کبھی ایک فریق کا قبضہ ہوتا ، کبھی دوسرے کا ۔ یہاں تک کہ گورا سپاہی اُسے "قتل گاہ" کا نام دینے پر مجبور ہو گئے ۔

۲۴ اکتوبر کو مجاہدینِ ملکا سید مبارک شاہ کی قیادت میں انگریزی ٹھکانوں پر حملہ آور ہوئے ۔ میجر کیئر (KAYES) کو اُن کے مقابلے پر بھیجا گیا ۔

امیر المجاہدین مولوی عبداللہ اور شہزادہ مبارک شاہ نے درّے کے تینوں جانب مورچے قائم کر لئے ۔ اپنے لشکر کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ۔ ایک پیر سید شاہ محمود ابن سید عمر سنتھانوی شہید) دوسرے پر

سید اعظم اور تیسرے پر سید یوسف ساکن نواگئی کو سالار مقرر کیا۔

مؤخر الذکر دستہ لاتو پہاڑ کی چوٹی پر متعین تھا۔ اور اس میں گدون۔ خدوخیل اکا زئی اور عیسیٰ خیل مجاہد تھے۔ اہل بونیر میں سے عائشہ زئی، گرائی زئی اور پنج پائی انگریز لشکر کے بالکل سامنے مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔ سالار زئی، لوزی زئی، دولت زئی اور جعفر زئی (جن کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی) انگریزی فوج کے شمال اور مغرب میں گوگرہ پہاڑ پر متعین تھے۔ مجاہدین کاٹ گلہ میں سینے تانے کھڑے تھے۔ اپنی انتہائی بے سروسانی کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی منظم ترین فوجوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے۔ ہر روز معرکے پڑتے۔ مظفرین کا زبردست نقصان ہوتا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجاہدین پھر تازہ دم ہو کر اسی شان سے کھڑے ہوتے۔

حضرت اخون صاحبؒ کے پیروکاروں میں عبدالرحمان کابلی عرف پاسنے باباؒ بہت مشہور مقرر تھا جہاں تقریر کرتا آگ لگا دیتا۔ اور لوگ گاؤں چھوڑ کر جہاد کو نکل پڑتے۔ اخون صاحبؒ نے حالات کی نزاکت کو دیکھا تو گوشۂ عبادت چھوڑ کر میدانِ قتال میں کود پڑے۔ سیدو شریف سے نکلے۔ تو لوگ پروانہ وار ساتھ تھے۔ منگورہ پہنچ کر کچھ قیام کیا۔ وہیں جمعہ کی نماز ادا کی۔ خطبہ سراپا دعوتِ جہاد تھی۔ انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ اگر انگریز سوات اور بونیر پر قابض ہو گئے تو میں ہجرت کر جاؤں گا کہ کافر کی غلامی میں رہنا منظور نہیں۔ ان کا یہ اعلان سن کر کون تھا جو پیچھے رہتا۔ ہر کوئی ساتھ ہو لیا۔

محاذِ جنگ پر پہنچ کر انہوں نے اس جگہ قیام کیا۔ جہاں اب اس واقع کی یاد میں ایک خوبصورت مسجد بنا دی گئی ہے۔ وہیں امیر المجاہدین اور شہزادہ مبارک شاہ اُن کی ملاقات کو آئے۔ بات چیت ہوئی۔ تو مولوی عبداللہ نے اپنے مذہبی عقائد بیان کئے۔ اخون صاحبؒ اٹھے۔ انہیں گلے لگا لیا۔ اور بغلگیر ہو کر فرمایا۔ "آج میرے اور آپ کے ناموس پر حملہ ہوا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ مل کر انگریزوں سے مقابلہ کریں"۔

ایک رات فیصلہ کیا گیا کہ انگریزی کیمپ پر شب خون مارا جائے۔ اخون صاحبؒ سے منظوری لے لی گئی۔ طے پایا کہ ایک طرف سے سوات کے اکوزئی ہوں۔ دوسری طرف سے بونیر کے جیش حرکت میں رہیں اور تیسری طرف سے مجاہدین کے دو دستے دادِ شجاعت دیتے کو نکلیں۔

فجر کے وقت مجاہدین کے دستے نجف خان جمعدار اور قائم خان جمعدار کی سالاری میں بڑھے۔ قرابینوں سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ اُدھر سے اکوزئی نعرے لگاتے شیروں کی طرح دشمن پر پل پڑے۔ اُن میں

سے الیاس خان، عمارہ خان، یوسف خان، اور فضل خان سب سے پہلے انگریزی مورچوں تک پہنچے اور دشمن کی صفوں کی صفیں الٹ دیں۔

قائم خان اور نجف خان نے بھی اتنے والہانہ جوش سے جنگ کی کہ درجنوں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

جہاں تک جمعیت مجاہدین کا تعلق ہے۔ اس نے ایثار و قربانی کی عظیم داستان رقم کی۔ جہادِ امبیلہ میں کم سے کم چار سو مجاہدین نے شہادت پائی۔ اُن میں وہ دو سو جان باز بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ناصر محمد اور کلیم الدین کی قیادت میں انگریزی فوج کی ایک پوری رجمنٹ کا مقابلہ کیا اور اس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی ان کی دینی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ لوگ بے حد صابر و شاکر تھے اور ہر وقت ذکرِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے پہرہ دار ایک دوسرے کو آواز دیتے تو ایسے انداز میں سبحان اللہ کا نعرہ بلند کرتے کہ سننے والوں کا دل تڑپ اٹھتا۔ دوسرا پہرہ دار اس صدا کا جواب الحمد للہ سے دیتا۔ تیسرا پکارتا۔ میر حکم اللہ۔ چوتھا جواب دیتا۔ یوں یکم اللہ!"

داستانِ جہاد

جہادِ امبیلہ کے دوران غازیوں کے کارنامے تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔ مولانا عبدالحق آردی نے "غزائے بونیر" کے نام سے ایک طویل فارسی نظم لکھی ہے۔ اس میں بیان کرتے ہیں کہ بارہ نوجوان غازی تھے جنہیں عزیز خان برادر عجب خان سے پتہ چل گیا کہ انگریز امبیلہ پر حملے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے پہاڑی کے اہم مقام پر مورچہ قائم کر لیا۔ چاندنی رات تھی۔ ہر ایک جوان باری باری جاتا۔ دشمن پر گولی چلاتا۔ گولیاں ختم ہوتیں تو واپس چلا جاتا۔ اس پر دوسرا جوان اس کی جگہ لیتا۔ ساری رات اس مورچے سے دشمن پر آگ برستی رہی۔

دولت زئی اور نوری زئی بونیریوں کے ستر، اسی آدمی اس درّے میں پہنچ گئے جو چملہ اور بونیر کے مابین واقع ہے۔ انگریزی فوج کے تیرہ سوار جن میں سے چار انگریز تھے گشت پر نکلے۔ غازیوں نے اُن کے چھکے چھڑا دیئے۔ جب مجاہد اس کارروائی سے فارغ ہو کر واپس ہونے لگے۔ تو انگریزی کیمپ سے اُن پر آتش باری ہونے لگی۔ توپوں نے اُن پر زمین تنگ کر دی۔ ایسے میں بھی اُن کے اوسان بجا رہے۔ اُن میں تین حقیقی بھائی تھے۔ اُن کے پاس صرف تلواریں تھیں۔ انہوں نے متفقہ طور پر

اپنی تلواروں سے دشمن کے مورچے پر حملہ کیا۔ بہت سے انگریزوں کو جہنم واصل کیا۔ اور بالآخر خود بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اُن کے باپ کو بیٹوں کی شہادت کی خبر سُنی تو وہ خود شمشیر بدست گیا۔ اور انگریزوں سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گیا۔ پھر قبیلے کا ایک ایک غازی جاتا۔ اور پروانہ وار شمع اسلام پر قربان ہو جاتا ـــــ انہوں نے انفرادی شجاعت اور جانبازی کے وہ نمونے پیش کئے۔ کہ دشمن بھی عش عش کر اُٹھا۔

پشاور یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر اور نامور مؤرخ ڈاکٹر منور خان نے (CRAG POST) نامی فوجی چوکی کے گرد ہونے والی لڑائی کا جو حال بیان کیا ہے۔ وہ اہلِ سرحد کی حریت پسندی اور جذبۂ جہاد کی ایک روشن مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۳۰ اکتوبر کا دن تھا جب پختون مجاہد پہلی بار "کریگ پوسٹ" پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے۔ میجر کے (KAYE) نے فرسٹ پنجاب انفنٹری اور گائیڈ کے ایک دستے کی مدد سے دوبارہ پوسٹ پر قبضہ کر لیا۔ سرحدی غازیوں نے کمال شجاعت سے دفاعی جنگ لڑی۔ دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ غازیوں میں سے ساٹھ افراد شہید ہوئے۔ جبکہ دشمن کے پچاس آدمی ڈھیر ہوئے۔ ۱۲ نومبر کو غازیوں نے پھر اس پوسٹ پر ہلہ بول دیا۔ خوفناک لڑائی ہوئی۔ تاہم غازیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن ۱۳ نومبر کو غازیوں نے پھر پکٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ خونریز معرکہ پڑا۔ کہ انگریزی فوج کے سپاہیوں کو جن کی تعداد ۲۰ تھی۔ دُم دبا کر بھاگتے ہی بن پڑی۔ اپنی فوج کا یہ حشر دیکھ کر سارے انگریز کیمپ کے چہرے اتر گئے۔

تاہم انگریز کے سامنے وقار کا مسئلہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر پکٹ چھیننے کے لئے حملہ کیا۔ پہلی بار انگریزوں کا حملہ ناکام رہا۔ اس پر میجر راس (ROSS) پیادہ فوج اور سواروں کی ایک کثیر تعداد سے اپنے ساتھیوں کی مدد کو بڑھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے اس نے حملہ کیا۔ اور غازیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم ابھی مورچہ سر نہیں ہوا تھا۔ اس پر جنرل جیمیرلین نے ایک گورا رجمنٹ مدد کے لئے بھیجی۔ اتنی بڑی تعداد میں سپاہی بھیج کر اگرچہ انگریز پکٹ کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن یہ کامیابی ایسی ہرگز نہ تھی جس پر انگریز فخر کر سکتا۔ اس اکیلے معرکے میں ۲۳۰ غازی شہادت پا گئے جبکہ انگریزی فوج کے ۸۴ افسروں اور سپاہیوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

۲۹ نومبر کو اس پوسٹ پر ایک بار پھر دونوں فریقوں کا آمنا سامنا ہوا۔ غازیوں نے پورے جوش سے حملہ کیا اور انگریز کے سپاہیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ اپنی فوج کی یہ ابتر حالت دیکھ کر جنرل چیمبرلین خود آگے بڑھا اور بصد دشواری پکٹ پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ (چیمبرلین خود بھی سخت زخمی ہوا اور اُسے بازو پر گولی لگی)۔

پکٹ پر قبضے کے بعد انگریز نے اپنے سپاہیوں کی لاشیں شمار کیں تو وہ ۱۵۳ تھیں۔ ظاہر ہے کہ مجاہدین کو بھی شدید جانی نقصان ہوا ہو گا"۔

"سٹوری آف دی گائیڈز" کا مصنف (جو خود بھی فوج کے ایک اہم عہدے پر فائز تھا) اس بارے میں غازیوں کی شجاعت خود اعتراف کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے۔

"کرگیک پکٹ کی کہانی عجیب ہے۔ چار مرتبہ اسلامی جذبۂ جہاد سے سرشار غازیوں نے اپنی پوری قوت سے اس پر حملے کئے۔ تین بار وہ اس پکٹ پر قابض ہوئے اور تینوں بار بھاری جانی قربانی دے کر ہم نے اس اہم مورچے کو پھر اُن کے ہاتھ سے چھینا۔ یقیناً اس جگہ کو "قتل گاہ" کہنا ہی زیادہ موزوں ہے کہ دونوں طرف کے قریباً ایک ہزار لڑاکوں نے اس پر قبضہ کرنے یا اسے واپس لینے کی کوششوں میں اپنا خون بہایا۔ اور اپنی جانوں کی قربانی دی"۔

۱۹ نومبر ۱۸۶۷ء تک حالت یہ ہو گئی تھی کہ جنرل چیمبرلین نے وائسرائے کو تار دے کر مطلع کیا کہ "ہمارے فوجیوں کو دن رات سخت مشقت کرنی پڑی ہے۔ وہ لمحہ بھر آرام نہیں کر سکے۔ تازہ دم دشمنوں (غازیوں) کا مقابلہ اب نقصان اٹھانے کے مترادف ہے۔ کمک کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے لئے دشمن کا مقابلہ کرنا، رسد کے لئے فوجی دستے بہم پہنچانا یا زخمیوں کو ہسپتالوں تک پہنچانا بہت مشکل ہو گیا ہے"۔

جب ایک ماہ کی لڑائی کے بعد دنیا کی منظم ترین فوج کا یہ حال تھا تو قبائلی سرفروشوں اور غازیوں کی حالت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اُن بیچاروں کے پاس نہ خیمے تھے نہ گرم وردیاں، نہ رسد کی باقاعدہ سپلائی تھی۔ نہ علاج معالجے کی سہولتیں۔ اکثر غازی تو صرف تین تین چار چار دن کے لئے مکئی کی روٹیاں لے کر آئے تھے۔ وہ کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ تاہم وہ جنگلی جڑی بوٹیاں کھا کر بھی اسلام کے ناموس کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ کھلے آسمان تلے پڑے تھے۔ اور سردی کی ان راتوں کو

چٹانوں پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اس سلطنتِ برطانیہ کا منہ پھیر دیا تھا جس کی حدود پر سورج غروب ہونے نہیں پاتا تھا۔ یہ سب قوتِ ایمانی کا معجزہ تھا۔

جنرل چیمبرلین زخمی ہونے کے بعد ہسپتال جا چکا تھا۔ اور اب فوجوں کی کمان میجر جنرل گریوک (CRAVIK) کے حوالے ہو چکی تھی۔ اس نے آکر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو سخت مایوس ہوا۔ وائسرائے لارڈ ایلگن سے حکم طلب کیا گیا۔ وہ شملہ میں بیمار پڑا تھا۔ اس نے فوراً فوجوں کو واپس بلانے کا حکم دے دیا۔ تاہم کمانڈر ان چیف روز نے ایسا کرنا فوجی پالیسی کے خلاف سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر امبیلہ سے قدم واپس ہٹایا گیا تو سارے صوبہ سرحد میں انگریز کے خلاف طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اور ہر جگہ لوگ سرکشی پر اُتر آئے تو ایک انگریز بھی سرحد سے واپس زندہ نہ جانے پائے گا۔ پہلی افغان جنگ کا انجام اُن کے سامنے تھا۔ کمانڈر ان چیف نے واضح حکم دیا کہ شمالی ہند کی ساری چھاؤنیوں سے سب کے سب سپاہی فوراً امبیلہ بھیج دیئے جائیں۔ چنانچہ نومبر ۱۸۶۳ء میں لاہور سے پشاور تک کی ساری شاہراہ پر فوجی قافلوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ سارے علاقہ سے گھوڑے، خچر، گدھے اور اُونٹ خرید کر بونیر کی سرحد پر بھیج دیئے گئے تھے۔ دسمبر ۱۸۶۳ء کے آغاز تک خود انگریزوں کے کہنے کے مطابق پچیس ہزار برطانوی سپاہی محاذِ جنگ پر یا اس کی قریبی چھاؤنیوں میں جمع ہو چکے تھے۔

۲۰ نومبر کو وائسرائے لارڈ ایلگن کا انتقال ہو گیا۔ ۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اُس کا جانشین کلکتہ پہنچا تو سب سے پہلے امبیلہ ہی کے معاملے پر توجہ دی۔ کونسل کی اکثریت اس حق میں تھی کہ نقصان سے بچنے کے لئے فوجیں واپس بلا لی جائیں۔ تاہم سردی کی شدت میں اضافہ ہونے اور جنگ طویل ہو جانے کی وجہ سے اکثر سرحدی غازی اپنے اپنے دیہات کو واپس چلے گئے تھے اور سرحد سے تھوڑی بہت امید افزا خبریں آنے لگی تھیں۔ اس لئے نئے وائسرائے نے کونسل کے ممبروں پر زور دیا کہ وہ فوجیں واپس بلانے کا سابقہ فیصلہ واپس لے لیں۔ اُدھر ۱۵ دسمبر کو جنرل گاروک کے محاذِ جنگ پر پہنچتے ہی فوجی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔ نئے جرنیل نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر لالو کے گاؤں پر جو کریگ پکٹ کے اوپر ایک مخروطی پہاڑی پر واقع تھا۔ حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات کو پانچ ہزار سے زیادہ سپاہیوں اور توپوں کی مدد سے اس نے لالو پر حملہ کیا۔ مجاہدین چونکہ اس نئی صورتِ حال کے لئے

تیار نہ تھے۔ اس لئے وہ انگریزوں کا حملہ نہ روک سکے۔

اب لالو کے گاؤں کو محاذِ جنگ بنایا گیا۔ دوسرے دن سامنے کی پہاڑی پر سرحدی غازی مورچے جما چکے تھے۔ تاہم توپ خانہ کی اندھا دھند گولہ باری کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی جنرل گارڈ نے اب کے ایک اور چال چلی۔ اپنی فوج کے صرف ان سپاہیوں کو آگے آگے رکھا۔ جو صوبہ سرحد کے باشندے تھے۔ اور یہاں کے حالات کو بخوبی جانتے تھے۔ تاہم ایک ایک قدم اور ایک ایک چٹان پر غازیوں نے اس لشکرِ جرار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ایک طرف فوجی جرنیل پیش قدمی کی تیاری کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف کمشنر پشاور اور پولیٹیکل حکام سیاسی ریشہ دوانیوں میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے جاسوسوں کے ذریعے انہوں نے غازیوں میں بددلی پھیلا دی تھی۔

۱۶ر دسمبر کو کرنل وائیلڈ کا بریگیڈ امبیلہ کی طرف بڑھا۔ رسالے کے چار سو سوار کرنل پیروین کی کمان میں اس کے ساتھ تھے۔ سکھ سپاہیوں کو جان بوجھ کر حملہ آور لشکر کے آگے آگے رکھا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی انتقام کی آگ بجھا سکیں۔ اب غازیوں کی جمعیت بہت تھوڑی تھی۔ اپنی کامیابی کی خوشی میں انگریز لشکر بڑھتے بڑھتے امبیلہ سے بھی کچھ آگے نکل گیا تھا کہ اچانک گھاٹیوں سے نکل کر دو سو مجاہدینِ اسلام نے اُن پر دھاوا بول دیا۔ یہ حملہ ایسا اچانک اور شدید تھا۔ کہ کثرت تعداد کے باوجود انگریز کے پاؤں اکھڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ حالانکہ دو سو میں سے صرف چند مجاہدوں کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ انہوں نے انگریز سپاہیوں کو چُن چُن کر نشانہ بنایا اور جب گولیاں ختم ہوگئیں تو وہ تلواریں سونت کر انگریزوں کی صفوں میں گھس گئے وہ جس طرف جاتے۔ صفوں کی صفیں الٹ کر رکھ دیتے خصوصاً انگریز افسروں کو چُن چُن کر قتل کرتے چنانچہ صرف چند منٹ کی لڑائی میں لفٹیننٹ الیگزینڈر، میجر وہیلر، کیپٹن کمبرلین لفٹیننٹ ناٹ اور لفٹیننٹ مارش ہلاک یا زخمی ہوئے اور ۱۷۳ دوسرے مارے گئے۔ اب چونکہ انگریز ہی توپ خانہ مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ اس لئے مجاہدین مصلحتاً پیچھے ہٹ گئے۔ جب انگریز نے دیکھا کہ شمشیر و سپاہ سے کام نہیں چل سکتا تو مکر و فریب کے تیر استعمال کئے۔ غازیوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لئے کچھ "مُہرے" خریدے گئے۔ خود ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر معترف ہے کہ

"جو کام ہماری سپاہ سے نہ ہو سکا۔ وہ ہماری ڈپلومیسی نے کر دکھایا"۔

۲۵ نومبر ہی سے پشاور کا کمشنر اور پولیٹیکل حکام سیاسی جوڑ توڑ اور جرگہ بازیوں میں لگے تھے۔ بالآخر وہ بونیر کے چند ملکوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے الگ ہونے کے بعد دو ہزار غازیوں کے ایک اور دستے کو بھی خاموشی کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس چلے جانے پر راضی کر لیا گیا۔ دسمبر کے اوائل تک سیاسی میدان میں انگریز کو خاص کامیابی ہو چکی تھی۔ ۱۰ دسمبر کو بونیر کے قبائل کا ایک بڑا جرگہ کمشنر سے آکر ملا۔ لیکن صلح کی شرائط طے نہ ہو سکیں۔ قبائل بونیر پر دباؤ ڈالنے کے لئے نئے جرنیل نے ۱۵ دسمبر کو تلو پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ۱۶ دسمبر کو امبیلہ کی بستی میں آگ لگا کر یہ ثابت کر دیا کہ انگریز اب غالب آچکا ہے اور اپنی من مانی شرطیں منوا سکتا ہے۔ بونیر کا خان زید اللہ خان اور اس کے چند ساتھی انگریزوں سے جا ملے۔ انگریز کمانڈر نے خوش ہو کر اپنا ذاتی پستول انعام کے طور دے دیا۔ ان بونیری ملکوں کے ساتھ یہ معاہدہ طے پایا کہ

۱ ـــــ بونیر کی سرحدوں سے فرنگی فوج ہٹالی جائے گی۔

۲ ـــــ مجاہدین کو بونیر سے نکال دیا جائے گا۔

۳ ـــــ ایک فوجی جماعت تلکا جا کر مجاہدین کے امیر کا گھر جلا دے گی۔

اس معاہدہ کے مطابق ایک فوجی دستہ زید اللہ خان اور اس کے ساتھیوں کی ہمراہی میں تلکا روانہ ہوا۔ راہ میں دوسرے قبائل نے اپنے علاقے میں فوج کی مداخلت کو برا منایا۔ تاہم زید اللہ خان نے بتایا کہ چونکہ بونیر کا جرگہ وعدہ کر چکا ہے اس لئے پشتون روایات کے مطابق ایفائے عہد نہایت ضروری ہے۔ ۲۲ دسمبر کو تلکا میں ایک دو کوٹھوں کو آگ لگانے کے بعد انگریزی لشکر ۲۳ دسمبر کو امبیلہ پہنچ گیا۔

۲۸ دسمبر کو انگریز وہاں سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنی اپنی چھاؤنیوں کو واپس چلے گئے۔ اس کے بعد انہیں کبھی سوات اور بونیر کی طرف منہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور سرحد یوسف زئی کے یہ علاقے ہمیشہ غیر ملکی تسلط سے پاک رہے۔

امبیلہ کی جنگ کہنے کو تو ختم ہو گئی لیکن اس میں انگریزی فوج کے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد اُن لوگوں کی مجموعی تعداد سے بھی دوگنی تھی۔ جو ۱۸۴۹ء اور ۱۸۷۳ء کے درمیانی عرصہ کی

سرحدی مہمات اور جھڑپوں میں ہلاک ہوئے تھے۔ زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کی کل تعداد کوئی ایک ہزار تھی۔ جن میں سے ۳۷ بڑے بڑے انگریز افسر تھے۔ انگریز نے یہ نقصان محض ایک معمولی صند کو پورا کرنے اور مٹھی بھر مجاہدین کو مٹانے کے لئے کیا تھا۔ تاہم برطانوی خزانے کے کروڑوں روپے خرچ کرنے اور ہزاروں آدمی مروانے کے بعد اُس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا اور تحریک مجاہدین بدستور سرگرم عمل رہی۔

شہداء کو میدانِ جنگ کے ایک گوشے میں دفن کیا گیا۔ امبیلہ گاؤں کے عقب میں چیڑ کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ یہی "گنج شہداء" یا شہیدوں کا قبرستان ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انجیر کے درخت کے پاس ایک بڑی سی ڈھیری ہے۔ جہاں کئی شہداء کو یک جا دفن کیا گیا ہے۔ دورانِ جہاد جس جگہ اخون صاحبؒ کا قیام رہا۔ اور جہاں وہ مصروفِ عبادت و دعا رہے وہاں ایک خوبصورت پختہ مسجد بنادی گئی ہے۔

انگریز کی کئی فوجی رپورٹوں میں مسلمان شہداء اور زخمیوں کی تعداد تین ہزار بتائی گئی ہے اگر یہ تعداد مبالغہ آمیز نہ بھی ہو۔ تب بھی فرزندانِ اسلام کے لئے حوصلہ شکن اس لئے نہیں کہ ہمارا ایمان ہے کہ جو پیدا ہوا ضرور مرے گا۔ پھر اُس جان سے بڑھ کر قیمتی اور قابلِ فخر جان اور کون سی ہوگی۔ جو ملک و ملت کے ناموس کے لئے قربان ہو۔

۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۶ء تک

۱۸۶۳ء میں جہاں جہادِ امبیلہ میں انگریزی حکومت کو بہت بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ وہیں افغانستان کے امیر دوست محمد خان کی وفات سے ایک نیا سیاسی مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "نادر انساب نامہ" کے بیان کے مطابق وفات کے وقت امیر دوست محمد خان کے ۲۰ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑا سردار محمد افضل خان تھا اور اس سے چھوٹا سردار محمد عظیم خان تھا۔ باپ کے مرتے وقت وہ دونوں دارالحکومت میں موجود نہ تھے۔ وہ دُرانی ماں کے بیٹے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں زیادہ ہر دلعزیز بھی نہ تھے اس کے برعکس امیر کا پانچواں بیٹا شیر علی خان نہ صرف بہت ہوشیار اور قابل تھا بلکہ تھا بھی دُرانی خاتون کے بطن سے۔ اس لئے اُسے کابل میں تخت نشین کر دیا گیا۔ تاہم تخت نشینی کے ساتھ ہی افغانستان ایک بار پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ کبھی ایک شہزادہ حکومت سنبھالتا تو کبھی دُوسرا۔

ہندوستان میں اس وقت سر جان لارنس وائسرائے کے عہدے پر فائز تھا۔ جہاں تک سرحدی پالیسی کا تعلق ہے وہ عدمِ مداخلت کے رویّہ کو اپنانا ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ برطانوی ہند کو کابل کے کسی فریق کی بھی حمایت یا مخالفت نہیں کرنی چاہیئے۔ جو برسرِ اقتدار آ گیا۔ اُسے شاہِ افغانستان تسلیم کر لیا جائے گا۔ بعد میں اس کے دو جانشینوں لارڈ میو (MAYO) اور لارڈ نارتھ بروک (NORTH BROOK) نے بھی اسی غیر جانبدانہ پالیسی پر عمل کرنا بہتر سمجھا۔ کئی سال کی خونریزی اور خانہ جنگی کے بعد بالآخر جب امیر شیر علی خان نے اپنی بادشاہت کا لوہا منوا لیا تو برطانوی حکومت نے نہ صرف اس کی امارت تسلیم کر لی بلکہ اُسے ہر طرح کی امداد دینی بھی منظور کر لی۔

جہادِ امبیلہ کے بعد

جہادِ امبیلہ کی کامیابی سے سرحدی مجاہدوں کے حوصلے بلند ہو گئے وہ یہ جان گئے کہ اپنی ایمانی قوت اور اپنے اتحاد و اتفاق سے وہ

دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے بھی پنجہ لڑا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت انگریزی سامراج کے خاتمے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ فرنگی کی صورت تک دیکھنا انہیں گوارا نہ تھا۔ جہاں کوئی انگریز نظر آتا اُن کا خون کھولنے لگتا۔

بنّوں ۱۸۶۱ء سے بنّوں کو الگ ضلع قرار دیا گیا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد گورا فوج کوہاٹ بنّوں روڈ پر جا رہی تھی کہ انگریز کپتان میچم (MECHAM) کو کسی کابل خیل وزیری نے گولی کا نشانہ بنا دیا ـــــ اس پر اُس سارے قبیلہ کے خلاف فوج کشی کی گئی اور قاتل کو گرفتار کر کے اُسی جگہ پھانسی دی گئی جہاں سے انگریز کپتان کی لاش ملی تھی۔

ڈپٹی کمشنر تھارین (THORBUN) نے لکھا ہے کہ اس واقع کے بعد قبائلی حملے اور بڑھ گئے۔ ڈر کے مارے شام کے بعد چھاؤنی میں بھی کوئی فوجی باہر نہ نکلتا۔ ایک انگریز کو اس کے بنگلے میں سوتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔

بنّوں میں ایک بار فوجی سامان کا نیلام ہو رہا تھا لوگ قلعے کے باہر میدان میں جمع تھے۔ ایک انگریز افسر اپنے سکھ باڈی گارڈوں کے ساتھ نیلام کی نگرانی کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جوشیلا نوجوان مجمع کو چیر کر آگے بڑھا اور ہزاروں اشخاص کی موجودگی میں سکھ سپاہی پر خنجر (لور) سے وار کر کے اُسے ڈھیر کر دیا۔ جب اُس سے قتل کی وجہ پوچھی گئی تو جواب دیا "کافر کو مارنا میرا ایمان ہے۔ میں انگریز افسر کو مارنا چاہتا تھا لیکن اُس تک نہ پہنچ سکا تو سکھ ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔" بعد میں انگریزوں نے عین جمعہ کے دن، مویشیوں کی منڈی کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے سامنے اُسے پھانسی دی لیکن پھانسی چڑھتے وقت بھی اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ۱۸۷۰ء میں محمد خیل وزیری نے فرنگی حکمرانوں سے بغاوت کر دی ـــــ اُن دنوں سخت خشک سالی تھی۔ نہروں کا پانی بنوں چھاؤنی کے بنگلوں کو دے دیا جاتا تھا لیکن کھیتیاں پانی نہ ملنے سے سوکھ رہی تھیں۔ وزیریوں نے دریائے کرم پر بند باندھ کر پانی کا رُخ اپنے دیہات کی طرف کر لیا اور بنّوں چھاؤنی کو پانی سے محروم کر دیا ـــــ فضل شاہ اور مدامین وزیریوں کے ملک تھے۔ آخر انگریز افسر اُن پر فوجیں لیکر چڑھ دوڑے اور بمشکل تمام چھاؤنی کا پانی بحال کرایا۔

چھاؤنی کے پاس ہی کھیتوں میں ۲۴ اونٹ چر رہے تھے۔ اُن کے محافظ پاس ہی موجود تھے۔

اتنے میں ایک جنازہ آتے دکھائی دیا۔ جب جنازہ اٹھائے ہوئے لوگ اونٹوں کے بالکل قریب پہنچے تو چارپائی رکھ دی۔ چارپائی پر میت کی بجائے رائفلیں پڑی تھیں، جنازہ برداروں میں سے ہر ایک نے ایک ایک رائفل سنبھال لی اور اونٹوں کو ہانک کر اپنے علاقے میں لے گئے۔ یہ ساری کارروائی اتنی تیزی سے ہوئی کہ لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

محمد زئی قبیلہ کی کُل آبادی چند سو افراد سے زیادہ نہ تھی، اس کے باوجود انگریزوں کو اُن کے خلاف بہت بڑی فوجی مہم بھیجنی پڑی۔ سارے علاقے پر گھیرا ڈال لیا گیا۔ اگر اس موقع پر دوڑ ان کی مدد نہ کرتے تو سارے بھوکے مر جاتے۔ بالآخر انگریز قبیلے کے سب مردوں کو پکڑ کر لے گئے۔ چھ سرکردہ ملکوں کو لاہور لے جا کر قید کر دیا گیا۔ دو تو جیل ہی میں فوت ہو گئے جب کہ باقی چار کو وائسرائے نے اپنے دورۂ بنوں کے موقع پر رہا کر دیا۔ وزیریوں سے ہزاروں روپیہ جرمانہ بھی وصول کیا گیا۔

مہمند غازی

حضرت اخون صاحب سوات (عبدالغفور باباؒ) سارے قبائلی علاقہ کے رُوحانی پیشوا تھے اور لوگ اُن کے ادنیٰ اشارے پر اپنی جانیں قربان کر دینے کو تیار رہتے تھے۔ جنگِ امبیلہ کے موقع پر جونہی انہوں نے اعلانِ جہاد کیا، سارا قبائلی علاقہ فرنگیوں کے خلاف بھڑک اٹھا۔ علاقہ مہمند میں دسمبر ۱۸۶۳ء کو کئی مقامات پر مجاہدوں نے انگریزی فوج پر حملے کئے۔ اس پر انگریزوں کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے دھڑا دھڑ شبقدر کو اپنی فوجیں بھیجنی شروع کر دیں۔ ۱۸۶۴ء کا آغاز ہوا تو چھ ہزار سے زیادہ مسلح فوجی شبقدر میں جمع ہو چکے تھے۔ کمان کرنل میکڈانلڈ کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۲ جنوری کو انگریزوں کو معلوم ہوا کہ مہمند غازی چاروں طرف سے آ کر قلعہ شبقدر کے سامنے ایک پہاڑی پر جمع ہو رہے تھے۔ تاہم ایک منصوبے کے تحت اُن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی صبح سویرے انگریزی رسالے نے ان پر چڑھائی کر دی۔ شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ہر بار مجاہدین فرنگی دستوں کو پیچھے ہٹاتے تو وہ زیادہ طاقت سے اُن پر حملہ کر دیتے۔ اسّی کے قریب نے بہادری سے لڑتے ہوئے جانیں قربان کیں اور قلیل تعداد میں ہونے اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود ایک سو کے قریب انگریزوں کو موت کی نیند سُلا دیا۔

۱۸۶۵ء

۱۸۶۵ء میں اگرچہ افغانستان سے پریشان کُن خبریں آتی رہیں تاہم انگریز خاموش تماشائی بنے رہے۔ وہ ابھی جنگِ امبیلہ کے زخموں کو چاٹ رہے تھے اور اپنے

اندر اتنی طاقت نہ پاتے تھے کہ مسلمان مجاہدوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے برعکس انہوں نے تمام تر توجہ اپنی فوجی پوزیشن کو مستحکم بنانے پر مبذول کی۔ امبیلہ کی جنگ میں انگریز کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا جو اس سے پیشتر کسی اور مہم میں نہ ہوا تھا بلکہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۴ء تک کی تمام سرحدی مہموں میں مجموعی طور پر بھی اتنے افسر اور سپاہی نہیں مارے گئے تھے جتنے ایک غزائے امبیلہ میں۔

مردان میں گائیڈ رسالہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ گائیڈز نے سرحدی مہموں اور افغانستان کی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ۱۸۶۳ء کے بعد اس کی نفری بھی بڑھا دی گئی۔ اسی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں کچھ فوجی دستے ملیشیا قسم کے ایسے بنائے گئے تھے جن کی کمان براہ راست کمانڈر ان چیف کے ہاتھ میں نہ تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ایسے کئی ایک دستے ختم کر دیئے گئے۔ صوبہ سرحد میں اپنی فوجی اور سیاسی اغراض کے لئے انگریزوں ۱۸۴۹ء میں پنجاب فرانٹیئر فورس کے نام سے ایک پلٹن قائم کی تھی۔ اس فورس کی کمان پولیٹیکل افسروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور اس کے ساتھ رسالہ اور توپ خانہ بھی تھا۔ زیادہ تر سرحدوں کی حفاظت اس فورس کی ذمہ داری تھی۔ اس کا نام "پفرز" (PIFFRS) تھا۔ ۱۸۶۳ء کے بعد اس فوج کے جوانوں اور افسروں کی تعداد بڑھتے بڑھتے دس ہزار تک پہنچ گئی۔

چرچ مشنری

اپنی آمد کے ساتھ ہی انگریزوں نے عیسائیت کے پرچار کے لئے مشن قائم کئے۔ ۱۸۵۱ء میں ڈاکٹر کیمپ (KEMP) کی نگرانی میں پشاور مشن قائم کیا گیا بعد میں مشنری سکول ایڈورڈز مشن سکول کے نام سے ۱۸۵۵ء میں اس عمارت میں قائم کیا گیا۔ جو بارکزئی سرداران پشاور کی قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔ انگریز کا خیال یہ تھا کہ سرحدی قبائل کو "مہذب" اور "پُرامن" بنانے میں مشنری سوسائٹیاں، مشن سکول اور مشن ہسپتال اہم کردار بجالائیں گے۔ بعد میں یہ سلسلہ اور بھی بڑھ گیا۔ بنوں میں ڈاکٹر پنیل نے مشن کی نمایاں خدمات انجام دیں چنانچہ اس کے بارے میں ایک انگریز حاکم نے یہاں تک لکھا کہ "بنوں میں ڈاکٹر پنیل کا وجود فوج کی دو رجمنٹوں کے ہونے سے کہیں زیادہ مؤثر ہے"۔ اکبر الہ آبادی نے بجا کہا تھا۔

ع دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مغربی تعلیم کا بنیادی مقصد مسلمانوں اور دوسری ہندوستانی قوموں کے قلوب و اذہان کو بدلنا،

انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنا اور دینی تعلیم اور دُنیوی تعلیم کو الگ الگ راہوں پر ڈالنا تھا۔

کوہ سیاہ کے قبائل پر فوج کشی

ہماری یک جہتی اور ہم آہنگی کو نقصان پہنچانے میں جاگیر دارانہ نظام بھی ایک اہم عنصر ہے ــــ چونکہ صوبہ سرحد اور بالخصوص دُور دراز کے سرحدی اور پہاڑی علاقوں میں خان خوانین اور زمیندار بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ اس لئے ایک عرصے تک محنت کش اور غریب عوام کو اُبھرنے کا موقع نہ ملا اور ساری سیاست اُنہی جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے ہاتھ میں رہی جو اپنے مفاد اور اپنی مقصد برآری کے لئے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے، ایک سردار دوسرے کی ٹانگ کھینچنے یا دوسرے کے تسلط سے چھٹکارا پانے کے لئے سکھ اور فرنگی جیسی اسلام دشمن طاقتوں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ دوسرے سرحدی علاقوں کی طرح شمالی ہزارہ کی سیاست پر بھی یہی خان لوگ چھائے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی آمد کے وقت شمالی ہزارہ کی سیاست میں نواب آف امب اور خان اگرور کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ تاہم دونوں کی آپس کی ناچاقی ایک قابلِ افسوس بات تھی جس سے فرنگی شاطر لوگ پورا فائدہ اٹھا رہے تھے خان اگرور انگریزوں کے خلاف تھا۔ وہ اکثر انگریزی علاقوں پر چھاپے مارا کرتا تھا۔ اس پر انگریزوں نے اوگی کے مقام پر پولیس پوسٹ قائم کر دی اور ۲۴ سپاہی وہاں متعین کر دیئے۔ اس پر خان اگرور نے بُرا منایا، اور اسلامی غیرت اور جہاد کے نام پر کوہِ سیاہ کے قبائلیوں کو جمع کیا۔ انہوں نے ۳۰ جولائی ۱۸۷۸ء کو اوگی کی چوکی پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دیا۔

یہ دیکھ کر انگریزوں نے ایبٹ آباد چھاؤنی سے کرنل روٹنی کے تحت ایک فوج روانہ کی تاہم مسلمان مجاہد اس بے جگری سے لڑے کہ روٹنی کی کوئی پیش نہ گئی۔ مجبوراً انگریزوں نے اپنے حلیف نواب امب سے مدد مانگی، نواب امب نے اپنی فوج کا ایک دستہ انگریزوں کی مدد کے لئے بھیجا۔ اب بھی روٹنی اپنے آپ کو قبائلی غازیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ پاتا تھا۔ آخر لاہور اور دوسری جگہوں سے انگریزی فوج کے دستے ۲۴ ستمبر کو اوگی پہنچے اس اثنا میں پولیٹیکل حکام بھی جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ نواب امب کے تحت جرگہ بھیج کر انہوں نے حسن زئی کو ساتھ ملا لیا۔ البتہ باقی تمام قبیلے بدستور فرنگی سامراج کے بالمقابل ڈٹے رہے۔ ۴ اکتوبر کو انگریزی لشکر جنرل

برائٹ (BRIGHT) کے تحت پہاڑی علاقوں کی طرف بڑھے، آگے چل کر فوج کو مختلف دستوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر دستہ الگ الگ راستے سے آگے بڑھا۔ شام تک جنرل برائٹ کا دستہ چٹابٹ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا دستہ مناکا وانا کی طرف بڑھتا رہا۔ اس حملے میں انگریزوں نے توپیں ہاتھیوں پر لاد رکھی تھیں اور دھڑا دھڑ قبائل کے ٹھکانوں پر گولہ باری کر رہے تھے۔ ۱۲ اکتوبر کو انگریزی فوجیں مچائی تک پہنچ چکی تھیں۔ قبائلی مجاہدین اکا دکا حملے کرتے رہے لیکن چونکہ اُن کے پاس نہ اچھا اسلحہ تھا نہ کوئی اجتماعی نظام۔ اس لئے دشمن کو زیادہ نقصان پہنچنے نہ پایا۔ انگریزوں نے سارے علاقے کا جائزہ لیا۔ بعد میں سڑکیں تعمیر کر لیں اور اسی جنگ کو بہانہ بنا کر اگرور کے علاقے پر قبضہ جما لیا۔ صرف ایک دن میں انگریزوں کے پانچ آدمی ہلاک اور ۳۰ شدید زخمی ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ بعض اوقات انگریزوں کے پولیٹیکل افسر خود قبائل کو اکسا کر کارروائیوں پر مجبور کیا کرتے تھے، جنگ کی صورت میں ایک تو انہیں اپنے ہاتھ رنگنے اور اپنی اہمیت جتانے کا پورا موقع مل جاتا اور دوسرے قبائل کی انگریز دشمنی کو بہانہ بنا کر وہ اُن کے علاقوں پر قبضہ جما لیتے یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ ۱۸۸۸ء تک کوہ سیاہ کے مسلمان قبیلوں کو پھر انگریزوں کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

اورک زئی اورک زئی ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے جو درہ آدم خیل اور کوہاٹ کے نواح میں آفریدی قبائل کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اپنی قلت تعداد کے باوجود یہ قبیلہ ابتدا ہی سے انگریز کے خلاف مصروف جہاد رہا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے صوبہ سرحد میں وارد ہوتے ہی اورک زئی ان کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے۔ انگریز "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا ماہر رہا ہے۔ اس نے کسی بہانے اورک زئی کو آدم خیل آفریدیوں اور بعد میں بنگش قوم سے بھڑا دیا۔ ساتھ ہی اورک زئی کو خوش کرنے کے لئے ان کے ملک رحمت خان کو آٹھ ہزار روپیہ مواجب کے عوض کوہاٹ سے کوہاٹ تک سڑک کی حفاظت سونپ دی۔ اس رقم میں سے دو ہزار روپیہ سالانہ رحمت خان کو ملتا تھا۔ جبکہ چھ ہزار اُسے مسلح چوکیدار رکھنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ چوکیدار اورک زئی قبیلہ ہی کے افراد ہوتے تھے جب کبھی سڑک پر کوئی واقع ہوتا اورک زئی

چوکیدار آفریدیوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے۔ اس پر دونوں قبیلوں میں ٹھن جاتی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۵۳ء میں اورک زئی چوکیداروں اور آدم خیل آفریدیوں میں ایسی جھڑپ ہوئی جس میں طرفین کا کافی نقصان ہوا۔

اُدھر کوہاٹ سے ہنگو اور ٹل جانے والی شاہراہ پر کبھی کبھی اورک زئی چھاپہ مارتے اور انگریز کو پریشان کرتے۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۵ء کو اورک زئی کی شاخوں شیخاں، مُشتی اور ربیعہ خیل کے جوانوں نے درسمند میں مقیم بریگیڈیر جیمبرلین کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ اس پر کوہاٹ کے انگریز ڈپٹی کمشنر میجر کوک نے حکومت کو اورک زئی کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کو کہا۔ چنانچہ اس واقع کو بہانہ قرار دیتے ہوئے ڈھائی ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ انگریز نے تینوں طرفوں سے ربیعہ خیل پر چڑھائی کر دی۔ تاہم یہ کارروائی بے اثر ثابت ہوئی اور انگریز اورک زئی کا سرکاری علاقوں پر چھاپے مارنے سے باز نہ رکھ سکے۔ تنگ آکر انہوں نے ۱۸۵۹ء میں عثمان خیل کی ناکہ بندی کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عثمان خیل کو باہر سے خوراک پہنچنا بند ہو گئی جس پر عارضی طور پر صلح ہو گئی۔

۱۸۶۸ء میں اورک زئی کی بزوٹی شاخ نے علی ذئی پر حملہ کر کے ایک انگریز کو ہلاک اور دو کو زخمی کر دیا۔ اس پر انگریز بگڑ گئے اور انہوں نے بزوٹی، عثمان خیل اور سپاہ خیل قبائل پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا۔ اور ساتھ ہی ان لوگوں کو کہا گیا کہ وہ حملہ آوروں کے گھروں کو نذرِ آتش کر کے انہیں اپنے علاقوں سے نکال دیں لیکن انہوں نے انگریز کے اس مطالبے کے سامنے سر خم کرنے سے انکار کر دیا۔ تنگ آکر انگریز نے بزوٹی کا مواجب بند کر دیا۔ انگریز کی یہ انتقامی کارروائی بھی بزوٹی کو خائف نہ کر سکی اور وہ بدستور چھاپہ مار سرگرمیوں میں لگے رہے۔

۱۱ مارچ ۱۸۶۸ء کو انہوں نے انگریزی لشکر کے گیارہ افراد کو ہلاک اور ۴۴ کو زخمی کر دیا، چنانچہ میجر جونز (L.B. JONES) کی کمان میں اورک زئی پر فوج کشی کی گئی۔ اورک زئی ابلان درّہ میں تھے۔ انگریز نے ان تک پہنچنے کے لئے کوتل پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے اورک زئی پر وار کرنا آسان تھا لیکن مجاہد اس انگریزی مورچے سے بھی بلند تر چوٹی پر قابض ہو گئے اور سنگر (مورچے) قائم کر لئے۔ یہ سنگر ایسی جگہ پر تھا کہ جو انگریز آگے بڑھتا مجاہدوں کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ کمانڈر بار بار اپنے دستوں کو کمک بھیجتا لیکن ہر بار مجاہد انہیں پیچھے ہٹا دیتے۔ شام تک انگریز ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے۔ انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ شام کو جب اپنی لاشیں اٹھائے زخمیوں کو ٹانگوں اور ڈولیوں میں

لادے انگریز فوجیں کوہاٹ پہنچیں تو اُن کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے جب یہ خبر باقی چھاؤنیوں میں پہنچی تو ماتم بپا ہو گیا۔

اب کے یہ صلاح ٹھہری کہ حملہ کرنے کی بجائے قبائلیوں کا اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے اور اُن پر رسد بند کر دی جائے۔ تاہم یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا۔ آفریدی اور اورک زئی بدستور ڈٹے رہے مہینوں تک یہی حال رہا لیکن مجاہدوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کے برعکس انگریزی فوج کی کئی حفاظتی چوکیاں اورک زئی مجاہدوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں ـــــ ۱۳ر فروری کو انگریزوں نے پشاور کوہاٹ روڈ کی ایک چوکی کو واگذار کرانے کے لئے کوتل سے اورک زئی پر حملہ کیا لیکن مُنہ کی کھائی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اورک زئی پر بہت بڑی فوجی مُہم بھیجی جائے۔

۲۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو کرنل کے (KEYES) یہ مہم لے کر نکلا، اورک زئی کو کسی نہ کسی طرح لشکر کی آمد کا پہلے سے پتہ چل گیا۔ انہوں نے اپنے بال بچے ساز و سامان اور مال مویشی دور دراز پہاڑی علاقوں کو بھیج دیئے اور خود اِدھر اُدھر مورچوں میں دبک کر بیٹھ رہے۔ انگریزی فوج کے سپاہی دیہات کو جاتے تو وہاں کوئی شخص نظر نہ آتا۔ بامرِ مجبوری کرنل کے نے پشاور سے مدد طلب کی اور ایک منصوبہ بنا کر شمال اور جنوب دونوں طرف سے اورک زئی پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس اقتصادی ناکہ بندی سے تنگ آ کر گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ بالآخر ۴ر اپریل ۱۸۶۹ء کو صلح کی شرطیں طے پا گئیں۔

سال ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء میں خشک سالی کی وجہ سے قحط رونما ہو گیا۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کے لوگ کچھ تو جنگوں، بدامنی، سکھوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پہلے ہی قلاش ہو چکے تھے۔ اب رہی سہی کسر قحط نے نکال دی۔ ہزاروں لوگ فاقوں سے مر گئے۔

امیر شیر علی کی آمد

۱۸۶۸ء کے آخر تک کابل کی خانہ جنگی تھم گئی تھی اور امیر شیر علی خان کو فرمانروا تسلیم کر لیا گیا تھا۔ روسی حملوں اور اپنے بھائی بندوں کی آویزشوں کے خدشہ کے پیشِ نظر امیر شیر علی خان انگریزوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا خواہشمند تھا، جان لارنس کی بھی یہی پالیسی تھی کہ ہمسایہ ملک میں امن قائم رہے۔ اُس نے امیر کابل کو ہندوستان کے دورے کی دعوت دی۔ امیر نے دعوت بخوشی قبول کر لی اور ۱۸۶۹ء کے آغاز میں کابل سے چلکر

درہ خیبر کی راہ پشاور پہنچا۔ اس عرصے میں لارنس کی بجائے لارڈ میو ہندوستان کا وائسرائے بن چکا تھا۔
۲۴ مارچ کو امیر شیر علی خان انبالہ پہنچے جہاں ایک شاہی دربار منعقد کیا گیا تھا۔ امیر افغانستان کے ہمراہ ولی عہد شہزادہ عبداللہ جان اور دوسرے عمائدینِ سلطنت بھی تھے۔ اُدھر لارڈ اور لیڈی میو بھی کلکتہ سے روانہ ہو کر دھوم دھام سے انبالہ پہنچے جہاں ہر طرف عالی شان خیمے نصب تھے، بارہ ہزار چاق و چوبند سپاہی پریڈ کرتے تھے، توپیں نصب تھیں۔ جو صبح، دوپہر، شام سر کی جاتی تھیں۔ ۲۷ مارچ کو دونوں سربراہانِ مملکت کی ملاقات ہوئی۔ لارڈ میو نے امیر کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ امیر نے پریڈ کا معائنہ کیا اور انگریزی افواج کے ڈسپلن سے بڑا متاثر ہوا۔ اس موقع پر سارے ہندوستان کے والیانِ ریاست اور بڑے بڑے فوجی اور سول افسر بھی موجود تھے سرحد میں متعینہ فوجیوں میں سے میجر لمسڈن اور وار برٹن بھی موجود تھے، امیر کا اُن سب سے تعارف کرایا گیا امیر شیر علی خان کی کوشش تھی کہ ایک دوستانہ معاہدہ طے پا جائے جس کی رُو سے انگریز روسی حملوں اور اندرونی شورشوں کے خلاف اس کی مدد کریں اور افغانستان کی سلامتی کا ذمہ لیں۔ تاہم انگریز اب تک لارڈ لارنس کی "عدم مداخلت" کی حکمتِ عملی پر کاربند تھے۔ وہ زبانی طور پر امیر کو دوستی کا یقین دلاتے تھے لیکن تحریری معاہدہ کرتے ڈرتے تھے۔ بہر حال طے پایا کہ انگریزی حکومت امیر شیر علی خان کو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور اسلحہ کی مقررہ مقدار فراہم کرتی رہے گی اور امیر روسیوں کے خلاف انگریزوں کا حلیف رہے گا۔

۳ اپریل کو انبالہ کا دربار ختم ہوا۔ واپسی سفر کے دوران امیر کابل نے کچھ دن تک پشاور میں قیام کیا، چونکہ وہ انگریزوں کی فوجی تیاریوں سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ اس لئے کابل پہنچتے ہی ایک نئی چھاؤنی بنانے کا حکم دے دیا اور ہزاروں معمار اور مزدور کام پر لگا دیئے۔

صوبہ سرحد وار برٹن کی نظر میں

سر رابرٹ وار برٹن کو خیبر ایجنسی کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ متواتر اٹھارہ برس تک اس ذمہ داری کو نبھاتا رہا۔ اس کا باپ فوجی افسر کی حیثیت سے پہلی جنگِ افغانستان (۴۲-۱۸۳۹ء) کے سلسلے میں کابل گیا اور وہاں ایک افغان شہزادی جو امیر دوست محمد خان کی بھانجی تھی۔ شادی کر لی۔ رچرڈ وار برٹن اسی افغان شہزادی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ فارسی اور پشتو پر کامل عبور رکھنے کے علاوہ مشرقی

آدابِ معاشرت سے بخوبی واقف تھا اس لئے صوبہ سرحد میں جہاں جاتا لوگوں سے گھل مل جاتا۔ جولائی ۱۸۷۰ء میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں وار برٹن پہلی بار پشاور پہنچا تو کرنل واٹر فیلڈ یہاں کا ڈپٹی کمشنر تھا اور رچرڈ پولاک یہاں کا کمشنر۔ وار برٹن کا بیان ہے کہ اُن دنوں پشاور کے نام سے انگریز افسر کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے، ابھی یہاں ریل نہ آئی تھی۔ آنے والے راولپنڈی سٹیشن پہ اُترتے اور پھر گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے پشاور پہنچتے۔ پشاور کا علاقہ دلدلی اور نشیبی تھا۔ ہر طرف سبزہ ہونے کی وجہ سے مچھروں کی بہتات تھی۔ بخار اور ہیضہ پھوٹ پڑتا تو بہت نیا ہی مچاتا۔ ۱۸۶۹ء کا ہیضہ بہت ہی جان لیوا ثابت ہوا۔ کچھ دنوں کے لئے وار برٹن کو کوہاٹ جانے کا موقع ملا جہاں اُن دنوں کیوگنیزی (CAVAGNARI.) ڈپٹی کمشنر تھا۔

اُن دنوں پشاور کے لوگ شکار کے شوقین تھے انگریز بھی باز پالتے، کُتے رکھتے اور اکثر ٹولیوں کی صورت میں گرد و نواح کے علاقے بلکہ رستم، سدوم (مردان) تک گھوڑوں کا شکار کیا کرتے۔

وار برٹن بتاتا ہے کہ تہکال سے جمرود تک کا علاقہ گھنے جنگل پر مشتمل تھا لیکن بعد میں آفریدیوں نے درخت کاٹ کاٹ کر یہ جنگل ختم کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اُن دنوں چھاؤنی میں بسنے والے انگریز ہر وقت خائف رہا کرتے تھے۔ پہاڑی لوگ اِدھر اُدھر پھرتے رہتے تھے جو چیز ان کے ہاتھ لگتی اٹھا کر چلتے بنتے۔ خصوصاً گھوڑوں اور رائفلوں پہ تو یہ لوگ جان چھڑکتے تھے، مارچنگ کرتے ہوئے فوج سڑک پر جاتی تو لوگ ساتھ ساتھ ہو لیتے اور کوئی فوجی غافل ہوتا تو اس کی رائفل چھین کر چلتے بنتے۔ مردان میں دورے کے دوران ایک انگریز افسر نے کسی راہ گیر سے کہا کہ ایک منٹ کے لئے اُس کے گھوڑے کی باگ تھام لے کہ اُسے کوئی کام درپیش تھا۔ راہ گیر نے گھوڑے پر چست لگائی اور اُسے لے کر ہوا ہو گیا۔ پولیس تلاش کرتی رہی لیکن اُسے گرفتار کر لے نہ پائی۔ گھوڑے اور رائفل تو درکنار گورا سپاہیوں اور افسروں کی اپنی جان محفوظ نہ تھی ـــــ ایک رات کچھ قبائلی چھاؤنی میں آئے، انہیں اور تو کچھ نہ ملا تو ایک موٹے تازے انگریز ہیڈ ماسٹر کو اٹھا کر چلتے بنے۔ بڑی منّت سماجت سے حکومت اُسے واپس لائی۔

اس وقت تک کسی انگریز کو قبائلی علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے تمام معاملات مقامی خوانین، ملکوں اور سرداروں کے ذریعے طے کئے جاتے تھے۔ وار برٹن نے اپنے تجربے کی

بنا پر اس طریق کار کی سخت مذمت کی ہے ۔

وار برٹن کے بیان کے مطابق مختلف قبائل سے نپٹنے کی ذمہ داری مختلف خوانین کو سونپی گئی تھی، گدون اور خدوخیل کے لئے ابراہیم خان آف زیدہ ، وادی چملہ اور نارنجی کے نواحی قبیلوں کے لئے امیر خان آف شیوہ ، بونیر کے باشندوں کے لئے عجب خان ، سوات اور رائیزئی کے لئے ہوتی مردان کے خوانین اتمان خیل کے لئے تنگی کے میر حسن خان اور ابازئی کے میانگان ، مہمند کے لئے مٹہ مغل خیل کے خان اور داؤدزئی کے تحصیلدار ارباب عبدالمجید خان ، خیبری آفریدیوں اور ملاگوری کے لئے تہکال بالا کے ارباب صاحبان اور اکاخیل ، آدم خیل کے لئے لنڈی یرغہ جوڑ کے ارباب سرفراز خان نگران کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ مختلف قبیلوں کے جرگوں سے ساری بات چیت انہی خوانین کی وساطت سے ہوتی تھی ـــــ وار برٹن کی رائے میں ان قبیلوں کو مشتعل کرنے اور حالات بگاڑنے کی زیادہ تر ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی تھی کہ وہ اپنی اہمیت جتانے کے لئے بسا اوقات کوئی نہ کوئی چکر چلاتے رہتے تھے ـــــ مردان میں اسسٹنٹ کمشنر کے فرائض انجام دینے کے دوران وار برٹن پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی تھی کہ جنگِ امبیلہ کی زیادہ تر ذمہ داری عجب خان چارگلئی (سدوم) مردان پر عائد ہوتی ہے ۔ اس کا ایک بھائی ڈگر کے خان کی بہن سے شادی شدہ تھا ۔ اس لئے وہ ایک طرف تو انگریزوں کو تسلی دیتا رہا کہ وہ بونیر کے لوگوں کو انگریزی علاقہ پر حملہ کرنے سے باز رکھے گا اور دوسری طرف اہلِ بونیر کو انگریزوں کے خلاف بھڑکاتا رہا ۔ کہ اگر تم نے اب کے انگریز کو نہ روکا تو تمہارا "پردہ" اٹھ جائے گا ۔ اور انگریز ہمیشہ کے لئے تمہارے علاقہ پر قابض ہو جائے گا ۔ اس غیرت دلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوات اور بونیر کے تمام قبائل آپس کے اختلافات بھلا کر متحد ہو گئے اور پندرہ ہزار جنگجو جمع کر کے انگریزوں کے دانت کھٹے کئے ۔

وار برٹن کے خیال میں اس سے یہ کہیں بہتر اور مفید تر تھا کہ انگریز براہِ راست خود اُن قبائل کے ذمہ دار افراد سے رابطہ قائم کرتے ۔ کیونکہ قبائلی سردار بڑے جہاندیدہ لوگ تھے ۔ اُن سے اچھا سلوک کیا جاتا اور انہیں امن کی یقین دہانی کرائی جاتی تو غلط فہمیاں دور ہو کر باہمی مفاہمت پیدا ہوتی اور مسائل آسانی سے طے ہو جاتے ۔

لارڈ میئو کا قتل شیر علی تیراہ کا رہنے والا آفریدی تھا۔ اپنے وطن میں اس کی اپنے بھائی بندوں (تربوروں) سے عداوت تھی۔ مدت سے قتل مقاتلے جاری تھے۔ ایک فریق دوسرے فریق کے آدمی کو مار دیتا تو دوسرا فریق انتقام کے لئے موقع کی تاڑ میں رہتا جہاں موقع ملتا وہ قاتل سے بدلہ لے کر دل ٹھنڈا کرتا۔ شیر علی اس آئے روز کی دانتا کل کل سے تنگ ہو کر پشاور چلا آیا اور انگریز کی نوکری کر لی۔ اُن کی ہر ممکن خدمت کر کے انہیں خوش رکھا۔ یہاں تک کہ جنگِ امبیلہ میں انگریز کی طرف سے جا کر اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گولیاں چلائیں ـــــ صرف اس لئے کہ انگریز خوش رہے اور انگریز افسر اُس سے خوش بھی تھے۔ رفتہ رفتہ وہ کمشنر پشاور کے اردلیوں (محافظوں) کے دستہ میں لے لیا گیا۔ وہ مزے سے زندگی گزار رہا تھا لیکن یہ مزے اُسے راس نہ آئے ـــــ ایک دن وہ کمپنی باغ (مال روڈ) میں گھوم رہا تھا کہ اُس نے اپنے ایک "تربور" (دشمن) کو دیکھ لیا۔ اُس نے خیال کیا کہ شاید وہ تیراہ سے اُسی (شیر علی) کی تاک میں آیا ہے۔ شیر علی نے سوچا کہ قبل اس کے کہ دشمن اس پر وار کرے کیوں نہ پہلے ہی اس کا کام تمام کر دیا جائے چنانچہ اس نے پستول نکالا اور دشمن کو وہیں ڈھیر کر دیا۔

مال روڈ پر، انگریز افسروں کی بالکل ناک کے نیچے، ایک پبلک سیرگاہ میں قتل کیسے چھپا رہتا۔ شیر علی پر مقدمہ چلا ـــــ سادہ لوح شیر علی کو یقین تھا کہ اس نے جن انگریز افسروں کی عمر بھر خدمت کی ہے وہ اسے سزا سے بچا لیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ عدالت نے اس کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ البتہ اس کی اپیل پر اور اس کی خدمات کے پیشِ نظر بعد میں سزائے موت کو عمر قید کی سزا (کالا پانی) میں تبدیل کر دیا گیا اور شیر علی کو قیدی بنا کر جزائر انڈیمان بھیج دیا گیا، جہاں وہ دوسرے ہزاروں لوگوں کے ساتھ قید کاٹنے لگا ـــــ تاہم اس غیور آفریدی کے دل میں یہ بات سما گئی کہ انگریز قابلِ اعتماد نہیں۔ اس سے وفا کی اُمید غلط ہے اور اُس سے انتقام لینا ضروری ہے۔ لیکن یہ بات اس نے دل ہی میں رکھی۔ قید کے دوران وہ دین کی طرف مائل ہو گیا۔ نماز پابندی سے پڑھنے لگا۔ ڈاڑھی بھی بڑھالی اور اس کا اکثر وقت قرآن شریف کی تلاوت میں گزارنے لگا۔ وہ یوں بھی بڑا خادم خلق تھا۔ ہر ایک کی مدد کرتا۔ ہر ایک کا کام کر دیتا اس لئے باقی ساتھیوں میں بڑا ہر دلعزیز تھا۔ انہی دنوں جمعیتِ مجاہدین کے وہ ارکان بھی جنہوں نے امبیلہ اور دوسرے مقامات پر انگریز کے خلاف

جہاد میں حصّہ لیا تھا۔ کالے پانی (عمر قید) کی سزا گزار رہے تھے۔ وہ سب عالم باعمل لوگ تھے۔ شیر علی اُن کے پاس اٹھتا بیٹھتا اور اُن کے وعظ و نصیحت کو بغور سُنتا۔

۸ر فروری ۱۸۷۳ء کا دن جزائر انڈیمان (جہاں برصغیر کے عمری قیدی بھیجے جاتے تھے) کی تاریخ میں یادگار دن تھا۔ اُس دن وائسرائے ہند لارڈ میئو جو جیلوں کی اصلاح کا دلی حامی تھا اور چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں قیدیوں کا حال دیکھے اور اپنے کانوں اُن کی سرگزشت سُنے، اسی مقصد کے لئے انڈیمان پہنچا تھا۔ بڑے بڑے افسر بھی اس کے ساتھ تھے اور ذاتی عملہ کے ارکان اور محافظ بھی۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کا کوئی وائسرائے اس بدقسمت جزیرہ کے معائنہ پر آیا ہو۔ اس لئے اس کے استقبال کی بڑی تیاریاں کی گئی تھیں۔ جہاز سے جونہی لارڈ میئو نے جزیرے پر قدم رکھا۔ اکیس توپوں کی سلامی سے اُسے خوش آمدید کہا گیا۔ سارا دن وائسرائے قیدیوں کی بارکوں۔ ورکشاپ اور فیکٹری وغیرہ کو دیکھتا رہا۔ پچھلے پہر کچھ آرام کیا۔ شام ہوئی تو جزیرے کی ایک پہاڑی چوٹی (ماؤنٹ ہیریٹ) پر جا بیٹھا۔ یہ چوٹی ۱۱۹۳ فٹ اُونچی تھی اور اسے ایک عمدہ سیرگاہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ دیر تک وائسرائے وہاں بیٹھا غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتا رہا۔ شام ہوئی تو واپسی کے لئے اٹھا۔ راہ میں ایک پُل پڑتا تھا۔ پُل سے گزر کر وائسرائے کو ایک کشتی کے ذریعے اپنے شاہی بحری جہاز میں شب بسری کے لئے جانا تھا۔ مشعلیں اٹھائے دو شخص اس کے آگے آگے جا رہے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری اور باڈی گارڈ دائیں بائیں چل رہے تھے۔ پولیس کی مسلح گارد پیچھے پیچھے تھی۔ جونہی گھاٹ کی سیڑھیاں اُترا۔ وائسرائے پر کسی نے چھُری سے وار کیا ——— دس بارہ آدمی ایک دم حملہ آور پر ٹوٹ پڑے۔ ارجن نامی قیدی نے پکڑ کر چھُری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ افراتفری اور دوڑ بھاگ میں مشعلیں بھی گم ہو گئیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری آگے بڑھا اور حملہ آور کو باریٹ سے چھڑایا ورنہ وہ لوگ تو اسے جان ہی سے مار دیتے۔

لارڈ میئو زخمی ہو کر سمندر میں گر گیا۔ تاہم سنبھلا اور مُنہ صاف کرتا ہوا اُٹھا ——— پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا "فکر کی بات نہیں۔ زخم معمولی ہے ٹھیک ہو جاؤں گا" محافظ وائسرائے کو سہارا دے کر پرے لے گئے مشعلیں دوبارہ روشن کی گئیں تو معلوم ہوا وائسرائے کی پشت سے کوٹ میں چھید پڑ گیا ہے اور خون پرنالے کی طرح بہہ رہا ہے۔ انہوں نے رومال وغیرہ باندھ کر خون روکنا چاہا

لیکن خون نہ رُکا۔ وائسرائے ایک دو منٹ تک چُپ چاپ بیٹھا رہا پھر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ گرا اور گرتے ہی اُس کی جان نکل گئی۔

یہ قاتلانہ حملہ شیر علی آفریدی ہی نے کیا تھا۔ شیر علی چھوٹے سے قد کا کمزور سا آدمی تھا اور لارڈ میو سات فٹ قد اور مضبوط جسم کا دیو پیکر انسان، دیکھنے والے حیران ہوتے تھے کہ شیر علی میں یہ بجلی کی سی پھرتی اور بلا کی طاقت کہاں سے آگئی۔

اس پر قتل کا مقدمہ چلا۔ حکومت کا خیال تھا کہ قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ ان دنوں مولوی محمد جعفر تھانیسری اور سید احمد شہید کے پیروکار مجاہدین میں سے کئی ایک جزائر انڈیمان میں بغاوت کے مقدموں میں قید کاٹ رہے تھے، اس لئے انگریزوں نے مجاہدین کو مقدمے میں ملوث کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ شیر علی نے خود تسلیم کیا کہ اُس نے ۱۸۶۹ء ہی سے تہیہ کر رکھا تھا کہ مرنے سے پہلے ایک نہ ایک انگریز کو قتل کرے گا۔ اس سے پہلے بھی ایک موقع پر اس نے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں توڑ کر اور بتی بجھا کر گورے پہرہ دار کی سنگین چھین کر اُسے زخمی کر دیا تھا۔ اور اس کی قید میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ وائسرائے کے قتل کے بارے میں جب بھی اس سے پوچھا جاتا کہ "تم نے حملہ کس کی ایماء پر کیا ہے"؟ ـــــ تو وہ صرف یہی جواب دیتا۔ "خدا کے حکم سے"۔ اس نے بتایا کہ وہ وائسرائے کی آمد پر دن بھر گھاٹ میں بیٹھا رہا لیکن موقع نہ مل سکا۔ شام کو نا اُمید ہو کر وہ ماؤنٹ ہیریٹ پر جا بیٹھا کہ تقدیر گھیر کر وائسرائے کو خود بخود اُدھر لے آئی۔

ہندوستان بھر کے لوگوں نے مقدمے سے گہری دلچسپی لی۔ بالآخر ۱۱ مارچ ۱۸۷۲ء کو شیر علی کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا ـــــ پھانسی پانے سے پہلے اس نے پھانسی کے رسّے کو چُوما اور بلند آواز سے کہا۔

"میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تو اُسی وقت سے اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ مسلمان بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو مار ڈالا۔ تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں"۔

یہ کہہ کر شیر علی کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ دو دفعہ کلمہ پوری طرح پڑھا۔ تیسری بار پھانسی کی رسّی سے گلا گھٹ گیا تو الفاظ پوری طرح ادا نہ ہونے پائے۔ یوں آفریدی مجاہد نے اپنا انتقام لے لیا۔ اگرچہ حکومت کو مجاہدین کے معاملے میں ملوث ہونے کا کوئی واضح ثبوت نہ مل سکا تاہم مجاہدین کی قید میں

کئی کئی سال کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ تھا فرنگیوں کا انصاف[1]۔

دَوڑ دَوڑ وزیرستان کا ایک غریب لیکن مجاہد قبیلہ ہے جو بنوں کے مغرب میں درویش خیل وزیر اور محسود کے درمیان آباد ہے۔ اس علاقے تک پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ درّہ ٹوچی۔ درّہ باران اور درّہ خیسورہ، فرنگی اس بات کے متمنی تھے کہ دوڑ کے علاقے میں طاقت کا مظاہرہ کریں۔ چنانچہ اس بات کو بہانہ بنا کر دوڑ گاہے گاہے نواحی فوجی چوکیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں حکومتِ ہند نے پنجاب فرانٹیئر فورس کے بریگیڈیر جنرل کے (KAYES) کو دَوڑ پر فوج کشی کرنے کی ہدایت کی، انگریز "ہمیشہ لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے تھے اس لئے سرحدی مجاہدوں پر حملہ کرنے کے لئے سکھ پلٹنوں کو آگے آگے رکھا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں پیش پیش رہا کرتے تھے اور مذہبی جوش سے بہادری دکھاتے تھے۔

۱۸۷۱ء میں جب وزیریوں کے خلاف فرنگیوں نے تادیبی مہم بھیجی تو بھی دَوڑ نے وزیریوں کا ساتھ دیا۔ اسے بھی بہانہ قرار دیا گیا ـــــ پہلے دَوڑ کا جرگہ بُلایا گیا اور انگریزوں نے دَوڑ قبیلہ کی مختلف شاخوں پر جُرمانہ کر دیا گیا۔ جب وہ نادار لوگ جرمانہ ادا نہ کر سکے تو پوری قوت سے اُن پر حملہ کر دیا گیا۔

۵، ۶ مارچ ۱۸۷۲ء کی درمیانی شب کو یہ لشکر جرّار شنکی کوتل پر قبضہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ ایک دَوبار قبائل نے اس فوج کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی لیکن اس سیلِ بے پناہ کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی۔

۷ مارچ کی صبح کو جنرل صاحب نے شنکی کوتل کی طرف پیش قدمی کی۔ سیاسی جوڑ توڑ کے لئے علاقے کا کمشنر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ شنکی کوتل سے پرے دوڑ کے تین گاؤں حیدر خیل حسو خیل اور ایپی تھے۔ انگریز کی نظریں انہی دیہات پر تھیں۔ ابھی لشکر شنکی خیل سے کوچ کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ دَوڑ کے قبائلی سربراہ کمشنر صاحب اور جنرل صاحب کے پاس آئے اور صُلح کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اُن سے فراخدلانہ سلوک کرنے کی بجائے انگریز نے انہیں بے بس سمجھتے ہوئے جرمانہ کے علاوہ اُن پر

---

[1] سرگزشت مجاہدین۔ (مہر)

مزید تاوانِ جنگ عائد کر دیا۔ حسوخیل سے ایک ہزار اور حیدرخیل اور اپی سے پانچ سو روپیہ کا اضافی جرمانہ طلب کیا گیا۔ قبائلی ملکوں نے جرمانہ ادا کرنے کے لئے کچھ مہلت مانگی۔ اُس وقت سہ پہر کا عمل تھا۔ انگریزوں کو خدشہ تھا کہ رات ہو گئی تو قبائلی حملہ کر دیں گے۔ اس لئے انہوں نے انہیں مُہلت بھی دی تو صرف پندرہ منٹ کی —— پندرہ منٹ میں وہ غریب بھلا اتنی رقم کہاں سے لاتے —— جب پندرہ منٹ گزر گئے تو فرنگی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی وہ توپ خانہ لے کر آگے بڑھے اور حیدرخیل کا محاصرہ کر لیا۔ دَوڑ بڑے پریشان ہوئے مجبوراً انہوں نے اپنے مکانوں کی دیواروں کی آڑ لی اور مقابلہ شروع کر دیا۔ ایک ایک گلی کوچے اور ایک ایک مکان پہ گھمسان کا رَن پڑا۔ دست بدست لڑائی تک نوبت آ پہنچی۔ تاہم توپوں نے مسلسل گولہ باری کر کے انہیں بے بس کر دیا۔ مکان ایک ایک کر کے گرنے لگے تو مجبوراً یہ مٹھی بھر مجاہد میدان میں نکلے۔ ان کا گاؤں سے نکلنا تھا کہ انگریزی رسالے کے سوار نیزے تان کر اُن پہ ٹوٹ پڑے۔ مجاہدین کے جسم چھلنی ہو گئے۔ لاشوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے رَوند دیا گیا۔ بالآخر ایک ایک کر کے ہر مجاہد یا تو جامِ شہادت نوش کر گیا اور یا فرنگی کے ہاتھوں قید ہوا۔ ایک گاؤں کا یہ حشر دیکھ کر باقی سارا علاقہ دم بخود رہ گیا۔ دُنیا کی کسی بھی قوم نے آج تک بستے شہریوں پہ اتنے مظالم نہیں ڈھائے جتنے انگریز نے۔

بعد میں اپی کے لوگوں نے بھی فرنگی فرعونوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے بے پناہ قربانی دی۔ البتہ حسوخیل کے رہنے والوں نے صُلح کر کے مزید کشت وخون کو روکا —— انگریزوں نے دل کی بھڑاس نکالی اور لوگوں پہ اپنی طاقت کا سکہ بٹھانے کے بعد واپس بنّوں چلے گئے۔ انہوں نے کُل اٹھارہ گھنٹے داوڑ کی سرزمین پر گزارے۔

مہمند

مارچ ۱۸۷۳ء میں پشاور اور اردگرد کی چھاؤنیوں میں رہنے والے افسروں میں بڑی دہشت پھیل گئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ قلعہ مچنی کے کمانڈنٹ میجر میکڈانلڈ کو لال پورہ کے بہرام خان مہمند نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ میکڈانلڈ اپنے بُل ڈاگ کے ساتھ روزمرہ کے معمول کے مطابق قلعہ سے باہر مرگشت کر رہا تھا کہ دوسری طرف سے بہرام خان مہمند چند سواروں کے ساتھ اُدھر آ نکلا۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ دیہاتی کتے بھی تھے۔ ان کتوں نے انگریز میجر کے بُل ڈاگ پر حملہ کر کے اسے خوب بھنبھوڑا۔ میجر صاحب افسری

کے نشے میں تھے۔ اور اُسے یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ بہرام خان لال پورہ کے حکمران مہمند قبیلے کا چشم و چراغ ہے۔ اس لئے اس نے انہیں بہت بُرا بھلا کہا۔

بہرام خان اس وقت تو بات کو پی گیا لیکن بعد میں ٹوہ میں لگا رہا۔ اُسے معلوم ہوا کہ میجر میکڈانلڈ روزانہ سہ پہر قلعے سے باہر سیر کو نکلا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن جب میکڈانلڈ اپنے ایک دوست کیپٹن کلفورڈ (CLIFFORD) کے ساتھ سیر کر رہا تھا کہ بہرام خان نے حملہ کر کے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ کلفورڈ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ عام روایت یہ ہے کہ انگریز مچلنی قلعہ کے پاس دریا میں ننگے نہایا کرتے تھے، چونکہ وہاں سے عورتوں کا گزر بھی ہوتا تھا۔ مہمند ملکوں نے انہیں منع کیا اور منع نہ ہونے پر میجر میکڈانلڈ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

ایک عجیب واقع

وار برٹن نے اپنی کتاب میں انہی دنوں کا ایک عجیب واقع بیان کیا ہے۔ جس سے شہدائے اسلام اور اولیائے کرام کی کرامات کا اقرار کئے بغیر بن نہیں پڑتی۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پشاور شہر اور گرد و نواح کے دیہات بلکہ سارے سرحدی علاقے میں جگہ جگہ کچھ مزارات دکھائی دیتے ہیں جن کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ صاحبان مزار کون ہیں؟ ـــــ ایک بات البتہ یقینی ہے کہ "سلطان محمود غزنوی، محمد غوری اور دوسرے فاتحینِ اسلام کے ساتھ جو غازی آئے وہ جگہ جگہ کفار سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ جہاں وہ زخمی یا شہید ہوئے وہیں دفن کر دیئے گئے۔ اور بعد میں لوگوں نے احتراماً ان کے مزار بنا ڈالے۔ شہدائے اسلام کو چونکہ جنتی ہونے کی بشارت ملی ہے۔ اس لئے ان کے لئے کفن دفن اور غسل لازم نہیں ہوتا۔ بلکہ اکثر اوقات بڑی سی اجتماعی قبر کھود کر سب کو اکٹھا اس میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں لمبی لمبی نوگزی (اصل میں نوغازی) اور چہل گزی قبریں اصل میں انہی شہدائے اسلام کی اجتماعی قبریں ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے جان دی۔ تاہم نہ اُن کے نام معلوم ہیں نہ سالِ وفات۔

وار برٹن نے بیان کیا ہے کہ کیپٹن اینڈرسن لفٹیننٹ ولیم سن (WILLIAM SON) اور ڈاکٹر پامر تین انگریز افسر تھے جن کا تقرر ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ نوشہرہ چھاؤنی میں ہوا ـــــ اُس زمانے میں چھاؤنی آباد نہ تھی، نئے نئے بنگلے بن رہے تھے۔ چنانچہ ان تینوں دوستوں کے لئے دریائے کابل کے دائیں کنارے چھاؤنی میں بنگلہ بنانے کے لئے ایک جگہ منتخب کی گئی۔ اس جگہ کے اردگرد شیشم

کے درخت تھے، جن کے نیچے چار پانچ پرانی قبریں تھیں۔ ایک قبر ذرا بڑی تھی۔ اس پر ایک بوڑھا مجاور بیٹھا رہتا تھا۔ جمعرات کو وہ مزار پر باقاعدگی سے چراغاں کرتا اور گرد و نواح کے عقیدت مند فاتحہ خوانی اور حصولِ برکات کے لئے وہاں آتے تھے۔ بنگلہ بنانے کے لئے انگریز انجینیروں نے مزار کو ڈھانا چاہا تو مجاور بابا نے بار بار انہیں منع کیا۔ لیکن وہ نشۂ اقتدار میں مست تھے، انہوں نے بوڑھے مجاور کی ایک نہ سُنی۔

بابا رونے لگا ـــــ پھر جب ایک مزدور نے مزار پر کُدال مارا تو اس نے بے اختیار کہا ـــــ "یاد رکھو ـــــ اس مزار کو برباد کرو گے تو خود بھی برباد ہو جاؤ گے ـــــ اسے مت ڈھاؤ ـــــ" لیکن اس کے احتجاج کے باوجود مزار ڈھا دیا گیا ـــــ بنگلہ بن گیا اور تینوں افسر وہاں رہنے لگے۔ تاہم مزار مسمار کرنے کے ایک ہی ماہ بعد کیپٹن اینڈرسن پشاور چھاؤنی میں پولو میچ کھیلتا ہوا گھوڑے سے گرا اور ہلاک ہو گیا۔ اس کا گھوڑا دوڑتے ہوئے ایک دوسرے گھوڑے سے ٹکرایا، وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں چل بسا۔

چند ہی ماہ بعد دوسرا افسر گائیڈ رسالے کے افسروں کے ہمراہ شکار کھیلنے مردان گیا تو اس کا گھوڑا بھی اسی طرح ایک دوسرے افسر کے گھوڑے سے ٹکرایا اور وہ اسی وقت دُنیا سے چل بسا جبکہ تیسرا افسر تبدیل ہو کر ہندوستان گیا تو دریائے گنگا میں نہاتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔

وار برٹن کا کہنا ہے کہ نہ صرف تینوں افسر چھ ماہ کے اندر ہلاک ہو گئے بلکہ بعد میں دریائے کابل میں ایسا سیلاب آیا کہ اس بنگلے کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اور اس طرح فقیر کی بد دُعا پوری ہو کر رہی۔ وار برٹن کے بقول مدتوں کسی کو وہاں مکان تعمیر کرنے اور رہائش اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

جُوں جُوں انگریز کے قدم مضبوط ہوتے گئے انہوں نے بندوبست اراضی، نظم و نسق اور زرعی ترقی کے لئے بھرپور کوششیں شروع کر دیں چنانچہ ۱۸۷۶ء سے دریائے سوات اور دریائے کابل سے نہریں نکالنے کے کام کا آغاز ہو گیا۔

دسمبر ۱۸۷۶ء میں قلعہ ابازئی سے تین میل کے فاصلے پر نہر کی کھدائی جاری تھی کہ رات کو قبائلی لشکر نے حملہ کر کے تیئس چالیس مزدوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس واقعہ سے علاقے میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔

لارڈ لٹن کا دورہ

۱۸۷۶ء میں وائسرائے لارڈ لٹن نے پشاور اور سرحد کے دوسرے مقامات کا دورہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ افغانستان میں اُن دنوں حالات نہایت تیزی سے بدل رہے تھے اور لارڈ لٹن کو صورتِ حال کے مطابق عمل کرنا تھا۔

لارڈ لٹن ۱۲ اپریل ۱۸۷۶ء کو کلکتہ پہنچا وہاں کونسل کے ارکان سے صلاح مشورہ کیا اور پھر فوراً شملہ چلا آیا جہاں پشاور کا کمشنر سر رچرڈ ٹیمپل لاک پہلے سے ہدایات لینے پہنچا ہوا تھا۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ تھا کہ ایک مسلمان رسالدار میجر کو جس کے افغان حکمرانوں سے ذاتی تعلقات بھی تھے، امیر شیر علی خان کے پاس کابل بھیجا جائے اور خیر سگالی کا پیغام بھیجنے کے ساتھ ہی امیر کی اجازت سے سر لیوس پیلی (LEWIS PELLY) کو حکومتِ برطانیہ کا خصوصی نمائندہ بنا کر کابل بھیجا جائے تاکہ دونوں حکومت کے باہمی تعلقات اور سیاسی صورتِ حال پر بات چیت کا راستہ ہموار ہو۔

امیر شیر علی خان نے اس دعوت کے جواب میں اس خط کی نقل وائسرائے ہند کو بھیج دی جو اُسے روسی جرنیل کوف مین کی طرف سے موصول ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنی روسی سرحد پر رونما ہونے والے واقعات سے بھی اُسے آگاہ کیا۔ امیر کابل اصل میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر وہ روسی نمائندوں کو اجازت نہیں دے رہا تو پھر برطانوی نمائندے کو کابل میں مداخلت کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔ اس کے جواب میں لارڈ لٹن نے افغان حکمران کو ۱۸۷۳ء کا معاہدہ یاد دلایا۔ جس کی رو سے افغانستان اس امر کا پابند تھا کہ رُوسی سفارت کاروں کو اپنے ہاں نہ بُلائے بالآخر امیر کابل صرف اس امر پر راضی ہوا کہ اپنا ایک وزیر سید نور احمد پشاور بھیجے گا۔ جہاں وہ سر لیوس پیلی سے گفت و شنید کرے گا۔

ان دنوں روسی شہنشاہ نے توسیع پسندی کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ چنانچہ جون ۱۸۶۵ء میں تاشقند کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۸۶۸ء میں سمرقند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۸۶۹ء میں بخارا پر چڑھائی کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور امیر بخارا محض رُوس کا باجگذار بن کر رہ گیا۔ ۱۸۷۳ء میں روسی سپہ سالار جنرل کوف مین خیوہ پر چڑھ دوڑا اور اسے ہڑپ کر لیا۔ رُوس کی ان جارحانہ کارروائیوں سے امیر شیر علی کا مرعوب ہونا قدرتی بات تھی۔

دوسری طرف خود انگریزوں سے بھی امیر شیر علی خان کو اس عرصہ میں کئی شکایات پیدا ہو چکی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیر علی خان فرنگی سامراج سے دوستی کا معاہدہ کر چکا تھا۔

لیکن دوستی کے اس معاہدے کے باوجود سنڈیمین نے بڑھتے بڑھتے سارے بلوچستان اور درۂ بولان پر انگریزی تسلط قائم کر دیا تھا۔ اسی طرح کرم اور خوست کے علاقے میں بھی برطانیہ کی ریشہ دوانیاں زوروں پر تھیں۔ ان سب کارروائیوں کا مقصد برطانوی سرحد کو براہِ راست افغانستان سے ملانا تھا۔ قدرتی بات یہ ہے کہ یہ امر امیر شیر علی خان کے مفادات کے خلاف تھا۔ اُس نے وہ امداد لینی بھی بند کر دی تھی جو انگریز دوستانہ معاہدہ کے تحت اسے دے رہے تھے اور جب انگریزی حکومت نے اپنا سفیر کابل بھیجنا چاہا تو بھی امیرِ کابل نے اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔

سید نور احمد افغانستان کے نمائندے کی حیثیت میں پشاور آیا۔ ۳۰ر جنوری سے ۱۹ر فروری ۱۸۷۷ء تک کے طویل عرصہ تک مذاکرات جاری رہے۔ انگریزوں کی طرف سے سر پیلی وفد کے سربراہ تھا۔ سید نور احمد اصل میں روس نواز شخص تھا۔ اس لئے اُس نے انگریز سے سخت رویہ اختیار کئے رکھا۔ اُس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ امیر کابل کو مکمل فوجی اور مالی مدد دیں۔ لیکن اس کے باوجود امیرِ کابل اس بات کے مخالف ہیں کہ برطانوی نمائندہ کابل میں مقیم رہے۔ پیلی (PELLY) سمجھ گیا کہ ان حالات میں افغانستان سے کبھی مفاہمت کی اُمید رکھنا خوش فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔

لارڈ لٹن نے اس پر پھر امیر شیر علی خان کو (سید نور احمد کی وساطت سے جو پشاور ہی میں قیام پذیر تھا) لکھا کہ برطانوی نمائندے کا دارالحکومت کابل میں رہنا دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید استواری کا باعث ہوگا ـــــ نور احمد مارچ ۱۸۷۷ء میں بیمار پڑ گیا اور اس مراسلے کا کوئی جواب ملنے نہ پایا۔ اُدھر انگریزوں کو برابر خبریں پہنچ رہی تھیں کہ شیر علی خان روس کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، اس نے صوبہ سرحد کی سرحدوں پر فوجوں کی نقل و حرکت میں اضافہ کر دیا ہے اور "جہاد" کے نام پر قبائل سرحد کو اپنے اپنے ساتھ ملانے میں کوشاں ہے۔

سرحدی پالیسی

اصل میں انگریز اپنی "سرحدی پالیسی" کے بارے میں کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ سر جان لارنس اور اس کے حامی ابھی تک اس بات پر زور دیتے تھے کہ صوبہ سرحد میں عدمِ مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ صرف صوبہ کے میدانی اضلاع تک اپنا اقتدار محدود رکھا جائے اور سرحدی اور قبائلی علاقوں میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔

اس کے برعکس لارڈ لٹن اور دوسرے مدبر اس نظریے کے حامی تھے کہ صوبہ سرحد کو ایک الگ انتظامی وحدت قرار دیا جائے اور اس کی مخصوص سیاسی اور جغرافیائی پوزیشن کے پیشِ نظر سرحدی اضلاع کو الگ کر کے انہیں ایک چیف کمشنر کی نگرانی میں دے دیا جائے ۔ اپنے سرحدی دورے کے سلسلے میں لارڈ لٹن نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ سرحدی علاقوں میں کام کرنے والے اکثر انگریز افسر مقامی مسائل اور جغرافیائی حالات سے پوری طرح آگاہ نہ تھے اور اُس کے خیال میں یہ بے خبری ہی اس بات کی ذمہ دار تھی کہ سرحدی پالیسی ناکام ہو رہی تھی ۔

انگریز پہلی جنگِ افغانستان کا نتیجہ دیکھ چکا تھا لہٰذا وہ پھُونک پھُونک کر قدم بڑھا رہا تھا ۔ لارڈ لٹن کافی وقت وزیرِ ہند متعینہ لندن سے خط و کتابت میں صرف کر رہا تھا اور اس کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح امیر شیر علی خان کو اپنی راہ پر لے آئے لیکن اب وقت گزر چکا تھا اور حالات کے سنورنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔

دوسری جنگِ افغانستان

بڑی طاقتوں کی سیاسی رقابتیں امنِ عالم کے لئے ہمیشہ بہت بڑا خطرہ ثابت ہوتی ہیں۔ اقتدار کی ہوسِ طاقت کے نشہ سے بدمست آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیتی ہے کہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار انہیں دکھائی ہی نہیں دیتیں اور لاکھوں انسانی جانیں اُن کی توسیع پسندی اور جُوعِ ارض کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں ـــــ انیسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں روس اور برطانیہ کی باہمی آویزش کی وجہ سے صوبہ سرحد، قبائلی علاقے اور افغانستان کی سرزمین کئی برسوں تک جنگ کا اکھاڑہ بنی رہی اور ان علاقوں کے لوگ ان شہنشاہیوں کے ہاتھوں ایک پل کے لئے بھی چین سے نہ بیٹھ سکے۔

۱۸۷۸ء میں برطانیہ میں قدامت پسند پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو وزیرِ ہند لارڈ سالسبری نے افغانستان کے معاملے میں عدمِ مداخلت کی پالیسی اور نرم روی کو یکسر ترک کر دیا اور وائسرائے ہند لارڈ لٹن کو سرحدی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے اور امپیریل ازم کے توسیع پسندانہ مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مؤثر قدم اٹھانے کی ہدایت کی۔

پشاور میں برطانوی اور افغان نمائندوں کے مذاکرات ہوئے لیکن مسئلے کا کوئی حل دریافت نہ ہوا۔ جس پر انگریزی حکومت نے امیرِ شیر علی خان پر زور دیا کہ کابل میں ایک انگریز ریذیڈنٹ کے تقرر کی اجازت دے دے جو وہاں رہ کر برطانوی مفاد کی نگہداشت کر سکے۔ لیکن رُوس کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور افغانستان کے اندرونی عدمِ استحکام کے پیشِ نظر امیرِ کابل اپنے آپ کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ انگریز ریذیڈنٹ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لے سکے۔ دوسری طرف افغان عوام کی جانب سے انگریز نمائندے کے خلاف شدید ردِّ عمل کا بھی خدشہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر نے انگریز کی اس شرط کو منظور نہ کیا ـــــ اُدھر لارڈ لٹن اتنا ضدی نکلا کہ اس نے امیرِ کابل کی رضامندی کے

بغیر ہی سر نیول چیمبرلین کو (جو امبیلہ کی جنگ میں زخمی ہونے کے بعد قدرے صحت یاب ہو چکا تھا) انگریزی حکومت کی طرف سے سفیر بنا کر کابل روانہ کر دیا ـــــ امیر شیر علی خان کی حکومت اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی، اُس نے انگریز سفیر کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اُسے واپس بھیج دیا ـــــ حالانکہ اس واقع سے تھوڑے دن پہلے رُوسی سفیر کی آمد پر کابل کے حکمران اور عوام اس کا شاندار بلکہ مثالی خیر مقدم کر چکی تھی ـــــ انگریز سفیر کی سُبکی پر لارڈ لٹن بڑا برہم ہوا۔ اُس نے افغانستان پر فوج کشی کا فیصلہ کر لیا اور انتظامات کی نگرانی کے لئے خود لاہور پہنچ گیا۔

امیر شیر علی خان ان دونوں بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے پریشانِ خاطر تو تھا ہی لیکن محلاتی سازشوں نے اُسے اور بھی پریشان کر دیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے یعقوب خان کو چھوڑ کر اپنے ایک اور چہیتے بیٹے عبداللہ جان کو ولی عہد مقرر کر رکھا تھا۔ جس پر یعقوب خان باپ کے خلاف مصروفِ بغاوت تھا۔ باپ نے اُسے قید میں ڈال دیا لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ۱۸۷۸ء کے اوائل میں عبداللہ جان (ولی عہد) فوت ہو گیا جس سے امیرِ کابل کی مشکلات مزید بڑھ گئیں۔

یہ صورتِ حال تھی جب انگریز نے افغانستان کو چیلنج دے دیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ۲۰ نومبر ۱۸۷۸ء کو افغانستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ہر طرف سے انگریزی فوج لاہور پہنچ گئی جسے تین مختلف دستوں میں تقسیم کر کے ہر دستے کو الگ الگ راستے سے افغانستان پر دھاوا بولنے کا حکم دے دیا گیا۔ جنرل سام براؤن خیبر کی جانب سے، جنرل رابرٹس کرم پاڑہ چنار کے راستے اور جنرل سٹوارٹ درہ بولان سے ہوتا ہوا افغانستان پر حملہ آور ہوا ـــــ اس سلسلے میں میجر کیوگنری کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ خیبری آفریدیوں سے رابطہ قائم کرے تاکہ اہلِ خیبر پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی فوج کی مزاحمت سے باز رہیں ـــــ اس وقت تک درہ خیبر پر برائے نام افغانستان کا تسلط برقرار تھا اور علی مسجد کے قلعے میں افغان فوج کے کچھ پیدل اور سوار دستے بھی موجود تھے جن کی کمان فیض محمد خان (ابابکر خیل، غلزئی) کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فیض محمد، محمد شاہ خیل غلزئی کا بیٹا تھا۔ جو ۱۸۴۲ء میں لیڈی میکناٹن، لیڈی سیل، جنرل الفنسٹن اور دوسرے انگریز یرغمالیوں پر محافظ مقرر کیا گیا تھا۔

پشاور کی انگریز انتظامیہ نے خیبری قبائل کے سربراہوں سے بات چیت کرنے کے بعد ۲۰ ستمبر ۱۸۷۸ء

کولارڈ ڈلٹن کو نا ردیا کہ "خیبری قبیلے علی مسجد تک انگریز فوج کا ساتھ دیں گے جب کہ علی مسجد سے آگے جانے کے لئے افغان افسروں کی اجازت ہوگی"۔

۲۱ ستمبر کو میجر کیو یگنری نے اپنے باقی فوجی دستوں کو جمرود میں چھوڑا اور خود گائیڈ رسالہ کے جوانوں پر مشتمل محافظ دستے کے ہمراہ علی مسجد جا پہنچا۔ کچھ آفریدی ملکوں نے وہاں اُسے آگے بڑھنے سے روکا، ابھی ان قبائلی سرداروں سے بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ فیض محمد خان بھی پہنچ گیا، کیو یگنری سے اس سے بات چیت کی خواہش ظاہر کی۔ بالآخر علی مسجد کے نواح میں لال چینہ کے ایک جندر (پن چکی) میں دونوں سرداروں کی بات چیت ہوئی۔ فیض محمد خان انگریز فوج کو درہ خیبر سے گزرنے کی اجازت دینے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا جس پر میجر کیو یگنری واپس جمرود چلا گیا ـــــ انگریز جان گئے کہ فوجی طاقت کے استعمال کے بغیر وہ درہ خیبر کو ہرگز پار نہ کر سکیں گے چنانچہ برطانوی فوج کے کمانڈروں نے اپنے سپاہیوں کو خیبر کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ سر سام براؤن کے پاس دس ہزار سپاہی تھے اور رابرٹس کے پاس ساڑھے چھ ہزار لڑاکا جوان ـــــ اتنی بڑی انگریزی فوج آج تک صوبہ سرحد کی کسی مہم میں استعمال نہ ہوئی تھی۔

۲۱ نومبر کو سام براؤن کے فوجی دستے علی مسجد کی طرف بڑھے۔ انگریز جرنیل نے ایک بریگیڈ فوج تو سڑک کی راہ روانہ کی جسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن دو بریگیڈ فوج دائیں اور بائیں طرف کی پہاڑیوں کی تسخیر پر متعین کر دی۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی لشکر جیسے تیسے لنڈی کوتل پہنچ گیا۔ آفریدیوں نے فرنگی کے عقبی دستوں پر اکا دکا حملے کئے لیکن جنرل ماڈ (MAUDE) اپنی فوج کو بحفاظت اُن کے نرغے سے نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا اور جلال آباد تک برابر پیش قدمی کرتا گیا۔

اُدھر جنرل رابرٹس کی فوج راولپنڈی سے چل کر کوہاٹ۔ بنگو اور ٹل ہوتی ہوئی کرم پاڑہ چنار میں داخل ہو گئی۔ اس فوج کی کوئی قابلِ ذکر مزاحمت نہ ہوئی ـــــ ۲۸ نومبر ۱۸۷۸ء کو جب یہ لشکر پیواڑ کوتل (پاک افغان سرحد پر) پہنچا تو اُسے پتہ چلا کہ افغان فوج کے سپاہی مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ نکلے ہیں تاہم انگریز کمانڈر نے کسی بات پر یقین کئے بغیر اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ جاسوسوں نے اُسے اطلاع دی کہ افغان فوج اور توپ خانہ کوتل کے نواحی گھنے جنگل کے ایک

کلیدی مقام پر گھات لگائے فرنگی کی آمد کا منتظر تھا اور افغانیوں نے اپنی توپیں بھی پہاڑیوں پر گاڑ رکھی تھیں۔ اس پر انگریز نے پیوار کوتل سے کچھ آگے پین گاوے کے درّے کی راہ فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

اس حملے کے دوران انگریز نے انتہائی چالاکی اور رازداری سے کام لیا۔ وہ یوں کہ سپاہیوں کے خیمے اپنی جگہ ہی پر لگے رہے اور ان میں آگ بھی جلتی رہی جب کہ رات کی تاریکی میں سارے برطانوی سپاہی کیمپ سے نکلے اور مارچنگ کرتے ہوئے خطرے کے مقام سے بھی آگے نکل گئے۔ صبح کابلی فوجوں کو صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ گھبراہٹ میں کوتل کو خالی کر کے واپس روانہ ہو گئیں ـــــ ۹ دسمبر کو انگریز دستے درّہ شُتر گردن کو پار کر کے (جو سطح سمندر سے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے) افغانستان کی حدود میں داخل ہو گئے۔

برطانوی فوج کا تیسرا دستہ سر ڈانلڈ سٹوارٹ کی کمان میں درّہ بولان سے ہوتے ہوئے ۸ جنوری کو قندھار پہنچا۔ اس موقع پر انگریز نے خان قلّات کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا اور درّہ بولان کی چوٹی پر واقع "قلعہ کوٹ" میں بھی اپنے فوجی متعین کر دیئے تھے۔ اس لئے انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

جنوری کے وسط تک انگریزی فوج کے تینوں دستے افغانستان میں داخل ہو چکے تھے جس پر امیر شیر علی خان نے بار بار رُوسی شہنشاہ سے امداد طلب کی لیکن کوئی امداد ملنے نہ پائی۔ یہاں تک کہ امیرِ کابل نے خود روسی سفیر اور روسی فوج کے کمانڈر ان چیف سے ملاقات کی اور اُن کی توجہ انگریزی حملے کی طرف دلائی لیکن وہ ٹس سے مَس نہ ہوئے ـــــ یہ دیکھ کر امیر شیر علی خان کو پسینہ ہی تو آ گیا۔ وہ نہ اِدھر کے رہے تھے نہ اُدھر کے ـــــ ولی عہد شہزادہ عبداللہ جان کی موت سے امیر شیر علی خان کی کمر پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ اب روسیوں کی سرد مہری سے اُن کا حوصلہ اور بھی پست ہو گیا ـــــ مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے بڑے بیٹے یعقوب خان کو قید خانے سے نکال کر عنانِ حکومت اس کے حوالے کی اور خود دِل شکستہ ہو کر مزار شریف کو روانہ ہو گیا ـــــ روسی امداد تو نہ پہنچی تھی نہ پہنچی البتہ امیر شیر علی خان فروری ۱۸۷۹ء میں اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں جا پہنچے۔

امیر یعقوب خان

باپ کے مرنے پر محمد یعقوب خان افغانستان کے وارثِ تخت و تاج قرار پایا۔ چونکہ وہ بھی اتنے بڑے لشکرِ جرار سے مقابلے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا مجبوراً دوستی کا ہاتھ فرنگی کی طرف بڑھایا ـــــ انگریز نے موقع کو غنیمت سمجھا، اُس وقت امیر کابل دبا ہوا تھا اس لئے اس سے اپنی شرطیں منوانا مشکل نہ تھا۔ چنانچہ طویل گفت و شنید کے بعد مئی ۱۸۷۹ء میں گنڈمک کے مقام پر دونوں فریقوں میں ایک معاہدہ طے پا گیا۔

اس عہد نامہ کو گنڈمک کا صُلح نامہ کہا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے خیبر اور بولان کے مشہور اور اہم تاریخی درّے انگریز کی تحویل میں چلے گئے۔ افغان حکومت وادیٔ کرّم سے بھی دست بردار ہو گئی۔ اسی طرح بلوچستان کے اضلاع سبّی، پشین وغیرہ بھی انگریزوں کے مقبوضات میں شامل ہو گئے۔ اس کے معاوضے میں انگریز نے افغانستان کی حکومت کو بارہ لاکھ روپیہ بطور امداد دینا منظور کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ ایک انگریز ریذیڈنٹ کابل میں متعین ہو گا جب کہ اُس کے نائب قندہار، ہرات اور دوسرے اہم افغان شہروں میں قیام پذیر ہوں گے تاکہ افغان حکومت برطانوی پالیسی کے خلاف کسی دوسرے ملک سے تعلقات قائم نہ کر سکے۔

پھر وہی تباہ کاری

کابل پر قبضہ جمانے اور اپنی شرطیں منوانے کے بعد بظاہر تو لارڈ لٹن اور برطانوی استعمار پسند بہت خوش دکھائی دیتے تھے لیکن سوچا جائے تو انہوں نے وہی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ چالیس برس پیشتر وہ بھگت چکے تھے، چند امیروں، وزیروں کو ساتھ ملانے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ افغان عوام اُن سے دب گئے تھے، حریّت پسند فرزندانِ اسلام بھلا فرنگی کا تسلّط کیسے برداشت کر سکتے تھے اس لئے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ پھر فرنگی غاصبوں کے خلاف میدانِ جہاد میں اُتر پڑے۔

معاہدہ گنڈمک کے نتیجے میں سر لوئی کیوگیتری کو کابل میں برطانوی سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ کابل پہنچ کر اُس نے بالا حصار کے قلعہ میں رہائش اختیار کی اور بڑے کرّ و فر سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے لگا۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مسلسل جنگوں، بدامنی، انتشار اور بادشاہ گردی کی وجہ سے افغانستان کا خزانہ بالکل خالی تھا۔ کئی مہینوں سے افغان عسکری تنخواہ تک سے محروم تھے۔ وہ تنخواہ کا مطالبہ کرنے پہلے تو امیر کابل کے پاس گئے لیکن اس کے پاس دھرا تھا۔ اُس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ

سپاہیوں کو انگریز سفر کے پاس بھیج دے۔ امیر کا خیال تھا کہ انگریز افغانستان کو دیئے جانے والے زرِ امداد سے افغان سپاہیوں کو تنخواہ ادا کر دے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ اتنی بڑی تعداد میں افغان عسکریوں کو بالاحصار کی طرف آتا دیکھ کر کیوگنیری گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے اپنے حفاظتی دستوں کو ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جس پر افغان سپاہیوں نے بھی گولی کا جواب گولی سے دیا۔ فرنگی سپاہیوں کی فائرنگ سے کچھ افغان سپاہی ہلاک ہوئے تو اشتعال بڑھ گیا۔ افغانی جوش میں آکر بالاحصار پر چڑھ دوڑے۔ کیوگنیری کے مکان کو آگ لگا دی۔ وہ خود بھی اسی مکان میں چھپا بیٹھا تھا۔ جل کر کباب ہو گیا۔ بعد میں افغان سپاہیوں نے انگریزی فوج کے باقی ارکان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جوابی کارروائی

جب اس واقع کی اطلاع ہندوستان پہنچی تو ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ انگریز فوجی کمانڈر سر فریڈرک رابرٹس اس وقت تک کوہاٹ ہی میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی فوج کو لے کر کُرّم پاڑہ چنار کے راستے افغانستان پر پھر چڑھائی کر دی۔ امیر کابل یعقوب خان کو انگریزی فوج کی پیش قدمی کا علم ہوا تو وہ خود رابرٹس کی پیشوائی کو آیا اور اسے یقین دلایا کہ کیوگنیری کے واقع محض غلط فہمی کی بناء پر ہوا اور یہ محض اتفاقی واقعہ تھا۔ تاہم طاقت کے نشہ میں بدمست رابرٹس نے امیر کابل کی بات پر کان تک نہ دھرا۔ الٹا امیر یعقوب خان کو گرفتار کر لیا اور اُسے ساتھ لے کر کابل کی طرف روانہ ہو پڑا ـــــ امیر یعقوب خان کے قیدی بنائے جانے کا علم افغانستان کے عوام کو ہوا تو اُن میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو کر انگریز فوج کے مقابلے کو نکل آئے۔ چار آسیا کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مسلمانوں کے پاس توپ خانہ تھا نہ گولہ بارود ـــــ اُنہیں پسپا ہوتے ہی بن پڑی ـــــ امیر یعقوب خان نے محض اس خیال سے کہ انگریز افغان عوام سے انتقام نہ لیں، تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ جس پر انگریز امیر موصوف کو ڈیرہ دُون لے گئے اور وہیں نظر بند کر دیا ـــــ کچھ عرصہ تک کابل کی حکومت رابرٹس کے ہاتھ میں رہی۔ اس اثناء میں اُس نے قلعہ بالاحصار کو مسمار کرا دیا اور حکم دیا کہ دوبارہ اس کی جگہ کوئی عمارت تعمیر نہ کی جائے۔ ذرا ذرا سی بات پر اہلِ کابل سے سخت انتقام لیا جانے لگا۔ تنگ آکر افغان عوام گوریلا جنگ پر اُتر آئے۔ انگریزوں کے کیمپوں اور فوجی چوکیوں

پر روزانہ شب خون مارے جانے لگے۔ اب انگریز کے ہوش ٹھکانے لگے۔ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے اور اپنے ہزاروں سپاہی مروا کر بھی اُسے افغانستان سے کچھ حاصل وصول نہ ہوا بلکہ عوام کی شورش سے باقی ماندہ انگریزوں کی جان بھی عذاب میں آگئی۔

اسی اثناء میں کابل کے حکمران خاندان کے ایک رُکن، عبدالرحمٰن (ابن افضل خان) نے جو ترکستان میں جلاوطنی کے دن گذار رہا تھا، افغان عوام کو ساتھ ملا کر مُلک کے کئی حصوں پر قبضہ کر لیا۔ اُدھر انگریز بھی ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھے جسے کابل کے تخت پر بٹھا کر خود ہندوستان لوٹ جائیں۔ اُنہیں اس مقصد کے لئے عبدالرحمٰن خان موزوں شخص نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے اُسے بُلا بھیجا۔ اُس سے صلح کی شرائط طے کیں اور کابل میں دربارِ خاص منعقد کر کے نہ صرف امیر عبدالرحمٰن خان کو والیٔ افغانستان تسلیم کر لیا بلکہ اُسے اُنیس۱۹ لاکھ روپیہ کی فوری امداد بھی دی تاکہ وہ افغان فوجیوں کو تنخواہ ادا کر کے اپنے ساتھ ملا سکے اور دوسری ضروریات پوری کر سکے۔ یوں افغانستان کی دوسری لڑائی کا ڈراپ سین ہوا اور انگریز (بزعم خود) اپنے وقار کو بلند کرنے کے بعد عازمِ ہند ہو گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّہ درّہ خیبر سے ہوتے ہوئے اور دوسرا درّہ بولان سے گزر کر اپنے اپنے ہندوستانی ٹھکانوں میں پہنچا۔

جنگِ میوند

اس لڑائی میں "کامیابی" کے بعد انگریز نے ایک سکیم یہ بنائی تھی جس کا منشاء افغانستان کے حصّے بخرے کرنا تھا، وہ چاہتے تھے کہ قندھار اور ہرات میں الگ الگ حکومتیں قائم کر دی جائیں۔ فی الاصل قندہار کو انگریز براہِ راست اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے تھے تاہم وقتی طور پر انہوں نے بارک زئی سردار ولی شیر کو قندہار کا گورنر تسلیم کر لیا۔ تاہم ساتھ ہی ڈیرہ اسمٰعیل خان کے کرنل نواب سر غلام حسن خان علی زئی کو قندہار کا نائب گورنر اور دربارِ قندہار میں برطانوی نمائندہ مقرر کیا گیا۔ ہرات میں ان دنوں امیر یعقوب خان کے بھائی ایوب خان داد حکومت دے رہا تھا۔ جب انگریزوں کی اس "سازش" کا علم ایوب خان کو ہوا تو اس نے فرنگی کی اس مداخلت کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ افغان مجاہد دھڑا دھڑ اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ ایوب خان اپنے مجاہدین کے ہمراہ اس ارادے سے قندہار کی جانب بڑھا کہ انگریز کو مُلک سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ دیکھ کر قندہار میں مقیم برطانوی فوج کے کمانڈر جنرل بَرو (BURROW) کے کان

کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ایوب خان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ قندہار سے چالیس میل شمال کو میوند کے مقام پر دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، مسلمان مجاہد اپنی بے سروسامانی کے باوجود انتہائی پامردی سے لڑے۔ چنانچہ انگریزوں کو اس مقام پہ ایک تباہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا ـــــ اُن کے ایک ہزار افسر اور سپاہی مارے گئے اور بہت سے اسلحہ اور سامانِ جنگ سے ہاتھ دھونے پڑے ـــــ انگریز مصنفوں نے یورپی فوجوں کے مقابلے میں جنگ میوند کو کسی ایشیائی فوج کا سب سے اہم معرکہ قرار دیا ہے۔

یہ لڑائی ۲۷ جولائی ۱۸۸۰ء کو ہوئی۔ جب اس کی خبر کابل پہنچی تو وہاں کی تمام برطانوی فوج، جو دس ہزار سے زیادہ لڑاکا جوانوں پر مشتمل تھی، جنرل رابرٹس کی کمان میں قندہار کو چل پڑی۔ یکم ستمبر ۱۸۸۰ء کو اس انگریزی لشکر نے ایوب خان کی فوج کو بابا ولی کے مقام پر شکست دی ـــــ تاہم فتح کے باوجود انگریز کو قندہار یا افغانستان کے کسی شہر میں قیام کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور انہوں نے فوری واپسی اختیار کر لی ـــــ ایوب خان نے تھوڑے دنوں بعد پھر سنبھالا لیا۔ اور قندہار پر قبضہ کر لیا لیکن یہ قبضہ محض عارضی نوعیت کا تھا۔ انگریز نے بہتری اسی میں سمجھی کہ قندہار کو بھی عبدالرحمٰن خان کی تحویل میں دے دیا جائے چنانچہ وہ اپنی فوج اور قندہار کے پاکستانی نائب الحکومتہ نواب سر غلام حسن خان علی زئی کو نکال لائے اور واپس اپنی اپنی چھاؤنیوں میں پہنچ گئے۔

جولائی ۱۸۸۱ء میں ایوب خان نے، جو ہرات پر قابض تھا۔ عبدالرحمٰن خان کے خلاف اعلانِ جہاد کیا کیونکہ مؤخرالذکر فرنگی کا نامزد کردہ حاکم تھا۔ تاہم اس وقت تک عبدالرحمٰن خان کی حکومت کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں اس لئے ایوب خان کو لینے کے دینے پڑ گئے اور ہرات بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا جس پر وہ مشہد میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

۱۸۸۷ء میں غلزئیوں نے عبدالرحمٰن خان کے خلاف بغاوت کی تو ایوب خان نے ایک بار پھر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر شکست کھائی اور ایران چلا گیا۔ بعد ازاں وہ لاہور آ گیا اور یہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اس نے زندگی کے باقی ایام لاہور ہی میں گزارے اور ۱۶ اپریل ۱۹۱۴ء کو وفات پائی ـــــ لوگ اُسے "فاتح میوند" کے لقب سے پکارتے تھے اور بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ اس کی وصیت کے مطابق اُسے پشاور میں مشہور نقشبندی بزرگ شیخ حبیب علیہ الرحمتہ

کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

امیر عبدالرحمٰن خان نے داخلی مشکلات اور خارجی اُلجھنوں کے باوجود اپنے ملک کی آزادی اور وحدت کو برقرار رکھا اور بڑی کامیابی سے حکومت کی۔ انگریز نے ابتدا میں اُسے پانچ لاکھ روپے، کئی سو توپیں اور ہزاروں بندوقیں دیں۔ بعد میں اُسے اٹھارہ ہزار پونڈ سالانہ کی امداد بھی برطانوی حکومت کی جانب سے ملتی رہی۔ زندگی بھر امیر عبدالرحمٰن نے انگریزی حکومت سے تعاون کی پالیسی پر عمل کیا۔

گائیڈز کا کردار

افغانستان کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں مردان کے انگریزی رسالے "گائیڈز" نے نمایاں حصّہ لیا۔ انگریزی حکومت کی جانب سے بھی گائیڈز کے ان جانبازوں کی بڑی قدر افزائی ہوئی اور اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ مردان میں ان سرفروشوں کی ایک یادگار تعمیر کی گئی جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

گائیڈز کے اس چھوٹے سے دستے نے جان نثاری اور شجاعت کے جو کارنامے انجام دیئے ان کی مثال کسی فوج یا رجمنٹ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔"

مردان میں واقع گائیڈز کے تاریخی میس (MESS) میں سر سام براؤن، لمسڈن، ہڈسن، ڈیلی اور دوسرے فوجی افسروں کے آثار اب بھی موجود ہیں، پچھلے دنوں جب انگلستان کی ملکہ الزبتھ پاکستان کے دورے پر آئی تو خاص طور پر مردان گئی اور اس میس کے آثار دیکھ کر ان افسروں کی یاد تازہ کی۔

۱۸۷۹ء میں لفٹیننٹ جنرل سر سام براؤن کے تحت جو فوج درّہ خیبر کی راہ افغانستان بھیجی گئی تھی اُن میں گائیڈز کی کثیر تعداد بھی شامل تھی۔ گائیڈز اس مہم میں جنرل ٹیٹلر (TATLAR) کے دستے میں شامل تھے۔ ان لوگوں نے آٹھ ہزار فٹ اُونچے پہاڑوں میں دشوار گزار پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے علی مسجد پہنچنے میں کامیابی حاصل کی اور جب وہ اچانک قلعے کے سامنے جا پہنچے تو افغان فوج انہیں دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی۔

بتایا جاتا ہے کہ قلعہ علی مسجد پر گولہ باری کے دوران دھوئیں کے بادل سے گائیڈز نے ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ انگریز افسروں کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس کا نام بہاؤالدین تھا اور وہ افغان رسالے میں ملازم تھا۔ لیکن جب قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اس نے بھاگتے ہوئے افغانیوں کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کرنے کو ترجیح دی۔ گائیڈز کا ایک افسر جنکینز

اس کی بہادری اور حق گوئی سے بڑا متاثر ہوا اور اُسے گائیڈز کا جونیئر افسر بنا دیا۔ اُس نے لڑائی کے دوران بہادری کے کئی کارنامے انجام دیئے لیکن دوسری افغان جنگ کے ختم ہوتے ہی وہ واپس وطن چلا گیا۔

ملک ولی محمد

وار برٹن نے اپنی کتاب "درہ خیبر میں اٹھارہ سال" میں ایک آفریدی ملک ولی محمد خان ذخاخیل کا ذکر بڑے عمدہ الفاظ میں کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دوسری جنگِ افغانستان کے موقع پر خیبری آفریدیوں کی اکثریت نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا تاہم کچھ من چلے آفریدی ایسے بھی تھے جنہوں نے نفع نقصان کی پرواہ کئے بغیر امیرِ کابل کی حمایت کی۔ انہی میں سے ایک شخص ملک ولی محمد خان ذخاخیل بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ۲۲ نومبر ۱۸۷۸ء وادئی بازار میں افغان فوج کی قیادت کی تھی بلکہ خود کابل جا کر امیر یعقوب خان کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ لیکن جب امیرِ کابل نے اُسے بتایا کہ وہ انگریزوں سے صلح کر چکا ہے اور اس نے ولی محمد خان کو مشورہ دیا کہ بہتر ہے تم بھی انگریزوں سے دوستی کر لو تو ولی محمد خان نے فوراً امیر کی بات مان لی۔ وہ سیدھا کابل سے گندمک پہنچا جہاں انگریزی افواج چھاؤنی ڈالے ہوئے تھیں اور اپنی خدمات کیو یگنری کو پیش کر دیں۔ بعد میں وار برٹن کے ساتھ، جو خیبر ایجنسی کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ بنا ولی محمد خان نے نمایاں تعاون کیا۔

خیبر پولیٹیکل ایجنسی

دوسری جنگِ افغانستان کے نتیجے میں امیرِ کابل نے خیبر اور کرم کے قبائلی سرحدی علاقوں پر انگریز کا تسلط تسلیم کر لیا اور افغان حکمران ان علاقوں سے مکمل طور پر دستبردار ہو گئے۔ اس پر خیبر کا علاقہ انگریز کے زیرِ انتظام آ گیا۔ اپریل ۱۸۷۹ء میں اسے حکومتِ ہند کی بجائے صوبائی حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا تو میجر ہسٹنگز (HASTINGS) کو خیبر کا پولیٹیکل افسر بنا کر لنڈی کوتل میں تعینات کیا گیا جب کہ مرک (MERK) اور بکٹ (BECKETT) کو جمرود اور پشاور میں اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کے فرائض تفویض کئے گئے۔

چونکہ اس جنگ میں انگریزوں کو خیبری آفریدیوں اور بالخصوص ذخاخیل کے ہاتھوں بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لئے صلح نامہ گندمک کے طے پانے کے فوراً بعد انہوں نے اس امر کی کوششیں شروع کر دیں کہ اہلِ خیبر کو اپنا ہم نوا بنایا جائے۔ اُن کی خواہش تھی کہ درہ خیبر کی شاہراہ فوجوں، تجارتی

قافلوں اور عام مسافروں کے لئے ہر وقت کھلی رہے، چنانچہ بڑی تگ و دو کے بعد سارے قبائلی ملکوں کا ایک نمائندہ جرگہ فروری ۱۸۸۱ء کو بلایا گیا جس میں بڑی بحث و تمحیص اور لے دے کے بعد ایک اعلان مرتب ہوا جس پر تمام قبیلوں کے ملکوں نے اپنی مُہرِ سیادت ثبت کی۔ اس اعلان کی رُو سے آفریدیوں کی اندرونی آزادی تسلیم کر لی گئی جس کے جواب میں قبائل نے برطانوی حکومت سے سیاسی وابستگی اختیار کر لی اور اس امر کی ذمہ داری قبول کی کہ اس تاریخی اور بین الاقوامی شاہراہ پر ہر طرح امن و امان برقرار رکھا جائے گا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے ہر قبیلے کے لئے مواجب کی رقم تعین کی گئی ـــــ اس جرگے میں اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ شاہراہِ خیبر سے گزرنے والے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے آفریدی نگہبان یا "جزیلچی" بھرتی کئے جائیں جو حکومت کے تنخواہ دار ملازم متصور ہوں۔

اس جرگے کے فیصلوں کی رُو سے لنڈی کوتل اور علی مسجد کے قلعوں میں مقیم انگریزی فوج ہٹائی گئی اور اس کی جگہ خاصہ داروں یا جزیلچی جوانوں نے لے لی۔ فوجی افسروں کی واپسی پر رابرٹ وار برٹن کو خیبر ایجنسی کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا جس نے ۱۳ جولائی ۱۸۷۹ء کو جمرود پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ وار برٹن کی مدد کے لئے پشاور کے سردار محمد اسلم خان سدوزئی کو خاصہ داروں کا کمانڈنٹ مقرر کیا گیا۔ ان دونوں افسروں نے خیبر ایجنسی کے نظم و نسق کو بہتر اور باقاعدہ بنانے میں بڑا اہم کردار انجام دیا۔

دوسری جنگِ افغانستان پر ایک نظر

دوسری جنگ افغانستان کے سلسلے میں وائسرائے لارڈ لٹن پر بڑی لے دے ہوئی۔ نہ صرف برِصغیر کے اہل الرائے طبقے نے بلکہ برطانوی عوام، اخبارات اور لبرل پارٹی کے اراکین نے اس جنگ کے چھیڑنے پر کڑی نکتہ چینی کی، ایسے وقت میں جب ہندوستان کے کئی علاقوں میں کروڑوں لوگ بدترین قسم کی قحط سالی کا شکار تھے۔ افغانستان کی اس "بے مقصد جنگ" پر کروڑوں روپے اڑانے کی سخت مذمت ہوئی۔ تاہم اس جنگ کے نتیجے میں کوئٹہ، پشین، سبی، کُرم پاڑہ چنار اور خیبر کے علاقوں پر مستقلاً انگریز کا قبضہ ہو گیا۔ بعد میں فرنگیوں نے ان علاقوں میں فوجی نقل و حرکت کے لئے ریلوے لائن بچھا دی اور اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے پر پوری توجہ دی۔

۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک

انگریز ۱۸۴۹ء میں صوبہ سرحد میں وارد ہوئے، یوں تو اُن کی آمد کے پہلے ہی دن سے اُن کے توسیع پسندانہ عزائم منظرِ عام پر آنے لگے تھے تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سامراجی مقاصد شدت اختیار کرتے گئے اور اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے اُن کی کوششیں تیز تر ہوتی گئیں۔ اسی سلسلے میں سڑکوں، فوجی چوکیوں، قلعوں اور چھاؤنیوں کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ پشاور اور کوہاٹ کو ملانے والی اہم سڑکوں پر ۱۸۵۰ء ہی سے کام شروع ہو گیا۔ سرحدی قبائل انگریز کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ آدم خیل آفریدیوں کی وجہ سے درّہ آدم خیل میں سڑک کی تعمیر ۱۸۶۵ء تک رُکی رہی، جس پر ۱۸۶۶ء میں فرنگی نے متعلقہ قبائل کو مراعات اور الاؤنس دینا منظور کر لیا اور یوں اس سڑک پر آمد و رفت بحال ہو گئی۔

جواکئی کا جہاد

۱۸۷۵ء میں سڑک بنانے کا کام دوبارہ شروع کرنے کے لئے انگریز افسروں اور آدم خیل آفریدیوں کی مختلف شاخوں کے مابین بات چیت ہوئی۔ آدم خیل کی کئی شاخوں نے تو کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن شیرا گئی فرنگیوں کی اس مداخلت کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے فوجی چوکیوں اور قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ انگریز نے ان قبائل کا ناطقہ بند کرنے کے لئے اُن کے اقتصادی گھیراؤ کی سکیم بنائی — باہر سے ان لوگوں کو غلّہ کی بہم رسانی روک دی گئی، اس پر آدم خیل اور بھی مشتعل ہو گئے۔ درہ کوہاٹ کی مشرقی سمت بسنے والے ژواکئی یا جواکئی لوگ اس جہاد میں پیش پیش تھے۔ بالآخر انگریز نے فوجی کارروائی کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۷ اگست ۱۸۷۷ء کو بہت بڑا انگریزی لشکر ژواکئی کو سر کرنے کے لئے کوہاٹ میں جمع ہوا۔ اس مہم کی کمان پہلے بریگیڈیر جنرل کے (KEYES) کے سپرد کی گئی تھی وہ بیمار پڑ گیا تو سکھ رجمنٹ کے کمانڈنٹ

کرنل موکٹا (MOCATTA) کو اُس کا جانشین منتخب کیا گیا۔

ان سب فوجی تیاریوں میں بڑی رازداری سے کام لیا گیا منصوبے کے تحت ۳۰ راگست کو بیک وقت تین اطراف سے جواکئی پر ہلہ بول دیا گیا۔ فوج ایک دستہ تورنگ کی گھاٹی سے، دوسرا درہ گنڈیالئی سے اور تیسرا مشرقی جانب سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جواکئی کی چھوٹی سی وادی کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹے سے غریب قبیلے کے خلاف اتنی بڑی فوجی مہم بھیجنے سے انگریز کی حواس باختگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس تزک و احتشام کے باوجود جونہی یہ لشکر ژواکئی کے علاقے میں داخل ہوا۔ لوگ بستیاں خالی کر کے پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے۔ فرنگی لشکر کو کچھ ہاتھ نہ لگا اور وہ جس طرح گیا تھا اسی طرح واپس آنے پر مجبور ہو گیا بلکہ واپسی کے وقت قبائلی مجاہدوں نے جو ترکائی کے درّہ میں گھات لگائے بیٹھے تھے، فرنگی لشکر کو سخت نقصان پہنچایا۔

جب اس مہم میں فرنگی کو ناکامی کا سامنا ہوا تو نومبر ۱۸۷۷ء میں اس سے بھی بڑی مہم ژواکئی کے خلاف روانہ کی گئی۔ اس مہم کا ہراول دستہ ایک رات ایک خشک پہاڑی نالے میں خیمے لگائے پڑا تھا کہ آفریدیوں نے اُس پر دھاوا بول دیا۔ حملہ اتنا بھرپور اور اتنا خلافِ توقع تھا کہ آن کی آن میں چودہ گورا سپاہی ہلاک ہو گئے اور غازی اُن کی بندوقیں چھین کر چلتے بنے۔ اب تو فرنگی کا پارہ اور چڑھ گیا۔ طے پایا کہ پشاور سے جنرل راس (ROSS) اور کوہاٹ سے جنرل کے (KEYES) کی کمان میں ایک ساتھ درّہ آدم خیل کے اس علاقہ پر حملہ کیا جائے اور قبائلیوں کو مزا چکھایا جائے لیکن اس بار قدرت نے بے یار و مددگار مسلمان مجاہدوں کی آبرو رکھ لی۔ کئی ماہ تک لگاتار بارش ہوتی رہی۔ تیز ہوا کے جھکڑ چلتے رہے اور سردی اتنی بڑھ گئی کہ برطانوی فوج کے سکھ اور گورکھا سپاہیوں کے لئے خیموں سے باہر قدم رکھنا بھی مشکل ہو گیا۔

پروگرام کے مطابق جنرل کے تورننگ اور گنڈیالئی کے راستے جواکئی کے علاقے کی طرف بڑھا۔ کرنل گارڈنیر (GARDINER) کے فوجی دستے بھی راہ میں اس سے آ ملے۔ یہ معرکہ دسمبر کے مہینے میں پیش آیا۔ وہ جواکئی کے مرکز جامو پر قبضہ کرنے کی سوچ رہا تھا لیکن مسلسل بارشوں کی وجہ سے پشاور سے جنرل راس کی آمد ملتوی ہو گئی، اس لئے اس کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا ——

جنرل کے اسی اثنار میں گڑھا پہنچا جو جامو کے بعد علاقے کا سب سے بڑا گاؤں تھا لیکن گڑھا میں کیا دھرا تھا۔ آفریدی اپنا اپنا ساز و سامان، مال مویشی اور بیوی بچے لے کر پہلے ہی پہاڑی غاروں اور کمین گاہوں کو جا چکے تھے۔ انگریز جنرل حیران تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ اُدھر ۸ دسمبر سے دوبارہ طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ مجبور ہو کر انگریزی فوج کو فورٹ میکسن میں پناہ لینی پڑی ــــ بارش تھمی تو انگریزی فوج پھر نکلی۔ دستے مختلف سمتوں سے روانہ ہوئے اور پستاؤنی کے مقام پر جا کر ایک دوسرے سے مل گئے۔ کئی موقعوں پر معمولی جھڑپیں ہوئیں تاہم آفریدیوں نے احتیاط برتی اور بڑی لڑائی کی نوبت آنے نہ پائی۔ شدید سردی اور مشکلات کے باوجود انگریزی فوج محض اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے آفریدیوں کے علاقے میں مقیم رہی۔ بالآخر کسی خاص کامیابی کے بغیر ۲۲ جنوری ۱۸۷۸ء کو واپس اپنی اپنی چھاؤنی کو چلی گئی۔ بعد میں انگریزوں نے سیاسی گفت و شنید کا سہارا لیا۔ قبائلیوں کا جرگہ بلایا۔ صلح کی شرائط طے پائیں اور جو اکثر حسب دستور آزاد اور خود مختار ہی رہے۔

بونیر سُدّم (تحصیل صوابی) کے خوانین یوسف زئی کی شاخ اکازئی سے تعلق رکھتے ہیں اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام پر خوانین کا یہ گھرانا میر بابو خیل کہلاتا ہے۔ میر بابو خان ابتداء میں سید احمد شہیدؒ اور مجاہدین کے حلیف تھے لیکن بعد میں سکھوں نے اُن کا تعاون حاصل کر لیا۔ اُن کی "خانی" تسلیم کر لی گئی اور سکھ دربار کی جانب سے مالیہ کی وصولی اُن کی ذمہ داری قرار پائی۔ جنگِ بونیر کے وقت انگریزوں نے سُدّم کے خوانین عجب خان اور عزیز خان سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی جس پر وہ دونوں اُن سے بگڑ گئے۔ چونکہ بونیر کے قبائل میں اُنہیں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا اس لئے جنگِ امبیلہ کے بعد وہ قبائل کو انگریزوں کے خلاف آمادۂ جہاد کرنے میں لگ گئے۔ انہوں نے اردگرد کے قبیلوں کو سمجھایا کہ اگر ہم انگریزوں سے دب گئے تو وہ ہمارے علاقے چھین لے گا۔ ہمیں آزادی سے محروم کر دے گا اور ہمارا "پردہ" (وقار) اٹھ جائے گا۔ عزیز خان تو جنگِ امبیلہ کے دوران ہی وفات پا گیا۔ عجب خان باقی تھا۔ اس نے ۱۸۷۷ء میں بونیر وال غازیوں کی مدد سے سُدّم پر ہلہ بول دیا۔ درّوں اور پہاڑوں سے اُتر کر بونیر وال فرنگی کیمپ پر ٹوٹ پڑے۔ کئی ایک دیہات پر قبضہ کر لیا اور کئی ایک کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس پر انگریزوں نے بہت

بڑا لشکر اُن کے مقابلے کو بھیجا۔ محب خان گرفتار ہوا۔ اس پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ انگریزی عدالت نے اسے موت کی سزا سُنائی۔ آخر دم تک اس نے انتہائی مستقل مزاجی کا ثبوت دیا اور خوف و ہراس کو پاس تک نہ پھٹکنے دیا ـــــ اُس نے پھانسی قبول کر لی لیکن اپنی آن پر حرف نہ آنے دیا۔

امّان خیل امّان خیل ۱۸۵۲ء ہی میں انگریز سے دو دو ہاتھ کر چکے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں جب دوسری جنگِ افغانستان کی آڑ میں انگریز نے مختلف سرحدی قبیلوں کے خلاف تادیبی مہمیں بھیجیں تو سارے صوبہ سرحد میں اشتعال پھیل گیا۔ جگہ جگہ انگریزوں کے خلاف مظاہرے ہوئے بلکہ قبائلی مجاہدوں نے فرنگی کی کئی فوجی چوکیوں کو نشانہ بنایا ـــــ جنگ کے دوران تو انگریز مصلحتاً خاموش رہے لیکن اُدھر سے فارغ ہوتے ہی سرحدی قبیلوں کے خلاف فوج کشی کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔

۱۴ فروری ۱۸۷۸ء کو گائیڈز رسالہ کا کپتان بیٹی (BATTYE) کافی جمعیت کے ہمراہ امّان خیل کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ حملے میں اتنی رازداری سے کام لیا گیا کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر ہونے نہ پائی۔ شام سات بجے کپتان بیٹی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا اور ساری رات سفر کرتے ہوئے اپنے رسالے سمیت صبح چار بجے سپری جا پہنچا جو امّان خیل کے ملک میاں خان کا مسکن تھا۔ گاؤں والے نیند سے بیدار ہوئے تو انہیں پتہ چلا کہ چاروں طرف سے انگریز سپاہیوں کے نرغے میں آ چکے ہیں۔ ملک میاں خان معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا تاہم ہتھیار ڈالنے اور شکست قبول کرنے کی بجائے وہ ہتھیار لگا کر مردانہ وار میدان میں نکلا اور بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گیا۔

۱۴ مارچ ۱۸۷۸ء کو قبیلہ رانی زئی کے مرکزی گاؤں شاہ کوٹ کا بھی محاصرہ کیا گیا۔ یہ لوگ تعداد میں بہت تھوڑے تھے، ایک مسلح فوج سے لڑتے بھی تو کیسے؟ ـــــ جرگہ بازی شروع ہوئی۔ کچھ عرصہ دونوں فریقوں میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر ایک صلح نامہ طے پایا جس کی رُو سے امّان خیل نے فرنگی کو تاوانِ جنگ دینا منظور کر لیا۔

درّۂ خیبر دوسری جنگِ افغانستان انگریز کے لئے کئی اعتبار سے بڑی تباہ کُن ثابت ہوئی۔ اُن کا

سفیر متعینہ کابل (کیوگنری) قتل کر دیا گیا۔ اس کے سینکڑوں ساتھی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ میوند (قندہار) کے مقام پر بے سروسامان افغان مجاہدوں کے ہاتھوں فرنگی فوج کو وہ شکستِ فاش ہوئی جس کی مثال فوجی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ تاہم سیاسی طور سے انگریز اس لئے فائدے میں رہا کہ صلح نامہ گنڈمک کی رُو سے اُسے سرحد کے قبائلی علاقوں میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ درۂ خیبر اور وادی کرم کے علاقے پوری طرح انگریز کے تسلط میں آ گئے۔ ایک انگریز افسر رچرڈ وار برٹن کو خیبر ایجنسی کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا، وار برٹن کا انتخاب اس لحاظ سے بے حد موزوں اور مناسب تھا۔ کہ وہ پشتو اور فارسی زبان پر کابل عبور رکھتا تھا۔ پشتون روایات اس کی گھٹی میں تھیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا باپ ایک انگریز فوجی افسر تھا اور ماں ایک افغان شہزادی ـــــ افغانستان کی پہلی لڑائی میں اس کا باپ کابل میں مقیم تھا جہاں اس نے امیر دوست محمد خان کے گھرانے کی ایک دوشیزہ سے شادی رچالی۔ وار برٹن اسی افغان شہزادی کے بطن سے تھا۔ اس لئے وہ مقامی رسم و رواج اور قبائلی سیاست سے پوری طرح واقف تھا، اٹھارہ برس تک وہ ایجنسی کا پولیٹیکل ایجنٹ رہا اور اس عرصے میں اپنے تجربے اور صلاحیتوں کی بنا پر برطانوی اقتدار کے استحکام کے ضمن میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

سردار محمد اسلم خان

تاہم وار برٹن اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اتنا کامیاب حاکم ثابت نہ ہوتا اگر اُسے سردار محمد اسلم خان سدوزئی کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ سردار موصوف شاہ شجاع کے وزیر سردار محمد عثمان خان سدوزئی کے صاحبزادے تھے۔ شاہ شجاع اور اُن کے وزیر سردار عثمان خان کو آفریدی قبائل میں بڑا عزت و احترام حاصل تھا۔ سردار عثمان خان ہی کی کوششوں سے آفریدی جرّہ اور بازار میں دو بار شاہ شجاع کو سیاسی پناہ بھی دے چکے تھے۔ ۱۸۴۳ء میں دوست محمد خان برسرِ اقتدار آیا تو اس نے سردار محمد عثمان خان کو وزارت سے ہٹا دیا تو وہ خود اور ان کا خاندان پشاور آکر آباد ہو گئے۔ اہلِ پشاور بھی اس خاندان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے درۂ خیبر سے گزرنے والے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے "جزیلچی" دستہ (جو بعد میں خیبر رائفلز کہلایا) بھرتی کیا تو سردار محمد اسلم خان کو ان کا پہلا کمانڈر مقرر کیا گیا، انہوں نے اس فوج کی تربیت پر بڑی توجہ دی اور اُسے ہر لحاظ سے دوسری فوجی یونٹوں کا ہم پلّہ بنا دیا۔ یہ

سردار اسلم خان ہی کا کمال تھا کہ اُن کے ہوتے ہوئے خیبر رائفلز کے سپاہی بہترین کردار اور نظم و نسق کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ۱۸۹۱ء میں وائسرائے ہند لارڈ لینسڈاؤن درّہ خیبر کے معائنے پر آئے تو خیبر رائفلز کے دستوں نے انہیں سلامی دی جس پر وائسرائے نے ان کے نظم و ضبط کی بڑی تعریف کی۔

سردار محمد اسلم خان نے کئی سرحدی مہموں میں حصّہ لیا، کوہ سیاہ کے قبائل کے خلاف ایک مہم میں وہ زخمی بھی ہوئے، انگریز حکمران اُنہیں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے انہیں بہت سے اعزازات اور خطابات سے نوازا۔

سردار اسلم خان کے صاحبزادے بریگیڈیر سر حسام الدین خان بھی اپنے دَور کی ایک عظیم شخصیت ہو گزرے ہیں، قیامِ پاکستان کی تحریک میں انہوں نے قائداعظمؒ کا ساتھ دیا اور تمام خطابات واپس کر دیئے۔ سردار محمد اسلم خان کے پوتے کرنل محمد خالد خان اور اُن کے بھائی بھی اُونچے اُونچے عہدوں پر فائز رہے اور اپنی خاندانی وجاہت اور زُہد و تقویٰ کی وجہ سے پشاور کی قابلِ احترام شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ذخا خیل

۱۸۷۸ء میں دوسری جنگِ افغانستان کے سلسلے میں انگریز کی کابل جانے والی فوج اور توپ خانہ کا گزر درّہ خیبر سے ہوا تو آفریدی مجاہدوں نے ان کی شدید مزاحمت کی۔ مزاحمت کرنے والے قبیلوں میں ذخا خیل پیش پیش تھے۔ جنگ کے دوران تو انگریز اس پوزیشن میں نہ تھے کہ ذخا خیل کے خلاف فوج کشی کرتے چنانچہ انہوں نے یہ بات بعد پر اٹھا رکھی۔ جونہی اُنہیں جنگِ افغانستان سے فراغت ملی وہ ذخا خیل سے بدلہ لینے پر اُتر آئے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۷۸ء کو بیک وقت ڈکّہ اور جمرود سے انگریزی فوج کے دو دستے لفٹیننٹ جنرل ماڈ (MAUDE) کی کمان میں ذخا خیل کی سرکوبی کے لئے بھیجے گئے۔ ڈکّہ کا فوجی دستہ بریگیڈیر جنرل ٹیٹلر (TYTLER) کی کمان میں تھا۔ وہ چنار اور سنوبی کے درّوں کی راہ ذخا خیل کے مسکن وادیٔ بازار کی طرف بڑھا۔ اُدھر جنرل ماڈ۔ چورہ اور ولائی کے راستے پیش قدمی کرتے ہوئے علاقہ ذخا خیل میں داخل ہوا۔ آفریدی انگریز کے مذموم ارادوں سے باخبر تھے۔ انہوں نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کھلی جنگ سے جان بچائی اور اپنے دیہات خالی کر کے اپنے بال بچوں اور مالِ مویشی کو پہاڑی چوٹیوں پر پہنچا دیا۔ انگریزی فوج کچھ عرصے تک ذخا خیل کے علاقے میں رہی ـــ سارے عرصہ میں ذخا خیل

چپ سادھے رہے تاہم جب گورا پلٹنوں نے واپسی اختیار کی تو ذخاخیل نے اکا دکا حملے کر کے لشکر کے عقبی دستوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ انگریز بھی چونکہ دُنیا کو دکھانے کے لئے محض آفریدیوں کو مرعوب کرنے آئے تھے۔ جنگ سے احتراز کرتے رہے اور یوں قریباً ایک ماہ تک آفریدی علاقوں میں گھوم پھر کر برطانوی فوج واپس اپنی بیرکوں کو چلی گئی۔

انگریز کے پیٹھ پھیرتے ہی ذخاخیل نے چھاپہ مار کارروائیاں پھر تیز کر دیں اور درّہ خیبر سے گزرنے والے فوجی قافلوں کا ناک میں دم کر دیا۔ اس پر جنوری ۱۸۷۹ء کو انگریز نے پھر ایک فوجی مُہم ان کے خلاف ترتیب دی، اس مرتبہ حملہ آور فوج کو پانچ دستوں میں تقسیم کیا گیا اور ہدایت کی گئی وہ بیک وقت جمرود علی مسجد، لنڈی کوتل، ڈکّہ اور بساول سے کوچ کرتے ہوئے ذخاخیل کے علاقے بازار میں داخل ہو جائیں۔ فرنگی فوجوں نے بہت سے آفریدی دیہات اور "بُرج" بھی تباہ کر دیئے چونکہ ذخاخیل اکیلے اتنے بڑے لشکر کے مقابلے کی سکت نہ رکھتے تھے انہوں نے اپنے بھائی بندوں سے امداد طلب کی۔ ذخاخیل کی اپیل پر خیبری آفریدیوں کی تمام شاخوں کا ایک نمائندہ اجلاس باڑہ میں ہوا جس میں طے پایا کہ سارے آفریدی متحد ہو کر اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ جونہی قبائل کے اس ارادے اور اس اتحاد و اتفاق کی خبر جنرل ماڈ کو ملی اس نے خیر اسی میں سمجھی کہ اپنے لاؤ لشکر کو آفریدی علاقہ سے نکال کر واپسی کا رُخ اختیار کرے۔ اُسے علم تھا کہ جب آفریدیوں کے صرف ایک قبیلے (ذخاخیل) سے پنجہ لڑانا اتنا مشکل ہے تو آفریدیوں کی متحدہ طاقت کے سامنے ٹھہرنا کب ممکن ہوگا ——— اس نے اپنے سر سے بلا ٹالنے کے لئے حکومتِ ہند کو اس خطرناک صورتِ حال" سے آگاہ کیا تو حکومت نے یہ بات جنرل ماڈ ہی کی صوابدید پر چھوڑ دی کہ آفریدیوں سے جنگ چھیڑی جائے یا نہ؟ اشارہ پانے کی دیر تھی کہ جنرل ماڈ اور اس کا لشکر علاقہ ذخاخیل کو خالی کر گیا اور ۳ر فروری ۱۸۷۹ء تک کوئی فرنگی فوجی اس علاقے میں باقی نہ رہا۔

بعد میں سیاسی گفت و شنید کا سلسلہ چھڑا۔ خیبری آفریدیوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رُو سے انگریز نے آفریدیوں کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ اور انہیں یقین دلایا کہ تمام انگریزی فوج خیبر ایجنسی سے نکال لی جائے گی۔ اس کے جواب میں آفریدیوں نے برطانوی حکومت کی بالادستی قبول کر لی۔ سڑک، ریلوے لائن اور دوسری تنصیبات کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ہر طرح سے امن و امان قائم

رکھنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس یقین دہانی کے صلے میں حکومتِ ہند نے آفریدیوں کو سالانہ ۸۵۸۶۰ روپیہ مواجب دینا منظور کر لیا اور یوں وقتی طور پر وادیٔ خیبر میں امن بحال ہو گیا۔

مہمند جنگِ افغانستان کے دوران مہمندوں نے محض اسلامی جذبۂ اخوت کے تحت انگریزوں کے خلاف امیر شیر علی خان کی بھرپور حمایت کی تھی اور اس جہاد میں حصہ لینے کے لئے ایک لشکر امیرِ کابل کی امداد کے لئے علی مسجد بھی بھیجا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز اُن کے خلاف بھرے بیٹھے تھے اور مہمندوں سے انتقام لینے کے لئے موقع کی تاک میں تھے۔ مہمند بھی اس صورتِ حال سے غافل نہ تھے چنانچہ دوسری جنگِ افغانستان کے فوراً بعد ایک مہمند جرگہ انگریز کمانڈر جنرل براؤن کے پاس حاضر ہوا اور اپنے سابقہ رویہ پر اظہارِ ندامت کیا۔ بظاہر جنرل براؤن نے ان کی معذرت قبول کر لی لیکن بباطن اس کا دل مہمندوں سے صاف نہ ہوا۔

۲۸ فروری ۱۸۷۹ء کو مچنی کے پاس ایک انگریز انجینئر سروے کے کام میں مصروف تھا۔ کہ کسی منچلے مہمند نے اس پر گولی چلا دی، اگرچہ یہ محض ایک انفرادی فعل تھا تاہم انگریز نے خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہوئے ساری مہمند قوم پر اجتماعی جرمانہ عائد کر دیا۔ اس پر مہمند بگڑ گئے اور انہوں نے کثیر تعداد میں جمع ہو کر ڈکہ کے انگریزی کیمپ کا محاصرہ کر لیا۔ جس پر انگریز نے فوراً ہی ایک تادیبی مہم مہمندوں کے خلاف بھیج دی۔ اس فرنگی فوج نے دریائے کابل کے دائیں کنارے پر واقع مہمند گاؤں کام ڈکہ کا محاصرہ کر لیا۔ مہمندوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی اور انگریز کو اشتعال کا کوئی موقعہ نہ دیا۔ انگریز فوج دم سادھے پڑی رہی اور چند دن بعد محاصرہ اٹھا کر واپس چلتی بنی۔

۲۱ اپریل ۱۸۷۹ء کو دوبارہ ایک فوجی دستہ کیپٹن کریگ کے تحت مہمندوں کے خلاف بھیجا گیا۔ راستہ خراب اور دشوار گزار تھا، یہ دستہ کوئی گیارہ بجے رات کو کام ڈکہ پہنچا۔ گاؤں کی آبادی تھوڑی تھی، لوگ چُپ رہے اور اس فوجی مداخلت کے خلاف کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ تاہم دوسرے دن دریائے کابل کے بائیں کنارے پر بسنے والے مہمندوں نے دریا کو پار کر کے فرنگی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ انگریز کمانڈر بھانپ گیا کہ مہمند غازیوں کے جوش و خروش کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ڈکہ سے مزید کمک طلب کر لی ـــــ اب کام ڈکہ کے لوگ بھی فرنگی کی مزاحمت پر اتر آئے تھے۔ اس لئے انگریز کمانڈر نے گاؤں سے نکلنے ہی کو بہتر جانا اور کام ڈکہ اور دریائے کابل

کے مابین ایک پہاڑی پر مورچہ (سنگھڑ) قائم کرلیا۔ شام کو ۳۶ انگریز فوجیوں کا ایک دستہ گولی بارود لے کر اپنے بھائی بندوں سے آن ملا۔ مہمندوں کو پتہ چلا کہ مزید کمک انگریز کو پہنچنے والی ہے تو انہوں نے فوراً سنگھڑ پر حملہ کر دیا۔ صبح سے سہ پہر تک فریقین میں سخت لڑائی ہوتی رہی۔ قریب تھا کہ انگریز ہتھیار ڈال دیتے لیکن اُن کی خوش قسمتی کہ انہیں مزید کمک پہنچ گئی۔ مہمند تازہ دم فرنگی فوج کے آنے پر گھبرا گئے اور مورچہ چھوڑ، دریا کو پار کر کے اپنے اپنے علاقوں کو چل دیئے۔ فرنگی لشکر نے بھی وہاں زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً ڈکہ قلعہ کی طرف کُوچ کر دیا۔

۲۳ اپریل کو ڈکہ چھاؤنی کی ساری فرنگی فوج مہمندوں کے خلاف محاذ پر بھیج دی گئی۔ مہمند انگریز کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ میدانی علاقوں کو خالی کر کے اُن پہاڑی ٹھکانوں کو چلے جائیں جو انگریز کی زد سے باہر تھے ـــــ اس طرح چند مہینوں کے لئے اس محاذ پر خاموشی ہوگئی۔

دسمبر ۱۸۷۹ء اور جنوری ۱۸۸۰ء میں مہمندوں نے پھر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ انہوں نے ڈکہ چھاؤنی سے انگریز کو نکال باہر کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا، اس کے جواب میں انگریزوں نے یہ پروگرام بنایا کہ مہمندوں پر سامنے سے اور عقب سے بیک وقت حملہ کیا جائے۔ چنانچہ ڈکہ میں متعین انگریزی دستے سامنے سے اور لنڈی کوتل کی فوج پیچھے سے مہمندوں پر حملہ آور ہوئی۔ تاہم حملے سے پہلے ہی مہمند غازی پہاڑوں پر مورچے سنبھال چکے تھے۔ لنڈی کوتل کی فوج کو پیش قدمی میں کچھ تاخیر ہوگئی، صرف ڈکہ کے فوجی دستے میدان میں اترے۔ جلد ہی مہمندوں کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لاکر انگریزوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ۱۸ جنوری کی صبح تک لنڈی کوتل سے ہزاروں تازہ دم فوجی اپنے ساتھیوں کی امداد کو پہنچے۔ اتنی بڑی طاقت کے باوجود بمشکل تمام انہوں نے غازیوں سے مورچے خالی کرائے۔ چند مہمند دیہات کو تباہ کر کے اپنے چلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے فرنگی فوج واپس ڈکہ اور لنڈی کوتل روانہ ہوگئی۔

میران زئی میران زئی کی وادی ہنگو (کوہاٹ) اور پاڑہ چنار کے مابین واقع ہے۔ دوسری جنگِ افغانستان کے دوران اس وادی کے لوگوں نے بھی اسلامی ناطے سے افغانستان کی مدد کی تھی۔ جنگ سے فارغ ہوتے ہی انگریز نے اُن سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

میران زئی کا علاقہ زائی مشت قبیلہ کا مسکن ہے ۔ یہ پہاڑوں اور ندی نالوں سے گھرا ہوا خطہ ہے جہاں نہ سڑکیں ہیں نہ اچھے راستے ۔ دشوار گذار پگڈنڈیوں سے ہو کر زائی مشت کے دیہات تک پہنچنا جان جوکھوں کا کام تھا تاہم انگریز انتقام لینے پر تُلا ہوا تھا ۔

دسمبر کے اوائل میں فرنگی حکومت نے مختلف چھاؤنیوں سے فوجی دستے جمع کئے اور زائی مشت پر حملہ کر دیا ۔ کمان بریگیڈیر جنرل ٹیٹلر (TYTLER) کے ہاتھ میں تھی ۔ ۸ر دسمبر کو دُنیا کی اس سے سب بڑی شہنشاہیت کا لشکر میران زئی کے غریب اور نادار لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہونے نکل کھڑا ہوا ۱۲ر دسمبر کو یہ لشکر چنارک پہنچا ۔ چنارک سے زاؤ پہنچنے کا راستہ ایک گہری گھاٹی سے ہو کر گذرتا تھا جس کے دائیں بائیں اہم ناکوں پر زائی مشت سرفروشوں نے مورچے قائم کر رکھے تھے ۔ انگریز نے اُن سے مورچے چھیننے کے لئے بار بار حملے کئے ۔ توپ خانہ، مشین گنیں حرکت میں آگئیں ۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد انگریزوں نے ایک پہاڑی چوٹی کو سر کیا ۔ انہوں نے اس کامیابی کے بعد اپنا غصہ بے گناہ دیہاتیوں سے لیا ۔ ان کے جھونپڑے جلا دیئے ۔ جو شخص ہاتھ آیا اُسے گولی سے اُڑا دیا ۔ گیا ۔ بالآخر ۱۲ر دسمبر کو انگریزوں نے زاؤ پہنچ کر ہی دم لیا ۔ اس لاؤ لشکر سمیت انہیں وہاں ٹھہرنے کا یارانہ پڑا ۔ جنرل ٹیٹلر نے فوراً ہی واپسی کا حکم دے دیا اور ۱۵ر دسمبر کو فوجی چنارک جا پہنچے ۔

بعد میں برائے نام شرائط پر زائی مشت سے ایک معاہدہ طے پا گیا اور ۲۳ر دسمبر کو یہ فوج ٹل کی طرف کُوچ کر گئی ۔

محسود وزیرستان کا علاقہ تنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے اضلاع کے مغرب میں چٹیل پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادیوں پر مشتمل ہے ۔ جہاں کہیں پانی میسر آتا ہے اور زمین اچھی ہے کھیتی باڑی ہوتی ہے ۔ ورنہ لوگوں کی اکثریت کا گذارہ گلہ بانی اور چوپانی پر ہے ۔ علاقہ چونکہ پشاور سے کابل جانے والی شاہراہ سے ہٹ کر ہے اس لئے تاریخ میں اس کا ذکر بہت کم آتا ہے ۔ مغلوں اور درانی کی حکومت زیادہ تر علاقہ یوسف زئی، پشاور اور کوہاٹ کے میدانی علاقوں تک محدود رہی ہے ۔ ان میں سے کسی حکمران نے کبھی وزیرستان کی تسخیر کا ارادہ نہیں کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطہ کے لوگ غلامی کے نام سے ناآشنا رہے اور ہر قیمت پر آزادی کا تحفظ کرتے رہے

انگریز آیا تو اس نے محض دفاعی نقطۂ نظر سے وزیرستان کو اپنے تسلط میں لانا چاہا ۔ یوں بھی

انگریزوں نے اپنی فوجوں کو پہاڑی طرزِ جنگ سکھانے کیلئے اِسے ایک تربیت گاہ بنائے رکھا۔ متواتر جانی اور مالی نقصان کے باوجود انہوں نے وزیرستان کے معاملات میں مداخلت جاری رکھی۔

۱۸۶۰ء میں سات ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر فرنگیوں نے کانی گرام پر حملہ کیا۔ اس حملے میں اُن کے ساڑھے تین سو سے زیادہ فوجی مارے گئے ملاکھوں روپے کا جنگی سامان غارت ہوگیا۔ تاہم اس کے باوجود انہیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی ہونے نہ پائی۔

صوبہ سرحد میں آنے کے بعد چودہ پندرہ سال کے عرصہ میں انگریز نے محسود اور وزیر کے خلاف کئی مہمیں بھیجیں۔ جواب میں وزیر اور محسود بھی موقع ملنے پر بنّوں کے سرکاری دیہات پر ہلّہ بولتے رہے صرف ایک سال میں انہوں نے بارہ ایسے حملے کئے، جس پر جان نکلسن پندرہ سو سپاہیوں اور توپوں کے ساتھ وزیر اور محسود پر چڑھ دوڑا اور اُن کے کئی دیہات جلا کر راکھ کر دیئے۔

دوسری افغان جنگ کے خاتمے پر معاہدۂ گندمک کی رُو سے امیرِ افغانستان وزیرستان اور کُرم کے علاقوں سے دستبردار ہوگیا تو یہ علاقے فرنگی کے زیرِ اقتدار آ گئے۔ چونکہ اس جنگ میں دوسرے سرحدی قبیلوں کی طرح وزیر اور محسود نے بھی اسلامی حمیت کی بنا پر امیرِ کابل کی حمایت کی تھی۔ اس لئے انگریز نے اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کی ٹھان لی۔ کینیڈی اور گارڈن جیسے تجربہ کار جرنیلوں کو حکم ہوا کہ وہ بنّوں اور ٹانک کی چھاؤنیوں سے بیک وقت محسود پر فوج کشی کریں۔

جنرل کینیڈی ۱۸ اپریل ۱۸۸۱ء کو ٹانک سے روانہ ہوکر چار دن میں جنڈولہ پہنچا اور شاہو رغنگی کی راہ سے پیش قدمی جاری رکھی حتّٰی کہ ۲۲ اپریل کو وہ وادی خیسورہ میں داخل ہوگیا۔ انگریز لشکر کی آمد پر محسود نے اپنا روایتی طریقِ جنگ آزمایا۔ وہ دیہات کو خالی کر کے ایسے پہاڑی ٹھکانوں کو چلے گئے جہاں تک کسی سامراجی لٹیرے کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ اپنی خفّت مٹانے کے لئے انگریز لشکر نے محسود کے مکانوں اور کھلیانوں کو آگ لگادی اور اس طرح اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ چار مئی کو شاہ عالم کے مقام پر دونوں فریقوں میں پہلا زبردست معرکہ ہوا۔ محسود نے یہاں پہلے سے مورچے قائم کر رکھے تھے۔ انگریز کی تین بٹالین فوج اپنے زبردست توپ خانہ کی مدد سے بار بار اِن مورچوں پر قبضہ کرنے میں کوشاں رہی لیکن ہر بار اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی بالآخر سینکڑوں جانوں کی قربانی دے کر فرنگی نے یہ خونی معرکہ سَر کر لیا ـــــ اپنی اس کامیابی کے بعد

جنرل کینیڈی نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور ۸ رمئی کو کافی گرام پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو محسود قبائل کا سب سے بڑا اور اہم مرکز ہے۔ کچھ دن تک کافی گرام میں قیام کرنے کے بعد انگریزی فوج اور آگے بڑھی اور مکین کے قصبہ تک جا پہنچی ـــ کینیڈی پہلا انگریز تھا جس نے مکین کی آزاد سرزمین پر قدم رکھا۔

اُدھر بنوں کا فوجی دستہ جنرل گارڈن کے تحت ۱۶ راپریل کو چھاؤنی سے روانہ ہوا اور ۹ رمئی کو رزمک پہنچا۔ اس دستے کا مقصد زیادہ تر اپنی قوت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس لئے اس کی زیادہ مزاحمت نہ ہوئی۔ اپنی حکومت کی ہدایت کے مطابق واپسی پر اس دستے نے شکتوی کی وادی کا راستہ اختیار کیا اور ۱۸ رمئی کو واپس ٹانک اور ۲۲ رمئی کو بنوں پہنچ گیا۔

اس طرح اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے اور اپنا پورا دباؤ ڈالنے کے بعد انگریز نے مختلف قبائلی جرگوں سے صلح کی گفت وشنید کا آغاز کیا۔ بالآخر ۷ ستمبر ۱۸۸۱ء کو محسود اور انگریزی حکومت میں ایک معاہدہ طے پاگیا۔ جس کی وجہ سے کچھ عرصہ امن وامان کی فضا برقرار رہی۔

تختِ سلیمان کی مہم

ڈیرہ اسمٰعیل خان کی سرحد پر شیرانی قبیلہ آباد ہے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے تاہم جوشِ جہاد میں کسی بڑے قبیلے سے ہرگز پیچھے نہیں۔ ۱۸۵۲ء میں اس نے انگریز سے کھلم کھلا ٹکر لی تھی۔ پھر کچھ عرصہ اس نے خاموشی اختیار کئے رکھی تاہم بعد دوسری جنگِ افغانستان کے بعد انگریز نے سرحدی قبائل کے خلاف تادیبی مہموں کا آغاز کیا اور قبائلی علاقوں میں سڑکیں بنانے کی غرض سے سروے شروع کیا تو شیرانی نے ان کارروائیوں کی شدید مذمت کی۔ اس پر ۱۵ رنومبر ۱۸۸۳ء کو ایک فوجی مہم ڈیرہ اسمٰعیل خان سے روانہ ہوئی اور دوآبن اور شیخ حیدر کے درہ سے گزرتی ہوئی شیرانی کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ جنرل کینیڈی اس مہم کے انچارج تھے۔ چونکہ راستے میں کئی جگہ چٹانیں گری ہوئی تھیں، راہ مسدود تھی اس لئے فوج کو آگے بڑھنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ شیرانی نے حتی المقدور انگریزی لشکر کی ڈٹ کر مزاحمت کی، بعد میں انگریز جرنیل نے شیرانی جرگے کو یقین دلایا کہ یہ مہم فوجی غرض سے نہیں بلکہ اس کا مقصد صرف سڑکیں تعمیر کرنا ہے تو وہ لوگ خاموش ہوگئے اور مزاحمت ترک کردی۔ ۸ ردسمبر ۱۸۸۳ء کو انگریزی لشکر واپس ڈیرہ پہنچ گیا۔

ریلوے لائن کی توسیع

۱۸۷۰ء تک ریلوے لائن کا سلسلہ صرف راولپنڈی تک پہنچا تھا۔ وہاں سے پشاور آنے والے لوگ پیدل یا گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے سفر کیا کرتے تھے تاہم ۱۸۷۰ء کے بعد ریلوے لائن کو پشاور تک پہنچانے کا کام شروع ہوا ـــــ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ پر پُل باندھا گیا تو ۳۱ مئی ۱۸۸۱ء کو ریل کی پٹڑی خیرآباد تک بچھا دی گئی۔ اس سے اگلے سال یکم مئی کو پشاور تک ریلوے لائن مکمل ہو گئی۔ یکم جنوری ۱۸۸۳ء وہ دن تھا جب پشاور شہر اور چھاؤنی کے مابین بھی ریل چلنے لگی۔ اس طرح عوام کو آمد و رفت میں بڑی سہولت ہو گئی تاہم انگریز کا اصل مقصد یہ تھا کہ ریلوے کی بدولت فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔ رفتہ رفتہ صوبہ سرحد کی تمام بڑی بڑی چھاؤنیاں ریلوے لائن کے ذریعے ہندوستان کے دوسرے مقامات سے ملا دی گئیں ـــ کوئی سرحدی قبیلہ سر اٹھاتا تو فوری طور پر فوج وہاں پہنچا دی جاتی۔ گویا ریلوے لائن نے انگریزی اقتدار کو سرحدی علاقوں میں مستحکم بنانے میں بڑی مدد دی۔

پشاور چھاؤنی چونکہ صوبہ سرحد کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی۔ اس لئے اس کی توسیع و ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس چھاؤنی کی بنیاد سر کولن کیمبل نے رکھی تھی۔ پہلے پہل چھاؤنی سپاہیوں کی چند بیرکوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں یہاں فوجی دفاتر، ہسپتال، کلب، گرجا گھر، کالج، افسروں کے بنگلے اور گورنمنٹ ہاؤس تعمیر ہوئے تو اس کی رونق بڑھی۔ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں بنائی گئیں۔ باغ اور درخت لگائے گئے۔ ہیڈ کوارٹر قائم ہوا تو رفتہ رفتہ پشاور چھاؤنی کا شمار ملک کی سب سے بڑی اور خوبصورت چھاؤنیوں میں ہونے لگا۔

مجاہدینِ ہزارہ

سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل دہلویؒ کی تحریک مجاہدین نے صوبہ سرحد کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس تحریک کی بدولت عوام کا دینی شعور بیدار ہوا۔ اور جذبۂ جہاد کو فروغ ملا۔ ۱۸۳۱ء میں ان دونوں بزرگوں اور ان کے ساتھیوں نے شہادت پائی تاہم بچے کھچے مجاہدین نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنا جہادی مشن جاری رکھا۔ کوہِ سیاہ اور علاقہ یوسف زئی میں انہوں نے بار بار انگریز سے پنجہ لڑایا۔ ۱۸۶۳ء کے جہادِ امبیلہ میں انہوں نے اپنے امیر مولوی محمد عبداللہ کی قیادت میں جاں نثاری اور سرفروشی کا نیا باب رقم کیا۔ دشمن کو شدید نقصان پہنچایا۔ اور پروانہ وار شمعِ اسلام پر جانیں قربان کیں۔

امبیلہ کی جنگ کے ختم ہوتے ہی بچے کھچے مجاہدین چغرزئی کے علاقے کو نکل گئے۔ جب انگریزوں نے ان کا پیچھا کیا تو وہ کوہ سیاہ کی ڈھلوانوں پر جا کر آباد ہو گئے۔ حسن زئی قبیلے نے اسلامی ہمدردی کے پیش نظر انہیں دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر، ورسند سے کوئی بیس میل شمال کو بلوسی کے مقام پر کچھ اراضی دے دی تو ۱۸۸۸ء تک وہ وہیں مقیم رہے۔ اس سارے عرصے میں انگریز ان کے پیچھے لگا رہا۔ بلوسی کو تباہ کرنے کے لئے ایک فوجی مہم بھیجی گئی ـــــ بچارے مجاہدین کی تعداد اس وقت دو سو سے بھی کم تھی تاہم انہوں نے کوٹکئی کے مقام پر انگریزی لشکر سے ٹکر لی۔ ایک ایک مجاہد آگے بڑھتا اور دست بدست لڑائی کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر جاتا۔ جب ایک ایک کر کے سارے مجاہد شہید ہو گئے تو انگریزی لشکر یلغلیں بجاتا ہوا آگے بڑھا اور بلوسی میں واقع مجاہدین کا قلعہ تباہ کر دیا۔ انگریز کی فوجی رپورٹوں میں کوہ سیاہ کی اس مہم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

"۱۸ جون ۱۸۸۸ء کو میجر بٹی (BATTYE) اور کیپٹن ارمسٹن (URMSTON) چند دیسی افسروں اور سپاہیوں کے ہمراہ اکازئی کی پہاڑیوں میں "سروے" کر رہے تھے کہ اچانک ان پر حملہ ہوا۔ دونوں انگریز افسر اور ان کے کئی ساتھی ہلاک کر دیئے گئے۔ اس پر اوگی (ہزارہ) کیمپ کی برطانوی سپاہ کو انتقام لینے کی ہدایت کی گئی۔ صرف اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ۷ ستمبر ۱۸۸۸ء کو جنرل میکوئین (MAQUEEN) کی کمان میں ایک لشکر جرار بھیجا گیا۔ جس میں کشمیر کی ڈوگرہ رجمنٹ اور لنڈی کوتل کی خیبر رائفلز کے آفریدی بھی شامل تھے ـــــ جنرل میکوئین پوری تیزی سے محاذ پر پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے پولیٹیکل حکام کو نواحی قبیلوں کا جرگہ بلانے کا حکم دیا ـــــ جرنیل نے قبائلی ملکوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ۲ اکتوبر تک انگریز کی تمام شرائط قبول کر لیں ورنہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے گی۔"

اس مرتبہ انگریز نے اپنے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک محاذ کھولنے کی بجائے بیک وقت تین محاذ کھولے اور تینوں اطراف سے مجاہدین پر یلغار کرنے کا فیصلہ کیا۔ فرنگی کا مقصد تراڑہ میں اپنا فوجی کیمپ اور قلعہ قائم کرنا تھا۔ انگریز چاروں طرف سے مجاہدین کا گھیراؤ کرنے کی کوشش میں تھے، پہلے پہل تو ان کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی تاہم جب وہ ایک پہاڑی نالے کے

کنارے کے گھنے جنگل میں پہنچے تو ۸۸ مجاہدینِ اسلام کا ایک دستہ سر پر کفن باندھے ہوئے تلواریں لہراتا گورا فوجیوں پر ٹوٹ پڑا اور فرنگی سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگا۔ فوجی دستہ حواس باختہ ہو گیا اور اپنے آپ کو بے بس پا کر خطرے کا الارم (بگل) بجا کر اپنے باقی ساتھیوں کو امداد کے لئے بلایا۔ اس پر پورا لشکر جمع ہو کر توپوں اور مشین گنوں سے مجاہدین پر آگ برسانے لگا۔ تاہم وہ قلندرانِ خدامست نتائج سے بے نیاز ہو کر آخر تک لڑتے رہے اور ایک ایک کر کے سبھی جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ان ۸۸ مجاہدوں میں ۸۴ کا تعلق جمعیتِ عالیہ مجاہدین سے تھا جب کہ باقی ماندہ ۴ قبائلی سرفروش تھے ـــــ ۸۸ افراد کے اس چھوٹے سے گروہ نے بہادری کی وہ مثال قائم کی کہ دشمن بھی داد دینے پر مجبور ہو گیا۔"

اس معرکے کے بعد انگریزوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور کوٹکئی۔ کیمسا اور دلبوڑی کے دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جو سامنے آیا اسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

۸ اور ۹ اکتوبر کی درمیانی رات کوہِ سیاہ کے سرفروش قبائلی ایک بار پھر جمع ہوئے اور پوری قوت سے انگریزی لشکر پر شب خون مارا۔ وہ تاک تاک کر انگریز افسروں کو نشانہ بناتے تھے۔ کُنہار کے منبع کے پاس ایک مجاہد نے انگریز کرنل کروک شینک (CROOK SHANK) پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

۱۳ نومبر کو جنرل چانسر (CHANCER) مزید فوج لے کر آیا اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر، میدان نامی گاؤں کے پاس واقع ہندوستانی مجاہدین کی بستی کو پیوندِ زمین کر دیا۔

ایک چھوٹی سی جمعیت مجاہدین کے خلاف اپنی بڑی فوجی مہم کو "بغاوت کو دبانے" کا نام دے کر انگریز نے بڑی خوشیاں منائیں۔ فتح کے شادیانے بجائے گئے، جشن برپا ہوئے اور خیبر رائفلز اور ڈوگرہ رجمنٹ کے افسروں اور سپاہیوں کو خصوصی میڈل اور انعام دیئے گئے۔ اس سے انگریز کی اُس بوکھلاہٹ اور پریشانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اُسے مٹھی بھر سرحدی حریت پسندوں کی وجہ سے لاحق تھی۔

فارورڈ پالیسی دوسری جنگِ افغانستان کے خاتمے تک سرحدی اور قبائلی علاقوں میں انگریز اپنی "عدم مداخلت" کی نام نہاد پالیسی پر کاربند رہے ـــــ وہ میدانی علاقوں

میں اپنے قدم مضبوط کرتے جاتے اور قبائلی علاقوں میں صرف اُسی صورت میں دخل دیتے جب اُن پر اس سمت سے کوئی حملہ ہوتا۔ تاہم گنڈمک کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد جب افغان حکومت کُرم، خیبر، اور وزیرستان کے سرحدی علاقوں سے دستبردار ہو گئی تو انگریز کو کھلم کھلا ان علاقوں میں مداخلت کرنے کا قانونی جواز ہاتھ آ گیا۔

دوسری جنگِ افغانستان کے دوران جنرل رابرٹسن کی سرکردگی میں ایک انگریز لشکر کُرم اور پیواڑ کوتل کی راہ کابل اور غزنی کی جانب بھیجا گیا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ لشکر کرم ہی میں رہ پڑا ـــــ جنرل رابرٹسن نے شلوزان کے پُرفضا مقام پر اپنی قیام گاہ تعمیر کر لی اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیں ـــــ اس نے پولیٹیکل حکام کی مدد سے سازشوں کا جال پھیلایا اور قبائل کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر طوری قبیلہ کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ واقع یہ تھا کہ طوری قبیلہ کے لوگ شیعہ مسلک کے پیروکار تھے جب کہ اُن کے گرد و نواح میں آباد سبھی قبیلے اہلِ سنّت والجماعت عقائد کے علمبردار تھے۔ عقائد کے اس اختلاف کی بنا پر ان قبیلوں میں اکثر خانہ جنگی کی کیفیت رہتی تھی ـــــ انگریز نے اپنی مقصد برآری کے لئے طوری کی پیٹھ ٹھونکی۔ انہیں اپنی امداد کا یقین دلایا اور ان کے تعاون اور حمایت سے کُرم کی پوری وادی پر مستقل قبضہ جمانے کا سامان کرنے لگے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد "فارورڈ پالیسی" کے تحت کُرم کو انگریزی علاقہ قرار دے دیا گیا اور سر رُوس کیپل جیسے جہاندیدہ افسر کو وہاں کا پہلا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا گیا۔ روس کیپل نے بڑی ہوشیاری اور حکمتِ عملی سے انگریز کے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کی اور کُرم کی خوبصورت اور زرخیز وادی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

میران زئی کی مہم

کُرم پاڑہ چنار کے لوگوں کو ساتھ ملانے کے بعد اب انگریز اورکزئی اور آفریدی قبیلوں کی طرف متوجہ ہوا۔ کوہاٹ سے پاڑہ چنار جانے کے لئے چونکہ میران زئی کی وادی راہ میں پڑتی تھی اور انگریز جانتا تھا کہ جب تک میران زئی کے لوگوں کو زیر نہ کیا جائے پاڑہ چنار جانے والی سڑک محفوظ نہیں رہ سکتی اس لئے ۱۸۹۱ء میں اورک زئی اور آفریدی قبیلوں کے خلاف مہم بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ درونِ پردہ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ میران زئی کے اہم مقامات پر فوجی چوکیاں، پلٹنیں اور قلعے بنائے جائیں اور اہم راستوں پر

سڑکیں بنائی جائیں تاکہ انگریزوں کو فوجی نقل و حرکت میں دشواری نہ ہو۔ تاہم بہانہ یہ بنایا گیا کہ اورکزئی اکثر اوقات سرکاری علاقے پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ مہم کا مقصد انہیں ایسے حملوں سے باز رکھنا ہے ـــــ یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک قوم تو سات سمندر پار سے آکر کروڑوں انسانوں کی آزادی سلب کرے اور اس پر بھی "حق بجانب" قرار پائے اور دوسری قوم غاصب حکمرانوں سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش کرے تو اُسے "حملہ آور" قرار دیا جائے ـــ لیکن اہلِ فرنگ کے حیلوں بہانوں اور "ڈپلومیسی" سے کون واقف نہیں۔

بہر حال فوجی مہم کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سارے مُلک سے منتخب فوجی دستے کوہاٹ چھاؤنی پہنچنے لگے اور جنوری ۱۸۹۱ء میں جنرل سر ولیم لوکہارٹ کی کمان میں ایک لشکرِ جرار پوری طرح لیس ہو کر کوہاٹ سے نکلا۔

۲۹ جنوری تک ساری فرنگی فوج وادیٔ خانکی کے مقام گوادا پہنچ چکی تھی۔ گوادا میں فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ ہر دستہ الگ الگ راہ سے پیش قدمی کرے، چنانچہ یہ لشکر ایک طوفان بن کر علاقے پر ٹوٹ پڑا۔ راہ میں پڑنے والی اورک زئی دیہات کو لوٹ لیا گیا، فصلوں کو آگ لگا دی گئی اور مال مویشی کو ہانک کر فوجی اپنے کیمپوں میں لے گئے۔ ان دہشت پسندانہ کارروائیوں سے انگریز کا مقصد اورک زئی کا حوصلہ پست کرنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح بے بس ہو کر اورک زئی دب جائیں گے اور انگریز اُن سے اپنی من مانی شرطیں منظور کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اورک زئی یوں بھی چھوٹا سا غریب قبیلہ ہے۔ اتنے بڑے لشکر سے ٹکر لینے کا یارا اُس میں کہاں تھا۔ تاہم قدرت نے ان مردانِ مجاہد کا ساتھ دیا۔ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں اور حالت یہ ہو گئی کہ انگریزی فوج کے بہت سے سپاہی اور باربرداری کے جانور سردی کی وجہ سے اکڑ کر مر گئے۔

انہی دنوں ہزارہ کے کوہستانی قبیلوں کے خلاف بھی فوج کشی جاری تھی۔ وہاں سرکاری فوجوں کا قافیہ تنگ ہونے لگا تو سر ولیم لوکہارٹ کو اس محاذ سے ہٹا کر ایک ڈویژن فوج دے کر اُدھر روانہ کیا گیا جس کی وجہ سے اورک زئی کے خلاف انگریز کی فوجی مہم کچھ عرصہ کے لئے کھٹائی میں پڑ گئی۔ ہزارہ سے فراغت ہوئی تو لوکہارٹ صاحب نے پھر اورک زئی پر توجہ مبذول کی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے انگریز کا منشا تو یہ تھا کہ سمانہ کے پہاڑی سلسلے میں مناسب اور کلیدی مقامات پر فوجی چوکیاں، قلعے اور سڑکیں تعمیر کرے چنانچہ گورا سپاہیوں کی سنگینوں کے سایہ میں تعمیری کام شروع کر دیئے گئے۔ پہلے پہل تو غریب قبائلی خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے لیکن جب فرنگی کی مداخلت بڑھنے لگی تو ان کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا۔

۲۴ اپریل کو انگریز انجینیر اور ایم۔ ای۔ ایس کا عملہ حسب معمول سڑک بنانے میں مصروف تھا اور سکھ رجمنٹ کے سپاہی سنگینیں تانے اُن کی حفاظت پر متعین تھے کہ کچھ قبائل چرواہے تماشا دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور سکھ سپاہی سے بات چیت کرنے لگے۔ دورانِ گفتگو سکھ سپاہی نے کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے چرواہے کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چاقو نکال کر دو تین سکھوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ انگریز تو بہانے کی تلاش ہی میں تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر ایلائی کے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ حال دیکھ کر اردگرد کے تمام قبائلی پہاڑوں پر جمع ہونے لگے ـــــ انگریز کے فوجی دستے ان کے تعاقب میں نکلے تو ایسے پھنسے کہ سارا دن انہیں نہ پانی مل سکا نہ کھانے کی کوئی چیز ـــــ ان بے آب و گیاہ بنجر چٹانوں کے درمیان زندگی بسر کرنا تو شاہین صفت قبائلیوں ہی کا دل گردہ ہے۔ کوئی دوسرا یہ سختیاں بھلا کہاں برداشت کر سکتا ہے۔ فرنگی فوج کے دستے سارا دن پہاڑوں میں گھوم پھر کر شام کو اپنے کیمپوں میں واپس چلے جاتے۔ اُنہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آتا ـــــ تنگ آ کر انگریز کمانڈر نے مزید کمک طلب کر لی۔ درسمند رکا سارا علاقہ گورا فوجوں سے بھر گیا ـــــ ان لوگوں نے میران زئی کے دیہات میں بڑا خوف و ہراس پھیلایا۔ قبائلی مجاہد اعلانیہ طور پر تو ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ البتہ پہاڑی نالوں اور گھاٹیوں میں جہاں تک ہو سکتا دشمن کو خوب نقصان پہنچاتے۔ گلستان کے مقام پر تو انتہائی سخت لڑائی ہوئی ـــــ مہینہ ڈیڑھ مہینہ انگریزی فوج کے دستوں اور قبائلی مجاہدوں میں آنکھ مچولی کا یہ سلسلہ جاری رہا لیکن بعد دونوں فریق جنگ سے اکتا گئے۔ بالآخر ۹ مئی کو صلح نامہ طے پا گیا اور انگریزی فوج بزعم خود اپنا "وقار بلند کرنے" کے بعد اپنی اپنی چھاؤنیوں کو لوٹ گئی۔

کوہِ سیاہ کے قبائل

۱۸۸۸ء میں برطانوی حکومت نے ہزارہ کے کوہِ سیاہ کے مجاہد قبائلیوں کے خلاف فوجی مہم بھیجی تھی۔ اس مہم کا مقصد قبائلی غازیوں کو ہراساں

اور مرعوب کرنا تھا۔ کسی حد تک مہم سے یہ مقصد حاصل بھی ہو گیا لیکن توسیع پسندوں کی حرص کب ختم ہوتی ہے۔ اب انگریز کی خواہش تھی کہ ان علاقوں پر مکمل تسلط حاصل کرے۔ اس مقصد کے لئے جنرل میکوئین مارچ ۱۸۹۰ء میں فوجوں اور توپ خانے کو لے کر اوگی پہنچا۔ پہلے پہل تو اُس نے قبائل پر زور دیا کہ وہ اپنے علاقوں میں فوجی چوکیوں، قلعوں اور سڑکوں کی تعمیر کی اجازت دے دیں لیکن قبائل کی طرف سے حوصلہ افزا ردِ عمل نہ دیکھ کر فوج کشی پر اُتر آیا، اس کا پہلا نشانہ قبائلی قصبہ برچڑھ تھا۔ قبائلی مجاہدوں نے جان پر کھیل کر اپنی آزادی کی حفاظت کی۔ اس شدید مزاحمت اور سردی کی شدت نے جنرل میکوئین کو اپنی مہم ملتوی کر دینے پر مجبور کر دیا۔

مارچ ۱۸۹۱ء کا موسم بہار شروع ہوا تو انگریز کے جوشِ جنوں نے انگڑائی لی اور جنرل ایلیس کی قیادت میں برطانوی فوجیں پھر اوگی میں جمع ہونے لگیں۔ ایک دوسرا انگریزی لشکر دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ کوہ سیاہ کی طرف بڑھا۔ دونوں لشکر آگے چل کر یکجا ہو گئے اور بارہ مارچ کو تواڑہ پہنچے۔ ۱۵ر مارچ کو انگریز لشکر مزید پیش قدمی کرتے ہوئے ٹلی کے مقام تک جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں کے پیشِ نظر ایلیس کو اپنی فوج دو حصّوں میں تقسیم کرنی پڑی۔ اور جنرل ولیم سن (WILLIAMSON) اور جنرل ہیمنڈ (HAMMOND) کو بالترتیب دریائے سندھ کے دائیں اور بائیں کنارے کے دستوں کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔

۱۸ر اور ۱۹ر مارچ کی درمیانی رات کو غازی کوٹ کے مقام پر قبائلی مجاہدوں نے سکھ رجمنٹ پر زبردست شب خون مارا اور دن نکلنے تک سکھوں کی ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کئی گھنٹے کی لڑائی کے بعد تازہ دم کمک پہنچی تو سکھوں کی جان میں جان آئی۔

۲۰ر مارچ کو انگریز نے اور زیادہ فوج جمع کی اور پوری قوت سے آگے بڑھتے ہوئے پلوسئی۔ بِلّی اور سیری کے مقامات پر قبضہ جما لیا۔ سارے علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کا کام تیز کر دیا گیا اور ہاکرئے کے مقام پر ایک پُل بھی تعمیر کیا گیا لیکن اسی روز شام کے بعد قبائلی مجاہد اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکل کر سکھ دستوں پر ٹوٹ پڑے۔ سکھوں نے فوراً کمک طلب کر لی جس پر کرنل گیسلی ہزاروں سپاہی لے کر ان کی مدد کو پہنچا۔ تاہم مجاہدین نے جان پر کھیل کر ان غاصبوں کا مقابلہ کیا۔ ایک شب خون میں انہوں نے بہت سے سکھ اور گورا سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دن نکلنے سے پہلے اپنی اپنی

پہاڑی کمین گاہوں میں پہنچ گئے۔ اب انگریز نے مزید کمک طلب کی۔ توپوں میں بھی اضافہ کیا گیا ——— گورا فوج پیش قدمی کرتی ہوئی ولیاڑی تک جا پہنچی۔ ۲۳ر مارچ کو انگریز نے سپیری کو تباہ کر دیا۔ ۲۴ر مارچ کو جنرل ہیمنڈ ٹلی، رِل اور مکرائی سے ہوتا ہوا پلوشی جا نکلا۔ ۲۵ر مارچ کو دربانئی کے نواح میں انگریز فوجوں اور مجاہدینِ آزادی میں ٹکر ہوئی۔ اس معرکے کے نتیجے میں انگریز اتنے گھبرائے کہ انہوں نے راولپنڈی سے مزید دو ڈویژن فوج طلب کر لی۔ ۲۱ر مارچ کو یہ بریگیڈ دربند پہنچا اور ۷ر اپریل تک وہیں مقیم رہا۔

۸ر اپریل کو ایک قبائلی جرگہ منعقد ہوا جس میں کچھ شرطیں طے پا گئیں۔ قدرے اطمینان ہونے پر انگریز نے اپنی آدھی فوج ہزارہ سے نکال لی جب کہ باقی ماندہ فوج ۱۱ر جون تک اپنی علاقوں میں پڑی رہی ——— اس صلح نامہ کی رُو سے انگریز نے یہ شرط عائد کی تھی کہ مجاہدین کے رہنما ہاشم علی کو کوہ سیاہ کے علاقے میں آباد ہونے کی اجازت نہ دی جائے لیکن انگریزی لشکر کے پیٹھ پھیرتے ہی قبائل نے ہاشم علی کو دوبیہ میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ جس پر انگریز پھر غضب میں آ گیا۔ اور ستمبر ۱۸۹۲ء میں سر ولیم لوکہارٹ ایک لشکر جرار لے کر حسن زئی اور اکاخیل کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے دربند پہنچ گیا۔ ۵ر اکتوبر کو انگریز جرنیل اپنے سارے لاؤ لشکر کے ساتھ قبائلی علاقے میں داخل ہوا اور ولئی اور منجاکوٹ جا پہنچا، دوسرے دن باپوآ اور دوبیا پہنچنے پر اُسے معلوم ہوا کہ ہاشم علی خود ہی اپنا مسکن چھوڑ کر کہیں اور جا چکا ہے۔ جنرل لوکہارٹ نے اس امر کو غنیمت سمجھتے ہوئے واپسی کی راہ اختیار کی اور اپنی فوج کے ہمراہ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کو واپس دربند پہنچ گیا۔

امیر عبدالرحمٰن خان کی آمد

امیر عبدالرحمٰن خان ایک مدبر حکمران تھا، اُس نے افغانستان کے مختلف علاقوں کو پھر سے متحد کیا، نظم و نسق کو بہتر بنایا امن و امان قائم کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے ملک کو غیر ملکی حکمرانوں کا تختۂ مشق بننے سے بچایا۔ امیر کا کہنا تھا کہ "افغانستان چکی کے دو پاٹوں میں پس چکا ہے۔ اب اسے مزید پسنے سے بچانا چاہیئے"۔ ایک موقع پر اُس نے کہا تھا ——— "افغانستان وہ بکری ہے جس پر شیر کی آنکھیں بھی لگی ہوئی ہیں اور ریچھ کی بھی۔ اسے صرف خدائی امداد ہی بچا سکتی ہے ———" بات بالکل درست تھی۔ اُن دنوں رُوس اور برطانیہ میں سخت رقابت تھی۔ دونوں ممالک افغانستان کے معاملات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔

اور دونوں طاقتیں افغانستان اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کو ایک مستقل جنگی اکھاڑہ بنائے رکھنے پر تُلی ہوئی تھیں۔

دونوں طاقتوں کی رقابت کے سلسلے میں ایک واقعہ ۱۸۸۴ء میں پنج دِہ کے مقام پر پیش آیا۔ روس اس سے قبل مرو کو ہڑپ کر چکا تھا اور مزید آگے بڑھنے کے لئے موقع کی تاک میں تھا۔ برطانیہ کو رُوسی اقدامات پر گہری تشویش تھی۔ گفت وشنید کے بعد ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد افغانستان کی شمالی سرحدوں کا تعین کرنا تھا۔ جب کمیشن پنجدہ پہنچا (جو افغانستان کا ایک گاؤں تھا) تو روسیوں نے اس مقام پر اپنا حق جتایا۔ برطانوی ارکان اس پر بگڑ گئے۔ قریب تھا کہ یہ تنازعہ دونوں ملکوں میں جنگ چھڑنے کا باعث بن جائے لیکن امیر عبدالرحمٰن خان نے انتہائی فراست سے کام لیتے ہوئے ایک دانش مندانہ مؤقف اختیار کیا اور کہا کہ "میں وُثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا پنجدہ افغان علاقہ ہے یا روسی مقبوضہ مقام ——" اس سے خطرہ ٹل گیا اور بات آگے بڑھنے نہ پائی۔

چونکہ سرحدی قبائلی علاقوں میں بھی ایسی حدِ فاصل مقرر کرنا ناگزیر تھا۔ اس لئے امیرِ کابل اور برطانوی حکومت میں گفت وشنید ضروری سمجھی گئی۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے امیر عبدالرحمٰن خان کو راولپنڈی آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

۲۷ مارچ ۱۸۸۵ء کو حکمرانِ کابل کا فراش باشی اپنے عملہ کے ہمراہ لنڈی کوتل پہنچا اور بادشاہ کے استقبال کے لئے کئے گئے انتظامات کا معائنہ کیا۔ ۲۷ مارچ کو امیر عبدالرحمٰن خان اپنے مصاحبوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار تورخم پہنچا۔ وزیر اعظم (دبیر الملک) غلام نبی خان اور سپہ سالار غلام حیدر خان کے علاوہ برطانوی ہند کی جانب سے افغانستان میں متعینہ نمائندے سردار محمد افضل خان اس کے ہمراہ تھے۔ وائسرائے نے رسالے کے دستے سلامی اتارنے کے لئے بھیجے تھے۔ جنہوں نے تورخم کے مقام پر امیرِ کابل کو شاہی سلامی پیش کی۔ امیر نے رات لنڈی کوتل میں گزاری، دوسرے دن بارش شروع ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود پروگرام کے مطابق امیر نے سفر جاری رکھا۔ ۲۸ مارچ کی رات کو امیر شاہ گئی (نزد علی مسجد) میں ٹھہرا —— ۲۹ مارچ کو جنرل گارڈن نے امورِ خارجہ کے شعبے کے نمائندہ کے طور جمرود میں امیرِ کابل کا استقبال کیا۔ امیر عبدالرحمٰن خان پشاور چھاؤنی پہنچے تو ریلوے سٹیشن پر نہایت آراستہ پیراستہ ریل کے ڈبے افغان حکمران اور اس کے ہمراہیوں کے لئے

موجود تھے۔ امیر کا قافلہ ریل گاڑی سے راولپنڈی پہنچا، جہاں وائسرائے ہند لارڈ ایلگن نے اُن کے اعزاز میں شاہانہ دربار کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس ملاقات میں دونوں لیڈر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ قبائلی علاقوں میں دونوں ملکوں کے مابین سرحدوں کا تعین کرنے کے لئے ایک کمیشن قائم کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ مستقل حد بندی کے بعد کسی فریق کے لئے شکایت کا موقع نہ رہے۔

راولپنڈی سے واپسی پر ۱۵ اپریل ۱۸۸۵ء کو کمشنر پشاور کی طرف سے امیر عبدالرحمٰن خان کے اعزاز میں گارڈن پارٹی دی گئی جس میں پشاور کے معززین اور بڑے بڑے افسروں نے شرکت کی۔ ۱۸ اپریل کو امیر افغانستان تورخم سے ہوتے ہوئے واپس وطن روانہ ہو گئے۔ حکومتِ ہند کی طرف سے انہیں بہت سے تحائف اور نذرانوں کے علاوہ چھ توپیں اور ایک ہاتھی بھی پیش کیا گیا۔

ولی عہد برطانیہ کا دورہ

امیر عبدالرحمٰن خان کی آمد سے پہلے ستمبر ۱۸۸۴ء میں برطانیہ کے وارثِ تاج و تخت، پرنس آف ویلز بھی پشاور آئے۔ وہ برطانوی شاہی خاندان کے پہلے فرد تھے جنہوں نے درہ خیبر دیکھا — جمرود میں انہوں نے آفریدی ملکوں کے ایک جرگہ میں شمولیت کی۔ کمشنر پشاور نے جرگے سے خطاب کرتے ہوئے، شہزادے کا خیر مقدم کیا، شہزادے نے خیبری قبائل کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ سردار محمد اسلم خان سدوزئی۔ کمانڈنٹ خیبر رائفلز، ان کے نائب سید بادشاہ نبوری (جرما ضلع کوہاٹ) اور پولیٹیکل ایجنٹ وار برٹن کی کوششوں سے اس وقت وادیٔ خیبر میں کامل امن و سکون تھا اور تجارتی قافلے کھلے بندوں اس راہ سے افغانستان اور وسطِ ایشیا کے ممالک کو آیا جایا کرتے تھے۔

لارڈ کرزن پشاور میں

۹ نومبر ۱۸۹۴ء کو ہندوستان کے نامزد وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ کرزن (CURZON) پشاور آئے، انہوں نے والیٔ افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان کی خصوصی اجازت سے پروگرام بنایا تھا کہ گھوڑے پر پشاور سے کابل، کابل سے غزنی، غزنی سے قندہار اور قندہار سے چمن کا سفر کریں اور وہاں سے ریل گاڑی کے ذریعے کوئٹہ جائیں۔

چند دن بعد، ۱۹ نومبر ۱۸۹۴ء کو وائسرائے لارڈ ایلگن، کمانڈر انچیف انڈیا اور لفٹیننٹ گورنر صوبہ پنجاب بھی پشاور آئے اور انہوں نے درہ خیبر کی سیر کی۔

مکڑی گودام میں آگ

ریلوے سٹیشن پشاور شہر کی مشرقی جانب اسلحہ، خوراک اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا فوجی گودام ہے۔ عوام اسے "مکڑی گودام" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں اس گودام میں اچانک آگ بھڑک اٹھی اور لاکھوں روپیہ کا گولہ بارود، اناج، فوجی وردیاں اور دوسرا سامان جل کر راکھ ہوگیا۔ حکومت بڑی پریشان ہوئی اور اسے ایک سازش سمجھ کر مدتوں اس کا سُراغ لگانے میں کوشاں رہی لیکن قطعاً کچھ پتہ نہ چل سکا کہ آگ کس نے لگائی ــــ؟ اور کیوں لگائی؟

ڈیورینڈ مشن

صوبہ سرحد اور افغانستان کے مابین قبائلی علاقے چترال سے قلات تک پھیلے ہوئے ہیں، چونکہ ابتداء میں ان پہاڑی علاقوں کی سرحدیں پوری طرح متعین نہ تھیں۔ اس لئے افغانستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی تھی ــــ فارورڈ پالیسی کے تحت انگریز قبائلی علاقے پر تسلط قائم کرنے کے درپے تھا جس کے نتیجے میں سرحدی قبائل سے اکثر تنازعے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان علاقوں میں پیش قدمی سے انگریز کو کوئی مالی فائدہ ہرگز نہ تھا بلکہ اس کے برعکس سرحدی مہمات پر ہندوستان کے خزانے سے کروڑوں روپیہ بے فائدہ اُٹھایا جا رہا تھا۔ لندن اور کلکتہ میں بارہا اس پر شدید اعتراضات ہوئے تاہم انگریز رُوس کے ہَوّا سے لرزہ براندام تھا۔ وہ رُوسی حملے کے مفروضہ کے پیشِ نظر دفاع کے نام پر ہر جانی اور مالی نقصان کو برداشت کئے جا رہا تھا ــــ پہلی اور دوسری افغان جنگوں نے انگریز اور افغان حکمرانوں کو اس نقصان کا احساس دلایا تھا، اس لئے دونوں مملکتوں کی کوشش تھی کہ آپس میں امن و آشتی سے رہیں۔ خوش قسمتی سے افغانستان کو امیر عبدالرحمٰن خان جیسا مدبر رہنما مل گیا جو خود بھی رُوس یا برطانیہ کو کسی فوجی کارروائی کا موقع دینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے برطانیہ کے ساتھ بھی تمام مسائل بات چیت کے ذریعے سُلجھانے کی کوشش کی۔ بالآخر دونوں حکومتوں کے مابین یہ امر طے پا گیا کہ ایک ایسا مشن مقرر کیا جائے جو دونوں ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور جو واخان سے وزیرستان تک ایک ایسی سرحد کی نشان دہی کر دے جو افغانستان اور ہندوستان میں حدِ فاصل کا کام دے۔

برطانوی حکومت کی طرف سے سیکرٹری امورِ خارجہ سر مورٹیمر ڈیورینڈ کو کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ ۱۸۷۹ء میں رابرٹسن کے ساتھ کام کر کے سرحدی امور کا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ کامیاب سیاستدان

تھا اور فارسی زبان پر بھی کامل عبور رکھتا تھا۔ سردار محمد اسلم خان سدوزئی اور سرحدی امور کے ماہر دوسرے افراد کو کمیشن کے ممبر نامزد کیا گیا۔

۲ر اکتوبر ۱۸۹۳ء کو یہ مشن کابل پہنچا، شہر کے باہر سپہ سالار غلام حیدر خان نے ارکانِ وفد کا شاندار خیر مقدم کیا، وفد کے قیام کے لئے ولی عہد سردار حبیب اللہ خان کا محل خالی کرایا گیا تھا، انہیں اس محل میں ٹھہرایا گیا۔ امیر افغانستان اور دوسرے عمائدینِ حکومت وفد سے بڑی خوش خلقی سے پیش آئے۔ کئی دنوں تک دونوں ملکوں کے وفود میں مذاکرات ہوتے رہے' امیر عبدالرحمٰن خان بڑا محتاط اور زیرک انسان تھا۔ اس نے اس کمرے میں جہاں بات چیت ہوتی تھی۔ اپنے میر منشی سلطان محمد خان کو پردے کے پیچھے بٹھا رکھا تھا۔ اس امر کا علم امیر کے علاوہ کسی شخص کو نہ تھا۔ وفد کا کوئی رکن جس جس زبان میں بھی کوئی کلمہ مُنہ سے نکالتا میر منشی اسے شارٹ ہینڈ میں لکھ لیتا اور اس طرح وفد کی پوری کارروائی امیر عبدالرحمٰن خان تک پہنچ جاتی اور وہ مکمل ریکارڈ محفوظ کر لیتا۔

امیر عبدالرحمٰن کی خود نوشت سوانح حیات بڑی دلچسپ، معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام نے اسے کسی مشرقی حکمران کا بہترین ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔ خود نوشت سے امیر کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً راولپنڈی میں وائسرائے کے دربار کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے جہاں اس نے انگریز افسروں کی سادگی، چستی اور پابندیٔ اوقات کی تعریف کی ہے وہیں دربار میں شامل ہونے والے اُن راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے "زنانہ" طور طریقوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ جو ریشمی ملبوسات اور ہیرے جواہرات میں ملبوس تصنع، تکلف اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔

۱۲ر نومبر ۱۸۹۳ء کو کابل غور و خوض کے بعد افغانستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے مابین حد بندی کا فیصلہ ہو گیا اور خود امیر کابل کے الفاظ میں یہ طے پایا کہ "واخان، کافرستان، اسمار، لال پورہ ہند اور وزیرستان کا علاقہ بیرمل میری (افغانستان کی) حکومت کے پاس رہے گا جب کہ میں چمن ریلوے سٹیشن، چاغی، وزیرستان، بلند خیل، کُرّم، آفریدی، باجوڑ، سوات، بونیر، دیر، چلاس اور چترال سے فوری طور پر دستبردار ہو جاؤں گا۔"

بظاہر انگریز اس معاہدے پر خوش تھے، اُن کا خیال تھا کہ بہت سے نئے علاقے اُن کے تسلط

میں آگئے ہیں۔ لیکن یہ اُن کی خام خیالی تھی، کیونکہ عملاً اُن علاقوں میں سے کئی ایک پر انگریز کو کوئی دسترس حاصل نہ تھی بلکہ یہ علاقے دے کر امیرِ کابل نے بہت بڑے خطرے کو اپنے سر سے ٹال دیا اور اس کے بدلے میں انگریز سے بہت سی مراعات بھی حاصل کر لیں۔

۱۴ر نومبر کو یہ مشن (جو بعد میں ڈیورینڈ مشن کے نام سے مشہور ہوا) کابل سے واپس روانہ ہوا اور ۲۲ر نومبر کو پشاور پہنچا۔

بعد میں حد بندی کا یہ کام دو تین سال تک جاری رہا۔ اس سرحد کو عموماً "ڈیورینڈ لائن" کے نام سے پکارا جاتا ہے ـــــ ڈیورینڈ معاہدہ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں :-

۱ ـــــ امیرِ افغانستان اس کے بعد آفریدی، وزیری علاقوں اور ڈیورینڈ لائن سے مشرق میں بسنے والے سرحدی قبیلوں کے معاملات میں مداخلت سے باز رہے گا۔

۲ ـــــ افغانستان اور برطانوی ہند کے سرکاری نمائندے مشترکہ طور پر سرحدات کا تعین کریں گے۔

۳ ـــــ سوات، باجوڑ، دیر اور چترال کے علاقوں پر افغانستان کا عمل دخل ختم ہو جائے گا۔

۴ ـــــ برطانوی ہند سے افغانستان کو ملنے والی سالانہ امداد بارہ لاکھ سے بڑھا کر اٹھارہ لاکھ کر دی جائے گی۔

۵ ـــــ برطانوی ہند کی حکومت کو افغانستان کے اسلحہ خریدنے یا فوجی قوت بڑھانے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اس معاہدے کی رُو سے یہ بھی طے پایا تھا کہ امیر عبدالرحمٰن خان لندن کا سرکاری دورہ کریں گے۔ اور دونوں حکومتوں کے درمیان سفارتی تعلقات کو مزید مستحکم بنانے پر غور کریں گے تاہم بیماری کی وجہ سے امیر خود لندن نہ جا سکے۔ اُن کی جگہ شہزادہ نصراللہ خان ۱۸۹۵ء میں لندن گئے لیکن بات چیت کچھ آگے بڑھنے نہ پائی۔

امیر عبدالرحمٰن خان کی وفات (۱۹۰۱ء) کے بعد اُن کے جانشین امیر حبیب اللہ خان نے ۱۹۰۵ء میں ڈیورینڈ معاہدے کی تصدیق کرتے ہوئے انگریز نمائندے سر لوئی ڈین کو یقین دلایا کہ وہ مرحوم امیر کے دستخط کے تحت کئے گئے معاہدے کی حرف بحرف پابندی کرتا رہے گا۔

تیسری جنگِ افغانستان کے بعد امیر امان اللہ خان اور انگریزوں کے مابین جو معاہدہ ۸ راگست ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا۔ اس میں بھی ڈیورینڈ معاہدہ کی پوری طرح توثیق و تصدیق کی گئی تھی۔

اسی طرح ۲۲ رنومبر ۱۹۲۱ء کو ڈابس (DOBBS) مشن کے ساتھ کئے جانے والے معاہدے میں بھی افغان حکومت نے ڈیورینڈ معاہدہ اور ۸ راگست ۱۹۱۹ء کے معاہدے کی کامل تائید و تصدیق کی۔

صوبہ سرحد کے آخری انگریز گورنر سر اولف کیرو نے اپنی تصنیف میں افغان حکومت کی جانب سے ڈیورینڈ معاہدے کی وقتاً فوقتاً تصدیق و توثیق کی تفصیل دی ہے اور حکومتِ برطانیہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر نوئیل بیکر کی دارالعوام میں کی گئی تقریر مورخہ ۳۰ رجون ۱۹۵۰ء کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ڈیورینڈ لائن افغانستان اور پاکستان کے مابین مسلّمہ بین الاقوامی سرحد ہے جس سے انحراف قطعاً غیر قانونی ہے۔ برطانیہ پاکستان کا پیش رَو ہے۔ اس سے کئے گئے معاہدوں کا اطلاق پاکستان پر بھی ہوتا ہے اور خود افغانستان بھی ان سابقہ معاہدوں کا قانوناً اور اخلاقاً پوری طرح پابند ہے۔

چترال کی مہم

چترال کا علاقہ برصغیر پاک و ہند کی انتہائی شمال مغربی سرحد پر واقع ہے۔ اس کی کلیدی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں چار ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں — پاکستان کا یہ ضلع رُوس، چین، افغانستان اور پاکستان کا نقطۂ اتصال ہے۔ بیس ہزار فٹ اونچے پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس علاقہ کا رقبہ کوئی چار ہزار مربع میل اور آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہے، چترالی امن پسند اور غریب لوگ ہیں۔ ۱۸۹۵ء تک وہ دُنیا سے الگ تھلگ، چُپ چاپ اور گمنام زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک دُنیا بھر کی توجہ چترال پر مرکوز ہو گئی۔

انگریز نے یوں تو برصغیر میں آتے ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے تھے تاہم ۱۸۸۵ء میں روسی حملے کے خطرے کی آڑ لے کر انہوں نے کشمیر، گلگت، ہنزہ اور نگر کے شمالی علاقوں میں اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں اور جگہ جگہ فوجی چھاؤنیاں قائم کر لیں — چترال پشاور سے کوئی دو سو میل شمال میں ہے۔ آج کل چترال جانے کے لئے بری اور ہوائی سفر کا آغاز پشاور ہی سے ہوتا ہے لیکن ان دنوں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ پشاور سے چترال جانے والی سڑک چونکہ مالاکنڈ، سوات، دیر اور باجوڑ سے ہو کر جاتی ہے جو یوسف زئی مجاہدوں کے علاقے ہیں۔ انگریز ۱۸۶۳ء کے جہادِ امبیلہ میں اُن کے زورِ بازو کا اندازہ لگا چکا تھا اس لئے فرنگی فوجیں اس طرف کا رُخ کرتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چنانچہ اُن دنوں چترال جانے والا واحد راستہ گلگت سے نکلتا تھا۔ گلگت سے چترال کا فاصلہ کوئی سوا دو سو میل ہے۔ راہ میں انتہائی دشوار گزار، برف پوش پہاڑیاں اور خطرناک گھاٹیاں اور ڈھلوانیں ہیں۔ اس لئے اس راہ سے سفر جان جوکھوں کا کام ہے۔

۱۸۸۵ء میں ریاست چترال کے حکمران سے سیاسی تعلقات بڑھانے کے لئے انگریز نے ایک وفد

گلگت سے چترال بھیجا۔ انگریز یہ چاہتا تھا کہ کسی غیر ملکی حملے کی صورت میں مہتر چترال اس کا ساتھ دے اور اس کے مفادات کا خیال رکھے۔ اس سیاسی گفت وشنید کے نتیجے میں برطانوی ہند کا نمائندہ لفٹیننٹ گرڈن (GURDON) تھوڑی سی فوج کے ساتھ چترال میں رہنے لگا۔ انتظامی اعتبار سے چترال میں مقیم انگریزی دستہ گلگت کے انگریز ریذیڈنٹ رابرٹسن کے ماتحت تھا۔ کئی سال تک حالات اطمینان بخش رہے لیکن ۱۸۹۲ء میں مہتر چترال امان الملک کے مرتے ہی خانہ جنگی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا اور سارا چترال اور نواحی علاقہ طوائف الملوکی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

امان الملک کے سترہ بیٹے تھے جن میں سے دو کی مائیں اونچے خاندانوں کی چشم وچراغ تھیں۔ اس لئے ان دو شہزادوں کو عوام کی حمایت حاصل تھی۔ ان دونوں میں سے چھوٹا شہزادہ افضل الملک باپ کی وفات کے وقت چترال میں تھا جب کہ بڑا بیٹا نظام الملک دارالحکومت سے کوئی ایک سو ساٹھ[۱۶۰] میل دور یاسین نام کے علاقے کا حاکم تھا۔ افضل نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہی فوراً تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور محض تخت وتاج ملنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فوج لے کر اپنے بڑے بھائی نظام الملک کو گرفتار کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اپنے بھائی کے انتقام سے بچنے کے لئے نظام الملک یاست چترال کو چھوڑ کر گلگت چلا گیا اور انگریز پولیٹیکل ریذیڈنٹ سے پناہ کا طالب ہوا۔

اُدھر نیا مہتر چترال افضل الملک بھی چین سے بیٹھنے نہ پایا۔ اُس کا ایک چچا شیر افضل ان دنوں افغانستان میں مقیم تھا۔ اپنے بھائی کی وفات کا سن کر وہ عازم چترال ہو گیا۔ اس کا بھتیجا افضل الملک چچا کا استقبال کرنے شہر کے دروازے پر پہنچا تو شیر افضل (چچا) نے موقع پاتے ہی اسے ہلاک کر دیا۔ اور چترال کی حکومت خود سنبھال لی۔ شیر افضل انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ بھلا انگریز یا اس کی سیادت وقیادت کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے نظام الملک کی حمایت کرتے ہوئے اُسے بزور باپ کی گدی پر جا بٹھایا اور خود بادشاہ گر بن بیٹھے ـــــ بیچارا نظام الملک ابھی تھوڑا عرصہ ہی حکومت کر پایا تھا کہ اٹھارہ سالہ سوتیلے بھائی امیر الملک نے اُسے قتل کر دیا ـــــ قاتل امیر الملک کا گہرا دوستانہ جندول کے حاکم حاجی عمر اخان سے تھا۔ عمر اخان انگریز کے خون کا پیاسا تھا وہ کسی قیمت پر انگریز کو ان علاقوں میں قدم جمانے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ عمر اخان فوراً اپنے تین ہزار جانبازوں کو لے کر چترال جا دھمکا۔ موسم ان دنوں نہایت خراب تھا ایسے میں لواری کے

برف پوش خطرناک درّے کو پار کرنا عمرا خان ہی کا دل گردہ تھا۔ عمرا خان نے چترال پہنچتے ہی انگریز ریذیڈنٹ رابرٹسن سے مطالبہ کیا کہ وہ چترال سے اپنی فوج فوراً نکال لے لیکن رابرٹسن نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ اس نے حکومتِ ہند کو لکھ رکھا ہے اور حکومتِ ہند کی منظوری آتے ہی چترال کو خیرباد کہہ جائے گا لیکن درپردہ وہ دفاعی تیاریوں میں لگا تھا۔ اندر ہی اندر اس نے چترال کے قلعہ کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے بعد امیر الملک کو، جو عمرا خان کا ساتھی تھا، معزول کر کے اس کے ایک اور بھائی دس سالہ شجاع الملک کو عارضی طور پر مہتر چترال بنا دیا۔

چترال سے گڑبڑ کی خبریں ملتے ہی انگریزی حکومت حرکت میں آگئی۔ اس نے چترال کے محصورین کی امداد کے لئے ایک فوجی دستہ گلگت سے کرنل کیلی (KELLY) کی قیادت میں اور دوسرا پشاور سے سر رابرٹ لو (LOW) کے تحت روانہ کر دیا۔ تاہم عین موسمِ سرما میں کسی ایک راستے سے بھی چترال پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ دوسری طرف عمرا خان کے سپاہیوں نے چترال کے قلعہ کا سختی سے محاصرہ کر رکھا تھا۔ کھانے پینے کی کوئی چیز انگریزی فوج کے محصور سپاہیوں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ یہاں تک کہ دریا سے پانی حاصل کرنے کے لئے انگریز کو باقاعدہ مسلح دستہ بھیجنا پڑتا تھا۔ تاہم انتہائی مشکلات و مصائب اور سخت جانی نقصان اٹھانے کے بعد انگریزی فوج ڈٹی رہی اور اُس نے قلعہ کا قبضہ نہ چھوڑا۔

یکم اپریل کو رابرٹ لو اپنے ہزاروں سپاہیوں اور توپ خانہ کے ساتھ چترال جانے کے ارادے سے پشاور سے روانہ ہوا۔ مردان اور درگئی سے ہوتے ہوئے وہ مالاکنڈ پہنچا تو اُس نے سوات، باجوڑ اور دیر کے تمام قبائل کے نام ایک اعلان جاری کیا جس کہا گیا تھا کہ انگریز کی اس فوجی مہم کا مقصد و منشا صرف چترال کی صورتِ حال کی اصلاح ہے ـــــ حملہ آور فوج راستے کے علاقوں کے رہنے والوں سے ہرگز کسی چھیڑ چھاڑ کا ارادہ نہیں رکھتی ـــــ انگریز کمانڈر رابرٹ لو کو اس کے ساتھی جنرل بلڈ (BLOOD) نے مشورہ دیا کہ وہ مالاکنڈ کا راستہ ہرگز نہ کرے کہ ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔ تاہم رابرٹ لو نے اپنی طاقت کے زعم میں کوئی مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رات کو سخت طوفانی بارش شروع ہوگئی۔ فرنگی فوج کے خیمے اکھڑ گئے اور اُڑ اُڑ کر دور تک جا پہنچے۔ گھوڑے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ سارا لشکر بھیگ گیا۔ یہ اُفتاد ایک آسمانی تنبیہ کا درجہ رکھتی تھی لیکن لو

پھر بھی اپنی ضد سے باز نہ آیا۔

ونسٹن چرچل کے الفاظ میں مالاکنڈ ایک ایسے پیالے کی مانند ہے جس کے کنارے کہیں کہیں سے ٹوٹے ہوئے ہوں۔ ایسے مقام پر قیام فوج کے لئے ہزاروں خطرات لئے ہوئے تھا۔ پھر یہ علاقہ یوسف زئی قبائل کا مسکن ہے جنہوں نے روزِ ازل سے جان پر کھیل کر اپنی آزادی کی حفاظت کی ہے۔ اب کے بھی یہی ہوا۔ جونہی یوسف زئی قبائل کو انگریز کی اس پیش قدمی کا پتہ چلا وہ اپنی انتہائی بے سروسامانی کے باوجود میدان میں اُتر آئے۔ چاروں طرف سے مجاہد سر پر کفن باندھ کر جمع ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر انگریز کمانڈر نے ایک جگہ بیس توپیں گاڑ دیں اور اندھا دھند قبائلی سرفروشوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ فوجی دستے بھی بندوقوں سے مجاہدین پر آگ برسانے لگے۔ اس کے باوجود ہر مجاہد جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے آگے بڑھتا اور لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کر جاتا۔

۳۰ اپریل کو دن کے دو بجے تک دو ہزار سے زیادہ غازی شہید یا زخمی ہو چکے تھے۔ انگریزی فوج نے بڑا حملہ کیا تو باقی ماندہ دس ہزار غازی پہاڑی ٹھکانوں کی طرف پیچھے ہٹنے کو مجبور ہو گئے۔

دوسرے دن یوسف زئی شمشیر آزما پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں آئے اور دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔ انگریزی رسالہ کے سوار بار بار قبائلیوں پر نیزوں سے حملہ کرتے لیکن ہر بار یہ مردانِ مجاہد پھر لوٹ آتے اور بجلی کی تیزی کے ساتھ فرنگی کی صفوں پر حملہ کرتے۔ کمال یہ ہے کہ مجاہدین ڈھول بجاتے نعرے لگاتے شیر کی طرح سیدھے اپنے شکار پر جھپٹتے اور وار کرنے کے بعد غائبوں کی طرح غائب ہو جاتے۔ ۷ اپریل تک ان نہتے مجاہدوں نے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی فوجوں اور توپخانے کی پیش قدمی روکے رکھی۔

دریائے سوات کے پاس حاجی عمر اخان جندول کے بھائی نے چار ہزار مجاہدوں کے ساتھ فرنگی سے سخت ٹکر لی۔ جونہی توپوں کی گولہ باری ہوتی مجاہد مجبور ہو کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر انگریز کے سامنے سینہ تان کر آ کھڑے ہوتے ـــ گولہ بارود ختم ہونے لگا تو مجاہد کچھ پیچھے ہٹے اور انگریزی لشکر چکدرہ کے مقام پر دریا کو پار کر کے آگے بڑھنے لگا۔ راموڑا کے قریب انگریز کو سرحدی نپولین حاجی عمر اخان جندول کا قلعہ نظر پڑا ـــ فرنگی فوج اور توپخانے نے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ قلعہ جوں کا توں

رہا ـــــ مجبوراً فرنگی نے اسے تسخیر کرنے کی کوششیں ترک کر دیں اور اپنی راہ لی ۔

اُن دنوں سوات کی ریاست ابھی قائم نہ ہوئی تھی ۔ البتہ دیر کی ریاست موجود تھی جس کا نواب شریف خان تھا ۔ نواب عمرا خان کے ہاتھوں تنگ آیا بیٹھا تھا ۔ انگریز نے اس پر ڈورے ڈالے اور اُسے اس امر پر راضی کر لیا کہ اہلِ دیر اُن کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں ۔ نواب دیر کی جانب سے تسلی ہوئی تو جنرل والٹر فیلڈ نے ساری توجہ غازیوں پر مبذول کر دی ۔ دریا کے پار ہزاروں یوسف زئی سرفروش جمع ہو چکے تھے، وہ بار بار نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے اور دشمن کو للکارتے ۔ انگریز جنرل نے چالاکی سے کام لیا ۔ توپوں سے گولہ باری کر کے مجاہدوں کو اُلجھائے رکھا لیکن ساتھ ہی گائیڈ رسالے کو حکم دیا کہ وہ غازیوں سے آنکھ بچا کر کسی محفوظ مقام سے دریا کو پار کرے اور عقب سے مجاہدین پر حملہ کر دے ۔ مجاہد اس غیر متوقع صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھے تاہم انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جب اُن کی کچھ پیش نہ گئی تو اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو پیچھے ہٹ گئے ۔ جونہی مجاہد دریا کے کنارے سے ہٹے فرنگی نے میدان صاف پا کر باقی ماندہ فوج بھی دریا کے پار اُتار دی ۔ اس دوران بھی جھڑپیں جاری رہیں اور طرفین کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا ۔

انگریزی فوج نے چکدرہ پہنچتے ہی اپنی تیاریاں شروع کر دیں ۔ فوجوں کی نقل و حرکت کے لئے فوجی انجینئروں نے ایک عارضی پُل چکدرہ کے سامنے تعمیر کیا ۔ مجاہدوں نے پُل کو تباہ کرنے کے لئے ایک نرالی چال چلی ۔ رات کو لکڑی کا ایک اُونچا سا گٹھا باندھا اور دریا میں ڈال دیا ۔ لکڑی کا یہ ٹال کافی اُونچا تھا اور دریا کا بہاؤ بھی یہاں تیز تھا ۔ چنانچہ یہ گٹھا تیزی سے بہتا ہوا آیا اور انگریز کے تعمیر کردہ عارضی پُل کو ساتھ بہا کر لے گیا ۔ اب انگریزی فوج دو حصّوں میں بٹ چکی تھی ۔ رسالہ دریا کے شمال کی طرف تھا اور باقی ماندہ فوج دریا سے جنوب کی طرف ۔ انگریزی رسالے نے پُل کی تباہی کا بدلہ لینے کے لئے اِرد گرد کے دیہات تباہ کر دیئے ۔ مکانوں اور کھلیانوں کو آگ لگا دی ۔ مجاہد یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ انگریزی فوج اس پستی پر اُتر آئے گی اور بے گناہ عورتوں اور بچوں کو نشانۂ ستم بنائے گی ۔ اب انہوں نے فرنگی کی یہ حرکت دیکھی تو ان میں سخت اشتعال پھیل گیا اور انہوں نے پوری قوت سے فرنگی لشکر پر حملے شروع کر دیئے ۔ دریائے جندول کے دونوں کناروں پر گھمسان کی جنگ ہوئی ۔ انگریزوں کی توپیں دنا دن گولے برساتی رہیں تاہم مجاہدین بھی سر دھڑ کی بازی لگائے

مورچوں میں ڈٹے رہے، انہوں نے گورا سپاہیوں کو چُن چُن کر نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ گائیڈ رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر لفٹیننٹ کرنل بیٹی (BATTYE) اور اس کے بہت سے ساتھی لقمۂ اجل بن گئے یوسف زئی مجاہدوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جسے بندوق یا تلوار میسر نہ آئی وہ لاٹھیاں سونٹے اور پتھر لے کر ہی میدان میں اتر آیا اور اسی حال میں آخر تک ڈٹا رہا۔ جس مجاہد کے پاس بندوق کی گولیاں ختم ہو جاتیں وہ دشمن کی صفوں میں گھس کر دست بدست لڑائی شروع کر دیتا اور لڑتے لڑتے جان دے دیتا۔ میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیرنا تو ان کی روایات میں تھا ہی نہیں ـــــ ایک انگریز افسر کیپٹن ینگ ہسبنڈ (YOUNG HUSBANB) نے لکھا ہے کہ "ان لوگوں میں بلا کی قوت برداشت تھی۔ یورپی سپاہیوں کے مقابلے میں وہ انتہائی سخت جان تھے۔ زخمی ہوتے تو زخم پہ خود ہی پٹی باندھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور پھر لڑائی شروع کر دیتے۔"

اُس نے سرحدی غازیوں کی شجاعت و حمیت کے بہت سے واقعات تحریر کئے ہیں، ایک چشم دید واقعہ وہ یوں بیان کرتا ہے :-

"ایک قبائلی سردار سُرخ ہلالی پرچم سنبھالے اپنے ساتھیوں سمیت نعرے لگاتا ہوا گورا فوج کے ایک دستے پر حملہ آور ہوا ـــــ گورا سپاہیوں کی تعداد اُن کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی لیکن غازیوں نے اس کثرتِ تعداد کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اُن میں سے کوئی بھی موت سے خائف نہ تھا ـــــ ایک ایک مجاہد انتہائی بہادری سے لڑتا اور شہید ہو جاتا ـــــ کوئی ایک بھی زندہ نہ بچا تو ان کا سردار انتہائی پامردی اور بے جگری سے لڑا اور مسکراتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گیا۔"

ایک دوسرے مجاہد کی بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ وہ اپنے بہادر ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ایک اُونچی چٹان پر کھڑا ڈھول بجا رہا تھا۔ یہ جگہ گورا سپاہیوں کی عین زد میں تھی۔ گولی آتی۔ اُسے لگتی تو وہ تھوڑی دیر کے لئے رُک جاتا لیکن زخم پہ پٹی باندھنے کے بعد پھر ڈھول بجانے لگتا۔ اس اثنا میں اسے کئی گولیاں لگیں لیکن اس کی ہمت میں فرق نہ آیا۔ آخر کار ایک گولی اُسے دل کے قریب لگی، وہ کئی سو فٹ گہری گھاٹی میں جا گرا اور جان بحق ہو گیا۔ لیکن سانس نکلنے تک ڈھول اس کے گلے میں پڑا رہا اور ہاتھ بے اختیار اُسی طرح اُوپر اٹھے ہوئے تھے۔ گویا ڈھول

بجا کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا ہو ـــــ اللہ اللہ ! یہ ہے رقصِ بسمل اور یہ ہے ذوقِ شہادت۔

مجاہدین نے دریائے جندول کا پُل توڑ دیا تو انگریز نے اس کے بدلے میں ایک نیا پُل بنانے کی تجویز کی، خوش قسمتی سے انہیں وہ تمام سامان ہاتھ لگ گیا جو عمرا خان جندول نے دریا پر پختہ پُل باندھنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اس طرح انہیں پُل بنانے میں آسانی ہو گئی۔ وہ فوراً پل باندھنے میں لگ گئے تاہم اس دوران بھی غازی برابر اُن پر حملے کرتے رہے، ان حملوں کے دوران توپ خانہ کا انچارج کیپٹن پیبلز (PEBELS) اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔

اِدھر پشاور سے چترال بھیجی جانے والی فوج برابر آگے بڑھ رہی تھی اُدھر چترال کے عوام اپنی آزادی کے تحفظ کی جنگ پوری جرأت اور بامردی سے لڑ رہے تھے۔ دس سالہ شجاع الملک کو چترال کا مہتر قرار دیئے جانے کے بعد چترال کے لوگ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ انگریز اپنی پسند کا حکمران ان پر مسلط کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ چنانچہ چترالیوں کی اکثریت عمرا خان کا ساتھ دینے لگی ـــ یہ پہلا موقع تھا کہ اہلِ چترال انگریز کے خلاف آمادۂ جہاد ہوئے تھے۔ اس پر فرنگی کے کان کھڑے ہوئے۔ قلعۂ چترال میں محصورین کی حالت نازک ہونے لگی تو انہوں نے مستوج کے انگریزی قلعہ سے امداد طلب کر لی۔ چنانچہ پچاس سکھ فوجیوں کا ایک دستہ صوبیدار گورمکھ سنگھ کی کمان میں مستوج سے چترال بھیجا گیا اور اُسے ہدایت کی گئی کہ وہ وہاں لفٹیننٹ گرڈن (GURDON) کو مدد دے۔ چترالیوں نے اس فوجی دستے کو راستے ہی میں روک لیا۔ یہ حال دیکھ کر برطانوی ایجنٹ میجر سکاٹ رابرٹسن خود ان کی مدد کے لئے خطرے کے مقام پر پہنچا۔ کیپٹن ٹاؤن ایڈ (TOWNSEND) اور کوئی ایک سو سپاہی اُس کے ہمراہ تھے۔ لفٹیننٹ ہربی (HEBBY) کی کمان میں چالیس سکھ سپاہی اس کے علاوہ تھے۔ اس طرح سارے برطانوی ہند سے چترال کے فرنگی محصورین کے لئے کمک بھیجی جا رہی تھی۔ چنانچہ مارچ تک چترال میں انگریزی فوج کی نفری چھ سو تک پہنچ چکی تھی۔

مستوج کے انگریز کمانڈر کو حالات کا پورا علم نہ تھا۔ اس نے دو گورا افسروں کو ساٹھ سپاہیوں کا ایک دستہ اور گولہ بارود دے کر چترال روانہ کیا۔ جب یہ دستہ پریشان پہنچا تو غازی عمرا خان جندول اور شیر افضل کے مجاہدوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ سات دن تک انگریزی دستے کا گھیراؤ جاری رہا۔ بالآخر وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ دستے کے مسلمان سپاہیوں کو تو رہا کر دیا گیا۔ البتہ سکھ سپاہیوں

اور اُن کے انگریز افسروں لفٹیننٹ ایڈورڈز اور لفٹیننٹ فاؤلر (FOWLER) کو قیدی بنالیا گیا۔ عمراخان نے ان انگریز افسروں کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کیا اور انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے دی۔

اس دستے کی شکست کے بعد انگریز نے مستوج سے ایک سو فوجیوں پر مشتمل ایک دوسرا دستہ کیپٹن راس (ROSS) اور لفٹیننٹ جونز (JONES) کی قیادت میں چترال کو بھیجا۔ لوٹی کے مقام پر راس اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر گلگت سے آنے والے فوجی قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے نکلا تو چترالیوں کے گھیرے میں آگیا ـــــ ہوا یہ کہ راہ میں ایک دشوار گزار گھاٹی تھی جس پر چترالیوں نے مورچے (سنگھڑ) بنا رکھے تھے۔ ان چترالیوں کے پاس نہ بندوقیں تھیں نہ تلواریں وہ خالی ہاتھوں ہی مصروفِ جہاد تھے، جب راس اور اس کا دستہ اس گھاٹی میں پہنچا تو چترالیوں نے دو ہزار فٹ اُونچے مورچوں سے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پتھراؤ اتنا شدید تھا کہ انگریز کے لئے آگے بڑھنا ناممکن ہوگیا۔ مجبوراً انگریزی دستے نے واپسی کی راہ اختیار کی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اب عقبی راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ راستے میں ایک پُل توڑ دیا گیا تھا اور چترالی مجاہد سینکڑوں کی تعداد میں پہاڑوں پر جمع ہو چکے تھے، جب انگریزی دستہ بالکل بے بس ہوگیا تو اس نے ایک پہاڑی غار میں پناہ لی اور دو دن رات کچھ کھائے پیئے بغیر وہیں دبکا رہا ـــــ لیکن نا بکے، تیسرے دن غار سے نکلے تو چترالیوں کے گھیرے میں آگئے۔ کسی چترالی مجاہد کی گولی کیپٹن راس (ROSS) کو لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ لفٹیننٹ جونز جوں توں بچتے بچاتے لوٹی واپس پہنچا تو صرف چودہ سپاہی اُس کے ساتھ تھے۔ ۴۶ فرنگی سپاہی اور افسر لڑائی میں ہلاک ہو چکے تھے۔ باقی ماندہ زخمی پڑے تھے۔

یہ خبر مستوج پہنچی تو موبر سے پچاس سپاہی اور اسلحہ لے کر جونز کی مدد کو نکلا، رات دن سفر کرتے ہوئے وہ لوٹی پہنچ تو گیا لیکن اُدھر اس کا مستوج سے نکلنا تھا کہ عمراخان جندول کے غازیوں نے مستوج کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس طرح مستوج کا رابطہ گلگت اور چترال سے بالکل کٹ گیا۔

اُدھر گلگت سے کرنل کیلی جو فوج لے کر چترال کے محصورین کی امداد کے لئے نکلا تھا۔ اُس نے ۱۲۵ میل کا سفر تو بخیر و خوبی طے کیا لیکن اس کے بعد برفانی علاقوں میں اُسے سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم ۳۰ اپریل کو وہ گرتا پڑتا چترال پہنچ ہی گیا۔ اس اثناء میں چترال میں گھری ہوئی فوج کا حال اتنا پتلا تھا کہ اگر مزید چند دن تک اسے خواک اور رسد نہ پہنچتی تو ایک فرد بھی زندہ نہ بچتا۔ ۳ مارچ

سے ۱۹ اپریل تک کے عرصے میں چترال میں مقیم ساٹھ انگریز مارے گئے تھے لیکن گلگت سے امدادی دستے پہنچنے کے بعد محصورین کے حوصلے بلند ہو گئے۔ گلگت کے اس دستے کی بڑی قدر افزائی ہوئی۔ وائسرائے ہند اور ملکہ برطانیہ تک نے انہیں تعریفی سندوں اور اعزازات سے نوازا۔

(انگریزی فوج کے جو دستے پشاور سے مالاکنڈ کے راستے چترال بھیجے گئے تھے۔ انہیں راہ میں یوسف زئی مجاہدوں کے ہاتھوں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہزاروں جانوں کی قربانی دینے کے بعد بھی فرنگیوں کی پیش قدمی رُکی رہی، البتہ اس مہم سے انگریز کو ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ دِیر اور جندول پر یلغار کی وجہ سے عمرا خان چترال کے جہاد پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے اُس کا جندول لوٹ آنا ضروری ہو گیا۔ اُس کے چترال سے نکلتے ہی شیر افضل بھی حوصلہ ہار بیٹھا اور افغانستان کو بھاگ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ اصل میں افغان سپہ سالار غلام حیدر خان چرخی نے عمرا خان اور شیر افضل کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ اگر وہ چترال پر قابو پالیں تو افغانستان سے بیس ہزار سپاہی (دس ہزار درّہ خیبر کی راہ اور دس ہزار علاقہ مہمند کی طرف سے) ان کی مدد کے لئے روانہ کر دیئے جائیں گے اور اس طرح سارے سرحدی علاقوں کو انگریزی تسلط سے نجات مل جائے گی۔ لیکن جونہی عمرا خان پر افتاد پڑی، افغان سپہ سالار نے آنکھیں بدل لیں اور اس طرح عمرا خان اور شیر افضل بے بس ہو کر رہ گئے۔ اس موقع پر انگریز نے ایک اور چال بھی چلی تھی اور شیر افضل کو کہلا بھیجا تھا کہ اگر وہ عمرا خان کا ساتھ چھوڑ دے تو اسے چترال کا مہتر بنا دیا جائے گا۔ اُدھر عمرا خان کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کے اپنے بھائی بند (جن میں نواب دیر بھی شامل تھا) اس کے شدید مخالف تھے۔ چترال سے واپس آتے ہوئے عمرا خان نے دروش کے قلعہ سے وہ تمام انگریز قیدی رہا کر دیئے جو اس کی تحویل میں تھے۔ البتہ میجر ایڈورڈز اور میجر فولر کو رہا ہونے کے بعد اُس نے اختیار دیا تھا کہ وہ چاہیں تو چترال چلے جائیں اور چاہیں تو اس کے ہمراہ جندول کا سفر اختیار کریں۔ دونوں انگریز افسروں نے جندول جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

حاجی عمرا خان جندول جہاں انتہائی دلیر اور جنگ جُو تھا، وہیں سیاسی نشیب و فراز بھی خوب جانتا تھا۔ اس نے ان دونوں انگریز افسروں سے کام لیا۔ انہیں اپنی جانب سے خط دے کر انگریزی حکومت سے گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ لیکن یہ اقدام اب بعد از وقت تھا، وقتی طور پر انگریز کے سر سے

خطرہ ٹل چکا تھا اس لئے اس نے عمر اخان کے دستِ صُلح کو جھٹک دیا اور سخت رویہ اختیار کر لیا۔ عمر اخان نے بظاہر تو انگریزی لشکر سے جنگ جاری رکھی لیکن وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب مقابلہ کرنے اور بے وجہ جانیں لڑانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے اُس نے راتوں رات خچروں پر پہلے تو اپنا خزانہ اور اسلحہ افغانستان بھیج دیا اور بعد میں اپنے بیوی بچے بھی محفوظ مقام پر پہنچا دیئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اصل میں غازی عمر اخان کا اپنا سپہ سالار بھی درپردہ انگریز سے ساز باز کر چکا تھا اور عمر اخان کے لئے کسی طرح بھی کامیابی کی کوئی صورت باقی رہنے نہ پائی تھی۔ اس کے باوجود عمر اخان نے آخری وقت تک انتہائی رازداری سے کام لیا اور بڑی مستقل مزاجی دکھائی ـــــ ۱۷ اپریل کو اُس نے منڈا کے قلعے میں اپنے سارے سرکردہ ساتھیوں کا اجلاس بُلایا۔ ہر ایک سے جنگ جاری رکھنے یا بند کرنے کے بارے میں رائے طلب کی اور آخر میں ایک مدلل تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ مزید فوج کے بغیر انگریز سے مقابلہ مشکل ہے۔ مزید فوج صرف افغانستان ہی سے مل سکتی ہے۔ اس لئے وہ راتوں رات سفر کر کے اسمار میں افغان سپہ سالار سے ملاقات کرے گا۔ وہاں سے افغان فوج ساتھ لائے گا۔ اور واپسی پر انگریز سے دو دو ہاتھ کرے گا"۔ یہ کہہ کر دوستوں سے اجازت لے کر وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ صرف دو تین قابلِ اعتماد دوست اس کے ساتھ تھے، وہ عازمِ افغانستان ہو گیا ـــــ لیکن ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

عمر اخان کی روانگی کے دوسرے ہی دن انگریزی فوجیں منڈا کے قلعے پر حملہ آور ہوئیں تو کمانڈر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک شخص بھی مزاحمت کرنے والا نہ تھا۔ قلعے کا بڑا دروازہ کھلا پڑا تھا ـــــ فرش پر کچھ سامان اور کچھ کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ انہی کاغذات میں سے انگریز کو ایک ایسی دستاویز ہاتھ لگی جو سکاٹ لینڈ کی ایک تجارتی فرم (جس کا صدر دفتر بمبئی میں تھا) کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ اس فرم نے عمر اخان سے اسلحہ سپلائی کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ ایک عرصہ سے یہ فرم عمر اخان جنڈول کو بندوقیں۔ ریوالور اور مشین گنیں سپلائی کر رہی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت کو اس کا علم تک نہ تھا۔ انگریز نے اس سکاچ فرم پر مقدمہ قائم کیا لیکن فرم کے منتظمین نے اس سے پہلے ہی سارا کاروبار قاہرہ (مصر) کو منتقل کر دیا تھا اس لئے وہ انگریز کی گرفت سے بچے رہے۔ دوسرے دن انگریز فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے منڈا میں داخل ہوئے۔ جب وہاں

سے کچھ ہاتھ نہ آیا تو اپنی کامیابی کی نشانی کے طور پر عمر خان کے قلعے کے صدر دروازہ کے کواڑ اکھاڑ لائے۔ بتایا جاتا ہے کہ اب یہ کواڑ اس فتح کی یادگار کے طور، مردان چھاؤنی کے گائیڈز میس (MESS) میں رکھے ہوئے ہیں۔

انگریز مؤرخوں نے عمر خان کو "سرحدی نپولین" کا نام دیا ہے۔ اس کا بچپن انتہائی افلاس میں گزرا جوان ہوا تو اپنی بہادری اور عالی دماغی کی وجہ سے بڑا نام پایا۔ اردگرد کے خان خوانین سے مقابلہ کر کے اُن سے اپنا لوہا منوالیا۔ چھوٹے موٹے ایک سو قلعے فتح کئے اور اس کے بہادرانہ کارناموں کا تذکرہ گھر گھر میں ہونے لگا ـــــ لوگ اُس کے حسنِ اخلاق اور اعلیٰ انسانی اوصاف کے گرویدہ تھے اور اُسے ہر اعتبار سے اپنا "ہیرو" سمجھتے تھے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ درجہ کا بہادر تھا بلکہ انتہائی زیرک اور معاملہ فہم انسان بھی تھا ـــــ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ساری سرزمین یوسف زئی کی سب سے عظیم شخصیت بن گیا، دوسرے رؤسا اُس سے حسد کرنے لگے اور انہوں نے قدم قدم پر اُس کی راہ میں سازشوں کے جال بچھائے ـــــ وہ عرصۂ دراز تک انگریز کی مخالفت سے بچتا رہا۔ لیکن چترال کی مہم کے دوران حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ اُسے فرنگی کے خلاف اعلانِ جہاد کرتے ہی بن پڑی ـــــ اور یہی اس کی زندگی کا آخری جہاد ثابت ہوا۔

۱۸۹۷ء

تاریخِ سرحد کا ایک طوفانی سال

۱۸۹۷ء تاریخِ سرحد کا ایک طوفانی سال ثابت ہوا۔ ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ مالاکنڈ باجوڑ، مہمند، خیبر، تیراہ، اورک زئی، میران زئی، وزیرستان، کرم، شیرانی اور بھٹنی۔ ہر علاقہ کے لوگ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر اٹھے اور اپنی سرزمین کو فرنگی غاصبوں سے آزاد کرانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس پر سارے ہندوستان کی انگریزی فوج توپ و تفنگ سے لیس ہو کر صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں پر چڑھ دوڑی اور اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تُل گئی۔ سارا سرحدی صوبہ فوجی سپاہیوں سے بھر گیا۔ ہر بڑی سڑک پر سپاہی ہی سپاہی نظر آنے لگے۔ انہیں رسد پہنچانے کے لئے گھوڑا گاڑیاں، خچر اور لاریاں حرکت میں آگئیں۔

اس سے پہلے صوبہ سرحد میں کبھی کشت و خون کا ایسا ہمہ گیر بازار گرم نہیں ہوا تھا جیسا ۱۸۹۷ء میں ہوا۔ بغاوت کا جذبہ دلوں میں اُبل رہا تھا۔ ایک دم باہر نکل پڑا۔ قبائلی علاقوں کا کوئی صحت مند نوجوان ایسا نہ تھا جو اس جہادِ عظیم میں شامل نہ ہوا۔ خود انگریز مصنفوں نے ۱۸۹۷ء کے ان واقعات کو "پٹھانوں کی بغاوت" کا نام دیا اور فوجی مہموں کی تباہ کاریوں اور نقصانات کا دلی اعتراف کیا، اس جہاد کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ علمائے اسلام کی ایک کثیر تعداد نے اس میں بڑھ چڑھ کر عملی حصہ لیا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ۱۸۹۷ء کا انقلاب علماء ہی کی کوششوں اور تبلیغی مساعی کے نتیجے میں رُونما ہوا، تو اس میں رتی بھر مبالغہ نہ ہوگا ـــــ ہر گاؤں اور ہر قریہ سے ہر عالمِ دین، ہر خانقاہ اور ہر سلسلہ کے پیر اور طریقت

اور اُن کے عقیدت مند اسے کفر اور اسلام کے درمیان معرکہ سمجھتے ہوئے جہاد کے مقدس نام پر میدان میں اترے اور انتہائی بے سروسامانی کے باوجود دُنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت سے ٹکرا گئے۔

بعض انگریز اہلِ قلم ۱۸۹۷ء کی "سرحدی شورش" کو ایک منظم سازش قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک صوبہ سرحد کے طول و عرض میں رونما ہونے والے واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑی تھے۔ ان کی ابتداء ۱۰ جون کو مُہمند (وزیرستان) سے ہوئی۔ ابھی انگریزی فوجیں اُس سے نپٹنے نہ پائی تھیں کہ ۲۷ جولائی کو مالاکنڈ، چکدرہ اور سوات میں بارہ ہزار یوسف زئی مجاہدوں نے پرچمِ جہاد بلند کر دیا۔ ۱۴ اگست کو باجوڑ اور مہمند کے غازی شبقدر کے قلعہ پر چڑھ دوڑے تو اٹھارہ اگست کو تیراہ میں میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ ۲۳ اگست کو خیبری قبائل نے علی مسجد، شاہ گئی اور لنڈی کوتل کی انگریزی چھاؤنیوں پر قبضہ کر لیا تو جنوری ۱۸۹۸ء میں بونیر کے غازی فرنگی کے خلاف حرکت میں آ گئے۔ یہ سب اقدام اتنے مربوط تھے کہ دُنیا حیران رہ گئی ـــــ خود انگریزی حکومت بھی چکرا گئی اور اپنے وقار کو بچانے کے لئے اس نے ساری فوجیں جنگ کی بھٹی میں جھونک دیں۔

بظاہر ۱۸۹۷ء کی یہ جنگ آزادی ایک اتفاقیہ امر نظر آتی تھی لیکن بباطن یہ پھوڑا عرصہ دراز سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ دوسری جنگِ افغانستان اور ۱۸۹۷ء کے درمیانی عرصے میں انگریز کم و بیش سولہ مرتبہ پٹھان قبائل کے خلاف فوج کشی کر چکا تھا۔ گنڈمک کے معاہدے اور ڈیورینڈ لائن کے تعین کے فیصلے کے بعد وہ اس خطہ سے مشرق میں بسنے والے تمام قبائلیوں کو اپنی رعیت سمجھنے لگا تھا۔ جب کہ عملاً اسے ان علاقوں پر کوئی کنٹرول اور اختیار حاصل نہ تھا۔ وہ قبائل کی گردن میں غلامی کا شکنجہ کسنے کے درپے تھا لیکن ہر بار اسے اپنے مذموم ارادوں میں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا تھا۔ بہرحال انتہائی ڈھٹائی سے وہ رفتہ رفتہ قبائلی علاقوں کو اپنے زیرِ نگین لانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ فارورڈ پالیسی کے تحت وہ اپنے اس اقدام کو حق بجانب ثابت کرنے پر بضد تھا اور رفتہ رفتہ قبائلی علاقوں میں قدم آگے بڑھانے پر تُلا ہوا تھا۔ ڈیورینڈ معاہدہ (۱۸۹۳ء) کے بعد خیبر ایجنسی پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کے لئے وار برٹن جیسے گرگ باران دیدہ کو وہاں کا پولیٹیکل افسر بنا دیا گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں کُرم کو بھی برطانیہ کا زیرِ نگین علاقہ قرار دیتے ہوئے وہاں پولیٹیکل ایجنسی بنا دی گئی تھی۔ ۱۸۹۵-۹۶ء میں مالاکنڈ ایجنسی کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ سوات، دیر، چترال اور مالاکنڈ کا سارا علاقہ اس ایجنسی

میں شامل تھا۔ اسی طرح ٹوچی اور دانا میں شمالی اور جنوبی وزیرستان ایجنسیاں بنا کر وہاں انگریز افسر اور فوجیں تعینات کر دی گئی تھیں۔ قبائلی علاقے کے ہر کلیدی مقام پر فوجی چوکیاں، قلعے اور چھاؤنیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ انہی قبیلوں کے افراد پر مشتمل ملیشیا اور بارڈر پولیس اس غرض سے بھرتی کی گئی تھی کہ قبائلی علاقوں میں سڑکوں اور اہم فوجی تنصیبات کی حفاظت ہو سکے۔ ریلوے لائن کو درگئی، جمرود، لنڈی کوتل، ٹل اور ٹانک کے اہم قبائلی مرکزوں تک پہنچا دیا گیا ـــــ اسی طرح ہر اہم پہاڑی درّے کی حفاظت کے لئے اُس کے دہانہ پر بڑی فوجی چھاؤنی بنا دی گئی تھی جہاں گورا فوج، توپ خانہ اور رسالہ ہر وقت ہر ضروری کارروائی اور فوجی مہم کے لئے تیار کھڑا رہتا۔ مالاکنڈ کے دہانے پر مردان اور نوشہرہ، درّہ خیبر کی حفاظت کے لئے جمرود اور پشاور، پیواڑ کوتل اور کُرّم کے بچاؤ کے لئے کوہاٹ درّہ ٹوچی کے مُنہ پر بنوں، درّہ گومل کے سر پر ڈیرہ اسمٰعیل خان اور درّہ فراقرم اور کوہ سیاہ پر تسلط مضبوط بنانے کے لئے ایبٹ آباد کے مقام پر مستقل چھاؤنیاں بنا دی گئی تھیں۔ ان چھاؤنیوں کے فوجی اخراجات کروڑوں روپے تک پہنچتے تھے، "سرحدی ڈیوٹی" کے الاؤنس پر ایک کثیر رقم انگریز افسروں اور گورا سپاہیوں کی جیبوں میں جاتی تھی۔ لازماً لندن کی برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ اتنے اخراجات برداشت کرنے پر بھی ان کے ہاتھ کیا آتا تھا ـــــ کچھ بھی تو نہیں ـــــ ۱۸۴۹ء سے انگریز صوبہ سرحد پر قابض ہوئے تھے لیکن پچاس برس گزرنے کے بعد بھی اس چھوٹے سے صوبے پر پوری طرح قابو نہ پا سکے تھے، نہ یہاں انگریز کے قانون کو مانا جاتا تھا نہ انگریز کے وجود ہی کو برداشت کیا جاتا تھا ـــــ پھر قانون کی حکمرانی یہاں تھی ہی کہاں ـــــ؟ انگریز سرحدی حاکم نیم فوجی، نیم سول افسر ہوتے ـــــ اپنے مُنہ سے نکلے ہوئے ہر حکم کو وہ قانون کا درجہ دیتے ـــــ ایک عرصہ تک نہ صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کی سی عدالتیں تھیں نہ نظم و نسق کا کوئی ضابطہ یا تصور کہیں "فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن" کا سہارا لیا جاتا کبھی "غازی ایکٹ" کے تحت ہر سرحدی مجاہد کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ـــــ حریت پسندوں سے انتقام لینا ہر انگریز اپنا پدری حق سمجھتا ـــــ یہی وجہ تھی کہ پچاس سال کے قریب عرصہ گزرنے پر بھی انگریز کے خلاف نفرت کے جذبات لوگوں کے دل میں اسی طرح موجزن تھے جس طرح ان کی آمد کے وقت تھے۔

یہ تو تھے ۱۸۹۷ء کے جہادِ آزادی کے اندرونی اسباب ـــــ لیکن ان کے علاوہ بعض بین الاقوامی

معاملات اور تبدیلیوں نے سرحدی مسلمانوں کے ذہنوں کو متاثر کر رکھا تھا، خصوصاً خلافتِ اسلامیہ ترکیہ کے خلاف انگریز کی انتقامی کارروائیوں نے مسلمانانِ برصغیر کے دل زخمی کر رکھے تھے۔ یونان نے سرحدی تنازعہ کو آڑ بنا کر ترکوں کے خلاف جنگ چھیڑی تو یورپ کے تمام عیسائی حکمران کھلم کھلا ترکی کے مخالف ہو گئے۔ یورپی پریس کھلم کھلا اسلام پر اشتعال انگیز حملے کرنے لگا ـــــ مسلمانوں کے مذہب کا مذاق اُڑایا جانے لگا۔ اس تکلیف دہ صورتِ حال کو دیکھ کر ہر مسلمان کا خون کھولنے لگا۔ بعض اطلاعات کے مطابق ترکوں کے کچھ نمائندے اور علماء اپنے حق میں عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے افغانستان آئے تھے اور انہوں نے قبائلی علاقہ کے علمائے اسلام کے وفود سے بھی ملاقات کی تھی ـــــ دنیائے اسلام کے مقتدر علماء اس موقع پر جہاد کا فتویٰ بھی دے چکے تھے۔ اُنہی کے تتبع میں افغانی اور سرحدی علماء نے بھی فرنگی کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیئے۔ یہ فتوے قبائلی اور سرحدی علاقے کے ہر گاؤں میں پہنچے۔ ان کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ہر دردمند مسلمان جہاد کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے فرنگی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

کئی ذرائع کے مطابق اس موقع پر امیر عبدالرحمٰن خان نے سیاسی شعور کا نمایاں ثبوت دیا۔ بظاہر وہ قبائل کو انگریز کی مخالفت مول لینے سے روکتا رہا لیکن درپردہ اپنے سپہ سالار غلام حیدر خان اور دوسرے زعماء کے ذریعے قبائل کو فرنگی کے خلاف اکساتا بھی رہا۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ امیر عبدالرحمٰن ڈیورینڈ معاہدے پر دستخط تو کر چکا تھا لیکن باطن اس معاہدے کو ناکام بنانے کی سوچ رہا تھا۔ شروع ہی سے اس کی نظر کنڑ کی زرخیز وادی پر لگی تھی بلکہ وہ وہاں دریا کے ساتھ ساتھ ایسی شاہراہ نکالنے کی بھی سوچ رہا تھا جو جلال آباد کو یوسف زئی اور مہمند کے علاقوں سے ملا دیتی ۹۴-۱۸۹۳ء کی جنگِ چترال میں بھی اس نے عمرا خان اور شیر افضل کی پیٹھ ٹھونکی تھی تاہم اُوپر سے وہ ہمیشہ انگریز کی حمایت کا دم بھرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں وزیریوں اور آفریدیوں کے وفد جب امیر کابل کے پاس ہدایات لینے پہنچے تب بھی اس نے قبائلی عوام کو "ناقابلِ اعتماد" قرار دیتے ہوئے ان کی خاطر جنگ میں کودنے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود کئی مورخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قبائل کو انگریز کے خلاف آمادۂ جہاد کرنے میں امیر عبدالرحمٰن کا ہاتھ ضرور تھا۔

میزار کا وقوعہ

۱۰ر جون ۱۸۹۷ء کو "خونی انقلاب" کی ابتداء وادیٔ ٹوچی میں رہنے والے قبیلہ مداخیل کے ایک چھوٹے سے گاؤں "میزار" سے ہوئی۔ انگریز کئی برسوں سے وانا اور دوسرے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں بنانے کی سوچ رہا تھا۔ اس عرصے میں کبھی کبھی وزیری قبیلوں سے ٹکراؤ بھی ہوتا رہتا تھا۔ ایک بار شیرانی کیمپ میں متعینہ ایک ہندو فوجی کلرک کو ایک وزیری نے کسی بات پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس پر انگریز نے مداخیل پر تعزیری جرمانہ عائد کر دیا۔ مداخیل انتہائی مفلوک الحال تھے۔ جرمانہ ادا نہ کر سکے تو ٹوچی کا پولیٹیکل افسر مسٹر گی (GEE) تین سو سپاہی اور چھ توپیں لے کر اُن سے جرمانہ وصول کرنے نکل کھڑا ہوا۔ مہم کا اصل مقصد دوانوئی کے اہم مقام پر فوجی چوکی کی تعمیر کے لئے جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔ اس چوکی کی تعمیر سے فرنگی ہیرمل (وزیرستان) سے غزنی کو جانے والی شاہراہ کی نگرانی کر سکتے تھے۔

میزار پہنچنے پر گاؤں کے لوگوں نے فوجیوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ گرمی کی دوپہر تھی۔ انگریز افسروں کو چارپائیاں مہیا کی گئیں کہ وہ ستا سکیں۔ فرنگی افسر اور سکھ سپاہی اس آؤ بھگت پر بہت خوش ہوئے۔ فوجی بینڈ بجتا رہا اور گاؤں کے بچے، بوڑھے اور جوان اُس سے محظوظ ہوتے رہے۔ غریب مداخیل انگریز کی خاطر تواضع کرتے رہے کہ اس کا پارہ چڑھنے نہ پائے لیکن فرعون مزاج پولیٹیکل افسر اس عاجزی کو مداخیل کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے اور زیادہ شیر ہو گیا۔ اس نے جرگہ بلا کر جرمانے کی فوری ادائیگی پر زور دیا۔ جرگہ نے کچھ مہلت مانگی اور درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ اس عرصہ میں فوجی سپاہی اور افسر مکانوں کی دیواروں کے سائے میں چارپائیاں بچھا کر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس اثنا میں کسی گورا سپاہی سے ایسی حرکت سرزد ہوئی جس سے سارے گاؤں میں اشتعال پھیل گیا ـــــ بستی کے سب مرد غضب ناک ہو کر اٹھے اور انہوں نے اہم ناکوں پر مورچے سنبھال لئے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ بیک وقت فرنگی سپاہیوں اور افسروں پر ٹوٹ پڑے۔ سب سے پہلے غازیوں نے کیپٹن براؤن (BROWN) اور لفٹیننٹ کروک شینک (CRUIK SHANK) کو گولی کا نشانہ بنایا پھر باقی ماندہ فوجیوں کا رُخ کیا۔ فرنگی فوج کے حوالدار میجر محمد اسمٰعیل نے حوصلہ کر کے توپ خانے کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور فائرنگ شروع کر دی لیکن مجاہد بڑھتے بڑھتے اُس کے سر پر جا پہنچے اور اُسے دست بدست لڑائی میں اُلجھا لیا۔ اتنے میں

سکھ صوبیدار سُندر سنگھ اپنے دس ساتھیوں سمیت آگے بڑھا اور آدھ گھنٹے تک مسلمان مجاہدوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اگرچہ مجاہدوں نے جان پر کھیل کر فرنگی دستے کے ایک ایک فرد کو موت کی نیند سلا دیا تاہم اس کارروائی سے انگریزی توپ خانے کو اپنا کام کرنے کا موقع مل گیا۔ شدید گولہ باری کے باوجود مجاہد شیروں کی طرح آگے بڑھ کر دشمن پر وار کرتے رہے۔ عصر تک انہوں نے کپتان بُونی (BUNY) اور تین دوسرے انگریز افسروں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اس عرصے میں انگریزی دستے کے کچھ سوار بھاگے اور انہوں نے دتہ خیل کی چوکی میں پہنچ کر اس تباہی کی اطلاع دی۔ دتہ خیل سے توپیں اور تازہ دم کمک پہنچتے ہی فرنگی دستے کی جان میں جان آئی۔ انگریزی توپ خانے نے اندھا دھند گولہ باری کر کے بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہاں قبائلی مجاہد جو صرف تلواریں سنبھالے ہوئے تھے یا ایک دو کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں اور کہاں اعلیٰ درجے کی ولائتی توپیں اس کے باوجود آدھی رات تک میدانِ کارزار گرم رہا۔ حتیٰ کہ رات کے اندھیرے میں انگریز اپنے زخمی اور باقی ماندہ سپاہی لے کر دتہ خیل کو روانہ ہو گئے۔

اگرچہ اس مقابلے میں بہت سے مدّاخیل بھی جان بحق ہوئے تاہم ان نہتے لوگوں نے انگریزی فوج کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔ فوجی دستے کا شائد ہی کوئی افسر یا سپاہی ایسا ہو جو زخمی یا ہلاک ہونے سے بچا ہو۔

اپنی خفّت مٹانے کے لئے انگریز نے ایک لشکرِ جرار جمع کیا اور جنرل کوری بِرڈ (CORRIE BIRD) کی کمان میں مدّاخیل کے خلاف طاقت آزمائی کی۔ مدّاخیل کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تاہم ان غازیوں نے دشمن سے بھی اپنی بہادری کا لوہا منوالیا۔

جوانانِ یوسف زئی

واقعۂ مَیزار کو ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ سوات، مالاکنڈ اور باجوڑ کے مردانِ تیغ آزما غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف میدانِ جہاد میں کُود پڑے۔

۲۶ جولائی ۱۸۹۷ء کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ مالاکنڈ کے قلعے میں متعین انگریز افسر کلب میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کوئی تاش، ٹینس اور بلیرڈ سے جی بہلا رہا تھا تو کوئی جام پر جام لنڈھا کر دادِ عیش دے رہا تھا۔ اتنے میں باہر ڈھول اور سُرنا کی آواز سنائی دی۔ بیرے سے پوچھا گیا۔

"باہر کیا ہے ؟" اس نے بتایا" ایک قلندر جھنڈا اٹھائے جا رہا ہے، بچے اور نوجوان ساتھ ہیں اور سب بآواز بلند لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ورد کر رہے ہیں"۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک سنتری نے بتایا" سامنے پہاڑ کی چوٹی پہ لوگ جمع ہو رہے ہیں" ـــــ یہ باتیں سُن کر فرنگی تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے ـــــ اُن کا خیال تھا کہ یہ لوگ کسی زیارت یا عُرس پر جلوس لے کر جا رہے ہیں ـــــ" چنانچہ چُہل بازیاں جاری رہیں ـــــ شام ہوگئی ـــــ اندھیرا ہوتے ہی بتیاں روشن ہوئیں اور وہ کھانے کی میز کی طرف بڑھے ۔ ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ خطرے کا بگل بجا ـــــ سارے افسر چونک پڑے ۔ ہر کوئی وردی پہننے اور ہتھیار سنبھالنے کو دوڑا ـــــ ابھی وہ اپنی بارکوں میں پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ پہاڑی سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی ـــــ گولیاں آ آ کر کیمپ میں گرنے لگیں ۔ مالاکنڈ کے قلعے میں اس وقت انگریز کی کئی رجمنٹیں متعین تھیں ۔ فوجی نقطۂ نظر سے فرنگی اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر سمجھے ہوئے تھے ۔ یوں بھی ۱۸۹۳ء کی مہم چترال کے بعد ہر طرف امن و سکون تھا ۔ اُنہیں گمان تک بھی نہ تھا کہ سوات کے شمشیر آزما ایک دم اُن کے خلاف حرکت میں آجائیں ۔ گے ـــــ مالاکنڈ کا قلعہ پیالے کی مانند تھا ۔ سامنے پہاڑیاں تھیں ۔ مجاہد بجلی کی تیزی کے ساتھ آئے اور آناً فاناً انہوں نے امان درّہ پر قبضہ کر لیا ـــــ بعد میں وہ مالاکنڈ کی تجارتی سرائے بلکہ چھاؤنی کے پولوگراؤنڈ تک میں داخل ہو گئے ـــــ ساری رات لڑائی ہوتی رہی ـــــ مجاہدین اس بیجگری سے لڑے کہ ہر ایک نے کئی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ انگریزی توپیں آگ اُگلتی رہیں ـــــ مشین گنوں سے گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں لیکن سرفروشانِ یوسف زئی تلواریں سنبھالے نعرے لگاتے دشمن کی صفوں میں گھُسے جا رہے تھے ۔ وہ شیر کی طرح جھپٹتے اور انگریز کے سپاہیوں سے بندوقیں چھین لیتے ـــــ پھر اُنہی بندوقوں سے دشمن کو ٹھکانے لگانے میں لگ جاتے ۔ سارے انگریز افسر بلکہ خود قلعے کا کمانڈر اس حملے کی شدت سے بوکھلا اٹھے، انہوں نے فوراً مردان اور درگئی کی چھاؤنیوں کو سگنل دیا اور کہہ دیا کہ اگر فوری کمک نہ پہنچی تو مالاکنڈ کی خیر نہیں ۔

دو بجے رات یہ پیغام مردان چھاؤنی پہنچا ۔ اُسی وقت گائیڈز رجمنٹ کے سکھ سپاہیوں کو کُوچ کا حکم ملا ۔ سخت گرمی تھی ـــــ سپاہی بے ہوش ہو ہو کر گرتے تھے ۔ ایک انگریز افسر کا گھوڑا تیورا کر گرا اور گرتے ہی ختم ہوگیا ۔ گرتے پڑتے دوسرے دن یہ سکھ پلٹن درگئی پہنچی ۔ انیس سکھ راہ میں گرمی سے

ہلاک ہو چکے تھے۔ اس اثنار میں ریل کے ذریعے نوشہرہ چھاؤنی سے بھی کمک درگئی پہنچ چکی تھی۔ فرنگی دستوں نے اکٹھے ہو کر قدم آگے بڑھائے۔ سکھ رجمنٹ لفٹیننٹ واہان (VAGHAN) کی کمان میں تھی جب کہ دوسری امدادی فوج کرنل ریڈ (REED) کے تحت محاذ کو روانہ تھی۔

اُدھر ۲۶ جولائی ہی سے مالاکنڈ میں قیامت کا سا سماں تھا۔ قلعہ کے سکھ دستوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ باہر نکل کر قبائلی یلغار کو روکیں۔ وہ حکم بجا لائے لیکن مجاہدوں کے ریلے کو روک نہ سکے۔ اُدھر مجاہدوں نے ایک اور محاذ کھول دیا اور شمالی رُخ سے قلعے پر حملہ کیا۔ درمیان میں ایک سرائے پڑتی تھی جس میں لیوی کے محافظ دستے رہتے تھے۔ مجاہدین نے پُرزور حملہ کیا اور سرائے پر قابض ہو گئے۔ اس طرح چکدرہ جانے والی سڑک بھی مجاہدوں کی تحویل میں چلی گئی۔ مجاہدین جوش میں آکر مزید آگے بڑھے تو انہوں نے انگریز کے اسلحہ اور گولہ بارود کے ایک ذخیرے پر بھی قبضہ کر لیا۔

صبح ہوئی تو غازی پیچھے ہٹ کر اپنے پہاڑی مورچوں کو چلے گئے۔ اس پر دوبارہ سکھ رجمنٹ کو ان پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ سکھوں نے اپنی طرف سے بڑا زور لگایا لیکن ان کی کوئی پیش نہ گئی اور بیسیوں لاشیں میدان میں چھوڑ کر وہ پھر پسپا ہونے اور قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

اُدھر چکدرہ کی فوجی چوکی بھی خطرے میں تھی۔ اس میں کُل دس سپاہی تھے جن کا کام مالاکنڈ کے انگریزی قلعے سے رابطہ قائم رکھنا اور کسی خطرے کی صورت میں سگنل دینا تھا۔ قبائلی مجاہدوں کو چوکی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر انہوں نے بار بار کمک کے لئے درخواست کی۔ چنانچہ مالاکنڈ سے چالیس سپاہی اپنے انگریز افسروں کی کمان میں اُن کی مدد کے لئے روانہ کئے گئے۔ قبائلی غازیوں نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ پسپا ہو گئے لیکن کچھ دیر بعد کسی دُور دراز راستے سے چھپتے چھپاتے دریا کو پار کر کے بالآخر چکدرہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اُدھر مالاکنڈ میں تازہ دم کمک پہنچ گئی تو انگریز نے مجاہدین پر بار بار حملے شروع کر دیئے تاہم مجاہد ہر بار فرنگیوں کو پیچھے ہٹا دیتے۔ غازیوں نے مالاکنڈ قلعہ کے عین سامنے ایک پہاڑی چوٹی پر "سنگر ڈھ" (مورچہ) بنا رکھا تھا۔ سنگر ڈھ سے دنادن گولیاں آتیں اور فرنگی سپاہیوں کو ٹھنڈا کر دیتیں۔ جواب میں انگریزی توپیں غازیوں پر اندھا دُھند گولہ باری کرتیں۔ تاہم شدید گولہ باری کے باوجود اُن مردانِ خدامست کے حوصلے بلند رہے اور پورے تین دن رات تک انہوں نے فرنگی کا ناک میں دم

کئے رکھا۔

۲۹ جولائی ۱۸۹۷ء کو جمعہ کا دن تھا اور ہجری مہینے کا پہلا دن ـــــ شہادت کے لئے جمعہ سے بڑھ کر اور کون سا موزوں دن ہو سکتا تھا۔ اس لئے مجاہدین کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ٹولیاں بنا بنا کر قلعے پر حملے کرتے، سینے پر گولیاں کھاتے لیکن بدستور آگے بڑھتے رہے، چند ہی گھنٹوں میں سینکڑوں سپاہیوں کے علاوہ انہوں نے گائیڈز رسالہ کے دو افسروں لفٹیننٹ بالڈوِن (BALDWIN) اور لفٹیننٹ کیس (KEYS) کو بھی ہلاک کر دیا۔ ایک گولی لفٹیننٹ کرنل آدمز (ADAMS) کے گھوڑے کو آ کر لگی۔ گھوڑا وہیں ہلاک ہو گیا اور خود کرنل بھی زخمی ہوا ـــــ مجاہدین نے ایک ہی ہلّے میں انگریزی رسالہ کے بیس سے زیادہ گھوڑے مار دیئے۔

یکم اگست تک مالاکنڈ کے محصورین کا حال پتلا ہو چکا تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر سارے ہندوستان کی انگریزی سپاہ حرکت میں آ گئی تھی۔ راولپنڈی کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل سر بائیڈن بلڈ (BINDON BLOOD) خود مالاکنڈ پہنچ کر کمان سنبھال چکے تھے۔ مختلف انگریزی چھاؤنیوں سے دس ہزار کے قریب فرنگی سپاہی مالاکنڈ پہنچ چکے تھے۔ جنرل بلڈ نے چکدرہ اور مالاکنڈ کو غازیوں سے واگذار کرانے کے پروگرام پر بیک وقت عمل شروع کیا۔ رات کو ایک دستہ کرنل میکل جان ۔ (MEIKLE JOIN) کی سرکردگی میں تیار کیا گیا جسے صبح دم چکدرہ پر چڑھائی کرنی تھی اور دوسرا دستہ کرنل گوڈنی (GOLDNY) کی قیادت میں تیار کیا گیا جو مالاکنڈ پر حملہ کرنے والے غازیوں کے خلاف کارروائی کرتے ملا تھا ـــــ ان دستوں نے نہتے مجاہدوں پر اس شدت سے گولہ باری کی کہ مجاہدین کو منتشر ہوتے ہی بن پڑی۔ کمال یہ ہے کہ اتنے بڑے حملے کے باوجود مجاہدین میں سے کُل آٹھ نو افراد شہید ہوئے اور صرف ایک ہی زخمی مجاہد کو زندہ گرفتار کیا جا سکا۔ باقی سب غازی سلامتی سے نکل کر اپنے اپنے ٹھکانوں تک پہنچ گئے۔ جنرل بلڈ آتے وقت تمام چھاؤنیوں سے توپیں جمع کر کے لایا تھا۔ یہ توپیں مجاہدین پر دن رات آگ اگلتی رہیں۔

یکم اگست کو انگریز کو چکدرہ کی فکر لاحق ہوئی۔ دو تین دن کے حملوں میں مجاہدین نے چکدرہ کے قلعے میں جگہ جگہ رخنے ڈال دیئے تھے۔ کئی جگہ سے بیرونی دیوار گر گئی تھی اور قلعے کی عمارت میں دراڑ پڑ گئے تھے۔ ۲ اگست کو قریب تھا کہ چکدرہ کا قلعہ یوسف زئی غازیوں کے ہاتھ میں چلا جاتا لیکن مالاکنڈ اور

امان قلعہ سے بھاری تعداد میں انگریز لشکر پہنچ گیا۔ اپنی بے سروسامانی کے باوجود مجاہدوں نے انتہائی دلیری اور پامردی سے اس لشکر کا مقابلہ کیا۔ خالی ہاتھ نوجوان رائفل بردار گوروں سے گتھم گتھا ہو جاتے یہاں تک کہ نوعمر غازی صرف پتھر لے کر انگریز سپاہیوں پر پل پڑتے ـــــ انگریز اہلِ قلم کے مطابق دو ہزار یوسف زئی مردانِ مجاہد نے اپنے آخری سانس تک انتہائی استقلال، جوش اور جذبے سے لڑتے ہوئے شہادت قبول کی۔ یہ تعداد صرف چکدرہ کے معرکوں کی ہے ـــــ پوری مہم کے دوران شہیدوں کی تعداد تین، ساڑھے تین ہزار سے کم کیا ہوگی۔ اُدھر دشمن کے نقصان کا اندازہ بھی کوئی معمولی اندازہ نہ تھا۔ امبیلہ کے جہاد کے بعد مالاکنڈ اور چکدرہ کا غزا تاریخ یوسف زئی کا ایک نہایت نمایاں کارنامہ ہے۔

سوات مالاکنڈ اور چکدرہ میں حالات پر قابو پانے کے بعد جنرل بلڈ نے سوات کے اُن علاقوں کے خلاف انتقامی اور تادیبی کارروائی کا منصوبہ بنایا جہاں کے عوام نے محض اپنی دینی حمیت کے پیشِ نظر انگریزی قوت سے ٹکر لی۔ اس وقت تک مالاکنڈ میں انگریزی فوج کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ جنرل بلڈ کے علاوہ دو بریگیڈیر جنرل اور کوئی ایک سو انگریز افسر اس مہم میں گورا اور دیسی سپاہیوں کی قیادت کر رہے تھے۔ درجنوں توپیں اور ہزاروں گھوڑے اور خچر اس لشکر کے ساتھ تھے، سارے برِصغیر سے رسد اور اسلحہ اُنہیں سپلائی ہو رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں یوسفزئی غازیوں کے پاس دو دن کی خوراک کا ذخیرہ بھی نہ تھا۔ نہ گولہ بارود مہیا تھا وہ محض اللہ کی راہ میں جہاد کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

چونکہ اس سارے علاقہ میں تھانہ کا قصبہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اس لئے انگریز کمانڈر نے پہلے اس کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ قبائل نادار اور بے وسیلہ تھے لیکن ہار ماننا ان کی روایت ہی نہ تھی۔ انہوں نے جگہ جگہ انگریز لشکر کی ڈٹ کر مزاحمت کی لیکن تا بکے ـــــ انگریز نے اپنا پلہ بھاری دیکھا تو تھانہ کی تمام بستیوں کو تباہ کر دیا۔ فصلیں اور کھلیان جلا دیئے اور جو شخص ہاتھ آیا اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے باوجود اہلِ سوات کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ لنڈاکئی کے مقام پر انہوں نے انگریز لشکر کو وہ سبق سکھایا جو اُسے ہمیشہ یاد رہے گا۔ پہاڑی کمین گاہوں سے نکل کر یوسف زئی غازیوں نے فرنگی پر ایسا اچانک اور بھرپور حملہ کیا کہ دشمن چکرا کر رہ گیا۔ انگریز فوج کا ہراول دستہ پوری

طرح مجاہدین کے نرغے میں آگیا۔ بے شمار گورا سپاہیوں کے علاوہ تین بڑے بڑے انگریز افسر بھی مارے گئے۔ اس پر جنرل بلڈ نے پوری فوج کو جنگ کی آگ میں دھکیل دیا۔ ہزاروں سپاہیوں نے جدید توپخانے کی مدد سے سواتیوں کا مقابلہ کیا تب کہیں جا کر اُن کی جان بچی ـــــ اس "کامیابی" پر کرنل آدمز (ADAMS) اور لارڈ فن کیسٹل (FINCASTLE) کو بہادری کا سب سے بڑا برطانوی اعزاز "وکٹوریہ کراس" عطا ہوا ـــــ یوسف زئی بہادروں کا انعام اور جزا تو اللہ ہی کے پاس ہے تاہم ان کی جانبازی کا اعتراف خود اُن کے دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔

۱۸ اگست کو مالاکنڈ فیلڈ فورس بری کوٹ اور منگورہ کی طرف بڑھی ـــــ ایک ہفتے تک یہ لاؤلشکر وادئ سوات میں خیمہ زن رہا ـــــ انگریز چاہتا تھا کہ اہلِ سوات اس طاقت و قوت سے مرعوب ہو کر صلح پر مجبور ہو جائیں ـــــ لیکن ایسا نہ ہوا ـــــ سوات کے بعد جنرل بلڈ کا ارادہ تو بونیر پر یلغار کرنے کا بھی تھا لیکن اس اثناء میں اُسے خبر ملی کہ مہمند غازیوں نے شبقدر کے انگریزی قلعے پر دھاوا بول دیا ہے اور باجوڑی اور اُتمان خیل بھی اس جہاد میں شریک ہو گئے ہیں۔ اس لئے اسے شبقدر کو سدھارنا پڑا ـــــ تاہم ایک بریگیڈ گورا فوج کافی دنوں تک سوات میں پڑی رہی کہ کہیں مالاکنڈ اور چکدرہ کے محاذوں پر غازی دوبارہ آغازِ جہاد نہ کر دیں۔

مالاکنڈ اور چکدرہ پر جہاد کا آغاز اصل میں علمائے اسلام کے اُس فتوے کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا جس میں انگریز کے خلاف (جو خلیفۃ المسلمین، سُلطان ترکی سے برسرِ پیکار تھا) جہاد کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا گیا تھا۔ ۲۶ جولائی سے دو تین دن قبل مُلّا سعد اللہ خان (جو سر تور مُلّا اور مستان مُلّا کے نام سے زیادہ مشہور ہے) اپنے مرشد ہڈّہ مُلّا صاحب کے حکم سے تبلیغِ جہاد کے لئے سوات کے قصبہ تھانہ میں آیا۔ وہ سرخ ہلالی پرچم اٹھائے ہوئے تھا اور صرف چند لڑکے اس کے ہمراہ تھے۔ تاہم اس کی تبلیغ کا اتنا اثر تھا کہ دو تین ہی دن میں آٹھ دس ہزار یوسف زئی جانباز غازیوں کی صفوں میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے جنگ کے لئے پہلے سے نہ کوئی تیاری کی تھی نہ منصوبہ بندی ـــــ نہ ان کے پاس مال و دولت تھا نہ توپ و تفنگ ـــــ اس بے سروسامانی کے باوجود ان کے جذبۂ ایثار و قربانی کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک نعرے لگاتا دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑتا اور لڑتے لڑتے جان دے دیتا۔

ان سرحدی مہمات کا ذکر کرتے ہوئے کیپٹن نیول (NEVILL) بیان کرتا ہے کہ "دیسی ساخت کی معمولی بندوقوں کے ساتھ غازیوں کو مالاکنڈ اور چکدرہ کے مضبوط انگریزی قلعوں پر حملہ کرنا تھا تاہم اس سے اُن کے عزم و استقلال میں ذرا بھر کمی آئی نہ اُن کے قدم ڈگمگائے۔ اُنہیں بھاری جانی قربانی دینی پڑی لیکن یوں نظر آتا تھا کہ غیرتِ ایمانی سے سرشار ان میں سے ہر شخص موت کو گلے لگانے آیا تھا۔"

لارڈ فن کیسل (FINCASTLE) جو گائیڈ رسالے کے ہمراہ تمام حالات کا خود مشاہدہ کر رہا تھا، مجاہدوں کے جوش و خروش کو "مذہبی جنون" قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "غازی ڈھول پیٹتے۔ نعرے لگاتے، سینہ تانے مالاکنڈ قلعہ کی فصیل پر حملہ آور ہوتے تھے اور آخری دم تک لڑتے لڑتے جان قربان کر دیتے تھے۔"

ایک اور چشم دید شاہد کا بیان ہے کہ صرف غازیوں ہی کو جانی نقصان اٹھانا نہ پڑتا تھا بلکہ وہ دشمن (انگریز) پر بھی کاری ضرب لگاتے تھے۔ انہوں نے ایک فرنگی پکٹ کے ۲۵ افراد میں سے ایک دیسی افسر اور اٹھارہ سپاہیوں کو ہلاک اور زخمی کر دیا ـــــ جب کہ ایک دوسری پکٹ پر دست بدست لڑائی میں غازیوں کے ہاتھوں ۴۵ میں سے ۲۱ سکھ لقمۂ اجل بن گئے۔

سر ونسٹن چرچل

اس مہم میں ونسٹن چرچل نے (جو بعد میں برطانیہ کا نامور وزیر اعظم منتخب ہوا) بھی شرکت کی۔ اس کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ

"۱۸۹۷ء میں چرچل ہندوستانی فوج سے چھٹی لے کر انگلستان گیا ہوا تھا۔ ابھی اس کی چھٹی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سوات اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں سے لڑائی کی خبریں آنے لگیں۔ چرچل کو سرحدی علاقوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایک رومانی لگاؤ تھا۔ اس نے فوراً اپنے جنرل کو تار دیا اور پیش کش کی کہ وہ مالاکنڈ پہنچنا چاہتا ہے۔ چونکہ جنگی نامہ نگار بنے بغیر وہاں پہنچنا مشکل تھا اس لئے اس نے فوراً "ڈیلی گراف" لندن اور انگریزی کے ایک ہندوستانی روزنامہ کی نامہ نگاری قبول کر لی۔ وہ ریلوے ٹرین سے نوشہرہ چھاؤنی پہنچا اور وہاں سے چالیس میل کا سفر ٹانگہ میں طے کر کے مالاکنڈ میں حاضر ہو گیا۔

ستمبر ۱۸۹۷ء کے دوران وہ مالاکنڈ فیلڈ فورس کے ہیڈ کوارٹر زمیں خدمات بجا لا رہا تھا۔ اس سے پہلے "ٹائمز" کا ایک انگریز نامہ نگار محاذ جنگ پر بہادری دکھاتے ہوئے "وکٹوریہ کراس" حاصل کر چکا تھا۔

اس کی مثال چرچل کے سامنے تھی اس لئے چرچل نے بھی بڑی محنت اور جرأت سے خدمات بجالائیں۔ سرکاری مراسلوں میں اس کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا کہ ـــــ "لفٹیننٹ چرچل نے انتہائی نازک حالات میں انتہائی مفید خدمات انجام دی ہیں"۔

یوسف زئی مجاہدوں کے ساتھ ایک جھڑپ کا حال بیان کرتے ہوئے چرچل کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ

"سخت جنگ جاری تھی۔ کبھی پہاڑیوں پر چڑھنا پڑتا تھا کبھی دوڑتے ہوئے اترنا اور ندیوں کو پھلانگنا ـــــ چرچل بنگال لانسرز کے ساتھ تھا کہ اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور پانچ سکھ اور ایک انگریز افسر وہیں ڈھیر ہو گئے ـــــ چرچل آگے بڑھا وہ ایک زخمی سپاہی کو سہارا دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک یوسف زئی نوجوان شیر کی طرح جھپٹا اور اس نے زخمی سپاہی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ چرچل کو اس پٹھان مجاہد پر غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی ـــــ وہ اس ارادے سے آگے بڑھا کہ پٹھان مجاہد کا کام تمام کر دے اغلباً اس وقت تک پٹھان مجاہد کے پاس گولیاں ختم ہو چکی تھی، اس لئے وہ تلوار سونت کر چرچل پر جھپٹا ـــــ چرچل بھی ایک ماہر شمشیر آزما تھا تاہم اس نے اپنے ریوالور کا استعمال ہی بہتر سمجھا اور کچھ فاصلے سے مجاہد پر پے در پے گولیاں چلا کر اُسے ٹھنڈا کر دیا"۔

ایک دوسرے موقع پر جب مہمندوں کے حملے کی تاب نہ لا کر انگریزی لشکر راہِ فرار اختیار کرنے لگا۔ تو چرچل کو اُس کے کمانڈر نے فوراً ہیڈ کوارٹر زلوٹ جانے کا حکم دیا۔ تاہم چرچل ٹالتا رہا اور اس نے تحریری حکم کے بغیر وہاں سے جانے میں مصلحت نہ سمجھی۔

اس واقعے کے بعد اخبار کی نامہ نگاری کی بجائے اسے ۳۱ ویں پنجاب انفنٹری میں تعین کر دیا گیا۔ وہ ابھی یہاں کی زبان سے آشنا تھا نہ مقامی حالات سے ـــــ تاہم اس نے بخوشی بٹالین کی کمان سنبھال لی لیکن اس عہدے پر وہ کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ اس وقت تک تیراہ کے عوام بھی انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد کر چکے تھے اور صوبہ سرحد میں حالات پر قابو پانے کا کام "تیراہ ملیف فورس" کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ چرچل اور اُس کی والدہ نے بڑی دوڑ دھوپ کی کہ اُسے سرحدی محاذِ جنگ ہی پر خدمت کا موقع دیا جائے لیکن اُسے ناتجربہ کاری کی بنا پر واپس بنگلور (رجمنٹل سنٹر) بھیج دیا گیا۔

چرچل صحافت کے رموز سے آگاہ تو تھا ہی۔ محاذِ جنگ سے متعلق اُس کے اخباری مراسلوں کی بڑی تعریف ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ ان سرحدی مراسلات پر مبنی ایک کتاب شائع کر دی جائے۔ چنانچہ "مالاکنڈ فیلڈ فورس" کے عنوان سے یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ایسی کتاب شائع کر دینا چرچل کا بہت بڑا کارنامہ تصور ہوا۔ تحریر میں بڑی روانی اور زور تھا اور معلومات بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی گئی تھیں لہٰذا کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے اس کا عمیق مطالعہ کیا۔ پرنس آف ویلز نے اسے ایک کامیاب کوشش قرار دیا۔ اس طرح چرچل کو عالمی شہرت مل گئی اور آمدن بھی اتنی ہوئی جو اس کی دو سال کی تنخواہ کے برابر تھی —— بعد میں اس کی دوسری کتابیں بھی اپنی ادبی اور فنی خصوصیات کی وجہ سے بڑی مقبول ہوئی۔

گویا ونسٹن چرچل کے روشن مستقبل کا آغاز مالاکنڈ کی سرحدی مہم ہی سے ہوا۔ چکدرہ کے پاس پہاڑی پر ایک پکٹ ہے جسے مقامی لوگ "چرچل پکٹ" کہتے ہیں۔ عین ممکن ہے چرچل وہاں متعین رہا ہو۔

چند شہید رح اہلِ سوات نے ۱۸۹۴ء، ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۷ء کی لڑائیوں میں انگریز کے خلاف انتہائی شجاعت، عالی حوصلگی اور استقلال کا ثبوت دیا۔ ہزاروں اہلِ ایمان نے ملتِ ایمان کے ناموس اور وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے اپنی جانوں کی قربانی پیش کی۔ ان شہدائے کرام کی فہرست بہت طویل ہے تاہم حال ہی میں جناب محمد اسلام اجملی نے تحقیق و تدقیق کے بعد ان شہیدانِ راہ حق کے کچھ نام گنوائے ہیں۔

سرتور فقیر رح یہ مردِ درویش سوات کے موضع فتح پور کا رہنے والا تھا۔ بچپن ہی سے اہلِ اللہ کی صحبت کا شائق تھا۔ اصل نام سعد اللہ خان تھا تاہم بعد میں "مستان مُلا" اور "سرتور فقیر" کے لقب سے مشہور ہوا۔ ابتدائی دینی تعلیم کے بعد دس سال تک افغانستان کی مشہور زیارت "مزار شریف" میں مقیم رہا۔

وہ مشہور مجاہد اور عالم دین نجم الدین عرف ہڈہ مُلّا صاحب کا ارادت مند تھا۔ ۱۸۹۷ء میں علمائے اسلام نے جہاد کا فتویٰ دیا تو وہ بھی میدانِ عمل میں نکلا اور کونٹر، باجوڑ اور اتمان خیل کے علاقوں میں تبلیغی دورے کرتا رہا۔ جولائی ۱۸۹۷ء میں وہ سوات کے قصبہ تھانہ میں وارد ہوا تو لوگ اُس کی کرامات دیکھ کر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ جہاں تقریر کرتا انگریزوں کے خلاف آگ لگا دیتا

اور لوگ اپنے کھیت اور اپنے گھر بار چھوڑ کر غزا کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ جلد ہی سارا علاقہ یوسفزئی اس کے جھنڈے تلے متحد اور متفق ہو گیا۔ مالاکنڈ اور چکدرہ میں اس کی کمان میں عوام نے انگریزی سامراجیت پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ اُسے ہوش ہی تو آگیا۔

سرتور فقیرؒ کی تقریروں نے یوسف زئی جوانوں میں وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ وہ موت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایک معرکے میں ایک انگریز سوار نے ایک پٹھان مجاہد پر نیزے سے ایسا کاری وار کیا کہ نیزہ پٹھان کے جسم میں دھنس گیا۔ سوار زور لگانے پر بھی نیزہ نہ نکال سکا اور جلدی میں زخمی غازی کو اسی طرح چھوڑ کر چلتا بنا ـــــ لیکن اس کے پیٹھ پھیرتے ہی بہادر پٹھان نے خود اپنے جسم سے نیزہ نکال کر پرے پھینک دیا۔ اٹھا اور اپنی تلوار لے کر انگریز پر اس شان سے جھپٹا کہ اُسے وہیں ڈھیر کر دیا ـــــ اتنے میں ایک دوسرے انگریز افسر نے پستول سے وار کر کے اس بہادر کو شہید کر دیا۔

مُلّا مستان سے انگریز اتنے چڑتے تھے کہ اپنی تصانیف میں ہر جگہ اسے "دیوانہ مُلّا" یا "MAD MULLAH" لکھا ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک یہ دیوانگی فرزانگی سے ہزار درجہ زیادہ قیمتی ہے۔ مُلّا صاحب صرف مبلغ ہی نہ تھے عملاً مجاہد بھی تھے۔ خود بھی شریک جہاد ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ اس دوران زخمی ہوئے اور اُن کی دو انگلیاں کاٹ دینی پڑیں۔ ان کٹی ہوئی انگلیوں کو عوام نے عقیدت اور احترام سے دفن کر کے اُن پر جھنڈا گاڑ دیا۔ لوگ احتراماً جاتے اور اس مردِ مجاہد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے۔

بتایا جاتا ہے کہ مُلّا مستان کچھ عرصہ تک اجمیر شریف میں بھی رہے تھے۔ بڑے عابد و زاہد انسان تھے اور اپنی کرامتوں کی وجہ سے عوام میں بڑے ہر دلعزیز۔

سردار خان جس نے اس غزا میں شہادت پائی۔ ڈھیری جو لگرام کے قبیلہ لونڈہ خیل یا اوریا خیل کا چشم و چراغ تھا۔

اخون خان عوامی شاعر تھا اور سرتور فقیرؒ کا انتہائی ارادت مند، اس نے اس جنگ کا منظوم حال بھی لکھا ہے۔

مقرب خان اور صدیق خان بائیزئی کے نوجوان تھے۔ انتہائی شکیل اور بڑے بہادر۔ انتہائی بہادری کے کارنامے انجام دینے کے بعد دادِ وغا دیتے ہوئے راہِ اسلام میں جان دی۔

میاں گل آف سوات سید و بابا علیہ الرحمتہ کے دو صاحبزادے، جنہیں احتراماً میاں گل کہا جاتا ہے، شریک جہاد تھے۔ عالم باعمل تھے، جدھر جاتے صفوں کی صفیں اُلٹ دیتے۔ درویشانِ خدامست بھی تھے اور مردانِ میدان بھی۔ شاعر محمد جان نے ان کا حال لکھا ہے۔

سعداللہ جان ڈھیری جولگرام کا ایک نامور خان تھا جو ناموس اسلام پہ اپنی جان قربان کر گیا۔

خطاب خان خارگزو کا رہنے والا تھا۔ نقارہ نہایت جوش سے بجاتا تھا اور میدانِ جہاد میں جانبازوں کا خون گرماتا تھا

یوسف خان ڈھیری جولگرام کا رہنے والا تھا۔ غزار پہ جانے سے پہلے ایک پہاڑی کو اپنی قبر کے لئے پسند کیا۔ شہید ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق اُسے وہیں دفن کیا گیا۔

مدین کا گمنام شہید مدین کا رہنے والا ایک پاکباز جس کا نام معلوم نہیں۔ تاہم لوگ اسے "چوڑی شہید" کے نام سے پکارتے ہیں، وہ بہادر تھا جس نے چکدرہ میں انگریزی فوج کا وقار خاک میں ملا دیا۔ انتہائی دلیر تھا اور بے حد مدبر ـــــ میدانِ جنگ میں اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔

عارف شاہ ولد احمدی ڈھیری جولگرام کا گوجر تھا۔ اس بہادری سے لڑا کہ جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ شہید ہوا تو انگریزوں نے لاش جلا دی۔ تاہم جسم کے جو حصے جلنے سے بچ رہے وہ احتراماً دفن کر دیئے گئے۔

صحبت گوجر ساون کا مہینہ تھا۔ سخت گرمی تھی۔ صحبت گوجر گھاس کاٹ رہا تھا کہ لوگوں کو غزار پہ جاتے ہوئے دیکھا۔ بے ساختہ اُٹھا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔ صرف ایک "لور" (درانتی نما خنجر) پاس تھی۔ اُسی سے سپلائی کے سب سے بڑے انگریز افسر کو خاک و خون میں تڑپا دیا کئی دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد خود بھی شہادت کا درجہ پا گیا۔

تنگئی کا خانزادہ نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اپنے علاقے کا سرکردہ اور متمول خان تھا۔ غزار میں شہید ہوا ـــــ خار میں مقبرہ ہے، "بڑے شہید" کے نام سے موسوم ہے۔

سعادت خان شہید

خار کا رہنے والا تھا۔ اس کا ایک ساتھی سربالی خان بھی تھا۔ دونوں کے مزارات خار میں ہیں۔

علاوہ ازیں سکندر شاہ، پور دل خان، عبدالجبار کاکا، مجاہدین، میر اعظم خان، ابدالی خان، شاہنو ولد خوشحال، امیر خان خوازہ خیل اور چند دوسرے شہیدوں کے نام بھی معلوم ہوئے ہیں۔ یہ صرف تھوڑے سے نام ہیں۔ غازی کسی باقاعدہ فوج کے رکن تو نہ تھے کہ ان کے نام کسی باقاعدہ رجسٹر میں درج ہوتے، وہ تو اللہ کے سپاہی تھے اور اللہ ہی کی راہ میں جان قربان کر گئے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ —— ان گمنام مجاہدوں کے لئے اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

ان سرحدی معرکوں سے یہ سبق ملتا ہے کہ اسلام ہی وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بدولت اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمان کو وہ جوش اور جذبہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ توپوں اور ٹینکوں سے ٹکرا جاتا ہے اور حمیت و شجاعت کے بڑے بڑے کارنامے بجا لا سکتا ہے۔ وہ دن انتہائی مبارک ہوگا۔ جب خانہ جنگیوں میں اپنی صلاحیتیں تلف کرنے کی بجائے سرحدی مجاہدوں کی تمام تر توانائیاں غلبۂ اسلام کے لئے وقف ہو جائیں۔

مہمندوں کا جوش و خروش

۷ راگست ۱۸۹۷ء کا دن تھا اور چار بجے سہ پہر کا عمل۔ پشاور سے اٹھارہ میل دور شبقدر کے انگریزی قلعے کے لوگ آرام کر رہے تھے۔ باہر لشکر گڑھ کی منڈی اور بازار میں بھیڑ بھاڑ تھی۔ بنیے سیٹھ دن بھر کی کمائی سے تجوریاں بھر چکے تھے اور اب بہی کھاتے لکھ رہے تھے۔ سبھی لوگ اپنے اپنے معمول کے مطابق کام کاج میں لگے تھے کہ اچانک ایک شور اٹھا اور چار ہزار مہمند مجاہدوں کا لشکر نمودار ہوا۔ قلعے میں خطرے کا بگل بجا —— بارڈر پولیس کے سپاہیوں نے مہمند غازیوں پر بندوقیں تان لیں۔ تاہم مہمندوں کا سیلاب رکنے میں نہ آیا۔ وہ دندناتے ہوئے بازار اور منڈی میں داخل ہو گئے —— انہیں آتا دیکھ کر ہندو سکھ سیٹھ دوڑے کہ قلعہ میں پناہ لے کر جانیں بچائیں لیکن قلعے تک پہنچنے سے پہلے ہی مہمند لشکر نے انہیں آن لیا۔ بڑی افراتفری مچی، بہت سے سیٹھ بھاگتے ہوئے مہمندوں کی گولیوں کا نشانہ بنے اور مہمند غازیوں کی کافی تعداد بھی بارڈر پولیس کی فائرنگ سے جان بحق ہوئی۔

شام کو یہ خبر پشاور پہنچی تو انگریز کا ماتھا ٹھنکا۔ اس سے پہلے میزار (وزیرستان) اور مالاکنڈ میں بغاوت ہو چکی تھی۔ سرکاری فوجیں اُدھر سے فارغ ہونے نہ پائی تھیں کہ اب شبقدر پر افتاد آن پڑی۔ مہمند غازیوں کے خلاف فوری کمک پہنچانا ضروری تھا اس لئے بریگیڈیر جنرل ای۔ آر ایلس (ELLIS) توپ خانے سے لیس کئی رجمنٹ فوج کے ہمراہ شبقدر روانہ ہو گیا۔ راہ میں دریائے کابل کو پار کرنے کا مسئلہ تھا۔ ان دنوں دریا پر پُل نہ تھا۔ کشتیوں سے دریا کو پار کرنا پڑتا تھا۔ تاہم جیسے بھی ہوا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ انگریز کا لشکر رات کو شبقدر پہنچ گیا لیکن ان کے پہنچنے سے قبل ہی مہمند اپنا کام کرنے کے بعد اپنی اپنی پہاڑی کمین گاہوں کو جا چکے تھے۔

شبقدر کا قلعہ سکھوں کا تعمیر کردہ ہے ـــــ پچاس فٹ اونچی دیواریں ہیں۔ مہمندوں کے پاس ایک بھی توپ نہ تھی ـــــ چنانچہ قلعہ تسخیر ہوتا تو کیسے؟ قلعہ کے مورچوں سے تھوڑے سے سپاہی بھی حملہ آور کو سخت نقصان پہنچا سکتے تھے۔ چنانچہ اس جھڑپ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بہت سے مہمند شہید اور زخمی ہوئے۔

انگریز کو پورا یقین تھا کہ حملہ نجم الدین ہڈہ ملّا صاحبؒ کی ایماء پر ہوا ہے۔ ہڈہ ملّا اُن دنوں بالائی مہمند میں جروبئی کے پاس مقیم تھے جو افغان سرحد کے بالکل قریب تھا۔ اس لئے ان پر ہاتھ ڈالنا فرنگی کے بس کی بات نہیں تھی۔ انگریز کو یہ بھی علم تھا کہ مالاکنڈ اور سوات کا جہاد بھی ہڈہ ملّا اور اُن کے ارادت مندوں کے کہنے پر ہوا ہے تاہم وہ فوری طور پر ہڈہ مُلّا کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے قابل نہ تھے ـــــ عام خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے مہمندوں نے شبقدر پر حملہ محض اس لئے کیا ہو کہ انگریز کی توجہ سوات اور مالاکنڈ کے محاذ سے ہٹ جائے لیکن ایک اعتبار سے یہ حملہ بعد از وقت اس لئے تھا کہ ۷ راگست تک انگریز اس مہم سے نمٹ چکے تھے اور اب ان کی چار بریگیڈ فوج ہاتھ پر ہاتھ دھرے آرام کر رہی تھی۔ بعض لوگوں کی رائے میں شبقدر پر حملے میں کسی وجہ سے تاخیر ہو گئی تھی۔ ورنہ چاہیئے تو یہی تھا کہ قبائلی لشکر مالاکنڈ، چکدرہ، درگئی، لنڈاکئی، پر بیک وقت حملہ کرتے۔ اس طرح دشمن کی طاقت تقسیم ہو جاتی اور غازیوں کی کامیابی یقینی ہوتی۔ لیکن جانے کیا وجوہ تھیں کہ شبقدر پر حملہ اتنی تاخیر سے ہوا۔

۸ راگست کو پشاور سے مزید فوج شبقدر پہنچ گئی ـــــ جاتے ہی انگریز جرنیلوں نے میٹنگ

کی اور اِدھر اُدھر مخبر بھیج کر مہمند لشکر کی قوت کے بارے میں پتہ کرایا ـــــ ۹ راگست کی صبح کو لفٹیننٹ کرنل وُڈ (WOOD) نے جسے شبقدر کی مہم کا انچارج بنایا گیا تھا۔ قلعہ سے نکل کر اپنی صفیں ترتیب دیں۔ اس کے پاس بارہ سو سوار اور پیادہ سپاہیوں کے علاوہ چار بڑی توپیں بھی تھیں۔ قبائلی لشکر اس وقت شبقدر سے میل ڈیڑھ میل دور ایک پہاڑی پر مورچے سنبھالے ہوئے تھا۔ مُلّا ہڈہ خود ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ کرنل وُڈن کے دستے نے حملے کی ابتدا کی۔ ابھی صبح کے چھ ہی بجے تھے کہ فرنگی غازیوں کے سر پہ پہنچ گئے۔ تاہم مہمند غازی پورے استقلال سے ڈٹے رہے، انہوں نے انگریزی فوج کی بھرپور مزاحمت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل وُڈن نے پسپائی ہی کو غنیمت سمجھا اور اپنے سپاہیوں کو مورچوں سے ہٹا کر واپس شبقدر لے گیا۔

پشاور سے آنے والی فوج کا دوسرا دستہ جنرل ایلس کی کمان میں تھا۔ وہ اس واقعہ کے فوراً ہی بعد محاذ پہ پہنچ گیا اور توپ خانے سے گولے برسانے کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی فرنگی رسالے کے نیزہ بازوں نے آگے بڑھ کر غازیوں پہ حملہ کیا۔ مہمند پاپیادہ لڑ رہے تھے، ابتداء میں انہوں نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ رسالے کے کمانڈنگ افسر ایٹکن (ATKINS) اور لفٹیننٹ چین (CHEYNE) کے گھوڑے مہمند مجاہدوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ قریب تھا کہ بنگالی رسالہ شکست کھا کر بھاگ نکلتا کہ پنجاب انفنٹری کے دستے رسالے کی مدد کو پہنچ گئے۔ اس تازہ دم کمک کے پہنچنے سے جہاں انگریزوں کی جان میں جان آئی وہیں مہمندوں کی حالت پتلی ہوتی گئی۔ اتنی بڑی فوج کے دباؤ کے تحت انہوں نے عقبی مورچوں کی طرف ہٹنا شروع کر دیا اور دوپہر تک واقعات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ شبقدر کے نواح میں انگریز اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس جھڑپ میں اِن کے دس بارہ افسر ہلاک اور زخمی ہوئے اور سینکڑوں سپاہی ہلاک ہو گئے۔

اس سے پہلے ۱۸۵۲ء اور ۱۸۶۳ء میں بھی مہمندوں کا جہاد اسی پہاڑی مورچے سے شروع ہوا تھا جس سے ۱۸۹۷ء کے جہاد کی ابتداء ہوئی۔ پہلے ہی دن کی جھڑپوں کے نتیجے میں جنرل ایلس اتنا بوکھلا گیا کہ اس نے پشاور، نوشہرہ، مردان، راولپنڈی کی چھاؤنیوں سے مزید کمک طلب کر لی۔ چند دنوں کے اندر اندر شبقدر کے گرد و نواح میں فوج ہی فوج نظر آنے لگی۔ بہت بڑی جمعیت کے ساتھ انگریز نے پھر حملہ کیا۔ اب کے مہمند بہت پیچھے ہٹ چکے تھے۔ اس لئے انگریزوں کو

زیادہ مزاحمت کا سامنا کرنا نہ پڑا۔ رفتہ رفتہ مہمند لشکر بالائی علاقے کو کوچ کر گیا۔

مہمند ایک چھوٹا اور غریب قبیلہ ہے۔ اس کے پاس نہ پیسے تھے نہ اسلحہ اور دوسرے وسائل۔ وہ تو محض اللہ کی راہ میں مصروفِ جہاد تھے، اُنہیں اللہ کی امداد پر بھروسہ تھا کہ اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کی امداد کا یقین دلا رکھا ہے ـــــ اللہ نے مہمند مجاہدوں کی پوری نصرت اور امداد فرمائی چنانچہ ان خشک علاقوں میں جہاں شاذ و نادر ہی کبھی سال میں ایک دو بار بارش ہوتی ہے۔ پانچ دن رات وہ طوفانی بارش ہوئی جس کی مثال علاقہ مہمند میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔ بارش اور سیلاب سے سارا علاقہ دلدل بن گیا۔ فوجیوں کے خیمے پانی میں تیرنے لگے۔ ان کا گولہ بارود بھیگ کر ناکارہ ہو گیا۔ ان کی بھاری توپیں کیچڑ میں دھنس کر رہ گئیں اور اس طرح انگریز کی پیش قدمی رُک گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ مچنی کے مقام پر دریائے کابل کا پُل سیلاب کی نذر ہونے سے بچ رہا ورنہ انگریزی لشکر پر پسپائی کا راستہ بھی بند ہو جاتا۔

بارش تھم جانے کے بعد بھی کئی دن تک سرکاری فوج گندھاؤ کی وادی میں پڑی رہی۔ جنرل صلاح مشوروں میں لگے رہے کہ اگلا اقدام کیا ہو۔ مزید کمک بھی انہیں دھڑا دھڑ پہنچتی رہی۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ فوج دو حصّوں میں تقسیم کی جائے اور جنوب کو شبقدر کی راہ سے اور شمال کو علی کندی کے درّے سے بیک وقت مہمند علاقے پر حملہ کیا جائے تاکہ مہمندوں کا زور مکمل طور پر ٹوٹ جائے۔

۲۳ اگست کا دن اس منصوبے کے لئے مقرر ہوا۔ تاہم عین اسی دن انگریز پر ایک اور افتاد آن پڑی۔ سمانہ کے علاقہ میں اورکزئی اور آفریدی اُن کے خلاف میدانِ جہاد میں نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے سمانہ رینج کی فوجی چوکیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اب شبقدر کے محاذ پر فرنگی حملوں میں پہلی سی شدت نہ رہی اور اسی پر اکتفا کیا گیا کہ سرکاری فوجیں علاقہ مہمند کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر واپس شبقدر چلی جائیں۔

جب پورا صوبہ سرحد فرنگی سامراج کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور ہر جگہ سے شورش کی خبریں آنے لگیں تو انگریز کو اور زیادہ فوجوں کی ضرورت پڑی۔ ہندوستان بھر کی تمام چھاؤنیوں سے آئی ہوئی فوجیں پہلی ہی صوبہ سرحد کے کسی نہ کسی محاذ پر مصروفِ جنگ تھیں۔ اب آخر اور فوج کہاں سے آتی ـــ؟ بالآخر ہندوستان کے راجوں مہاراجوں سے فوجی مدد مانگی گئی۔ ہندو سکھ راجوں مہاراجوں نے

موقع غنیمت سمجھا۔ اس طرح ایک تو انہیں انگریز بہادر کی خوشنودی حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ آتا تھا۔ چنانچہ گوالیار، جے پور، پٹیالہ، کشمیر اور دوسری ہندو سکھ ریاستوں کے فوجی دھڑا دھڑ سپیشل ٹرینوں کے ذریعے پشاور اور نوشہرہ پہنچنے لگے۔ مرہٹوں کا راجہ سندھیا اور پٹیالہ کا سکھ مہاراجہ تو مسلمان دشمنی میں یہاں تک آگے بڑھے کہ خود سرحدی علاقوں میں پہنچ کر اپنی فوجوں کی کمان کرنے کی پیش کش بھی کر دی۔

بالآخر یہ سکیم طے پائی کہ دو بریگیڈ فوج جنرل ایلیس کی قیادت میں پشاور اور شبقدر کی طرف سے علاقۂ مہمند پر یلغار کرے جبکہ دو ڈویژن فوج جنرل سر بائنڈن بلڈ، بریگیڈیر جنرل وڈہاؤس اور بریگیڈیر جنرل جیفری کی کمان میں دریائے پنجکوڑہ کے ساتھ ساتھ مالاکنڈ کی جانب سے پیش قدمی کرتے ہوئے علاقۂ مہمند کے قلب تک جا پہنچے۔

تاریخ عالم میں ایک مہذب قوم کے لئے اس سے بڑھ کر شرمناک بات اور کیا ہوگی کہ وہ پندرہ ہزار مسلح سپاہیوں کے ساتھ اپنے ہی ملک کے اس علاقے پر دھاوا بول رہی تھی۔ جس کی کل آبادی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سمیت اٹھارہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ انگریزی فوج کی تیاریوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا گویا برطانوی سرکار جرمن یا روس کی فوجوں سے ٹکر لینے چلی ہو۔

۵ ستمبر کو شملہ سے وزارتِ خارجہ کا سرکاری اعلان جاری ہوا جس میں مہمندوں کے خلاف فوج کشی کے منصوبے کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اعلان کے ہوتے ہی جنرل سر بائنڈن بلڈ کا لشکر جرار جس میں مہاراجہ سندھیا، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ جودھپور اور مہاراجہ جے پور بنفس نفیس اپنی اپنی فوجوں کی کمان سنبھالے موجود تھے) مالاکنڈ سے روانہ ہوا اور سڈو کے مقام سے دریائے پنجکوڑہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ وہ منڈا سے خالوزئی جانے والی سڑک کے ذریعے نواگئی وارد ہوئے جہاں سے شمال اور شمال مشرق کی طرف آگے بڑھ کر علاقہ مہمند کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔

نواگئی سے ایک تنگ راستہ جروبئی کو نکلتا ہے اور جروبئی وہی مقام تھا جہاں اُن دنوں مُلّا صاحب ہڈہ کا "ہیڈ کوارٹر" تھا۔ جروبئی فرنگی کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہا تھا اور دُنیا کی یہ سب سے طاقتور سلطنت زور اور زر دونوں کی مدد سے مسلمان مجاہدوں کو ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔

۱۱ ستمبر تک انگریزی فوج کے دونوں دستے دو مختلف سمتوں سے سرزمین مہمند میں داخل ہو چکے تھے۔ منصوبہ کے مطابق ۱۸ ستمبر کو لوکر بیلی کے مقام پر دونوں فوجوں کو جمع ہونا تھا اور دونوں کی مشترکہ کمان جنرل بلڈ نے سنبھالنی تھی۔

جنرل جیفری ۱۳ ستمبر کو اپنے لاؤ لشکر سمیت روانہ ہوا۔ نواگئی کے علاقے میں تو اس لئے خیر گزری کہ وہاں کا خان انگریزوں کا حلیف تھا۔ لیکن ۱۴ ستمبر کو جب جیفری کا بریگیڈ عنایت کلی کے مقام پر خیمہ زن ہوا تو ساری رات اس پر گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ مہمند نشانہ باز اور باجوڑی غازی ایسی مہارت سے نشانہ لگاتے کہ چند گھنٹوں کے اندر دو انگریز افسر نو دیسی افسر اور بہت سے سپاہی لقمۂ اجل بن گئے اور سو کے قریب گھوڑے مارے گئے، غازیوں نے یہ حملہ کمال مہارت سے کیا۔ دور ہی سے دشمن کو نشانہ بناتے رہے اور خود دشمن کی زد سے بچے رہے۔

۱۵ ستمبر کی صبح کو انگریزی دستوں نے چاروں طرف سے مہمندوں پر یلغار کر دی۔ ایک ایک پہاڑی ٹیلے کی تلاشی لی گئی۔ ۲۱ کے قریب غازی جوان کی زد میں آئے، گولی سے اڑا دیئے گئے۔ جنرل جیفری اور جنرل وڈ ہاؤس کے بریگیڈ الگ الگ راستوں سے پیش قدمی کر رہے تھے لیکن مسلمان مجاہدوں کی مزاحمت کا یہ عالم تھا کہ خود انگریز کمانڈروں نے تسلیم کیا کہ

"اگر اس موقع پر صرف ایک بریگیڈ مہمندوں کے خلاف کارروائی کرتا تو یہ مہم قطعاً ناکام ہو جاتی ——"

جمعرات ۱۶ ستمبر کو انگریزوں نے ماموند کے علاقہ پر بھرپور کیا۔ غازیوں کے پاس توپیں تو کجا اچھی ساخت کی بندوقیں بھی نہ تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے صرف ایک دن کے معرکوں میں انگریزی فوج کا ایک بریگیڈ یا نو بڑے بڑے افسر اور دو سو سے زیادہ سپاہی ہلاک کر دیئے۔ انگریزوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ "امبیلہ کی لڑائی (۱۸۶۳ء) کے بعد کسی لڑائی میں ایک دن کے دوران سرکاری فوج کو کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچا تھا جتنا ۱۶ ستمبر ۱۸۹۷ء کو پہنچا"

اس دن کی تفصیلی روداد یہ ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی انگریزی لشکر عنایت کلی سے وٹیلائی کی وادی کو چل پڑا تھا۔ جنرل جیفری نے انگریزی حملہ آور لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ فرنگی دستے جدھر جاتے مہمند دیہات کو تباہ کرتے جاتے۔ بارہ بجے دوپہر تک تو انہیں کوئی مزاحمت

پیش نہ آئی لیکن دوپہر کے بعد مہمندوں کی ایک جمعیت اچانک نمودار ہوئی اور اس نے ۳۵ ویں سکھ رجمنٹ کو گھیرے میں لے لیا۔ اس موقع پر مہمند مجاہدوں نے بہت شجاعت دکھائی وہ توپوں اور مشین گنوں کی فائرنگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمن کے قلب میں گھس گئے اور دست بدست لڑائی کا آغاز کر دیا ـــــ ریوالوروں اور خنجروں کا استعمال ہونے لگا۔ اس اثناء میں ایک پہاڑی سے وہ مہمند جن کے پاس بندوق اور تلوار تک نہ تھی۔ انگریزی لشکر کے عقب پر پتھر برسانے لگے۔ اس محصور سکھ دستے (جو جیفری کی کمان میں تھا) کی تباہی کو دیکھ کر فوج کے باقی دو دستوں نے (جو کرنل ویوین (VIVIAN) اور میجر کیمپبل (CAMPBELL) کی کمان میں تھے) حوصلہ ہار دیا اور کیمپ کی طرف پسپائی اختیار کر لی۔ تاہم تھوڑی دیر ستانے کے بعد انگریز نے پھر اپنی طاقت کو مجتمع کیا اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے مہمندوں پر زور دار حملہ شروع کر دیا۔ اس پر مہمند اپنے عقبی مورچوں کو چلے گئے اور موقع بموقع دشمن پر آگ برساتے رہے۔ ڈھائی بجے کے قریب انگریز ذرا سنبھلے اور انہوں نے مہمندوں کے ایک گاؤں کو نذرِ آتش کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس کے بعد پھر انہوں نے اپنے کیمپ کا رُخ کیا لیکن مہمند راہ میں چٹانوں کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔ وہ تاک تاک کر گولی چلاتے اور انگریز سپاہی زخمی ہو ہو کر زمین پر گرتے ـــــ اس جہاد میں پھر قدرت نے ان مردانِ مجاہد کی امداد کی ـــــ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ـــــ کالے بادل چھا گئے شام سے پہلے ہی گھُپ اندھیرا چھا گیا اور انگریزی لشکر کا پہاڑی گھاٹیوں، برساتی نالوں اور پگڈنڈیوں سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ بارش کے دوران بھی جو بھی بجلی چمکتی اور گورے سپاہیوں کی سنگینیں چمکتیں تو مہمند نشانہ باز گورا سپاہیوں پر گولی چلا دیتے۔ ساڑھے آٹھ بجے شام کو فرنگی لشکر گرتا پڑتا اپنے کیمپ پہنچا تو گوروں کی جان میں جان آئی۔

اس لڑائی کے دوران ایک موقع پر سکھوں کی ایک کمپنی نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر مورچے قائم کرنے کی کوشش کی لیکن چٹانوں کی اوٹ سے نکل کر مہمند غازی ان پر ٹوٹ پڑے اور ایسی خطرناک دست بدست لڑائی شروع ہوئی کہ انگریز کمانڈر کیپٹن رائڈر (RYDER) لفٹیننٹ گننگ (GUNNING) کئی دیسی افسر اور بیسیوں سپاہی ہلاک اور زخمی ہو گئے۔

باد و باراں کا طوفان اس دن اتنا مہیب تھا کہ انگریز لشکر کا اپنے باقی ماندہ دستوں سے رابطہ

ٹوٹ گیا۔ جو گورا سپاہی طوفان کے باعث راستے سے بھٹک گئے تھے، مہمندوں نے انہیں چُن چُن کر گولی کا نشانہ بنایا۔ خود بریگیڈیر جنرل جیفری کوشش بسیار کے باوجود رات گئے تک واپس کیمپ کو نہ پہنچ سکا۔ گرتا پڑتا وہ تھانہ نامی گاؤں میں پہنچا اور اپنے سپاہیوں کو وہیں شب بسری کا حکم دیا۔ فوج نے اپنے اردگرد خندقیں کھود لیں اور جیسے تیسے رات وہیں کاٹی ـــــ تاہم مہمند ان کی نقل و حرکت سے غافل نہ تھے۔ انہوں نے گاؤں کے مکانوں پر مورچے بنا کر فرنگی فوج پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ گولیوں سے جنرل جیفری کا سر پھٹ گیا، اس کے ساتھیوں میں سے بیسیوں افسر اور سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ بعد میں گورا اور گورکھا سپاہیوں اور سکھ لڑاکوں نے بڑا حملہ کر کے بمشکل تمام اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کو مہمندوں کے نرغے سے نکالا۔

۱۷ ستمبر کو کوشش بسیار کے باوجود انگریز لشکر عنایت کلی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۸ ستمبر کی صبح کو چھ بجے دمودلہ نامی گاؤں پر چڑھائی کی گئی۔ ۳۵ ویں سکھ رجمنٹ کے کافی آدمی اس معرکے کی نذر ہو گئے تاہم انگریز اپنی جند پوری کر کے رہا۔ انہوں نے ساری بستی کو تباہ کر دیا ـــ محض اتنی سی بات کے لئے بھی انہیں کم سے کم بیس انگریز افسروں اور سپاہیوں کی قربانی دینی پڑی۔

۱۹ ستمبر کو ماموند قبیلے نے جرگہ بھیجا۔ لیکن جرگے نے نہ تو ۱۶ ستمبر کی چھینی ہوئی بندوقیں واپس کرنے کی شرط مانی، نہ کوئی اور پابندی قبول کی ـــــ انگریز ان لوگوں کی جرأت ایمانی پر دم بخود تھا۔ کہ ماموند جیسا چھوٹا سا قبیلہ، جس کے لڑاکا جوانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ کس دلیری سے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت برطانیہ کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ اس دن انگریز نے جس گاؤں کو تباہ کیا اس کا نام "ڈگا ڈیری" تھا۔

۲۰ ستمبر کو انگریز کا لشکر جرار زگئی پہنچا۔ (جو کبھی عمر اخان جندول کا مسکن رہ چکا تھا) گاؤں پر قبضہ کرنے کے بعد اُسے نذرِ آتش کر دیا گیا اور اپنی کامیابی پر نازاں و فرحاں فرنگی فوج خوشی خوشی آگے بڑھنے لگی۔ تاہم ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ ایک گھاٹی میں پہنچتے پر غازیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ان پر بے دریغ گولیاں برسائیں۔ انگریز کپتان کول، لفٹیننٹ کین اور لفٹیننٹ پاور مارے گئے اور بہت سے سپاہی ہلاک یا زخمی ہوئے۔

۲۱ اور ۲۲ ستمبر کی جھڑپوں میں انگریز نے سخت لڑائی کے بعد ڈاگ کے اہم گاؤں پر قبضہ کر

لیا، جہاں سے اُنہیں اناج کا کافی ذخیرہ ہاتھ لگا تاہم اس مقام کو حاصل کرنے کی لڑائی میں انگریزی ذرائع کے مطابق ۱۶ برطانوی افسر اور ۱۵۳ گورا سپاہی ہلاک ہوئے اور دو سو کے قریب مولیشی مارے گئے۔

یہ حشر تو جنرل جیوفری کے بریگیڈ کا ہوا۔ جنرل بائنڈن بلڈ اور جنرل وڈ ہاؤس بھی محفوظ رہنے نہ پائے۔ ان کے بریگیڈ کو بدنائی کے درّہ سے گزرنا تھا۔ ۱۷ اور ۱۸ ستمبر کو تو خیر گزری لیکن ۱۹ اور ۲۰ ستمبر کی درمیانی رات کو انگریز جرنیل اور اُن کے ساتھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے کہ مُلّا صاحب نجم الدین ہڈہ کے غازی اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ان غریب لوگوں کے پاس تلوار کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ تھا۔ وہ بجلی کی تیزی سے کیمپ پر حملہ آور ہوئے اور سوتے ہوئے فرنگی سپاہیوں کے سر پر پہنچ گئے، انہوں نے چُن چُن کر گورا سپاہیوں اور افسروں کو تہ تیغ کیا اور پھر ایک دم کیمپ سے نکل کر اپنے اپنے پہاڑی مورچوں کو چلے گئے یہاں تک کہ صبح ہونے پر مہمند غازیوں کی ایک لاش بھی فرنگی فوجیوں کے ہاتھ نہ لگی۔

دوسری رات (۲۰ اور ۲۱ ستمبر کی درمیانی شب) ہڈہ ملّا کے غازیوں نے پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ انگریزی کیمپ پر شب خون مارا۔ غازی نو بجے سے ایک بجے رات تک انگریزی کیمپ میں مصروفِ قتال رہے اور جو بھی اُن کے سامنے آیا موت کے گھاٹ اُترا۔ انگریزی توپ خانہ کی بے پناہ گولہ باری کے باوجود مجاہدین بے محابا آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ بریگیڈیر جنرل وُڈ ہاؤس بھی غازیوں کے ہاتھوں بچ نہ سکا۔ ایک گولی اُس کی ٹانگ میں لگی اور وہ سخت زخمی ہوا ـــــ دوسرے گورا افسر اور سپاہی بھی سینکڑوں کی تعداد میں ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جنرل بلڈ (BLOOD) نے یہ حال اور یہ تباہی دیکھ کر پورے لشکر کو ہمہ گیر اور بڑے حملے کا حکم دے دیا۔ لیکن قبائلی اپنا مشن پورا کرنے کے بعد اپنے اپنے پہاڑی مورچوں میں پہنچ گئے اور اتنا بڑا فرنگی لشکر اُن کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکا۔

۲۱ ستمبر کو جنرل بلڈ کو پیغام ملا کہ جنرل ایلس اپنی فوج کے ہمراہ شبقدر سے پیش قدمی کرتے ہوئے لکڑئی پہنچ چکا تھا۔ اُس کی دو بریگیڈ فوج کو نسبتاً کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ حلیم زئی نے انگریزوں کی شرطیں مان لی تھیں۔ خرڑپہ اور لختئی کے علاقے سے گزرتے ہوئے انگریز

لشکر نے مہمندوں کے غلّہ، دانہ اور بھُس کے ذخیرے لُوٹ لئے تھے۔ تختی سے نو میل دُور کنگ کے مقام پر صافی مُلّا اپنے دو ہزار مجاہدوں کے ساتھ مورچے سنبھالے ہوئے تھا لیکن ان بچاروں کے پاس بندوقیں تک نہ تھیں۔ اتنے بڑے لشکر سے لڑتے تو کیا لڑتے!

۲۱ ستمبر کو جنرل بلڈ، جنرل ایلیس اور جنرل ویسٹ ماکوٹ (WEST MACOTT) تینوں کی فوجیں لکڑئی میں جمع ہوئیں۔ ان جرنیلوں کا سارا زور اس پر تھا کہ ہڈہ مُلّا صاحب سے بدھنائی کا درّہ خالی کرایا جائے۔ کیا یہ بات کم حیرت انگیز ہے کہ اتنا عظیم لشکر جو کسی پُورے ملک کو فتح کرنے کے لئے کافی تھا۔ ایک مردِ درویش اور اس کے چند ارادت مندوں کے خلاف سرگرمِ عمل ہو ـــــ جنرل ایلیس یہ اعزاز حاصل کرنے کا متمنّی تھا کہ اُسے "فاتحِ جروبئی" کہا جائے۔ جروبئی ہڈہ مُلّا صاحب کا ہیڈ کوارٹر ضرور تھا۔ لیکن کیا فقیر اور کیا فقیر کا ہیڈ کوارٹر ـــــ چند جھونپڑے تھے یا ایک مسجد ـــــ باقی رہے نام اللہ کا ـــــ انگریز فوج ڈرتے ڈرتے وہاں پہنچی تو مجاہدین اسے خالی کر کے کہیں اور جا چکے تھے ـــــ انگریز جرنیل سوچ میں پڑ گئے کہ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اور سینکڑوں افسر اور سپاہی مروا کر کیا وہ محض ایک فقیر کی کُٹیا کو ڈھانے آئے تھے ـــــ؟ تاہم اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برطانوی لشکر پاک افغان سرحد تک پہنچا۔ اسے کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ بلکہ شام کو فرنگی فوج وہاں سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں پہاڑی مورچوں سے اُس پر شدید فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں کئی گورا افسر اور سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اب انگریز کا کام یہ تھا کہ مہمندوں کے گاؤں اور بستیاں تباہ کرے۔ اُن کے بُرج مسمار کر دے۔ چھوٹے چھوٹے قبیلوں سے بزورِ تاوانِ جنگ وصول کرے یا جو کام لشکر و سپاہ سے نہ ہو سکا تھا وہ پولیٹیکل حکام کی چالبازیوں سے انجام پا سکے۔

۲۷ ستمبر کو پولیٹیکل افسر ڈیوس (DAVIS) نے ماموند قوم کا جرگہ بُلایا اور اُس سے تاوانِ جنگ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ قبائلی اُس کی باتوں میں آنے والے کہاں تھے، انہوں نے اپنی روایتی صاف گوئی سے یہ اعلانیہ تسلیم کیا کہ وہ چکدرہ کے جہاد میں شریک تھے اور ساتھ ہی کہا کہ وہ اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے آئندہ بھی سرگرمِ عمل رہیں گے ـــــ انگریز نے اُن پر زور دیا کہ وہ فوج سے چھینی ہوئی بندوقیں واپس کر دیں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ انگریزی کیمپوں پر چھاپے مارتے وقت اُنہیں

بہت سی بندوقیں ملی تو ضرور تھیں لیکن وہ انہوں نے کُنڑ کے غازیوں کو دے دی تھیں۔ پولیٹیکل افسر نے انہیں ۳۰ ستمبر تک کی مہلت دی کہ اس تاریخ تک وہ فرنگی لشکر سے چھینا ہوا اسلحہ واپس کر دیں لیکن ماموند نے پھر بھی پرواہ نہ کی۔ تنگ آکر جنرل جیفری نے ان کے دیہات کو تاخت و تاراج کر دیا۔

یکم اکتوبر کو انگریز لشکر نے آگرہ کے گاؤں پر دھاوا بولا۔ سخت معرکہ پڑا۔ دس انگریز افسر اور بہت سے سپاہی ہلاک ہوئے۔ انگریز حملہ کرتے تو پہلے تو اس علاقے پر توپ خانے سے گولے برساتے پھر رسالہ آگے بڑھتا جس کے پیچھے پیچھے پیادہ فوج آتی اور غریب کسانوں کے جھونپڑوں کو تباہ کر دیتی ـــــ قبائلی ان ساری کارروائیوں کے دوران پیچھے ہٹ جاتے اور پہاڑی ٹھکانوں میں پناہ لیتے لیکن جونہی انگریزی فوج کے دستے واپس ہونے لگتے وہ اُن پر اچانک حملہ کر دیتے اور بڑی تباہی مچاتے ـــــ آگرہ کے معرکے میں انگریز کمانڈر اوبرین (OBRYEN) مارا گیا اور سرکاری فوجی رپورٹوں میں ۲۴۵ دوسرے افسروں اور سپاہیوں کی ہلاکت کا اعتراف کیا گیا۔ اس موقع پر بھی اگر انگریز کو تازہ کمک نہ پہنچتی تو شکست اس کا مقدر بن چکی تھی۔

۳ اکتوبر کو جنرل جیوفری نے توپ خانے اور رسالے کی مدد سے بدھلائی کے گاؤں پر حملہ کیا، لیکن وہاں بھی انگریزی لشکر کا پہلا سا حشر ہوا۔

۶ اکتوبر کو کُنڑ کے ایک ہزار مجاہد مہمندوں کی مدد کو پہنچ گئے لیکن اس وقت تک صُلح کی گفت و شنید کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس لئے اپنے وعدوں کا پاس کرتے ہوئے مہمندوں نے اہلِ کُنڑ کو کسی کارروائی کی اجازت نہ دی۔ کافی دن تک یہ حال رہا کہ انگریز مہمندوں سے اپنی من مانی شرطیں منوانا چاہتے تھے لیکن مہمند کوئی شرط ماننے پر آمادہ نہ تھے۔ بالآخر خان آف خار اور خان آف نواگئی نے ثالثی کے فرائض انجام دیئے تب کہیں جاکر صلح نامہ عمل میں آیا اور انگریزی فوج اپنا کھویا ہوا "وقار" بحال کرنے کے بعد واپس اپنی اپنی چھاؤنیوں کو چلی گئی۔

درّۂ خیبر

اگست ۱۸۹۷ء کا مہینہ تھا اور غضب کی گرمی۔ تاہم اس بلا کی گرمی میں بھی چند مسلمان علماء اور اُن کے متعلّم درّہ خیبر اور وادیٔ تیراہ کے ایک ایک مقام پر پہنچ کر تبلیغِ جہاد کا فریضہ انجام دے رہے تھے ـــــ ایسے حالات میں جب انگریز یا دریوپی

ممالک متحد ہو کر خلافتِ اسلامیہ ترکیہ کے خلاف میدان میں نکل آئے تھے مسلمان علما خاموش رہتے بھی تو کیسے۔ ملا سید اکبر اس سلسلے میں پیش پیش تھا، وہ بندۂ خدا جہاں جاتا ایسی تقریر کرتا کہ آگ لگا دیتا ــــ ۱۳ اگست کو اس نے تمام سرکردہ آفریدی اکابر کو خیبر ایجنسی کے مرکزی مقام مسجد باغ میں بلایا ــــ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے عالمِ اسلام کے مسائل پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کے خلاف فرنگی کی معاندانہ چالوں کی تفصیل بیان کی۔ اس نے بتایا کہ ان حالات میں جب ملتِ اسلامیہ کا ناموس خطرے میں ہو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا بہت بڑا قومی جُرم ہے ــــ آفریدی قبائل کے تمام ملکوں نے اعلانِ سید اکبر کا ساتھ دیا۔ جہادِ مقدس کا اعلان کر دیا گیا اور درّہ خیبر، تیراہ، میران زئی، اورک زئی اور آدم خیل کے جوان سر پر کفن باندھ کر انگریز سے ٹکر لینے نکل کھڑے ہوئے۔

آفریدی جرگے نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مالاکنڈ اور سوات کے لوگوں کے خلاف فوجی کارروائیاں بند کر دے اور سمانا، جمرود اور شاہ گئی کے قلعوں سے اپنی فوجیں نکال لے۔ انگریز بظاہر تو یہ شرائط ماننے پر تیار نہ ہوا لیکن دل ہی دل میں ڈرنے لگا کہ کہیں اس کے سپاہی مجاہدین کے نرغے میں نہ آجائیں۔ چنانچہ اس نے اس اٹھتے ہوئے طوفان کے پیشِ نظر پہلے تو لنڈی کوتل کی چھاؤنی سے اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر بارٹن (BARTON) اور گورا فوج کو واپس پشاور بلا لیا اور صرف خیبر رائفلز کے دستے وہاں رہنے دیئے۔ پھر جمرود میں اپنے دفاعی انتظامات مضبوط بنانے کی غرض سے جنرل ایلس (کمانڈنگ، پشاور ڈویژن) نے مزید سپاہی اور توپ خانہ وہاں بھیج دیا۔ خیبر رائفلز کی کمان اُن دنوں کرنل سردار محمد اسلم خان سدوزئی کے ہاتھ میں تھی، انہوں نے اپنی چار پلٹنیں جمرود پہنچا دیں تاکہ متوقع آفریدی حملے کی روک تھام ہو سکے جب کہ خیبر رائفلز کے باقی دستے قلعہ شاہ گئی اور لنڈی کوتل سرائے کی حفاظت پر متعین کر دیئے۔ پھر اس خدشہ کے پیشِ نظر کہ کہیں آفریدی لشکر پشاور کا رُخ نہ کر لے پشاور چھاؤنی میں بھی سپاہیوں کی نفری میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔

۲۱ اگست کو آفریدی لشکر جمع ہونے شروع ہوئے۔ آفریدی قوم کے آٹھ قبیلوں میں سے چھ نے اپنے اپنے جوان میدان میں اتار دیئے۔ آدم خیل چونکہ درّہ کوہاٹ میں آباد ہیں۔ اس لئے محاذِ خیبر میں عملی حصّہ نہ لے سکے۔ خیبری قبائل میں سے صرف ککی خیل قبیلہ اپنے سردار ملک امین خان کے کہنے پر اس متحدہ لشکر میں شریک نہ ہوا۔

اُدھر جنوب میں اورک زئی اور تیراہی مجاہد بھی جوشِ جہاد سے سرشار باطل سے پنجہ لڑانے نکل کھڑے ہوئے۔ تاہم چونکہ دور دراز پہاڑی سلسلوں میں آباد مختلف قبائل کے درمیان کوئی رابطہ تھا نہ سلسلۂ مواصلات۔ ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ پہنچانے کے لئے آدمی دوڑائے جاتے تو انہیں منزل تک پہنچنے میں ہفتے لگ جاتے، اس لئے بیک وقت فرنگی کے خلاف کارروائی نہ ہو سکی۔ خیبری اس انتظار میں رہے کہ حملے میں پہل اورک زئی کریں جب کہ اہلِ تیراہ یہ دیکھتے رہے کہ خیبری قبائل کوئی حرکت کریں تو وہ بھی جہاد کا آغاز کر دیں۔ اس طرح دیر ہوتی گئی ـــــ آفریدی حملہ میں تاخیر واقع ہو گئی جس سے انگریز کو تیاری کا موقع ہاتھ آگیا ورنہ اگر مالاکنڈ کے غزاء کی طرح خیبری اور تیراہی بھی ایک دم حملہ کر دیتے تو دشمن کے قدم اکھڑنے میں دیر نہ لگتی۔

بہرحال ۲۳ اگست کو آفریدی جانباز حرکت میں آگئے اور انہوں نے علی مسجد اور فورٹ ماڈ (جو جمرود سے کچھ میل جنوب کو ہے) پر ہلہ بول دیا۔ ایک دوسرا قبائلی دستہ الاچی کے راستے علی مسجد کے قلعہ (شاہ گئی) پر ٹوٹ پڑا۔ اگرچہ قلعہ کے دفاعی انتظامات کافی مستحکم تھے تاہم خیبر رائفلز کے سپاہیوں نے اپنے ہی آفریدی بھائیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا اور قلعہ غازیوں کے حوالے کر دیا۔ اس قلعے سے حُریت پسندوں کو بہت سی بندوقیں اور گولی بارود ہاتھ آیا۔ انہوں نے اسلحہ اور سامان نکال لینے کے بعد قلعہ کو آگ لگا دی اور نعرے مارتے ہوئے فورٹ ماڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ قلعہ اگرچہ بہت چھوٹا ہے تاہم اپنے محلِ وقوع کے لحاظ سے ایک عوامی لشکر کے لئے ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس وقت قلعے میں انگریز کی طرف سے پچاس ساٹھ سپاہی رہتے تھے جب کہ حملہ آور آفریدی لشکر میں ہزاروں افراد شامل تھے۔ اس لئے محصورین نے خوف کے مارے کوئی حرکت نہ کی۔ اُدھر حملے کی خبر ملتے ہی جمرود سے توپ خانہ رسالہ اور گورا فوج فورٹ ماڈ کو روانہ کیا گیا۔ تاہم راستہ دشوار گزار تھا، توپ خانے کا وہاں پہنچنا آسان نہ تھا۔ پھر توپ خانہ اور رسالہ پہنچا بھی تو کوئی مؤثر کارروائی نہ کر سکا اور فوراً جمرود واپس چلا گیا۔ اس امدادی فوج کے پیٹھ پھیرتے ہی آفریدی قلعے پر چڑھ دوڑے اور اُسے آگ لگا دی۔ جمرود کے قلعے میں مقیم گورا فوج اور اس کے افسر فورٹ ماڈ سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ لیکن کچھ کر نہ سکے ـــــ اتنے مضبوط قلعے کا ہاتھ سے نکل جانا انگریز کے وقار کے بالکل منافی تھا۔ تاہم حالات نے اُسے بے بس بنا کر رکھ دیا تھا۔

اسی رات جمرود پر حملہ ہوا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں لیکن دن چڑھا تو گورا فوج نے دیکھا کہ آفریدی لشکر غائب ہو چکا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اس روز لنڈی کوتل پہ حملے کا پروگرام تھا۔ دن بھر آفریدی مجاہد دُور دراز کے پہاڑی علاقوں سے آکر لنڈی کوتل میں جمع ہوتے رہے ـــــ پچھلے پہر انہوں نے چھاؤنی کی فوج پر ہلہ بول دیا۔ پہلے پہل سخت مقابلہ ہوا۔ لیکن اس وقت تک قلعے میں صرف خیبر رائفلز کے آفریدی سپاہی رہ گئے تھے اس لئے انہوں نے اپنے ہی بھائی بندوں پہ گولیاں برسانا گوارا نہ کیا بلکہ قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ دوسرے دن دس بجے تک لنڈی کوتل پر حریت پسند غازیوں کا قبضہ ہو گیا۔ علی مسجد اور ماڈ کے قلعوں کی طرح انہوں نے لنڈی کوتل کا انگریزی قلعہ بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ حملے کے وقت لنڈی کوتل کے قلعے میں پانچ افسر تھے اور ۳۷۰ سپاہی۔

چند ہی دنوں میں ساری وادیٔ خیبر آفریدی مجاہدوں کے تصرف میں چلی گئی اور یوں دکھائی دینے لگا جیسے ان علاقوں سے انگریز کی حکومت ختم ہو کر رہ گئی ہو۔

کئی مہینوں کے بعد جب انگریز تیراہ۔ مالاکنڈ، مہمند اور دوسری مہمات سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے درۂ خیبر کے معاملات کی طرف توجہ کی۔ مدتوں تیراہ اور خیبر میں مصروفِ جنگ رہنے کے بعد اب آفریدیوں میں پہلا سا دم خم باقی نہ تھا، ان کے پاس خوراک بھی ختم ہو چکی تھی اور گولی بارود بھی ـــــ چنانچہ انگریز نے پھر سیاسی جال بچھایا اور پولیٹیکل چالیں چلتے ہوئے کئی آفریدی قبیلوں کو ساتھ ملا لیا ـــــ ان قبیلوں کی حمایت حاصل ہونے کے بعد پھر سے فرنگی نے وادیٔ خیبر میں قدم جمانے شروع کر دیئے۔

۱۷ دسمبر کو پشاور کے پورے فوجی ڈویژن کو جمرود کی طرف کوچ کا حکم دیا گیا۔ بعد میں جنرل ہارٹ اور جنرل گیسلی کی کمان میں مزید دو بریگیڈ فوج اس محاذ پر بھیجی گئی۔ اُدھر خیبری قبائل سے گفت و شنید کے لئے کرنل سردار محمد اسلم خان سدوزئی اور کیپٹن بارٹن بھی فوج کے ہمراہ تھے۔ جب یہ لشکر فورٹ ماڈ اور علی مسجد کی طرف بڑھا تو کسی آفریدی نے بھی ان کی مزاحمت نہ کی کیونکہ وہ سب کے سب میدانی علاقوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے پہاڑی ٹھکانوں کو جا چکے تھے۔ وادیٔ خیبر کے باقی مقامات پر بھی صورتِ حال یکساں تھی ـــــ ۲۴ دسمبر کو انگریزی فوج نے علی مسجد سے وادیٔ بازار کا رُخ کیا تاکہ ذخاخیل کے خلاف تادیبی کارروائی کی جا سکے۔ جنوب میں تیراہ کی جانب سے ایک بریگیڈ فوج بھی

سر ولیم لوکہاوٹ کی قیادت میں بازار پہنچ گئی ـــــ الاچی کے گاؤں کو فرنگی نے منہدم کر دیا۔ چند دن بعد لنڈی کوتل کی طرف فوجی پیش قدمی عمل میں آئی۔ لنڈی کوتل کی چھاؤنی اور قلعہ جل چکا تھا۔ صرف ٹوٹی پھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ انگریز نے نہایت آسانی سے دوبارہ قلعے پر قبضہ کر لیا۔ سیاسی بات چیت ہوئی تو شنواریوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ انگریز سے صلح کی شرائط طے کر لیں۔

اُدھر سے فارغ ہو کر انگریز نے ذخاخیل پر پورا دباؤ ڈالا۔ ذخاخیل ڈٹے رہے۔ انہوں نے انگریز پر واضح کر دیا کہ اگر اُن کے دیہات تباہ کئے گئے تو وہ خاموش نہ رہیں گے۔ یہ قبیلہ چار پانچ سو لڑاکا نوجوان محاذ پر لا سکتا تھا اور ان کے پاس اسلحہ بھی عمدہ قسم کا تھا۔ انہوں نے جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ۳۰ دسمبر کو علی مسجد کی پہاڑیوں کے قریب انگریزی فوج کے ایک دستے کو گھیرے میں لے لیا۔ کم و بیش بیس گورا افسروں اور بہت سے سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس پر فرنگی نے مزید فوجی کمک طلب کر لی۔ اس کمک کے پہنچنے پر بھی سوائے اس کے کہ: ۱۔ اپنی فوج کو گھیرے سے نکال لیں، وہ ذخاخیل کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو انگریزوں نے پھر پوری قوت سے ذخاخیل کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ذخاخیل نے بھوسے کے ذخیرے خود جلا دیئے تھے کہ دشمن کے ہاتھ نہ لگیں۔ وہ اپنے گھروں سے سارا سامان بھی نکال کر پہاڑی غاروں کو لے گئے تھے، جب دیہات میں پہنچ کر انگریزوں کو کچھ ہاتھ نہ آیا تو انہوں نے پہاڑی غاروں کا رُخ کیا۔ غازیوں نے یہ دیکھ کر اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ انگریز جرنیل کالے۔ ڈی۔ سی ہلاک ہو گیا اور بہت سے دوسرے افسر زخمی ہوئے۔

۱۷ جنوری تک گورا پلٹنیں اور دیسی سپاہیوں کے دستے ذخاخیل کے خلاف تادیبی کارروائی میں مصروف رہے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی گئے دیہات کو خالی پایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ذخاخیل تیراہ کی وادیٔ بازار کی طرف کوچ کر چکے تھے۔ اس مہم کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جہاں آفریدی اور دوسرے مسلمان حریت پسند انگریز سامراجیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جنگ لڑ رہے تھے وہیں ہندو اور سکھ انگریز کے حواری بن کر اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف کارروائی میں مصروف تھے۔ کوچ بہار کا ہندو مہاراجہ اپنی پلٹن کے ساتھ بنفسِ نفیس اورک زئی، تیراہ کی مہم میں شریک تھا جب کہ نابھہ کی سکھ پلٹن راج کمار شیر سنگھ کی سرکردگی میں اپنے ہی وطنی بھائیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر رہی تھی۔

جنرل سائمن ذخاخیل کے خلاف مہم کے سلسلے میں وادئی بازار کی ایک ایک بستی میں گیا۔ جھونپڑے اور برج تباہ کر دیئے گئے اور آفریدیوں کا جو سامان ہاتھ آیا اٹھا لیا گیا۔ تاہم اپنی اس بے سروسامانی اور قلت تعداد کے باوجود ذخاخیل جوانوں نے برگ کے نواح میں گورا فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ اور اس کے بہت سے افسروں اور سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ کوئی ڈھائی گھنٹے تک فریقین میں گولی چلتی رہی۔

۲۹ جنوری کو انگریز لشکر نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ذخاخیل کسی بھی جگہ اجتماعی طور پر مقابلے پر نہ آئے، صرف پہاڑی کمین گاہوں سے اکا دکا فائر کرتے رہے جس کے نتیجے میں ایک انگریز لفٹیننٹ اور ایک درجن سے زائد گورا اور گورکھا سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب انتہائی فوجی دباؤ ڈالنے پر بھی فرنگی ذخاخیل سے اپنی شرطیں نہ منوا سکے تو انہوں نے کھجوری کے میدان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، کھجوری نسبتاً ایک سرسبز میدان ہے جو موسم سرما میں سارے آفریدی قبائل کے مویشیوں کے لئے چراگاہ کا کام دیتا ہے۔ جب پہاڑی چوٹیوں پر برف باری ہوتی ہے تو وہاں کے مکین کھجوری چلے آتے ہیں تاکہ سردی کی شدت سے محفوظ رہیں، یہی وجہ ہے کہ کھجوری سبھی آفریدی قبیلوں کے لئے ایک قیمتی متاع حیات ہے ـــــ انگریز نے چاروں طرف سے کھجوری کی طرف پیش قدمی کرنے کا منصوبہ بنایا۔ باقی دستے تو کھجوری تک کسی مزاحمت کے بغیر ہی پہنچ گئے لیکن مغربی جانب سے شین قمر کے درے سے آنے والے فرنگی فوجی لشکر کو ذخاخیل نے گھیرے میں لے لیا۔ آفریدی نشانہ بازوں نے ایک ایک گورا اور گورکھا سپاہی کو تاک کر نشانہ بنایا۔ چنانچہ اس ایک جھڑپ میں انگریز کمانڈر لفٹیننٹ کرنل ہٹن (HAUCHTON) کے علاوہ لفٹیننٹ ٹورنگ (TURING) لفٹیننٹ واکر (WALKER) لفٹیننٹ ڈاوڈل (DOWDEL) لفٹیننٹ ہیف (HUGH) اور بہت سے دوسرے افسر اور سپاہی ہلاک اور میجر اسکل، کپتان ماربل، لفٹیننٹ ہال اور بہت سے دوسرے لوگ شدید زخمی ہوئے۔ انگریزوں کی اپنی رپورٹ کے مطابق صرف یارک شائر کی گورا رجمنٹ کے ۲۲ افسر ہلاک اور ۱۷ زخمی ہوئے۔ سکھوں کو بھی آفریدیوں نے خوب سبق سکھایا۔ اُس دن فرنگی حکمرانوں کو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ مرنے والوں کی لاشیں ہی اٹھا کر لے جاتے۔

۳۱ جنوری کو جنرل ولیسٹ ماکوٹ بذاتِ خود بہت بڑا لشکر لے کر زخمیوں اور مُردوں کو اٹھانے

آیا۔ تاہم صرف ۳۲ لاشیں اُن کے ہاتھ آئیں، باقی لاشیں بھی آفریدی اٹھا کر لے گئے۔ اُس دِن کی جھڑپ میں سرجن کیپٹن ڈِک (DICK) اور لفٹیننٹ براؤن (BROWN) شدید زخمی ہوئے اور بہت سے توپچی اور سپاہی لڑتے لڑتے مارے گئے۔ ۳۰ جنوری کا یہ معرکہ انگریزوں کے لئے اتنا تباہ کُن ثابت ہوا کہ اس کے بعد انہوں نے تیراہ اور بالخصوص ذخاخیل پر حملے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

تیراہ انگریزوں بلکہ سارے اہلِ مغرب کو شاید ہی کسی لفظ سے اِتنی چڑ ہو جتنی لفظ "جہاد" سے ہے۔ مسلمان اللہ کا سپاہی ہے۔ وہ فطرتاً امن پسند اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا علمبردار ہے۔ تاہم جب کبھی کسی غاصب یا جابر قوت کی طرف سے اس کے دین یا ملّی ناموس کو کوئی خطرہ درپیش ہو، وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک فیورانسان کی طرح میدان میں اُترتا ہے اور باطل سے ٹکرے کر یا تو اُسے پاش پاش کر دیتا ہے یا اس کوشش میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے — حق و باطل کی اس آویزش اور اس امتحان میں ثابت قدم رہنے کے بعد اگر وہ زندہ بچے تو "غازی" ہے اور اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دے تو "شہید" کا رُتبہ پاتا ہے — علمائے حق کی طرف سے فریضۂ جہاد کا اعلان ہونے جو مسلمان بلا وجہ اس آزمائش سے پیچھے رہ جائے وہ گھاٹے میں ہے اور اس کا ایمان مکمل نہیں۔

۱۸۹۷ء میں جب سارے صوبہ سرحد کے جید علماء نے فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا تو دُنیا بھر کی اسلام دشمن قوتیں سٹپٹا اٹھیں، سب سے بڑھ کر انگریز سیخ پا ہوئے اور انہوں نے سرحدی علاقوں پر یورش کر دی، ابھی سر بائیٹن بلڈ مالاکنڈ اور بہند کی مہموں سے واپس آنے نہ پایا تھا کہ اب تیراہ کے پہاڑوں میں رہنے والے آفریدی اور اورکزئی مجاہدوں کے خلاف بہت بڑا لشکر جمع کیا جانے لگا۔ اسے "مہم تیراہ کی فوج" (تیراہ ایکسپیڈیشن فورس) کا نام دے کر اس کی کمان سر ولیم لوکہارٹ جیسے جہاندیدہ اور نامور جرنیل کے سپرد کی گئی جسے صوبہ سرحد کے معاملات سے گہری واقفیت تھی۔

ان انتہائی مفلس اور نادار، انتہائی پسماندہ اور بے سروسامان آفریدیوں کے خلاف جو فوج اکٹھی کی گئی اس میں ۱۰۱۰ برطانوی افسر ۹۴۹، دیسی افسر، ۱۹۷ ہسپتال کے کارکن ۱۰۱۸۲ گورا اور ۲۲۱۲۳ دیسی سپاہی شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ ۳۴۲۰۳ مسلح سپاہی روس یا جرمنی کو فتح کرنے نہیں

نکلے تھے بلکہ ۳۵، ۴۰ ہزار آبادی کے ایک سرحدی پہاڑی علاقہ کے غریب لوگوں کو اُن کی حُریت پسندی کی سزا دینے چلے تھے۔ اور تو اور اس فوج ظفر موج کا سامانِ رسد سترہ ہزار گھوڑوں، خچروں اور اُونٹوں پر لدا ہوا تھا اور اس کے ہمراہ کمشنر پشاور سر اُڈنی، پولیٹیکل افسر خیبر کرنل وار برٹن (جو خیبر ایجنسی کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا) اور دوسرے بے شمار گرگ باران دیدہ بھی تھے جو سیاسی مہرہ بازیوں میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

۷ اکتوبر کو برطانوی حکومت نے اس عظیم فوجی مہم کا جواز بناتے ہوئے ایک حکمنامہ جاری کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ "حکومت نے خیبر ایجنسی اور آفریدی علاقے میں قلعوں، چوکیوں، درّوں اور سڑکوں کی حفاظت کا کام قبائلی لوگوں کے سپرد کر رکھا تھا جس کے معاوضے میں برطانوی سرکار ان لوگوں کو بھاری الاؤنس (مواجب) بھی ادا کرتی تھی لیکن اس کے باوجود خیبری قبائل نے مہمندوں اور یوسف زئی کی حمایت میں مظاہرے کئے۔ کئی ایک انگریزی قلعوں اور چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ سماّنہ اور گلستان کے قلعوں کو تباہ کیا اور انگریزوں کی جان و مال کو نقصان پہنچایا۔ اس لئے اب آفریدیوں کے وطن تیراہ کو فوجی مہم بھیجنا ناگزیر ہو گیا ہے"۔

یہ اعلان محض دکھاوے کا اعلان تھا۔ اصل میں انگریز کی ہوسِ اقتدار اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی اور اُس کے سامراجی عزائم شروع ہی سے سب پر آشکار تھے چنانچہ اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر تیراہ کی جانب پیش قدمی ہو چکی تھی۔ ۹۲-۱۸۹۱ء میں میران زئی کے خلاف تادیبی مہم کی آڑ میں تیراہ کے اہم پہاڑی مقامات پر کئی فوجی چوکیاں، قلعے اور سڑکیں تعمیر کر لی گئی تھیں۔ دو ایسے قلعے تھے جن میں سے بڑے کا نام لوکہارٹ فورٹ اور چھوٹے کا نام کیوگنری فورٹ یا گلستان فورٹ تھا۔ ان دونوں قلعوں کے مابین نامہ و پیام کی سہولت کی غرض سے سُورغر کی چوٹی پر ایک فوجی چوکی بھی تعمیر کی گئی تھی جس کی حفاظت کے لئے بیس اکیس سپاہیوں کا ایک دستہ بھی متعین تھا۔

تیراہ کو یہ فخر حاصل تھا کہ کسی سفید فام سامراجی کو یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی بلکہ روزِ اوّل سے یہ لوگ آزاد چلے آ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پُر بہار وادیوں میں بسنے والے اِن پُر امن لوگوں کو باہر کی دُنیا سے کوئی غرض نہ تھی، صدیوں سے وہ اپنی ہی قبائلی روایات کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ اہلِ تیراہ یہ جانتے تھے کہ اگر ایک بار "پردہ" اُٹھ گیا تو یہ صحت افزا، جنتِ نظیر خطہ ہمیشہ کے لئے

ایک عیار قوم کا غلام بن کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ درّہ خیبر سے جہاد کی خبریں آتے ہی تیراہ کے اورک زئی اور آفریدی جانباز سمانہ کے نواح میں جمع ہونے لگے تھے۔ تاہم ان لوگوں کے ارادے جارحانہ ہرگز نہ تھے وہ صرف اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کا تحفظ چاہتے تھے اور محض اپنے دفاع کے لئے میدانِ جہاد میں نکلے تھے ـــــ سمانہ ایک چھوٹا سا صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ جہاں ان دنوں کوہاٹ بریگیڈ کے انگریز افسر موسمِ گرما گزارا کرتے تھے۔ سمانہ اور دوسری انگریزی چوکیوں سے تیراہی غازیوں پہ فائرنگ ہوئی تو سخت اشتعال پھیل گیا۔ اسی اشتعال کے تحت مجاہدوں نے آگے بڑھ کر ان سب چوکیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا ـــــ انگریز چاہتے تو تیراہ کی مہم ٹل سکتی تھی لیکن اُن پر کچھ اس طرح سے جنگی جنون سوار تھا کہ ۳۴ - ۳۵ ہزار سپاہیوں پر مشتمل برطانوی لشکر کو تیراہ بھیجنا ناگزیر سمجھا گیا۔ حالانکہ بعد میں انہوں نے خود تیراہ کی مہم کو ایک "انتہائی غیر ضروری مہم" اور "انتہائی غیر دانش مندانہ اقدام" قرار دیا۔

انگریز جرنیلوں کا منصوبہ یہ تھا کہ ہنگو اور سمانہ سے تیراہ پہ چڑھائی کی جائے اور خانکی بازار، مستورہ اور دریائے باڑہ کی وادیوں کو تسخیر کرتے ہوئے باغ یا میدان کے علاقوں تک پہنچا جائے۔ اور سارے تیراہ کو اس طرح پامال اور تاراج کیا جائے کہ آئندہ آفریدیوں یا اورک زئی کو کبھی اُن کے خلاف سر اٹھانے کا خیال نہ آئے۔

سر ولیم لوکہارٹ نے جنرل بگس (BIGGS) سر پاور پامر (PALMER)، کرنل میک مین (MACMAN) میجر کلسن اور دوسرے ایسے افسروں کو ساتھ لیا جنہیں سرحدی مہمات کا طویل تجربہ تھا، کچھ فوج خوشحال گڑھ کی راہ اور کچھ درّہ کوہاٹ کی راہ کوچ کرتی ہوئی شینہ وڈی کے مقام پہ خیمہ زن ہوئی جو سمانہ اور درگئی کی پہاڑی چوٹیوں کے دامن میں جانبِ جنوب واقع ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو لوکہارٹ نے اپنی فوج کو درگئی کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ اس مہم میں سب سے مشکل کام درگئی کی نوکیلی چوٹی کی چڑھائی اور پھر وہاں سے جانبِ تیراہ خطرناک اترائی تھی۔ گورا فوج (GORDON HIGHLANDERS) صبح سویرے پہاڑی توپیں لے کر مہم پر روانہ ہوئی۔ ان کے مقابلے میں اورک زئی مجاہد ابھی پوری طرح تیاری بھی نہ کر پائے تھے کہ یہ لشکر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ مجاہدین کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا اور درگئی کی چوٹی پر گورا فوج کا قبضہ ہو گیا۔ تاہم وہاں پر نہ رسد

کی سپلائی کا انتظام تھا نہ سر چھپانے کی کوئی جگہ۔ شام کو مجبوراً انہیں پانچ ہزار فٹ اونچی چوٹی سے اتر کر اپنے کیمپ شینہ وڑی پہنچنا پڑا۔ اب اورک زئی مجاہدوں کی باری تھی ہر گھاٹی اور ہر چٹان کے پیچھے سے انہوں نے گورا فوج پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ نشانہ بازی کے یہ ماہر دیسی ساخت کی بندوقوں سے اس کمال سے نشانہ باندھتے تھے کہ ہر گولی کے ساتھ ایک گورا سپاہی لڑھکتا ہوا کسی کھڈ میں جا گرتا تھا۔ پچاس گورے مروانے اور سینکڑوں زخمی کروانے کے بعد شام کو انگریزی لشکر شینہ وڑی کے اُسی کیمپ میں واپس پہنچا جہاں سے صبح کو چلا تھا۔

دو دن تک صلاح مشورے کرنے اور مزید فوجی طاقت جمع کرنے کے بعد جنرل میکبین نے گورا اور گورکھا پلٹنوں کو (جو پہاڑی طریقِ جنگ کی ماہر تھیں) درگئی کی پہاڑی چوٹی کی تسخیر کا حکم دے کر روانہ کیا۔ تنگ راستوں اور پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے کچھ سپاہی کوتل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ان کا کرنل ٹریورس (TRAVERS) اس انتظار میں تھا کہ کافی جمعیت کو لے کر درگئی کی طرف پیش قدمی کرے۔ لیکن سپاہی اپنے پیش روؤں کا حشر دیکھ چکے تھے اس لئے کسی کو آگے بڑھنے کا یارا نہ تھا۔ یہ دیکھ کر جنرل کیمسٹر نے دو گورا رجمنٹوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا لیکن فائریوں کی مینہ کی طرح برستی ہوئی گولیوں کی وجہ سے اُن کے لئے ایک قدم تک آگے بڑھانا ناممکن ہو گیا ـــــ اُدھر جنرل بگس متواتر سگنل دے رہا تھا کہ ہر قیمت پہ درگئی کی طرف پیش قدمی جاری رکھی جائے۔ بچارے سپاہی کرتے بھی کیا، ہر طرف گورا سپاہیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، جو آگے بڑھتا انہیں دیکھ کر ٹھٹک جاتا۔

اس موقعہ پہ ایک سکاچ کرنل نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے بینڈ کو پائپ بجانے کا حکم دیا تاکہ سپاہیوں میں جوش پیدا ہو۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ بینڈ کی دھنوں نے گوروں کا خون گرمایا اور ہائی لینڈرز گرتے پڑتے درگئی کی چوٹی تک جا پہنچے۔

سرکاری رپورٹوں میں درگئی تک پہنچنے کے لئے جو معرکہ پڑا اس میں صرف گارڈن رجمنٹ کے تین سو افسر اور سپاہی ہلاک ہوئے۔ گورکھا اور ڈورسٹ پلٹنوں کو بھی شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اُس دن انگریزوں پہ ایسی بیتا پڑی کہ اپنے گھوڑوں اور خچروں کو دانہ پانی دینا بھی بھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں جانور درگئی کی چڑھائی چڑھتے ہوئے ساز و سامان سمیت تیور اکر ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔ مزید گھوڑوں اور خچروں کے آنے تک فرنگی فوجوں کی پیش قدمی ملتوی ہو گئی۔

۲۰ نومبر کو پھر سے طاقت مجتمع کرنے کے بعد فرنگی لشکر اونگہ کے درّے کی جانب بڑھا، گورکھا اور ہائی لینڈرز، جو کوہ پیمائی کے ماہر تھے۔ حملے میں آگے آگے تھے، انتہائی مشکل سے وہ درّے پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دستے کا سالار جنرل گیسلی پہلا انگریز تھا جس نے پہاڑی پر کھڑے ہو کر تیراہ کی برفانی چوٹیوں اور سرسبز وادیوں کی ایک جھلک دیکھی۔

قدم قدم پہ آفریدی غازیوں کی گولیوں کا سامنا کرتے ہوئے فرنگی لشکر کئی دنوں کے صبر آزما سفر کے بعد باغ (میدان) پہنچا۔ باغ ہی کے آفریدی مرکز سے ملا سید اکبر اور قبائلی اکابر نے فرنگی کے خلاف جہاد کا فیصلہ دیا تھا۔ فرنگی اس مسجد کو خصوصی طور پر دیکھنا چاہتے تھے جس کے منبر سے اعلانِ جہاد ہوا تھا۔ وہ مسجد کے اندر گئے۔ فرش پر خشک گھاس بچھا تھا۔ طاقچے پہ قرآن مجید کے چند نسخے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کچی سی سادہ مسجد میں اللہ ہی اللہ تھا۔ نہ آرائش و زیبائش تھی۔ نہ شاہا نہ شان۔

اردگرد کی ساری آبادی فرنگی کے حکم سے جلا دی گئی، میوہ دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے غازیوں کے برج مسمار کر دیئے گئے تاہم انگریز کو اس چھوٹی سی سادہ مگر پُروقار مسجد کے انہدام کا حوصلہ نہ ہوا ـــــ اُسے خدشہ تھا کہ مسجد کو کوئی نقصان پہنچا تو سارے برِصغیر کی مسجدوں سے ان کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری ہو جائے گا۔

اپنی فوجی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے بعد انگریز نے مسئلے کے سیاسی حل کی تلاش پر توجہ دی۔ انہوں نے آفریدی قبیلوں کو خبردار کیا کہ وہ انگریز سے چھینی ہوئی اور فوجی چوکیوں سے لوٹی ہوئی آٹھ سو رائفلیں واپس کریں اور پچاس ہزار روپیہ بطورِ ہرجانہ ادا کریں۔ ساتھ ہی انہوں نے اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ وہ تیراہ پر مستقل قبضے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ـــــ اگرچہ آفریدی اس وقت انتہائی مشکل حالات سے دوچار تھے، اُن کے بیوی بچے سخت سردی کے دنوں میں بھی پہاڑوں کے غاروں میں مقیم تھے۔ اُن کے غلے کے ذخیرے لوٹ لئے گئے تھے تاہم انہوں نے ذلت آمیز شرطوں پر صلح کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی ماہ تک سردی اور برف باری کے زمانے میں انگریز لشکر تیراہ کے مختلف مقامات پر پڑاؤ ڈالے پڑا رہا ـــــ بالآخر سرکار نے شرطیں نرم کر دیں۔ جرمانہ بالکل معاف کر دیا گیا۔ تھوڑی بہت رائفلیں البتہ انگریز کو واپس ملیں اور اس طرح تیراہ کی اس فوجی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ میں خود

سر ولیم لوکہارٹ بھی شریک تھا، جسے بعد میں پورے ملک کی افواج کا کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔

اس امر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ تیراہ کی مہم سے انگریز نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ مشہور اہلِ قلم آرتھر سوئنسن کا کہنا ہے کہ

"یہ مہم آفریدیوں کو مہنگی پڑی تو انگریز کو بھی کچھ کم نقصان برداشت کرنا نہ پڑا۔ کئی کروڑ پونڈ مہم پر خرچ ہوئے اور آٹھ سو افسروں اور سپاہیوں کی جانیں گئیں"

چرچل نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ۱۸۹۷ء کی سرحدی مہموں میں انگریز کے بہترین فوجی افسر کام آئے انہیں میں ایک جنرل ہملٹن (IAN HAMILTON) بھی تھا جو گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

چرچل نے لکھا ہے کہ سر ہائینڈن بلڈ کے فوجی دستے کے (جو مالاکنڈ اور ہندوانگبسی میں برسرِ پیکار رہا) بارہ سو افراد میں سے ۳۳ افسر اور ۲۴۹ سپاہی جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔

کرنل میک مین نے جو خود تیراہ کی مہم میں شریک تھا، اعتراف کیا ہے کہ ان سرحدی مہموں میں انگریز کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچا۔ وہ کہتا ہے کہ۔

"ان مہموں سے انگریز پر بھاری فوجی ذمہ داریاں آن پڑیں۔ مالاکنڈ، خیبر، کُرم، سمانہ، ٹوپی۔ وانا اور گومل کے علاقوں میں بڑی بڑی چھاؤنیاں قائم کر کے وہاں فوجیں متعین کی گئیں اور ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کو اُن کی مرضی کے خلاف وہاں فرائض انجام دینے پڑے علاوہ بریں مہموں پر بے پناہ جنگی اخراجات کی وجہ سے ہندوستان کے خزانے کو بھی بھاری نقصان کا متحمل ہونا پڑا۔"

کُرم انگریز کے خلاف ہنگامے صوبہ سرحد کے کسی ایک مقام تک محدود نہ تھے بلکہ اس آگ نے سارے قبائلی اور سرحدی علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ۲۶ اگست ۱۸۹۷ء کو کوہاٹ سے چھ میل دور ابلان کے درّے میں انگریز کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اورک زئی کے قبیلہ دولت زئی کی شاخ بزدوٹی نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ کوہاٹ سے کُرم پاڑہ چنار جانے والی شاہراہ اسی درّے سے ہو کر گزرتی ہے، اگر درّہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جاتا تو کرم سے ان کا رابطہ قائم رہنے نہ پاتا۔

اس سے پہلے ۱۸۶۸ء میں بھی ایک بار بزدوٹی نے ابلان سے گزرنے والے فوجی قافلوں کو لوٹا تھا اور درّہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریز نے دوبارہ درّے کو اپنے قبضے میں لے تو لیا۔ لیکن کم سے کم

پچاس گورا افسروں اور سپاہی کی قربانی دینے کے بعد کہیں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔

دوسرے سال پھر یہی حالات پیدا ہوئے تو رانوں رات ایک فوجی مہم درّے کی واگذاری کے لئے بھیجی گئی جس نے نہ صرف درّے کو واپس لے لیا بلکہ آگے بڑھ کر اورک زئی کے گاؤں غورہ اور کچھ دوسری بستیوں کو بھی نذرِ آتش کر دیا۔ تاہم اورک زئی گھات لگا کر بیٹھے رہے اور جب اس کارروائی کے بعد انگریز فوج واپس کوہاٹ جا رہی تھی تو انہوں نے چھاپہ مار کر چالیس کے قریب فوجی افسر اور سپاہی ہلاک کر دیئے۔

اب کے ۲۵ اگست کو کوہاٹ چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر کو خبر ملی کہ اورک زئی لشکر نے محمد زئی کے قلعے کو (جو درّہ ابلان کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا) گھیرے میں لے لیا ہے اور ابلان کے دونوں طرف "سنگر ڈھ" اور مورچے قائم کر لئے ہیں۔ مورچے عین اُسی مقام پر بنائے گئے تھے جہاں سے اورک زئی نے ۲۹ سال قبل گورا فوج پر کاری ضربیں لگائی تھیں ـــــ اُسی دن کوہاٹ چھاؤنی سے میجر ہیوک کوپلی (BEWICK COPLEY) اور کپتان ویک (WAKE) کی قیادت میں ایک لشکر درّہ ابلان کی طرف بھیجا گیا۔

۲۶ اگست کو اورک زئی نے محمد زئی کے قلعے پر، جہاں بارڈر پولیس متعین تھی، حملہ کر دیا، ایک سپاہی مارا گیا۔ چند زخمی ہوئے اور باقی نے قلعے میں پناہ لے کر جانیں بچائیں۔ ۲۶ ہی کی شام کو ایک اور رجمنٹ محمد زئی بھیجی گئی لیکن اورک زئی کے جوابی حملوں میں کمی نہ آئی جس پر بریگیڈیر جنرل بگس (BIGGS) مزید سپاہی اور توپ خانہ لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ اُس نے توپوں سے اندھا دھند گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے باوجود وقفے وقفے سے اورک زئی گولیاں برساتے رہے۔ تنگ آکر انگریز جرنیل نے درّے پر عام حملے کا حکم دے دیا۔ فوجی دستے درّے میں تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ہر سنگر ڈھ اور ہر مورچے سے اُن پر گولیاں برسنے لگیں، انتہائی جان جوکھوں کے بعد اور بے شمار جانیں قربان کر کے سرکاری لشکر درّے کی چوٹی پر کامیاب تو ہو گیا لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی قبائلی لشکر درّے کے عقبی طرف سے اُتر کر غائب ہو چکا تھا۔ ایک شخص بھی انگریز کے ہاتھ نہ لگا۔

دن بھر کی سخت لڑائی۔ گرمی لُو اور تھکن سے بہت سے گورا سپاہی ہلاک ہو گئے ـــــ اورک زئی جس شان اور جس طریق سے حملے کرتے تھے اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہیں ماہر فوجی افسروں نے

ترتیب دے رکھی ہے۔ اُن کے کپڑے بھی عموماً خاکی ہوتے تھے اور وہ چٹانوں میں اس طرح چھپ جاتے تھے کہ مخالف کو نظر تک نہ آتے تھے۔ ان جھڑپوں میں کپتان برڈ سمتھ کے ٹخنے پر گولی لگی جبکہ لفٹیننٹ نارتھ کو لگنے والی گولی اس کی پسلیوں کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ فوجی سرجن نے مرہم پٹی کرنے کے بعد انہیں ڈولی میں ڈال کر کوہاٹ بھیج دیا۔ کوتل سے واپسی پر اترائی میں ٹوٹ لگنے سے سترہ فوجی ہلاک ہو گئے۔ باقی ماندہ لشکر مارچنگ کرتا ہوا کوہاٹ چھاؤنی پہنچ تو گیا، لیکن بالکل ناکام اور مُراد ــــــ

اُدھر ہنگو کے مغرب میں واقع سمانہ کے پہاڑی سلسلے اور وادیٔ کُرّم سے وحشت ناک خبریں ملنے لگیں ان خبروں کے ملتے ہی کوہاٹ سے کرنل رچرڈسن کی کمان میں فوج اور توپ خانہ اُدھر کو روانہ کیا گیا جو راتوں رات ۲۶ میل کا سفر طے کرتے ہوئے علی الصبح ہنگو پہنچ گیا۔ اس اثنا میں یہ افواہ گرم تھی کہ ہنگو پر بھی قبائل حملہ ہونے والا ہے' اس لئے مقامی لوگوں میں بڑا خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔

۲۶ اگست کو ایک فوجی دستہ رسد اور اسلحہ دے کر فورٹ لوکہارٹ اور فورٹ گلستان بھیجا گیا کرنل جیمز سن اور کرنل رچرڈسن دستے کے ہمراہ تھے، بظاہر انہیں کسی طرف بھی کوئی قبائلی نقل و حرکت دکھائی نہ دی تاہم دوسرے ہی دن ہنگو کی نواحی فوجی چوکی لاخہ سے خطرے کا بگل سنائی دیا۔ کرنل ایبٹ فوراً توپ خانہ اور سپاہیوں کے ہمراہ اس جانب روانہ ہو گیا۔ اس فوجی دستے کا مقصد لاخہ کے محصورین کو بچانا تھا۔ جب کرنل ایبٹ کے دستے نے بڑی دیر لگا دی تو میجر وائٹ کی کمان میں مزید کمک لاخہ بھیجی گئی ــــ دونوں لشکروں نے مل کر بڑی مشکل سے لاخہ کے محصورین کو تو قبائلیوں کے نرغے سے نکالا لیکن ساتھ ہی یہ خبر موصول ہوئی کہ لاخہ کے مغرب میں سیفل درّہ کی چوکی بھی مجاہدین کی عین زد میں ہے، چنانچہ پہلے کرنل رچرڈسن نے اُدھر کا رُخ کیا اور پھر ایبٹ بھی مدد دینے کے لئے چل پڑا۔ شام تک پہاڑی چوٹیوں پر چڑھنے، اُترنے اور گرمی کی شدّت سے فوج بے تاب ہو چکی تھی۔ چودہ گھنٹوں سے اسے پانی ملا تھا نہ خوراک ــــ ان کا حال پتلا تھا ــــ اندھیرا پڑتے ہی قبائلی غازی چاروں طرف سے اُن پر ٹوٹ پڑے اور سخت نقصان پہنچایا۔ گرتے پڑتے، بمشکل تمام، انگریزی فوج کے باقی ماندہ سپاہی رات کے گیارہ بجے ہنگو واپس پہنچے۔ رات کو غازیوں نے ہنگو کیمپ پر بھی چھاپہ مارا لیکن اُن کا مقصد محض دہشت پھیلانا تھا مقابلہ

کرنا نہ تھا۔۔۔ دوسرے دن مزید انگریزی فوج ہنگو پہنچ گئی۔

۲۹۔ اگست کو ہنگو کیمپ پر پھر فائرنگ ہوئی۔ ساتھ ہی پتہ چلا کہ اورک زئی لشکر نے شینہ ڈڑی کی پوسٹ پر ہلہ بول دیا ہے اور کاہی اور نریاب کے ہندو سیٹھوں کو لوٹ لیا ہے۔ انگریزی لشکر مجاہدین کی تلاش میں نکلا لیکن وہ لوگ واردات کے فوراً بعد روپوش ہو گئے اور اُن میں سے ایک بھی انگریز کے ہاتھ نہ لگا۔

۳۰۔ اگست کو کرنل منسل (MINSEL) فوج لے کر نکلا اور چالیس میل تک گشت کی لیکن کوئی غازی سامنے نہ آیا۔ واپسی پہ تھکا ماندہ انگریزی لشکر ابھی لیٹا ہی تھا کہ سامنے کی پہاڑی سے پھر اُن پر گولیاں برسنے لگیں۔ جواب میں انگریزوں نے توپوں سے گولہ باری کی۔ اس گولہ باری کے باوجود وہ محفوظ نہ رہ سکے اور ایک رات میں دس گورا اور سکھ سپاہی مارے گئے۔

۳۱۔ اگست کو جنرل بگس بذاتِ خود پورا بریگیڈ لے کر ہنگو پہنچا۔ ہنگو سے تھوڑی دُور اِدھر غازیوں نے لشکر کے عقبی دستوں پر چھاپہ مار کر بہت سا ساز و سامان اور باربرداری کے جانور چھین لئے۔ ٹل، سدہ اور پاڑہ چنار سے بھی اُس دن تشویشناک خبریں آنے لگیں۔ چنانچہ کرنل ایبٹ کا دستہ ٹل کو اور کرنل رچرڈسن کا لشکر پاڑہ چنار کو روانہ کیا گیا۔ رات کو لشکر نے دوآبہ کے مقام پر پڑاؤ کیا تو وہاں بھی قبائلیوں نے اُن پر گولیاں برسائیں۔ فرنگی کسی جگہ بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتے تھے۔ بڑے بڑے فوجی افسر بھی قبائلیوں کے کمالِ نشانہ بازی کے معترف تھے۔ رات کو انگریز افسر میس میں کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ سنسناتی ہوئی گولیاں برسنے لگیں۔ پہلی ہی گولی میز پر آ کر لگی۔ لیمپ بجھ گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے انگریزی لشکر نے کوچ کیا۔ دھوپ اور گرمی میں سفر کرتے ہوئے فوجی دستے سرپہر کو ٹل پہنچے۔ ایک اکیلا غازی کہیں گھات میں بیٹھا تھا اُس نے ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ ایک سکھ افسر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سکھ سپاہیوں نے بہتیرا تعاقب کیا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ انہوں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اندھا دھند فائرنگ کر کے چھ بے گناہ دیہاتی ہلاک کر دیئے اور دس بارہ کو گرفتار کر کے کیمپ میں لے آئے۔

۴ ستمبر کو یہ لشکر سدہ پہنچا، جہاں سدہ اور بالش خیل کی فوجی چوکیوں کو تین چار ہزار غازیوں نے گھیرے

میں لے رکھا تھا۔ پاڑہ چنار کے قلعے کا بھی یہی حال تھا ـــــ انگریز لشکر نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اُدھر پاڑہ چنار کے دو ایک قبیلے بھی انگریزوں سے مل گئے جس سے حُریّت پسندوں کو تشویش لاحق ہو گئی، جنرل لوکہارٹ نے قبائل کو صُلح کی شرائط پیش کیں لیکن چکینی اور دوسرے قبیلوں نے واضح اعلان کر دیا کہ جب تک ہڈہ ملا صاحب، مُلّا سیّد اکبر اور دوسرے مذہبی رہنما حکم نہ دیں گے وہ انگریز کے خلاف کارروائیوں سے باز نہ رہیں گے۔

۱۶، ۱۷ ستمبر تک انگریز لشکر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ اس اثناء میں کئی قبائلی دیہات کو لوٹ لیا گیا۔ مکانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ فصلیں تباہ کر دی گئیں۔ مال مویشی اور ڈھور ڈنگر ہانک کر لے گئے تاہم غازی مقابلے میں ڈٹے رہے، طویل گفت و شنید کے بعد انگریزوں کی شرائط کے جواب میں موسیٰ زئی نے اپنے مطالبات اُن کے سامنے پیش کئے۔ جن میں کہا گیا تھا کہ

(۱) انگریز خیبر اور سمانہ کے علاقوں سے دستبردار ہو جائیں۔

(۲) نمک پر عائد کردہ محصول ختم کر دیا جائے اور

(۳) قبائلی عوام کو تمام سرحدی علاقوں میں آمد و رفت کی مکمل آزادی دی جائے۔

انگریز نے جان بوجھ کر فوجی کارروائیوں کو طول دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی غازیوں کا زور ٹوٹ گیا۔ غازیوں کے پاس خوراک کے ذخیرے تھے نہ رسد رسانی کے ذرائع، وہ لوگ تو سوکھی روٹیاں کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ آخر کب تک حکومت کی فوجوں سے ٹکر لیتے ـــــ قبائل کو خاموش دیکھ کر انگریز خوش ہوا کہ اس کا وقار بحال ہو گیا ہے چنانچہ موقع غنیمت پا کر انگریز لشکر واپس کوہاٹ کو چل دیا۔

پٹھان مجاہدوں کے جذبۂ حریّت اور جوشِ اسلامی کا یہ عالم تھا کہ روزنامہ "پائنیر" کے جنگی نامہ نگار نے، جو ان سرحدی معرکوں میں موقع پر موجود تھا، اپنی کتاب (RISINGS) "بغاوت" میں اعتراف کیا کہ

"ان پٹھان غازیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے پاس بندوقیں تک نہ تھیں۔ وہ صرف لاٹھیاں اٹھائے ہوئے یا خنجر سنبھالے ہوئے تھے۔ ہنستے کھیلتے، نعرے لگاتے وہ انگریز کی صفوں میں گھس جاتے اور فوجیوں پر بھرپور وار کرتے۔ موت اُن کے نزدیک کھیل تھا اور جنگ ایک تماشہ ـــــ وہ دشمن کی طرف یوں بڑھتے تھے جیسے شادی کی تقریب

میں براتی۔ اُن کے جسم پر پھٹے پُرانے چیتھڑے لگے ہوتے اور پاؤں میں جُوتا تک نہ ہوتا۔ گھاس پھوس کے چپل، جو وہ پہنے ہوئے ہوتے تھے، دَوڑ دھوپ میں ٹوٹ پھوٹ جاتے تو انہیں پھینک کر وہ ننگے پاؤں نکیلی چٹانوں اور تپتے ہوئے پتھروں پر دوڑنے لگتے۔"

اُتمان خیل مالاکنڈ اور مہمند کی مہمات سے انگریز کا مقصد محض اپنا بھرم قائم کرنا تھا ورنہ کسی جگہ بھی اُسے کوئی ٹھوس اور نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی ـــــ مورخوں کے نزدیک یہ ڈرامہ محض سرحدی قبائل کو مرعوب کرنے کے لئے کھیلا گیا تھا۔ سر ونسٹن چرچل انگریز کی سرحدی پالیسی کے کھوکھلا پن پہ اظہار رائے کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ

"۱۱ اکتوبر کو ایک دربار ترتیب دیا گیا ـــــ ایک چوکور میدان میں تین اطراف پہ قبائلی زعما نے نشستیں سنبھالیں جب کہ چوتھی طرف جنرل سر بائنڈن بلڈ اور اس کا ذاتی سٹاف، میجر ڈین (چیف پولیٹیکل افسر) گائیڈ رسالہ کے باڈی گارڈوں کے ہمراہ کرسیوں پہ براجمان تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد قبائلی اکابر نے بتایا کہ اُن کے چند گرم مزاج نوجوانوں نے عمرا خان جندول اور اُس کے ساتھیوں کی ترغیب پہ بزرگوں کی اجازت کے بغیر جنگ چھیڑ دی تھی۔ سارے قبیلے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہے ـــــ قبائلی ملکوں نے انگریز جنرل کو یقین دہانی کرائی کہ وہ صلح نامہ کی شرائط کے مطابق ساری رائفلیں واپس نہیں کر سکے۔ کوشش کی جائے گی کہ باقی ماندہ رائفلیں جلد واپس کر دی جائیں۔"

جنرل بلڈ نے جوابی تقریر میں کہا کہ

"چونکہ قبائلی لوگ پہلے ہی بہت نقصان اُٹھا چکے ہیں، اس لئے میں اُنہیں مزید سزا دینا پسند نہیں کرتا نہ کوئی ہرجانہ اُن پہ عائد کرتا ہوں"۔

اس پہ قبائلی بزرگوں نے ہاتھ لہرا لہرا کر اظہار پسندیدگی کیا اور معاہدے کی شرائط بجا لانے کا پورا یقین دلایا۔ اس طرح پندرہ منٹ کے اندر اندر یہ دربار برخاست ہو گیا۔"

بونیر یوسف زئی، مہمند، خیبر اور تیراہ کی طرف سے فراغت ہوئی تو انگریز نے چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بونیر کے لوگ بھی سوات اور مالاکنڈ

کے بھائی بندوں کے ساتھ شریکِ جہاد رہے تھے اس لئے فیصلہ ہوا کہ اس قبیلے پر بیک وقت دونوں جانب سے فوج کشی کی جائے۔ چنانچہ فوج کا ایک دستہ پشاور سے جلالہ کی راہ اور دوسرا مالاکنڈ سے روانہ ہو کر اُتمان خیل کے علاقے میں داخل ہو گیا۔

۲۲ نومبر کو فوج جلالہ سے روانہ ہوئی اور ۲۴ نومبر ۱۸۹۷ء کو ہرن کوٹ جا پہنچی ـــــ کوٹ کے مقام پر اتمان خیل کے معززین کا جرگہ ہوا جس نے پیغام بھیجا کہ ان کا قبیلہ انگریز سے معاہدہ کرنے پر تیار ہے۔ تاہم اِدھر تو نیت میں فتور تھا۔ انگریزی فوج اس یقین دہانی کے باوجود طوطالئی کے راستے آگے بڑھنے لگی۔ سیلہ پٹی، آگرہ اور دوسرے دیہات میں جا کر فوج نے اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا۔ ۲۹ نومبر تک اُتمان خیل نے شرائط مان لیں جس کے بعد یہ بے معنی مہم اپنے اختتام کو پہنچی۔

بونیر یوسف زئی لوگوں کا مسکن ہے، آبادی زیادہ نہیں، تاہم ان بہادروں نے امبیلہ، مالاکنڈ اور لنڈاکئی کے معرکوں میں بڑے قبیلوں کے شانہ بشانہ بھرپور حصہ لیا۔ علاوہ بریں ایک مدت تک اہلِ بونیر سید احمد شہید اور اُن کے پیروکار مجاہدوں کے حلیف۔ مربّی اور میزبان بھی رہے، یہی وجہ ہے کہ بونیر وال لوگوں کا وجود انگریز کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء میں جنرل سر بائنڈن بلڈ نے بونیر پر بھی فوج کشی کا منصوبہ بنایا۔ خود جنرل صاحب کی کمان میں ایک بہت بڑا فرنگی لشکر اس چھوٹے سے جانباز قبیلے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر انگریز جرنیل نے پورا زور لگایا کہ اہلِ بونیر کے علاوہ چملہ وال، گدون، ملی زئی اور خدوخیل سے بھی اپنی من مانی شرطیں منوائے۔ پوری دو ڈویژن فوج جنرل جیوفری اور جنرل میکل جان کی کمان میں کئی دنوں تک قبائلیوں کے سینوں پر بندوقیں تانے کھڑی رہی۔ قبائل نے بھی مورچے سنبھال لئے اور ہر پہاڑی گذرگاہ پر ایک ایک قبیلہ کے مجاہد اپنے دفاع کے لئے متعین کر دیئے ـــــ ساتھ ہی سیاسی گفت و شنید بھی جاری رہی بالآخر ڈپٹی کمشنر مردان اور پولیٹیکل حکام کی کوششوں سے ان قبیلوں نے حکومت کی کچھ شرطیں تسلیم کر لیں۔ بس اسی کو اپنی فتح قرار دیتے ہوئے انگریز لشکر واپس چلا گیا۔

۹۸-۱۸۹۷ء کی سرحدی مہمات سے برطانوی حکومت کی سرحدی پالیسی پر بڑے دُور رس اثرات مرتب ہوئے، انگریز ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ صوبہ سرحد کے دو لاکھ قبائلی جنگ آزماؤں کو دبانا کوئی آسان کام نہیں۔ نہ ہی "فارورڈ پالیسی" کے تحت قبائلی علاقوں میں مداخلت کا کوئی فائدہ

ہو سکتا ہے۔ اس لئے مارچ ۱۸۹۸ء میں برطانوی دارالامراء اور پارلیمان میں صوبہ سرحد کے امور پر کھل کر بحث ہوئی ۔ کئی حلقوں کی جانب سے اس امر کا بھی مطالبہ ہوا کہ سرحدی امور کو پنجاب کی انتظامیہ کے ہاتھ میں نہ رکھا جائے بلکہ صوبہ سرحد کو ایک الگ انتظامی وحدت قرار دیا جائے ۔ گویا وقتاً فوقتاً صوبہ سرحد کے قیام کا جو مطالبہ ہوا کرتا تھا ۔ ۱۸۹۷ء کے واقعات نے اُسے مزید تقویت دی ۔

داربرٹن اور دوسرے تجربہ کار سرحدی افسروں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ انگریز حاکم سرحدی عوام سے خود براہ راست رابطہ قائم کیا کریں اور مختلف خان خوانین، اربابوں یا ملکوں کی وساطت سے سرحدی قبائل کے معاملات کو نمٹانے کی پالیسی ترک کر دی جائے ۔

اس سے پیشتر یہ دستور تھا کہ عام حالات میں تو سرحدی علاقوں کا کنٹرول حکومت پنجاب کے ہاتھ میں ہوتا تاہم جنگ اور غیر معمولی حالات میں حکومت ہند خود ان علاقوں کے سارے اختیارات سنبھال لیتی ۔ اب اس امر کی کھل کر حمایت کی جانے لگی کہ سرحدی اضلاع پر مشتمل ایک الگ صوبہ بنایا جائے ۔ جس کا سربراہ (چیف کمشنر) سرحدی اضلاع کا انتظام بھی چلائے اور قبائلی علاقوں کے لئے گورنر جنرل کے ایجنٹ کے طور بھی فرائض انجام دے ۔

صوبۂ سرحد کا قیام

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز برِصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کے لئے ایک اہم تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صدی کے پہلے ہی سال سرحدی اضلاع اور قبائلی علاقوں پر مشتمل ایک الگ انتظامی وحدت "شمال مغربی صوبۂ سرحد" کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔

اصل میں ۱۸۹۷ء کی سرحدی مہمات انگریز حکمران کے لئے بڑی سبق آموز ثابت ہوئیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب ایک لاکھ کے لگ بھگ سپاہی اور سینکڑوں توپیں بھیج کر بھی وہ اہلِ سرحد کی رُوحِ آزادی کو کچلنے میں ناکام رہے تو پھر آخر وہ کون سا اقدام ہو گا جس کے تحت سرحدی اور قبائلی علاقوں کو پورے طور پر زیرِ نگین لایا جائے۔

اس وقت تک انگریز کی سرحدی پالیسی کے بارے میں دو مکتبِ فکر تھے، انگریز افسروں اور سیاستدانوں کا ایک گروہ تو اس امر کا حامی تھا کہ فرنگی حکومت کو پشاور سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہیئے اور قبائلی علاقوں کی سیاست سے لاتعلق رہنا چاہیئے جبکہ دوسرا گروہ ہر قیمت پر آگے بڑھنے اور ڈیورینڈ لائن تک کے سارے علاقوں کو براہِ راست اپنے زیرِ انتظام لانے کا حامی تھا۔ خواہ اس کے لئے ساری برطانوی سلطنت کو داؤ پر لگانا پڑے ـــــ ۱۸۹۷ء میں فرنگی فوجیں ابھی صوبہ سرحد کے مختلف قبیلوں سے برسرِ پیکار تھیں کہ ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور نئے وائسرائے لارڈ کرزن نے سنبھالی۔ کرزن امورِ خارجہ اور امورِ ہند کا ماہر اور بڑا پُرجوش اور جرأت مند حاکم تھا۔ اس لئے وہ بہرحال سرحدی مسئلے کے سلسلے میں کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ نہ تو فارورڈ پالیسی کا زیادہ مدّاح تھا نہ دریائے سندھ یا پشاور تک قدم واپس ہٹانے کا حامی تھا ـــــ وہ کسی درمیانی راستے کی تلاش میں تھا۔ آخر مسلسل سوچ اور محنت کے بعد اُس نے بزعم خود مسئلے کا یہ حل نکالا کہ :-

۱۔ سرحدی قبائل کے خلاف تادیبی مہموں کا سلسلہ ختم کر کے فوجوں کو قبائلی علاقوں سے نکال لیا جائے اور اُن کی جگہ سرحدی فوجی چوکیوں، قلعوں، سڑکوں اور ریلوے لائن کی حفاظت کے لئے ملیشیا کے سپاہیوں کو تعین کیا جائے۔

۲۔ پانچ سرحدی اضلاع اور پانچ قبائلی ایجنسیوں کو صوبہ پنجاب سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ "شمال مغربی سرحدی صوبہ" کے نام سے قائم کیا جائے۔

۳۔ اس نئے صوبہ کو ایک چیف کمشنر کی تحویل میں دیا جائے جو باقاعدہ اضلاع میں معمول حکومت چلائے جب کہ قبائلی علاقوں کے لئے وائسرائے یا مرکزی حکومت کے ایجنٹ (کانڈے) کے طور پر کام کرے۔

۴۔ چترال، مالاکنڈ اور چند دوسرے مقامات پر باقاعدہ افواج بدستور متعین رہیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۰۱ء کو شمال مغربی سرحدی صوبہ وجود میں آیا، پشاور، ہزارہ، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے باقاعدہ اضلاع اور مالاکنڈ (بشمول سوات، دیر، چترال) خیبر، کُرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کی پولیٹیکل ایجنسیاں اس میں شامل تھیں۔ چونکہ سرکاری اضلاع میں نظم و نسق کا طریق کار کچھ اور تھا اور قبائلی ایجنسیوں کا طریق کار کچھ اور ـــــ اس لئے سرکاری اضلاع پر ڈپٹی کمشنر (اور اُن کے تحت سب ڈویژنل آفیسر وغیرہ) مقرر کئے گئے جب کہ قبائلی علاقوں کے انتظامی سربراہ پولیٹیکل ایجنٹ کہلائے۔ مالاکنڈ ایجنسی میں چونکہ تین بڑی سرحدی ریاستیں شامل تھیں، اس لئے اس کا نظم و نسق براہِ راست مُلک کی مرکزی حکومت کی تحویل میں رہا ـــــ صوبے میں چیف کمشنر کی مدد کے لئے مالیہ وغیرہ کی وصولی پر ایک ریونیو کمشنر اور عدالتی کاموں کی نگرانی کے لئے ایک جوڈیشل کمشنر کا تقرر بھی عمل میں آیا۔

کئی حلقوں نے اس نئے صوبے کے قیام کو بہت ناپسند کیا، یہاں تک کہ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر میک ورتھ ینگ نے بھی نئے صوبے کی تشکیل پر پُرزور احتجاج کیا۔ وجہ یہ تھی کہ لارڈ کرزن نے اس سے مشورہ کئے بغیر یہ سکیم سیکرٹری آف سٹیٹ کو بھیج دی تھی۔ تاہم لارڈ کرزن ہر مخالفت کے باوجود اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا اور بالآخر اس نے صوبہ سرحد بنا کر ہی چھوڑا۔ لفٹیننٹ کرنل ہیرلڈ ڈین (HAROLD DEANE) اس نئے صوبے کا پہلا چیف کمشنر قرار پایا۔

نیا صوبہ پنجاب کی نسبت رقبہ میں ۱/۴ آمدن میں ۱/۵ اور آبادی میں ۱/۸ تھا۔ اس کی علیحدگی سے صوبہ پنجاب کے نظم ونسق پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑتا تھا۔ تاہم برصغیر کے ہندو سکھ عموماً اور صوبہ سرحد کے ہندو سکھ خصوصاً صوبہ سرحد کی تشکیل کے خلاف مسلسل احتجاج کرتے رہے، کئی موقعوں پر انہوں نے متعلقہ حاکموں کو محضر ناموں کے ذریعے اپنے جذبات سے آگاہ کیا لیکن کسی نے ان خودغرض عناصر کی باتوں پر توجہ نہ دی۔

نئے صوبے کے قیام سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کے تمام انتظامی امور اور مسائل پشاور ہی میں طے کئے جانے لگے اور لاہور، دہلی اور شملہ کی محتاجی ختم ہوگئی۔ دوسرے مقامی لوگوں میں اعتماد بحال ہوا۔ انہیں صوبے کے معاملات میں رائے دینے کا موقع ملا تو وہ اس کی تعمیر وترقی میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

لارڈ کرزن چونکہ صوبہ سرحد کے قیام کی مہم میں پیش پیش تھا، اس لئے نئے صوبے کے قیام کو اپنا فخریہ کارنامہ سمجھنے لگا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں ایک تقریر کے دوران اس نے دعویٰ کیا کہ

"گزشتہ سات سال کے دوران سرحدی قبائل کے خلاف ایک مہم کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ ۹۹-۱۸۹۴ء کے دوران جہاں ہندوستانی عوام کو ان سرحدی مہموں کی وجہ سے ۴۵ لاکھ پونڈ اخراجات کا بوجھ برداشت کرنا پڑا تھا وہیں اب محسود اور دوسرے قبائل کے خلاف اکادکا مہموں پر صرف ڈھائی لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں"۔

تاہم لارڈ کرزن کا یہ بیان مبالغہ آمیز تھا۔ وہ صرف اپنا دفاع کر رہا تھا ورنہ حالت یہ تھی کہ ۱۸۹۹ء میں چترال، وزیرستان اور درہ خیبر میں دس ہزار برطانوی فوجی موجود تھے اور سرحدی قبائل حسب سابق فرنگی استعمار کے خلاف سرگرمی سے مصروف جہاد تھے۔

محسود جنوبی وزیرستان میں انگریز کا اقتدار محض برائے نام تھا۔ محسود غازیوں کے گروہ ہر طرف کھلے بندوں پھرا کرتے تھے، نہ پولیس کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوتی تھی نہ ملیشیا کو ــــ ۱۸۹۴ء میں انگریزوں کو محسود لڑاکوں نے جو سبق سکھایا تھا وہ انہیں بھولنے نہ پایا تھا ــــ ۱۸۹۴ء کے آخر میں ڈیورینڈ معاہدے کے تحت قائم کیا جانے والا حدبندی مشن ابھی وانا ہی میں مقیم تھا کہ اس کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے۔ اکتوبر میں وزیری حملے کا خطرہ بڑھا تو انگریز

نے اپنے دفاعی انتظامات مضبوط کر لئے۔ اس کے باوجود دو اور تین نومبر کو درمیانی رات کو غازی انگریزی کیمپ کے باہر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ عین فجر کے وقت انہوں نے مُلّا پاوندہ کی رہنمائی میں ایسا بھرپور حملہ کیا کہ انگریز فوجیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گورکھا اور سکھ سپاہی اتنا بھی نہ کر سکے کہ خطرے کا الارم ہی بجا دیتے ـــــ تلواریں سونتے ہوئے، موت سے نڈر، محسود مردانِ مجاہد انگریز کے مسلح اور تربیت یافتہ سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپنے لگیں ـــــ صبح تک یہی عالم رہا ـــــ کشتوں کے پشتے لگ گئے ـــــ محسود تھے کہ برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جوشِ جہاد میں انہوں نے واپسی کا سوچا تک نہ تھا۔ انگریز نے ان کے بے احتیاطی سے فائدہ اٹھایا۔ چھاؤنی کے جرنیل ٹرنر (TURNER) نے میجر اومیلی (O'MEALY) کی کمان میں فوجی دستے بھیجے اور غازیوں کی واپسی کی راہ مسدود کر دی۔ دن چڑھے جب محسود اپنی کارروائی سے فارغ ہو کر واپس ہونے لگے تو مورچے سنبھالے ہوئے فوجی دستے نے اُن پر بے پناہ فائرنگ کی جس سے بہت سے غازی جامِ شہادت نوش کر گئے۔

اس معرکے کی خبر ملتے ہی افواجِ ہند میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ سر ولیم لوکہارٹ ایک بہت بڑا لشکر لے کر آن دھمکا۔ اس نے ۱۸ دسمبر تک محسود کو ہتھیار ڈال دینے کا الٹی میٹم دے دیا جب اس وقت تک بھی محسود نے الٹی میٹم کی پرواہ نہ کی تو انگریزی فوج کو تین حصّوں میں تقسیم کر کے بیک وقت وانا سے کافی گرام پر، جنڈولہ سے مکین پر اور تنّوں سے رزمک پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ تینوں مقامات محسود کے مرکزی قصبے تھے تاہم جب انگریز وہاں پہنچے تو انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ حسبِ معمول وزیر اور محسود لوگ اپنا سامان اور بیوی بچے نکال کر دور پہاڑی ٹھکانوں کو جا چکے تھے اور دیہات میں دور دور تک آدم تھا نہ آدم زاد ـــــ شدید سردی کے دن تھے، ہندوستانی سپاہی اتنی سردی کے عادی نہ تھے اس لئے سخت مشکل سے دوچار رہے۔

۹ جنوری ۱۸۹۵ء کو ساری فوج جنڈولہ میں جمع ہوئی۔ وزیریوں کے اکیس نمائندے آئے اور انگریز حاکموں سے بات چیت کی۔ بالآخر معمولی شرطوں پر صلح نامہ طے پا گیا۔

اس معاہدے کے نتیجے میں محسود اور بھی شیر ہو گئے اور بدستور انگریزی لشکر پر چھاپہ مار کارروائیوں میں مصروف رہے۔

فروری ۱۹۰۲ء میں ہونے والے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انگریز اسسٹنٹ کمشنر برن نے محسود کی سرکشی کا حال بیان کیا ہے کہ لالہ بھنجو رام تحصیلدار کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش تھا کہ محسود جرگہ کے لوگ اندر آ گئے۔ انہوں نے اعلانیہ تحصیلدار کو دھمکی دی کہ اگر اُس نے اس مقدمے میں محسود کے خلاف فیصلہ دیا تو اس کی خیر نہ ہوگی ـــــ عدالت نے کریم داد نامی ایک شخص کو بھیجا کہ وہ فتح خان (محسود) کی طرف سے ناجائز طور پر تعمیر کئے ہوئے بُرج (مورچہ) کو مسمار کر دے ـــــ کریم داد نے تعمیل تو کی لیکن مُدتوں کانپتا رہا کہ اگر میں فتح خان کے ہاتھ آ گیا تو میرا حشر کیا ہوگا۔؟

محسود لشکر نے سارے علاقے میں اتنی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ فوج اور ملیشیا کے سپاہی بھی اُن سے ٹکر لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ۱۸ر جون ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہے، بارآن کی فوجی چوکی کے باہر سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ ایک تھکا ماندہ مسافر اس کے پاس آیا۔ پانی طلب کیا۔ سپاہی نے بے پرواہی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا" اندر جاکر پانی پی لو ـــ" مسافر نے پانی بھی پیا اور چوکی کا اچھی طرح مشاہدہ بھی کر لیا۔ پانی پی کر وہ مُسافر تو چلتا بنا لیکن اس کے فوراً ہی بعد پندرہ بیس محسود نوجوانوں کا ایک گروہ آیا اور سپاہی یا سنتری کو غافل پاکر چپکے سے چوکی میں گھس گیا۔ چوکی کی کُل نفری ۲۲ سپاہیوں اور ایک دفعدار پر مشتمل تھی، اُن میں سے کچھ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، کچھ چارپائیوں پر دراز لوک گیت الاپ رہے تھے اور کچھ گھومتے پھرتے باہر گئے ہوئے تھے۔ محسود لڑاکوں نے جاتے ہی چوکی میں موجود سپاہیوں پر بندوقیں تان لیں، انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ دفعدار سے فوجی چوکی کی چابیاں لیکر میگزین سے سرکاری رائفلیں ۵۴۸ راؤنڈ گولیاں اور دوسرا سامان اٹھایا اور چپکے سے نکل کر جدھر سے آئے تھے، اُدھر چل دیئے۔

۳ر نومبر کو مرتضیٰ کی فوجی چوکی سے بارڈر پولیس کے سپاہی پریڈ کرتے ہوئے نکلے اور کچھ دُور چلے گئے۔ واپسی پر جب وہ ایک ٹیلے کے پاس سے گزرے تو محسود غازیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور آدھے سے زیادہ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس سے پہلے کئی موقعوں پر انگریز افسر محسود قبیلے پر مختلف" جرائم" کی پاداش میں جرمانے عائد کرتے رہتے تھے لیکن محسود کبھی ایک پائی تک جرمانہ ادا نہ کرتے تھے۔ مُلا پاوندہ نے انہیں اتنا منظم کر رکھا تھا کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت سے خائف نہ ہوتے تھے بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر مسکرایا کرتے تھے۔ محسود کے اس باغیانہ رویّے سے تنگ آکر انگریزوں نے میجر جنرل ایگرٹن کی کمان میں ان کے خلاف ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور محسود علاقوں پر چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا۔ مدتوں تک محسود کو نہ باہر سے خوراک پہنچ سکی نہ دوسری ضروریاتِ زندگی۔ لیکن اس ناکہ بندی کے باوجود اُن کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ تنگ آکر فوج کو حملے کا حکم دیا گیا اور چاروں طرف سے فرنگی سپاہی سرزمینِ محسود پر چڑھ دوڑے۔ بستیاں تباہ کر دی گئیں۔ تین سو افراد کو قیدی بنا لیا گیا جس پر محسود جرگے نے انگریز سے بات چیت شروع کی اور دس مارچ ۱۹۰۲ء کو صلح کی سترائط طے پا گئیں ان جھڑپوں میں سرکاری رپورٹوں کے مطابق ڈیڑھ سو سے زیادہ فوجی افسر اور سپاہی ہلاک ہوئے اور بہت سے زخمی اور ناکارہ ہو گئے۔ علاوہ ازیں سخت سردی کے ان دنوں میں ہندوستانی فوج کے سپاہی انتہائی خوار اور پریشان ہوئے۔ لیکن اُنہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

سیاسی سرگرمیاں

کہنے کو تو لارڈ کرزن نے سرحدی علاقوں پر مشتمل علیحدہ صوبہ قائم کر دیا۔ تاہم عوام ہر طرح کی سہولیات یا مراعات سے پھر بھی محروم ہی رہے۔ صوبہ پنجاب کے مروجہ قوانین بھی صوبہ سرحد میں نافذ نہ کئے گئے۔ منٹو مارلے سکیم یا مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کے تحت دی جانے والی سیاسی اصلاحات بھی اہلِ سرحد کے لئے ایک ممنوعہ شجر ہی رہیں۔ اس کے برعکس سرحدی علاقوں کے "مخصوص حالات" کا بہانہ بنا کر یہاں انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ قوانین نافذ کئے گئے جن میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (قوانینِ جرائم سرحد) اور MURDEROUS OUTRAGES ACT (جسے عام طور پر "غازی ایکٹ" بھی کہا جاتا تھا) شامل ہیں۔ ان ظالمانہ قوانین کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ کوئی سرحدی بھی ان سے بچ نہ سکتا تھا۔ نام تو قتل کا تھا لیکن اگر ایک انگریز افسر جھوٹے سے بھی یہ رپورٹ کر دیتا کہ مجھے فلاں دیسی شخص نے میلی آنکھ سے دیکھا ہے تو اُس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا جاتا اور اُسے پھانسی تک کی سزا کا مستوجب قرار دیا جا سکتا تھا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی تشکیل کے مدتوں بعد بھی یہ حال تھا کہ اگر کوئی دیسی (سرکاری اجازت نامے کے بغیر) شام کو مال روڈ، فورٹ روڈ یا پشاور چھاؤنی کی کسی شاہراہ پر گھومتا پھرتا نظر آتا یا بھولے سے بھی کسی گورے کی طرف اُنگلی اٹھاتا تو اُسے گرفتار کر کے سزا دی جاتی ـــ لطف یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا مقدمہ قائم ہو جاتا تو اس کی سماعت کے دوران نہ وکیل پیش کرنے کی اجازت دی جاتی نہ دلیل ہی سنی جاتی۔

ایسے ہی جابرانہ قوانین میں ایک "جرگہ سسٹم" بھی تھا۔ حکومتِ وقت کے چند خوشامدی اس جرگے کے ممبر ہوتے تھے۔ وہ کسی مقدمے کی سماعت کے دوران نہ تو "قانونِ شہادت" کو مدِنظر رکھتے نہ کسی اور ضابطے کو ـــــ خود ہی تحقیقات کرتے، خود ہی سزا سُنا دیتے ـــــ اور سزا بھی چودہ سال قید تک کی۔ برائے نام اس جرگے کے فیصلے کے خلاف اپیل کی اجازت تو تھی لیکن اپیل کے سلسلے میں بھی نہ وکیل پیش کئے جا سکتے نہ گواہ۔

ان حالات میں صوبہ سرحد کے عوام اور بالخصوص پڑھے لکھے طبقے کے افراد یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ علیحدہ صوبہ بنا کر بھی اُن کے ساتھ ایک طرح کا مذاق کیا گیا ہے۔ نہ تو رائے عامہ کو کوئی وقعت دی جاتی تھی، نہ حکومت کے کسی کاروبار میں عوام کو اعتماد میں لیا جاتا تھا ـــــ نیم فوجی اور نیم سول قسم کے افسر صوبہ سرحد میں تعین کئے جاتے تھے۔ جن کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا ـــــ ہر ایک زبان پر تالا ڈال دیا گیا تھا اور ہر ذہن سے سوچ چھین لی گئی تھی ـــــ اس سیاسی گھٹن کا جو نتیجہ برآمد ہونا تھا، برآمد ہوا اور لوگوں کے دل میں فرنگی راج سے نفرت کا جذبہ دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

مشنری سرگرمیاں

انگریز کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک خاص انداز تھا۔ ہر مسجد ایک باقاعدہ مکتب تھی، جہاں مروجہ علوم پڑھائے جاتے۔ ہر گاؤں اور ہر محلہ کا امام یا عالمِ دین۔ مذہبی امور اور مسائل میں لوگوں کی رہنمائی کرتا۔ ہر علاقے کا خان، ملک یا بزرگ تمام دُنیوی تنازعے طے کر دیتا۔ گویا زندگی ایک مربوط نظام کے تحت بسر ہو رہی تھی اور ہر بستی یا ہر قریہ ایک خود مختار یونٹ یا خود کفیل اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن انگریز نے آتے ہی اپنی مرضی کے خان خوانین مقرر کئے۔ آئمہ مساجد اور علمائے دین کی حیثیت کو عوام کی نظروں میں گرا دیا۔ مشنری سکول اور ہسپتال قائم کرنے شروع کر دیئے۔ ۱۸۵۵ء میں پشاور میں باقاعدہ ایک چرچ مشنری سوسائٹی پشاور قائم کی گئی جس نے کوہاٹی دروازہ میں ایک گرجا گھر تعمیر کرایا۔ اسی گرجا کے قریب اُس شاہی عمارت میں جو کبھی بارک زئی سردار یار محمد خان کی قیام گاہ تھی اور جہاں شاہ اسمٰعیلؒ دہلوی اور اُن کے مجاہد ساتھی بھی مقیم رہے تھے، ایک مشن سکول قائم کر دیا جو ترقی کرتے کرتے ہائی سکول بن گیا۔ پھر ۱۹۰۱ء میں مال روڈ پر مشن کالج کا قیام بھی عمل میں آیا جہاں سے ۱۹۰۳ء میں پہلی مرتبہ سات طلباء نے پنجاب یونیورسٹی

کا امتحان ایف اے پاس کیا۔

اس سے قبل مال روڈ پشاور پر کانونٹ چرچ کی بنیاد بھی رکھی جا چکی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک پادری نے اندرونِ شہر کی ایک سرائے میں شفاخانہ قائم کیا جو ترقی کر کے بڑا ہسپتال بن گیا تو اُسے ڈبگری دروازے کے باہر منتقل کر دیا اور آج تک "افغان مشن ہسپتال" کے نام سے کام کر رہا ہے، اس ہسپتال میں زیادہ تر قبائلی علاقوں کے غریب لوگ علاج کے لئے آتے۔ مشنری ورکران مریضوں کو اپنے مذہب کی ترغیب دیتے رہتے ـــــ ایک نوجوان لڑکا کافی عرصہ تک ہسپتال میں مریض رہا۔ ڈاکٹر اس کے سامنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرتے رہے، وہ کسی حد تک عیسائیت کی طرف مائل ہو گیا۔ جب ہسپتال سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں پہنچا اور اس نے لوگوں کو اپنے بدلے ہوئے خیالات سے آگاہ کیا تو اُس کے دیندار باپ کی غیرت اس امر کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت مشن ہسپتال پشاور پہنچا، ۱۶ر ۱۷ر مارچ ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب کو ڈاکٹر ورن سٹار (VERNON STARR) کے بنگلے پر دستک دی۔ ڈاکٹر باہر نکلا تو اُسے خنجر کے ایک ہی وار سے ڈھیر کر دیا گیا ـــــ اسی ڈاکٹر کی بیوہ مسز للین سٹار نے بعد میں ایس کے برآمد کرنے میں نمایاں حصہ لیا جسے عجب خان اٹھا کر تیراہ لے گیا تھا ـــــ پنوں میں ڈاکٹر پینل نامی مشنری نے سکول اور ہسپتال قائم کئے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ایک انگریز اہلِ قلم نے اُس کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ "ملک کی شمال مغربی سرحدوں پر ڈاکٹر پینل کا وجود دو بریگیڈ فوج کی موجودگی سے کہیں زیادہ مؤثر تھا"۔ انگریزی سکولوں کا چرچا ہوا اور وہاں کے پڑھے لکھوں کو ملازمتیں ملنے لگیں تو ۱۸۹۷ء میں پشاور میں میونسپل ہائی سکول بھی کھولا گیا جو بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ پشاور شہر کے نام سے موسوم ہوا۔

اُدھر ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمٰن خان، والی افغانستان فوت ہو گئے اور اُن کی جگہ امیر حبیب اللہ خان نے سنبھالی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خانہ جنگی اور باہمی کشمکش کے بغیر کوئی شخص کابل کا حکمران بنا ہو۔

صوبہ سرحد کے قیام اور تعلیم عام ہونے کے ساتھ یہاں کے لوگ ہندوستان کی سیاسی اور قومی تحریکوں سے متاثر ہوئے، ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ اخبارات شائع ہونے لگے، تحریکِ آزادی نے تقویت پائی اور جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ فرنگی حکمرانوں کے خلاف آئینی

اور سیاسی جدوجہد بھی شروع ہوگئی۔

وائسرائے کا دربار اگرچہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کا قیام شہنشاہ برطانیہ کے جشن سالگرہ کے موقع پر ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو عمل میں آیا تھا۔ تاہم اس صوبے کا باقاعدہ افتتاح ۲ اپریل ۱۹۰۲ء کو ہوا۔ اُس دن وائسرائے لارڈ کرزن خود پشاور آیا۔ شاہی باغ میں ایک عظیم الشان دربار ترتیب دیا گیا۔ جس میں سارے صوبے سے تین ہزار کے قریب خان خوانین معززین اور سرکاری افسروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر لارڈ کرزن نے حاضرین کو یقین دلایا کہ وہ صوبہ سرحد کے معاملات میں ذاتی دلچسپی لیتے رہیں گے اور حکومت ہند براہ راست سرحدی امور کے حل کرنے کی ذمہ دار ہوگی ـــــ وائسرائے نے اہل سرحد سے اپیل کی کہ وہ نئے صوبے میں امن وامان قائم رکھنے میں حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں اور اس کی ترقی اور بہبود کو اپنے ذاتی وقار اور حب الوطنی کا مسئلہ قرار دیں۔

فوج کی تنظیم نو نومبر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کچنر کو ہندوستانی افواج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تو اُس نے فوج کی تنظیم نو پر بڑی توجہ دی۔ پہلے ہندوستانی فوج شمالی جنوبی، مشرقی اور مغربی ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ اب اُسے نو ۹ ڈویژنوں میں تقسیم کر دیا گیا ـــــ باری باری ہر ڈویژن کو سرحدی اور قبائلی علاقوں میں تعین کیا جانے لگا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ پورے ملک کی فوج کو پہاڑی طریق جنگ کی تربیت مل جائے اور ایک ہی ڈویژن کو زیادہ عرصہ تک قبائلی علاقوں میں ڈیوٹی نہ دینی پڑے۔ بقول ولیم بارٹن صوبہ سرحد کو افواج ہند کے لئے ایک تربیت گاہ بنا دیا گیا۔

وزیرستان ۱۹۰۱ء میں شمالی وزیرستان کے قبیلہ مداخیل پر فوج کشی کی گئی اور اُنہیں ۱۸۹۷ء کے معاہدے کی شرائط کی پابندی کرنے پر مجبور کیا گیا۔

۱۹۰۲ء میں کابل خیل وزیریوں پر بیک وقت ٹل، عیدک اور ہنّوں کی جانب سے حملہ کر دیا گیا۔ اس حملے کے دوران کہیں بھی وسیع پیمانے پر مقابلہ تو نہ ہوا البتہ گمتی کے مقام پر چند مہم باز نوجوان وزیروں نے انگریزی لشکر کی خوب خبر لی۔

گمتی بُرج کا واقع افسانے سے بھی بڑھ کر دلچسپ ہے اور آج تک لوگ اسے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔

بنوں چھاؤنی کے نواح میں وزیریوں کا ایک قبیلہ کابل خیل آباد ہے۔ علاقہ کابل خیل کے ایک پہاڑی درّے میں گمتی کے مقام پر ایک قلعہ اور بُرج بنا ہوا تھا جو ایک مشہور وزیری مُہم باز اور شمشیر آزما کا مسکن تھا۔ وزیرستان کے اس رابن ہُڈ کا نام سیلچی تھا، بنوں اُن دنوں صوبہ سرحد میں ہندو سیٹھوں کا گڑھ تھا، ہندو آبادی کی اکثریت کی وجہ سے اسے "سرحد کا بنارس" کہا جاتا تھا۔ یہ ہندو خاصے دلیر اور ستیز تھے۔ اُن کے ہر مکان پر مورچے بنے ہوئے تھے، جونہی مسلمان سر اٹھاتے وہ مورچہ بند ہو کر بیٹھ جاتے اور مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔ تاہم ان سارے انتظامات اور احتیاطی تدابیر کے باوجود سیلچی اور اس کے ساتھی دن دہاڑے دندناتے آتے اور ہندوؤں کو لوٹ کر چلے جاتے۔ پولیس مُنہ دیکھتے رہ جاتی اور فوج بھی ان چھاپہ ماروں کا کچھ بگاڑ نہ سکتی ـــــ یہاں تک کہ بنوں چھاؤنی کے بنگلوں میں انگریز افسروں کے گھوڑے اور سامان بھی سیلچی کے ہاتھوں سے محفوظ نہ تھا۔ ۱۸۹۷ء کے بعد انگریزی علاقے پر وزیری حملوں میں اور بھی شدّت پیدا ہو گئی۔ اس پر انگریز افسروں نے ایک میٹنگ کی جس میں فیصلہ ہوا کہ جیسے بھی ہو سیلچی کے بُرج اور گمتی کے قلعہ کو مسمار کر دیا جائے۔ چنانچہ ۵۳ ویں سکھ رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر کرنل ٹنوچی۔ (TANN-OCHY) اور اس کا ایجوٹنٹ میجر وائٹ (BLANCO WHITE) کو ایک فوجی دستہ دے کر اس مُہم پر بھیجا گیا۔ اس دستے میں چھ سو افسر اور سپاہی شامل تھے اور ان کے پاس توپیں بھی تھیں۔ دوسری طرف سیلچی کے پاس گنے چُنے کُل آٹھ دس آدمی تھے، اور وہ اپنے ان جانثار ساتھیوں اور اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ بُرج میں مزے سے زندگی گزار رہا تھا ـــــ بڑی رازداری سے کام لیتے ہوئے انگریزی فوج کا یہ دستہ رات دو بجے بنوں چھاؤنی سے نکلا اور درّے کی جانب روانہ ہو گیا ـــــ صبح نو بجے تک انہوں نے گمتی بُرج کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ فوجی دستے کے ہمراہ پولیٹیکل آفیسر مسٹر ڈائلڈ بھی تھا۔ ڈائلڈ غیر معمولی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلعے کے دروازے کی جانب بڑھا اور صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اس پر سیلچی مذاکرات کے لئے تیار ہو گیا۔ انگریزوں نے سیلچی سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا جس کے جواب میں سیلچی نے یہ شرط پیش کی کہ اگر انگریز اُسے اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں نہ لگائے اور اس کے بُرج اور قلعہ کو مسمار نہ کرنے کا وعدہ کرے تو وہ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرنے پر تیار تھا ـــــ انگریز طاقت کے نشّہ میں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چھ سات سو

مسلح فوجیوں کے سامنے سات آٹھ آدمیوں کی بساط ہی کیا ہے۔ چنانچہ انگریز نے سیلجی کی کوئی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ اور توپوں سے برج اور قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ سیلجی اور اس کے جانباز ساتھی بھی ڈٹے رہے' تاہم فوج اپنا گھیرا تنگ کرتی گئی اور ہوتے ہوتے قلعے کے قریب پہنچ گئی — انہوں نے ایک بار پھر سیلجی کو ہتھیار ڈالنے کو کہا لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوا — اس اثناء میں فرنگی توپوں کی گولہ باری سے قلعے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ یہ حال دیکھ کر سیلجی فوراً فصیل پر نمودار ہوا اور اس نے دو انگریز توپچیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل ٹنوچی اور ڈانلڈ یہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھے کہ آیا اُن شگافوں سے فوج کا قلعے میں داخل ہونا ممکن ہے یا نہ — ؟ دیکھتے ہی دیکھتے سیلجی کی ایک گولی کرنل کے سینے پر آ کر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا — اپنے کمانڈنگ آفیسر کو مرتے دیکھ کر سپاہی دل چھوڑ بیٹھے تاہم پسپائی کی ذلت سے بچنے کے لئے پھر مقابلے پر ڈٹ گئے۔ کرنل کی موت کا بدلہ لینے کے لئے انجینئرز کا لفٹیننٹ براؤن دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور بارودی سُرنگ لگا کر قلعے کو اڑا دینے کی کوشش کی۔ پہلے پہل تو اُسے کامیابی نہ ہوئی لیکن بعد میں توپ کا ایک گولہ لگنے سے دیوار میں کافی شگاف پڑ گیا — انگریز سپاہی طوفان کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر آگے بڑھے کہ شگاف سے قلعے میں داخل ہو جائیں لیکن وزیری بدستور گولیاں برساتے رہے جن سے باڈی گارڈز کا ایک سکھ افسر زخمی ہو کر ایسا گرا کہ پھر اُٹھ نہ سکا۔

کہا جاتا ہے کہ اس معرکے میں وائٹ نے اپنے کرنل کی موت کا انتقام لینے کی قسم کھا رکھی تھی لیکن کرنل کا انتقام لیتے لیتے وہ اپنی جان بھی گنوا بیٹھا اور قلعے میں داخل ہوتے ہی ایک وزیری نے اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا۔

توپوں کی مسلسل گولہ باری کے آگے قلعے کی کچی دیواریں کہاں تک ٹھہرتیں، ایک ایک کر کے ساری دیواریں گر گئیں تو ساری انگریزی فوج ان بچارے چھ وزیریوں پر ٹوٹ پڑی۔ تاہم وہ جانباز آخر تک ڈٹے رہے اور لڑتے لڑتے ایک ایک کر کے جاں بحق ہو گئے، جب مقابلہ ختم ہو گیا۔ اور سناٹا چھا گیا تو سیلجی کی لاش کی ڈھونڈ یا پڑی۔ لاش ایک دیوار کے ملبے کے نیچے دب گئی تھی۔ سیلجی کو نکالا گیا تو بھی اس حال میں کہ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور بندوق کو اس نے اس

مضبوطی سے تھاما ہوا تھا کہ بمشکل دو آدمیوں نے اس کے ہاتھ سے بندوق الگ کی۔

اس وزیری جانباز کی ماں اور بیوی بھی اسی قلعے میں مقیم تھیں۔ اس قیامت خیز لڑائی میں انہوں نے انتہائی صبر و تحمل کا ثبوت دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ انگریز فوج گنتی کا بُرج گرانے جا رہی تھی تو جلیانوالہ باغ (امرتسر) میں ہزاروں انسانوں پر گولیاں برسانے والا انگریز جرنیل مائیکل او ڈائر O'DYER بھی اتفاق سے بنوں آیا ہوا تھا۔ وہ بھی تماشائی کی حیثیت سے حملہ آور لشکر کے ساتھ ہو لیا۔ مائیکل کا بیان ہے کہ سیلچی کی بیوی سے بڑھ کر خوبرو، باوقار اور وضع دار عورت مجھے دُنیا بھر میں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ـــــ بعد میں ان دونوں خواتین کو اُن کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب ڈانلڈ نے سیلچی کی شرطیں منظور نہ کیں اور جنگ ناگزیر ہو گئی تو وہ رائفل ہاتھ میں لئے سیدھا اپنی والدہ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ یہ معرکہ اس کی زندگی کا آخری معرکہ ثابت ہوگا۔ اس پر ماں نے اُسے گلے لگایا۔ دُعا دی اور خوشی خوشی رُخصت کیا ـــــ فی الواقع تھوڑی دیر بعد سیلچی اس دُنیا سے رُخصت ہو چکا تھا۔

کہنے کو تو انگریزی لشکر نے سیلچی کا چھوٹا سا مٹی اور گارے سے بنا ہُوا بُرج پیوندِ زمین کر دیا اور اس بات کو اپنی بہت بڑی کامیابی قرار دیا تاہم انہیں اس کی کچھ کم قیمت ادا نہ کرنی پڑی۔ یہ بُرج اُنہیں کتنا مہنگا پڑا، اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کرنل، ایک ایجوٹنٹ ایک لفٹیننٹ، کئی دیسی افسر اور بیسیوں سپاہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور انگریز کو معلوم ہو گیا کہ ایسی قوم سے پنجہ لڑانا جس کا ہر فرد موت کو ایک کھیل سمجھتا ہو، خالہ جی کا گھر نہیں ـــــ چنانچہ اس واقع کے کئی سال بعد تک انگریزوں کو وزیرستان کی طرف رُخ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سڑکیں اور ریل سرحدی علاقوں پر اپنا تسلط مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے انگریز نے ریلوے لائن بچھانے اور اسے قبائلی علاقوں تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ ضرورت پڑنے پر فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔ ۱۹۰۲ء میں خوشحال گڑھ کا پل تعمیر ہوا اور ریلوے لائن کوہاٹ تک پہنچ گئی ـــــ بعد میں اسے ہنگو اور ٹل تک بڑھا دیا گیا۔

کوہاٹ اور پشاور کو ملانے والی سڑک کی تعمیر یوں تو ۱۸۵۰ء ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ تاہم وقتاً فوقتاً اس پر کام بند ہو جاتا رہا۔ ۱۸۶۵ء میں درّہ کوہاٹ کے آفریدی انگریز سے اُلجھ پڑے تو کچھ

عرصہ کے لئے سڑک کی تعمیر معرضِ التواء میں پڑ گئی۔ ۱۸۶۶ء میں جرگہ بلایا گیا اور معاہدے کے نتیجے میں سڑک پر آمد و رفت بحال ہو گئی۔ ۱۸۷۵ء تک حالات پُرسکون رہے اور کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ لیکن اُسی سال کے آخر میں شیرا کئی قبیلہ نے انگریز کو مجبور کر دیا کہ وہ تعمیری کام سے ہاتھ اٹھا لے۔ ۱۸۷۷ء کو انگریزوں نے جنرل کے (KEYES) کے تحت ایک مُہم شیرا کئی اور جوا کئی کے خلاف بھیجی۔ پشاور سے جنرل راس (ROSS) بھی اس لشکر کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ مارچ ۱۸۷۸ء میں انگریز نے ان قبیلوں کو الاؤنس (مواجب) دینا منظور کر لیا اور اس طرح فریقین میں صلح ہو گئی۔ ۱۸۹۹ء میں درّہ آدم خیل کے قبائل نے الاؤنس میں اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ یہ الاؤنس سال بسال بڑھتے بڑھتے اس وقت تک ۲,۴۷,۰۰۰/- روپیہ تک جا پہنچا۔

کابل سے تعلقات

وائسرائے لارڈ کرزن امورِ خارجہ میں بھی گہری بصیرت رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ قبائلی علاقے میں امن و امان کا دار و مدار اس امر پر بھی ہے کہ کابل سے تعلقات خوشگوار ہوں، چنانچہ تخت نشینی کے فوراً بعد کرزن نے افغانستان کے نئے امیر حبیب اللہ خان کو دعوت دی کہ وہ پشاور آئے تاکہ اُن کے والد سے کئے گئے بین المملکتی معاہدے کی توثیق مزید ہو سکے۔ حبیب اللہ خان کابل چھوڑنے پر رضامند نہ تھا۔ اس لئے ۱۹۰۴ء میں سر لوئی ڈین کو کابل بھیجا گیا۔ طویل عرصے تک فریقین میں بات چیت ہوتی رہی۔ بالآخر ۲۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو برطانوی حکام اور امیرِ افغانستان کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا جس کی رُو سے برطانیہ نے سالانہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ زرِ امداد کے طور پر افغانستان کو دینا منظور کر لیا۔ اور اُسے یہ بھی اجازت دی کہ ہندوستان کی راہ اپنے دفاعی انتظامات کے لئے اسلحہ منگوائے۔ اس طرح افغانستان سے دوستانہ تعلقات کو فروغ اور استحکام حاصل ہوا۔

بعد میں ان دوستانہ تعلقات میں مزید استواری پیدا ہوئی۔ امیر حبیب اللہ خان ہندوستان آئے اور اس وقت کے وائسرائے لارڈ منٹو کے مہمان ہوئے۔ لارڈ کچنر، کمانڈر ان چیف، افواجِ ہند اس دورے میں سائے کی طرح امیرِ کابل کے ساتھ رہا اور اُس پر اس حد تک اثر انداز ہوا کہ امیر حبیب اللہ خان نے اس کی ایما پر فری میسن تحریک کی رکنیت اختیار کر لی۔ امیرِ کابل کو زیرِ دام لانے کے لئے کچنر اتنا بے تاب تھا کہ فری میسن کے اکثر ضابطے بھی ایک طرف رکھ دیئے۔ فری میسنری کے تین

مرحلے جو عموماً کئی سالوں میں طے ہوتے ہیں۔ راتوں رات طے ہو گئے اور لارڈ کچنر نے (جو صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد کی فری میسن لاج کے "گرینڈ ماسٹر" بھی تھے) امیر کابل کو "فرانٹیئر لاج" کا "ماسٹر میسن" بنا دیا ـــــ فری میسن میں حلف برداری عموماً بائبل پہ ہوتی ہے لیکن چونکہ امیر کابل بائبل پر حلف اُٹھانے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے اُسے قرآن شریف پر حلف دیا گیا، ایک رسالہ کے مطابق قرآن مجید کا وہ نسخہ جس پر امیر کابل نے حلف اٹھایا، اب تک بطور یادگار کلکتہ کے "فری میسن لاج" میں رکھا ہوا ہے۔

انگریز کی خوش قسمتی کہ امیر حبیب اللہ خان نے عمر بھر اُس سے عہد وفا نبھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگِ عظیم اوّل ۱۸-۱۹۱۴ء کے دوران افغانستان کا رویہ سرحدی اور قبائلی امور میں انگریز کے لئے بڑی تقویت کا باعث ثابت ہوا ـــــ افغانستان اور قبائلی علاقے ان دنوں بالکل پُرامن رہے صوبہ سرحد سے انگریز کو خوب بھرتی ملی۔ اور بالآخر برطانوی سلطنت جنگ کی اس آزمائش میں سُرخرو اور کامیاب ہو کر رہی۔

خیبر ریلوے خیبر ریلوے کا منصوبہ یوں تو ۱۸۷۹ء ہی سے انگریزی حکومت کے زیرِ غور تھا۔ تاہم ۱۸۹۷ء کی عام "بغاوت" کے بعد اس سرحدی ریلوے کی ضرورت اور بھی شدّت سے محسوس کی جانے لگی۔ اس کام کا جائزہ لینے کی ابتداء ۱۲ جولائی ۱۸۸۷ء کو ہوئی۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے چیف انجنیئر مسٹر بیکر خود موقع پہ پہنچے اور حالات کا جائزہ لیا۔ درّہ خیبر کے آس پاس کے قبائل بالخصوص ذخاخیل کا رویہ چونکہ انگریز سے زیادہ دوستانہ نہ تھا، دوسرے اس راہ میں پیچ دار گھاٹیاں اور سخت چڑھائی تھی اس لئے کچھ مدّت تک یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا اور اس کے مقابلے میں دریائے کابل کے ساتھ ساتھ ملاگوری، شلمان اور شنواری علاقہ سے ریلوے لائن نکالنے کا فیصلہ ہو گیا۔ کام شروع ہو گیا اور وارسک تک پٹڑی کہیں کہیں بچھا بھی دی گئی۔ اس کام کے لئے سروے فروری ۱۸۸۰ء میں کیپٹن میکڈانلڈ کی نگرانی میں ہوا تھا۔ خیبر ایجنسی کا پہلا انگریز پولیٹیکل آفیسر وارببرٹن بھی اس ریلوے لائن کے حق میں تھا۔ کیونکہ اس راہ سے "تورسپر" پہنچا جا سکتا تھا جو وارببرٹن کے خیال میں بہت عمدہ صحت افزاء مقام بن سکتا تھا۔ وارببرٹن کے خیال میں "تورسپر" چراٹ سے بھی زیادہ خوشگوار آب و ہوا والا مقام تھا۔ اس کے قریب شہید میانہ

کے پانی کے چشمے بھی تھے اور پشاور سے اس کا فاصلہ بھی صرف تیس میل تھا۔ دارسک والی ریلوے لائن ۱۹۰۵ء میں بچھائی گئی تھی لیکن بعد میں کچھ مشکلات کی وجہ سے یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔

تیسری افغان جنگ کے دوران فوجوں کی نقل و حمل میں دشواری کا سامنا ہوا تو انگریز نے از سرِ نو خیبر ریلوے کی تعمیر پر توجہ دی، جولائی ۱۹۲۰ء میں کرنل جی۔ آر۔ ہیرن (HEARN) کو منصوبے کا چیف انجینئر مقرر کیا گیا ـــــ خیبر ریلوے جمرود سے شروع ہوتی ہے جو سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ بلند ہے، جمرود کے بعد اس پر پہلا اسٹیشن بگھیاڑی ہے جو قلعہ بگھیاڑی کے نواح میں واقع ہے۔ اس سے بالکل اوپر چوٹی پر جنگئی سٹیشن ہے، ریل بل کھاتی ہوئی وہاں پہنچنے میں کافی وقت لیتی ہے، جب کہ پیدل پہنچنا وہاں نسبتاً بہت آسان ہے، بگھیاڑی کے بعد ایک پُل پر سے ہوتی ہوئی ریلوے لائن آگے بڑھتی ہے۔ کئی تنگ مقامات پر یہ پٹڑی انگریزی حرف (W) ڈبلیو کی طرح کبھی آگے کو بڑھتی ہے کبھی پیچھے کو ہٹ آتی ہے، شاہ گئی تک چڑھائی ہی چڑھائی ہے، اس جگہ ریلوے لائن بہت سی سرنگوں سے گزرتی ہے۔ کٹہ کُشتیا سے پھر اُترائی کا آغاز ہوتا ہے جب کہ لنڈی کوتل کے نواح میں میدانی علاقے واقع ہیں، لنڈی کوتل سطح سمندر سے ۳۵۰۰ فٹ بلند ہے، لنڈی کوتل سے تورخم تک بہت سے موڑ ہیں اور متعدد سرنگوں سے گزر کر ریلوے ٹرین آگے بڑھتی ہے۔ جمرود سے لنڈی کوتل تک ۲۶ میل کا فاصلہ ہے۔ اس میں ۳۴ سرنگیں ہیں جن کی مجموعی لمبائی تین میل ہے، جمرود سے لنڈی کوتل جانے کے لئے ریلوے لائن کو چھوٹے بڑے ۹۲ پُلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ریلوے لائن کی حفاظت کے لئے خاصہ دار مقرر ہیں۔ آج کل ہفتہ میں صرف ایک بار مسافر گاڑی پشاور اور لنڈی کوتل کے مابین چلتی ہے۔

اسلحہ کی تجارت

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں صوبہ سرحد میں انگریز کو جو مسائل درپیش تھے، اُن میں سے ایک سنگین مسئلہ اسلحہ کی ناجائز تجارت کا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے سرحدی مجاہدوں کے پاس صرف تلواریں ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ توڑے دار دیسی بندوقیں ـــــ لیکن اب قبائلیوں کے پاس اعلیٰ درجہ کی مارٹینی مارک ولایتی دُور مار بندوقیں عام ہوتی جا رہی تھیں ـــــ ان نئی بندوقوں کی مدد سے وہ قبائلی ملیشیا اور برطانوی فوج کے سپاہیوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں قبائلیوں نے خیبر کی بہت سی فوجی چوکیوں

سے سرکاری اسلحہ لوٹا تو اُن کی طاقت میں اور اضافہ ہوگیا — ۱۸۹۷ء کے بعد باہر سے اسلحہ کی آمد جاری رہی تاہم ۱۹۰۷ء میں تو تیس ہزار رائفلوں پر مشتمل ایک کھیپ کا پتہ چلا جو قبائلی علاقوں کے راستے قندھار بھیجی جارہی تھی — یہ اسلحہ چوری چھپے مکران کے ساحل پر لایا جاتا تھا پھر وہاں سے قبائلی علاقے میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۱۰ء تک اس قسم کی کم سے کم ایک لاکھ رائفلیں صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں پہنچ چکی تھیں۔ آدم خیل اور دوسرے قبیلے اس نفع بخش کاروبار میں پوری دلچسپی لے رہے تھے، بالآخر انگریزوں نے اپنی بحریہ کے ذریعے ساحلی علاقوں کی دیکھ بھال سخت کر دی، سرحد کے قبائلی علاقوں میں ملیشیا کو بھی چوکنا کر دیا گیا۔ یہ حال دیکھ کر آدم خیل طیش میں آ گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے خیبری آفریدیوں سے مل کر اس سلسلے میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ تاہم کافی حد تک اسلحہ کی سمگلنگ پر قابو پالیا گیا۔ اُدھر انگریزوں نے بھی ملیشیا، فرانٹیئر کور، فرانٹیئر کنسٹیبلری اور دوسرے سرحدی محافظوں کو جدید اور طاقتور اسلحہ سے لیس کر دیا تاکہ وہ قبائلی غازیوں کے مقابلے میں اپنی برتری قائم رکھ سکیں۔

اسی طرح اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ قبائلی علاقوں میں مفروروں اور جرائم پیشہ افراد کو پناہ نہ دی جا سکے۔ عام رواج یہ تھا کہ کوئی شخص یا گروہ سرکاری علاقے میں واردات کرنے کے بعد قبائلی علاقے میں پناہ لے لیتا تو قانون کے شکنجے سے بچ جاتا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ افغانستان سے نکالے ہوئے لوگ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں پہنچ جاتے۔ ایک دو بار خوست کے افغان عسکریوں نے اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور جب اُنہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو کُرم (پاڑہ چنار) میں آکر پناہ گزین ہو گئے اور اس طرح اپنی حکومت کے عتاب سے بچ گئے۔ مفروروں کے اس مسئلے سے نپٹنے میں افغان حکومت نے بھی انگریزوں کا پورا ساتھ دیا۔

سیاسی سرگرمیوں کی ابتداء

اُنیسویں صدی کے آخری عشرے میں سرسید احمد خان کی علمی اور فکری تحریک کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے، صوبہ سرحد کے جو نوجوان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فارغ ہو کر نکلے۔ وہ قومی اور ملّی جذبے کے تحت عوامی تحریکوں میں حصّہ لینے لگے۔ اخبارات نے بھی ذہنی بیداری پھیلانے میں اہم کردار انجام دیا۔ بالخصوص لاہور کا روزنامہ "زمیندار" تو مسلمان عوام کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

لوگ اس کی آمد کا یوں انتظار کرتے جیسے روزہ دار ہلالِ عید کا کیا کرتے ہیں؛ اس طرح تعلیم کے عام ہونے اور صحافت کے فروغ پانے سے عوام کے ذہنوں میں سیاسی خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ تاہم برصغیر میں سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال کا برطانوی فیصلہ تھا۔ انگریز نے انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مشرقی اضلاع اور آسام پر مشتمل قائم ہونے والے نئے صوبے میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، یہ وہی علاقے ہیں جو بعد میں مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کہلائے۔ تقسیمِ بنگال کے بعد مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں، تجارت، صنعت اور تعلیم کے شعبوں میں ترقی کے نمایاں مواقع ملے۔ ڈھاکہ میں یونیورسٹی اور اعلیٰ عدالتیں بنیں تو کلکتہ کی برتری ختم ہونے لگی، اقتصادی اور صنعتی شعبوں میں بھی غیر مسلموں پر انحصار کم ہونے لگا۔ یہ بات ہندو اکثریت کو گوارا نہ تھی، وہ تو یہی چاہتے تھے کہ مسلمان ہمیشہ اُن کے دست نگر رہیں اور وہ اُن سے اقتصادی فوائد حاصل کرتے رہیں۔ حالت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند تھے ــــ ایک لاکھ مسلمان سپاہی فوج سے فارغ کئے جا چکے تھے، فارسی کی بجائے "ہندوستانی" کے عدالتی زبان قرار پانے سے مسلمان پڑھے لکھوں کی ایک کثیر تعداد بے روزگار ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندو ہر میدان میں آگے تھا اور تمام وسائلِ آمدنی پر اس کا قبضہ تھا ــــ اب تقسیمِ بنگال کے بعد مسلمانوں کو سنبھلنے اور اُبھرنے کا موقع ملا تو اکثریتی طبقے کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف انتہائی تشدد آمیز مظاہرے شروع کر دیئے ــــ بم پھینکے گئے ــــ ریل گاڑیوں کی آمد و رفت میں خلل ڈالا گیا ــــ آگ لگانے کی کارروائیاں کی گئیں ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۱ء میں انگریز کو تقسیمِ بنگال کا فیصلہ منسوخ کرتے ہی بن پڑی۔ ابنائے وطن کی اس اسلام دشمن روش نے مسلمان رہنماؤں کو احساس دلایا کہ اُنہیں اپنے ملی حقوق کے تحفظ کے لئے اپنی الگ سیاسی تنظیم کی بنیاد ڈالنی چاہیئے، چنانچہ ۱۹۰۶ء میں "مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔

اسی زمانے سے صوبہ سرحد کے حریت پسندوں میں بھی اپنے حقوق کے تحفظ اور سیاسی آزادی کے حصول کا جذبہ بیدار ہوا ــــ تاہم انگریز صوبہ سرحد میں کسی کو اس انداز پر سوچنے کی اجازت کہاں دے سکتا تھا ــــ یہاں تو الگ صوبہ بن جانے کے باوجود مارشل لاء قسم کی حکومت تھی ــــ عوام نہ جلسہ

کر سکتے تھے نہ تقریریں ـــــ نہ کوئی سیاسی تنظیم قائم کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی مطالبہ حکومت تک پہنچا سکتے تھے ـــــ انتہائی سخت دَور تھا اور لوگوں کو فولادی ہاتھ سے دبا دیا گیا تھا تاہم آزادی کا جذبہ دبنے سے کہیں دبتا ہے ـــ؟ اندر ہی اندر لاوا اُبلتا رہا ـــــ اخبار بین طبقہ اور تعلیم یافتہ گروہ انگریزی حکومت کی چیرہ دستیوں اور "مخصوص حالات" کا ڈھونگ رچا کر صوبہ سرحد میں سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کی کوششوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرنے لگا۔

مُلک کے دوسرے صوبوں کے سرکردہ مسلمانوں نے البتہ ہمت سے کام لیا اور ایک وفد شملہ لے جا کر انگریز وائسرائے کو مسلمانانِ ہند کے مسائل سے آگاہ کیا، جس پر ۱۹۰۹ء میں حکومت نے مسلمانوں کی یک جہتی اور متفقہ مطالبے کے سامنے سپر ڈال دی اور تسلیم کر لیا کہ کونسلوں میں مسلمانوں کے نمائندے جُداگانہ انتخاب کے ذریعے چُنے جائیں گے ـــــ یہ فیصلہ دو قومی نظریئے کی بنیاد تھا تاہم اس فیصلہ سے بھی صوبہ سرحد کو کوئی فائدہ اس لئے پہنچنے نہ پایا کہ صوبہ سرحد میں نہ تو ۱۹۰۱ء کی اصلاحات نافذ کی گئیں نہ کسی اور قانون کے تحت سیاسی مراعات دی گئیں ـــــ اور یہ صوبہ حسبِ سابق "سرزمین بے آئین" بنا رہا۔ اسے دوسرے صوبوں کو دی جانے والی اصلاحات سے بھی محروم رکھا گیا ـــــ اس احساسِ محرومی نے قدرتاً اُس سیاسی بے چینی کو جنم دیا جس کا اظہار ۱۹۱۹ء کی جنگِ افغانستان اور ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے موقعوں پر صوبہ گیر مظاہروں، گرفتاریوں اور قصہ خوانی پشاور، ہاتھیاں، ٹکر اور دوسرے مقامات میں عوام پر فائرنگ کی صورت میں ہوا۔

اس وقت تک چونکہ صوبہ سرحد میں کوئی سیاسی تنظیم معرضِ وجود میں نہ آئی تھی۔ اس لئے سیاست سے دلچسپی رکھنے والے لوگ پنجاب کی سیاسی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ بقول اللہ بخش یوسفی سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی پاداش میں اوّلین گرفتاری ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء کو ہوئی جب مشہور صحافی پنڈت امیر چند بمبوال (ایڈیٹر فرنٹیئر ایڈووکیٹ پشاور) اور ان کے رفقاء کو جو پنجاب کانگرس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد پشاور واپس آ رہے تھے، خیرآباد ریلوے سٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ چونکہ انہوں نے تعزیراتِ ہند کے کسی ضابطے کی خلاف ورزی نہ کی تھی اس لئے ان کی گرفتاری "قوانینِ جرائم سرحد" کی دفعہ ۴۰ کی آڑ میں کی گئی ـــــ گرفتار کرتے ہی انہیں فوراً کمپنی باغ پشاور کے قریب، اس عمارت میں قید کر دیا گیا جہاں آجکل کور ہیڈ کوارٹر قائم ہے۔

ایک اور شخص جس پر سیاسی نوعیت کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ یار حسین تحصیل صوابی، ضلع مردان کا پنڈت رام چند تھا۔ وہ اخباروں میں مضمون لکھ کر اس امر کا مطالبہ کیا کرتا تھا کہ صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر سیاسی مراعات دی جائیں ـــــ تاہم رام چند گرفتار نہ کیا جا سکا، وہ روپوش ہو کر پنجاب چلا گیا اور انقلابی پارٹی میں شامل ہو گیا، جب وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کے واقعہ میں اُسے بھی ملوث قرار دیا گیا اور اُس کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے تو وہ ملک چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد انگریز کی شہ پر ایک سکھ نے ۲۳ اپریل ۱۹۱۸ء کو اُس پر قاتلانہ حملہ کر کے اُسے موت کی نیند سُلا دیا ـــــ اور اس طرح یہ پروانہ وطن، وطن سے دُور دیارِ غیر میں شمعِ وطن پہ نثار ہو گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ صوبہ سرحد کے سیاسی کارکن جن میں مولوی عبداللہ جان اور پنڈت امیر چند بموال پیش پیش تھے۔ قبائلی علاقہ سے اسلحہ خرید کر "عذر پارٹی" یا "انقلابی پارٹی" کے کارکنوں کو پہنچایا کرتے تھے۔

ذخا خیل ایک طرف سیاسی محاذ پر سرحدی عوام فرنگی حکومت کے خلاف مظاہروں میں مصروف تھے تو دوسری طرف قبائلِ سرحد بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ ذخا خیل آفریدی اکثر پشاور چھاؤنی پر چھاپے مارتے رہتے تھے بلکہ ایک بار تو اُن کے ایک سرفروش ملتان خان نے پشاور شہر کے بازار صرافہ کو لُوٹ لیا تھا اور پولیس ڈر کے مارے سامنے نہ آئی تھی۔ انگریز چاہتے تو یہ تھے کہ آفریدیوں کو سبق سکھائیں۔ لیکن ۱۸۹۷ء کی تباہ کاریاں ابھی اُنہیں بھولی نہ تھیں لہٰذا، انہوں نے صرف ذخا خیل قبیلہ ہی کے خلاف فوجی مُہم بھیجنے پر اکتفا کیا لیکن بہت جلد دوسرے قبیلوں کے آفریدی زعماؤں کے کہنے سُننے سے معاملہ جلد رفع دفع ہو گیا اور ذخا خیل نے صلح کی شرائط تسلیم کر لیں۔

مہمند مہمند اکثر شبقدر اور مچنی کے انگریزی قلعوں پر چھاپے مارتے رہتے تھے اور جو سامنے آتا تھا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے۔ کئی انگریز افسر اور سپاہی اُن کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ اس پر دو بریگیڈ فوج ان کے خلاف بھیجی گئی ـــــ مہمند اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے اتنی بڑی سپاہ کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے انہوں نے جرگہ کی

وساطت سے انگریز سے صلح کی شرطیں طے کرلیں۔

ذخاخیل کے بارے میں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر ہربرٹ ڈیون نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ سات سال کے عرصہ میں اُن کے ہاتھوں سرکاری علاقہ کے ۳۲ انگریز ہلاک، ۲۹ زخمی اور ۳۷ اغوا کئے جاچکے تھے۔ اغوا شدگان کو ذخاخیل نے رہائی تو دی لیکن بھاری رقمیں وصول کرنے کے بعد ــــ آفریدیوں کے خلاف فوجی مہم اتنی زوردار تھی کہ اس میں جنرل ولہل بھی (جو بعد میں فیلڈ مارشل کے عہدے تک پہنچا) شریک تھا ــــ ان قبائلی مہمات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قیام سے قبائلی سیاست قطعاً متاثر نہ ہوئی تھی۔ قبائلی حملے بدستور جاری تھے۔ فرنگ دشمنی قبائلی پالیسی کا سنگ بنیاد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سکھ اور انگریز حلقوں سے ایک بار پھر یہ مہم چلائی گئی۔ کہ سرحدی علاقوں کو دوبارہ صوبہ پنجاب ہی میں ضم کردیا جائے۔

تعلیمی ادارے بیسویں صدی شروع ہوتے ہی صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں بہت سے تعلیمی ادارے قائم ہوگئے تھے۔ ان میں چند ایک تو گورنمنٹ سکول تھے لیکن اکثریت مختلف انجمنوں کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں کی تھی ــــ گورنمنٹ ہائی سکول پشاور ۱۸۸۸ء میں، نیشنل ہائی سکول ۱۸۹۵ء میں، اسلامیہ ہائی سکول پشاور ۱۸۹۰ء میں قائم ہوا۔ ابتداء میں ان میں صرف پرائمری کلاسز تھیں لیکن بعد میں انہیں ہائی کا درجہ دے دیا گیا۔ پشاور اور بنوں کے مشن سکول پہلے سے قائم تھے۔ کوہاٹ کے باہمت مسلمانوں نے انجمن اسلامیہ کے تحت ایک معیاری سکول قائم کیا۔ یہی حال ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ہزارہ کا بھی تھا۔ ان اسلامیہ سکولوں کے سالانہ جلسوں میں اکثر پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں سے نامور قومی رہنما بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ نیشنل ہائی سکول پشاور (موجودہ گورنمنٹ ہائی سکول) چونکہ ایک آریہ سماجی تنظیم کے تحت چلتا تھا۔ اس لئے لالہ لاجپت رائے اور متعصب قسم کے دوسرے ہندو زعماء پشاور آکر اپنی زہریلی تقریروں سے فضاء کو مکدر کرتے رہتے تھے۔ اصل میں یہ دور مذہبی مناظروں اور تبلیغی سرگرمیوں کا دور تھا۔ ہر شعبۂ زندگی میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے مابین مسابقت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ہندوستان کے کئی مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوچکے تھے تاہم ۹۵ فی صد مسلم آبادی کا یہ علاقہ (صوبہ سرحد) اس وقت تک بالکل پُرامن اور پُرسکون تھا۔

پہلا ہندو مسلم فساد یہاں ۲۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو رونما ہوا۔ اُس سال اتفاقاً ہولی اور عید میلاد النبیؐ کے تہوار ایک ہی دن پڑتے تھے، ہندو ہولی پر باجے تاشے بجاتے، سوانگ بھرتے اور ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے تھے جب کہ مسلمان عید میلاد النبیؐ بے حد سادگی اور سنجیدگی سے منانے کے عادی تھے یہاں تک کہ بارہ وفات کے دوران کسی کو باجا بجانے یا گانے تک کی اجازت نہ ہوتی۔ اس رات کو ہندوؤں نے ڈھول ڈھمکا کے ساتھ ہولی کا جلوس نکالا تو مسلمانوں نے اعتراض کیا۔ ہندو اس پر برہم ہو گئے اور انہوں نے حملہ کر کے جان محمد نامی ایک مسلمان کو شہید کر دیا۔ صبح ہوئی اور جان محمد کا جنازہ اٹھا تو سخت اشتعال پھیل گیا ــــ ہندوؤں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ جو ہندو نظر آیا وہیں ڈھیر کر دیا گیا۔ اس پر لنڈی کے ارباب محمد حسین خان نے، جنہیں عام مسلمان احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے، عوام کا رُخ پھیرنے کے لئے یہ کہہ دیا کہ قتل و خون کیوں کرتے ہو، اس سے کیا ملے گا۔ بہتر ہے ہندوؤں کی دکانیں لُوٹ لو ــ بس پھر کیا تھا لوگ لُوٹ مار میں لگ گئے اور فساد ٹل گیا ــــ بعد میں مسلمان اکابر کی اپیل پر لوگوں نے لُوٹا ہوا مال بھی غیر مسلموں کو واپس کر دیا۔

اس سانحہ پر پنجاب کے ہندو پریس نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور برطانوی پارلیمنٹ تک احتجاجی قرار دادیں منظور کرانے کی کوشش کی۔ حسنِ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک مدبر رہنما سید امیر علی اُن دنوں انگلستان میں مقیم تھے، انہوں نے اس معاندانہ پروپیگنڈے کا جواب دیا۔ سر رَوس کیپل اُن دنوں ریٹائرمنٹ سے قبل کی رخصت کے سلسلے میں لندن گیا ہوا تھا۔ سید امیر علی نے کوشش کر کے اسے دوبارہ صوبہ سرحد کی چیف کمشنری پر واپس پشاور بھجوا دیا اور اس نے آکر حالات پر قابو پا لیا۔

ہمہ گیر بیداری

۱۹۱۲ء سے مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر بیداری کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کی ایک وجہ تو برطانوی حکومت کا وہ غیر دانشمندانہ فیصلہ تھا کہ اس نے اس ہندوؤں کے احتجاجی مظاہروں اور تشدد آمیز کارروائیوں کے دباؤ میں آکر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا اور مشرقی بنگال کے مسلمان ایک بار پھر اپنے صوبے کی ہندو اکثریت کے دستِ نگر بن کر رہ گئے۔ دوسرے بحیثیت مجموعی سارے عالمِ اسلام میں اہم سیاسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ مغربی طاقتوں نے کسی نہ کسی بہانے مسلمان ملکوں کو آزادی سے محروم کر دینے کی سازشیں تیز کر دی تھیں ایک بلی بھگت کے نتیجے میں شمالی ایران پر رُوس نے اور جنوبی ایران پر برطانیہ نے اپنی

سیادت قائم کرلی۔

۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس کی اسلامی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ ترکوں نے طرابلس کی مدد کے لئے فوج بھیجنی چاہی تو برطانیہ نے مصر سے ترک فوجوں کے گزرنے کی اجازت نہ دی۔ اُدھر بلقان کی ریاستوں نے اکٹھے ہو کر یورپ کی واحد اسلامی مملکت ترکیہ پر دھاوا بول دیا۔ اس پر ہندوستانی مسلمانوں نے ترک اور عرب بھائیوں کی حمایت میں پُرزور تحریک چلائی۔ لاکھوں روپے چندہ جمع کر کے ترکی کو بھیجا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک طبی وفد ترکی بھیجنے کا اعلان کیا جس کے قائد ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ صوبہ سرحد کے غیور مسلمان بھائی خلافت کی اس تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔

پشاور کے کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جن میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر، سید علی عباس بخاری، قاضی محمد ولی خان، حکیم محمد امین اور قاضی میر احمد خان کے نام قابلِ ذکر ہیں، آگے بڑھے اور ترکوں کی حمایت میں جلسے کئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب پشاور میں عام جلسوں کا رواج ہوا۔ اس سے پیشتر مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، خواجہ کمال الدین احمد پشاور میں تقریریں کر چکے تھے۔ لیکن وہ تقریریں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یا دوسری تعلیمی انجمنوں کے پلیٹ فارم سے ہوتی تھیں لیکن ۱۹۱۲ء کے بعد مسلمانوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا اور اُخوتِ اسلامی کے جذبے کے تحت وہ اپنے ترک اور عرب بھائیوں کے دُکھ درد کو اپنا ہی دُکھ درد سمجھنے لگے۔ بچہ بچہ سُرخ ہلالی نشان سینے پر سجائے میدانِ عمل میں کُود پڑا۔

غازی عبدالرحمٰن خان

جنگِ بلقان سے مسلمانانِ سرحد کی اس قدر گہری جذباتی وابستگی تھی کہ انور پاشا نوجوان نسل کے قومی ہیرو سمجھے جانے لگے۔ ہر گھر، ہر ہوٹل اور ہر دکان پر ترک غازیوں کی تصویریں بڑے فخر سے لگائی جاتی تھیں۔ نوجوانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جب ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبی وفد ترکی جانے لگا تو پشاور کے مشہور رئیس حاجی غلام صمدانی خان ٹھیکہ دار کے فرزند عبدالرحمٰن جو علی گڑھ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے، اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر ترکی روانہ ہو گئے۔ بعد میں دوسرے ارکانِ وفد تو واپس آ گئے لیکن عبدالرحمٰن نے ایک غلام ملک کو واپس آنے سے انکار کر دیا اور ترکی ہی میں رہ پڑے۔ وہ ترک غازیوں کے دوش بدوش شریکِ جہاد رہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت وہاں اُونچے عہدوں تک پہنچے۔ ترکی کے مشہور مدبر

اور جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کمانڈر عبدالرؤف بے عبدالرحمٰن کے اس جذبۂ ایثار سے اتنے متاثر ہوئے۔ کہ انہیں اپنا حقیقی بھائی سمجھنے لگے۔ مصطفیٰ کمال برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے بھی عبدالرحمٰن خان کی بڑی قدر و منزلت کی اور انہیں ترکی کی جانب سے افغانستان میں سفیر مقرر کیا گیا۔ کئی سال افغانستان میں گزار کر جب عبدالرحمٰن بے ترکی گئے تو ۲۳ مئی ۱۹۲۵ء کو کسی ظالم ارمنی نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ گویا عبدالرحمٰن بے ترکی کی اُسی خاک میں دفن ہوئے جس سے اُن کو اتنا لگاؤ تھا۔

بعد میں جب مشہور ترک رہنما خالدہ ادیب خانم ہندوستان کے دورے پر آئیں تو خاص طور پر عبدالرحمٰن بے کے مسکن، کوہاٹی دروازہ پشاور کو دیکھنے آئیں۔ اُن کے خاندان کی مہمان رہیں اور بیوہ عبدالرحمٰن بے کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر انصاری کی تجویز پر علی گڑھ سے ایک وفد صوبہ سرحد کے دورے پر آیا جس میں مولانا شبلی نعمانی بھی شامل تھے۔ ارکانِ وفد کی تقریروں نے عوام کے دلوں میں آزادی کی وہ شمع روشن کی جو آج تک فروزاں ہے۔

۱۹۱۴ء ہی وہ سال تھا جب انگریز کے خلاف نفرت کے جذبات شدت سے بھڑک اُٹھے اور اہلِ مغرب کی اسلام دشمنی پر شدید ردِ عمل دیکھنے میں آیا۔ مشہور مجاہد بزرگ حاجی صاحب ترنگ زئی ضلع پشاور سے سکونت ترک کر کے علاقہ آزاد مہمند کو منتقل ہو گئے اور عمر بھر انگریز کے خلاف مصروفِ جہاد رہے پشاور کے مشہور قومی کارکن حکیم محمد اسلم سنجری، قاضی غلام محی الدین، قاضی گل احمد اور دوسروں کو سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں چار چار سال قید کی سزا سنائی گئی۔ مشہور قومی رہنما حکیم عبدالجلیل ندوی کے بڑے بھائی حکیم محمد امین روپوش ہو کر بمبئی چلے گئے اور قیامِ پاکستان کے بعد ہی پشاور لوٹے۔

کانپور کی مسجد اگست ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی ایک مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے دل جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی وجہ سے پہلے ہی دُکھے ہوئے تھے اور وہ انگریز کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے، مسجد کے انہدام کی گستاخی پر ملک بھر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ ایک احتجاجی جلوس نکلا تو فرنگی نے اس پر گولی چلا دی۔ بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ اگرچہ یہ واقع صوبہ سرحد سے بہت دُور رُونما ہوا تاہم اس کا اہلِ سرحد پر شدید ردِ عمل ہوا۔ مسلمان عوام تو بھرے بیٹھے تھے انہوں نے مسجد کے انہدام پر انگریزوں کے خلاف وہ احتجاجی تقریریں کیں کہ

چاروں طرف آگ لگ گئی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو سلطان ترکیہ نے، جو خلیفۃ المسلمین بھی تھے، جرمنی کی حمایت میں برطانیہ اور اُس کے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، چونکہ اس وقت تک عرب اور فلسطین میں واقع تمام اسلامی مقامات مقدسہ (خانہ کعبہ، روضۂ سرکارِ دو عالمؐ، بیت المقدس وغیرہ) ترکوں کی تحویل میں تھے۔ مسلمان ہرگز یہ برداشت نہ کرتے تھے کہ یہ مقامات کسی غیر مسلم طاقت کے ہاتھ میں چلے جائیں۔ قدرتاً مسلمان ترکی کی حمایت کرنے پر مجبور تھے۔ اُدھر ترکوں کی حمایت کا مطلب انگریز کی مخالفت مول لینا تھا، اس لئے برصغیر کے مسلمان سخت مشکل سے دوچار تھے۔

ایسے میں مسلمان زعماء نے بڑے استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا۔ دینی رہنماؤں اور پیرانِ طریقت نے فتوے دیئے کہ انگریز کی فوج میں بھرتی حرام ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے "لندن ٹائمز" کی ہرزہ سرائی کے جواب میں ترکوں کی حمایت میں وہ فاضلانہ مقالہ لکھا کہ انگریز کے ایوانِ اقتدار میں زلزلہ آگیا۔ علی برادران کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد گرفتار کر لئے گئے۔ صوبہ سرحد کے خلافتی رہنماؤں کو بھی قید کر دیا گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی افغانستان پہنچ کر انقلاب برپا کرنے کی تیاریوں میں لگ گئے، سرحدی نوجوانوں میں سے محمد اکبر خان قریشی (ہری پور ہزارہ) اکبر شاہ میاں (بدرشی، نوشہرہ) سید علی عباس، قاضی ولی خان، امیر محمد خان درانی اور بیسیوں سرفروش ملک کو خیرباد کہہ کر دوسرے ممالک کو ہجرت کر گئے۔ ان عالی ہمت لوگوں نے ملک و ملت کی خاطر تمام تکلیفیں خندہ پیشانی اور مجاہدانہ عزم اور حوصلے کے ساتھ برداشت کیں۔

اسلامیہ کالج پشاور کا قیام

صوبہ سرحد کے لوگ ایک عرصہ تک تعلیمی پسماندگی کا شکار رہے وجہ یہ ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کے ہاتھوں اُن پر وہ ستم ٹوٹے کہ اُنہیں دم بیٹھنے اور اپنے اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کی فرصت ہی نہ ملی — اسلامی مدرسوں کا جو نظام مسلمانوں کے عہد میں قائم تھا وہ بھی دم توڑ چکا تھا کہ یہ مدرسے سرکاری سرپرستی سے محروم تھے — علاوہ بریں قدامت پسندوں کی جانب سے انگریزی تعلیم اور سرکاری سکولوں کی شدید مخالفت بھی جاری تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانانِ صوبہ سرحد تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گئے۔ انگریز بھی اپنی مخصوص مصلحت کے تحت عمداً سارے برصغیر اور خصوصاً سرحدی مسلمانوں کو تعلیم کی

طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ اعداد و شمار اس امر کے شاہد ہیں کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک سارے صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں پرائمری سکولوں کی تعداد ۸۸ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان میں سے صرف دو تین سکولوں کے ساتھ ہائی اور مڈل کلاسز کا انتظام تھا۔

بیسویں صدی عیسوی شروع ہوئی تو علی گڑھ اور لاہور کی دیکھا دیکھی صوبہ سرحد کے لوگوں میں بھی نئی تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ پشاور کے ایک رئیس مفتی فدا محمد خان یورپ سے بیرسٹری کی سند لے کر لوٹے تو انہوں نے جرأت سے کام لے کر لوگوں کو اسلامیہ سکول قائم کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ مشہور مخیّر بابو غلام حیدر خان ٹھیکیدار، میاں عبدالکریم اور دوسرے دوستوں نے اُن کا ساتھ دیا چنانچہ ۱۸۹۰ء میں پشاور میں انجمن حمایت الاسلام کے نام سے ایک جماعت بن گئی جس نے تھوڑے ہی عرصے میں کرایہ کی ایک عمارت میں پرائمری سکول جاری کر دیا۔ ۱۹۰۲ء تک اس سکول نے اسلامیہ ہائی سکول کی صورت اختیار کر لی۔ انجمن نے محلہ خداداد میں سکول کی اپنی عمارت تعمیر کرائی۔ کچھ عرصہ تک مشہور اہلِ قلم مولانا عبدالقادر بھی اس سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ طلباء کی تعداد بڑھی تو یہ عمارت ناکافی ثابت ہونے لگی جس پر سکول کابلی دروازے کے باہر (موجودہ خیبر بازار میں) منتقل کر دی گئی۔ پشاور کے مشہور خلافتی رہنما حاجی جان محمد نے اسلامیہ کلب بلڈنگ (موجودہ یونیورسٹی بک ایجنسی) قومی کاموں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ جہاں ایک ہال اور کلاس روم تعمیر ہوئے۔ وقت گزرنے پر سکول اپنی نئی عمارت (موجودہ ایڈورڈز گورنمنٹ ہائی سکول) میں منتقل ہو گیا۔ تو اسلامیہ کلب بلڈنگ پشاور یونیورسٹی کی تحویل میں دے دی گئی۔ جہاں دکانیں اور مارکیٹ بنا دی گئی۔

۱۹۰۸ء میں سر روس کیپل صوبہ سرحد کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ اُنہیں صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی رفاقت بیحد عزیز تھی۔ چنانچہ ۹ اگست ۱۹۰۹ء کو جب اسلامیہ ہائی سکول پشاور کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ تو صاحبزادہ صاحب کے کہنے پر چیف کمشنر نے اُس کی صدارت قبول کر لی۔ اس جلسے میں ایک قرارداد کی صورت میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانانِ صوبہ سرحد کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج (دارالعلوم) جلد قائم کیا جائے۔ سکول کے آنریری سیکرٹری قاضی عبدالاکبر خان نے عوام سے مالی معاونت کی اپیل کی تو اس کا بھی حوصلہ افزاء جواب ملا۔ انہیں دنوں سر صاحبزادہ اور سر روس کیپل کسی کام سے علی گڑھ گئے تو انہوں نے وہاں کالج کی کارکردگی اور دیگر امور کا تفصیلی جائزہ لیا۔ جنوری

۱۹۱۰ء میں مسلمانانِ صوبہ سرحد کی دعوت پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے سربراہ مولانا عبداللہ انصاری پشاور آئے تاکہ انجمن اسلامیہ کو نصابِ تعلیم کے بارے میں مشورہ دیں۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد تہکال بالا کے نواح میں واقع جگہ اسلامیہ کالج پشاور کی تعمیر کے لئے پسند کی گئی جو ہر لحاظ سے موزوں ثابت ہوئی۔

یوں تو صوبہ سرحد کے سبھی لوگوں نے اسلامیہ کالج کے قیام میں حتی المقدور حصہ لیا۔ تاہم سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان، میاں رحیم شاہ کاکاخیل۔ بالبہ غلام حیدر خان، میاں کریم بخش سیٹھی، عبدالمجید خان آف تنگی، ٹھیکیدار عبدالکریم خان، حاجی صحبت خان پٹرانگ، غلام سرور خان الکوزئی اور خوشحال خان آف سواتی ہر کام میں پیش پیش رہے۔ سیٹھی کریم بخش مرحوم نے دارالعلوم کی مسجد کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا۔ جب کہ نواب خانی زمان آف امب نے ایک لاکھ، نواب دیر نے سوا لاکھ اور میاں رحیم شاہ کاکاخیل نے ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ باقی لوگوں نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا چنانچہ مئی ۱۹۱۲ء تک آٹھ لاکھ بارہ ہزار چھیاسٹھ روپیہ کی رقم کالج کے لئے جمع ہوگئی۔

۲۱ مارچ ۱۹۱۲ء کو دارالعلوم سرحد (اسلامیہ کالج) پشاور کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ کارکنوں کی خواہش تھی کہ سنگِ بنیاد ایسی ہستی کے ہاتھوں رکھا جائے جو فی الواقع اس اعزاز کی مستحق ہو چنانچہ نگاہِ انتخاب حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی پر پڑی جو اس سے قبل مختلف مقامات پر کئی دینی مدرسے قائم کر چکے تھے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لئے شب و روز کوشاں تھے۔ ایک عظیم پنڈال بنایا گیا جس میں صوبہ سرحد اور پنجاب کے سرکردہ مسلمانوں نے شرکت کی۔

جلسے کا آغاز مولانا عبداللہ قطب شاہیؒ نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا اور اسلام میں علم و عمل کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ بعدہٗ حاجی صاحب ترنگ زئی نے کالج کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور کرنل سردار محمد اسلم خان نے چونے کا لگن اٹھا رکھا تھا۔ حاجی صاحبؒ نے مسجد کی پہلی اینٹ لگائی جس کے بعد موقع پر موجود تمام علمائے کرام اور سادات عظام نے ایک ایک اینٹ بنیاد کی رکھی۔

۱۹۱۳ء سے اسلامیہ کالج میں تدریسی کام شروع ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۳۷ء تک صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے دن رات کالج کی ترقی کے لئے کام کیا لیکن عین اُن دنوں جب کالج کی سلور جوبلی منانے کی تیاریاں

ہو رہی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

۱۹۵۰ء میں حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناح کی خواہش کے مطابق کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ نئے نئے شعبہ جات کھلتے گئے، بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور آج نہ صرف پشاور یونیورسٹی ملک کی ایک مثالی اقامتی یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر چکی ہے بلکہ صوبے میں گومل یونیورسٹی۔ زرعی یونیورسٹی اور انجینئرنگ یونیورسٹی بھی علمی ترقی کے ضمن میں نمایاں کردار بجا لا رہی ہیں۔

اسلامیہ کالج پشاور نے نہ صرف تعلیمی اعتبار سے ہزاروں نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ سارے صوبے کو ایک تعمیری لگن اور سیاسی ولولہ بھی عطا کیا۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں اس دارالعلوم کے فیض یافتہ لوگ پیش پیش ہیں۔ اسی دارالعلوم نے انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اہم ذمہ داریاں سنبھالیں اور اپنے صوبے اور اپنے ملک کے انتظام و استحکام میں نمایاں کردار ادا کریں۔

اگرچہ قومی مقاصد کی تکمیل کے لئے اسلامیہ کالج پشاور کا قیام ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا تاہم انگریز افسر اس درس گاہ کے بارے میں بھی اپنی سامراجی مصلحتوں کو ترجیح دیتے رہے۔ ایک موقع پر سر روس کیپل نے لکھا کہ

"میرے خیال میں اس کالج کے قیام سے قبائلی علاقوں میں امن و امان کی صورتِ حال پر بیحد خوشگوار اثر پڑے گا اور ان سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا کر نئی نسل یہ جان لے گی کہ انگریز اور اس کا نظمِ حکومت اتنا سیاہ اور قابلِ مذمت نہ تھا جتنا بنایا جاتا رہا۔"

اسی طرح اسلامیہ کالج پشاور (بلکہ اسلامیہ کالج لاہور اور مسلم مدرسہ کراچی) کے قیام سے فرنگیوں کا ایک مکروہ مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی مرکزی حیثیت کو ختم کیا جائے۔ ہر جگہ کے مسلمان الگ الگ اداروں میں تعلیم پائیں اور انہیں سر جوڑ کر بیٹھنے اور اپنے سیاسی مستقبل اور حقوق کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں سر ہیلے نے لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے) کو انتہائی رازداری سے لکھا کہ

"..... ایک رحمان علی گڑھ کو یکہ و تنہا چھوڑ دینے کا ہے ـــــ اور میرے خیال میں ہمیں اس رجحان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے ..... اگر ہم اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ کالج لاہور اور ڈھاکہ اور بمبئی کے مجوزہ کالجوں کی سرپرستی کریں تو علی گڑھ کی موجودہ حیثیت

ختم ہو کر رہ جائے گی ــــ"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز مسلمانانِ ہند کو کوئی موقع ایسا فراہم کرنے پر تیار نہ تھے۔ جس سے اُن میں فکری ہم آہنگی یا وحدتِ عمل پیدا ہو، چنانچہ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس پشاور میں منعقد کئے جانے کی تجویز ہوئی تو حکومتِ صوبہ سرحد نے اُس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اس پر یہ اجلاس پشاور کی بجائے راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ البتہ صوبہ سرحد سے دوسرے مندوبوں کے علاوہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔

ایک مرتبہ علی گڑھ کے ایک وفد نے اسلامیہ کالج پشاور کا دورہ کرنا چاہا تو اُسے بھی ایسا کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اسی طرح راجہ صاحب محمود آباد نے صاحبزادہ صاحب کو لکھا کہ آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے صوبہ سرحد کے نوابوں، خوانین یا اکابر میں سے کسی کا نام تجویز کیا جائے تو بھی انہوں نے خاموشی اختیار کر لی ــــ یہ سب کچھ فرنگی حاکموں ہی کے اشارے پر ہوتا رہا۔

انگریز دل سے یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں سے صوبہ سرحد کے عوام متاثر ہونے نہ پائیں ــــ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ آزادی کی اس جنگ میں صوبہ سرحد کے حریت پیشہ لوگ پیچھے رہ جائیں ــــ وہ ہندوستان کے حریت پسندوں سے کامل ہم آہنگی کا اظہار کرنے لگے تو فرنگی کے سارے منصوبے خاک میں مل کر رہ گئے۔

اخبارات نے جو ذہنی بیداری پھیلائی تھی صوبہ سرحد کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اُس سے متاثر ہوا، چنانچہ اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء کے ایک گروہ نے مولانا محمد علی جوہر کے کہنے پر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ دہلی میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا ــــ اس موقع پر جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جب تیس چالیس طلباء کا یہ دستہ دہلی جا رہا تھا تو اسلامیہ کالج پشاور کے قریباً سبھی طالب علم انہیں الوداع کہنے پشاور چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ جامعہ ملیہ جانے والے جرأت مند طلباء میں خان عبدالقیوم خان، ملک امیر عالم اعوان، ماسٹر میر قلم خان نیازی اور مولانا غلام ربانی لودھی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن خدام کعبہ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان چھڑ جانے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے اسلامی جذبات جوش پر تھے۔ وہ ہر شعبۂ زندگی میں غیر کی دستِ نگری ختم کرنے

پُتلے ہوئے تھے۔ اُن دنوں مسلمانانِ ہند کو ایک مسئلہ یہ درپیش تھا کہ حج پہ جانے والوں کا بڑا استحصال کیا جاتا تھا۔ تمام جہاز ران کمپنیاں غیر مسلموں کی ملکیت تھیں۔ وہ پہلے تو حاجیوں کے لئے رعایتی کرایہ کا اعلان کرتے لیکن جب حجّاج کرام بمبئی پہنچتے تو عین موقع پر کرائے کی رقم بڑھا دی جاتی۔ اسی طرح معاہدے کے باوجود حاجیوں کو جہازوں میں کھانا نہ دیا جاتا۔ حجّاج کی ان مشکلات کو دُور کرنے کے لئے مولانا عبدالباری فرنگی محل اور مولانا شوکت علی نے "انجمن خدّامِ کعبہ" کی بنیاد رکھی جس کا مقصد اپنے جہاز خرید کر رعایتی کرایہ پہ عازمینِ حج کو حجاز پہنچانا تھا

اگرچہ انجمن خدّام کعبہ خالصتاً رفاہی جماعت تھی تاہم انگریز افسروں کو اس سے بھی سیاست کی بُو آنے لگی۔ چنانچہ سر ولیم ہارٹن نے لکھا کہ

"مسلم ہندوستان میں ہمیشہ مذہبی جذبات سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ یہ لوگ برطانیہ اور ہندو کے خلاف نفرت کو ہوا دے کر دوبارہ اسلامی حکومت کے قیام کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ ان جذبات کو خفیہ انجمنوں مثلاً خدّام کعبہ، دیوبندی تحریک وغیرہ اور بھڑکاتی رہتی ہیں۔"

چنانچہ پشاور میں خدّام کعبہ کے سرگرم ارکان حکیم محمد امین اور سید سلطان شاہ وغیرہ کو مختلف حیلوں بہانوں کے تحت گرفتار کر کے اُن پر سختیاں کی گئیں۔ بعد میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی نظر بندی کی وجہ سے انجمن خدّام کعبہ بھی خود بخود ختم ہو گئی تو کارکنوں کی جان چھوٹی۔

پہلی جنگِ عظیم

پہلی جنگِ عظیم جس نے دُنیا کے قریب قریب ہر قابلِ ذکر مُلک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو اختتام کو پہنچی۔

جو معمولی واقع اتنی بڑی جنگ کا پیش خیمہ بنا وہ یہ تھا کہ آسٹریا کا ولی عہد شہزادہ فرڈی ننڈ سربیا کے ایک شخص کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ دونوں ملکوں میں اس بات پر جنگ چھڑی تو دوسرے ملکوں میں سے کسی نے ایک فریق کا ساتھ دیا تو کسی نے دوسرے کا ـــ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری دُنیا دو کیمپوں میں بٹ گئی۔ آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، ترکیہ اور جرمنی پانچ ملک ایک طرف تھے تو امریکہ برطانیہ، آسٹریلیا، اٹلی، جنوبی افریقہ، بلجیم، پرتگال، جاپان، رُوس، رُومانیہ، سرویا، فرانس، کینیڈا، مانٹینگرو، یونان، نیوزی لینڈ اور ہندوستان سترہ ممالک پر مشتمل گروہ دوسری طرف۔ مسلمانوں کی اس جنگ سے دلچسپی ترکی کی شمولیت کے باعث تھی۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر اس وقت کے ترک وزیرِ جنگ غازی انور پاشا کی وساطت سے بہت کوشش کی کہ ترکی جنگ کی آگ میں نہ کُودے لیکن اُن کا مشورہ قبول نہ کیا گیا اور بالآخر نومبر ۱۹۱۴ء میں حکومتِ ترکیہ نے جرمنوں کی طرفداری میں جنگ میں حصّہ لینے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانانِ ہند کو ترکی سے جذباتی وابستگی تھی۔ سلطان ترکی اس وقت تک خلیفۃ المسلمین کے منصب پر فائز تھا اور مسلمان ہر قیمت پر اس مرکزِ خلافت کی حمایت اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔

بحیثیت مجموعی جنگ کے سلسلے میں ہندوستان کے لوگوں نے انگریز کا بڑا ساتھ دیا۔ انسائیکلوپیڈیا

آف برٹانیکا کے مطابق ہندوستان نے جان و مال سے انگریزوں کی مدد کی۔ ہندوستان کی سپاہِ عظیم آٹھ لاکھ جنگ آزماؤں اور چار لاکھ غیر عسکری افراد پر مشتمل تھی جن میں سے مختلف محاذوں پر چھتیس ہزار ہندوستانی سپاہی مارے گئے اور ستر ہزار مجروح ہوئے ـــــ لارڈ ہارڈنگ کے الفاظ میں "اس جنگ میں ہندوستان نے اپنا اس قدر خون دیا کہ وہ خود بالکل ہی سفید ہو گیا ـــ" ہندوستان نے مالی اعتبار سے دس کروڑ پاؤنڈ (ڈیڑھ ارب روپیہ) انگریز کی نذر کیا۔ علاوہ ازیں مختلف حیلوں بہانوں سے دو ارب تیس کروڑ سے زیادہ کا قرض بھی ہندوستان سے لیا گیا۔ فوجوں کے مصارف اس سے الگ تھے۔ اشیائے خورد و نوش اور سامانِ جنگ اس کثرت سے باہر بھیجا گیا کہ خود ملک کے غریب طبقوں کو فاقہ کشی پر مجبور ہونا پڑا۔ جنگ ختم ہونے کے مدتوں بعد تک سخت کساد بازاری کا عالم رہا اور عوام کو سخت مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔

صوبہ سرحد اور جنگِ عظیم

کرنل کین نے اپنی کتاب "جنگِ عظیم اور صوبہ سرحد" میں لکھا ہے کہ "یہ درست ہے کہ جنگ کے دوران ہمیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ہمارے مخالفوں نے لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کیں تاہم صوبہ سرحد کی اکثریت عملی طور پر انگریز کی مخالفت سے باز رہی۔"

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل وار کمیٹیاں اس لئے قائم کیں کہ وہ وار فنڈ جمع کریں۔ اور نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کی رغبت دلائیں۔ ان وار کمیٹیوں کی کوششوں کے نتیجے میں صوبہ سرحد کے عوام نے انگریز کو جنگی امداد کے طور پر ۱،۳۸،۴۵۱/- روپیہ چندہ دیا۔ اس رقم میں سے ۲۴۶۱۲ روپیہ شہری دفاع کے اخراجات کے لئے وضع کر کے باقی رقم مرکزی حکومت کو بھیج دی گئی۔ اس کے علاوہ جنگی قرضے میں صوبہ سرحد کے لوگوں نے ۲۶،۹۰،۲۱۰/- روپیہ کی رقم لگائی ـــ اُن دنوں صوبہ سرحد میں سر روس کیپل چیف کمشنر تھے جو لوگوں کے ساتھ گھل مل کر کام کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اُن سے بڑا تعاون کیا، خصوصاً امب، چترال اور دوسرے والیانِ ریاست، بڑے بڑے خان خوانین اور ہندو سیٹھوں نے بڑھ چڑھ کر جنگ کے سلسلے میں انگریز کی مالی مدد کی۔

اس سے پہلے فوجی بھرتی کے سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس نے اپنی رپورٹ میں

سرحدی پٹھانوں کو "بہترین لڑاکا" قرار دیا تھا۔ (اس کمیٹی کا مقصد ہی یہ معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان کی کون سی قوموں کو فوج میں بھرتی کیا جائے اور کن پر بھرتی کے دروازے بند کر دیئے جائیں) چنانچہ جنگِ عظیم کے شروع میں پندرہ ہزار سرحدی نوجوان انگریز کی باقاعدہ افواج میں بھرتی تھے۔ جنگ کے دوران سرکردہ افراد پر مشتمل ضلعی ریکروٹنگ کمیٹیاں قائم کی گئیں جن کی کوششوں سے ۴۵۴ر۳۲ لڑاکا جوانوں کے علاوہ ۱۳۰۵۰ غیر لڑاکا افراد سرحدی علاقوں سے برطانوی فوج میں بھرتی ہوئے۔ علاوہ بریں ۴۱۶ر۱۳ افراد ملیشیا اور بارڈر پولیس میں مختلف سرحدی چوکیوں میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

عوام کا ردِ عمل انگریزی حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود فضا پورے طور پر اس کے حق میں سازگار نہ تھی۔ مسلمان عوام دل سے چاہتے تھے کہ ترکوں اور دوسرے مسلمانوں پر کوئی زیادتی ہونے نہ پائے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد ـــــ جو اُس وقت مسلمانانِ ہند کی آواز تھے۔ انگریز سے تعاون کو ہرگز جائز نہ سمجھتے تھے اور اپنی تقریروں میں مسلم عوام کو برطانوی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن پر "بغاوت" کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ کراچی کے خالقدینا ہال میں مقدمے کی سماعت ہوئی اور اُن سب رہنماؤں کو قید میں ڈال دیا گیا ـــــ صوبہ سرحد کے عوام بھی مُلک کے سیاسی حالات سے متاثر ہوئے اور خلافتی رہنماؤں کی تقلید میں برابر انگریزوں کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔

اس موقع پر انگریزوں نے کئی سیاسی چالیں چلیں۔ بہت سے نام نہاد علماء سے فتوے حاصل کئے کہ جنگ میں انگریز کی امداد کرنا ضروری ہے۔ ان لوگوں کا مؤقف یہ تھا کہ جنگِ عظیم میں انگریزوں کی شکست کی صورت میں ہندوستان پر بھی جرمنی حملے کا ڈر ہے، اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کریں تاکہ ملک جنگ کی آگ سے محفوظ رہے۔

افغانستان کی سیاسی غلطی خود افغانستان اور ایران بھی رُوس کے متوقع حملے سے اتنے خوفزدہ تھے کہ اُنہیں انگریز کے سامنے آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ انگریز نے فوراً ہی جنگ کی آڑ میں کوئٹہ نوشکی ریلوے کو زاہدان تک بڑھا دیا تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو تاہم افغانستان اور ایران نے اُن کے اقدام پر چُپ سادھے رکھی۔

اُس وقت تک سرحدی قبائل اکثر و بیشتر ہر معاملے میں امیرِ کابل کے اشارۂ ابرو پر چلا کرتے تھے۔ اور مسلمان حکمران کی پیروی کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ انگریز کی غلامی کے دوران یہ حکمتِ عملی قدرتی طور پر درست بھی تھی ـــــ جنگِ عظیم کے دوران اوّل اوّل سرحدی قبائل بالکل خاموش رہے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ امیرِ افغانستان کی جانب سے کچھ حرکت ہو تو وہ بھی انگریز کے خلاف میدانِ جہاد میں کود پڑیں۔ لیکن کابلی حکمرانوں نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا حالانکہ ایسے وقت جب انگریز اپنے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا، تھوڑی سی ہمت کر کے سرحدی علاقوں کو فرنگی کے پنجے سے آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ تاہم امیرِ کابل نے "مجرمانہ خاموشی" اختیار کئے رکھی۔ بلکہ حبیب اللہ خان نے جو فری میسن تحریک کا ممبر بھی بن چکا تھا، الٹا انگریز کو اپنے تعاون کا یقین دلایا، اس طرح سرحدی قبائل اور کابلی حکمرانوں کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد انگریز نے اپنا سارا زور صوبہ سرحد کے سیاسی کارکنوں کے خلاف صرف کیا۔ سارا نزلہ اُن بیچاروں پر گرا اور جس شخص پر بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کا شُبہ ہوا، اُسے جیل میں ڈال دیا گیا۔

جمعیت عالیہ مجاہدین چمرقند کے امیر مولانا ابوسعید فضل الٰہی نے امیر حبیب اللہ خان کی اس پالیسی کو "بیسویں صدی کی سب سے بڑی سیاسی غلطی" قرار دیتے ہوئے ایک کتابچہ میں لکھا ہے کہ

"شروع شروع میں جب جنگِ عظیم کے دوران ترکوں اور جرمنوں نے انگریزوں کو پوری طرح دبا رکھا تھا تو یہ سنہری موقع تھا کہ انگریزی اقتدار پر افغانستان کی طرف سے بھی کاری ضرب لگائی جاتی۔ اس صورت میں صوبہ سرحد اور آزاد قبائل کا علاقہ بغیر کسی مزاحمت کے مسلمان حاکم کے قبضہ میں آجاتا۔"

مولانا فضل الٰہی نے سر ولیم بارٹن (BARTON) کی کتاب "INDIA - NORTH - WEST FRONTIER" کا ایک اقتباس دیا ہے جس میں بارٹن اعتراف کرتا ہے کہ

"برطانوی حکمتِ عملی سے اختلاف کے باوجود جنگِ عظیم (اوّل) کے دوران امیر حبیب اللہ خان اپنے سابقہ وعدوں کے پابند رہے، حالانکہ اگر اس موقع پر وہ جہاد کا اعلان کر دیتے تو انگریزوں کے لئے ہندوستان پر قابض رہنا مشکل ہو جاتا۔"

بقول مولانا فضل الٰہی جنگِ عظیم کے دوران شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے بھی سیاسی فروگذاشت۔

ہوئی وہ انگریزوں کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی غرض سے حجاز روانہ ہو گئے حالانکہ مجاہدین نے کئی بار اُن سے درخواست کی تھی کہ اُن کا سرحدی قبائل کے علاقے یا افغانستان میں رہنا زیادہ مفید مطلب تھا۔

اگست ۱۹۱۴ء (مطابق ماہِ رمضان ۱۳۳۲ھ) میں انگریزوں نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اس وقت مجاہدین کے امیر مولانا حافظ عبدالکریم بن مولانا ولایت علیؒ تھے۔ انہوں نے فوراً مولانا عبدالرحیم قنوجی کی قیادت میں ایک وفد کابل روانہ کیا۔ مولانا قنوجی مولانا برکت اللہ بھوپال کے (جنہیں انقلابی تحریک میں بہت بلند مرتبہ نصیب تھا اور جو اُن دنوں افغانستان میں مقیم تھے) گہرے دوست تھے۔ اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ وہ نائب السلطنت سردار نصراللہ خان اور قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق خان کی وساطت سے امیر حبیب اللہ خان کے حضور حاضر ہوں اور انہیں دس لاکھ سرحدی اور قبائلی مجاہدوں کی حمایت کا یقین دلائے تاکہ وہ انگریز کے خلاف اعلانِ جہاد کر سکیں۔ تاہم رُوس اور برطانیہ سے معاہدوں کی موجودگی میں امیرِ کابل نے وفد کی معروضات پر زیادہ توجہ نہ دی — بلکہ مجاہدینِ چمرقند کا یہ وفد ابھی کابل ہی میں مقیم تھا کہ ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو برطانیہ اور اُس کے اتحادیوں نے خلیفۃ المسلمین سلطانِ ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور چھوٹتے ہی بحرِ قلزم کے فوجی استحکامات اور تنصیبات پر قبضہ کر لیا۔ اس پر سلطان ترکی کو خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کئے بغیر چارہ نہ رہا — فقہِ حنفی کی رُو سے افغانستان کے بادشاہ، اس کی مسلمان رعایا اور آزاد قبائل کے مجاہدوں کے لئے خلیفۃ المسلمین کی اطاعت واجب تھی اور جہاد سے جان چھڑانے کے لئے کوئی وجہِ جواز نہ تھی — تاہم امیرِ افغانستان نے جہاد سے پہلوتہی کر کے عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیا۔

مولانا فضل الٰہی کی رائے میں اگر شیخ الہند مولانا محمود الحسن بھی حجاز جانے کی بجائے صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقے میں آجاتے جہاں دارالعلوم دیوبند سے نکلے ہوئے علماء کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے، بلکہ افغانستان کا قاضی القضاۃ حاجی عبدالرزاق بھی دارالعلوم دیوبند ہی کا فارغ التحصیل تھا۔ تو سارے سرحدی علاقوں میں علمِ جہاد بلند کیا جا سکتا تھا — اور اگر شمالی مغربی صوبہ سرحد انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا تو کم سے کم چھ ڈویژن فوج، جو انگریزوں نے ترکوں کے خلاف لگا رکھی

تھی ۔ ہندوستان واپس آکر جنگ میں اُلجھ جاتی اور اس طرح ترکی پر سے دباؤ کم ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا بلکہ ہوا یہ کہ حجاز مقدس پہنچتے ہی مولانا محمود الحسن انگریزوں کے قابو میں آ گئے ۔ اور دعوتِ انقلاب ناکام ہو کر رہ گئی ـــــ اگر اس معاملے میں افغانستان جہاد سے باز بھی رہتا تو بھی صرف سرحدی علاقوں کے غازی مولانا محمود الحسن جیسی عظیم شخصیت کے اشارے پر انگریز کو خاصا پریشان کر سکتے تھے ۔

مولانا ابوسعید فضل الٰہی نے اس کتابچے میں اس امر کی بھی صراحت کی ہے کہ

" مالٹا میں قید کے دن پورے کرنے کے بعد ہندوستان واپسی پر بھی مولانا محمود الحسن سے اساسی غلطی یہ ہوئی کہ بدون کسی معاہدۂ شرعی کے مشرکینِ ہند سے اشتراکِ عمل شروع کر دیا گیا اور کام ایسے طریق پر انجام دیا گیا کہ اس کی ساری باگ ڈور ہندو قوم کے ہاتھ میں رہی اور ہندوستان کی اس ہمہ گیر انقلابی تحریک کا " امام " ایک ایسے شخص کو مقرر کیا گیا جو ہندوستان کے ۳۲ کروڑ مشرکوں کا پیشوا مانا جاتا تھا اور جس کا نام " گاندھی " تھا ـــ اس فروگذاشت کا تباہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم جو سلطان ٹیپوؒ کے وقت سے تمام انقلابی اور سیاسی تحریکوں کی زمام دار اور امام چلی آ رہی تھی ـــ امام کے درجہ سے گر کر مامور اور مقتدیٰ کے درجے سے گر کر مقتدی بن گئی ـــ اس کے بعد اسلام اور اہلِ اسلام کو مشرکینِ ہند کے ہاتھوں جو پیش آیا اور آ رہا ہے سب کو معلوم ہے ـــ لکھنے کی حاجت نہیں ـــ "

جہاں تک ترکوں کا تعلق ہے اپنی قلیل تعداد کے باوجود وہ ڈٹ کر لڑے ۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو عراق عرب کے محاذ قطعۃ العمارہ میں ترکوں نے انگریزوں کی ایک لاکھ کے قریب فوج کو، جو جنرل ٹاؤنزشیڈ (TOWNSSHED) کی کمان میں تھی گھیرے میں لے لیا ۔ انگریز جرنیل کی بار بار استدعا کے باوجود ایک عرصے تک اُسے ہندوستان سے کوئی کمک نہ پہنچ سکی اور انگریزوں کے بہت تھوڑے سپاہی زندہ بچے اگر اس موقع پر افغانستان کی طرف سے ذرا بھی جنبش ہوتی یا سرحدی قبائل بیک وقت اٹھ کھڑے ہوتے تو مسلمانوں کی کامیابی یقینی تھی ۔

بہر حال اپنے طور پر سرحدی غازیوں نے جہاد کی انفرادی کوششیں کیں جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔

اُدھر انگریزوں نے کرنل لارنس کو بھیج کر عربوں کو گمراہ کیا اور قوم پرستی اور وطن پرستی کے نام پر اُن میں ترکوں کے خلاف نفرت کے بیج بوئے۔ مسلمانوں میں پھوٹ پڑی تو دشمن کا مقصد پورا ہوگیا اور نہ صرف ترکوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ ساری دُنیائے اسلام چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی اور باہمی رقابتوں نے وہ روزِ بد دکھایا کہ پھر کبھی وہ ایک متحدہ، غالب اور فاتح ملت کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

ایک انقلابی رہنما اقبال شیدائی مرحوم نے ۱۹۶۹ء میں روزنامہ "امروز" لاہور میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جس میں جنگِ عظیم کے سلسلے میں افغانستان کی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ

"امیر حبیب اللہ خان یہ جانتے تھے کہ رُوس اور انگریز ہمارے قریبی ہمسائے ہیں جب کہ ترکی اور جرمنی دُور فاصلے پر ہیں۔ اس لئے وہ ترکوں اور جرمنوں کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے"۔

انہی دنوں ہندوستان کے چند مقتدر انقلابیوں نے کابل میں (جلاوطن) انقلابی حکومتِ ہند بھی قائم کر لی تھی جس کے صدر راجہ مہندر اپرتاب، وزیراعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی، وزیرِ داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی، وزیرِ جنگ مولوی محمد بشیر (عبدالرحیم) امیرالمجاہدین چمرقند، وزیرِ مواصلات ڈاکٹر رحمت علی اور وزیرِ خارجہ ایک جرمن مسٹر ہلپائی تھے۔ ان انقلابیوں نے افغان حکومت سے یہ وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ کامیابی کی صورت میں افغان شہزادے کو دہلی کے تخت پر بٹھایا جائے گا — یہ لوگ "غدر" یا انقلابی پارٹی کے ممبر تھے۔

ایک آفریدی سرفروش

برطانوی افواج میں "وکٹوریہ کراس" بہادری کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ صوبہ سرحد کا پہلا شخص جسے یہ اعزاز ملا ایک آفریدی جمعدار (موجودہ نائب صوبیدار) میر دست خان تھا، وہ جنگِ عظیم کے دوران یورپی محاذ وائی پریس (YPRES) پر متعین تھا۔ اس کا دستہ جرمنوں کے مقابلے میں بہت بہادری سے لڑا۔ جب ایک ایک کر کے سبھی انگریز افسر ہلاک ہوگئے تو آفریدی مجاہد نے کمان خود سنبھال لی اور دشمن کی شدید گولہ باری کے باوجود اپنے تمام ساتھیوں کو سلامتی سے نکال لے گیا بلکہ اپنے زخمیوں اور افسروں کی لاشوں کو بھی نکال لایا۔ برطانوی حکومت نے اس شاندار کارنامے پر نہ صرف اُسے صوبیدار بنا دیا جو دیسی فوجیوں

کے لئے اس وقت سب سے بڑا عہدہ تھا بلکہ اسے وکٹوریہ کراس بھی دیا ـــــ وہ اعزاز پانے کے بعد انگلستان بھی گیا۔ اُس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، شہنشاہ انگلستان نے بکنگھم پیلس میں اُسے ضیافت دی اور اس کی بڑی بڑی تصویریں بنا کر صوبہ سرحد کے تمام سکولوں اور سرکاری دفتروں میں آویزاں کی گئیں۔

کچھ عرصہ بعد اس آفریدی صوبیدار کو ایک ایسے محاذ پر بھیجا گیا جہاں اُسے ترک سپاہیوں سے لڑنا تھا۔ عین اس وقت جب میدانِ کارزار گرم تھا، اُس کے ضمیر نے اُسے پکارا۔ عزتِ ایمانی بیدار ہوئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا مسلمان ہو کر اُسے خلیفۃ المسلمین کے خلاف گولی چلانی چاہیئے ـــ اب ایک طرف ایمان کی پکار تھی دوسری طرف دُنیوی وجاہت اور اعزاز و اکرام ـــــ آخر میر دست خان نے صحیح فیصلہ کیا اور انگریز کا ساتھ چھوڑ کر ترک لشکر کا رضاکار بن گیا۔ پھر جس بہادری سے وہ لڑتا تھا اُس سے بھی زیادہ بہادری سے ترکوں کی جانب سے انگریز کے خلاف لڑتا رہا۔ اُس نے انگریز کے سب اعزازات ٹھکرا دیئے۔ قسطنطنیہ میں وہ سلطان ترکی سے ملاقات کو گیا تو سُلطان نے اُس کی خدمات کے اعتراف میں ایک مرصع ترکی علَم عطا کیا ـــــ ۱۹۱۲ء میں افغانستان کے راستے صوبیدار میر دست خان تیراہ میں پہنچا تو آفریدیوں کے مرکزی مقام باغ میں یہ پرچم لہرایا۔ اس نے وادیٔ خیبر اور تیراہ میں خلافت پارٹی قائم کی اور جب تک زندہ رہا ملّتِ اسلامیہ کی خدمات بجالاتا رہا۔

بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی افواج کے بہت سے مسلمان سپاہیوں نے ترک بھائیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا لیکن اُن لوگوں کو یا تو برما کے جنگلوں میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ مر کھپ گئے یا سمندری جہازوں میں لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

حاجی صاحبؒ ترنگزئی

صوبہ سرحد کے علمائے حق نہ صرف تبلیغِ دین کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیتے رہے بلکہ یہ فخر بھی سرحد ہی کے علمائے حقانی کو حاصل ہوا کہ انہوں نے میدانِ جہاد میں بھی مسلمان عوام کی قیادت کی ـــــ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے دوران ہر محاذ پر سرحدی غازیوں کی کمان ایسے ہی مجاہد اور ایثار پیشہ علماء ہی کے ہاتھ میں تھی۔ علاقہ مہمند اور مالاکنڈ میں حاجی صاحبؒ ترنگ زئی اور فقیر صاحبؒ علی نگر، سوات میں ہڈہ ملّا صاحبؒ اور میاں گل عبدالودودؒ، وزیرستان میں ملّا پاوندہؒ اور دوسرے محاذوں پر دوسرے

نامور علماء اپنے اپنے ارادت مند غازیوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے، انہوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انگریز پر کاری ضربیں لگائیں۔

حاجی صاحب ترنگ زئی علاقہ مشنغر میں دینی مدرسے قائم کرنے اور اسلامی معاشرے سے غلط رسم ورواج کو مٹانے کی مہم میں لگے تھے۔ ہر جگہ انہیں بیحد عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ــــ ۱۹۱۲ء میں اسلامیہ کالج پشاور کا سنگ بنیاد بھی انہوں نے رکھا تھا۔ تاہم ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑتے ہی انگریز نے حاجی صاحبؒ کی کڑی نگرانی شروع کر دی اور ان کی گرفتاری کے لئے بہانے ڈھونڈنے لگے ــــ حاجی صاحبؒ کو فرنگی کی نیت میں فتور نظر آیا تو چپکے سے ترنگ زئی سے نکل کر آزاد علاقہ مہمند کو چلے گئے اور جہاد کی تیاریوں میں لگ گئے۔ دوسرے علمائے کرام مثلاً مولانا سیف الرحمٰن (متھرا۔ شبقدر) مولانا شاہ رسول بر سے گڑھی۔ قاضی صاحب کڑوی، قاری محمد ادریس باندہ ملاخاں، مولوی میراجان زیارت کاکا صاحب اور مولوی عبدالعزیز (اتمان زئی) نے بھی حاجی صاحب ترنگ زئی کا ساتھ دیا اور ہندوستان کے انقلابی علماء نے بھی انگریز کے خلاف جہاد میں حاجی صاحب سے رابطہ قائم رکھا۔

حاجی صاحب ترنگ زئی کے قبائلی علاقے میں پہنچ جانے سے حکومت کی تشویش میں اور اضافہ ہوگیا، چیف کمشنر نے تہکال کے ارباب دوست محمد خان۔ عمر زئی کے خان سعداللہ خان اور دوسرے معززین پر مشتمل ایک وفد حاجی صاحب کو واپس لانے کے لئے بھیجا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا ــــ حاجی صاحب کسی طرح واپس آنے پر آمادہ نہ ہوئے اور اپنے مرشد اخون صاحب صوات اور نجیم الدین، ہڈہ ملا کی پیروی کرتے ہوئے فریضہ جہاد انجام دیا۔ ۱۹۱۶ سے ۱۹۳۷ء تک متواتر انہوں نے شبقدر اور دوسری انگریزی چھاؤنیوں اور چوکیوں پر حملے جاری رکھے۔ حاجی صاحبؒ کی قیادت میں مہمند لشکر اچانک انگریزی علاقے پر چھاپہ مارتا اور فرنگی کو ہراساں کرنے کے بعد اپنے ٹھکانوں کو واپس چلا جاتا۔ حاجی صاحبؒ جانتے تھے کہ وہ برصغیر سے انگریز کا اقتدار ختم تو نہیں کر سکتے تاہم وہ جنگ عظیم کے دوران فرنگی فوجوں کو جھڑپوں میں الجھائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ انگریز ترک مسلمانوں پر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے۔

آخری دنوں میں اپنی علالت کے باوجود حاجی صاحبؒ پالکی میں سوار محاذ جنگ پر پہنچتے اور غازیوں

کی کمان کرتے۔ دسمبر ۱۹۲۷ء کو وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کی ساری عمر خدمتِ اسلام اور تبلیغِ جہاد میں گذری۔

سرحدی قبائل کا جوشِ جہاد

جنگِ عظیم کے شروع ہوتے ہی جونہی شیخ الاسلام نے برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا، قبائلی علاقوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے برطانوی فوجی چوکیوں، قلعوں اور چھاؤنیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں وزیری اور خوست وال قبائلیوں نے میران شاہ کی چھاؤنی پر ہلّہ بول دیا۔ انگریز نے بڑا نقصان اٹھانے کے بعد کہیں حملہ آوروں کو پسپا کیا۔ ۱۹۱۵ء میں ٹوچی کی فوجی چوکی سپین خیسورہ کو قبائلی مجاہدوں نے محاصرے میں لے لیا۔ اُدھر مُلّا صاحب پاوندہ کے ایماء پر محسود نے بار بار سرکاری چوکیوں اور قلعوں پر چھاپے مارے۔

کوہِ سیاہ (ہزارہ) کے عوام نے جمعیتِ مجاہدین کے اشتراک سے شمالی ہزارہ اور بونیر میں انگریزی اقتدار کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ کابل میں جلاوطن حکومتِ ہند کے انقلابی رہنماؤں سے بھی مجاہدین نے رابطہ قائم رکھا اور انگریز کو ہر ممکن طریق سے زچ کرتے رہے۔

سال ۱۹۱۵ء کے آخری مہینوں میں ہر طرف جہاد کے پرچم بلند ہونے لگے تو انگریز کی تشویش میں اور بھی اضافہ ہو گیا — قریب تھا کہ افغانستان کے عوام بھی فرنگی سامراج کے خلاف جہاد شروع کر دیں لیکن امیر حبیب اللہ خان نے بمشکل تمام حالات پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

وزیرستان میں سروا کئی کی ملیشیا پوسٹ پر حملہ کر کے مجاہدین نے کمانڈنٹ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہرحال انگریز کی خوش قسمتی تھی کہ والیٔ افغانستان نے موقع کی نزاکت سے سیاسی فائدہ نہ اٹھایا اور انگریز کی پوری طرح حمایت جاری رکھی۔

سیاسی کارکنوں کی گرفتاریاں

"نمدر" یا انقلابی پارٹی ان دنوں صوبہ سرحد میں زیرِ زمین سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ اُس کا ایک کارکن جگت رام گرفتاری سے بچنے کے لئے امریکہ چلا گیا تھا۔ کچھ مدت بعد وہ پشاور آیا تو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے کچھ ہندو ساتھی پنڈت امیر چند بموال، بخشی لال چند، کیشو رام اور وشنو داس بھی دھر لئے گئے۔ فرنگی کی پالیسی عجیب تھی۔ اب کے صوبہ سرحد میں صرف ہندو سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا جا

رہا تھا۔ مسلمانوں کے مواخذہ سے عمداً چشم پوشی کی جارہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں کسی طرح بھی اشتعال نہ پھیلے اور وہ ترکی کی حمایت سے باز رہیں۔ علاوہ بریں حکومت یہ تاثر بھی دینا چاہتی تھی کہ سیاسی میدان میں ہندو مسلمانوں میں اتحاد کی کوئی مشترکہ بنیاد نہیں اور دونوں کے دائرہ کار الگ الگ ہیں۔

تحریکِ ریشمی رومال "تحریکِ ریشمی رومال" انگریز کی اسلام دشمن ریشہ دوانیوں کے خلاف ایک انقلابی کوشش تھی جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے۔ مسلمانوں کے نمائندے شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے اور ہندوؤں کے سربراہ رانا مہندر اپرتاپ۔ تاہم اس تحریک کو رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، لاجپت رائے اور راجندر اپرشاد کی حمایت بھی حاصل تھی۔

اس تحریک کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ ساری دُنیا میں انگریز کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا انتخاب کیا گیا اور ہر ایک کو اُس کی صلاحیتوں کے مطابق کام تفویض کیا گیا۔

ان انقلابیوں کے کئی منصوبے تھے جن میں سے ایک فوجی تیاریوں کے بعد مختلف سمتوں سے ہندوستان پر حملہ کرنا تھا۔ یہ کام مولانا عبیداللہ سندھی اور محمد ابراہیم ایم اے کو سونپا گیا تھا۔ مولانا عبیداللہ نے کئی بار صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے خفیہ دورے کئے۔ اس کام میں زیارت کاکا صاحب کے جرأت مند اور ایثار پیشہ عالم دین مولانا عزیز گل بھی (جو شیخ الہند کے نہایت رازدار شاگرد تھے) اکثر حاجی صاحب ترنگ زئی کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ نامہ و پیام کا یہ کام بیحد کٹھن اور دشوار تھا۔ یہ لوگ ریشمی کپڑے پر دھاگے سے کچھ لکھتے، تو وہ رومال پیغام رسانی کا ذریعہ بن جاتے۔ سی آئی۔ ڈی ہر وقت ان لوگوں کے پیچھے لگی رہتی تاہم یہ انقلابی اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انتہائی لگن سے اپنا کام انجام دیتے۔

یہ انقلابی مشن ۱۹۱۰ء سے مختلف ملکوں میں کام کر رہا تھا۔ جب افغانستان میں امیر امان اللہ خان برسرِ اقتدار آیا تو حملۂ ہند کا منصوبہ انہی انقلابیوں نے بنایا تھا۔ فوج کے تین حصے کئے گئے اور ایک علاقہ آزاد مہمند کی جانب سے دوسرا جلال آباد اور خیبر کی راہ اور تیسرا کرم پاڑہ چنار سے ہوتے

ہوئے صوبہ سرحد پہ حملہ آور ہوا۔ تاہم تھوڑی بہت کامیابی اس تیسرے دستے ہی کو حاصل ہوئی۔ میر ظفر الحسن ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، ریاضی دان ہندوستانی نوجوان تھے۔ ٹل کے محاذ پہ انہوں نے توپ خانہ میں شاندار خدمات انجام دیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی اور افغان شہزادے نصراللہ خان نے ایک ماہر کاری گر سے اس معاہدے کی، جو انقلابی پارٹی اور افغانستان کے مابین برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے سلسلے میں ہوا تھا، ساری عبارت (جو عربی زبان میں تھی) ایک ریشمی رُومال پہ کڑھا لی۔ یہ معاہدہ ایک رومال کے ذریعے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو بھیجا جانا تھا۔ رومال کی لمبائی چوڑائی ایک گز تھی۔ اس کا رنگ حاجیوں کے رومال کی طرح زرد تھا۔ پہلے یہ رومال کابل سے پشاور بھجوایا گیا۔ یہ کام شیخ عبدالحق نے انجام دیا جو بنارس کا ایک نومسلم گریجویٹ تھا اور افغانستان اور ہندوستان کے مابین بنارسی کپڑے کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اسی قسم کے پانچ سادہ رومال بھی تیار کئے گئے اور ریشمی رومال کو ان میں ملا دیا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ ریشمی رومال حیدر آباد سندھ میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچایا جائے جو اُسے لے کر حج پہ روانہ ہو جائیں اور مکہ معظمہ میں اسے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو پہنچا دیں۔ جو ان دنوں وہاں مقیم تھے۔ وہاں سے اس رومال کو ترکی بھجوایا جانا تھا ـــــ انقلابیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو ترکی افغانستان کی راہ ہندوستان پر حملہ کرے اور افغانستان اور صوبہ سرحد کے لوگ ترکی کا ساتھ دیں۔

شیخ عبدالحق نے یہ رومال نو بجے حق نواز نامی ایک کارکن کو پشاور پہنچایا، جس نے صبح ۴ بجے ایک خاص آدمی کے ذریعے اسے بہاولپور کے مقام دین پور میں سجادہ نشین غلام محمد کو ارسال کر دیا۔ خفیہ پولیس انقلابیوں پہ کڑی نظر رکھے ہوئے تھی، جونہی رومال کے پشاور پہنچنے کی خبر ملی، فجر کی نماز کے وقت حق نواز خان کے مکان پر چھاپہ مارا گیا لیکن اُس سے تھوڑی دیر پیشتر وہ رُومال آگے بھجوا چکے تھے، اگرچہ حق نواز خان سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا تاہم محض شبہ کی بناء پر اُسے چار ماہ کے لئے جیل خانہ بھجوا دیا گیا۔

دین پور سے دوسرے دن دوپہر کو رُومال حیدر آباد (سندھ) میں شیخ عبدالرحیم (جو نومسلم اور مشہور کانگرسی رہنما اچاریہ کرپلانی کے بھائی تھے) کو ملا۔ عشاء کے وقت وہ اُس رومال کو اپنی گودڑی میں سی رہے تھے کہ چھاپہ پڑا اور شیخ صاحب رومال سمیت گورا فوج کے ہتھے چڑھ گئے۔

اس دستاویز کے ہاتھ آجانے سے انگریزی حکومت کو مجاہدین، افغانستان اور ترکی کے عزائم کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے علاقوں میں فوج کی تعداد دگنی کر دی۔ انقلابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ سینکڑوں گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ تاہم دو چار کے سوا سبھی کارکن ثابت قدم رہے۔

جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی انگریزوں نے افغانستان پر بڑا دباؤ ڈالا۔ اس دباؤ کے تحت وہاں سے اکثر ہندوستانی انقلابیوں کو نکال دیا گیا اور وہ قبائلی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حاجی صاحبؒ ترنگ زئی البتہ ڈٹے رہے اور کئی سال تک متواتر فرنگی سامراجیوں کا بھرپور مقابلہ کرتے رہے، اسی طرح قلات اور لس بیلا کے لوگوں نے بھی انگریزوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔

ریشمی رومال کیسے پکڑا گیا؟ اس ضمن میں بہت سی باتیں مشہور ہیں، مولانا عبید اللہ سندھی کے خیال میں حق نواز خان نے مخبری کی تھی جبکہ مولانا حسین احمد مدنی حق نواز خان کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان اور اس کا بیٹا عنایت اللہ خان مجاہدین اور انقلابیوں کے تمام راز انگریز کو پہنچاتے رہے۔ وہ فی الاصل انگریز کی خوشنودی چاہتے تھے۔ کئی لوگوں نے اس سلسلے میں مولانا میاں عزیز گل کو ملوث کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن مولانا عزیز گل ایسے بلند اخلاق، عالی ہمت اور ایثار پیشہ عالمِ دین کے خلاف ایسی بات کرنا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

تحریکِ حزب اللہ

ملک میں اس وقت تحریکِ خلافت، انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعتیں حصولِ آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش تھیں، لیکن یہ جماعتیں اعتدال پسندوں کی جماعتیں سمجھی جاتی تھیں اور ملکی قانون کے دائرے کے اندر رہ کر کام کرتی تھیں۔ تاہم بائیں بازو کی کچھ جماعتیں بھی ملک میں سرگرم عمل تھیں جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کی سیاست سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں، انہی میں ایک "حزب اللہ" بھی تھی۔ پشاور کے کئی سیاسی کارکن اس میں شامل تھے اور انہیں حاجی صاحب ترنگ زئیؒ، ملا صاحب ہڈہ، خان عبدالغفار خان اور مولانا عبدالرحیم پوپل زئی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مجاہدِ اعظم مولانا عبدالرحیم تو اتنے مخلص اور ایثار پیشہ تھے کہ حزب اللہ کے مرکزی دفتر دہلی سے ہدایات حاصل کرنے پشاور سے پیدل دہلی جایا کرتے تھے۔ جمعیت عالیہ مجاہدین چمرقند کے جوشیلے نوجوان بھی اس جماعت کے سرگرم کارکن تھے، آزاد قبائل میں ان کا صدر دفتر چمرقند میں قائم تھا جہاں سے پشتو کا ایک اخبار "غازی" بھی

دستی پریس پر شائع ہوتا تھا اور مختلف ذرائع سے ملک کے کونے کونے میں تقسیم ہوا کرتا تھا۔ حزب اللہ کی تمام شاخیں مجاہدین اور انقلابیوں کے دیئے گئے پروگرام پر عمل کیا کرتی تھیں۔

۱۹۱۱ء میں دہلی میں شہنشاہ برطانیہ جارج پنجم کا جشنِ تاجپوشی منایا گیا تو مولانا آزاد نے انگریز کی خوشیوں اور درباروں میں شامل ہونے کو گناہ قرار دیا، اپنے اخبار "الہلال" کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ فرنگیوں سے اپنے روابط منقطع کریں۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس میں مسلمانوں پر اہلِ مغرب نے جو مظالم روا رکھے تھے۔ اُس نے مسلمانوں کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔

۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو چاندنی چوک دہلی میں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تو اُس وقت اگرچہ بہت سی انقلابی جماعتیں موجود تھیں تاہم حکومت نے بم پھینکنے کی واردات کا ذمہ دار حزبُ اللہ کے ارکان کو قرار دیا ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں صوبہ سرحد کے بہت سے کارکنوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے دوران حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے انگریز نے "انڈین ڈیفنس ایکٹ" کے نام سے ایک قانون نافذ کیا جس کے تحت بے شمار محبانِ وطن گرفتار کر لئے گئے۔ اس پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لئے صوبہ سرحد کے بہت سے لوگ آزاد مہمند اور دوسرے قبائلی علاقوں کو ہجرت کر گئے اور حاجی صاحب ترنگ زئی اور قبائلی مجاہدوں کے ساتھ مل کر انگریز کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب مہمندوں نے حاجی صاحبؒ ترنگ زئی کی سرکردگی میں شبقدر اور دوسرے سرکاری علاقوں پر حملے کئے تو مولانا سیف الرحمٰن، حکیم محمد اسلم سنجری اور دوسرے سرفروش اُن کے شانہ بشانہ شریکِ جہاد رہے۔ ۱۹۱۶ء میں حاجی صاحبؒ اور انگریزوں کے مابین ایک اور ٹکراؤ شبقدر کے نواح میں ہوا جس میں برطانوی فوج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

جنگ کے دوران فوجی ضروریات کے بہانے انگریزوں نے اسلامیہ کالج پشاور کی عمارات اور ہوسٹل خالی کرا لئے اور کچھ دیر تک کلاسز شاہی مہمان خانہ (موجودہ لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول) میں لگتی رہیں۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں کالج بلڈنگ بھی اُس کی انتظامیہ کے حوالے کر دی گئی۔ اصل میں یہ چال محض اس لئے چلی گئی تھی کہ کالج کے طلباء سیاسی تحریکات سے متاثر ہونے نہ پائیں۔

جمعیّت مجاہدین

سید احمد بریلوی شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین بھی کسی نہ کسی رنگ میں مسلسل انگریز کے خلاف مصروفِ عمل رہی۔ مولانا نعمت اللہ اور مولوی محمد بشیر (عبدالرحیم) کی قیادت میں ان مٹھی بھر مجاہدوں نے انگریز کو متواتر پریشان کیئے رکھا۔

اگست ۱۹۱۵ء سے مجاہدین نے اپنی چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کیا۔ ۲۰ اگست کی رات کو رُستم کے انگریزی کیمپ پر حملہ کیا گیا۔ حملہ اتنا ناگہانی تھا اور اتنے انگریز افسر اور سپاہی زخمی ہوئے کہ انہیں سولہ ڈولیوں میں ڈال کر مردان چھاؤنی بھیجا گیا۔ ۲۲ اگست کو مجاہدین نے پھر یلغار کی اور بہت سے انگریز اور ہندوستانی سپاہیوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔ خار دار تاروں کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے مجاہدین سر ہتھیلی پر رکھے کیمپ میں گھس گئے۔ ایک انگریز افسر مارا گیا اور بہت سے دوسرے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔

۲۵ اگست کو ایک انگریز کرنل مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا اور بہت سا اسلحہ بھی غازیوں کے ہاتھ لگا۔ معرکہ اتنا سخت تھا کہ دس مجاہدین لڑتے لڑتے شہید اور چھ زخمی ہو گئے تاہم اپنی بے سرو سامانی کے باوجود مجاہدین نے جس جوش اور جذبے کا مظاہرہ کیا اُس سے اور تو اور افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے مجاہدین کو خراجِ تحسین ادا کیا —— مولانا محمد بشیر عبدالرحیم ۱۹۳۴ء کو کسی مخبر کے ہاتھوں شہادت پا گئے۔

اس دوران مجاہدین فرنگی اقتدار کے خلاف پروپیگنڈہ مہم بھی چلاتے رہے۔ اپنے اخبار "المجاہد" کے ذریعے انہوں نے مسلمانانِ ترکی کے خلاف انگریزوں کے مظالم کو پوری طرح بے نقاب کیا۔

جنگِ عظیم کے دوران انگریز مجاہدین سے بھرے بیٹھے تھے جونہی لڑائی ختم ہوئی اور انہیں کچھ چین نصیب ہوا۔ انہوں نے مجاہدین کے خلاف تادیبی کارروائیاں تیز تر کر دیں —— ایک بار مجاہدین چمرقند میں سے سات افراد سرکاری علاقے میں آئے تو انہیں گرفتار کر کے اُن پر "بغاوت" کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور انہیں کڑی سزائیں سنائی گئیں۔

جنگِ عظیم ہی کے دوران "فرانٹیئر کانسٹیبلری" کے نام سے صوبے میں ایک سرحدی پولیس فورس قائم کی گئی جس میں مختلف آزاد قبائل کے نوجوان بھرتی کیئے گئے۔ ان کا کام قبائلی علاقوں میں مجرموں

مفروروں اور ڈاکوؤں سے نپٹنا اور دیہات اور سرحدی علاقوں میں امن و امان کو بحال رکھنا تھا۔

مجموعی طور پر جنگِ عظیم اوّل میں ہندوستان نے بیس لاکھ سپاہی انگریزی اقتدار کو بچانے کے لئے جنگ میں جھونکے اور کروڑوں روپیہ کا قرضہ جنگی فنڈ میں دیا۔ جنگ کی تباہ کاریوں کا نتیجہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں دونوں طرفوں کے دس لاکھ آدمی ہلاک اور بیس لاکھ زخمی ہوئے۔ ہندوستانی سپاہیوں میں سے ستر ہزار مارے گئے اور ساڑھے چھتیس ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ جنگ عظیم کے بعد قحط سالی کے آثار نمودار ہو گئے اور وبائی بخار پھوٹ پڑا جس نے لاکھوں انسانی جانوں کو ہڑپ کر لیا۔

افغانستان کی تیسری جنگ

جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان نے انگریزوں کا پورا ساتھ دیا تھا، ہزاروں ہندوستانیوں نے فرنگی کی خاطر مختلف محاذوں پر اپنا خون نذر کیا، کروڑوں روپیہ کی امداد جنگی مقاصد کے لئے دی گئی۔ اپنی فتح کے بعد انگریز بظاہر اہلِ ہند سے بیحد خوش تھا اور کئی بار یقین دہانی کرا چکا تھا کہ جنگ کے فوراً ہی بعد اہلِ ہند کو حکومت کے نظم و نسق میں زیادہ عمل دخل حاصل ہو جائے گا اور سیاسی مراعات دے کر حکومت خود اختیاری کی طرف قدم اٹھایا جائے گا لیکن انگریز کی بدعہدی دُنیا بھر میں مشہور ہے ـــــ اس موقع پر بھی یہی تلخ حقیقت سامنے آئی۔ جنگ سے فارغ ہوتے ہی فرنگی حکمرانوں نے سلطنتِ ترکیہ کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے۔ شام پر فرانس کو مسلط کر دیا گیا۔ فلسطین میں یہود آباد کئے جانے لگے۔ عربوں کی مرکزیت ختم کر کے دُنیائے عرب کو چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور ہر ریاست اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے انگریز کی محتاج ہو کر رہ گئی۔ مسلمانوں کا دل پہلے ہی دُکھا ہوا تھا، ترکی کے ساتھ انگریز کے متنقانہ رویہ کو دیکھ کر اُن کے دل پر آرے چلنے لگے اور وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔

اُدھر جنگِ عظیم میں مدد دینے کا صلہ ہندوستان کو یہ ملا کہ ملک سے سیاسی بے چینی ختم کرنے کے بہانے، سیاسی کارکنوں کو دبانے کے لئے جسٹس رولٹ نامی ایک انگریز کی قیادت میں ایک کمیشن قائم کر دیا گیا جس نے سیاسی تحریکوں کو کچلنے کے لئے اپنی سفارشات مرتب کیں۔ یہ سفارشات ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں پیش ہوئیں تو غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے اس پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ پہلی قابلِ اعتراض بات تو یہی تھی کہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے

اس بل کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ رہی سہی سیاسی سرگرمیاں بھی ختم ہو کر رہ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے ہر طبقے نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی۔ قائداعظم محمد علی جناح جیسے اعتدال پسند مدبر نے اس ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ تاہم اہلِ ہند کے جذبات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی حکومت نے اس بل کو ایکٹ کی صورت دے دی۔ بس پھر کیا تھا ملک بھر میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے

ہندو مسلمان سبھی نے اس ظالمانہ قانون کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو لاہور اور امرتسر میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ہڑتال ہوئی۔ جلوس کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلائی گئی تو عوام مشتعل ہو گئے، انہوں نے انگریزی بنکوں کو آگ لگا دی۔ ریل کی پٹڑی اُکھاڑ دی۔ تار گھر جلا دیئے اور سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ اس موقع پر عوام کے جذبات کا احترام کرنے کی بجائے انگریز نے رائے عامہ کو دبانے کی خاطر انتہائی استبداد سے کام لیا اور رولٹ ایکٹ کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا ــــ ۱۰ اپریل کو امرتسر کے دو قومی رہنماؤں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے گورہ فوج کے پہرے میں نامعلوم مقام کو بھیج دیا۔ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری پر عوام نے مظاہرہ کیا تو فوج نے مظاہرین پر گولی چلا دی، کئی لوگ جان سے گئے ــــ بارہ اپریل کو بیساکھی کا تہوار تھا۔ لوگ حسبِ معمول میلہ منانے کے لئے امرتسر کے ایک میدان "جلیانوالہ باغ" میں جمع تھے کہ ایک جابر انگریز جرنیل ــــ ڈائر نے بغیر کسی اشتعال اور بغیر کسی وارننگ کے اُن پر گولی چلا دی، چند ہی منٹوں میں ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے گئے جن سے ۳۷۹ افراد ہلاک اور ۱۱۳۱ شدید زخمی ہوئے۔

صوبہ سرحد میں بھی ان واقعات کا شدید ردِ عمل ہوا۔ جگہ جگہ جلسے ہونے لگے۔ جلوس نکلنے لگے اور انگریز کے خلاف نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ پشاور کے تعلیم یافتہ طبقے نے فرنگی استبداد کے خلاف مظاہروں میں نمایاں حصّہ لیا۔ پشاور صدر کے قاضی خاندان کی فاضل شخصیت قاضی محمد ولی خان نے تحریک مخالفت رولٹ ایکٹ کی قیادت سنبھال لی۔ حکیم عبدالجلیل ندوی سید عبداللہ شاہ، پنڈت امیر چند بموال، ڈاکٹر گھوش، محمد عاشق فروٹ مرچنٹ، سردار ملاپ سنگھ اور آغا جی شاہ احتجاج کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ ہزارہ میں مولوی محمد عرفان۔ مولانا محمد اسحاق اور

غلام رسول خان سواتی تحریک کے روحِ رواں تھے تو بنوں میں محمد جان خان عباسی بیرسٹر، ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ملک خدا بخش خان ایڈووکیٹ اور کوہاٹ میں مولوی احمد گل رولٹ ایکٹ کی مخالفت کرنے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کارکنوں نے انگریزی عدالتوں کے بائیکاٹ، انگریزی چیزوں کے نہ خریدنے اور انگریزی اداروں سے مقاطعہ کا پروگرام بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انگریزی عدالتوں سے رجوع کرنا چھوڑ دیا۔ سبھی جھگڑے اور تصفیہ طلب امور قومی جرگوں میں طے ہونے لگے۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے جذبات جوبن پر تھے، اس لئے ان حریت پسندوں کی کوششوں سے فرنگی حکمرانوں کے وقار کو سخت دھچکا لگا۔ تحریک کے نتیجے میں جب ملک کے طول و عرض میں سیاسی کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو صوبہ سرحد کے محبانِ وطن بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ "قوانین جرائم سرحد" جیسے ظالمانہ قانون تو پہلے ہی موجود تھے۔ اُن کی آڑ میں دھڑا دھڑ سرحدی جان نثاروں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ پشاور میں پنڈت امیر چند بموال، ڈاکٹر گھوش، حکیم عبدالجلیل ندوی، سردار ملاپ سنگھ آغا عبداللہ شاہ، آغا جی شاہ، محمد عاشق فروٹ مرچنٹ، اندر ناتھ، لالی رام، بشیشر ناتھ، لکھی چند اور شیو رام کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ جہاں انہیں قید کے دوران سخت اذیتیں دی گئیں۔

اُن دنوں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمود الحسن مولانا حسرت موہانی، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان سارے ملک کی بساطِ سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور مہاتما گاندھی یا عبدالغفار خان (بادشاہ خان) ابھی سیاسی میدان میں قدم جمانے نہ پائے تھے۔[1]

امیر امان اللہ خان

۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو لغمان کے نواح میں شکار پر آئے ہوئے امیرِ کابل حبیب اللہ خان کو رات کے وقت اس کے خیمے میں قتل کر دیا گیا۔ جس پر اس کی جانشینی کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حبیب اللہ خان کے بیٹے شہزادہ امان اللہ خان اُسی دن افغانستان کے تخت پر بیٹھے جس دن جلیانوالہ باغ امرتسر میں نہتے عوام پر گولیاں برسا کر گورکھا فوج نے قیامت مچا رکھی تھی۔ اُن دنوں ہندوستان کے کچھ انقلابی رہنما (تفصیل آچکی ہے)

---

[1] "آزادی جنگ" عبدالخالق خلیق

بھی کابل میں موجود تھے۔ امیر امان اللہ خان اُن کے خیالات سے بے حد متاثر تھے۔ ان انقلابیوں میں سب سے مؤثر کردار قاضی ولی خان انجام دے رہے تھے جو رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچنے کے لئے کابل چلے گئے تھے۔

اُدھر اہلِ افغانستان مسلمان ہونے کے ناطے سے ترک بھائیوں سے بھی گہری ہمدردی رکھتے تھے اور ترکوں کے خلاف انگریز کی انتقامی کارروائیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ترک اور جرمن نمائندے بھی ان دنوں کابل آئے ہوئے تھے۔ اِدھر سارا ہندوستان پہلے ہی انگریز کے چنگل سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس عام بے چینی کے پیشِ نظر انگریز کو افغانستان کی جانب سے حملے کا خدشہ لاحق ہو گیا اور ہر جگہ فرنگی سامراجیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔

انگریز کی جنگی تیاریاں

بس پھر کیا تھا انگریز کو ہندوستان کے باقی علاقوں کی پروا نہ رہی ساری توجہ صوبہ سرحد کے جنگی محاذ پہ مبذول کر دی گئی۔ آرتھر سوئنسن (SWINSON) کے مطابق ساڑھے سات لاکھ گورا اور ہندوستانی سپاہی صوبہ سرحد پہنچا دیئے گئے۔ اس قدر اسلحہ اور سامانِ رسد ان فوجیوں کو مہیا کیا گیا کہ باربرداری کے جانوروں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ خود انگریز جرنیلوں کے بقول (تیسری جنگِ افغانستان) انگریز کے سو سالہ دورِ اقتدار میں سرحدی صوبے میں لڑی جانے والی سب سے بڑی جنگ بن گئی — ابھی ترکی، عراق، دوسرے محاذوں سے ہندوستانی فوج واپس پہنچی ہی تھی کہ اُسے اس جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا، بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو، جو بمبئی سے جہازوں میں سوار ہو کر برطانیہ جانے والے تھے، وہیں روک لیا گیا۔ ریزرو دستوں تک کو معاف نہ کیا گیا، ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا۔ اب تک تو دو بار انگریز افغانستان پر فوج کشی کر چکے تھے، اب افغانستان کی جانب سے اُن پر چڑھائی کی نوبت آن پہنچی چنانچہ انگریز سامراجی سر دھڑ کی بازی لگانے میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

انگریز جرنیل مولز ورتھ (MOLES WORTH) نے اس جنگ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ تو امان اللہ خان نے یہ طے کر رکھا تھا۔ کہ خیبر، کُرّم اور کوئٹہ کی جانب سے بیک وقت ہندوستان پر حملہ کیا جائے گا اور ہندوستان کو فرنگی کی غلامی سے آزاد کرایا جائے گا۔ تاہم امیرِ افغانستان کا اصل مقصد یہ تھا کہ کچھ سرحدی علاقوں پر قبضہ کر کے

افغانستان کی خود مختاری تسلیم کرالے (اور اس میں اُسے کامیابی بھی ہوئی۔

پشاور کے انقلابی

انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ چیف کمشنر روس کیپل صوبہ سرحد کے معاملات سے پوری آگاہی رکھنے کے ساتھ ساتھ عوام کے ہر طبقے سے بھی گہرے مراسم رکھتا تھا چنانچہ ایک مخبر کے ذریعے روس کیپل کو ایسی معلومات مل گئیں جن سے افغانستان اور انقلابیوں کے منصوبے کو بڑا نقصان پہنچا۔

بات یہ تھی کہ "کابل میں ہندوستان کی مشروط انقلابی حکومت" کا پشاور کے قومی رہنما قاضی ولی خان سے گہرا رابطہ تھا۔ افغانستان سے انقلابی جو لٹریچر بھیجتے وہ پشاور میں مقیم افغان پوسٹ ماسٹر کی وساطت سے مختلف سیاسی حلقوں کو پہنچایا جاتا تھا۔ افغانستان کا یہ ڈاک خانہ بازار حیا نگیر پورہ پشاور کے محلہ سرائے کالا خان میں واقع تھا۔ افغانستان کا ٹریڈ ایجنٹ بھی اُن دنوں وہیں رہتا تھا۔ تحریک مخالفت رولٹ ایکٹ کے دنوں میں سردار غلام حیدر افغان پوسٹ ماسٹر تھا اور سردار عبدالحکیم ٹریڈ ایجنٹ ـــــ جن لوگوں کو افغانستان ڈاک بھیجنا ہوتی وہ ٹکٹ لگا کر اس ڈاک خانہ میں چھوڑ جاتے اور وہاں سے ڈاک افغانستان پہنچا دی جاتی تھی۔

بدقسمتی سے افغان حملے کے منصوبے اور ہندوستانی انقلابیوں کی سکیم کا ذکر افغان پوسٹ ماسٹر نے اپنے کسی دوست سے کر دیا۔ وہ دوست اصل میں انگریزوں کا مخبر تھا۔ اس نے فوراً ہی بات سر روس کیپل چیف کمشنر صوبہ سرحد تک پہنچا دی۔ فوج نے فوراً چھاپہ مار کر افغان پوسٹ ماسٹر اور ٹریڈ ایجنٹ کو گرفتار کر لیا اور انقلابیوں کی طرف سے آئے ہوئے پوسٹروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ بھی اُن سے برآمد کر لیا جو مبینہ طور پر انقلابی کارکنوں میں تقسیم کرنے کے لئے آیا ہوا تھا۔

اس خبر کے ملتے ہی ملک بھر میں تمام سیاسی کارکنوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ حفاظتی اور دفاعی اقدامات سخت کر دیئے گئے اور انگریزی فوجیں افغان سرحدوں پر پہنچا دی گئیں۔

انگریز اہلِ قلم کا خیال ہے کہ ہندوستان پر افغانستان کا حملہ اُسی دن ہونا تھا جب امرتسر میں احتجاجی مظاہرہ ہوا اور گورا فوج نے لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا لیکن افغانی پوسٹ ماسٹر کی گرفتاری اور انکشاف راز کی وجہ سے یا پھر افغانستان کے اندرونی حالات کی وجہ سے اس حملے میں کافی تاخیر ہو گئی اور انگریز کو اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کا موقع مل گیا۔ اگر حملے کی خبر باہر نہ نکلتی اور حملہ اچانک

ہوتا تو اس کی ناکامی کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ جنگِ عظیم کے بعد انگریز ابھی سابقہ زخم چاٹ رہا تھا اور اپنے ہی پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

پہلی جھڑپ امان اللہ خان کے سر پر اقتدار آتے ہی افغان لشکر نے وادیٔ خیبر کے مغرب میں ایک گاؤں "ہفت چاہ" پر ڈیرے ڈال دیئے۔ یہ متنازعہ جگہ تھی اور دونوں حکومتیں اس پر اپنا دعویٰ جماتی تھیں ـــــ افغان لشکر کے آنے کے بعد حکومتِ ہند کے فوجی دستے بھی ہفت چاہ پہنچے لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کیئے رکھی اور لڑائی چھڑنے نہ پائی۔

مئی ۱۹۱۹ء کے شروع ہوتے ہی افغان سپہ سالار صالح محمد خان نے اپنا ہیڈکوارٹر لنڈی خانہ کے مغرب میں ڈکہ کے مقام پر منتقل کر لیا۔ ۳ مئی کو خیبر رائفلز کے سپاہی حسبِ معمول ایک تجارتی قافلے کے ساتھ حفاظت کی غرض سے جا رہے تھے کہ اس جگہ کی افغان پکٹ نے انہیں روک کر واپس کر دیا اور آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی۔

۴ مئی کو افغان سپہ سالار نے توپ خانہ کی مدد سے آفریدی علاقہ باغ کے ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا ـــــ ۵ مئی کو افغان لشکر نے درّہ خیبر کے انگریزی مقبوضہ علاقے میں مزید پیش قدمی کی۔ افغان لنڈی کوتل چھاؤنی کے واٹر سپلائی سسٹم پر قابض ہو گئے اور انہوں نے وہاں کام کرنے والے فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ اُدھر افغانستان سے تازہ دم فوجیں درّہ خیبر کی طرف بڑھنے لگیں ـــــ اب انگریز بھی چُپ نہ رہ سکا، چنانچہ ۶ مئی کو برطانوی حکومت کی جانب سے افغانستان کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔

اب کیا تھا ـــــ ؟ ۱۸۹۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ سرحدی قبائل کے سبھی غازیوں نے متحد ہو کر چودہ سو میل لمبی پاک افغان سرحد پر اپنی بندوقیں انگریزوں کے خلاف تان لیں۔

درّہ خیبر سات مئی کو انگریز نے سکھ گورکھا اور گورا پلٹنیں بندلاریوں کے ذریعے راتوں رات درّہ خیبر میں پہنچا دیں۔ بریگیڈیئر کراکر (CROCKER) نے آدھی رات کو تمام فوجی افسروں کی میٹنگ بلائی اور طے پایا کہ صبح ہوتے ہی باغ کے آفریدی گاؤں پر حملہ کر کے اُسے افغان دستوں سے واگذار کرا لیا جائے ـــــ افغان فوج کے پاس لاریاں وغیرہ نہ تھی لہٰذا، ان کو جلد کمک

نہ پہنچ سکی۔ تاہم فوری طور پر حملہ اس لئے نہ ہو سکا کہ شدید آندھی اور بارش نے انگریزوں کی نقل و حرکت ناممکن بنا دی۔ دو بجے تک انگریزوں نے باغ کا گاؤں افغان فوج سے خالی کرا لیا اور افغان فوج پسپا ہو کر لنڈی کوتل پہنچی ـــــ بعد میں فوج کشی کر کے انگریزوں نے سارا علاقہ افغان فوج سے خالی کرا لیا۔

۱۹۱۹ء تک انگریزی فوج ہوائی جہازوں سے کام لینے لگی تھی۔ علاوہ ازیں فرنگیوں کے پاس عمدہ اور تیز رفتار آرمرڈ کاریں بھی تھیں جب کہ افغان فوج ابھی وقت سے بہت پیچھے تھی اور اس کا سارا دارومدار پیادہ سپاہیوں پر تھا۔ صبح سویرے ابھی افغانی سپاہی خواب سے بیدار بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انگریزی ہوائی جہاز ڈکہ میں اُن کے سروں پہ منڈلانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوائی جہازوں نے مشین گنوں سے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ افغان سپہ سالار صالح محمد خان بھی زخمی ہو گیا۔ افغان فوج بے بس ہو کر جلال آباد کی جانب پسپا ہوئی تو انگریزوں نے آگے بڑھ کر ڈکہ اور ہزار نو کی چوکیوں پہ اپنا جھنڈا لہرا دیا۔

جلال آباد پہنچنے پر بھی افغان فوج چین سے نہ بیٹھنے پائی۔ روزانہ انگریزوں کے آٹھ دس ہوائی جہاز جلال آباد جا پہنچتے اور شہری آبادی پہ بم برساتے، مجبوراً گورنر نے شہری آبادی کو جلال آباد خالی کرنے کا حکم دے دیا لیکن شہر خالی ہوتے ہی دوسری مصیبت یہ آن پڑی کہ اردگرد کے غلزئی اور پہاڑی لوگ شہر پر ٹوٹ پڑے اور لوٹ مار مچا دی ـــ بعد میں انگریزوں کا حوصلہ بڑھا تو اُن کے ہوائی جہاز کابل شہر پہ بھی بمباری کرنے لگے، لوگ اس بلائے ناگہانی سے بڑے پریشان ہوئے۔

ٹل ڈکہ اور کوئٹہ (بولان) دونوں محاذوں پہ امان اللہ خان کی فوج کو منہ کی کھانی پڑی۔ البتہ کُرم پاڑہ چنار کے محاذ پر میدان اُس کے ہاتھ رہا۔ ٹل کے قصبہ سے افغانستان تک ایک تنگ گھاٹی کوئی بیس میل تک دریائے کُرم کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ کابل کی کوئی آٹھ دس ہزار فوج اس گھاٹی کے راستے ٹل تک پہنچ گئی۔ افغان فوج کی کمان جنرل نادر خان کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۲ مئی کو انگریزوں کو پتہ چلا کہ افغان فوج ٹوچی کی وادی اور وانا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انگریزوں کو اصل خطرہ یہ تھا کہ اگر وزیر اور محسود قبائلیوں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا تو وزیرستان سکاؤٹس اور بارڈر پولیس انہیں روکنے کے قابل نہ ہو گی۔ گھبراہٹ کے عالم میں انگریز جرنیل نے یہ حکم دیا کہ اس علاقے کی ساری

فوجی چوکیوں کو خالی کر دیا جائے اور اُن میں پڑا ہوا اسلحہ اور ذخیرہ خوراک تباہ کر دیا جائے تاکہ دشمن اُس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان چوکیوں کو توڑ دینے سے ایک نقصان یہ ہوا کہ نوکری سے نکالے ہوئے سپاہی افغان فوج کے ساتھ جا ملے اور اُن کی طرف سے دادِ شجاعت دینے لگے، جب انگریزی فوج کے انخلاء کی خبر وانا پہنچی تو جنوبی وزیرستان کی فوجی چوکیاں بھی مسمار کر دی گئیں تاکہ محسود قبیلے کی جانب سے حملے کا خدشہ نہ رہے ـــــ اب لے دے کے کل تین سو آدمی ان علاقوں میں انگریزی فوج کے پاس رہ گئے۔ کچھ دنوں تک تو یہ فوجی میجر رسل کی کمان میں دفاعی لڑائی لڑتے رہے لیکن بعد میں مُغل کوٹ کے مقام پر انہیں شرمناک پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔ قبائلی سپاہی جاتے ہوئے فوجی چوکیوں سے سارا سامان بھی لُوٹ کر ساتھ لے گئے تھے اور انگریز ہی کی رائفلیں اُس کے خلاف استعمال ہونے لگیں۔ مجبوراً انگریز نے وانا اور مغل کوٹ کی فوجی چوکیاں بھی خالی کر دیں۔ ان معرکوں میں بہت سے انگریز افسر ہلاک اور زخمی ہوئے۔ محسود اور وزیر فوجی چوکیوں پر چڑھ دوڑے اور دونوں ہاتھوں سے انہیں لُوٹا۔

۲۳ مئی کو سپہ سالار نادر خان ماتون سے روانہ ہو کر دریائے کیتو کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے ٹل کے راستے سپین وام کے مقام تک پہنچا۔ انگریز ابھی یہ چوکی خالی کرنے نہ پائے تھے کہ نادر خان کی فوج اور قبائلی غازیوں کا لشکر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس موقع پر نادر خان کے پاس نو حربی توپیں بھی تھیں جو ہاتھیوں پر لاد کر لائی گئی تھیں۔ پہاڑی گھاٹیوں میں سے ہوتا ہوا افغان لشکر ٹل سے بیس میل کے فاصلے پر آ پہنچا۔ ٹل نہ صرف وادی ٹوچی کا سب سے بڑا انگریزی قلعہ تھا بلکہ ٹل کوہاٹ ریلوے کا پہلا سٹیشن ہونے کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل تھا۔

اس وقت کوہاٹ کا بریگیڈیر جنرل ایسٹس (AUSTACE) تھا۔ اس نے ہر ممکن طریق سے ٹل اور پاڑہ چنار کو کمک بھیجی اور بالآخر خود ٹل پہنچ کر کمان سنبھال لی۔ خود ٹل کے قلعے اور کیمپ میں اُس وقت کوئی دو ہزار سپاہی اور چار توپیں تھیں۔

۲۶ مئی کو ساری رات انگریزی لشکر قلعے کے دفاعی انتظامات کو مضبوط بناتا رہا لیکن ۲۷ مئی کو دن نکلتے ہی تین ہزار افغان عسکریوں اور نو ہزار سرحدی مجاہدوں نے آگے بڑھ کر ٹل کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

ٹل کا قلعہ دو پہاڑی ندیوں کے درمیان دریائے کرم کے مغربی کنارے ایک اونچے ٹیلے پہ واقع ہے اس قلعہ کی دیواریں نادر خان کی قلعہ شکن جرمنی توپوں کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ قلعہ کے تینوں طرف اُونچی پہاڑیاں تھیں جن پہ قابض ہو جانے کے بعد افغان توپ خانہ اور لشکر کی کامیابی یقینی تھی۔

سرحدی قبائل کی اکثریت افغان لشکر کا ساتھ دے رہی تھی تاہم اورک زئی قبیلہ ابھی میدان میں نہ اُترا تھا۔ اس کے آٹھ ہزار جنگ آزما دونوں لشکروں کی پنجہ آزمائی کے نتیجے کے انتظار میں تھے اور دیکھ رہے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

قلعے کا انگریز کمانڈر سرحدی لڑائیوں کا زیادہ تجربہ نہ رکھتا تھا، وہ اپنی سرگرمیوں کو زیادہ تر دفاع تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی مدد کے لئے دو ہوائی جہاز موجود تھے جو گاہے گاہے بمباری کرتے تھے کہ افغان فوج منتشر ہو جائے۔ تاہم جب دو مارجرمن توپیں پہاڑی چوٹیوں پر نصب کر دی گئیں تو ہوائی جہازوں کے لئے بھی بمباری کرنا ممکن نہ رہا۔

۲۸ مئی کو افغان توپوں کی گولہ باری سے قلعہ ٹل میں پٹرول کے ذخیرے، بھوسے کے ڈھیر اور ٹل ریلوے سٹیشن کے گودام میں رکھے ہوئے غلّے کے انبار کو آگ لگ گئی۔ سنگر وبہ ندی کے پار فرنٹیئر کانسٹیبلری کی ایک چوکی تھی جو اس پمپنگ سٹیشن کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی جہاں سے قلعہ ٹل کو پانی سپلائی ہوتا تھا۔ اس چوکی کے سپاہی بھی رات کو چوکی خالی کر گئے اور افغان حملہ آوروں سے جا ملے۔ خطرہ تھا کہ کہیں پانی کی سپلائی بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ انگریز کمانڈر نے قلعے میں گڑھے کھدوا کر پانی سے بھر لئے۔ سپاہیوں اور گھوڑوں کے راشن کی مقدار آدھی کر دی گئی تاکہ خوراک کا ذخیرہ دیر تک چل سکے۔ گولہ باری سے بچنے کے لئے قلعے کے اندر خندقیں کھود لی گئیں۔ تاہم ان سارے انتظامات کے باوجود محصور فوج کا حال دن بدن پتلا ہوتا گیا۔

حالات کی نزاکت کو دیکھ کر کوہاٹ کے ہندو سکھ ڈر کے مارے شہر خالی کرنے لگے۔ خود انگریزوں کو بھی ڈر تھا کہ اگر ایک بار ٹل کا قلعہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا تو خوشحالی گڑھ تک کسی جگہ اُن کے قدم جم نہ سکیں گے، یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر آفریدی اور اورک زئی قبیلوں نے ٹل میں انگریزوں کی کمزوری بھانپ لی تو وہ خیبر میں بھی ان کا راستہ مسدود کر دیں گے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر پشاور

سے سر آرتھر بیرٹ (BARROT) نے سولہویں ڈویژن کو حکم دیا کہ فوراً کوہاٹ پہنچ کر دفاعی لائن کو مضبوط بنائے، اُدھر جنرل ڈائر (DYER) کے ڈویژن کو (جو جالندھر سے پشاور پہنچا تھا) ہدایت کی گئی کہ ٹل پہنچ کر انگریزی فوج کی مدد کرے۔

اس منصوبے کے مطابق ہر طرف سے آنے والی انگریزی فوج کے دستے ہنگو میں جمع ہوتے گئے۔ جنرل ڈائر کار سے ہنگو پہنچا اور جو فوج جمع ہو چکی تھی اُسے فوراً توغ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ شام تک سبھی دستے توغ پہنچ چکے تھے۔

توغ پہنچ کر جنرل ڈائر نے سارے فوجیوں کو جمع کیا۔ اُن کے سامنے بڑے مؤثر پیرائے میں تقریر کی اور سپاہیوں پر زور دیا کہ ٹل کے محصورین کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔

۳۱ مئی کی صبح کو یہ لشکر ٹل کی طرف روانہ ہوا۔ انتہائی گرمی کے دن تھے۔ درجہ حرارت ۱۲۰ تک پہنچ رہا تھا۔ خصوصاً گورہ سپاہی گرمی کی شدت سے بے حال ہو ہو کر گرتے تھے اور اُنہیں ایمبولنس میں لے جانا پڑتا تھا۔ خود جنرل ڈائر کا پٹھان اردلی اللہ داد بار بار تولیہ بھگو کر "صاحب بہادر" کے سر اور کندھوں پہ ڈالتا تھا کہ کہیں اُسے لُو نہ لگ جائے۔ انتہائی تکلیف اٹھا کر شام تک یہ لشکر توغ سے درسمند پہنچ گیا۔

گورا پلٹن، جس میں زیادہ تر لندن کے شہری اور تاجر پیشہ لوگ بھرتی ہوئے تھے، سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا تھی۔ فروری ۱۹۱۶ء میں ہندوستان پہنچتے ہی انہیں وزیرستان میں خدمات انجام دینی پڑیں تو سب کے سب بیمار پڑ گئے۔ دو ماہ قبل انہیں تری بھیج دیا گیا تھا لیکن صوبہ سرحد میں ہنگامی حالت کا اعلان ہوا تو انہیں بھی ٹل طلب کر لیا گیا۔ درسمند کی گرمی کی وجہ سے ۳۱ افسروں اور ۳۰۰ سپاہیوں پر مشتمل اس انگریزی دستے کا یہ حال تھا کہ اُن کی جلد دھوپ کی تمازت سے جھلس گئی تھی اور اُن کے جسموں سے بُو آنے لگی تھی۔

درسمند سے ٹل کل نو میل کا فاصلہ ہے تاہم انگریز فوج کے لئے یہ سفر کا دشوار ترین مرحلہ تھا۔ یکم جون کو جنرل ڈائر اپنے سپاہیوں کو لے کر روانہ ہوا ـــــ ابھی ٹل سے دو میل اِدھر ہی تھا کہ اس کی ملاقات سٹاف آفیسر میجر وائیلی (WYLLY) سے ہوئی۔ دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر حملے کی سکیم بنائی۔ اس وقت افغانی فوج دریائے کُرم سے پار ایک اُونچی پہاڑی پر مورچے سنبھالے ہوئے تھی۔ دو ہزار

قبائلی نوجوان خادی مخ کے ٹیلے پر ڈٹے ہوئے تھے اور اُن کے پاس چار توپیں بھی تھیں۔ بتایا جاتا ہے کہ توپ خانے پر ہندوستان کا ایک انقلابی میر ظفر الحسن نگران تھا۔ ریاضی میں ایم اے ہونے کی وجہ سے وہ توپ خانے کے کام میں مہارت رکھتا تھا اور ٹھیک نشانوں پر گولے پھینکتا تھا۔ اشخلئی ندی کے جنوب میں چار ہزار خوست وال اور وزیری اپنے کمانڈر ہبرک زدران کی سرکردگی میں ڈٹے ہوئے تھے۔

جنرل ڈائر نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سب سے پہلے اسی خوست وال لشکر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جنرل ڈائر کے نزدیک ان کی پوزیشن تین طرح سے کمزور تھی۔ ان کے پاس توپیں نہ تھیں دوسرے خوست وال اور وزیر ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے تھے ان میں وحدت فکر و عمل ناپید تھی۔ تیسرے ان کی پشت پر دریائے کرم تھا اس لئے ان کے لئے پیچھے ہٹنا آسان نہ تھا۔ جنرل ڈائر نے بڑی ہوشیاری سے ابتداء میں تینوں طرف توپوں سے گولے پھینکے لیکن بالآخر خوست وال اور وزیر لشکر پر بھرپور حملہ کر دیا۔ یہ حملہ ایسا ناگہانی تھا اور انگریزی توپ خانہ اس شدت سے گولہ باری کر رہا تھا کہ خوشی کمانڈر ہبرک زدران حوصلہ ہار گیا، توپوں کی گولہ باری اتنی شدید تھی کہ وہ کچھ بھی کر نہ سکے اور جان بچا کر نکل بھاگنے ہی میں خیریت سمجھی۔ چار بجے تک اس پہاڑی چوٹی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور جنرل ڈائر نے دو سو آدمیوں کو وہاں متعین کرنے کے بعد باقی ماندہ فوج کو سڑک کے کنارے رات گزارنے کا حکم دے دیا۔

اس مورچے کو سر کرنے کے بعد دوسرے دن انگریزی توپ خانے نے کابلی لشکر پر پورا دباؤ ڈالا اگر یہ کمک نہ پہنچتی تو ٹل کے قلعہ کے بچاؤ کی کوئی امید نہ تھی۔ قلعے میں اس وقت ایک سو فوجی ہلاک ہو چکے تھے اور توپوں کی گولہ باری سے سینکڑوں جانور مر چکے تھے۔ علاوہ بریں پانی اور خوراک کے ذخیرے بھی ختم ہونے والے تھے۔ جنرل ڈائر نے قلعے میں پہنچ کر جنرل آسٹس سے چارج لے لیا اور اُسے کوہاٹ بھیج دیا۔ دوسرے ہی دن جنرل ڈائر نے افغان مورچوں کی طرف پیش قدمی کی۔ پولیٹیکل افسر نے اسے بتایا تھا کہ افغان فوج کی کمک کے لئے چار پلٹنیں اور مزید توپیں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن اسی شام کو جنرل نادر خان نے ڈائر کو ایک خط بھیجا کہ امیر امان اللہ خان نے اسے جنگی کارروائی معطل کرنے کا حکم دے دیا ہے کیونکہ افغانستان اور ہندوستان کی حکومتوں میں صلح کے لئے گفت و شنید شروع ہو گئی ہے۔ ڈائر جیسا سرکش ایسی باتوں پر کان کب دھرتا تھا۔ اس نے اس خط کو افغان حکومت

کی کمزوری پر محمول کیا اور پیش قدمی جاری رکھی۔ وہ اپنے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ یوسف خیل کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن سخت گرمی اور چڑھائی کی وجہ سے اس دن ایسا نہ کر سکا۔ تاہم دوسرے دن دریائے گرم کو ایک مقام سے پار کر کے وہ افغانی کیمپ میں داخل ہو گیا۔ پہاڑی پر جنرل نادر خان کا خیمہ اسی طرح نصب تھا۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ خیمے کے اوپر افغان پرچم بھی لہرا رہا تھا تاہم جنرل نادر اور اس کے ساتھیوں کا کہیں پتہ نہ تھا، وہ نکل کر دور جا چکے تھے۔ انگریزی لشکر تو افغانیوں کے تعاقب میں آگے نکل گیا البتہ مقامی لوگوں نے افغان خیموں کو خوب لوٹا۔

ڈائر کو یقین تھا کہ افغان توپ خانہ ہاتھیوں پر واپس لے جایا جا رہا ہے اور پہاڑی راستوں پر ہاتھی کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے کچھ دور تک افغانیوں کا تعاقب کیا۔ جب انہیں نہ پا سکا تو واپس ہو گیا۔ افواجِ ہند کے کمانڈر ان چیف نے اسے اور اس کے سپاہیوں کو مبارک کا پیغام بھیجا۔

اصل میں نادر خان کا خط صحیح تھا۔ جلال آباد پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جانے کے بعد خدشہ یہ تھا کہ فرنگی کہیں مزید آگے نہ بڑھے۔ نیز اہلِ کابل فضائی حملوں سے بھی گھبرا گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ ۳۱ مئی کی صبح کو جنگ بندی کی شرائط طے پا گئیں جس پر انگریزی فوجوں نے بھی جنگی کارروائیاں ترک کر دیں۔

اصل میں ہماری اکثر کارروائیوں میں ہوش کی بجائے جوش کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ امیرِ کابل نے جوش میں آ کر جنگ تو چھیڑ دی تھی لیکن ملک نہ تو اقتصادی طور پر اس کا متحمل ہو سکتا تھا نہ فوجی لحاظ سے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ خیبر رائفلز کی ایک رجمنٹ جو انگریز کی جانب سے درہ خیبر کی حفاظت پر مامور تھی۔ اسلامی جذبے کے تحت اسلحہ سمیت امیرِ کابل کے لشکر میں جا شامل ہوئی تھی، بعد میں اس رجمنٹ کے سپاہی کابل پہنچے تو افغان حکومت انہیں تنخواہ بھی ادا نہ کر سکی۔ حالت یہ ہو گئی کہ وہ کابل کے بازاروں میں نکل پڑتے اور دکانداروں سے زبردستی کھانے پینے کی چیزیں چھین کر لے جاتے۔ اس پر کابل کے شہری امیر کے پاس شکایت لے کر گئے تو اس نے بمشکل تمام انہیں دو دو ماہ کی تنخواہ دے کر اس وعدہ پر رخصت کیا کہ ضرورت ہوئی تو انہیں واپس ڈیوٹی پر بلا لیا جائے گا لیکن واپس بلانے کی نوبت ہی نہ آئی — بالآخر آفریدی رجمنٹ کے سپاہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

حکومتِ کابل نے ایک وفد سردار علی احمد جان کی سرکردگی میں ڈکہ بھیجا تاکہ انگریز کمانڈر سے صلح کی بات چیت کی جائے اور بتایا جائے کہ جنگ محض کسی غلط فہمی کی بناء پر چھڑ گئی ہے۔ چنانچہ وہ (انگریز کمانڈر) عارضی صلح پر رضامند ہوگیا۔

اُدھر انگریزی حکومت ہندوستان کی عام سیاسی بے چینی سے پہلے ہی سخت پریشان تھی، جنگِ عظیم کے بعد خلافت، ہجرت اور ترکِ موالات کی تحریکیں زوروں پر تھیں، آئے دن برطانوی راج کے خلاف پُرزور مظاہرے ہو رہے تھے۔ جنگِ عظیم کے بے پناہ اخراجات کی وجہ سے ملکی خزانہ پہلے ہی زیرِ بار تھا اور مزید بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جونہی امیر امان اللہ خان نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا برطانوی حکومت صلح پر راضی ہوگئی۔ ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو راولپنڈی میں ایک دربار منعقد ہوا جس میں ایک معاہدۂ صلح طے پا گیا۔ اس معاہدے کی رُو سے انگریز نے افغانستان کی خود مختارانہ حیثیت تسلیم کر لی، امان اللہ خان کو "بادشاہ" مان لیا گیا اور وعدہ ہوا کہ آئندہ انگریز افغانستان کے داخلی معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ اس کے بعد مختلف ملکوں کے سفیر کابل میں رہنے لگے، خود افغانستان کا نمائندہ بھی لندن میں متعین ہوا۔

کچھ عرصہ بعد شاہ امان اللہ خان کے خسر اور افغانستان کے واحد اخبار کے ایڈیٹر سردار محمود طرزی بھی ہندوستان کے دورے پر آئے جس کے جواب میں انگریزوں کا وفد سر ہنری ڈابس (DOBBS) کی قیادت میں کابل گیا۔ وفد کو قصرِ دلکشا میں ٹھہرایا گیا اور اُس کے اعزاز میں تاریخی نوعیت کا ایک استقبالیہ دیا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے گئے ہوئے انقلابی رہنماؤں نے اس جنگ میں کابلی حکومت کے لئے بڑا کام کیا۔ اکثر انقلابی کارکن افغان عسکریوں کے دوش بدوش جنگ کے مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت دیتے رہے، ان خدمات کے اعتراف میں افغان حکومت نے قاضی ولی خان کو "لوئی خان" (خانِ اعلیٰ) کا خطاب دیا اور دوسرے انقلابیوں کی بھی قدر افزائی کی۔ تاہم انگریز چونکہ "جمعیت عالیہ مجاہدین" کے نام سے چڑتے تھے اس لئے افغان حکومت سے معاہدہ کرتے وقت یہ شرط عائد کر دی گئی کہ ان انقلابی رہنماؤں اور مجاہدین کو افغانستان میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اس کے باوجود

امیر امان اللہ خان خود مروت کی وجہ سے ان لیڈروں کو افغانستان چھوڑ دینے کا نہیں کہتے تھے ـــــ اُدھر انگریز بار بار اس پر اصرار کرتے تھے کہ انقلابیوں کو افغانستان سے نکال دیا جائے ـــــ جب یہ بات انقلابی رہنماؤں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے از خود ہی افغانستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ قاضی ولی خان ترکی کو، عبید اللہ سندھی اور راجہ مہندر اپر ناپ رُوس کو اور دوسرے کارکن جہاں سینگ سمائے چلے گئے اور یوں انہوں نے حکومت افغانستان پر حرف نہ آنے دیا۔

سیاسی صورت حال

جنگِ افغانستان اور خلافت و ہجرت کی قومی تحریکوں کے زیرِ اثر ملک بھر میں عموماً اور صوبہ سرحد میں خصوصاً فرنگی راج سے نفرت انتہا کو پہنچ گئی تھی، جنگ میں اُلجھے ہوئے ہونے کی وجہ سے حکومت کا نظم و نسق بھی ڈھیلا پڑ گیا اور کچھ عرصہ تک تو یوں معلوم ہونے لگا جیسے صوبہ سرحد میں کوئی حکومت ہی نہ ہو ـــــ سرحدی قبائل شیر ہو گئے۔ ۲۰-۱۹۱۹ء کے دوران سرکاری علاقوں پر قبائلی حملوں کی تعداد ۶۱۱ تک پہنچ گئی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے مردان اور پشاور سے ہزارہ تک کا کوئی علاقہ حملہ آوروں سے محفوظ نہ رہا۔ ان حملوں میں ۲۹۸ برطانوی شہری ہلاک ہوئے اور زخمیوں اور اغواء کئے جانے والوں کی تعداد بالترتیب ۳۹۲ اور ۴۶۳ تک پہنچ گئی۔ لاکھوں روپے کا سامان لوٹ لیا گیا اور دہشت گردی انتہا کو پہنچ گئی۔

اُدھر سرحدی شورش کی وجہ سے اس سال صوبہ سرحد کی انتظامیہ کے اخراجات ۵۵ لاکھ روپیہ سالانہ سے بڑھ کر ۱۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ تک جا پہنچے، مجلس قانون ساز میں خزانے پر اس بوجھ کے خلاف خوب واویلا مچا۔ ہر طرف سے حکومت پر نااہلی کا الزام عائد کیا جانے لگا تو یہ کہہ کر مجلس قانون ساز کے ارکان کو مطمئن کیا گیا کہ سرحدی علاقوں کے دفاعی اخراجات صرف صوبہ سرحد پر کئے گئے اخراجات نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے دفاعی اخراجات کا حصہ ہیں۔

وزیرستان

جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد انگریز نے سارا زور وزیرستان کے قبائل کے صرف کیا۔ "جنڈولہ" اور "پلوسینا" کے محاذوں پر اتنی فوجیں اور اسلحہ بھیجا گیا جو اس سے پہلے کسی بھی سرحدی مہم پر نہ بھیجا گیا تھا۔ رائل ایئر فورس کے طیارے اندھا دھند

قبائلی عوام کو بموں اور گولہ باری کا نشانہ بناتے۔ وزیرستان کے سینکڑوں دیہات پیوند زمین کر دیئے گئے۔ انگریزوں کے غیض وغضب کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ایک ماہ میں وزیر اور محسود کے خلاف بیس بار فوج کشی کی گئی، خصوصی تمغے جاری کئے گئے جو وزیرستان کے محاذ پر "شجاعت" کے کارنامے بجالانے والے فوجی افسروں اور سپاہیوں کو دیئے گئے، اہل وزیرستان کی اقتصادی ناکہ بندی کی گئی اور اس طرح انگریز اپنے ہی تہذیب عوام پر وہ مظالم ڈھاتے رہے جو آج تک کسی مہذب حکومت نے اپنے شہریوں پر روا نہیں رکھے۔

بالآخر انگریز نے ان فوجی مہمات کی آڑ میں رزمک میں بہت بڑی چھاؤنی بنالی اور وہاں دس ہزار فوجی تعین کر دیئے گئے۔ اسی طرح وانا میں بھی نئی چھاؤنی تعمیر ہوئی اور انگریز کے قدم ان علاقوں میں مضبوط ہوتے گئے۔

خلافت اور ہجرت کی تحریکیں

اسلام نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اُخوّت کے ایسے لازوال رشتے میں منسلک کر رکھا ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اس کا دل پورے عالمِ اسلام کے لئے دھڑکتا ہے۔ وطن اور نسل کے مصنوعی اختلافات وحدتِ ایمانی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتے ـــــ دُوری اور نزدیکی بھائی چارے کے اس احساس کو متاثر نہیں کر پاتی۔ سیاسی حالات خواہ کچھ بھی ہوں دُنیا بھر کے مسلمان روزِ ازل سے ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔

جنگِ عظیم اوّل کے بعد اتحادِ عالم اسلامی کا یہی جذبہ برصغیر پاک و ہند میں "مجلسِ خلافت" کی صورت میں ظہور میں آیا۔ مجلس خلافت نہ صرف ہمارے ہاں کی پہلی عوامی تحریک تھی بلکہ ہر اعتبار سے مسلم لیگ یا تحریکِ پاکستان کی پیش رَو جماعت بھی ـــــ اس لئے کہ یہ جماعت شروع ہی سے جداگانہ مُسلم قومیت کے نظریے پر اعتقاد رکھتی تھی اور اس کا مقصدِ وحید غلبۂ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی تھا۔

فرنگی سامراج کے خاتمے اور آزادئ وطن کے حصول کی جدوجہد کا آغاز بھی برصغیر میں مجلسِ خلافت ہی کے پلیٹ فارم سے ہوا جیسا کہ خود مولانا محمد علی جوہر نے ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ

> "کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مُسلمانوں نے بنایا، ورنہ اس سے پہلے وہ عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی ـــــ مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی۔ چنانچہ کلکتہ کانگرس میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگرس کو ترکِ موالات کو اپنا شعار بنانا پڑا ـــــ اور یہ حقیقت

ہمیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمائے سے دورے کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی گاندھی جی کے دورے کے مصارف خلافت فنڈ سے ادا کئے گئے۔ حتیٰ کہ کانگرس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لئے انہوں نے جو دورے کئے ان کے اخراجات بھی مجلس خلافت نے برداشت کئے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روحِ رواں اور بنیاد تحریک خلافت اور مجلسِ خلافت تھی"۔

حقیقت یہی ہے کہ فرنگی اقتدار کا سامنا جس دلیری سے مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خان، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی جیسے مسلمان رہنماؤں نے کیا، اس کی مثال تاریخ سیاسیات عالم میں بہت کم دیکھنے میں آئے گی۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے سیاست کے لئے فضا ہموار کی، گولیوں کی بارش میں نعرۂ حق بلند کیا اور دار و رسن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے برطانوی اقتدار کا رُعب خاک میں ملا دیا۔ یہ ایثار پیشہ لوگ اس وقت میدان عمل میں اُترے جب دوسرے ابھی گھٹنوں چل رہے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں "خلافت سے مُراد وہ نظامِ شرعی ہے جو ہر مسلمان کو خلیفۂ وقت کی معرفت اور اطاعت پر مجبور کرتا ہے جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر تاوقتیکہ خلیفہ اللہ اور اُس کے رسول کی منشاء کے خلاف کوئی حکم نہ دے"۔

بیسویں صدی کے آغاز میں خلافت، ترکی کے سلاطین عثمانیہ کے پاس تھی، اس خلافت میں وہ قوت اور تمکنت تو نہ تھی جو دورِ اوّل کی خلافت کا خاصہ تھی تاہم یہ برائے نام خلافت بھی مسلمانوں کی مرکزیت اور وحدتِ امّت کا ایک زندہ نشان تھی، دُنیا بھر کے مسلمان خلیفہ کے ایک اشارہ پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ کے مقدّس مقامات سے بھی خلیفۃ المسلمین کا پیغام دُنیا بھر کے مسلمانوں تک پہنچتا تھا اور مشرقِ وسطیٰ کے زیادہ تر علاقے پر بھی خلیفہ ہی کا سکّہ چلتا تھا — مغرب کی لادینی حکومتیں مسلمانوں کی اس مرکزیت اور وحدت سے خائف تھیں وہ جانتی تھیں کہ خلافتِ اسلامیہ کا دامن تار تار کئے بغیر مسلمانانِ عالم کو زیرِ نگیں نہیں لایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، فرانس اور اُن کے حلیف ترکی کی خلافت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

مسلمانانِ ہند جو انگریز کے جبر و استبداد کا مزا چکھ چکے تھے اور جو سیاسی اعتبار سے باقی جگہوں کے مسلمانوں سے زیادہ بیدار اور حساس تھے۔ ترکی اور مقاماتِ مقدسہ اسلامیہ پر دُنیائے مغرب کا تسلط ہرگز برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ اُن کی ایمانی اور جذباتی وابستگی ترکی کے ساتھ تھی۔

۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور بلقان کی غیر مسلم ریاستیں متحد ہو کر ترکی پر چڑھ دوڑیں تو مسلمانانِ ہند نے گہرے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ترکوں کے لئے چندہ جمع کیا گیا۔ ہلالِ احمر کے تحت طبی وفد بھیجا گیا اور ہزاروں ہندی مسلمان محض جذبۂ اسلام کے تحت رضاکارانہ طور پر ترکوں کی صفوں میں شامل ہو کر غاصب حملہ آوروں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔

جنگِ عظیم اوّل کے دوران مولانا محمد علی جوہر نے ہر چند کوشش کی کہ ترکی جنگ کی آگ میں نہ کُودے لیکن اپنے سیاسی حالات سے مجبور ہو کر ترکی کو انگریزوں اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہی بن پڑی، اس پر مسلمانانِ ہند کے لئے پھر آزمائش کا دَور شروع ہو گیا۔ اپنے حاکمانِ وقت (انگریز) کے خلاف ترکی کی مدد کرنا مصائب و آلام کو دعوت دینا تھا۔ تاہم مسلمانانِ ہند اس وقت بھی اس آزمائش میں پورے اترے اور ترکی کی حمایت میں پیش پیش رہے۔

جنگِ عظیم کے دوران انگریزی حکومت یقین دلاتی رہی کہ ترکی کے مقبوضات پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا اور ترکوں سے کوئی انتقام ہرگز نہیں لیا جائے گا ـــــ لیکن جونہی جنگِ عظیم میں اتحادیوں کو فتح نصیب ہوئی انگریز اپنی روایتی بدعہدی پر اتر آیا۔ موصل اور قسطنطنیہ پر برطانوی فوجیں قابض ہو گئیں۔ یونان نے سمرنا میں فوجیں داخل کر دیں۔ سیورے کے نام نہاد معاہدے کے تحت شام پر فرانس کو مسلط کر دیا گیا، فلسطین کو یہودی مملکت بنانے کا ناپاک منصوبہ بنایا گیا۔ دنیائے عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے آپس ہی میں اُلجھا دیا گیا۔ غرضیکہ کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو مغربی طاقتوں نے خلافتِ اسلامیہ کا دامن تار تار کرنے کے لئے استعمال نہ کیا ہو۔

ان حالات کو دیکھ کر مسلمانانِ ہند تڑپ اٹھے۔ جنگ کے خاتمہ پر مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تو قید میں تھے، مولانا عبدالباری، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان نے ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ کے مقام پر "خلافت کمیٹی" کی داغ بیل ڈالی۔ خلافت کمیٹی کا پہلا جلسۂ عام نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ہوا جس میں مسلمانانِ ہند کی جانب سے مطالبہ کیا گیا کہ ترکی کی خلافت بحال رکھی جائے۔

مقاماتِ مقدسۂ اسلامیہ سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے اور ترکی سے نا وانِ جنگ نہ لیا جائے۔

ملک بھر کے کونے کونے میں خلافت کمیٹیاں قائم ہوگئیں اور جگہ جگہ جلسے ہونے لگے۔ مقرروں نے اپنی شعلہ بار تقریروں سے کروڑوں دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔ اس دوران رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے بھی زوروں پر تھے۔ ہندو مسلمان سب متحد ہو کر انگریزی سامراج کے خلاف میدان میں نکل آئے، یہی وہ موقع تھا جب گاندھی جی عوامی زندگی میں داخل ہوئے اور مجلسِ خلافت کے کندھے پر بیٹھ کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔

صوبہ سرحد کے حریت پیشہ مسلمانوں کا اس تحریک سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ سرحدی مسلمان ترکوں سے محبت میں اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ ہر گھر، ہر دکان اور ہر ہوٹل ترک مجاہدوں اور ترک غازیوں کی تصویروں سے آراستہ کیا جاتا۔ ہر نماز کے بعد اور ہر اسلامی اجتماع میں ترکوں کی فتح کی دعا مانگی جاتی یہاں تک کہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۲ء کو جب اسلامیہ کالج پشاور کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ بیس پچیس ہزار معززین کا اجتماع تھا، خود چیف کمشنر اور سینکڑوں بڑے بڑے انگریز افسر موجود تھے، ترک مسلمانوں کی کامیابی کی دعا مانگی گئی تو ہر طرف سے "آمین" کا شور اٹھا تو سرکار پرست عناصر حیران ہو کر رہ گئے۔ سرحدی مسلمانوں نے ترکی کے ہلالِ احمر فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا بلکہ صوبہ سرحد سے عبدالرحمٰن خان اور دوسرے لوگ ایک طبی وفد میں شامل ہو کر اپنے ترک بھائیوں کی خدمت کے لئے محاذِ جنگ پر جا پہنچے۔

اب تو یہ حال ہو گیا کہ انگریز کو ہر جلسے پر خلافت کے جلسے کا گمان ہوتا۔ انہی دنوں اتمان زئی میں خان عبدالغفار خان اور اُن کے ساتھیوں نے معززین علاقہ کا ایک جلسہ بُلایا تھا جس میں عوام کی بعض شکایات اور مطالبات پر تقریریں ہوئیں اور مقامی مسائل زیرِ بحث آئے تو بھی انگریز نے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا۔ دوسرے دن گرفتار شدگان کو ایک میدان میں بٹھا کر اُن کے اردگرد توپیں نصب کر دی گئیں اور یہ تاثر دیا گیا گویا سبھی مظاہرین کو توپوں سے اُڑا دیا جائے گا۔ تاہم بعد میں ان لوگوں کو مختلف میعاد کی سزائیں سنا دی گئیں۔

ترک موالات

مولانا محمد علی جوہر ایک وفد لے کر انگلستان گئے تھے تاکہ برطانوی حکومت کو ترکی کے بارے میں مسلمانانِ برصغیر کے جذبات سے آگاہ کریں۔ لیکن انگریز یوں

نے فتح کے گھنٹہ میں وفد کے ارکان سے بڑی سرد مہری کا اظہار کیا — اس وفد کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند کا اضطراب اور بڑھ گیا — اس پر مئی ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی نے ترک موالات کا آغاز کر دیا، حکومت کے دیئے ہوئے خطابات واپس کر دیئے گئے۔ کونسلوں کی رکنیت اور سرکاری ملازمتوں سے استعفیٰ دیئے جانے لگے۔ سرکاری کالجوں، سکولوں اور عدالتوں سے عدم تعاون کیا جانے لگا اور ولایتی مال کا بائیکاٹ (مقاطعہ) کر دیا گیا — علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلہ میں قوم پرست مسلمانوں نے "جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی" کی بنیاد رکھی تو اسلامیہ کالج پشاور کے بہت سے جوشیلے طلباء نے بھی اپنے ادارے کو چھوڑ کر اس قومی درس گاہ میں داخلہ لے لیا۔

پشاور صوبہ سرحد کے پہلے شخص جنہوں نے سرکاری ملازمت سے احتجاجاً استعفیٰ دیا۔ زیارت کاکا صاحبؒ کے میاں حمید گل کاکا خیل تھے، انہیں "خان صاحب" کا خطاب اور "قیصرِ ہند" کا تمغہ اور جاگیر ملی ہوئی تھی، مجلس خلافت کی جانب سے ترکِ موالات کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور حکومت کو لکھا کہ چونکہ انگریز کی نوکری حرام قرار دے دی گئی ہے اس لئے میں اس سے مستعفی ہوتا ہوں۔ انگریز افسروں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ استعفیٰ واپس لیں لیکن وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے، بعد میں انہیں کہا گیا کہ "اچھا، یہ ہی لکھ دو کہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے مستعفی ہوتا ہوں"۔ لیکن وہ اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استعفیٰ تو منظور ہوا لیکن حکومت کی مخالفت کی پاداش میں قید کر دیئے گئے۔ بڑی مشکل سے میاں اکبر شاہ کاکا خیل، صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور نواب دوست محمد خان (تنہکال بالا) نے کوشش کر کے انہیں رہا کرایا — جیل سے باہر نکلے تو مجلسِ خلافت نے انہیں "فخرِ قوم" کا خطاب دیا — عمر کے آخری دور میں میاں صاحب سخت مالی مشکلات سے دوچار رہے تاہم محبانِ وطن کا پورا ساتھ دیتے رہے۔

پشاور کے رئیس حاجی غلام صمدانی خان کا خانوادہ قومی اور دینی کاموں میں ہمیشہ بھرپور حصہ لیتا رہا ہے۔ جنگِ بلقان کے دوران حبیب مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے ایک طبی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ترکی بھیجا گیا تو غلام صمدانی خان کے بیٹے عبدالرحمٰن بھی، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وفد کے ہمراہ ہو لئے۔ کچھ

عرصہ بعد طبی وفد تو وطن لوٹ آیا لیکن عبدالرحمٰن وہیں رہ پڑے اور ترک غازیوں کے شانہ بشانہ جہاد میں حصہ لیتے رہے۔ بعد میں وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اُونچے اونچے عہدوں تک پہنچے ترکی کے مشہور مدبر اور جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کمانڈر عبدالرؤف بے نے انہیں اپنا بھائی بنالیا۔ کچھ عرصہ کے لئے وہ حکومت ترکیہ کی جانب سے افغانستان میں ترکی کے سفیر بھی رہے، ہجرت کے بعد ایک دن کے لئے بھی انہوں نے غلاموں کی سرزمین، ہندوستان پر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔

پشاور صدر کے قاضی محمد ولی خان بڑے عالی دماغ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، خلوص اور ایثار میں کوئی اُن کا ہم پلہ نہ تھا، انہیں پتہ چل گیا کہ حکومت اُنہیں گرفتار کرنے والی ہے تو وہ چپکے سے درّہ کوہاٹ کی راہ کابل جا پہنچے اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت کے انقلابی گروہ میں شامل ہوگئے۔ افغانستان کی تیسری جنگ میں انہوں نے افغانستان کی جانب سے انگریزوں کے خلاف نمایاں جنگی خدمات انجام دیں، امان اللہ خان نے انہیں "لوئے خان" کا خطاب دیا۔ تاہم جب افغان حکومت نے انگریزوں سے صلح کرلی تو قاضی صاحب مولانا برکت اللہ بھوپالی اور راجہ مہندر اپرتاپ کے ہمراہ ترکی چلے گئے۔ جنگ بلقان میں وہ ترکوں کی جانب سے لڑے اور شدید زخمی ہوئے۔ اس کے بعد بھی وہ مسلسل مسلمانوں کے بہبود اور غلبے کے لئے اَن تھک کام کرتے رہے، اس دوران وہ یورپ کے مختلف ملکوں میں رہے۔ کئی غیر مسلموں نے اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ۱۹۵۹ء میں پشاور واپس آئے، بیمار تو تھے ہی، چند ماہ بعد وفات پاگئے۔

چارسدہ کے درّانی خاندان کے چشم وچراغ امیر محمد خان بھی ہجرت کے دوران ترکی جا پہنچے اور ترک غازیوں کے شانہ بشانہ شریک جہاد رہے، پشاور شہر کے میاں عبدالغفور کے صاحبزادے عبدالعزیز اور عبداللہ جان پشاور سے افغانستان اور روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچے اور پھر وطن واپس نہ آئے، شہر ہی کے حکیم قطب عالم اور اُن کے بھائی فضل قادر ہجرت کر کے گئے۔ اوّل الذکر تو واپس آ گئے لیکن مؤخر الذکر نے ترکی شہریت اختیار کرلی۔

ان معروف لوگوں کے علاوہ ہزاروں ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلامی حمیت کی وجہ سے خلافت اور ہجرت کی تحریکوں میں مخلصانہ حصہ لیا لیکن اب ان کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں — اللہ پاک ان گمشدگان محبت کو جزائے وافر دے۔

کوہاٹ مسلمانانِ کوہاٹ میں سیاسی بیداری کا آغاز "انجمن اسلامیہ" کے قیام سے ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا احمد گل، شیخ عبدالرحمٰن اور شاہ جی وکیل نے اس انجمن کے تحت سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کی طرح ڈالی۔ کوہاٹ کے اس وقت کے اسسٹنٹ کمشنر سردار احمد خان بھی ان کی بھرپور پشت پناہی کرتے رہے۔ انجمن کے تحت ایک سکول اور ایک پبلک ہال تعمیر ہوا۔ اسلامیہ سکول کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہر سال ملک کے نامور مسلمان زعماء آتے اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتے۔ مولانا شبلی، خواجہ کمال الدین احمد، مولانا ظفر علی خان اور دوسرے بڑے بڑے لیڈر اس سلسلے میں کوہاٹ تشریف لائے اور انجمن کے جلسوں سے خطاب کیا۔

طرابلس کی جنگ کا ردِعمل کوہاٹ میں بھی دیکھنے میں آیا۔ لوگ فرنگی حکمرانوں سے سخت متنفر ہوگئے۔ ایک بار دن دہاڑے دو انگریز افسروں (مسٹر فوکس اور اس کے ساتھی) کو گولی مار دی گئی۔

۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر انصاری کی تجویز پر علی گڑھ سے ایک وفد کوہاٹ آیا۔ وفد کے سربراہ مولانا شبلی نعمانی تھے اس وفد کے ایک رکن سردار عبدالرؤف پشاوری نے ترکوں کی حمایت اور انگریز کی مخالفت میں وہ معرکتہ الآرا تقریر کی جو بڑے بوڑھوں کو ابھی تک نہیں بھولی ـــــ انجمن اسلامیہ کے ان جلسوں کی بدولت نئی نسل حُبّ الوطنی کی رُوح سے سرشار ہوئی۔ چنانچہ اسلامیہ ہائی سکول سے جو طالب علم نکلے وہ اب تک کوہاٹ کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں امرتسر کے نہتے عوام پر گولیاں برسائی گئیں تو کوہاٹ سے رضاکاروں کا ایک دستہ جس میں میاں غلام محمد پراچہ ملتانی، میاں غلام محمد دکنی، حافظ رحمت اللہ اور مولانا عبداللطیف شامل تھے، امرتسر گیا۔ ان دنوں ہندو مسلم اتحاد کا چرچا تھا۔ چنانچہ دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ سرکردہ کارکن بھی خلافت کے رضاکاروں میں شامل ہوگئے۔ انگریز خلافت کے نام سے بِدکتے تھے اُنہیں ایک سرحدی شہر میں مجلسِ خلافت کا قیام کہاں پسند تھا ـــ؟ ڈپٹی کمشنر نے مولانا احمد گل کو طلب کیا اور دو شرطیں اُن کے سامنے رکھیں۔ مجلسِ خلافت کے کارکن رہو یا انجمن اسلامیہ کے صدر۔ مولانا کچھ دیر کے لئے سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر سوچا کہ انجمن تو اب چل نکلی ہے۔ اسے کوئی اور چلالے گا۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو انجمن کی صدارت سے استعفیٰ لکھ دیا۔ اور اپنے آپ کو مجلسِ خلافت کے کام کے لئے وقف کر دیا۔ پیر شہنشاہ، لالہ ایوب، خیر محمد جلالی اور دوسرے لوگ بھی ان کا

ساتھ دینے لگے۔

بعد میں جب ہجرت کی تحریک شروع ہوئی اور علماء نے فتویٰ دے دیا کہ فرنگی کے سایہ میں زندگی گزارنا کفر ہے تو جمعہ خان ٹھیکہ دار، مہر علی خان، چاچا غلام رسول اور غلام حیدر کاریگر بھی تحریک کی صفِ اوّل میں نظر آنے لگے۔ جمعہ خان ٹھیکہ دار ناخواندہ تھے لیکن بڑی سیمابی طبیعت کے مالک، مہاجرین کی خدمت میں سب کچھ لٹا دینے پر تیار رہتے تھے۔ بہت سے کوہاٹیوں نے اپنی جائدادیں اونے پونے بیچ کر افغانستان کی راہ لی اور بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔

ایک مردِ خدا جن کا نام عبدالکریم بتایا جاتا ہے۔ کوہاٹ (یا ضلع کوہاٹ) کے رہنے والے تھے۔ ہجرت کے دوران پہلے افغانستان اور پھر وہاں سے رُوس جا پہنچے۔ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ ہوائی جہاز اڑانے میں مہارت پیدا کی۔ ۱۹۲۵ء میں فوت ہوئے۔ وفات کی خبر شائع ہوئی تو لکھا تھا کہ وہ کوہاٹ کے رہنے والے تھے۔ تاہم اُن کے بارے میں تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

درہ کوہاٹ کے لوگ مہاجرین کے قافلوں کی بڑی قدر کرتے اور انہیں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاتے تھے۔

بنّوں مجلسِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے ضمن میں اہلِ بنّوں نے بڑی حُبّ الوطنی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے انگریزی عدالتوں کا اتنا مؤثر بائیکاٹ کیا کہ کچہریوں میں اُلّو بولنے لگے کوئی اُدھر کا رُخ نہ کرتا۔ سبھی جھگڑے اور تنازعے شرعی عدالتوں یا جرگوں میں فیصل ہونے لگے۔

بنوں میں تحریک کی قیادت محمد جان خان عباسی بیرسٹر کے ہاتھ میں تھی۔ نہایت بلند قامت، شکیل و وجیہہ اور گورے چٹے، بارُعب انسان تھے۔ انگلستان سے کئی زبانوں میں ایم اے کی ڈگری اور بیرسٹری کی سند لے کر لوٹے تھے۔ انگریزی میں بات کرتے تو کوئی پہچان نہ سکتا کہ انگریز ہیں یا پاکستانی ـــــ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور خلافت کا پرچم بلند رکھا، مولانا ظفر علی خان کی اُن سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی صلاحیتوں اور شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ "زمیندار" کے پہلے صفحہ پر اُن کی شان میں نظم شائع کی۔

اسی طرح بیرسٹر محمد جان خان عباسی کے دوسرے عظیم رفیقِ کار حکیم عبدالرحیم کی گرفتاری پر بھی مولانا ظفر علی خان نے اسے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ان دو حضرات کے علاوہ ملک خدا بخش ایڈووکیٹ، محمد نواز خان کنڈی ایڈووکیٹ، ملک معزاللہ خان، ماسٹر میر قلم خان نیازی، شیخ حق نواز خان، مولانا گل خوشداد، مرزا مقرب حسین ملک غلام جیلانی، مولانا غلام سرور، قاضی فضل قادر شہید، مولانا لطف اللہ خان عرف خان مُلّا ملک اکبر علی، ملک آزاد خان، حاجی عبدالرحمٰن خان، ملک زرداد خان، حاجی مختار خان، ارباب جمعہ خان، حاجی امان خان اور دوسرے سینکڑوں اہلِ بنّوں نے بھی تحریکِ خلافت میں زبردست قربانیاں دیں۔

بنّوں کا ڈپٹی کمشنر گارلٹن تحریکِ خلافت کی کامیابی سے بوکھلا اُٹھا اور تحریک کو کچلنے کے ارادہ سے اُس نے بیرسٹر محمد جان خان عباسی، ملک خدا بخش ایڈووکیٹ، ارباب جمعہ خان اور حکیم عبدالرحیم کو تین تین سال کے لئے جیل بھیج دیا۔ کارکنوں کو ہراساں کرنے کے لئے چھاپے مارے جانے لگے۔ علاقہ داؤد شاہ اور تپہ ممش خیل تحریکِ خلافت کے گڑھ تھے، وہاں کے لوگوں پہ بڑی سختی کی گئی۔ مرزا مقرب حسین، ملک غلام جیلانی۔ ملک زرداد خان، رئیس معزاللہ خان اور دوسرے بہت سے کارکن کابل کو ہجرت کر گئے۔ معزاللہ خان نے پھر وطن کا رُخ نہ کیا اور مرنے کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق انہیں کابل ہی میں دفن کیا گیا۔

ہزارہ ہزارہ میں تحریکِ خلافت اس درجہ کامیاب ہوئی کہ سارے ضلع سے انگریزی اقتدار ختم ہوتا نظر آنے لگا۔

ایورٹ (EWART) نامی انگریز اعتراف کرتا ہے کہ "صوبہ سرحد کے لاکھوں لوگوں نے یا تو ہجرت کی یا ہجرت کے لئے تیار ہو گئے۔ ہر مسلمان دارالحرب (برصغیر پاک و ہند) میں رہنے کو گناہ سمجھنے لگا"۔

کوہستانِ ہزارہ کے قبائلی مجاہد میدان میں نکل آئے اور انہوں نے سرکاری علاقوں پر چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ حکومت کو امن و امان کی بحالی کے لئے فوجی دستے بھیجنے پڑے۔

مانسہرہ کے مولوی محمد اسحٰق کی مسجد تو ایک عدالتِ عالیہ کا منظر پیش کرنے لگی۔ مانسہرہ تحصیل میں عملاً برطانوی عمل داری ختم ہو کر رہ گئی۔ ڈھوڈیال اور شنکیاری میں اپنے تھانے قائم کر لئے اور اپنے تھانیدار اور سپاہی متعین کر دیئے، تحصیلدار مقرر کئے گئے جو سارے انتظامی امور انجام دینے لگے۔ جو سرکاری افسر اپنے فرائض انجام دینے کی جرأت کرتا۔ عوام اُسے زدوکوب کرتے۔

جنرل میکماہن نے اپنے کتابچے میں لکھا :۔

"یہ امر یاد رہنا چاہیئے کہ مذہبی اشتعال ہندوستان سے بڑھتے بڑھتے صوبہ سرحد تک بھی پہنچ چکا ہے، جہاں سے دو لاکھ سے زائد لڑاکا جوان کسی وقت بھی میدان میں کود سکتے ہیں"۔

مولانا محمد اسحاق کے علاوہ مولانا محمد عرفان مانسہروی بھی تحریکِ ہجرت اور خلافت کے مقتدر رہنما تھے۔ دونوں حضرات کو بعد میں ہزارہ سے جلا وطن کر دیا گیا اور انہوں نے ساری زندگی پنجاب کے مختلف مقامات میں گزار دی۔

جرید (بالا کوٹ) ہزارہ کے مولانا عبدالمنان نہ صرف سرگرم سیاسی کارکن تھے بلکہ ہجرت کر کے ترکی جانے والوں میں بھی شامل تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب حجاز میں باہمی کشمکش شروع ہوئی تو انہوں نے "مسئلہ حجاز" کے عنوان سے ایک اُردو کتاب بھی لکھی تھی۔

جرأت و ایثار کی روشن مثالیں

تحریک خلافت اور تحریکِ ہجرت کے دوران جرأت و ایثار کی بڑی روشن مثالیں دیکھنے میں آئیں، چارسدہ کے حضرت گل ٹھیکیدار خان عبدالغفار خان کی تقلید میں شبقدر کی راہ عازمِ افغانستان ہوئے۔ ایک بہن، ایک بھائی اور ماموں بھی ساتھ تھے، پہلے حاجی صاحب ترنگ زئی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر کونٹر میں ڈیڑھ ماہ تک ٹھہرے۔ دورانِ سفر ایک مشکیزے پر دریا پار کر رہے تھے کہ مشکیزہ پھٹ گیا۔ بہتے ہوئے بڑی مشکل سے ایک جزیرے پر پہنچے اور جان بچی۔ جلال آباد تک گئے تو معلوم ہوا کہ افغان حکومت کی طرف سے ہجرت کر کے جانے والوں کے لئے کوئی اہتمام نہیں۔ واپسی پر بیل بیچ کر بمشکل تمام پشاور پہنچے۔

پشاور کے لالہ عمر بخش اور اُن کے اہلِ خاندان نے ہجرت کی اور افغانستان پہنچے، وہاں کے عوام اور حکومت کی سرد مہری سے تنگ آ کر تاشقند چلے گئے، کچھ عرصہ بعد واپس آ رہے تھے کہ انقلابی ہونے کے شبہ میں گرفتار کر لئے گئے ـــــ انگریز نے اُن پر وہ ستم توڑے کہ بھاگ کر پھر ایک خفیہ راستے سے افغانستان جا پہنچے اور پھر وہاں سے روس پہنچ کر ہی دم لیا۔

سرحدی مہاجرین کا ایک بڑا قافلہ افغانستان جانے کے لئے پشاور سے نکلا تھا، جب یہ قافلہ اسلامیہ کالج پشاور سے کچھ آگے "کچی گڑھی" کے قریب پہنچا تو ایک درندہ صفت گورے سپاہی

نے ایک مہاجر حبیب اللہ خان (سکنہ تنگی ، چارسدہ) کو شہید کر دیا۔ اس شہید کا جنازہ پشاور پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ہزاروں لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔ خواتین اور بچے گھروں کی چھتوں سے جنازے کو دیکھتے اور روتے رہے۔ اس بے بسی اور بے چارگی پہ کون تھا جو آنسو نہ بہاتا۔ تاہم مہاجرین چونکہ اللہ کی راہ میں نکلے تھے اس لئے انہوں نے یہ درندگی صبر و سکون سے برداشت کر لی ورنہ خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔

درہ خیبر بتایا جا چکا ہے کہ جمعدار میر دست خان آفریدی (وکٹوریہ کراس) کی بدولت سلطانِ ترکی کا پرچم درہ خیبر پہنچ چکا تھا اور آفریدی اس تحریک کا سرگرمی سے ساتھ دے رہے تھے، پشاور سے ہجرت کرنے والوں کے جو قافلے کابل جاتے خیبری آفریدی نہ صرف ان کی ہر ممکن خدمت کرتے، ان کو خورد و نوش کی چیزیں مہیا کرتے بلکہ نہایت احترام کے ساتھ لنڈی خانہ تک پہنچا دیتے تھے۔ لنڈی کوتل کے شنواری قبیلہ کی ہمدردیاں بھی کارکنانِ خلافت کے ساتھ تھیں۔

خان عبدالغفار خان اگست میں ہجرت کی تحریک پورے عروج پہ تھی۔ چنانچہ خان عبدالغفار خان، خان عباس خان، محمد اکبر خان خادم چند دوسرے ہمراہیوں سمیت علاقہ مہمند کے راستے عازمِ افغانستان ہوئے۔ تاہم وہاں پہنچنے سے پہلے ہی انہیں خبر ملی کہ افغانستان میں مناسب انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے مہاجر بڑے پریشان ہیں بلکہ تنگ آکر واپس آ رہے ہیں۔ خان محمد عباس خان نے پشاور آکر چوک یادگار پہ جلسہ کیا اور لوگوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ لیکن کسی نے اُن کی آواز پہ کان نہ دھرا۔ عبدالغفار خان بھی کچھ عرصہ علاقہ آزاد مہمند میں قیام کرنے کے بعد واپس اُتمان زئی پہنچ گئے۔

تحریک کا انجام سید ہاشمی فرید آبادی کا یہ محاکمہ مبنی بر حقیقت ہے کہ "مجلسِ خلافت اور اس کی شورش، مذہبی اور سیاسی سے زیادہ جذباتی نوعیت رکھتی ہے"۔ جذباتی اشتعال انگیزی چونکہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی اس لئے جلد ہی یہ تحریک ختم ہو کر رہ گئی۔ بانیٔ خاکسار تحریک علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کو حکومتِ ہند نے یہ پیش کش کی تھی کہ وہ افغانستان کی سفارت کا عہدہ قبول کر کے مہاجرین اور حکومتِ افغانستان میں ٹکراؤ پیدا کر دیں تاکہ ہجرت کی تحریک اپنی موت آپ مر جائے۔ علامہ مشرقی کی غیرت نے یہ پیش کش تو قبول نہ کی تاہم انہوں نے

مجلس خلافت پشاور کے روحِ رواں حاجی جان محمد کو صاف بتادیا کہ مزید لوگوں کو افغانستان نہ بھیجیں ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔

چونکہ تحریک ہجرت کا سب سے بڑا مرکز پشاور تھا۔ اس لئے شہر میں بے حد جوش و خروش تھا۔ مخیر لوگ مہاجرین کی خاطر ہر ممکن ایثار کا ثبوت دے رہے تھے۔ نمک منڈی میں خیمے لگے تھے جہاں آنے والے مہاجروں کو ٹھہرایا جاتا۔ اس کے خورد و نوش کا انتظام کیا جاتا، پنجاب اور سندھ سے بڑے بڑے قافلے آتے۔ سندھ کے بیرسٹر جان محمد جونیجو مہاجرین کی ایک سپیشل ریل گاڑی لے کر سندھ سے پشاور پہنچے تو اُن کا شاندار استقبال کیا گیا ـــــ حاجی جان محمد، مرزا محمد سلیم، منشی عبدالکریم، یوسف علی خان، حکیم قطب عالم اور دوسرے کارکن دن رات مہاجرین کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اندازہ ہے کہ سب سے زیادہ سرحدی عوام ہی نے ہجرت کی تحریک میں حصّہ لیا، لوگ اپنے گھر بار بیچ رہے تھے، مویشی فروخت کر رہے تھے، بال بچوں کو اپنے عزیز و اقارب کے سپرد کر کے سفرِ ہجرت پر پورے جوش سے روانہ ہو رہے تھے، یہ سب قربانی صرف جذبۂ اسلامی کے تحت دی جا رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف افغانستان جیسے پسماندہ ملک کے وسائل ایسے نہ تھے کہ ان مہاجروں کی آبادکاری کا کوئی انتظام ہوتا۔ وہاں نہ اُن کے سر چھپانے کو کوئی جگہ تھی۔ نہ کام روزگار ـــــ افغان حکومت تھوڑا ہی عرصہ پہلے ایک تباہ کن جنگ سے فارغ ہوئی تھی وہ خلافتی کارکنوں کی مدد کر کے انگریز کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اقتصادی طور پر بھی اس وقت افغانستان کے حالات نہایت ابتر تھے۔

شوکت عثمانی کا بیان

برِصغیر کے معروف قومی کارکن شوکت عثمانی نے جو خود ہجرت کر کے افغانستان، روس اور دوسرے ملکوں میں پہنچے اپنی تصنیف "پشاور سے ماسکو" (انگریزی، سنِ اشاعت ۱۹۲۷ء) میں اس سفر کی سرگذشت یوں سنائی ہے :-

"۱۹۲۰ء میں ہجرت کی تحریک ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ نہ صرف عام مسلمان بلکہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس سے خاصا متاثر ہوا۔ حتیٰ کہ انتہا پسند قسم کے نوجوان بھی وطن چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔ اُدھر علماء نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ

دے دیا۔ تاہم مسلمانانِ ہند اپنے ہمسایہ ملک افغانستان کے حالات سے بے خبر تھے۔ وہ اسے اسلامی مملکت سمجھتے ہوئے یقین رکھتے تھے کہ شاہِ افغانستان ہر حال میں ان کا ساتھ دیں گے۔ میرے اندازے کے مطابق چھتیس ہزار افراد ہجرت سے متاثر ہوئے۔ پہلے پہل بیس بیس پچیس پچیس مہاجروں کے قافلے جاتے تھے لیکن جب تحریک نے زور پکڑا تو ایک ایک وقت میں سینکڑوں لوگ پشاور کے راستے کابل پہنچنے لگے۔ میں (شوکت عثمانی) تیسرے قافلے میں تھا۔

ہم پشاور سے کسی خاص دقت کے بغیر جلال آباد پہنچے جہاں جنرل نادر خان نے جو وزیر جنگ بھی تھے اور کابل کے گورنر بھی، مہاجرین کا استقبال کیا، شوکت عثمانی کے مطابق جنرل نادر خان ہی وہ شخص تھے جن سے مہاجرین متاثر ہوئے۔ اُن کی شخصیت میں ایک ایسا سحر تھا کہ جو اُن سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ بے حد سلیقہ اور خوش خلق تھے۔ سیاست حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے اور ایک اخبار "اتحاد مشرق" کے ایڈیٹر بھی تھے۔

دو ہفتہ تک جلال آباد میں ٹھہرنے کے بعد مہاجرین کا قافلہ کابل روانہ ہوگیا۔ دو قافلوں میں پچاس آدمی تھے۔ تانگوں میں سفر کرتے ہوئے ۳ر جون ۱۹۲۰ء کو کابل پہنچے۔ اعلیٰ حضرت شاہ کابل نے استقبال کیا۔ بڑی حوصلہ افزائی کی لیکن خدا جانے اس میں کیا منطق تھی کہ انہوں نے کہا کہ قافلہ دو ماہ تک جیل السراج میں ہمارا مہمان رہے گا۔ اس کے بعد ہر مہاجر کو کام پر لگا دیا جائیگا۔

دو ماہ طویل عرصہ تھا بے کار بیٹھے ہوئے مہاجرین آپس میں یہی بحث کیا کرتے تھے کہ آیا انہیں افغانستان ٹھہرنا چاہیئے یا انا طولیہ (ترکی) چلا جانا چاہیئے۔ بدقسمتی یہی تھی کہ کوئی واضح پروگرام سامنے نہ تھا۔ محض جذباتی نعروں سے متاثر ہو کر اور انگریز دشمنی کے روایتی جذبہ کے تحت لوگ اللہ کے آسرے پر ہندوستان سے تو نکل کھڑے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسا رہنما نہ تھا جس کا فیصلہ سب کو قابل قبول ہوتا۔

اُدھر شاہ کابل نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ مہاجرین ہمارے مہمان ہوں گے لیکن اُن دنوں افغانستان کا نظم و نسق بڑا ابتر تھا۔ جو کچھ حکومت کی طرف سے آتا، افغان افسر اور کارکن خود ہڑپ

کر جاتے۔ مجبوراً مہاجرین کو کھانے پینے کی چیزیں اپنی جیب سے خریدنی پڑتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن لوگوں میں افغان حکومت کے خلاف غم و غصہ بڑھتا گیا۔

انہی دنوں ایک بار مولانا عبید اللہ سندھی مہاجرین کی ملاقات کو آئے۔ وہ اپنے آپ کو سوشلسٹ رہنما خیال کرتے تھے۔ لمبی سفید ڈاڑھی اور بارعب شخصیت کی بدولت افغان حکمران ان سے بے حد متاثر تھے اور انہیں مہاجرین کے سلسلے میں اپنا مشیر بنا رکھا تھا۔ تاہم یہ مولوی صاحب اندر ہی اندر ایک دوسرے مہاجر رہنما قاضی ولی خان (پشاوری) کے سخت مخالف تھے اور ہر قیمت پر انہیں نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ قاضی ولی خان قوم پرست عناصر کے ترجمان اور نمائندے تھے۔ مولوی عبید اللہ نے مہاجرین کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن کوئی اُن کی باتوں میں نہ آیا اور وہ بے نیل و مرام واپس چلے گئے۔

دوسرے دن ان مہاجرین اور دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کو قاضی ولی خان کی جانب سے کابل میں ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا۔ مولوی عبید اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ اور مولوی عبدالحق نامی ایک اور شخص بھی، جو لیڈری کا دم بھرتے تھے اور اس امر کے حامی تھے کہ مہاجرین کو ترکی پہنچ کر خلیفۃ المسلمین کی جانب سے شریک جہاد ہونا چاہیئے — ان تینوں لیڈروں میں خوب کھینچا تانی ہوئی۔ ہر ایک اپنی بات منوانا چاہتا تھا تاہم مولوی عبید اللہ کا رویہ تحکمانہ تھا۔ یہی حال مولوی عبدالحق کا بھی تھا۔ لیکن قاضی ولی خان شرافت کا دامن ہرگز نہ چھوڑتے تھے۔ ان کی باتیں مدلل اور پُرمغز تھیں۔ ہر ایک نے اُنہیں پسند کیا تمام مہاجرین اُن کے ساتھ ہو لئے اور "ترکی چلو — ترکی چلو —" کے نعرے لگانے لگے۔ گویا قاضی ولی خان کا مؤقف تسلیم کر لیا گیا۔

مولوی عبید اللہ بھلا اس شکست کو کہاں برداشت کر سکتے تھے، انہوں نے بادشاہ کابل کے کان بھرے، افغان حکومت چونکہ مولوی صاحب کے زیر اثر تھی اس لئے نزلہ قاضی ولی خان پر گرا۔ انہیں شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ جیسے بھی ہو مہاجرین کو واپس جبل السراج بھیج دیں۔ قاضی صاحب تجربہ کار فوجی افسر بھی تھے۔ جبل السراج کے عرصۂ قیام میں انہوں نے مہاجرین کی فوجی تربیت کا انتظام کر دیا۔ اور دو ماہ کے بعد افغان فوج بھی مہاجرین کی پریڈ دیکھ کر دنگ رہ گئی، مہاجرین کو افغان فوج میں شامل کئے جانے کی پیشکش کی گئی۔ لیکن انہوں نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔

دو ماہ کے بعد بھی جب مہاجرین کے لئے کوئی پروگرام طے نہ ہو سکا تو اُن میں بے چینی پھیلنے لگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مہاجرین کو جبل السراج میں روکے رکھنے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی بات تو اس دوران مہاجرین کے ذہنی رجحانات کا پتہ چلانا تھا۔ دوسرے کابلی حکومت یہ پتہ لگانا چاہتی تھی کہ مہاجرین میں کوئی برطانوی مخبر تو نہیں۔ حالانکہ مہاجرین تو صرف جذبۂ اسلامی کے تحت اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہِ خدا میں نکلے تھے۔ بہر حال جوں جوں وقت گزرتا گیا مایوسی بڑھتی گئی۔ قاضی ولی خان کی طرف سے نہ تو ترکی کے پاسپورٹ موصول ہوئے نہ کوئی اور خبر آئی۔ بچارے مہاجر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ہدایات کے منتظر تھے۔ چند دن بعد ایک نیا قافلہ آیا تو اُن کی زبانی معلوم ہوا کہ قاضی ولی خان کو مقبرۂ بابر (کابل) کے پاس کہیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی مہاجرین میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے ایک محضر نامہ لکھ کر حکومت افغانستان سے مطالبہ کیا کہ قاضی ولی خان کو رہا کیا جائے اور مہاجرین کو ترکی کے لئے پاسپورٹ مہیا کئے جائیں۔ درخواست پر تین سو مہاجرین کے دستخط تھے۔

اب مہاجرین نے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ محمد اکبر خان قریشی (ہری پور، ہزارہ) کو صدر مجلس بنایا گیا۔ اکبر قریشی نہایت دلیر اور مدبر انسان تھے۔ بڑے قابل اور بڑے جوشیلے ــــ (۱۹۲۱ء میں وطن واپس آئے تو برطانوی حکومت نے دس سال کی سزائے قید اس لئے سنائی کہ اُن پر بالشویک سرگرمیوں کا الزام تھا۔ دس سال تک وہ جیل میں رہے لیکن کانگرس یا کسی قومی جماعت کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ اُن کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج ہی بلند کی جاتی)

اس تنظیم نے کافی کام کیا۔ مہاجرین کو مزید نقصان پہنچنے نہ پایا ــــ معلوم ہوا کہ اس اثناء میں افغان حکومت اور حکومت ہند میں مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی، اکثر مہاجر تنگ آ کر واپس آ گئے جو زیادہ غیرتی تھے۔ ترکی اور رُوس کو نکل گئے۔

۱۹۲۳ء میں ترکی میں مصطفیٰ کمال برسر اقتدار آ گیا۔ اس نے سلطان ترکی کو معزول کر دیا اور ترکی میں جمہوری طرز کی قومی حکومت قائم ہو گئی۔ جب ترکوں نے خود ہی اپنے ہاتھوں خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کر دیا تو ہندوستان میں خلافت اور ہجرت کی تحریکیں بھی رفتہ رفتہ خود ہی گوشۂ گمنامی میں چلی گئیں۔

کارکنانِ خلافت

مجلسِ خلافت قائم کرنے کے سلسلے میں پشاور میں پہلا اجلاس شاہی باغ میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا عبدالغفور اس زمانے کے مشہور مقرر تھے۔ شعلہ بار تقریر کیا کرتے تھے۔ اس اجلاس کی افتتاحی تقریر بھی انہوں نے کی۔ اس وقت تک ہندو مسلم سبھی مجلسِ خلافت کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے کیونکہ اسی جماعت کو اس وقت کی واحد سیاسی جماعت ہونے کا شرف تھا۔ چنانچہ پشاور میں پہلی بار جو کمیٹی بنی اس کے عہدہ دار یہ تھے :-

صدر ——— آغا سید مقبول شاہ

نائب صدر ——— بابو ذکریا خان

سیکرٹری ——— سردار گوربخش سنگھ

جائنٹ سیکرٹری ——— چاچا عبدالکریم

بعد میں مجلسِ خلافت کے عہدہ داروں میں تبدیلی بھی ہوتی رہی، ایک مرتبہ خان عبدالغفار خان بھی اس کمیٹی کے صدر رہے، کچھ عرصے بعد صوبائی خلافت کمیٹی تشکیل پائی تو سید مقبول شاہ اس کے صدر تھے اور مرزا سلیم خان، حاجی جان محمد، حاجی عبدالرحیم، مولانا عبدالحکیم پوپل زئی، حاجی کریم الٰہی سید قاسم جان، مولانا خان میر بلالی، خان علی گل خان اور غازی عثمان اس کے ممبر تھے۔ کچھ عرصہ بعد سید مقبول شاہ مستعفی ہو گئے تو صدارت آغا سید لال بادشاہ بخاری نے سنبھالی اور اللہ بخش یوسفی سیکرٹری چُنے گئے۔

انہی دنوں جمعیت العلمائے ہند کے نام سے ایک جماعت بنی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالباری اور مولانا محمود الحسن پیش پیش تھے۔

تحریکِ ہجرت کا آنکھوں دیکھا حال

مشہور انقلابی رہنما اقبال شیدائی نے اپنی سرگزشت پر مبنی ایک سلسلۂ مضامین "امروز" لاہور میں ۱۹۶۹ء میں شروع کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ہندی اور افغان مسلمانوں کی ترقی اور بہبود کا ایک جامع منصوبہ شاہ افغانستان کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں گوجرانوالہ کے ایک مسلمان تاجر نے انہیں دس لاکھ روپے بھی دیئے تھے، تاہم چونکہ انفرادی حیثیت سے کابل جانا ممکن نہ تھا اس لئے وہ سندھی مہاجرین کے اس قافلے میں شامل ہو گئے جس کی قیادت حاجی جان محمد جونیجو بیرسٹر ایٹ لاء کو

رہے تھے اور مولانا احمد علی (جو مولانا عبید اللہ سندھی کے داماد تھے) امیر قافلہ تھے۔ قافلے میں مولانا تاج محمود بھی تھے اور ملک لال خان بھی۔ ۱۳ر جولائی کو قافلہ پشاور پہنچا۔ پشاور کے بارے میں شیدائی صاحب لکھتے ہیں کہ

"پشاور ان دنوں ایک اسلامی مملکت کے دارالحکومت کا منظر پیش کر رہا تھا، ہر طرف سے "کابل چلو ــــ کابل چلو ــــ" کے نعرے بلند ہوتے تھے، اہلِ بصیرت اور سنجیدہ لوگ اس صورتِ حال پر بڑے پریشان تھے لیکن وہ خود کو بے بس پا رہے تھے کیونکہ ایسے طوفانی وقت میں ہجرت کے خلاف آواز اٹھانا موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔ تمام خطیب جمعہ کے خطبوں میں لوگوں کو اس بات پر ابھارتے تھے کہ وہ ہجرت کی قدیم شان کو زندہ کریں۔ ادھر انگریز دل ہی دل میں ہنس رہے تھے اور جانتے تھے کہ کابل کی بے تاج حکومت ہجرت کی ان بے پناہ لہروں کی تاب کہاں لا سکے گی۔

ضلع پشاور میں گاؤں کے گاؤں ہجرت کے لئے بے تاب تھے، بے شمار پٹھان کا لشکار نے جوش میں آکر کھلیانوں کو آگ لگا دی تھی کہ ان کی ہجرت کے بعد یہ کھلیان کہیں کافروں کے ہاتھ نہ لگیں۔

اقبال شیدائی پشاور کے جن لیڈروں سے متاثر ہوئے وہ حاجی جان محمد، مولوی محمد یعقوب پیر پیائی اور خان علی گل خان تھے۔ پشاور کے لوگ ٹانگے لئے ان مہاجرین کی خدمت پر کمربستہ تھے، چنانچہ جولائی کی کڑکتی دھوپ میں مہاجرین نے جلال آباد تک کا سڑک ٹانگوں ہی میں کیا۔ مولوی ظفر احسن اس وقت جنرل نادر خان سپہ سالار افغانستان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اقبال شیدائی نے اپنا منصوبہ انہی کو پیش کرنا تھا۔

افغانستان میں اس ہجرت کے دوران جن قابلِ ذکر لوگوں سے اقبال شیدائی کی ملاقات ہوئی ان میں پشاور کے سید علی عباس بخاری، مولانا عبید اللہ سندھی، محمد حسین خان جالندھری (پرنسپل حبیبیہ کالج کابل) مولوی ظفر الحسن اور امیر المجاہدین حمپر قند مولانا محمد بشیر، عبدالرحیم شامل تھے۔

کابل کا آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہوئے شیدائی صاحب کا کہنا ہے کہ

"کابل میں مہاجرین کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سارے ہندوستانی

مسلمان کابل پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ پٹھانوں کی تعداد بلاشبہ سب سے زیادہ تھی ——
خان عبدالغفار خان بھی ایک قافلے کے ساتھ کابل پہنچ چکے تھے۔ مہاجرین کی تعداد
۲۵ ہزار سے کم کیا ہوگی لیکن اتنی تعداد کے لئے رہائش یا کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام
نہ تھا۔ انگریز نے قافلوں میں اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے جو لوگوں میں بددلی پھیلایا کرتے
تھے۔ مقامی لوگ مہاجرین کو لوٹ لیتے تھے۔ اس پر اکثر مہاجرین واپس روانہ ہو گئے۔
جو مہاجر لوگوں کے طعنوں سے ڈرتے تھے، روسی ترکستان اور ترکی کو نکل گئے۔"

بقول اقبال شیدائی ہجرت کی ذمہ داری دو رہنماؤں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبیداللہ سندھی
پر عائد ہوتی تھی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء خلافت کانفرنس میں مولانا محمد علی نے امیر امان اللہ خان کے نام سے اعلان
کیا تھا کہ افغانستان کے دروازے ہر ہندوستانی مسلمان پر کھلے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اعلان
مولانا عبیداللہ سندھی نے خود لکھا تھا۔

اقبال شیدائی لکھتے ہیں کہ "جب اتنی تعداد میں مہاجرین کابل پہنچے تو جنرل نادر خان نے امیر المجاہدین
کو خط لکھا کہ ہجرت کی تحریک بند کرائی جائے ورنہ مسلمانانِ ہند خود بھی تباہ ہوں گے اور افغانستان کے
لئے بھی مصیبت کھڑی کر دیں گے۔

بعد میں حکومت افغانستان کی جانب سے ایک ہجرت کمیٹی بھی بنی تھی جس کے سربراہ جنرل
نادر خان کے بھائی سردار محمد عزیز خان اور سیکرٹری سردار غلام صدیق خان تھے۔ کمیٹی کے بیس ارکان
تھے جن میں اقبال شیدائی کے علاوہ خان عبدالغفار خان، حکیم اسلم سنجری، شیخ عبدالحق، خان سلیم
خان، ارباب دوست محمد خان اور بنوں کے ایک سربرآوردہ شخص شامل تھے۔

۱۹۲۷ء میں ترکی کی مشہور مجاہدہ خاتون خالدہ ادیب خانم پشاور آئیں تو صاحبزادہ عبدالقیوم خان
کی دعوت پر اسلامیہ کالج میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

"..... جو چیز صوبہ سرحد کو دوسرے علاقوں سے ممیز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ مختلف خیالات
رکھنے کے باوجود یہاں کے لوگوں میں حیرت انگیز یکسانیت اور ہم آہنگی ہے .... مجھے
اندازہ ہوا ہے کہ اہلِ سرحد میں حقیقت شناسی کا مادہ موجود ہے۔"

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ملک بھر میں سیاسی بیداری کو فروغ ملا۔ جنگ کے دوران حکومت بار بار عوام کو مزید مراعات دینے کا اعلان کرتی رہی تھی، اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ عوامی تحریکوں اور قومی رہنماؤں کی جانب سے حکومت خود اختیاری دیئے جانے کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔

تحقیقاتی کمیشن جنگِ عظیم اور تیسری افغان جنگ کے دنوں میں چونکہ لوگوں میں حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات زوروں پر تھے، اس لئے سرکاری علاقوں پر قبائلی حملوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ـــــ اُدھر امن و امان کی بحالی اور دفاعی انتظامات کو مستحکم بنانے کے سلسلہ میں حکومت صوبہ سرحد کو کثیر اخراجات کا متحمل ہونا پڑا تھا، اس لئے صوبے کی مالی حالت متاثر ہوئی اور ہندو سکھوں کو اپنا مطالبہ دہرانے کا موقع ہاتھ آگیا کہ صوبہ سرحد خسارے کا صوبہ ہے اس لئے اسے پھر سے پنجاب میں ضم کر دیا جائے ـــــ اس کے برعکس ترقی پسند اور آزاد خیال طبقہ صوبہ سرحد کو ملک کے دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات دلانے کے لئے سرگرمِ عمل رہا۔ مسلم لیگ اس سلسلے میں کئی بار حکومت کی توجہ اس طرف دلا چکی تھی کہ صوبہ سرحد کو ملک کے دوسرے صوبوں میں نافذ کی جانے والی اصلاحات سے محروم نہ رکھا جائے۔ حال یہ تھا کہ ۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات بھی صوبہ سرحد میں نافذ نہ کی گئی تھیں۔ جب اہلِ سرحد اور ملک کے بیدار مغز عوام کے اس مطالبہ نے زور پکڑا کہ صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر سیاسی مراعات دی جائیں تو مرکزی حکومت نے سیکرٹری خارجہ سر ڈینیس برے (DENNYS BRAY) کی قیادت میں ایک سرحدی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جس میں تین انگریز، تین مسلمان اور دو ہندو ارکان شامل تھے۔ ۱۹۲۲ء کے اوائل میں یہ کمیشن (جو برے کمیٹی کے نام سے مشہور رہا) صوبہ سرحد آیا اور مختلف طبقوں کے نمائندوں سے الگ الگ

ملاقات کی۔ ہندو سکھوں نے بدستور صوبہ سرحد کی علیحدہ حیثیت ختم کر کے اسے پنجاب کی انتظامی وحدت میں ضم کرنے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے آئے دن کے قبائلی حملوں پر بڑی لے دے کی۔ خان خوانین اور جاگیرداروں نے صوبہ سرحد کو مزید اصلاحات دیئے جانے کی مخالفت کی اور "مخصوص حالات" کی آڑ میں یہاں "قوانین جرائم سرحد" اور "جرگہ سسٹم" بحال رکھنے کے حق میں رائے دی جبکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ نے صوبہ سرحد کو ملک کے دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات دیئے جانے کے مطالبے کو دہرایا۔

یہی وہ موقع تھا جب انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے صدر سردار گل محمد خان نے کمیٹی پر زور دیا کہ فرقہ وارانہ فسادات اور کشیدگی کو دور کرنے کا واحد حل تقسیم ہند کا فارمولا ہے۔ انہوں نے کمیٹی کو بیان دیتے ہوئے کہا ــــ "ہندو مسلم اتحاد کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتا۔ اس کی بجائے ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ رہنے دیا جائے۔ جنوب میں ۲۳ کروڑ ہندوؤں کی حکومت ہو اور شمال میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی، راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کے پاس ہو اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کے پاس ــــ" گویا پہلی بار صوبہ سرحد کے ایک زعیم نے پاکستان کا دو قومی نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء کو برے کمیٹی نے حکومت ہند کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے صوبہ سرحد کو کسی دوسرے صوبے میں ضم کئے جانے کی مخالفت کی۔ اسی طرح اضلاع سرحد اور قبائلی علاقوں کے لئے الگ الگ طریق نظم ونسق کو بھی ناممکن العمل قرار دیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کا علیحدہ وجود قائم رکھنا ناگزیر قرار دیا تاہم عدلیہ اور انتظامیہ میں کچھ تبدیلیوں اور اصلاح کے لئے سفارشات پیش کیں۔ انہوں نے ایک ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر کے تقرر کی منظوری دی اور مقامی اداروں (بلدیات) میں عوام کے منتخب نمائندوں کو اختیارات دینے کی سفارش کی۔

برے کمیٹی کے دو ہندو ارکان نے کئی امور میں البتہ اختلافی نوٹ لکھے۔

سر جارج روس کیپل اور سر ہربرٹ ایڈورڈز بھی، جو سرحدی معاملات کی گہری بصیرت اور طویل عملی تجربہ رکھتے تھے، صوبہ سرحد کو مراعات دیئے جانے کے حق میں تھے۔ یہ لوگ خائف تھے کہ خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کی وجہ سے اہل سرحد میں پہلے ہی انگریزوں کے خلاف بڑا جوش پایا جاتا ہے

اگر اصلاحات نہ دی گئیں تو بہانہ بنا کر لوگ ترکِ تعاون کی تحریک اور تیز کر دیں گے۔

صوبہ سرحد کے اعتدال پسند رہنماؤں میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان ہی وہ واحد مدبر تھے جو اصلاحات دلانے کے معاملے میں پیش پیش تھے۔ سر ڈینس برے نے اسلامیہ کالج پشاور کا معائنہ کیا اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان سے ملاقات کی تو وہ ان سے اتنا متاثر ہوا کہ حکومتِ ہند سے پُرزور سفارش کی کہ صاحبزادہ صاحب کو وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر بنایا جائے کہ سرحدی معاملات پر ان سے زیادہ سوجھ بوجھ کوئی نہیں رکھتا ـــــ چنانچہ بعد میں سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور نواب سر محمد اکبر خان آف ہوتی ملک کی مرکزی کونسل میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کرتے رہے۔

پرنس آف ویلز کی آمد

۷ مارچ ۱۹۲۲ء کا دن پشاور کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم دن تھا۔ برطانیہ کا شہزادہ ولی عہد (پرنس آف ویلز، جو بعد میں ایڈورڈ ہشتم کے لقب سے تخت نشین ہوا) پشاور کے دورے پر آ رہا تھا۔ حکومت کی خواہش تھی کہ شہزادے کا شایانِ شان استقبال ہو جب کہ مجلس خلافت نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ پرنس آف ویلز کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوں تاکہ اُسے اہلِ ہند کے جذبات کا پتہ چل سکے۔ کارکنانِ خلافت نے اپنی مرکزی تنظیم کی ہدایت پر حتی المقدور انگریز وارثِ تخت و تاج کے استقبال کو ناکام بنانے کی سعی کی۔ اور اہلِ پشاور نے متفقہ طور پر دو دن مکمل ہڑتال کر کے بائیکاٹ اور احتجاج کی حد کر دی۔

اللہ بخش یوسفی نے، جو اُن دنوں پشاور کی جمعیت رضاکارانِ خلافت کے سیکرٹری تھے اور ہڑتال کرانے کی پاداش میں قید بھی ہوئے لکھا ہے کہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے انگریز چیف کمشنر کو مشورہ دیا تھا کہ شہزادے کا استقبالیہ دربار چھاؤنی کے کسی مقام پر منعقد کیا جائے لیکن چند دوسرے سرکردہ لوگوں کے کہنے پر چیف کمشنر نے چوک یادگار پر دربار منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سارے صوبے سے خان خوانین، والیانِ ریاست اور خطاب یافتگان کو دربار میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ پروگرام کے مطابق پرنس آف ویلز نے حکومت سے تعاون کرنے والوں کو سندیں اور اعزازات بھی عطا کرنے تھے ـــــ حکومتی سطح پر استقبال کی شاندار تیاریاں کی گئی تھیں لیکن مٹھی بھر قومی رضاکاروں نے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ رضاکارانِ خلافت کو مظاہروں سے باز رکھنے کے لئے سرکردہ خان خوانین کو اُن کے پاس بھیجا گیا۔ تاہم رضاکار اندر ہی اندر تیاریوں میں لگے رہے۔ انہوں نے

ہزاروں چھوٹے چھوٹے اشتہار لکھ کر شہر میں تقسیم کر دیئے۔ ان اشتہاروں میں اہلِ پشاور سے اپیل کی گئی تھی کہ استقبال کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے ـــــ شہزادے کی آمد سے ایک دن قبل کچھ رضا کارانِ خلافت کو گرفتار بھی کر لیا گیا، تاہم یہ سختی بھی عوام کو ہڑتال کرنے سے نہ روک سکی۔ ہڑتال ہوئی اور مکمل ہوئی۔ یہاں تک کہ سکولوں کے جن طلباء کو جھنڈیاں دے کر سڑک کے دورویہ استقبال کے لئے کھڑا کیا گیا تھا۔ انہوں نے بھی شہزادہ کو آتا دیکھ کر "سٹیم"۔ "سٹیم" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

حکومت نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا اور شاہی گاڑی کی بجائے پرنس آف ویلز کو عام گاڑی میں چوک یادگار پہنچایا گیا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف نہ ہو سکے۔ جونہی پرنس آف ویلز چوک یادگار پر بنائے گئے ڈائس پر بیٹھا اور رائے بہادر کرم چند (نائب صدر، پشاور میونسپل کمیٹی) شہریوں کی جانب سے سپاسنامہ پیش کرنے اٹھا، اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے عوام نے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ اس کے بعد "گاندھی جی کی جے" ـــــ "مولانا محمد علی کی جے" اور "مولانا شوکت علی کی جے" کے نعرے لگنے لگے۔ ان قومی نعروں نے انگریزوں کا سارا مزا کِرکِرا کر دیا ـــــ ابھی کارروائی پوری ہونے بھی نہ پائی تھی کہ شہزادہ سٹیج سے اترا اور چیف کمشنر کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر (پروگرام کے برعکس) کچہری دروازے کے راستے گورنمنٹ ہاؤس جا پہنچا اور دُور دُور سے آئے ہوئے رؤسا اور سرکار پرست لوگ مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

کوئی ایک ہفتہ بعد حکومت نے تمام قابلِ ذکر خلافتی رضا کاروں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا، اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں مختلف میعاد کی قید کی سزا سنا دی گئی۔

کرنل وِیج وُڈ کی آمد

اُنہی دنوں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک لیبر ممبر کرنل وِیج وُڈ (WADGE-WOOD) اپنی اہلیہ کے ہمراہ پشاور کے دورے پر آئے۔ یہ صاحب پارلیمنٹ میں ہندوستان کی قومی تحریکوں کی حمایت کرنے والوں میں پیش پیش رہا کرتے تھے اس لئے لوگوں نے ان کا دل کھول کر استقبال کیا۔ ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کو آزادی دیئے جانے کی بھرپور حمایت کی جس سے عوام بہت متاثر ہوئے۔

وِیج وُڈ اسلامیہ کالج پشاور بھی گئے اور طلباء کو تعلیم کا بائیکاٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر طلباء کی ایک جمعیت اسلامیہ کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ دہلی میں داخلے کے لئے روانہ ہو گئی جب کہ باقی ماندہ

طلباء میں بھی بڑا جوش پھیل گیا۔

مِس ایلس کا واقع چونکہ ان دنوں لوگوں میں فرنگی سامراج سے شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے سرحدی قبائل اکثر و بیشتر انگریزی کیمپوں اور چھاؤنیوں پر چھاپے مار کر انگریز کو پریشان کیا کرتے تھے ـــــ ۱۹۲۰ء میں کوہاٹ چھاؤنی کی ایک بارونق سڑک پر کیپٹن فوکس اور مسز فوکس کو گولی ماردی گئی۔ ۲۲ر فروری ۱۹۲۳ء کی ایک طوفانی رات کو کوہاٹ چھاؤنی کی ایک رجمنٹ سے ۳۱۳ قسم کی ۶۴ بندوقیں اڑالی گئیں ـــــ کئی بار پولیس چوکیوں پر چھاپہ پڑا۔ اور حملہ آور سپاہیوں کی بندوقیں چھین کر چلتے بنے۔ پریشان ہو کر انگریزوں نے ادھر اُدھر کے آزاد قبائل سے پوچھ گچھ شروع کر دی تاہم کسی قبیلے یا خیل نے ان وارداتوں کی ذمہ داری قبول نہ کی۔ بالآخر حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ کسی ایک فرد یا کسی خاص گروہ کی کارستانی ہے۔ اس نے اپنے جاسوس ہر طرف پھیلا دیئے تاکہ اتا پتا اور سراغ مل سکے۔ مخبروں نے بوستی خیل قبیلہ کے دو نوجوانوں عجب خان اور اس کے بھائی شہزادہ خان پر شک کا اظہار کیا۔ عجب خان کا گاؤں درہ کوہاٹ میں چھاؤنی سے چند میل کے فاصلے پر آدم خیل آفریدیوں کے علاقہ میں واقع تھا۔ فوراً ایک فوجی دستہ بھیج کر گاؤں کی تلاشی لی گئی۔ عجب خان اس وقت گھر پر نہ تھا۔ اس کی غیر حاضری میں برطانوی سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کی خواتین نے احتجاج کیا تو انہوں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کی ـــــ عجب خان گاؤں آیا اور اُسے واقع کا علم ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک اس بے عزتی کا بدلہ نہ لے لے وطن واپس نہیں آئے گا۔

کئی دن تک وہ کوہاٹ چھاؤنی میں چھپ چھپا کر گھومتا پھرتا رہا۔ چھاؤنی میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کے پاس ہی میجر ایلس کا بنگلہ تھا جو اغلباً اس رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر تھا جس کے سپاہیوں نے بوستی خیل کی تلاشی لی تھی۔ کئی دن تک عجب خان اور اس کا بھائی شہزادہ بنگلے کا جائزہ لیتے رہے۔ بتایا جاتا ہے کہ میجر ایلس کے ہاں ایک خونخوار کتا تھا، عجب خان کئی راتوں تک کتے کو گوشت کھلاتا رہا تاکہ وہ اس سے مانوس ہو جائے۔

یہ سارے انتظامات کرنے کے بعد چودہ اپریل ۱۹۲۳ء کی رات کو عجب خان اور شہزادہ میجر ایلس کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ اتفاق سے میجر ایلس اس رات گھر پر نہیں تھا۔ اس کی بجائے اس کی چارپائی

پر اس کی سترہ سالہ بیٹی مولی (MOLLIE) سوئی ہوئی تھی۔ شہزادہ نے کمرے کے روشندان سے اندر جا کر دروازے کی چٹخنی کھولی تاکہ عجب خان اندر داخل ہو سکے۔ چٹخنی کھلنے کی آہٹ پر مسز ایلس نے کروٹ لی، شہزادہ خان کو شک ہوا کہ میجر ایلس بیدار ہو چکا ہے۔ اس نے بے ساختہ بھائی کی طرف دیکھا۔ عجب خان نے یہ نہ جانتے ہوئے کہ بستر پر میجر کی بجائے اس کی بیوی دراز تھی، اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا جس بات کا اشارہ تھا کہ اس کا کام تمام کر دو ـــــ شہزادہ خان نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ سونے والے کا سر تن سے جدا ہو کر رہ گیا ـــــ اپنی دانست میں میجر ایلس کو ختم کر کے وہ دوسری چارپائی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں میجر کی بیوی سوئی ہوئی ہوگی۔ انہیں یہ کب معلوم تھا کہ وہاں جواں سال دوشیزہ مس ایلس محوِ خواب ہے۔ انہوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ شور نہ کرے اور کندھے پر ڈال کر چل دیئے۔ چھاؤنی سے نکل کر وہ اس جگہ پہنچے۔ جہاں وہ اپنے گدھے کو چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے مس ایلس کو گدھے پر سوار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ دیر تک تو وہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر پہاڑوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ دوسرا سارا دن انہوں نے ایک ایسے غار میں گزارا جہاں سے مس ایلس کوہاٹ پشاور روڈ پر آنے جانے والوں کو بخوبی دیکھ رہی تھی، رات ہوئی تو انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور مس ایلس کو لے کر تیراہ کے اندرونی علاقے کو چلے گئے۔

صبح ہوئی تو اس واقع کی اطلاع ملتے ہی انگریزی حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آ گئی۔ چیف کمشنر میفی نے تینوں جانب سے تلاش کرنے والی پارٹیاں تیراہ بھیج دیں۔ اس نے خود اپنی کار میں مشن ہسپتال پشاور کی لیڈی ڈاکٹر مسز سٹار (STARR) کو (جو آفریدی پشتو روانی سے بولتی تھی اور آفریدیوں کا سا لباس پہنتی تھی) سوار کیا اور ایک ہی دن میں کوہاٹ سے ہنگو اور ہنگو سے سمانہ فورٹ پہنچا ـــــ وہاں سے اس نے لیڈی ڈاکٹر کو رسالدار میجر مغل باز خان اور ایک دستہ فوج کے ہمراہ تیراہ میں بھیج دیا تاکہ وہ مس ایلس کی تلاش کرے۔ ساتھ ہی کرم پاڑہ چنار کے اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر خان بہادر قلی خان دوسرا دستہ لے کر تیراہ میں داخل ہوئے۔ جب کہ تیسرا دستہ خان زمان خان کے تحت درہ خیبر کی طرف سے تیراہ میں پیش قدمی کرنے لگا ـــــ تیراہ کے مذہبی پیشواؤں نے بھی اس کام میں حکومت سے تعاون کیا۔ بالآخر کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ لوگ مس ایلس کو

ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

عجب خان اور شہزادہ نے لڑکی کو جو اکئی تیراہ میں اپنے دوست سلطان میر کے بُرج میں چھپا رکھا تھا۔ خان بہادر قلی خان نے آفریدی جرگے پر زور دیا کہ وہ عجب خان اور شہزادہ کی طرف داری نہ کریں ورنہ انگریزوں سے جنگ چھڑ جائیگی۔ اُس صورت میں انہیں بے حد نقصان پہنچے گا۔ ملا صاحب محمود اخونزادہ، ملا صاحب کربوغہ اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی نظر میں بھی ایک دوشیزہ کا اغوا بہادری اور غیرت سے گری ہوئی بات تھی۔ ان کے دباؤ میں آکر عجب خان نے انگریز دوشیزہ کو حکومت کے کارندوں کے حوالے کر دیا۔

مس ایلس نے چیف کمشنر صوبہ سرحد اور مسز سٹار کے سامنے اعتراف کیا کہ عجب خان اور شہزادہ نے اس کے آرام و آسائش کا پوری طرح خیال رکھا اور اس کی طرف میلی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ اصل میں عجب خان اور شہزادہ نے جوشِ انتقام میں آکر اس واردات کا ارتکاب تو کیا تھا لیکن وہ خود بھی نادم تھے کیونکہ عورت پر ہاتھ اٹھانا اسلامی روایات کے منافی تھا۔

۲۲ اپریل کو پارٹی مس ایلس کو لے کر شینا وڑی کے انگریزی قلعہ میں پہنچی جہاں چیف کمشنر میجر ایلس اور ڈپٹی کمشنر کوہاٹ اس کے انتظار میں تھے۔

۱۲ مئی کو رائل ایئر فورس کے بمبار طیارے تیراہ پر پرواز کر رہے تھے تاکہ آفریدی انگریز کی قوت کا اندازہ لگالیں۔ چیف کمشنر مینفی نے تمام آفریدی قبائل کا جرگہ طلب کیا جس میں طے پایا کہ واردات کے پانچوں ذمہ دار افراد عجب خان، شہزادہ خان، گل اکبر، سلطان میر اور حیدر شاہ کو آفریدی علاقے سے نکال دیا جائے۔ جس پر یہ پانچوں مہم جُو افغانستان کی طرف کوچ کر گئے۔ اس پر بھی انگریز کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اس نے افغانستان کی حکومت پر سیاسی دباؤ ڈالا کہ ان پانچوں افراد کو افغان علاقہ میں پناہ نہ دی جائے، بالآخر افغان حکومت نے انہیں روسی ترکستان کی طرف بھیج دیا۔

پاکستان بننے کے بعد شہزادہ خان کوہاٹ آیا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ کافی عرصہ میو ہسپتال لاہور میں داخل رہا اور وہیں انتقال کر گیا ــــ عجب خان کی یہ داستان بڑی رومانی ہے، اس پر ناول لکھے گئے۔ اور فلمیں بنائی گئیں۔ خود لیڈی ڈاکٹر مسز سٹار نے ایک انگریزی کتاب میں واقعہ کی تمام تفصیل لکھی۔ مسز سٹار کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ مشن ہسپتال میں فرائض انجام دیتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر سٹار سے

شادی کر لی۔ ڈاکٹر سٹار طبی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ مشنری کا کام بھی کرتا تھا۔ ایک بار ایک نوعمر لڑکا اس کے زیر علاج رہا۔ وہ قبائلی علاقہ کے ایک مُلّا کا بیٹا تھا۔ تاہم ڈاکٹر سٹار کی ترغیب پر نصرانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ جب وہ تندرست ہو کر گھر گیا اور باپ کو اس کے عقائد میں تبدیلی کا علم ہوا تو وہ رہ نہ سکا — پشاور آیا — رات کے وقت ڈاکٹر سٹار کے گھر پہ دستک دی۔ وہ باہر آیا تو مُلّا نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا اور خود فرار ہو گیا — لیکن ڈاکٹر سٹار بیوہ ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک مشن ہسپتال میں ڈیوٹی دیتی رہی تاہم بعد میں اس نے پنجاب رجمنٹ منزئی کے کمانڈنگ آفیسر انڈر ہل (UNDER HILL) سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔

بنوں شہر کی توسیع و ترقی

موجودہ بنوں شہر کی بنیاد ہربرٹ ایڈورڈز نے ۱۸۴۸ء میں اس وقت رکھی تھی جب وہ سکھ حکومت کے کارندے کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں متعین ہوا۔ اس نے ایک قلعہ سکھ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے نام پر تعمیر کرایا جسے دلیپ گڑھ کہا جاتا تھا۔ جوں جوں شہر ترقی کرتا گیا بازار احمد خان اور نواحی دیہات کے تاجر اُدھر کا رُخ کرنے لگے — ۱۸۶۵ء میں ایک مشن ہائی سکول اور ہسپتال قائم ہوا۔ اور ۱۸۶۷ء میں میونسپل کمیٹی تشکیل پائی۔ بعد میں اس میں ایک ٹاؤن ہال جنرل نکلسن کی یادگار کے طور بھی تعمیر ہوا۔

۱۹۲۳ء میں نئی منصوبہ بندی کے بعد شہر میں توسیع کی گئی۔ سول ہسپتال، سڑکیں اور پارک بن گئے۔ پاکستان بننے تک بنوں شہر کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہاں ۷۵ فیصد آبادی ہندوؤں کی تھی۔ وہی لوگ شہر (بلکہ سارے علاقے) کی تجارت اور مجلسی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ میونسپل کمیٹی میں بھی ان کی اکثریت تھی۔ ہر ہندو کے مکان پر مورچے بنے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے بنوں کو "صوبہ سرحد کا بنارس" کہا جاتا تھا اور مسلمانوں کی جرأت نہ تھی کہ کوئی کام ہندو کی مرضی کے بغیر کر سکے، یہاں تک کہ گائے کے گوشت تک کی فروخت وہاں ممنوع تھی۔

ڈیرہ اسماعیل خان

ڈیرہ اسمٰعیل خان صوبہ سرحد کے جنوبی علاقے کا سب سے بڑا شہر ہے تاہم اس کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بھی مدتوں ہندوؤں کا غلبہ رہا۔ میونسپل کمیٹی بنی تو مسلسل بیس برس تک رائے بہادر دیوان جگن ناتھ اس کا سیکرٹری رہا۔

شہر کے میونسپل کمشنروں میں آدھے (آٹھ) مسلمان ہونے تو آدھے غیر مسلم۔ ایک نائب صدر مسلمان ہوتا تو دوسرا ہندو ـــــ تعلیمی لحاظ سے ہندو سکھ ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ ۱۹۰۰ء میں مسلمانوں نے ہوش سنبھالا اور پہلا اسلامیہ پرائمری سکول قائم ہوا۔ مفتی عزیز الرحمٰن، خان بہادر احمد یار خان سدوزئی، مولوی نور بخش ایڈووکیٹ، نواب احمد نواز خان سدوزئی اور نواب حبیب اللہ خان سدوزئی تعلیمی کمیٹی کے ارکان تھے۔ سکول کی زمین سدوزئی خاندان نے عطیہ دی۔ مولوی غلام محمد عرف مولوی وڈا مفت دینی خدمات بجالاتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں اسے مڈل اور ۱۹۲۶ء میں ہائی سکول کا درجہ دیا گیا۔ قریشی احمد علی صاحب کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ بعد میں سکول کا انتظام سردار جہان خان رسالدار، خان بہادر مولوی احمد دین اور شہزادہ فضل داد خان سدوزئی کے ہاتھ میں رہا۔ نواب زادہ عبدالرحمٰن خان سدوزئی کی نیک دل بیوہ نے ۲۵۔ ایکڑ اراضی عطیہ دی تو کھیل کے میدان بنائے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ سکول حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس اکلوتے اسلامیہ سکول کے مقابلے میں غیر مسلموں کے کئی سکول تھے بلکہ ایک کالج بھی چل رہا تھا۔

۱۹۲۳ء میں دریائے سندھ کے کٹاؤ کی وجہ سے شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا اور دریا کے دائیں کنارے پر شہر کے رُخ پر بند باندھنا ضروری ہو گیا۔ بند پر اس وقت چودہ لاکھ روپیہ کے خرچ کا تخمینہ تھا۔ اس میں سے آدھی رقم حکومت نے دی جب کہ باقی کا سات لاکھ روپیہ کمیٹی نے قرض لے کر خرچ کیا۔ یہ بند ڈھائی میل لمبا تھا اور کافی مضبوط ـــــ تاہم بعد میں وقتاً فوقتاً اس کی مرمت کا کام جاری رہا۔

کوہاٹ کا ہندو مسلم فساد

۱۹۲۰ء کے بعد کچھ عرصہ تک ملک میں سیاسی سرگرمیاں نعروں پر رہیں۔ ہندو مسلم عیسائی سبھی کمال یک جہتی کے ساتھ آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی مسرت آگیں ہوائیں سارے ملک کو معطر کرتی رہیں۔ کانگرس، مسلم لیگ، خلافت، ہجرت، نوجوان بھارت سبھا، جمعیت العلمائے ہند سبھی کے سامنے مشترکہ منزل ملک کی آزادی اور خود مختاری کا حصول تھی لیکن یہ اتحاد پرور فضا انگریز کو کب پسند تھی ـــــ؟ وہ تو "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرنے ہی میں اپنی خیر سمجھتا تھا۔ چنانچہ درپردہ مذہبی اختلافات کو ہوا دی جانے لگی۔ پریس اور پلیٹ فارم ہندو کے ہاتھ میں تھا، مالی وسائل اور تعلیم میں وہ مسلمانوں

سے بہت آگے تھے۔ مکر و فریب کی سیاست کے وہ زیادہ ماہر اور شاطر تھے، اس لئے رفتہ رفتہ انہوں نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور بساطِ سیاست پہ اپنا رنگ جمانے لگے۔

کوہاٹ میں بھی ملک کے دوسرے حصّوں کی طرح سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ہجرت کے فوراً بعد ترکِ موالات کی تحریک کا زور تھا۔ اسی سلسلے میں ایک بار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کوہاٹ آئے تو عیدگاہ میں متواتر پانچ گھنٹے تک ولولہ انگیز تقریر کر کے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہے، بچے بچے کی زبان پر "حکومت برطانیہ برباد" کے نعرے تھے۔

مولانا احمد گل اور سیّد کمال اپنے مشن کو کامیابی سے چلا رہے تھے۔ دونوں انتہائی دلیر اور انتہائی مخلص رہنما تھے۔ ایک بار باغیانہ تقریریں کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے تو ڈھوڈہ ریسٹ ہاؤس میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں تین تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ سزا سنانے کے بعد جب انہیں پولیس کی حراست میں ڈھوڈہ سے کوہاٹ جیل لایا جا رہا تھا تو انہیں دیکھنے کے لئے پندرہ بیس ہزار لوگ جمع ہو گئے اور "حکومت برطانیہ نرباد" کے نعرے لگانے لگے۔ دوسرے دن قبائلی علاقوں میں خبر پہنچی تو سیّد پیر کمال کے ہزاروں مرید کوہاٹ پہنچ گئے اور بلوے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے صورتحال کو بھانپ کر خیر اسی میں دیکھی کہ دونوں رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے، انہیں جیل سے رہا کیا گیا تو لوگ خوشی سے ناچنے لگے —— یہ کوہاٹ کے عوام کی پہلی سیاسی فتح تھی۔

کچھ عرصہ بعد مولانا احمد گل، پیر سیّد کمال، غلام محمد پراچہ، غلام محمد کنی کو دو دو سال کے لئے زبان بندی کا حکم سُنایا گیا لیکن اب گاڑی چل نکلی تھی۔ کوہاٹ کا ہر فرد اب مولانا احمد گل بن چکا تھا۔ اس لئے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی کمی ہونے نہ پائی۔

جب یہ میعاد ختم ہوئی تو ترکِ موالات کے تحت چکلہ ختم کرنے کی مہم چلائی گئی۔ اس وقت تک میاں فضل شاہ اور حاجی سعید شاہ بنوری بھی خلافت کمیٹی میں شامل ہو چکے تھے۔ پکٹنگ شروع کی گئی۔ دو دن میں تیس چالیس افراد نے گرفتاری پیش کی، کئی ہفتے تک پکٹنگ زور و شور سے جاری رہی۔ بالآخر سرکار نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا اور چکلہ اٹھا دینے کا اعلان ہوا —— یہ اہلِ کوہاٹ کی دوسری سیاسی فتح تھی۔

ان کامیابیوں سے عوام کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان دنوں خلافت کمیٹی کوہاٹ کے صدر جنگل خیل

کے پیشرو زمان گل اور پکٹنگ کمیٹی کے سیکرٹری پیر شہنشاہ کے بھائی پیر عثمان تھے۔ علاوہ بریں پیر شہنشاہ کے والد پیر عطا خان بھی خلافت کمیٹی کے بڑے مربی تھے۔ اس خاندان نے کوہاٹ میں سیاسی بیداری پھیلانے میں اہم کردار انجام دیا ـــــ ۱۹۲۲ء میں پیر شہنشاہ کو تین سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن بعد میں رہا کر دیا گیا۔ اہل کوہاٹ اس طرح کامیابی سے سیاسی محاذ پہ خدمات انجام دے رہے تھے کہ اچانک ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس نے ہندو مسلم اتحاد کا دامن تار تار کر کے رکھ دیا۔

۱۹۲۴ء کے ماہ اگست کے آخری دن تھے۔ سناتن دھرم سبھا کوہاٹ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ باہر سے آئے ہوئے مقررین نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت دل آزار تقریریں کیں۔ اشتعال انگیز پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ جلسوں میں کئی ٹولیاں "مسلمان کی ہستی مٹالی پڑیگی" قسم کے گیت گاتی رہیں، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے جذبات سخت مجروح ہوئے۔

یکم ستمبر کو محلہ پراچگان میں حاجی عصمت اللہ کے فرزند فوت ہو گئے۔ لوگ جنازے کے لئے جمع تھے کہ منشی لال محمد کھڑے ہو گئے اور ہندوؤں کی کارستانیوں کے خلاف زبردست تقریر کی۔ جنازے سے فراغت کے بعد تمام مسلمان جلوس کی صورت میں ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کے بنگلے پر پہنچے اور ہندوؤں کی دریدہ دہنی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ـــــ اس پہ ڈپٹی کمشنر نے سناتن دھرم سبھا کے سیکرٹری جیون داس کو گرفتار کر لیا اور مسلمانوں کے جذبات سرد پڑ گئے۔

چند دن تک وہ حوالات میں رہا۔ پھر سرکردہ ہندو لیڈروں نے دوڑ دھوپ کر کے اس کی ضمانت کرالی۔ سیکرٹری کی رہائی تباہی کا پیش خیمہ بن گئی۔ ۸ ستمبر کو وہ رہا ہوا تو اُسے دیکھ کر کوہاٹ کے مسلمانوں کا خون کھول اٹھا ـــــ مسجد حاجی بہادرؒ میں فوری طور پہ ایک جلسہ منعقد ہوا ـــــ اجتماع میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ سیکرٹری کی ضمانت منسوخ کی جائے اور اس پہ مقدمہ چلایا جائے لیکن حکومت خاموش رہی۔ اس عرصہ میں ایک سازش کے تحت ہندو اپنے مکانوں پہ مورچے بناتے دیکھے گئے۔ انہوں نے گولی کارتوس اور سامان خورد و نوش خرید کر گھروں میں ڈال لیا۔ جس سے مسلمان سمجھ گئے کہ یہ تیاری کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

دوسرے دن مسجد حاجی بہادرؒ میں پھر جلسہ ہوا۔ مسلمان نوجوانوں کے جذبات سخت مشتعل تھے۔

تاہم میاں فضل شاہ نے تقریر کر کے انہیں قابو میں رکھا اور کوئی ناخوشگوار سانحہ رونما نہ ہوا۔

۹ ستمبر ۱۹۲۴ء کو علاقے بھر کے مسلمانوں کا بہت بڑا جلسہ ٹاؤن ہال کے قریب ہوا۔ سارے شہر کے مسلمان جلسہ میں شریک ہوئے۔ مسلمان تو جلسے میں تھے، ہندوؤں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ٹاؤن ہال سے شہر کو جانے والے سارے راستے کے مکانوں پر مورچے قائم کر لئے۔ مقصد یہ تھا کہ جلسے سے لوٹنے والے مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے تاکہ مسلمان دب کر رہ جائیں ــــ جلسے میں ڈپٹی کمشنر اور پولیس کپتان نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ سناتن دھرم سبھا کے سیکرٹری کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس پر مسلمان خاموش ہو گئے اور جلسہ برخاست کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

ہندو تو تیار بیٹھے ہی تھے، جونہی مسلمان جلسہ گاہ سے شہر میں داخل ہوئے، انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پہلی گولی غزن خان نامی مسلمان نوجوان کو لگی۔ پھر کیا تھا۔ تمام مورچوں سے ہندو گولیاں برسا رہے تھے اور بے خبر مسلمان زخمی ہو ہو کر گر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیارہ مسلمان شہید اور پندرہ زخمی ہو گئے۔

جب مسلمانوں کے لئے کوئی جائے مفر نہ رہی تو محلہ شنوخیل کے ایک نوجوان اکبر خان نے، جو فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ نرائن داس پنساری کی دکان توڑ ڈالی۔ وہیں سے مٹی کے تیل کا ایک کنستر نکال کر دکان پر چھڑکا اور جیب سے دیا سلائی نکال کر آگ لگا دی۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی یہی کارروائی کی اور چند ہی منٹوں میں سارے بازار سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔

ادھر پولیس کپتان نے قتل و غارت بند کراتے اور لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹانے کے لئے دکانیں لوٹنے کا اشارہ کر دیا۔ اس پر خوب لوٹ مار مچی۔ ہندو اس دوران بھی مورچوں میں ڈٹے رہے۔

دوسرے روز درّہ آدم خیل اور اردگرد کے دیہات سے قبائلی لوگ کوہاٹ پہنچنے لگے۔ انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کر لی، جو بھی ہندو گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرتا گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ بہت سے ہندو مارے گئے۔

اخبار "ہمدم" کوہاٹ لکھتا ہے کہ اس سے تھوڑا عرصہ قبل شیخ خدا بخش، سیکرٹری میونسپل کمیٹی کوہاٹ، ہندوؤں سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا مکان بہت اونچا بھی تھا اور تھا بھی ہندوؤں کے

علاقے کے درمیان ـــــ مسلمانوں نے اس اُونچے مکان سے خوب فائرنگ کی۔ خود شیخ صاحب کے سابق (ہندو) رشتہ دار بھی ہلاک ہوئے۔ اس مورچے کے ملنے سے ہندوؤں کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ مورچوں کو چھوڑ کر کونے کھدرے تلاش کرنے لگے۔ اُدھر آگ پھیلتے پھیلتے بازار سے ہندو محلہ تک پہنچ گئی۔ پشاور سے بھی فائر بریگیڈ منگوایا گیا لیکن آگ پر قابو نہ پایا جا سکا۔

جب فائر بریگیڈ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو فوج آگے بڑھی۔ اُس نے اُن سب مکانوں کو گرانا شروع کر دیا جن کی وجہ سے آگ پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ تب جا کر کہیں آگ فرو ہوئی۔ تیسرے دن محاصرے سے تنگ آ کر ہندوؤں نے صلح کی درخواست کی جسے مسلمانوں نے منظور کر لیا اور فساد رُک گیا۔

کہنے کو تو فساد فرو ہو گیا لیکن قبائلی مسلمانوں کی مداخلت کا خطرہ موجود تھا۔ اس پر انگریز نے یہی فیصلہ کیا کہ سپیشل گاڑیوں کے ذریعے تمام ہندو سکھ آبادی کو کوہاٹ سے راولپنڈی منتقل کر دیا ـــــ ہندو مسلم فساد تو پہلے بھی ملک کے کئی مقامات پر رُونما ہو چکے تھے تاہم کوہاٹ کا ہندو مسلم فساد ایک تاریخی واقعہ بن گیا۔ وہی نظارہ دیکھنے میں آیا جو ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے موقع پر دیکھا گیا۔ سولہ ہزار ہندو سکھ کوہاٹ خالی کر گئے اور ایک سال تک راولپنڈی میں مقیم رہے ـــــ گاندھی جی تو اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے "مَرن برت" شروع کر دیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور دوسرے بڑے بڑے ہندو لیڈروں نے کروڑوں روپے جمع کئے اور نارکینِ کوہاٹ کی مدد کی۔ ہندوستان بھر کے "قوم پرست" ہندو تلملا اٹھے۔ مرکزی اسمبلی تک میں فساداتِ کوہاٹ کی بازگشت سنائی دی۔ یہاں تک کہ انگریزی کتابچے شائع کئے گئے جو لنڈن اور امریکہ بھیجے گئے اور اس طرح عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی گئی۔

خلافت کمیٹی نے فساد کے دوران ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ـــــ رضاکارانِ خلافت غیر مسلموں کے مال و جان کی حفاظت میں پیش پیش رہے۔ تاہم لوگوں نے وہ لوٹ مار کی اور وہ ہاتھ رنگے کہ سونا سرِ عام پانچ روپے تولہ بکتا رہا۔ نمک، دالیں اور کھانے پینے کی چیزیں اس کثرت سے لوگوں کے ہاتھ لگیں کہ کئی ماہ تک وہ ان اشیاء کی خریداری سے بے نیاز ہو گئے فساد کے تین دنوں میں کوہاٹ کی زمامِ حکومت خلافتی لیڈر مولانا احمد گل کے ہاتھ میں تھی اور ان کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی شخص شہر میں داخل ہو سکتا تھا نہ باہر نکل سکتا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور گاندھی جی فساد کی آگ بجھانے کوہاٹ آنا چاہتے تھے۔ لیکن حکومت کی طرف سے انہیں راولپنڈی میں روک لیا گیا۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان، نواب سر محمد اکبر خان پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ خوشحال چند خورسند ایڈیٹر روزنامہ "ملاپ" کوہاٹ آئے اور اسلامیہ ہائی سکول میں منعقدہ ایک اجتماع میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ پرانی رنجشوں کو بھلا کر ہندو سکھوں کو گلے لگالیں، مسلمانوں نے فراخدلی کا ثبوت دیا اور یقین دلایا کہ وہ پھر سے ہندوؤں سے دوستی نبھانے کو تیار ہیں۔

اُدھر ہندو پریس نے کوہاٹ کے واقعہ کو اتنی ہوا دی کہ پناہ بخدا ـــــ اور تو اور انہوں نے سرکاری افسروں پر بھی نااہلی اور جانب داری کا الزام لگایا۔ جس پر حکومتِ ہند نے ایک وضاحتی بیان ۸ دسمبر کو جاری کیا اور بتایا کہ واقعہ کی تمام تر ذمہ داری ہندوؤں اور صرف ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے۔ سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا کہ

"کسی ایسی نظم کی اشاعت کو، جس میں پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی گئی ہو، مسلمان کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ بالخصوص صوبہ سرحد میں اسے شائع کرنا جہاں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو ایک معمولی اقلیت ہیں؛ جہاں کے مسلمان قول و فعل میں مذہب کے حد درجہ پابند ہیں اور پھر جہاں سے اسلام کے شیدائی قبائلیوں کا علاقہ صرف تین میل دور ہے، اگر ایسا اقدام جان بوجھ کر کیا گیا تو اسے حماقت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

اسی طرح جب ملک کی مرکزی اسمبلی میں ہندو ارکان نے اسے موضوعِ بحث بنایا تو رکن امورِ خارجہ ہند سر ڈینس برے نے جواب میں بتایا کہ

"فساد کی وجہ ہندوؤں کا اشتعال انگیز پمفلٹ ہے، ۹ ستمبر تک صرف خوف و ہراس کی فضا طاری تھی کہ ایک مسلمان نوجوان کا سینہ گولیوں سے چھلنی کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ گولی ایک ہندو وکیل نے چلائی تھی۔ ہندو اپنے مکانوں کی چھتوں پر تھے، جہاں سے انہوں نے نہ صرف مجمع پر بلکہ حفاظتی پولیس پر بھی گولیاں برسائیں ـــــ تین پولیس والوں کو گولی لگی ـــــ اس دن کسی مسلمان کے ہاتھ میں اسلحہ دکھائی نہ دیا اور تمام نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ دس مسلمان جاں بحق اور تیس زخمی ہوئے۔ چھتوں پر سے گولیاں چلانے کا سلسلہ بند

کرنے کیلئے فوج نے نو بار ٹھیں ماریں دس تاریخ کو مسلمان دیہاتیوں کا ایک گروہ البتہ شہر میں داخل ہوا جس میں ہندوؤں کو نقصان پہنچا ـــ قبائلی اس فساد میں کوئی حصّہ نہ لے سکے۔ فوج نے اُنہیں باہر ہی روکے رکھا۔"

کوہاٹ کے فساد کو بہانہ بنا کر ہندوستان کے دوسرے مقامات پر کئی بے گناہ مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا گیا۔ تاہم مسلمان زعماء نے صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ بالآخر ۱۲ر جنوری ۱۹۲۵ء کو ایک معاہدہ ہوا جس پر حکومت کی طرف سے ڈپٹی کمشنر نے اور عوام کی جانب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں نے دستخط کیے۔ معاہدہ کی شرائط یہ تھیں :-

۱۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کے فسادات کوہاٹ کے سلسلے میں تمام فوجداری مقدمات، خواہ وہ انفرادی نوعیت کے ہوں، خواہ اجتماعی کے، ختم کر دیئے جائیں گے۔

۲۔ ہندو سکھ اور مسلمان اُن عبادت گاہوں کی بحالی اور تعمیر نو میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں گے جو وقوعہ سے پہلے موجود تھے۔

۳۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کا مال اور املاک واپس کر دیں گے۔

۴۔ مسلمان، ہندو اور سکھ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر سچے دل سے دوستانہ اور پُرامن فضاء پیدا کرنے میں صدقِ دل سے حصّہ لیں گے۔

اس راضی نامہ کے بعد حکومت کی طرف سے متاثرین فساد کو دس لاکھ روپیہ کی رقم بطورِ قرض دی گئی تاکہ وہ جلے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو دوبارہ تعمیر کر سکیں۔

اس طرح کئی مہینے تک پردیس کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ہندو اور سکھ سپیشل ریل گاڑیوں کے ذریعے کوہاٹ پہنچے تو مسلمان زعماء نے، جن میں نواب آف ٹیری پیش پیش تھے، ان کا شاندار خیر مقدم کیا اور وہ امن و سکون سے پھر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان

کوہاٹ میں ہندو مسلم اتحاد کی فضاء بحال ہوئی تو ڈیرہ اسمٰعیل خان سے تشویش ناک خبریں آنے لگیں۔ ڈیرہ شہر اور چھاؤنی کی دیواروں پر اشتہار لگائے گئے جن میں ہندوؤں سے کہا گیا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں، اسی میں اُن کی خیر ہے۔ بعد میں ڈیرہ شہر کے ہندو علاقوں میں آتش زنی کی وارداتیں بھی ہوئیں۔ ابتداء میں یہی خیال تھا کہ آگ مسلمانوں نے لگائی

ہوگی تاہم چونکہ آتشزدگی کا وقوعہ ایسی جگہ ہوا تھا جہاں مسلمانوں کے پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لئے تحقیقات کے بعد سرکاری رپورٹ (صوبہ سرحد، مطبوعہ ۱۹۲۶ء) میں حکومت نے بتایا کہ "آگ لگانے اور پوسٹر چسپاں کرنے کی یہ کارستانی خود ہندوؤں کی طرف سے ہوئی تھی اور اس کا مقصد محض مسلمانوں کو پھانسنا اور حکومت کی نظروں سے گرانا تھا۔" اس پر اگست کے بعد یہ وارداتیں رُک گئیں۔

فتنۂ ارتداد ۱۹۲۵ء تک ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی بہشت آفریں فضاء قائم تھی، خلافت کے رہنما اتحاد کو مضبوط تر بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔ خود قائداعظم محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کے نقیب سمجھے جاتے تھے لیکن اس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات نے سر اٹھایا۔ ہر فرقے اور ہر عقیدے کے لوگ علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنانے میں لگ گئے۔ جس سے اتحاد کا دامن تار تار ہوگیا۔ اغلب خیال یہ ہے کہ یہ سب کچھ فرنگی حکومت کا کیا دھرا تھا، وجہ یہ ہے کہ انگریز ہندو مسلم اتحاد کو اپنے وجود اور اپنی حکومت کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے تاہم اس میں ہندوؤں کی تنگ نظری کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ کانگرسی رہنما ابتداء میں مجلسِ خلافت سے اشتراکِ عمل کرتے رہے کیونکہ اُن دنوں یہی مجلس ملک کی سب سے طاقتور اور بااثر جماعت تھی لیکن بعد میں کانگرس نے تقویت حاصل کی تو ہندو لیڈر رام راج کے خواب دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں غالب اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ہر معاملے میں ہندو نقطۂ نظر ہی کو اولیت دی جائے ـــــ وہی شردھانند سوامی جو ۲۲-۱۹۲۱ء میں دہلی کی جامع مسجد میں عقیدۂ توحید کی حمایت میں گھنٹوں دلائل دیتا تھا اب مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلنے لگا۔ بلکہ اس کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ اسلام اور بانیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بہتان باندھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے قاضی عبدالرشید کی رگِ حمیت پھڑکی اور اس نے شردھانند کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

وہی پرمانند اور لالہ لاجپت رائے، جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے، اب ہندو مہاسبھا کے نام سے اپنی الگ جماعت بنا بیٹھے۔ کبھی ملکانہ کے مسلمان راجپوتوں کو پھر سے ہندو بنانے کے منصوبے بنائے گئے کبھی شیواجی کو قومی ہیرو بنانے کا عزم کیا گیا اگر ایسے میں سید پیر جماعت علی شاہؒ، سید مہر علی شاہؒ گولڑہ والے، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ اور دوسرے مسلمان زعماء

میدان میں نہ نکلتے تو یقیناً یہ لوگ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جاتے ـــــ ان متعصب ہندو لیڈروں کے بہکانے پر اُن تمام صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی واضح اکثریت تھی۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔

انہی دنوں لاہور کے ایک عاقبت نااندیش پبلشر راجپال نے "رنگیلا رسول" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی جس میں بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر رکیک حملے کئے گئے تھے۔ مسلمانوں نے پہلے تو اس گستاخ اور دریدہ دہن کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی لیکن جب عدالت نے اسے معمولی سزا کے بعد رہا کر دیا تو ایک شیدائی اسلام غازی علم دین نے موقع پاکر اس شاتمِ رسول کو ڈھیر کر دیا اور خود پھانسی کی سزا قبول کی۔

اسی طرح کراچی کے ایک مہاشہ نے ایسی ہی گستاخانہ کتاب شائع کی، اس پر مقدمہ چلا تو ماتحت عدالت نے اُسے رہا کر دیا۔ مجبوراً مسلمانوں نے بڑی عدالت میں اپیل کی، ایک دن جب وہ مہاشہ جج کے سامنے بیان دینے آیا تو صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ کا غازی عبدالقیوم آگے بڑھا اور چھرے کا وار کر کے اسے ختم کر دیا۔ انگریز جج نے وجہ پوچھی تو غازی عبدالقیوم نے عدالت میں لگی ہوئی جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جب آپ اپنے دُنیوی بادشاہ کی ہتک اور توہین برداشت نہیں کر سکتے تو ایک مسلمان اپنے شہنشاہ دوسرا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کہاں برداشت کر سکتا ہے ـــــ غازی عبدالقیوم کو موت کی سزا دی گئی جو اس نے مسکراتے ہوئے قبول کی ـــــ تاہم ان واقعات کے بعد کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ان فرقہ وارانہ فسادات کے زیرِ اثر مسلمانوں نے ہندو سکھوں سے سَودا لینا چھوڑ دیا اور خود اپنی دکانیں کھول لیں ـــــ اتمان زئی میں خان عبدالغفار خان نے بھی ایک ایسی ہی دکان کھولی اور مسلمانوں کو تجارت کی رغبت دلائی۔

انگریز سے نفرت کا جذبہ بدستور اہلِ سرحد کے دلوں میں موجزن رہا۔ فروری ۱۹۲۶ء میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع مردان مسٹر اکنز (EKKINS) کو سرحدِ سوات کے پاس ایک قبائلی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسی طرح ۱۲ اپریل کو فرنٹیئر کانسٹیبلری کے کمانڈنٹ ہینڈی سائڈ دو مفروروں کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مارے گئے۔

خیبر ریلوے انہی دنوں خیبر ریلوے کا باقاعدہ افتتاح وائسرائے ہند کے ایک نمائندے نے کیا۔ یہ ریلوے لائن پشاور سے لنڈی خانہ تک جاتی ہے اور انجینئرنگ کا ایک نادر شاہکار ہے۔ ۲۷ میل کے سفر میں ۳۴ سرنگیں ہیں جن کی مجموعی لمبائی تین میل بنتی ہے۔ جمرود کا سٹیشن سطح سمندر سے پندرہ سو فٹ اونچا ہے جب کہ لنڈی کوتل کی بلندی ساڑھے تین ہزار فٹ ہے۔ ریلوے لائن بل کھاتی ہوئی پیچ دار گھاٹیوں میں سے گزرتی ہے، اس منصوبے پر تیزی سے عمل درآمد ہوا اور ریلوے لائن کی حفاظت کے لئے خاصہ دار مقرر کئے گئے۔

ریاست سوات ۳ مئی ۱۹۲۶ء کو کرنل کین چیف کمشنر صوبہ سرحد نے سیدو شریف میں ایک شاہی دربار منعقد کیا جس میں ہزاروں یوسف زئی معززین، سرکاری افسروں اور عمائدین سرحد نے شرکت کی۔ چیف کمشنر نے اپنی تقریر میں میاں گل شہزادہ، عبدالودود خانؒ کو والئی ریاست سوات تسلیم کرتے ہوئے انہیں شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔

والئی سوات میاں گل عبدالودود حضرت اخون صاحب سوات رحمۃ اللہ علیہ کے نامور پوتے تھے جنہوں نے علاقے سے بدامنی، لوٹ مار اور پرہ جذب ختم کر کے ایک مضبوط اور مثالی ریاست کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے عوام کے فلاح و بہبود اور ان کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی، انہوں نے نواب یا حکمران کہلانے کی بجائے "والئی سوات" کا لقب اپنے لئے پسند کیا۔ بعد میں ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو وائسرائے لارڈ ارون خود سیدو شریف آیا اور والی صاحب کو "سر" اور "کے۔ بی۔ ای" کے خطابات دیئے۔ میاں گل عبدالودود (فرشتۂ امن) طویل عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اپنے صاحبزادے میاں گل جہاں زیب خان کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ عہدِ جہاں زیبی میں سوات نے ہر شعبۂ زندگی میں بے پناہ ترقی کی اور سوات ایک مثالی ریاست بن گئی۔ تاہم جولائی ۱۹۶۹ء میں حکومت پاکستان نے سرحدی ریاستیں ختم کر دیں اور سوات کو ایک ضلع بنا دیا گیا۔

صوبۂ سرحد کے لئے اصلاحات کا مطالبہ انگریز ۱۸۴۹ء میں سرحدی علاقوں میں وارد ہوئے لیکن ۷۵ سال حکومت کرنے کے بعد بھی یہاں اپنے آپ کو محفوظ خیال نہ کرتے تھے۔ ہر وقت انہیں قبائلی سرفروشوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ چنانچہ وہ اہلِ سرحد کو دبانے کے لئے جابرانہ قوانین کا سہارا لیتے تھے اور صوبہ سرحد کو

کوئی سیاسی یا آئینی مراعات دینے پر تیار نہ تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات دی جائیں ـــــ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ خود صوبہ سرحد (اور ملک بھر کے) ہندو، سکھ بھی صوبہ سرحد کو مراعات دیئے جانے کے حق میں نہ تھے۔ وہ فرضی خطرات اور واہموں کا بہانہ بنا کر اصلاحات کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ کانگرس نے بھی کبھی صوبہ سرحد کو اصلاحات دینے کے حق میں آواز نہ اٹھائی۔

بالآخر مجلس خلافت ہی نے اس کام کو ہاتھ میں لیا اور مشہور خلافتی رہنما اور مرکزی اسمبلی کے رکن سید مرتضیٰ بہادر نے ۱۶ر فروری ۱۹۲۶ء کو ذیل کی قرارداد ایوان میں پیش کی۔

"یہ اسمبلی گورنر جنرل اِن کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ قانونِ ہند کی ان دفعات کو جن کا تعلق لیجسلیٹو کونسلوں اور وزراء کے تقرر سے ہے، انہیں اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ صوبہ سرحد میں نافذ کرے۔"

تمام ہندو لیڈروں، یہاں تک کہ موتی لال نہرو اور مدن موہن مالویہ تک نے اس قرارداد کی شدید مخالفت کی۔ کبھی کوہاٹ کے فسادات کا حوالہ دیا گیا۔ کبھی قبائلی حملوں کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ تاہم راجہ غضنفر علی خان، مولوی عبدالحئی، خان بہادر غلام باری اور قائداعظم محمد علی جناح نے مخالفین کے تمام اعتراضات کا مدلّل جواب دیا اور بالآخر یہ قرارداد منظور ہو ہی گئی ـــــ بعد میں اسی قرارداد کی بنیاد پر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، لندن میں صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر حقوق مل گئے اور ۱۹۳۲ء میں اسے گورنر کا صوبہ قرار دے دیا گیا۔

۱۹۲۶ء تک صوبہ سرحد سے کئی اخبار شائع ہونے شروع ہو گئے تھے، تاہم حکومت ترقی پسندانہ خیالات کے حامل نوجوانوں پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ چنانچہ جب مشہور قومی کارکن اور کسان لیڈر ملک امیر عالم اعوان نے پشاور سے اخبار نکالنا چاہا تو اس کو اجازت نہ دی گئی۔ وہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے "ترجمانِ سرحد" کے نام سے یہ اخبار راولپنڈی سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے قومی اخباروں کی طرح اس اخبار نے بھی صوبہ سرحد میں سیاسی بیداری پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا۔ آج تک یہ اخبار باقاعدگی سے پشاور سے شائع ہو رہا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کا ورودِ پشاور ۱۹۲۷ء میں شہر پشاور کو بہت سے عظیم رہنماؤں کے قدم

چومنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی سال مولانا محمد علی جوہر اور اُن کی بیگم صاحبہ نے پشاور اور کوہاٹ کا دورہ کیا اور اسی سال کے آخر میں جمعیت العلمائے ہند کے عظیم الشان اجلاس منعقدہ پشاور میں ملک کے نامور قائدین نے شرکت کی۔

مسلمانانِ صوبہ سرحد اور بالخصوص اراکینِ جمعیت خلافت کی مدت سے آرزو تھی کہ مولانا محمد علی جوہر اس صوبے کا دورہ کریں لیکن حکومت ایسا کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھی۔ ایک مرتبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے لئے انہیں مدعو کیا گیا تو حکومت نے راولپنڈی ہی میں انہیں روک لیا۔ اِس بار نواب دوست محمد خان (تہکال بالا) اور خان بہادر سعد اللہ خان عمر زئی (اسسٹنٹ کمشنر پشاور) کی ضمانت پر حکومت سرحد نے مولانا محمد علی جوہر کو پشاور آنے کی اجازت دے دی۔

چنانچہ اُن کی آمد پر وہ شاہانہ تاریخی استقبال ہوا جو اس وقت تک کسی بڑی سے بڑی ہستی کا بھی نہ ہوا ہوگا۔ روزنامہ "حق" پشاور کے ایڈیٹر اور مشہور خلافتی کارکن اللہ بخش یوسفی کا جلوس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"باشندگانِ شہر نے انتہائی خلوص و محبت سے شہر کو دُلہن کی طرح سجایا۔ شہر کے آس پاس راستے پر جہاں سے جلوس نے گزرنا تھا، ایک سو سے زیادہ آرائشی محرابیں بنائی گئیں۔ ہر بازار کے تاجر دوسرے بازار کے تاجروں سے سبقت لے جانے کے خواہاں تھے۔ ہر پیشہ کے لوگوں نے محرابوں میں اپنے پیشہ کی مہارت دکھائی اور اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا، مثلاً بعض دروازے صرف پھلوں کے بنائے گئے تھے تو بعض رنگارنگ سوتی کپڑوں سے بعض زربفت اور کمخواب سے سجائے گئے تھے تو بعض پر پھولدار کاغذ مڑھا ہوا تھا پھولوں والوں کے دروازے اپنی الگ بہار دکھا رہے تھے تو منیاری فروشوں کے دروازے کھلونوں وغیرہ سے سجے ہوئے تھے، چوک یادگار کے قریب صرافوں نے سونے چاندی کے زیورات سے ایک دروازہ بنایا تھا تو بعض دروازے تانبے اور پیتل کے ظروف، بعض قالینوں اور بعض سمور کی رنگارنگ کھالوں سے سجائے گئے تھے۔"

نواب صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اپنا وسیع مکان (واقع محلہ فضل حق صاحبزادہ) خلافت کمیٹی کی تحویل میں دے رکھا تھا۔ مولانا جوہر وہیں مقیم رہے ـــــ جلوس شہر کے ریلوے سٹیشن سے شروع

ہو کر ہشت نگری، کریم پورہ، پل پختہ، چوک یادگار، ریشم گراں، بازار مسگراں، قصہ خوانی، کابلی دروازہ بجوڑی دروازہ اور نمک منڈی سے ہوتا ہوا مولانا محمد علی کی مقررہ قیام گاہ پر ختم ہوا۔ جلوس کی سج دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ آگے گھڑ سواروں کا دستہ تھا، اس کے پیچھے اونٹوں پر عربی لباس میں ملبوس خلافتی رضا کار بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے سائیکل سوار اور آخر میں پیدل رضا کار اور عوام تھے۔ راستے میں جگہ جگہ بینڈ باجے فضاء میں خوشی کے نغمے بکھیر رہے تھے۔

اس سفر میں بیگم مولانا محمد علی جوہر بھی اپنے نامور شوہر کے ہمراہ آئی تھیں۔ انہوں نے پہلی بار پشاور میں ایک زنانہ جلسے سے خطاب کیا۔ سارے شہر کی مسلم خواتین اُن کی تقریر سننے کے لئے اُمڈ آئی تھیں۔

اپنے دورے کے دوران مولانا کوہاٹ بھی گئے۔ راستے میں درہ آدم خیل کے آفریدیوں نے نہایت شاندار طریق سے مولانا کا روایتی استقبال کیا، نواب دوست محمد خان نے مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے رُفقائے کار کے اعزاز میں شاہانہ ضیافت دی، دوسرے عمائدین سرحد نے بھی مولانا کی دل کھول کر عزت کی۔

جمیعۃ العلماء کا اجلاس

۱۹۲۷ء کے آخری دنوں میں پشاور میں ایک شاندار جمیعت العلماء کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ اجلاس بجوڑی دروازہ کے باہر شاہی مہمان (آج کل لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول) کے میدان میں ہوا۔ اجلاس سے قبل اِس کے انتظامات کے سلسلے میں ایک استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کے صدر صاحبزادہ عبدالقیوم خان تھے اور نائب صدر نواب دوست محمد خان تہکال بالا، سارا انتظام جمعیت خلافت ہی کے رضا کاروں کے ہاتھ میں تھا، اجلاس میں اتنی عظیم اور بزرگ ہستیوں نے شرکت کی کہ اجلاس ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ تین دن تک جلسے ہوتے رہے۔ صدارت علامہ سید انور شاہ صدر مدرسہ دیوبند نے کی۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی اور دوسرے بہت سے علمائے کرام اور زعمائے نظام نے اجلاس سے خطاب کیا ـــــ اجلاس میں دوسرے امور کے علاوہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی ہوا کہ سائمن کمیشن کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔

سائمن کمیشن

ہندوستان کے سیاسی مسائل حل کرنے کے لئے کوئی متفقہ منصوبہ موجود نہ تھا۔ نہرو رپورٹ کو مسلمان مسترد کر چکے تھے۔ کوئی متبادل تجویز تھی نہیں ـــ

اُدھر ہندوستانی عوام کی جانب سے آزادی اور حکومت خود اختیاری کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا اس لئے برطانوی حکومت نے سات ممبروں پہ ایک وفد حالات کا جائزہ لینے کے لئے ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا، چونکہ وفد کے قائد لارڈ سائمن تھے اس لئے یہ وفد سائمن کمیشن ہی کے نام سے مشہور ہوا۔ اہلِ ہند کے مطالبے کے باوجود کسی ہندوستانی کو وفد میں شامل نہ کیا گیا اس لئے ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی سائمن کمیشن کی مخالفت کی۔ کانگرس اور خلافت نے ہر جگہ اپنے رضا کاروں کو ہدایت کی کہ سائمن کمیشن کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا جائے۔

۱۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو یہ وفد پشاور آ رہا تھا، پشاور میں اس کے بائیکاٹ کی تیاریاں جاری تھیں کوہاٹ سے مولانا احمد گل، بنوں سے خان حبیب اللہ خان، ڈیرہ سے ملک خدا بخش اور ہزارہ سے دوسرے قائدین اپنے اپنے رضا کاروں کے ساتھ پشاور پہنچ چکے تھے۔ حکومت چاہتی تھی کہ سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ نہ ہو جب کہ خلافتی رضا کار ہر قیمت پر مظاہرہ کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ بالآخر صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور خان بہادر قلی خان (جو اُس وقت پشاور کے اسسٹنٹ کمشنر تھے) کے مشورے سے یہ طے پایا کہ رضا کار کسی محفوظ مقام پر جمع ہو جائیں اور سائمن کمیشن کے ارکان کو اپنے جذبات سے آگاہ کریں۔ اس طرح بدمزگی پیدا ہونے بھی نہ پائے گی اور مظاہرین کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ چنانچہ ریلوے لائن کے ساتھ قلعہ بالاحصار کے سامنے وہ میدان جو آج کل "جناح پارک" کہلاتا ہے، ملاقات کے لئے پسند کیا گیا ـــــ اراکینِ خلافت نے ملاقات کر کے سائمن کمیشن سے واپس جانے کا مطالبہ کیا۔

بعد میں اپنے قیامِ پشاور کے دوران وفد نے صوبہ سرحد کے مختلف طبقوں اور تنظیموں کے نمائندوں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔

اس وقت تک صوبہ سرحد میں مجلس خلافت ہی نمائندہ سیاسی جماعت تھی اور کانگریس یا کوئی اور جماعت موجود نہ تھی۔ کانگرس کی طرف سے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں میں پنڈت امیر چند بموال اور لالہ پیڑا رام کے سوا اور کوئی سامنے نہ آیا۔

پہلے میونسپل انتخابات | چونکہ اُس وقت تک مجلس خلافت ہی مسلمانوں کی نمائندگی میں

پیش پیش تھی، اس لئے ۱۹۲۹ء میں جب پہلی بار پشاور میں میونسپل انتخابات ہوئے تو جمعیت خلافت کی جانب سے سردار عبدالرب نشتر، پیر بخش خان، چچا محمد یونس اور عطاء اللہ جان خان جیسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو میونسپل کمشنری کے لئے نامزد کیا گیا جو سب کے سب انتخابات میں کامیاب ہوئے اور اہلِ شہر کی خدمت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے بعد میں بڑے بلند مرتبوں تک پہنچے۔

امان اللہ خان کی معزولی

صوبہ سرحد کے لوگوں کو غازی امان اللہ خان، شاہ افغانستان سے دلی لگاؤ تھا۔ تیسری افغان جنگ میں اُن کی کامیابی اصل میں سرحدی قبائل ہی کے تعاون کا نتیجہ تھی ـــــ تاہم شاہِ کابل کے متعلق عام طور سے مشہور تھا کہ وہ آزاد مشرب انسان ہیں، اس لئے علماء اُن کی مخالفت پر اُتر آئے۔ امان اللہ خان کی خواہش تھی کہ افغانستان کو جدید ترقیات سے روشناس کریں۔ چنانچہ وہ ملکہ ثریا کے ہمراہ ۱۹۲۷ء میں یورپ کی سیاحت پر روانہ ہوگئے۔ ان کی غیر حاضری میں مخالف عناصر کو اور بھی کھُل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ پہلے امان اللہ خان کا ارادہ پشاور کے راستے بمبئی جانے کا تھا لیکن بعد میں پروگرام میں تبدیلی آگئی اور وہ کابل سے قندہار اور قندہار سے چمن پہنچے، جہاں حکومتِ ہند کی جانب سے تین سپیشل گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ دو تین دن کراچی میں گزارنے کے بعد وہ عازمِ بمبئی ہوگئے مسلمانانِ ہند نے ہر جگہ اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ دورۂ یورپ کے دوران جدید ترقیوں سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ وطن واپس آکر انہوں نے دوسری اصلاحات کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کی جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا۔ پسماندہ علاقوں کے لوگ نئی تعلیم کے حق میں نہ تھے، چنانچہ جلال آباد کے نواح میں شنواری قبیلے نے بغاوت کر دی ـــــ باغیوں نے زور پکڑا اور وہ جلال آباد پر قابض ہوگئے۔ اُدھر کوہ دامان کے لوگ کابل پر چڑھ دوڑے۔ امیر نے ملّا صاحب شور بازار کو قید میں ڈال دیا جس سے عوام اور بھی مشتعل ہوگئے۔ بالآخر امان اللہ خان کو تخت چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑا ـــــ انہوں نے اپنی جگہ اپنے بھائی عنایت اللہ کو تخت نشین کیا۔ لیکن اس وقت تک حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ شاہ امان اللہ خان اپنے ہمراہیوں سمیت کابل کے طالوی سفارت خانہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ سفیر نے انہیں ہوائی جہاز سے پشاور بھیجدیا

لوگوں نے اب کے بھی ان کا والہانہ استقبال کیا۔ سپیشل ریل گاڑیوں میں بادشاہ کا قافلہ پشاور سے لاہور، لاہور سے کوئٹہ اور چمن پہنچا ـــــ بادشاہ نے قندہار جاکر پھر کوشش کی کہ تختِ کابل پر دوبارہ متصرف ہو جائیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

جب امان اللہ خان کی پیش نہ گئی تو ہندوستان آکر پہلے بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مقیم رہے، جہاں ملکہ ثریا کے ہاں بچہ پیدا ہوا ـــــ کچھ عرصہ بعد وہ اٹلی چلے گئے اور پھر کبھی وطن کا رُخ نہ کیا۔

ہندوستان کے مسلمان اور سرحدی قبائل افغانستان کی اس طوائف الملوکی کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتے تھے، وہ افغانستان میں ایک مستحکم حکومت دیکھنے کے متمنّی تھے۔ چنانچہ اُن کی نظریں جنرل نادر خان پر پڑیں جو ٹل کے معرکے میں بھی دادِ شجاعت دے کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ نادر خان اُن دنوں فرانس میں سفیر تھے اور سخت بیمار تھے۔ تاہم عوام کی درخواست پر وہ سردار محمد ولی خان اور سردار محمد ہاشم خان کے ساتھ بمبئی پہنچے۔ مسلمانانِ ہند نے لاکھوں روپے سے ان کی مدد کی ـــــ پھر سپیشل ریل گاڑی سے لاہور کے راستے فروری ۱۹۲۹ء میں وہ پشاور پہنچے، پشاور کے عوام نے بھی اُن کا شاندار خیر مقدم کیا۔

مولانا ظفر علی خان کی قیادت میں مجلسِ خلافت کا ایک وفد ۲۶ فروری ۱۹۲۹ء کو جنرل نادر خان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جنرل صاحب بیماری سے ابھی پوری طرح سنبھلنے نہ پائے تھے اس لئے خان عبدالغفار خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب نے ان کا طبی معائنہ کیا اور اُنہیں باتیں کم کرنے کا مشورہ دیا۔

مولانا ظفر علی خان نے جنرل نادر خان کو مسلمانانِ ہند کی جانب سے افغانستان میں بحالیٔ امن و امان کے ضمن میں پورے تعاون کا یقین دلایا اور اس مضمون کا ایک سپاسنامہ بھی اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ جواب میں جنرل نادر خان نے مسلمانِ افغانستان سے دلچسپی لینے پر مسلمانانِ ہند کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ مشرقی جانب سے جاکر امیر امان اللہ خان کے خسروانہ اقتدار کی بحالی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ چند دنوں بعد وہ کوہاٹ اور ٹل کے راستے خوست چلے گئے اور اہلِ خوست کی امداد سے کابل کی طرف بڑھے۔ اس عرصہ میں اُن کے بھائی شاہ ولی خان شنواری لوگوں کی

مدد سے کابل کو بچہ سقّہ سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے اور ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو فاتحانہ شان سے کابل میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بعد نادر خان بھی دارالحکومت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو عوام نے اُن کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ـــــ بچہ سقّہ گرفتار ہوا اور اُسے اور اُس کے گیارہ ساتھیوں کو بغاوت کے جرم میں برسرِ عام پھانسی دے دی گئی۔

نادر شاہ کی حکومت کو انگریزوں نے جلد ہی تسلیم کر لیا اور اُن کی تخت نشینی پر اظہارِ خوشنودی کرتے ہوئے سارے ملک میں تعطیلِ عام کا اعلان کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد سردار شاہ ولی خان اور سردار احمد علی جان کو انگلستان اور فرانس میں سفیر مقرر کر کے روانہ کیا گیا تو راستے میں وہ پشاور میں رُکے۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر اور بڑے بڑے افسروں نے اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، توپوں سے ان کی سلامی اتاری گئی اور کئی دن تک انہیں پشاور کے گورنر ہاؤس میں مہمان رکھا گیا۔ اس دوران پشاور کے معززین اور سیاسی اکابر نے بھی اُن سے ملاقات کر کے اپنے جذباتِ خیر سگالی سے اُنہیں آگاہ کیا۔ پشاور سے بمبئی تک ہر ریلوے سٹیشن پر مسلمانوں نے اُن کا والہانہ خیر مقدم کیا۔

اس سے قبل شنواری قبیلہ نے تورخم کی افغان چوکی پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن حکومت کابل سے سمجھوتہ طے پانے کے بعد تورخم کی چوکی کا انتظام ڈکّہ کے افغان افسروں کے حوالے کر دیا گیا۔

لاہور کانگریس ۱۹۲۹ء کے آخر میں لاہور میں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کی فضا برقرار تھی لیکن اس کے بعد مولانا محمد علی جوہر اور بہت سے دوسرے سرکردہ مسلمان زعماء نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ اجلاس اس لئے اہم تھا کہ اس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے "مکمل آزادی" یا "سوراج" کو اپنی سیاسی منزل قرار دیا اور نہرو رپورٹ سے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ مکمل آزادی کے اعلان کے پیشِ نظر قومی کارکن زیادہ تعداد میں انڈین نیشنل کانگرس کی طرف رجوع کرنے لگے اور کانگرس کو تقویت حاصل ہو گئی۔

لاہور کانگرس میں صوبہ سرحد کے قومی کارکنوں نے بھی کثیر تعداد میں حصّہ لیا۔ پشاور کے تیس چالیس رضاکاروں کا ایک دستہ آغا سیّد لالا بادشاہ بخاری کی قیادت میں شاملِ اجلاس ہوا۔ اُتمان زئی سے خان عبدالغفار خان اور اُن کے کچھ ہم نواؤں نے اجلاس میں شرکت کی۔ اسی

اجلاس میں رضا کاروں کو وردیوں میں ملبوس دیکھ کر خان عبدالغفار خان کو ایک رضا کار تنظیم قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے "خدائی خدمت گار" یا سرخپوش کے نام سے نوجوانوں کی تنظیم کی بنیاد رکھی۔

کوہاٹ سے پیر شہنشاہ، خیر محمد جلالی، غلام حیدر اختر، محمد امین، میاں غلام محمد، مولانا عبداللطیف اور مہابت خان پر مشتمل وفد نے لاہور کانگرس میں حاضری دی۔ بنوں سے شیخ حق نواز خان، حکیم عبدالرحیم اور سردار رام سنگھ پر مشتمل وفد لاہور پہنچا تو ہزارہ سے ملک فقیر اخان، مولانا غلام غوث ہزاروی۔ حکیم عبدالسلام اور ملک امیر عالم اعوان نے اپنے ضلع کی نمائندگی اجلاس میں کی۔

پنڈت نہرو کو اس موقع پر آل انڈیا نیشنل کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔

واضح رہے کہ اس سے پہلے مولانا حسرت موہانی خلافت کی سٹیج سے "مکمل آزادی" کو اہلِ ہند کو سیاسی منزلِ مقصود قرار دے چکے تھے۔

قصّہ خوانی میں خُون کا دریا

"قصہ خوانی پٹھانوں کا پیرس ہے"۔ جس نے قصہ خوانی نہیں دیکھا، اُس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ـــــ" پشاور شہر کے سب سے بڑے اور سب سے بارونق بازار کے بارے میں یورپی سیاحوں کا یہ تاثر بالکل بجا ہے

ایک زمانہ تھا جب دریائے باڑہ قصہ خوانی میں بہتا تھا اور لوگ اس کے کنارے شہتوت اور سفیدے کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر قہوہ نوشی اور چلم سے جی بہلاتے تھے۔ لیکن ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو ایک وقت وہ بھی آیا جب اس تاریخی بازار میں انسانی خون کا دریا بہہ نکلا ـــــ نہتے عوام کے پُرامن جلوس کے ہزاروں شرکاء پر گھنٹوں مشین گنوں سے گولیاں برستی رہیں سینکڑوں بے گناہ جان سے گئے ـــــ ہزاروں زخمی ہوئے ـــــ گورا فوج کی اس سفاکی اور درندگی کی صدائے بازگشت دُنیا بھر کے مہذب ملکوں میں سُنی گئی اور انگریز حکمرانوں کے چہرے بے نقاب ہو کر رہ گئے۔

۱۹۳۰ء میں انگریز کو صوبہ سرحد پر حکومت کرتے اسّی سال پورے ہو گئے تھے لیکن ان اسّی سالوں میں سرحدی عوام کے لئے گولیاں تھیں یا جیل خانے، فوج کشی تھی یا جبر و تشدّد۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی احساس ہونے لگتا تھا کہ یہ صوبہ برصغیر ہند و پاک کا حصّہ ہی نہیں۔ اس لئے کہ اسے ان سیاسی مراعات سے بھی محروم رکھا گیا تھا جو دوسرے ہندوستانی صوبوں کو حاصل تھیں۔ سرحد میں انتظامیہ کے قانون اور عدلیہ کے ضابطے الگ تھے۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات سے سرحدی لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع ملا تھا نہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے۔ یہاں مجالس قانون ساز تھیں نہ وزارت، میونسپل کمیٹی تھی تو اس کے ممبر بھی حکومت کی طرف سے نامزد کردہ تھے، ایسے ایسے جابر قانون

تھے جن کے تحت پولیس اور انتظامیہ جس شخص پر ہاتھ ڈالتی اسے بلا وجہ برسوں تک قید رکھتی ـــــ اس احساسِ محرومی نے انگریز سے نفرت کا وہ شدید رجحان پیدا کر دیا تھا کہ اہلِ سرحد اپنی جان پر کھیل کر بھی آزادی اور عزتِ نفس کا حصول ضروری سمجھتے تھے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کے درمیانی عرصے میں خلافت، ہجرت، نوجوان بھارت سبھا، اصلاح افاغنہ اور کانگرس تحریکوں کی بدولت سرحدی عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا، اخبارات کا مطالعہ قومی جذبے کے فروغ میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا تھا۔ تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ قومی ہم آہنگی اور ملی احساس کو جلا ملی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۳۰ء کے ابتداء تک اہلِ سرحد شدید سیاسی بے چینی کا شکار ہو چکے تھے۔

۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے نمک سازی کو اپنے ہاتھ میں لے کر گجرات احمد آباد سے سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا۔ ترکِ موالات اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کا فیصلہ ہوا ـــــ حکومت سے ترکِ موالات کیا گیا ـــــ تمام ملک میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ گاندھی جی تو عدمِ تشدد کا درس دیتے تھے لیکن کانگرس کا انتہا پسند عنصر تشدد پسندی سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ ۱۰-اپریل کو چٹاگانگ میں سرکاری اسلحہ خانہ لوٹا گیا۔ کلکتہ کے پولیس کمشنر سر چارلس ٹیگارٹ پر بم پھینکا گیا۔ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کرنل سمپسن کو حکومتِ بنگال کے سیکرٹریٹ میں گولی مار دی گئی۔ ہندوستان کے دوسرے مقامات پر ایسی کارروائیوں کو دہرایا گیا سرحد کے حریت پرور عوام کا بھی ان ہنگاموں اور ان واقعات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ یہاں بھی بدیشی مال کی دکانوں اور شراب خانوں پر پکٹنگ شروع ہو گئی۔ حکومت کے خلاف جلوس نکلنے لگے ـــــ یہی سرگرمیاں آگے چل کر ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کے طوفان کا پیش خیمہ بن گئی۔

مجلسِ خلافت، کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا نے ترکِ موالات کی مہم کو چلانے کے لئے پشاور میں بارہ ارکان پر مشتمل ایک "وار کونسل" بنائی جس میں آغا سید لال بادشاہ بخاری، مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپل زئی، ڈاکٹر سی بی گھوش، لالہ پیڑا خان، خان علی گل خان، غلام ربانی سیٹھی، رحیم بخش غزنوی، عبدالرحمان ریا، لالہ اچرج رام، غازی محمد عثمان، مولانا خانمیر ہلالی اور اللہ بخش برقی شامل تھے۔ چند دن تک مظاہرے ہوتے رہے جو انتہائی پُرامن تھے، حکومت کے احکام کی خلاف ورزی

کی ابتداء نمک سازی سے ہوئی۔ پھر غیر ملکی مال کی خریداری کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس کے بعد تیسرا قدم اٹھانے کا اعلان ہوا اور فیصلہ ہوا کہ ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو صبح سویرے شراب خانوں پر پکٹنگ شروع کر دی جائے۔ بات بڑی نہ تھی اگر فرنگی حکومت تدبر اور نرمی سے کام لیتی تو قطعاً سنگین حالات سے دوچار ہونا نہ پڑتا لیکن وہ تو ہر بات طاقت کے بل بوتے پر منوانے کے عادی تھے۔ اہلِ سرحد کے معاملے میں نرم روی کی پالیسی اُس نے اپنائی ہی کب تھی جواب اپنائی جاتی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز نے نہتے عوام کے مقابلے میں ٹینک، آرمرڈ کاریں اور فوجیں لا کھڑی کیں اور مظاہرین کو خاک و خون میں تڑپا دیا۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کی اس قیامتِ صغریٰ کے پُورے حقائق تک پہنچنا مشکل ہے۔ تاہم انہی روایات اور بیانات کو معتبر اور مستند مانا جا سکتا ہے جن کے راوی خود بھی اس تحریک میں عملاً شریک تھے۔

اللہ بخش یوسفی کا بیان

پشاور کے مشہور سیاسی کارکن، صحافی اور اہلِ قلم اللہ بخش یوسفی (مدیر روزنامہ سرحد) جو خود بھی ۴ مئی ۱۹۳۰ء کو گرفتار ہوئے اور جن کے اخبار سے دس ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی۔ قصہ خوانی پشاور کے حادثہ فاجعہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"پشاور شہر میں اُن دنوں کانگرس کمیٹی قائم تھی تاہم زیادہ سرگرمی نوجوان بھارت سبھا کے وہ کارکن دکھا رہے تھے جن کی رگ و پے میں انقلاب کا جذبہ موجزن تھا۔"

پشاور میں سول نافرمانی کے سلسلے میں پہلے نمک سازی کے قانون کو پامال کیا گیا۔ پھر چکلے اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا اور بعد ازاں یہ فیصلہ ہوا کہ ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو شراب خانے پر پکٹنگ کی جائے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی حکومت کی مشینری حرکت میں آگئی۔ ۲۲۔ اور ۲۳ اپریل کی درمیانی شب کو پشاور شہر کے بہت سے قومی کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ دن چڑھا تو زندہ دلانِ پشاور ٹولیوں کی صورت میں گرفتار شدہ لوگوں کو مبارک دینے اُن کے گھروں پر پہنچے۔ "انقلاب زندہ باد" اور "اللہ اکبر" کے نعروں سے گلی کوچے گونجنے لگے۔ سارے شہر میں ان گرفتاریوں پر بڑا جوش و خروش پھیل گیا۔ سب سے بڑا اجتماع چوک یادگار پر ہوا ـــــ ان لوگوں نے جہانگیر پورہ کے بازار ٹین گراں میں واقع

شراب خانے پر پکٹنگ کا فیصلہ کیا تاہم جب انہوں نے کوتوالی اور بیڑ بازاں کے راستے آگے بڑھنا چاہا تو پولیس نے اُن کا راستہ روکا۔ بعد ازاں جلوس نے اندر شہر اور ڈھکی نعل بندی سے ہوکر جہانگیر پورہ پہنچنا چاہا۔ جب یہ لوگ ڈھکی سے گزر کر قصہ خوانی میں داخل ہونے لگے تو حکومت نے فوج طلب کر لی تھی اور وہ قصہ خوانی میں بندوقیں تانے کھڑی تھی۔ حالانکہ پشاور کے اسسٹنٹ کمشنر خان بہادر سعد اللہ خان نے (جیسا کہ بعد میں انہوں نے سلیمان کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا) حکومت کو صاف کہہ دیا تھا کہ فوج بلانے کی ضرورت نہیں۔ فوج نے عوام کو دیکھتے ہی گولی چلا دی اور سینکڑوں کو شہید کر دیا۔

مولانا خان میر ہلالی کا بیان

ہفت روزہ "جمہوریت" پشاور کے مدیر اعلیٰ مولانا خانمیر ہلالی جو ۲۳ اپریل کے جلوس میں شریک تھے اور "وارکونسل" کے رکن بھی تھے اس قیامتِ صغریٰ کے متعلق اپنے اخبار کی اشاعت ۲۶ اپریل ۱۹۵۷ء میں قرطاس کرتے ہیں:

اپریل ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی (ضلع پشاور) میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی، تقریروں کے علاوہ آخری اجلاس میں ایک پشتو ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ یہی ڈرامہ ایک عظیم انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا۔ جلسہ ختم ہونے کو تھا تو ہلالی صاحب کی طرف سے سٹیج پر اعلان کیا گیا کہ ۲۳ اپریل کو پشاور شہر کی کانگرس کمیٹی شراب خانوں پر پکٹنگ کرنے اور غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کی مہم چلائے گی۔ اس پر حکومت نے ۲۲ اور ۲۳ اپریل کی درمیانی رات کو ہی قومی رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ رات کو شہر سے خان علی گل خان، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی رحیم بخش غزنوی، عبدالرحمٰن ریاء اچرج رام کپور، روشن لال اور لالہ پیڑا خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ البتہ غلام ربانی میتھی۔ اللہ بخش برقی، خان میر ہلالی اور صوبائی کانگرس کمیٹی کے صدر اور پشاور کی قابل احترام شخصیت سید لال بادشاہ بخاری کی گرفتاری رات کو عمل میں نہ آسکی۔ ان رضا کاروں نے یہی بہتر سمجھا کہ کانگرس کے دفتر میں پہنچ جائیں تاکہ ان کی گرفتاری سربازار ہو اور عوام میں جوش و خروش پھیل سکے۔ صبح نو بجے کے قریب کانگرس کے دفتر نزد گھنٹہ گھر سے ان کارکنوں کو گرفتار کیا گیا اور انہیں لے کر پولیس کابلی تھانہ کی طرف چل پڑی۔ اس وقت تک بازار کھل چکے تھے، لوگ پہلے ہی غم و غصہ کے عالم میں تھے، وہ گرفتاریوں کا سنتے ہی کانگرس کے دفتر کے نیچے جمع

ہونے لگے۔ تھوڑی دیر میں مجمع بہت بڑھ گیا اور چوک یادگار سے نعرے لگاتا ہوا کابلی تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔ جب پولیس گرفتار شدگان کو لاری میں تھانے لے جا رہی تھی تو ہجوم بے قابو ہو گیا۔ اس اثنا میں پشاور کا انگریز ڈپٹی کمشنر آرمرڈ کاروں اور فوج کو لے کر کابلی دروازے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ایک آرمرڈ کار اس اندھا دھند طریق سے آگے بڑھی کہ ایک نوجوان اس کے نیچے آکر کچلا گیا۔ اس پر ہجوم برہم ہو گیا۔ لوگوں نے طیش میں آکر ایک آرمرڈ کار پر مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دیا۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بھاگ کر تھانہ کابلی میں پناہ لینا چاہی تو ہجوم اُن پر پل پڑا ـــــ دونوں افسر زخمی ہوئے تو انہوں نے فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس وقت ایک گڑھوالی (گورکھا) پلٹن ڈیوٹی پر تھی اس کے افسر جمعدار چندر سنگھ نے تہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا ـــــ انگریز کے خلاف یہ انتہائی جرأت کا مظاہرہ تھا ـــــ بعد میں اس گڑھوالی پلٹن پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کے کئی آدمیوں کو پھانسی اور باقی کو کالے پانی کی سزا ملی ـــــ پھر انسپکٹر جنرل پولیس آلس منگر نے بارڈر پولیس اور باقاعدہ پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ بس پھر کیا تھا آتش دوزخ نے مُنہ کھول دیا۔ لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں اور سارا بازار آزادی کے پروانوں سے بھر گیا ـــــ ان میں سے کئی ایک کی رُوح پرواز کر چکی تھی جب کہ کئی نیم جان رقص بسمل کا نظارہ پیش کر رہے تھے انگریز نے وہ کچھ کیا ـــــ جو چنگیز اور ہلاکو نے بھی نہ کیا ہو گا ـــــ

ہلالی صاحب کا کہنا ہے کہ

..... "خان عبدالغفار خان اس وقت تک ابھی کانگرس میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ وہ "خدائی خدمت گاروں" کے قائد تھے ـــــ جب انہیں پشاور میں گولی چلنے کے واقع کا پتہ چلا تو دوسرے دن صبح سویرے پشاور کو چل پڑے ـــــ تھی تھانہ کے پاس پولیس اُن کے انتظار میں کھڑی تھی وہاں پہنچتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں دوسرے سرخپوش رہنماؤں میاں احمد شاہ بیرسٹر (چارسدہ) عبدالاکبر خان عمرزئی، سرفراز خان اتمان زئی، شہنواز خان اتمان زئی کو بھی اُن کے گھروں سے گرفتار کر لیا گیا ـــــ تھی میں گرفتاری کے وقت خان عبدالغفار خان نے تحریک کی باگ ڈور میاں جعفر شاہ کے سپرد کر دی تھی۔ میاں صاحب اور اُن کے مخلص ساتھیوں نے بڑی قربانیاں دیں اور تحریک کو زندہ رکھا۔

خان عبدالغفار خان کو گرفتاری کے بعد گجرات (پنجاب) کے سیاسی جیل خانہ میں رکھا گیا جب کہ عبدالاکبر خان، شہنواز خان اور سرفراز خان کو رسالپور کے فوجی کیمپ میں اور پشاور شہر کے رہنماؤں کو قلعہ بالاحصار میں رکھا گیا اور نو نو سال قید کی سزا سنائی گئی۔

ہلالی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"آج قصہ خوانی کے شہداء کے متعلق مسلم لیگ، سرخپوش اور دوسری جماعتیں اس بات کی دعویدار ہیں کہ عوام نے یہ قربانی اُن کی جماعت کے تحت دی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قصہ خوانی کی قربانی صرف اور صرف پشاور کی کانگرس کمیٹی (جو اس وقت نوجوان بھارت سبھا اور تحریکِ خلافت کے اشتراک سے کام کر رہی تھی) کی قیادت میں دی گئی کیونکہ مسلم لیگ یا خدائی خدمت گار تحریک کا ان دنوں شہر میں وجود ہی نہ تھا۔ سرحد کی صوبائی کانگرس کے صدر اس وقت آغا سید لال بادشاہ تھے اور جنرل سیکرٹری خان علی گل خان اسی طرح نوجوان بھارت سبھا کے صدر مولانا عبدالرحیم پوپلزئی تھے اور جنرل سیکرٹری خانمیر ہلالی"۔

غلام ربّانی سیٹھی کا بیان

ایک دوسرے مشہور قومی کارکن غلام ربانی سیٹھی کی زبانی قصہ خوانی کے وقوعہ کی کہانی یوں بیان کی گئی ہے کہ

....." ۲۲ اپریل کو مجھے ایک خفیہ ذریعے سے اطلاع ملی کہ پولیس ہمیں گرفتار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں نے فوراً سردار عبدالرب نشتر (مرحوم) کے بالاخانہ پر جا کر سب کو اس گرفتاری کے بارے میں خبردار کیا۔ لیکن اکثر نے بات مذاق میں ٹال دی۔ تاہم میں نے دل میں ٹھان لی کہ رات کو کسی صورت گرفتاری نہ دوں گا ـــــ بعد میں پتہ چلا کہ خبر ٹھیک تھی اور رات کو بہت سے رہنما گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کی صبح کو ایک جلوس کی صورت میں ہم گھنٹہ گھر سے نکلے۔ دو تین ہزار لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں پولیس جگہ جگہ ہمارے ساتھیوں کو وارنٹ گرفتاری دکھا کر ہتھکڑیاں پہناتی رہی۔ آغا سید لال بادشاہ، مولانا خان میر ہلالی، مولانا عبدالرحیم رحیم بخش غزنوی، لالہ پیڑا خان اور غازی عبدالرشید تو پولیس کی حراست میں چلے گئے لیکن میں اور اللہ بخش پولیس کی نظروں سے بچے رہے۔ شاید اس وقت ہمارے وارنٹ گرفتاری پولیس کے

پاس موجود نہ تھے اس لئے ہم دوبارہ جلوس کی صورت میں کانگرس کمیٹی کے دفتر (گھنڈ گھر) کو واپس آ گئے۔ تقریباً ۹ بجے صبح علاؤالدین شاہ سب انسپکٹر پولیس آئے جن کے پاس صرف اللہ بخش برقی کا وارنٹ گرفتاری تھا۔ تاہم میں نے خود آگے بڑھ کر استدعا کی کہ میں گو اسامراج سے بہت تنگ آچکا ہوں اس لئے مجھے بھی گرفتار کیا جائے۔ چنانچہ پولیس نے ہم دونوں کو گرفتار کر کے اپنی لاری میں بٹھا دیا۔ ابھی یہ لاری پل پختہ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ کسی نے اس کے ٹائر چاقوؤں سے پھاڑ دیئے جس پر لاری چوک یادگار کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ اس موقع پر شہر میں ہڑتال ہو چکی تھی۔ اور ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ مجھے اس امر کا خدشہ تھا کہ کہیں ہجوم پولیس پر حملہ نہ کر دے اس خیال کے آتے ہی میں نے علاؤالدین شاہ سب انسپکٹر سے کہا کہ آپ کابلی تھانہ نہ پہنچ جائیں۔ ہم جلوس کی صورت میں خود وہاں آجائیں گے۔ اس وقت جلوس کی قیادت اللہ بخش برقی کر رہے تھے ہم کابلی تھانے پہنچے تو بیرونی پھاٹک بند تھا۔ کچھ دیر تک تو پھاٹک نہ کھلا کہ اندر سید اللہ خان اسسٹنٹ اور دوسرے افسر صلاح مشورے کر رہے تھے۔ بعد میں سب انسپکٹر کے آنے پر ہم نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ میں نے اور برقی نے عوام کو الوداعی پیغام دیتے ہوئے تحریک کو جاری رکھنے کی ہدایت کی اور خود تھانے کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم نے تھانے کے اندر قدم ہی دھرا تھا کہ ڈپٹی کمشنر کابلی دروازے سے آرمرڈ کاروں کو لے کر آن پہنچا۔ ایک کار اس تیز رفتاری سے آئی کہ ایک نوجوان اُس کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا جب کہ کچھ دوسرے لوگ زخمی ہوئے یہ دیکھ کر لوگوں کا خون کھول اٹھا۔ ایک بہادر نوجوان نے ایک قریبی دکان سے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھا کر آرمرڈ کار پر انڈھیل دیا اور اسے آگ دکھا دی، دوسرے نے ایک انگریز موٹر سائیکل سوار فوجی افسر کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر زمین پر پچھاڑ دیا اور کلہاڑی سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ (سیٹھی صاحب لکھتے ہیں) باہر کیا ہوا۔ ہمیں پوری طرح معلوم نہیں، ہم تو تھانے کے اندر تھے۔ ہمیں ایک کمرے میں بند کر کے پولیس کی بھاری جمعیت کا پہرہ ہم پر لگا دیا گیا۔ دن بھر ہنگامہ ہوتا رہا۔ رات گیارہ بجے تک گولیوں کی آوازیں آتی رہیں، حکومت نے مارشل لاء لگا دیا۔

رات ساڑھے گیارہ بجے پولیس کپتان آیا اور ہمیں ایک پرائیویٹ کار میں بٹھا کر سنٹرل جیل پشاور

لے گیا۔ وہاں ہم اپنے حوالاتی ساتھیوں سے ملے۔

۲۴ اپریل کی صبح کو قیدیوں نے جیل میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ سب کے سب قیدی جیل کی بارکوں سے نکل آئے۔ دروازے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور جلوس کی صورت میں ہم سیاسی قیدیوں کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر جلوس نے باقاعدہ جلسے کی صورت اختیار کر لی۔ ہم نے اپنی تقریروں میں انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ قیدیوں سے کہا گیا کہ وہ شہدائے قصہ خوانی کی یاد میں روزہ رکھیں۔ اور ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ اس کے بعد قیدی اپنی اپنی بارکوں کو چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد گورا فوج کا ایک دستہ جیل میں آیا اور ہمیں ہتھکڑیاں پہنا کر سنٹرل جیل سے قلعہ بالاحصار میں منتقل کر دیا گیا۔ گورا سپاہی ہماری بیرک پر پہرہ دیتے رہے۔ تین چار روز بعد ہمارے مقدمے کی سماعت قلعہ بالاحصار میں ہوئی۔ مجھے چھ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس کے دس دن بعد پولیس کی ایک گاڑی ہمیں اکوڑہ خٹک لے گئی۔ جہاں سے ہمیں ریل گاڑی پر سوار کر کے گجرات کی سیاسی جیل میں پہنچا دیا گیا۔

بعد ازاں برٹش حکومت کی طرف سے جسٹس سلیمان کی قیادت میں اور کانگرس کمیٹی کی طرف سے پٹیل جی کی سربراہی میں اس سانحہ کی تحقیقات کے لئے کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ پٹیل کمیٹی کو صوبہ سرحد میں داخلے کی اجازت نہ ملی اور وہ راولپنڈی ہی میں رہ کر تحقیقات کرتی رہی۔ ہم ایک ماہ گجرات جیل میں رہے لیکن بعد میں ڈپٹی کمشنر پشاور نے انتقامی جذبے کے تحت مجھے اور مولانا ہلالی کو انبالہ جیل میں اور باقی سیاسی قیدیوں میں سے دو دو کو دوسری مختلف جیلوں میں تقسیم کر دیا۔ پونے گیارہ ماہ تک ہم جیلوں کی سختیاں جھیلتے رہے اس کے بعد گاندھی ارون سمجھوتے کے تحت ہم سب کو رہا رہا کر دیا گیا۔"

عبدالرحمٰن ریا کا بیان

جریدہ "مظلوم دنیا" کے مدیر اعلیٰ عبدالرحمٰن ریا نے جو خود بھی اپریل ۱۹۳۰ء کی تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ قصہ خوانی فائرنگ پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے اُن کے خیال میں ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کا سانحہ ہندو لیڈروں اور فرنگی حکومت کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ جس کا شکار بنے تو صرف سادہ لوح مسلمان۔ لیکن جب ان قربانیوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا تو غریب عوام اس وقت بھی تہی دست

ہی رہے۔ روزنامہ "ترجمان افغان" پشاور کے ۵ رمئی ۱۹۵۴ء کے اشبوع میں ریاصاحب نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے :-

"جس طرح ایک چور بازار یا گراں قیمت پہ اپنے مال کی نکاسی کے لئے کسی نہ کسی طرح مل ملا کر پرائس کنٹرول آرڈر جاری کرا لیتا ہے اسی طرح اس وقت کے انگریز حاکم مال کھانے کی خاطر یا کسی قبائلی علاقہ پہ قبضہ جمانے کی خاطر وہاں کے کسی ملا یا پیر کو اکسا کر جہاد پہ وعظ کرانا شروع کرا دیتے تھے اور اس طرح فوج کسی کا کوئی جواز پیدا کر کے اپنے ناپاک عزائم پورے کر لیتے تھے۔ میں یہ الزام کسی پہ نہیں دھرتا۔ لیکن حقیقت ہے کہ آنجہانی گاندھی جی کی سول نافرمانی نے اس واقعہ کے سلسلے میں جلتی پہ تیل کا کام کیا اور انگریز کے لئے آفریدی نیراہ کے کھجوری میدان پہ قبضہ کرنے کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ گاندھی اِروِن پیکٹ کے موقع پہ جب خان عبدالغفار خان نے گاندھی جی کو کہا کہ آفریدیوں کا چھینا ہوا کھجوری میدان انہیں واپس دلایا جائے تو گاندھی جی کے یہ الفاظ کہ پٹھانوں کو کہیں ابھی کھجوری انگریزوں کے حوالے کر دیں جب کانگرس راج ہو گا تو علاقہ آفریدیوں کو واپس دے دیا جائے گا۔ شہادت کو تقویت دینے اور انگریز ہندو سازش کا پتہ دیتے ہیں۔

ریاصاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا حقائق کو منظر عام پہ لانے سے میری مراد یہ ہے کہ

۱۔ کانگرس کا یہ دعویٰ کہ ۱۹۳۰ء کی جنگِ آزادی اس کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بالکل غلط ہے۔

۲۔ یہ کہ انگریز کے کھجوری میدان پہ قبضہ جمانے، صوبہ سرحد میں نوجوان تحریک کو کچلنے اور غازی امان اللہ کے تحت افغانستان پہ دوبارہ قبضے کو روکنے کے لئے یہ (۱۹۳۰ء کے واقعات) ایک گہری سازش تھی جو گاندھی جی اور انگریزوں کے درمیان ہوئی۔ چنانچہ بعد میں گاندھی اِروِن پیکٹ نے اس پہ مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

علاوہ بریں پہلی مرتبہ جب صوبہ سرحد میں کانگرس وزارت قائم ہوئی تو اُس نے یادگار شہیدان قصہ خوانی دوبارہ تعمیر کرانے سے صاف انکار کر دیا کہ یہاں تو فقیر اور مسکین لوگ مارے گئے اور کوئی مشہور قوم پرست (کانگرسی) نہیں مارا گیا تھا۔

یہ نوجوان بھارت سبھا کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ موجودہ یادگار شہیدانِ عالم وجود میں آئی۔ سب سے

پہلے نوجوان بھارت سبھا ہی کے ممبروں نے یادگار شہیدان پر پھول چڑھائے۔ جس کے بعد یہ رسم ایک فیشن بن کر رہ گئی جسے مفاد پرست حضرات ہر سال دہراتے ہیں اور جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آج تک ان شہداء کے پس ماندگان کو کوئی عملی امداد قطعاً نہیں دی گئی۔"

شہدائے قصہ خوانی کی تعداد

فرنگیوں نے جس بے پناہ سختی سے کام لیا اور جتنی دیر تک فوج گولیاں برساتی رہی، اُس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سینکڑوں محبانِ وطن اس سانحے میں جان بحق ہوئے ہوں گے۔ بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بہت سی لاشوں کو تو راتوں رات اٹک کے پاس دریا بُرد کر دیا گیا اور کئی ایک کو آدھی رات کو یکہ توت کے باہر قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ چونکہ گولی چلنے کے وقت تمام ذمہ دار قومی کارکن جیلوں میں تھے اور اخباروں پر مارشل لاء کے تحت پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اس لئے صحیح اعداد و شمار کا پتہ نہ چل سکا۔ ایک معروف اہلِ قلم نصراللہ خان نصر نے پوچھ گچھ کے بعد چالیس شہداء کے نام اور پتے "جمہوریت" پشاور کے ۲۶ اپریل ۱۹۵۷ء کے شمارے میں شائع کئے تھے، اگر ستائیس سال بعد بھی اتنے شہداء کے ناموں کا پتہ چل سکتا ہے تو یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچتی ہے کہ مرنے والوں کی تعداد ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ضرور ہوگی۔

سرکاری اعلامیہ

قصہ خوانی فائرنگ کے بعد فرنگی حکومت نے جو کمیونک (اعلامیہ) جاری کیا اس میں واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا، لوگوں کے سیاسی مطالبات کا ذکر تک نہیں کیا گیا اور بے چینی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ لوگ "شاردا ایکٹ" کی منظوری کی وجہ سے خلافِ حکومت مظاہروں پر اُتر آئے تھے، اسی طرح "نوجوان بھارت سبھا" کے ممبروں پر "روسی ایجنٹ" ہونے کا لیبل لگا کر اصل واقعات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ پولیس افسروں کی سختی اور تنگ دلی کا اعلامیہ میں ذکر تک نہیں کیا گیا۔ آخر یہ قومی جذبہ نہیں تو اور کیا تھا کہ خود انگریزی فوج کے ایک دستے (گڑھوالیوں) نے اپنے نہتے بھائیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔؟ اعلامیہ میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کو بھی بے حد گھٹا کر پیش کیا گیا ہے اور اُن کے نام اور پتے تک منظرِ عام پر نہیں لائے گئے ـــــ گویا سرکاری اعلامیہ سرتاپا فرنگی نقطۂ نظر سے جاری کیا گیا ـــــ اس میں بتایا گیا تھا کہ

"گذشتہ سات ماہ سے کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا کے کارکن صوبہ سرحد میں بے چینی پھیلانے کا باعث بن رہے ہیں۔ اُن کی بے چینی اور ہنگامہ آرائی کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو ملک میں سول نافرمانی کی تحریک کی موجودگی اور دوسرے مقامی مطالبات و شکایات۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی نے شاردا ایکٹ منظور کرانے میں بڑے شد و مد اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اب کانگرسی کارکن ہی اسے غلط رنگ دے کر عوام کے سامنے پیش کرنے اور حکومت اور عوام کے درمیان نفرت کا بیج بونے کا سبب بن رہے ہیں۔ دراصل شاردا ایکٹ کا مقصد ان معاشرتی خرابیوں کو دور کرنا ہے جو کم عمری کی شادیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ چونکہ صوبہ سرحد کے لوگوں میں کم عمری کی شادیوں کا رواج ہی نہیں لہٰذا یہاں سیاسی مقاصد کے لئے شاردا ایکٹ کو اچھالنے کا کوئی جواز ہی نہیں ـــــ تاہم سیاسی ایجی ٹیٹر لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلا رہے ہیں کہ شاردا ایکٹ سے اُن کے جذبات مجروح ہوں گے۔

مذہبی جذبات کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ نوجوان بھارت سبھا کے کارکن ضلع پشاور کے سادہ لوح دیہاتیوں میں اشتمالی نظریات کی اشاعت میں بھی سرگرم ہیں۔ ضلع کے عوام کو ان سیاسی ایجی ٹیٹروں کے ہتھکنڈوں سے بچانے کی غرض سے ۲۲ر اپریل ۱۹۳۰ء کو مقامی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا کے ان تخریب پسند لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے جنہوں نے ایک نام نہاد "جنگی کونسل" بنا کر سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ چنانچہ گیارہ افراد کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے جن میں نو کو تو بغیر کسی ہنگامے کے گرفتار کر لیا گیا لیکن جب باقی ماندہ دو افراد کو گرفتار کر کے پولیس تھانے کی طرف لے جا رہی تھی تو بپھرے ہوئے ہجوم نے پولیس کی جمعیت پر حملہ کر کے انہیں زبردستی پولیس سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اطلاع ملنے پر پشاور کا ڈپٹی کمشنر اپنی کار میں تین آرمرڈ کاروں کے ساتھ تھانہ کابلی کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پتہ چلا کہ دونوں سیاسی کارکنوں نے پھر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا ہے۔ اس لئے ڈپٹی کمشنر نے آرمرڈ کاروں کو تھانہ سے کافی فاصلے پر روک دیا۔ اور خود اپنی کار میں تھانہ کابلی کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اتنے میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈپٹی کمشنر کو آ کر بتایا کہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم کابلی تھانے کے باہر جمع ہے اور تشدد پر آمادہ ہے۔ پولیس تھوڑی تعداد میں

ہونے کی وجہ سے اتنے بڑے ہجوم سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں۔ اس سے قبل یہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک اینٹ لگنے سے خود بھی زخمی ہو چکا تھا۔

ڈپٹی کمشنر نے تھانے کے پاس بہت بڑے ہجوم کو دیکھا، وہ اپنی کار میں آرمرڈ کاروں کی حفاظت میں کابلی دروازے میں داخل ہوا۔ لوگوں نے آرمرڈ کاروں کو رستہ تو دے دیا لیکن اُن پر متواتر لاٹھیاں برساتے رہے، ہجوم کے ایک سرغنہ کے پاس کلہاڑی تھی، باقی کے ہاتھ میں لاٹھیاں یا اینٹ کے ٹکڑے۔ ڈپٹی کمشنر نے مُڑ کر دیکھا تو دوسری آرمرڈ کار رکی ہوئی کھڑی تھی اور ایک سرکاری قاصد اس کے پہیوں کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا تھا۔ سرکاری بیان کے مطابق یہ قاصد (RUNNER) سائیکل پر سوار گزر رہا تھا کہ ہجوم میں سے کسی نے اُسے لاٹھی مار کر گرا دیا۔ اس کے گرتے ہی ایک آرمرڈ کار اسے روندتی ہوئی گزر گئی۔ اس افراتفری میں لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تو کئی ایک آرمرڈ کاروں کے نیچے آکر کچلے گئے۔

ڈپٹی کمشنر اپنی کار سے باہر نکلا تاکہ پولیس افسروں کے ساتھ مل کر صورتِ حال کا جائزہ لے اور اُن کے صلاح مشورے سے صورتِ حال پہ قابو پانے کی کوشش کرے۔ وہ لوگوں سے منتشر ہونے کی اپیل کر ہی رہا تھا کہ چند افراد نے اُس پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی، اسی دوران ایک شخص نے آرمرڈ کار کے ایک فوجی افسر پر حملہ کر کے اُس کا پستول چھیننے کی کوشش بھی کی، لمحہ بہ لمحہ ہجوم کا دباؤ بڑھتا گیا اور اُس نے پولیس کو تھانہ کابلی کی سیڑھیوں تک پیچھے ہٹا دیا — اتنے میں ایک اینٹ ڈپٹی کمشنر کے سر پر آکر لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ پولیس کے سپاہی اُسے اُٹھا کر تھانے کی عمارت کے اندر لے گئے بلکہ پولیس کو خود بھی تھانے کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس عرصے میں ہجوم نے قصہ خوانی بازار میں کھڑی ہوئی آرمرڈ کاروں پر حملہ کر کے اُن میں ایک کو نذرِ آتش کر دیا۔ اور فوجی جوانوں کو کار سے نیچے اترنے پر مجبور کیا۔ دوسرے فوجی نے ایک کار کے نیچے پناہ لینی چاہی تو اُس پر گینتی (کُدال) سے حملہ کیا گیا۔ سپاہی نے پستول سے فائر کر کے بمشکل تمام اپنی جان بچائی۔ دوسری کار پر بھی ہجوم کلہاڑیوں، پتھروں اور کدالوں سے حملہ آور ہوا۔ اتنے میں ڈپٹی کمشنر ہوش میں آچکا تھا چنانچہ اس نے صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے پولیس اور فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فائرنگ ہوتی رہی اور ہجوم بالآخر منتشر ہو گیا۔

بعد ازاں شہر کے کئی مقامات پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فسادات ہوتے رہے اور ہجوم کو پُرامن رکھنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ سارا دن فوج کی انتہائی کوشش رہی کہ تشدد کا استعمال نہ ہونے پائے اور آخری وقت تک گولی چلانے سے بچنے کی سعی کی جاتی رہی یہاں تک کہ پہلے پہل پولیس اور فوج کے سپاہیوں کو عوام کے ساتھ دست بدست لڑائی بھی کرنی پڑی۔ تاہم انتہائی ناگزیر حالات میں حکام کو فائرنگ کی اجازت بھی دینی پڑی۔ اس کے باوجود امکانی حد تک کم سے کم فائرنگ کی گئی اور سرکاری اعلامیہ کے مطابق سارے دن میں ۱۰۹ سے زیادہ گولیاں نہیں چلائی گئیں۔

سرکاری بیان میں الزام لگایا گیا کہ کچھ غرض مند لوگ فسادات اور اس کے اسباب کو جان بوجھ کر غلط رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے حکومت ہند لوگوں کی توجہ ان امور کی طرف دلانی ضروری سمجھتی ہے۔

"فائرنگ بے وجہ اور ناجائز نہیں کی گئی"۔

"مرنے والوں کی کُل تعداد ۲۰ ہے البتہ تیس کے قریب بلوائی زخمی ہوئے جنہیں سرکاری ہسپتال میں طبی امداد بہم پہنچائی گئی"۔

"ان کے علاوہ زخمی ہونے والوں میں سے چند لوگ ایسے بھی تھے جو ہسپتال جانے پر ہرگز رضامند نہ تھے اس لئے انہیں کوئی طبی امداد نہ پہنچائی جا سکی"۔

اُس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ مرنے والوں کی تعداد سرکاری اندازے سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی"۔

سرکاری اعلامیہ کے مطابق ۲۳ اپریل کو چارسدہ میں بھی بہت سے سرکردہ سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ـــــ ان گرفتاریوں کے موقع پر بھی لوگوں نے بدامنی پھیلانے کی کوشش کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ لوگ پشاور کے حادثے پر سخت ناراض تھے اور سب کچھ کر گزرنے پر تیار تھے سرکاری اعلامیہ میں مزید لکھا ہے کہ "بہرحال کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا کے کارکن اب بھی حکومت کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کر کے نہ صرف ضلع پشاور کے شہریوں اور دیہاتیوں کو بلکہ سرحدی قبائلیوں کو بھی حکومت کے خلاف بھڑکانے کی کوششوں میں مصروف ہیں"۔

"چونکہ یہ لوگ اپنی برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں اس لئے حکومتِ ہند کی منظوری کے بعد ضابطہ فوجداری کے ایکٹ مجریہ ۱۹۰۸ء کے تحت ان دونوں جماعتوں (کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا) کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔"

آگے چل کر اعلامیہ کا کہنا ہے کہ چار مئی ۱۹۳۰ء کو پشاور شہر میں کچھ کارکنوں کی گرفتاری عمل میں لائی گئی (گرفتار ہونے والوں میں سردار عبدالرب نشتر۔ پیر بخش خان، اللہ بخش یوسفی اور دوسرے رہنما شامل تھے) اس موقع پر ضروری انتظامات کر لینے کی وجہ سے گولی چلانے کی ضرورت پیش نہ آئی اور نہ ہی کوئی دوسرا ناخوشگوار واقع پیش آیا۔

سرکاری اعلامیہ میں حکومت نے یقین دلایا تھا کہ "انقلابی سرگرمیوں کے ماند پڑتے ہی حکومت اور عوام کے تعلقات پھر بہتر ہو جائیں گے اور تلخی مٹ جائے گی۔"

اعلان کے خاتمے پر کہا گیا تھا کہ۔

"کانگرس اور نوجوان بھارت سبھا اپنے ارادوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر کھلم کھلا حکومت سے ٹکراؤ پیدا کرنے پر تر آئی ہیں اور انہوں نے اس امر کو فراموش کر دیا ہے کہ سرحدی علاقوں میں بدامنی پھیلانے سے ملک کے دوسرے حصوں پر کتنا برا اثر پڑ سکتا ہے۔ نیز یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو غلط راستے پر ڈال کر انہیں اُن کی مرضی کے خلاف استعمال کیا ہے۔"

۲۳ اپریل کو وحشیانہ فائرنگ کی خبر جب ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پہنچی تو ہر جگہ لوگ حکومت کے خلاف بھڑک اٹھے چنانچہ حکومت نے ان خبروں کو دبانے کے لئے ۳۰ اپریل سے اخباروں پر سنسر بٹھا دیا گیا۔

تاہم حکومت کی ان احتیاطی تدبیروں اور پابندیوں کے باوجود قصہ خوانی فائرنگ کا شدید ردِ عمل ہوا۔ پشاور شہر کے لوگ تو سیاست میں دلچسپی رکھتے ہی تھے۔ اب صوبہ سرحد کے دیہات بھی قومی تحریک میں نمایاں حصہ لینے لگے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ دیہاتی عوام نہایت جوش و خروش سے اور نہایت منظم طریق سے فرنگی حکومت کی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے میدانِ سیاست میں نکلے اور انہوں نے ایثار و قربانی کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کر دی۔ سرحدی دیہات میں سیاسی بیداری پھیلانے کا سہرا خان عبدالغفار خان اور ان کے رفقائے کار کے سر ہے۔

خان عبدالغفار خان

یہ اعزاز بھی خان عبدالغفار خان ہی کو حاصل ہے کہ اُن کی سیاسی زندگی تمام دوسرے زعماء سے طویل تر ہے، اُن کے سیاسی عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی عظمت، اُن کے مقام اور مرتبے اور اُن کی سیاسی خدمات کا انکار ناممکن ہے۔ ۱۹۳۰ء کی سیاسی تحریک کے بعد سے صوبہ سرحد میں جو شہرت انہیں نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے سرحدی کے حصے میں نہ آ سکی۔

عبدالغفار خان جنوری ۱۸۹۰ء میں اُتمان زئی تحصیل چارسدہ کے ایک آسودہ حال خان بہرام خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ عبدالجبار خان (جو بعد میں ڈاکٹر خان صاحب کے نام سے مشہور ہوئے اور صوبہ سرحد اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بھی رہے) عبدالغفار خان کے بڑے بھائی تھے۔ گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے بعد دونوں بھائیوں نے پشاور کے مشن ہائی سکول میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ بڑے بھائی تو اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ چلے گئے جہاں سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر برطانوی فوج میں ڈاکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن چھوٹے بھائی عبدالغفار خان نے والدہ کی خواہش کے مطابق یورپ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے گاؤں ہی میں رہنا شروع کر دیا۔ اُن کا دل پٹھانوں کی بے علمی، پردہ جنبہ اور غلط رسم و رواج پر کڑھتا تھا اس لئے وہ ابتداء ہی سے اصلاحی کاموں میں حصہ لینے لگے۔ ان دنوں حاجی صاحب ترنگ زئی ہشت نگر کے دیہات میں دینی مدرسے قائم کرنے میں لگے تھے۔ عبدالغفار خان بھی اس کام میں اُن کے ساتھ شریک رہے۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی اور انگریز نے حاجی صاحب ترنگ زئی کی گرفتاری کے احکام جاری کئے تو وہ وطن چھوڑ کر علاقہ آزاد مہمند کو چلے گئے اور وہیں رہ کر عمر بھر فرنگی حکومت کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔

حاجی صاحب کے جانے کے بعد ان مدرسوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عبدالغفار خان پر آ پڑی۔ جنگِ عظیم کے دوران انگریز نے ترکیہ کی اسلامی حکومت اور مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان سے مسلمانانِ ہند بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے خلافت کی تحریک شروع کی، یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس نے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی چنگاری روشن کی، عبدالغفار خان بھی مجلسِ خلافت کے رکن بلکہ کچھ عرصہ کے لئے خلافت کمیٹی پشاور کے صدر بھی رہے۔ بعد

میں علمائے اسلام نے ہندوستان کے "دارالحرب" ہونے کا فتویٰ دیا اور ہجرت کی تحریک شروع ہوئی تو عبدالغفار خان نے شبقدر اور علاقہ آزاد مہمند کی راہ افغانستان کو ہجرت کی لیکن تحریک کے ٹھنڈا پڑنے پر کچھ عرصہ بعد واپس وطن آگئے۔

افغانستان سے واپسی پر انہوں نے مختلف ہم خیال لوگوں کو جمع کیا اور معاشرے سے فضول رسم و رواج ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے قبل رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی تحریک میں بھی عبدالغفار خان پیش پیش رہے تھے اور انہیں تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ قید سے رہائی کے بعد انہوں نے میاں احمد شاہ بیرسٹر (مرحوم) محمد اکبر خان خادم، میاں عبداللہ شاہ اور عبدالاکبر خان کی رفاقت میں "انجمن اصلاح افاغنہ" کی بنیاد رکھی۔ یہ ۱۹۲۴ء کا سال تھا۔ اس انجمن نے دیہاتی عوام میں نئی روح پھونک دی۔ اُن میں قومی جوش اور جذبہ پیدا کیا۔ کئی سال تک دن رات کی محنت سے بہت سے عوام نے غلط رسوم کو ترک کرنے اور سادہ اسلامی زندگی گزارنے کا عہد کر لیا اسلامی مدرسوں میں بچوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ہر جگہ "پختون جرگہ" کے نام سے ایسی کمیٹیاں قائم ہوگئیں جو مسلمان عوام کو تعلیم، تجارت اور اصلاح معاشرہ کی طرف متوجہ کرتیں۔ اس سارے عرصہ میں خان عبدالغفار خان ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے رہے ان دنوں کانگرس اور خلافت مل جل کر کام کر رہی تھیں اور ہندو مسلم اتحاد کے فضا قائم تھی۔ چنانچہ پشاور کے دوسرے قومی کارکنوں کے ہمراہ خان عبدالغفار خان نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۹ء منعقدہ لاہور میں بھی شرکت کی۔ یہ وہ اجلاس تھا جس کی صدارت جواہر لال نہرو نے کی اور جس میں ہندوستان کے لئے "مکمل آزادی" کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگرس اجلاس میں خان عبدالغفار خان رضاکاروں کی تنظیم اور وردی سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ انمان زئی واپس آکر اپنے ساتھیوں کے مشورے سے انہوں نے بھی ایک نیم عسکری رضاکار تنظیم شروع کی، ان رضاکاروں کو "خدائی خدمت گار" کہا جانے لگا۔ چونکہ یہ تسواری (چاکلیٹ) رنگ کی وردی پہنتے تھے اس لئے عام لوگ انہیں "سرخپوش" کہہ کر پکارنے لگے۔

خان عبدالغفار خان، میاں احمد شاہ بیرسٹر، محمد اکبر خادم، میاں جعفر شاہ اور دوسرے رہنماؤں نے تحریک خدائی خدمت گار کے سلسلے میں ضلع پشاور اور مردان کے دیہات کے وسیع دورے کئے

وہ چونکہ دیہاتی عوام سے اُنہی کی زبان میں مخاطب ہوتے اور انہیں اصلاح معاشرہ اور فروغ تعلیم کے نیک مقاصد کے لئے منظم ہونے کا کہتے اس لئے لوگ دھڑا دھڑ اس میں شامل ہونے لگے

۱۹۳۰ء کے اوائل میں گاندھی جی اور ملک کے سرکردہ رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی (ترکِ موالات) کی تحریک چلائی تو اس کا اثر صوبہ سرحد کے عوام پر بھی ہوا۔ لوگ انگریز سے نفرت کرنے لگے۔ ۱۹ اور ۲۰ اپریل ۱۹۳۰ء کو آزاد مدرسہ اتمان زئی کا سالانہ اجلاس ہوا تو اُس میں دُور دُور سے آئے ہوئے ہزاروں دیہاتی شامل ہوئے۔ اس موقع پر "سرخپوشوں" کا فوجی کیمپ بھی لگایا گیا۔ یہ لوگ جُبہ پوش دردیوں میں پریڈ کرتے تو لوگوں پر اس کا بڑا اثر پڑتا۔ میاں سرور شاہ جرنیل (زوشہرہ) نے کیمپ کو خوب کامیاب بنایا۔ جلسے میں مشاعرہ بھی ہوا جس میں پشتو شعراء کی انقلابی نظموں نے عوام کے دلوں کو گرمایا اور فرنگی کے مظالم کو بیان کرنے کے لئے ایک قومی ڈرامہ بھی سٹیج کیا گیا۔ اجلاس ہر لحاظ سے بڑا کامیاب رہا۔

اُدھر پشاور کانگرس کمیٹی سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ چنانچہ جلسے کے اختتام پر خاص میر ہلالی (ایڈیٹر جمہوریت پشاور) نے سٹیج پر اعلان کیا کہ ۲۱۔ ۲۲ اپریل سے پشاور کانگرس کمیٹی سول نافرمانی کی مہم چلائے گی۔

اس جلسے کے چند ہی دن بعد ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو قصہ خوانی پشاور میں عوام پر وحشیانہ فائرنگ ہوئی تو حکومت نے جہاں شہری رضا کاروں کو گرفتار کیا وہیں ۲۴ اپریل کو خان عبدالغفار خان کو اتمان زئی سے پشاور آتے ہوئے نتھی کے قریب گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد انہیں چارسدہ میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور اُن سے دفعہ ۱۰۷ سرحدی کے تحت ضمانت طلب کی گئی ۔ وہ تو ترکِ موالات کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ضمانت کیسے دیتے۔ انکار کرنے پر انہیں تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ ان کے ساتھیوں کو تو رسالپور فوجی کیمپ میں قید کر دیا گیا۔ لیکن عبدالغفار خان کو گجرات (پنجاب) کی سیاسی جیل میں بھیج دیا گیا جہاں کانگرس کے دوسرے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پنڈت پنت وغیرہ پہلے سے موجود تھے

خان عبدالغفار پر ہاتھ ڈالتے ہی سرحدی عوام بالخصوص دیہاتی خدائی خدمت گار میدان میں نکل آئے۔ حکومت نے پہلی غلطی تو عبدالغفار خان کو گرفتار کرنے کی کی تھی۔ دوسری غلطی عوام پر مظالم

ڈھانے کی کی ۔ سرحدی عوام دبنے والے کہاں تھے ۔ گرفتاریوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، ہر طرف جوش پھیل گیا اور سارا صوبہ سرحد بغاوت پر آمادہ ہو گیا ۔

فائرنگ کا ردِّ عمل ۲۳ اپریل سے شہر میں مارشل لاء نافذ تھا لیکن اس کے باوجود لوگ ٹولیوں میں جمع ہو جاتے اور "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے سیاسی لیڈروں کو گرفتار کیا جاتا اور قلعہ بالاحصار پہنچا دیا جاتا ۔ چند ہی دنوں میں پشاور کے جو لوگ پکڑے گئے اُن کے نام یہ ہیں ۔

خلافت : اللہ بخش یوسفی ۔ ڈاکٹر محمد افضل گیلانی

کانگرس : ڈاکٹر چار دچند گھوش، سردار کاہن سنگھ ، ڈاکٹر جواہر سنگھ ، سردار ملاپ سنگھ ڈاکٹر جواہر سنگھ بیدی ، امیر چند رنگین ، عبدالحئی ، سید قاسم جان ، غازی محمد عثمان حاجی کرم الٰہی ۔

نوجوان بھارت سبھا : صنوبر حسین ، اچرج رام ، عبدالرحمٰن ریا ، خان میر ہلالی ۔

بغیر پارٹی والے : سردار عبدالرب نشتر ۔ ماسٹر شیر علی ، پیر بخش خان ، وزیر محمد بخش ۔ فقیر چند اور مہاشہ کرشن ۔

خان عبدالغفار خان کی گرفتاری کے بعد سرخپوش تحریک کی قیادت میاں جعفر شاہ اور میاں عبداللہ شاہ (چارسدہ) کے ہاتھ آئی ۔ انہوں نے اس سرگرمی سے کام کیا کہ تحریک میں جان پڑ گئی ۔ اور ہزاروں لوگ سُرخ کپڑے پہنے گرفتاریاں پیش کرنے نکل آئے ۔

اُدھر دوسرے مقامات پر بھی انگریز کی اشتعال انگیزیاں بڑھتی گئیں ۔ ۵ مئی کو پشاور شہر کے لوگ نیند سے بیدار ہوئے تو انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ راتوں رات گورا فوج نے شہر کو محاصرے میں لے لیا تھا ۔ ہر کوچہ و بازار میں فوج کا پہرہ تھا ۔ گلیوں تک میں گورا سپاہی گشت کر رہے تھے ، شہر کے تمام دروازوں پر پکٹیں بنا دی گئی تھیں ۔ سارا دن لوگوں کی تلاشیاں لی جاتی رہیں ، اسلحہ چھین لیا گیا اور سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا ۔

۷ مئی کو امروہہ (یو ۔ پی) میں جمعیت العلمائے ہند کا اجلاس تھا ۔ علمائے اسلام نے فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کو اس جدوجہد میں ضرور شرکت کرنی چاہیئے جو انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے

شروع کی گئی ہے ۔ اجلاس نے آل انڈیا کانگرس کے "مکمل آزادی" کے مطالبہ کی بھی تائید کی اور شاردا ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔

۸ رمئی کو مولانا ظفر علی خان (مدیر اعلیٰ زمیندار) اور ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کو بغاوت کے الزام میں سزائے قید سنائی گئی ۔

۱۰ رمئی کو آل انڈیا کانگرس کے قائم مقام صدر عباس طیب جی نے بارڈولی میں نمک بنا کر سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا ۔ ۱۲ رمئی کو انہیں گرفتار کر لیا گیا ۔ تاہم غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ اور شراب خانوں اور تجہ خانوں پر پکٹنگ کا سلسلہ جاری رہا ۔

انگریز نے جتنی سختی سے صوبہ سرحد میں قومی تحریک کو دبانا چاہا ، تحریک اتنی ہی تیزی سے دیہات میں پھیل گئی ۔ تین چار ماہ کی مدت میں خدائی خدمت گار تحریک چنداں مقبول نہ ہوئی تھی لیکن گرفتاریوں اور تشدد کے بعد خدائی خدمت گاروں کی تعداد ، ایک اندازے کے مطابق دس ہزار تک جا پہنچی ۔ سرحدی اضلاع کے علاوہ آزاد قبائل بھی تحریک کی لپیٹ میں آ گئے اس پر انگریزی حکومت کے اوسان خطا ہو گئے ۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر نارمن بولٹن کو فی الفور تبدیل کر دیا گیا اور اسے ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر دہلی پہنچنے کا حکم دے دیا گیا ۔

قصہ خوانی پشاور میں عین اس جگہ جہاں گولی چلنے کا واقع پیش آیا تھا ، ایک قومی کارکن محمد عاشق (فروٹ والے) نے ایک یادگار تعمیر کر دی تھی جس پر ہر شام کو چراغاں کیا جاتا تھا ۔ اس پر محمد عاشق کو گرفتار کر لیا گیا اور راتوں رات گورا فوج نے یادگار مسمار کر دی ۔

سرکاری رپورٹوں میں ۱۹۳۰ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ

مئی ۱۹۳۰ء میں حکومت صوبہ سرحد نے صورت حال سے نپٹنے کے لئے زبردست اقدام کئے ۔ پشاور کے بعد بنوں اور کوہاٹ میں بھی سیاسی تحریکوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور پولیس نے فوج کے اشتراک سے ایجی ٹیشن کرنے والوں اور سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ۔ پشاور شہر میں معززین پر مشتمل کمیٹیاں بنائی گئیں کہ وہ لوگوں کو مشتعل ہونے سے روکیں ۔

تحصیل چارسدہ اگرچہ اس وقت تک تحریک اصلاح افاغنہ صرف دیہات سدھار کے کام میں مصروف تھی اور اس نے قصہ خوانی کے جلوس میں کوئی عملی حصہ نہ

لیا تھا تاہم جلد بازی سے کام لے کر حکومت نے اسے بھی خلاف قانون قرار دے دیا اور کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اس سے لوگوں میں بڑا جوش پھیل گیا۔ اتمان زئی۔ چارسدہ، پڑانگ اور دوسرے دیہات میں سرخپوش اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے حامیوں کو دھڑا دھڑ گرفتار کیا جانے لگا، اس پر سارے علاقے کے نوجوان سرخ کپڑے پہن کر نکل آئے اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں پیش کرنے لگے کہ محمد اکبر خان خادم آزاد مدرسہ کے طلباء کو لے کر گاؤں گاؤں میں پہنچتے، اپنی انقلابی نظمیں سناتے اور لوگوں کا خون گرماتے۔

بازار کلاں پشاور کی قتل گاہ

۳۱ مئی ۱۹۳۰ء کو ایک سکھ گنگا سنگھ نامی ایک ٹانگہ میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ گزر رہا تھا کہ کابلی تھانہ کے سامنے ایک گورے سپاہی نے بلاوجہ اس پر فائرنگ کر دی جس سے دونوں بچے فوت ہو گئے، لوگوں میں اس واقعے سے جوش پھیلنا ضروری تھا۔ آناً فاناً پابندیوں کے باوجود لوگ جمع ہو گئے۔ بازار بند کر دیئے گئے۔ لوگ ایک جلوس کی صورت میں بچوں کی لاشوں کو اٹھائے کریم پورہ کی طرف (جہاں گنگا سنگھ کا مکان تھا) روانہ ہو گئے حکیم عبدالجلیل جلوس کی قیادت کر رہے تھے، جونہی یہ جلوس گھنٹہ گھر پہنچا، سامنے گورکھٹڑی سے گورا فوج نے آن کر راستہ روکا۔ حکیم صاحب نے آگے بڑھ کر فوجی افسر کو ساری بات سمجھانی چاہی لیکن اس بدد ماغ نے بغیر کچھ سنے عوام پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جلوس میں سے گیارہ افراد گولی لگنے سے شہید ہو گئے۔ کئی لوگ زخمی ہوئے، زخمیوں میں ایک غازی عبدالجلیل بھی تھے۔ جنہوں نے ایک گورہ افسر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ گولی لگنے سے غازی عبدالجلیل کی ایک ٹانگ کاٹنی پڑی لیکن اس کے باوجود وہ تحریک خاکسار اور تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیتا رہا اور زندگی کے آخری سانس تک قومی خدمت میں معروف رہا۔

مرنی کا قتل

مئی ۱۹۳۰ء میں ضلع مردان کے قومی کارکنوں ملک ماسم خان، سالار شمروز خان پیر شہزادہ اور پیر ماسم کو گرفتار کیا گیا تو ان کارکنوں نے جیل کی لاری میں مردان جانے سے انکار کر دیا اور پیادہ پولیس کے ہمراہ چل پڑے۔ گاؤں کے لوگ بھی بطور ہمدردی اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تخت بھائی پہنچے تو سینکڑوں لوگ ساتھ ہو لئے، جب گوجر گڑھی کے مقام پر پہنچے تو بے شمار سپاہی آ گئے اور انہوں نے ہجوم کو روکنے کی کوشش کی، ہجوم کا کہنا تھا کہ پولیس

چلی جائے تو ہم منتشر ہو جائیں گے۔ پولیس بضد تھی کہ وہ لوگوں کے منتشر ہونے کے بعد جائے گی۔ اتنے میں مردان کے انگریز اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ہے (HAY) اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر مرفی (MURPHY) موقع پر پہنچ گئے۔ مسٹر مرفی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ کافی لوگ زخمی ہوئے لیکن ہجوم میں سے کسی نے ایسا وار کیا کہ مرفی صاحب وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر نے اس پر فوج طلب کر لی لیکن فوج کے پہنچنے سے قبل ایسی سیاہ آندھی آئی کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ فوج پہنچی تو عوام غائب ہو چکے تھے۔ چنانچہ فوج اور پولیس اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

ٹکر میں فائرنگ گوجر گڑھی میں لاٹھی چارج سے زخمی ہونے والے ٹکر پہنچے تو لوگوں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، عوام نے بہت بڑا احتجاجی جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ حکومت کے منع کرنے کے باوجود ہزاروں لوگوں نے جلسے میں شمولیت کی، جلسہ شروع تھا کہ پولیس نے اس پر گولی چلا دی جس سے کئی بے گناہ شہید ہوئے۔ خدائی خدمت گاروں کے دفتر کو آگ لگا دی گئی، سرکردہ لوگوں کو گرفتار کر کے تین تین سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

لوند خوڑ کا جلسہ لوند خوڑ (مردان) کے خان غلام محمد خان، محمد زرین خان، فردوس خان اور میر نواب خان تحریک خدائی خدمت گار کے سرگرم کارکن تھے، ٹکر فائرنگ کے احتجاج میں انہوں نے لوند خوڑ میں بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ غلام محمد خان کے حجرہ کو جلا دیا گیا۔ اُن سے لائسنسدار اسلحہ واپس لے لیا گیا۔ گاؤں کے باقی لوگوں پر بھی انتہائی جبر و تشدد کیا گیا لیکن لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کثرت سے لوگ سرخپوشوں میں شامل ہوئے کہ بازار سے سرخ رنگ ملنا مشکل ہو گیا۔ کئی جگہ تو پولیس نے دکانوں پر چھاپے مار کر سرخ رنگ کے ڈبے قبضہ میں لے لئے تاکہ رنگ نہ ملنے سے لوگ سرخ کپڑے پہننا بند کر دیں۔

اُتمان زئی کے محمد اکبر خادم کو گرفتاری کے بعد اس بے دردی سے پیٹا گیا کہ اُن کا دماغ چل گیا اور کافی علاج معالجہ کے بعد صحت یاب ہوئے۔ خادم صاحب انقلابی شاعر تھے، جہاں نظم پڑھتے آگ لگا دیتے۔ اُن کے علاوہ عبدالخالق خلیق، خان میر بلالی، امیر نواز خان جلیا، عبدالمالک استاد فضل حق شیدا نے بھی اس دوران اعلیٰ پایہ کی قومی نظمیں کہیں۔ ڈرامے پیش کئے گئے۔ چارسدہ میں

ایک انقلابی ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا۔ ایک ہمدرد نوجوان حبیب نور اس سے اتنا متاثر ہوا کہ جوش میں آکر اس نے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر بارنس پر حملہ کر دیا۔ گولی پستول میں پھنس جانے سے انگریز افسر تو بچ گیا لیکن حبیب نور کو گرفتار کر کے "غازی ایکٹ" کے تحت اس پر مقدمہ چلایا گیا اور ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر فیصلہ سنا کر اُسے پشاور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

یہ ایکٹ اندھے کی لاٹھی تھا جسے چاہتے انگریز پکڑتے اور دار پر کھینچ دیتے، بعد میں برطانوی پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے احتجاجی ریزولیوشن پر اس ایکٹ کو منسوخ کر دیا گیا۔

۳ جون ۱۹۳۰ء کی رات کو فرانٹیئر کانسٹیبلری کی دو لاریاں قلعہ شبقدر کو خالی واپس جا رہی تھیں۔ کہ چند افراد نے اُن کے ڈرائیوروں پر گولیاں چلائیں، ایک ڈرائیور مارا گیا تو لاری کو آگ لگا دی گئی جبکہ دوسری لاری کا ڈرائیور بھی بُری طرح زخمی ہوا۔ چونکہ یہ واقعہ شہری آبادی میں ہوا تھا۔ اس لئے انگریز دل کو اس جسارت پر بڑا غصہ آیا۔ ۵ جون کو کگیانی محلہ کو گھیرے میں لے لیا گیا اور بہت سے افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

ضلع پشاور کے بہت سے دیہات کے لوگوں سے اسلحہ واپس لے لیا گیا کہ کہیں لوگ اُسے حکومت کے خلاف استعمال نہ کریں۔ جلسوں کے انعقاد پر پابندی لگا دی گئی تاہم لوگ برابر جلسے کر کے سرکاری قانون کی دھجیاں فضا میں بکھیرتے رہے۔

یہ امر باعث افسوس ہے کہ حکومت کے ہوا خواہ خان خوانین نے اس قومی آزمائش کے موقع پر بھی انتہائی پست کردار کا مظاہرہ کیا۔ دس جون کو چارسدہ میں ایسے خان خوانین کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے سول نافرمانی کرنے والوں کی مذمت کی گئی۔

کوہاٹ ۲۳ اپریل کی فائرنگ کا کوہاٹ میں شدید ردِ عمل ہوا۔ قومی کارکنوں نے ایک فوری اجلاس منعقد کیا جس میں انگریزوں کے اس اقدام کی شدید مذمت کی گئی۔ خیر محمد جلالی ایک دو کارکنوں کے ہمراہ پشاور گئے اور واقعہ کی خود تحقیقات کی، دو روز کی تحقیقات کے بعد کوہاٹ کانگرس کی طرف سے فائرنگ کے بارے میں ایک کتابچہ شائع کیا گیا جو بعد میں یوسفی رپورٹ اور پٹیل کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ کی بنیاد قرار پایا۔

اس کے ساتھ ہی کوہاٹ میں سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے۔ ۱۲ مئی کی رات کو بہت سے خدائی

خدمت گار گرفتار کر لئے گئے، کانگرس کمیٹی کے مذکورہ بالا کتابچے کو ضبط کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں پیر شہنشاہ، خیر محمد جلالی، غلام محمد، محمد امین، سُندر سنگھ، گوپال سنگھ اقل، گوپال سنگھ دوم، لالہ ایوب، سردار نارا سنگھ، پنڈت ترلوک ناتھ، حاجی فقیر محمد آڑھتی وغیرہ شامل تھے۔ انہیں راتوں رات قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ شہر میں ۲۴ گھنٹے تک مارشل لاء لگا دیا گیا۔ رضا کاروں کو ۲۴ گھنٹے تک بھوکا پیاسا رکھا گیا اور سخت اذیت دی گئی، دوسرے دن صبح نو بجے قلعہ کے اندر ہی احمد نواز خان سینئر سب جج نے ان کے مقدمے کی سماعت کی اور پیر شہنشاہ کو تین سال کے لئے اور باقی کارکنوں کو چھ چھ ماہ سزائے قید سُنا دی گئی۔

بعد میں کوہاٹ، ہنگو اور ٹل سے مزید بہت سے سیاسی کارکنوں کو گرفتار کر کے چھ چھ ماہ کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔

چرسی دروازے کے اندر کارکنوں نے شراب خانے پر پکٹنگ کی، پولیس نے کارکنوں پر وہ بے دریغ لاٹھیاں برسائیں کہ پہلوان عبداللطیف پراچہ کا جگر پھٹ گیا اور شیخ عبداللہ مخبوط الحواس ہو گیا۔

اس کے باوجود دوسرے دن پھر شراب خانہ پر پکٹنگ کی گئی۔ اب کے اُستاد نور احمد صوفی قادر چاچا، عبدالغفور پہلوان، حاجی خدا بخش۔ آسیہ بان، میاں حیدر شاہ، میاں عبداللطیف قاسم شاہ اور میاں طاہر شاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں سوا سوا سال قید کے ساتھ ۲۴ ۲۴ کوڑوں کی سزا سنائی گئی کارکن یہ سب کچھ انتہائی حوصلے سے برداشت کرتے رہے، مولانا عبداللطیف لنگی فروش کو ۲۴ بید لگائے گئے لیکن ٹکٹکی سے اُترتے ہی اس نے پھر "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ اس پر مزید بارہ بید لگائے گئے، اس پر بھی وہ برابر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے رہے، چنانچہ تیسری بار بارہ کوڑے لگائے گئے۔ جیل والے تھک گئے۔ لیکن مولانا لطیف ڈٹے رہے، چھ چھ ماہ قید گزار کر کارکن رہا ہوئے تو انہیں دفعہ ۱۰۷ سرحدی کے تحت تین تین سال کے لئے پابند ضمانت کر دیا گیا کہ وہ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں۔

بنوں

۱۹۲۹ء کے آخر میں بنوں کے بہت سے قومی کارکنوں نے لاہور کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی تھی، واپسی پر انہوں نے کانگرس اجلاس کو منظم کیا اور جب ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے سول نافرمانی کی مہم چلائی تو بنوں کانگرس کے صدر شیخ حق نواز خان نے سب سے

پہلے گرفتاری پیش کی۔ اس کے بعد لوگ جوق در جوق آتے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے حکومت ان لوگوں پر لاٹھیاں برساتی انہیں مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا تاہم ان کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہ آتا۔ پولیس کارکنوں کو گرفتار کرنے کے لئے دیہات پر بھی چھاپے مارتی، مردوں کو زدوکوب کرتی، عورتوں کی بے عزتی کرتی اور جبر و تشدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ تپہ سورانی کے ایک گاؤں میں پولیس نے چھاپہ مارا تو گاؤں کے سب مرد ننگ دھڑنگ پولیس کے سامنے آن کھڑے ہوئے، پولیس انہیں دیکھ کر انتہائی شرمندہ ہوئی اور واپس چلی گئی۔ ضلع بھر میں پکڑ دھکڑ کا یہ عالم تھا کہ کم و بیش سات ہزار افراد قید ہوئے۔ حکومت کی ان سختیوں کا ردِ عمل یہ ہوا کہ تمام لوگ قومی کارکنوں کی ہم نوائی میں انگریز کے خلاف میدان میں نکل آئے۔ شیخ حق نواز خان، خان حبیب اللہ خان ایڈووکیٹ، حاجی محمد اسلم خان، سالار یعقوب خان، سالار بہادر خان، مولانا خوشدل، حکیم عبدالرحیم، مولانا نصف جہان، ملک اکبر علی، ملک آزاد خان، ملک ایوب خان، حاجی ممتاز خان، رحم زاد خان، امیر ممتاز خان، مقصود جان خان، ماسٹر میر قلم خان نیازی، قاضی حبیب الرحمٰن اور بیرسٹر محمد جان خان اس تحریک میں پیش پیش رہے۔

ہاتھی خیل کا میدانِ کربلا

حکومت کا خیال تھا کہ ان رہنماؤں کی گرفتاریوں کے بعد تحریک سرد پڑ جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ بلکہ لوگوں میں وہ جوش و خروش پھیلا کہ سرخ و زرد پہننا فخر کا باعث تصور کیا جاتا۔ دیہات کے عوام سے اسلحہ واپس لے لیا گیا اور اُن پر جا بیجا تشدد کیا جانے لگا۔ لوگ چونکہ عدمِ تشدد پر کاربند تھے اس لئے وہ حکومت کی ہر سختی برداشت کرتے گئے۔ عوامی جلسے جلوسوں کا زور رہا۔ اگست کے مہینے میں بنوں کے دروازہ قصاہان کے باہر مسجد میں اعلان ہوا کہ ۲۴ اگست کو "سپین تنگی" میں جلسہ عام منعقد ہوگا۔ یہ مقام بنوں کوہاٹ روڈ پر شہر سے کوئی بارہ میل دُور ایک سرسبز و شاداب وادی میں واقع ہے، جلسہ ظہر کے بعد شروع ہونا تھا لیکن ڈپٹی کمشنر بنوں کرنل سی۔ ایچ گڈنی صبح ہی سے پولیس، فوج اور فرانٹیئر کانسٹیبلری کی بھاری جمعیت لے کر وہاں پہنچ گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے لوگوں کو ہراساں کرنے کے لئے کہ وہ جلسے میں شریک نہ ہوں، ایسی کارروائیاں شروع کر دیں جن سے عوام میں اشتعال پھیلنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے گاؤں کے رئیس اور قومی رہنما ہیبت خان اور رئیس خان کو گرفتار کیا گیا۔

ان کے گھروں کی تلاشی لی گئی۔ کئی ایک کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ لوگ اس پر بھی پُرامن رہے ــــ اس علاقے میں ان دنوں ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ قاضی فضل قادر تھے۔ عوام اُن سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ قاضی صاحب گوشہ نشین لیکن حریت پسند انسان تھے انہوں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ہمارا ملک کافر فرنگیوں سے آزاد نہیں ہو جاتا وہ سیاہ لباس پہنا کریں گے چنانچہ لوگ انہیں "بابا سیاہ پوش" کہا کرتے تھے۔ مجوزہ جلسے کی صدارت انہی قاضی صاحب نے کرنی تھی۔ ڈپٹی کمشنر کو اس بات کا پتہ چلا تو اُس نے قاضی صاحب اور دو دوسرے معززین علاقہ ایوب خان اور میر داد خان کو جلسے سے پہلے ہی گرفتار کرنا چاہا۔ ان رہنماؤں نے ڈپٹی کمشنر کو یقین دلایا کہ جلسہ انتہائی پُرامن ہوگا اس لئے حکومت کو بلاوجہ گھبرانا نہیں چاہیئے۔ انہوں نے اس خدشے کا اظہار بھی کر دیا کہ ان کی گرفتاری کے بعد جو اشتعال پیدا ہوگا اس کے زیر اثر لوگ بے قابو ہو جائیں گے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ڈپٹی کمشنر انہیں جلسے کے بعد گرفتار کرے لیکن ڈپٹی کمشنر کے دماغ میں خدا جانے کیا سمایا ہوا تھا کہ وہ ایسی فوجی تیاری سے گاؤں میں آیا تھا گویا کسی بہت بڑے غنیم سے دو دو ہاتھ کرنے نکلا ہو۔

ظہر کے بعد حسبِ اعلان جلسہ شروع ہوا۔ قاضی فضل قادر (بابا سیاہ پوش) نے تقریر شروع ہی کی تھی کہ فرانٹیئر فورس رجمنٹ کا کپتان ایش کرافٹ (ASHCROFT) سٹیج پر آن دھمکا۔ اس نے آتے ہی قاضی صاحب کو ڈاڑھی سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا اور انہیں سٹیج سے اُتارنا چاہا۔ کھلا ہوا ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اور غیض و غضب کے آثار اُس کے چہرے سے ہویدا ــــ قاضی صاحب نے مزاحمت کی اور تقریر جاری رکھی تو ایش کرافٹ نے اس سفید ریش بزرگ کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ایک اور ضعیف العمر شخص اسٹیج پر قاضی صاحب کے برابر کھڑا تھا وہ کپتان صاحب کے آڑے آیا تو کپتان ایش کرافٹ کے ایک ساتھی نے اسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ بازار احمد خان کے رہنے والے ایک نوجوان سے انگریز کپتان کا یہ ظلم دیکھا نہ گیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے لور (درانتی نما خنجر) سے ایش کرافٹ کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ پھر کیا تھا فوج اور پولیس کے دستے تو پہلے ہی مورچے سنبھالے کھڑے تھے، دھڑا دھڑ عوام پر گولیاں برسانے لگے۔ دو سو سے زیادہ حریت پسند شہید ہوئے جس میں کافی تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سارے

گاؤں کو محاصرے میں لے لیا گیا تھا۔ گولی اس بے دریغ طریق سے چلائی گئی کہ انسان تو انسان ڈھور ڈنگر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اندازاً چار سو کے قریب بھیڑ بکریاں اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ شدید گرمی کے دن تھے۔ زخمی ہونے والے "پانی پانی" پکارتے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے لیکن وہاں پانی دینے والا کون تھا۔ طبی امداد کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ گھنٹوں گولی چلتی رہی، یہاں تک کہ خود انگریزی فوج کے بارہ سپاہی اور ایک حوالدار بھی اپنے ہی ساتھیوں کی گولیوں کی زد میں آکر مارے گئے۔ حکومت نے یہ اعتراف تو کیا کہ اسے زبردست نقصان اٹھانا پڑا ہے تاہم صحیح واقعات اور اعداد و شمار عمداً چھپائے گئے۔ پریس کا گلا تو پہلے ہی گھونٹ دیا گیا تھا باہر خبر نکلتی بھی تو کیسے ؟

جب انگریز ڈپٹی کمشنر دل کھول کر بربریت کا مظاہرہ کر چکا تو اندھا دھند گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جو ملا اُسے پکڑ لیا گیا۔ یہاں تک کہ لولے۔ لنگڑے اور اپاہج بھی پکڑ دھکڑ سے بچ نہ سکے۔ اور یوں انگریز کی انصاف پسندی کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔

بعد میں ایک خصوصی جرگہ ایک سپیشل مجسٹریٹ کی سربراہی میں مقرر کیا گیا۔ ۸۷ افراد پر مقدمہ قائم کیا گیا اور انہیں مختلف میعاد کی سزائیں سنا دی گئیں۔

ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ قاضی فضل قادر شہید کی لاش تک مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی، فوجیوں نے اُسے بنوں لے جا کر اپنی نگرانی میں بنوں جیل کے احاطہ میں دفن کر دیا۔ اور کسی کو کانوں کان اُن کے تجہیز و تکفین کی خبر ہونے نہ پائی۔ بنوں جیل کے قبرستان میں ایک کچی قبر ہے جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ اُسی عظیم شہید کی آخری آرام گاہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ گرفتار شدہ افراد میں سے ۳۲ کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال قید، چار کو دس دس سال قید اور دو (میر داد خان اور ایوب خان) کو چودہ چودہ سال قید سخت کی سزا دی گئی تو تمام علاقے میں کہرام مچ گیا۔

بعد میں ملک بھر کے عوام کی طرف سے اس ظلم ناروا کے خلاف احتجاج کیا گیا اور اس حادثے کی تحقیقات کرائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس نعمت اللہ کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کا اصل کام تو یہ تھا کہ وہ "قوانین جرائم سرحد" (ایف۔ سی۔ آر) کے بارے میں متعلقہ لوگوں سے مل کر اپنی رپورٹ دے، تاہم دوسرے ضمنی واقعات

بھی کمیٹی کے نوٹس میں لائے گئے۔ جب سپین تنگی کے ان متاثرہ وزیریوں کا معاملہ اس کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو جسٹس نعمت اللہ نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا :۔

"..... دیکھا گیا ہے کہ اراکین جرگہ نے تحریری شہادتوں پر کوئی غور نہیں کیا اور نہ اپنے فیصلے کی کوئی بنا اور وجہ بیان کی ہے۔ بہرحال ایسا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ ایوب خان، میر داد خان، میر صاحب دین یا پیر بدین ملزمان کے پاس اسلحہ موجود تھا..... اور یہ کہ وہ اسلحہ انہوں نے فوج کے خلاف استعمال کیا تھا"۔

مدتوں ایف۔ آر۔ سی یا جرگہ سسٹم کا یہ غیر جمہوری قانون اہل سرحد پر مسلط رہا اور اس کی آڑ میں فرنگی حکام اپنی من مانی کرتے رہے۔

جہاں تک حصول آزادئ وطن کی راہ میں قربانیاں دینے کا تعلق ہے مسلمان ملک کے دوسرے تمام طبقوں سے پیش پیش رہے بالخصوص صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی قربانیاں تو بے مثل اور بے نظیر رہیں۔ مشہور ریاضی دان اور مسلمان زعیم علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کے الفاظ ہیں۔

"جہاں تک قربانی اور ایثار کا تعلق ہے مسلمانوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں تمام قوموں سے زیادہ جانی اور مالی قربانی دی، لیکن افراد کی اکثریت چونکہ ہندو کو حاصل تھی، اس لئے کامیابیوں کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر بندھتا رہا ـــــ اگر صرف سرحدی مسلمانوں کی جانی قربانی ہی کو لیا جائے تو باقی ماندہ سارے ہندوستان سے بڑھ کر صرف اس علاقہ کے لوگوں نے آزادئ وطن کی خاطر اپنا خون دیا ہے"۔ (اکثریت یا خون)

اصل میں ان دنوں پریس اور پلیٹ فارم پر ہندو کا تسلط تھا اس لئے اس نے دنیا کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ صوبہ سرحد میں یہ ساری تحریک محض گاندھی جی کے اشارے پر چل رہی ہے، حالانکہ اس وقت تک ہندو لیڈروں اور ہندو پریس نے ہمیشہ سرحدی عوام کو دوسرے صوبوں کے ساری درجہ اور مراعات دینے کی مخالفت کی تھی اور اس وقت تک خدائی خدمت گاروں نے بھی کانگرس سے کوئی باقاعدہ الحاق نہیں کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں شاہی باغ پشاور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے یہ سوال کیا تھا کہ

"یہ بجا کہ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء میں صوبہ سرحد کے لوگوں نے زبردست قربانی دی ـــ لیکن

مَیں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس کا صلہ کیا ملا ؟ ۱۹۲۴ء میں (اور اس کے بعد بھی) جب مسلم لیگ آپ کے صوبے کو اصلاحات دلانے کے لئے لڑ رہی تھی تو کانگرس نے مرکزی اسمبلی تک میں اس مسئلے کی مخالفت کی تھی۔"

اس کے بعد بھی جتنے آئینی کمیشن صوبہ سرحد آئے، اُن کے سامنے سرحدی ہندوؤں نے اہلِ سرحد کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کے برابر مراعات دینے کی مخالفت کی بلکہ اُن میں سے اکثر تو یہ مطالبہ کرتے رہے کہ سرحد کا علیٰحدہ صوبہ سرے سے ختم کر دیا جائے اور ان اضلاع کو حسبِ سابق پنجاب کی انتظامی وحدت میں ضم کر دیا جائے۔

یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں جب گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ اِروِن میں مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی تو صوبہ سرحد کے قومی کارکنوں نے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے مطالبات پیش کئے تھے جن میں ایک تو کھجوری کا میدان آفریدیوں کو واپس دلانے کے متعلق تھا اور دوسرا سپین تنگی کے ہاتھی خیل وزیریوں کی فوری رہائی کا ـــــ وزیریوں کے متعلق تو گاندھی جی نے برملا کہہ دیا

"وہ تشدد کے مجرم ہیں۔ مَیں اُن کی سفارش کیسے کر سکتا ہوں۔"

البتہ کھجوری کے میدان کی واپسی کے بارے میں انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ "جب کانگرس کا راج آئے گا، کھجوری کا علاقہ اہلِ تیراہ کو واپس کر دیا جائے گا۔"

بعد ازاں جب صوبہ سرحد میں قانون ساز کونسل کا قیام عمل میں آیا اور حزبِ اختلاف کے ڈپٹی لیڈر خان حبیب اللہ خان آف لکی نے صوبہ سرحد کے گورنر سے سانحہ سپین تنگی کے باقی ماندہ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا تو نہ صرف سی۔ ایچ گڈنی (ڈی۔ سی بنوں جو اس وقت کونسل کے ریونیو ممبر بن چکے تھے) کی جانب سے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی گئی بلکہ کونسل کے رجعت پسند ارکان نے بھی فرنگیوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس المناک واقعہ کے تمام قیدیوں کو اپنی پوری میعادِ قید گزارنے کے بعد ہی جا کر رہائی نصیب ہوئی۔ بلکہ کئی ایک تو سختیوں کی تاب نہ لا کر جیل ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے برعکس گاندھی جی کے تمام ہم مذہب ایجی ٹیٹر مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی اِروِن پیکٹ پر دستخط ہوتے ہی جیلوں سے رہا

کر دیئے گئے۔

سپین تنگی میں اس مقام پہ جہاں جلسے پہ گولی چلائی گئی تھی، گمنام شہیدوں کی یادگار موجود ہے جس پہ لوگ انتہائی احترام و عقیدت کے ساتھ پھول چڑھاتے ہیں۔

سپین تنگی کے جن شہداء کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں :۔

ترکال خان سکنہ ترجو کلاں، مولوی صمد خان تورگری کلہ، پیاؤ خان سکنہ پٹال خیل، اندر خان سکنہ پٹال خیل، اصل دین سکنہ موسیٰ خیل، شادامیر سکنہ پٹال، گنج خان سکنہ موازکلہ، تھانیدار خان پٹال خیل، میاں محمد یوسف سکنہ مش خیل، محمد شیر خان سکنہ شہباز عظمت خان اور قاضی فضل قادر خان عرف بابا سیاہ پوش۔

سپین تنگی فائرنگ کے نتیجے میں بنوں کے طول و عرض میں انگریز کے خلاف شدید نفرت پھیل گئی، یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے لئے بنوں اور کوہاٹ کے درمیان فرنگی افراد کا سفر ممنوع قرار دے دیا گیا، اگر ضرورت کے تحت کوئی فوجی یا سول انگریز افسر سفر کرتا بھی تو مسلح دستوں کی حفاظت میں کرتا۔۔۔ تمام دیہات کی مسجدوں میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی جاتی تو مقررین اور علماء کو بھی گرفتار کر لیا جاتا۔ یکم ستمبر کو بنوں کے پولیس انسپکٹر کے گھر میں دیسی ساخت کا بم پھٹا تاہم کوئی نقصان ہونے نہ پایا۔ ۱۲ ستمبر کو سانحہ سپین تنگی کے سلسلے میں یوم احتجاج منایا جاتا تھا اس دن جمعہ کو تمام مساجد میں احتجاجی تقریریں ہوتی تھیں لیکن حکومت نے جمعہ سے قبل ہی مشہور مقرر "بنوچی ملا" اور دوسرے عالموں کو گرفتار کر لیا۔ چودہ اور سترہ ستمبر کے لئے پبلک جلسوں کا اعلان ہوا تو حکومت نے سرکردہ وزیری ملکوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا جن کی مداخلت پہ یہ جلسے روک دیئے گئے، بنوں کے ایک سرکردہ عالم مولوی عطاء اللہ خان وزیرستان چلے گئے تاکہ لوگوں کو جہاد پہ آمادہ کریں۔ لیکن فرنگی حکومت نے وہاں سے بھی انہیں گرفتار کر لیا۔

تحقیقاتی کمیٹیاں

انگریزی حکومت کی تحقیقاتی کمیٹی کے علاوہ جو جسٹس نعمت اللہ کی سرکردگی میں صوبہ سرحد آئی، جمعیت خلافت کی طرف سے اللہ بخش یوسفی اور اور انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے مسٹر پٹیل (سابق صدر اسمبلی) کی قیادت میں تحقیقاتی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ پٹیل کمیٹی کو صوبہ سرحد میں داخلے کی اجازت نہ ملی، اس پر کمیٹی نے راولپنڈی ٹھہر کر

اپنی تحقیقاتی رپورٹ مرتب کی جب کہ یوسفی کمیٹی کی رپورٹ خفیہ طریقے سے میاں جعفر شاہ نے "فرانٹیئر ٹریجڈی" کے نام سے شائع کر کے سارے ملک اور انگلستان میں تقسیم کی۔ اس پر ہر جگہ کی رائے عامہ نے فرنگی مظالم کی سخت مذمت کی، اس رپورٹ کی اشاعت پر یوسفی صاحب کو قید کر دیا گیا اور تحقیقاتی رپورٹ کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔

بعد کے واقعات اکتوبر ۱۹۳۰ء کے دوران صوبہ سرحد کے اکثر شہروں اور قصبوں میں شراب خانوں اور غیر ملکی کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ جاری رہی، پشاور کے شہری کارکن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں نکلتے، پکٹنگ کرتے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے۔

نومبر ۱۹۳۰ء میں بھی ترکِ موالات کی قومی تحریک زور شور سے جاری رہی۔

دسمبر ۱۹۳۰ء سے اخباروں اور اشتہاروں وغیرہ کی اشاعت پر پابندی اور کڑی کر دی گئی۔

یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو ماشوخیل اور شیخان (تحصیل پشاور) کے لوگ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ اس بار گورا سپاہیوں نے عیسوی سالِ نو کے دن سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی، اسلحہ ضبط کر لیا گیا اور جس کسی کے گھر سے سُرخ وردی، کوئی اخبار یا سیاسی لٹریچر ملا اسے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار شدگان کو سردی کے شباب میں دریائے باڑہ کے یخ بستہ پانی میں کھڑا رکھا جاتا۔ ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے، اُن کے سامنے سُرخ جھنڈوں کو نذرِ آتش کیا جاتا اور ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے۔ جنہیں کوئی مہذب انسان گوارا تو کیا بیان تک نہیں کر سکتا۔

چمکنی خدائی خدمت گاروں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ دسمبر ۱۹۳۰ء کے آخری دن تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی پشاور اور سٹی مجسٹریٹ پشاور مسٹر کول ایک جمعیت کے ساتھ چمکنی پہنچے۔ انہیں دیکھ کر لوگ جمع ہو گئے تو مسٹر کول نے ایک چھوٹی سی دیوار پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو کہا کہ وہ نادان نہ بنیں، عبدالغفار خان کا ساتھ نہ دیں کہ وہ انہیں برباد کرنا چاہتا تھا۔

کول کی یہ گستاخانہ باتیں سُن کر محمد ایاز خان رہ نہ سکا۔ وہ کنکولہ سکول میں صدر مدرس تھا

اور کرسمس کی چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں آیا ہوا تھا۔ اس نے کول کو کلائی سے پکڑ کر زمین پر گرانا چاہا۔ کول نے پستول نکال لیا۔ خان بہادر سرفراز خان نے اُسے سمجھایا کہ گولی چلانے سے باز رہے ورنہ اشتعال پیدا ہو جائے گا اس پر وہ خاموش ہو گیا۔

تاہم بعد میں ماسٹر محمد ایاز اور ۲۰ دوسرے افراد کو گرفتار کر کے ہری پور سنٹرل جیل بھیج دیا گیا جہاں جیل ہی میں ان پر مقدمہ چلا اور فروری ۱۹۳۱ء میں چمکنی کے محمد موسیٰ خان، سید چن بادشاہ اور ماسٹر محمد ایاز، وڈنگ کے سید مہتاب شاہ، ناصر پور کے سید حبیب شاہ اور چابیاں کے قاضی محمد علی کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اس علاقے کے مشہور عالم دین قاضی صاحب کڑوی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔

سرحدی قبائل کا اعلانِ جہاد

قصہ خوانی پشاور، بازار کلاں، موضع ٹکہ (مردان) سپین بنگی (بنوں) اور دوسرے مقامات پر پُرامن شہریوں پر فائرنگ سے انگریزی حکومت کی مخالفت کا وہ طوفان اُٹھا جو رفتہ رفتہ سارے میدانی علاقوں بلکہ سرحدی قبائل کے پہاڑوں اور وادیوں تک جا پہنچا۔ قبائلی لوگ اپنے بھائی بندوں کے ساتھ رشتۂ اخوت کی بناء پر میدان میں نکل آئے اور فرنگی سامراج کے خلاف پُرزور مظاہرے کرنے لگے۔

مالاکنڈ ایجنسی

سوات، دیر اور چترال کی ریاستوں کے حکمرانوں نے تدبر سے کام لیا اس لئے وہاں حالات پوری طرح اُن کے قابو میں رہے البتہ مالاکنڈ ایجنسی کے قبائل اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکے۔ بدرگہ کے میاں فضل لطیف کی کوششوں سے ہزاروں لوگ سرحد پوش تحریک میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں مولانا سراج الدین نے اپنے جوشیلے اندازِ بیان سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا ـــــ میاں فضل لطیف گرفتار ہوئے تو اُن کے عزاد میاں عبدالودود ایجنسی جرگہ کے صدر چُن لئے گئے انہوں نے تحریک کو بڑی گرمجوشی سے زندہ رکھا۔

وزیرستان

۱۱ مئی کو متاخیل اور خدا خیل وزیریوں نے دتہ خیل کی فوجی چوکی پر حملہ کر دیا۔ یہاں پر ٹوچی سکاؤٹس کی ایک کمپنی مقیم تھی، اس نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ شروع کر دیا۔ اُدھر اس حملے کی خبر میران شاہ پہنچی تو وہاں سے فوجی طیارے آن پہنچے انہوں نے آتے ہی

وزیری مجاہدین پر مشین گنیں کھول دیں۔ اس پر وزیری پہاڑی ٹھکانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۲ر مئی کو ان جہازوں نے کاٹی گرام پر بھی پرواز کی اور گولیاں برسائیں۔ مقصد یہ تھا کہ محسود قبیلے کا حوصلہ پست ہو اور وہ وزیریوں کی مدد کرنے سے باز رہے' ۱۳ر مئی کو وزیریوں نے دوبارہ دتہ خیل پر حملہ کیا۔ جس پر ہوائی جہازوں سے اندھا دھند بمباری کر کے گرد و نواح کے دیہات مسمار کر دیئے گئے، بہت سے بے گناہ شہری جان بحق ہوئے، اس پر قبائلی ملکوں نے صلح کی شرائط پیش کر دیں۔

۱۴ر مئی ۱۹۳۰ء کو رزمک کے مغرب میں وزیریوں کا بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا، انگریزوں نے کئی بریگیڈ فوج بھیج کر مشکل سے اُسے روکا۔ تاہم چھوٹے پیمانے پر فرنگی کے خلاف مظاہرے جاری رہے۔

اُتمان خیل مئی ۱۹۳۰ء میں پنجکوڑہ کے مقام پر فرنگی حکومت کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے اور اس کے ساتھ ہی باجوڑ کے اُتمان خیل کثیر تعداد میں سامراجیوں سے پنجہ آزمائی کے لئے نکل کھڑے ہوئے، جون کے مہینے میں اُتمان خیل لشکر پہاڑیوں سے اُتر کر ہشت نگر کے قصبہ تنگی تک آپہنچا۔ یہاں بھی انگریزوں کو فضائیہ کی مدد لینی پڑی اور ہوائی جہازوں سے حریت پسندوں پر بمباری کر کے انہیں آگے بڑھنے سے روکا گیا۔ تاہم اُتمان خیل نے پسپائی اختیار کرنے کی بجائے جنیدے خوڑ کے اردگرد مورچے قائم کر لئے قبائلی لشکر کو منتشر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزوں نے سیاسی حربہ بھی استعمال کیا۔ اور کئی سرکردہ قبائلی ملکوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ انگریزوں کی کوشش کسی حد تک کامیاب ہوئی لیکن جولائی میں فقیر صاحب آف علی نگر نے پھر ایک لشکرِ مجاہدین جمع کر لیا اور قبائلی بہادر دوبارہ جنیدے خوڑ کے مورچوں پر قابض ہو گئے وہاں سے انہوں نے برطانوی فوجوں پر شب خون مارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ سرکاری علاقہ کے دیہات کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ آخر کار حکومت نے کرنل سکاٹ (SCOTT) کو ایک بہت بڑا لشکر دے کر تنگی بھیجا جس نے جاتے ہی قبائلی مجاہدوں پر توپوں سے گولے برسانے شروع کر دیئے، بالآخر قبائلی لشکر کو منتشر ہوتے ہی بن پڑی، ان معرکوں میں بہت سے قبائلی مجاہدین شہید اور زخمی ہوئے تاہم انہوں نے دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔

آفریدی

آفریدی لوگ اس سے پہلے تحریک خلافت میں بھی اہم حصہ لے چکے تھے۔ اب ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کی قصہ خوانی فائرنگ کے بعد ان میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ مئی کے اوائل میں آفریدی قبائل نے باغ کے مقام پر ایک نمائندہ جرگہ بلایا۔ بڑے بوڑھے ملکوں نے تو کسی سیاسی تحریک میں حمایت میں انگریز سے ٹکر لینے کی مخالفت کی لیکن نوجوان آفریدی انگریزوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ ملک دین خیل کے دو نوجوان رہنماؤں سید کبیر اور سید عالم کی قیادت میں ایک بہت بڑا آفریدی لشکر اکٹھا ہو گیا۔ دور دراز سے آفریدی رضاکار کھجوری میں جمع ہونے لگے، جون کے اوائل تک ان کی تعداد سات ہزار تک پہنچ گئی ـــــ ۴ جون کو پھر ایک بہت بڑا جرگہ منعقد ہوا۔ عمر رسیدہ ملک اسی امر کے حق میں تھے کہ لشکر بغیر کسی کارروائی کے منتشر ہو جائے تاہم نوجوان انگریز کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ بڑی گرما گرمی کے بعد آخر آفریدی جرگے نے پشاور پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

آفریدی جرگے کے اس اقدام پر رائل ایئر فورس فوراً حرکت میں آگئی اور آفریدی لشکر پر گولہ باری شروع کر دی گئی، اس پر دن کو تو آفریدی کھیتوں اور باغوں میں چھپے رہتے اور رات کو حرکت کرتے۔ انگریز اس لشکر سے اس درجہ خائف تھے کہ کوئی جارحانہ کارروائی کرنے کی بجائے انہوں نے مدافعانہ حکمت عملی اختیار کرنے ہی میں خیر سمجھی۔ ۴ جون کی رات کو باڑہ، شبقدر، چارسدہ اور کوہاٹ سب جگہ بیک وقت تار اور ٹیلی فون کی لائنیں کاٹ دی گئیں، رسالہ کے ایک دستہ پر باڑہ کی سڑک پر فائرنگ ہوئی اور راتوں رات آفریدی پشاور شہر کے جنوب اور مغرب کے باغات تک جا پہنچے پشاور کے دیہاتی بھی ان کے ساتھ پورا تعاون کر رہے تھے اس لئے انگریز شہر اور چھاؤنی سے باہر نکل کر انہیں روکنے کی جرأت نہ کرتے۔

اس پر پشاور ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر نے فیصلہ کیا کہ رسالے کی مدد سے باڑہ پر حملہ کر کے آفریدیوں کی واپسی کی راہ مسدود کر دی جائے۔ ۱۱ بجے صبح تک فوجی دستے باڑہ کے قلعے میں پہنچ گئے اور دریا کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرنے لگے۔ اس پر آفریدی قبائل میں تشویش پیدا ہوئی اور کچھ عرصہ کے لئے انہوں نے اپنی سرگرمیاں ملتوی کر دیں۔

یکم اگست کو پھر ایک آفریدی جرگہ منعقد ہوا جس فیصلہ کیا گیا کہ کھجوری اور اکاخیل سے آفریدی

دستے پشاور پر یلغار کے لئے بھیجے جائیں۔ اس پر انگریز کے فوجی دستے حرکت میں آ گئے۔ ۹ اگست تک آفریدی تھوڑی تعداد میں پشاور کی طرف بڑھتے دیکھے گئے۔ کوہاٹ روڈ سے آفریدی لشکر کی آمد کو روکنے کے لئے رسالہ بھیجا گیا۔ آفریدی باڑہ کے اونچے کناروں کی اوٹ میں آگے بڑھتے رہے اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے رسالہ کو گھیرے میں لے لیا۔ زبردست مقابلہ ہوا۔ آفریدیوں نے اپنی نشانہ بازی کا کمال دکھاتے ہوئے فرنگی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اطلاع ملنے پر آرمرڈ کاریں اور رسالے کے مزید دستے کمک کو بھیجے گئے لیکن آرمرڈ کاریں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں اور رسالہ بھی آفریدیوں کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہ کر سکا۔

شام سے کچھ پہلے آفریدی لشکر پشاور شہر کے ریلوے سٹیشن کے مشرق میں واقع فوجی گودام پر حملہ آور ہوا ـــــ سنتری نے دیکھتے ہی گیٹ بند کر کے خطرے کا الارم بجایا۔ فوجی دستے نے جو گودام کی حفاظت پر متعین تھا۔ عمارت کی چھت پر مورچے بنا لئے اور لوئی گن سے آفریدیوں پر گولی چلاتے رہے۔ ٹیلی فون کرنے پر چھاؤنی سے آرمرڈ کاریں ان کی مدد کو پہنچ گئیں۔ اُدھر فضا میں ہوائی جہاز بھی غرّانے لگے۔ اس معرکہ میں ۳۰ سے زیادہ آفریدی شہید ہوئے تاہم ہوائی جہاز کی گولہ باری کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکے۔

آفریدی حملے سے انگریز اتنا ہراساں ہوا کہ کچھ عرصہ تک پشاور اور نوشہرہ کے مابین ریل گاڑیوں کی آمد کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا، ہزاروں آفریدی شہر کے گرد و نواح میں منڈلاتے دیکھے گئے اگر مہمند اور ادک زئی بروقت ان کی مدد کرتے تو یقیناً وہ انگریز کو سخت نقصان پہنچاتے لیکن ایسا ہونے نہ پایا۔

۱۶ اگست کو سارے ضلع پشاور میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

کافی دیر تک آفریدی حملے کا خوف طاری رہا۔ بالآخر انگریز چیف کمشنر نے جمرود میں آفریدی ملکوں کا جرگہ بلایا۔ تاہم خلافت پارٹی تیراہ اور خیبر میں اس قدر زور پکڑ چکی تھی کہ وہ ملکوں کو جمرود پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ خلافت پارٹی کا مطالبہ تھا کہ انگریز کھجوری اور اکاخیل کے میدان خالی کر دیں خان عبدالغفار خان کو رہا کر دیا جائے۔ اور پچاس ہزار روپیہ بطور ہرجانہ آفریدی جرگے کو ادا کیا جائے۔

۲۳ اگست کو جرگہ منعقد ہوا لیکن کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گیا ـــــ مارچ ۱۹۳۱ء میں

گاندھی اِروِن سمجھوتہ کے تحت خان عبدالغفار اور دوسرے سیاسی قیدی رہا ہو گئے جس پر آفریدیوں کے لئے جہاد کا جواز نہ رہا۔ اُدھر مسلسل ناکہ بندی سے آفریدیوں کی معیشت بُری طرح متاثر ہو رہی تھی، اس لئے ۳ر اکتوبر کو پھر ایک جرگہ ہوا جس میں انگریزوں اور آفریدیوں میں صُلح نامہ طے پاگیا۔ تاہم نہایت عیاری سے فرنگی نے کھجوری کے میدان پر قبضہ جما لیا۔ سڑکیں اور نئی فوجی چوکیاں تعمیر کرلیں اور تیراہ اور خیبر کے آفریدی علاقوں میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔

مہمند اور حاجی صاحب ترنگ زئی

خان عبدالغفار خان کی گرفتاری، پشاور اور ہشت نگر کے دیہات پر انگریزوں کے بے پناہ مظالم اور پکڑ دھکڑ پر مشہور مذہبی پیشوا حاجی صاحب ترنگ زئی سخت برافروختہ ہوئے، انہوں نے مہمندوں کو اذنِ جہاد دے دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مہمند ارادت مند اُن کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ حاجی صاحب کے فرزند حضرت بادشاہ گل صاحب اب کے رضاکاروں کی قیادت کر رہے تھے۔ اس وقت تک انگریزوں کو ہوائی فوج کی وجہ سے برتری حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی فرنگی ہوائی جہازوں نے علاقہ مہمند پر پروازیں شروع کردیں۔ جلیم زئی کے علاقہ پر اس اس مضمون کے اشتہار پھینکے گئے کہ اگر اُن لوگوں نے حاجی صاحب کے لشکر کا ساتھ دیا تو اُن کے دیہات پر بمباری کی جائے گی، پٹھان مجاہد ہوائی حملے کے سامنے بالکل بے بس تھے۔ ابھی حاجی صاحب کا لشکر گندہاب ہی میں تھا کہ انگریزوں نے اس پر بے دریغ بمباری شروع کردی، سب سے بڑی مشکل یہ ہوئی کہ مجاہدین کے خوراک اور گولہ بارود کے ذخیرے تباہ ہو گئے۔ اس پر لشکر فوری حملے کے قابل نہ رہا۔ اُدھر ایک طرف تو انگریز ہوائی جہازوں سے بم برسا رہا تھا تو دوسری طرف سیاسی ریشہ دوانیاں بھی جاری تھیں۔ چنانچہ سرکاری علاقے میں رہنے والے سات سرکردہ مہمند ملکوں پر مشتمل ایک جرگہ بھی بادشاہ گل صاحب کے پاس بھیجا گیا اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ ایسے نازک وقت میں انگریز کی مخالفت نہ کریں ـــــ اپنی بے سروسامانی کے باوجود مہمند مجاہد ۱۲ر جون ۱۹۳۰ء تک مورچوں میں ڈٹے رہے، ہوائی جہازوں کی مسلسل بمباری سے انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

تیراہ سے آفریدیوں کے قاصد بھی اس دوران حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

انگریز کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی درخواست کرتے رہے تاہم ضلع پشاور کی سرحدوں پہ بسنے والے علیم زئی اور ترک زئی مہمند مصلحتاً میدان میں کودنے سے مجتنب رہے، خود حاجی صاحب بھی سات نومبر تک گندہاب میں قیام پذیر رہے، چونکہ اس اثنار میں ضلع پشاور اور دوسرے علاقوں میں سول نافرمانی کی مہم ٹھنڈی پڑ چکی تھی اس لئے بالآخر وہ بھی خاموشی سے واپس اپنی قیام گاہ کو چلے گئے۔ اس مرحلہ پہ بالائی علاقہ کے مہمندوں اور زیریں علاقہ کے مہمندوں میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کے سلسلے میں اختلاف رونما ہو چکا تھا۔ زیرین علاقہ کے لوگ انگریز کے خلاف کارروائی کے مخالف تھے۔ اس لئے بالائی علاقہ کے مہمندوں نے گندہاب کی وادی پہ دھاوا بول دیا اور کئی انگریز نواز ملکوں کے دیہات تباہ کر دیئے ـــــ اس طرح انگریزوں نے کمال عیاری سے مہمندوں میں پھوٹ ڈلوا کر اپنا الّو سیدھا کر لیا۔

کرّم ایجنسی ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء میں پشاور کے جس ننھتے ہجوم پہ گولی چلی اس میں بہت سے آفریدی، اورک زئی اور کرّم پاڑہ چنار کے باشندے بھی جاں بحق ہو گئے تھے۔ قبائلی ہر قیمت پہ اُن کی موت کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اُدھر کچھ سیاسی رہنما قبائلی علاقوں میں پہنچ چکے تھے اور اپنی جوشیلی تقریروں سے قبائل کے جذبۂ قومی کو بیدار کر رہے تھے۔ کرم ایجنسی کے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، ستمبر ۱۹۳۰ء میں اورک زئی اور پاڑہ چمکنی کے غازیوں نے انگریز کی فوجی چوکیوں پہ حملے شروع کر دیئے۔ پہلے پہل تو کرم ملیشیا اور فرانٹیئر کانسٹیبلری کے سپاہی ان حملوں سے نپٹتے رہے لیکن جب ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو انگریز نے ہوائی جہازوں سے کام لینا شروع کر دیا، کئی دنوں تک فضا سے بم برسائے جاتے رہے تب کہیں صورتحال پر قابو پایا جا سکا ـــــ قبائلی خطرے کے پیشِ نظر پاڑہ چنار سے انگریزوں نے اپنے بیوی بچے نکال کر دوسرے محفوظ مقامات تک پہنچا دیئے ـــــ بمباری سے کرّم کے لوگوں میں اشتعال بڑھا تو انہوں نے پوری قوت سے پاڑہ چنار پہ ہلّہ بول دیا ـــــ نواحی پہاڑیوں پہ مورچے قائم کر کے یہ لوگ سرکاری چوکیوں پہ فائرنگ کرتے ـــــ یہاں تک کہ سڑک پہ آمد و رفت بھی معطل ہو گئی۔ ۳ر اور ۴ر ستمبر کو انگریزوں نے بڑی توپوں کی مدد سے مجاہدین کے مورچوں پہ انتہائی وحشیانہ گولہ باری کی جس کی وجہ سے قبائلی غازیوں کو اپنے مورچے چھوڑنے ہی بن پڑی ـــ تاہم

اس کے بعد بھی وہ متواتر فوجی ٹھکانوں پر شب خون مارتے رہے اور جب کبھی بس چلتا بڑے اور منظم حملے بھی کرتے رہے ـــــ خرلاچی پر تو قبائلی حملہ اس زور کا تھا کہ انگریز کے قدم اکھڑ گئے اور بڑی مشکل سے انگریز سپاہیوں نے اپنی جانیں بچائیں ۔ دوسرے دن اہلِ کرم نے ملیشیا کی ایک اور چوکی پر بھرپور حملہ کیا جسے پسپا کرنے کے لئے فوجی سپاہیوں کو زبردست جانی قربانی دینی پڑی، یہ سلسلہ کوئی ایک ماہ جاری رہا تاہم بعد میں چمکنی قبیلہ کی خانی خیل اور خواجک شاخوں نے ایک وفد بھیج کر انگریزوں سے صلح کی شرطیں طے کرلیں ۔

۱۹۳۰ء کی تحریک کے دوران کئے گئے برطانوی مظالم کی داستان بہت طویل ہے ۔ شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہو جو ان مظالم کی زد سے بچا ہو، پبی اور اُڈمڑ کے گاؤں کو گھیرے میں لے کر ایک ایک شخص کو گرفتار کیا گیا اور اُسے وحشیانہ سزا دی گئی ـــــ اکبر پورہ میں کرم ملیشیا کے پچاس سواروں سے دن دہاڑے ڈاکہ ڈلوایا گیا اور ڈاکو لوگوں کا مال لے کر چلتے بنے ۔

یکم جون کو پڑانگ ، بابڑا ۔ اور چارسدہ کو فوج نے گھیرے میں لے کر بہت سے خدائی خدمتگاروں کو گرفتار کرلیا ۔ ان گرفتار شدگان کو دریا کے کنارے لے جا کر ان سے پتھر اٹھانے کا کام لیا جاتا رہا ـــــ لوگوں کی کھڑی فصلیں جلا دی گئیں ، افغان جرگہ کے دفتروں کو نذرِ آتش کر دیا گیا غرضیکہ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو اس تحریک کے دوران فرنگی حکومت نے عوام پر روا نہ رکھا ہو ۔ لیکن ان کی تمام ناپاک کوششوں کے باوجود لوگوں کے جذبۂ آزادی کو دبایا نہ جا سکا ۔ جدوجہد جاری رہی اور اس وقت تک جاری رہی جب تک وطن غیر ملکی سامراجیوں سے پاک نہ ہو گیا ۔

صوبۂ سرحد کا آئینی اِرتقا

۱۹۳۰ء میں اہلِ سرحد نے اپنی آزادی کی خاطر جو قربانیاں دی تھیں، وہ رائیگاں نہ گئیں، شہیدوں کا لہو رنگ لایا۔ انگریز کو رائے عامہ کے آگے جھکتے ہی بن پڑی اور بالآخر وہ صوبہ سرحد کو بھی ملک کے دوسرے صوبوں کے مساوی سیاسی اور آئینی مراعات دینے پر تیار ہو گیا۔

حالت یہ تھی کہ انگریز کو اس سرزمین پر تسلط جمائے اسّی برس کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس ساری مدت میں ایک دن بھی اسے یہاں چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ مجاہدین سرحد غیر ملکی سامراج کے خلاف مسلسل مصروفِ جہاد رہے تھے۔ انہوں نے جان کی بازی لگا کر ہر محاذ پر فرنگی کی توپوں کا مقابلہ کیا۔ اہلِ سرحد کی ان عظیم قربانیوں کا اعتراف قائداعظم محمد علی جناح نے بارہا اپنی تقریروں میں کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے صوبہ سرحد کی آئینی مراعات سے محرومی پر اس خطّہ کو "سرزمینِ بے آئین" کا نام دیا۔ تو مشہور مسلمان زعیم اور ریاضی دان علامہ عنایت اللہ خان المشرقی نے برملا کہا کہ

"جہاں تک قربانی اور ایثار کا تعلق ہے، مسلمانوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ جانی اور مالی قربانی دی، لیکن افراد کی کثرت چونکہ ہندو کو حاصل تھی، اس لئے کامیابیوں کا سہرا ہمیشہ ہندو ہی کے سر بندھتا رہا ——— اگر صرف سرحدی مسلمانوں کی جانی قربانی ہی کو لیا جائے تو باقی ماندہ سارے ہندوستان سے بڑھ کر صرف اس صوبہ کے لوگوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر اپنا خون دیا ہے۔"

(اکثریت یا خون)

اہلِ سرحد کے ساتھ سیاسی ستم ظریفی یہی ہوئی کہ قربانیاں تو انہوں نے دیں۔ لیکن اُن سے فائدہ اٹھایا تو اُن چالاک اور زمانہ ساز غیر مسلموں نے اٹھایا، جو ڈپلومیسی اور تعلیم میں مسلمانوں سے آگے تھے۔

اور نشر و اشاعت کے ذرائع (پریس اور پلیٹ فارم) پر قابض تھے۔ ۱۹۴۵ء میں شاہی باغ پشاور میں منعقد ہونے والی عظیم الشان مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے کیا خوب کہا تھا کہ

"صوبہ سرحد کے لوگوں نے ۱۹۳۱-۳۰ء میں زبردست قربانیاں دیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس کا کیا صلہ ملا؟ ـــــ ۱۹۲۶ء میں جب مسلم لیگ آپ کے صوبے کو اصلاحات دلانے کے لئے لڑ رہی تھی تو کانگرس نے مرکزی اسمبلی تک اس مسئلے میں سخت مخالفت کی تھی"۔

۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مولانا محمد علی جوہر نے پشاور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا تھا کہ

"کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے، اس سے پہلے وہ عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی ـــــ چنانچہ کلکتہ کانگرس میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگرس نے ترکِ موالات کو اپنا شعار بنایا اور یہ حقیقت ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمائے سے دورے کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد مہاتما جی کے دورے کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے مہیا کئے گئے۔ حتیٰ کہ کانگرس کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لئے آپ کے دوروں کا خرچ بھی مجلسِ خلافت نے ادا کیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روحِ رواں اور بنیاد تحریکِ خلافت اور مجلسِ خلافت تھی"۔

حیرت ہوتی ہے کہ برصغیر کی ہندو اکثریت ملک کے دوسرے صوبوں کو سیاسی مراعات اور حکومت خود اختیاری دلانے میں تو ہمیشہ پیش پیش رہتی تھی لیکن جب کبھی صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر مراعات دیئے جانے کا سوال آتا یہ نام نہاد آزادی پسند ہمیشہ اس امر کی مخالفت کرتے، وہ کبھی سرحدی مسلمانوں کو اس قابل نہ سمجھتے کہ وہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کے دوش بدوش شاہراہِ آزادی پر آگے بڑھیں۔ اہلِ سرحد کے جائز مطالبات کی حمایت کرنے کی بجائے وہ ہمیشہ ان کی مخالفت میں پیش پیش نظر آتے ـــــ یہ فخر مجلسِ خلافت اور مسلم لیگ ہی کے زعماء کے حصے میں آیا۔

کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے آئینی حقوق کے حصول کے لئے دل وجان سے جدوجہد کی۔

۱۹۱۳ء وہ سال تھا جب صوبہ سرحد کے تعلیم یافتہ مسلمان زعماء نے مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کی۔ مسلم لیگ کے ہر سالانہ اجلاس میں یہ اولوالعزم لوگ صوبہ سرحد کے لئے آئینی مراعات کا مطالبہ کرتے ان رہنماؤں میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر، سید علی عباس بخاری، قاضی ولی خان، قاضی میر احمد خان، خان بہادر سید سکندر شاہ (کوہاٹ) نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

۳۱ دسمبر ۱۹۲۴ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں سید رضا علی کی صدارت میں ہوا تو اس کے خطبۂ صدارت میں سرحد کو سیاسی اصلاحات دیئے جانے کے مطالبے کو بھی دہرایا گیا اور کہا گیا کہ

"امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد شمال مغربی سرحدی صوبہ میں لیجسلیٹو کونسل قائم کی جائے گی اور سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی آئینی سفارشوں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔"

واضح رہے کہ ۱۹۲۲ء میں اہل سرحد کے اس مطالبے کا جائزہ لینے کے لئے برطانوی حکومت کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی سیکرٹری امور خارجہ سر ڈینس برے کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی جس کے ممبروں میں تین انگریز، تین مسلم اور دو ہندو شامل تھے۔ اس تحقیقاتی کمیٹی نے صوبے کے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے صاحب رائے لوگوں سے ملاقاتیں کر کے ان کا نقطۂ نظر معلوم کیا، جہاں اکثر مسلمان زعماء نے صوبہ سرحد کو جلد سے جلد دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات اور مراعات دیئے جانے کا پُرزور مطالبہ کیا وہیں سب کے سب ہندو اور سکھ زعماء نے یہ کہتے ہوئے صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کی شدید مخالفت کی کہ سرحدی لوگ اتنے "مہذب" نہیں ہیں کہ وہ اصلاحات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ایسے لوگوں میں صرف سخت قوانین ہی کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے ـــــ یہی وہ موقعہ تھا جب انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے صدر سردار گل محمد خان نے کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے تقسیم ہند کا فارمولا پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ

"ہندو مسلم اتحاد کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتا، اس کی بجائے ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ رہنے دیا جائے۔ جنوب میں ۲۳ کروڑ ہندوؤں کی حکومت ہو اور شمال میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی ـــــ راس کماری سے آگرہ تک کا

علاقہ ہندوؤں کا ہو اور آگرہ سے پشاور تک مسلمانوں کا ——"

۳۱ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا، سر عبدالرحیم صدر اجلاس تھے، اس اجلاس میں میاں عبدالعزیز بیرسٹر پشاور نے صوبہ سرحد کو سیاسی اصلاحات دیئے جانے کے مطالبہ کو دہراتے ہوئے ایک قرارداد پیش کی کہ

"حکومت سے استدعا ہے کہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کو بلا تامل عملی جامہ پہنایا جائے اور سنٹرل اسمبلی اور پنجاب اسمبلی کے ممبروں سے درخواست ہے کہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشوں پر عمل کرانے کے لئے حکومت پر زور اور دباؤ ڈالا جائے۔"

اس تجویز پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ مسلمان زعماء کا ایک وفد چیف کمشنر صوبہ سرحد سے ملا تھا لیکن کمشنر نے یہ عذر پیش کیا کہ ہندو صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے خلاف حالانکہ یہ جواب ہمارے لئے ہرگز موجب تسلی نہیں۔

مسٹر علی امام نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ "صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی خدمت کرنا ہمارا قومی فرض ہے، کیونکہ اگر سرحد میں آئینی اصلاحات نافذ نہ کی گئیں تو ہندوستان کی آئندہ ذمہ دار حکومت کو بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی ترقی کے لئے کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔ ان اصلاحات کے نفاذ سے سرحد کے لوگوں اور ہندوستان کے باقی لوگوں میں ہم آہنگی اور برابری پیدا ہوگی —— اس کے برعکس آئینی اصلاحات کے نفاذ کے سلسلے میں اہل سرحد کے مطالبہ کو پورا نہ کرنا فاش سیاسی غلطی ہوگی۔"

اب تک تو مسلمانانِ سرحد مسلم لیگ اور مجلسِ خلافت ہی کے پلیٹ فارم سے اپنے صوبے کے لئے آئینی مراعات کا مطالبہ کرتے تھے لیکن ۱۹۲۶ء میں اس سلسلے میں مزید پیش رفت ہوئی، مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم کی وساطت سے اب وہ اپنا معاملہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ایوان تک کے جانے میں کامیاب ہوگئے —— مرکزی اسمبلی کا ۱۹۲۶ء کا بجٹ سیشن وہ تاریخی موقعہ تھا جب سید مرتضیٰ بہادر، صدر مجلس خلافت (رکن مرکزی اسمبلی) نے جرأت سے کام لیتے ہوئے ایوان میں یہ قرارداد پیش کر دی کہ

"اسمبلی گورنر جنرل اِن کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ دستورِ ہند کی اُن دفعات کو، جن کا

تعلق لیجسلیٹر کونسلوں اور وزراء کے تقرر سے ہے، صوبہ سرحد میں بھی نافذ کرے، اور وہاں ۱۹۱۹ء کی اصلاحات پر بلا توقف عمل درآمد کیا جائے۔"

اس قرارداد کے پیش ہونے پر عجیب ردِ عمل دیکھنے میں آیا اور ہندو کانگرسی لیڈروں نے حسبِ سابق اپنا پورا زور قرارداد کی مخالفت میں صرف کیا، لالہ لاجپت رائے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے سبھی ہندو رہنما کھل کر سامنے آگئے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے ان ہندو ارکان کے دلائل کو رد کرتے ہوئے ایک پُرزور تقریر کی، اجلاس میں فرنٹیئر تحقیقاتی کمیٹی کے سربراہ سر ڈینیس برے بھی موجود تھا۔ انہوں نے اسے براہِ راست خطاب کرتے ہوئے کہا "تو کیا برے کمیٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ محض کاغذ کا ایک پُرزہ تھی؟" جواب میں سر ڈینیس برے نے قائداعظمؒ کی تقریر کی پُرزور حمایت کی اور بتایا کہ وہ اپنے دورۂ سرحد کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ اہلِ سرحد کو آئینی مراعات کا دیا جانا ناگزیر ہے۔" اس پر پنڈت مالویہ بڑے سیخ پا ہوئے، پہلے تو وہ عام ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے رہے پھر ان فرقہ وارانہ فسادات کی فہرست پیش کرنے لگے جو گزشتہ بیس برس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہوئے تھے، انہوں نے خاص طور پر کوہاٹ کے فساد ۱۹۲۴ء کا رونا رویا جس کے بعد مہاتما گاندھی نے اکیس روزہ برت رکھا تھا۔ اور کہا کہ جس صوبے میں ایسے حالات ہوں وہاں اقلیت پر ظلم توڑنے والی اکثریت کے ہاتھ میں آئینی اصلاحات کے ذریعے اختیارات دینا ہرگز مناسب نہیں۔"

اس پر پنجاب کے مشہور مسلم لیگی کارکن راجہ غضنفر علی خان، جو پہلی مرتبہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو کر ایوان میں پہنچے تھے، جوش میں آگئے اور صوبہ سرحد سیاسی مراعات دیئے جانے کی قرارداد کی حمایت میں بڑی جوشیلی تقریر کی، انہوں نے پنڈت مالویہ سے پوچھا کہ کیا صوبہ سرحد کو اصلاحات سے اس لئے محروم رکھا جا رہا ہے کہ وہاں بیس برس کے عرصہ میں چند ہندو مسلم فسادات ہوئے ـــــ تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر فسادات کہاں نہیں ہوئے ہیں ـــــ پنڈت مدن موہن مالویہ کے اپنے صوبے میں نہیں ہوئے ہیں؟ ـــــ تو کیا یو۔پی کو اس لئے سیاسی آزادی کے لئے نااہل قرار دیا جانا چاہیئے؟ ـــــ فسادات ہر صوبے میں ہوتے ہیں ـــــ کیا صوبہ سرحد کے فسادات کو محض اس لئے اہمیت دی جا رہی ہے کہ وہاں ایک خاص فرقہ اقلیت میں ہے۔"

پنجاب کے مولوی عبدالحیٔ اور خان بہادر غلام باری نے بھی قرارداد کی حمایت میں زوردار تقریریں کیں۔ قائداعظم کے پیچھے بیٹھے ہوئے سر صاحبزادہ عبدالقیوم نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے صوبہ سرحد کو آئین مراعات دیئے جانے کی حمایت کی۔

اس وقت مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کی نمائندگی نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور نواب سر محمد اکبر خان ہوتی کر رہے تھے، لیکن وہ حکومت کی طرف سے نامزد ممبر ہونے کی وجہ سے کھل کر سامنے نہ آسکتے تھے ـــــ بات طول پکڑ گئی، انگریز اور ہندو ممبروں نے اپنے موقف پر مبنی کتابچے اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کئے جن میں کہا گیا تھا کہ اگر اہلِ سرحد کو اصلاحات اور سیاسی اختیارات دیئے گئے تو وہ اور شیر ہو جائیں گے اور حکومت سے نظم و نسق برقرار نہیں رکھا جاسکے گا۔ نیز ہندو سکھوں کے جان و مال کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

اس کتابچے کا جواب دیا جانا ضروری تھا چنانچہ سر صاحبزادہ عبدالقیوم کے ایماء پر مجلسِ خلافت پشاور کے دو سرگرم کارکنوں میاں جعفر شاہ اور اللہ بخش یوسفی نے (GIVE US OUR DUE) "ہمیں ہمارا حق دیا جائے"۔ کے عنوان سے کتابچے تقسیم کئے جن میں مسلمانانِ سرحد کے موقف کی مدلل وضاحت کی گئی تھی، کتابچوں کی تقسیم پر ہندو ارکان بڑے سیخ پا ہوئے ـــــ بالآخر ۱۸ اور ۱۹ مارچ ۱۹۲۶ء کو قرارداد پر گرما گرم بحث ہوئی جس میں قائداعظم محمد علی جناح نے اہلِ سرحد کی کھل کر وکالت کی۔

قائداعظم محمد علی جناح کو اپنی سیاسی بصیرت کی بناء پر یقین تھا کہ جب تک دستوری اصلاحات کے سلسلے میں تمام مسلمان تنظیموں کا نقطۂ نظر ایک نہ ہو کامیابی مشکل ہے لہٰذا انہوں نے سر جوڑ کر کوشش کی کہ تمام مسلمان زعماء سر جوڑ کر بیٹھیں اور متحدہ محاذ بنا کر حکومت سے اپنے قومی مطالبات منوائیں۔ ان کی مخلصانہ کوششیں کامیاب ہوئیں۔ اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو تمام مسلمان زعماء دہلی میں جمع ہوئے۔ اس مسلم کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بھی قائداعظم ہی کے حصے میں آیا۔ انہی کے اصرار سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں منجملہ دیگر امور کے یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو حسبِ ذیل شرائط پر کاربند رہتے ہوئے دوسری تنظیموں سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے جداگانہ صوبہ بنایا جائے۔

۲۔ جس بنیاد پر کسی دوسرے صوبے میں اصلاحات نافذ کی جائیں، شمال مغربی سرحدی صوبے کو بھی اُن سے محروم نہ رکھا جائے۔

۳۔ یہ کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمان ممبروں کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

اگرچہ یہ مطالبات نہایت معقول اور جائز تھے تاہم ہندوؤں نے ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور مسلمانوں کے اصرار کے باوجود انہیں "نہرو رپورٹ" میں شامل نہ کیا گیا۔ اُدھر انگریز بھی صوبہ سرحد کو محض اپنی فوجوں کے لئے ایک تربیت گاہ بنانے پر تلے ہوئے تھے اس لئے یہی رٹ لگاتے رہے کہ اگر صوبہ سرحد کو اصلاحات دی گئیں تو سرحدی اور بھی سرکش اور بے قابو ہو جائیں گے۔ ان سب مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنی قومی جدوجہد جاری رکھی، مولانا محمد علی جوہر نے اپنے روزنامہ "ہمدرد" کی ۱۹ اپریل ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں اپنے افتتاحیہ مقالہ میں لکھا کہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو مختلف الخیال مسلمانوں کو خداوند کریم نے ایک ایسی سکیم سمجھا دی جو دونوں قوموں میں توازن پیدا کر سکتی ہے۔ قدرت نے ہمیں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ دو بڑے صوبوں پنجاب اور بنگال میں ہمیں تھوڑی سی اور سرحد اور سندھ میں بہت بڑی اکثریت حاصل ہے، اب تک ہمیں (مسلم) اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے لئے شور مچانا پڑتا تھا لیکن ہندو اکثریت اسے قوم پروری کے خلاف سمجھتی تھی، اگر صوبہ سرحد کو بھی حقِ انتخاب مل جاتا (جو ۱۹۳۵ء تک نہ مل سکا) اور ہمیں وہاں اتنی ہی بڑی اکثریت حاصل ہو جاتی جو ہندوؤں کو متعدد صوبوں میں حاصل ہے تو وہاں (سرحد) کی ہندو اقلیت اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ہماری طرح مطالبہ کرتی اور اس کی قوم پروری کا بھانڈا پھوٹ جاتا ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے سرحد کو حقِ انتخاب دیئے جانے کی مخالفت کی اور یہی وجہ ہے کہ وہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی بھی مخالفت کر رہے ہیں، لیکن خداوند کریم نے ہماری اقلیت کو غیر مساوی طریقہ پر پھیلا کر ہمارے تحفظ کا سامان کر دیا ہے ـــــ ہندو اکثریت ہر جگہ مسلمانوں کو اقلیت ہی میں رکھنا چاہتی ہے لیکن خود کہیں بھی اقلیت میں رہنا نہیں چاہتی۔" مولانا محمد علی جوہر کے یہ الفاظ بڑے مبنی بر حقیقت تھے۔

ہندو قوم پرست بظاہر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے۔ لیکن در پردہ ہندو راج کے قیام کے خواب دیکھتے تھے۔ ان کی اسی روش کے پیشِ نظر برطانوی وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہندوستان کے ہندو مسلم کسی ایک مشترکہ سیاسی فارمولے پر متفق ہی نہیں ہو سکتے — فرنگی وزیر کا یہ طعنہ سن کر ہمارے اربابِ سیاست کو شرم آئی اور وہ "میثاقِ لکھنؤ" کی طرح دوبارہ متحدہ فارمولہ تلاش کرنے لگے، قائدِ اعظم محمد علی جناح، جو اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے پُر جوش حامی تھے، نے نہایت سوچ بچار کے بعد اپنے شہرہ آفاق "چودہ نکات" مرتب کئے، کانگرس کے کئی اکابر نے ان معقول نکات کو تسلیم کر لیا تاہم وہ اپنے ساتھیوں کی مخالفت پر قابو نہ پا سکے۔ یہی حشر اس سے اگلے سال "نہرو رپورٹ" کا ہوا، اور سیاسی دُنیا کو ماننا پڑا کہ انگریز وزیر کی بات سچ تھی اور اہلِ ہند کسی مشترکہ ملکی آئین پر متفق ہو ہی نہ سکتے تھے۔

قائدِ اعظم کے پیش کردہ چودہ نکات میں بھی صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر مراعات دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا، ان چودہ نکات کا خلاصہ یہ تھا:۔

۱۔ ہندوستان کا دستور وفاقی ہوگا۔

۲۔ تمام صوبوں کو مساوی اصلاحات اور کامل اندرونی اختیارات دیئے جائیں گے۔

۳۔ کوئی اکثریت، کم تعداد فرقے کے مساوی یا کم نہیں رہے گی مگر اقلیت کو کافی مؤثر نیابت دی جائے گی۔

۴۔ مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہوگی۔

۵۔ جداگانہ انتخاب قائم رہے گا۔ بجز اس کے کہ کوئی فرقہ اپنی مرضی سے یہ حق چھوڑ دے،

۶۔ صوبوں کی کوئی ایسی تقسیم نہ کی جائے گی جس سے پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو نقصان پہنچے۔

۷۔ سب کو ضمیر و مذہب کی آزادی ہوگی۔

۸۔ کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جس کی کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان مخالفت کرتے ہوں۔

۹۔ سندھ کا علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا۔

۱۰۔ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مثل آئین نافذ ہوگا۔

۱۱۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے گا۔

۱۲۔ اسلامی تہذیب، مذہبی شخصی قانون، زبان، رسم الخط کا پورا تحفظ کیا جائے گا۔
۱۳۔ ہر صوبے کی وزارت میں ایک تہائی وزیر مسلمانوں کے انتخاب کردہ ہوں گے۔
۱۴۔ دستورِ اساسی میں کوئی ترمیم نہ ہوگی جب تک کہ تمام صوبے اور دیسی ریاستیں اسے تسلیم نہ کرلیں۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں سر محمد یعقوب کی صدارت میں منعقد ہوا تو اس میں بھی بلوچستان اور صوبہ سرحد کو بھی دوسرے صوبوں کے برابر مراعات دینے کے مطالبے کو دہرایا گیا، تاہم فرنگی سامراج نے اہلِ سرحد سے کوئی رعایت روا نہ رکھی۔

صوبہ سرحد کی سیاسی اصلاحات و مراعات سے محرومی کی داستان بہت تلخ بھی ہے اور طویل بھی۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک یہ علاقہ صوبہ پنجاب ہی میں شامل رہا۔ ۱۹۰۱ء میں اسے علیحدہ صوبہ تو بنا دیا گیا تاہم یہاں انگریز افسروں کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر حکم ہی قانون کا درجہ رکھتا تھا وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے حکومت کرتے۔ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کے باقی صوبوں میں مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کا نفاذ ہوا تو بھی صوبہ سرحد کو نظر انداز کر دیا گیا۔ منٹو مارلے سکیم کے تحت بھی سرحد سے یہی سلوک روا رکھا گیا۔

نومبر ۱۹۲۷ء میں وائسرائے لارڈ اِروِن نے اعلان کیا کہ ہندوستان کو مزید سیاسی حقوق دینے کے لئے برطانوی حکومت کی جانب سے ایک شاہی کمیشن قائم کیا گیا ہے ــــ تاہم یہ کمیشن چونکہ دارالامراء اور دارالعوام کے صرف انگریز ممبروں پر مشتمل تھا۔ اور ہندوستان کے کسی رہنما کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے ملک بھر میں اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن پشاور پہنچا تو اس کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا گیا اور فضا "سائمن کمیشن واپس جاؤ" ــــ کے نعروں سے گونجنے لگی۔ صرف سرکار پرست عناصر پر مشتمل چند وفد کمیشن کے ممبروں سے ملے صوبے کے بڑے بڑے جاگیرداروں کا ایک وفد خان عبدالغفور خان آف زیدہ کی قیادت میں سائمن کمیشن سے ملا اور یہ مضحکہ خیز مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد کو لیجسلیٹو کونسل تو دی جائے لیکن اس کے صرف ایک تہائی ارکان منتخب کردہ ہوں جبکہ دو تہائی ارکان حکومت خود نامزد کرے، اسی طرح ہندوؤں سکھوں کے جو وفد کمیشن سے ملے انہوں نے صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر سیاسی مراعات

دیئے جانے کی پُرزور مخالفت کی لیکن خود اپنے لئے زیادہ سے زیادہ تحفظات اور حقوق کا مطالبہ کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح اس ساری سیاسی صورتِ حال پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ۱۹ جون ۱۹۲۹ء کو نہایت واشگاف الفاظ میں وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزی میکڈانلڈ کو لکھ دیا کہ

"سائمن کمیشن کا سیاسی ہندوستان مکمل مقاطعہ کر چکا ہے۔ اگر اس بنیاد پر معاملات آگے آگے بڑھائے گئے تو سارا ہندوستان بھڑک اٹھے گا۔ ہندوستان اب برطانیہ کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچئے کہ یہ کھویا ہوا اعتماد آپ کیسے بحال کر سکتے ہیں؟ ـــــ آپ کے لئے واحد چارۂ کار یہ ہے کہ آپ ایک واضح اعلان کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ حکومتِ برطانیہ جلد سے جلد ہندوستان کو نوآبادیاتی حکومت دے دے گی۔"

حکیم الامت علامہ اقبال اہلِ سرحد کے جذبۂ حریت اور شاہین مزاجی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان مردانِ کہستان پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے ایک بیان میں فرنگی حکومت کو واضح طور پر خبردار کیا کہ

"مسلمانانِ ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے اتفاق نہیں ہوگا جس کے ماتحت سندھ کو بھی ایک علیحدہ صوبہ قرار نہ دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبے کا ہے۔" (سیاسیاتِ ملی) صـ ۲۲۷

سائمن کمیشن کی آمد پر اپنے ردِ عمل کا اظہار انہوں نے ان واشگاف الفاظ میں کیا:۔

"... رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ، سو یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ ارکانِ کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق ہے ان کی سفارشات سب کمیٹی سے بھی کم ہیں اور وہ (صوبہ سرحد کے لئے) جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض آڑ کا کام دے گی۔"

سائمن کمیشن نے صوبہ سرحد کو "باردو خانہ" قرار دیتے ہوئے یہاں کے رہنے والوں کو سیاسی مراعات دینے سے انکار کیا تھا، علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ کے استعمال پر کمیشن کی خوب خبر لی اور کہا کہ

"پٹھانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ سلگائے محض اس لئے سلب کر دیا گیا ہے کہ وہ

بارود خانے میں رہنا ہے۔ ارکانِ کمیشن کی یہ دلیل کس قدر لطیف کیوں نہ ہو، اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی، ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں خواہ وہ بارود خانے میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں ـــــ پٹھان ایک بہادر اور ذہین قوم کے افراد ہیں، وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں ـــــ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو اُن کو آزادانہ ترقی کے حق سے روکے، ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔"

انہوں نے مزید کہا کہ ـــــ

"حکومتِ ہند نے اپنی یادداشت میں صوبہ سرحد کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے، وہ ناکافی ہیں، بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ تجویز کی گئی ہے لیکن حکومتِ ہند نے بھی اس صوبے کو وہ درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو دیا گیا ہے۔ حالانکہ پٹھان اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری اداروں میں حصہ لیں۔" (اقبال اور سیاساتِ ملی)

سائمن کمیشن کے جاتے ہی کانگرس کی دوعملی کا ایک اور ثبوت دیکھنے میں آیا۔ وہی لوگ جو صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی مراعات دینے کے روادار بھی نہ تھے، خود اپنے لئے "آزادی کامل" کا مطالبہ کرنے لگے۔ مولانا ہاشمی فرید آبادی کے الفاظ میں :-

"اُدھر سائمن کمیشن کی مخالفت میں اُدھم اٹھانے کے باوجود کانگرس والوں کو نظر آیا کہ اُن کا مجوزہ (نہرو رپورٹ والا) آئین مقبول نہ ہو سکا، تب کمیشن کے توڑ پر لاہور کانگرس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں "آزادی کامل" کی قرارداد منظور کی گئی ـــــ آٹھ سال پہلے احمد آباد میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ اجلاسوں میں مولانا حسرت موہانی نے یہی آواز بلند کی تھی، اب پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں یہ منصوبہ منظور ہوا۔ اور خود اُن کے والد کا حکومتِ خود اختیاری کا نقشہ رادی میں ڈبو دیا گیا۔"

اسے اس نئے کانگرسی منصوبے کا ردِ عمل سمجھا جائے یا حسنِ اتفاق کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ تاریخی اجلاس میں حکیم الامت، زعیم مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے وہ خطبۂ صدارت پڑھا جسے داستانِ پاکستان کی بسم اللہ مانا گیا ہے، اپنے اس تاریخی خطبے میں مفکرِ اسلام نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو بھی اپنی تہذیب و روایات کے مطابق ترقی کرنے کی آزادی دی جائے تو وہ ممالک ہند کی آزادی کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، انہوں نے فرمایا۔

"ایسی صورت میں کہ ہندوستان کے ہندوؤں ہی میں پوری یک رنگی نہیں پائی جاتی، یہاں کے دوسرے فرقوں کی (جداگانہ) ہستی تسلیم کئے بغیر فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست نہیں ہو سکتا ـــــ ان حالات میں مسلمانوں کا ایک "اسلامی ہند" کی تشکیل کا مطالبہ قطعی جائز و صحیح ہے ـــــ میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر واحد مستقل مملکت قائم کی جائے جو سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر یا علیحدہ ہو کر (بہر حال) خود مختار ہونی چاہیئے ـــــ اسی متحدہ مملکت کی تعمیر مسلمانوں کا نصب العین ہونا چاہیئے میں شبہ کرنے والوں کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان صرف آزادانہ ترقی چاہتے ہیں جو (کل ہند) وحدانی طرزِ حکومت کے تحت تقریباً غیر ممکن ہے اور "قوم پرست" ہندو سیاست اسی طرزِ حکومت کی شیدا ہے تاکہ سارے ہندوستان پر اس کا مستقل غلبہ برقرار رہے۔"

۱۹۳۰ء کا سال مسلمانانِ صوبہ سرحد کے لئے ایک خونی سال ثابت ہوا۔ سائمن کمیشن کی آمد سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا، لوگ بدستور محرومی اور مایوسی کا شکار رہے۔ ان کے دلوں میں فرنگی کے خلاف نفرت اور غم و غصہ اور بڑھ گیا، دن بدن بے چینی بڑھتی گئی، ولایتی مال کا بائیکاٹ ہونے لگا، شراب کی دکان اور قحبہ خانوں پر پکٹنگ شروع ہو گئی، سارے ملک کی سیاسی فضاء مکدر ہوتی گئی، اُدھر گاندھی جی نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو احمد آباد گجرات میں نمک سازی کر کے قانون کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ترکِ موالات کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ حکومت کے خلاف جلوس نکلنے جانے لگے۔ ۲۰، ۲۱ اپریل کو اسلامیہ کالج میں آزاد مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں ہزاروں لوگوں نے شمولیت کی۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگائے ۲۲، ۲۳ اپریل کی درمیانی شب کو بہت سے قومی کارکن گرفتار کر لئے گئے جو رات کو گرفتار نہ ہو سکے۔ انہیں دن کو پولیس کی حراست میں کابلی تھانہ لے جایا جا رہا تھا کہ ہجوم مشتعل ہو گیا، گورا فوج نے

ناعاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس بے دردی سے گولی چلائی کہ تین سو کے قریب بے گناہ اور نہتے شہری شہید ہو گئے۔ بعد میں پشاور کے نواحی دیہات میں بھی قومی کارکن کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، خان عبدالغفار خان، میاں احمد شاہ، میاں جعفر شاہ اور اُن کے ساتھیوں کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور سارا صوبہ فرنگی استبداد کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

ہندوستان کی اسی سیاسی شورش کے پیشِ نظر حکومت برطانیہ ایک بار پھر سیاسی رہنماؤں سے مذاکرات پر تیار ہو گئی، لندن میں گول میز کانفرنس بلائی گئی۔ مختلف اوقات پر کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے جن میں مسلمانوں کی نمائندگی مولانا محمد علی جوہر، سر آغا خان، علامہ محمد اقبال، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر شاہنواز بھٹو، اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے کی۔ سردار اورنگ زیب خان سیکرٹری کی حیثیت میں صاحبزادہ صاحب کے ساتھ لندن گئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان بڑے زیرک اور مدبر انسان تھے، وہ خود آئینی طریق سے بات چیت کے ذریعے صوبہ سرحد کے لئے مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے لیکن درپردہ قومی کارکنوں کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ سیاسی محاذ پر اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔ کانگرسی زعماء میں سے کئی ایک اعتراف کرتے ہیں کہ صاحبزادہ صاحب کی طرف سے ان کی برابر حوصلہ افزائی ہوتی رہتی، کبھی کبھی خفیہ ملاقاتیں بھی ہوتیں اور وہ ہمیں مفید مشورے دیتے رہتے۔ قومی پیمانے پر تو گول میز کانفرنس زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ کانگرسی رہنما اپنی ضد پر اڑے رہے، انہوں نے مسلمانوں کو درخور اعتنا نہ سمجھا، تاہم یہ بات باعثِ اطمینان رہی کہ مسلمان رہنماؤں نے ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا، انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات کی بنا پر اپنی تجویزیں کانفرنس کے سامنے رکھیں۔ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء میں صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی سیاسی مراعات دینے کا فیصلہ ہو گیا ـــــ صوبہ سرحد میں لیجسلیٹو کونسل کے قیام کی منظوری دے دی گئی اور صوبہ سرحد کو چیف کمشنر کی بجائے گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔

۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن پشاور آئے اور صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر رالف گرفتھ کو گورنر کا عہدہ دیئے جانے کا اعلان کیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو فرانٹیئر لیجسلیٹو کونسل کا پہلا باقاعدہ اجلاس وکٹوریہ میموریل ہال (موجودہ عجائب گھر) پشاور میں منعقد ہوا۔

صوبہ سرحد کی یہ پہلی لیجسلیٹو کونسل چالیس ارکان پر مشتمل تھی جن میں سے ۲۸ منتخب شدہ اور

۱۲ نامزد کردہ ارکان تھے، منتخبہ ممبروں میں سے ۲۲ مسلمان، ۵ ہندو اور ایک سکھ تھا، کونسل میں صرف ایک ہی غیر سرکاری وزیر تھا جو منتقلہ محکموں کا انچارج تھا، یہ وزیر صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان تھے۔ زیدہ کے رئیس خان بہادر عبدالغفور خان کونسل کے سپیکر اور ڈیرہ کے خان بہادر عبدالرحیم خان ڈپٹی سپیکر تھے جب کہ کونسل کے سیکرٹری کے فرائض شیخ عبدالحمید (بعد میں جسٹس) انجام دیتے تھے۔

کونسل کے منتخب ارکان یہ تھے۔

پشاور: خان بہرنجش خان، عبدالغفور خان بیرسٹر، سردار غبدالرب نشتر، ارباب عبدالرحمٰن خان، خان بہادر تاج محمد خان بدرشی، ارباب محمد شریف خان لنڈی، نواب صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان، خان ہدایت اللہ خان عمرزئی، نواب حمید اللہ خان طورو اور خان محمد ایوب خان مروان۔

ہزارہ: خان عبدالقیوم خان سواتی، خان محمد زمان خان، کھلابٹ، خان محمد عباس خان سلطان محمد خان، خان سمند خان۔

کوہاٹ: نواب باز محمد خان ٹیری، پیر حسن گل۔

بنوں: خان حبیب اللہ خان، خان بہادر غلام حیدر خان۔

ڈیرہ: خان عبدالحمید کنڈی، خان عبدالرحیم خان کنڈی، مولوی نور بخش وکیل، ملک خدا بخش ایڈووکیٹ

ہندو: رائے بہادر مہر چند کھنہ پشاور، لالہ کرم چند پشاور، لالہ رچی رام، ڈیرہ، لالہ لدھا رام (بنوں) لالہ ایشر داس ہزارہ سکھ: سردار راجہ سنگھ۔

نامزد ارکان میں نواب اللہ نواز خان (ڈیرہ) خان غلام ربانی خان (ہزارہ) سلطان حسن علی خان ہزارہ ملک الرحمٰن خان کیانی کوہاٹ اور سردار نرنجن سنگھ بیدی پشاور کے نام قابل ذکر ہیں۔

لیجسلیٹو کونسل کے ارکان کا انتخاب ایسے وقت میں عمل میں آیا جب سرخپوشوں کے اکثر کارکن اور رہنما قید خانوں میں تھے، سرخپوش لیڈروں نے الیکشن کے بائیکاٹ کی ہدایات جاری کیں جس پر جگہ جگہ ووٹروں کو ووٹ ڈالنے سے روکا گیا، پبی اور چارسدہ میں زبردست مظاہرے ہوئے اور بمشکل تمام کچھ ووٹر پولنگ سٹیشنوں تک پہنچے، کاٹلنگ مروان، کالو خان اور رستم اور مایار میں

پولیس کو مشتعل ہجوم پر قابو پانے کے لئے گولی چلانی پڑی، تاہم کچھ عرصہ بعد تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور حالات پُرامن ہوتے گئے۔

لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات کے نتیجے میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے محکمہ جات منتقلہ کا حلف اٹھایا۔ صاحبزادہ صاحب بڑے باصلاحیت انسان تھے۔ گول میز کانفرنس میں اُن کی تقریر بڑی مؤثر تھی، انہوں نے اپنے صوبے کو ملک کے دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات دلانے میں بھرپور جدوجہد کی۔ برطانوی پریس نے ان کی لندن کی تقریر کو نمایاں جگہ دی اور ان کے مؤقف کی حمایت میں مقالے لکھے، اپنی سحر آفریں شخصیت اور اپنی قابلیت کی بنا پر وہ ایوان پر چھائے رہے، وزیرِ ہند لارڈ برمنزے میکڈانلڈ نے صاحبزادہ صاحب کو خراج تحسین پیش کیا، وہ صوبہ سرحد کے معمار تھے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے بانی اور منتظم تھے۔ صوبہ سرحد کو ترقی دینے میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُن کے دورِ وزارت میں پشاور میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا۔ مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم پر کام کا آغاز ہوا۔ شریعت ایکٹ منظور ہوا۔ قانون بنایا گیا کہ غیر مسلم اور غیر زراعت پیشہ لوگ زرعی زمینیں نہ خرید پائیں، تعلیمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اُردو کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا، ایسے مدرسوں کی سرکاری امداد بند کر دی گئی جہاں ہندی اور گورمکھی ذریعہ تعلیم تھا۔ اس پر ہندو سکھوں کی جانب سے ان کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے تاہم وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔

بعد میں ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت مزید آئینی مراعات دی گئیں۔ لیجسلیٹو کونسل کو لیجسلیٹو اسمبلی کا درجہ دے دیا گیا، اسمبلی میں نشستوں کی تعداد بڑھا کر پچاس کر دی گئی، نامزدگی کا طریقِ کار ختم کر دیا گیا، اب کے نشستوں کی تفصیل یوں تھی۔

مسلمان ۳۲ ـــــ ہندو ۹ ـــــ سکھ ۳ ـــــ زمیندار ۲

اس وقت صوبہ سرحد میں سُرخپوش یا کانگرس پارٹی زوروں پر تھی، یہی وہ واحد جماعت تھی جس نے اجتماعی طور پر اُمیدوار کھڑے کئے، اس کے برعکس دوسری پارٹیاں محض اسمبلی پارٹیاں تھیں جنہیں کسی عوامی سیاسی جماعت کی حمایت حاصل نہ تھی۔ الیکشن ہوئے اور بڑے زور شور سے ہوئے۔ کامیاب ہونے والے ارکانِ اسمبلی کی ترتیب یوں تھی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی پروگریسو پارٹی

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان ، خان بہادر سعداللہ خان ، خان صاحب عبدالمجید خان نواب زادہ اللہ نواز خان ، خان صاحب اسداللہ خان ، خان عزیزاللہ خان ، نواب باز محمد خان ٹیری خان فیض اللہ خان ، پیر سید جلال گیلانی ، ملک الرحمٰن کیانی ، سردار محمد اورنگ زیب خان ، نوابزادہ محمد سعید خان ، نواب محمد ظفر خان ، خان نصراللہ خان اور میاں ضیاء الدین ۔

کانگرس ڈاکٹر خان صاحب ، خان عبداللہ خان ، خان عبدالعزیز خان ، ارباب عبدالغفور خان ، ارباب عبدالرحمٰن خان ، خان اکبر علی خان ، قاضی عطاء اللہ خان ، خان امیر محمد خان لالہ بھنجو رام گاندھی ، ایم ۔ فقیر اخان ، ڈاکٹر سی ۔ سی گھوش ، لالہ حکم چند ، میاں جعفر شاہ ، لالہ جمنا داس ، خان محمد افضل خان ، پیر محمد کامران ، خان محمد زمان خان ، خان زرین خان ۔

ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی رائے بہادر مہر چند کھنہ ، سردار اجیت سنگھ ، رائے بہادر لالہ جمن لال ، رائے بہادر ایشر داس ، سردار جگت سنگھ نارنگ ، رائے صاحب لالہ کنور بھان بگائی ، رائے صاحب پرمانند ، رائے بہادر لالہ رمجی رام ۔

ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی خان محمد سرور خان ، خان صاحب راجہ عبدالرحمٰن خان ، خان محمد عباس خان ، خان صاحب عطائی خان ۔

انڈی پنڈنٹ ملک خدا بخش خان ، خان پیر بخش خان ۔ سردار عبدالرب نشتر ۔

ظاہر ہے کہ جہاں صاحبزادہ گروپ نے ۱۶ مسلمان نشستوں پہ کامیابی حاصل کی وہیں کانگرس ٹکٹ پہ کامیاب ہونے والے مسلمانوں کی تعداد پندرہ تھی ، دونوں پارٹیوں میں سخت مقابلہ تھا ۔ وہی جماعت کامیاب ہو سکتی تھی جو دوسرے گروپوں کو بھی ساتھ ملا لے صاحبزادہ صاحب البتہ مشاق سیاست دان تھے ۔ انہوں نے رائے بہادر مہر چند کھنہ کو (جو اس سے قبل ہندی گورمکھی سرکلر کی وجہ سے ان کا بدترین مخالف تھا) وزارت کی پیش کش کر کے اور ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے محمد سرور خان کو ڈپٹی سپیکر کا عہدہ دے کر ساتھ ملا لیا اور اس طرح پہلی سرحد اسمبلی کے انتخاب کے بعد کابینہ یوں بنی کہ

وزیرِ اعلیٰ ——— صاحبزادہ عبدالقیوم خان
وزیرِ مالیات ——— رائے بہادر مہر چند کھنہ
وزیرِ تعلیم ——— خان بہادر سعد اللہ خان
سپیکر ——— ملک خدا بخش خان
ڈپٹی سپیکر ——— محمد سرور خان طاہر خیلی

مارچ ۱۹۳۷ء کے آخر میں اس پہلی سرحدی وزارت نے کام شروع کر دیا تاہم اسے روزِ اوّل ہی سے کانگرس کی مخالفت کا سامنا رہا، ہندو سکھ ارکان بظاہر تو صاحبزادہ وزارت میں شریک تھے لیکن درپردہ ان کی ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ تھیں۔ ایک طرف سارے ہندوستان کے سیاسی دماغ اور وسائل تھے۔ دوسری طرف صاحبزادہ صاحب کسی بھی جماعت سے وابستہ نہ تھے، آل انڈیا کانگرس نے فوراً مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صوبہ سرحد بھیجا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے زیرِ اثر ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی صاحبزادہ کا ساتھ چھوڑ کر ڈاکٹر خان کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی۔ اُدھر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی کے دو ارکان کو توڑ لیا۔ چنانچہ ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو جب ڈاکٹر خان صاحب کی جانب سے صاحبزادہ وزارت کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کی تو وہ ۲۲ کے مقابلے میں ۲۷ ووٹوں سے کامیاب ہو گئی، صوبے کی اس پہلی کانگرسی وزارت میں وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب تھے، وزیرِ تعلیم قاضی عطاء اللہ، وزیرِ مالیات دیوان بھجو رام گاندھی اور وزیرِ جنگلات خان محمد عباس خان۔ کانگرس کی یہ وزارت کوئی دو سال تک برسرِ اقتدار رہی ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ کانگرس نے انگریز سے عدمِ تعاون کا فیصلہ کیا تو سبھی صوبوں کی کانگرسی وزارتوں نے استعفےٰ دے دیئے۔

سول نافرمانی کی تحریک کی وجہ سے بہت سے کانگرسی ارکانِ اسمبلی جیلوں کو چلے گئے تو اُن کی جماعتی اکثریت متاثر ہوئی، اس پر مسلم لیگ چند دوسرے ممبروں کو ساتھ ملا کر صوبہ سرحد میں اپنی وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی، ۲۵ مئی ۱۹۴۲ء کو سردار محمد اورنگ زیب کی مسلم لیگی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ اس کابینہ میں سردار عبدالرب نشتر، خان ثمین جان خان اور سردار اجیت سنگھ شامل تھے، نشتر اس سے قبل انڈی پنڈنٹ تھے تاہم مسلم لیگ کی صفوں میں آئے تو

اپنی قابلیت، خلوص اور مقناطیسی شخصیت کی بناء پر پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کے منصب تک پہنچے اور قائداعظم ہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ وہ ہندوستان کی عبوری حکومت اور پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر بھی رہے۔

مسلم لیگ کی یہ وزارت ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء تک کام کرتی رہی۔ جنگ ختم ہوئی تو کانگرسی ارکان اسمبلی جیلوں سے باہر آ گئے اور ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں کانگرسی وزارت دوبارہ برسراقتدار آ گئی۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں سو فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبوں میں بھی ۵۰۷ میں سے ۴۲۷ نشستیں مسلم لیگ کو ملیں۔ تاہم صوبہ سرحد میں یہ حال رہا کہ سرحد اسمبلی کی ۳۸ مسلمان نشستوں میں سے ۱۷ پر کانگرسی امیدوار کامیاب ہوئے۔ جب کہ ۱۶ نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ دو امیدواروں کا تعلق جمعیت العلماء سے تھا۔ جبکہ باقی لوگ آزاد ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے وقت صوبہ سرحد میں کانگرس وزارت ہی برسراقتدار تھی، لیکن غیر مسلم ارکانِ اسمبلی کے انخلاء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ ڈاکٹر خان عبدالقیوم خان کی سربراہی میں مسلم لیگی وزارت نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔

خدائی خدمت گار تحریک

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مجلس خلافت ہی ملک کی وہ پہلی عوامی جماعت تھی جس نے کروڑوں دلوں میں اسلام دوستی اور حُبّ الوطنی کا جذبہ پیدا کیا اور فرنگی استعمار کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بخشا، محمد علی جوہر، جن کی انگریزی تحریر اور جن کی دماغی صلاحیتوں کے دشمن بھی معترف تھے، سیاست میں آئے تو ایک درویش خدامست اور ایک متشرع مبلغ اسلام کے رُوپ میں آئے، ان کی فیضان تربیت سے نوجوان نسل بڑی متاثر ہوئی۔ آگے چل کر یہی نوجوان مشہور قومی رہنما بنے — انہی نوجوانوں میں صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خان بھی ہیں۔ جن کی جماعت "خدائی خدمت گار" نے صوبہ سرحد کے عوام کو بیدار کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔

عبدالغفار خان جنوری ۱۸۹۰ء میں چارسدہ تحصیل کے قصبہ اُتمان زئی میں محمد زئی قبیلے کے ایک آسودہ حال زمیندار خان بہرام خان کے ہاں پیدا ہوئے، اُن کا خانوادہ افغانستان سے، جہاں درّانی حکمرانوں نے اُن کے پردادا عبدالشہید خان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا۔ نقلِ مکانی کر کے یہاں آیا تھا۔ بہرام خان ایک مدبر اور روشن خیال انسان تھے، انہوں نے اپنے بیٹوں عبدالجبار خان (ڈاکٹر خان صاحب) اور عبدالغفار خان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی اور عام خانزادوں کے برعکس انہیں انگریزی تعلیم پانے کے لیے پشاور کے ایڈورڈز مشن ہائی سکول میں داخل کرایا۔ بڑے بھائی عبدالجبار خان میٹرک پاس کر لینے کے بعد پہلے بمبئی اور پھر انگلستان گئے اور ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر کے لوٹے، انہوں نے فوج میں خدمات انجام دیں اور کیپٹن کا عہدہ پایا۔ تاہم چھوٹے بھائی میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ایک بار انہیں فوج میں بھرتی ہونے کا خیال آیا۔ لیکن وہاں یہ دیکھ کر کہ ایک نوعمر انگریز افسر دوسرے دیسی افسر سے گستاخی سے پیش آ رہا تھا۔ انہوں نے

یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اُن کے سوانح نگار مسٹر لوئس کا کہنا ہے کہ وہ کچھ عرصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی زیرِ تعلیم رہے لیکن والد چونکہ انہیں مزید تعلیم کے لئے انگلستان بھجوانا چاہتے تھے اس لئے واپس گاؤں بُلا لیا۔ انگلستان روانہ ہونے کو تیار تھے لیکن ماں کی ممتا آڑے آئی — ایک بیٹا تو پہلے ہی پردیس جا چکا تھا۔ دوسرے کی جُدائی وہ کیسے برداشت کرتیں۔ والدہ کے آنسوؤں نے نوجوان عبدالغفار خان کو ولایت جانے سے روک لیا۔ قُدرت کو یہی منظور تھا کہ پڑھ لکھ کر کوئی سرکاری ملازمت کرنے کی بجائے یہ نوجوان اپنے اہلِ وطن کے دلوں پر حکومت کرے، خوش قسمتی سے عبدالغفار خان کو اپنی زندگی کا نصب العین متعین کرنے میں دیر نہ لگی اور حاجی صاحب ترنگ زئی کی رفاقت نے انہیں صحیح راہ پر ڈال دیا۔ مرحوم عبدالخالق خلیق (جو تحریک آزادی کے ایک ممتاز کارکن اور جاننے پہچاننے دانش ور تھے) کے بقول یہ حاجی فضل واحد ترنگ زئی ہی تھے جنہوں نے صوبہ سرحد میں سب سے پہلے سیاسی میدان میں قدم رکھا وہ نہ صرف مذہبی پیشوا تھے بلکہ آزادئ وطن کے شیدائی بھی، حاجی صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تعلیم کے بغیر عوام میں بیداری کا جذبہ پیدا ہونا ناممکن ہے اس لئے انہوں نے جگہ جگہ دینی مدرسے قائم کئے۔ حاجی صاحب کی رفاقت مولانا عبدالعزیز سے تھی، جن کے پاس نوجوان عبدالغفار خان کا اکثر اٹھنا بیٹھنا تھا، چنانچہ وہ بھی ان دونوں حضرات کا ہاتھ بٹانے لگے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی فروغِ تعلیم کی ان کوششوں کی وجہ سے اتنے مقبول ہوئے کہ جب دارالعلوم اسلامیہ (اسلامیہ کالج) پشاور کے سنگِ بنیاد رکھنے کی نوبت آئی تو سب کی نظرِ انتخاب اُنہی پر پڑی تاہم چونکہ وہ تعلیم کے زیادہ حامی نہ تھے، اس لئے طے پایا کہ سب سے پہلے دارالعلوم کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا جائے۔ اس تقریب میں صوبے کے سبھی انگریز افسر موجود تھے۔ انہیں حاجی صاحب کی یہ ہر دلعزیزی کہاں بھاتی تھی، چنانچہ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حاجی صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے — تاہم حاجی صاحب وارنٹ ملنے سے پہلے ہی راتوں رات ترنگ زئی کو چھوڑ کر آزاد مہمند کی طرف کوچ کر گئے جب تک زندہ رہے انگریزی استعمار کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔

حاجی صاحب کے جانے کے بعد دینی مدرسوں کی دیکھ بھال کا کام عبدالغفار خان نے

سنبھال لیا۔ یہ ۱۹۱۴ء کا سال تھا۔ اس سے قبل ۱۹۱۲ء میں خان عبدالغفار خان رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو چکے تھے، اس شادی سے اُن کے ہاں ۱۹۱۳ء میں عبدالغنی خان اور دسمبر ۱۹۱۵ء میں عبدالولی خان پیدا ہوئے ـــــ پہلی بیگم کے انتقال پر ۱۹۲۰ء میں انہوں نے دُوسری شادی کی۔ جس سے اللہ نے انہیں عبدالعلی خان اور ایک صاحبزادی عطا کیں۔

خان عبدالغفار خان شروع ہی سے انقلابی نظریات کے حامل تھے، انہیں غلامی سے سخت نفرت تھی اور وہ آزادیٔ وطن کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے، وہ مولانا محمد علی جوہر حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا کفایت اللہ خان، اور مولانا احمد سعید سے بے حد متاثر تھے، ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی اور ملک بھر میں رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا تو عبدالغفار خان بھی اس میں حصّہ لینے لگے، ایک بار انہوں نے علاقے کے تمام سرکردہ افراد کا ایک اجلاس اتمان زئی میں بُلایا اور فرنگی سامراج کے خلاف انتہائی جوشیلی تقریر کی۔ دوسرے دن گورا فوج نے سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور توپیں سیدھی کر لیں، اُتمان زئی کے محمد عباس خان، حاجی شاہنواز خان اور حاجی عبدالغفار کو گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم خان عبدالغفار خان فوج کے ہاتھ نہ لگ سکے کیونکہ وہ ایک قریبی گاؤں محمد ناڑی گئے ہوئے تھے، اس پر حکومت نے ان کے والد بہرام خان کو گرفتار کر لیا اور بتا دیا کہ جب تک عبدالغفار خان ہاتھ نہیں آئیں گے ان کے والد کو نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہ خبر عبدالغفار خان کو ملی تو وہ فوراً واپس آئے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا، اُنہیں نو ماہ قید کی سزا سنائی گئی ـــــ قید کاٹ کر وہ جیل سے باہر آئے تو ہجرت کی تحریک زوروں پر تھی، سارے ملک سے قافلے آتے، پشاور آکر ٹھہرتے اور کابل روانہ ہو جاتے، عبدالغفار خان، محمد اکبر خادم اور اُن کے بھائی بند علاقہ مہمند کی راہ عازمِ ہجرت ہوئے لیکن وہاں گئے ہوئے مہاجروں کی ابتر حالت دیکھ کر جلد واپس آ گئے۔

افغانستان سے واپسی کے بعد عبدالغفار خان نے اپنی تمام تر کوششیں اصلاحِ معاشرہ کے لئے وقف کر دیں۔ انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ ہندو سکھ تو تعلیم، تجارت اور سرکاری ملازمتوں پر چھائے ہوئے تھے لیکن مسلمان آپس ہی کے پیچیدہ جنبہ اور فضول رسم و رواج میں وقت ضائع کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے "مسلمان سے سَودا خریدو" کی مُہم شروع کی اور اپنے لوگوں کو تجارت کی

تزغیب دینے کے لئے خود اتمان زئی میں آرائشت کی دکان کھولی، فضول رسوم کے خاتمے اور مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے بعد میں انہوں نے میاں احمد شاہ بیرسٹر ایٹ لاء اور محمد اکبر خان خادم کے ساتھ مل کر ایک سماجی جماعت "انجمن اصلاح افاغنہ" کے نام سے شروع کی، یہ رہنما ایک ایک گاؤں جاتے اور لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے، وہ لوگوں کو سادہ زندگی گزارنے اور فضولیات سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔ اصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انجمن اصلاح افاغنہ نے فروغ تعلیم کی طرف بھی توجہ دی اور جامعہ ملیہ دہلی کی طرز پر آزاد مدرسے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ علاقہ کے سرکردہ خوانین نے اس مقصد کے لئے دل کھول کر مالی امداد دی، چنانچہ خان بہادر رحمت اللہ خان کی عطا کردہ عمارت میں پہلے آزاد مدرسہ کا اجراء ہوا۔ بعد میں بھانہ ماڑی پشاور میں "رفیع العلوم" کے نام سے بھی تعلیمی اداروں نے کام شروع کر دیا۔ "انجمن اصلاح افاغنہ" کے ارکان ہر معاشرتی تقریب میں شامل ہوتے اور لوگوں کو غیر اسلامی رسوم سے روکتے۔ وہ علاقے کے ایک ایک حجرے میں جاتے اور لوگوں کو بیداری کا پیغام دیتے ـــــ انجمن کی سرگرمیاں بڑھیں تو انگریز کا ماتھا ٹھنکا، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں سر جان میفی، چیف کمشنر صوبہ سرحد نے انجمن کے ارکان کو اپنی سرگرمیوں سے باز رہنے کی ہدایت کی۔

آزاد مدرسہ اتمان زئی کے ہیڈ ماسٹر بنوں کے ایک سرگرم نوجوان مقصود جان خان تھے اور اساتذہ دینیات برسے گڑھی کے مولانا شاہ رسول۔ ان لوگوں نے مسلمان بچوں میں قومی اور دینی جذبہ بیدار کرنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔

اس دوران خان عبدالغفار خان نے پشاور کی خلافت کمیٹی کے صدر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں، یہ وہ دور تھا جب مجلس خلافت نے انگریز سے عدم تعاون کی تحریک شروع کر رکھی تھی، بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا اور انگریزی حکومت کے دیئے ہوئے خطابات واپس کئے جا رہے تھے۔ صوبہ سرحد میں سب سے پہلے جس شخص نے خطاب واپس کیا، وہ زیارت کاکا صاحب کے میاں حمید گل تھے۔ لوگوں نے اُن کی بڑی قدر و منزلت کی اور انہیں "فخر قوم" کا لقب دیا۔ اسی تحریک عدم تعاون کے دوران عبدالغفار خان بھی گرفتار ہوئے اور انہیں میانوالی جیل میں رکھا گیا۔ جہاں قیدیوں پر انتہائی سختی برتی جاتی تھی۔

۱۹۲۴ء میں وہ جیل سے نکلے تو لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ اُتمان زئی میں، جو بعد میں صوبہ سرحد میں سیاسی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ ایک شاندار اجتماع منعقد ہوا جس میں عبدالغفار خان کو "فخرِ افغان" کا لقب دیا گیا۔ فخرِ افغان اور اُن کے ساتھیوں نے اصلاحی اور معاشرتی سرگرمیاں جاری رکھیں، جگہ جگہ آزاد مدرسے جاری کئے اور لوگوں میں ذہنی بیداری پھیلانے کی سرگرم کوشش کی۔

۱۹۲۶ء میں عبدالغفار خان نے اپنی بیگم اور ہمشیرہ کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، حج سے فراغت کے بعد انہوں نے اسلامی ملکوں کی سیاحت بھی کی، وہ بیت المقدس بھی گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہر جگہ مسلمان فرنگی کے پنجۂ استبداد میں گرفتار تھا اور مغرب کی استعماری قوتیں ہر جگہ اپنی بالادستی قائم کئے ہوئے تھیں ـــــ چنانچہ انہوں نے فرنگی سامراج سے رہائی پانے کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں اور معاشرتی اصلاح کے پروگرام کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

۱۹۲۷ء میں وطن واپس آکر انہوں نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے "پختون جرگہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور ایک پشتو رسالہ "پختون" بھی جاری کیا اور انگریز کی غلامی سے نجات پانے کی تحریک تیز تر کر دی۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں "انجمن اصلاح افاغنہ" کا سالانہ جلسہ اتمان زئی میں بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ دُور دُور سے لوگوں نے اس میں شرکت کی، اس موقع پر قومی نظمیں پڑھی گئیں اور ایک اصلاحی ڈرامہ بھی سٹیج کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں بھی اس انجمن کے قیام کی سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی گئی۔ مشاعرہ ہوا جس میں بڑی جوشیلی نظمیں پڑھی گئیں۔ تقریروں میں عوام کے جذبۂ حریت کو بیدار کیا گیا اور ایک قومی ڈرامہ سٹیج کیا گیا۔

اس دوران خان عبدالغفار خان برِصغیر کی سیاست سے بھی منسلک رہے، انہوں نے کلکتہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کے سالانہ جلسوں میں شرکت کی اور مجلسِ خلافت سے بھی دلچسپی لیتے رہے ان کی اپنی جماعت کی سرگرمیاں اس وقت تک صوبہ سرحد ہی تک محدود تھیں، اس لئے وہ ان جلسوں میں شرکت کرتے تو اپنی ذاتی حیثیت سے کرتے یا مجلسِ خلافت کے رہنما کے طور پر ـــــ

کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجتماعات میں انہیں نوجوان رضاکاروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے انہوں نے صوبہ سرحد کے نوجوان کو منظم کرنے کی طرف بھی توجہ دی، اس مقصد کے لئے یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو صوبہ سرحد کے نوجوانوں کا ایک اجتماع اتمان زئی میں منعقد ہوا۔ فخر افغان خان عبدالغفار خان نے مندوبین کا خیر مقدم کیا اور میاں احمد شاہ بیرسٹر چارسدہ نے "نوجوان جرگہ" کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ محمد رمضان خان وکیل (ڈیرہ) کی تجویز پر ایک آٹھ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام مختلف مقامات پر تنظیم کی شاخیں قائم کرنا تھا۔ اس اجتماع میں نوجوانوں سے کہا گیا کہ متحد ہو کر آزادی وطن کی کوششوں میں حصہ لیں، جرگہ کا صدر دفتر اتمان زئی قرار پایا اور زبان پشتو۔ اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ جرگہ کے ارکان پُرامن ذرائع سے آزادی کے حصول کی جدوجہد میں حصہ لیں گے۔

بقول عبدالخالق خلیق مرحوم اس اجتماع کے شرکاء میں مقصود جان خان وکیل بنوں، پیر گوہر علی شاہ کوہاٹ، عبدالرحمٰن خان وکیل ڈیرہ، علی اصغر خان مانسہرہ، قاضی عطاءاللہ خان مردان، امیر ممتاز خان بنوں، میاں قائم شاہ وکیل چارسدہ، عبدالاکبر خان عمر زئی، میاں عبداللہ شاہ قاضی خیل، شیر محمد خان رجڑ، عبدالقدوس خان رجڑ، محمد عالم خان گنڈہ پور، ڈیرہ، نوشیروان خان وکیل رجڑ، غلام صدیق خان وکیل بدرشی، شیر بہادر خان وکیل بدرشی اور محمد اسلم خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اجلاس میں کثرت رائے سے نوجوان جرگہ کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا اور عبدالاکبر خان صدر، میاں احمد شاہ بیرسٹر جنرل سیکرٹری اور میاں عبداللہ شاہ خزانچی چُنے گئے۔

اس واقعہ کے بعد خان عبدالغفار خان اور اُن کے کچھ ساتھیوں نے لاہور میں ہونے والے کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی تو وہ والنٹیروں کی تنظیم سے بہت متاثر ہوئے اجلاس سے واپسی پر طے پایا کہ انجمن اصلاح افاغنہ کے تحت رضاکاروں کا ایک دستہ قائم کیا جائے، فیصلہ ہوا کہ یہ رضاکار کھدر کی نسواری رنگ کی وردی پہنیں گے۔ میاں احمد شاہ کی تجویز پر رضاکاروں کو "خدائی خدمت گار" کا نام دیا گیا۔ تاہم بعد میں وہ اس وردی کی مناسبت سے "سرخپوش" کہلانے لگے۔ ابتداء میں سرفراز خان، اکبر خان اور حجاب گل کو رضاکاروں کا سالار مقرر کیا گیا۔

خان عبدالغفار خان اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، محمد اکبر خان خادم، میاں عبداللہ شاہ اور میاں جعفر شاہ جیسے مخلص ساتھی ملے جنہوں نے دن رات

ایک کر کے سارے علاقے میں خدائی خدمت گار تحریک کو فروغ دیا۔ لوگ دھڑا دھڑ اس میں شامل ہوتے گئے۔ ہر خدائی خدمت گار کو ایک عہد نامہ پُر کرنا ہوتا تھا اور دس اصولوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی جن میں سے قابلِ ذکر اصول یہ تھے۔

۱۔ خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی عبادت ہے لہٰذا میں خلقِ خدا کی خدمت بغیر کسی غرض کے خدا واسطے کروں گا۔

۲۔ میں تشدد نہیں کروں گا، نہ کسی سے بدلہ لوں گا۔

۳۔ خانہ جنگی اور گروہ بندی سے دور رہوں گا۔ ہر پختون کو اپنا بھائی سمجھوں گا، فضول رسم و رواج چھوڑ دوں گا، سادگی اور نیکی پر کاربند رہوں گا۔ اور بے کار وقت نہ گنواؤں گا۔

۱۹، ۲۰، اپریل ۱۹۳۰ء کو اُتمان زئی کے آزاد مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا، ہر طرف خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے، لوگ دور و نزدیک سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے، پہلی مرتبہ سینکڑوں باوردی رضاکار بھی اس میں شامل تھے۔ رات کو ایک پشتو مشاعرہ ہوا جس میں قومی نظمیں پڑھ کر شاعروں نے لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔ خان عبدالغفار خان (بادشاہ خان) نے آزادیٔ وطن کے موضوع پر پُرجوش تقریر کی، ایک ڈرامہ بھی پیش کیا گیا۔ اسی سٹیج سے مشہور قومی کارکن مولانا خان میر ہلالی نے اعلان کیا کہ پشاور شہر کی کانگرس کمیٹی ۲۳ اپریل کو سول نافرمانی کی مہم کے سلسلے میں ایک زبردست مظاہرہ کرے گی۔

یہی وہ دن تھے جب گاندھی جی نمک سازی کر کے حکومتِ وقت کا قانون توڑ رہے تھے۔ اسی سلسلے میں چند دن پہلے شاہی باغ پشاور میں خان علی گل خان کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ پیتی سے شورہ منگا کر نمک بنایا گیا، اس نمک کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں بنا کر سو سو دو دو روپے میں نیلام ہوئیں۔ دوسرے دن حکومت نے شہر کے اکثر قومی کارکنوں کو گرفتار کر لیا، جو کارکن گرفتار نہ ہو سکے تھے انہیں ۲۳ اپریل کو گرفتار کیا گیا، ان کارکنوں کو تھانہ کابلی لے جایا جا رہا تھا کہ لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا، جنہیں منتشر کرنے کے لئے گورا فوج نے گولی چلا دی، سینکڑوں لوگ جان سے گئے اور ہر طرف پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی (تفصیل پہلے بتائی جا چکی ہے)

پشاور میں نہتے عوام پر فائرنگ کے سانحہ کی خبر عبدالغفار خان کو پہنچی تو وہ اپنے ساتھیوں، میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، سرفراز خان، شاہنواز خان وغیرہ کے ہمراہ اُتمان زئی سے عازمِ پشاور

ہو گئے۔ لیکن راستے میں تھی تھانہ کے قریب پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ پشاور میں تو پہلے ہی بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے، انگریز نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کو رسالپور لے جایا جائے ـــــ رسالپور میں اُن سے ضمانت طلب کی گئی، گرفتار شدگان نے ضمانت دینے سے انکار کیا جس پر انہیں تین تین سال قید بامشقت کی سزا سنا کر مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا، عبدالغفار خان کو گجرات سپیشل جیل میں بھیجا گیا۔ جہاں اتفاق سے اُن دنوں پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا آزاد۔ ڈاکٹر انصاری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور پنڈت پنت کو بھی رکھا گیا تھا۔ انہی لوگوں کی قربت اور ترغیب سے بعد میں خان عبدالغفار خان نے خدائی خدمت گار تحریک کا کانگرس سے انضمام منظور کر لیا۔

فرنگی حکومت نے خان عبدالغفار خان اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے بڑی حماقت کا ثبوت دیا۔ اگر ان رہنماؤں کو گرفتار نہ کیا جاتا تو سول نافرمانی کی تحریک صرف پشاور شہر تک محدود رہتی لیکن خدائی خدمت گاروں کے اکابر کو گرفتار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریکِ آزادی دیہات میں بھی پھیل گئی، ہر جگہ لوگ دھڑا دھڑ گرفتاریاں دینے لگے، حکومت کی طرف سے جس قدر تشدد کا مظاہرہ ہوا اور جتنی سختی سے کام لیا گیا، تحریک اور زور پکڑتی گئی ـــــ خدائی خدمت گاروں کی تعداد دو سو سے بڑھتے بڑھتے ہزاروں تک پہنچ گئی، ہر شخص سُرخ وردی پہن کر "انقلاب زندہ باد" اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتا میدان میں کود پڑا ـــــ صوبہ سرحد کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب سیاسی تحریک دور دراز کے دیہات اور قبائلی علاقہ تک پھیل گئی۔ کئی جگہ گولی چلی۔ ہزاروں لوگوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا، اُن پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے۔ لیکن تحریکِ آزادی کو دبایا نہ جا سکا برطانوی حکومت نے صوبہ سرحد کے چیف کمشنر بولٹن کو اس حماقت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اُسے پشاور سے واپس بُلا لیا ـــــ ۱۹۳۰ء کی اس آزمائش میں سُرخ رُو ہو کر سُرخپوش تحریک صوبہ سرحد کی سب سے منظم اور سب سے بڑی عوامی تحریک بن گئی۔ تاہم عبدالخالق خلیق مرحوم کے اعتراف کے مطابق اس تحریک کا دائرہ کار صرف پشتو بولنے والے علاقوں تک محدود رہا۔ دوسرے لوگوں نے اس کا اتنا اثر قبول نہ کیا۔

۱۹۳۰ء میں حکومت کے خلاف مظاہروں نے اتنا زور پکڑا کہ پشاور شہر کو فوج نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ بار بار کرفیو نافذ کیا گیا ـــــ مئی ۱۹۳۰ء میں سُرخ پوش تحریک کو خلافِ قانون قرار دے

دیا گیا ـــــ اس قدر گرفتاریاں عمل میں آئیں کہ جیل خانوں میں جگہ نہ رہی۔

تاہم جب ۴ر مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ ارون میں سمجھوتہ طے پا گیا تو اکثر سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا، اسی معاہدے کے تحت بادشاہ خان اور اُن کے ساتھی بھی جیلوں سے باہر نکلے، کچھ عرصہ بعد کراچی میں کانگرس کا سالانہ جلسہ ہوا تو بادشاہ خان نے ستر اسّی خدائی خدمت گاروں کے ہمراہ اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر انہیں کانگرسی رہنماؤں سے مذاکرات کا بھی وقت ملا۔ گجرات جیل کے قیام کے دوران وہ کانگرسی لیڈروں کا اثر قبول کر چکے تھے۔ کانگرس کے سالانہ اجلاس کے بعد اُن کا جھکاؤ کانگرس کی طرف بڑھتا گیا۔ ۹ر اگست ۱۹۳۱ء انہوں نے خدائی خدمت گار تحریک کو آل انڈیا نیشنل کانگرس میں مدغم کرنے کا اعلان کر دیا، بمبئی کے اس معاہدے کی رُو سے طے پایا کہ افغان جرگہ آئندہ سے فرانٹیئر کانگرس کمیٹی کہلائے گا۔ خدائی خدمت گاروں کو کانگرس کے رضا کار تصوّر کیا جائے گا اور جرگہ کے دفتروں پر کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرایا جائے گا۔

کانگرس اور خدائی خدمت گاروں کے اس انضمام کو بہت سے کارکنوں نے پسند نہ کیا، کئی ایک نے یہ تجویز پیش کی کہ شہروں کے افغان جرگہ کو کانگرس کا نام دیا جائے لیکن دیہات کے جرگوں کو بدستور افغان جرگہ ہی کہا جائے۔ عبدالغفار خان کے تعلیم یافتہ ساتھیوں کی اکثریت اس انضمام کے خلاف تھی چنانچہ میاں احمد شاہ بیرسٹر، خان عبدالاکبر خان اور دوسرے کئی کارکن اُن سے اختلافِ رائے کی وجہ سے الگ ہو گئے۔

اُدھر پشاور شہر کے کانگرسیوں نے اس امر پر شدید احتجاج کیا کہ دیہات کے سرخپوش "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے اور اپنے آپ کو ایک دینی جماعت کے رکن تصوّر کرتے ہیں جب کہ کانگرس لامذہبیت پر یقین رکھتی ہے، صوبے کے پرانے کانگرسی عبدالغفار خان کی نئی قیادت کو قبول کرنے سے ہچکچاتے تھے، بالآخر پشاور کانگرس کمیٹی کے اس اعتراض پر بادشاہ خان نے اپنا دفتر اتمان زئی تبدیل کر لیا۔ سرحدی کانگرس کے نئے انتخاب کرائے۔ چنانچہ پیر شہنشاہ کو جرگے کا صدر اور سعداللہ خان کو جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔

اس کے برعکس کئی قومی کارکن ایسے بھی تھے جنہوں نے خدائی خدمت گار تحریک اور کانگرس سے انضمام کا دلی خیر مقدم کیا اور خان عبدالغفار خان کی قیادت پر اطمینان کا اظہار کیا، یہاں تک کہ

صوبہ سرحد کے ایک دیرینہ اخبار نویس پنڈت امیر چند بمبوال نے خان عبدالغفار خان کو "سرحدی گاندھی" کا لقب دیا اور وہ ہندوستان میں اسی لقب سے مشہور ہوئے۔

کانگرس سے ادغام کے بعد سرخپوش تحریک کو اور تقویت ملی، اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر گاؤں اور ہر قصبے میں جلسے ہونے لگے، جرگے قائم ہوئے جو عدالتوں کے طور جھگڑے نمٹانے لگے۔ چمکنی، پبی اور اُڈمڑ میں مظاہرے ہوئے، اکوڑہ خٹک میں جلسہ ہوا — اس پر پہلے تو حکومت نے یہ پابندی لگائی کہ جی۔ ٹی روڈ کے اردگرد چار چار میل تک جلسوں کا انعقاد ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس پر بھی تحریک کی رفتار مدھم نہ پڑی تو ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو سرخپوش تحریک کے خلاف قانون قرار دے دیا گیا، پارٹی کے فنڈز ضبط کر لئے گئے، خان عبدالغفار خان اور چار دوسرے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر کے صوبے سے باہر بھیج دیا گیا۔ فوج میدانِ عمل میں آگئی اور خلاف ورزی کرنے والوں کو گرفتار کرنے لگی۔ چند ہی دنوں میں حالات بہتر ہوئے تو ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو پشاور شہر سے فوج ہٹالی گئی، اسی افراتفری کی آڑ میں انگریز نے آفریدیوں کے ایک علاقے کھجوری میدان پر قبضہ جمالیا، وہاں سڑکیں اور فوجی چوکیاں تعمیر کی گئیں۔ آفریدیوں کے احتجاج کے باوجود یہ علاقہ انہیں واپس نہ کیا گیا۔

بعض لوگوں کی نظر میں صوبہ سرحد میں اس بڑھتی ہوئی بے چینی کی بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کی اصلاحات سے محرومی تھی، ۱۹۳۲ء میں یہ عالم تھا کہ ایک اندازے کے مطابق صرف ہری پور سنٹرل جیل میں چھ ہزار کے قریب سیاسی قیدی تھے، حکومت اتنی عاجز آگئی تھی کہ اتنی زیادہ تعداد کو راشن اور کمبل مہیا کرنا اس کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔

آخر مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کے لئے برطانوی حکومت کی جانب سے رائے عامہ کے مختلف طبقوں کے نمائندوں کی گول میز کانفرنس لندن میں بلائی گئی، کانفرنس میں صوبہ سرحد کی نمائندگی صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے کی، ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء تک کانفرنس مختلف امور پر غور کرتی رہی، مختلف امور پر سوچ بچار کے لئے کانفرنس نے ۹ سب کمیٹیاں قائم کیں جن میں سے ایک کمیٹی کا کام صرف صوبہ سرحد کو آئینی مراعات دینے کے بارے میں تھا۔ آرتھر ہینڈرسن اس کمیٹی کے سربراہ تھے، اس وقت صوبہ سرحد کے پانچ اضلاع کی آبادی کوئی چوبیس لاکھ تھی جس میں

صرف ڈیڑھ لاکھ تھے، ہندو سکھ تھے۔ ان لوگوں کی طرف سے صوبہ سرحد کو آئینی مراعات دیئے جانے کی مسلسل مخالفت کی جاتی، ہندوستان کا ہندو پریس بھی آئے دن یہی پروپیگنڈہ کرتا کہ اہلِ سرحد کو اصلاحات دینا خطرناک ہوگا اور ایسا کرنے سے ہندو سکھوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

بہرحال کافی غور و خوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کی جائیں اور ایک لیجسلیٹو کونسل قائم کی جائے جس کے ۲۸ راراکین منتخب ہوں اور ۱۲ رنامزد کردہ۔

کانگرس اور سرخپوشوں کی طرف سے گول میز کانفرنس کے فیصلوں کا بائیکاٹ کیا گیا چنانچہ جب کونسل کے انتخابات کے لئے پولنگ کے دن آئے تو سرخپوشوں نے لوگوں کو ووٹ ڈالنے سے روکنے کی کوشش کی، پولنگ سٹیشنوں کا گھیراؤ کر لیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع مردان کے کئی مقامات پر پولیس کو گولی تک چلانا پڑی۔

۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تو صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات دے دی گئیں اور لیجسلیٹو اسمبلی کے ارکان کی تعداد بڑھا کر پچاس کر دی گئی، فروری ۱۹۳۷ء میں انتخابات منعقد ہوئے۔ کانگرس اس وقت تک پورے عروج پر تھی اور اس کے مقابلے میں صوبے میں کوئی دوسری سیاسی تنظیم موجود نہ تھی۔ اس کے باوجود اسے واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان کسی نہ کسی طرح وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر آل انڈیا کانگرس حرکت میں آ گئی۔ اس نے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صوبہ سرحد میں بھیجا، ان کی کوششوں سے کانگرس کو کچھ مزید ارکان کی حمایت حاصل ہو گئی اور ڈاکٹر خان صاحب نے ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو صوبے کے وزیراعلیٰ کا منصب سنبھال لیا۔

خان عبدالغفار خان نے خود کبھی سرکاری عہدہ قبول نہ کیا، وہ جماعتی کاموں میں مصروف رہے کانگرس وزارت نے آتے ہی مجسٹریٹ ختم کر دیئے، فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن منسوخ کیا۔ لوکل باڈیز کے انتخاب کرائے، شراب کی ممانعت کر دی، عبدالغفار خان اور علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا داخلہ صوبہ سرحد میں بند تھا، انہیں داخلے کی اجازت دے دی۔

کانگرس وزارت ستمبر ۱۹۳۹ء تک کام کرتی رہی لیکن اس کے بعد انگریز کی جنگی کوششوں سے عدم تعاون کے اظہار کے لئے کانگرسی وزراء نے استعفے دے دیئے۔

اس دوران خان عبدالغفار خان کئی بار قید و بند کی آزمائشوں سے گزرے، ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں بھی اُن کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد میں اپنی وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے اور قیامِ پاکستان تک برسرِ اقتدار رہے۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس اور دوسرے کانگرسی اکابر بارہا صوبہ سرحد کے دورے پہ آئے اور جگہ جگہ جلسے منعقد کئے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو برِصغیر کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا اور پاکستان کو تسلیم کر لیا گیا۔ تاہم کانگرس کے سرحدی رہنماؤں نے مطالبہ کیا کہ اس صوبہ میں ریفرنڈم کرایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہاں کے عوام پاکستان کے حامی ہیں یا ہندوستان کے؟ حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا، چنانچہ ۶ جولائی سے ۱۷ جولائی ۱۹۴۷ء تک ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) نتیجہ نکلا تو پاکستان کو ۲۹۲۱۱۸ ووٹ ملے تھے اور ہندوستان کو ۲۸۷۴ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل نے اپنے اپنے جرگوں کے ذریعے پاکستان کی غیر مشروط حمایت اور وفاداری کا اعلان کیا، بالآخر صوبہ سرحد کے تمام علاقے پاکستان میں شامل ہو گئے۔

پاکستان بننے کے بعد خان عبدالغفار خان کو دستور ساز اسمبلی کا ممبر بنایا گیا۔ انہوں نے وہاں چند دوسرے ارکان کے اشتراک سے "پیپلز پارٹی" کے نام سے ایک پارلیمنٹری گروپ تشکیل دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس پارٹی کے بارے میں کوئی بات سُننے میں نہ آئی۔

حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ سرحدی کانگرس میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں، خدائی خدمتگار یا سرحد پراونشل کانگرس ختم کر دی گئی اور اس کی جگہ خان عبدالغفار خان کے صاحبزادے خان عبدالولی خان نے ملک کے دوسرے سیاست کاروں کے تعاون سے نیشنل عوامی پارٹی تشکیل دی جو پاکستان کے سیاسی میدان میں اپنا کردار بجا لا رہی ہے۔

خان عبدالغفار خان بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، وہ ہندوستان کا کئی بار دورہ کر چکے ہیں اور آج کل افغانستان میں مقیم ہیں، وہ طویل القامت، وجیہہ اور پُروقار شخص ہیں۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک

بے چینی کی لہر ۱۹۳۰ء کی قصہ خوانی فائرنگ اور قومی کارکنوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریوں نے حالات کو بہت سنگین بنا دیا۔ سرکاری گزٹ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں حکومت صوبہ سرحد کی مشکلات بہت بڑھ گئیں۔ قانون شکنی کی ایک لہر چل پڑی جسے روکنا ناممکن ہو گیا۔ سرکاری رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ سال ۱۹۳۱ء کے دوران صرف ضلع پشاور میں قتل کی چار سو وارداتیں ہوئیں، مالیہ کی وصولی قریب قریب ختم ہو کر رہ گئی، عوام کھلے بندوں پولیس اور سرکاری افسروں کے منہ آنے لگے، دیہات میں خان خوانین اور جاگیرداروں کی زندگی اجیرن ہو گئی، مزارع انہیں بٹائی کا حصہ دینے تک پر تیار نہ تھے حکومت نے سیاسی کارکنوں اور عوام سے جو ظالمانہ برتاؤ کیا اس سے قومی تحریک کو مزید تقویت ملی خان عبدالغفار خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب (عبدالجبار خان) جو فوج میں کپتانی سے ریٹائر ہو کر اپنا مطب چلا رہے تھے اور سیاست سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے، انگریز کے اس ظلم و ستم کو دیکھ کر اعلانیہ میدانِ سیاست میں اتر پڑے، یہی حال دوسرے باشعور لوگوں کا بھی تھا۔ انگریز مدبروں کا خیال ہے کہ اگر اس موقع پر کابل کی حکومت خاموش تماشائی نہ بنی رہتی اور سرحد کے قومی کارکنوں کی تھوڑی بہت بھی حوصلہ افزائی کر دیتی تو انگریز کے لئے صوبہ سرحد کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

آفریدی قبائل سرحد میں اس بار سب سے نمایاں حصہ آفریدیوں نے لیا، تیراہ میں قومی بیداری پھیلانے کا سہرا جمعدار میر دست خان کے سر ہے، میر دست خان انگریزوں کی فوج میں نائب صوبیدار تھا، جنگِ عظیم اوّل میں ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو میرپس (YPRES) کے محاذ پر اس نے انتہائی بہادری کا کارنامہ دکھایا، جب اس کے دستے میں کوئی بھی انگریز افسر زندہ نہ

بچا تو اُس نے کمان خود سنبھال لی۔ منتشر سپاہیوں کو جمع کیا اور اس وقت تک مصروفِ جنگ رہا جب تک لشکر کو واپسی کا حکم نہ مل گیا، خطرے کے اس عالم میں بھی اس نے حواس بجا رکھے اور آٹھ انگریز اور دیسی افسروں کو محفوظ مقام تک اٹھا کر لے گیا، حالانکہ وہ جگہ دشمن کی شدید گولہ باری کی زد میں تھی، میر دست خان آفریدی کی خدمات کے اعتراف میں اُسے بہادری کا سب سے بڑا تمغہ "وکٹوریہ کراس" دیا گیا۔ اس کے فوٹو گراف صوبہ سرحد کے دفتروں اور سکولوں میں آویزاں کئے گئے تاہم بعد میں جب اُسی مجاہد کو ترکوں کے خلاف لڑنے کو کہا گیا تو اس کی اسلامی غیرت نے گوارا نہ کیا اور سارے اعزازات کو ٹھکرا کر جرمنوں سے جا ملا جو اُن دنوں ترکوں کے حلیف تھے۔ جرمنی میں اُسے صوبہ سرحد کا ایک ہندو نوجوان رام چند (ساکن موضع یار حسین تحصیل صوابی مردان) مل گیا، یہ وہی نوجوان تھا جس کی وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکنے کے سلسلے میں تلاش تھی لیکن وہ بھاگ کر امریکہ جا پہنچا اور وہاں سے جنگ کے دوران جرمنی چلا گیا۔ جمعدار میر دست، رام چند اور مولوی برکت اللہ بھوپالی اُردو میں باغیانہ اشتہار چھاپتے جو جرمنی کے ہوائی جہازوں سے ہندوستانی فوج کے دستوں پر گرائے جاتے۔ جرمنی سے نکل کر آفریدی میر دست خان ترکی پہنچا، جہاں خلیفۃ المسلمین نے اُسے ایک مرصع ترکی علم عطا کیا، آفریدی بڑے فخر سے یہ پرچم لے کر تیراہ پہنچا اور لوگوں کو خلافت کا ہم نوا بنانے لگا[1]۔ جب ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کی قصہ خوانی فائرنگ اور انگریز کے مظالم کی خبر آفریدی قبائل کو پہنچی وہ تلملا اُٹھے، ایک نمائندہ آفریدی جرگہ طلب کر لیا۔ اگرچہ سرکردہ اور معمر ملک انگریز کی دشمنی مول لینے پر تیار نہ تھے لیکن خلافتی آفریدی بڑے جوش میں تھے بالآخر انہی کی رائے غالب آئی۔ دس ہزار آفریدی مجاہد سپین قمر کے مقام پر جمع ہو گئے، ۷ر اگست کو ان لوگوں نے پشاور کے سب سے بڑے فوجی گودام نزد ریلوے سٹیشن پشاور شہر پر حملہ کر دیا۔ انگریز کو تو بہانہ چاہیئے تھا اس نے بڑی تعداد میں فوجیں آفریدی علاقہ میں داخل کر دیں اور ۳ر اکتوبر ۱۹۳۱ء تک کھجوری اور کاکا خیل کے میدانوں پر قبضہ کر لیا، وہاں دفاعی نقطہ نظر سے سڑکیں اور فوجی چوکیاں تعمیر کر لیں، اس طرح آفریدیوں کو مجاہدینِ آزادی کی خاطر بہت بڑی قربانی دینی پڑی۔

---

[1] "سرحد اور جدوجہد آزادی"۔ اللہ بخش یوسفی

مہمندوں کا جہاد

اپریل ۱۹۳۰ء میں سیاسی بیداری کی جو لہر اٹھی اس نے مہمند قبائل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور فقیر صاحب النگر کی کمان میں مجاہدین کے لشکر جہاد پر تیار ہو گئے تاہم زیریں مہمند کے قبیلے اس موقع پر انگریز سے ٹکر لینے کو تیار نہ تھے، بالائی مہمندوں نے ان پر لپوراد باؤ ڈالا۔ تنگ آکر زیریں مہمند کے قبیلوں نے انگریز سے امداد چاہی، جنرل آکنلک کی کمان میں بہت بڑی فوج گندھاب کی جانب بھیجی گئی۔ اس دباؤ کے تحت مہمند قبائل گفت وشنید پر آمادہ ہو گئے اور وقتی طور پر اس محاذ پر خاموشی چھا گئی تاہم ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک وقفے وقفے سے انگریزوں اور مہمند غازیوں کے مابین جھڑپیں جاری رہیں۔

دیوی داس گاندھی کی آمد

بتایا جا چکا ہے گاندھی اروِن معاہدے کی رُو سے اکثر سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا، چنانچہ خان عبدالغفار خان نے رہائی کے بعد پھر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ خدائی خدمت گاروں کو کانگرس میں ضم کئے جانے کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ اس لئے اُن کی طرف سے مہاتما گاندھی کے بیٹے دیوی داس گاندھی کو صوبہ سرحد کے دورے کی دعوت دی گئی۔ دیوی داس مختلف مقامات پر گئے اور سرخپوشوں کی تنظیم کو دیکھ متاثر بھی ہوئے لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر جگہ سرخپوش رضاکار سرخ ہلالی پرچم اٹھائے ہوئے تھے اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہے تھے۔

ڈیرہ اسماعیل خان کا ہندو مسلم فساد

۱۲ اگست ۱۹۳۱ء کو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا۔ ہندو پریس نے واقعہ کو بڑی ہوا دی، جس پر چیف کمشنر نے مسٹر جے آمنڈ کی سربراہی میں خان بہادر عبدالغفور خان آف زیدہ اور رائے بہادر دیوان چند اویرائے پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی۔ فساد کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک ہندو دکاندار کا لین دین کے معاملے پر میونسپل کمیٹی کے ایک بیلدار سے جھگڑا ہو گیا، بیلدار کا بیان تھا کہ دکاندار نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی ہے۔ ہندو دکانداروں نے پولیس کی آمد سے پہلے کئی مسلمانوں کو زخمی کر دیا۔ بات طول پکڑ گئی، ہجوم بڑھتا گیا تو ہندو دکاندار کی جان بچانے کے لئے اُسے دکان ہی میں بند کر دیا گیا تاکہ کوئی اُسے نقصان نہ

پہنچائے ۔ اتنے میں ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی موقع پہ پہنچ گئے ۔ اردگرد ہندوؤں کے اُونچے اونچے مکان تھے انہوں نے وہاں سے اینٹیں برسانی شروع کر دیں ۔ صورتِ حال پولیس کے قابو سے باہر ہوئی تو ٹانک سے ایف ۔ سی طلب کر لی گئی ۔ اس اثنار میں دکانوں کو آگ لگا دی گئی اور لوٹ مار شروع ہو گئی ۔ اب ہندو بھاٹیہ بازار میں جمع ہو چکے تھے اور مسلمان نظام بازار میں ـــــ بہت سے لوگ تو پانوالہ بازار میں بھی اکٹھے ہوئے تھے ، ڈپٹی کمشنر نے بمشکل تمام ہجوم کو وہاں سے ہٹایا ، آگ کے شعلے اب لکڑ منڈی تک جا پہنچے تھے ، ایک ہندو جل کر مر گیا تھا ، توپانوالہ بازار کی دکانوں کو بھی آگ لگا دی گئی ـــــ کڑی علی زئی کی جانب سے اکا دکا گولیاں چلنے کی بھی آواز سنائی دیتی تھی ، آگ ساری رات سلگتی رہی ، فوج اور ایف ۔ سی پہرہ دیتی رہی ، صبح کو پتہ چلا کہ پانچ ہندو اور دو مسلمان مارے گئے ہیں اور ۱۴ ہندو اور ۲۳ مسلمان زخمی ہوئے ہیں ۔ نقصان کا اندازہ ۲۵ لاکھ روپیہ تھا ، ۲۲۶ دکانیں جل کر تباہ ہو گئی تھیں ، کئی حلقوں کا خیال ہے کہ یہ تلخی رائے بہادر ٹھاکر دت نے پھیلائی تھی کیونکہ وہ صوبہ سرحد کو اصلاحات دینے کا سخت مخالف تھا بعض لوگ اس شبہ میں تھے کہ سُرخ پوشوں نے حکومت کو پریشان کرنے کے لئے فساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی تھی جب کہ بعض لوگ مقامی مولویوں کو بھی مورد الزام ٹھہراتے تھے جن کی تقریروں نے ہندو مُسلم کشیدگی کو ہوا دی تھی ـــــ بہرحال تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ یکم جولائی ۱۹۳۲ء کے سرکاری گزٹ میں شائع کر دی ـــــ مہینوں بعد کہیں فساد کی تلخیاں دور ہوئیں اور دونوں فریق امن و امان سے رہنے لگے ۔

گرفتاریاں

سُرخ پوشوں کی سرگرمیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں ، حکومت سرحد کے کلیدی صوبے میں پیدا ہونے والی اس صورتِ حالی سے پریشان تھی ، اس نے پولیس کی مدد کے لئے فوج بھی متعین کر رکھی تھی لیکن نتائج کے ۔ آخر حکومت نے ایک سکیم بنائی اور ۲۴ اور ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کی درمیانی رات کو ہر جگہ چھاپے مار کر قومی کارکنوں کو گرفتار کر لیا ۔ حکومت نے اس موقع پہ انتہائی رازداری سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ـــــ صرف تہکال بالا اور گجرات ضلع مردان میں پولیس کو سخت اقدام کرنے پڑے اور گولی چلنے کی نوبت آئی ، اب کے ڈاکٹر خان صاحب کو بھی پشاور چھاؤنی میں ان کے بنگلے سے گرفتار کر لیا گیا ۔ خان برادران کو ہزاری باغ جیل میں بھیج دیا گیا جب کہ گرفتار ہونے والے باقی لوگوں کو مختلف جیلوں

ہیں رکھا گیا۔

لیجسلیٹو کونسل ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ صوبہ سرحد کو چیف کمشنر کی بجائے گورنر کا صوبہ بنا دیا جائے اور یہاں دوسرے صوبوں کی طرح لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آئے، چنانچہ ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء کو وائسرائے نے صوبہ سرحد کی پہلی لیجسلیٹو کونسل کا افتتاح کیا۔

اسی سال ۱۶ اپریل کو وائسرائے لارڈ ولنگڈن ہوائی جہاز سے پشاور آئے اور ۱۸ اپریل کو ایک تقریب میں سر رالف گرفتھ کو صوبہ سرحد کا پہلا گورنر مقرر کیا۔ ۱۹ اپریل کو وائسرائے نے لیجسلیٹو کونسل سے خطاب کیا۔ اس موقع پر ارکان کونسل کے علاوہ صوبے کی سرکردہ شخصیتیں سرکاری افسر اور اخبار نویس بھی موجود تھے۔ وائسرائے نے اس امر پر اظہار اطمینان کیا کہ کافی انتظار کے بعد ہی سہی تاہم صوبہ سرحد کو اصلاحات مل ہی گئی ہیں۔ فرانٹیر لیجسلیٹو کونسل کا پہلا باقاعدہ اجلاس ۱۲ مئی ۱۹۳۲ء کو ایبٹ آباد کے ٹاؤن ہال میں شروع ہوا اور ۲۷ مئی کو اختتام کو پہنچا۔ دوسرا اجلاس ۲۵ اکتوبر کو پشاور میں منعقد ہوا، کونسل کے کل ۵۱ اجلاس ہوئے اور اس میں ۲۸ منتخبہ ارکان کی جانب سے ۱۸۰ سوال پوچھے گئے، سب سے زیادہ سوال ۲۷۴ خان پیر بخش خان کی طرف سے کئے گئے جبکہ رائے بہادر مہر چند کھنہ نے ۲۴۰ سوال پوچھ کر ثانوی پوزیشن حاصل کی۔

سنہ ۱۹۳۳ء سیاسی کارکنوں کی گرفتاریوں کے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی اور کچھ عرصہ تک صوبہ سرحد میں کوئی قابل ذکر سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی، ادھر مولانا محمد علی جوہر بھی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات پا چکے تھے، اُن کے مرتے ہی مجلس خلافت بھی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی ـــــ انگریز نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنی ساری توجہ قبائل سرحد کے مجاہدین کو دبانے پر مبذول کر دی۔

یہ وہ دور تھا جب سائنسی ایجادات کی بدولت انگریزی فوج کی کارکردگی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ وائرلیس کا استعمال عام تھا، فوج جدید اسلحہ، ٹینکوں اور آرمڈ کاروں سے مسلح تھی اور اس کی مدد کے لئے ہوائی جہاز موجود تھے، قبائلی مجاہدوں کے لئے انگریز کی فوجوں سے لڑنا اب آسان کام نہ تھا تاہم یہ مردان کہستان مسلسل فرنگی سامراج کے خلاف مصروف جہاد رہے، انہوں نے انگریز کے پچاس ہزار سپاہیوں کا ناک میں دم کئے رکھا، فرنگی افواج کے آزمودہ کار سپہ سالار فیلڈ مارشل

آکنلک اور فیلڈ مارشل الیگزینڈر سرحدی مجاہدوں کو دبانے کی کوششوں میں مصروف رہے، ایک سرکاری رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی عرصہ میں سرحدی مہموں پہ انگریز کو گیارہ کروڑ بیس لاکھ پونڈ خرچ کرنے پڑے، ایک دن کے لئے بھی انگریزی فوج کو آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کبھی ایک علاقہ کے لوگ اعلانِ جہاد کر دیتے تو کبھی دوسرے کے۔ انگریزی لشکر ایک جگہ مجاہدوں سے دو دو ہاتھ کر کے فارغ ہوتا تو اُسے فوراً دوسری جگہ پہنچنا پڑتا۔

مئی ۱۹۳۳ء میں برطانوی حکومت کی توجہ چارمنگ کی قبائلی وادی پہ مرکوز ہو کر رہ گئی، جہاں ایک شخص نے تختِ افغانستان کا جائز مالک ہونے کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ خان آف کوہستی نے اُسے سیاسی پناہ دے رکھی تھی، اس مدعی تخت کی کوشش تھی کہ قبائلِ سرحد کو ساتھ ملا کر کابل پہ ہلہ بول دے۔ افغانستان کی حکومت نے انگریز سے مدد چاہی، جس پہ پہلے تو گفت و شنید کے ذریعے مسئلے کے حل کی کوشش ہوتی رہی، جب کامیابی نہ ہوئی تو جنگی طیاروں نے اس وادی پہ بمباری کی اور افغانستان کے خلاف کی جانے والی اس سازش کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔

۸ نومبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان کے حکمران نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا، بتایا جاتا تھا کہ قاتل کے باپ کو نادر شاہ نے کسی جرم میں مروا دیا تھا اس نے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے بادشاہ کو مار دیا لیکن سوال یہ ہے کہ آخر قاتل کو بادشاہ کے دربار تک رسائی کیسے حاصل ہو گئی۔ عام خیال یہ ہے کہ سرحدی قبائل اور خود افغانیوں کے نزدیک تخت کا اصل وارث امان اللہ خان تھا اور وہ نادر شاہ اور اس کے حامیوں کو غاصب خیال کرتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نادر شاہ نے امان اللہ خان ہی کے نام پہ حکومت حاصل کی ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ یہ امانت اس کے جائز مالک کو پہنچا دے۔

مرکزی اسمبلی کی نشست

۱۹۳۴ء میں ملک کی مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کے لئے ایک نشست رکھی گئی، کانگرس نے اس کے لئے ڈاکٹر خان صاحب کو ٹکٹ دیا، چونکہ صوبے میں دوسری کوئی منظم جماعت موجود نہ تھی، لے دے کے مجلسِ خلافت تھی اس کے حامی بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے ایک گروہ سابقہ کمیٹی کا ساتھ دیتا تھا تو دوسرا مولانا ابوالکلام کے زیرِ اثر کانگرس کی طرف مائل نظر آتا تھا، دوسرے گروہ کی قیادت پشاور میں آغا سید لال بادشاہ کر رہے تھے، لہٰذا کوئی ڈاکٹر خان صاحب کے مقابلے پہ نہ آیا۔ تاہم صاحبزادہ

عبدالقیوم خان نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر خان صاحب بلامقابلہ منتخب ہوں۔ چنانچہ انہوں نے خانپور ہزارہ کے رئیس راجہ حیدر زمان خان کو الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ توقع کے مطابق ڈاکٹر خان صاحب کامیاب ہوئے اور مرکزی اسمبلی میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کرتے رہے، بعد میں ۱۹۳۷ء میں وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو اس سیٹ پر خان عبدالقیوم خان کامیاب ہوئے۔ جو مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر بھی رہے۔

خان عبدالغفار خان

۱۹۳۴ء میں خان عبدالغفار خان جیل سے تو باہر آ گئے تاہم اُن پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ پنجاب یا صوبہ سرحد میں داخل نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کافی عرصہ تک وہ ہندوستان ہی میں رہے، مختلف جلسوں میں حصہ لیتے رہے اور کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ مختلف علاقوں کے دورے کو جاتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس کے نیتاؤں سے اُن کے تعلقات اور بھی مستحکم ہو گئے۔

اسی دنوں ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے انتخاب بھی ہوئے، اگرچہ لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن کا تو کانگرس کی طرف سے بائیکاٹ کیا گیا تھا تاہم لوکل باڈیز کے ان انتخابات میں کانگرسی نمائندوں نے انتخاب لڑا۔ مردان میونسپل کمیٹی کے لئے تو کوئی بھی کانگرسی کامیاب نہ ہو سکا تاہم پشاور ڈسٹرکٹ بورڈ میں کانگرس ہی کو اکثریت حاصل ہوئی۔

شریعت کانفرنس

اپریل ۱۹۳۴ء کے آخری ہفتے میں پشاور میں ایک پراونشل شریعت کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ مشہور عالم دین مفتی کفایت اللہ نے اجلاس کی صدارت کی۔ جمعیت العلماء صوبہ سرحد کی طرف سے خان بہیر بخش خان کو استقبالیہ کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا گیا، کانفرنس بڑی کامیاب رہی، اجلاس کے آخر میں حکومت سے اپیل کی گئی کہ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی پر عائد شدہ پابندیاں ان کی خرابی صحت کی بناء پر ختم کر دی جائیں۔

اس سے قبل اکتوبر ۱۹۲۷ء میں بھی جمعیۃ العلمائے ہند کا ایک عظیم اجلاس موجودہ لیڈی گرفتھ ہائی سکول (شاہی مہمان خانہ) میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، سید حسین احمد مدنی، مولانا ظفر علی خان اور علامہ عبداللہ یوسف علی جیسے عظیم مسلمان رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔

ہندو کانفرنس اقلیت میں ہونے کے باوجود صوبہ سرحد کے ہندو بڑے منظم اور ہوشیار تھے، موقع بموقع وہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق اور تحفظات کا مطالبہ کرتے رہتے ان کے پاس مضبوط پریس بھی تھا اور مالی وسائل بھی، اُن کے اکثر لیڈروں کا یہ حال تھا کہ کانگرس کی ہم نوائی بھی کرتے اور ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم سے اپنے فرقے کے مفادات کی جنگ بھی لڑتے، اُن کی طرف سے اکثر یہ مطالبہ بھی دہرایا جاتا کہ صوبہ سرحد کو پھر سے پنجاب میں ضم کر دیا جائے، اسی طرح یہ لوگ صوبہ سرحد کو ملک کے دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دینے کی بھی مخالفت کرتے۔

اپریل ۱۹۳۴ء میں صوبہ سرحد، پنجاب، اور سندھ کے ہندوؤں کی ایک نمائندہ کانفرنس راجہ سر نریندر ناتھ کی صدارت میں پشاور میں ہوئی۔ رائے بہادر مہر چند کھنہ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے، اس اجلاس میں انہوں نے اصلاحات کی حسب سابق مخالفت کی اور "پان اسلامزم" کو اپنے مفادات کے منافی قرار دیا۔ کانفرنس نے ایک قرارداد میں مخلوط انتخابات کرائے جانے کا مطالبہ بھی کیا اور اس امر کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔

غازی عبدالقیوم ہزاروی ۱۹۳۴ء کا سال تھا۔ کراچی اُن دنوں ایک چھوٹا مگر بارونق شہر تھا، صوبہ سرحد کے اکثر لوگ وہاں محنت مزدوری کرنے جایا کرتے تھے، انہی میں سے ایک فرد عبدالقیوم بھی تھا جو غازی ضلع ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ وہ دن بھر وکٹوریہ گاڑی چلاتا اور رات کو کہیں پڑ کر سو رہتا۔ اسے ملکی سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ ہی وہ زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ البتہ وہ دین دار مسلمان تھا اور نماز روزے کی پوری پابندی کرتا تھا، ایک دن اس کی گاڑی میں کچھ سواریاں بیٹھیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ ایک ہندو نے ایک کتاب لکھ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے اور اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے، کوچوان عبدالقیوم اُن کی باتیں غور سے سُنتا رہا، اُسے یقین نہ آتا تھا کہ کوئی شخص فخر نوعِ انسان، ہادیٔ کون و مکان جناب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ایسی دریدہ دہنی بھی کر سکتا ہے، چند دن بعد وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے جامع مسجد، جو ناما رکیٹ گیا تو وہاں بھی مولوی صاحب اسی گستاخ کا ذکر کر رہے تھے، اس پر عبدالقیوم نے ٹوہ لگائی۔ ایک دوسرے سے حقائق

دریافت کئے تو اُسے معلوم ہوا کہ حیدر آباد سندھ کے آریہ سماج کے سیکرٹری نتھورام نے تاریخ اسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں سرورِ دو عالمؐ پر بڑے رکیک حملے کئے ہیں، مسلمانوں کے احتجاج پر حکومت نے نتھورام کے خلاف مقدمہ درج کر لیا اور اُسے ایک سال قید اور معمولی جرمانے کی سزا سنائی، نتھورام نے اس فیصلے کے خلاف کمشنر کراچی کے پاس اپیل کی جس نے اس کی ضمانت منظور کر لی۔ اس پر مسلمانوں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی، جہاں دو انگریز ججوں پر مشتمل بنچ اس مقدمے کی سماعت پر مامور ہوا۔ عبدالقیوم نے یہ تفصیلات معلوم کر لیں اور اس بات کا بھی پتہ کر لیا کہ نتھورام آئندہ کب عدالت میں پیش ہوگا۔ بظاہر وہ بالکل خاموش رہا۔ پیشی کے دن کمرۂ عدالت ماہرینِ قانون اور عوام سے بھرا ہوا تھا۔ عبدالقیوم بھی ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ جونہی نتھورام کو ججوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدالقیوم بپھرے ہوئے شیر کی طرح اس پر لپکا اور تیز دھار چاقو سے دو وار کئے۔ دونوں وار نتھورام کی گردن پر ہوئے۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا ـــــ غازی عبدالقیوم نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے اس پر قتل کا مقدمہ چلا اور سیشن جج نے اُسے موت کی سزا سُنا دی۔ مسلمان وکیلوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنا اقبالی بیان تبدیل کر لے تو موت سے بچ سکتا ہے لیکن اُسنے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ میں بیان تبدیل کر کے اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔ میں نے مرتبۂ شہادت کے حصول کے لئے یہ کام کیا ہے، آپ مجھ سے یہ نعمت چھیننے کی کوشش نہ کریں"۔

دورانِ مقدمہ جب انگریز سیشن جج نے اُس سے اس اقدام کی وجہ پوچھی تو اس نے کمرۂ عدالت میں لگی ہوئی جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا ـــــ "کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین برداشت کر سکتے ہو ـــــ اگر برداشت نہیں کر سکتے تو میں اپنے آقا و مولا، شہنشاہ دو عالمؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو کیسے معاف کر سکتا ہوں"؟

جس وقت جسٹس وادیا ہتہ اور نو ارکان جیوری نے (جو سب کے سب غیر مسلم تھے) غازی عبدالقیوم کی اپیل کی سماعت شروع کی تو ۲۰ - ۲۵ ہزار مسلمانوں کا ہجوم عدالت کے باہر مظاہرہ کر رہا تھا۔ عدالت نے غازی عبدالقیوم کی سزائے موت بحال رکھی تاہم پھانسی دینے کا وقت صیغۂ راز میں رکھا۔ ایک رات اسے چپکے سے پھانسی دے دی گئی اور لاش کسی قبرستان میں دفنا دی ـــــ تاہم غازی علم دین اور

غازی عبدالقیوم کی شہادت کے بعد کسی غیر مسلم کو جرأت نہ ہوئی کہ حضور مقبولؐ کی شان میں گستاخی کرے

۱۹۳۵ء

۱۹۳۵ء میں جہاں سیاسی محاذ پر قومی کارکن حکومت خود اختیاری کے سلسلے میں مزید مراعات کے حصول کی کوششوں میں مصروف تھے وہیں آزاد قبائل سرحد کے مردانِ مجاہد سروھڑ کی بازی لگائے فرنگی استبداد سے نجات پانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

فقیر صاحب النگر

"خیبر میل" پشاور کے ۶ فروری ۱۹۳۷ء کے پرچے میں فقیر صاحب النگر (یا علی نگر) کو "سرحدی رابن ہڈ" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اخبار لکھتا ہے :-

"صوبہ سرحد میں جہاں کہیں بھی ہنگامہ کھڑا ہو۔ جیسا کہ ان دنوں بھی ہے۔ یا قبائل کے جوشِ جہاد کا ذکر ہو، فقیر صاحب النگر کی طلسماتی شخصیت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے، کوہ سلیمان کا یہ چھ فٹ لمبا، مردِ قلندر فی الواقع صوبہ سرحد کا رابن ہڈ ہے۔ وہ تیس سال سے زیادہ عرصہ تک اپنے وطن مقدس کے دشمنوں (فرنگی) کے خلاف سرفروشی سے مصروف جنگ ہے، وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے اور اُسے نقصان پہنچا کر آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے۔ دشمن کے دل پر اس کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ اس کا نام سُنتے ہی اُس کا زہرہ آب ہو جاتا ہے ـــــ فقیر صاحب النگر کی فطرت میں قہاری بھی ہے اور شانِ رحیمی بھی۔ وہ اچھا لڑاکا بھی ہے اور باصلاحیت قائد بھی۔"

"وہ ایک شتربان کا بیٹا ہے، اسے نہ تو اپنے حسب نسب پر کوئی غرور ہے نہ دولت پر ناز ـــــ ایک وقت تھا جب وہ پشاور کے بازاروں میں مزدور کے طور کام کرتا تھا یا فوجی افسروں کا خدمت گار بن کر روزی کماتا تھا ـــــ پشاور سے وہ اپنے آبائی گاؤں گیا تو اس کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ اس نے درویشی اختیار کر لی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کوہ سلیمان کی تنہائیوں میں مصروفِ عبادت ہو گیا۔ پہلے پہل تو وہ اپنی روحانی استعداد بڑھانے میں لگا رہا۔ بعد میں اپنی مافوق الفطرت قوت سے دوسروں کی بگڑی بھی بنانے لگا۔ جس بیمار پر دم کر دیتا وہ تندرست ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت میں اضافہ ہوا تو ہر وقت اس کے گرد چرواہوں کا ہجوم نظر آنے لگا۔ اس کے مریدوں کی تعداد بڑھی تو اس نے ایک

خانقاہ قائم کرلی، وہ مریدوں کو سادگی اور سخت کوشی کی تعلیم دیتا، اُس کے مُرید زمین کے فرش پر سوتے اور لحاف اور کمبل کی بجائے اپنے آپ کو خشک گھاس سے ڈھانپ لیتے۔ بعد میں مریدوں کی دینی تربیت کے ساتھ ساتھ اس نے انہیں عسکری تربیت بھی دینی شروع کردی، وہ انہیں نشانہ بازی اور پہاڑی جنگ کے طریقے سکھاتا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے اپنے مریدوں کو بندوقوں سے بھی مسلح کردیا ـــــ یہ اسلحہ کہاں سے آیا؟ ـــــ کوئی نہیں کہہ سکتا ـــــ

فقیر صاحب اردگرد کے خوانین کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ـــــ جو لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے وہ اُن سے جنگ کرتا ـــــ جلد ہی سارا علاقہ اس کے زیر اثر آگیا اور وہ قبائلی علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھا جانے لگا۔"

۵ راپریل ۱۹۳۵ء کو اسی فقیر کی کمان میں مسلمان سرفروشوں نے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف وہ زبردست جنگ لڑی جس کا شمار تاریخ صوبہ سرحد کی خطرناک ترین لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ فقیر صاحب کئی برسوں سے فرنگی کی فوجی چوکیوں پر مسلسل چھاپے مار رہا تھا، اُسے حکومت کی طرف سے بار بار وارننگ دی جاتی لیکن وہ انگریز کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتا ـــ بالآخر اس نے مالاکنڈ سے تھوڑی دور مغرب میں لوئی آگرہ کے میدان میں ڈیرہ جمالیا۔ حکومت کی طرف سے سوات لیوی کے لڑاکوں کو اس کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا لیکن فقیر صاحب کے مجاہدوں کے سامنے اُن کی پیش نہ آئی اور انہیں راہِ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ اس پر فروری ۱۹۳۵ء میں پورے نوشہرہ بریگیڈ کو اس کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا گیا۔ علاقہ بڑا دشوار گزار تھا اور پہاڑی نالوں، نکیل چٹانوں اور خطرناک درّوں سے پٹا پڑا تھا، یہاں تک کہ خچر اور گھوڑے بھی ان عمودی پہاڑیوں پر نہ چڑھ سکتے تھے پھر ان چٹیل پہاڑوں میں نہ پانی ملتا تھا نہ چارہ یا غلّہ دانہ دستیاب تھا۔ دو ماہ تک انگریزی فوج اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی بالآخر ۵ راپریل کو اللہ کے ان بندوں نے اپنی انتہائی بے سروسامانی کے باوجود دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ـــــ انگریز کے خلاف وہ جنگ لڑی جو ہمیشہ یاد رہے گی۔

جنگ کا زور قلعہ ہری کی پہاڑی چوٹی کے اردگرد رہا جس کا دفاع انگریزوں کی ایک رائفل کمپنی اور گورکھا پلٹن کی ایک مشین گن پلاٹون کر رہی تھی۔ غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے مجاہدین نے نقارہ

بجایا ـــ نقارہ بجتے ہی ہر طرف سے مجاہدینِ اسلام ڈنڈہ غونڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ پھر وہ تین حصّوں میں بٹ گئے، ایک حصّہ مشرق اور دوسرا مغرب کو چل دیا۔ جب کہ تیسرا دستہ وہیں ڈٹ گیا، اندھیرا ہوتے ہی قبائلی لشکر ڈھول بجاتا ہوا فوجی چوکی پر ٹوٹ پڑا۔ وہ تلواریں سونتے، اللہ اکبر کے نعرے لگاتے بڑھتے ہی چلے جاتے تھے، وہ دشمن کی مشین گنوں سے خائف تھے نہ ہوائی جہازوں کی بمباری سے، یہاں تک کہ انہوں نے قلعے کے گرد بچھی ہوئی خاردار تاروں کی بھی پرواہ نہ کی اور جنوبی سمت سے بڑھتے بڑھتے قلعے کے دروازے تک جا پہنچے، دست بدست لڑائی شروع ہوگئی، بعض مجاہدوں نے تو دشمن کے سپاہیوں سے رائفلیں اور مشین گنیں تک چھین لیں۔ گورا اور گورکھا لڑاکوں نے اپنی مشین گنوں سے مجاہدوں پر بے تحاشا آگ برسائی تاہم مجاہد بھی سر پر کفن باندھ کر میدان میں اترے تھے انہوں نے پلاٹون کمانڈر صوبیدار کو موت کے گھاٹ اتارنے کے علاوہ کئی سپاہیوں کو بھی ہلاک اور زخمی کر دیا، وائرلیس اور ٹیلی فون پر اس تباہی کی خبر ملتے ہی بریگیڈ کمانڈر حرکت میں آیا اور اس نے توپ خانے سے مجاہدوں پر فائر کھول دیا، توپیں آگ برساتیں تو کچھ دیر تک مجاہد اِدھر اُدھر دبک جاتے اور خاموشی طاری ہو جاتی لیکن تازہ دم ہو کر مجاہد پھر حملہ کر دیتے، قبائلی شمشیر آزما اس کوشش میں تھے کہ وہ دشمن کے مورچوں تک پہنچ جائیں اور دست بدست لڑائی کر کے اُسے مزا چکھائیں صبح کی روشنی نمودار ہونے تک مجاہد بار بار حملے کرتے رہتے لیکن پَو پھٹتے ہی اپنی اپنی پہاڑی کمین گاہوں کو چلے جاتے۔

انگریز کمانڈر کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ مزید کمک منگوائے۔ کمک پہنچنے پر انگریزی فوج نے بار بار فقیر صاحب پر حملے کئے لیکن کوئی کامیابی ہونے نہ پائی، بالآخر شموزئی قبیلے کا جرگہ بُلایا گیا۔ لیکن جرگہ کے ارکان بھی فقیر صاحب کی مرضی کے خلاف دم نہ مار سکتے تھے۔ کافی عرصہ تک فقیر صاحب نے انگریزوں کو خوب پریشان کیا۔ آرتھر سونسن کے بقول انگریزوں نے تسلیم کیا کہ اگرچہ لوئی آگرہ کی یہ مُہم بہت بڑی مُہم تو نہ تھی لیکن اس کے دوران وہی خوفناک نظارے دیکھنے میں آئے جو امبیلہ کی جنگ میں سر بنوں چیمبرلین کو یا مالاکنڈ میں جنرل بائنڈن بلڈ کو دیکھنے پڑے تھے، ان کے خیال میں صرف اوّل درجے کے بہادر اور تربیت یافتہ فوجی ہی ایسے مجاہدوں سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

مہمندوں کا جوشِ جہاد

۱۹۱۴ء میں جب انگریز حاجی صاحب ترنگ زئی کو گرفتار کرنے کا سوچ رہے تھے، وہ اپنے مخلص دوست مولوی عبدالعزیز کے ہمراہ ہشت نگر کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے آزاد علاقہ مہمند کو چلے گئے، اس پر ایک بڑے انگریز افسر نے کہا تھا۔

"حاجی صاحب ترنگ زئی ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے۔"

اس وقت سے اپنی وفات (دسمبر ۱۹۳۷ء) تک حاجی صاحب اور اُن کے ارادت مند فرنگی کے خلاف مسلسل برسرِپیکار رہے۔ بارہا انہوں نے شبقدر کے انگریزی قلعے اور سرکاری علاقوں پر حملے کئے تاہم ۱۹۳۰ء کی تحریکِ آزادی کے نتیجے میں قبائلی علاقہ کے لوگ بھی انگریز کے خلاف بھڑک اٹھے، ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک وقفے وقفے سے حاجی صاحب ترنگ زئی کے مہمند مجاہدوں اور انگریز لشکر میں کئی جھڑپیں ہوئیں، مشکل یہ تھی کہ اس دوران زیریں مہمند کے کچھ لوگ انگریز کی مخالفت مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ اس لئے حاجی صاحب کا لشکر شبقدر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بالآخر ۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے مہمند غازیوں کے خلاف ایک بہت بڑے حملے کا منصوبہ بنایا اور غلنئی کے مقام پر ڈیرے ڈال لئے۔ تین بریگیڈ فوج اس مہم میں حصہ لے رہی تھی اور میجر جنرل مسپرٹ (MUSPRATT) کی غیر حاضری میں اس کی کمان بریگیڈیر آکنلک (بعد میں کمانڈر ان چیف) کے ہاتھ میں تھی۔ اس مہم کے دوران سب سے قابلِ ذکر معرکہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۵ء کو بروئے کار آیا، اس دن انگریز کی تین بریگیڈ فوج درہ نحقی کا محاصرہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی، مہمند چونکہ چھوٹا سا قبیلہ ہے، وہ اتنی بڑی فوج کے اتنے بڑے حملے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، تاہم انہوں نے ایسی بہادری کا ثبوت دیا جس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی، پچھلے دنوں میجر جنرل گاف ہملٹن پاکستان آئے تو وہ خصوصی طور پر علاقہ مہمند میں ان مقامات کو دیکھنے گئے، جہاں اُن کی جھڑپ مہمند غازیوں سے ہوئی ہے، ہملٹن اس وقت سیکنڈ لفٹیننٹ تھا اور فرانٹیئر فورس رجمنٹ کے ایک دستے کے ساتھ وابستہ تھا۔ ہملٹن کا کہنا ہے کہ مہمند ایک جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے، انہوں نے وہاں سے ایسے نشانے لگائے کہ ۳۵ گورا سپاہی ایک رات میں ہلاک ہوئے جب کہ ساٹھ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ہملٹن کو اس جنگ میں بہادری دکھانے

پر شجاعت کا دوسرا بڑا انعام ڈی ایس او دیا گیا تھا۔ انگریز نے اس معرکہ میں ہوائی جہازوں سے بھی کام لیا۔ بمباری کر کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے جن نالائیوں سے مجاہدین پانی پیتے تھے اُن پر بھی بم پھینکے گئے، اس کے باوجود مہمند غازیوں کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ انہوں نے گائیڈز کے دستے کا صفایا کر دیا۔ حاجی صاحبؒ کی کمان میں عثمان خیل قبیلہ نے اس موقع پر بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دی، عیسیٰ خیل کے ایک سرفروش مغل خان ایک بہت بڑے انگریز افسر کا سر کاٹ لائے۔ انگریز بوکھلا گئے، انہوں نے صلح کی پیشکش کی۔ صوبہ سرحد کے گورنر نے ایک جرگہ حلیم زئی کی طرف بھیجا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جس پر حاجی صاحبؒ ترنگ زئی بھی صلح پر آمادہ ہو گئے، گندہاب میں ایک بہت بڑا جرگہ منعقد ہوا جس میں مہمند قوم کے قریب قریب سبھی بزرگوں نے شرکت کی اور اس طرح صلح نامہ طے پا گیا ـــــ یہ حاجی صاحبؒ ترنگ زئی کی زندگی کا آخری جہاد تھا

آکنلک کو اس جنگ میں نمایاں کارکردگی دکھانے پر سی۔ بی اور سی۔ ایس۔ آئی کے اعزازات ملے اور اُسے میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

انگریز مصنف آرتھر سوئنسن (SWIN SON) نے تسلیم کیا ہے کہ انگریز کو اس مہم سے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، خود مہم میں شریک فوجی بھی حیران تھے کہ آخر اس منصوبے کا مقصد اور فائدہ کیا تھا۔ تاہم سپاہی کا کام اطاعت ہے نہ کہ دلائل کی تلاش ـــــ سینکڑوں انگریز سپاہی برطانوی حکومت کی فضول اَنا کی صلیب پر چڑھ گئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں جُداگانہ حقِ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور یہ یقین بھی دلایا گیا تھا کہ آئندہ ہندوستان کے عوام کو زیادہ سے زیادہ آئینی مراعات دی جائیں گی۔ ۱۹۳۵ء کے آغاز ہی میں ایک بل برطانیہ کی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد اُسے ایکٹ کی صورت دے دی گئی، اگرچہ اس کا نفاذ مکمل طور پر ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

اس قانون میں باقی مراعات کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت صوبائی خود مختاری تھی، اس کے تحت ہر صوبے کو پارلیمانی ذمہ داریاں حاصل ہو گئیں، ہر صوبے کی اکثریتی پارٹی کو وزارت بنانے کا حق مل گیا۔ نامزدگی کا طریق ختم کر دیا گیا، گورنر کے اختیارات محدود کر دیئے گئے اور وہ جمہوری انداز کو

اپنانے کا پابند ہوگیا، ہر اُس شخص کو ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا جو

۱ _____ حکومت کو ٹیکس یا لگان ادا کرتا ہو۔

۲ _____ شہر میں جائداد رکھتا ہو۔

۳ _____ کرایہ دار ہونے کی حیثیت میں کم سے کم ایک روپیہ ادا کرتا ہو۔

۴ _____ زمین رکھتا ہو۔

۵ _____ پڑھا لکھا ہو۔

اس آئین کے تحت مرکزی اسمبلی کی مدتِ کار پانچ سال مقرر کی گئی لیکن وائسرائے کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ جب چاہے اسمبلی کو برخاست کر سکتا ہے۔

یہ آئین بھی عوام کی توقعات پر پورا نہ اترا، اس میں مرکزی حکومت کی دو عملی اور بعض دوسری شرائط کو ناپسند کیا گیا، چنانچہ رائے عامہ کے اکثر لیڈروں نے اس پر تنقید کی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے کہا "نیا آئین سراسر مکمّا اور لغو ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی قسم کی خامیوں سے بھی پُر ہے، اس لئے قابلِ عمل اور قابلِ قبول نہیں"۔

جواہر لال نہرو نے کہا "ہندوستانیوں کو ایک خوبصورت موٹر کار مل گئی ہے جس میں انجن نہیں ہے بس پہیے ہی پہیے ہیں"۔

اے۔ کے فضل الحق نے کہا "یہ ایکٹ نہ تو ہندو راج کے لئے ہے نہ ہی مسلم راج کے لئے۔ یہ برطانوی سامراج کے قیام کے لئے ایک ستون ہے"۔

مسجد شہید گنج لاہور کے ریلوے سٹیشن سے دہلی دروازہ جاتے ہوئے ایک جگہ ایک قدیم مسجد تھی جسے مغل کوتوال عبداللہ خان نے تعمیر کرایا تھا۔ میر معین الملک حاکم پنجاب کے دور میں سکھوں نے سر اٹھایا تو اُن سے نمٹنے کے لئے کارروائی کی گئی۔ اس کارروائی کے دوران چند سکھ اس مسجد کے پاس مارے گئے، انیسویں صدی عیسوی میں جب حکومت سکھوں کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے ان سکھ مقتولوں کی یاد میں اس جگہ کو "شہید گنج" کا نام دے دیا۔ جون ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے اس مسجد کو شہید کر کے گوردوارہ میں شامل کرنا چاہا تو فرقہ وارانہ کشیدگی کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ بات عدالت تک پہنچی تو انگریزی عدالت نے فیصلہ سکھوں کے حق میں دے دیا، اس پر مسلمانوں نے

تحریک چلائی ـــــ جس سے صوبہ سرحد کے مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مولانا ظفر علی خان پشاور آئے اور بڑی جوشیلی تقریریں کیں، خدشہ تھا کہ اگر ایک بار صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے تو خطرناک نتائج برآمد ہوں گے، مسلمان رہنماؤں کے کہنے پر قائداعظم محمد علی جناح خود لاہور تشریف لائے۔ یہ ۲۱ر فروری ۱۹۳۵ء کا دن تھا، نمازِ جمعہ کے بعد شاہی مسجد میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے مسلمانوں کو قربانیاں پیش کرنے پر مبارک پیش کی اور فرمایا:۔

"آپ لوگوں نے مسجد شہید گنج میں نماز ادا کرنے کی نئی تحریک کو عارضی طور پر میری خواہش کے مطابق ملتوی کر دیا گیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلمان ایک منظم قوم ہے، اس تحریک کے عارضی التوا نے قوم کے وقار کو بلند کر دیا ہے ـــــ میں آپ حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ ایسا رویہ اختیار کریں جس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے ـــــ میں لاہور آیا ہوں اور اس امر کی مخلصانہ کوشش کروں گا کہ مسلمانوں کے لئے کوئی باعزت سمجھوتہ کر دوں"۔

۲۲ر فروری کو قائداعظم پنجاب کے انگریز گورنر سے ملے، اسی دن انہوں نے تحریک شہید گنج کے سرکردہ رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔

اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے مطابق قائداعظم کے سامنے یہ مقاصد تھے کہ

(۱) ـــــ مسلمان قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔

(۲) ـــــ اخبارات کی ضبط شدہ ضمانتیں واپس دلائی جائیں۔

(۳) ـــــ سبھی فرقوں میں صلح صفائی کرائی جائے۔

۲۳ر فروری کو قائداعظم نے دوبارہ گورنر پنجاب سے ملاقات کی، گورنر نے انہیں یقین دلایا کہ اگر مسلمان سول نافرمانی بند کر دیں اور مسجد کی بازیابی کے لئے کوئی آئینی راستہ اختیار کریں تو وہ قائداعظم کے مطالبات کو تسلیم کر لیں گے۔

۲۴ر فروری کو حکومت کی طرف سے نظر بندوں کی رہائی کا اعلان کر دیا گیا ـــــ قائداعظم نے سکھ لیڈروں سے بھی ملاقات کی اور انہیں بھی امن و آشتی سے کام لینے کی تلقین کی، انہوں نے مسجد شہید گنج کا موقع بھی ملاحظہ کیا۔

یونیورسٹی کے قیام کی تجویز

مارچ ۱۹۳۶ء میں فرانٹیئر لیجسلیٹو کونسل میں غیر سرکاری قرارداد منظور ہوئی جس میں صوبہ سرحد میں یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا، اس موقع پر ڈاکٹر آرگل، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے ایوان کو بتایا کہ صوبائی حکومت نے اس سلسلے میں مرکز سے پُرزور سفارش کر رکھی ہے۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ مجوزہ یونیورسٹی نہ صرف صوبہ سرحد بلکہ قبائلی علاقہ کی بھی ضروریات پوری کرے گی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان ایک باخبر اور زیرک انسان تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، اس لئے بڑا انتظامی تجربہ رکھتے تھے، انہیں علم تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا تناسب بہت زیادہ ہے اس لئے اپنے دور میں ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ نئی آسامیوں کے لئے مسلمانوں کو ترجیح دی جائے۔ اسلامیہ کالج پشاور کے قیام کے بعد اب تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد خاصی بڑھ چکی تھی، بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر ماہ ہر سرکاری محکمے سے رپورٹ طلب کرتے تھے کہ مہینے کے دوران کتنی آسامیاں خالی ہوئیں اور ان پر کن لوگوں کو لگایا گیا۔ ہندو اس صورتِ حال سے پریشان تھے اس لئے کونسل کے اجلاس کے وقت ایک پمفلٹ ممبروں میں تقسیم کیا گیا جو ایک "سرحدی ہندو" کی طرف سے شائع کیا گیا تھا، اس پمفلٹ میں اعداد و شمار دے کر واضح کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کی حق تلفی ہو رہی ہے، حالانکہ فی الحقیقت ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اپنے تناسب آزادی کے اعتبار سے اس وقت بھی ہندو خاصی تعداد میں سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

قائداعظمؒ کا اوّلین دورۂ سرحد

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ملکی سیاست میں خاصی تیزی آگئی، چونکہ نئے ایکٹ کے تحت انتخابات ہونے والے تھے اس لئے تمام جماعتیں تیاری میں لگ گئیں ——

قائداعظم محمد علی جناح شروع ہی سے ایک معتدل مزاج اور آئین پسند رہنما تھے، ان کی اصول پرستی مثالی درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں انہوں نے مرکزی اسمبلی کی رکنیت تک سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اسی طرح سائمن کمیشن کا بھی مکمل بائیکاٹ کیا تھا، تاہم وہ خواہ مخواہ کی انتہا پسندی کے بھی حامی نہ تھے۔ اس وقت تک مسلم لیگ پر انتہا پسند گروہ چھایا ہوا تھا اس لئے قائداعظم نے خاموشی ہی بہتر سمجھی، وہ لندن ہی میں آباد ہو گئے اور پریوی کونسل میں وکالت شروع کر دی ——

ادھر مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد مسلمانانِ ہند کسی مؤثر قیادت سے محروم ہو چکے تھے، لیڈر شپ میں جو خلاء نمودار ہو چکا تھا اسے پورا کرنا ضروری تھا، چنانچہ علامہ اقبال، نواب زادہ لیاقت علی خان اور دوسرے مسلمان زعماء نے اپنے خطوں میں قائداعظم پر زور دیا کہ وہ ان نازک حالات میں ملک واپس آکر مسلمانوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ بالآخر ۱۹۳۴ء میں وہ وطن واپس آگئے ــــ اُن کی آمد سے مسلمانانِ ہند کی سیاست میں ایک روشن اور مبارک دور کا آغاز ہوا ــــ انہوں نے آتے ہی مسلم رائے عامہ کو منظم کرنا شروع کر دیا ــــ مولانا شوکت علی نے ان کا بھرپور ساتھ دیا ان کے اس جذبۂ ایثار کی بدولت مسلم لیگ مجلسِ خلافت کی جانشین بن گئی اور قریب قریب سبھی خلافتی کارکن مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگے۔

قائداعظم ملک کے بہترین مسلمان پارلیمنٹرین تو تھے ہی اب مقبول ترین عوامی رہنما بھی بن گئے پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کا المیہ یہ تھا کہ اُن کی سیاست چند شخصیتوں سے وابستہ تھی اور وہ اس وقت تک کسی ملک گیر مسلمان جماعت کی حمایت سے محروم تھے۔ صوبہ سرحد میں انفرادی طور پر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے مسلمانوں کی شاندار خدمات انجام دی تھیں لیکن ان کا مقابلہ کانگرس ایسی منظم سیاسی جماعت سے تھا، اگر ان حالات میں صاحبزادہ صاحب کو بھی کسی ملک گیر سیاسی جماعت کی پشت پناہی حاصل ہوتی تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔

یہ وہ سیاسی حالات تھے جن میں قائداعظم محمد علی جناح پہلی بار صوبہ سرحد کے دورے پر آئے۔ جون ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں صوبہ سرحد کے کچھ مسلم لیگیوں نے بھی شمولیت کی اور قائداعظمؒ کو دورۂ سرحد کی دعوت دی، ۱۹۳۱ء میں قائداعظم محمد علی جناح گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہونے والے تھے تو خان پیر بخش خان، خان علی گل خان اور خان عبدالغفار خان پر مشتمل ایک سرحدی وفد نے بمبئی میں اُن سے ملاقات کر کے سرحد کے مسائل سے آگاہ کیا تھا اور اپیل کی تھی کہ وہ صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات دلانے کی پوری کوشش کریں، پیر بخش خان نے قائداعظم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا تھا چنانچہ ۱۹۳۶ء میں بھی انہوں نے خط لکھ کر قائداعظم کو صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

اپنی تصنیف "سیاسیاتِ سرحد کے ارتقائی منازل" میں اللہ بخش یوسفی لکھتے ہیں کہ "قائداعظمؒ

خود بھی صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کے خواہاں تھے لیکن حالات سازگار نہ تھے، لہٰذا جمعیت خلافت کی طرف سے ہم نے مولانا شوکت علی خان کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ایک رفیق نے جو وکالت کرتے تھے (یوسفی صاحب کی مُراد پیر بخش خان ایڈووکیٹ سے ہے) جناب محمد علی جناح کو پشاور آنے کی دعوت دے دی، اس پر جمعیتِ خلافت پشاور کے باقی ارکان بڑے پریشان ہوئے، انہیں خدشہ تھا کہ دورہ کامیاب نہیں ہوگا جس سے جمعیتِ خلافت کی سُبکی ہوگی اور مخالفوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔" اس پر یوسفی صاحب نے لاہور جا کر قائداعظم سے ملاقات کی انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ وہ پشاور آنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ لیکن قائداعظمؒ بڑے باصول اور مستقل مزاج انسان تھے، انہوں نے جواب میں بس اتنا ہی کہا ــــ "اب میں دعوت قبول کر چکا ہوں ــــ میں دورۂ سرحد پر ضرور جاؤں گا۔"

اصل حالات یوں تھے کہ میونسپل انتخابات کے دوران پشاور کے خلافتی کارکن دو دھڑوں میں بٹ چکے تھے، ایک گروہ پیر بخش خان کے ساتھ تھا جس کی قیادت آغا سید لال بادشاہ کے ہاتھ میں تھی جب کہ دوسرا گروہ سردار عبدالرب نشتر کے حامیوں پر مشتمل تھا جس میں اللہ بخش یوسفی اور رحیم بخش غزنوی کے نام قابلِ ذکر ہیں ــــ نشتر گروہ کا خیال تھا کہ قائداعظم کو صوبہ سرحد کے دورے پر بُلا کر پیر بخش خان اپنی سیاسی پوزیشن کو مضبوط بنا کر آنے والے انتخاب میں فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، چنانچہ اسی جذبۂ مسابقت کا اظہار بعد میں بھی ہوا اور قائداعظم کی آمد پر سردار نشتر اور اُن کے ساتھیوں نے کیمبل پور پہنچ کر قائداعظم کا استقبال کیا جب کہ باقی ماندہ ارکان خلافت پشاور شہر کے ریلوے سٹیشن پر اُن کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔

قائداعظم کے دورے کے سلسلے میں جو مجلسِ استقبالیہ تشکیل دی گئی اس کے صدر آغا سید لال بادشاہ تھے اور سیکرٹری پیر بخش خان ایڈووکیٹ ــــ ایک کارکن عبدالعزیز خوشحباش کو لاہور بھیجا گیا تھا کہ وہ قائداعظم کو اپنے ہمراہ لائے۔

قائداعظمؒ اس سے قبل مرکزی اسمبلی میں اور دوسرے مواقع پر صوبہ سرحد کو سیاسی مراعات دلانے کی پوری جدوجہد کرتے رہے تھے، اس لئے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کی خدمات کا دلی معترف تھا۔ تاہم عوام میں وہ ابھی زیادہ متعارف نہیں تھے۔

۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کی صبح کو قائداعظم محمد علی جناح پشاور ریلوے سٹیشن پر اُترے۔ وہ انگریزی سوٹ اور سفید سولا ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔ آغا لال بادشاہ کی قیادت میں مجلس خلافت کے سرکردہ ارکان اور معززینِ پشاور اُن کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے، قائداعظم کو موٹر کار میں بٹھایا گیا اور ایک جلوس کی صورت میں بڑے بڑے بازاروں سے گزار کر منڈھی بیری یکہ توت لایا گیا۔ سید اقبال شاہ بخاری (ایڈووکیٹ) فرزند آغا سید لال بادشاہ، جو اُس وقت نوعمر بچے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ قائداعظم کی آمد پر پشاور کے مسلمان بہت خوش تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ قائداعظمؒ اس مکان میں ٹھہرے جس میں آج کل گورنمنٹ گرلز ہائی سکول یکہ توت کام کر رہا ہے، قیام و طعام کا انتظام مجلس خلافت ہی نے کیا تھا۔ اور خلافتی رضاکار باقاعدہ پہرہ بھی دیا کرتے تھے۔

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان دل سے قائداعظم کی قدر کرتے تھے، تاہم کھل کر سامنے نہیں آ رہے تھے، وہ بڑے محتاط انسان تھے، اُن کی خواہش تھی کہ بلا شرکت غیرے صوبہ سرحد کی سیاست پر چھائے رہیں، قائداعظم اور صاحبزادہ صاحب میں بات چیت ہوئی لیکن یہ بات چیت کوئی خاص نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں ایک اہلِ قلم، عبدالخالق خلیق نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ صاحبزادہ صاحب قائداعظم کی سیاسی بصیرت و قابلیت سے اس حد تک مرعوب تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اُن سے ملنے سے روکتے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جو کوئی ملاقات کو گیا، قائداعظم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

ایک روایت یہ ہے کہ صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی طرف سے جمخانہ کلب پشاور میں قائداعظم کے اعزاز میں ایک عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے قائداعظم اس میں شرکت نہ کر سکے، جب کہ بعض لوگوں کے نزدیک قائداعظم اس عصرانہ میں شرکت کرنا ہی نہ چاہتے تھے اور انہوں نے صاحبزادہ صاحب کے آدمیوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ "میں ٹی پارٹیوں میں شرکت کے لئے نہیں آیا بلکہ ایک خاص مقصد لے کر آیا ہوں، اگر انہوں (صاحبزادہ صاحب) نے میری بات پر کان نہ دھرا تو نہ صرف اُن کے اپنے مقصد بلکہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے مقصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔"

۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو شاہی باغ پشاور میں ایک جلسۂ عام کا انتظام کیا گیا، صوبہ سرحد میں یہ پہلا جلسہ تھا جس سے قائداعظم کو خطاب کرنا تھا۔ ان دنوں صوبے میں کانگرس پورے عروج پر تھی۔

کانگرسی ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ مسلم لیگ سرکاری جماعت ہے، قائداعظم جلسے کے لئے روانہ ہوئے تو حسب عادت انگریزی سوٹ میں ملبوس اور ہیٹ پہنے ہوئے تھے، اس پر پیر بخش خان نے مشورہ دیا کہ آپ دیسی لباس میں جلسہ گاہ جائیں تو عوام پر زیادہ اثر ہوگا اس پر قائداعظم غصہ میں آگئے اور کہا کہ "میں کسی فریب اور نمائش کو پسند نہیں کرتا ـــــ میں خالص اور بے ریا سیاست میں یقین رکھتا ہوں ـــــ اور محض دکھاوے کے لئے لباس تبدیل نہیں کرنا چاہتا ـــــ" چنانچہ اسی لباس میں انہوں نے جلسے میں شمولیت کی۔

جلسے کی صدارت آغا سید لال بادشاہ نے کی۔ آغاز میں پیر بخش خان نے قائداعظم کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ ہمیشہ اہلِ سرحد کے حقوق کی وکالت کرتے رہے ہیں اور مسلمانانِ ہند کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ صوبہ سرحد کے مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تیار ہو جائیں۔

اپنی تقریر میں قائداعظم نے مسلمانانِ سرحد کو مبارک دی کہ بالآخر اُن کے صوبے کو سیاسی مراعات مل گئی ہیں اور صوبے میں پہلی بار اسمبلی کے انتخابات ہونے والے ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ ہمیشہ صوبہ سرحد کے مفادات کے حصول کی جدوجہد کرتے رہے ہیں اور اب اس امر کے خواہاں ہیں کہ تمام مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور متحد ہو کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں۔

قائداعظم کی یہ تقریر انگریزی زبان میں تھی۔ اس لئے خان پیر بخش خان نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے اور نہایت شستہ اُردو میں قائداعظم کا پیغام حاضرین تک پہنچایا خود قائداعظم نے بھی پیر بخش خان کے اس برجستہ انداز میں ترجمے کو بہت پسند کیا۔

اس دورے کے دوران قائداعظم نے صوبہ سرحد کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء سے بھی خطاب کیا اور ایڈورڈز کالج ہال میں بھی طلباء اور اساتذہ کے سامنے اپنے دورۂ سرحد کی غرض و غایت بیان کی۔ وہ درۂ خیبر دیکھنے بھی گئے اور لنڈی کوتل میں ملک مُراد خان شنواری اور ملک سید خان شنواری کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔

اپنے اوّلین دورۂ سرحد کے آخری دن قائداعظم نے سارے صوبے کے سرکردہ مسلمان رہنماؤں کا ایک اجلاس پشاور میں بلایا۔ اجلاس میں زیادہ تر آزاد خیال رہنماؤں نے شرکت کی، "خیبر میل" پشاور کے بیان کے مطابق قائداعظم نے ان زعماء پر زور دیا کہ وہ متحد ہو کر آنے والے انتخابات میں حصہ

لیں اور جو مسلمان ممبر کامیاب ہوں وہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنا کر اہلِ سرحد کی خدمات انجام دیں۔
انتخابات میں مؤثر کردار بجالانے کے لئے ۲۰ ارکان پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جس کے کنوینر پیر بخش خان تھے، بورڈ ملک خدا بخش، حاجی محمد رمضان عبدالقیوم خان سواتی، ملک امیر عالم اعوان، حاجی کرم الٰہی، ملک سیدا خان، ملک مُراد خان، رحیم بخش غزنوی، محمد جان خان بیرسٹر، نواب محبت علی خان، خان حبیب اللہ خان، آغا سید لال بادشاہ، میاں خیر محمد جلالی، عبدالمالک خان کافور ڈھیری آزاد خان صوابی، غازی عثمان، راجہ مہدی زمان ہزارہ حکیم عبدالسلام، بہادر خان شیر گڑھی اور خان پیر بخش خان پر مشتمل تھا۔

تاہم اس بورڈ سے کوئی نمایاں کام بن نہ پڑا، الیکشن میں صرف چند مہینے باقی تھے، مسلم لیگ منظم طریق پر اس الیکشن میں حصّہ نہ لے سکی، اُمیدواروں کی اکثریت نے انفرادی طور پر انتخاب لڑا ـــــ اس کے برعکس کانگرس اس وقت صُوبے کی واحد منظم پارٹی تھی اس لئے اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب رہی۔

قائدِاعظم محمد علی جناح کے دَورے کا اثر زائل کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم کانگریس نے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور بھولا بھائی ڈیسائی کو صوبہ سرحد بھیجا۔ ان دونوں لیڈروں نے جگہ جگہ سرخپوشوں کے اجتماعات سے خطاب کیا اور ہر ضلع میں آنے والے انتخابات لڑنے کے لئے پارلیمانی کمیٹیاں قائم کیں۔ وہ صُوبے کے تمام اضلاع میں گئے اور اپنی پارٹی کو منظم کیا۔

اسلام بی بی کا واقعہ

سال ۱۹۳۶ء میں ضلع بنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ ہوگیا اور بے چینی کی فضا پیدا ہوئی۔

جھنڈو خیل ضلع بنوں کی ایک ہندو دوشیزہ رام کوری یا رام کماری نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان نوجوان امیر نور علی شاہ سے نکاح کر لیا۔ جس پر ہندو طیش میں آگئے، انہوں نے لڑکی کی ماں منسا دیوی اور چچا ہرنام داس کی طرف سے امیر نور علی شاہ پر اغواء کا مقدمہ بنا دیا ـــــ ہندو سول سرجن نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ میں لڑکی کو نابالغ ظاہر کیا، جس پر مقدمہ کا فیصلہ ہندوؤں کے حق میں ہوگیا۔ مسلمان چاہتے تو لڑکی کو وزیرستان کے قبائلی علاقے میں بھیج سکتے تھے لیکن انہوں نے قانونی ذرائع سے کام لینا بہتر سمجھا اور اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی ـــــ لڑکی نے اپنے بیان میں بالغ ہونا اور

بخوشی اسلام قبول کرنا تسلیم کیا تاہم عدالت نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کو بہانہ بنا کر لڑکی کو اس کے ہندو سرپرستوں کے حوالے کر دیا۔ ہندو اُسے ہوشیار پور (پنجاب) لے گئے۔ اُسے شدھی کر کے از سرِ نو اپنے مذہب میں داخل کیا۔ اس پر مسلمانانِ بنوں میں اشتعال پھیل گیا، ہزاروں افراد نے جلوس نکالا اور ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ اور عدالتوں کو گھیرے میں لے لیا، یہ خبر وزیرستان پہنچی تو قبائلی مجاہد بھی بپھر گئے مشہور وزیری مجاہد فقیر آف اپی نے اعلانِ جہاد کر دیا ـــــ تاہم کچھ عرصہ کی گرما گرمی کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

سنہ ۱۹۳۷ء یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے مردان اور صوابی کی تحصیلوں کو ضلع پشاور سے الگ کر کے ایک علیحدہ ضلع قائم کر دیا۔ مردان اس سے پیشتر ایک بارانی علاقہ تھا۔ لیکن دریائے سوات سے نہریں نکالی گئیں اور آبپاشی کی سہولتیں میسر آئیں تو بنجر زمینیں لہلہاتی ہوئی کھیتیوں میں تبدیل ہو گئیں، علاقے کی زرخیزی میں اضافہ ہوا، خان خوانین نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں سے زمینیں خرید لیں۔ ہر طرف خوشحالی کا دَور دَورہ ہوا۔ نئی بستیاں آباد ہوئیں، چنانچہ نظم و نسق کو بہتر طور پر چلانے کے لئے نئے ضلع کا قیام ناگزیر ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم سے بجلی کی فراہمی اور شکر سازی کے کارخانوں کے قیام کے بعد ضلع مردان کی رونقیں اور بھی بڑھ گئیں۔

لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۳۷ء کے ابتدائی مہینوں میں صوبہ سرحد میں انتخابی گہما گہمی اپنے عروج کو پہنچ گئی، کانگرس صوبے کی واحد منظم جماعت تھی، باقی اُمیدوار آزادانہ حیثیت میں انتخاب لڑ رہے تھے اُن کے ہاتھ میں کسی پارٹی کا ٹکٹ نہ تھا، عوام کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ خان خوانین سبھی "ٹوڈی" یا انگریز پرست ہیں، پشاور میں دو مسلم نشستیں تھیں جن پر تین اُمیدوار پیر بخش خان، عبدالرب نشتر اور خان عبدالقیوم خان تھے، ہر ووٹر کے دو ووٹ تھے، چنانچہ پیر بخش خان اور نشتر کامیاب ہوئے۔ عبدالقیوم خان اس ناکامی کے بعد کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر مرکزی اسمبلی کے ممبر بن گئے ـــــ آزاد اُمیدواروں کی اکثریت صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی حامی تھی، صاحبزادہ صاحب اپنے ضلع مردان کی نشست پر بھی کھڑے تھے اور خانپورہ ہزارہ کے حلقے سے بھی۔ ضلع مردان میں انہیں عبدالعزیز آف زیدہ کے ہاتھوں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا البتہ ہزارہ کی نشست پر وہ کامیاب

رہے (کامیاب امیدواروں کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے) اور بالآخر اپنی وزارت بنانے میں کامیاب رہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۳۷ء کو صوبہ سرحد کے گورنر نے پہلی صوبائی اسمبلی کی رسم افتتاح انجام دی۔ انہوں نے عوام کے سیاسی شعور کی تعریف کی کہ عوام نے انتخابات کے دوران کامل نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اور کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچنے والے ارکان کو مبارک دی۔ یہ اسمبلی کا صرف افتتاحی اجلاس تھا، اس میں قانون سازی کا کوئی کام نہ ہو سکا۔

اجلاس میں ملک خدا بخش ایڈووکیٹ کو اسمبلی کا سپیکر مقرر کیا گیا۔

۱۹۳۷ء میں چھپنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ صوبہ سرحد ایک خسارے کا صوبہ ہے، حکومت کو یہاں قبائلی مجاہدوں سے نمٹنے کے لئے نہ صرف فوج کی بھاری تعداد رکھنی پڑتی ہے بلکہ پولیس کی نفری بھی ۶ ہزار سے زیادہ ہے، انتظامیہ پر یہاں سالانہ اخراجات ۲۱ لاکھ۔ تعلیم پر ۲۲ لاکھ، پنشنوں پر آٹھ لاکھ، تعمیرات پر ۲۳ لاکھ، پولیس اور جیل خانہ جات پر ۴۲ لاکھ سالانہ تھے، وزارت کے قیام کے بعد انتظامیہ کے اخراجات میں مزید اضافہ ہو گیا، ان بھاری اخراجات کو پورا کرنے کے لئے مرکزی حکومت سے امداد لینی پڑتی تھی اور فنڈز کی کمی کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں کی طرف توجہ نہیں دی جا سکتی تھی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے بتانے کو تو اپنی مخلوط وزارت بنالی تھی لیکن وہ واضح اکثریت کی حمایت سے محروم تھے۔ اس لئے کانگرس نے دوڑ دھوپ شروع کر دی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صوبہ سرحد بھیجا گیا وہ آزاد ارکان اسمبلی سے ملے اور بالآخر ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی کے دو ارکان اور ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے چار ارکان کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو جب ایبٹ آباد میں اسمبلی کا گرمائی اجلاس شروع ہوا تو ڈاکٹر خان صاحب نے صاحبزادہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی جو ۲۲ کے مقابلے میں ۲۷ ووٹوں سے کامیاب ہو گئی اور اس طرح ڈاکٹر خان صاحب نے پہلی بار کانگرسی وزارت بنالی۔ اُن کی کابینہ قاضی عطاء اللہ خان، دیوان بھنجو رام گاندھی اور خان محمد عباس خان پر مشتمل تھی۔

پہلی سرحدی کابینہ نے جہاں پشاور کے لیڈی گرفتھ گرلز ہائی سکول میں انٹرمیڈیٹ کلاسز کھولیں۔ وہیں کامرس کی تعلیم کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ انہی دنوں صوبے میں پن بجلی کا پہلا منصوبہ مالاکنڈ

ہائیڈرو الیکٹرک سکیم تکمیل پذیر ہوا۔ کانگرس کا آرگن "پشتون" دوبارہ جاری کیا گیا، آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ ختم کر دیا گیا، سکولوں میں پشتو تعلیم کا آغاز ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اور پھر جنوری ۱۹۳۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو صوبہ سرحد کے دورے پہ آئے، اسی طرح گاندھی جی بھی آئے اور کافی دنوں تک خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کے مہمان رہے۔ سابقہ حکومتوں نے خان عبدالغفار خان اور علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا داخلہ صوبہ سرحد میں بند کر رکھا تھا، یہ پابندی ختم کر دی گئی۔

شریعت ایکٹ

سرحد اسمبلی ہی وہ پہلی اسمبلی تھی جس نے شریعت بل منظور کیا، سرحدی صوبے کے ایکٹ اطلاق قانون شخصی مسلمانان بابت ۱۹۳۵ء (۱۹۳۵ء کے چوتھے قانون) نے مسلم عوام کو یہ حق دیا کہ جانشینی، عورتوں کی خصوصی جائدادوں، منگنی، شادی بیاہ، طلاق، وصیت نامے، ترکے، ہبہ یا کسی اور مذہبی معمول یا ادارے (بشمول اوقاف کے معاملات میں) جہاں کہیں فریق مسلمان ہوں، مسلم پرسنل لاء یا شریعت ایکٹ کے فیصلے کا اصول مدنظر رکھا جائے گا، سوائے ان صورتوں کے جب اس قانون میں کسی باقاعدہ قانون سازی کے ذریعہ ترمیم یا تنسیخ کی گئی ہو یا یہ کہ صوبہ سرحد کے ضابطۂ قانون و انصاف بابت ۱۹۰۱ء کی مدت کے خلاف ہو۔ اس ایکٹ کے پاس کرانے میں پیر بخش خان پیش پیش رہے۔

کسان تحریک

ان دنوں غلہ ڈھیر اور مفتی آباد میں کسان تحریک نے زور پکڑا۔ غلہ ڈھیر میں نوابزادگان طورو کی زمینوں پر مزارعین قابض تھے، مالکان اراضی نے انہیں بے دخل کرنا چاہا تو کسانوں نے تحریک شروع کر دی۔ فارورڈ بلاک کے اراکین کسان تحریک کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ میاں اکبر شاہ وکیل، میاں مکرم شاہ ڈاگ، اسمٰعیل خیل، سمندر خان مہمند، ہاتھیاں اور ڈاکٹر خان صاحب کے صاحبزادے عبید اللہ خان اس میں پیش پیش تھے۔ کانگرسی وزارت نے نہایت سختی سے اس تحریک کو دبا دیا۔ اس سلسلے میں کسانوں پہ لاٹھی چارج اور فائرنگ کی نوبت بھی آئی۔

سال ۱۹۳۷ء کے آخر میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور حاجی صاحب ترنگ زئی نے وفات پائی۔ یہ دونوں اپنے اپنے میدان میں صوبہ سرحد کے عظیم رہنما تھے، صاحبزادہ عبدالقیوم ایک عالم گھرانے میں پیدا ہوئے، اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کی بناء پر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد

ڈالی، صوبہ سرحد کے پہلے وزیر مقرر ہوئے اور گول میز کانفرنس میں صوبہ سرحد کو ملک کے دوسرے صوبوں کے برابر مراعات دلانے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ حاجی فضل واحد آف ترنگ زئی تحصیل چارسدہ نے سرحدی عوام میں تعلیمی بیداری پھیلانے میں نمایاں حصہ لیا، جگہ جگہ مدرسے قائم کئے، اسلامیہ کالج پشاور کا سنگ بنیاد رکھا۔ بعد میں فرنگی حکومت کے خلاف عمر بھر جہاد بالسیف کیا اور علاقہ آزاد مہمند میں غازی آباد کے مقام پر دفن ہوئے۔

مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لن لتھگو صوبہ سرحد آئے اور مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ یہ بجلی گھر مالاکنڈ کے مقام پر اپر سوات نہر پر تعمیر کیا گیا، دریائے سوات سے نکلنے والی یہ نہر کئی میل تک پہاڑ کے نیچے سرنگ سے گزرتی ہے اور مردان کی وادی میں تین لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی کو سیراب کرتی ہے، اس پر پن بجلی پیدا کرنے والے تیس تیس سو کلوواٹ کے تین جنریٹر نصب ہیں جن کی بدولت پشاور اور دوسرے شہروں کو بجلی مہیا ہوتی ہے۔ بعد میں اس منصوبے کو مزید وسعت دی گئی اور درگئی کے مقام پر بھی پن بجلی گھر تعمیر ہوا۔

۱۹۳۸ء میں کانگرس وزارت نے نہ صرف سیاسی قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا بلکہ بدنام زمانہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کو بھی ختم کر دیا، اسے کالا قانون" بھی کہتے تھے اور اس کی رُو سے حکومت ہر شخص پر مقدمہ چلا سکتی تھی اور من مانی سزا دے سکتی تھی۔

اسی سال تخت بھائی ضلع مردان میں شکر سازی کے کارخانے کی تعمیر کا کام بھی شروع ہوا۔

فقیر آف اپی ۱۹۳۶ء میں اسلام بی بی کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہوا۔ تو بنوں اور اس کے نواحی قبائلی علاقہ میں شدید ردِ عمل دیکھنے میں آیا، مسلمانوں کو یقین تھا کہ انگریز اور ہندو کی سازش سے یہ نومسلم دوشیزہ دوبارہ ہندوؤں کے حوالے کر دی گئی ہے، مسلمانوں کے جذبات اس وقت بڑے برانگیختہ تھے، فقیر آف اپی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ اس سے پہلے اس کا نام کبھی سُننے میں نہ آیا۔ وہ بنوں سے ٹوچی جانے والی سڑک پر واقع اپی نامی گاؤں میں ایک غیر معروف امام مسجد تھے۔ اس نے اسلام بی بی کے واقعہ کو ہوا دی اور ہزاروں لوگوں کو فرنگی حکومت کے خلاف جہاد پر اُبھارا۔ اس نے وزیریوں اور بنوچیوں کا ایک جرار لشکر جمع کیا اور بنوں اور رزمک

کے نواح میں انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ انگریزوں نے اس کے خلاف فوج کشی کی لیکن وزیر اور محسود لڑاکوں سے ٹکر لینے میں ناکام رہے۔

جنرل مولز ورتھ نے جو اس مہم میں اہم عہدہ پر فائز تھا، لکھا ہے کہ ——

"فقیر آف ایپی نے اپنے لشکر کو اس عمدہ طریق پر منظم کیا تھا کہ اُن سے نمٹنا مشکل تھا اور تو اور فقیر نے توپیں ڈھالنے تک کا انتظام کر لیا تھا، اس کے فدائیوں کا یہ حال تھا کہ ہر لڑاکا دس دن کی خشک خوراک گھر سے لے کر آتا اور اس دن تک دادِ شجاعت دینے کے بعد جب خوراک کا ذخیرہ ختم ہوتا، رات کی تاریکی میں غائب ہو جاتا، نہ ان لڑاکوں کے لئے رسد رسانی کا انتظام تھا نہ کسی اور سہولت کا —— اس پر بھی وہ لوگ ہر مورچے پر ڈٹے ہوئے تھے"

۱۹۳۷ء کے دوران تیس ہزار فرنگی فوجی، کیل کانٹے سے لیس فقیر آف ایپی اور اس کے ہمراہیوں کے خلاف نبرد آزما تھے تاہم انہیں کسی جگہ بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی —— یہاں تک کہ بارہا ان پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی لیکن جونہی ہوائی جہاز واپس ہوتے وہ لوگ پہاڑی سے نکل کر دادِ شجاعت دینے لگتے

انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے بارہا سیاسی حربے استعمال کئے قوری خیل ملکوں کو جرگہ طلب کیا لیکن فقیر نے نوجوانوں کے جذبات کو اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ وہ اپنے ملکوں کی بات سُننے کے بھی روادار نہ تھے۔

مشہور اہلِ قلم سر ولیم بارٹن کا کہنا ہے کہ ——

"اُس ضمن میں بنوں کے سرکاری علاقوں پر قبائلی حملوں کا سلسلہ ایسا چلا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا، قتل، اغوا اور آتش زنی کی بیسیوں وارداتیں ہوئیں، تھوڑے ہی عرصہ میں ان حملوں میں دس ہندو مارے گئے، ساٹھ مکان نذرِ آتش کر دیئے گئے، حملہ آور مال مویشی بھگا کر لے گئے، اُن کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ انگریز کی فوجی چوکیوں پر حملے ہونے لگے، یہاں تک کہ پچاس فوجی لاریوں کے ایک قافلے پر جو وانا جا رہا تھا۔ شاہور تنگی کے قریب چھاپہ مارا گیا ——"

حکومت بار بار طوری خیل پر زور دیتی کہ وہ فقیر آف ایپی کو اپنے علاقہ سے نکال باہر کریں لیکن

لوگوں کو اُس سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اس بات پر آمادہ ہی نہ ہوتے ـــ مجبوراً جنرل مولز ورتھ نے فیصلہ کیا کہ فقیر کی پناہ گاہ ارسل کوٹ پر حملہ کر کے اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن جب بعد از خرابی بسیار انگریز لشکر اُن غاروں کے پاس پہنچا تو فقیر اور اس کے ساتھیوں کا دور دور تک کہیں پتہ نہ تھا، البتہ غار کے آتش دان میں آگ سُلگ رہی تھی اور ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

۳ر جون ۱۹۳۸ء تک ان لڑائیوں میں انگریز کے ۱۶۳ سپاہی ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہو چکے تھے۔ طوری خیل پر دباؤ پڑا تو مجبوراً انہوں نے فرنگی سے عارضی صلح کر کے جان چھڑائی۔

اب فقیر آف اپی طوری خیل کے علاقہ سے نکل کر مدّاخیل کے علاقہ کو چلا گیا، انگریز نے اپنی فوجی قوت میں مزید اضافہ کیا اور چالیس ہزار مسلح سپاہیوں کے ساتھ ایک "فقیر" کی سرکوبی کو روانہ ہوا۔ لیکن فقیر کبھی ایک جگہ چلا جاتا تو کبھی دوسری جگہ ـــ فوجی افسر اپنی ناکامی پہ دانت پیس کر رہ جاتے۔ انہیں سمجھ نہ آتی کہ آخر حکومت ہند کو اس فقیر سے جنگ کیوں ناگزیر نظر آتی ہے ؟

فرنگی حکومت نے اسلام بی بی کے معاملے میں مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر کے جو حماقت کی تھی، اُسے اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، قبائلی معرکوں پر کروڑوں روپے پھونک دیئے گئے لیکن پھر بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ـــ اِدھر ہندوؤں کو اس بات کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۳۸ء کو محسود اتنے دلیر ہو گئے کہ انہوں نے بنّوں شہر اور چھاؤنی پر ہلّہ بول دیا۔ محسود لڑاکوں کا دستہ کل دو سو افراد پر مشتمل تھا لیکن اس نے پولیس اور ایف' سی کو بے بس بنا دیا ـــ کئی ہندو ہلاک کر دیئے، کئی زخمی ہوئے۔ شہر کے ایک حصّے کو آگ لگا دی گئی، لاکھوں روپے کی املاک تباہ ہوئیں ـــ قبائلی لشکر کے کئی افراد بھی مقابلے کے دوران مارے گئے ـــ اس حملے کے نتیجے میں جو خوف و ہراس پھیلا، اُس کی وجہ سے سینکڑوں ہندو خاندان بنّوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر پنجاب اور دوسرے صوبوں کو چلے گئے۔ اس طرح حکومت برطانیہ کے وقار کو سخت دھچکا لگا۔

۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں بھی فقیر آف اپی کی سرگرمیاں جاری رہیں ـــ ۱۹۳۹ء میں جب یورپ کے محاذ پر جنگ کے بادل چھانے لگے تو ہٹلر نے مفتی اعظم فلسطین سیّد امین الحسینی اور بغداد کے قابلِ احترام گیلانی خانوادے کے کچھ لوگوں کو وزیرستان بھیجا تاکہ وہ اس محاذ پر انگریز کو اُلجھائے رکھیں اور اسے یہ موقع نہ دیں کہ ساری فوج جرمنوں کے خلاف میدان میں اتار سکے، اس سارے

عرصے میں بنوں اور وزیرستان میں انگریزی حکومت مفلوج ہوکر رہ گئی اور ہر جگہ خوف وہراس کی فضا طاری رہی۔

مسلم لیگ کی سرگرمیاں

کانگرس وزارت کے قیام کے بعد صاحبزادہ عبدالقیوم خان سرحد اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے سرگرم کار تھے۔ ان کی وفات پر ان کی جگہ کلاچی کے سردار محمد اورنگ زیب خان ایڈووکیٹ نے سنبھالی۔ انہوں نے پارٹی کا نام یونائیٹڈ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی بجائے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی رکھا اور اسمبلی سے باہر بھی مسلم لیگ کی تنظیم شروع کی۔ خان بہادر سعداللہ خان نے بھی ان کا ساتھ دیا، ۱۹۳۸ء میں صوبہ کے ضمنی انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ نے بھی اپنے اُمیدوار کھڑے کئے، اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ نے مولانا شوکت علی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جمال میاں فرنگی محل اور مولانا ظفر علی خان کو صوبہ سرحد کے دورے پر بھیجا۔ اس وفد نے صوبے کے مختلف مقامات پر جلسے کئے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے میں اہم کردار بجالایا۔

ان ضمنی انتخابات میں ہزارہ سے راجہ منوچہر اور عبدالرشید مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے منتخب منتخب ہوگئے۔

کانگرس وزارت کا استعفیٰ

ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ میں جنگ چھڑ گئی، برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان کی جانب سے اس عالمی جنگ کے سلسلے میں پوری مدد ملے۔ تاہم انڈین نیشنل کانگرس نے اس موقع پر عدم تعاون کی پالیسی کو اپنایا، اس فیصلے کے بعد ملک کے جن جن صوبوں میں کانگرسی وزارتیں تھیں، انہوں نے ہائی کمان کے کہنے پر استعفیٰ پیش کر دیئے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۹ء میں صوبہ سرحد کی کانگرس وزارت بھی مستعفی ہوگئی اور صوبے میں گورنر راج قائم ہوگیا۔ گورنر سر جارج کننگھم نے اپنی آسانی کے لئے پہلے سر آرتھر پارسنز کو اپنا مشیر مقرر کیا، پھر کرنل کیمبل کو ـــــ جنگ نے زور پکڑا تو جاپان نے کلکتہ تک پہ بمباری کر دی، لاکھوں لوگ ہراساں ہوکر کلکتہ سے نکل بھاگے اور کچھ عرصہ کے لئے انگریزی فوج کی توجہ شمال مغربی صوبہ سرحد کے محاذ سے ہندوستان کی شمال مشرقی سرحدات برما اور آسام کی طرف مبذول ہوگئی۔

قائداعظم نے ۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سندھ مسلم لیگ کانفرنس کراچی میں تقریر کرتے ہوئے صوبہ سرحد

کی کانگرس وزارت کی سرگرمیوں پر تبصرہ کیا اور اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ

"سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ صوبہ سرحد کا ہے، مسلم لیگ نے صوبہ سرحد کو سیاسی اصلاحات دلانے کے سلسلے میں شروع ہی سے نمایاں کام کیا، جب کہ کانگرس اور ہندو جماعتیں صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ دینے کی ہمیشہ مخالفت کرتی رہیں بالآخر ہم صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے برابر آئینی مراعات دلانے میں کامیاب ہو کر رہے ـــــ لیکن افسوس کہ صوبہ سرحد اب واردھا کے گورو کا چیلا بنا ہوا ہے ـــــ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ صوبہ سرحد کے مسلمان بہت جلد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آکر ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمان بھائیوں کی طرح اپنے آپ کو مسلم لیگ کا مطیع و فرمانبردار ثابت کر دکھائیں گے ـــــ" [1]

دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ (بہار) میں بھی قائداعظم کی ہدایت پر صوبہ سرحد کے مسلمانوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت برسراقتدار تھی۔ تاہم وزیرستان اور دوسرے آزاد قبائل پر آئے دن انگریزوں کے ہوائی جہاز بمباری کرتے تھے اور کانگرس صرف اس لئے اس پر صدائے احتجاج بلند نہیں کرتی تھی کہ کہیں ہندو ناراض نہ ہو جائیں۔ اس اجلاس میں مولانا ظفر علی خان نے علی الاعلان کہا کہ۔

"ـــــ حکومت برطانیہ کی فارورڈ پالیسی جو انڈین ڈیفنس کے نام پر شمال مغربی سرحدی صوبے کے آزاد قبائل کو جبراً اپنے قبضہ میں لانا چاہتی ہے ـــــ انتہائی فوجی کارروائیوں کے باوجود ابھی تک اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ ہزاروں انسانی جانیں اور قومی دولت ضائع ہو رہی ہے ـــــ یہ ایک بہت بڑا ضیاع ہے ـــــ جب کہ سرحد کے آزاد قبائل نے اپنے عمل سے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ وہ غلامی پر اپنی زندگی کے خاتمے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے وطن پر ہرگز ہرگز برطانوی قبضہ نہیں ہونے دیں گے بلکہ آخری وقت تک برطانوی سامراج کا مقابلہ کریں گے، لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے یہ ہے

---

[1] تاریخ مسلم لیگ ۔ مرزا اختر حسن

کہ حکومت برطانیہ حقِ خود اختیاری کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سرحد کی موجودہ پالیسی پر نظر ثانی کرے، نیز یہ اجلاس صوبہ سرحد کی کانگرس حکومت کے اس طرزِ حکومت اور پالیسی کی شدید مذمت کرتا ہے جس کی رُو سے کانگرس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قبائلی علاقوں کو بھی باقاعدہ سرکاری اضلاع میں شامل کیا جائے ــــ"

اجلاس میں اس قرارداد کی حمایت صوبہ سرحد کے نمائندے میاں ضیاء الدین بیرسٹر نے کی۔

یومِ نجات ہندوستان کے چھ سات صوبوں میں کانگرسی حکومتیں بنیں تو ہندو رہنماؤں کا دماغ آسمان کو پہنچ گیا، صدیوں کی محرومی کے بعد ہندو کو اقتدار ملا تو اس نے مسلمان اقلیتوں پر زندگی دوبھر کر دی، کون سا ستم تھا جو مسلمانوں پر نہ توڑا گیا، کانگرسی وزیروں کو عدم تشدد کی پالیسی بھول گئی اور ہر جگہ وہ ہندو راج کے قیام کے منصوبے بنانے لگے، جولائی ۱۹۳۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء کا یہ دور کانگرسی صوبوں کے مسلمانوں کے لئے قیامت کا دور تھا۔ بالآخر جب ترکِ موالات کی پالیسی کے پیشِ نظر کانگرسی وزارتوں نے استعفے دیئے تو مسلمان اقلیتوں نے سکھ کا سانس لیا ــــ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کو یومِ نجات منانے کی ہدایت کی چنانچہ ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک بھر میں "یومِ نجات" منایا گیا ــــ کانگرس کے دورِ اقتدار کے ان مظالم کا ردِ عمل یہ تھا کہ ان تمام صوبوں کے مسلمانوں نے، جہاں وہ اقلیت میں تھے کھل کر مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے صوبے پاکستان میں شامل نہیں ہو رہے، البتہ مسلمان اکثریت کے صوبے حسبِ دستور بے پرواہی سے کام لیتے رہے۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو یو۔پی میں شیعہ سنی فسادات زوروں پر تھے، خاکسار رہنما کا خیال تھا کہ فسادات کرانے میں خود کانگرسی حکومت کا ہاتھ ہے، چنانچہ ان کے کہنے پر خاکساروں نے یو۔پی حکومت کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ کانگرس وزارت ختم ہوئی تو خاکساروں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ علامہ مشرقی نے ایک پمفلٹ لکھ کر ثابت کیا کہ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں زیادہ قربانیاں مسلمانوں نے دی ہیں۔ انگریز پر لازم ہے کہ جب ہندوستان سے دستبردار ہو تو حکومت مسلمانوں کو لوٹائے، یہ پمفلٹ ضبط کر لیا گیا، یہ تحریک پنجاب کے دیہات میں بھی پھیلتی جا رہی تھی جو یونینسٹ حکومت کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی تھی، اس لئے سر سکندر حیات خان نے اس پر پابندیاں

عائد کر دیں۔ خاکسار طیش میں آکر لاہور میں جمع ہونے لگے۔ صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر علامہ مشرقی دالسرائے سے بات چیت کرنے دہلی روانہ ہوئے تو چند جوشیلے نوجوانوں کے اکسانے پر ۱۹ر مارچ ۱۹۴۰ء کو خاکساروں نے لاہور میں مظاہرہ کرنے اور حکومت کی طرف سے عائد شدہ پابندیاں توڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر ٹکراؤ ہوگیا۔ ٹبی بازار لاہور میں پولیس نے اندھا دھند گولی چلائی اور بہت سے خاکسار جاں بحق اور زخمی ہو گئے۔

قراردادِ پاکستان

اس سے قبل مسلم لیگ اپنا سالانہ اجلاس ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منعقد کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح اس اجلاس کے سلسلے میں ۲۱ر مارچ کو لاہور پہنچے تو وہاں موت کی سی خاموشی طاری تھی، ہر زبان پر یہی مطالبہ تھا کہ سر سکندر حیات سے اس مسلم کشی پر مواخذہ کیا جائے۔ کئی لوگ یہ مشورہ دیتے تھے کہ مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے، قائداعظم نے اس موقع پر انتہائی تدبر، بردباری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے مسلم لیگیوں کو اپنا استقبالیہ جلوس نکالنے سے روک دیا، سٹیشن سے سیدھے ہسپتال پہنچے۔ خاکسار زخمیوں کی عیادت کی، ایک ایک سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انہیں یقین دلایا کہ اُن سے پورا انصاف کیا جائے گا۔ اس خونیں واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے گی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، جلسے کے آغاز میں بھی خاکساروں سے ہمدردی کی۔ قرارداد منظور کی گئی، قائداعظم کے ہمدردانہ رویّہ نے لاہور کے مسلمانوں کے زخمی دلوں پر مرہم کا کام کیا اور حالات مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے سازگار ہو گئے۔

لاہور کے اس تاریخی اجلاس میں صوبہ سرحد کے مسلم لیگی عمائدین اور کارکنوں نے بھی پوری تیاری کے ساتھ حصّہ لیا، میاں ضیاء الدین (جنرل سیکرٹری) کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کے رضا کاروں نے اس موقع پر قائداعظم کے باڈی گارڈز کے طور پر خدمات انجام دیں" نوائے وقت" میں چھپنے والی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق اس اجلاس میں صوبہ سرحد کی نمائندگی سردار اورنگ زیب خان، خان بہادر سعد اللہ خان، میاں ضیاء الدین بیرسٹر، عبدالواحد خان ایڈووکیٹ، بخت جمال خان، مولوی شاہ محمد خان، میاں معاون الدین، پیر صاحب زکوڑی شریف، میاں معاون الدین، تاج محمد خان، بیگم زری سرفراز اور بہت سی دوسری شخصیتوں نے کی، سرحدی رضا کاروں کی کل تعداد ۳۲ تھی، وہ

سب بڑے منظم اور مستعد تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا یہ عظیم اجتماع مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ علامہ اقبال کے مزار کے پہلو میں ایک لاکھ مسلمانوں کے اجتماع میں اس مطالبہ کو دہرایا گیا جو حکیم الامت نے دس سال پیشتر الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں کیا تھا، قرارداد لاہور میں پاکستان کا نام تک نہ لیا گیا تھا۔ لیکن جب ہندو پریس نے اسے قرارداد پاکستان کہنا شروع کیا تو یہ اسی نام سے مشہور ہو گئی ـــــ قرارداد کا پہلا جزو دستورِ ہند ۱۹۳۵ء کے وفاقی حصے کو ناقابلِ قبول بتاتا ہے مگر جانِ سخن تیسرا فقرہ تھا کہ مسلم لیگ کی رائے میں کوئی دستوری نظام اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کو منظور نہ ہوگا جب تک مندرجہ ذیل اساسی اصول پر مرتب نہ کیا گیا ہو۔

"اُن اقطاع کو جہاں مسلمان آبادی کی اکثریت ہے (جیسے شمال مغربی اور مشرقی ہند کے اقطاع) مستقل مملکتوں کی حیثیت سے الگ شیرازہ بند کر دیا جائے ـــــ دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات وغیرہ ضروری امور میں وہ خود مختار ہوں ـــــ ان میں (غیر مسلم) اقلیت کے اور ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مذہبی، سیاسی، معاشی، تہذیبی حقوق کے تحفظ کا آئینی انتظام کیا جائے ـــــ"

اس قراردادِ پاکستان کی کھل کر حمایت ہوئی، ہندوستان کے ہر حصے کے مسلمان زعما نے اسے اپنی منزلِ مقصود قرار دیا، اس عظیم اجتماع میں مسلمانانِ سرحد کے جوش و خروش اور دلی جذبات کی ترجمانی قائدِ حزبِ اختلاف سرحد اسمبلی سردار اورنگ زیب خان نے کی۔ انہوں نے گرجتے ہوئے کہا کہ ـــــ

"میں شیر بنگال، مولوی فضل حق کی پیش کردہ قرارداد کی انتہائی پرزور الفاظ میں تائید کرتا ہوں۔ اس قرارداد کا ایک ایک لفظ ہمارے دلوں کی ترجمانی کرتا ہے اور قرارداد نہایت ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کا تقاضا کرتی ہے۔ میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں بسنے والے ان جرأت مند مسلمانوں کو دلی مبارک باد دیتا ہوں جنہوں نے اس قرارداد کی کھل کر حمایت کی جو چھ کروڑ مسلمانوں کو آزاد حکومت دلانے کی ضامن ہے۔"

"ہم مسلمانانِ صوبہ سرحد ہندوستان کی سرحدوں کے محافظ ہیں اور ہندو اکثریت کے

صوبوں میں رہنے والے مسلمان بھائیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اپنے دینی بھائیوں کے تحفظ اور بہبود کی خاطر ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو تیار رہیں"۔

مسلمانانِ ہند کا قافلۂ آزادی تو پہلے ہی قائداعظم کی رہنمائی میں رواں دواں تھا۔ اب اس کی منزلِ مقصود متعین ہو گئی تو اس کے جوش و خروش اور سرگرمی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

وائسرائے کی نئی پیشکش

جوں جوں جرمنی اور جاپان کو جنگ میں کامیابیاں ہو رہی تھیں برطانوی حکومت اپنے رویہ میں لچک دکھا رہی تھی، اگست ۱۹۴۰ء میں وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے واضح طور پر یہ پیشکش کی کہ ہندوستان کو اُن شرائط کے تحت حقِ خود اختیاری دے دیا جائے گا جس پر ہندو، مسلمان اور دوسری قومیں متحد و متفق ہوں، اس صورت میں آئندہ دستور سازی کا اختیار بھی اہلِ ہند کو سونپ دیا جائے گا۔ تاہم کانگرس نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

کانگرس سول نافرمانی کے اسی چکر میں گرفتار رہی، اس کے برعکس قائداعظم محمد علی جناح نے صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے دن رات کام کیا اور برطانوی حکومت پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبہ کو تسلیم کئے بغیر ہندوستان کا سیاسی مسئلہ ہرگز ہرگز حل نہیں ہو سکتا۔

صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گاروں نے بھی سول نافرمانی اور حکومت سے عدمِ تعاون کی تحریک میں حصّہ لیا۔ لیکن انہیں کوئی خاص کامیابی ہونے نہ پائی۔

اس سال سوبھاش چندر بوس آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔

صوبہ سرحد کی سیاسی جماعتیں

صوبۂ سرحد وہ سرزمین ہے جہاں یکے بعد دیگرے وسطی ایشیا سے حملہ آور لشکروں کے ریلے آتے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد گنگا اور سندھ کے زرخیز میدانوں کی طرف چل دیتے، اس علاقے نے بیسیوں تہذیبوں کے آثار چڑھاؤ دیکھے، کوئی تہذیب بھی مستقلاً یہاں قدم نہ جما سکی، یہاں کے لوگ کم و بیش ہر دور میں آزاد ہی رہے، اگر کسی نے انہیں طاقت کے بل بوتے پر غلام بنانا چاہا تو انہوں نے جان پر کھیل کر اس قوت کی مزاحمت کی۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں انہوں نے سکھ راج اور برطانوی شہنشاہیت سے کھل کر ٹکر لی، یہ خطہ تحریکِ مجاہدین کی سرگرمیوں کی جولان گاہ بھی رہا تو خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کا اہم مرکز بھی۔ خدائی خدمت گار تحریک کی بدولت یہاں سیاسی شعور بیدار ہوا تو مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں نے اس شعور کو مزید پختگی بخشی، قائدِ اعظم نے اہلِ سرحد کے جذبۂ حریت پر دری، ایثار اور قربانیوں کو یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا کہ

"بحیثیت مجموعی پٹھان سب لوگوں سے زیادہ منظم (اور باشعور) ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کی غلامی کا زمانہ نسبتاً کم ہے۔"

یوں تو یہاں انگریز کی مزاحمت اسی وقت شروع ہو گئی جب اس نے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ تاہم منظم سیاسی سرگرمیاں بہت بعد کو دیکھنے میں آئیں۔ ۱۹۰۱ء میں پنجاب سے چند اضلاع کو الگ کر کے صوبہ سرحد کی تشکیل ہوئی تو یہاں کے لوگ ہر ملکی تحریک کا اثر قبول کرنے لگے، تعلیم کے فروغ اور اخبارات کی اشاعت کے ساتھ عوام کا سیاسی شعور مزید بیدار ہوا، سیاسی اصلاحات سے محرومی نے حکمرانوں سے نفرت کا جذبہ تیز تر کر دیا، فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن اور دوسرے جابرانہ قوانین اور متشددانہ پالیسی نے آزادی کے شعلہ کو ہوا دی۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس کے واقعات کا سرحدی

مسلمانوں کے ذہنوں پر شدید ردِ عمل ہوا۔ پہلے پہل تو ہم خیال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہے لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہاں باقاعدہ منظم سیاسی جماعتیں منظرِ عام پر آئیں۔

مُسلم لیگ سید علی عباس بخاری، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، قاضی میر احمد، قاضی ولی خان اور دوسرے تعلیم یافتہ نوجوان میدان میں اترے اور مسلمانانِ سرحد کے حقوق کے حصول کے لئے کوشش کرنے لگے، انہی روشن خیال حضرات کی بدولت ۱۹۱۲ء میں پہلی بار یہاں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی اور میاں عبدالعزیز بیرسٹر کو جماعت کا صدر اور قاضی میر احمد خان کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا، ان نوجوانوں کا مولانا محمد علی جوہر سے گہرا رابطہ تھا اور وہ انہی کو اپنا سیاسی قائد تصور کرتے تھے ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد شہید کی گئی اور مسلمانانِ ہند نے اس کے خلاف تحریک چلائی تو ان نوجوان کارکنوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے اہلِ سرحد کو انگریز کی اسلام دشمنی سے آگاہ کیا اور انہی لوگوں کی کوششوں سے صوبہ سرحد کے مختلف مقامات سے کافی رقم جمع کر کے بھیجی گئی۔

ان لوگوں کا مقصد کسی نہ کسی رنگ میں قومی خدمت کرنا تھا۔ چنانچہ مجلسِ خلافت کا عروج ہوا تو یہی لوگ اس کی سٹیج پہ بھی نمایاں رہے، ہجرت کے دوران بھی یہی اہلِ درد آگے بڑھے اور بڑھ چڑھ کر تحریک کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے رہے، جنگِ عظیم کے دوران انگریز نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو قاضی ولی خان، سید علی عباس بخاری، محمد اکبر قریشی (ہری پور) غازی عبدالرحمٰن اور دوسرے بہت سے جوشیلے کارکن ہمیشہ کے لئے غلام ہندوستان کی سکونت ترک کر کے کابل اور ترکی چل دیئے۔ اس وقت تک خلافت اور مسلم لیگ کی سرگرمیاں آپس میں متصادم نہیں ہوتی تھیں، اس لئے زیادہ تر لوگ خلافت ہی سے وابستہ تھے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مسلم لیگ ہی وہ پہلی جماعت تھی جس نے اہلِ سرحد کے مطالبات کی حمایت کی اور صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی مراعات دلانے کی پُرزور جدوجہد کی بعد میں خلافت اور خدائی خدمت گار تحریک کا زور ہوا تو کچھ عرصہ تک صوبہ سرحد میں مسلم لیگ پس منظر میں چلی گئی، اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور اسے سکون و جمود نے آن لیا ـــــ یہ سکون و جمود اسی وقت ٹوٹا جب ۱۹۳۴ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح انگلستان کی سکونت ترک کر کے وطن لوٹے اور انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں قائدِ اعظم نے پہلی بار صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور لوگوں کو

آئندہ انتخابات میں منظم طریق سے حصہ لینے کی تلقین کی، قائداعظم کے اس دورۂ سرحد سے مسلم لیگی حلقوں میں حرکت اور حرارت پیدا ہوئی، چنانچہ ۱۹۳۷ء میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا احیاء عمل میں آیا یہ وہ دن تھے جب ایبٹ آباد میں کانگرس نے صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے خلاف اسمبلی کے اجلاس میں عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی، صاحبزادہ صاحب کو اس موقع پر احساس ہوا کہ کسی ملک گیر جماعت سے وابستگی کتنی ضروری ہے۔ چنانچہ انہی کے مشورے اور ایماء پر صوبے کے ہر جگہ سے سرکردہ مسلمانوں کو بلایا گیا، اس اجلاس میں مسلم لیگ کا احیاء عمل میں آیا اور عہدہ داروں کا انتخاب بھی کیا گیا۔ اس انتخاب کی رُو سے مولانا محمد شعیب صوبائی مسلم لیگ کے صدر، مولانا شاکر اللہ نائب صدر، حکیم عبدالعزیز چشتی جائنٹ سیکرٹری، عبدالحکیم خان جلوزئی خزانچی منتخب ہوئے، بعد ازاں صوبے کے ہر ضلعی صدر مقام اور اہم قصبوں میں بھی مسلم لیگ کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں اورنگ زیب خان، خان بہادر سعد اللہ خان، میاں ضیاء الدین، سید سلطان شاہ "الجمیعت سرحد" مولانا عبدالودود سرحدی، خان بہادر قلی خان، مرزا محمد سلیم، محمد اسمٰعیل غزنوی ایڈووکیٹ، حاجی عبدالرحمٰن، نصر اللہ خان بھانہ ماڑی، میاں غلام حسین، ارباب مدد خان تہکال، میاں محمد شفیع، رحیم بخش غزنوی، اللہ بخش یوسفی، ارباب شیر علی خان، سید لال بادشاہ اور دوسرے کارکنوں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔

۱۹۳۸ء میں مولانا شوکت علی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور دوسرے زعماء نے صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے مسلم لیگ کی تنظیم کو مستحکم بنا دیا۔ انہی دنوں ہزارہ میں سرحد اسمبلی کا ضمنی انتخاب ہو رہا تھا، کانگرس کی طرف سے راجہ مہدی زمان خان اُمیدوار تھے جب کہ مسلم لیگ کی جانب سے عبدالرشید خان طاہر خیلی کو ٹکٹ دیا گیا تھا۔ مقابلہ بہت سخت تھا، صوبہ سرحد میں ان دنوں کانگرس کی حکومت تھی۔ تاہم ان زعماء کی تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ مسلم لیگ امیدوار کامیاب ہوا اور کانگرس کو خفت اٹھانی پڑی۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ایبٹ آباد میں مسلم لیگ کانفرنس سے ہزارہ میں مسلم لیگ اور بھی مضبوط ہو گئی۔ مولانا شوکت علی کو ہاٹ بھی گئے جہاں ان دنوں سید جلال گیلانی مسلم لیگ کے صدر اور میاں غلام حیدر اختر مدیر "ہمدم" سیکرٹری تھے۔

۱۹۳۷ء کے عام انتخابات کے بعد ہندوستان کے چھ سات صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں بنیں۔

تو ہندو رہنماؤں کا دماغ آسمان کو پہنچ گیا۔ ایک مدت کے بعد ہندو کو اقتدار ملا تھا۔ طاقت کے نشہ نے اسے بدمست کر دیا۔ مسلمانوں پر زندگی دوبھر کر دی گئی، عدمِ تشدد کا سبق بھلا دیا گیا۔ ہر جگہ خونی فسادات ہوئے جن میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا ـــــ ان واقعات کا ملتِ اسلامیہ پر گہرا اثر ہوا۔ ہندو ذہنیت آشکارا ہو گئی خصوصاً مسلم اقلیت کے صوبوں میں تو لوگ دھڑا دھڑ مسلم لیگ کی طرف مائل ہوتے گئے۔

۱۹۳۹ء میں کانگرس نے برطانیہ کی جنگی پالیسی سے عدم پالیسی کا اظہار کرنے کے لئے اپنی وزارتوں کو مستعفی ہونے کی ہدایت کی تو مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ چنانچہ قائداعظم کی ہدایت پر ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو "یومِ نجات" منایا گیا۔

۱۹۴۰ء میں لاہور میں "قراردادِ پاکستان" منظور ہوئی تو مسلمانوں میں اپنے علیحدہ اور آزاد وطن کے قیام کا جذبہ اور تیز ہوا، کانگرسی کارکن ترکِ موالات کی پالیسی کے تحت جیلوں کو چلے گئے تو مسلمانوں کو اپنی صفیں درست کرنے کا اچھا موقع ملا، سرحد اسمبلی کے دس ارکان نے گرفتاری دی تو صوبائی ایوان میں کانگرس پارٹی کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو گئی اور مسلم لیگ کچھ دوسرے ممبروں کو ساتھ ملا کر صوبہ سرحد میں پہلی بار اپنی وزارت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چنانچہ ۲۵ مئی ۱۹۴۴ء کو سردار اورنگ زیب خان وزیر اعلیٰ، سردار عبدالرب نشتر وزیر خزانہ اور جناب ثمین جان خان وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ اقلیتوں کی نمائندگی اس وزارت میں سردار اجیت سنگھ نے کی۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء تک مسلم لیگ کی وزارت برسرِ اقتدار رہی۔

اس وقت تک مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن چکی تھی۔ وہ ہندو اور انگریز دونوں سے مقابلہ کرنے کو تیار تھی ـــــ انگریزی حکومت سے پہلی بار پنجہ آزمائی جولائی ۱۹۴۱ء میں ہوئی، وائسرائے ہند نے جنگی کوششوں میں تعاون کے لئے ایک نئی مجلسِ دفاع ہند قائم کی تھی جس میں کئی لیگی ارکان اور صوبائی وزیر بھی شامل تھے۔ قائداعظم نے ہدایت کی کہ اس مجلسِ دفاع سے استعفےٰ دے دیئے جائیں۔ چنانچہ ارکان کی اکثریت مستعفی ہو گئی۔ جن تین چار ممبروں نے اس حکم کی تعمیل سے روگردانی کی، انہیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا ـــــ کانگرس کا منشاء تھا کہ انگریز ہندوستان سے دستبردار ہو تو اختیار اُن کے حوالے کر دیا جائے لیکن مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی قوت اور ہر دلعزیزی سے

انکار اب ناممکن ہو گیا تھا۔

لندن سے سر سٹفورڈ کرپس کو انتقالِ اقتدار کی تجاویز دے کر بھیجا گیا تو بھی مسلم لیگ نے اس کے سامنے اپنا مطالبۂ پاکستان پیش کیا اور بتا دیا کہ پاکستان سے کم کسی بات پر مسلمانانِ ہند ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔

۱۹۴۲ء میں کانگرس نے انگریز کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا تو قائداعظم نے اُسکے توڑ میں "تقسیم کرو اور چلے جاؤ" کا فارمولا پیش کیا۔

گاندھی جی نے ۱۷ جولائی ۱۹۴۴ء کو قائداعظم کو خط لکھ کر ملاقات کی دعوت دی۔ تب بھی قائدِ اعظم نے قراردادِ پاکستان کے مطابق مسلمانوں کی الگ اسلامی مملکت کے قیام پر زور دیا۔ گاندھی جی اپنی ہی بات پر اڑے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بات چیت ناکام ہو گئی۔

جون ۱۹۴۵ء میں ایک مصالحتی کانفرنس شملہ میں ہوئی۔ اس میں بھی کانگرس نے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ صرف مسلم لیگ ہی کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے مسلم ارکان کے انتخاب اور نامزدگی کا حق ہے ـــــ اب مسلمانانِ ہند پر کانگرس کی ہٹ دھرمی واضح ہو گئی۔ یہاں تک کہ کانگرسی مسلمانوں نے بھی اب گاندھی جی کا ساتھ چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا، ان میں پنجاب کانگرس کے صدر میاں افتخار الدین، صوبہ کے الا کے صدر، محی الدین کٹی، سلہٹ کانگرس کے صدر مولوی عبدالحمید اور مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر خان عبدالقیوم خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی سرگرمیاں اور تیز کر دیں، اس ضمن میں قائداعظم محمد علی جناح نے صوبہ سرحد کا دوسری بار دورہ کیا۔ اس وقت تک تہکال کے ارباب عبدالغفور خان، مردان کے شیر جان خان، لنڈی ارباب کے نور محمد خان، لوانی کلی مردان کے بخت جمال خان حاجی صاحب ترنگ زئی کے فرزند اکبر حضرت بادشاہ گل صاحب ہنڈ کے سرکردہ سیاست دان خان حبیب اللہ خان۔ خان دمساز خان، سرفراز خان خٹک عقاب، ہزارہ کے جلال بابا، عبدالعزیز چشتی، مولانا محمد اسحٰق، مفتی محمد ادریس، سردار بہادر خان، غلام جان خان طاہر خیلی، خان عباس خان (وزیر) راجہ سکندر زمان خان، مردان کے نوابزادہ محمد علی خان، شیر پاؤ کے غلام حیدر خان تنگی کے میر عالم خان، کوہاٹ کے نواب محبت علی خان، سید جلال گیلانی، غلام حیدر اخونزادہ، سالار رسول شاہ،

پشاور کے بریگیڈیر سر حسام الدین خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان کے پیر صاحب زکوڑی شریف اور پشاور کے پیر صاحب مانکی شریف اور سینکڑوں دوسرے کارکن دوسری جماعتوں سے رشتہ توڑ کر مسلم لیگ سے وابستگی اختیار کر چکے تھے، چنانچہ جب ۱۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو قائداعظم پشاور پہنچے تو آپ کا شاندار شاہانہ استقبال کیا گیا، سبز وردیوں میں ملبوس ہزاروں رضاکار فیض محمد خان سالار صوبہ اور خدا محمد خان ایڈووکیٹ کی قیادت میں اُن کی خدمت اور حفاظت پر مامور رہے، شاہی باغ میں ایک عظیم الشان مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی جس نے تحریک پاکستان کو مزید استقامت اور قوت بخشی۔

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات بڑے اہم تھے۔ انہی انتخابات کے نتائج کی بناء پر ملک کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا، نتیجہ نکلا تو مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستوں پر مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہو گئے۔ انتخابات میں سو فی صد کامیابی کی ایسی مثال شاید ہی تاریخ میں ملتی ہو، مجموعی طور پر صوبائی اسمبلیوں کی ۵۰۷ مسلم نشستوں میں سے ۴۲۷ مسلم لیگ نے جیتیں، اس پر قائداعظم کی ہدایت پر "یوم فتح" منایا گیا۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل نہ ہوئی اور سرحد اسمبلی کی ۳۸ مسلمان نشستوں میں ۱۷ پر کانگرسی امیدوار کامیاب ہوئے اور ۱۶ پر مسلم لیگی۔ دو امیدواروں کا تعلق جمعیت العلماء سے تھا اور باقی آزاد امیدوار تھے۔

انتخابات کے بعد مسلم لیگ نے اپنی سرگرمیوں مزید تیز کر دیں۔ اس نے کانگرس حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلائی، خود ۱۹۴۷ء کے اوائل میں وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن ہندوستان آئے تو لاکھوں مسلمان مردوں اور خواتین سبز جھنڈے اٹھائے پاکستان کے حق میں مظاہرہ کرتے دیکھے گئے۔ وائسرائے بھانپ گیا کہ تقسیم ملک کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا، قائداعظم کی ہدایت پر اس مرحلہ پر سرحد مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی، تاہم صوبہ سرحد میں استصواب رائے عامہ کے ذریعے یہ فیصلہ کرنے کا اعلان ہوا کہ اہل سرحد ہندوستان کا ساتھ دینا چاہتے ہیں یا پاکستان کا ——؟ جولائی ۱۹۴۷ء میں ریفرینڈم ہوا تو نہایت واضح اکثریت سے پاکستان کے حق میں ووٹ آئے۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن پاکستان

معرضِ وجود میں آیا اور مسلمانانِ برِصغیر کی دو سو سالہ جدوجہدِ آزادی کامیاب ہو کر رہی۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم و تشکیل ہوئی۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی کے خالق دینا ہال میں ایک اجلاس ہوا جس کی رُو سے مُسلم لیگ کو دو حصّوں آل انڈیا مُسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ میں تقسیم کر دیا گیا۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی حکومت بنی تو نئے نئے لوگ اس میں شامل ہوتے گئے، مصلحتوں کو اصولوں پہ ترجیح دی جانے لگی، یہاں تک کہ پیر صاحب مانکی شریف اور ان کے ساتھیوں کو نظر انداز کر دیا گیا جس پہ پیر صاحب نے جناح عوامی لیگ کے نام سے الگ جماعت بنا ڈالی۔

۲۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو چوہدری خلیق الزمان کو صدر اور محمد یوسف خان خٹک کو جنرل سیکرٹری چُن لیا گیا۔

۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خان کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا اور اس طرح حکومت اور مسلم لیگ کی صدارت ایک ذات میں مجتمع ہو گئی۔

۱۹۵۱ء میں سرحد مسلم لیگ کے انتخابات کا وقت آیا تو محمد ابراہیم خان جھگڑا خم ٹھونک کر خان عبدالقیوم خان کے مقابلے کو نکلے لیکن کامیاب ہونے نہ پائے۔

دسمبر ۱۹۵۱ء میں سرحد اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو جھگڑا گروپ اور یوسف خٹک گروپ کو ٹکٹ ہی نہ دیئے گئے، بلکہ خان قیوم نے کئی نشستوں پہ آزاد امیدواروں کا ساتھ دیا جو کامیاب ہونے پہ مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو گئے۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگی وزارت بنائی جس میں اُن کے علاوہ میاں جعفر شاہ، جلال بابا، ملک الرحمٰن خان کیانی اور سالار ایوب خان شامل تھے، ان دنوں صوبہ کی گورنری پہ خواجہ شہاب الدین فائز تھے۔

۱۹۵۳ء میں محمد علی بوگرہ وزیرِ اعظم پاکستان بنے تو انہوں نے خان قیوم کو مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا۔ اس پر صوبہ سرحد کے ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید خان نے وزیرِ اعلیٰ کا منصب سنبھالا ـــــ تھوڑے عرصہ بعد سردار عبدالرشید صوبہ سرحد کی مُسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔

اسی اثناء میں ملک میں اہم سیاسی تبدیلی عمل میں آئی اور وحدتِ مغربی پاکستان کے نام سے نیا صوبہ معرضِ وجود میں آیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ سرحد کی اسمبلی نے وحدتِ مغربی پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب وحدتِ مغربی پاکستان کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ بعد میں انہوں نے سکندر مرزا سے مل کر ری پبلکن پارٹی بنائی تو صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے اکثر مسلم لیگی ارکان نئی جماعت میں شامل ہو گئے۔

۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو مسلم لیگیوں کا ایک گروہ ان کی حمایت کرنے لگا جب کہ دوسرے گروہ نے اپنا الگ وجود قائم رکھا، اوّل الذکر گروہ کنونشن مسلم لیگ اور مؤخر الذکر گروہ کونسل مسلم لیگ کہلایا ـــــ ۱۹۶۹ء میں جنرل محمد یحییٰ خان کا مارشل لاء نافذ ہوا اور اس کے تحت انتخابات کرائے گئے تو خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں پاکستان مسلم لیگ مرکزی اسمبلی کی کافی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جب کہ صوبائی اسمبلی میں بھی اس کی کارکردگی نمایاں رہی۔

جولائی ۱۹۷۷ء سے سیاسی سرگرمیوں پہ پابندی ہے۔ صوبہ سرحد کے "مردِ آہن" خان عبدالقیوم خان اکتوبر ۱۹۸۱ء میں فوت ہو چکے ہیں، آج کل اس امر کی کوششیں زوروں پہ ہیں کہ مسلم لیگ کے مختلف دھڑے پھر سے متحد ہو کر ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کریں۔

خاکسار تحریک

اپریل ۱۹۳۱ء میں خاکسار تحریک کے قیام کا اعلان ہوا اور اسی سال ۲۵ اگست کو پانڈو کی نزد لاہور میں خاکی وردی میں ملبوس ہیلمٹ بردار نوجوانوں کی پہلی جماعت کوچہ دبازار میں پریڈ کرتی نظر آئی۔ اس تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی تھے جو ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر کے ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بیحد ذہین و فطین طالب علم تھے، ۱۸ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے ریاضی کا امتحان بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کیں اور اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وطن واپس آنے پہ وہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ مناصب پہ فائز رہے، ان کی ملازمت کا زمانہ زیادہ تر صوبہ سرحد ہی میں گزرا جہاں انہوں نے خلافت، ہجرت اور سرخپوشی کی تحریکوں کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا، وہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے، اُن کا عقیدہ تھا کہ

غلبۂ اسلام کی منزل تک تبھی پہنچا جاسکتا ہے جب ہر مسلمان روحِ جہاد سے سرشار ہو چنانچہ وہ ہر مسلمان کے لئے عسکری تربیت حاصل کرنا ناگزیر سمجھتے تھے۔ ۷ راکتوبر ۱۹۳۲ء کو علامہ مشرقی خاکساروں کا ایک چاق و چوبند دستہ لے کر پشاور پہنچے ——— اہلِ پشاور اور اُن کے علمی مرتبے اور مقام سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے جلد ہی اُن کی تحریک سے دلچسپی لینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں نوجوان خاکسار تحریک میں شامل ہو گئے، علامہ مشرقی کا یہ انقلابی اقدام حکومت صوبہ سرحد کے لئے وجہِ تشویش بن گیا، اس وقت تک مشرقی ابھی سرکاری ملازمت ہی میں تھے، ان سے اس اقدام کی وضاحت طلب کی گئی، علامہ نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایچی سن اور دوسرے حکام کو سمجھایا کہ جہاد ہر مسلمان پہ لازم ہے، اس لئے عسکری تربیت داخلِ مذہب ہے انہوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ خاکسار تحریک خالصتاً غیر سیاسی تنظیم ہے، اعتدال پسند سرحدی مسلمانوں کے ایک وفد نے صوبہ سرحد کے گورنر سے ملاقات کر کے اُسے خاکسار تحریک کے متعلق تسلی کرانی چاہی لیکن گورنر نے جواب دیا کہ "یہ تحریک صرف ایک رات میں خطرناک بن سکتی ہے" بالآخر ڈپٹی کمشنر کی طرف سے یہ پابندیاں لگائی گئیں کہ

۱ ——— خاکساروں کی بھرتی میونسپل حدود میں ڈھائی سو تک محدود رہے۔

۲ ——— پندرہ آدمیوں سے زیادہ کی کوئی جماعت نہ ہو۔

۳ ——— خاکسار صرف آٹھ بجے شام سے دس بجے تک سپاہیانہ عمل کریں۔

۴ ——— بڑے بازاروں میں مارچ نہ ہو،

۵ ——— کوئی نعرے نہ لگائے جائیں۔

۶ ——— پولیس کے فرائض میں مداخلت نہ کی جائے۔

خاکساروں نے ان شرائط کی پابندی کی، وہ خدمتِ خلق کو اپنا شعار سمجھتے اور اصلاحِ اخلاق کی کوشش کرتے، مسلمان نوجوان اُن کی عسکری شان سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ جماعت میں شامل ہونے لگے۔ اس پہ حکومت حرکت میں آگئی، علامہ مشرقی سے ملازمت سے استعفیٰ لے لیا ان کا داخلہ صوبہ سرحد میں بند کر دیا گیا، اُن کی غیر حاضری کے دوران مالک مکان سے مقدمہ کروا کر ان کا ہزاروں روپے کا سامان ضبط کرا دیا گیا۔

۱۹۳۴ء میں حکومت نے مزید سختی سے کام لیا اور پندرہ سرکردہ سالاروں کو تحریک سے علیحدگی کا نوٹس دے دیا۔ انہی میں سالارِ شہر میاں بشیر احمد صدیقی بھی تھے جن کے بارے میں علامہ نے کہا کہ "ہم سے ہمارا ایک بازو توڑ لیا گیا ہے"۔ تاہم خاکسار لیڈر نے رضاکاروں کو ہدایت دی کہ حکومت کی پابندیوں کا خیال رکھیں اور سفید کپڑوں میں عمل کیا کریں، اس پر ہزاروں سفید پوش بھی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

جون ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے واقعہ نے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی، اس سلسلے میں اگست ۱۹۳۵ء میں راولپنڈی میں ایک کانفرنس ہوئی علامہ مشرقی بھی اس مؤتمر میں شریک ہوئے اس موقع پر پشاور کے خاکساروں کے ایک باوردی دستے نے راولپنڈی میں مظاہرہ کیا، ان کی تنظیم نے دیکھنے والوں پر بڑا اچھا اثر کیا۔

تاہم حکومت مسلمانوں کو منظم ہوتے نہ دیکھ سکی اور تین سالاروں کو تحریک سے قطع تعلق کرنے کا نوٹس دیا۔ ۷ ستمبر کو مزید پانچ خاکساروں کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔ ۱۴ ستمبر کو علامہ مشرقی نے گورنر سرحد کے اس حکم کو چیلنج کرتے ہوئے لکھا کہ یا تو خاکساروں کی کسی قابلِ مواخذہ حرکت کی نشاندہی کرے بصورت دیگر انہیں آزادی سے اپنا کام کرنے دے۔

کافی عرصہ تک صوبہ سرحد میں خاکسار تحریک اسی طرح زیرِ عتاب رہی، بالآخر ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات ہوئے اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی حکومت بنی تو خاکساروں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ۲۵ اگست ۱۹۳۷ء کو تمام پابندیاں ہٹا لی گئیں ـــــ اسلامیہ کالج پشاور میں سپین جمات کے نواحی میدان میں خاکساروں کا عسکری کیمپ ہوا جس میں صاحبزادہ صاحب خود بھی شریک ہوئے۔

ستمبر ۱۹۳۷ء کے اوائل میں صاحبزادہ عبدالقیوم کی حکومت کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک منظور ہوئی اور کانگرس وزارت نے اس کی جگہ سنبھالی۔

صوبہ سرحد کی طرح یہ تحریک پنجاب میں بھی مقبول ہوئی۔ خاکسار رہنما نے حکومت پنجاب کے سامنے تین مطالبات پیش کئے۔

۱۔ زکوٰۃ کی وصولی کے لئے مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کیا جائے۔

۲۔ ایک براڈ کاسٹنگ سٹیشن کی منظوری دی جائے جو محض تبلیغ اسلام کے لئے وقف ہو۔
۳۔ سرکاری ملازموں کو خاکسار تحریک میں شمولیت کی اجازت دی جائے کیونکہ یہ خالصتاً ایک دینی جماعت ہے۔

بڑی کشمکش کے بعد ۱۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو پنجاب کی حکومت نے یہ مطالبات تسلیم کر لئے۔ لیکن یہ محض لفظی اعلان تھا، حکومت کی نیت اس سلسلے میں صاف نہ تھی۔

بعد میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کے سامنے بھی یہ تین مطالبات کئے گئے کہ

۱۔ حکومت صوبہ سرحد زکوٰۃ کے جمع و صرف کے لئے ایک قانون وضع کرے تاکہ اسلامی بیت المال کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

۲۔ صوبہ سرحد میں اوقاف کی آمدنی (جس کے متعلق سرحد اسمبلی میں قانون پاس ہو چکا ہے) ایکٹ کے مطابق جمع کی جائے۔

۳۔ خاکسار تحریک نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک معاشرتی اور مذہبی تنظیم ہے۔ اس لئے اُن سرکاری ملازمین کو، جو اس میں حصہ لینا چاہیں، شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔

اس مہم کی حمایت میں اسمبلی کے ارکان سے بھی دستخط لئے گئے، جلسوں میں بھی مطالبات دہرائے گئے جس پر وزیر اعلیٰ سرحد کے سیکرٹری نے یہ یقین دلایا کہ وزیر اعلیٰ کو ان مطالبات سے کامل ہمدردی ہے۔ لیکن اس کے برعکس وہ تحریک کی مقبولیت کو ختم کرنے پر تُل گئے۔ خاکساروں پر کفر کے فتووں کی بھرمار کی گئی، پوسٹر شائع کئے گئے جن میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ "جو خاکساروں کو قتل کرے گا۔ وہ غازی ہوگا اور جو اُن کے ہاتھوں مارا جائے گا، شہید کہلائے گا۔"

میاں احمد شاہ بیرسٹر چارسدہ نے، جو اس وقت خاکسار تحریک میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب کی توجہ اس طرف دلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ـــــ یکم مئی ۱۹۳۹ء کو میاں احمد شاہ، ارباب شیر اکبر خان اور میاں بشیر احمد صدیقی ہزارہ کے دورے پر روانہ ہوئے تو ان پر انکشاف ہوا کہ مقامی حکام بالکل خاموش تھے اور خاکساروں پر زیادتی کرنے والوں کا کوئی نوٹس نہ لیتے تھے۔

بعد میں علامہ صاحب کی ہدایت پر میاں احمد شاہ نے جو صلح کل طبیعت کے مالک تھے اور

ایک سرکردہ خدائی خدمت گار بھی رہ چکے تھے، خان عبدالغفار خان سے ملاقات کی، دونوں رہنماؤں کے مابین ایک صلح نامہ طے پا گیا کہ آئندہ کسی طرح کی کوئی اشتعال انگیزی نہ ہوگی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن ہی ۱۰ ارجون کو نوشہرہ اور اکوڑہ خٹک کے ساٹھ خاکساروں کا ایک دستہ (جس میں ۴۵ سائیکل سوار اور پندرہ پیادہ رضاکار تھے) علم نصب کرنے ڈگر زئی (موجودہ آدم زئی) گیا۔ واپسی پر وہ اکوڑہ پہنچے تو نماز مغرب کا وقت تھا، سڑک کے کنارے ایک مسجد میں انہوں نے نماز ادا کرنا چاہی تو امام مسجد نے انہیں مسجد میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ اس پر خاکساروں نے مسجد کے باہر نماز پڑھنی شروع کر دی، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ سینکڑوں مسلح آدمی اُن پر ٹوٹ پڑے، خاکسار سخت زخمی ہوئے، زیارت گل نامی ایک قریب المرگ خاکسار کو اٹھا کر قریبی دریا میں پھینک دیا گیا، ایک زخمی خاکسار کو کنویں میں پھینکنے لے جا رہے تھے کہ ایک خدا ترس شخص رسالدار عبداللہ خان نے پستول نکال لیا اور دھمکی دی کہ اگر کسی نے زیادتی کی تو خیر نہیں ہوگی۔ ایک دوسرے خاکسار کو باندھ کر قتل کرنے والے تھے کہ قریبی تھانہ سے پولیس بھاگتی آئی۔ روشنی کے گولے چھوڑے جس پر قاتل بھاگ گئے، زخمی خاکساروں کو پولیس نے حملہ آوروں سے چھڑایا۔ نوشہرہ کے شمس خان اس جتھے کے سالار تھے۔

۱۹۳۹ء میں صوبہ یو۔ پی کے شہر لکھنؤ میں شیعہ سُنّی فسادات زوروں پر تھے، علامہ مشرقی کے نزدیک یہ سب کچھ حکومت کی سازش کا نتیجہ تھا۔ وہ احتجاج کرنے لکھنؤ گئے تو حکومت نے ایک جعلی معافی نامہ اُن سے منسوب کر کے شائع کر دیا۔ جس پر خاکسار رہنما دوبارہ لکھنؤ گئے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا، جو لوگ اُن کے ساتھ تھے ان میں بھی اکثریت صوبہ سرحد کے لوگوں کی تھی، جن میں میاں احمد شاہ بیرسٹر چارسدہ، خان حبیب اللہ خان ایڈووکیٹ بنوں، عبداللہ جان ایڈووکیٹ پشاور ارباب شیر اکبر خان پشاور اور حکیم محمد اکرم خان جلیسی ایبٹ آباد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان گرفتاریوں کے خلاف خاکساروں نے چاروں طرف سے لکھنؤ پہنچنا شروع کر دیا اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی، بلند شہر، میرٹھ اور کئی دوسرے مقامات میں خاکساروں پر گولی چلائی گئی بہت سے خاکسار شہید اور زخمی ہوئے، اس وقت تک خاکسار مسلم لیگ کے حلیف تھے، چنانچہ دہلی کیمپ میں قائدِ اعظمؒ اور نوابزادہ لیاقت علی خان نے علامہ مشرقی اور میاں احمد شاہ سے ملاقات

کی اور اپنی حمایت کا یقین دلایا ـــــ یو۔پی کی جیلوں میں خاکسار قیدیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تاہم نومبر ۱۹۳۹ء میں کانگرسی وزارتوں نے استعفےٰ دیئے تو قیدیوں کو رہائی ملی۔

اس وقت تک خاکسار تحریک پنجاب کے دیہات میں جڑیں پکڑ چکی تھی، یہ بات پنجاب کے وزیراعلیٰ سکندر حیات خان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس نے اس تحریک کو یونینسٹ پارٹی کے اقتدار کے لئے خطرناک سمجھتے ہوئے اسے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور عسکری نوعیت کی تمام جماعتوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا، علامہ مشرقی نے سکندر حیات کے پاس وفد بھیجے لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ بالآخر علامہ وائسرائے سے ملاقات کی غرض سے دہلی روانہ ہو گئے، ان کی غیر حاضری میں کسی نے ایسا چکر چلایا کہ خوشحال خان جدون نامی ایک سالار نے خود بخود مجلسِ مشاورت طلب کی، حالانکہ اُسے ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کی خونین صبح کو تین سو تیرہ کفن پوش خاکساروں کا ایک جیش بھاٹی گیٹ سے مظاہرے کی غرض سے نکلا۔ یہ جیش تین دستوں پر مشتمل تھا، پہلے دستے کی کمان آغا فرمان علی شاہ پشاوری کے ہاتھ میں تھی، اس کے بعد سبز و خان (راولپنڈی) اور صدیق بہادر کے دستے تھے، پورے جیش کی کمان بقول شہید فارابی پشاور کے الٰہی بخش خان کے ہاتھ میں تھی، جیش کا علمبردار صدیق نامی خاکسار تھا، اس کے عین پیچھے منصور ضیغم اور میر ولایت حسین تھے، ٹبی پولیس سٹیشن کے قریب گھڑ سوار پولیس نے اس خاکسار جیش کو روکنے کی کوشش کی، انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ایس۔پی اور ڈی ایس۔پی موقعہ پر موجود تھے، پہلے پہل تو خاکساروں نے پولیس کے کئی حملے پسپا کئے لیکن بعد میں وہ کوچوں میں گھر گئے جہاں مکانوں کی چھتوں سے پولیس انہیں چُن چُن کر نشانہ بناتی رہی، بیسیوں خاکسار شہید اور زخمی ہوئے۔ علامہ مشرقی کو دہلی سے گرفتار کر لیا گیا، دوسری جگہوں کے خاکسار بھی جیل خانوں میں ڈال دیئے گئے۔

علامہ مشرقی کے بعد خاکساروں کی قیادت میاں احمد شاہ بیرسٹر چارسدہ کے ہاتھ میں رہی، میاں صاحب نے خاکساروں اور قائد تحریک کی رہائی کے لئے بڑی جدوجہد کی، جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو علامہ نے ویلور جیل میں مسلسل روزے رکھنے شروع کئے۔ انگریز تحریک کو بند کرنے پر زور دیتا تھا۔ علامہ اس پر رضامند نہ تھے۔ بالآخر ۹۵ دن کے روزوں کے بعد ۱۶ جنوری ۱۹۴۲ء کو انہیں رہا کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ویلور شہر میں رہنے کی پابندی عائد کر دی گئی۔ پابندی ختم ہوئی

تو ۳ر جنوری ۱۹۴۳ء کو لاہور پہنچے۔ انہوں نے تحریک کا پھر احیاء کیا۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں خاکساروں کا بہت بڑا اجتماع شاہی باغ پشاور میں ہوا۔ میاں احمد شاہ سالارِ اوّل تھے۔

۱۹۴۷ء میں علامہ مشرقی نے خاکساروں کا مرکزی کیمپ دہلی میں منعقد کیا، اُن کی شرط یہ تھی کہ اگر تین لاکھ خاکسار جمع نہ ہوئے تو تحریک کو منتشر کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس مرحلہ پر بھی خاکساروں کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا ـــــ بعد میں علامہ نے اسلام لیگ کے نام سے جماعت بنائی، جاں نثاروں نے اُن کے ہر اقدام کی حمایت کی۔ ۱۹۵۰ء میں انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ وہاں سے نکلے تو ۱۹۵۸ء میں اُنہیں ڈاکٹر خان صاحب کے قتل میں ملوث کرنے کی ناکام کوشش کی گئی، کبھی سنٹرل جیل میں رکھا گیا، کبھی شاہی قلعہ کے تہہ خانوں میں اذیتیں دی گئیں، بالآخر جب کوئی ثبوت نہ مل سکا تو اُنہیں رہا کر دیا گیا لیکن ایک عمر رسیدہ، عالم و فاضل شخصیت اتنے مصائب نہ سہہ سکی، صحت جواب دے گئی۔ ۲۷ر اگست ۱۹۶۳ء کو علامہ مشرقی انتقال کر گئے، کچھ عرصہ بعد راولپنڈی کے ایک نمائندہ اجتماع میں پشاور کے ایک آزمودہ کار کارکن میاں بشیر احمد کو قائد تحریک خاکساراں چُن لیا گیا، ۱۹۷۶ء میں قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ملتان کے محمد اشرف خان ایڈووکیٹ بھی خاکساروں کے قائد بن کر منظرِ عام پر آئے۔ پرانے کارکنوں کی موت سے تحریک کمزور پڑتی گئی۔ نوجوان نسل اس کی طرف زیادہ مائل نہ ہوئی۔ خاکسار تحریک کے سرحدی کارکنوں میں میاں احمد شاہ بیرسٹر (چارسدہ) میاں بشیر احمد صدیقی پشاور، الٰہی بخش خان میاں محمد صاحب نشان، رحیم اللہ قریشی، خواجہ ثمین جان، سالار ستم خان، سالار حاجی اللہ دتہ جانباز، سالار اکبر علی، سالار انور بیگ، خان پیر بخش خان ایڈووکیٹ خواجہ غلام قدیر ایم۔ ایچ قریشی بنوں، خان حبیب اللہ خان بنوں، رنبواز خان ایڈووکیٹ، حاجی عبدالغفار خان حکیم عبدالرحیم اور حاجی فضل قادر، کوہاٹ کے قاضی شفیع الدین، جمیل راز بنگش، فطرت قریشی، قاضی سکندر شاہ، پیر ریحان شاہ، حبیب الرحمٰن پراچہ، مردان کے نوابزادہ محمد ایوب خان تہکال کے ارباب شیر اکبر خان اور مولوی عبداللہ جان، ہزارہ کے خواجہ محمد خان اور نوشہرہ کے میاں محمد وغیرہ کے نام مشہور ہیں، پشاور کے قبرستان بیرون گنج گیٹ میں خاکسار شہداء گل بادشاہ اور محمد دین کے مزار موجود ہیں جنہوں نے گولیوں سے اپنے سینے چھلنی کرائے۔ کوہاٹ کے قاضی

سکندر شاہ کے چھوٹے بھائی اور ایک شاعر عبدالحمید لازم بھی خاکسار شہیدوں کے اسی زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

جمعیت العلماء

اسلامی معاشرے کی تعمیر و تطہیر میں علمائے کرام اور مشائخ عظام نے ہمیشہ اور ہر دور میں بڑا نمایاں کردار انجام دیا ہے، یہ حضرات اُمتِ مسلمہ کی زبان بھی ہیں اور قندیلِ راہ بھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انہی جرأت مند علماء نے انگریزی استعمار کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا، تحریک مجاہدین میں قیادت انہی کے ہاتھ میں رہی، ریشمی رُومال کی تحریک، تحریکِ خلافت تحریک ہجرت اور تحریک ترک موالات کے رُوحِ رواں یہی علماء تھے، تحریک پاکستان میں حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد، خواجہ قمرالدین سیالوی، پیر صاحب مانکی شریف، پیر صاحب زکوڑی شریف اور دوسرے دینی رہنماؤں کی خدمات کو ہرگز ہرگز فراموش نہیں کیا جائے گا۔

یوں تو ہمارے علمائے کرام ہر دینی اور سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے تاہم ان کی اپنی تنظیم جمعیت العلماء کا باضابطہ طور پر قیام ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں معرضِ عمل میں آیا، اس اجلاس میں مفتی کفایت اللہ کو جمعیت کا صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی کو ناظم منتخب کیا گیا۔ جمعیت کا دوسرا اجلاس ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مولانا محمود الحسن کی صدارت میں ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی شرکت کی۔ تیسرا اجلاس ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء کو لاہور میں ہوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، اس کے بعد قریب قریب ہر سال جمعیت کے اجلاس مختلف شہروں میں ہوتے رہے۔

صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں جمعیت العلماء کا سالانہ جلسہ پہلی بار ۲ سے ۵ دسمبر ۱۹۲۷ء تک منعقد ہوا۔ شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیری نے اجلاس کی صدارت کی جب کہ مقررین میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ عبداللہ یوسف علی ایسی ہستیاں شامل تھیں، اجلاس کو کامیاب بنانے میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان نے اہم کردار انجام دیا اور ایک نشست کی صدارت بھی کی، اس اجلاس میں آزادیٔ وطن کا مطالبہ دہرانے کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کے چودہ نکاتی پروگرام کو ہندوستان کے

سیاسی مسائل کا بہترین حل قرار دیا گیا اور اس کی مکمل تائید کی گئی۔

کچھ عرصہ تک تو جمعیت العلماء چودہ نکات کی حامی رہی بلکہ ایک بار جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے مابین انتخابی معاہدہ بھی ہوا اور دونوں جماعتوں نے ایک ہی منشور کے تحت الیکشن میں حصہ لیا لیکن بعد میں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، رفتہ رفتہ علماء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ایک گروہ کا جھکاؤ آل انڈیا نیشنل کانگرس کی طرف تھا جب کہ دوسرا گروہ اسلام کے اصولوں کے عین مطابق مسلمانوں کی آزاد مملکت کے قیام کا خواہاں تھا۔ پہلے گروہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید حسین احمد اور سید عطاء اللہ شاہ جیسے حضرات تھے تو دوسرے میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید سلیمان ندوی جیسے زعمائے ملت۔

صوبہ سرحد میں آئمہ مساجد کی اکثریت دیوبند کے فارغ التحصیل حضرات پر مشتمل تھی۔ انہوں نے جمعیۃ العلماء ہند کا ساتھ دیا اور اسے مضبوط بنانے کے لئے دن رات کام کیا، ان علماء میں مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبدالقیوم پوپلزئی، حکیم عبدالسلام، مولانا گل بادشاہ، مولانا مفتی محمود مولانا ایوب بنوری اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ شعلہ بیان مقرر تھے، جہاں جاتے اپنی تقریروں سے مسلمان عوام کے دل موہ لیتے، مجلس احرار اسلام کو بھی زیادہ تر انہی حضرات کی تائید و حمایت حاصل تھی، تاہم صوبہ سرحد میں کانگریسیوں نے ان علماء کی خدمات کی زیادہ قدر نہ کی اور ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں کئی جگہ جمعیۃ العلماء کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کر دیئے۔

قیام پاکستان کے بعد جمعیۃ العلماء نفاذ اسلام کے مطالبے کی حمایت میں پیش پیش رہی اور اس نے "قادیانیت" کے استیصال کی مہم میں بھی پُرزور حصہ لیا، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیت نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی متعدد نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور ایک وقت وہ بھی آیا جب جمعیت العلماء کے ایک قائد مولانا مفتی محمود نیپ کے اشتراک سے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔

علماء کا دوسرا طبقہ جمعیت العلمائے اسلام سے وابستہ رہا۔ اس جمعیت کے ارکان نظام اسلام کے نفاذ کے تو دلی حامی ہیں البتہ وہ لادینی سیاست میں یقین نہیں رکھتے اس لئے نیپ یا پیپلز سے

اشتراک اور تعاون کرنا اپنے اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں، مولانا شاہ احمد نورانی اس جمعیت کے سربراہ ہیں اور صوبہ سرحد کے مشائخ، پیرانِ طریقت اور بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے دین جمعیۃ العلمائے اسلام کے سرگرم کارکن ہیں۔

نوجوان بھارت سبھا

کانگرس، مسلم لیگ مجلسِ خلافت اور دوسری سیاسی پارٹیاں تو آئینی ذرائع سے حصولِ آزادی کی کوششوں میں مصروف تھیں لیکن کچھ ایسی انقلابی جماعتیں بھی کام کر رہی تھیں جو انگریز کو ملک سے نکالنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کے حامی تھے، صوبہ سرحد کی ان انقلابی جماعتوں میں پہلا نام "غدر پارٹی" کا تھا۔ یہ پارٹی ۱۹۰۸ء - ۱۹۰۹ء سے اپنے کام میں مصروف تھی، حکیم عبدالجلیل ندوی کے بڑے بھائی حکیم محمد امین اور مولوی عبداللہ جان ان انقلابی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ وہ امریکہ اور دوسرے ملکوں سے افغانستان کے راستے اسلحہ اور اخبار منگواتے اور لوگوں میں تقسیم کرتے۔

ہندو انقلابی کارکنوں میں پنڈت امیر چند بموال اور پنڈت رام چند کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ پنڈت امیر چند بموال ایک معروف صحافی تھے اور تحریکِ آزادی میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں بشیشر ناتھ اور جے گوپال کے ہمراہ کانگرس کے اجلاس میں شمولیت کے بعد لاہور سے پشاور آ رہے تھے کہ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء کو انہیں صوبہ سرحد کے پہلے ریلوے اسٹیشن خیر آباد کنڈ میں گاڑی سے اتار کر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ صوبہ سرحد میں سیاسی نوعیت کی پہلی گرفتاری تھی، انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں ایک بار پنڈت امیر چند کو عمر قید کی سزا بھی ہوئی تھی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔

پنڈت رام چند موضع یار حسین تحصیل صوابی ضلع مردان کے رہنے والے تھے، انہوں نے ایک مسلمان عالم دین سے تعلیم پائی تھی جو تحریک مجاہدین کے پرجوش حامی اور انگریز کے سخت مخالف تھے، پنڈت رام چند ایک اچھے ادیب اور نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے اخباروں میں مضمون لکھ کر پہلی بار یہ مطالبہ کیا کہ اس صوبے کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کی بجائے کسی اور موزوں نام سے پکارا جائے، فرنگی سامراج نے اُسے قوانین جرائم سرحد کے تحت گرفتار کرنا چاہا تو وہ روپوش ہو کر دہلی چلا گیا اور اخبار "اکاش" کے عملۂ ادارت میں شریک ہو گیا۔

پنڈت رام چند کا دوسرا بھائی، امیر چند بھی انقلابی نظریات سے متاثر تھا۔ وہ مشہور انقلابی

نوجوان بھگت سنگھ کے گروہ میں شامل تھا، یہ وہی گروہ ہے جس نے ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا، امیر چند گرفتار ہوا اور اُسے پھانسی دے دی گئی ـــــ اسی بم کیس کے سلسلے میں پنڈت رام چند کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو وہ کسی نہ کسی طرح فرار ہو کر امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں پہنچ گیا جہاں پٹھانوں کی کافی تعداد کھیتی باڑی کے کام میں مصروف تھی۔ رام چند نے انہیں منظم کیا، وہ انہی کی زبان میں اُن سے مخاطب ہوتا اور انہیں انگریزی سامراج کے خلاف اُبھارتا۔ اس نے امریکہ سے "غدر" اخبار بھی نکالنا شروع کیا، یہ اخبار خفیہ ذرائع سے دُنیا کے مختلف ملکوں میں پہنچتا اور انگریزی مظالم پر کڑی نکتہ چینی کرتا ـــــ ۲۳ر اپریل ۱۹۱۸ء کو ایک نابکار سکھ نوجوان نے رام چند کو قتل کر دیا، بتایا جاتا کہ یہ واردات انگریز ہی کی ایماء پر ہوئی تھی۔

یہ نوجوان پہلے پہل تو انفرادی طور پر انقلابی سرگرمیوں میں مصروف رہے لیکن ۱۹۲۹ء میں انہوں نے "نوجوان بھارت سبھا" کے نام سے ایک باقاعدہ جماعت بنالی جس کے صدر موضع گگرہ لہ پشاور کے صنوبر حسین مہمند، نائب صدر ماسٹر شیر علی خان، سیکرٹری عبدالرحمٰن ریا، نائب سیکرٹری چونی لال اور خزانچی عبدالعزیز خوشباش تھے، پشاور کے مشہور علمی خانوادے کے معزز رکن مولانا عبدالرحیم پوپلزئی رام سرن نگینہ، بخشی فقیر چند دید بھی اس انقلابی تحریک میں سرگرم حصّہ لیتے رہے اور کئی بار قید و بند کی آزمائشوں سے گزرے۔

نوجوان بھارت سبھا ایک ملک گیر جماعت تھی جو ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی، مشہور انقلابی بھگت سنگھ اس کے پہلے سیکرٹری جنرل اور بھگوتی چرن پروپیگنڈا سیکرٹری تھے، اس گروہ کے ارکان سرکاری خزانوں کو لوٹتے اور جو رقم حاصل ہوتی اس سے اسلحہ خرید کر انقلابی نوجوانوں میں تقسیم کرتے۔ وہ انگریز کو ہراساں کرنے کے لئے دہشت پسندانہ سرگرمیوں سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ۱۹۲۷ء میں لاہور میں دسہرہ کے موقع پر بم پھٹا، بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا گیا لیکن اس نے کوئی راز افشاء نہ کیا، عدم ثبوت کی بناء پر اُسے چالیس ہزار روپیہ کی ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ بعد میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہروں میں بھی اس گروہ کے ارکان نے بھرپور حصّہ لیا۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۷ء کو سائمن کمیشن کے ارکان لاہور پہنچے تو ان کے خلاف بڑا زبردست مظاہرہ ہوا جس کی قیادت مشہور انقلابی لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔ دوسرے رہنما مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری

افضل حق اور ڈاکٹر ستیہ پال بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ جونہی سائمن کمیشن کے ارکان گورنر ہاؤس جانے کے لئے مال روڈ سے گزرے مظاہرین کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ پولیس نے مظاہرین پر بے دریغ لاٹھی چارج کیا۔ جس کے نتیجہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ لاجپت رائے بھی زخمی ہوئے اور بعد میں ان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے۔

نوجوان انقلابیوں نے اپنے اجلاس میں لالہ لاجپت رائے کی ظالمانہ موت کا بدلہ لینے کا عہد کیا۔ جگہ جگہ بم پھینکے گئے۔ انگریز افسروں پر گولیاں برسائی گئیں۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۸ء کو نوجوان انقلابی راج گرو نے انگریز اے۔ ایس۔ پی سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، یہ واقعہ موجودہ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے احاطہ میں رُونما ہوا۔ پولیس نے قاتل راج گرو کا تعاقب کیا تو ایک دوسرے دہشت پسند چندر شیکھر نے پولیس پر فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل مارا گیا۔ اسی افراتفری میں بھگت سنگھ اور راج گرو بچتے بچاتے کلکتہ جا پہنچے۔

انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی کانووکیشن ہال میں تقسیم اسناد کی تقریب ہوئی۔ جب پنجاب کا انگریز گورنر تقریر کرنے اٹھا تو صوبہ سرحد کے انقلابی رام چند نے اس پر بم پھینکا، علاوہ ازیں وائسرائے کی ریلوے ٹرین کو بم سے اُڑانے کی کوشش کی گئی۔

۸ر اپریل ۱۹۲۹ء کو ملک کی مرکزی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جا رہا تھا جس کا مقصد مزدور تحریک پر پابندیاں لگانا تھا۔ سائمن کمیشن کے صدر سر جان سائمن بھی اسمبلی کی کارروائی سننے کے لئے ہال میں موجود تھے۔ جونہی ایوان میں وائسرائے کا اعلان پڑھا گیا، بھگت سنگھ پبلک گیلری سے اٹھا اور ہوم ممبر کی نشست پر بم پھینکا، زور کا دھماکہ ہوا اور بھگدڑ مچ گئی، اتنے میں بی کے دت نے دوسرا بم بھی پھینک، شرکائے اجلاس گھبرا کر بھاگے تو انقلابیوں نے پستولوں سے گولیاں چلائیں اور اس کے ساتھ ہی اشتہار بھی پھینکے گئے۔ تاہم انقلابیوں کا مقصد محض دہشت پھیلانا تھا نہ کہ کسی کی جان لینا۔ ڈیڑھ دو سال تک مقدمہ چلا بالآخر بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کو موت کی سزا سنا دی گئی۔ باقی انقلابیوں کو بھی کڑی سزائیں دی گئیں۔

نوجوان بھارت سبھا مزدوروں، دہقانوں اور محنت کشوں کے حقوق کے تحفظ کی علمبردار تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں کانگرس وزارت برسر اقتدار آئی اور اس نے مزارعین کے خلاف زمینداروں کی

حمایت شروع کی تو نوجوان بھارت سبھا نے غلہ ڈھیر اور مفتی آباد میں کانگرس گورنمنٹ کے خلاف تحریک چلائی، خود وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کے فرزند عبیداللہ خان نے بھی اس موقع پر ہزارعین کی حمایت کی، کانگرس حکومت نے سختی سے اس تحریک کو دبا دیا۔

وقت گزرنے پر نوجوان بھارت سبھا کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں تو یا انقلابی کارکن کمیونسٹ پارٹی اور فارورڈ بلاک وغیرہ تحریکوں کا ساتھ دینے لگے۔

تحریک حزب اللہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے حریت پسندوں سے جی کھول کر انتقام لیا، خصوصاً مسلمان علماء اور زعماء پر تو عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے آزادی پسند ہجرت کر کے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقہ میں آبسے، تحریک مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز چمر قند بھی اسی علاقہ میں واقعہ تھا، ان سب حریت پسندوں کی کوشش تھی کہ جیسے بھی ہو انگریزی اقتدار کے خلاف جد وجہد جاری رکھی جائے چنانچہ انہوں نے صوبہ سرحد کے قومی کارکنوں کے اشتراک سے "حزب اللہ" نامی جماعت قائم کی جس کے پروگرام میں مسلمانوں کی دینی اصلاح کے علاوہ انگریزی ساخت کی ہر قسم کی چیزوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ جماعت کا مرکز دہلی میں رکھا گیا جب کہ صوبہ سرحد میں اس کا مرکز ترنگ زئی۔ ملا صاحبؒ نجم الدین ہدہ خان عبدالغفار خان، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، حکیم محمود سنجری، حکیم اسلم سنجری اور دوسرے رہنما اس میں شامل تھے، پشاور کے ہندو سکھ سیاسی کارکن بھی اس کی دل جمعی کرتے تھے، دہلی اور پشاور کے مابین خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا۔ مجاہد اسلام مولانا عبدالرحیم اس جماعت کے سفیر کے طور پر پا پیادہ پشاور سے دہلی آیا جایا کرتے تھے، چمر قند سے پشتو کا ایک اخبار "غازی" بھی باقاعدگی کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا، اس کی تحریروں سے آزاد قبائل اور اہل ہند کو فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کرنے پر ابھارا جاتا تھا۔

۱۹۱۱ء میں برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کا جشن تاج پوشی دہلی میں منایا جا رہا تھا، سرکار پرست افراد انعام واکرام اور خطابات ملنے کی توقع پر دور دور سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے تاہم قوم پرست اور حریت پرور رہنما انگریز کی خوشیوں میں شرکت کو قومی گناہ تصور کرتے تھے، چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ انگریز سے تمام روابط توڑ لیں، صوبہ سرحد

کے مسلمانوں اور بالخصوص تحریک حزب اللہ کے کارکنوں پر ان تحریروں کا گہرا اثر ہوا۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس میں فرنگی مظالم کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات برطانوی سامراج کے خلاف پہلے ہی سے مشتعل تھے، چنانچہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی کے چاندنی چوک میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا۔ اگرچہ ان دنوں بنگال کی انقلابی پارٹی اور پنجاب میں غدر پارٹی بھی دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ تاہم بم پھینکنے کی اس واردات کی تمام تر ذمہ داری تحریک حزبُ اللہ کے سرحدی ارکان پر ڈال دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت کے سرحدی ارکان مدتوں زیرِ عتاب رہے۔

جنگِ عظیم اوّل (۱۸-۱۹۱۴ء) میں "حزب اللہ" نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ چونکہ برطانوی شہنشاہیت خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی کے خلاف جنگ پر آمادہ ہے اور خلیفہ تمام عالمِ اسلام کا سربراہ ہے اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس نازک وقت میں ترکی کی مدد کرے اور انگریز کی ہر طرح مذمت کرے۔ برطانوی شہنشاہیت یہ دیکھ کر بوکھلا اٹھی، اُس نے "انڈین ڈیفنس ایکٹ" کا قانون بنا ڈالا اور محبانِ وطن کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں، بہت سے قومی کارکن گرفتاریوں سے بچنے کے لئے صوبہ سرحد پہنچ گئے۔ اور حاجی صاحب ترنگ زئی کے پاس آزاد علاقہ مہمند میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں جب حاجی صاحب ترنگ زئی کی قیادت میں انگریزوں پر بھرپور حملہ کیا۔ گیا تو مولانا سیف الرحمٰن، حکیم محمد اسلم سنجری اور دوسرے علماء و زعماء بھی حاجی صاحب کے مجاہدین اسلام کے شانہ بشانہ مصروفِ جہاد تھے، ۱۹۱۶ء میں شبقدر کے انگریزی قلعہ پر بھی مجاہدین نے حملہ کیا اور اس جان فشانی سے لڑے کہ انہوں نے انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا —— سوڑکا دی اور کڑپہ کے محاذوں پر جو جھڑپیں ہوئیں ان میں حکیم محمد اسلم زخمی ہو گئے —— اس جہاد کے دوران مجاہدینِ اسلام کے پاس گولہ بارود ختم ہو گیا۔ چنانچہ اسلحہ اور رسد حاصل کرنے کے لئے حکیم محمد اسلم سنجری کو پشاور بھیجا گیا، ان کا فرضی نام مہاجر کاشغری تھا اور وہ حلیہ تبدیل کئے ہوئے تھے۔ وہ بچتے بچاتے پشاور میں اپنے مکان پر پہنچے۔ اسلحہ کی ایک کھیپ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ سی۔آئی۔ڈی سایہ کی طرح ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جونہی انہیں اسلم سنجری کی آمد کا پتہ چلا رات کو مکان کا گھیراؤ کر لیا گیا۔ سخت تلاشی لی گئی۔ تاہم کسی کو اُس تہہ خانے کا سُراغ کرنے کا خیال نہ آیا جہاں گولہ بارود ذخیرہ کیا گیا تھا۔ حزب اللہ کے ایک اہم کارکن ڈاکٹر عبدالکریم بھی تھے جو صدرالدین کے فرضی نام

سے سارے ملک کا دورہ کرتے اور مجاہدین کے لئے فنڈ جمع کرتے تھے۔

حکیم اسلم اور اُن کے ساتھی اکبر مجاہد حزب اللہ کے شہباز تھے، انگریز نے دونوں کو گرفتار کر لیا اور سوچا کہ ان کے گرفتار ہوتے ہی تحریک اپنی موت آپ مر جائے گی، دونوں کو موت کی سزا سُنا دی گئی۔ اس حکم کے خلاف اپیل تک نہ ہو سکتی تھی، صرف رحم کی اپیل کی جا سکتی تھی لیکن دونوں مجاہدوں نے اپنے والدین کو رحم کی اپیل کرنے سے منع کر دیا۔ اس پر اکبر مجاہد کو تو پھانسی دے دی گئی تاہم حکیم اسلم کی سزا اس بناء پر عمر قید میں تبدیل کر دی گئی کہ چیف کمشنر صوبہ سرحد سر جارج روس کیپل اُن کے والد کا شاگرد رہ چکا تھا اور اس نے پشتو زبان اُنہی سے پڑھی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں بیماری کی بناء پر حکیم محمد اسلم کو رہا کر دیا گیا۔

مشہور قومی کارکن صنوبر حسین مہمند بھی اس موقع پر حاجی صاحب ترنگ زئی کی تحریک جہاد کا پورا ساتھ دیتے رہے، وہ ایک انقلابی اخبار بھی نکالا کرتے تھے جو دستی پریس پر چھپتا تھا،

زیارت کاکا صاحب کے مولانا عزیز گل میاں نے بھی تحریک حزب اللہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے رازدار خزانچی اور معتمد علیہ شاگرد تھے، وہ شیخ الہند اور مجاہدین چرمقند اور حاجی صاحب کے مابین پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتے، بسا اوقات انہیں انتہائی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا، ہر وقت جان کا کھٹکا لگا رہتا تاہم وہ ہر مشکل سے مشکل کام کو انجام دیتے۔

فارورڈ بلاک

فارورڈ بلاک آل انڈیا نیشنل کانگرس ہی کی ایک شاخ تصور کی جاتی ہے، ۱۹۴۰ء میں جب سبھاش چندر بوس کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تو اس جماعت کو خاصی تقویت ملی، اس جماعت کے اراکین انتہا پسندانہ خیالات کے حامل تھے، اُن کا خیال تھا کہ انگریز سے گلو خلاصی کرنے کے لئے ہمیں صرف آئینی جدوجہد پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دوسرے ممکنہ ذرائع سے بھی اپنی منزل کو پانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سوبھاش بوس کے دورۂ صوبہ سرحد سے اس جماعت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ انقلابی ذہن رکھنے والے کانگرسی اس میں دھڑا دھڑ شریک ہونے لگے۔ صوبہ سرحد سے اس میں زیادہ تر وہی نوجوان شریک ہوئے جو اس سے قبل نوجوان بھارت سبھا اور دوسری انقلابی تحریکوں میں حصہ لے چکے

تھے۔ بدرشی نوشہرہ کے میاں اکبر شاہ۔ ڈاگ اسماعیل خیل کے میاں مکرم شاہ پیر پیائی کے عباد خان، پشاور کے بخشی فقیر چند وید، رام سرن نگینہ، ہاتھیاں کے سمندر خان، اچرج رام، عبدالرحمٰن ریا، ایبٹ آباد کے محمد حسین عطار اور دوسرے کارکن فارورڈ بلاک کی سرگرمیوں میں نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں جب سوبھاش چندر بوس نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا تو وہ پشاور پہنچے اور عباد خان اور دوسرے مخلص کارکنوں کی مدد سے آزاد علاقہ بھمند کے راستے افغانستان پہنچ گئے، جہاں صوبہ سرحد کے انقلابی کارکنوں نے اُن کی مدد کی اور بالآخر وہ جاپان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

غلّہ ڈھیر اور مفتی آباد میں کسانوں نے کانگرس کے خلاف جو تحریک چلائی اس میں بھی فارورڈ بلاک کے ارکان پیش پیش تھے۔

مجلسِ احرارالاسلام

مجلس احرار کی دیواریں ۱۹۲۹ء میں پنجاب خلافت کمیٹی کے ملبے پر تعمیر ہوئیں، خلافت کمیٹی پر تعطل چھایا تو مجلس احرارالاسلام کے نام سے یہ نئی جماعت بنائی گئی، باقاعدہ طور پر اس کا افتتاح ۳۱ جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ہوا اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا، اس مجلس کے بانی ارکان میں چوہدری افضل حق، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمٰن، شیخ حسام الدین، مظہر علی خان اظہر، مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[1]۔

کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے ریاست کے مسلمانوں کو مظالم کا نشانہ بنایا تو مجلس احرار اسلام کھل کر سامنے آئی۔ اس نے ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف تحریک چلائی، ہزاروں کارکن کشمیر پہنچے اور انہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ بالآخر راجہ کو مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرتے ہی بن پڑی۔ یہ مجلس احرار کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔

۱۹۳۳ء میں دوسری مرتبہ کشمیر میں پھر امتحان کا وقت آیا، ریاستی حکمرانوں کی ایماء پر ہندو مسلم فسادات بھڑک اُٹھے، مجلس احرار نے پھر تحریک چلائی اور ریاستی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا۔

۱۹۳۵ء میں شہید گنج کا قضیہ پیش آیا، اس مرتبہ احرار کو چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ بلکہ مولانا

---

[1] تاریخ پنجاب، اقبال صلاح الدین

ظفر علی خان نے اُن کے مقابلے میں مجلسِ اتحادِ ملت قائم کرلی، چند برس بعد اس جماعت کے رہنماؤں کا جھکاؤ بھی انڈین نیشنل کانگرس کی طرف ہوگیا۔ اس جماعت کو شعلہ بیان مقرروں کی قیادت حاصل تھی۔ یہ لوگ جہاں جاتے مجمع پر چھا جاتے۔ تاہم اب وقت کی رفتار بدل چکی تھی، مسلمان اپنی الگ مملکت کے قیام کے خواہاں تھے، اس لئے ۱۹۴۰ء کے بعد مجلسِ احرار کی مقبولیت میں اضافہ نہ ہوسکا۔ صوبہ سرحد میں اس مجلس کی قیادت زیادہ تر دیوبندی مکتبِ فکر کے علماء تک محدود رہی، چنانچہ مولانا غلام غوث ہزاروی، حکیم عبدالسلام، مولانا عبدالقیوم لوپلیٹی، سید مخدوم شاہ بنوری اور دوسرے قوم پرست علماء اس پر چھائے رہے، مجلس کے رضاکار سفید شلوار اور سرخ قمیض پہنتے اور تبر (کلہاڑی) کندھے پر رکھ کر فوجی پریڈ کیا کرتے تھے۔ کئی بار پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں احرار کانفرنسیں منعقد ہوئی، پاکستان بننے کے بعد اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔

جماعت اسلامی

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور شہر میں مولانا ظفر اقبال کی کوٹھی پہ ملک بھر سے آئے ہوئے مسلمان زعماء کا ایک اجلاس ہوا جس میں جماعت اسلامی کی تاسیس کی گئی[1]۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کے رُوحِ رواں تھے، ان کا مقصد مسلمانوں میں ذہنی اور نظریاتی انقلاب برپا کرنا تھا۔ سید مودودی نے مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا، اُن کے نزدیک مجلسِ خلافت کی ناکامی کی وجہ ترک قوم پرستی تھا، ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلافت کا لبادہ اتار پھینکا تو ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا بھی ختم ہوکر رہ گئی، دونوں قومیں ایک دوسرے سے اُلجھنے لگیں اور بالآخر مسلمانانِ ہند میں علیحدگی پسندی کی رَو چل نکلی۔ مودودی مرحوم کے الفاظ ہیں کہ

> "میرے دماغ میں یہ بات کسی طرح نہیں اترتی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کیسے ہو سکتے ہیں اور ان کو ایک قوم مان کر جو جمہوری نظام بنایا جائے گا، اس میں مسلمانوں کے لئے آخر کیا تحفظ ہو سکتا ہے ــــ؟ مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ ہوگی کہ وہ ہندو

---

[1] "جنگ" کراچی ۔ ۹ ستمبر ۱۹۷۰ء

۱۱ اکثریت کی دستبرد سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔"

۱۹۲۵ء میں سوامی شردھانند نے شدھی (مسلمانوں کو ہندو بنانے) کی تحریک شروع کر دی۔ حالانکہ یہ وہی شردھانند جو ہندو مسلم اتحاد کا بہت بڑا علمبردار سمجھا جاتا تھا اور دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے لوگوں سے بھائی بھائی بننے کی اپیلیں کیا کرتا تھا، اس سے سید مودودی بھی متاثر ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ "مسلمان اس قوم کا نام ہے جو دنیا میں اپنا ایک مشن رکھتی ہے۔"

مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کے خلوص سے شدید متاثر ہوئے تھے، مولانا جوہر نے پوچھا تھا "کاش! کوئی شخص اسلام کے مسئلہ جہاد کی پوری طرح وضاحت کرے تاکہ اس مسئلہ میں اسلام کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، ان کا سدباب ہو سکے"۔ اس سوال کا جواب میری کتاب "الجہاد فی الاسلام" ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنے عالم شباب ہی سے احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف رہے اور مضامین لکھ کر مسلمانوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے حیدر آباد دکن سے رسالہ "ترجمان القرآن" جاری کیا، ستمبر ۱۹۳۷ء میں ملک کے کئی صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہوئیں جنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، مودودی اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے ملک گیر دورہ کیا، اس دورے کے دوران وہ لاہور میں علامہ اقبال سے بھی ملے اور انہی کے مشورے پر مارچ ۱۹۳۸ء میں وہ حیدر آباد دکن کی سکونت کو ترک کر کے پٹھان کوٹ (پنجاب) میں منتقل ہو گئے۔ اپنی دنوں انہوں نے لکھا کہ "میرے پیش نظر اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو کسی طرح اپنی قومی انفرادیت اور قومی شخصیت فراموش نہ ہونے دوں اور ان کو غیر مسلم اکثریت کے اندر جذب ہونے سے بچاؤں۔"

قیام پاکستان کے بعد بھی وہ مسلسل مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلاتے رہے کہ "تم محض ایک قوم نہیں اور تمہارا مقصود محض ایک عوامی ریاست کا قیام نہیں ہونا چاہیئے بلکہ تمہارا مقصود ایک اسلامی ریاست کا قیام ہونا چاہیئے۔" اس سلسلے میں انہوں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

صوبہ سرحد میں جماعت اسلامی پہلے پہل صرف پڑھے لکھے طبقے تک محدود رہی، وہ نوجوان جو

مولانا مودودی کی اسلامی تحریروں سے متاثر تھے۔ اس طرف متوجہ ہوئے۔ درسِ قرآن کے نام سے حلقے قائم کئے گئے، طلبا اور اہلِ علم طبقہ جماعت کا حامی بنتا گیا، بارہا ایسا ہوا کہ برسرِ اقتدار طبقہ جماعت اسلامی کی طرف سے کی گئی تنقید برداشت نہ کر سکا اور اس کے سرکردہ افراد کو قید میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء کی تحریک ختمِ نبوت میں جماعت اسلامی پیش پیش رہی، سیّد مودودی کو پھانسی کی سزا دی گئی جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔

مودودی صاحب ایک بار صوبہ سرحد کے دورے پر بھی آئے اور جلسوں سے خطاب کیا، جماعت نے عام انتخابات میں بھی حصّہ لیا لیکن اسے زیادہ کامیابی ہونے نہ پائی تاہم طلبا کو اس تحریک نے بے حد متاثر کیا اور کئی کالجوں اور یونیورسٹی کے کئی شعبوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ صوبہ سرحد میں اس جماعت کے سرگرم ارکان میں ارباب محمد سعید، قاضی حسین احمد، مولانا فضل معبود، مولانا سلامت اللہ۔ ڈاکٹر یعقوب خان (ویپ) ڈاکٹر محمد یونس، سیّد میر بادشاہ ایڈووکیٹ، مولانا عبدالرحمٰن شاہ، مولانا معین الدین، حمید اللہ خان صرّاف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آج کل جماعت اسلامی کے کارکن افغان مہاجرین کی آبادکاری اور خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں، مولانا سیّد مودودی کی وفات کے بعد اب میاں محمد طفیل جماعت کے امیر اور قاضی حسین احمد (زیارت کاکا صاحب) جنرل سیکرٹری ہیں۔ جماعت کی کئی ذیلی تنظیمیں بھی ہیں۔ جو اپنی اپنی جگہ سرگرم عمل ہیں۔

تحریکِ سیرت

مسلمانوں کے لئے سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی سب کچھ ہے کیونکہ حضورؐ کی عملی زندگی قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے، یہی وجہ ہے کہ سال کے بارہ مہینے ہر جگہ سیرت النبیؐ کے جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں، تاہم تحریک سیرت کا منظّم آغاز پھلواری (پٹنہ) سے ہوا جہاں کے مولانا شاہ سلیمان ایک بڑی درگاہ کے سجادہ نشین اور صاحبِ اثر دینی رہنما تھے، اس تنظیم کے تحت ربیع الاوّل کے مہینے میں ہر شہر اور قریہ میں سیرتِ رسولِ انام صلی اللہ علیہ وسلّم کے سلسلے میں جلسے منعقد ہوتے اور حضورؐ کی حیات و تعلیمات پر تقریریں ہوتیں۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسوۂ حسنہ پیغمبرِ اسلام کے مطابق ڈھالیں اور ہر چھوٹے بڑے کام میں سنّتِ رسولؐ کی پیروی کو اپنے لئے باعثِ برکت سمجھیں۔ تحریکِ سیرت چھوٹے

کتابچے بھی شائع کرتی تاہم اَن پڑھ عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وعظ و نصیحت کی مجلسیں برپا کرتی۔

صوبہ سرحد اور پنجاب میں تحریک سیرت کو فروغ دینے میں لاہور کے قصبہ پٹی کے مولانا عبدالمجید قرشی نے نمایاں حصّہ لیا، پشاور میں اس کی شاخ قائم کرنے والوں میں سیّد لال شاہ، حاجی تصیر الدین حاجی فضل الٰہی پیش پیش رہے، انہوں نے مسلمان بچیوں کی تعلیم کے لئے مدرسۂ بنات کے نام سے ڈبگری میں ایک ادارہ بھی قائم کیا جو اب تک کامیابی سے جاری ہے، پشاور صدر میں چوہدری عبدالعزیز، مفتی عبدالغنی، حاجی محمد اسلم، حاجی محمد دین، حاجی محمد منیر، محمد شفیع صابر اور دوسرے کارکنوں نے مجلس سیرۃ النبیؐ کی بناء ڈالی اور ہر سال تبلیغ سیرت کے جلسے منعقد کرتے رہے، ان جلسوں سے مولانا اہتشام الحق تھانوی، علامہ علاء الدین صدیقی، صاحبزادہ فیض الحسن، حافظ محمد اسمٰعیل مجاہد دکن، سیّد قاسم رضوی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور دوسرے علمائے کرام خطاب کرتے ــــ پشاور شہر میں آغا سیّد ظفر علی شاہ اور دوسرے معززین نے "ادارہ تبلیغ الاسلام" کے تحت اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لئے بڑا کام کیا، یہ ادارہ ربیع الاوّل اور محرم الحرام کے ابتدائی ایام میں روزانہ شام کو شہر کے ایک نہ ایک علاقے میں تبلیغی جلسوں کا اہتمام کرتا ہے اور اس کے تحت ہر سال بارہ ربیع الاوّل کو عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں ایک بڑا شکر جلوس بھی نکلتا ہے۔

۱۹۷۶ء میں عالمی سیرت کانگرس، اسلام آباد کے انعقاد سے تحریک سیرت کو مزید فروغ ملا۔ آجکل پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح صوبہ سرحد کے ہر شہر اور قریئے میں مختلف ناموں سے سیرت کمیٹیاں قائم ہیں، علاوہ بریں ہر تعلیمی اور ثقافتی ادارے میں سیرت النبیؐ کے سلسلے میں اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں، ہمدرد فاؤنڈیشن کے تحت ہر ماہ "شام ہمدرد" پشاور میں منعقد ہوتی ہے جس میں مقررین مختلف اسلامی، اصلاحی اور معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اشاعتِ تعلیم کے سلسلے میں مختلف اسلامی انجمنوں نے بھی قوم کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ پشاور میں پہلے پہل انجمن اسلامیہ ہی نے دینی جلسوں کی طرح ڈالی۔ اس انجمن کے تحت محلہ خداداد میں اسلامیہ سکول قائم ہوا۔ جب یہ ناکافی ثابت ہوا تو خیر بازار میں اسلامیہ ہائی سکول (موجودہ گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۳) کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور پشاور کے دوسرے سرکردہ لوگوں نے مسلمان بچوں کی تعلیم میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لی، یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج کا

قیام عمل میں آیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جس سے موجودہ نسل نے فیض پایا۔ آج اسی ادارہ سے فارغ التحصیل لوگ صوبے اور ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

کوہاٹ کے دردمند مسلمانوں نے انجمن اسلامیہ کے تحت اسلامیہ ہائی سکول کی شاندار عمارت اور ایک مسلم ہال کی تعمیر کا کارنامہ انجام دیا، سردار احمد خان اسسٹنٹ کمشنر نے اس انجمن کی تشکیل و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ کوہاٹ میں اکثر اسلامی جلسے جلوس اسی انجمن کے تحت ہوا کرتے۔ ضلع کوہاٹ کے مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے کا سہرا اسی انجمن کے کارکنوں کے سر ہے۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں زیادہ تر تعلیمی ادارے ہندو سکھوں کے بنائے ہوئے تھے، اس پر انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ مخیر خواتین و حضرات نے اس انجمن کی دل کھول کر امداد کی چنانچہ ایک وسیع قطعۂ اراضی پر اسلامیہ ہائی سکول کی تعمیر عمل میں آئی۔ یاد رہے کہ یہ وہی انجمن اسلامیہ ہے جس کے صدر سردار گل محمد خان نے فرانٹر انکوائری کمیٹی (ہربرٹ کمیٹی) کے سامنے ملک کے سیاسی مسئلے کے حل کے طور پر تقسیم وطن کی تجویز پہلی بار پیش کی اور مطالبہ کیا کہ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے درّہ خیبر تک کا خطہ مسلمانوں کو دے دیا جائے تاکہ وہ وہاں اپنی خود مختار حکومتیں قائم کریں۔

بنوں کی انجمن اسلامیہ اور مجلس میلاد النبیؐ نے تبلیغی مساعی میں اہم کردار انجام دیا، تعلیمی ادارے قائم کئے اور اسلامی جلسوں کی بنیاد رکھی۔ اب تک ہر سال ربیع الاوّل میں سیرت النبیؐ کے جلسے باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں، مرحوم ماسٹر میر قلم خان نیازی جب تک زندہ رہے، اس مجلس کے سیکرٹری رہے

ہری پور کی انجمن اسلامیہ بھی مسلمانوں میں ذہنی بیداری پھیلانے کی کوشش میں پیچھے نہ رہی، اس انجمن نے ایک اسلامیہ ہائی سکول، ایک یتیم خانہ اور ایک شاندار عیدگاہ بنوائی، ایبٹ آباد کی انجمن اسلامیہ اور ادارۂ تعلیم قرآن نے بھی دین کی روشنی پھیلانے میں حتی المقدور نمایاں حصہ لیا۔

مردان میں بھی تحریک سیرت پوری طرح سرگرم عمل ہے، ماہ ربیع الاوّل میں سیرت کے جلسے اسی انجمن کے تحت منعقد ہوتے ہیں اور ایک شاندار جلوس نکالا جاتا ہے۔ نوابزادہ محمد علی خان، حاجی محمد آصف مولانا مدرار اللہ مدرار اور دوسرے دردمند مسلمان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

صوبہ سرحد کے مشائخ کرام اور پیرانِ طریقت کے آستانے وہ اسلامی اور تبلیغی مرکز ہیں جہاں سے ہر طالبِ حق کو ذہنی آسودگی اور دینی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، ان درگاہوں پر پورے التزام سے عُرس اور مجالسِ وعظ کا اہتمام ہوتا ہے، علمائے ربانی اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے ہیں اور اس طرح تبلیغ اسلام کا یہ مقدس مشن سارا سال جاری رہتا ہے، پشاور میں سیّد محمد امیر قادری (دربار سیّد حسن بادشاہؒ) گھمکول کوہاٹ کے پیر صاحب، زیارت حاجی بہادر کے منتظمین ہر پور میں خانقاہ نقشبند مجددیہ صدریہ کے سجادہ نشین قاضی محمد عبدالرائم پشاور میں مُرشد آباد کے ابوالخیر محمد عبداللہ جان، مانکی شریف کے صاحبزادگان، زکوڑی شریف کے گدی نشین، لنڈی کوتل کے باباجی کے ارادت مندان تبلیغی کوششوں میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ حضرت رحمٰن بابا اور دوسرے کئی صوفیاء کے مزارات پر ادبی تقریبوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے، پشاور کے سیّد محمد امیر قادری، تخت بھائی مردان کے قاضی عبدالحلیم اثر اور کراچی کے اعجاز الحق قدوسی نے مشائخ صوبہ سرحد کی حیات و تعلیمات پر مبنی وقیع کتابیں اردو اور پشتو میں شائع کی ہیں جن کا مطالعہ دلوں کو روشنی اور ذہنوں کو بصیرت عطا کرنے کا موجب ہے۔

لال جھنڈے کی تحریک

فرنگی استعمار کے خلاف برِصغیر کے حریت پسندوں کی سرگرمیوں کی داستان بڑی طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی، ہر ذی شعور شخص غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے کا تمنائی تھا، وہ اپنے اپنے رنگ میں کام کر کے سامراج کے خاتمے میں سرگرم نظر آتا ـــــ بڑی سیاسی جماعتوں کے علاوہ نوجوان کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ایسی تھیں جن کی پشت پہ نہ تو کسی عالی دماغ سیاسی رہنما کا ہاتھ تھا نہ کسی سرمایہ دار کا زر و مال ـــــ تاہم یہ مردانِ قلندر کسی نہ کسی طرح سامراجی قوتوں سے اپنی شدید نفرت کا اظہار کرتے ہی رہتے ایسے ہی چند من چلے نوجوانوں نے پشاور میں لال جھنڈے کی تحریک شروع کی[1]

اس تحریک کی ابتداء لاہور سے ہوئی جہاں کھڑیا مٹی اور گلیسرین کو جما کر دستی پریس بنا لیا جاتا اس پر انقلابی نوعیت کے پوسٹر چھاپے جاتے۔ یہ پوسٹر خفیہ ذرائع سے پشاور اور صوبہ سرحد کے

---

[1] مضمون ـــ رام سرن نگینہ۔

دوسرے شہروں میں بھی پہنچے۔ انگریز کی خفیہ پولیس نے ہر چند کوشش کی۔ پوسٹر شائع کرنے والوں کا سراغ نہ لگا سکی۔ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے سرحد پولیس یہ کہہ کر جان چھڑاتی کہ پوسٹروں کی طباعت کا مرکز لاہور اور صرف لاہور ہے، خود انگریزی حکومت کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ہر طرف مخبر چھوڑ رکھے تھے جن میں سے کوئی فقیروں کے لباس میں گھومتا پھرتا کوئی کھدر پوش قومی کارکن کا روپ دھار کر قومی جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوتا۔ تاہم یہ کام اتنی رازداری سے انجام پاتا کہ مدتوں کسی کو حقیقتِ حال کا پتہ نہ چل سکا۔

پشاور کے نوجوانوں کی ٹولی کے سربراہ ایک صحافی اور انقلابی کارکن رام سرن نگینہ تھے، وہ اور اُن کے ساتھی راتوں رات پوسٹر چھاپتے اور شہر کے اہم مقامات پر چسپاں کر دیتے، ایک دن لوگ صبح سویرے اپنے اپنے کاروبار پر جا رہے تھے کہ انہوں نے چوک یادگار پر لگا ہوا ایک پوسٹر دیکھا، جس کا مضمون یہ تھا۔

"لال جھنڈا صوبہ سرحد کے لوگوں کا ترجمان ہے ـــــ سرحد کے لوگ چاہتے ہیں کہ فرنگیوں کو جلد سے جلد ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ تاہم آزادی حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد سے کام نہیں چلے گا ـــــ تشدد ناگزیر ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ جس سرکار نے بے گناہ لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا۔ نہتے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا، اُس کے آگے ہاتھ جوڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ صوبہ سرحد کے نوجوانوں کو چاہیئے کہ سب کام چھوڑ کر بغاوت کا پرچم بلند کریں۔ خفیہ پوسٹر شائع کریں، بم بنائیں، ڈاکے ماریں۔ مفروروں کو پناہ دیں اور خفیہ اڈے قائم کریں ـــــ انقلابیوں پر لازم ہے کہ وہ یہ خفیہ پوسٹر ہر بڑے سرکاری ادارے میں پہنچا دیں۔"

"انقلاب زندہ باد!"

اس پوسٹر کے چھپتے ہی ہل چل مچ گئی، سینکڑوں لوگ اسے پڑھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ اتنے میں خفیہ پولیس کا ایک آدمی (غالباً میر زمان خان) مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ پوسٹر اتارا اور اُسے لے کر فاتحانہ انداز میں پولیس سٹیشن کی طرف چل دیا۔ جلد ہی پولیس حرکت میں آگئی۔ پارٹی کے دفتر واقع بازار بٹیر بازاں پر چھاپہ مارا گیا، کئی گرفتاریاں بھی ہوئیں۔

لیکن ثبوت نہ مل سکا۔ بالآخر نوجوانوں کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا تاہم پوسٹر بدستور شائع ہوتے رہے۔

ایک بار ایک پوسٹر کسی کالج تک پہنچایا تھا، وہاں کے ایک طالب علم کے حوالے کیا گیا، پولیس کو شک گزرا، راستے میں اس طالب علم کی تلاشی لی گئی لیکن کچھ برآمد نہ ہوا کیونکہ اس نے پوسٹر سائیکل کے ٹائر میں چھپا رکھا تھا۔

ایک بار لوگ مسجد مہابت خان میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد باہر نکل رہے تھے کہ کسی نے لال جھنڈے کے انقلابی اشتہار فضا میں اچھال دیئے، لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے، پولیس کو پتہ چلا تو حرکت میں آگئی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے ایک مزدور کو گرفتار کر لیا جس کے پاس ویسے بہت سے پوسٹر تھے، اس بچارے پر بڑا تشدد کیا گیا لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ مجھے کسی شخص نے چار آنے دیئے تھے کہ میں یہ پوسٹر مسجد میں پھینک دوں، مجھے کیا علم کہ ان میں کیا لکھا ہے۔

۱۹۳۸ء کی ایک صبح تھی۔ ایک انقلابی نوجوان پر کوئی پولیس کیس تھا۔ وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ خان عبدالقیوم خان بیرسٹر اس کی طرف سے وکیل تھے، کارروائی جاری تھی کہ مجسٹریٹ کرسی سے اُچھل پڑا۔ لال پوسٹر اس کے سامنے میز پر موجود تھا جسے چھاپنے اور تقسیم کرنے کے سلسلے میں نوجوان پر مقدمہ چل رہا تھا۔ پوسٹر کہاں سے آیا اور کون لایا ـــــ کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

رام سرن نگینہ پر پولیس کو شک تھا، پولیس گرفتاری کے لئے آئی تو وہ روپوش ہو گیا، پولیس نے غصے میں آکر اس کے بوڑھے باپ کو گرفتار کر لیا۔ وہ فوراً پولیس کے پاس گیا اور کہا "پوسٹر میرا ہے اور میں نے اسے شائع اور تقسیم کیا ہے ـــــ میرے والد کا قصور نہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے" پولیس خوش ہوئی کہ اصل مجرم ہاتھ آگیا۔ لیکن عدالت میں پیشی ہوئی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ مجھ سے اپنے والد کو ہتھکڑیوں میں دیکھا نہ گیا اور میں نے قصور اپنے سر لے لیا، ورنہ میرا ان پوسٹروں سے کیا تعلق ـــــ؟" پولیس نے شبہ میں دوسرے بہت سے نوجوانوں کو بھی پکڑ رکھا تھا۔ سب کی تحریر حاصل کی گئی لیکن کوئی تحریر پوسٹر کی لکھائی کے مطابق نہ تھی۔ تاہم اپنی خفت کو چھپانے کے لئے رام سرن نگینہ کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی، البتہ عدالت نے اتنا کیا کہ اپیل کی اجازت دے دی، خان عبدالقیوم اور سردار عبدالرب نشتر نے اپیل کی پیروی کی۔ اور نگینہ ضمانت پر رہا ہو گئے، بعد میں انقلابی گروہ نے ایک سائیکلو سٹائل مشین بھی حاصل کر لی۔

وہ یوں کہ دہلی میں موٹر کاروں کے پُرزے فروخت کرنے والی ایک کمپنی تھی جس کے ایک بڑے افسر انقلابی تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے، انہوں نے مشین موٹر کے پُرزوں کی پیٹی میں اپنی پشاور برانچ کو بھیج دی، جہاں سے وہ انقلابیوں کو پہنچا دی گئی۔

ایک بار انقلابیوں کو رسالپور سے کچھ خفیہ کاغذات مل گئے جن میں فوجی راز بھی تھے، انہوں نے "چند انکشافات" کے تحت وہ راز شائع کر دیئے، اس پر فوجی افسر بڑے جزبز ہوئے، کچھ نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ انہیں مارا پیٹا، لالچ بھی دیا لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

ایک بار انقلابیوں کو یہ شرارت سوجھی کہ جیسے بھی ہو پوسٹر گورنمنٹ ہاؤس پر چسپاں ہونے چاہئیں وہاں پولیس اور فوج کا کڑا پہرہ تھا، پوسٹر لگتا بھی تو کیسے ــــ؟ تاہم اس فیصلہ کے دوسرے ہی دن گورنر ہاؤس کے صدر دروازہ پر پوسٹر چسپاں پایا گیا۔ اتفاق سے کسی ضروری مشورے کی خاطر اُس وقت کے انسپکٹر جنرل پولیس گورنر سے ملاقات کو آئے تو انہوں نے صدر دروازے پر لال پوسٹر چسپاں دیکھا، بڑے سٹپٹائے، پوسٹر اُتروایا اور پولیس کے سپاہیوں پر غصہ نکالا کہ پوسٹر کون لگا گیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ صبح سے کوئی شخص ادھر سے نہیں گزرا، صرف ایک بُرقع پوش بیمار بڑھیا ابھی ابھی ہانپتی کانپتی آئی تھی اور ستانے کے لئے پھاٹک کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ بڑھیا کے بھیس میں یہ کوئی انقلابی نوجوان ہی تھا جس نے چپکے سے بُرقعے کے نیچے سے پوسٹر نکالا اور چسپاں کر دیا تھا۔

کافی عرصے تک انقلابیوں نے اسی طرح فرنگی حاکموں کا ناک میں دم کئے رکھا۔

قراردادِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک

قراردادِ پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی اور پاکستان کا قیام ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا۔ سات، ساڑھے سات سال کا یہ درمیانی عرصہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے بڑا فیصلہ کن دور تھا۔ اس دور میں برِصغیر میں سیاسی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں، اُدھر برطانوی حکومت بھی ایک کٹھن آزمائش سے گزر رہی تھی، ہٹلر کے نازی طوفان بن کر اٹھے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آسٹریا اور چیکوسلواکیہ پر چھا گئے تھے ۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمن فوجیں پولینڈ پر قابض ہو گئیں اور چند ہی ماہ کے بعد ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک پر بھی جرمنی کا پرچم لہرانے لگا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں جرمنی کے ہوائی جہاز انگلستان پر بم برسانے لگے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انگریز کو اعلانِ جنگ کرتے ہی بن پڑی۔ تاہم ہندوستان کی مرکزی اسمبلی سے اس بارے میں مشورہ تک نہ لیا گیا، البتہ ہندوستانی فوجیوں کو دھڑا دھڑ محاذِ جنگ پر بھیجا جانے لگا۔ سیاست دانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا، جس پر وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے اگست ۱۹۴۰ء میں ایک سیاسی پیش کش کی جس میں اہلِ ہند کو نوآبادتی درجہ دینے کا وعدہ کیا گیا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت ہر اس دستور کو نافذ کرنے کے لئے تیار ہے جس پر ہندو، مسلمان سکھ سبھی متفق ہوں۔ تاہم انڈین نیشنل کانگرس نے جو اس وقت ملک کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں حکومتیں بنا چکی تھی، اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے سول نافرمانی کی دھمکی دے دی۔ انگریز نے اس دھمکی کا کوئی خاص اثر نہ لیا۔ اس پر اکتوبر ۱۹۳۹ء میں کانگرسی وزارتوں نے استعفےٰ دے دیئے۔ اپنے دورِ اقتدار میں کانگرسی حکومتوں نے مسلمان اقلیت پر وہ مظالم ڈھائے کہ خدا کی پناہ! — چنانچہ ان وزارتوں کے خاتمے پر قائداعظم

کی ہدایت پر مسلمانانِ ہند نے "یوم نجات" منایا۔

سول نافرمانی کی پاداش میں بہت سے کانگرسی زعماء جیلوں میں چلے گئے، تاہم ایسے میں بھی قائداعظم نے مسلمانوں کو منظم کرنے کی مہم جاری رکھی، انہوں نے اپنی صفوں میں استحکام پیدا کیا اور مسلمانوں کے آئینی حقوق کی حفاظت کے لئے پوری طرح مستعد رہے، چنانچہ جولائی ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ایک یادداشت برطانوی حکومت کو پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ "برطانوی حکومت ایسا کوئی اعلان یا بیان شائع نہ کرے جس سے قرارداد پاکستان کے بنیادی اور لازمی اصولوں کو کوئی ضعف پہنچتا ہو۔ اور حکومت صاف صاف لفظوں میں مسلمانوں کو یقین دلائے کہ دورانِ جنگ عارضی طور پر یا خاتمۂ جنگ کے بعد مستقل طور پر کوئی آئین مسلمانوں کی منظوری اور رضامندی کے بغیر مرتب نہ کیا جائے گا۔"

۸ اگست ۱۹۴۰ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے جو اعلان جاری ہوا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا ــــ "وزیر امور ہند کی تشریح سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ حکومت برطانیہ کسی نئے دستور کو ہندوستان میں اس وقت تک نافذ نہیں کرے گی جب تک ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اس پر متفق نہ ہوں۔"

آل انڈیا نیشنل کانگرس کے فیصلے کے مطابق صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت مستعفی ہوئی تو سر جارج کننگھم گورنر صوبہ سرحد نے حکومت کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سر آرتھر پارسنز اور کرنل کیمبل یکے بعد دیگرے گورنر کے مشیر رہے، کننگھم کا زیادہ تر عرصۂ ملازمت صوبہ سرحد میں گزرا تھا اس لئے وہ سرحدی امور کا وسیع تجربہ رکھتا تھا، چنانچہ کانگرس کی سول نافرمانی کے دوران بھی وہ نہایت محتاط پالیسی پر چلتا رہا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں خاکساروں پر گولی چلنے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا اور ہزاروں خاکساروں کو قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں خاکساروں نے حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی، کئی بار محاذ آرائی کی نوبت آئی، بالآخر میاں احمد شاہ بیرسٹر ایٹ لاء اور دوسرے خاکسار زعماء کی کوششوں سے مفاہمت کی صورت پیدا ہو گئی اور خاکساروں کی پکڑ دھکڑ بند ہو گئی۔ تاہم

۱۹۴۰ء کے اس حادثہ کے بعد خاکسار تحریک دوبارہ اُبھر نہ سکی۔ علامہ مشرقی کو ویلور جیل میں نظر بند کر دیا گیا اور اس وقت رہا کیا گیا جب مسلسل روزوں کی وجہ سے وہ انتہائی کمزور ہو گئے تھے۔ اتفاق سے کانگرس کے مشہور رہنما راج گوپال راجہ جی بھی ان دنوں ویلور جیل میں نظر بند تھے، بتایا جاتا ہے کہ علامہ نے انہیں ہندو مسلم اتحاد کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ملک کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کی طرف مائل کیا، چنانچہ ۱۹۴۴ء کو گاندھی جی جناح مذاکرات راجہ جی ہی کی تحریک کا نتیجہ تھے۔

۱۹۴۰ء کے آخر تک سرحدی کانگرس کے بہت سے رہنما گرفتار ہو چکے تھے اور جماعت کا آرگن "پختون" بھی بند کر دیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۱ء قرارداد پاکستان نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی منزل متعین کر دی تھی اور مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بالخصوص نوجوان دھڑا دھڑ مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگے تھے۔ صوبہ سرحد کے کالجوں میں مسلمان طلباء نے اپنی تنظیمیں قائم کر لی تھیں اور صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں مسلم لیگ کے دفاتر قائم ہو گئے تھے، کانگرسی اور "قوم پرست" لوگ یہ صورت حال برداشت نہ کر سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی تمام کوششیں یہ بات ثابت کرنے میں صرف کر دیں کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی اور کانگرس کو بھی مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں دہلی میں "آزاد مسلم کانفرنس" جمعیت العلمائے ہند کانفرنس، احرار کانفرنس اور شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے اجلاس منعقد کئے گئے تاہم یہ اجلاس مسلم لیگ کی مقبولیت کو کم نہ کر سکے۔ مسلمان اب زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگے تھے، انہیں قائداعظم کے تدبر پر پورا اعتماد تھا، بالخصوص مسلم اقلیت کے صوبوں کے لوگوں کو کانگرسی حکومتوں کی چیرہ دستیوں کا عملی تجربہ ہو چکا تھا اس لئے وہ مسلم لیگ میں نسبتاً زیادہ جوش اور ولولے سے کام کرتے تھے۔

کانگرس نے انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریک شروع کی، جو زیادہ کامیاب نہ ہو پائی۔ اتنی بڑی آبادی میں سے صرف چند ہزار افراد نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا، اب تک نیشنل کانگرس کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ملک کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ثابت کر کے

انگریز کو مجبور کرے کہ وہ صرف اور صرف اُسی کی بات پہ کان دھرے۔ تاہم وقت تیزی سے بدل رہا تھا، مسلم لیگ اب مسلمان عوام کا اعتماد حاصل کر چکی تھی اور یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ مسلمان اپنی الگ خود مختار ریاست قائم کئے بغیر چین نہ لیں گے۔

اُدھر انگریز کی پوری کوشش تھی کہ جنگی کارروائیوں کے سلسلے میں ہندوستانی عوام کا تعاون حاصل کرے۔ چنانچہ ۲۱ جولائی ۱۹۴۱ء کو یکایک وائسرائے نے اپنی ڈیفنس کونسل کا اعلان کر دیا جس میں دوسرے ممبروں کے علاوہ سر سکندر حیات خان، مولوی فضل الحق، سر سعد اللہ خان اور دو دوسرے مسلم لیگیوں کو بھی نامزد کیا گیا۔ مسلمان عوام نے مطالبہ کیا کہ ڈیفنس کونسل کے ان ارکان کے خلاف کارروائی کی جائے اور انہیں مسلم لیگ سے نکال دیا جائے۔ قائداعظم جمہوریت پسند رہنما تھے اور رائے عامہ کا بیحد احترام کرتے تھے، چنانچہ ۲۴ اگست ۱۹۴۱ء کو انہوں نے بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کر لیا۔ ان نامزد ارکان سے جواب طلبی کی گئی تو انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ وائسرائے نے ہمیں ہماری ذاتی حیثیت سے نامزد کیا ہے۔ نہ کہ جماعتی طور پہ ـــــ قائداعظم نے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا ـــــ "میں یہ نامزدگیاں ان ارکان کی اعلیٰ پوزیشن اور مسلم قوم میں ان کے مرتبہ کے پیشِ نظر کر رہا ہوں"۔ چنانچہ دفاعی کونسل کے ان نامزد ارکان کو کہا گیا کہ وہ اس سے مستعفی ہو جائیں۔ سکندر حیات اور دوسروں نے استعفیٰ دے دیا۔ البتہ مولوی فضل الحق نے انکار کیا۔ جس پہ انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔

مسلم لیگ میں تو اس وقت تک انقلابی تبدیلی آ چکی تھی اور وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی جماعت کا کردار بجا لا رہی تھی لیکن اس کے برعکس سندھ میں کانگرس کے زیر اثر خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کام کر رہی تھی جو برطانیہ کی جنگی کارروائیوں میں برابر مدد دیتی رہی۔ خود اللہ بخش بدستور مجلسِ دفاعِ ہند کے سرگرم کارکن رہے لیکن کانگرس نے ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔

آزاد ہند فوج

اس وقت تک جاپان بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں کود پڑا تھا۔ ابتداء میں اسے زبردست کامیابیاں ہوئیں۔ اس نے امریکہ کے ساحل

پر پہنچ کر اس کی بحریہ پر کاری ضربیں لگائیں۔ فروری ۱۹۴۲ء تک جاپان نے ملایا اور سنگاپور کے برطانوی مقبوضات پر قبضہ کر کے انگریزوں کو سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ انگریز کے ایک لاکھ تیس ہزار افسر اور سپاہی جاپان کے جنگی قیدی بن چکے تھے، مئی ۱۹۴۲ء تک جاپان کی قید میں ہندوستانی سپاہیوں کا شمار ستر ہزار تک جا پہنچا تھا۔ جاپان نے چالاکی یہ کی تھی کہ ہر قوم کے جنگی قیدیوں کو الگ الگ رکھا تھا۔ ہندوستانی فوجیوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی تھی کہ وہ انگریز کے مفاد میں لڑنے کی بجائے خود اپنے وطن کی آزادی کے لئے کیوں نہیں لڑتے۔ اس عرصہ میں سوبھاش چندر بوس اور کچھ دوسرے انقلابی رہنما بھی خفیہ طور پر وہاں جا پہنچے تھے، چنانچہ اُن کے زیر اثر ان جنگی قیدیوں میں سے تیس ہزار میں ذہنی تبدیلی نمودار ہو چکی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں فوجی سپاہیوں کی "بغاوت" انگریزی اقتدار کے لئے بہت بڑے خطرے کا باعث بن سکتی تھی، انگریز کو اس بات کا پورا احساس تھا چنانچہ اس نے ایک بار پھر ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے فوری حل پر بھرپور توجہ دی۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء میں سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز دے کر برصغیر پاک و ہند بھیجا گیا، تحریک پاکستان میں کرپس مشن کی اہمیت اس لئے مسلّم ہے۔ کہ اس میں پہلی بار برطانوی حکومت نے تقسیم ہند کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا۔

کرپس کی تجاویز کے دو حصے تھے۔

(الف) ایک حصہ مستقبل سے تعلق رکھتا تھا۔ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر برصغیر کو نوآبادیاتی درجہ دے دیا جائے گا اور وہ داخلی اور خارجی امور میں آزاد ہوگا۔ جنگ کے خاتمہ پر آئین ساز مجلس قائم کی جائے گی۔ ملک کا آئین وفاقی ہوگا۔ جس میں اقلیتوں کے تحفظ کا پورا اہتمام ہوگا۔ صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو مجوزہ وفاق سے الگ رہیں اور اپنی الگ یونین بنالیں۔

(ب) دوسرا حصہ فوری اقدامات کے بارے میں تھا حکومت نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ وائسرائے کی کونسل تمام تر دیسی ارکان پر مشتمل ہو البتہ دفاع کا محکمہ برطانیہ کے پاس رہے۔

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈروں سے کرپس مشن کے مذاکرات ہوئے۔ تاہم دونوں

جماعتوں نے کرپس کی تجاویز مسترد کر دیں۔ کانگرس کو اعتراض تھا کہ صوبوں کو علیحدگی کا حق دے کر ملکی وحدت کو نقصان پہنچایا گیا ہے، علاوہ بریں کانگرس کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ دوسری سیاسی جماعتیں اُسکے ساتھ ساتھ اقتدار میں شریک ہوں، اس کے برعکس مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں اس امر پر تو اطمینان کا اظہار کیا کہ ان میں اصولاً قیام پاکستان کا امکان تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن واضح پر تقسیم ہند کا مطالبہ نہیں مانا گیا تھا۔ برطانیہ اس وقت اپنی مصیبت میں گرفتار تھا وہ بہتیرا یقین دلاتا تھا کہ آزادیٔ ہند کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے گا لیکن گاندھی جی اور دوسرے رہنما اس کو کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ بے یقینی کے اس عالم میں مذاکرات کا نتیجہ نکلتا بھی تو کیا؟

اعتدال پسند کانگرسی رہنما یہ چاہتے تھے کہ "پاکستان" کا مطالبہ تسلیم کر کے مسئلے کو سُلجھا لیں لیکن گاندھی جی اور دوسرے جوشیلے ہندو تقسیم وطن کا نام تک سُننے کو تیار نہ تھے۔

انگریز جُوں جُوں جنگ میں الجھتا گیا، گاندھی جی اور شیر ہوتے گئے۔ وہ صلح پسندی کو انگریز کی کمزوری پر محمول کرتے رہے۔ بالآخر ۸ راگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے گاندھی جی کو مکمل طور پر "تحریک بغاوت" چلانے کا مجاز بنا دیا۔ ہر جگہ شورش مچ گئی۔ ہنگامے ہونے لگے۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی گئیں، سرکاری دفتر لوٹے گئے۔ عدالتوں پر پکٹنگ کی گئی، بڑے پیمانے پر قانون شکنی شروع ہو گئی۔ بالآخر انگریز کو اپنی فوج اور پولیس حرکت میں لانی پڑی اور کانگرس کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔

ہندوستان کی اس ہمہ گیر شورش سے صوبہ سرحد کا متاثر ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ کانگرس ہائی کمانڈ کی ہدایت پر یہاں بھی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا آغاز کر دیا گیا۔ جس کا حال خود خان عبدالغفار خان کے الفاظ میں یوں ہے۔

"میری ہدایت پر سول نافرمانی خوب زور شور سے شروع ہو گئی۔ ہم لوگ عدالتوں پر پکٹنگ کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے اس تحریک کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ پشاور کے ڈپٹی کمشنر نے سرکار پرستی کی ایک مثال قائم کر دی۔ اس ذات شریف کا نام سکندر مرزا تھا۔ وہ خود لاٹھی لے کر نکلتا۔ اُس نے خدائی خدمت گاروں کے کیمپ میں جا کر ان کے سالن میں زہر ڈال دیا۔ جس سے وہ تمام خدائی خدمت گار جنہوں نے کھانا کھایا ایسے بیمار پڑے کہ موت کے دروازے پر پہنچ گئے۔"

ادھر سکندر مرزا نے اپنی آپ بیتی میں سرحدی کانگرس کی اس سول نافرمانی کی داستان بڑے مزے لے لے کر بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اُس نے کس انوکھے طریقے سے سُرخپوشوں کی اس تحریک کو ناکام بنا کر رکھ دیا ـــــ سکندر مرزا کا بیان ہے ۔

"۱۹۴۰ء کے اوائل میں مجھے پشاور کا ڈپٹی کمشنر اور علاقہ مہمند کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا ۔ میں اس عہدے پر فائز ہونے والا پہلا ہندوستانی تھا ۔ میں نے چارج لیا تو وہاں گاندھی اور وائسرائے لارڈ لنلتھگو میں مصالحت کی بات چیت ناکام ہو گئی تھی اور کانگرس وزارت مستعفی ہو چکی تھی ـــــ کچھ عرصہ بعد سول نافرمانی شروع ہو گئی ۔ کانگرسی لیڈر بازاروں میں نکلتے ، انگریز کی جنگی پالیسی کے خلاف تقریریں کرتے اور کارکنوں کو ترغیب دیتے کہ وہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں ۔"

"۱۴ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ڈاکٹر خان صاحب سول نافرمانی کے لئے نکلے ، وہ پھولوں سے لدے پھندے تھے اور کوئی آٹھ دس ہزار آدمی اُن کے گرد ہجوم کئے ہوئے تھے میں نے انہیں سمجھایا کہ جنگ کا زمانہ ہے ، اس وقت یہ کارروائی مناسب نہیں ، انہوں نے میری بات پر کان نہ دھرا اور جلوس کی صورت میں آگے بڑھتے گئے ، جگہ جگہ انہوں نے لوگوں سے کہا " جنگ میں مدد نہ دو " ـــــ "جنگ میں مدد نہ دو" ـــــ میں نے قصہ خوانی بازار میں انہیں اپنے پاس بلایا اور اپنی کار میں بٹھا لیا ـــــ ڈاکٹر خان خوش تھے کہ میں انہیں گرفتار کر کے جیل لے جا رہا ہوں ۔ لیکن میں فوراً انہیں پشاور چھاؤنی میں اُن کے اُن کے بنگلہ پر لے گیا ـــــ اور اُن کی انگریز بیوی کو سمجھایا کہ وہ انہیں (ڈاکٹر خان صاحب کو) جنگ کے دوران قانون شکنی سے روکے ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا ـــــ میں نے ڈاکٹر خان صاحب کو جلدی سے کار سے اُتارا اور واپس آ گیا ۔"

سکندر مرزا کا منشاء یہ تھا کہ کسی بھی سرخپوش کو گرفتار نہ کیا جائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گرفتاریوں لاٹھی چارج یا گولی چلانے سے عوام میں اشتعال پیدا ہوگا اور سارا صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ انگریزوں کے خلاف بھڑک اٹھے گا ۔ وہ لکھتا ہے کہ

"گورنر جارج کننگھم پٹھانوں کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا تھا اس لئے وہ کوئی مزاحمت

کرنا نہ چاہتا تھا ـــــ ہر روز جلوس نکلتے۔ مظاہرین عدالتوں کے باہر بیٹھے رہتے لیکن کوئی گرفتاری نہ کی جاتی، نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک خود بخود ٹھنڈی پڑ گئی۔"

خان عبدالغفار خان کے اس الزام کے جواب میں کہ سرخپوشوں کو زہر دیا گیا، سکندر مرزا یوں تحریر کرتا ہے :۔

"پشاور شہر کے ایک مقام پر ڈیڑھ دو ہزار سرخپوش جمع تھے۔ وہ صبح سویرے چائے پی کر ٹولیوں کی صورت میں بازار میں نکلتے اور حکومت کے خلاف مظاہرہ کرتے۔ پہلے دن ان کا جلوس سیشن کورٹ میں جا داخل ہوا اور اس نے عدالتی کارروائی روک دی، اس پر پولیس کو انہیں منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج کا سہارا لینا پڑا ـــــ لیکن اس کے بعد یہ دستے روزانہ آتے، پولیس انہیں عدالتوں کے باہر روکے رکھتی لیکن نہ گرفتار کرتی نہ ان پر تشدد کرتی ـــــ پچھلے پہر سرخپوش خود ہی اپنے کیمپوں کو واپس چلے جاتے ڈیڑھ دو ماہ یہی کیفیت رہی ـــــ آخر میں نے سرخپوشوں کے دو جرنیلوں کو اپنے اعتماد میں لے لیا، وہ گھڑی گھڑی کی خبر مجھے پہنچاتے رہتے، میں نے انہیں کہا کہ کسی نہ کسی بہانے سرخپوش کیمپ میں کھانے پینے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا تو میں نے انہیں دو لمبی لمبی بوتلوں میں "جمال گھوٹا" (دست آور دوا) بھر کر دی۔ ان کی مٹھی گرم کی اور کہا کہ یہ دوا صبح سویرے سرخپوشوں کی چائے کی دیگوں میں ڈال دیں ـــــ اس دن جب چائے پی کر حسب معمول سرخپوش پکٹنگ کی خاطر عدالتوں کو آئے تو "جمال گھوٹا" نے اپنا اثر دکھایا ـــــ ہر کانگرسی پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پولیس نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ایسے میں رفع حاجت کو جاتا تو کہاں جاتا ـــــ؟ ہر ایک کا برا حال تھا۔ شلوار پکڑے بھاگا جاتا تھا اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس دن سے ان کی جمعیت بکھر گئی اور کانگرس کی سول نافرمانی کا زور ختم ہو گیا ـــ"

سکندر مرزا بڑا جہاندیدہ اور زمانہ شناس تھا، پشاور میں اس کی ڈپٹی کمشنری کے دوران بہت سے قازق مہاجر آئے جو روسی حکومت کے لادینی نظریات کو برداشت نہ کرتے ہوئے ترکِ وطن کر آئے تھے، سکندر مرزا نے ان کی ہر طرح پذیرائی کی، جنگ کے دن تھے۔ روزمرہ کے

استعمال کی چیزوں پر کڑا کنٹرول تھا تاہم اُس نے قازق مہاجروں کو اجازت دے دی کہ چینی، کپڑا، ماچس، مٹی کا تیل کھلے بندوں بیچیں، اس طرح مہاجر جلد ہی اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے قابل ہو گئے اور حکومت پر بھی کوئی بوجھ نہ پڑا —— ان قازق مہاجروں کے سینکڑوں گھرانے اب بھی پشاور میں آباد ہیں اور عزت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

سرحد کی پہلی مسلم لیگ وزارت

"ہندوستان چھوڑ دو" کے نام سے کانگرس نے جو سول نافرمانی شروع کی تھی وہ جاری رہی، سکندر مرزا کی حکمت عملی سے پشاور نسبتاً پُرسکون رہا البتہ مردان، بنّوں، کوہاٹ اور دوسرے مقامات پر سرخپوشوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ خود خان عبدالغفار خان بھی چارسدہ سے مردان جاتے ہوئے گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔ سرحد اسمبلی کے دس کانگرسی ارکان نے بھی ہائی کمانڈ کے حکم کی تعمیل میں سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتاریاں دیں، اس طرح سرحد میں کانگرس اسمبلی پارٹی کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو گئی چنانچہ مسلم لیگ آگے بڑھی اور اس نے چند غیر جانبدار ممبروں کو ساتھ ملا کر صوبہ سرحد میں پہلی بار مسلم لیگی وزارت مرتب کر لی۔ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں بنگال، آسام اور سندھ میں بھی مسلم لیگی وزارتیں کام کرنے لگیں، البتہ پنجاب کے یونینسٹ وزیراعلیٰ خضر حیات ٹوانہ نے لیگ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر اس کے خلاف عوامی تحریک چلائی گئی اور اُسے مستعفی ہوتے ہی بن پڑی۔

صوبہ سرحد میں پہلی مسلم لیگ وزارت ۲۵ مئی ۱۹۴۴ء کو معرضِ وجود میں آئی اور سردار محمد اورنگ زیب خان پہلے مسلم لیگی وزیراعلیٰ منتخب ہوئے۔ وہ پرانے مسلم لیگی تھے اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی رفاقت میں بھی برسوں کام کر چکے تھے، اُن کی کابینہ میں سردار عبدالرب خان نشتر (وزیر خزانہ) خان نمین جان خان (وزیر تعلیم) اور سردار اجیت سنگھ (وزیر صحت) شامل تھے۔

مسلم لیگ کی یہ وزارت ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء تک کام کرتی رہی، یہاں تک کہ جنگِ عظیم دوم ختم ہو گئی۔ کانگرسی رہنما جیلوں سے باہر آئے اور دوبارہ ڈاکٹر خان صاحب کی سربراہی میں صوبہ سرحد کی کانگرس وزارت برسرِ اقتدار آ گئی۔

مسلم لیگ دن بدن مستحکم ہوتی جا رہی تھی بالخصوص پڑھا لکھا طبقہ تحریکِ پاکستان میں سرگرم

حصّہ لینے لگا تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۴۳ء میں جب سرحد اسمبلی کے ضمنی انتخابات ہوئے تو ارباب شیر علی خان، میاں غلام حسین، نواب نصراللہ خان اور سالار محمد ایوب خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے، اقلیتوں کی نشستوں پر ہندوں سے لالہ کیول رام اور کوہاٹ سے لالہ سنس راج بھی اپنی ضمنی انتخابات کے نتیجہ میں سرحد اسمبلی کے ارکان منتخب ہوئے۔

اس اثنار میں صوبہ سرحد کے نوجوان طلباء نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے اپنی تنظیم قائم کرلی، صوبہ سرحد کے اکثر علاقوں میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوچکی تھیں، تاہم ابھی صحیح معنوں میں مسلم لیگ عوامی جماعت بننے نہ پائی تھی۔ کچھ کارکنوں کا خیال تھا کہ جماعت کے اس خلفشار کا باعث سردار اورنگ زیب خان کی کمزور پالیسی تھی۔ چنانچہ کئی حلقوں نے اعلانیہ اُن کے خلاف پروپیگنڈہ مہم جاری کردی تھی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اپنی وزارت کے دوران سردار اورنگ زیب خان نے جماعتی تنظیم کے لئے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا، چنانچہ پشاور (اور کئی دوسرے مقامات پر) ترقی پسند مسلم لیگیں قائم ہوگئی تھیں۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جماعت کی تنظیم نو کے سلسلے میں کوئٹہ کے مشہور بیرسٹر اور مسلم لیگی رہنما قاضی محمد عیسیٰ کو پشاور بھیجا اور سرحد کے مسلم لیگی کارکن کی دعوت پر خود بھی صوبہ سرحد کا دورہ کرنا قبول کرلیا۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں خود سردار اورنگ زیب خان بھی دہلی گئے اور قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی، دونوں رہنماؤں میں صوبہ سرحد کی سیاسی صورتِ حال پر کھل کر بات ہوئی جس سے سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم کو فائدہ پہنچا۔

گاندھی جناح مذاکرات

۱۹۴۴ء کے وسط تک جنگی محاذ پر صورتِ حال اتحادیوں کے حق میں تھی، کانگرس کی طرف سے تحریک مزاحمت اور سول نافرمانی محض بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اُدھر اس اثنار میں قائداعظم اور اُن کے رفقاء کی کوششوں سے تحریکِ پاکستان کو کافی تقویت مل چکی تھی۔ گاندھی جی اور کانگرسی لیڈروں پر یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ مسلمانوں کے مطالبۂ تقسیم ہند کو تسلیم کئے بغیر اب کوئی چارہ نہیں، لہٰذا انہوں نے ایک بار پھر قائداعظم سے ملاقات کی ٹھانی ــــ گاندھی جی کی دعوت پر ستمبر ۱۹۴۴ء میں دونوں لیڈروں کے درمیان مذاکرات ہوئے جو اٹھارہ روز تک جاری رہے تاہم اس گفت و شنید کا کوئی نتیجہ

برآمد نہ ہو سکا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذاکرات کی دعوت دے کر گاندھی جی دُنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کانگرس ایک صلح جو اور فراخدل جماعت ہے، یہ محض ایک چال تھی۔ تاہم ان مذاکرات سے بھی تحریکِ پاکستان کو کافی تقویت ملی اور دُنیا پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ دونوں لیڈر دو الگ الگ قوموں کے نمائندے ہیں اور ان کے باہمی سمجھوتے ہی سے ملک کے مستقبل کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

شملہ کانفرنس

۱۹۴۴ء کے آخر میں یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ جنگ کا خاتمہ قریب ہے اور انگریز جنگ میں فتح مند رہے ہیں۔ اس دوران لارڈ لن لتھگو کی جگہ لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ برطانوی حکومت کی دلی خواہش تھی کہ برصغیر کا آئینی بحران جلد ختم کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء کے وسط میں ویول انگلستان گیا اور اپنی حکومت سے صلاح مشورہ کے بعد واپسی پر ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا جو "ویول منصوبہ" کہلاتا ہے اس کا خلاصہ یہ تھا:۔

"وائسرائے اور کمانڈر اِن چیف کے سوا مرکزی کونسل کے تمام ارکان دیسی ہوں گے۔ کونسل میں برصغیر کی تمام قومیتوں کی نمائندگی ہوگی۔ مسلمان اور اعلیٰ ذات کے ہندو تعداد میں برابر ہوں گے۔ اگر مرکز کے لئے یہ منصوبہ تسلیم کر لیا گیا تو صوبوں میں بھی عوامی وزارتیں قائم کر دی جائیں گی۔"

اس منصوبے پر غور کرنے کے لئے ۲۵ جون کو تمام قومیتوں کے لیڈروں کا اجلاس شملہ میں منعقد ہوا۔ تاہم مسلم نمائندگی کے سوال پر آکر تعطل ہوگیا۔ ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کانگرس کو برصغیر کی جملہ اقوام کی نمائندگی کا دعویٰ تھا اور وہ ہندو نشستوں کے علاوہ مسلم نشستوں میں بھی اپنا حصّہ چاہتی تھی۔ قائداعظم کانگرس کے اس دعوے کو تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اُن کا مطالبہ بالکل بجا تھا کہ مسلمان نمائندوں کی نامزدگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ آخر میں وائسرائے نے یہاں تک کہا کہ چار ارکان مسلم لیگ سے لئے جائیں لیکن ایک مسلم رُکن غیر لیگی ہو جو پنجاب سے لیا جائے۔ اصل میں وہ خضر حیات ٹوانہ کو نامزد کرنے پر مصر تھا مگر قائداعظم نے کسی کٹھ پتلی مسلمان کو ملّت اسلامیہ کی نمائندگی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا

اور اگرچہ شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی تاہم یہ حقیقت سب پر عیاں ہوگئی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور مسلم لیگ اُن کی نمائندہ جماعت ہے، قائداعظم کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی بے وقعت ہو کر رہ گئی۔

قائداعظم کا دوسرا دورۂ سرحد

شملہ کانفرنس ناکام ہو چکی تھی، قائداعظم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو سے انصاف کی توقع عبث ہے، مصالحت کا کوئی امکان باقی نہ تھا، لے دے کے ایک ہی حل رہ گیا تھا کہ مُلک میں عام انتخابات جلد منعقد ہوں تاکہ رائے عامہ کا فیصلہ اور رجحان سامنے آئے، اسی امر کے پیشِ نظر دسمبر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ انتخابات جلد کرائے جائیں۔ بالآخر اگست ۱۹۴۵ء کو حکومتِ ہند کا یہ اعلان شائع ہوا کہ ملک میں عام انتخابات جلد منعقد کئے جائیں گے۔

قائداعظم جانتے تھے کہ یہ انتخابات برصغیر کے مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھے۔ اس لئے انہوں نے پورے جوش و خروش سے اس کے لئے تیاری شروع کر دی، اپنی انتہائی کمزور صحت کے باوجود وہ ملک کے کونے کونے میں پہنچے اور اپنی مسیحانفسی سے مسلمانوں کے قلوب کو ایمان کی حرارت عطا کی ـــــ قائداعظم کو صوبہ سرحد کے انتخابات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ کیونکہ یہاں مقابلہ ایک انتہائی منظم جماعت سے تھا جس کی جڑیں عوام میں بہت گہری تھیں اور جو مسلمان کارکنوں اور رہنماؤں پر مشتمل تھی۔ تاہم اس وقت تک حالات پلٹا کھا چکے تھے، خان عبدالقیوم خان، پیر صاحب مانکی شریف، غلام محمد خان لوند خوڑ، ثمین جان خان، محبت خان پیر زکوڑی شریف، ارباب عبدالغفور خان، مولانا بخت جمال خان، جلال بابا، خان حبیب اللہ خان، بریگیڈیر سردار حسام الدین خان، خان محمد علی خان، بادشاہ گل صاحب اور دوسری بہت سی اہم شخصیتیں کانگرس سے دامن چھڑا کر اپنا مستقبل مسلم لیگ اور پاکستان سے وابستہ کر چکے تھے، نوجوان مسلمان قیامِ پاکستان کو اپنی منزلِ مقصود بنا چکے تھے اور صوبہ سرحد کی تاریخ میں پہلی بار خواتین بھی منظم ہو کر میدانِ سیاست میں اُتر آئی تھیں۔

نو سال کے بعد قائداعظم محمد علی جناح ۱۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو صوبہ سرحد کے دورے پر آئے

انہوں نے نشتر آباد پشاور میں اپنے ایک خلوص کیش خان بہادر محمد حسن خان کے ہاں قیام کیا — پشاور کے بازاروں میں ان کا تاریخی اور شاہانہ جلوس نکالا گیا۔ شاہی باغ پشاور میں ایک عظیم الشان مسلم لیگ کانفرنس ہوئی، جس سے قائداعظم اور دوسرے زعماء نے خطاب فرمایا۔ انہوں نے تقریر کے دوران کہا — "پٹھان مجموعی طور پر باقی لوگوں سے زیادہ منظم اور باشعور ہیں، وجہ یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کی غلامی کا عرصہ بہت کم ہے، میری اپیل ہے کہ آپ اپنی قومی ذمہ داری کا پورا احساس کریں اور مسلم لیگ کا ساتھ دیں"۔ . . .

اس دورے کے دوران قائداعظم اسلامیہ کالج پشاور، ایڈورڈز کالج پشاور اور درہ خیبر بھی گئے، انہوں نے ہر جگہ لوگوں کو صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلایا اور زور دیا کہ لوگ قیام پاکستان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں ورنہ وہ اپنے ہی وطن میں غیروں کے دستِ نگر بن کر رہ جائیں گے۔

قائداعظم کے اس دورے سے صوبہ سرحد میں تحریکِ پاکستان کو بڑی تقویت ملی، زیادہ سے زیادہ لوگوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے کا اعلان کیا — مخالفین قائداعظم کے دورے کی کامیابی سے بوکھلا اٹھے، انہوں نے قائداعظم کے دورے کا اثر زائل کرنے کے لئے "سرحد پولیٹیکل کانفرنس" کے نام سے ایک بہت بڑے اجتماع کا اہتمام کیا، کانفرنس میں صرف سرحدی سرخپوش ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے سرکردہ کانگریسوں نے شمولیت کی، اجلاس کی صدارت ملک کے مشہور نیشنلسٹ لیڈر سید محمود کر رہے تھے۔

اس کانفرنس کے دو مقاصد تھے اوّل یہ کہ کانگرس کے نقطۂ نظر کا سرکاری طور پر اعلان کیا جائے، دوسرے مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے۔ کانفرنس میں کشمیر کے شیخ عبداللہ نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ مسٹر جناح کی شخصیت صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں "کمتر" ہے تاہم مسلم لیگ کا صدر ہمیشہ مسلم عوام کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

آزاد ہند فوج کے مقدمے

۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت کو کئی سنگین مسائل کا سامنا تھا، لاکھوں سپاہیوں اور

افسروں کو فوج سے فارغ کیا جانا تھا۔ ان کے لئے فوری طور پر کوئی متبادل ذریعۂ روزگار نہ تھا، جنگ سے متعلقہ صنعتیں اور کاروبار ختم ہو رہے تھے۔ ہزاروں لوگوں کی بے روزگاری کا خدشہ تھا، تاہم اس سے بھی پُرخطر مسئلہ جنگی قیدیوں سے نمٹنے کا تھا، بتایا جا چکا ہے کہ فروری ۱۹۴۲ء میں جاپان کی بڑھتی اور ابھرتی ہوئی طاقت کے آگے برطانوی فوج کے ایک لاکھ تیس ہزار سپاہیوں اور افسروں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، اس وقت تک مشہور انقلابی لیڈر سوبھاش چندر بوس پشاور اور علاقہ مہمند کی راہ فرار ہو کر برما اور سنگاپور کے محاذ پر پہنچ گئے تھے، حکومت جاپان اور سوبھاش بوس کے ساتھیوں نے جاپان کی قید میں پھنسے ہوئے ہندوستانی فوجیوں کو انگریز سے بغاوت پر اکسایا اور "آزاد ہند فوج" میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ بیس ہزار سے زیادہ سپاہی اور افسر انگریز کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے، جنگ کے خاتمہ پر انگریز ان "باغیوں" کو قرار واقعی سزا دینا چاہتا تھا لیکن اتنی بڑی تعداد کو سزا دینا خارج از امکان تھا۔ بالآخر اگست ۱۹۴۵ء میں فیصلہ کیا گیا کہ صرف ذمہ دار افسروں کے خلاف فوجی عدالتوں میں مقدمے چلائے جائیں۔ اس غرض کے لئے لال قلعہ دہلی کو عدالت کے طور پر منتخب کیا گیا، اس وقت ملک میں سیاسی سرگرمیاں ویسے بھی عروج پر تھیں، سیاسی جماعتوں نے صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور عوامی جذبات کو اُبھارا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں مقدموں کا آغاز ہوا تو پنڈت نہرو بھی جنہوں نے زندگی بھر شاید ہی قانون کی پریکٹس کی ہو، بیرسٹری کا لبادہ پہن کر ان فوجی افسروں کی وکالت کو نکل پڑے۔ مسلم لیگ بھی پیچھے رہنے نہ پائی، اس نے مسلمان فوجی افسروں کا دفاع کرنے کے پورے انتظامات کئے۔

یہ حال دیکھ کر صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم نے وائسرائے کو لکھا کہ "ان مقدموں کی وجہ سے رائے عامہ انگریز کے خلاف ہو رہی ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئیں۔ بہتر ہوگا کہ سابق فوجیوں کے خلاف یہ مقدمات فوراً ختم کر دیئے جائیں۔"

ابھی لال قلعہ دہلی کے یہ مقدمات زیرِ سماعت ہی تھے کہ ایک اور گُل کھلا۔ ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو خراب خوراک دیئے جانے کے بہانے رائل انڈین نیوی کے جہاز "تلوار" کے عملے نے ہڑتال کر دی۔ بحریہ کے جوان بازاروں میں نکل آئے، ایک عمارت سے امریکی جھنڈا اتار کر پاؤں تلے

مسل دیا گیا اور اس کی جگہ کانگرس کا ترنگا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ ۲۰ فروری تک بمبئی کی بندرگاہ میں کھڑے ہوئے ۷۵ جہازوں میں سے سب کے عملہ نے کام چھوڑ دیا۔ ساحل پر مقیم بحریہ کے دستے بھی ان سے مل گئے، کراچی میں بھی اپنی واقعات کو دہرایا گیا، آزاد ہند فوج کے قیام نے انگریز کو پہلے ہی ہراساں کر رکھا تھا۔ اب بحریہ کی ہڑتال دیکھ کر اس کا اعتماد فوج سے اٹھ گیا اس لئے وہ فوراً ہندوستان کی حکومت سے دستبردار ہونے اور انتقالِ اقتدار کے لئے تیار ہو گیا۔

صوبہ سرحد کی سیاسی فضا بھی آزاد ہند فوج کے افسروں اور جوانوں سے اس "بدسلوکی" کی بناء پر متاثر ہوئی، لوگوں نے ان کی حمایت میں مظاہرے کئے، چندے جمع کر کے اُن کے دفاعی فنڈ میں دیئے، ان میں سے جنرل شاہ نواز اور جنرل ایس۔ ڈی خان نے پشاور کا دورہ بھی کیا، مؤخرالذکر خاکسار رہنما علامہ مشرقی کے ہمراہ آیا اور شاہی باغ پشاور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔

حکومتِ ہند نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ان فوجی افسروں کے مقدمات کو مزید ڈھیل دے اور سختی کی بجائے درگزر کی پالیسی کو اپنایا۔

عام انتخابات شملہ کانفرنس میں سارا اختلاف اس بات پر ہوا تھا کہ آیا مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے یا نہیں ــــ؟ آخر اس کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا گیا، حکومت نے اعلان کیا کہ ۱۹۴۵ء کے اوائل میں ملک بھر میں عام انتخابات کرائے جائیں گے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے زور شور سے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں تاہم اصل مقابلہ کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین تھا، یہ انتخابات واقعی فیصلہ کُن ثابت ہوئے، مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تیس کی تیس مسلم نشستیں جیت لیں۔ مسلم لیگ کے مخالف اُمیدواروں میں سے اکثر کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں اور مجموعی طور پر ۸۷ فی صد ووٹ مسلم لیگ کو ملے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح خود بھی بمبئی کے ایک حلقہ سے مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار تھے، انہوں نے خود ایک دن بھی اپنے حلقۂ انتخاب میں کام نہ کیا۔ بلکہ جس دن اس حلقے کے لئے ووٹ ڈالے جا رہے تھے تو قائدِ اعظم درّہ خیبر کے دورہ پر تھے، وہیں انہیں اپنی کامیابی کی خبر ملی۔ ان کے مخالف اُمیدوار حسین بھائی لال جی اپنی ضمانت بھی ضبط کرا بیٹھے۔

ان انتخابات کا ایک شاندار پہلو یہ تھا کہ مسلم لیگ نے جتنے اُمیدوار کھڑے کئے وہ سب کے سب کامیاب ہوئے جب کہ ہندوؤں کی فرقہ پرست جماعت ہندو مہاسبھا کا ایک بھی اُمیدوار کامیاب ہونے نہ پایا۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں اس شاندار کامیابی پر ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے "یومِ فتح" منایا۔ اس موقع پر ۱۰ر جنوری ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے فرمایا :۔

"دُنیا کے کسی ملک یا کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سو فی صد کامیابی کی مثال نہیں ملتی۔ مسلم قوم نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے، اب وہ اُن تمام حالات اور مُشکلات کا مقابلہ کرے گی اور ہر وہ قربانی دے گی جس کا حالات تقاضا کریں۔"

یہ انتخابات صاف طور پر "اکھنڈ بھارت" اور "پاکستان" کے نام پر لڑے جا رہے تھے، کانگرس کو ہر طرح کے وسائل حاصل تھے، مُسلمان محض اللہ کے بھروسے پر میدان میں اُترے تھے تاہم اُن کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

جہاں تک صوبائی اسمبلیوں کا تعلق ہے، صوبہ سرحد کے سوا ہر صوبے میں لیگ بڑی اکثریت سے جیت گئی۔ بمبئی، مدراس، سی پی اور اڑیسہ میں اُسے سو فیصد کامیابی ہوئی، بہار اور آسام میں کوئی ۹۱ فیصد، صوبہ یو۔پی میں ۸۲ فیصد، بنگال میں بھی مسلم لیگ کی کامیابی مثالی تھی۔ مجموعی طور پر مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلیوں کی ۴۹۲ مُسلم نشستوں میں سے ۴۲۸ پر قبضہ کر کے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

صوبہ سرحد میں ان انتخابات کے نتیجے میں کانگرس اپنی وزارت بنانے میں کامیاب تو ہو گئی تاہم مسلم لیگ نے بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ۳۸ مسلم نشستوں میں سے ۱۷ پر مسلم لیگ کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔

بعد میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں ایک اور اہم واقع بھی رونما ہوا، مردان کے حلقہ کمال زئی سے نواب سر محمد اکبر خان آف ہوتی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے لیکن جب "راست اقدام" کے سلسلے میں قائداعظم نے تمام لیگیوں کو سرکاری خطابات واپس کرنے کی ہدایت کی تو نواب آف ہوتی اس پر رضامند نہ ہوئے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے خطابات واپس نہ کئے بلکہ

مسلم لیگ اور صوبائی اسمبلی دونوں کی ممبری سے مستعفی ہو گئے۔ اس پر مردان سے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی ہو گئی اور حکومت کی طرف سے اس کے لئے ضمنی انتخابات کرانے کا اعلان ہوا۔ مسلم لیگ نے اس سیٹ کے لئے محمد اسحٰق خان کو ٹکٹ دیا جب کہ کانگرس نے اپنے دیرینہ کارکن میاں شاکر اللہ جان آف گوجر گڑھی کو مقابلے کے لئے کھڑا کیا۔ دونوں جانب سے پروپیگنڈے کی مہم شروع ہو گئی۔ مسلم لیگ نے کامیابی کا دعویٰ کیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے یہ چیلنج دے دیا کہ "یہ مقابلہ فیصلہ کن ہو گا ــــ اگر مسلم لیگ یہ نشست جیت گئی تو میں وزارت سے استعفیٰ دے دوں گا۔" بات یہ تھی کہ کانگرسی امیدوار بہت بارسوخ تھا جبکہ اس کے مسلم لیگی مدِمقابل محمد اسحٰق خان ۱۹۴۱ء کے انتخاب میں شکست کھا چکے تھے۔ تاہم اب فضا بدل چکی تھی۔ مردان کے مسلم لیگی کارکن بالخصوص خواتین نے دن رات کام کیا۔ خود عبدالقیوم اور دوسرے مسلم لیگی رہنما بھی سرگرم عمل رہے۔ بالآخر ۱۴ فروری ۱۹۴۶ء کو ووٹ پڑے اور نتیجہ نکلا تو مسلم لیگ کے امیدوار محمد اسحٰق خان ہزاروں ووٹوں کی برتری سے کامیاب قرار دیئے گئے۔

صوبہ سرحد اور پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارتیں تو نہ بن سکیں تاہم مسلمان عوام کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف ضرور ہو گیا، پنجاب میں مسلم لیگ مسلمانوں کی ۸۶ میں سے ۷۳ نشستوں پہ قابض تھی لیکن انگریز نے باقی ارکان کا گٹھ جوڑ کر کے خضر حیات ٹوانہ کی وزارت بنوادی، سرحد میں غیر مسلم ارکان کی حمایت سے ڈاکٹر خان صاحب وزیراعلیٰ بنے لیکن بہت جلد ان کے خلاف عوامی تحریک شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ریفرینڈم ہوا تو لوگوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

وزارتی مشن قائداعظم جمہوری روایات کو ہمیشہ عزیز رکھتے تھے اور ہر کام صلاح مشورہ سے کرنے کے عادی تھے۔ عام انتخابات کے بعد ۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے منتخب ارکانِ اسمبلی کا ایک کنونشن بُلایا، جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ "شمال مشرقی علاقے میں آسام اور بنگال اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان پر مشتمل ایک خود مختار مملکت قائم کی جائے ــــ" اور اعلان کیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر اگر کوئی دستور مسلط کرنے یا مرکز میں مسلم لیگ کے مطالبے کے خلاف جبراً عبوری انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمان اپنی بقاء اور قومی تحفظ کے لئے تمام ممکن طریقوں سے اس کی مخالفت کریں گے۔

اس وقت ہندوستان کے مسائل بڑے اُلجھے ہوئے تھے، جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ملکی معیشت درہم برہم ہو چکی تھی، سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ خود فوج کے اندر بے چینی پائی جاتی تھی، ان حالات کے پیشِ نظر برطانوی حکومت سنجیدگی سے چاہتی تھی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا کوئی حل نکل آئے۔ عام انتخابات کے بعد آئینی اقدامات اور بھی ناگزیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی وزیر اعظم ایٹلی نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لئے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رُکنی وفد ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا، وفد میں وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس صدر تجارت بورڈ سر سٹیفورڈ کرپس اور بحریہ کے فرسٹ لارڈ اے۔ وی الیگزینڈر شامل تھے

اُن دنوں انگلستان میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار تھی جس کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ وہ کانگرس نواز رویہ رکھتی ہے ـــــ اپنے ان جذبات کا اظہار وزیرِ اعظم ایٹلی نے ۱۵ مارچ کو پارلیمنٹ کے ایک بیان میں کیا اور کہا کہ "ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا پورا پورا احساس ہے اور اقلیتوں کو بلا خوف و خطر آزاد زندگی بسر کرنی چاہیئے لیکن کسی اقلیت کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اکثریت کی ترقی کی راہ میں حقِ استرداد کے روڑے اٹکائے"۔

قائدِ اعظم برطانوی وزیر اعظم کے عندیہ کو بھانپ گئے اور انہوں نے ۱۷ مارچ کو اُسے دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا "اکثریت کی ترقی کی راہ روکنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ مسلمانانِ ہند خود ایک قوم ہیں اور حقِ خود اختیاری ان کا بنیادی حق ہے"۔

وفد کے ارکان ۲۴ مارچ کو دہلی پہنچے، وہ مختلف مکاتبِ فکر کے رہنماؤں سے ملے۔ ۴ اپریل کو انہوں نے قائدِ اعظم سے ملاقات کی، ۵ مئی سے ۱۲ مئی تک شملہ میں مذاکرات کا دور ہوا، اس کانفرنس میں کانگرس کی طرف سے ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبدالغفار خان نے اور مسلم لیگ کی جانب سے قائدِ اعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب محمد اسمٰعیل اور سردار عبدالرب نشتر نے شمولیت کی۔ جب کسی بات پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا تو ۱۶ مئی کو وزارتی مشن نے اپنے منصوبے کا از خود اعلان کر دیا، ملک کو تین یونٹوں میں تقسیم کیا جانا تجویز ہوا۔

(ا) بنگال اور آسام (ب) شمال مغربی صوبے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد (ج) باقی تمام صوبے۔ صوبوں کو مقننہ میں کثرتِ رائے کی بناء پر اپنا گروہ تبدیل کرنے کی اجازت دی گئی۔ ۶ جون

کو مسلم لیگ نے اُسے منظور کر لیا کیونکہ اس میں پاکستان کی بنیاد موجود تھی۔ تاہم کانگرس مختلف عذر پیش کر کے اسے ٹھکراتی رہی۔ انگریز اور ہندو کی ملی بھگت پر مسلمانوں کا ردِ عمل قدرتی بات تھی، بالآخر مسلم لیگ نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو "یومِ راست اقدام" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ حکومت کی غلط اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ جلسے کئے جائیں اور رائے عامہ کو اپنے حق میں استوار کیا جائے۔ بنگال میں ان دنوں مسلم لیگ وزارت برسرِ اقتدار تھی۔ اس نے ۱۶ اگست کو عام تعطیل کا اعلان کر دیا اور یوم راست اقدام منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہندو تنظیموں نے پہلے ہی تیاریاں کر رکھی تھیں انہوں نے مسلمانوں کے محلّوں پر حملے کئے، اُن کے دکانوں اور مکانوں کو لوٹا اور آگ لگا دی، قیامت کا سماں تھا، وہ تباہی مچی کہ پانچ ہزار افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔

۲۴ اگست کو حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی عارضی حکومت کے لئے ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ کانگرس اب بھی بضد تھی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے لیکن قائداعظم نے دوٹوک کہہ دیا کہ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا حق صرف اور صرف مسلم لیگ کو پہنچتا ہے۔ عبوری حکومت کی تشکیل کے بعد بھی یہ کشمکش جاری رہی۔ کانگرس کی طرف سے برطانوی حکومت پر یہ بھی زور دیا گیا کہ وہ لارڈ ویول کی جگہ کسی اور کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجے ــــ نہرو جانتے تھے کہ برطانیہ کی لیبر حکومت کانگرس کی ہر ممکن ناز برداری کرے گی ــــ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ مسلم لیگ کو اعتماد میں لئے بغیر لارڈ ویول نے ۲۲ جولائی کو دونوں جماعتوں کو مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے دی، قائداعظم نے جمہوری قدروں کے عین مطابق وائسرائے کی دعوت کے قبول یا رد کرنے کا سوال مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ۲۷ سے ۳۰ جولائی تک مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اہم اجلاس ہوا۔ جس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

"اس صورت میں جب انگریز ابھی اس ملک پر حکمران ہیں کانگرس کئی بار اپنے وعدوں سے پھر چکی ہے تو اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ آزادی مل جانے پر کانگرس اقلیتوں کے مفادات کا ہر ممکن تحفظ کرے گی"۔

اس امر کا اعلان سنتے ہی کہ حکومت کانگرس کو ملنے والی ہے، ہندو سکھوں نے فتنہ و فساد کا بازار

گرم کر دیا، ہر جگہ مسلمانوں پر منظم حملے کئے گئے، ہزاروں بے گناہ مسلمان شہید ہوئے اور لاکھوں بے گھر اور بے در ہو کر رہ گئے۔

ضرورت تھی کہ ہندو مسلم فسادات کو روکا جائے اور سبھی فرقوں میں اتحاد عمل کی فضا پیدا ہو، چنانچہ بڑی سوچ بچار کے بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگی ارکان دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوں، مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کی مسلم نشستوں میں سے ۹۴ فیصد نشستیں حاصل کی تھیں۔ صرف چار مسلمان ممبر ایسے تھے جو دوسری جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم قائد اعظم نے یہاں بھی یہ شرط لگا دی کہ پنڈت نہرو دستور ساز اسمبلی میں صرف کانگرس پارٹی کے لیڈر ہوں گے نہ کہ تمام ایوان کے۔ مسلم لیگ براہ راست وائسرائے سے رابطہ رکھے گی۔

عبوری حکومت میں شمولیت کے بعد جب محکموں کی تقسیم کا وقت آیا تو مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ امورِ داخلہ، امورِ خارجہ یا امور دفاع میں سے کم سے کم ایک محکمہ مسلم لیگی ارکان کے سپرد کیا جائے تاکہ ان کی حق رسی ہو سکے اور وہ اطمینان سے کام کر سکیں، پہلے خیال تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل کی جگہ کسی مسلم لیگی کو وزیرِ داخلہ بنایا جائے گا لیکن پٹیل اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اس پر رفیع احمد قدوائی نے کانگرس کو یہ تجویز پیش کی کہ وزارتِ مالیات مسلم لیگ کو سونپ دی جائے۔ اس تجویز پر ہندو ارکان نے خوب بغلیں بجائیں۔ وہ جانتے تھے کہ محکمہ مالیات اگرچہ بڑا اہم ہے لیکن ساتھ ہی بڑا مشکل اور ٹیکنیکل بھی ہے۔ مسلمان بھلا اسے کیسے چلا سکیں گے؟ اصل میں اس پیش کش سے وہ مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ چونکہ یہ مشکل کام ہے اس لئے مسلم لیگ خود ہی وزارتِ مالیات قبول کرنے سے گریز کرے گی اور اگر اس نے یہ وزارت قبول کر لی تو مشکل اور الجھن میں پڑ جائے گی اور دنیا کی نظروں میں بدنام ہو جائے گی۔ اس طرح دونوں صورتیں کانگرس کے لئے مفید ہوں گی۔

جب لارڈ ویول نے یہ اطلاع قائد اعظم کو دی تو انہوں نے کہا "وہ اپنا جواب کل بھیجیں گے" اس اثنا میں چوہدری محمد علی، جو اس وقت وزارتِ مالیات میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھے، قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بتایا کہ کانگرس کی یہ پیشکش ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

ہے کیونکہ سب محکموں کی کنجی شعبۂ مالیات ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مالیات پر قبضہ کرنے کے بعد مسلم لیگ کو حکومت کے ہر محکمہ میں عمل دخل حاصل ہو جائے گا۔ اس پر قائداعظم نے لیاقت علی خان کو وزیرِ مالیات بنا دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ "بہت جلد کانگرس نے یہ محسوس کر لیا کہ محکمہ مالیات مسلم لیگ کی تحویل میں دے کر اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ اگر پٹیل یا کسی دوسرے کانگرسی وزیر کو ایک چپڑاسی بھی ملازم رکھنا ہوتا تو محکمہ مالیات سے اس کی منظوری لینی پڑتی اور اس طرح سبھی کانگرسی وزیر لیاقت علی خان کے دستِ نگر بن کر رہ گئے۔"

بعد میں جب سالانہ بجٹ پیش کرنے کا وقت آیا تو لیاقت علی خان کے پیش کردہ میزانیہ نے ہندو سرمایہ داروں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے، عوام پر کوئی ٹیکس نہ لگایا گیا تھا، سارے ٹیکسوں کی زد میں صرف بڑے بڑے سیٹھ اور صنعت کار آتے تھے، اس لئے یہ بجٹ صحیح معنوں میں غریب عوام کا بجٹ تھا۔ اس بجٹ کی بڑی دھوم مچی۔ اُدھر ہندوؤں کی یہ غلط فہمی بھی دُور ہو گئی کہ مسلمان مالیاتی امور میں ہیٹے اور پھسڈی ہیں۔

عبوری حکومت میں مُسلم لیگ کی جانب سے پانچ وزراء شریک ہوئے، جن کے محکمے تھے۔

۱۔ نوابزادہ لیاقت علی خان ——— وزیرِ خزانہ

۲۔ اسمٰعیل ابراہیم چندریگر ——— وزیرِ تجارت

۳۔ سردار عبدالرب نشتر ——— وزیرِ مواصلات

۴۔ راجہ غضنفر علی خان ——— وزیرِ صحت

۵۔ جوگندر ناتھ منڈل ——— وزیرِ قانون

مسلم لیگ قائداعظم کے حکم پر عبوری حکومت میں شامل ہو تو گئی لیکن اُس کا اصل مقصد پاکستان ہی کا حصول تھا، گویا عبوری حکومت میں شمولیت بھی "راست اقدام" ہی کے عمل کا ایک حصّہ تھی۔ بعد میں پنڈت نہرو نے کئی بار مُسلم لیگ سے کہا کہ وہ راست اقدام کی قرارداد واپس لے لے لیکن مسلم لیگ نے نہرو کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

نہرو کا دورۂ سرحد

ابوالکلام آزاد اپنی خود نوشت میں صوبہ سرحد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"عبوری حکومت قائم ہونے کے بعد صوبہ سرحد سے اطلاعات ملنے لگی تھیں کہ ڈاکٹر خان صاحب کے وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود صوبہ سرحد کے لوگ کانگرس کی بجائے مسلم لیگ کے زیادہ وفادار ہیں۔ جواہر لال نہرو (جو بزعم خود پورے ہندوستان کے وزیر اعظم تھے) یہ سمجھتے تھے کہ یہ رپورٹیں انگریز افسروں کی تیار کردہ ہیں، اس لئے انہوں نے خود صوبہ سرحد جا کر حقیقت حال معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا ـــــ جب مجھے اس فیصلے کا علم ہوا تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لیں، کانگرس نے ابھی ابھی مرکز (دہلی) میں وزارت قبول کی ہے، ابھی یہ وزارت مستحکم نہیں ـــــ اگر اس موقع پر وہ سرحدی دورے کی وجہ سے مرکز سے غیر حاضر رہے تو مخالف عناصر کو کانگرس کے خلاف سرگرم عمل ہونے کا موقع مل جائے گا۔ لہٰذا مناسب ہے کہ وہ (نہرو) سردست یہ دورۂ سرحد ملتوی کر دیں۔ گاندھی جی نے بھی میری تائید کی تاہم جواہر لال نہرو اپنی بات پہ اڑے رہے، انہوں نے کہا۔ نتائج خواہ کچھ ہوں وہ بہر حال سرحد جائیں گے"۔

آگے چل کر ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :۔

"۱۹۴۶ء میں صحیح پوزیشن یہ تھی کہ ہم دہلی میں بیٹھے ہوئے خان برادران (ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان) کی ہر دلعزیزی کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے، وہ حقیقت پر مبنی نہ تھی، جواہر لال جب پشاور کے ہوائی اڈے پر اترے تو انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں پٹھان کالی جھنڈیاں لئے کھڑے تھے اور مخالفانہ نعرے لگا رہے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب اور سرحدی وزراء جو جواہر لال کے استقبال کے لئے آئے تھے، پولیس کے پہرے میں کھڑے بالکل بے بس نظر آ رہے تھے"۔

"جواہر لال جیسے ہی طیارے سے اترے، اُن کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر اُن کی کار پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی، اس پر ڈاکٹر خان صاحب نے اپنا ریوالور نکال کر گولی چلانے کی دھمکی دی، تب کہیں انہیں باہر جانے کا راستہ مل سکا"۔

یہ واقعہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو پیش آیا۔ بات یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں دو مرتبہ نہرو صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کا دورہ کر چکے تھے، اُن دنوں صوبے میں کانگرس کا طوطی بول رہا تھا کوئی دوسری منظم سیاسی جماعت موجود نہ تھی اس لئے ہر جگہ ان کا شاندار استقبال ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان منظور ہونے کے بعد سے حالات بہت بدل چکے تھے۔ ۱۹۴۶ء تک صوبہ سرحد کے پڑھے لکھے اور سیاسی شعور رکھنے والے لوگ تحریک پاکستان کے حامی بن چکے تھے، نہرو بچارے غلط فہمی میں مارے گئے اور ہر جگہ ان کی بہت سبکی ہوئی۔

سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل[1] کا بیان ہے کہ پنڈت نہرو نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ دورہ محض اس لئے کیا کہ سرحدی کانگرسیوں کی حوصلہ افزائی اور تالیف قلوب کا سامان ہو سکے اور پاکستان کا مطالبہ کمزور پڑ جائے کیونکہ انہیں علم تھا کہ جلد ہی پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کے لئے رائے شماری ہونے والی ہے ـــــ بہر حال جب ۱۶ اکتوبر کو پنڈت نہرو کا ہوائی جہاز پشاور پہنچا تو ہوائی اڈے کے باہر بہت بڑا اجتماع تھا، کم سے کم تین ہزار مسلم لیگی رضا کار سبز وردیوں میں ملبوس مظاہرے کا نظم و نسق سنبھالے ہوئے تھے، جونہی نہرو ہوائی جہاز سے اُترے کالے رنگ کے ہزاروں غبارے فضا میں چھوڑے گئے۔ غباروں پر سفید حروف میں "واپس جاؤ" کے الفاظ تحریر تھے۔ ہزاروں لوگ سیاہ جھنڈیاں لہرا لہرا کر "نہرو واپس جاؤ" کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے، اس سے قبل پشاور کی تاریخ میں کبھی اتنا بڑا احتجاجی مظاہرہ نہیں دیکھا گیا تھا ـــــ اگرچہ سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے تھے تاہم جواہر لال نہرو کی کار مقررہ گیٹ سے باہر نہ نکل سکی اور وہ کسی دوسرے گیٹ سے نکل کر مچنی روڈ سے ہوتے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔

دوسرے دن پنڈت نہرو درہ خیبر کے دورے پر نکلے، تہکال اور اسلامیہ کالج ہی سے سیاہ جھنڈیوں سے اُن کا "سواگت" ہونے لگا، جدھر سے گزرتے لوگ "واپس جاؤ" کے نعرے بلند کرتے، حکومت نے اُنہیں متحدہ ہندوستان کا وزیر اعظم سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے پورے حفاظتی اقدام کئے تھے، صوبائی وزراء ڈاکٹر خان صاحب اور رائے بہادر مہر چند کھنہ بھی پنڈت نہرو کی

---

[1] پسنتانہ دَ تاریخ پہ رنمیا کبن ص ۱۲۰۸

کار میں سوار تھے، جمرود پہنچے تو قبائلی عوام کی جانب سے بڑا پُرجوش مظاہرہ ہوا اور "نہرو واپس جاؤ" کے نعرے بلند ہونے لگے، ساری وادیٔ خیبر میں ہر مکان اور ہر حجرے پہ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور ہر شخص "پاکستان زندہ باد" اور "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ پنڈت نہرو اسی پہ اکتفا کرتے، حالات سے سبق لیتے اور واپسی کی راہ اختیار کر لیتے لیکن اپنی خفت کے ڈر سے انہوں نے ایسا نہ کیا اور مزید آگے بڑھے، لنڈی خانہ (تورخم) تک پہنچتے پہنچتے مظاہرہ دل کاز دراور بڑھ گیا۔ پہاڑیوں کی اوٹ سے نہرو کی کار پہ پتھراؤ کیا گیا جس سے مہر چند کھنہ زخمی ہو گئے۔

دوسرے دن پنڈت نہرو مالاکنڈ کے دورے پہ روانہ ہوئے تو وہاں اُن سے اس سے بھی بدتر سلوک ہوا۔ کانگرسی عمائدین اور وزراء بھی ہمراہ تھے، جب وہ مالاکنڈ کی تنگ گھاٹی میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے کار پہ پتھراؤ ہونے لگا، ایک خطرناک موڑ پہ پتھر ڈال کر راستہ روک دیا گیا تھا، اگر ڈرائیور ہوشیاری سے کام نہ لیتا اور گاڑی کو کچے راستے پہ ڈال کر نکال نہ لے جاتا تو پنڈت نہرو کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔ پنڈت نہرو کو ایک پتھر آکر لگا اور پیشانی خون آلود ہو گئی تاہم انہوں نے جرأت اور برداشت کا ثبوت دیا، ان واقعات سے اُن پہ صوبہ سرحد کی کانگرسی وزارت کی بے بسی صاف واضح ہو گئی۔

کانگرس وزارت نے بعد میں اس سارے واقعے کی ذمہ داری مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ شیخ محبوب علی خان پہ ڈال دی، حالانکہ شیخ محبوب علی اور گورنر صوبہ سرحد نے پنڈت نہرو کو پہلے ہی سے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا، اس کے باوجود پنڈت نہرو کی حکومت نے شیخ صاحب کو اُن کے عہدے سے معطل کر کے اُن پہ اپنے فرائض سے غفلت برتنے کا مقدمہ قائم کر دیا۔ بمبئی ہائیکورٹ کے مسٹر کلارک تحقیقات پہ متعین کیے گئے۔ تاہم شیخ محبوب علی خان پہ عائد کردہ الزامات ثابت نہ ہو سکے اور انہیں باعزت بری کر دیا گیا۔

میران شاہ اور رزمک میں نہرو کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ قبائلی جرگے نے اُن کی بات سننے سے انکار کر دیا اور صاف کہا کہ وہ ایک مسلمان کے مقابلے میں کافر کا ساتھ دینے پہ ہرگز تیار نہیں۔ اِس دورے کے سلسلے میں نہرو "سرد دریاب" بھی گئے جو صوبہ سرحد میں سرخپوش تحریک کا ہیڈکوارٹر

ہے تاہم اس مرتبہ اُن کا دورہ بہت بے مزا رہا اور انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ سرحد کی سیاسی فضا میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے اور مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان لوگ دل کی گہرائیوں سے قبول کر چکے ہیں۔

ہندو مسلم فسادات

عبوری حکومت میں نہرو وزیر اعظم تھے اور ولبھ بھائی پٹیل وزیر داخلہ بس پھر کیا تھا، ہندو عوام کو یقین ہو گیا کہ پورے ہندوستان پر اُنہی کی حکومت ہے۔ نو سو سال تک وہ مسلمانوں سے جتنے دبے ہوئے تھے اب اُتنے ہی اُبھرے، بپھرے اور تیز ہوئے، کلکتہ، بمبئی اور ملک کے قریباً تمام بڑے شہروں کے سرمایہ دار ہندوؤں نے ہندو آبادیوں کو اسلحہ خانہ بنا رکھا تھا۔ جن سنگھ، ہندو مہا سبھا اور اکالی دل کے رضا کار دندناتے پھرتے تھے جبکہ "اپنوں" کی مہربانی اور غیروں کی نوازش سے مسلم نیشنل گارڈ اور خاکسار مجاہدوں کو "خلاف قانون" قرار دیا جا چکا تھا، منظم پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار کے سات اضلاع میں اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں کہ کئی ہزار مسلمان مارے گئے جن میں اسّی فیصد تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی، چار مہینوں میں کوئی چھپن ۵۶ بلوے ہوئے۔ بڑے بڑے کانگرسی رہنما ان حملوں میں بلوائیوں کی قیادت کرتے رہے، یہاں تک کہ خود پنڈت نہرو نے معائنے کے بعد ہندوؤں کی سفاکی کا اعتراف کیا۔

"فسادات کے سلسلے کا آخری معرکہ گڑھ مکتیر تھا۔ جہاں کُمبھ کے میلے میں کئی لاکھ یاتری مقدس گنگا میں اشنان کرنے اور پاپ دھونے جمع ہوئے تھے۔ میرٹھ، مراد آباد اور گرد و نواح کے دو چار ہزار مسلمانوں نے حسبِ سابق میلے پر دکانیں لگائی تھیں، ہندو سورماؤں کا لشکر پہلے پہل ان پر حملہ آور ہوا۔ پھر قصبے کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ضلع کانگرس کے صدر ایک مسلمان تھے اور بڑے راسخ العقیدہ کانگرسی، یہاں تک کہ انہوں نے خود ہی مسلمانوں سے ہتھیار لے کر پولیس کے پاس جمع کرائے تھے، بلوائیوں نے سب سے پہلے اُنہی کو نشانہ بنایا اور بیوی بچوں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر سینکڑوں مسلمانوں کو ہلاک اور ان کی بہو بیٹیوں کو بے آبرو کیا گیا ـــــ کئی دن تک مسلمان بیبیوں کی گلی سڑی لاشیں کنوؤں سے نکالی جاتی رہیں[1]۔ یہ واقعہ نومبر ۱۹۴۶ء کا ہے۔

---

[1] تاریخ مسلمانانِ پاک و بھارت

سب سے مضحکہ خیز حال سکھوں کا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اُنہیں یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا ساتھ دینے کی صورت میں سکھ بہت فائدے میں رہیں گے اور اُن کے لئے سکھ سٹیٹ بنا دی جائے گی لیکن کانگرس نے اُنہیں ایسا چکمہ دیا کہ وہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ کسی ایک علاقہ پر بھی ان کا اقتدار بحال نہ رہا۔ کھسیانی بلّی کھمبا نوچے، پریشان ہو کر سکھ سارا غصہ مظلوم مسلمانوں پر نکالنے لگے۔ کلکتہ کے فسادات میں بھی سکھ پیش پیش تھے لیکن مشرقی پنجاب کے دیہات میں تو انہوں نے سنگدلی کی انتہا کر دی، گھوڑ سوار سکھوں کے منظم اور مسلح دستے رات کو دیہات پر ٹوٹ پڑتے اور جو مسلمان ہاتھ آتا اسے تہ تیغ کر دیتے، پٹیالہ، نابھہ، مالیر کوٹلہ، الور اور اس قسم کی دوسری ریاستوں میں تو شاید ہی کوئی ایسا خوش قسمت مسلمان ہو جو سکھ بلوائیوں کے ہاتھ سے زندہ بچا ہو۔

صوبہ سرحد کے لوگ کاروبار اور محنت مزدوری کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کو جاتے رہتے تھے، وہ بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے ـــــ بچے کھچے سرحدی باشندے جان بچا کر اپنے علاقوں کو واپس آئے اور انہوں نے ہندو سکھوں کے وحشیانہ کارناموں کی خبریں اہلِ وطن کو سُنائیں۔ تو سرحدی مسلمان تلملا اٹھے، ان کا خون کھولنے لگا، ویسے بھی صوبہ سرحد کے دور افتادہ دیہات میں ہندو سکھ بڑے منہ چڑھے تھے۔ تجارت اور منڈیوں پر انہیں کا قبضہ تھا وہ غریب مسلمانوں کو خاطر میں کب لاتے تھے، اندر ہی اندر وہ اسلحہ جمع کر چکے تھے لہٰذا مسلمانوں پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی نہ چوکتے تھے، ان واقعات کی ابتداء ہزارہ کے ضلع کوہستان سے ہوئی جہاں کے لوگ محنت مزدوری کرنے بمبئی اور کلکتہ تک جاتے تھے، دسمبر ۱۹۴۶ء میں نندھیار کے قبائل کے مجاہدوں نے بٹل اور اگی کی منڈیوں پر ہلّہ بول دیا، پھر مانسہرہ کے سود خوار ہندو سیٹھوں کو سبق سکھایا، کوٹ نجیب اللہ میں بھی ایسے ہی واقعات ہوئے، مری اور راولپنڈی کے قریبی علاقے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے باقی علاقوں میں بھی اکا دکا واقعات ہوئے تاہم ان وارداتوں میں نقصان کا اندازہ اس نقصان کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا جو مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھ سے پہنچا۔

ایک تو ہندو مسلم فسادات کی ان خبروں سے سرحدی مسلمانوں کے جذبات بڑے مشتعل تھے دوسرے پنجاب میں سر خضر حیات خان ٹوانہ کی غیر نمائندہ حکومت کے قیام کے خلاف بھی مسلم لیگ کی جانب سے سول نافرمانی زوروں پر تھی، اس لئے دن بدن سرحدی عوام تحریکِ پاکستان کے پُرجوش

حامی بنتے جا رہے تھے، اسی دوران اتفاق سے ایسا سانحہ ہوا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانانِ سرحد کے جذبات ایک دم بھڑک اٹھے۔ ہُوا یہ کہ ہزارہ کے علاقہ گلیات کی ایک غیر مسلم خاتون نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان سے نکاح کر لیا ـــــ ہندو سکھوں نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے مذکورہ مسلمان پر مقدمہ دائر کر دیا ـــــ اس اثنار میں ہندوؤں کے ایک وفد نے صوبہ سرحد کے کانگرسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب پر زور دیا کہ وہ نو مسلمہ اُن کے سپرد کر دی جائے، ڈاکٹر صاحب نے اُن کی بات مان کر وہ عورت ہندوؤں کے حوالے کر دی ـــــ یہ خبر عام ہوئی تو مسلمان عوام میں بڑا اشتعال پھیل گیا۔ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ نے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے تین ارکان پر مشتمل ایک وفد ڈاکٹر خان صاحب کے پاس بھیجا اور انہیں مسلمانوں کے ردِ عمل سے آگاہ کیا تاہم ڈاکٹر خان صاحب اس عورت کو اس کے مسلمان شوہر کے حوالے کرنے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔

سول نافرمانی اس پر ۱۹ر فروری ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ۲۱ر فروری کو چوک یادگار میں ایک احتجاجی جلسہ کیا جائے اور بعد میں ایک جلوس نکال کر عوامی سطح پر ڈاکٹر خان صاحب سے اس نو مسلمہ کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

۲۱ر فروری کو دن کے دو بجے چوک یادگار میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسۂ عام ہوا جس کی صدارت سٹی مسلم لیگ کے صدر خان فدا محمد خان نے کی۔ اس وقت تک پیر صاحب مانکی شریف بھی مسلم لیگ میں شامل ہو چکے تھے اور ان کے ہزاروں مُرید تحریک پاکستان میں پُرجوش حصہ لے رہے تھے۔ اس جلسے سے تہکال کے ارباب عبدالغفور خان اور صوبائی مسلم لیگ کے صدر خان بخت جمال خان نے بھی خطاب کیا اور عوام کو کانگرسی حکومت کی چیرہ دستیوں سے آگاہ کیا۔

جلسے کے بعد ایک بہت بڑا جلوس ترتیب دیا گیا جو قصہ خوانی سے ہوتا ہوا وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد ڈاکٹر خان صاحب کی سرکاری رہائش گاہ بالمقابل گورنر ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ پولیس کی بڑی تعداد جلوس کے ساتھ تھی۔ پولیس نے سنٹرل جیل کا قریبی پھاٹک بند کر دیا تاکہ مظاہرین وزیر اعلیٰ کے بنگلے کی طرف نہ جا سکیں ـــــ اب صورتِ حال اور بھی نازک ہو گئی ـــــ نہ جلوس پیچھے ہٹنے کو تیار تھا نہ پولیس راستہ دینے کو تھی ـــــ اس وقت جلوس کی قیادت ارباب عبدالغفور خان اور

فدا محمد خان کر رہے تھے۔ مؤرخ الذکر رہنما اس واقعہ کی تفصیل یوں بتاتے ہیں :۔

"جب ہم پل کی چڑھائی چڑھ رہے تھے تو سید فرید اللہ شاہ نے، جو اُن دنوں مجسٹریٹ درجہ اوّل تھے، ارباب عبدالغفور کو روکا اور آگے جانے سے منع کیا لیکن کسی نے اُن کی بات پر کان نہ دھرا۔ ہم لوگ آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ پھاٹک کے قریب جا پہنچے جہاں ڈپٹی کمشنر پشاور ایس۔ بی شاہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سردار عبدالرشید خان موجود تھے، انہوں نے ہمیں واپس ہو جانے کو کہا لیکن لوگوں نے واپس ہونے سے انکار کر دیا ـــــ لمحہ بہ لمحہ ہجوم بے قابو ہوتا جا رہا تھا، بعض نوجوان آہنی گیٹ کو پھلانگ کر دوسری طرف جانا چاہتے تھے جبکہ بعض پل سے اُتر کر ریلوے لائن پار کر کے اپنا مارچ جاری رکھنا چاہتے تھے ـــــ میں نے چند نوجوان رضاکاروں کے ہمراہ پھاٹک کا رُخ کیا تاکہ جس طرح بھی ہو ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر پہنچا جائے۔ جب ہم گیٹ سے زور آزمائی کر رہے تھے تو ڈپٹی کمشنر نے مجھے روکا اور میرے نہ رُکنے پر اس نے مجھے پکڑ کر ایس ایس پی کے حوالے کر دیا۔"

اس دوران جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے بے دریغ آنسو گیس چھوڑنی شروع کر دی، ہر طرف دھواں پھیل گیا ـــــ مجھے (فدا محمد خان کو) جیل کے صدر دروازہ کی طرف لے جایا گیا لیکن جیل کے حکام نے مجھے اندر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی کیونکہ پولیس کے پاس وارنٹ گرفتاری نہ تھا ـــــ خاصی دیر تک جیل کی ڈیوڑھی میں انتظار کرنا پڑا۔

جلوس اب مشتعل ہوتا جا رہا تھا اور اس کا روکنا مشکل تھا، بہت سے لوگ پھلانگ کر پھاٹک کو عبور کر چکے تھے، سنٹرل جیل اور سیشن کورٹ کے سامنے لوگ اکٹھے ہو چکے تھے، اب کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی چنانچہ جلوس نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا اور وزیر اعلیٰ کے بنگلہ میں داخل ہو گیا ڈاکٹر خان صاحب، اور یحییٰ جان خان، وزیر تعلیم اس وقت وہاں موجود تھے، وہ چھجے (بالکونی) میں کھڑے ہو کر جلوس کو دیکھتے رہے جب کہ نیچے کوٹھی کے لان میں جلوس نے ایک باقاعدہ جلسے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ارباب عبدالغفور خان اور خان بخت جمال خان نے بڑی جوشیلی تقریریں کیں اور وزیر اعلیٰ سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا ـــــ مقررین نے مسلمان لڑکی کو

ہندوؤں کے حوالے کرنے پر ڈاکٹر خان صاحب کی شدید مذمت کی ۔۔۔ ڈاکٹر خان صاحب، (جو بڑی ٹھنڈی طبیعت کے مالک تھے) غور سے تقریریں سنتے رہے، جب ارباب عبدالغفور خان نے کہا "کہ قوم تم سے مطالبہ کرتی ہے کہ استعفیٰ دو"۔ تو ڈاکٹر خان صاحب نے کہا "قوم کہاں ہے؟" اس پر بخت جمال خان نے مظاہرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یہ قوم ہی تو ہے ۔۔۔!" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "یہ قوم نہیں، یہ مظاہرین ہیں، جن لوگوں نے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے اگر وہ کہیں تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔"

جلوس کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس چھوڑی گئی۔ جب ڈپٹی کمشنر نے جلوس کے قائدین کو گرفتار کرنا چاہا تو ہر شخص آگے بڑھ بڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنے لگا۔ بہت سے سرکردہ مسلم لیگیوں کو اُسی وقت حراست میں لے لیا گیا جب کہ باقی ماندہ کو شام کے وقت اُن کے گھروں سے گرفتار کر لیا گیا۔

اس دن کے بعد روزانہ مسلم لیگ کے زیر اہتمام احتجاجی جلوس نکلنے لگے، لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہر جگہ جیلیں بھر گئیں۔ ۲۸ فروری کو سرحد اسمبلی میں مسلم لیگ کے قائد خان عبدالقیوم خان نے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا تو سول نافرمانی کی تحریک میں جان پڑ گئی اور صوبے کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں جلوس نکلنے لگے۔

۱۰ مارچ سے سرحد اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا تھا، مسلم لیگی ارکان اسمبلی میں سے بہت سے گرفتار ہو چکے تھے۔ رضا کاروں نے طے کیا کہ جیسے بھی ہو ۱۰ مارچ کو اسمبلی ہال کے باہر زوردار مظاہرہ کیا جائے تاکہ ایوانِ حکومت میں کھلبلی مچ جائے ۔۔۔ اسمبلی ہال، اُن دنوں اس عمارت میں واقع تھا جہاں آج کل ہائی کورٹ پشاور کام کر رہی ہے۔ ۱۰ مارچ آیا تو چوک یادگار سے بہت بڑا جلوس نکلا اور اسمبلی ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ حکومت نے مظاہروں کے خدشے کے پیشِ نظر اسمبلی ہال کے گرد پولیس اور فوج کا زبردست پہرہ لگا رکھا تھا، جونہی یہ جلوس چناح پارک کے ریلوے پُل کے قریب پہنچا تو فوجی سپاہیوں نے اسے روکا ۔۔۔ تاہم بپھرے ہوئے لوگ پھر آگے بڑھے تو فوج نے ایک فیتہ باندھ دیا اور اعلان کیا کہ جو بھی فیتے کے قریب آیا،

گولی سے اڑا دیا جائے گا ـــ تاہم فوج کی یہ دھمکی اور انتباہ بھی لوگوں کو روک نہ سکا ـــ مسلم لیگی رضا کار نڈر ہو کر آگے بڑھنے لگے ـــ ایک بار تو فوجیوں نے فیتہ ذرا پیچھے سرکا لیا لیکن دوبارہ وارننگ دی کہ اب کے کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو خیر نہ ہوگی ـــ بات یہ تھی کہ حکومت نے جان بوجھ کر یہاں ڈوگرہ سپاہیوں کی ڈیوٹی لگائی تھی، مسلمان فوجی متعین نہ کئے تھے کہ کہیں مظاہرین کا لحاظ نہ کریں ـــ تاہم فوج کی اس وارننگ کے بعد بھی جوش میں آئے ہوئے رضا کار "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے بلند کرتے آگے بڑھنے لگے۔ پبی تحصیل نوشہرہ کا ایک مرد مجاہد نواب خان ہلالی پرچم اٹھائے جلوس کے آگے آگے تھا، اس نے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے جونہی قدم آگے بڑھایا ڈوگرہ فوجیوں کی گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اور اللہ کا یہ مخلص بندہ پاکستان کی عزت و عظمت پہ جاں نثار کر گیا ـــ حال یہ تھا کہ آخر وقت تک وہ سبز ہلالی پرچم کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ جونہی وہ زمین پر گرنے لگا پشاور شہر کا ایک رضا کار مشتاق احمد (غوثیہ الیکٹرک سٹور) دوڑ کر آگے بڑھا اور پرچم کو تھام لیا ـــ گولیوں کی بوچھاڑ میں ہلالی پرچم برابر لہراتا رہا ـــ گولی چلنے سے بہت سے لوگ زخمی ہو گئے جن میں سے متنی کا محمد علی خان زخموں کی تاب نہ لا کر شہادت کے درجے کو پا گیا۔ اسی مظاہرے میں قصہ خوانی پشاور کا ایک نوجوان تاجر آغا محمد سخت زخمی ہوا اور ہمیشہ کے لئے ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔

ڈوگرہ فوجیوں کی اس وحشت و بربریت کے باوجود سول نافرمانی کی تحریک جاری رہی، یہاں تک کہ صوبہ سرحد کی پردہ دار خواتین بھی میدان میں نکل آئیں اور اسمبلی ہال کے بالکل سامنے ریلوے لائن کو پار کرتے ہوئے ان کا بھی یہی حشر ہوا اور بہت سی خواتین زخمی ہوئیں۔

تحریک پاکستان اب اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ اسے دبایا جانا ناممکن تھا، صوبے کے طول و عرض میں جلوس نکلتے۔ پابندیوں کے باوجود جلسے ہوتے، دارالحکومت پشاور میں اتنے مسلم لیگی رضا کاروں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا کہ سنٹرل جیل میں مزید جگہ نہ رہی۔ سختی کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے رہنما کو بھی "سی" کلاس میں ڈال دیا گیا، جیل ہی میں ان قیدیوں پہ مقدمات چلائے گئے اور مختلف میعاد کی سزائیں سنائی گئیں۔ پچاس سرکردہ مسلم لیگیوں پہ تو دس دس دفعات عائد کی گئیں۔

۱۹ مئی ۱۹۴۷ء کو سنٹرل جیل پشاور میں ہنگامہ ہوگیا۔ ایک رائے تو یہ ہے[1] کہ خود کانگرسی حکومت نے قیدیوں کے بھیس میں اپنے آدمی بھیجے تھے کہ وہ جیل میں ہنگامہ کرائیں تاکہ اسی بہانے مسلم لیگیوں کو دبایا جاسکے۔ جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ مسلم لیگی رضاکاروں کے کچھ مطالبات تھے جو وہ جیل حکام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اُدھر حکومت نے تہیہ کر رکھا تھا کہ سختی کرنی پڑے تو بھی ان رضاکاروں کو دبایا جائے تاکہ وہ سر نہ اٹھانے پائیں ـــــ بہرحال ڈپٹی کمشنر پشاور اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات مسٹر سمتھ کافی دیر تک مسلم لیگی کارکنوں سے بات چیت کرتے رہے، جب رضاکاروں نے ان کے حکم سے سرتابی کی تو ڈپٹی کمشنر نے فائر کھول دینے کا حکم دیا ـــــ آرڈر ملتے ہی پولیس دھڑا دھڑ آنسو گیس کے گولے پھینکنے لگی، ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا، ایک گھنٹہ کے بعد جب ہنگامہ فرو ہوا تو ایک سو کے قریب مسلم لیگی رضاکار میدان میں بے ہوش پڑے تھے کئی معمر لوگ تو قریب المرگ تھے، پولیس کی اس بے دردانہ کارروائی سے پشاور شہر کے دو نوجوان سید مبارک علی شاہ اور محمد ظفر شدید متاثر ہوئے، انہیں طبی امداد کے لئے ہسپتال میں داخل کیا گیا لیکن وہ رُتبہ شہادت حاصل کر گئے۔

ان چار شہداء کے پاکستان کے علاوہ حویلیاں ضلع ایبٹ آباد کے نوجوان رضاکار سید داؤد شاہ نے بھی تحریک پاکستان کے دوران شہادت پائی۔ "اخبار نشیمن" کے مطابق[2] سید داؤد شاہ موضع پنج گراں کے ایک دینی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، والد کا نام سید نور علی شاہ تھا، وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار تھے اور رسول نافرمانی کرتے ہوئے گورکھا کیمپ کے سامنے جا پہنچے، انگریز ڈپٹی کمشنر نے انہیں مخاطب کر کے گولی سے اڑا دینے کی دھمکی دی لیکن وہ اس دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خاردار تار عبور کر کے فوجی کیمپ میں جا پہنچے اور ڈپٹی کمشنر کو للکارا کہ "مارو گولی شہادت میری معراج ہے"۔ اچانک ایک گولی آئی اور داؤد شاہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

یہ سہرا صوبہ سرحد ہی کے سر ہے کہ اس کے پانچ جیالوں نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ دوسرے صوبوں کے لوگوں نے فرقہ وارانہ فسادات میں تو

---

[1] ہفت روزہ "نشیمن" ایبٹ آباد۔ [2] ہفت روزہ "نشیمن" ایبٹ آباد۔

بہت نقصان اٹھایا نا ہم سول نافرمانی کے دوران انہیں اتنی قربانیاں نہ دینی پڑیں۔

ہمہ گیر تحریک صوبہ سرحد کے باقی مقامات کے لوگوں نے بھی قیام پاکستان کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں لوگوں نے اتنی تعداد میں گرفتاریاں پیش کیں کہ اتنی بڑی جیل میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو یہ عالم تھا کہ جیل کے حکام نظم ونسق برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئے، قیدیوں نے اعلانیہ بغاوت کر دی۔ حکام کی سختی کی اطلاعات شہر میں پہنچیں تو عوام مشتعل ہو گئے، ہر طرف لوٹ مار اور فسادات کا بازار گرم ہو گیا۔ پولیس صورت حال پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی، جس پر ڈاکٹر خان صاحب کی ہدایت پر دو صوبائی کانگرسی وزراء ڈیرہ پہنچے، انہوں نے جانے ہی مظاہرین کے خلاف سخت اقدامات کا حکم دے دیا چنانچہ منٹری سے فوج طلب کر لی گئی۔ اُدھر لوگ مورچہ بند ہو کر مکانوں میں بیٹھ گئے اور گولیاں برسانے لگے، کانگرسی وزراء کی ہدایت پر ۳۷۔ ایم۔ ایم کی توپوں سے مورچے اور برج مسمار کرنے کا حکم دے دیا گیا، چھ دن تک فسادات ہوتے رہے، نو سو دکانیں لوٹ لی گئیں پھر بھی فساد کی آگ فرو نہ ہوئی بلکہ شعلے دیہات تک پھیل گئے۔ گومل بازار، پہاڑ پور، کلاچی، موسیٰ زئی اور دوسرے درجنوں دیہات متاثر ہوئے۔

۱۷ اپریل کو ٹانک بھی فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ وہاں مالدار ہندوؤں نے محسود چوکیدار رکھے ہوئے تھے ایک ہندو دکاندار کی اشتعال انگیزی سے فساد شروع ہوا تو ساؤتھ وزیرستان سکاؤٹس کو طلب کرنا پڑا۔ حالانکہ ان کا دائرہ کار صرف قبائلی علاقے تک محدود تھا۔ دکانیں اور مکان لوٹے جانے لگے۔ دوسرے دن فساد رُکا لیکن ۱۹ اپریل کو تیز ہوا کی وجہ سے شعلے پھر بھڑک اٹھے اور ساری منڈی جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

روزنامہ "سٹیٹس مین" کے ایڈیٹر سٹیفنز نے ٹانک کے زنانہ مشنری ہسپتال کی انگریز نرسوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ فسادات کی وجہ سیاسی کے علاوہ اقتصادی بھی تھی، تجارت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ غلہ اور کپڑا مسلمانوں کے لئے نایاب تھا۔ کنٹرول پر ڈیڑھ گز فی کس کپڑا ملتا جس سے تن ڈھانپنا بھی مشکل تھا، اکثر مسلمان گھرانوں کی عورتوں کے پاس صرف ایک چادر تھی جو وہ باری باری اوڑھ کر باہر نکلا کرتیں۔ اس کے برعکس ہندو کے لئے کسی چیز کی قلت نہ تھی، ایک ذریعہ کے

مطابق کلاچی کے کچھ مسلمان تاجر کلکتہ گئے تھے جہاں وہ فسادات میں گھر گئے، جب واپس آکر انہوں نے اپنا دکھڑا سنایا تو سارا نواحی علاقہ مشتعل ہوگیا۔

پشاور کے علاوہ ہزارہ ڈویژن میں بھی تحریک سول نافرمانی زوروں پر تھی، یہ علاقہ مسلم لیگ کا ایک مضبوط مرکز سمجھا جاتا تھا، مرد تو مرد یہاں کی خواتین بھی پیچھے رہنے نہ پائیں اور انہوں نے بیگم کمال الدین کی قیادت میں کانگرسی حکومت کے خلاف زوردار مظاہرے کئے۔ یہی حال مردان، کوہاٹ، بنوں اور دوسرے اہم مراکز کا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ اس وقت تک ایک ہردلعزیز عوامی جماعت بن چکی تھی، پاکستان کا حصول مسلمانانِ برِصغیر کا نصب العین قرار پا چکا تھا اور اب دُنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنے راستے سے ہٹا نہ سکتی تھی۔

نیا وائسرائے

مرکز میں عبوری حکومت قائم ہونے کے باوجود ملک کا سیاسی مسئلہ حل نہ ہوا تھا، کانگرس کو قابو میں رکھنا وائسرائے کے لئے مشکل ہو رہا تھا، اُدھر مسلم لیگ کو بھی خفا نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس صورت میں مسلمان پھر "راست اقدام" کی قرارداد پر عمل شروع کر دیں گے، بالآخر برطانوی وزیرِ اعظم نے ۲ر فروری کو اعلان کیا کہ جُون ۱۹۴۸ء تک حکومت برطانیہ تمام اختیارات ایک ایسی ہندوستانی حکومت کے حوالے کر دے گی، جسے عوام کی حمایت حاصل ہو، جو امن قائم کر سکے اور عدل و انصاف سے نظم و نسق چلا سکے ـــــ اسی بیان میں یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا جا رہا ہے اور وہ مارچ ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھال لیں گے۔

۲۲ر مارچ کو مونٹ بیٹن دہلی پہنچا، آتے ہی اس نے کانگرس، مسلم لیگ اور دوسرے طبقوں کے رہنماؤں سے طویل ملاقاتیں کیں، اپریل ۱۹۴۷ء میں وہ چھ بار قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقاتی ہوا۔ اگرچہ شروع میں مونٹ بیٹن کا جھکاؤ کانگرس کی طرف تھا، وہ نہرو خاندان سے ذاتی مراسم رکھتا تھا، ایک کانگرسی ہندو وی۔ پی مینن اس کے سٹاف میں شامل تھا اور اس کے مزاج میں بے حد دخیل تھا۔ تاہم قائداعظم کے دلائل میں وہ قوت تھی کہ مونٹ بیٹن کو اُن کی بات پر توجہ دینی ہی پڑی۔ قائداعظم نے ثابت کر دیا کہ برصغیر کے مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور مسلم لیگ ان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ مونٹ بیٹن مسئلے کو جلد حل کرنے کا متمنی تھا، اس نے صوبوں کے گورنروں کو صلاح مشورے کے لئے

بُلایا۔ ہر ایک سے اپنے صوبے کے حالات دریافت کئے۔ صُوبہ سرحد کے گورنر سر اولف کیرو نے وائسرائے کو بتایا کہ اگر ہندوستان کا سیاسی مسئلہ جلد حل نہ ہوا تو صوبہ سرحد بدنظمی کا شکار ہو کر رہ جائے گا اور سرحدی قبائل، جن سے برطانوی حکومت ہمیشہ خائف رہی ہے۔ اپنی من مانی کرنے لگیں گے۔

وائسرائے مونٹ بیٹن کو پھر بھی یقین نہ آیا، اُسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ صُوبہ سرحد میں کانگرس کی حکومت ہے اور وہاں کے عوام بھی کانگرس کے حامی ہیں ـــــ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ بذاتِ خود پشاور جائے اور حالات کا جائزہ لے کر کسی حتمی فیصلے پر پہنچے۔

مؤنٹ بیٹن کا دَورہ

اپریل ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ میں ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن اپنی بیگم کے ہمراہ پشاور پہنچا، اُس نے ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے زعماء سے ملاقات کی، آرتھر سولسن کے مطابق ڈاکٹر خان نے بتایا کہ مسلم لیگ صرف سرمایہ داروں کی جماعت ہے اور عوام کی نمائندگی نہیں کرتی۔ جس پر گورنر اولف کیرو نے جواب دیا کہ "کانگرس میں بھی تو سرمایہ دار ہندو کافی تعداد میں شامل ہیں"۔ مسلم لیگ نے اس موقع پر ایک مظاہرے کا بندوبست کر رکھا تھا، نواب صدیق علی خان سالارِ اعلیٰ مسلم لیگ اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اپنے فرائض منصبی کو بجالانے کے سلسلہ میں میں وائسرائے کی آمد سے چوبیس گھنٹے پیشتر پشاور پہنچا شہری مسلمانوں کے علاوہ دور دراز کے پہاڑی علاقوں سے آنے والے پٹھانوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ قلعہ بالاحصار کے نیچے جمع ہو چکے تھے جہاں تک نگاہ جاتی سبز پوش رضاکار نظر آتے۔ یہاں تک کہ ہزاروں کی تعداد میں برقعہ پوش سرحدی خواتین بھی اس میدان میں جمع ہو کر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہی تھیں، اسلامیانِ ہند کے اتحاد و اتفاق کا یہ وہ پُروقار مظاہرہ تھا کہ جو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔"

بالاحصار، جناح پارک اور اس کا نواحی علاقہ ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا، لاکھ ڈیڑھ لاکھ مظاہرین جمع تھے، ایسے ہجوم کے سامنے جانا خطرے سے خالی نہ تھا تاہم گورنر کیرو کے مشورے پر وائسرائے نے جرأت سے کام لیتے ہوئے مونٹ بیٹن نے مظاہرے کو دیکھنے کی حامی بھر لی لیکن مشکل یہ بنی کہ لیڈی مونٹ بیٹن (ایڈوینا) بھی ساتھ جانے پر مُصر تھی، مؤنٹ بیٹن ہجوم کا اندازہ کرنے جناح پارک کے پاس ریل کی پٹڑی پر چڑھ گیا، جگہ کافی اُونچی تھی، وہاں سے وہ ہجوم کو ایک نظر دیکھ سکتا تھا، اُس نے

لیڈی مونٹ بیٹن کا ہاتھ تھام رکھا تھا، ہجوم "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا۔ اس کے جوش و خروش کا عالم بیان سے باہر تھا، ایسے مجمع کو دیکھ کر خود کیرو کا خون خشک ہو رہا تھا، اُسے خدشہ تھا۔ کہ کہیں وائسرائے کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ مونٹ بیٹن سبزی مائل رنگ کی بشرٹ پہنے ہوئے تھا، اس نے مجمع کے جوش و خروش کو دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کیا چاہتے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پشتو کہاں سے آتی۔ آخر اس نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے کہا "ہاتھ لہرا کر ان کے سلام کا جواب دو ——" خود وائسرائے نے بھی ہاتھ لہرایا —— اس پر بھی ہجوم نے فرطِ مسرت سے "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

چونکہ ان دنوں سرحد مسلم لیگ کے تمام قابلِ ذکر رہنما جیلوں میں تھے، اس لئے مسلم لیگ کی نمائندگی اور ترجمانی کے لئے وزیرِ مواصلات سردار عبدالرب نشتر اور ملک فیروز خان نون بطور خاص پشاور آئے۔

مونٹ بیٹن اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے اتنا بڑا عوامی مظاہرہ پہلی بار دیکھا تھا، وہ صورتِ حال کو بھانپ گیا اور دہلی پہنچتے ہی صوبہ سرحد کے زعماء کو صلاح مشورے کے لئے بلایا جس پر پیر صاحب مانکی شریف، ارباب نور محمد خان، خان ثمین جان خان اور خان عبدالقیوم خان کو جیل سے رہا کر کے دہلی بھیجا گیا۔ کانگرسی لیڈر بھی اس موقع پر موجود تھے۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں صوبہ سرحد کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھیں، اس لئے وائسرائے اسی نتیجہ پر پہنچا کہ استصوابِ رائے عامہ سے معلوم کیا جائے کہ آیا صوبہ سرحد کے لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں ——؟ مسلم لیگی رہنماؤں نے جواب دیا کہ اگر رائے شماری کے بغیر چارہ نہیں تو ہم رائے شماری کرانے پر بھی تیار ہیں۔

اس بات چیت کے نتیجے میں یہ بھی طے پایا کہ صوبہ سرحد کی حکومت فوری طور پر ایسے تمام قیدیوں کو رہا کر دے گی جو تشدد کی کارروائیوں میں ملوث نہیں۔ لیکن مسلم لیگی کارکنوں نے اس وقت تک جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک کانگرسی وزارت مستعفی نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسلم لیگ نے حسبِ سابق صوبہ سرحد کی وزارت کے خلاف ایجی ٹیشن جاری رکھا۔

۳ جون کا منصوبہ

پشاور کے دورہ کے بعد وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے کہوٹہ ضلع راولپنڈی اور پنجاب کے دوسرے دیہات میں بھی حالات کا بچشم خود معائنہ کیا۔ وہ جان گئے کہ ان نازک حالات میں ہندوستان کا متحد رہنا ناممکن ہے، ۲ مئی کو اس نے لارڈ اسمے

اور جارج ایبل کے ذریعے اپنی تجاویز برطانوی حکومت کو بھیجیں، مونٹ بیٹن اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ جتنی جلد ہندوستان کو سیاسی آزادی دے دی جائے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ جب لارڈ اسمے کے بھیجنے سے کام نہ بنا تو وہ خود ہوائی جہاز سے لندن گیا اور تقسیم ہند کے منصوبے کی منظوری لے کر ہی دہلی واپس لوٹا۔

۳ رجون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند اور انتقالِ اقتدار کا منصوبہ شائع کر دیا گیا، جس کے اہم نکات یہ تھے۔

۱۔ ہندوستان کے دو حصے کر دیئے جائیں گے دونوں کو مستعمراتی مرتبہ حاصل ہوگا۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں کے لئے آئینِ حکومت اور قوانینِ خود بنائیں گے، اپنے حاکم اعلیٰ (گورنر جنرل) کا انتخاب کریں گے۔ دونوں کو سلطنت برطانیہ کے حلقے میں رہنے یا اسے چھوڑ دینے کی آزادی ہوگی۔

۲۔ بنگال اور پنجاب کے صوبے ہندو اور مسلم اکثریت کے اضلاع میں تقسیم کر دیئے جائیں گے ان اضلاع کے ارکان مجلس وضع قوانین کو اختیار ہوگا کہ جس مستعمرہ کے ساتھ چاہیں، اپنا الحاق کرائیں تقسیم کی حدود کا تعین ایک باؤنڈری کمیشن کرے گا۔

۳۔ سلہٹ میں اور دوسری طرف صوبہ سرحد میں وہاں کے مسلمانوں کی رائے عامہ لے کر ان علاقوں کے ہندوستان یا پاکستان میں الحاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

۴۔ آسام اور سندھ کی اسمبلیاں اپنے ارکان کی اکثریت سے اپنے اپنے الحاق کا فیصلہ کریں گے۔

۵۔ ہندوستان کی ریاستوں کو کسی ایک مستعمرہ میں شامل ہونے یا آزاد رہنے کا حق حاصل ہوگا۔

قائداعظم کی پہلی نشری تقریر

۳ رجون ۱۹۴۷ء کا دن ہماری قومی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے، یہی دن اصل میں سفرِ پاکستان کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس دن ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان کے عوام کے نام اختیارات کی منتقلی کے منصوبے کا اعلان کیا، ہندوؤں کی طرف سے جواہر لال نہرو نے اور سکھوں کے نمائندے کی حیثیت سے سردار بلدیو سنگھ نے اس منصوبے کا خیر مقدم کیا جب کہ قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کی جانب سے اس منصوبے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔

قائداعظم نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے دہلی ریڈیو سٹیشن سے آپ حضرات سے براہِ راست گفتگو کا موقع دیا گیا ہے، میرے خیال میں یہ پہلی بار ہے کہ کسی غیر سرکاری فرد کو اس طاقتور آلے کے ذریعے سیاسی مسائل پر عوام سے خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے، یہ اچھا آغاز ہے اور مجھے

امید ہے کہ مستقبل میں مجھے ایسی ہی سہولتیں حاصل رہیں گی تاکہ میرے خیالات و نظریات آپ لوگوں تک اخباروں کے سرد اور جامد الفاظ کی بجائے براہِ راست زندگی کی حرارت سے بھرپور انداز میں پہنچ سکیں۔

قائداعظم نے لارڈ مونٹ بیٹن کے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے کہا "اگرچہ بعض اہم معاملات میں یہ منصوبہ ہمارے نقطۂ نظر کے عین مطابق نہیں ہے ـــ تاہم اس کی بعض جزئیات اطمینان بخش ہیں۔ اب اس کی حتمی منظوری مسلم لیگ کونسل ہی دے سکتی ہے جس کا اجلاس ۹ جون کو ہو رہا ہے۔

اپنی تقریر میں صوبہ سرحد کے متعلق قائداعظم نے فرمایا :-

"جو منصوبہ ابھی ابھی نشر کیا گیا ہے اس کے پیراگراف گیارہ سے واضح ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرینڈم کرایا جائے گا جس کے ذریعے شمال مغربی صوبے کی قانون ساز اسمبلی کے رائے دہندگان اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں ؟"

صوبہ سرحد میں مسلم لیگی کارکنوں کی سول نافرمانی کے متعلق قائداعظم نے کہا۔

"اندریں حالات میں سرحد کی صوبائی مسلم لیگ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پُرامن سول نافرمانی کی تحریک کو، جو انہیں بوجہ مجبوری شروع کرنا پڑی تھی، اب ختم کر دیں ـــ میں مسلم لیگ کے تمام لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے عوام کو منظم کریں تاکہ وہ اس استصواب رائے عامہ میں ہمت اور حوصلے کے ساتھ پُرامید ہو کر حصہ لیں ـــ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ سرحد کے عوام متفقہ طور پر پاکستان ہی کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کریں گے۔"

تحریکِ پاکستان میں سرحدی خواتین کے کردار کو سراہتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے کہا۔

"ہماری شہری آزادی کی جنگ میں مسلمانوں کے تمام طبقوں نے جیسی جیسی مصیبتیں برداشت کیں، جو جو قربانیاں دیں اور خاص طور پر سرحد کی خواتین نے جیسی خدمات انجام دیں، ان سب کے لئے میں اپنے تشکر و اطمینان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی پر الزام لگائے بغیر جس کا یہ موقع بھی نہیں، مجھے ان تمام لوگوں کے ساتھ پوری ہمدردی ہے جنہوں نے اس جدوجہد میں تکلیفیں برداشت کیں، جن کی جائداد اور املاک تباہ و برباد ہوئی اور جو اس راہ میں شہادت پا گئے۔"

"مجھے پوری پوری امید ہے کہ صوبہ سرحد میں استصواب رائے عامہ پر امن طریقے سے ہوگا، ہر شخص کو اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ صوبہ سرحد کے عوام کی آزادانہ، منصفانہ اور سچی رائے حاصل کی جائے ـــــ میں ایک بار پھر تمام لوگوں سے امن وامان برقرار رکھنے کی پُرزور اپیل کرتا ہوں ـــــ پاکستان زندہ باد!"

اس تقریر کے بہت سے سیاسی اور آئینی پہلو ایسے تھے جنہیں عوام اچھی طرح سمجھ نہ پائے لیکن "پاکستان زندہ باد" کے کلمات نے لوگوں کے تمام شکوک دور کر دیئے اور انہیں یقین ہوگیا کہ پاکستان اب بن کے رہے گا۔

صوبہ سرحد کی جیلیں اس وقت تک مسلم لیگی قیدیوں سے بھری ہوئی تھیں، جونہی انہوں نے قائداعظم کی تقریر سنی وہ "پاکستان زندہ باد!" ـــــ "قائداعظم زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ اس اہم اعلان کے بعد سول نافرمانی ختم ہوگئی۔ جیل خانوں کے پٹ کھول دیئے گئے اور مسلم لیگی زعماء اور رضاکار رہائی کے بعد پورے جوش اور عزم کے ساتھ ریفرینڈم جیتنے کی تیاریوں میں لگ گئے۔

ریفرنڈم

صوبہ سرحد کا ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) بے حد اہم تھا اس لئے کہ اگر ۹۶ فیصد مسلم اکثریت کا یہ کلیدی صوبہ پاکستان میں شامل نہ ہوتا تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور غیر مسلموں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ لیجئے خود مسلمان بھی پاکستان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ قائداعظم اگرچہ اس سلسلے میں صوبہ سرحد کا دورہ نہ کر سکے تاہم اپنے تدبر اور فراست سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اس میں ذاتی دلچسپی لی، انہی کی ہدایت پر ایک ریفرنڈم کمیٹی قائم کی گئی جس کے صدر مسٹر اسمٰعیل ابراہیم چندریگر تھے (جو اس وقت عبوری حکومت میں ملک کے وزیر تجارت تھے) اور کمیٹی کے ارکان میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے سالار اعلیٰ نواب صدیق علی خان، عبوری حکومت کے وزیر صحت راجہ عنضنفر علی خان سرحد اسمبلی میں حزب اختلاف کے لیڈر خان عبدالقیوم خان اور دوسرے سرکردہ لوگ شامل تھے۔

قائداعظم نے ریفرنڈم کے طریق کار کے سلسلے میں تفصیل بھی پہلے سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے طے کر لی تھی، اس بات کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ ریفرنڈم کی تمام تر نگرانی گورنر صوبہ سرحد کرے اور یہ کہ سول انتظامیہ کی بجائے ریفرنڈم کا سارا اہتمام ایسے انگریز فوجی افسروں کے ہاتھ میں ہو، جو سرحدی معاملات کا طویل تجربہ رکھتے ہوں، نیز یہ کہ پولنگ سٹیشنوں پر امن وامان بحال رکھنے کے لئے فوج متعین کی جائے۔ چنانچہ

انڈین آرمی کے ایک سینیئر اور غیر جانبدار افسر بریگیڈیر جے۔ آر۔ بُوتھ کو سرحد کا ریفرنڈم کمشنر مقرر کیا گیا، اس کے ماتحت بہت سے دوسرے فوجی افسر متعین کئے گئے۔ پولیس کے علاوہ ۲۸ ہزار فوجی سپاہیوں کو امن و امان کی بحالی اور انتظامات کے سلسلے میں فرائض سونپے گئے، پولنگ سٹیشنوں کے پاس آتشیں اسلحہ اور دوسرے ہتھیار لانے کی ممانعت کر دی گئی۔ ریفرینڈم کے لئے ۶ رجولائی سے ۱۷ رجولائی تک کی میعاد مقرر کی گئی۔ اس سارے عرصہ میں فوجی ٹینک اور آرمرڈ کاریں سڑکوں پر گشت کرتی رہیں تاکہ عوام کو پتہ چل جائے کہ گڑبڑ کرنے والوں سے کسی قسم کی رعایت نہیں کی جائے گی۔

اس وقت تک صوبہ میں کانگرسی وزارت برسر اقتدار تھی، گورنر سر اولف کیرو تھے، جونہی ریفرنڈم کا اعلان ہوا۔ گورنر کیرو نے دو ماہ کے لئے چھٹی کی درخواست دے دی، انہوں نے وائسرائے کو لکھا کہ چونکہ کانگرسی مجھ پر مسلم لیگ کی جانبداری کا الزام لگا چکے ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ میری جگہ کسی دوسرے موزوں افسر کو لگایا جائے جو رائے شماری پر اثر انداز نہ ہو سکے، وائسرائے نے سر اولف کیرو کی درخواست کے جواب میں لکھا کہ "اگرچہ میں اس قسم کے الزامات کو کوئی وقعت نہیں دیتا تاہم آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے جنرل سر راب لوکہارٹ کو آپ کی جگہ صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کرتا ہوں"۔

ریفرنڈم اور اس کے عواقب کے بارے میں مہاتما گاندھی کے سوانح نگار پیارے لال، لارڈ مونٹ بیٹن کے پرائیویٹ سیکرٹری کیمبل جانسن اور دوسرے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرحدی کانگرس نے اب پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے کی بجائے ایک الگ "پٹھان" سٹیٹ کا تصور پیش کر دیا تھا۔ اس نئے مطالبہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے :۔

"ایک مرتبہ جب کانگرس نے تقسیم ہند کی سکیم منظور کر لی تھی، کچھ اور بات زیر بحث آنی رہ گئی تھی ـــــ ماؤنٹ بیٹن پلان کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبے الگ کر دیئے جائیں اور وہ اپنی الگ حکومت (پاکستان) بنالیں۔ صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی لہٰذا لازمی طور پر اسے پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ صوبہ پاکستانی رقبہ کے اندر تھا۔ ہندوستان سے وہ کسی قسم کا رابطہ قائم نہ رکھ سکتا تھا"۔

آگے چل کر ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :۔

"خان برادران نے جب یہ دیکھا کہ کانگرس تقسیم ہند کو تسلیم کر چکی ہے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں، استصواب رائے عامہ قبول کرنے سے وہ انکار نہیں کر سکتے تھے، انکار کرتے تو مطلب یہی لیا جاتا کہ عوام اُن کے ساتھ نہیں ہیں — بہرحال آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے خان عبدالغفار خان کو اختیار دے دیا کہ اس سلسلے میں وہ جو مناسب سمجھیں گے کانگرس ان کا ساتھ دے گی۔"

گیارہ جون ۱۹۴۷ء کو خان عبدالغفار خان نے مہاتما گاندھی کو لکھا کہ "آج شام فرنٹیر پراونشل کانگرس کمیٹی، کانگرس پارلیمنٹری پارٹی اور خدائی خدمت گاروں سالاروں کا ایک مشترکہ اجلاس چار گھنٹے تک یہاں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہمیں ۳ جون کے اعلان کی شق چہارم (اے) کے تحت ریفرنڈم میں حصہ نہیں لینا چاہیئے۔ سب سٹرکائے اجلاس کا فیصلہ یہی تھا کہ اس شق میں مناسب ترمیم کی جائے اور ریفرنڈم پاکستان یا ایک آزاد پٹھان ریاست کی بنیاد پر کرایا جائے۔ اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کے بعد ہی مناسب قدم اٹھایا جائے گا۔ میں جمعہ کو ہوائی جہاز سے دہلی پہنچ رہا ہوں۔"[1]

خان عبدالغفار خان دہلی گئے اور گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں سے مشورے کئے انہوں نے ۱۸ جون کو قائداعظم سے ان کی قیام گاہ پر دہلی میں بھی ملاقات کی اور کچھ شرائط ان کے سامنے رکھیں لیکن بتایا جاتا ہے کہ شرطیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ قائداعظم کے لئے انہیں مسترد کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

پشاور پہنچنے پر خان عبدالغفار خان نے ۲۱ جون کو بنوں میں ایک اجلاس طلب کیا جس میں سرحد کانگرس کمیٹی کے ارکان، کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کے ممبر، خدائی خدمت گاروں اور "زلے پختون" کے رہنماؤں نے شرکت کی، جلسے میں اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں "پٹھانوں" کی ایک آزاد مملکت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔"[2]

سرحدی کانگرس کے اس نئے موقف کا ردِ عمل کیا ہوا۔ اس کے بارے میں ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔ "لیکن مسٹر جناح اور لارڈ مونٹ بیٹن میں سے کوئی بھی پختونستان کا مطالبہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

---

[1] روزنامہ "پاکستان ٹائمز" ۱۳ ستمبر ۷۵ء

[2] پیارے لال۔ "مہاتما گاندھی"

لارڈ مؤنٹ بیٹن نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ صوبہ سرحد ایک جداگانہ اور آزاد ریاست نہیں بن سکتا، البتہ پاکستان یا ہندوستان میں سے جس کے ساتھ چاہے، الحاق کر سکتا ہے ——
اس پر خان برادران (ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغفار خان) نے اعلان کر دیا کہ اُن کی پارٹی ریفرنڈم (استصواب رائے عامہ) میں کوئی حصّہ نہ لے گی —— انہوں نے اپنے حامیوں سے اپیل کی کہ وہ ریفرینڈم کا بائیکاٹ کر دیں، تاہم یہ تجویز کارگر ثابت نہ ہوئی، ریفرنڈم ہوا اور باشندگان صوبہ سرحد کی بھاری تعداد نے پاکستان کی حمایت میں ووٹ دیئے"۔

ابوالکلام آزاد کے خیال میں اگر "خان برادران نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا اور اُن کے حامیوں نے اس سلسلے میں پوری پوری جدوجہد کی ہوتی تو آسانی سے یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ اہلِ سرحد کس تناسب سے پاکستان کے خلاف ہیں —— بہرحال استصواب رائے عامہ کا نتیجہ پاکستان کے حق میں رہا اور برطانوی حکومت نے اسے تسلیم بھی کر لیا"۔

صوبہ سرحد کے اس وقت کے گورنر سر اولف کیرو کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا الیکشن کانگرس نے اس لئے جیتا تھا کہ "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے نتیجے میں عوام کی ہمدردیاں اُس کے ساتھ ہو گئی تھیں تاہم تقسیم ہند کا فیصلہ ہو جانے کے بعد قدرتی طور پر فضا پاکستان کے حق میں ہو چکی تھی اس لئے سرحدی کانگرس کے لئے ریفرنڈم کا مقاطعہ کر دینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا ——" بات ہے بھی یہی، حالات نے اس وقت کچھ ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ کوئی مسلمان بھی (خواہ وہ کسی سیاسی نظریے کا حامل ہو) پاکستان کی اسلامی ریاست کے قیام کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

قائداعظم بھی اس صورتِ حال کو بخوبی سمجھتے تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں نکلے گا، چنانچہ جون ۱۹۴۷ء میں جب مشہور ہندوستانی صحافی کرکا نے قائداعظم سے پوچھا کہ "سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"؟ تو قائداعظم نے برجستہ جواب دیا کہ "اگر آپ مسلمان ہوتے تو کس کو ووٹ دیتے"؟ اس پر کرکا لاجواب ہو کر رہ گیا۔

رائے شماری سے صرف چند دن پہلے بائیکاٹ کا اعلان حیران کن اور معنی خیز ضرور تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ زعماء نے اس کا سبب نوٹس لیا۔ ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ پشاور کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے خان عبدالقیوم خان نے کہا —— "صوبہ سرحد قدرتی طور پر پاکستان کا ایک اہم حصّہ ہے اور

وہ یقیناً پاکستان میں شامل ہو کر رہے گا۔"

ایک بیان میں خان محمد علی خان ہوتی نے، جو اُن دنوں صوبائی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے بائیکاٹ کے اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا :۔

"خان عبدالغفار خان نے ریفرنڈم کے بائیکاٹ کا جو اعلان کیا ہے، وہ اصل میں مسلم لیگ کی مہم کو بے اثر بنانے اور جوش و خروش کو کم کرنے کی ایک چال ہے، تاہم صوبہ سرحد کے مسلمان اب بیدار ہو چکے ہیں اور وہ کسی کے کہنے پر غلط راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔"

بہر حال ریفرنڈم ہوا اور بڑے پُر امن اور منظم طریقے سے ہوا۔ اگرچہ جذبات نہایت کشیدہ تھے تاہم کسی جگہ سے بھی کسی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع نہ ملی ـــــ لوگوں کی بھاری تعداد پولنگ سٹیشنوں پر پہنچی، کانگرس کے کیمپ بھی موجود تھے اور اس کے بیلٹ بکس بھی رکھے ہوئے تھے، کئی دن تک ووٹ ڈالے جاتے رہے، بالآخر ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو استصواب رائے عامہ کے نتیجے کا اعلان کیا گیا، اعداد و شمار یہ تھے :۔

کل ووٹ جو ڈالے گئے ـــــ دو لاکھ بانوے ہزار ایک سو اٹھارہ (۲۹۲۱۱۸)

جو ووٹ پاکستان کے حق میں آئے ـــــ دو لاکھ اکاسی ہزار دو سو چوالیس (۲۸۹۲۴۴)

جو ووٹ ہندوستان کے حق میں پڑے ـــــ دو ہزار آٹھ سو چوہتر (۲۸۷۴)

حکومت ہند کے ایک اعلامیہ میں بتایا گیا تھا کہ صوبہ سرحد کے کل ووٹر ۵،۷۲،۷۹۸ تھے تاہم ۱۹۴۶ء کے جنرل الیکشن میں ۳۷۲۷۴۱ ووٹ پول ہوئے تھے۔

عام انتخابات کی نسبت ریفرنڈم میں کم ووٹ ڈالے جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے "الجمعیت سرحد" نے لکھا ہے" اس سلسلہ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ گزشتہ انتخاب میں پشاور کے ووٹ ڈبل شمار کئے گئے تھے جو بیس ہزار تھے، اس کے علاوہ بیس ہزار ووٹ لینڈ لارڈز کے تھے، غیر مسلموں کے ووٹ اس کے علاوہ تھے، انہوں نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ اگر صوبہ سرحد کے کل ووٹروں کی تعداد سے غیر مسلم ووٹروں کے ووٹ اور پشاور شہر اور چھاؤنی کے ڈبل شمار کئے جانے والے ووٹ نکال دیئے جائیں تو اُن کی تعداد تین لاکھ کے قریب رہ جاتی ہے۔ گویا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ انہوں نے عام انتخابات سے بھی زیادہ جوش و خروش سے ریفرنڈم میں ووٹ دیئے۔"

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کا فیصلہ سب سے پہلے سندھ اسمبلی نے کیا، پھر بنگال نے پاکستان میں شمولیت اختیار کی، اس کے بعد پنجاب اسمبلی اور بلوچستان کے شاہی جرگے نے پاکستان سے الحاق قبول کیا۔ ۱۳ر جولائی کو سلہٹ میں رائے شماری کے نتیجے کا اعلان ہوا جو پاکستان کے حق ہی میں تھا اور سب سے آخر میں صوبہ سرحد کے عوام نے ریفرنڈم میں بھاری اکثریت کے ساتھ پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

صوبہ سرحد کی ریاستوں سوات، چترال، دیر اور امب کے عوام اور حکمرانوں نے بھی متفقہ طور پر پاکستان سے الحاق کی منظوری دی، آزاد قبائل کے جرگے ہر علاقے میں ہوئے، ان جرگوں میں پاکستان کی آزاد اسلامی سلطنت میں شمولیت کا فیصلہ کیا گیا۔ بالآخر نومبر ۱۹۴۷ء تک ڈیورینڈ لائن سے اس طرف کے تمام علاقے پاکستان کی عملداری میں شامل ہو گئے اور دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت، پاکستان، عالمِ وجود میں آگئی ـــــ الحمد للہ!

پاکستان کا پہلا سال

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء برصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کا روشن ترین دن تھا۔ اس دن صدیوں کی غلامی کے بندھن ٹوٹ گئے، فرنگی سامراج کا خاتمہ ہوا۔ اپنے دیس میں اپنا راج قائم ہوا، آزادی کا سورج طلوع ہوا جو کروڑوں انسانوں کے لئے نئی زندگی کا پیغام لایا۔

پاکستان کا قیام تاریخ سیاسیات کا ایک محیر العقول واقعہ ہے، یہ ایک منظم قوم کی قوتِ ارادی اور عزمِ محکم کی شاندار فتح ہے۔ مسلمانانِ ہند نے یہ آزاد مملکت توپ و تفنگ کی مدد سے حاصل کی نہ لشکر و سپاہ کے سہارے، وہ صرف اس مخلصانہ جذبہ سے سرشار تھے کہ مسلمان کبھی غیروں کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، اُسے یقین تھا کہ مسلم قومیت کی بنیاد رنگ و نسل اور جغرافیائی یا علاقائی تخصیص پر نہیں بلکہ اسلام کے اس عالمگیر اصول پر ہے کہ مسلمان ہر اعتبار سے ایک جداگانہ اور منفرد قوم ہے، اس کے لئے ایسے خطۂ زمین کا حصول ناگزیر ہے جہاں وہ اپنی دینی، روحانی اور معاشرتی قدروں کے عین مطابق زندگی بسر کر سکے۔ برصغیر پاک و ہند میں وہ ہمیشہ سے ایک ممتاز مقام کا مالک رہا تھا اور اپنی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی اس کا نصب العین تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ مسلسل اپنی منزلِ آزادی کی جانب سرگرمِ عمل تھا، اس کے عظیم دینی اور سیاسی رہنماؤں نے اس کے اندر وہ چنگاریاں پھر دی تھیں کہ وہ ہمہ تن اور ہر وقت لیلائے آزادی کو پا لینے کے لئے سرگرمِ عمل تھا ـــــ قاعدہ کلیہ ہے کہ قومیں یا تو کسی اصول کے گرد جمع ہوتی ہیں یا کسی عظیم شخصیت کے گرد، قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ذات میں اُسے دونوں باتیں بیک وقت میسر آگئیں ـــــ قائدِ اعظم نے قوم کو ایک نصب العین دیا ـــــ پاکستان کے حصول کو اس کی منزل قرار دیا اور پھر اُسے اُس منزل تک پہنچا بھی دیا۔ غلامی میں زندگی کے مفہوم میں وسعت نہ تھی لیکن آزادی کی نعمت ملتے ہی زندگی ہمارے لئے "بحرِ بے کراں"

ثابت ہوئی ـــــ آزاد ملک کا آزاد پاکستانی قوتِ عمل سے سرشار اور لبریز ہو کر اٹھا اور ہر شعبۂ حیات میں آگے بڑھنے لگا ـــــ وہ جان گیا کہ اسے اپنی دُنیا خود تعمیر کرنی ہے، اپنا مقدر خود سنوارنا ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آزاد قوموں کی برادری میں اپنے لئے ایک باعزت اور باوقار مقام پیدا کرنا ہے۔

پاکستان بن گیا، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے لوگ بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہوئے، اُن کے دل فرطِ مسرت سے لبریز تھے، ہر بستی اور ہر قریہ جشنِ آزادی منا رہا تھا، ہر گھر اور ہر دُکان پر چراغاں کی بہار تھی، ہر قابلِ ذکر عمارت پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا، چھوٹے بڑے شکر کے سجدے لٹا رہے تھے تاہم تھوڑے بہت لوگ ایسے بھی تھے جو اُس روز بھی بجھے بجھے سے تھے، انہوں نے اپنی روش بدلی تھی نہ ماحول اور حالات کی تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔ پاکستان اب محض شاعرِ ملت کا خواب تھا نہ محض ایک سیاسی مفروضہ ـــــ یہ ایک حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ کار ہی کیا ہے؟

مارچ ۱۹۴۵ء سے صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت برسرِ اقتدار تھی، تاہم پاکستان بننے پر دس گیارہ ارکان مجلسِ قانون ساز ترکِ وطن کر گئے اور کچھ ارکان پارٹی تبدیل کر کے مسلم لیگ کا ساتھ دینے لگے، اس پر ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد کے گورنر نے ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر دیا اور خان عبدالقیوم خان کو وزارت بنانے کی دعوت دی، چنانچہ انہوں نے میاں جعفر شاہ کاکاخیل سالار محمد ایوب خان، خان محمد عباس خان اور ملک الرحمٰن خان کیانی پر مشتمل اپنی کابینہ بنالی۔

کانگرسی وزارت کی برطرفی کی مختلف وجوہ بتائی جاتی ہیں، روزنامہ جنگ میں سردار علی صابری نے بیان کیا ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو فوزائیدہ پاکستان کے گورنر جنرل (قائدِ اعظم) مرکزی وزیروں، صوبائی گورنروں اور صوبائی وزیروں نے اپنے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا لیکن صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے ایسا نہ کیا حالانکہ اسی تاریخ کو صوبائی گورنر سر جارج کننگھم نے حلف اٹھایا اور پاکستان کا پرچم لہرانے کی تقریب میں شرکت کے لئے کننگھم پارک (موجودہ جناح پارک) گیا ـــــ ڈاکٹر خان صاحب وہاں بھی موجود نہ تھے،

(شائد) ان کی غیر حاضری کا سبب اچاریہ کرپلانی کا وہ ہدایت نامہ تھا جو ۷ راگست کو لاہور سے جاری کیا گیا تھا اور جس میں پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے کانگرسی کارکنوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ چودہ اگست کے جشن میں شریک نہ ہوں کیونکہ کرپلانی کے مطابق، ہندوستان کی تقسیم سے سندھ، مشرقی بنگال، مغربی پنجاب اور صوبہ سرحد کے محبِّ وطن کانگرسیوں کے دل چُور چُور ہو چکے تھے اور اُن کے لئے ان مسرتوں میں شریک ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی "۔

مذکورہ بالا صحافی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۲۰ راگست کو پٹنہ سے گاندھی جی کے قریبی حلقوں سے یہ اطلاع پریس میں آئی کہ گاندھی جی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے، وہ صوبہ سرحد میں مستقل سکونت اختیار کریں گے اور اہلِ سرحد کے "حقِ خود ارادی" کے لئے راہ ہموار کریں گے۔

دوسرے دن ۲۱ راگست کو اقوامِ متحدہ میں افغانستان کے مندوب عبدالحمید خان نیویارک جاتے ہوئے کراچی میں رُکے اور اے پی۔ پی کے نمائندے سے باتیں کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کو "ناقابلِ اطمینان" بتایا اور "پختونستان" کی کھلے بندوں حمایت کی۔

اخبار "جنگ" لکھتا ہے، یہ تھے وہ حالات جن کے تحت ۲۲ راگست کو ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت گورنر کے حکم سے برطرف کر دی گئی اور مسلم لیگ کو وزارت تشکیل کرنے کی دعوت دی گئی۔

خان عبدالقیوم خان کے مطابق حالات ایسے تھے کہ کانگرسی وزارت کو ہٹانا ناگزیر ہو گیا تھا، اُن کا کہنا ہے کہ

"میں نے اپنے دورِ اقتدار میں جن لوگوں پر سختی کی وہ میرے مخالف نہیں بلکہ پاکستان کے دشمن تھے۔ مثال کے طور پر ریفرنڈم کے بعد جب صوبہ سرحد کے عوام کی واضح اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے تو بھی کئی لوگوں نے پاکستان کے وجود تک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، پھر جب سرحد اسمبلی پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا تو ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے کانگرسی وزراء نے جھنڈے کو سلام تک نہ کیا اس پر قائداعظم نے سرحد وزارت کو برخاست کر دیا ـــ بعد میں میں نے مرکز کی ہدایت پر، وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ڈاکٹر خان صاحب کو گرفتار کر کے خان پور کے ڈاک بنگلہ میں نظر بند کر دیا ـــ اگر میرے اس اقدام

کو بعض لوگ ذاتی مخالفت کا نام دیتے ہیں تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں"۔[1]

خان عبدالقیوم خان چونکہ ایک عرصہ تک کانگرس میں شامل رہ چکے تھے اس لئے کانگرسی حلقوں میں بھی ان کا خاصا رسوخ تھا، چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد اُن کی ترغیب پر بہت سے سرکردہ سرحدی کانگرسی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جن میں میاں جعفر شاہ کاکاخیل، ارباب عبدالرحمٰن خان گلی گڑھی، پیر شہنشاہ کوہاٹ، سالار اسلم خان کوہاٹ، صاحب گل خان بوگارے، یعقوب خان بنوں اور عبداللہ خان پوڑہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ـــــ کچھ عرصہ بعد سرحد اسمبلی کے سپیکر نواب زادہ اللہ نواز خان نے بھی مسلم لیگ میں شرکت اختیار کر لی۔

جمہوریت کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آپس کے اختلاف رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے، اگر پاکستان کے قیام کے بعد صوبہ سرحد کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگرس اپنے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملک کی تعمیرِ نو اور عوام کے فلاح کی خاطر متحد العمل ہو جاتیں تو صوبے کی تقدیر بدل جاتی، تاہم ایسا نہ ہونے پایا، دونوں فریق کھچے کھچے رہے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔

خان عبدالقیوم خان کی وزارت قائم ہوئی تو کانگرسی حلقوں نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ـــــ اخباری اطلاعات مظہر ہیں کہ چارسدہ اور شبقدر کے جلسوں میں کانگرسیوں نے سول نافرمانی کی دھمکی دی، نوشہرہ کے کئی دیہات میں پختونستان کے جھنڈے لہرائے گئے۔ ۱۳ ستمبر کو چارسدہ کے ایک جلسۂ عام میں مسلم لیگ کی مذمت کی گئی۔ ۱۹ ستمبر کو موضع کوچیان میں تقریر کرتے ہوئے خان عبدالغفار خان نے پختونستان قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا، ۴ اکتوبر کو سرخپوشوں کے ایک جلسۂ عام میں مسلم لیگی رہنماؤں کے متعلق ہجویہ اور طنزیہ نظمیں پڑھی گئیں۔ کانگرس اگرچہ بائیں بازو کی سیکولر جماعت تھی تاہم صوبہ سرحد میں وہ شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی دعویدار بن گئی اور خدائی خدمتگاروں کے جلوس نکلتے تو وہ گلے میں قرآن شریف حمائل کئے ہوتے اور "قرآن آزاد کرائیں گے" کے نعرے لگاتے۔

اس کے برعکس یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ خان عبدالغفار خان نے قائداعظم محمد علی جناح سے

---

[1] خان عبدالقیوم خان۔ انٹرویو۔ "سنڈے مشرق" ۲۲ فروری ۱۹۷۰ء

تلافات کی تھی وہ مسلم لیگ سے اختلافات ختم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تاہم بعض مفاد پرست عناصر نے دونوں عظیم رہنماؤں کو متحد العمل نہ ہونے دیا اور غلط فہمیاں دُور نہ ہوسکیں۔ ایک کتابچے میں صوبہ سرحد کے سابق وزیر تعلیم (اور خان عبدالغفار خان کے داماد) محمد یحییٰ جان خان نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"خان عبدالغفار خان نے نہایت خلوص اور بے لوث جذبے کے ساتھ خدائی خدمتگاروں کی خدمات قائداعظم محمد علی جناح کو پیش کی تھیں لیکن یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اندرون خانہ ناپاک سازشوں کی وجہ سے ان مقاصد کی تکمیل نہ ہوسکی"۔ یحییٰ جان خان کا کہنا ہے کہ "اس سازش میں نہ صرف اس علاقے کے زمانہ پرست افراد کا ہاتھ تھا بلکہ پاکستان بننے کے بعد صوبہ سرحد میں تعین ہونے والے انگریز افسر بھی جو سب کے سب خدائی خدمت گار تحریک کے کٹر دشمن تھے، اس اتحاد کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے"۔

مسٹر یحییٰ جان خان نے مزید لکھا ہے کہ

"فروری ۱۹۴۸ء میں خان عبدالغفار خان نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی تھی اور پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا تھا، نیز انہوں نے وہاں قائداعظم محمد علی جناح سے بھی ملاقات کی تھی ـــــ قائداعظم نے باچا خان کو گلے لگایا اور انہیں کہا کہ میں پاکستان کا آئینی گورنر جنرل ہوں۔ میری نظر میں مسلم لیگ اور خدائی خدمت گار جماعت برابر ہیں ـــــ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ خدائی خدمت گار بھی پاکستان کو تسلیم کریں۔ اب چونکہ انہوں نے پاکستان سے وفاداری کا حلف لے لیا ہے۔ لہٰذا میں انہیں مسلم لیگیوں سے کم تصور نہ کروں گا"۔

یحییٰ جان خان نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ

"اس موقع پر باچا خان نے قائداعظم کو صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کے ساتھ ایک دن گزارنے کی دعوت بھی دی تھی جسے قائداعظم نے قبول بھی کر لیا تھا۔ لیکن مفاد پرست عناصر نے قائداعظم کو خدائی خدمت گاروں کے قریب آنے کا موقع نہ دیا"۔

انہوں نے مزید کہا کہ

"پختونستان کے لفظ کو غلط معنی پہنائے گئے ہیں اور اب بھارت اور افغانستان اس نعرہ کو پاکستان کے خلاف استعمال کر رہے ہیں، جو ایک المیہ ہے۔"

یحییٰ خان خان صاحب کے اس کتابچے کے جواب میں خان عبدالقیوم خان نے ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کو روزنامہ "جنگ" کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا :-

"میں نے قائداعظم سے (صوبہ سرحد کے دورے سے کراچی جاتے ہوئے) آخری ملاقات کی تھی۔ قائداعظم نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے خان عبدالغفار خان کو پاکستان کی سالمیت کے لئے کام کرنے پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہوں نے (عبدالغفار خان) ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ قائداعظم نے مجھے (عبدالقیوم خان کو) فرمایا کہ اگر عبدالغفار خان اور اُن کے ساتھی اپنی سرگرمیاں بدستور جاری رکھیں تو اُن کے ساتھ سختی سے پیش آیا جائے۔"

پاکستان کے خلاف سازشیں

حصولِ پاکستان کی خاطر مسلمانانِ برصغیر کو خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا تھا۔ انہوں نے بے پناہ جانی اور مالی قربانیاں دی تھیں، انہیں یقین تھا کہ آزادی ملنے کے بعد اُن کی مشکلات ختم ہو جائیں گی لیکن ایسا نہ ہونے پایا —— اصل میں ہندو نے پاکستان کے وجود کو دل سے کبھی تسلیم نہ کیا، تقسیم ہند کے منصوبے کے اعلان کے بعد بھی ان کے فکر و عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ۳ جون کو مونٹ بیٹن نے تقسیم ہند کا حتمی اور قطعی فارمولا پیش کر دیا تھا تاہم ہندو رہنماؤں کی دوعملی کا یہ حال تھا کہ ۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ "ہندوستان کا طبعی جغرافیہ بدلا نہیں جا سکتا۔ جب موجودہ ہیجانی کیفیت دور ہو جائے گی اور پُرجوش جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو کانگرس کو یقین ہے کہ لوگ دوبارہ اس مسئلے (تقسیم ہند) پر سوچیں گے اور ہر کوئی دو قومی نظریے کو ترک کر دے گا۔"

دی۔ پی مینن جیسے ہندو ستانی مدبر نے لکھا "اگست ۱۹۴۷ء کی تقسیم پائیدار اور مستقل ثابت نہیں ہو گی اور بالآخر پاکستان اور ہندوستان کو متحد ہونا ہی پڑے گا۔"

اپنے اسی یقین کے پیش نظر انگریز اور ہندو نے شروع ہی سے پاکستان کو ختم کرنے اور

قائداعظم کی جان لینے کی خاطر کئی ناپاک سازشیں کیں، ایک سازش ننکانہ صاحب میں اسلحہ جمع کر کے مسلمانوں پہ اچانک حملہ کرنے کی تھی۔ ایک سازش مغربی پاکستان میں نہروں کے ہیڈورکس کو بموں سے اُڑا دینے کی تھی، ایک سازش یہ تھی کہ، ۱۵ اگست کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے دیہات پر حملے کر کے آگ لگا دی جائے، ایک اور سازش یہ تھی کہ پاکستان جانے والی ٹرینوں پر حملے کئے جائیں اور ایک ناپاک منصوبہ یہ تھا کہ ۱۴ اگست ۴۷ء کو کراچی میں قائداعظم محمد علی جناح کا جلوس نکلے تو ان کی کار پر بم پھینکا جائے۔

اسی طرح مسلمان اکثریت کے صوبوں بنگال اور پنجاب پر تقسیم کا آرا چلانے کے لئے دو باؤنڈری کمیشن قائم کئے گئے، ہر کمیشن کی ممبری کے لئے دو جج مسلمانوں کی جانب سے اور دو کانگرس کی جانب سے نامزد کئے گئے۔ پنجاب کے کمیشن کے لئے پاکستانی نمائندے مسٹر جسٹس دین محمد اور مسٹر جسٹس محمد منیر تھے اور بنگال کے لئے جسٹس صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس۔ اے رحمٰن تھے، دونوں کمیشنوں کے لئے "غیر جانبدار" صدر کے طور پر برطانوی حکومت کے نامزد کردہ شخص سر ریڈکلف کو قبول کر لیا گیا۔

ریڈکلف مسلمانوں کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے پاکستان کی وہ جڑیں کاٹیں کہ پناہ بخدا ــــ ضلع گورداسپور مسلم اکثریت کا ضلع تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف نے ملی بھگت کر کے اسے تقسیم کر دیا، پٹھان کوٹ کی تحصیل بھارت کو مل گئی جس سے وہ کشمیر کو جانے والی سڑک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سیکرٹری کیمبل جانسن نے اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے کہ ریڈکلف کا ایوارڈ وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ۹ اگست کو مل گیا تھا لیکن اس نے آٹھ دن کی تاخیر کے بعد اُسے سترہ اگست کو شائع کیا تاکہ اس ایوارڈ کو تسلیم کئے بغیر پاکستان کے لئے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔ بعد میں ایک فائل ملی اور یہ راز طشت از بام ہوا کہ ریڈکلف کے اصل ایوارڈ میں فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان میں شامل کی گئی تھیں۔ لیکن ۹ اگست اور ۱۷ اگست کے درمیانی عرصے میں یہ ایوارڈ تبدیل کر دیا گیا اور یہ دونوں تحصیلیں بھارت کو دے دی گئیں۔ یہ فائل گورنر پنجاب کی خفیہ فائلوں میں کہیں لاہور ہی میں پڑی ہوئی رہ گئی تھی جسے گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی نے قائداعظم

کی خدمت میں پیش کر دیا ـــــ ان حربوں سے، حد درجہ بد دیانتی سے کام لے کر ہمیشہ کے لئے کشمیر کا مسئلہ کھڑا کر دیا گیا [۱]

لارڈ مونٹ بیٹن نے ایک اور چال بھی چلی تھی۔ وہ بیک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ قائداعظم چونکہ اس کی نیت کو بھانپ گئے تھے اس لئے وہ اس جال میں نہ پھنسے اور مسلم لیگ کونسل سے مشورے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو بتا دیا کہ مسلم لیگ چاہتی ہے کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناح ہی ہوں ـــــ بتایا جاتا ہے کہ ایسا کرنے میں قائداعظم کے سامنے ایک اور مصلحت بھی تھی اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تربیت یافتہ بہت کم تھے، لازماً فوج کے کمانڈر ان چیف، صوبوں کے گورنر اور دوسرے اہم عہدہ داروں کے طور پر انگریز افسروں ہی کی خدمات حاصل کرنا تھیں، اگر سربراہ مملکت بھی انگریز ہی ہوتا تو لوگوں کو یقین ہی نہ آتا کہ پاکستان سیاسی طور پر آزاد ہوا بھی ہے یا نہ ؟

دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ تقسیم ملک کے وقت ریزرو بنک آف انڈیا کے پاس متحدہ ہندوستان کا کیش بیلنس چار ارب روپیہ تھا جس میں سے ۷۵ کروڑ روپیہ پاکستان کے حصہ میں آتا تھا۔ ۱۰ اس میں سے صرف ۲۰ کروڑ روپیہ کام چلانے کے لئے حکومت پاکستان کو منتقل کیا گیا۔ باقی ۵۵ کروڑ حساب کتاب برابر کرنے کے بہانے روک لیا گیا۔ ۱۵ر دسمبر کو حساب کتاب تکمیل کو پہنچا اور فیصلہ ہوا کہ بقیہ ۵۵ کروڑ روپیہ پاکستان کو دے دیا جائے لیکن بھارتی اخباروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ اگر یہ روپیہ پاکستان کو دیا گیا تو وہ گولہ بارود خریدے گا جو محاذ کشمیر پر بھارتیوں کے خلاف استعمال میں لایا جائے گا ـــــ چنانچہ رقم کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی جاتی رہی ـــــ تنگ آ کر پاکستان نے براہ راست گاندھی جی کو متوجہ کیا ـــــ گاندھی جی نے بات کا نوٹس لیا اور کانگرسی لیڈروں پر دباؤ ڈالا کہ ایسی صریح بے ایمانی اور بدعہدی کا ارتکاب نہ کریں ـــــ لیکن قبل اس کے کہ روپیہ پاکستان کو دیا جاتا ۳۰ر جنوری ۴۸ء کو گاندھی جی کو ایک متعصب مہاسبھائی کی گولی کا نشانہ بننا پڑا اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

---

[۱] مارشل لاء سے مارشل لاء تک ۔ سید نور احمد

فسادات برصغیر کو آزادی تو ملی لیکن اس کے لئے اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، خصوصاً مسلمانوں کی اتنا بھاری مالی اور جانی نقصان ہوا جس کی مثال دنیا میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔ آرتھر سونسن کے مطابق چھ لاکھ بچے بوڑھے اور عورتیں ہلاک ہوئیں، چودہ کروڑ انسانوں کے گھر بار تباہ ہوئے اور ایک لاکھ دوشیزاؤں کو اغواء کیا گیا ـــــ زیادہ تر قربانی پنجاب، کشمیر، یو۔پی، بہار، بنگال اور دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو دینی پڑی، لٹے پٹے لوگ وہاں سے صوبہ سرحد پہنچے تو یہاں بھی ردِ عمل ہوا اور فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ تاہم باقی مقامات کے مقابلے میں صوبہ سرحد بہت حد تک پُرامن رہا۔

تیام پاکستان کے بعد صوبہ سرحد کے ہندو سکھ مزے سے اپنے کاروبار میں مگن تھے کہ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اچانک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور سارے صوبے میں فساد کی آگ پھیل گئی ـــــ ہوا یہ کہ پشاور چھاؤنی میں انیسویں لانسرز رجمنٹ کے ایک سکھ سنتری نے ۳/۸ پنجاب رجمنٹ کے ایک مسلمان سپاہی پر گولی چلادی، مسلمان سپاہی شہید ہوگیا، آناً فاناً یہ خبر ہر طرف پھیل گئی، ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے اور ۷ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک ہر جگہ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔

فضا میں اس سے قبل بھی کشیدگی پائی جاتی تھی، خطرے کو بھانپ کر صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کننگھم نے ۴ ستمبر ہی کو کہہ دیا تھا "اگر بھارتی پنجاب اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں مسلم کش فسادات کو نہ روکا گیا تو صوبہ سرحد کے عوام کا مشتعل ہوجانا قدرتی بات ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی داستان اتنی تلخ ہے کہ سرحد کا کوئی مسلمان اُسے سُن کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔"

۶ ستمبر کو ہری پور، تخت بھائی اور مردان میں لوٹ مار شروع ہوگئی، اسی دن کوہاٹ سے بھارت جانے والے تارکینِ وطن کی ریل گاڑی پر کوہاٹ اور خوش حال گڑھ کے مابین حملہ ہوا۔ ۷ ستمبر کو سکھ سپاہی کی نادانی سے سارے پشاور شہر اور چھاؤنی میں مار دھاڑ اور آتش زنی کی وارداتیں ہونے لگیں ـــــ گورنر کننگھم اسی دن تھیا گلی سے پشاور پہنچا تھا، اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ایک سو کے قریب ہندو سکھ فسادات کی نذر ہوگئے۔ بہت سے مکانوں اور

دکانوں کو لوٹ لیا گیا، جگہ جگہ آگ لگنے کی وارداتیں ہوئیں خبریں آنے لگیں کہ آفریدی قبائل ڈگبری اور گنج کے علاقوں میں داخل ہو کر مورچے سنبھالے بیٹھے ہیں ــــ پولیس بے بس نظر آنے لگی۔ اس پر گورنر نے کرنل ملیشیا کو طلب کر لیا جس نے شہر میں امن و امان بحال کرنے میں مدد دی، سرکاری رپورٹ کے مطابق مرنے والوں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی کیونکہ فساد کی ابتداء ایک سکھ سنتری ہی کی طرف سے ہوئی تھی، گورنر نے حکمت عملی سے کام لے کر راتوں رات تمام سکھ فوجیوں کو ریل گاڑی سے ہندوستان روانہ کر دیا، ایسا نہ کیا جاتا تو نقصان بہت زیادہ ہوتا، ۱۰ ستمبر کی شام تک ہر جگہ امن بحال ہو گیا۔[1]

سٹیفنز تسلیم کرتا ہے کہ صوبہ سرحد میں ہونے والے فسادات میں ہندو سکھوں کا نقصان اُس نقصان کا عشر عشیر بھی نہ تھا جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ ۶ ستمبر سے ۱۰ ستمبر تک جہاں صوبہ سرحد میں سو ڈیڑھ سو افراد فساد کی نذر ہوئے وہیں اس عرصہ میں دہلی میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور نصف لاکھ سے زیادہ بے گھر ہو کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ پھر ایک دہلی پر کیا موقوف مشرقی پنجاب کے دیہات اور سکھ ریاستوں میں تو یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی مسلمان فسادیوں کے ہاتھوں محفوظ رہا ہو جو سامنے آیا قتل کر دیا گیا۔ ان کے گھروں کو لوٹا گیا اور عورتوں کو اغواء کر لیا گیا۔

کشمیر کی جنگِ آزادی

بتایا جا چکا ہے کہ برِصغیر کے ہندو سیاستدان تقسیم مُلک کے منصوبے کے دلی حامی نہ تھے، وہ ہر معاملے میں منافقت کا شکار تھے اپنے لوگوں کے لئے تو وہ "حقِ خود ارادیت" کا مطالبہ کرتے تھے لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو اُن کے جائز حقوق تک دینے کو تیار نہ تھے، اُن کی یہی ہٹ دھرمی مہبت سے بین الممالکتی تنازعات کا سبب بنی جن میں بعض ابھی تک حل ہونے نہیں پائے۔

۳۔ جون کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا تاہم ہندوستانی ریاستوں کے مسئلے کو اُن کے حکمرانوں اور عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ پاکستان یا بھارت جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں ــــ ان ۵۶۰ ریاستوں میں ریاست جموں اور کشمیر بھی تھی جس کی چالیس لاکھ آبادی کا ۷۷ فیصد حصّہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جغرافیائی۔ تمدنی اور اقتصادی لحاظ سے بھی یہ علاقہ پاکستان کا ایک جزو لاینفک تھا ــــ

---

[1] سٹیفنز۔ "پاکستان"

جموں اور کشمیر کا ہندو راجہ (اور اس کی مہارانی) انتہائی متعصب قسم کا ہندو اور برہمنوں کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے وزیر اعظم کاک نے (جو ایک روشن خیال کشمیری پنڈت تھا) حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اسے پاکستان سے الحاق کا مشورہ دیا تو اس نے اُسے نوکری ہی سے چلتا کر دیا۔ ۳ر جون اور ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصہ میں اچاریہ کرپلانی اور گاندھی جی یکے بعد دیگرے کشمیر گئے اور مہاراجہ کو شیشے میں اتارنے میں کوشاں رہے۔ لارڈ اسمے اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن بھی مہاراجہ کو اپنے مفاد میں مشورے دیتے رہے تاہم مہاراجہ گومگو کی حالت میں تھا اور "مناسب موقع" پر اپنے الحاق کے فیصلے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔ یہ ریاست دو حصوں پر مشتمل تھی، کشمیر اور جموں ـــــ کشمیر میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی لیکن جموں میں ہندو آبادی کا غلبہ تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جموں کے ہندو سکھوں نے ڈوگرہ فوجیوں کی شہ پر مسلمانوں کے قتل و غارت پر کمر باندھ لی اور ریاست جموں کے پانچ لاکھ مسلمانوں میں سے دو لاکھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا، باقی ماندہ مسلمان بمشکل تمام ریاست کو چھوڑ کر سیالکوٹ، گجرات، جہلم اور دوسرے پاکستانی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، اس اثناء میں شیخ عبداللہ کو بھی، جو کانگرس کے پُرجوش حامی تھے، جیل سے رہا کر دیا گیا تاکہ وہ جموں اور کشمیر کے لوگوں کو ہندوستان سے الحاق کے لئے تیار کریں، ریاست کے علاقہ پونچھ میں سُدھن (یا سدوزئی) مسلمان آباد تھے، یہ لوگ زیادہ تر برطانوی فوجوں میں ملازم تھے، ان کی تعداد چالیس ہزار لڑاکوں پر مشتمل تھی، ڈوگرہ مہاراجہ کی حکومت نے ان لڑاکا مسلمانوں سے جان چھڑانے کے لئے اُن کے دیہات پر حملے کئے، گھر بار جلا دیئے اور جس کسی نے مزاحمت کی اسے بنوک شمشیر ختم کر دیا گیا ـــــ تنگ آکر سُدھن مجاہد ڈوگرہ مظالم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی آزادی کے لئے مصروفِ جہاد ہو گئے ـــــ سُدھن مجاہدینِ آزادی نے اپنی مدد کے لئے صوبہ سرحد کے قبائلی بھائیوں کو پکارا چنانچہ صوبہ سرحد کے قبائلی مجاہد اپنے مظلوم بھائیوں کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے کشمیر کے جہاد پر روانہ ہو گئے ـــــ بس پھر کیا تھا۔ سارے برصغیر میں شور مچ گیا کہ "قبائلی حملہ آور کشمیر پر پل پڑے ہیں" ـــــ جنرل محمد اکبر خان نے پنڈت نہرو کے اس بیان کا کہ پٹھان حملہ آور ہوئے ہیں۔ جواب دیتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "ہمیں حملہ آور کہلانے پر فخر ہے، محمد بن قاسم بھی حملہ آور تھا اور محمود غزنوی بھی حملہ آور تھا ـــــ کشمیر کے بے بس اور مجبور انسانوں کو ڈوگروں کے ظلم و تشدد اور

جبری غلامی سے آزاد کرنے کے لئے پٹھانوں نے گھروں سے سینکڑوں میل دور جاکر جو حملہ کیا تھا، وہ ہماری روایات کے عین مطابق تھا اور قرآن کے اس فرمان کی تعمیل میں تھا کہ جس بستی میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد ہو رہا ہو، وہاں پہنچو اور انہیں ظالم حکمران سے آزاد کراؤ۔"

۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے جہادِ کشمیر کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ مجاہدین آزادی آگے بڑھتے ہوئے سرینگر کے دروازے تک جا پہنچے، مہاراجہ سرینگر سے بھاگ کر جموں کے محل میں جا پہنچا — اُسے صرف اپنے تعصب سے کام تھا، رعیت پر تو وہ پہلے ہی مظالم ڈھاتا رہا تھا، چنانچہ اپنے عوام کے حقِ خود ارادیت کے خلاف اس نے جموں اور کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ وہاں تو پہلے ہی سازش ہو رہی تھی، ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایک سو طیاروں کے ذریعے ہندوستان نے اپنی باقاعدہ فوج سرینگر میں اتار دی، یہ صورتِ حال دیکھ کر حکومتِ پاکستان بھی حرکت میں آئی۔ قائدِ اعظم خود لاہور پہنچے اور انہوں نے فوج کو جموں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم ہر طرح سے نہایت موزوں تھا۔ جموں پر کارروائی ہوتی تو مہاراجہ خود رائے عامہ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتا لیکن بدقسمتی سے اس وقت کے قائمقام انگریز کمانڈر ان چیف جنرل گریسی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے سپریم کمانڈر جنرل آکنلک (کمانڈر ان چیف انڈیا) کے بغیر کسی کا حکم ماننے سے معذور ہے۔ اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز پر پاکستان اور بھارت کے مابین ایک سربراہی اجلاس منعقد کرنے اور مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اجلاس منعقد ہونا تھا لیکن نہرو اور پٹیل دونوں بیمار پڑ گئے، صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور قائدِ اعظم کی ملاقات ہوئی جس میں طے پایا کہ کشمیر کا مسئلہ استصوابِ رائے عامہ سے طے کیا جائے، بیرونی فوجیں فوراً واپس چلی جائیں اور کشمیری عوام کی رائے کو قوقیت دی جائے — نیز یہ تنازعہ اقوامِ متحدہ میں پیش کیا جائے۔"

تھوڑے دنوں بعد ہندوستان کی حکومت نے یہ تجاویز ماننے سے انکار کر دیا — جنرل گریسی کو بھی اب یقین ہو گیا کہ بھارت کی ہٹ دھرمی سے نہ صرف مسئلہ کشمیر حل ہونے نہ پایا بلکہ بھارتی رہنما شروع ہی سے پاکستان کے قیام اور استحکام کے مخالف رہے۔

تاہم کشمیری عوام نے جدوجہد آزادی جاری رکھی، انہوں نے بہت سا علاقہ ڈوگرہ حکمرانوں اور بھارت کے تسلط سے آزاد کرا لیا اور سردار محمد ابراہیم خان کی سربراہی میں آزاد کشمیر کی الگ حکومت قائم کر لی۔

شمال میں ہنزہ ۔نگر اور گلگت کے عوام بھی ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ آزادی کے بعد ان علاقوں نے بہت ترقی کی، وہاں سکول اور کالج بنے، سڑکیں اور پل تعمیر ہوئے، ہوائی سروس کا آغاز ہوا، تجارت کو فروغ ملا اور وہاں کے رہنے والے شاہراہ ترقی پر تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

بھارت کے کارپردازانِ حکومت پہلے تو جنگ بندی کی تجویز کو ماننے پر تیار نہ تھے لیکن عوام کے جوشِ جہاد کے پیشِ نظر پھر خود ہی اس مسئلے کو اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش کرنے پر تیار ہو گئے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۴۸ء سے جنگ بندی عمل میں آگئی ـــــ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ بھارت مسلسل توسیع پسندی کی پالیسی پر کاربند ہے اور کشمیر میں استصوابِ رائے عامہ کی راہ میں مسلسل روڑے اٹکا رہا ہے، اُس کے اس رویہ کو دیکھ کر اب پاکستانی رائے عامہ کا تاثر یہی ہے کہ جنگ بندی کا فیصلہ غلط تھا، پاکستانی زعماء کی اب بھی پوری کوشش ہے کہ کشمیر کا مسئلہ وہاں کے رہنے والوں کی مرضی سے طے کیا جائے اور اہلِ کشمیر کے حقِ خود ارادیت کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے جائیں۔

جہادِ کشمیر کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقے کے لوگوں نے بڑے ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، وزیر، محسود، بھٹنی، آفریدی، شنواری، مہمند، اتمان خیل اور دیر، سوات اور دوسرے علاقوں کے سرفروش انتہائی بے سروسامانی کے باوجود انتہائی جرأت اور شجاعت سے غاصب حکمرانوں کی بے پناہ فوجی طاقت سے ٹکر لیتے رہے اور انہوں نے اپنے خون سے کشمیر کی سرزمین میں اسلامی اخوت اور ہمدردی کی وہ تاریخ رقم کی جو کبھی فراموش ہونے نہ پائے گی۔

قائدِ اعظم کا دورۂ سرحد

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو صوبہ سرحد کے حریت کیش اور جرأت پیشہ عوام سے بے حد محبت تھی، ایک موقع پر انہوں نے فرمایا تھا "صوبۂ سرحد کا بہبود مجھے اپنی جان سے پیارا ہے"۔ اور اس محبت کا عملی ثبوت یہ ہے کہ قائدِ اعظم کو اپنی سیاسی زندگی میں سب سے زیادہ مشقت اسی صوبے کو ملک کے باقی صوبوں کے برابر سیاسی مراعات دینے کے سلسلے میں کرنی پڑی، انہوں نے اہلِ سرحد کی خدمت کا آغاز ۱۹۲۶ء میں اس وقت کیا جب اس مسئلہ پر تمام زبانیں گنگ تھیں، اپنے شہرۂ آفاق چودہ نکات میں بھی انہوں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام کو اُن کے جائز حقوق دلانے کی پُرزور حمایت کی۔ نوجوانانِ سرحد سے اپنے

پیار کا ثبوت یہ دیا کہ اپنی وصیت کی رُو سے اپنی املاک کا ایک تہائی حصّہ اسلامیہ کالج پشاور کے لئے وقف کر دیا تاکہ سرحدی نونہال اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ وصیت قائدِاعظم نے اس وقت کی جب صوبہ سرحد میں کانگرسی حکومت برسرِاقتدار تھی۔ اسی طرح ۳ر جون ۱۹۴۷ء کی تاریخی نشری تقریر میں بھی قائدِاعظم نے خواتینِ سرحد اور کارکنانِ سرحد کو شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

قائدِاعظم نے سرحدی زعماء سے صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کا وعدہ کیا تھا، چنانچہ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۸ء سے انہوں نے صوبہ کے دس روزہ دورے کا آغاز کیا۔ ہوائی اڈہ پر استقبال کے لئے آئے ہوئے لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ جونہی قائدِاعظم اور محترمہ فاطمہ جناح ہوائی جہاز سے اترے صوبہ سرحد کے گورنر، وزیرِاعلیٰ، وزرائے کابینہ نے ان کا والہانہ استقبال کیا، قائدِاعظم آگے بڑھے اور والیٔ سوات، مہتر چترال اور نواب دیر سے مصافحہ کیا پھر قطار میں کھڑے ہوئے مسلم لیگی زعماء قبائلی ملکوں اور معززین سے ملے اور کار میں بیٹھ کر گورنمنٹ ہاؤس روانہ ہو گئے۔ سارے راستے پر دو رویہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جونہی قائدِاعظم کی سواری گزرتی لوگ فلک شگاف نعروں سے خیر مقدم کرتے۔

۱۲ر اپریل کو قائدِاعظم نے گورنمنٹ ہاؤس میں مسلم لیگی اکابر کو شرفِ باریابی بخشا اور اُن کی معروضات سُنیں، پھر پہروہ اسلامیہ کالج پشاور تشریف لے گئے، جہاں جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا تھا، کالج کمیٹی کی جانب سے کرنل اے، کے صاحبزادہ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اپنی تقریر میں قائدِاعظم نے صوبہ سرحد کا ریفرینڈم جیتنے پر مبارک دی، بالخصوص تحریکِ پاکستان میں طلباء کے کردار کو سراہا۔ انہوں نے طلباء کو تعمیری نقطۂ نظر اختیار کرنے کی ہدایت کی اور وعدہ فرمایا کہ جلد ہی صوبہ سرحد میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جہاں سے اُٹھنے والی علم و عمل اور تہذیب و تمدن کی شعاعیں سارے وسطی ایشیا کو منور کر دیں گی۔

۱۳ر اپریل ۱۹۴۸ء کو رسالپور تشریف لے گئے جہاں پاکستان ایئر فورس نے انہیں شاہی سلامی پیش کی، آپ نے فضائیہ کے دستوں کا مارچ پاسٹ دیکھا اور اپنی مختصر تقریر میں شاہینوں کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ ملک و ملت کے دفاع کے فریضہ کو پوری تندہی سے انجام دیں۔

رسالپور سے واپس پشاور آتے ہوئے انہوں نے نوشہرہ میں آرمرڈ بریگیڈ کا بھی معائنہ کیا۔
پچھلے پہر گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں صوبہ سرحد کے گورنر نے قائداعظم کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا جس میں صوبے کے ہر طبقۂ فکر کے سرکردہ معززین نے شرکت کی۔ تقریب میں خصوصیت سے نشستوں کا اہتمام اس طرح کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب اور کانگرسی زعماء قائداعظم کے قریب بیٹھیں تاکہ ان سے بات چیت میں آسانی ہو،

۱۴ اپریل کی صبح کو قائداعظم درۂ خیبر کے دورے پر روانہ ہوئے، جمرود میں نوابزادہ ملک ولی خان نے ۳۰۳ کی ایک بندوق، ایک خنجر اور سجے سجائے دُنبے روایتی طور پر قائداعظم کی نذر گزارے۔
آگے بڑھے تو ملک عبداللطیف خان (ملک دین خیل) نے آفریدی قبائل کی جانب سے قائداعظم کو خوش آمدید کہا۔ سارا راستہ دورویہ قبائلی عوام کی بہت بڑی تعداد قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جمع تھی ـــــ قائداعظم تورخم میں پاک افغان بارڈر تک گئے اور ڈیوٹی پر کھڑے افغان سنتریوں سے ہاتھ ملایا۔

۱۴ اپریل کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں قائداعظم محمد علی جناح نے صوبہ سرحد کے سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے خطاب کیا، انہوں نے انہیں ہدایت کی کہ اپنے فرائضِ منصبی انتہائی جاں فشانی اور غیر جانبداری سے انجام دیں اور پاکستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار حسن و خوبی سے بجالائیں۔

۱۵ اور ۱۶ اپریل کو بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم نے مٹّوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کا دورہ کیا اور وہاں کے عوام سے ملاقات کی۔

۱۷ اپریل کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک عظیم الشان قبائلی جرگہ منعقد ہوا، حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا ـــــ "میں اُن خدمات سے بخوبی واقف ہوں جو قبائلی عوام نے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ آپ کے اظہارِ وفاداری کے پیشِ نظر ہم نے قبائلی علاقوں سے فوجوں کو واپس بُلا لیا ہے۔ ہمارے اس اقدام سے ظاہر ہے کہ ہم آپ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔"

شام کو قائداعظم نے فاطمہ جناح پشاور صدر کی سیر پر تشریف لے گئے، لوگوں کو ان کی آمد کا علم ہوا تو راستے پر قالین بچھا دیئے، قائداعظم چند دکانوں پر تشریف لے گئے، ان کے دورے کی نسبت سے اسی دن سے صدر کے گورا بازار کا نام "جناح سٹریٹ" رکھ دیا گیا۔

۱۸ اپریل کو قائداعظم نے ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء سے اُن کی خصوصی درخواست پر خطاب کیا طلباء نے انہیں مہاجرین کے امدادی فنڈ کے لئے تین ہزار روپیہ کی تھیلی پیش کی، قائداعظم نے نہایت شستہ انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے تعمیری اندازِ فکر اپنانے پر زور دیا ـــــ اس دن بارش کی وجہ سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ پھر تقریر کے دوران مائیکروفون بھی فیل ہوگیا، قائداعظم نے اس کے باوجود تقریر جاری رکھی اور پورے زور سے بولتے رہے، یہ سب باتیں قائداعظم کی کمزور صحت پر اثر انداز ہوتی گئیں اور آپ کے چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری کے آثار دیکھنے میں آئے۔ اس کے باوجود انہوں نے جناح پارک کے جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ یہ دورہ قائداعظمؒ کا آخری عوامی دورہ ثابت ہوا ـــــ کراچی پہنچنے پر وہ علیل ہوگئے اور آرام کی خاطر زیارت (بلوچستان) تشریف لے گئے۔ بالآخر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو آخری دم تک ملک و ملت کی خدمت بجالاتے ہوئے وہ راہیٔ ملکِ بقا ہوگئے اور ایثار و قربانی کی ایک شاندار روایت چھوڑ گئے۔

فقیرایپی کی ریشہ دوانیاں

قبائلی علاقوں سے فوجیں واپس بلاکر قائداعظم نے جس باہمی اعتماد کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا قبائلی سرحد پر بڑا خوشگوار اثر ہوا، برطانوی غلامی کے دور میں جو رقم فوجی مہموں پر صرف ہوتی تھی اب قبائلی علاقوں کی تعمیر و ترقی پر صرف ہونے لگی۔ ہر جگہ نئے سکول اور کالج کھلے۔ سڑکیں اور پل تعمیر ہوئے۔ آبپاشی کے منصوبے زیرِ عمل آئے۔ قبائل کو کاروبار کی آزادی ملی، وہ سارے پاکستان میں پھیل گئے اور اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ آزادی کے فیوض و برکات سے متمتع ہونے لگے۔ تاہم وزیرستان کی سرحد پر فقیرایپی نامی پُراسرار شخصیت اپنی من مانی کارروائیوں میں ملوث رہی، یہاں تک کہ اُس نے پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھ کر پاکستان پر حملے کی دعوت دی۔ جون ۱۹۴۸ء میں اقبال حسین نامی شخص، پاکستان کے راستے دہلی جارہا تھا کہ مشتبہ حالت میں گرفتار ہوا۔ اس سے فقیرایپی کا خط پکڑا گیا جو اُس نے پنڈت نہرو کو لکھا تھا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ نہرو اقبال حسین کو تعارفی خط دیں تاکہ وہ کابل میں مقیم بھارتی سفیر سے رابطہ قائم کرسکے۔ یہ بھارتی سفیر روپ چند، لاہور کے ایک تاجر رام سرن کا چھوٹا بیٹا تھا، اس کا معاون کے۔ ایل۔ پوری صوبہ سرحد کا باشندہ اور کانگرس کا ایک سرگرم کارکن تھا وہیں ایک اور بھارتی افسر میجر کپور بھی ہندو شرنارتھیوں کے انخلاء کے سلسلے میں لیزان آفیسر کے طور پر کام کررہا تھا

جو صوبہ سرحد کے ہندو رہنما اور کانگرس وزارت کے ایک رکن مہر چند کھنہ کا بھانجا تھا۔

خان عبدالغفار خان کی سرگرمیاں

۱۹۴۸ء کے اوائل میں خان عبدالغفار خان نے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی تھی اور کراچی کے ایک اجتماع میں "پیپلز پارٹی آف پاکستان" کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی تھی، اس جماعت کے بنانے میں خان عبدالغفار خان۔ جی۔ ایم سید، غوث بخش بزنجو، عبدالصمد خان اچک زئی اور خان عبدالولی خان پیش پیش تھے جب کہ دستور ساز اسمبلی کے ہندو ارکان کی تمام تر ہمدردیاں بھی اُن کے ساتھ تھیں۔

سید نور احمد کے بیان کے مطابق

"اس پارٹی کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ یہ پاکستان میں آئینی حزب اختلاف کا کردار ادا کرے گا اور سرخپوش جماعت اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھتے ہوئے "پیپلز پارٹی" کی فوج کی حیثیت سے کام کرے گی ـــــ چند دن کراچی میں گزار کر خان عبدالغفار خان اتمان زئی واپس چلے گئے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے بظاہر اپنی آئینی حزب مخالف کے پرچار کے لئے سرحدی دیہات کا طوفانی دورہ کیا۔ اور جگہ جگہ جلسوں میں تقریریں کیں۔

چونکہ حکومت کی نظروں میں یہ تقریریں انتہائی قابلِ اعتراض تھیں، اس لئے حکومت صوبہ سرحد نے ایک پبلک سیفٹی آرڈیننس کا مسودہ تیار کر کے مرکزی حکومت کی منظوری کے لئے کراچی بھیج دیا۔ چونکہ قائداعظم ان دنوں کوئٹہ میں تھے، یہ مسودہ وہاں سے کوئٹہ بھیجا گیا۔ تو اس میں کافی وقت لگ گیا تھا اس لئے مرکز کی منظوری کا انتظار کئے بغیر ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو فرانٹیئر کرائمز ریگولیشن کے تحت خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر لیا گیا اور اُن کی اُن تقریروں کی بناء پر ان کا چالان عدالت میں پیش کیا گیا، جہاں سے انہیں تین سال قید سخت کی سزا سُنا دی گئی، بعد میں جب صوبائی حکومت کو کراچی سے نئے آرڈیننس کی منظوری وصول ہوئی تو اس کے تحت خان عبدالغفار خان کے چند ساتھیوں کو بھی نظر بند کر دیا گیا اور وقتی طور پر سرخپوش جماعت کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے کوئی خاص سیاسی سرگرمی دیکھنے میں نہ آئی۔"

لہ مارشل لاء سے مارشل تک

عبدالقیوم خان کا دورِ وزارت

اگست ۱۹۴۷ء ـــــ اپریل ۱۹۵۳ء

۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی تو اسے بے شمار مسائل کا سامنا تھا۔ پرانا نو آبادیاتی نظام دم توڑ چکا تھا اور نئے نظام میں ابھی اتنی سکت نہ تھی کہ اس کی جگہ لیتا، زندگی کا ہر شعبہ بحران کا شکار تھا، غیر مسلموں کے انخلاء سے تعلیمی ادارے، بنک اور بازار بند پڑے تھے، اناج کی پہلے ہی کمی تھی، کپڑے کا کارخانہ صوبہ بھر میں نام تک کو نہ تھا۔ مالی اعتبار سے صوبہ سرحد انتہائی خسارے کا صوبہ تھا۔ مرکزی حکومت اسے کروڑوں روپے کی گرانٹ دیتی تب کہیں مشکل سے اخراجات پورے ہوتے، ۱۹۴۶ء میں اس صوبے کی آمدنی دو کروڑ ستاسٹھ لاکھ انچاس ہزار تھی اور اخراجات دو کروڑ اناسی لاکھ تہتر ہزار، (جبکہ آج ۱۹۸۲ء میں آمدنی دو ارب ستر کروڑ ۴۷ لاکھ ہے اور اخراجات دو ارب اسی کروڑ ۳۱ لاکھ ہیں) ظاہر ہے کہ اس آمدنی سے ترقیاتی کاموں پر کتنی توجہ دی جا سکتی تھی۔

سیاسی میدان میں نئی حکومت کا مقابلہ ایک نہایت منظم، مضبوط اور مستحکم جماعت کانگرس سے تھا، جس کی جڑیں عوام میں بہت گہری تھیں اور جو عرصہ تک صوبے کی حکمران جماعت رہ چکی تھی، اس جماعت کو ہمسایہ ملکوں کی ہمدردی بھی حاصل تھی، صوبہ سرحد میں اس کے کرتا دھرتا اور بانی باشرع مسلمان تھے، اسلام کا دم بھرتے اور اسلامی نعروں سے عوام کے دلوں کو گرماتے تھے، اس کے مقابلے میں مسلم لیگ نسبتاً نئی جماعت تھی، اُسے صحیح معنوں میں عوامی جماعت بنانے کے لئے بڑی محنت اور ہمت کی ضرورت تھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ انگریزی سامراج نے جان بوجھ کر اہلِ سرحد کو سہولیات اور مراعات سے محروم رکھا تھا اور اہلِ سرحد کو اُن کی حریت کیشی کی سزا یہ دی تھی کہ

نہ یہاں تعلیمی ادارے قائم کئے تھے نہ کارخانے لگانے کی سوچی تھی، اس پسماندگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان بنا تو سارے صوبہ سرحد میں نہ کوئی سرکاری کالج تھا نہ یونیورسٹی، لے دے کے پندرہ سولہ ہائی سکول تھے، گویا ہر طرف مسائل ہی مسائل تھے اور ہر طرف مشکلات کے پہاڑ کھڑے تھے، ان سب مخالفتوں سے عہدہ برآ ہونا ـــــ خان عبدالقیوم خان جیسے قد کاٹھ اور دل گردے والے انسان ہی کا کام تھا، وہ کانگرس ہی کی صفوں سے نکل کر آئے تھے، متحدہ ہندوستان کی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہ چکے تھے اس لئے سیاسی داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف تھے، بیرسٹر اور قانون دان بھی تھے تو لندن سکول آف اکنامکس کے گریجویٹ ہونے کے ناطے سے اقتصادی منصوبہ بندی کے ماہر بھی، صحافت کی ضرورت اور نشیب و فراز سے آگاہ بھی تھے تو اچھے مقرر اور منتظم بھی ـــــ سختی کے موقع پر سختی کرنا بھی جانتے تھے تو لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور رام کرنے کا فن بھی انہیں آتا تھا۔ وہ چشم زدن میں دشمن کو دوست بھی بنا سکتے تھے اور دوست کو دشمن بھی ـــــ یہ درست ہے کہ ان کے مزاج میں سخت گیری، مطلق العنانی اور انتقام پروری جیسی خامیاں ضرور تھیں تاہم صوبے کی تعمیر و ترقی انہیں دل سے عزیز تھی، اہل سرحد کے مفاد سے کبھی پہلو تہی کرنے والے نہ تھے، پانچ چھ برس کی محنت شاقہ سے انہوں نے صوبہ سرحد کو ترقی کی ایسی راہ پہ ڈال دیا کہ آج تک یہ صوبہ مسلسل اور متواتر ترقی کی راہ پہ گامزن ہے۔

مقام اطمینان ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جہاں دوسرے صوبوں کی وزارتیں اندرونی انتشار کا شکار رہیں، وہیں صوبہ سرحد میں پانچ ساڑھے پانچ سال تک ایک مضبوط حکومت کو کام کرنے کا موقع ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس عرصے میں پشاور یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جگہ جگہ کالج اور سکول کھل گئے، پشاور، مردان، نوشہرہ، بنوں اور دوسرے مقامات پہ صنعتیں قائم ہوئیں۔ باہر کے سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اس صوبے میں کارخانے لگائیں، پرائمری اور مڈل کے درجوں تک تعلیم مفت قرار پائی، لبسوں کو قومی تحویل میں لیا گیا، دارسک کے منصوبے کا سرچشمہ ہوا۔ مہاجرین کی آبادکاری کی طرف توجہ دی گئی، قبائلی علاقوں سے فوجیں واپس بلائی گئیں، قبائلی علاقوں میں سڑکیں، سکول اور شفاخانے تعمیر ہوئے۔ وزیر محسود لوگوں کو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاقے میں اراضی دے کر آباد کیا گیا، غرضیکہ ہر طرف خوشحالی اور ترقی کے دور کا آغاز ہوا۔

مہاجرین کی آبادکاری پہلا کام جس پر پاکستان کے قیام کے بعد توجہ دینی ضروری تھی، وہ بھارت سے آئے ہوئے بے خانماں لوگوں کی آبادکاری تھی۔ مسلم اقلیت کے بھارتی صوبوں کے اہلِ ایمان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غیر مسلموں سے گھرے ہوئے ہیں، محض جذبۂ اسلامی کے تحت تحریک پاکستان میں بھرپور حصّہ لیا تھا۔ آزادی ملی تو ان بے چاروں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، ہزاروں مسلمانوں کو زندہ جلایا گیا، ہزاروں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ صرف ایک بہار ہی کے بھارتی صوبے میں وہ کچھ ہوا جس کے تصوّر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، خود پنڈت نہرو نے اعتراف کیا کہ "بہار میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بہت خوفناک ہے، مجھے یقین نہیں آتا کہ انسان ایسا وحشی اور سنگ دل بھی ہو سکتا ہے"۔ گاندھی جی اس وحشیانہ قتل و غارت کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ "بہار کی کانگرسی حکومت کا کردار باعثِ شرم ہے"۔ سب سے شرمناک کردار پنجاب کے سکھ راجوں مہاراجوں نے انجام دیا، اُن کے ایماء پر منظم سکھ جتھوں نے چُن چُن کر مسلمانوں کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں تک پر رحم نہ کھایا، کئی جگہ ساری آبادی میں سے ایک بھی مسلمان کو زندہ نہ چھوڑا ـــــ مہاجرین کے یہ لُٹے پٹے قافلے صوبہ سرحد پہنچے تو مقامی دردمند لوگوں نے ان کا دلی خیر مقدم کیا۔ انہیں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی۔ سرکاری رپورٹوں کے مطابق ابتدائی چند سالوں میں ۶۵ ہزار مہاجروں کو صوبہ سرحد کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد کیا گیا، انہیں دکانیں، مکان اور زمینیں الاٹ کی گئیں، اس خیال سے کہ کاروباری میدان میں خلاء واقع ہونے نہ پائے، متروکہ املاک کا دس فیصد حصّہ مقامی لوگوں کو بھی دیا گیا، اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں بازاروں اور منڈیوں کی رونق پھر عود کر آئی، مسلمان نئے جوش اور جذبے سے تجارت کے میدان میں اترے تو دیکھتے دیکھتے ان کے دن پھر گئے، ہر طرف مسرت و خوشحالی کا دَور دَورہ ہوا اور ہر طبقے میں دولت کی ریل پیل نظر آنے لگی۔

مسئلہ کشمیر جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ہندوستانی ریاستوں کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان میں سے جس کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔ ریاست جموں و کشمیر برصغیر میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی تھی، جغرافیائی، اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے پاکستان کے ساتھ اس کا الحاق ناگزیر تھا۔ اس کے رہنے والوں کی ستر پچہتر فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اصولی اور منطقی طور پر یہ پاکستان ہی کا جزو لاینفک تھی تاہم ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے یہ سیدھا سادا مسئلہ انتہائی

پیچیدہ صورت اختیار کر گیا، ریڈکلف نے پاکستان دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلم اکثریت کی تحصیل پٹھان کوٹ ہندوستان کے حوالے کر دی کیونکہ ہندوستان کو کشمیر سے ملانے والی واحد سڑک اسی تحصیل سے گزرتی تھی، اُدھر گاندھی جی نے ۱۹۴۷ء کے موسم گرما میں کشمیر کا دورہ کیا اور ڈوگرہ راجہ پر اپنے تقدس کے ڈورے ڈالے، جموں کے صوبے میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، ریاستی فوج کے ہندو سپاہیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا، لُٹے پٹے مسلمان دھڑا دھڑ سیالکوٹ اور گجرات کو ہجرت کرنے لگے۔ اپنے بھائیوں پر ڈھائے گئے اس ستم نارواکو دیکھ کر پونچھ کے مسلمانوں کا خون کھول اٹھا، پونچھ کے مسلمان جنگجو لوگ تھے اور ان کی اکثریت انگریزوں کی فوجوں میں شامل رہ چکی تھی۔ انہوں نے اعلانیہ ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور بہت سا علاقہ اس کے تسلط سے آزاد کرا لیا، کشمیر کی سرحدیں ہزارہ اور راولپنڈی ڈویژن سے ملتی ہیں، اسلامی ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ان علاقوں کے لوگ بھی اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے کشمیر پہنچے، اس جہاد میں سب سے نمایاں حصہ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد کے رضاکاروں نے لیا۔

۲۰ر اکتوبر کو یہ اطلاع ملی کہ نوسو محسود ٹانک سے کشمیر کے محاذ کے لئے روانہ ہو چکے ہیں، کوہاٹ کے مقام پر انہیں روکنے کی کوشش بے کار ثابت ہوئی اور وہ خوشحال گڑھ کے راستے راولپنڈی پہنچ گئے دوسرے دن دو سو مہمندوں کے جہاد پر جانے کی اطلاع ملی۔ سوات اور دیر کے یوسف زئی مجاہد بھی اپنے بھائیوں پر ظلم ہوتے نہ دیکھ سکے اور کشمیر میں مختلف اطراف سے داخل ہو گئے۔

۲۲ر اکتوبر کو خبر ملی کہ کئی ہزار مسلمان مجاہد ہزارہ کی جانب سے کشمیر میں داخل ہو چکے ہیں اور انہوں نے مظفر آباد اور دومیل پر قبضہ کر لیا ہے، ہزاروں قبائلی سرفروش جہلم کی راہ بارہ مولا کی طرف بڑھے اور دشمن کے توپ تفنگ اور لاؤ لشکر کی پرواہ کئے بغیر سری نگر کی طرف بڑھنے لگے، اُس وقت تک صوبہ سرحد اور پنجاب کے گورنر انگریز تھے اور پاکستان آرمی کے کمانڈر ان چیف بھی انگریز ہی تھے، وہ ہندو کے ساتھ اس سازش میں برابر مدد کرتے رہے، جب لڑائی کی آگ کشمیر اور جموں کے کونے کونے میں پھیل گئی اور ریاستی فوجوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا تو مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے ارکان حکومت بھاگ کر دہلی جا پہنچے، مہاراجہ نے بھارتی حکومت سے الحاق کی درخواست کر دی اور فوجی امداد طلب کی جسے فوراً منظور کر لیا گیا۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الحاق کی

دستاویز پر دستخط ہو گئے اور بھارتی فوجیں ہوائی جہازوں سے دھڑا دھڑ سری نگر پہنچنے لگیں ـــــ ادھر بھارت نے ایک اور چال چلی۔ کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کر کے کشمیر کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔

۲۷ اکتوبر کو دہلی ریڈیو نے اعلان کیا کہ بھارتی فوجوں کو ہوائی جہازوں سے سرینگر روانہ کر دیا گیا اس اعلان کے بعد قائداعظم اور لیاقت علی خان بھی ضروری صلاح مشورے کے لئے لاہور پہنچ گئے قائداعظم کا خیال تھا کہ پاکستان فی الفور جموں پر حملہ کر دے اور جتنے علاقہ پر ہو سکے قبضہ کر لے۔ تاہم انگریز فوجی کمانڈر اس بات کی اجازت دینے پر تیار نہ تھے ـــــ یہ انکشاف ایک برطانوی مصنف ایلن کیمبل نے اپنی کتاب "مشن ود مونٹ بیٹن" کے صفحہ ۲۶۶ پر کیا ہے ـــــ اس وقت پاکستان آرمی کا کمانڈر ان چیف جنرل مزوری تھا، اس کی عارضی غیر حاضری میں جنرل گریسی قائمقام کمانڈر ان چیف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایلن کیمبل نے اپنی کتاب میں قائداعظم کے حکم کے متعلق لکھا کہ قائداعظم کا یہ حکم کہ جموں پر حملہ کیا جائے۔ ملٹری سیکرٹری کی معرفت جنرل گریسی کو ملا تھا لیکن جنرل گریسی نے جواب دیا تھا کہ وہ سپریم کمانڈر کی منظوری کے بغیر فوج کو کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا، اُن دنوں فیلڈ مارشل آرکنلک بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی فوجوں کا سپریم کمانڈر تھا اور دہلی میں مقیم تھا[1]

اس وقت ہندوستان کی فوج ہماری فوج سے دُگنی تھی اور اس کے پاس اسلحۂ جنگ بھی ہم سے کہیں بڑھ کر تھا تاہم سرحدی مجاہدان باتوں کو خیال میں لانے والے نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں نے اپنے سے کہیں بڑی طاقت کو بارہا شکست دی تھی، لہٰذا وہ بے دریغ سرینگر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ ادھر پنجاب سے بھی میجر خورشید انور، سردار شوکت حیات اور زمان خان کیانی کی کمان میں رضاکاروں کی دستے جہادِ کشمیر میں حصہ لینے کے لئے تیار تھے ـــــ اس جہادِ مقدس کا نقشہ ایک مرد مجاہد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :۔

"یہ منظر ایسا تھا جیسے کسی نے تاریخ کا بہت پرانا دور ہمارے سامنے رکھ دیا ہو۔ میرا ذہن کئی صدیاں پیچھے چلا گیا، جب ہمارے آباؤ اجداد سرحد کے کوہساروں، وادیوں اور درّوں سے

---

[1] سابق میجر جنرل محمد اکبر خان

گزر کر آیا کرتے تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کا منظر بالکل ویسا ہی جذبہ تھا، عزم بھی اپنے آباؤ اجداد جیسا تھا، یہ قبائلی مجھے اپنے ہی بزرگوں جیسے نظر آرہے تھے، ان کا لباس، اُن کا انداز صدیوں پُرانا تھا، وہ اپنے دادا پردادا کی طرح اَن دیکھے اجنبی دیس کی طرف بڑھے جارہے تھے، صدیوں پہلے وہ پیدل چلتے تھے یا گھوڑوں پر آتے تھے، اب وہ کنوائے میں جارہے تھے، مگر یہ ایسا کنوائے تھا جسے کسی نے منظم نہیں کیا تھا ــــ نہ کوئی اس کا کمانڈر تھا ــــ"

جنگی محاذ پر تو اہلِ سرحد جوشِ شہادت سے سرشار اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کو ایک ظالم اور جابر حکمران سے آزاد کرانے میں یوں سرگرم تھے لیکن سیاسی محاذ پر انگریز اور ہندو پوری طرح متحد اور چوکنے تھے، یہ خبر سُنتے ہی کہ ہزاروں قبائلی مجاہد بارہ مُولا سے گزر کر سری نگر کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں، برطانوی حکومت بیچ میں کود پڑی اور ٹال مٹول کی پالیسی سے کام لینے لگی۔ تار موصول ہوا کہ حکومتِ ہند کل لارڈ مونٹ بیٹن، پنڈت نہرو، قائداعظم اور مہاراجہ ہری سنگھ کے مابین ایک میٹنگ کا اہتمام کر رہی ہے تاکہ گفت و شنید کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کیا جائے۔ تاہم ۲۹ اکتوبر کو اطلاع ملی کہ پنڈت نہرو علیل ہو گئے ہیں لہٰذا میٹنگ ملتوی کی جاتی ہے، قائداعظم سمجھ گئے کہ یہ چال محض اس لئے چلی گئی تھی کہ ہندوستانی فوجوں کو سری نگر پہنچنے کا وقت مل سکے، بعد میں قائداعظم نے اسے "صریح دھوکا دہی" (FRAUDULANT TRANSACTION) قرار دیا۔

مشکلات اور بے سروسامانی کے باوجود کشمیری مسلمانوں نے رضاکاروں کی مدد سے جنگِ آزادی لڑی اکتوبر ہی میں گلگت سکاؤٹس کے مسلمان سپاہیوں نے جموں کے مہاراجہ کے مقرر کئے ہوئے گورنر کے محل کو گھیرے میں لے لیا، گورنر کو قیدی بنا لیا گیا اور مجاہدین نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی، اسی طرح نگر اور ہنزہ کے علاقے بھی ڈوگرہ حکومت کے تسلط سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئے، تین کا علاقہ بھی مجاہدینِ آزاد کشمیر نے دوبارہ فتح کر لیا۔ ۱۲ نومبر کو ہجیرہ پر بھی قبضہ ہو گیا اور آزاد کشمیر کی حکومت نے باقاعدہ مفتوحہ علاقوں پر اپنا پرچم لہرانا شروع کر دیا، ایک باقاعدہ آزاد کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر محمد ابراہیم خان تھے۔

خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں اہلِ سرحد نے اپنے کشمیری مجاہد بھائیوں سے کامل ہم آہنگی کا

ثبوت دیا، ہندوستان کو یہ بخوبی علم تھا کہ مجاہدینِ کشمیر کو امداد کہاں سے پہنچتی ہے چنانچہ اس نے کئی بار ہزارہ ڈویژن کے علاقوں گڑھی حبیب اللہ وغیرہ پر ہوائی جہازوں سے بمباری بھی کی تاہم اہلِ سرحد نے اپنے کشمیری بھائیوں کا ساتھ نہ چھوڑا

مجاہدینِ آزادی انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بھی ہندوستانی افواج سے مسلسل برسرِ پیکار رہے۔ انہوں نے بھارتی فوجوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ بالآخر بھارتی حکومت نے سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹایا تو فائر بندی کا فیصلہ ہوگیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد منظور کرلی کہ کشمیر میں آزادانہ رائے شماری کرائی جائے گی اور کشمیری عوام اپنے حقِ خودارادیت کے تحت یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ اپنی سرزمین کا الحاق پاکستان سے کرنا چاہتے ہیں یا ہندوستان سے ــــ تاہم بعد میں بھارتی حکومت اپنے تمام وعدوں سے پھر گئی اور اب تک بنوکِ شمشیر کشمیر کے بہت سے علاقہ پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ پاکستان اس عرصہ میں متواتر رائے شماری کے ذریعے کشمیری عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے مؤقف کی حمایت کرتا چلا آیا ہے۔

بابڑہ فائرنگ سیاسی محاذ پر عبدالقیوم خان کی حکومت کو سرخپوشوں کی مخالفت کا سامنا تھا، اس میں شک نہیں کہ ملکی آزادی کے حصول کے لئے اس جماعت نے بہت قربانیاں دی تھیں اور سرحدی عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیا تاہم قیامِ پاکستان کے بعد اب کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ لوگ اپنی پرانی روش پر گامزن رہتے، البتہ کئی لوگوں نے بدلتی ہوئی صورتِ حال کا احساس کیا اور اپنی سیاسی روش تبدیل کر ڈالی، مثلاً پشاور شہر کے مشہور قومی رہنما حکیم عبدالجلیل ندوی (جو صوبہ سرحد کانگرس کے صدر بھی رہے تھے) حصولِ آزادی کے بعد سیاست سے بالکل کنارہ کش ہوگئے، دوسرے کئی رہنماؤں نے بھی انہیں کا تتبع کیا۔ تاہم سرخپوشوں کی اکثریت مسلم لیگ کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے رہی جس سے دونوں جماعتوں میں اختلافات کی خلیج مزید بڑھ گئی۔

اس صورتِ حال پر صوبہ سرحد کے ایک معروف قومی کارکن محمد افضل خان بنگش نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے کہ[1]

---

[1] روزنامہ "مشرق" - ۱۶ راگست ۱۹۷۳ء

"بادشاہ خان (خان عبدالغفار خان) نے ۳ رجون ۱۹۴۷ء کے اعلانِ تقسیم ہند پر سوچ بچار کرنے اور اپنے مستقبل کے لئے راہ متعین کرنے کے لئے ۲۱ رجون ۱۹۴۷ء کو بنوں میں ایک اجتماع سے جسے "لوئے جرگہ" کا نام دیا گیا، خطاب کیا، اجلاس میں سرحد اسمبلی کے کانگرسی ممبر، خدائی خدمتگار تحریک کے جملہ کمانڈر، کانگرس کمیٹیوں کے عہدیدار اور جمعیت العلمائے ہند کے سرکردہ ارکان شریک ہوئے۔ جن میں خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب، خان عبدالولی خان، سید گل بادشاہ، قاضی عطاء اللہ خان صاحب، اور سالار امین جان خان قابل ذکر ہیں۔ اجلاس کی صدارت خان امیر محمد خان نے کی جو اس وقت صوبائی کانگرس کے صدر تھے، اجلاس میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی، جسے بعد میں قرارداد پشتونستان کا نام دیا گیا، اس قرارداد میں اعلان کیا گیا تھا کہ "پشتون نہ پاکستان چاہتے ہیں اور نہ ہندوستان، بلکہ وہ آزاد پشتونستان چاہتے ہیں"۔ اسی قرارداد میں پاکستان کے مسئلے پر لیفرینڈم کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ اگر ریفرینڈم ہونا ہے تو آزاد پشتونستان کے مسئلہ پر کیا جائے۔ اس قرارداد کو اشتہارات کے ذریعہ لاکھوں کی تعداد میں بانٹا اور چسپاں کیا گیا۔ (بنگش صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے پاس اس اشتہار کی فوٹو سٹیٹ کاپی موجود ہے)۔

قیام پاکستان کے بعد کچھ دیر تک عبدالقیوم خان کی حکومت خاموش تماشائی بن کر سرخپوش تنظیم کی حرکات و سکنات کو دیکھتی رہی۔ لیکن جب یہ محسوس کیا کہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور اس کے رہنماؤں کے لب و لہجہ کی تلخی بڑھتی جا رہی ہے تو ۱۵ رجون ۱۹۴۸ء کو خان عبدالغفار خان کو گرفتار کر لیا گیا، ان پر الزام تھا کہ انہوں نے خدائی خدمت گاروں کو ہدایت کی تھی کہ قیام پاکستان کی سالگرہ کی تقریبوں میں شامل نہ ہوں، اس کے کچھ دن بعد خان عبدالغنی خان خان عبیداللہ خان اور ماسٹر عبدالکریم خان کو بھی قانون جرائم سرحد کی دفعہ ۴۰ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر جگہ جگہ سرخپوشوں کے احتجاجی جلسے منعقد ہونے لگے۔ انہی میں سے ایک جلسہ بابڑہ (چارسدہ) میں ہوا، جس میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی گئی، پولیس نے مظاہرین کو وارننگ دی اور جلوس نکلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، جب ہجوم منتشر نہ ہوا تو ان پر گولی چلا دی گئی جسے "بابڑہ فائرنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واقعہ بابڑہ کی تفصیل بتاتے ہوئے

سالار امین جان خان لکھتے ہیں کہ[1]

"چونکہ عبدالقیوم خان کی وزارت نے کانگرسی لیڈروں کو جیلوں میں ڈال رکھا تھا اس لئے سُرخپوشوں نے ان گرفتاریوں کے خلاف ایک احتجاجی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ جلسہ بابڑہ کے میدان میں منعقد ہونا تھا، اس کے لئے پندرہ دن پہلے ہی اخباروں میں اعلان کیا گیا لیکن ان پندرہ دنوں میں کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔ ۱۱ اگست کو سالار امین جان چارسدہ گئے، انتظامات کو آخری شکل دی، جلوس کی کمان کرنل عبدالرؤف آف پٹانگ کے سپرد کی گئی۔ جب ۱۲ اگست کو جلوس بابڑہ کے میدان میں پہنچا تو فوج اور پولیس ٹیلے پر مورچے جمائے بیٹھی تھی۔ جلوس ٹیلے کی طرف بڑھا تو علمبردار سپین ملنگ کو گولی آکر لگی وہ تیورا کر گر پڑا۔ تو جھنڈا دوسرے رضاکار نے سنبھال لیا۔ پھر تو اندھا دھند گولی چلنے لگی، بقول سالار امین جان خان چار ساڑھے چار سو افراد جان بحق ہوئے، بہت سی لاشیں پولیس نے اٹھالیں۔ باقی لاشیں ورثاء کے حوالے کی گئیں تو وہ مشتعل ہو گئے اور چارسدہ کے مسلم لیگیوں کے مکانوں کو گھیر لیا لیکن سالار امین جان نے انہیں اس امر سے منع کیا۔ بابڑہ کے میدان ہی میں شہیدوں کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، بعد میں پولیس نے سرخپوشوں کے گھروں کی تلاشیاں لیں اور اجتماعی جُرمانہ وصول کیا گیا عبدالمالک فدا کی ہمشیرہ اس فائرنگ میں جان بحق ہوئی تھیں۔ اُن سے دو سو روپیہ جرمانہ وصول کیا گیا۔

کرنل عبدالرؤف خان کا بیان ہے کہ پولیس نے دستی بم بھی استعمال کئے تھے۔ حاجی عبدالرحیم ان دنوں خدائی خدمت گار جماعت کا سیکرٹری تھا وہ بھی زخمی ہوا، میر حسن وارڈ کمانڈر کا کہنا ہے۔ کہ گولیاں مسجد کی چھت سے چلائی گئیں، بعد میں میر حسن کو تین سال قید کی سزا سنائی گئی، پیر محمد افضل چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ وہ بھی دستی بم سے زخمی ہوا لیکن پولیس نے اُسے ہسپتال میں داخل نہ ہونے دیا، نجت محمد نے بتایا کہ وہ اس وقت تیرہ سال کا تھا، اس کے کئی ساتھی فائرنگ میں مارے گئے ـــــ حمید اللہ خان زرین آباد بھی اُنہی لوگوں میں تھا جنہوں نے فائرنگ میں جان دی۔

۱۹۷۲ء میں نیشنل عوامی پارٹی صوبے میں برسر اقتدار آئی تو "یوم بابڑہ" سرکاری طور پہ منایا گیا جس میں بلوچستان کے گورنر میر غوث بخش بزنجو بھی شریک ہوئے۔

---

[1] ۔ روزنامہ "شہباز" پشاور ۱۳ اگست ۱۹۷۰ء

محمد افضل خان بنگش ایڈووکیٹ نے اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ "مشرق" پشاور (۱۶ اگست ۷۲ء) میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ اس وقت جب ملک آزاد ہو چکا تھا، مقتولین بابڑہ کو شہدائے آزادی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ! اتفاق سے "یوم بابڑہ" اس دن منایا گیا تھا جب ۱۹۱۵ء میں حاجی صاحب ترنگ زئی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا، گویا خدائی خدمت گار جلتے بابڑہ فائرنگ کو جد وجہد آزادی ہی کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں، حالانکہ اُن دنوں صوبے میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی حکومت تھی۔

افضل خان کے نزدیک صورتِ حال یہ تھی کہ ایک تو پاکستان بننے سے پہلے ۲۱ جون ۱۹۴۷ء کو بادشاہ خان نے بنوں میں "لوئے جرگہ" کا اجلاس طلب کیا تھا جس میں پشتونستان بنانے کی قرارداد منظور کی تھی، دوسرے انہوں نے جی۔ ایم سید سے مل کر پیپلز پارٹی بنائی جس کی وجہ سے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ خان عبدالغفار خان کی سرگرمیاں پاکستان کے منافی ہیں۔ بہت سے ضلعوں سے رپورٹیں جمع کر لی گئیں کہ عبدالغفار خان پاکستان کو "ریت کی دیوار" کہتے ہیں۔

خان قیوم نے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے ہوم ڈیپارٹمنٹ کا قلمدان سابق کانگرسی رہنما میاں جعفر شاہ کے سپرد کر رکھا تھا، مرکزی حکومت کے مشورے سے وسیع پیمانے پر خدائی خدمت گاروں اور جمعیت العلماء کے لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں، جب بہت سے کانگرسی رہنما گرفتار ہو گئے تو سرخپوشوں کی صوبائی ہائی کمان کے حکم پر ۱۲ اگست ۱۹۴۸ء کو بابڑہ میں ایک احتجاجی جلسۂ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ صوبے کے کونے کونے سے خدائی خدمت گاروں، زلمے پختون کے کمانڈروں اور سرخپوش رضا کاروں نے جلوس میں شرکت کی۔ ہزاروں باوردی خدائی خدمت گاروں نے پڑانگ اور چارسدہ کے گلی کوچوں میں پریڈ کی۔ جب یہ جلوس بابڑہ کی جامع مسجد کے پاس پہنچا تو اسسٹنٹ کمشنر چارسدہ گل محمد خان کے حکم سے اس پر فائرنگ کی گئی۔ کافی دیر تک گولی چلتی رہی اور بہت سے لوگ جان بحق ہوئے۔ حکومت نے مرنے والوں کی تعداد ۲۶ بتائی ہے جبکہ خدائی خدمت گاروں کے بیان کے مطابق اس میں سینکڑوں آدمی جان سے گئے۔ خان عبدالقیوم خان کا بیان ہے کہ وقوعہ کے چار دن پہلے

سے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی تھی، سرخپوشوں نے جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کی۔ اُن کے نزدیک غلطی سالار امین جان خان کی تھی کہ جب اُسے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا علم ہو گیا تھا تو اُسے چاہیئے تھا کہ جلوس نہ نکالتا، بقول فضل بنگش نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کی لیڈرشپ سو فیصد خان طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ باڑہ میں جان دینے والے سبھی غریب لوگ تھے، ایک بھی مالدار، لینڈلارڈ یا بڑا لیڈر باڑہ میں "شہید" نہ ہوا —— آخر یہ کیوں ؟

بعد میں خدائی خدمت گار لیڈروں نے واقعۂ باڑہ کے بارے میں عبدالقیوم خان پر ہائی کورٹ میں مقدمہ بھی دائر کیا تھا لیکن ہائی کورٹ نے عبدالقیوم خان کو بری الذمہ قرار دے دیا کہ براہِ راست وہ اس واقعہ میں ملوث نہ تھے۔

قائدِ اعظمؒ کی وفات

پاکستان کا قیام ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی مدبرانہ قیادت میں مسلمانوں نے اپنے اتحاد، اتفاق اور حسنِ عمل سے اپنے لئے ایک آزاد مملکت حاصل کی —— پاکستان معرضِ وجود میں آیا تاہم اس کی تعمیر و ترقی کا مشکل اور کٹھن کام ابھی باقی تھا۔ قائداعظم نے شبانہ روز اس کے لئے محنت کی، وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے، گورنر جنرل کی حیثیت سے اُن کی آئینی ذمہ داریاں محدود تھیں تاہم بابائے قوم کی حیثیت سے عملاً سارے کام انہیں کو انجام دینے پڑتے تھے۔ اُن کی کمزور صحت اتنا بوجھ برداشت نہ کر سکی، وہ بیمار پڑ گئے، اُنہیں آرام کی غرض سے زیارت (بلوچستان) کے صحت افزا مقام لے جایا گیا لیکن مرض غلبہ پا چکا تھا، بالآخر ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انہوں نے اپنی جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دی، اُن کی وفات اُس نازک وقت میں ہوئی جب ہندوستان نے حیدرآباد دکن پر دھاوا بول رکھا تھا اور جب مسلمانانِ کشمیر اپنی آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے، وقتی طور پر ان کی وفات سے سارے پاکستان پر غم و الم کے سیاہ بادل چھا گئے تاہم اللہ تعالےٰ کی رضا پر شاکر و صابر پاکستانی قوم پھر نئے جوش اور عزم سے اُٹھی اور منزلِ مراد کی طرف بڑھنے لگی۔ قائداعظم رخصت ہو گئے تھے لیکن ان کے بتائے ہوئے زرّیں اصول ملتِ پاکستان کے لئے روشنی کا مینار تھے۔ قوم اپنی اصولوں کو لے کر اٹھی اور پورے اعتماد سے پھر سرگرمِ سفر ہو گئی۔

صوبہ سرحد کی حکومت اور عوام کی جانب سے میاں جعفر شاہ، وزیر تعلیم کی قیادت میں ایک نمائندہ

وفد نے قائدِ اعظم کے مزار پر حاضری دی، فاتحہ خوانی کی اور عقیدت کے پھول بارگاہِ قائد میں نچھاور کیے۔

قائدِ اعظم کی وفات پر مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو اُن کی جگہ گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ جب کہ وزارتِ عظمیٰ کا منصب بدستور خان لیاقت علی خان کے پاس رہا۔ تاہم اس کے بعد وزیرِ اعظم کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ قائدِ ملت کی ذات سب کی اُمیدوں کا مرکز بن گئی اور ہر مسئلے اور ہر معاملے میں اُن کی رہنمائی اور قیادت پر بھروسہ کیا جانے لگا۔

قراردادِ مقاصد

جہاں ملت پاکستان کو اور بہت سے مسائل درپیش تھے وہیں ایک نہایت نازک اور کٹھن مسئلہ آئین سازی کا بھی تھا، چاہیئے تو یہ تھا کہ سب سے پہلے آئین سازی ہی کی طرف توجہ دی جاتی لیکن یہ ملک چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا اور یہ دشمن ایسے تھے جنہوں نے دل سے کبھی پاکستان کو تسلیم نہ کیا تھا، انہیں یقین تھا کہ پاکستان پنپ نہ سکے گا اور ان مسائل کے بوجھ تلے دب کر رہ جائے گا لیکن بقول قائدِ اعظم یہ ملک قائم رہنے کے لئے بنا تھا اور دُنیا کی کوئی طاقت اسے ختم نہ کر سکتی تھی۔

نئی دستور ساز اسمبلی کے فرائض میں دستور سازی اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کی ذمے داریاں شامل تھیں، ابتداء میں اس کے ارکان کی تعداد ۶۹ تھی جو بعد میں ریاستوں کے نمائندے ملا کر ۷۹ ہو گئی۔ مہاجرین کی آبادکاری، قائدِ اعظم کی وفات، کشمیر کی جدوجہد آزادی کی وجہ سے ابتداء میں دستور سازی پر کما حقہٗ توجہ نہ دی جا سکی، تاہم دستور سازی کی ابتداء قراردادِ مقاصد سے ہوئی جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پیش ہوئی اور مختصر بحث کے بعد منظور کر لی گئی، قراردادِ مقاصد میں پاکستان کا دستور قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کی تیاری اور اسے دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے کا سہرا زیادہ تر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے سر ہے، انہوں نے قوم کو قرارداد مقاصد پیش کر کے سیدھے راستے پر ڈال دیا اور یہ حقیقت سب پر آشکار ہو گئی کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس خطۂ آزاد میں اسلام ہی کے زریں اصولوں پر مبنی قانون نافذ ہو گا۔ کسی دوسرے قانون کو یہاں ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

۱۹۴۷ء کی دستور ساز اسمبلی میں صوبہ سرحد کی طرف سے خان عبدالغفار خان، سردار بہادر خان اور اسد اللہ خان نے نمائندگی کی جبکہ ۱۹۵۶ء کی دستور ساز اسمبلی میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کا

شرف سردار عبدالرشید خان، میاں جعفر شاہ، محمد جلال الدین خان اور ایم۔ آر۔ کیانی کو حاصل ہوا۔

پشاور یونیورسٹی کا قیام

پاکستان بننے کے بعد سندھ اور پنجاب میں وزارتیں بنیں اور ٹوٹتی رہیں، تاہم صوبہ سرحد میں خان قیوم کی وزارت ہی برسر اقتدار رہی، لہٰذا اس وزارت کو ملکی تعمیر میں حصہ لینے کا خاصا موقع ملا۔ سرحد پہلا صوبہ تھا جہاں مڈل کے درجے تک تعلیم مفت قرار پائی۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں اور دوسری انجمنوں کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ جہاں قیام پاکستان کے وقت صوبے بھر میں ایک بھی سرکاری کالج لڑکوں یا لڑکیوں کا نہ تھا وہیں نہ صرف ہر شہر میں کالج اور سکول قائم ہوئے بلکہ پشاور یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اپنے آخری دورۂ سرحد (اپریل ۱۹۴۸ء) کے دوران اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم حضرت قائداعظم نے فرمایا تھا ــــ "میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے زیادہ اور کوئی چیز عزیز نہیں کہ صوبہ سرحد میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جہاں سے علم و تمدن کی شعاعیں نکل کر سارے وسطی ایشیا کو منور کر دیں۔" قائداعظم کی یہ آرزو پوری ہوئی اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو وزیر اعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان نے پشاور یونیورسٹی کا باقاعدہ افتتاح کیا، صوبے کے ایک دیرینہ تعلیمی خادم پروفیسر شیخ محمد تیمور اس کے وائس چانسلر اور شیخ منہاج الدین رجسٹرار مقرر ہوئے۔ ابتداء میں یونیورسٹی لا کالج ٹیچرز ٹریننگ کالج، انگریزی، ریاضی اور اکنامکس کی ایم اے کلاسز پر مشتمل تھی اور ڈاکٹر رضی الدین میر ولی اللہ، ڈاکٹر مختار احمد اور ڈاکٹر بروکس مختلف شعبوں کے سربراہ تھے لیکن اب ہزاروں ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ہوئی اس یونیورسٹی کا شمار ملک کی سب سے بڑی اقامتی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔

پریمیئر شوگر ملز مردان

قیوم خان کا دور وزارت صنعتی ترقی کے اعتبار سے بھی ایک درخشاں دور تھا، حال یہ تھا کہ باہر کے سرمایہ کار یہاں سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے اور خود یہاں کے لوگوں کا رجحان صنعت و تجارت کی طرف بالکل نہ تھا، اس دور میں نوشہرہ کا صنعتی علاقہ معرض وجود میں آیا۔ پشاور میں کپڑے کا کارخانہ لگا، تاہم صنعتی شعبے میں سب سے اہم کارنامہ مردان میں پریمیئر شوگر ملز کا قیام تھا، سارے ایشیا میں یہ شکر سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہے، پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ۱۹ دسمبر ۱۹۵۰ء کو اس کارخانے کا سنگ بنیاد رکھا۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد، عبدالقیوم خان نے کہا کہ "جب قائد اعظم یہاں تشریف لائے تھے تو انہوں نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ تعمیری سرگرمیوں میں یہ صوبہ ملک کے دوسرے صوبوں سے بازی جائے گا۔" ہم انشاء اللہ قائد اعظمؒ کی اس پیش گوئی کو درست کر کے دم لیں گے۔"

صنعتی ترقی کے ضمن میں صوبہ سرحد میں بجلی کی فراہمی عام کر دی گئی، مالاکنڈ اور دیر گئی کے بجلی گھر میں توسیع کی گئی ـــــ اور وہاں سے واہ فیکٹری، کوٹ نجیب اللہ، ہری پور اور شبقدر کو بجلی دی گئی۔ ایک ایک کر کے صوبہ سرحد کے دیہات بھی بجلی کی روشنی سے منور ہو گئے۔ پشاور میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی شاخ کام کرنے لگی جگہ جگہ نئے بنک قائم ہوئے جس سے صوبے کی معیشت کو استحکام ملا۔

اندرونی کشمکش

پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کو یہاں کی حکمران پارٹی کی حیثیت حاصل ہو گئی، چنانچہ جماعت کی تنظیم نو پر توجہ دی گئی، صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کے انتخاب عمل میں لائے جس کی رو سے حضرت بادشاہ گل کو صدر، اورنگ زیب خان اور جلال الدین خان کو نائب صدر اور محمد یوسف خان خٹک کو جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے، ۱۹۴۹ء کے اوائل میں خان محمد عباس خان کے خلاف ایک انتخابی عذر داری دائر کی گئی، ان کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ان کی جگہ ہزارہ کے موضع بھیر کے خان محمد فرید خان کو صوبائی وزیر بنایا گیا۔ قیوم خان کا مطالبہ تھا کہ مسلم لیگ سے تعاون کرو ورنہ اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو جاؤ۔

اسی سال فروری میں آل پاکستان مسلم لیگ کے انتخاب ہوئے تو خلیق الزمان خان کو مسلم لیگ کا صدر اور محمد یوسف خان خٹک کو جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔

خان عبدالقیوم خان کے بارے میں مسلم لیگ کے پرانے کارکنوں کو یہ شکایت تھی کہ وہ من مانی کرتے ہیں اور ہر معاملے میں مسلم لیگی ارکان کی رائے کو نظر انداز کرنے کے عادی ہیں، اس کے برعکس وہ کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں آنے والوں کی خصوصی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس پر جماعت کے اندر انتشار نے سر اٹھایا، پیر صاحب مانکی شریف، ارباب عبدالغفور خان، غلام محمد خان لوند خوڑ، قاضی شفیع الدین، عبدالرزاق حکمت، محمد ابراہیم جھگڑہ، عبدالقیوم خان سواتی اور کئی دوسرے ارکان عبدالقیوم خان کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے لگے، بات بڑھتے بڑھتے لیاقت علی خان وزیر اعظم

پاکستان تک پہنچی۔ انہوں نے دونوں فریقوں کو قریب تر لانے کے لئے بلوچستان کے قاضی محمد عیسیٰ بیرسٹر کو پشاور بھیجا، وہ کافی عرصہ پشاور کے ڈین ہوٹل میں مقیم رہے اور مختلف مسلم لیگی گروہوں کے اختلافات ختم کرانے کی کوششوں میں مصروف رہے، تاہم وہ بھی خان عبدالقیوم خان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ دن بدن مخالف گروہ کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں، وہ مسلم لیگی ارکان کی کافی تعداد کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو خان عبدالقیوم خان کو صوبائی مسلم لیگ کے منصب سے ہٹا دیا جائے۔

دونوں طرف سے تیاریاں مکمل ہونے کے بعد صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات کے لئے ۳ اپریل ۱۹۵۱ء کی تاریخ مقرر کی گئی، معاملے کی نزاکت کے پیشِ نظر خود خان لیاقت علی خان پشاور پہنچے، سرحد مسلم لیگ کونسل کا اجلاس انہی کی صدارت میں پشاور میں منعقد ہوا، قیوم خان کے مقابلے میں دوسرے فریق نے محمد ابراہیم خان آف جھگڑا کو کھڑا کر دیا۔ ووٹ ڈالے گئے جس میں قیوم خان کو ۶۲ اور ابراہیم خان کو ۴۸ ووٹ ملے اور اس طرح خان عبدالقیوم خان سرحد مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ اسی اجلاس میں خان جلال الدین خان آف ہزارہ کو نائب صدر، ملک الرحمٰن کیانی (کوہاٹ) کو جنرل سیکرٹری، نوابزادہ محمد علی خان آف ہوتی کو خزانچی اور یوسف شاہ خان (مردان) اور امین جان خان (پشاور) کو جائنٹ سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔

بعد ازاں ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو صوبائی مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں صوبائی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لئے ۱۰ ارکان کا انتخاب عمل میں آیا، یہ بورڈ خان عبدالقیوم خان، جلال الدین خان، ملک الرحمن کیانی، صفی اللہ خان (پشاور) ارباب نور محمد خان (پشاور) یوسف شاہ خان (مردان) سید قاموس شاہ ایڈووکیٹ کوہاٹ، خان یعقوب خان (بنوں) اور جناب غلام حسین پر مشتمل تھا۔ حیران کن پہلو یہ تھا کہ محمد یوسف خان خٹک، ابراہیم خان جھگڑہ، فدا محمد خان پشاور اور پیر مالکی شریف جیسے سرکردہ اور دیرینہ مسلم لیگی مسلم لیگ کونسل تک کے رکن منتخب نہ ہو سکے اور نہ ہی انہیں پارلیمنٹری بورڈ کی رکنیت کے اہل سمجھا گیا۔

صوبائی اسمبلی کے انتخابات

۱۹۵۱ء کے آخر میں صوبہ سرحد میں پہلی بار بالغ رائے دہندگی کی بنا پر اسمبلی کے عام انتخابات منعقد ہوئے، ووٹروں

کی تعداد ۶ لاکھ سے بڑھ کر سترہ لاکھ ہو گئی تھی اس لئے اسمبلی کے ارکان کی تعداد بھی ۵۰ سے بڑھا کر ۸۵ کر دی گئی، پہلی بار خواتین کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی گئیں۔

عام انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو صوبائی اسمبلی توڑ دی گئی، یکم مئی کو حلقہ بندیاں کرنے والی کمیٹی نے کام شروع کر دیا، ضلع پشاور کے لئے ۲۳ ہزار کے لئے ۲۱، مردان کے لئے پندرہ، کوہاٹ کے لئے آٹھ، بنوں کے لئے آٹھ، ڈیرہ کے لئے سات نشستیں رکھی گئیں جب کہ ۲ نشستیں مسلم خواتین کے لئے مخصوص کی گئیں اور ایک جنرل سیٹ قرار دی گئی۔ ۲ نومبر ۱۹۵۱ء کو ووٹروں کی فہرستیں چھپ کر تیار ہو گئیں۔

صوبائی مسلم لیگ کونسل اور پارلیمنٹری بورڈ پر چونکہ عبدالقیوم خان ہی کا تسلط تھا، اس لئے مسلم لیگ کے ٹکٹ دیتے وقت مخالف گروہ کے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا، یوسف خٹک اور ابراہیم خان جیسے پرانے مسلم لیگی ٹکٹ سے محروم کر دیئے گئے۔ ان لوگوں نے پاکستان مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ سے اس سلسلے میں رجوع کیا اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی، مرکزی بورڈ نے ان میں سے کئی مسلم لیگیوں کی اپیلیں منظور کر لیں اور انہیں صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے لئے ٹکٹ دے دیئے اس پر قیوم خان بگڑ گئے اور ان مسلم لیگی امیدواروں کے خلاف آزاد امیدوار کھڑے کر دیئے، آزاد امیدوار کامیاب ہونے پر بعد میں مسلم لیگ ہی میں شامل ہو گئے۔

ان انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ نے ۸۵ میں سے ۶۸ نشستیں اور جناح عوامی لیگ نے چار نشستیں حاصل کیں جب کہ تیرہ آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔

۱۶ دسمبر کو خان عبدالقیوم خان نے اپنی کابینہ کا اعلان کر دیا۔ کابینہ میں ان کے علاوہ میاں جعفر شاہ، خان جلال الدین، ملک الرحمٰن کیانی، سالار محمد ایوب خان مردان اور محمد عباس خان شامل تھے۔

۱۰ جنوری ۱۹۵۲ء کو نئے ممبروں نے حلف وفاداری اٹھایا، عبدالقیوم خان ہزارہ اور پشاور کی دو نشستوں سے کامیاب قرار پائے تھے، وہ ہزارہ کی نشست سے مستعفی ہوئے تو ان کی جگہ محمد داؤد خان ضمنی انتخابات میں کامیاب قرار دیئے گئے جبکہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی خالی نشست پر بعد میں سردار عبدالرشید خان منتخب ہوئے۔ ایک دلچسپ معرکہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ نوشہرہ کے

حلقے سے پیر زادہ احمد گل مانکی شریف منتخب ہوئے تھے، بعد میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا تو اُن کے بھائی پیر امین الحسنات مانکی شریف نے جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا، مسلم لیگ کو پیر صاحب کی مقبولیت کا یقین تھا تاہم ان کے مقابلے میں پیر پیائی کے کرنل میر حیدر خان کو کھڑا کر دیا گیا لیکن کرنل صاحب کامیاب ہونے نہ پائے۔

پیر صاحب مانکی شریف اب کھُلے بندوں عبدالقیوم خان کی مخالفت کرنے لگے اور انہوں نے غلام محمد خان لوند خوڑ اور دوسرے لوگوں سے مل کر جناح عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کر لی، بعد میں زکوڑی شریف کے پیر عبداللطیف اور قیوم خان کے دوسرے مخالف بھی اُن کے ساتھ مل گئے۔ قیوم حکومت نے مخالفین پر مختلف الزامات کے تحت مقدمے قائم کر دیئے اور ان میں سے کئی ایک کو جیلوں میں ڈال دیا۔

مسلمان گورنر جون ۱۹۴۹ء میں سرحد صوبائی مسلم لیگ کونسل نے ایک قرار داد منظور کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک میں کلیدی آسامیوں پر غیر ملکیوں کی بجائے پاکستانیوں کو متعین کیا جائے، اس پر ۶ر جولائی ۱۹۴۹ء کو سر امبروس ڈنڈاس کی جگہ صاحبزادہ محمد خورشید خان کو صوبہ سرحد کا پہلا مسلمان گورنر بنایا گیا، صاحبزادہ خورشید صوبے کے پہلے وزیر اعلیٰ صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بیحد شریف النفس اور قابل حاکم تھے، صاحبزادہ خورشید نے ۱۵ر جولائی سے اپنے عہدے کا حلف لے کر کام شروع کیا تاہم قدرت نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی اور وہ جنوری ۱۹۵۰ء میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان کی جگہ ۱۷ر فروری کو مشہور مسلم لیگی رہنما اسمٰعیل ابراہیم چندریگر کو صوبے کا گورنر بنایا گیا۔ چندریگر قائداعظم مرحوم کے قریبی رفیق کار تھے اور ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومتِ ہند میں بھی وزیر رہ چکے تھے۔ مسٹر چندریگر فروری ۱۹۵۰ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک صوبہ سرحد کے گورنر رہے، بعد میں انہیں افغانستان میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا تو خواجہ شہاب الدین نے ان کی جگہ لی جو نومبر ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۴ء تک گورنر صوبہ سرحد کے عہدے پر متمکن رہے، خواجہ شہاب الدین اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کے بھائی تھے اور مشرقی پاکستان کے ایک نہایت ہی معزز گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کا تبادلہ ہوا تو صوبہ سرحد ہی کے ایک فرد خان قربان علی خان نومبر ۱۹۵۴ء سے اکتوبر ۱۹۵۵ء تک صوبے کے گورنر رہے، اکتوبر ۱۹۵۵ء میں صوبوں کو مغربی پاکستان کی وحدت

میں ضم کر دیا گیا تو صوبہ سرحد میں گورنر کا عہدہ خالی رہا۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں ایک یونٹ کے خاتمے کا اعلان ہوا اور سابق صوبے بحال کر دیئے گئے تو لفٹیننٹ جنرل خواجہ محمد اظہر نے صوبہ سرحد کے گورنر کا عہدہ سنبھالا۔

راولپنڈی سازش کیس

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے کشمیر حاصل کئے بغیر پاکستان کا مؤثر دفاع مشکل ہے، تاریخی اور معاشرتی اعتبار سے بھی واضح مسلم اکثریت کا یہ علاقہ پاکستان ہی میں شامل ہونا چاہیئے تھا لیکن ہندو اور فرنگی کے گٹھ جوڑ کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا ـــــ ۱۹۴۷ء ۱۹۴۸ء میں مسلمانانِ کشمیر نے پاکستان کے قبائلی مجاہدوں اور دوسرے رضا کاروں کی مدد سے نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ وہ ڈوگرہ مہاراجہ کے تسلط سے آزاد ہونے ہی والے تھے۔ کہ سلامتی کونسل اور اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا، یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو عین اس وقت جب مجاہدینِ کشمیر کامیابی سے ہم کنار ہو رہے تھے۔ فائر بندی کا فیصلہ کر دیا گیا یہ فائر بندی ایک فریب تھی، اس کے نتیجے میں جو التوا واقع ہوا اس میں بھارت کو اپنی جنگی قوت میں اضافے کا موقع مل گیا اور وہ کشمیری باشندوں کے حقِ خود اختیاری کو نظر انداز کر کے کشمیر پر مستقلاً قابض ہو گیا ـــــ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے اکثر رہنما اور عوام فائر بندی کے حق میں نہ تھے، یہاں تک کہ افواجِ پاکستان کے کئی سرکردہ افراد بھی فائر بندی اور جہادِ کشمیر کے التوا کو مسلمانانِ کشمیر اور خود پاکستان کے حق میں نقصان دہ سمجھتے تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ پاکستان کو کشمیری مسلمانوں کو ان کا حقِ خود ارادیت دلانے کے لئے فوری اقدام کرنا چاہیئے۔ ان دردمند فوجی افسروں میں میجر جنرل محمد اکبر خان (جنہیں جنرل طارق کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) پیش پیش تھے، میجر جنرل اکبر خان عمر زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور کے ایک معزز گھرانے کے فرد ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور میں تعلیم حاصل کی، انہیں فوج میں کمیشن دے کر انگلستان میں تربیت کے لئے بھیجا گیا۔ ۳۸-۱۹۳۷ء میں انہوں نے وزیرستان کے محاذ پر نمایاں خدمات انجام دیں اور قبائلی مجاہدوں کی صلاحیتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع پایا ـــــ دوسری جنگِ عظیم کے دوران انہوں نے برما میں نمایاں کارنامے انجام دیئے چنانچہ انہیں جنگی اہلیت اور بہادری کے سلسلے میں ڈی ایس او دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت انہیں فوجوں کی تقسیم کی سب کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ اس کے

فوراً بعد وہ جنگِ کشمیر میں شریک ہوئے، ۱۹۵۰ء میں انہیں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر چیف آف سٹاف بنایا گیا۔ اس دوران وہ ہر وقت کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے متعلق فکرمند رہتے اور سوچتے کہ ان مظلوموں کو حقِ خود ارادیت دلانے میں کیا مدد دی جا سکتی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے اخباروں میں چند ایک نہایت فکر انگیز مقالے بھی تحریر کئے، ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء کو اس سلسلے میں ان کے ہاں ہم خیال فوجی افسروں اور شہری دانشوروں کی ایک میٹنگ ہوئی، جسے "پنڈی سازش کیس" کا نام دے کر پریس میں اُچھالا گیا۔ میجر جنرل اکبر خان کے اپنے الفاظ میں اس اجلاس کی روداد یہ تھی کہ۔

"کشمیر میں کارروائی شروع کرنے سے پہلے پاکستان میں ایسی حکومت لائی جائے جو ہماری کارروائی کی پشت پناہی کرے، گورنر جنرل کے لئے مجوزہ اعلان جو میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے" پنڈی سازش کیس" کے کاغذات میں اب بھی موجود ہے، اس اعلان کے چیدہ چیدہ نکات یہ تھے کہ پرانی حکومت کو برطرف کیا جائے۔ نگران سول گورنمنٹ بنائی جائے، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کے لئے تاریخ مقرر کی جائے۔ آئین بنانے کے لئے آئین ساز اسمبلی بنائی جائے، انتخابات میں غیر جانبداری قائم رکھنے کے لئے فوج کی غیر جانبدار مشینری استعمال کی جائے اور تمام جرنیلوں کی ایک ملٹری مشاورتی کونسل بنائی جائے۔"

بعد میں ۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو جب پنجاب میں انتخابات شروع ہونے والے تھے، جنرل اکبر خان اور اس میٹنگ میں شامل ہونے والے چند دوسرے افراد کی گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۵ر مئی کو دس مزید فوجی اور فضائی افسروں کو گرفتار کیا گیا، جو افراد "پنڈی سازش کیس" کے سلسلے میں گرفتار کئے گئے ان کے نام یہ ہیں۔ میجر جنرل محمد اکبر خان، بیگم نسیم اکبر خان، ایئر کموڈور جنجوعہ، بریگیڈیر صدیق، کرنل ارباب نیاز محمد خان (حال وفاقی وزیر ثقافت) کرنل ضیاء الدین، کرنل صدیق راجہ، میجر اسحٰق محمد، میجر حسن خان، میجر خواجہ محمد یوسف، کیپٹن لطف اللہ، کیپٹن خضر حیات، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا۔

۳۰ر مئی کو میجر جنرل اکبر خان اور ان کی اہلیہ کو جسٹس محمد شریف کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مقدمے

کی سماعت اٹھارہ ماہ تک جاری رہی۔ اس کی کارروائی تین ہزار صفحوں پر ریکارڈ ہوئی اور ججوں کے فیصلے ایک ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ بقول اکبر خان "ہمیں کارروائی کے نوٹ یا نقلیں لینے کی اجازت نہ تھی، نہ ہی یہ جاننے کی اجازت دی گئی کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ ٹریبونل کے ایک جج نے ٹریبونل میں شامل دوسرے ججوں کے برعکس فیصلہ دیا تھا۔"

پانچ جنوری ۱۹۵۳ء کو ٹریبونل نے اس "سازش کیس" کا فیصلہ سنایا، ملزمین میں گیارہ فوجی افسر اور چار شہری تھے، ان میں سے بیگم نسیم اکبر خان کو بری کر دیا گیا۔ جب کہ میجر جنرل اکبر خان کو بارہ سال گروپ کیپٹن جنجوعہ کو سات سال، میجر محمد صادق کو سات سال، بریگیڈیر لطیف کو پانچ سال میجر ضیاء الدین کو پانچ سال، ارباب نیاز محمد خان کو پانچ سال، لفٹیننٹ خضر حیات کو ۲ سال کیپٹن حسن خان کو چار سال، میجر اسحٰق محمد کو چار سال، لفٹننٹ ظفر اللہ کو چار سال، فیض احمد فیض کو چار سال، سجاد ظہیر کو چار سال، محمد حسین عطاء کو چار سال اور لفٹیننٹ کرنل نذیر احمد کو تا برخواست عدالت کی سزا سنائی گئی جب کہ کرنل صدیق راجہ اور میجر خواجہ یوسف سلطانی گواہ بن گئے۔

فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور جنرل اکبر خاں نے ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔

مئی ۱۹۵۴ء کے آخر میں گورنر جنرل غلام محمد نے کابینہ کو برطرف کر کے اسمبلی توڑ دی، سندھ چیف کورٹ نے گورنر جنرل کے اس حکم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اس پر ملک عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار ہو گیا۔ بہر حال فیڈرل کورٹ نے گورنر جنرل کے حکم کو بحال کیا۔ اس قانونی بحث کے دوران اُن قوانین کے متعلق بھی سوال اٹھے جو اس سے پیشتر پاس کیے گئے تھے، اپریل ۱۹۵۵ء میں لاہور ہائی کورٹ نے "اسیرانِ پنڈی سازش کیس" کی حبس بے جا کی پٹیشن منظور کرتے ہوئے اُن سب کو رہا کر دیا، ان کی رہائی کو ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ان میں سے آٹھ کو دوبارہ گرفتار گرفتار کر لیا گیا، تین ہفتے بعد جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی نے گرفتار شدگان کو ضمانت پر رہا کر دیا۔

رہائی کے چند ماہ بعد جنرل اکبر خان نے ۱۹۵۶ء میں "کشمیر کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے" کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس کی پانچ ہزار کاپیاں دُنیا کے بڑے بڑے ملکوں میں تقسیم کی گئیں۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ میں یہ پمفلٹ گرما گرم بحث کا موضوع بنا اور ہندوستان کے کئی اخباروں نے اسے شہ سرخیوں سے شائع کیا۔

میجر جنرل اکبر خان نے اس کتابچے میں واضح کیا تھا کہ اقوام متحدہ اور سیکورٹی کونسل کو بار بار اپیلیں کرنے سے مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو سکتا، حل صرف ایک ہے کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی مدد کریں تاکہ وہ اپنی آزادی کے لئے لڑ سکیں"۔

میجر جنرل اکبر خان کے خیال میں ہمارے بہت سے لیڈروں اور جنرل ایوب خان پر خواہ مخواہ کا خوف طاری تھا، اس لئے وہ کشمیر میں کوئی کارروائی کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اس کے برعکس جنرل ایوب خان کا کہنا ہے کہ "کمانڈر ان چیف بننے کے بعد پہلا غیر معمولی واقعہ "راولپنڈی سازش کیس" تھا جس کی بدولت فوج کے وقار کو زبردست دھچکا لگا۔ یہ خیال کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو ملک اور فوج کا کیا حشر ہوتا ۔۔۔؟ مجھے فوج کا وقار اور اعتماد بحال کرنے میں اَن تھک محنت کرنی پڑی۔ میں اس دن رات کی محنت سے خوش تھا کہ اس طرح خود کو کام میں مصروف رکھ کر مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ پاکستان کے سیاسی اور انتظامی حالات کتنے اندوہناک ہوتے جا رہے ہیں ۔۔۔ دوسرا غیر معمولی واقعہ لیاقت علی خان کی شہادت کا تھا۔ ان کے بعد ملک میں جو سیاسی انتشار ہوا اس کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں فوج کی تعمیر میں ذرا بھی غفلت نہیں کرنی چاہیئے چنانچہ میں نے مختلف مراحل میں فوجی تنظیم میں انقلابی اصلاحات کیں اور پاکستانی فوج بہت تھوڑی مدت میں ترقی کے کئی مدارج طے کر گئی"۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پنڈی سازش کیس میں ملوث تمام ملزموں کو بری کر دیا گیا۔ جنرل اکبر خان کو ۱۹۷۱ء میں داخلی سلامتی کا وزیر مملکت مقرر کیا گیا اور وہ کچھ عرصہ تک بیرونی ملکوں میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ اُن کا اب بھی یہی خیال ہے کہ پاکستان کو پچاس لاکھ تربیت یافتہ قبائلی جوانوں کی ضرورت ہے خواہ ان کے پاس معمولی ہتھیار ہی کیوں نہ ہوں" ان جوانوں کے ہوتے ہوئے مسئلہ کشمیر کا فوری حل نکل سکتا ہے"۔ "پنڈی سازش کیس" کے متعلق ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء کو بہاولپور بار روم میں وکلاء سے خطاب کرتے ہوئے ایک ملزم میجر اسحٰق محمد (سربراہ کسان مزدور پارٹی) نے کہا تھا کہ

"اس کیس کے سرغنہ سابق میجر جنرل اکبر خان بتائے جاتے تھے۔ حکومت نے "پنڈی سازش کیس" کے نام سے جو کیس تیار کیا تھا اس میں ذرہ بھر صداقت نہ تھی، بات صرف یہ تھی کہ اس وقت کے انگریز کمانڈر اِن چیف، پاکستان آرمی، جنرل گریسی نے جب کشمیر میں جنگ بندی کا حکم دیا تو اس

وقت پاکستان کی افواج پیش قدمی کر رہی تھیں، سابق میجر جنرل اکبر خان نے اعلیٰ فوجی افسروں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں اس فیصلے کے خلاف ردِ عمل کا اظہار مقصود تھا تاکہ حکومت اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے، فوجی افسروں نے اتفاق نہ کیا، حکومت کو اس کا علم ہو گیا، حکومت نے ان فوجی افسروں کو ترقی دے دی اور میجر جنرل اکبر خان کو چیف آف سٹاف بنا دیا، اس حیثیت سے انہوں نے اپنے گھر میں ایک اجلاس طلب کیا اس میں مسئلہ کشمیر زیرِ بحث آیا لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی اور حکومت کو اس کا علم ہو گیا۔ میں اس اجلاس میں شریک نہ تھا، اُن دنوں پنجاب میں انتخابات ہو رہے تھے، انتخابات سے ایک روز قبل گرفتاریوں اور تحقیقات کا آغاز ہوا، مجھے اس کیس میں گواہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ میرے احتجاج پر حکومت نے مجھے بھی سازش میں ملوث کر دیا، بعد میں آنے والی حکومتوں نے اس کیس میں ملوث تمام فوجی افسروں کو اعلیٰ عہدے دیئے مجھے بھی دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ پر ایک عہدہ کی پیش کش کی گئی۔ لیکن میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[1]"

ہو سکتا ہے حکومت نے اس سیدھے سادے فوجی افسروں کے اجلاس کو "سیاسی" رنگ دینے کی کوشش میں کمیونسٹ لیڈروں سجاد ظہیر، محمد حسین عطاء اور مشہور شاعر فیض احمد فیض کو بھی اس "سازش" میں شریک کر لیا ہو، ورنہ فوجی افسروں کی میٹنگ میں ان کی شرکت کا کیا سوال اور کیا امکان تھا، فیض کا یہ شعر شاید اسی "حقیقت" کی طرف اشارہ ہے کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اپریل ۱۹۵۳ء میں صوبہ سرحد میں پشتو شاعر اجمل خٹک اور ہمیش گل خلیل کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا، ان پر سرکاری راز افشار کرنے کا الزام تھا۔ مقدمہ چلایا گیا۔ بالآخر اجمل خٹک کو تو رہا کر دیا گیا البتہ ہمیش خلیل کو قید اور جرمانہ کی سزا سنا دی گئی۔

جون ۱۹۵۴ء میں سرحد عوامی لیگ کے رہنما ارباب عبدالغفور خان کو فرانٹیر ریگولیشن کے تحت گرفتار کیا گیا اور غلام محمد خان لوند خوڑ، عبدالرزاق حکمت اور دوسرے کئی سیاسی کارکنوں

---

[1] "نوائے وقت" یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح جمعیت العلماء کے ایک رہنما مولانا عبدالقیوم پوپل زئی کو بھی ایک سال قید کی سزا دی گئی۔ اس کے برعکس ۱۹۵۳ء کے آخر میں خان عبدالولی خان اور خان عبدالغفار خان کو قید سے رہا کر دیا گیا۔

لیاقت نہرو معاہدہ

معاہدہ کشمیر نے شروع ہی سے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں اور عوام کے مابین تلخی پیدا کر دی، ہندوستان نے پاکستان کو دیا جانے والا فوجی سامان روک لیا، اسی طرح ریزرو بنک آف انڈیا سے پاکستان کو دی جانے والی رقم دینے میں بھی پس و پیش شروع کر دی، نہری پانی اور متروکہ جائیدادوں کی تقسیم میں بھی ہندوستان کی جانب سے زیادتیاں عمل میں آئیں، ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور دوسری دہشت پسند تنظیموں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ سارے بھارت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں، جگہ جگہ سے مسلم کش فسادات کی خبریں آنے لگیں اور ہزاروں مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیل دیا گیا، اُدھر بھارتی لیڈروں نے پاکستان کو آنکھیں دکھانی شروع کر دیں اور پاکستان کی سرحدوں پر اپنی فوجیں پہنچا دیں، اگر اس موقع پر وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت صبر و تحمل اور تدبر کا ثبوت نہ دیتی تو صورتِ حال اور بھی سنگین ہو جاتی — اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے قائدِ ملت لیاقت علی خان خود دہلی گئے اور طویل مذاکرات کے بعد پنڈت نہرو سے ایک معاہدہ کیا جسے لیاقت نہرو پیکٹ یا "اقلیتوں کا معاہدہ" کہا جاتا ہے، معاہدے کی رُو سے دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے تحفظ کے لئے الگ وزارتیں قائم کرنے اور اقلیتی فرقوں کے افراد کی حفاظت قبول کرنے کا عہد کیا۔

لیاقت علی خان کی شہادت

پاکستان کی سیاست ان دنوں نوابزادہ لیاقت علی خان کی شخصیت کے گرد گھوم رہی تھی، انہوں نے ہر شعبے میں پاکستان کو آگے بڑھانے کے لئے دن رات محنت کی، وہ امریکہ بھی گئے، اُن کا یہ دورہ بڑا کامیاب رہا، اُن کا ارادہ رُوس اور دوسرے ملکوں سے بھی اچھے تعلقات قائم کرنا تھا لیکن وقت نے انہیں مہلت نہ دی اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو انہیں راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام میں شہید کر دیا گیا، قاتل سید اکبر ایک افغان باشندہ تھا جو ایبٹ آباد میں سکونت پذیر تھا، سی آئی ڈی کو اس کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا خدا جانے وہ کس طرح راولپنڈی پہنچا اور پھر کس طرح جلسہ گاہ میں سٹیج کے اتنا قریب پہنچنے میں کامیاب

ہوگیا کہ کسی نے اسے روکا تک نہ اور نہ اس پر کسی شک کا اظہار کیا۔ واردات کے فوراً بعد سید اکبر کو اسی وقت ایک پولیس والے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اس طرح قتل کی وجوہ پردہ اخفا ہی میں رہیں، بعد میں اس پولیس والے کو جو سب انسپکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر اپنے آبائی شہر گجرات میں ایک ٹیکسٹائل فیکٹری تعمیر کرا رہا تھا کسی نامعلوم شخص نے سوتے میں قتل کر دیا۔

لیاقت علی خان کے سانحۂ قتل کی تحقیقات کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ آج تک مختلف لوگ اس واقعہ کی مختلف وجوہ بیان کرتے ہیں تاہم صورتِ حال سامنے نہیں آسکی۔ چونکہ قاتل کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اس لئے صوبہ سرحد کے عوام میں اس سانحہ کے متعلق خصوصی تجسس پایا جاتا تھا ـــــ ایک مسلم لیگی رہنما پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ اس قتل کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ[1] :-

"کمیٹی باغ (موجودہ لیاقت باغ) میں مسلم لیگ کے تحت چار بجے سہ پہر کو جلسہ ہونے والا تھا، سٹیج خاصی اونچی تھی، اس پر بیش قیمت قالین پڑے ہوئے تھے اور سٹیج پر صرف ایک کرسی تھی، ٹھیک چار بجے لیاقت علی خان جلسہ گاہ میں تشریف لائے فضا نعروں سے گونج اٹھی، مسلم لیگی کارکنوں نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں ہار پہنائے۔ وزیر اعظم کے ساتھ سٹیج پر صرف نواب صدیق علی خان بیٹھے تھے۔ تلاوت قرآن پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ شیخ مسعود صادق صدر بلدیہ راولپنڈی نے شہریوں کی جانب سے وزیر اعظم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ شیخ محمد عمر صدر شہری مسلم لیگ نے ان کی تشریف آوری پر وزیر اعظم کا شکریہ ادا کیا اور ان سے تقریر کرنے کی درخواست کی۔ قائد ملت تقریر کے لئے مائیکروفون پر آئے۔ ابھی ان کی زبان سے "برادرانِ ملت!" کے الفاظ ہی نکلے تھے کہ اچانک یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ لیاقت علی خان تیورا کر گرے، نواب صدیق علی خان، پروفیسر عنایت اللہ اور دوسرے رضا کاروں نے انہیں اٹھایا گولیاں دل اور معدہ کے درمیانی حصے پر لگی تھیں، وزیر امور کشمیر نے انہیں کار میں ڈالا اور فوجی ہسپتال کے آپریشن روم میں پہنچا دیا، ایک ڈاکٹر نے وزیر اعظم کے بازو پر انجکشن لگایا۔ کرنل میاں معالج تھے۔ صرف نواب صدیق علی خان اور وزیر امور کشمیر اس کمرے کے اندر تھے۔

---

[1] روزنامہ "شہباز" پشاور، ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء

سات بجے شام ریڈیو پاکستان سے وفات کی خبر نشر ہوئی تو سارے مُلک میں ماتم بپا ہو گیا۔ لیاقت علی خان نوابی چھوڑ کر قومی خدمت کے میدان میں اترے تھے، اپنا سب کچھ انہوں نے ملک و ملّت پر قربان کر دیا تھا اب اپنی عزیز جان بھی ملّت کی راہ میں نچھاور کر دی۔

بتایا جاتا ہے کہ جلسہ گاہ میں کسی نے افواہ اُڑا دی کہ وزیر اعظم کا قاتل کوئی خاکسار ہے اس پر مُلک بھر میں خاکساروں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ ان کی خانہ تلاشیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن بعد میں صحیح صورتِ حال سامنے آئی تو خاکساروں کی جان بچی اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔

قائدِ ملّت لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان مقرر ہوئے اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء تک اس منصب پر فائز رہے جب کہ وزیر مالیات ملک غلام محمد کو خواجہ ناظم الدین کی جگہ ملک کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین انتہائی نکیل اور نرم مزاج انسان تھے، اُن کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر سرکاری ملازمین سیاست میں دخل دینے لگے، اُدھر ہندوستانی حکومت پھر شیر ہو گئی۔ اس نے پاکستان کی نہروں کا پانی بند کر دیا۔ جس سے غلّے کی قلّت پیدا ہو گئی اور عوام کو مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اُدھر صوبائی وزراء اعلیٰ اپنی اپنی جگہ مطلق العنان بن گئے اور من مانی کرنے لگے، سندھ میں ایوب کھوڑو اور پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ نے کئی معاملوں میں مرکزی حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔

جاگیروں کی ضبطی

تاہم صوبہ سرحد میں حالات خوشگوار رہے، خان عبدالقیوم خان کو چھ سال تک کام کرنے کا موقع ملا تو بہت سی انقلابی اصلاحات عمل میں آئیں ۱۹۵۰ء میں مزارعین کا قانون نافذ ہوا —— معمولی رقم کی ادائیگی پر موروثی مزارعین اسی اراضی کے مالک بن گئے۔ جہاں کے زیرِ کاشت چلی آ رہی تھی، اس قانون کے تحت لاکھوں مزارعین کو مالکانہ حقوق مل گئے، اسی طرح یکم جنوری ۱۹۲۰ء سے پہلے کی رہن شدہ زمینیں بھی اصل مالکوں کو واگذار کر دی گئیں۔ ۱۹۵۲ء میں جاگیریں منسوخ کر دی گئیں، امب اور پھلڑہ کی ریاستیں ضلع ہزارہ میں ضم کر دی گئیں۔ ۱۹۵۲ء کے آخر میں پولیس کے تین پلاٹون اسی۔ پی ہزارہ میاں بشیر احمد کی قیادت میں ہری پور سے ریاست امب میں داخل ہوئی، ایک اور پلاٹون مانسہرہ سے ٹھاکر میرہ کے راستے آئی۔ ریاست کے سیکرٹری نے پولیس کی جمعیت کا خیر مقدم کیا اور اسے رئیسِ خانہ

کے ایک حصّہ میں ٹھہرایا۔ ایک مجسٹریٹ جان محمد خان کو شیر گڑھ میں متعین کر دیا گیا اور ۱۶ سپاہیوں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر پر مشتمل نفری کو مستقلاً شیر گڑھ کے تھانہ میں متعین کر دیا گیا۔ ریاست کے نواب سر محمد فرید خان نے گورنر سرحد سے ملاقات کی اور نئے سمجھوتے پر دستخط کئے۔ امب اور پھلڑہ تنولی قوم کے خوانین کی ملکیت تھیں، سکھوں کے دورِ حکومت میں نواب پائندہ خان نے اُن کی بنیاد رکھی تھی، ریاستوں میں نواب جرگہ سسٹم کے ذریعے مقدمات فیصل کرتے یا شرعی معاملات میں قاضی حضرات سے رجوع کیا جاتا، جاگیرداری نظام ختم کر دیا گیا تو ان علاقوں میں وہی قوانین نافذ کر دیئے گئے جو ملک کے دوسرے علاقوں میں مروج تھے۔

بعد میں کوہستان ہزارہ کا کئی سو مربع میل قبائلی علاقہ بھی ضلع ہزارہ میں مدغم کر دیا گیا اور بٹگرام میں نیا سب ڈویژن بنا دیا گیا، اسی طرح مردان کے شمال میں گدون کے قبائلی علاقے کو بھی ضلع مردان میں شامل کر دیا گیا ہے، اس اقدام سے ان پسماندہ علاقوں کے لوگوں پر ترقی کے نئے دروازے کھل گئے۔ انہیں آگے بڑھنے کے مواقع ملے اور وہ دوسرے سرحدی علاقوں کے لوگوں کے شانہ بشانہ شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھنے لگے۔

سرحدی ریاستیں

سرحدی ریاستوں سوات، دیر اور چترال کی تعمیر و ترقی کے لئے بھی اس دور میں پوری کوشش کی گئی۔ ۱۲ دسمبر ۴۹ء کو ریاست سوات میں ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ وزیر اعظم پاکستان سید وشریف آئے اور انہوں نے میجر جنرل میاں گل عبدالحق جہان زیب کی رسم تخت نشینی ادا کی، اُن کے والد اور ریاست کے بانی میاں گل عبدالودود بادشاہ ضعیف العمری کی وجہ سے حکومت کے کاروبار سے سبکدوش ہو گئے، نئے حکمران اسلامیہ کالج پشاور کے تعلیم یافتہ روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے ریاست میں سکولوں، شفاخانوں اور سڑکوں کا جال بچھا دیا اور ہر اعتبار سے سوات کو صوبے کی سب سے ترقی یافتہ اور متمدن ریاست بنا دیا۔

۱۹۵۳ء میں ریاست چترال میں بھی اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا۔ چترال کا عبوری ایکٹ ۱۹۵۳ء وہاں نافذ کر دیا گیا جس کے تحت ایک کونسل مقرر کر دی گئی، ایک مشیر خاص یا وزیر کا تعین کیا گیا جس کا کام ریاست کے حکمران کو مشورہ دینا تھا۔ مسٹر عزت بخش ایڈیشنل پولیٹیکل ایجنٹ چترال

اس منصب پر فائز ہونے والے پہلے شخص تھے، عوام سے بیگار لینے کا فرسودہ طریق ختم کر دیا گیا پولیس متعین کی گئی کہ نظم و نسق برقرار رہے، پولیس کا انتظام مشیر خاص یا وزیر کے ہاتھ میں تھا جبکہ مہتر چترال کو اپنا باڈی گارڈ دستہ رکھنے کا مجاز قرار دیا گیا۔

چترال صوبہ سرحد کی انتہائی شمالی ریاست تھی، محل وقوع کے اعتبار سے اسے بڑی اہمیت تھی کہ یہاں روس، چین، افغانستان اور پاکستان کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں چترال کے مہتر شجاع الملک تھے، وہ پشاور آئے اور دہلی میں وائسرائے لارڈ لنگڈن سے بھی ملے، ۱۳ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اُن کا انتقال ہوا تو سر محمد ناصر الملک نے اُن کی جگہ لی، انہوں نے سرحدوں کی حفاظت میں خاص دلچسپی لی اور ریاست میں جدید طرز کی اصلاحات نافذ کیں، ۱۹۴۱ء میں انہیں کے۔ سی آئی ای کا خطاب بھی ملا۔ وہ ۲۹ر جولائی ۱۹۴۳ء کو فوت ہوئے تو عنان اقتدار ہز ہائی نس مظفر الملک کے ہاتھ آئی، وہ بیمار پڑے تو اُن کے فرزند شہزادہ سیف الرحمٰن کو، جو اُن دنوں اسلامیہ کالج پشاور میں طالب علم تھے، ولی عہد تسلیم کر لیا گیا، مہتر مظفر الملک نے پاکستان کی پوری حمایت کی، نومبر ۱۹۴۷ء کو ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دیا، پاکستان فنڈ میں چالیس ہزار روپیہ دیا اور جہادِ کشمیر میں چترالی رضا کار بھی بھیجے، شہزادہ سیف الرحمٰن اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۹۴۹ء میں تخت نشین ہوئے ان کے عہد میں انتظامی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو وہ لواری ٹاپ کے قریب ہوائی جہاز کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تو اُن کے بیٹے ہز ہائی نس سیف الملوک ناصر کی رسمِ تاجپوشی ادا کی گئی۔ اس وقت اس شہزادے کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ جنرل محمد یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں چترال اور دوسری سرحدی ریاستوں کو ختم کر دیا گیا تو چترال کو مالاکنڈ ڈویژن کے ایک ضلع کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہاں ڈپٹی کمشنر کا تقرر عمل میں آیا اور پاکستانی قوانین پر عمل درآمد ہونے لگا۔

صوبہ سرحد کی تیسری ریاست دیر تھی، جہاں کے لوگ بڑے بہادر اور زیرک تھے، لیکن وہاں کے حکمران زمانے کے تقاضوں سے بالکل بے خبر تھے، یہی وجہ ہے کہ تعلیمی اور اقتصادی میدان میں دیر کی ریاست کوئی خاص مقام حاصل کر سکی، ایوب خان کے دورِ حکومت میں نواب دیر شاہ جہان خان کو معزول کر کے اس کے فرزند شہزادہ خسرو کو حکمران بنا دیا گیا اور ایک مشاورتی کونسل

بھی مقرر کردی گئی ۔ ۱۹۷۰ء کے آغاز میں دیر کو مالاکنڈ ڈویژن میں ضم کرکے اسے ضلع کا درجہ دے دیا گیا ۔ وہاں کالج ، سکول اور ہسپتال قائم کئے گئے اور پاکستان کے قوانین نافذ کر دیئے گئے ۔

انقلابی اقدام عبدالقیوم خان کا دور اس لئے بھی بڑا اہم ہے کہ اس میں بہت سے انقلابی اقدام ہوئے ۔ قیوم وزارت کے پہلے ہی سال میں شراب کی بندش کردی گئی ۔ روڈ ٹرانسپورٹ کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا ۔ اس سے نہ صرف عوام کو سفر کی سہولتیں حاصل ہوئیں بلکہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا ، یہ آمدن صوبے کے فلاح و بہبود پر خرچ ہونے لگی ، پشاور اور راولپنڈی اور پشاور اور ایبٹ آباد کے مابین صرف سرکاری بسیں چلنے لگیں ، جون ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ روڈ ٹرانسپورٹ بورڈ قائم کر دیا گیا ، جس نے ہر جگہ بس سٹینڈ بنائے اور مقررہ اوقات پر گاڑیاں چلانے کا اہتمام کیا ۔ صوبہ سرحد میں آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ روڈ ٹرانسپورٹ ہی ہے ۔ سرکاری انتظام کے تحت ہر راستے پر سرکاری بسیں چلنے لگیں ۔ آج گورنمنٹ ٹرانسپورٹ صوبہ سرحد کے بیڑے میں ہزاروں بسیں شامل ہیں ۔

یکم فروری ۱۹۵۲ء سے مڈل تک سارے صوبے میں تعلیم مفت قرار دے دی گئی ، تعلیمی ترقی کے سلسلے میں یہ اولیت صوبہ سرحد ہی کے حصے میں آئی ۔ ۱۹۵۰ء سے پشاور میں یونیورسٹی قائم کردی گئی تھی ، اس میں مزید شعبے کھلے ۔ خیبر میڈیکل کالج کا قیام عمل میں آیا ۔ ہر اہم مقام پر گورنمنٹ کالج قائم ہوئے ۔ پشاور میں لڑکیوں کے لئے فرنٹیئر کالج فار ومن قائم ہوا ۔ چند ہی سالوں میں صوبے میں تعلیمی اداروں کی تعداد دگنی ہو گئی اور غریب سے غریب لوگوں کے بچوں پر بھی تعلیمی ترقی کا دروازہ کھل گیا ۔

۱۹۵۴ء میں ایک قانون کے تحت صوبہ سرحد کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے ، اسلامیہ کالج پشاور کا انتظامی کنٹرول گورنمنٹ نے سنبھال لیا ، اسلامیہ کالج کی وقف جائیداد کے بارے میں بھی قانون بنا ، اسی طرح اس کالج میں اسلامیات کی خصوصی تعلیم کے لئے بھی انتظامات کئے گئے ۔

اس دوران ہری پور ہزارہ میں ٹیلیفون بنانے کی فیکٹری ، پشاور میں نشاط ٹیکسٹائل ملز ، نوشہرہ میں کالونی سرحد ٹیکسٹائل ملز ، بنوں میں وولن ملز اور مردان اور تخت بھائی میں شکر سازی کے کارخانوں نے بھی کام شروع کر دیا ۔ اسی طرح پن بجلی کی پیداوار بڑھی ، درگئی اور مالاکنڈ کے

بجلی گھروں میں توسیع کی گئی، بنوں میں کرم گڑھی سکیم پایۂ تکمیل کو پہنچی، جس سے اس علاقے کو بجلی اور آبپاشی کی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر کھل گئے اور پشاور میں مخطوطات اور دستاویزات کی حفاظت کے لئے سنٹرل ریکارڈ آفس بھی قائم ہوا۔

سرحدی قبائل

دیکھا جائے تو آزادیٔ وطن کا سب سے بڑا فائدہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائل کو پہنچا۔ انگریز نے اپنے سو سالہ دورِ حکومت میں سرحد کے مجاہد قبائلیوں کو ہمیشہ اپنا حریف سمجھا اور متواتر اور مسلسل اُن کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی رہی، وزیرستان جیسے چھوٹے سے علاقے پر پچاس پچاس ہزار برطانوی مسلح فوجیوں نے یلغار کی، مہمندوں کے خلاف بیسیوں بڑے حملے کئے گئے، کروڑوں روپیہ قبائلی جنگوں کی نذر ہوگیا۔ اس کے باوجود انگریز ان علاقوں پر قبضہ کرسکا نہ ان علاقوں کے لوگوں کو رام کرسکا۔ سارے فرنگی دور میں قبائلی علاقوں کی اقتصادی ناکہ بندی کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع سے آخر تک محاذ آرائی کی کیفیت رہی۔ لیکن بے سروسامان قبائلی مجاہد مسلسل مصروفِ جہاد رہے، فرنگی لشکر، توپ خانے اور ہوائی جہازوں کی مدد سے کسی قبائلی علاقے پر حملہ کرتا تو قبائلی اپنے بال بچے اور مویشی لے کر دشوار گزار اونچے پہاڑی سلسلوں کی غاروں کو چلے جاتے، جونہی برطانوی سرکار کی جانب سے فوجی کارروائی ختم ہوتی، یہ لوگ پہاڑی ٹھکانوں سے اُتر کر اپنے گھروں میں آبستے۔ ان شاہین صفت مجاہدوں کی قوتِ مدافعت پر دُنیا عش عش کر اٹھی، گوریلا جنگ میں جو مہارت سرحدی قبائلیوں نے دکھائی شاید ہی دُنیا کے کسی اور مقام کے لوگوں نے دکھائی ہو۔

جو مسئلہ فرنگی حکومت سو سال میں حل نہ کرسکی قائداعظم محمد علی جناح کے حسنِ تدبر نے منٹوں میں طے کردیا، اپنے پہلے ہی سرحدی دورے میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم نے حکم دیا کہ ساری فوجیں قبائلی علاقوں سے واپس بُلالی جائیں۔ اُن کے اس اعتماد آفریں اقدام نے قبائلی مجاہدوں کے دل موہ لئے، وہی رقم جو فوجی مہموں اور گولہ بارود پر خرچ ہوتی تھی، اب قبائلِ سرحد کی تعلیمی، معاشی اور معاشرتی ترقی و بہبود پر خرچ ہونے لگی۔ قبائلی آزادی سے پاکستانی علاقوں میں کاروبار کرنے لگے۔ اُن کے بچوں کو وظائف دیئے گئے، اُن کے لئے سکولوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا گیا جہاں انہیں مفت تعلیم کی سہولتیں حاصل ہوگئیں۔ انہیں ملازمتوں

میں خصوصی مراعات دی گئیں۔

جہاں حکومت پاکستان نے قبائل سرحد پر اتنا اعتماد کیا وہیں قبائلی لوگوں نے بھی اس اسلامی مملکت کے ساتھ مکمل تعاون کیا، ریفرینڈم میں صوبہ سرحد کے لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان کو دل و جان سے چاہتے ہیں، اس کے فوراً بعد جگہ جگہ قبائلی جرگے منعقد ہوئے جنہوں نے پاکستان میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کی۔ سرحدی ریاستوں دیر، سوات اور چترال نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں فیصلہ دیا اور چترال میں ہندوکش کی چوٹیوں سے لے کر مکران کے ساحل سمندر تک ہر جگہ پاکستان کا پرچم لہرانے لگا۔

قبائلی علاقوں میں یہ مسرت آمیز انقلاب ایسا عدیم النظیر واقعہ تھا کہ خود انگریز مدبر ششدر رہ گئے۔ صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کنگھم نے قبائل سرحد کی پاکستان دوستی کے بارے میں لکھا کہ

"۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد کے ہر بڑے قبیلے کے جرگے نے (جس میں بسا اوقات دو دو ہزار افراد شریک ہوتے تھے) مجھے (گورنر سرحد کو) اس بات کا یقین دلایا اور ساتھ ہی تحریری معاہدوں سے بھی اس کی تصدیق کی کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں"

مشہور اہل قلم آرنلڈ سوئن نے اپنی کتاب "نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" میں پاکستان کے بعد سرحدی قبائل کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ

"سارے سرحدی قبائل میں یہ تبدیلی فکر و نظر حیران کن اور غیر متوقع ہے۔ قبائلی علاقے میں سینکڑوں میل نئی سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں، گھوڑوں اور خچروں کے قافلوں کی جگہ ہر اہم مقام تک بس سروس کا انتظام ہے، دریائے کابل پر دارسک کے مقام پر بند باندھ کر نہریں نکالی گئی ہیں، جنوبی وزیرستان، تیراہ خیبر ایجنسی، چترال، سوات اور علاقہ ہمند سے قیمتی پتھر، ابرق، سلفر اور دوسری معدنیات برآمد ہو رہی ہیں، آبپاشی کی سکیموں کی بدولت بنجر زمینیں لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو چکی ہیں، نوجوان قبائلیوں کی کثیر تعداد پڑھ لکھ کر مہذب زندگی گزار رہی ہے، تجارت اور کاروبار کی بدولت سارے قبائلی علاقہ میں روپے پیسے کی ریل پیل ہے"۔

عالمی شہرت کے مؤرخ ٹائن بی نے ان علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد لکھا کہ

"اگرچہ فوجی چوکیاں، قلعے اور کیمپ اب بھی موجود ہیں تاہم نہ تو اب قبائل کی خانہ جنگی دیکھنے میں آتی ہے نہ ہی سرکاری چھاؤنیوں پر چھاپے مارے جاتے ہیں نہ ہی کوئی بداعتمادی دیکھنے میں آتی ہے"

اور تو اور برطانیہ کی حکمران ملکہ الزبتھ پاکستان کے دورے پر آئیں تو انہوں نے درہ خیبر بھی دیکھا وہ برطانیہ کی پہلی حکمران تھیں جنہوں نے قبائلی علاقہ کی سرزمین پر قدم رکھا، برطانوی دورِ حکومت میں کسی حکمران کی یہ جرأت نہ تھی کہ قبائلی علاقے میں داخل ہوتا۔

تاہم سرحدی قبائل کی پاکستان دوستی اور ہر جہتی ترقی اگر کسی کی نظروں میں خار بن کر کھٹکی تو وہ افغانستان تھا، افغانستان نے شروع ہی سے معاندانہ رویہ اختیار کئے رکھا، جب اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کا معاملہ پیش ہوا تو دنیا بھر کی قوموں نے اس کی تائید کی لیکن افغانستان ہی وہ واحد ملک تھا جس نے اس امر کی مخالفت کی، بعد میں افغانستان کی "چچا شاہی" نے "پختونستان" کا راگ الاپنا چاہا حالانکہ برطانیہ کے دولت مشترکہ کے معاملات کے وزیر نوئل بیکر اور وزیر اعظم سر انتھونی ایڈن نے افغانستان کو دوٹوک جواب دیا کہ ڈیورینڈ لائن افغانستان اور پاکستان کے مابین مسلمہ بین الاقوامی سرحد ہے اور اسے تسلیم نہ کرنا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

خان عبدالقیوم خان کی حکومت نے اس سلسلے میں بھی بیداری کا ثبوت دیا اور قبائلی علاقوں میں بھیجے گئے افغان ایجنٹوں کی ریشہ دوانیوں کو خاک میں ملا دیا، شورش پسندوں کو سختی سے کچل دیا گیا، ایک بار مغلگی کے مقام پر بمباری ہوئی جس کا الزام افغانستان نے پاکستان پر لگایا، حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں سردار عبدالرب نشتر کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی وفد کابل بھیجا، دونوں ملکوں کے نمائندوں نے بالاتفاق پاکستان کو ہوائی بمباری کے واقع سے بری الذمہ قرار دیا ـــ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے بعد افغانستان کی تسلی ہو جاتی لیکن کابلی پروپیگنڈے کی مہم تیز تر ہو گئی۔ بالآخر شہنشاہ ایلان نے ثالثی کے فرائض انجام دیئے اور کچھ دیر تک دونوں ملکوں کے تعلقات میں خوشگواری آگئی ـــ افغانستان کے مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف جمہوریت پسندوں کی جدوجہد جاری رہی، جب جمہوریت پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو ان میں سے کئی ایک افغانستان سے ترکِ وطن کر کے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، اسی طرح افغانستان کے کئی علماء کرام نے بھی افغانستان کو چھوڑ کر پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک

حکومتِ پاکستان نے اپنی مصلحتوں کی بناء پر خان عبدالقیوم خان کو مرکزی وزیر بنا دیا اور اُن کی جگہ سردار عبدالرشید خان کو صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ نامزد کیا، سردار عبدالرشید خان نے، جو انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے، ۲۳ر اپریل ۱۹۵۳ء کو اپنا منصب سنبھالا، انہوں نے آتے ہی تمام سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا حکم دے دیا، جس سے اُن کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔

سردار عبدالرشید کی کابینہ جلال الدین خان، ایم۔ آر۔ کیانی، میاں جعفر شاہ، سالار محمد ایوب خان اور مسٹر شمس الحق پر مشتمل تھی، بعد میں مسٹر شمس الحق مستعفی ہو گئے تو اُن کی جگہ ہزارہ کے محمد فشر خان کو وزارت میں شامل کر لیا گیا۔

۲۴ر اگست ۱۹۵۳ء کو صوبہ سرحد کے وزیر مہاجرین و بحالیات جلال الدین خان سے اس بناء پر استعفیٰ لکھوا لیا گیا کہ ان کے خلاف بدانتظامی اور کنبہ پروری کے الزامات تھے، تحقیقات کا کام مرکزی سپیشل پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔

اس وقت تک یہ روایت بن چکی تھی کہ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ بھی صوبائی وزیرِ اعلیٰ ہی کے پاس ہوتا تھا، عبدالقیوم خان جب تک صوبے کے وزیر اعلیٰ رہے کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن مرکز میں وزارت قبول کرنے کے بعد جب پشاور آئے تو مخالفین نے اُن کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کیا۔ وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئے اور اکتوبر ۱۹۵۳ء کو انہوں نے صوبائی مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کے مستعفی ہونے کے بعد صوبائی مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو سردار عبدالرشید خان صوبہ مسلم لیگ کے صدر بھی بن گئے۔

سردار عبدالرشید کے دورِ وزارت میں صوبے میں تعمیری سرگرمیاں جاری رہیں۔ پشاور یونیورسٹی

میں نئے شعبے قائم ہوئے، نئی عمارات تکمیل کو پہنچیں اور یونیورسٹی کے پاس ہی ایک نیا اور خوبصورت شہر یونیورسٹی ٹاؤن بھی آباد کیا گیا۔ صوبے بھر میں تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ سرحدی ریاستوں کے لئے عبوری آئین منظور کیا گیا جس کی رُو سے ہر ریاست میں مشاورتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ مردان اور چارسدہ کے مابین ریلوے لائن پر کام شروع ہوا۔

۴ جون ۱۹۵۳ء کو وزارتِ دفاع کے سیکرٹری کرنل سکندر مرزا (بعد میں صدر پاکستان) کا بیٹا پائلٹ آفیسر انور مرزا پشاور میں ایک لڑاکا جہاز اُڑانے کی مشق کرتا ہوا حادثے کا شکار ہو کر فوت ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۵۳ء کو عبدالقیوم خان نے پشاور یونیورسٹی کی چانسلرشپ سے بھی سبکدوشی حاصل کر لی تو اُن کی جگہ سردار عبدالرشید نئے چانسلر مقرر ہو گئے۔

انہی دنوں مردان میں ہونے والے ایک ضمنی انتخاب میں بڑی گرما گرمی ہوئی۔ فریقین میں تصادم ہو گیا جس کے نتیجہ میں پانچ افراد زخمی ہو گئے۔ اس پر خان غلام محمد خان لوند خوڑ کو گرفتار کر لیا گیا، بعد میں انہیں سات سال قید کی سزا سنائی گئی۔

لاہور کے فرقہ وارانہ فسادات

خواجہ ناظم الدین ایک نیک دل اور نرم مزاج انسان تھے، اُن کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران نوکر شاہی کو اُبھرنے کا موقع ملا اور اصل اختیارات گورنر جنرل کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ۱۹۵۲ء کے اوائل میں وہ مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے تو طلباء نے اُن کے خلاف مظاہرے کئے۔ بنگالی طلباء کا خواجہ ناظم الدین سے یہ مطالبہ تھا کہ بنگالی کو ملک کی سرکاری زبان بنایا جائے۔ اس سے قبل قائداعظم محمد علی جناح اعلان کر چکے تھے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی۔ خواجہ صاحب قائداعظم کے فیصلے پر قائم رہے جس پر ڈھاکہ میں زبردست گڑبڑ ہوئی۔ طلباء نے جلوس نکالے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا، جس پر پولیس نے گولی چلا دی، کئی طلباء مارے گئے، بالآخر حکومت ملک کی سرکاری زبان کے مسئلے پر دوبارہ غور کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اور مئی ۱۹۵۴ء میں اُردو اور بنگالی دونوں کو ملک کی سرکاری زبانیں تسلیم کر لیا گیا۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں لاہور میں اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک واقعہ ہوا۔ قادیانیوں یا

احمدیوں کے خلاف فسادات شروع ہو گئے ، مسئلے کی نوعیت مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی ۔ بتایا جاتا ہے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ نے یہ مہم خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم کو بدنام کرنے کے لئے شروع کی تھی ، اسی طرح مجلس احرار اور اس طرح کی دوسری جماعتیں اس مسئلے کی آڑ میں عوام میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتی تھیں ۔ ماہ مارچ کے شروع ہی میں لاہور ، سیالکوٹ ، گوجرانوالہ اور دوسرے مقامات پر "احمدیوں" کے خلاف منظم فسادات شروع ہو گئے اور یہ مطالبہ زور پکڑ گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے ۔ بڑے بڑے جلوس نکلے ، املاک بیس نذر آتش کر دی گئیں ۔ لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بارہ مرتبہ گولی چلنے پر بھی تحریک کی شدت برقرار رہی ، پولیس کی کارروائی سے ۳۵ افراد جان بحق ہوئے ۔ ۱۲۳ زخمی ہو گئے ۔ جلوس اب کے یہ مطالبہ کرتا کہ "احمدیوں" کو اقلیت قرار دیا جائے ورنہ مرکزی حکومت استعفیٰ دے دے ، شروع شروع میں تو خواجہ ناظم الدین چپ سادھے رہے لیکن بالآخر جاگے اور سخت کارروائی کرنے کا حکم دے دیا ۔ لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور میجر جنرل اعظم خان کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا ، اعظم خان نے ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ بدامنی پھیلانے سے باز رہیں ، اس اپیل کا کچھ اثر ہوا ۔ چند بازار اور کاروباری ادارے کھل گئے لیکن چند ہی دن بعد مارشل لاء کے باوجود جلوس نکلنے لگے ، فوجیوں کو مظاہرین پر گولی چلانی پڑی جس سے گیارہ شہری مارے گئے اور دو فوجی بھی ہلاک ہوئے ۔ اعظم خان نے تحریک کے چیدہ چیدہ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا ۔ انہیں جیلوں میں بھیج دیا گیا ، ۲ لیڈروں کو موت کی سزا تک سنائی گئی (جو بعد میں معاف کر دی گئی) ۔ اس پر صورت حال معمول پر آ گئی ـــــ خواجہ ناظم الدین خود لاہور پہنچے انہوں نے ممتاز دولتانہ کی وزارت کو برخاست کر دیا اور اس کی جگہ ملک فیروز خان نون کو وزیر اعلیٰ پنجاب بنا دیا ۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پنجاب کی چوتھی کابینہ تھی ، بعد میں حکومت نے جسٹس محمد منیر کی سربراہی میں واقعہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی ـــــ لاہور کے ان واقعات کا ردِ عمل پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے شہروں میں بھی دیکھنے میں آیا تاہم حالات پر جلد قابو پا لیا گیا ۔

اگرچہ خواجہ ناظم الدین حالات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے تھے ۔ تاہم ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء

کو گورنر جنرل غلام محمد نے اعلان کر دیا کہ "چونکہ خواجہ صاحب کی حکومت ملکی مسائل سے نپٹنے میں قطعی ناکام رہی ہے اس لئے اسے ختم کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ ان کی وزارت کی جگہ ایسی کابینہ قائم کی جائے گی جو اپنی ذمہ داریاں بہتر طریق سے نبھا سکے"۔

محمد علی بوگرہ کی وزارت

اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد وزارتِ عظمیٰ کے لئے قرعۂ فال محمد علی بوگرہ کے نام نکلا۔ یہ صاحب مشرقی پاکستان کے ایک گمنام سے سیاستدان تھے، بعد میں برما، کینیڈا اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے تھے، واشنگٹن سے وہ سیدھے کراچی پہنچے اور گورنر جنرل کی ایماء پہ ملک کے وزیراعظم بن گئے، ان کی کابینہ کے ارکان بھی گورنر جنرل غلام محمد کی پسند کے رکھے گئے، سابقہ کابینہ سے سردار عبدالرب نشتر، فضل الرحمن (بنگال) اور پیرزادہ عبدالستار جیسے آزمودہ کاروں کو نکال باہر کیا گیا اور اپنی پسند کے افراد کو وزیر بنا دیا گیا۔

پاکستان کا اوّلین مسئلہ آئین کی تیاری کا تھا۔ محمد علی بوگرہ نے اس کی طرف توجہ دی اور نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک مصالحتی فارمولا تیار کر کے دستور ساز اسمبلی میں پیش کر دیا۔ اس فارمولا کے مطابق مرکزی مجلس قانون ساز دو ایوانی قرار پائی۔ ایوانِ بالا بچاس ارکان پہ مشتمل تھا اور اس میں سب صوبوں کو برابر کی نمائندگی حاصل تھی، ایوانِ زیریں میں صوبوں کی نمائندگی تھی۔ اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی۔ صدرِ مملکت کا انتخاب پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مشترکہ اجلاس میں کرتے۔ اسی طرح وزیراعظم بھی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے جوابدہ ہوتا، یہ بھی تجویز تھی کہ صدر ملک کے ایک بازو کا ہو تو وزیراعظم دوسرے بازو کا — اس سے قبل علماء کا ایک بورڈ قوانین پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر تھا، اب یہ کام سپریم کورٹ کو سونپ دیا گیا۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں مجلس دستور ساز نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ پاکستان کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ ہوں گی تاہم بیس سال تک انگریزی زبان کی حیثیت سے موجود رہے گی۔

اب تک دستور ساز اسمبلی اُنہی اراکین پہ مشتمل تھی۔ جنہیں قیام پاکستان کے وقت منتخب کیا گیا تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ نئے انتخابات منعقد ہوں، مغربی پاکستان کے صوبوں میں ۱۹۵۱ء کے آخر میں انتخابات ہوئے۔ جن میں مسلم لیگ کو اکثریت حاصل رہی۔ تاہم جب ۱۹۵۴ء کے اوائل میں

مشرقی پاکستان کے انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو وہ بیحد حیران کن تھے۔ مسلم لیگ کو سارے صوبے میں دس نشستیں ملیں جب کہ اس کی مخالف جماعتوں کو جو "جگتو فرنٹ" یا متحدہ محاذ کے نام سے انتخاب میں اتری تھیں۔ ۲۲۳ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی، مولوی فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور اُن کے ساتھی پھر سے منظرِ عام پر آئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ چونکہ اب سابقہ دستور ساز اسمبلی کی قانونی حیثیت برقرار نہیں رہی، اس میں شامل مشرقی پاکستان کے اراکین میں اکثر لوگ منتخب نہیں ہو سکے، لہٰذا اُن کی نمائندگی ختم کر کے نئے منتخب شدہ ارکان کو دستور ساز اسمبلی میں کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

اُدھر گورنر جنرل غلام محمد بھی ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے "پروڈا" (PUBLIC AND REPRESENTATIVE OFFICES DISQUALIFICATION ACT - 1949) کے تحت بہت سے سیاستدانوں کو سیاست میں حصّہ لینے سے روک دیا۔

یہ دیکھ کر کہ گورنر جنرل غلام محمد نے تمام اختیارات خود سنبھال رکھے ہیں اور وہ اپنی من مانی کرتے رہے، محمد علی بوگرہ نے ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو "پروڈا" کو منسوخ کر دیا، اس طرح گورنر جنرل کے اختیارات کم ہو گئے، اگلے روز محمد علی بوگرہ نے ایک اور مسودہ اسمبلی میں پیش کر دیا، جس کی رُو سے گورنر جنرل کو کابینہ توڑنے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ گورنر جنرل ان دنوں صوبہ سرحد کے دورے پر آئے ہوئے تھے اُن کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو بوگرہ نے یہ قانون منظور کرا کے سرکاری گزٹ میں چھپوا بھی دیا۔ اس کارروائی کے بعد مجلس دستور ساز نے رسمی طور پر محمد علی بوگرہ کے فارمولے کو اپنانے کی منظوری بھی دے دی اور مجلس دستور ساز کا اجلاس ۲۷ اکتوبر تک ملتوی کر دیا۔

عین اس وقت جب اسمبلی دستور سازی کا کام ختم کر چکی تھی اور نیا مسوّدہ آئین ۲۷ اکتوبر کو ارکان کے ہاتھوں میں پہنچنے والا تھا، ۲۴ اکتوبر کو گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے برطرف کر دیا اور اعلان کیا کہ یہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ مولوی تمیز الدین خان نے جو اُس وقت دستور ساز اسمبلی کے سپیکر تھے۔ گورنر جنرل کے حکم کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں دعویٰ دائر کر دیا۔ عدالت نے فیصلہ اُن کے حق میں دے دیا۔ لیکن بعد میں فیڈرل کورٹ

نے گورنر جنرل کے حکم ہی کو برقرار رکھا۔

گورنر جنرل کی دعوت پر محمد علی بوگرہ نے نئی وزارت تشکیل دی جس میں سکندر مرزا، سہروردی اور کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کو بھی شامل کر لیا گیا۔

سازشیں اور خفیہ ہاتھ

دستور سازی کے کام میں مسلسل رکاوٹوں اور آئے دن کی سازشوں نے پاکستان کی ترقی اور استحکام کو بہت پیچھے ڈال دیا۔ ان سازشوں کا تانا بانا کچھ ایسے پُراسرار طریق پر تیار ہوتا تھا کہ خود سربراہِ مملکت تک کو خبر ہونے نہ پاتی تھی۔ ملک کے ایک سابق وزیر اور معروف دانش ور پیر علی محمد راشدی ان سازشوں اور کارستانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل کی سازش ایک دن کے اندر پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے والی بات نہ تھی، یہ سازش مختلف افراد کے مابین ایک عرصہ سے زیرِ بحث رہی ہوگی اس کو کامیاب بنانے کے لئے کئی امور کو ایک پروگرام کی صورت میں مربوط کرنا پڑا ہوگا۔ جس کے لئے کافی وقت لگا ہوگا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ سید اکبر (قاتل) کا پس منظر کسی کو معلوم نہیں تھا یہ شخص پہلے سے ان اداروں (انٹیلی جنس، سی، آئی، اے، الیف، آئی، اے) کے زیرِ نگرانی رہا اندرونِ ملک گھومتا پھرا، بہت سے لوگوں سے ملتا رہا۔ پشاور سے کراچی آیا۔ یہاں کے ہوٹل میں ٹھہرا پھر پشاور، ایبٹ آباد اور راولپنڈی کے چکر کاٹتا رہا۔ سارا وقت وہ ایک کافی وزنی ریوالور، بغیر لائسنس کے اپنے ساتھ لئے پھرا۔ پھر اس کو یہ پیشگی اطلاع بھی مل گئی کہ فلاں دن، فلاں وقت اور فلاں جگہ لیاقت علی خان راولپنڈی آکر ایک جلسے سے خطاب کریں گے، اس وقوعہ کے چند روز قبل یہ مسلح قاتل بھاری ریوالور لئے سرحد سے چل کر راولپنڈی پہنچتا ہے اور کسی ہوٹل میں رہنے لگتا ہے — بالآخر وہ میٹنگ والے دن ہوٹل سے چل کر جلسہ گاہ میں پہنچتا ہے اور جلسہ میں بالکل آگے کی صف میں وزیر اعظم مرحوم کے سامنے بیٹھ جاتا ہے — اور اس کے بالکل قریب وہ شخص بھی بیٹھ جاتا ہے جسے اسی لحظہ یعنی کام پورا ہو جانے کے فوراً بعد، خود قاتل کو قتل کر دینا تھا — یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا، اگر کسی کی آنکھ نہ کھلی اور کسی کو شبہ نہ ہوا تو ہماری خبر رساں ایجنسیوں کو، جن کا فرض تھا کہ وہ پرائم منسٹر کی حفاظت کریں جو خود ان محکموں کا ہیڈ بھی تھا۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس سازش کا تعلق تین صوبوں سے رہا۔ لیاقت علی خان کراچی سے چلے،

قاتل سید اکبر سرحد سے روانہ ہوا اور واردات پنجاب میں ہوئی، اگر سازش کے ان تین مراکز کے مابین بے زبان (مفاہمت) کا کوئی رشتہ نہ ہوتا تو قتل کا یہ پروگرام اس طرح سیٹ نہیں ہو سکتا تھا، بالفاظ دیگر یہ سازش تین صوبوں پر محیط رہی لیکن کہیں سے اس کا سراغ نہ ملا"۔

راشدی پرانی اور بھولی بسری باتیں (قسط ۱۹) میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

"خواجہ ناظم الدین کے خلاف مہینوں سازش ہوتی رہی ـــــ محمد علی بوگرہ (اُن کے جانشین) سے امریکہ میں رابطہ قائم کیا گیا۔ لیکن وزیر اعظم ناظم الدین کو خبر تک نہ ہوئی پھر انہیں ڈسمس کر دیا گیا تو انہوں نے ٹیلی فون اٹھا کر ملکہ برطانیہ سے شکایت کرنی چاہی کہ ان کا مقرر کردہ گورنر جنرل غیر آئینی قدم اٹھا رہا ہے (اس وقت تک پاکستان برطانوی دولت مشترکہ میں شامل تھا اور یہاں کے گورنر جنرل کی تقرری ملکہ الزبتھ کرتی تھی) تو معلوم ہوا کہ وزیر اعظم پاکستان کے گھر کی ٹیلی فون کی لائنیں کٹی پڑی تھیں"۔

محمد علی بوگرہ کے بارے میں بھی راشدی صاحب نے کچھ اسی طرح کا انکشاف کیا ہے:۔

"بوگرہ مرحوم اسمبلی سے گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرا دینے کے بعد بحالت بے خبری بڑے اطمینان کے ساتھ امریکہ کے دورے پر روانہ ہو جاتے ہیں ـــــ اور جب واپس آتے ہیں تو گورنر جنرل کے دو چوبدار لندن ہی سے ان کے ساتھ لگے آتے ہیں۔ وہ ایئرپورٹ سے سیدھا اُن کو گورنر جنرل کے یہاں لے جاتے ہیں، جہاں چوہدری محمد علی بھی بروقت پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ گالی گلوچ ہوتی ہے، پستول لہرائے جاتے ہیں، پاکستان کے پرائم منسٹر (بوگرہ) کی کھال کھینچی جاتی ہے اور ان کی جان بخشی تب جا کر ہوتی ہے، جب وہ پارلیمنٹ کو توڑنے، مرکزی کابینہ کو از سر نو بنانے اور صوبائی وزارتوں کو برطرف کرنے کے اعلان پر دستخط نہیں کر دیتے"۔

یہ محلاتی سازشیں بعد میں بھی ہوتی رہیں اور یہ خفیہ ہاتھ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ اپنی کارستانی دکھاتا رہا۔ اور ملک کی آئینی اور سیاسی پیش رفت میں رکاوٹ پڑتی رہی۔

وحدتِ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ نے مولوی فضل الحق کی قیادت میں وزارت تشکیل دی تو "صوبائیت" اور "علیحدگی پسندی" کے خطرات نے سر اُٹھایا۔ فضل حق کلکتہ گئے اور وہاں پاکستان کے خلاف منافرت انگیز تقریریں کیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نرائن گنج کے پٹ سن کے کارخانے میں غیر بنگالی کاری گروں اور محنت کشوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا جس میں ایک ہزار کے لگ بھگ لوگ مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ کارخانے کو سخت نقصان پہنچا، اس پر مرکزی حکومت نے فضل حق وزارت کو برخاست کر دیا۔ صوبے میں گورنر راج قائم کر دیا گیا اور میجر جنرل سکندر مرزا کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

مرکزی حکومت کے اس اقدام کے بعد ملک میں کچھ امن و امان قائم ہوا تو از سرِ نو آئین سازی کی طرف توجہ دی گئی، ملک کی جغرافیائی حالت یہ تھی کہ ایک طرف مشرقی پاکستان کا صوبہ تھا، جہاں ملک کی آبادی کی اکثریت تھی، لسانی اور تمدنی طور پر ان لوگوں میں یکسانیت اور وحدت پائی جاتی تھی، دوسری طرف مغربی پاکستان تھا جس میں مختلف صوبے، ریاستیں اور قبائلی علاقے تھے، جہاں کے لوگ مختلف زبانیں بولتے اور مختلف نسلی گروہوں میں منقسم تھے۔ ملک کے ان دونوں بازوؤں کو متحد رکھنا ناگزیر تھا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ کسی ایک صوبے یا کسی ایک علاقے کے لوگوں کے حقوق پر کوئی زد نہ پڑے۔ چنانچہ اس پر اتفاقِ رائے ہوا کہ مغربی بازو میں تمام صوبوں اور علاقوں کو ایک ہی وحدت میں ضم کر دیا جائے، چنانچہ اُنہی بنیادوں پر دستور سازی پر کام شروع کیا گیا۔

وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کے بنیادی مقاصد یہ تھے :-

۱۔ آئینی، قانونی اور انتظامی اعتبار سے مشرقی اور مغربی پاکستان کو یکساں سطح پر لانا تاکہ ملک کے دونوں بازوؤں میں کامل مساوات قائم ہو۔

۲۔ مغربی پاکستان میں پنجاب کے علاوہ باقی علاقے کم ترقی یافتہ اور پسماندہ تھے، مثلاً بلوچستان کے پاس آمدنی کے وسائل بہت کم تھے، چاروں صوبوں کی آمدن یکجا کر کے ان علاقوں کو ترقی دینا نسبتاً آسان تھا۔

۳۔ مغربی پاکستان میں چار قسم کے علاقے تھے، صوبے، ریاستیں، قبائلی علاقے، مرکز کے

زیرِ انتظام علاقے ۔ ان سب علاقوں میں مختلف قسم کے قوانین رائج تھے ۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام سے سارے علاقوں کے قوانین میں یکسانیت پیدا ہو سکتی تھی ۔

۲۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کو وزیرِ اعظم پاکستان نے اپنی نشری تقریر میں وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کے منصوبے کا اعلان کیا ۔ سب سے پہلے جس صوبے کی اسمبلی نے ون یونٹ کے قیام کی حمایت کی ، وہ صوبہ سرحد ہی تھا ۔

۲۴ر نومبر ۱۹۵۴ء کو وزیرِ اعلیٰ صوبہ سرحد سردار عبدالرشید خان نے وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کے حق میں قرارداد پیش کی ، جس کی تائید میاں جعفر شاہ اور دوسرے وزرائے صوبہ سرحد نے کی ۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ

" صوبہ سرحد کی قانون ساز اسمبلی کے نزدیک وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام نے مُلک کو انتشار سے بچا کر ایک روشن مستقبل کی راہ پر ڈال دیا ہے ۔ عوامی نمائندوں کے مابین ایک عزت مندانہ دوستانہ سمجھوتے سے آئینی مشکلات کا حل آسان ہو گیا ہے ، اس ایوان کی رائے میں ملک کے مغربی بازو کے تمام صوبوں ، ریاستوں اور قبائلی علاقوں کی وحدت ہی پاکستان کی ترقی و استحکام کی ضامن ہے ، اس لئے ہم ، اراکین صوبہ سرحد لیجسلیٹو اسمبلی ، وزیرِ اعظم پاکستان کی ۲۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کی نشری تقریر کی پُر زور حمایت کرتے ہوئے وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کا دلی خیر مقدم کرتے اور اس کی پُر جوش حمایت کرتے ہیں ۔"

۱۱ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو سندھ اسمبلی نے اور اسی ماہ پنجاب اسمبلی نے بھی قیامِ وحدتِ مغربی پاکستان کی حمایت میں قراردادیں منظور کیں ۔ بلوچستان کے شاہی جرگے اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کے جرگوں اور ریاستوں کی مشاورتی کونسلوں نے بھی قیامِ وحدتِ مغربی پاکستان کی تجویز کو سراہا ، اس طرح یہ نازک مرحلہ بخیر و خوبی طے پا گیا ۔

مؤرخ سٹیفنز نے یونٹ کے قیام کو پاکستان کے داخلی استحکام کے سلسلے میں سب سے اہم اقدام قرار دیا ہے ۔

خود مغربی پاکستان کے پہلے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی نشری تقریر میں اعلان کیا کہ

" پاکستان کے استحکام کے سلسلہ میں سب سے بڑی کوشش اور سب سے اہم قدم مغربی پاکستان

کا اتحاد اور وحدت ہے، اس کوشش کو کامیاب بنانا ہمارا فرض ہے، اس کوشش کی کامیابی ہی سے قومی وحدت پیدا ہوگی اور پاکستان مضبوط بنے گا۔"

ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی اسی تقریر میں یہ بھی کہا کہ "ہم کبھی کبھی دبے لہجے میں بے اطمینانی کی آواز بھی سنتے ہیں۔ بے اطمینانی کا اظہار کرنے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو علاقائی مفاد کی حمایت کر کے فائدہ اٹھا رہے تھے اور انہیں ایک یونٹ میں اپنے ذاتی مفاد اور موقع پرستی کی موت نظر آ رہی ہے۔ بعض وہ لوگ ہیں جو شک اور شبہ میں مبتلا ہیں اور ڈرتے ہیں کہ ہمارے زیادہ ترقی یافتہ بھائی ہم پر چھا نہ جائیں۔ میں اُن سب کو یقین دلاتا ہوں کہ مغربی پاکستان کی حکومت ان کے حقوق اور اُن کے فلاح و بہبود پر خاص توجہ دے گی۔ ان کو تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے دوسرے لوگوں کی سطح پر لانے کے لئے مؤثر قدم اٹھائے گی — حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے اتحاد اور وحدت سے خاص فائدہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے لوگوں کو پہنچے گا اور یہ لوگ مغربی پاکستان کے تمام وسائل میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔"

۱۴ جنوری ۱۹۵۵ء کو پاکستان مسلم لیگ نے بھی وحدتِ مغربی پاکستان کی حمایت کر دی، خواجہ شہاب الدین گورنر صوبہ سرحد کو نومبر ۱۹۵۴ء میں افغانستان میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا تھا، اُن کی جگہ خان قربان علی خان سابق انسپکٹر جنرل پولیس کو صوبے کا گورنر بنایا گیا۔ ۸ جولائی ۱۹۵۵ء کو گورنر سرحد نے سردار عبدالرشید کی وزارت برطرف کر دی اور سردار بہادر خان کو کابینہ بنانے کی دعوت دی، سردار بہادر خان کی کابینہ میں اُن کے علاوہ ایم۔ آر کیانی، محمد فرید خان، سالار محمد ایوب خان، اور ارباب نور محمد شامل تھے، سالار اسلم خان کو صوبے کا چیف پارلیمنٹری سیکرٹری مقرر کیا گیا — یہ وزارت اور خان قربان علی خان کی گورنری ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء تک قائم رہی۔ یونٹ بن جانے پر صوبہ سرحد وحدتِ مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔ دارالحکومت لاہور تبدیل ہو گیا، سرحدی ریاستوں کے انتظامی امور پشاور کے ڈویژنل کمشنر انجام دینے لگے۔

دوسری دستور ساز اسمبلی

صوبائی انتخابات کے بعد ضرورت تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے لئے بھی انتخاب عمل میں آئے۔ چنانچہ گورنر جنرل نے ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء کو نئے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا، یہ انتخابات صوبائی اسمبلیوں کے

ذریعے کرائے گئے ، نئی دستور ساز اسمبلی اسّی ارکان پر مشتمل تھی ، ان میں سے چالیس نشستیں مشرقی پاکستان کو دی گئیں ۔ باقی چالیس میں سے پنجاب کو ۲۱ ، سندھ کو ۵ ، صوبہ سرحد کو ۴ ، بہاولپور کو ۲ ، بلوچستان کو ایک ، بلوچستانی ریاستوں کو ایک ، خیرپور کو ایک ، سرحدی ریاستوں کو ایک ، کراچی کو ایک اور قبائلی علاقے کو تین نشستیں دی گئیں ۔ صوبہ سرحد سے سردار عبدالرشید جلال الدین خان ، ملک الرحمٰن کیانی اور میاں جعفر شاہ اور سرحدی ریاستوں سے میاں گل ، عبدالحق ، جہاں زیب ، دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ۔

ان انتخابات میں مشرقی پاکستان سے مسلم لیگ کے صرف ایک ہی نمائندے منتخب ہو سکے اور وہ تھے محمد علی بوگرہ ۔ تاہم مغربی پاکستان سے مسلم لیگ کو کافی نشستیں مل گئیں ۔ اگرچہ مجموعی طور پر مسلم لیگ کو نئی دستور ساز اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی تاہم دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں اس کے ارکان کی تعداد پھر بھی زیادہ تھی ۔ مسلم لیگ کو ۲۵ ، متحدہ محاذ کو ۱۶ ، عوامی لیگ کو ۱۲ نشستیں ملیں ۔ جب کہ باقی ارکان آزاد تھے ۔ اب کے مسلم لیگی ارکان نے وزیر مالیات چوہدری محمد علی کو اپنا پارٹی لیڈر منتخب کر لیا اور انہوں نے مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کے تعاون سے مرکز میں مخلوط وزارت بنالی ، اُدھر اپنی علالت کی وجہ سے گورنر جنرل غلام محمد چھٹی پر چلے گئے تھے اور اُن کی جگہ میجر جنرل سکندر مرزا نے لے رکھی تھی ۔

اس وقت تک مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کی اسمبلیاں وحدتِ مغربی پاکستان کے حق میں قرار دادیں منظور کر چکی تھیں ، اب ۳ ، اکتوبر ۱۹۵۵ء کو مرکزی اسمبلی میں بھی وحدت مغربی پاکستان کا مسودہ منظور ہو گیا اور ۱۴ ، اکتوبر سے اس قانون کو نافذ کر دیا گیا ، چار مختلف گورنروں وزارتوں اور اسمبلیوں کی بجائے حکومت کی صرف ایک تنظیم قائم ہو گئی جس سے نہ صرف اخراجات میں کمی ہوئی بلکہ ہمارے ملک کے اس حصہ کی سیاسی ۔ دفاعی ، جغرافیائی اور معاشی اقدار کے تقاضوں کے مطابق ایک انتظامی وحدت بھی قائم ہو گئی ، وحدتِ مغربی پاکستان کے پہلے گورنر نواب مشتاق احمد گورمانی تھے اور وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب ۔

اُدھر گورنر جنرل غلام محمد کی شدید علالت کے پیشِ نظر سکندر مرزا ، ۶ ، اکتوبر ۱۹۵۵ء سے پاکستان کے مستقل گورنر جنرل بن گئے ۔ پہلے تو وہ پس پردہ رہ کر کام کرتے تھے ، اب اعلانیہ

سیاست میں حصّہ لینے لگے اور گروہی جوڑ توڑ میں مصروف نظر آنے لگے۔ بتایا جاتا ہے کہ ون یونٹ کے قیام کے وقت سکندر مرزا نے ممتاز دولتانہ سے اس امر کا وعدہ لیا تھا کہ وہ ڈاکٹر خان صاحب کی مدد کریں گے اور وحدتِ مغربی پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے لیکن بعد میں ممتاز دولتانہ پر مسلم لیگ کا دباؤ اتنا بڑھا کہ وہ اپنے پرانے سیاسی حریف ڈاکٹر خان صاحب کی اعلانیہ حمایت کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر خان صاحب اور سکندر مرزا نے مل کر ایک نئی سیاسی جماعت ری پبلکن پارٹی بنالی، ان دونوں حضرات کے دباؤ کے تحت صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ارکان اپنی جماعت کو چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہونے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ۳۶ ارکان میں سے صرف دس ارکان ثابت قدم رہے اور ۲۶ ری پبلکن پارٹی سے جا ملے۔ مغربی پاکستان میں بھی عہدوں اور وزارتوں کے لالچ میں لوگ جماعتی وفاداریاں تبدیل کرنے لگے۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کے آخری دنوں میں یہ عالم ہو گیا کہ پشاور کے محمد اشرف خان، پشت خرہ کے اسلم خان اور گنتی کے چند ارکانِ اسمبلی کے علاوہ باقی سب ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور وزیر، نائب وزیر یا پارلیمنٹری سیکرٹری بنا دیئے گئے جس سے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

سنہ ۱۹۵۶ء کا آئین

چوہدری محمد علی ایک مخلص اور مدبر انسان تھے، انہوں نے دستور سازی پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ اس سلسلے میں دن رات محنت کی اور اعلان کر دیا کہ وہ فروری ۱۹۵۶ء تک ملک کو ایک قابلِ عمل دستور دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۹ جنوری ۱۹۵۶ء کو دستور کا مسوّدہ تیار کر کے مجلس دستور ساز میں پیش کر دیا گیا اور ۲۹ فروری تک اسمبلی نے اسے حتمی طور پر منظور کر لیا۔ ۲ مارچ کو گورنر جنرل نے اس پر دستخط کر دیئے اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو اسے رسمی طور پر نافذ کر دیا گیا، یہ دن پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل تھا، اسے "یومِ جمہوریہ اسلامیہ" کا نام دیا گیا۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد سکندر مرزا ملک کے پہلے صدر اور چوہدری محمد علی وزیر اعظم قرار پائے۔ اس دستور کے تحت پارلیمانی نظام اختیار کیا گیا، ملک کا آئینی سربراہ صدرِ مملکت تھا مگر

اصل معاملہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کا تھا، کابینہ کے ارکان کے لئے ضروری تھا کہ وہ قومی اسمبلی کے ارکان ہوں، نیز کابینہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھی۔ دستور میں اس امر کی پوری ضمانت دی گئی تھی کہ کوئی بھی قانون قرآن اور سنت کے منشار کے خلاف نہ ہوگا، نیز آئین میں حاکمیت الٰہیہ کا اقرار کیا گیا تھا۔ دستور کی نوعیت وفاقی تھی، وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے بعد ملک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے دو صوبوں پر مشتمل تھا۔ دونوں صوبوں کی حیثیت ہر لحاظ سے یکساں تھی۔ مرکزی مقننہ ایک ایوانی اور ۳۰۰ ارکان پر مشتمل تھی (حالانکہ دنیا کے کسی اور وفاق میں مرکزی مقننہ یک ایوانی نہیں) دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی حاصل تھی۔ ملک کے لئے بنگالی اور اردو دونوں سرکاری زبانیں تسلیم کی گئی تھیں، البتہ انگریزی کو ۲۵ سال تک برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

ایک یونٹ کی مخالفت

یونٹ کے قیام سے اگرچہ ملک کے چاروں صوبے ایک اکائی کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی ایک صوبے کی علیحدگی پسندی کا امکان باقی نہ تھا تاہم آئے دن کی سیاسی چپقلش اور وزارتوں کے لئے جوڑ توڑ کی کوشش نے بے یقینی کی فضا پیدا کر دی، وحدت مغربی پاکستان کے قیام سے جو فوائد مرتب ہونے چاہیئے تھے۔ مرتب نہ ہو سکے، اسی طرح انتظامی اخراجات میں جو کمی آنی چاہیئے تھی نہ آ سکی بلکہ اخراجات اور بھی بڑھ گئے ـــــ اس بدانتظامی اور افراتفری سے چھوٹے صوبوں کی سیاسی جماعتوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے عوام کی تکالیف کو اچھالا ـــــ حقوق کی محرومی کا رونا رویا اور صوبوں کے عوام کو پاکستان کی حکومت کے خلاف اکسایا۔ جس سے عوام کے ذہن میں ون یونٹ کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہوتے گئے۔

حزب اختلاف کی چھ پارٹیوں کے اشتراک سے نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد ۱۹۵۰ء ہی میں پڑ چکی تھی۔ اس میں صوبہ سرحد کی خدائی خدمت گار جماعت، پنجاب کی آزاد پاکستان پارٹی، جی ایم سید کا سندھ محاذ، حیدر بخش جتوئی کی سندھ ہاری کمیٹی، عبدالصمد اچکزئی کی دو ر پختون بلوچستان اور شہزادہ عبدالکریم آف قلات اور بزنجو کی گلیتمان گل بلوچستان شامل تھیں، تاہم اس جماعت کو پنپنے کا موقع یونٹ کے قیام کے بعد ہی ہاتھ آیا۔ ادھر مشرقی پاکستان کے بائیں بازو

سے تعلق رکھنے والے عناصر نے بھی ۱۹۵۷ء میں نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے ڈھاکہ میں ایک جماعت تشکیل کر لی جس میں مولانا بھاشانی، محمود الحق عثمانی اور محمود الحق سلہٹی وغیرہ پیش پیش تھے، صوبہ سرحد کے وہ رہنما جو مسلم لیگ سے کسی نہ کسی بات پر ناراض تھے۔ وہ بھی ون یونٹ کی مخالفت میں نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ ان لوگوں میں پیر صاحب مانکی شریف، ارباب عبدالغفور خان، خان ثمین جان خان، ارباب سکندر خان اور ماسٹر خان گل خٹک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُدھر ڈاکٹر خان صاحب ون یونٹ کے سربراہ اور کرتا دھرتا ہونے کی وجہ سے جنرل سکندر مرزا کے دستِ راست بنے ہوئے تھے اِدھر خان عبدالغفار خان دن رات جلسے کر کے یونٹ توڑنے کا مطالبہ کر رہے تھے، بالآخر قانون حرکت میں آیا، خان عبدالغفار خان کو ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء کو گرفتار کر لیا گیا اور اُن کے داخلہ بلوچستان پر پابندی لگا دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد خان عبدالغفار خان کی نظر بندی ختم ہوئی تو انہوں نے نئے انتخابات کرانے کا مطالبہ بھی شروع کر دیا۔ مغربی پاکستان کی اسمبلی میں بھی ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں وحدت مغربی پاکستان کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ رسم بن گئی کہ جو شخص حکومت سے خفا ہوتا یا جسے اپنی بات منوانی ہوتی وہ وحدتِ مغربی پاکستان کی مخالفت شروع کر دیتا۔ یہاں تک کہ آخر میں حسین شہید سہروردی (جن کے مشوروں سے یونٹ بنا تھا) تک اعلانیہ یونٹ کے مخالف ہو گئے۔ ۷ نومبر ۱۹۵۷ء کو سہروردی نے پشاور میں ایک جلسۂ عام کیا، ہزاروں افراد نے جلسے میں ایک یونٹ کے خلاف مظاہرہ کیا، جلسے میں ہنگامہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک سو سے زیادہ افراد زخمی ہو گئے۔

افغانستان کا رویّہ

اسلامیانِ ہند کی جدوجہدِ آزادی کے نتیجے میں پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت قائم ہوئی تو دُنیا بھر کے مسلمان ملکوں نے اظہارِ مسرت کیا، تاہم اگر کوئی ملک پاکستان کے قیام پر خوش نہ ہوا تو وہ افغانستان تھا جس نے "پختونستان" کا فرضی سٹنٹ کھڑا کر کے اس نئی مملکت کو پریشان کرنا شروع کر دیا، جس وقت پاکستان کشمیر کا مسئلہ اٹھاتا افغانستان مفاد پرست عناصر کی شہ پر پختونستان کا نعرہ لگانے لگتا پاکستان نے اس برادر اسلامی ملک کے سامنے بارہا اپنا موقف پیش کیا کہ پاکستان کسی ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس لئے افغان حکومت بھی ہمارے اندرونی معاملات

میں دخل نہ دے تاہم افغانستان کے مطلق العنان اپنی رَٹ لگانے سے باز نہ آئے۔
۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو حکومتِ پاکستان نے بھارتی حکومت سے احتجاج کیا کہ اس نے دہلی میں "آل انڈیا پختون جرگہ" کے انعقاد کی اجازت کیوں دی؛ ۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لندن میں "یوم پختونستان" منانے کا اہتمام کیا گیا تو برطانیہ نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح یہ ڈھونگ ناکام رہا۔ ایک بار مغلگئی نامی سرحدی مقام پہ بمباری ہوئی تو افغانستان کی حکومت نے پاکستان کو مطعون کرنے کی کوشش کی، اس پہ سردار عبدالرب نشتر کی قیادت میں ایک پاکستانی وفد کابل بھیجا گیا، گفت و شنید کے بعد واقعہ کی تحقیقات کے لئے ایک غیر جانبدار کمیشن قائم ہوا۔ جس نے مغلگی کے واقعہ سے پاکستان کو بری الذمہ قرار دیا۔ افغان عوام کی طرف سے کابل کی مطلق العنان "چچا شاہی" حکومت کے خلاف تحریک جاری تھی، لوگ ملک میں جمہوریت کا نفاذ چاہتے تھے افغان حکومت اُن سے سختی سے پیش آتی تھی۔ اس لئے بہت سے جمہوریت پسندوں نے پاکستان میں پناہ لی، وہ لوگ ایک "متوازی جمہوریہ افغانستان" قائم کرنا چاہتے تھے لیکن حکومتِ پاکستان نے ان کی اس لیے حوصلہ افزائی نہ کی کہ افغانستان سے تعلقات میں کشیدگی بڑھنے نہ پائے۔ مئی ۱۹۵۱ء میں بلوچستان کی سرحد پہ افغان لشکر کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی۔ افغان عسکریوں نے پاکستان کے دیہات پہ فائرنگ بھی کی۔ لیکن پاکستان نے واقعہ کو نظر انداز کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں مغربی پاکستان کے علاقوں پہ یونٹ یا وحدت قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی تو افغانستان نے اس پہ شدید ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ یہ خالصتاً پاکستان کا داخلی معاملہ تھا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو کابل میں مظاہرے ہوئے۔ جلوس نکالے گئے، مظاہرین نے کابل کے پاکستانی سفارت خانے کا سامان توڑ پھوڑ ڈالا اور پاکستانی پرچم کی بے حرمتی کی۔ دوسرے دن جلال آباد کے پاکستانی قونصل خانے پہ حملہ کیا گیا، توڑ پھوڑ کی کارروائی کے بعد قونصل خانہ کی عمارت پہ کالا جھنڈا لہرا دیا گیا، پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور حکومتِ پاکستان نے اس پہ شدید احتجاج کیا، لاہور، پشاور اور دوسرے مقامات پہ پبلک جلسے ہوئے جن میں افغان حکومت کی زیادتیوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ جلال آباد کا پاکستانی قونصل خانہ بند کر دیا گیا اور سٹاف واپس بُلا لیا گیا۔ دونوں ملکوں کے مابین اس کشیدگی کو دور کرنے کے لئے سعودی عرب کے شہزادہ مساعد نے ثالثی کیلئے

اپنی خدمات پیش کیں، صلح کی بات چیت کامیاب نہ ہوسکی، حکومت ترکیہ نے بھی دونوں ملکوں کے مابین مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کی، بالآخر افغان حکومت اگست ۱۹۵۵ء میں پروپیگنڈہ بند کرنے پر رضامند ہوگئی ـــــ ۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کو پاکستان اور افغانستان کے مابین اصولی طور پر تو سمجھوتہ ہوگیا۔ تاہم عملاً افغان حکومت کی جانب سے پاکستان کے خلاف معاندانہ کارروائیاں جاری رہیں۔ اس پر اکتوبر ۱۹۵۵ء میں پاکستان نے کابل سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۵۶ء کو افغان طیاروں نے فورٹ سنڈیمن کے پاکستانی قصبے پر پرواز کی اور ژوب ملیشیا کی چوکی پر حملہ کیا۔ اس پر ترکیہ کے وزیراعظم عدنان مینڈریس ثالثی کے فرائض انجام دینے کے لئے افغانستان گئے۔

۷ اگست ۱۹۵۶ء کو خود صدر پاکستان افغانستان کے دورے پر کابل پہنچے تاکہ وہاں کے حکمرانوں نے اس مسئلے پر بات چیت کریں۔ نومبر ۱۹۵۵ء کے آغاز میں برطانیہ کے دولت مشترکہ کے وزیر ارل آف ہوم پاکستان کے دورے پر آئے، انہوں نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ڈیورینڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان طے شدہ سرحد ہے، اس کے باوجود کابل کی اشتعال انگیزیاں جاری رہیں، افغانستان کے جنگی طیارے آئے دن پاکستانی علاقہ پر غیر قانونی طور پر پرواز کرتے رہے حکومت پاکستان نے اس زیادتی کے خلاف پُرزور احتجاج کیا اور بتایا کہ پاکستان کی ایک ایک انچ زمین مقدس ہے اور ہم ہر قیمت پر اس کا دفاع کریں گے، افغان ناظم الامور کو احتجاجی مراسلہ دیا گیا۔ یہ افسوسناک صورت حال دیکھ کر معاہدہ بغداد میں شامل ملکوں نے بھی پختونستان کو خبردار کیا، امریکہ کی جانب سے بھی مصالحتی کوششیں کی گئیں، دوسری طرف روس کے مارشل بلگانن نے پختونستان کی حمایت کی اور مسئلے کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے کی تجویز کی، کوئٹہ میں متعین افغان قونصل اکبر خان پروانی کو ناپسندیدہ سرگرمیوں کی بنا پر نکال دیا گیا ـــــ انہی دنوں برطانیہ کے وزیراعظم نے واضح کیا کہ ڈیورینڈ لائن افغانستان اور پاکستان کے مابین تسلیم شدہ بین الاقوامی سرحد ہے صوبہ سرحد کے ایک سابق گورنر سر جارج کننگھم نے بھی "ٹائمز" میں ایک مضمون لکھ کر پاکستانی مؤقف کی حمایت کی اور بتایا کہ ڈیورینڈ لائن بین الاقوامی سرحد ہے، افغانستان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس لائن سے مشرق میں واقع قبائلی علاقے کے معاملوں میں مداخلت کرے۔

پاکستان کی جانب سے انتہائی نرم اور دوستانہ برتاؤ کے باوجود افغان حکمرانوں نے اشتعال انگیزیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

سُہروردی وزارت

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نیا دستور نافذ ہوا اور اس کے تحت سکندر مرزا صدرِ پاکستان بنے تو ساری طاقت انہی کے ہاتھوں میں آگئی، وہ سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے، جسے چاہتے نوازتے، جسے چاہتے گرا دیتے۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ بھی، جسے پاکستان بنانے کا فخر حاصل تھا، بے بس ہو کر رہ گئی۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں ری پبلکن پارٹی کو تقویت پہنچائی اور جہاں ضرورت پڑی عوامی لیگ کرشک سماج اور نیشنل عوامی پارٹی کا تعاون حاصل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا، ۱۹۵۶ء کے ماہِ جنوری میں مسلم لیگ نے اپنی صفوں کو ازسرِنو منظم کیا، نئے انتخاب کرائے۔ جن میں سردار عبدالرب نشتر کو صدر، مولانا محمد اکبر (مشرقی پاکستان) کو نائب صدر، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان) کو جنرل سیکرٹری، مسٹر منظر عالم کو جائنٹ سیکرٹری اور شیخ صادق حسن کو خزانچی منتخب کرلیا گیا۔

ان دنوں چوہدری محمد علی کی مرکزی وزارت مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کی مخلوط وزارت تھی مسلم لیگی ارکان صدر سکندر مرزا کے اشارے پر چلتے تھے، اس لئے مسلم لیگ چوہدری محمد علی کی پالیسیوں پر اکثر نکتہ چینی کرتی رہتی تھی۔ اس پر چوہدری محمد علی وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے تو سکندر مرزا نے حسین شہید سہروردی کو وزارت بنانے کی دعوت دی، ایک زمانہ تھا جب سکندر مرزا حسین شہید سہروردی کو اپنا اوّلین دشمن سمجھتے تھے لیکن اب دونوں میں گاڑھی چھننے لگی، سہروردی کی عوامی لیگ سیکولر (لادینی) نظریات کی حامی تھی، خود سہروردی مغربی طاقتوں کے ہم نوا تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب نومبر ۱۹۵۶ء میں نہرِ سویز کے مسئلے پر مصر اور برطانیہ میں جنگ چھڑی تو مسلمانانِ عالم کے جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سہروردی نے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

انہی دنوں ایک اور مسئلہ سامنے آیا تو اس میں بھی سکندر مرزا اور سہروردی نے عجیب روش اختیار کی۔ بات یہ تھی کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں طریقِ انتخاب کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی، مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ اور دوسری جماعتیں اپنے ہاں کے اقلیتی لوگوں کو خوش کرنے کے لئے مخلوط انتخاب کی حامی تھیں۔ جب کہ مغربی پاکستان کے لوگ جداگانہ انتخاب چاہتے تھے۔ دستور ساز

اسمبلی نے بالآخر یہی منظور کیا کہ مشرقی پاکستان میں مخلوط طریق انتخاب نافذ کیا جائے جب کہ مغربی پاکستان میں جداگانہ طریق انتخاب مروج ہو۔

۲۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو نتھیا گلی (ہزارہ) میں صوبائی گورنروں کی کانفرنس ہوئی۔ دوسرے دن مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا چنانچہ اُن کی جگہ سردار عبدالرشید خان کو نیا قائد چنا گیا۔ ان دنوں مغربی پاکستان میں تین ماہ دو دن تک صدر راج رہا۔ وزارت معطل رہی۔ ۵۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت بحال کر دی گئی تاہم ڈاکٹر خان صاحب وزارتِ اعلیٰ کے منصب سے بھی مستعفی ہو گئے، اس پر ۱۷ جولائی ۱۹۵۷ء کو سردار عبدالرشید مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اُن کی وزارت میں سردار عبدالحمید دستی، میر علی احمد تالپور، نواب مظفر علی قزلباش، سید عابد حسین، سید حسن محمود، ممتاز حسن قزلباش، پیرزادہ عبدالستار، نواب افتخار حسین ممدوٹ، سید جمیل حسین رضوی، مہر محمد صادق، چودھری عبدالغنی گھمن، قاضی فضل اللہ، نجم الدین لغاری، خان خداداد خان، شیخ مسعود صادق کے علاوہ نائب وزراء کی کافی تعداد شامل تھی۔ قریب قریب ہر جانا پہچانا رکن اسمبلی وزیر، نائب وزیر یا پارلیمنٹری سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس دوران نواب مشتاق احمد گورمانی کے مستعفی ہونے کے بعد مسٹر اختر حسین مغربی پاکستان کے نئے گورنر مقرر کئے گئے۔

چندریگر

جنرل سکندر مرزا کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ حسین شہید سہروردی کے ساتھ بھی زیادہ دیر تک چل نہ سکے، جس پر ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو سہروردی صاحب وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے۔ اب کے مشہور مسلم لیگی رہنما اسمٰعیل ابراہیم چندریگر کو وزارت بنانے کی دعوت دی، اس مرکزی وزارت میں میاں ممتاز دولتانہ، مسٹر فضل الرحمٰن، یوسف ہارون، فیروز خان نون، میر غلام علی تالپور، میاں جعفر شاہ، مسٹر عبدالعلیم، عبداللطیف بسواس مصباح الدین احمد، لطف الرحمٰن، مولا بخش سومرو، اے۔ کے داس اور مولوی فرید احمد شامل تھے۔

چونکہ مرکزی یا صوبائی اسمبلیوں میں ملک کی کسی سیاسی پارٹی کو بھی واضح اکثریت حاصل نہ تھی اور ارکان اسمبلی اکثر پارٹی تبدیل کرتے رہتے تھے اس لئے سیاسی استحکام ناپید ہو گیا، اسمبلی کا ہر اجلاس ہنگاموں کی نذر ہو جاتا، چندریگر ایک قانون پسند رہنما تھے، چھ سات ہفتوں

کے بعد ہی انہیں معلوم ہوگیا کہ ان حالات میں وزارت کا چلنا مشکل ہے۔ لہٰذا وہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔

اب ملک فیروز خان نون کو ملک کا وزیر اعظم مقرر ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے بڑے تدبر سے کام کیا اور مغربی پاکستان کا وزارتی بحران کچھ عرصہ کے لئے حل ہوگیا مگر عوامی لیگ اس وزارت میں شامل نہ تھی، آئے دن کی اس جوڑ توڑ کی پالیسی سے سیاسی زندگی بُری طرح متاثر ہوئی اور ملک عدم استحکام کا شکار ہوگیا، اُدھر ون یونٹ کے خلاف جا بجا مظاہرے ہوئے، چھوٹے صوبوں کے سیاسی لیڈر یہ شور مچاتے تھے کہ اُن کا حق چھینا جا رہا ہے اور بڑے صُوبے والے یہ کہتے کہ اُن کا ۵۶ فیصد کا حق چھین کر انہیں ۴۰ (چالیس) فیصد نمائندگی پر ٹرخا دیا گیا ہے۔ وہ افراتفری مچی کہ عوام سیاست دانوں سے برگشتہ اور دل برداشتہ ہوگئے۔ یہاں تک سُننے میں آیا کہ سکندر مرزا اور اس کے ساتھی ہندوستان سے کنفیڈریشن بنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس وقت تک ری پبلکن پارٹی بھی دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ سیّد عابد حسین مستعفی ہوگئے تھے، سردار عبدالرشید نے بھی ڈاکٹر خان صاحب کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور نواب مظفر علی قزلباش نے اُن کی جگہ وزارتِ اعلیٰ مغربی پاکستان کا منصب سنبھالا۔ آئے دن لوگ ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شریک ہوتے، یوم جمہوریہ پر سکندر مرزا نے خود تسلیم کیا کہ قومی مسائل حل کرنے کے امکانات روشن نہیں ہوئے۔

اُدھر ۳۰ر مارچ ۱۹۵۸ء کو سردار عبدالرب نشتر کی جگہ خان عبدالقیوم خان پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوگئے، وہ عوام کو گرمانا خوب جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ملک بھر کا طوفانی دورہ کیا۔ جگہ جگہ بڑے بڑے جلسے منعقد کئے جس میں سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب کی پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی، ایک مرتبہ تو جہلم سے گجرات تک تیس میل لمبا جلوس نکلا۔ حکومت کو عبدالقیوم خان کی سرگرمیوں سے خطرہ لاحق ہوگیا اور اُس نے سرکردہ مسلم لیگیوں کو لیگ سے توڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک محمد یوسف خان خٹک جیسے دیرینہ مسلم لیگی بھی ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوگئے۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین، بیگم ممتاز جمال اور دوسرے لوگ جو نئی مسلم لیگ کو چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہوئے۔ انہیں مغربی پاکستان کے نائب وزراء بنا دیا گیا۔

ڈاکٹر خان صاحب کا قتل

۱۹ مئی ۱۹۵۸ء کو ڈاکٹر خان صاحب کو عطا محمد نامی ایک مخبوط الحواس شخص نے قتل کر دیا، یہ شخص ایک سابقہ پٹواری تھا اور ملازمت پر بحالی کے لئے درخواست دینے ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے پر ایکمین روڈ لاہور پہنچا تھا۔ تاہم مطلب پرست عناصر نے اس قتل کو سیاسی رنگ دے دیا اور ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لئے خاکسار تحریک کے سربراہ علامہ مشرقی اور اُن کے آٹھ رفقاء گرفتار کر لئے۔ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ سکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب کی غلط پالیسیوں پر تنقید کرتے اور ہندوستان کے خلاف دفاعی تیاریوں کو تیز تر کرنے کا مطالبہ کرتے تھے، عمر رسیدہ اور عالمی شہرت کے سکالر علامہ کو شاہی قلعہ میں نظر بند رکھا گیا اور ان پر انتہائی تشدد روا رکھا گیا۔ علامہ کے بیٹے پر بلا لائسنس اسلحہ رکھنے کا الزام عائد کیا گیا، سازش کی کڑیاں ملانے کے لئے متعدد خاکساروں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ خاکسار تحریک اور اسلام لیگ کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ ان جماعتوں کی رکنیت، عہدہ داری یا لٹریچر پاس رکھنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ علامہ مشرقی کے علمی اور معاشرتی مقام کے پیش نظر عدالت نے انہیں "بی" کلاس دیئے جانے کی سفارش کی تھی لیکن جیل کے حکام نے اسے ماننے سے انکار کر دیا جس پر انہیں توہینِ عدالت کا نوٹس دیا گیا۔

اُدھر ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کے ہم نواؤں نے بھی اس سانحہ کو سیاسی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنانے کی کوشش کی، پشاور اور دوسرے مقامات پر ماتمی جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے اور اعلانیہ سیاسی مخالفین سے انتقام لینے کے عزم کا اعادہ کیا گیا، اس پر خان عبدالقیوم خان صدر پاکستان مسلم لیگ نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ری پبلکن پارٹی قتل کے اس سانحہ کی آڑ میں مسلم لیگ (اور دوسری حریف جماعتوں) کو بدنام کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال کچھ عرصہ تک سخت جماعتی کشیدگی دیکھنے میں آئی۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قتل کے ملزموں پر پولیس نے انتہائی تشدد کیا اور علامہ مشرقی کے مخلص ترین ساتھیوں کو سلطانی گواہ بننے پر مجبور کر دیا۔ ۶ جون کو قتل کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ۱۱ جون کو سلطانی گواہ خورشید خالد نے عدالت کو بتایا کہ وہ پولیس کی ایذا رسانی سے تنگ

آکر سلطانی گواہ بننے پر رضامند ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس اُسے اس بات پر بھی آمادہ کرتی رہی کہ وہ خان عبدالقیوم خان کا نام بھی لے اور کہے کہ انہیں قتل کی واردات کرنے کے لئے تیس ہزار روپے کی رقم دی گئی تھی۔

ڈاکٹر خان صاحب کے قاتل عطا محمد نے بیان دیا کہ اس نے اپنی مرضی سے قتل نہیں کیا بلکہ دو صوبائی وزراء کی تحریک پر ڈاکٹر خان صاحب کو قتل کیا ہے، مجسٹریٹ نے سماعت کے بعد علامہ مشرقی اور دوسرے ملزمین کے معاملے کو سیشن کے سپرد کر دیا۔ یکم ستمبر کو علامہ مشرقی کی درخواست ضمانت بھی مسترد کر دی گئی ـــــ ۲۱ اکتوبر کو عطا محمد اپنے سابقہ بیانوں سے منحرف ہو گیا اور صاف کہہ دیا کہ قتل کی اس واردات میں علامہ مشرقی کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ علامہ مشرقی کا بیان بھی اس سلسلے میں قلمبند کیا گیا، اصل بات یہ تھی کہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا تھا اور عطا محمد پر ری پبلکن حکومت کا سیاسی دباؤ اب باقی نہ رہا تھا۔

۱۷ نومبر کو سیشن جج شیخ انوار الحق نے علامہ مشرقی کو رہا کر دیا۔ عطا محمد نے اپیل دائر کی، لیکن ۱۲ فروری ۱۹۶۰ء کو سپریم کورٹ نے عطا محمد کی سزائے موت بحال رکھی۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۱۹۶۱ء کو اُسے بہاولپور جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اُدھر قتل کے فوراً بعد نواب مظفر علی قزلباش اور ری پبلکن پارٹی کے زعماء نے ڈاکٹر خان صاحب کے قتل پر پردہ ڈالنے کے لئے اُن کے بیٹے عبداللہ خان کو، جو اس وقت محکمہ تعمیرات عامہ میں سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے پر فائز تھے، اپنے مرحوم باپ کی جگہ مغربی پاکستان کی حکومت میں وزیر بنا دیا۔

علامہ مشرقی

علامہ عنایت اللہ خان المشرقی اور اُن کے پیروکاروں کو پاکستان بننے کے بعد بلاوجہ نشانۂ ستم بننا پڑا، خاکسار رہنما حکومتِ وقت پر زور دیتے کہ وہ ہر صحت مند شہری کو مجاہدانہ تربیت دے۔ نہری پانی بند کرنے، دریاؤں کا رُخ موڑنے اور مشرقی پاکستان میں لادینی نظریات

پھیلانے کی بھارتی سازشوں سے باخبر رہے، اسلامی سادگی اختیار کرے۔ اور عیش و آرام کے تباہ کن اثرات سے قوم کو بچائے۔ لیکن ان کی بات پر کان دھرنے کی بجائے ان کی ہنسی اڑائی گئی اور انہیں ہر ممکن آزار دیا گیا۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو انہیں پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ ۱۸۶ کے تحت گرفتار کر لیا گیا، رہا ہوئے تو ۱۱ر جنوری ۱۹۵۱ء کو دوبارہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت پکڑ لئے گئے۔ ۲۷ر مئی کو ان کے رفیق کار ڈاکٹر عبدالودود کو رہا کر دیا گیا لیکن مشرقی جیل ہی میں رہے، ۶ ماہ کی نظر بندی کی میعاد ختم ہوئی تو ۶ ماہ کے لئے مزید بند کر دیا گیا، اس دوران ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کی شہادت کا وقوعہ ہوا تو اس پر بھی خاکساروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ بالآخر ۱۱ر جولائی ۱۹۵۲ء کو انہیں بورسٹل جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر خان صاحب قتل ہوئے تو پھر انہیں گرفتار کر کے اتنا تشدد کیا گیا کہ اس کے بعد اُن کی جسمانی صحت جواب دے گئی ـــــ قتل کے اس الزام سے رہائی ملی تو ۶ر مئی ۱۹۶۲ء کو ان پر کسی سازش کا الزام عائد کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ بڑی کوشش سے اور خرابیٔ صحت کے عذر کی بناء پر ۲۳ر اگست ۱۹۶۲ء کو ان کی نقل و حرکت سے پابندی اٹھالی لیکن اب وہ نقل و حرکت کے قابل ہی کہاں رہے تھے، قریباً ایک سال بستر علالت پر گزارنے کے بعد ۲۷ر اگست ۱۹۶۳ء کو ۷۵ برس کی عمر میں یہ شہرۂ آفاق سکالر اور عظیم رہنما البرٹ وکٹر ہسپتال لاہور میں انتقال کر گئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد نے جنازہ میں شرکت کی، کچھ عرصہ بعد میاں بشیر احمد صدیقی کو اُن کی جگہ قائد تحریک منتخب کر لیا گیا۔

مارشل لاء کا نفاذ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک ملک میں سیاسی عدم استحکام کا یہ عالم تھا کہ پاکستان دُنیا بھر کے لئے ایک تماشے کی صورت اختیار کر گیا تھا، ملک میں ایک ڈرامہ ہو رہا تھا۔ راتوں رات سیاست دان ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلے جاتے اور وزارت توڑ دی جاتی، سیاسی وفاداریاں بدل جاتیں اور ملک کے عزت و وقار اور استحکام کا کوئی خیال نہ کیا جاتا۔

سکندر مرزا اس وقت ملک کے کرتا دھرتا بنے بیٹھے تھے، ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اس نے اپنا آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بیک جنبش قلم، سیاسی پارٹیاں، وزارتیں اور آئین سب ختم کر دیئے اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔ نئے انتظام کے تحت افواج پاکستان کے سپہ سالار جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ اور سکندر مرزا صدر مملکت کے عہدے پر فائز رہے۔ لیکن چند دن کے بعد یہ کھیل بھی ختم ہو گیا اور خود سکندر مرزا کو بھی اقتدار چھوڑتے ہی بن پڑی۔

دورِ ایوبی

اکتوبر ۱۹۵۸ء ـــــ مارچ ۱۹۶۹ء

بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹۵۷ء ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں سیاسی انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ مغربی پاکستان میں بزرگ رہنما ڈاکٹر خان صاحب کا قتل اور مشرقی پاکستان کی اسمبلی کے ہنگامے کے دوران شاہد علی، ڈپٹی سپیکر کا قتل اس انارکی اور طوائف الملوکی کے شاہکار تھے، اسی طرح خان عبدالقیوم خان کی آمد کراچی پر ہنگامہ بھی کچھ کم قابلِ ذکر واقعہ نہ تھا، لائل پور میں ہڑتالی مزدوروں پر فائرنگ اور مشرقی پاکستان کے اکثر صنعتی علاقوں میں بہاری کارکنوں پر حملے بھی اسی بدانتظامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بلوچستان کی ریاست قلات میں بھی حالات کی ابتری کے پیشِ نظر خان قلات میر احمد خان کو معزول کر کے اس کے بیٹے کی جانشینی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے اس انقلاب کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر حکومت بدل گئی، اس سے قبل مصر، برما، عراق، سوڈان، ترکی وغیرہ میں بھی فوجی انقلاب آئے تھے لیکن پاکستان کا یہ انقلاب اُن سب سے پُرامن اور خوش آئند تھا۔ اس انقلاب کے داعیوں نے نہ تو سیاسی شخصیتوں کے خون سے ہاتھ رنگے، نہ انہیں جیل کی کال کوٹھڑیوں میں ڈالا، صرف اُن پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ چھ سال تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لے سکیں گے اور اس کے ساتھ ہی اُن کی کارکردگی، اثاثوں اور بدعنوانیوں کی تحقیقات کی مہم شروع ہو گئی، صرف ایک تیز مزاج سیاستدان محمد ایوب کھوڑو کو (جو اتفاق سے وزیر دفاع بھی رہ چکے تھے) ایک کار بلیک میں بیچنے پر سزائے قید بھگتنا پڑی، عوام چونکہ آئے دن کے ہنگاموں، وزارتی تبدیلیوں اور بے یقینی کی کیفیت سے تنگ

آئے بیٹھے تھے، اس لئے مارشل لاء کا خیر مقدم کرنے لگے، ساتھ ہی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے پورے خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ لوگوں کو یقین دلایا کہ انقلابی حکومت کا کام صرف صورتِ حال کی اصلاح اور جمہوریت کی بحالی ہے، جونہی یہ مقصد پورا ہو گیا ملک میں سول حکومت قائم کر دی جائے گی۔

۱۱ اکتوبر کو عبدالصمد اچکزئی جی۔ ایم سید، خان عبدالغفار خان، شیخ مجیب الرحمن، حمید الحق چودھری، مولانا بھاشانی اور کئی دوسرے لیڈروں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کا تعین ہوا۔ سمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ اور سماج دشمن کارروائیوں کے خلاف سخت اقدامات کئے گئے۔ مغربی پاکستان کے ۸۴ اور مشرقی پاکستان کے ۱۲۴ رشوت ستان اور بدکردار سرکاری ملازموں اور افسروں کو سزائیں دی گئیں جس سے دوسرے سرکاری ملازموں کی آنکھیں کھلیں اور وہ خدمتِ خلق کے سچے جذبے سے اپنے فرائض انجام دینے لگے۔

اس وقت ملک بھر کے عوام کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ آیا یہ انقلاب کسی غیر ملکی طاقت کے اشارے پر ہوا تھا یا محض داخلی حالات کی پیداوار تھا۔ اصل میں امریکہ ان دنوں پاکستان کے معاملات میں خاص دلچسپی لے رہا تھا۔ خود سکندر مرزا اور فیروز خان نون کا جھکاؤ بھی امریکہ کی طرف تھا۔ ایک فوجی معاہدہ کے تحت امریکہ کو پاکستان میں ایک فوجی اڈہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ بڈھ بیر پشاور کے اس اڈے کا عوام کو اُس وقت تک پتہ نہ چل سکا جب تک رُوس نے اس کے بارے میں احتجاج نہ کیا، رُوس کا الزام یہ تھا کہ اسی اڈے سے امریکی جہاز "یو۔ ٹو" جاسوسی کی غرض سے روس بھیجا گیا تھا۔ بعد میں رُوس نے اس امریکی دوستی کی سزا ہمیں پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء میں دی، اعلانیہ بنگلہ دیش کی علیحدگی پسندی اور بھارت کی فوجی کارروائی کی پشت پناہی کی جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا ـــــ صدر ایوب خان کے زوال کا ایک سبب بھی بڈھ بیر (پشاور) کا یہی فوجی اڈہ بنا ـــــ کئی سال کے تجربے کے بعد جب صدر ایوب نے غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنی چاہی تو "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" لکھ کر اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور روس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بڈھ بیر کے امریکی اڈے کو ختم کرنا چاہا تو امریکہ نے صدر ایوب کی حکومت ہی کو اٹھا دینے کا بندوبست کر دیا اور بڈھ بیر کا خاتمہ صدر ایوب کا خاتمہ بن گیا۔

۲۷ اکتوبر ــــ ایک اور انقلاب

سکندر مرزا ہوشیار شخص تھا اس نے بنانے کو تو جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنادیا تھا تاہم اب خود اُس سے خائف تھا ــــ جیسا کہ جنرل ایوب خان نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں بتایا ہے، سکندر مرزا کی بیوی اس امر کو اس کی بڑی غلطی قرار دیتی تھی کہ اُس (مرزا) نے سارے اختیارات ایوب خان کو سپرد کر دیئے تھے۔

چند دن بعد ایوب خان حالات کا جائزہ لینے مشرقی پاکستان گیا، وہاں سے واپس کراچی پہنچا تو اُسے سکندر مرزا کے ارادوں کا پتہ چلا ــــ ایک تو مارشل لاء لگ جانے کے بعد سکندر مرزا کی کوئی پوزیشن یا اتھارٹی باقی نہ رہی تھی، دوسرے عوام سکندر مرزا کی کارستانیوں سے پہلے ہی تنگ آئے بیٹھے تھے اور تیسرے خود فوجی جرنیل بھی سکندر مرزا کی سازشوں سے ڈرتے تھے، اس لئے فیصلہ ہوا کہ جیسے بھی ہو اُس سے جان چھڑائی جائے۔

اس پر جنرل اعظم خان اور دو دوسرے جرنیل ایک کاغذ لے کر سکندر مرزا کے پاس گئے، وہ باوردی اور مسلح تھے، انہوں نے کاغذ سکندر مرزا کے سامنے رکھا اور دستخط کرنے کو کہا۔ مرزا نے بلا حیل وحجت دستخط کر دیئے۔ یہ اس کا استعفیٰ تھا، اب اختیارات پوری طرح جنرل ایوب اور اُس کے فوجی جرنیلوں کی گرفت میں تھے۔ اُسی شام سکندر مرزا اور اس کی بیگم ناہید مرزا کو ہوائی جہاز سے کوئٹہ روانہ کر دیا گیا، ۶ دن وہاں گزار کر ساتویں دن انہیں کوئٹہ سے لندن بھیج دیا گیا اور یوں ہمیشہ کے لئے سکندر مرزا کا اقتدار ختم ہوگیا۔ جنرل ایوب اور فوجی جرنیلوں کو پورا یقین تھا کہ ملک کے حالات کو خراب کرنے کے سلسلے میں سکندر مرزا بھی نام نہاد سیاستدانوں سے کچھ کم خطرناک نہ تھا۔

اب جنرل محمد موسیٰ کو افواجِ پاکستان کا کمانڈر ان چیف بنادیا گیا، بارہ ارکان پر مشتمل صدارتی کابینہ تشکیل دی گئی جس میں سینئر وزیر جنرل اعظم خان، تین دوسرے جرنیل اور آٹھ سویلین وزیر شامل تھے۔ لفٹیننٹ جنرل بختیار رانا کو مغربی پاکستان کا ناظمِ اعلیٰ مارشل لاء اور بریگیڈیر فضل مقیم کو صوبہ سرحد کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ بڑے بڑے تجارتی اداروں پر معائنہ ٹیموں نے چھاپے مارے، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری ختم کر دی گئی، لوگوں کو کہا گیا کہ اپنی رجائز اور

ناجائز) آمدنی کے گوشوارے داخل کریں، کروڑوں روپوں کی خفیہ آمدنی کا پتہ چلا اور کروڑوں روپیہ ٹیکس کی صورت میں وصول ہوا، پندرہ لاکھ پونڈ کے خفیہ طریق سے حاصل شدہ سونے کا بھی پتہ چلا۔

نہری پانی کا جھگڑا

۱۰ نومبر کو شہری علاقوں سے فوج ہٹالی گئی، ایک عرصہ سے ہندوستان نے پاکستانی علاقہ کی کئی نہروں کا پانی روک رکھا تھا، عالمی بنک کے صدر کے تعاون سے اس سلسلے میں بھارتی حکومت سے بات چیت شروع ہوئی اور آخر چند سالوں کے بعد سندھ طاس کا منصوبہ منظور کیا گیا جس کے تحت تین بڑے بند، کئی ایک چھوٹے بند اور متعدد نہروں کی تعمیر پر کام شروع ہوا تاکہ دریائے سندھ اور جہلم کے زائد پانی سے ستلج اور بیاس کی نہروں کو پانی مہیا کیا جا سکے۔ منگلا اور تربیلا بند کی تعمیر عالمی بنک اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے عمل میں آئی اور یوں مغربی پاکستان کا علاقہ پانی کی کمی سے بنجر بن جانے سے بچ گیا۔

جنرل محمد ایوب خان ہری پور ہزارہ کے ترین خاندان میں ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے تھے، اُن کے آباؤ اجداد میں محمد خان ترین اور غلام خان ترین وہ مجاہد تھے جنہوں نے عمر بھر سکھ اقتدار کے خلاف جہاد کیا، ہری پور اور علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد صوبہ سرحد کا یہ خان زادہ فوج میں لفٹیننٹ منتخب ہوا اور ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے ستمبر ۱۹۵۰ء میں افواجِ پاکستان کے کمانڈر ان چیف کے عہدے تک پہنچا، برِصغیر ہند و پاک میں دو سو سال کے بعد اُسے ایک مسلمان فوج کا پہلا مسلمان سپہ سالار ہونے کا فخر حاصل ہوا۔

ایوب خان ملک کا جمہوری حکمران نہ تھا تاہم اس کا جذبۂ حبُ الوطنی اور خلوص شک و شبہ سے بالاتر تھا، اپنی خود نوشت میں اس کا کہنا ہے کہ "پاکستان میری جان ہے، میری زندگی ہے، لوگوں کے چہروں پر خوشی کی جھلک دیکھ کر میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اسی سے مجھے راحت ملتی ہے۔ اسی طرح اُن کی آنکھوں میں فکر و اضطراب کے آثار مجھے بے قرار کر دیتے ہیں۔ بارہا میں کھڑکی کے شیشوں پر آہٹ سن کر چونک پڑا ہوں اور یہ دیکھنے کے لئے لپکا ہوں کہ شاید یہ آواز مینہ کی بوندوں کی ہو جس کا شدت سے انتظار تھا۔ کوئی سوکھا ہوا کھیت دیکھ پاتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے، میں خود اندر سے جھلس گیا ہوں — پاکستان کی مٹی میری آنکھوں کا نور ہے

یہ مٹی میری ہے اور میں اس کا ہوں"۔

ایک رسالدار میجر کے اس فوجی فرزند نے ملک میں پہلی فوجی حکومت قائم کی تو اُس کے سامنے دو واضح مقاصد تھے۔ فوری مقصد یہ تھا کہ ملک میں شہری اور آئینی زندگی کو جلد سے جلد بحال کیا جائے اور طویل المعیاد مقصد یہ تھا کہ ہر شعبۂ زندگی میں اصلاحات لائی جائیں۔ فوری مقصد کے حصول کے لئے اُس نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کیا، قریباً ہزار گھرانوں پر مشتمل آبادی اپنا ایک نمائندہ چُنتی۔ دس بارہ ہزار کی آبادی میں ایک یونین کونسل یا یونین کمیٹی ہوتی — یہی یونینیں آگے چل کر تحصیل کونسل، ضلع کونسل اور ڈویژنل کونسل کا انتخاب کرتیں، اسی طرح ملک بھر میں یونین کونسلوں کے یہ اسّی ہزار نمائندے صوبائی اسمبلی کے ارکان بھی منتخب کرتے اور قومی اسمبلی کے ارکان بھی۔

جنوری ۱۹۶۰ء میں بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کا انتخاب ہوا — ان اراکین سے صدر محمد ایوب خان پر اعتماد کا ووٹ لینے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ ۹۵ فیصد ووٹروں نے محمد ایوب خان پر (جو مرکزی کابینہ کی منظوری سے اب فیلڈ مارشل بن چکے تھے) اعتماد کا اظہار کیا، ۷ر فروری کو ایوب خان نے ملک کے منتخب صدر کے طور حلف اٹھایا اور نئے آئین کی تیاری کا کام شروع ہو گیا۔

بنیادی جمہوریت کے اسی نظام کے تحت ایک طویل عرصہ کے بعد میونسپل کمیٹیوں اور ٹاؤن کمیٹیوں کا انتخاب عمل میں آیا اور ملک کے طول و عرض میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اسی طرح تمام اضلاع اور ڈویژنوں میں بھی بنیادی جمہوری اداروں نے کام شروع کر دیا۔ یہ ادارے جہاں شہریوں کو سہولت پہنچانے والے تعمیری اور ترقی منصوبوں کو چلاتے وہیں چھوٹے موٹے مقدمے اور تنازعے طے کرنے میں مصالحتی کردار بھی ادا کرتے، ہر یونین کونسل یا کمیٹی کو اپنے حلقہ کے ترقیاتی کاموں کے لئے مقررہ گرانٹ دی جاتی، نتیجہ یہ ہوا کہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے تحت چھوٹی سی چھوٹی بستی کے لوگ بھی اپنے ہاں کے مسائل کے حل میں دلچسپی لینے لگے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء سے مارشل لاء کے قوانین میں نرمی کر دی گئی اور پبلک جلسوں اور انتخابی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی۔

سیاسی کارکنوں کی نااہلی

اس کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی چھان بین کا کام بھی جاری رہا اور "ایبڈو" کے تحت اکثر سابق وزراء اور سیاسی جماعتوں کے عہدہ داروں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا نااہل قرار دے دیا گیا۔ جہاں تک صوبہ سرحد کا تعلق ہے،

مشہور مذہبی اور سیاسی رہنما محترم پیر امین الحسنات مانکی شریف تو سڑک کے ایک حادثے میں ۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء کو وفات پا گئے، پیر زکوڑی عبداللطیف صاحب کو مارشل لاء کے تحت اپریل ۱۹۶۰ء میں گرفتار کر لیا گیا، کچھ عرصہ بعد خان عبدالقیوم خان کو بھی قید کر دیا گیا، خان غلام محمد خان لوند خوڑ، مرزا شمس الحق (سابق وزیر) اور بہت سے دوسرے سیاسی رہنماؤں کو انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ صدر ایوب کے دور میں بھی وحدت مغربی پاکستان کو بحال رکھا گیا، صوبائی اسمبلی کے لئے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کی ووٹوں سے ممبر چنے گئے اور لاہور میں صوبائی اسمبلی کے اجلاس ہونے لگے۔

۱۹۶۲ء کے نئے آئین کے تحت قومی اسمبلی قائم ہوئی تو اس کے لئے صوبہ سرحد سے میجر جنرل محمد شاہ خان خسرو، خان خداداد خان، محمد حنیف خان (مانسہرہ) مولانا مفتی محمود، میاں گل اورنگ زیب (سوات) میاں جمال شاہ، محمد یوسف خان خٹک، محمد ایوب خان الائی، نوابزادہ عبدالغفور خان ہوتی اور بیگم زری سرفراز خان ممبر منتخب ہوئے۔

سیاست دانوں کی تطہیر کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازموں کی تطہیر اور چھانٹی کا کام بھی جاری رہا۔

دارالحکومت کی تبدیلی

اس وقت تک کراچی ملک کا دارالحکومت تھا، تاہم آب و ہوا، جغرافیائی اور دفاعی نقطۂ نظر سے وہ ایک موزوں دارالحکومت نہ تھا۔ علاوہ ازیں کراچی کا ماحول خالصتاً صنعتی اور تجارتی تھا، سرکاری دفاتر میں یکسوئی اور سکون سے کام نہ ہو سکتا تھا، اس لئے ملک کے کسی موزوں دارالحکومت کی تلاش کا کام مدت سے جاری تھا۔ چودھری محمد علی کے دورِ وزارت میں گڈاپ کو صدر مقام بنانے کی تجویز بڑی حد تک منظور ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں اس پر کوئی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ نئی حکومت نے اس مسئلے کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی، راولپنڈی کے قریب ایک وسیع علاقہ ملک کے دارالحکومت کے لئے پسند کیا گیا۔ بعد میں اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔ شہر کا نہایت خوبصورت نقشہ تیار ہوا۔ سرکاری دفاتر کی تعمیر عمل میں آئی، سرکاری ملازموں کے لئے رہائشی بستیاں تعمیر کی گئیں، خوبصورت اور دلکش سیر گاہیں، باغات سڑکیں اور تجارتی مراکز قائم ہوئے۔ یونیورسٹیاں، کالج، تعلیمی اور ثقافتی ادارے کھلے اور اسلام آباد ہر لحاظ سے دنیا کے دوسرے دارالحکومتوں میں ایک نمایاں مقام کا مالک بن گیا۔

تاہم دارالحکومت کی اسلام آباد منتقلی پر اہلِ کراچی بڑے برہم ہوئے، بعد میں ۱۹۶۵ء کے صدارتی

انتخاب میں انہوں نے اپنی اس برہمی کا عملی اظہار بھی کیا اور وہاں کی اکثریت نے صدر ایوب کی مخالفت میں اور محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت میں ووٹ دیئے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے مطالبے پر بعد میں ڈھاکہ میں بھی ملک کے ذیلی دارالحکومت کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔

آبادکاری کے منصوبے سابقہ حکومتیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مہاجرین کی مستقل آبادکاری کی طرف توجہ نہ دے سکی تھیں۔ صدر ایوب کی حکومت نے اس طرف سنجیدگی سے کام شروع کیا۔ جنرل محمد اعظم خان کی نگرانی میں مہاجرین کی بحالی اور انہیں بھارت میں چھوڑی ہوئی جائیدادوں کا معاوضہ دینے کے لئے موثر کارروائی کی گئی اور تھوڑے عرصہ میں اُن کی مستقل آبادکاری اور بحالی کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ فالتو جائیدادوں کا نیلام عمل میں آیا، کراچی میں جہاں متروکہ جائیدادیں کم تھیں اور مہاجرین کی تعداد زیادہ تھی۔ اضافی بستیوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا گیا، اس سلسلے میں پہلا کام کورنگی کالونی کی تعمیر کا تھا۔ جو پندرہ ہزار کوارٹروں پر مشتمل تھی، جس تیز رفتاری سے یہ سکیم مکمل ہوئی، اس کا سہرا جنرل اعظم خان کے سر ہے، بعد میں مزید اضافی بستیاں بھی تعمیر ہوئیں اور اس طرح بے گھر مہاجروں کی آبادکاری کا کام قریباً مکمل ہوگیا۔

نیا آئین فیلڈ مارشل ایوب خان نے نہ صرف زرعی اور تعلیمی اصلاحات پر زور دیا بلکہ ملک کو ایک نیا قابلِ عمل آئین دینے میں بھی دیر نہ کی۔ اس سے قبل ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی کی کوششوں سے ایک جمہوری آئین بن تو گیا تھا لیکن اس پر عمل درآمد کی نوبت ہی آنے نہ پائی۔ ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو سابق چیف جسٹس مسٹر شہاب الدین کی قیادت میں ایک دس رکنی آئین کمیشن قائم کیا گیا تاکہ وہ نئے دستور کے لئے سفارشات مرتب کرے، کمیشن نے ایک سوالنامہ جاری کیا۔ جس کے ۶۲۸۹ جوابات موصول ہوئے۔ ۵۶۵ افراد سے ملاقاتیں کی گئیں اور بالآخر ۶ مئی ۱۹۶۱ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ صدارتی کابینہ کی نامزد کمیٹی نے مشہور قانون دان منظور قادر کی نگرانی میں اس پر مزید غور کیا اور آخرکار یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے دستور کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ ایک جمہوری، وفاقی، یک ایوانی اور صدارتی طرز کا دستور تھا جس میں ملک کے دونوں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی، مرکز کو بہت مضبوط اور بااختیار رکھا گیا تھا اور صدرِ مملکت کو انتظامیہ اور قانون سازی کے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے، اس آئین کے تحت اپریل

میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے رکن چُنے گئے ۔ ۸ رجون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں نئی قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اُسی روز صدر ایوب خان نے نئے آئین کے تحت حلف اٹھایا ۔ مارشل لاء ختم کر دیا گیا اور حکومت کا کاروبار عام ملکی قانون کے تحت چلنے لگا ۔

آئین کے نفاذ کے بعد سیاسی سرگرمیاں بحال ہو گئیں ۔ اسمبلیوں میں بھی حزبِ مخالف قائم ہو گئی بہت سے سیاسی رہنماؤں نے اپنی جماعتوں کو از سرِ نَو منظم کرنا شروع کر دیا ۔ صدر ایوب نے بھی اب سیاسی زندگی میں آنے کا فیصلہ کر لیا ۔ مُسلم لیگ اب دو دھڑوں میں بٹ گئی ، ایک کونسل مسلم لیگ کہلائی جو صدارتی طرزِ حکومت کے مخالف اور پارلیمانی نظام کی بحالی کی طرف دار تھی اور دوسری کنونشن یا پاکستان مُسلم لیگ ـــــ صدر محمد ایوب خان پاکستان مُسلم لیگ کی صدارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ ان کی جماعت صدارتی طرزِ حکومت کی حامی تھی اور بنیادی جمہوریتوں کی انتخابی حیثیت برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔

صوبہ سرحد میں ترقیاتی سرگرمیاں

ایوب خان کو صوبہ سرحد کا بہبود بہت عزیز تھا ، اس کی خواہش تھی کہ صوبے کی پسماندگی ختم ہو اور وہ ملک کے دوسرے حصّوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھے ، بالخصوص قبائلی علاقوں کی ترقی کے لئے اس نے نمایاں کام کیا ۔ قبائلی عوام کے لئے تعلیم عام کر دی ، قبائلِ سرحد کو تجارتی سہولتیں دی گئیں ـــــ پشاور میں دیہی ترقیاتی اکاڈمی قائم کر دی گئی ، وارسک کی ۳½ میل لمبی سرنگ کا افتتاح کیا گیا ، ۱۹۶۱ء میں جب برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اور اُن کے شوہر ڈیوک آف اڈنبرا نے پشاور ، وارسک ، درّہ خیبر ، مردان ، مالاکنڈ اور سوات کا دَورہ کیا تو وہ ان علاقوں کی خوشحالی اور امن و امان کے حالات دیکھ کر بڑے محظوظ ہوئے ۔ صدر ایوب کے عہد میں کوہاٹ میں آبپاشی کے منصوبے تانڈہ ڈیم کی تکمیل عمل میں آئی ۔ سوئی گیس نوشہرہ پشاور اور دوسرے شہروں تک پہنچ گئی ۔ دریائے کابل پر جہانگیرہ کے مقام پر کشتیوں کے پُل کی جگہ پختہ پل تعمیر ہوا ۔ محترمہ فاطمہ جناح نے پشاور یونیورسٹی میں قائداعظم کا لج آف کامرس کا افتتاح کیا ۔ اور قائداعظم مرحوم کی وصیت کے مطابق اُن کے ترکہ کا ایک تہائی حصّہ پشاور یونیورسٹی کو عطیہ کے طور پر دیا ۔

۱۹۶۳ء کے ماہ اکتوبر میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے پشاور کے قریب جمرود کے مقام پر ، تاریخی درّہ خیبر

کے دہانے پر "بابِ خیبر" کا افتتاح کیا اور "جشنِ خیبر" کے نام سے ایک صنعتی، تجارتی اور ثقافتی میلہ منعقد کرنے کی منظوری دی تاکہ قبائلی علاقہ کے لوگوں کو اپنے بھائیوں سے آزادانہ میل ملاپ کا موقع پیدا ہو اور ملک کے دوسرے حصوں کی ترقی کو دیکھ کر اُن میں بھی تعمیر و ترقی کا جذبہ اور اُمنگ پیدا ہو۔

مسئلہ کشمیر وقت گزرنے کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ اور بھی سنگین صورت اختیار کرتا گیا، دورِ ایوبی میں اس کی نزاکت یہاں تک بڑھی کہ مسلح تصادم تک نوبت پہنچ گئی۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری بھارت پر ہے جس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسئلہ اور اُلجھتا گیا۔

۱۹۵۹ء کے اوائل میں راولپنڈی سے چالیس میل دور بھارت کے کینبرا جیٹ طیارے نے ناجائز پرواز کرتے ہوئے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی، پاکستانی فضائیہ ایک سیبر طیارے کے جرأتمند پائلٹ محمد یونس نے اسے مار گرایا، بھارتی ہوابازنے اعتراف کیا کہ وہ جاسوسی کی غرض سے پاکستانی علاقہ کے فوٹو گراف لینے آیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں لندن میں صدر ایوب اور بھارتی وزیراعظم نہرو میں مذاکرات ہوئے جن کے نتیجے میں سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی سال کے آخر میں بھارت کے مسلح فوجیوں نے آزاد کشمیر کے علاقہ پر حملہ کیا، جس کا منہ توڑ جواب دیا گیا اور بارہ بھارتی فوجی ہلاک کر دیئے گئے۔ انہی دنوں مسٹر کے۔ ایچ خورشید آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہو گئے۔

۱۹۶۲ء کے اوائل میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو بھارتی حکومت نے قید سے رہا کیا تو اُمید پیدا ہوئی کہ ان لیڈروں کے توسط سے بات چیت آگے بڑھے گی اور مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ شیخ عبداللہ مذاکرات کی غرض سے راولپنڈی آئے تو ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن عین اس وقت بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو انتقال کر گئے اور شیخ عبداللہ کو فوری طور پر دہلی جانا پڑا تو مذاکرات کا امکان ختم ہو گیا۔

بھارت کی جانب سے اشتعال انگیزیوں میں اضافہ ہوا تو پاکستان کی درخواست پر سلامتی کونسل نے اجلاس بلانے کا اعلان کیا، اعلان کے ہوتے ہی بھارت نے آٹھ ڈویژن فوج پاکستان کی سرحدوں پر جمع کر دی اور پنڈت نہرو نے دھمکی دی کہ آزاد کشمیر کی حکومت علاقہ خالی کر دے، اُدھر سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر پر بحث مارچ تک ملتوی کر دی، اس پر صدر خورشید نے اعلان کیا کہ سلامتی کونسل کی ناکامی کی صورت میں کشمیری ہر ممکن اقدام کریں گے۔ ۲۴ اپریل ۱۹۶۲ء کو سلامتی کونسل کا اجلاس تو ہوا لیکن

مسئلہ کشمیر پر بحث ۲۸ مئی تک ملتوی کر دی گئی، ان دنوں سردار عبدالقیوم خان تحریک آزادی کشمیر کے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ صدر ایوب اس عرصے میں دُنیا پر واضح کرتے رہے کہ مسئلہ کشمیر کا حل رائے شماری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء کو وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں ایک وفد دہلی گیا تاکہ مسئلہ کشمیر پر پاکستانی مؤقف کی وضاحت کرے۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں امریکہ نے کشمیر کے سلسلے میں مصالحت کی پیش کش کی جسے بھارت نے مسترد کر دیا، شیخ عبداللہ نے اس امر کی حمایت کی کہ یہ مسئلہ جمہوری طریقے سے حل کیا جائے۔ اپریل ۱۹۶۳ء کے آخر میں مذاکرات کشمیر کا چھٹا دَور نئی دہلی میں شروع ہوا۔ اسی سال ستمبر میں کشمیر کے مسئلے کے بارے میں وزیر خارجہ بھٹو نے روسی وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔

۱۹۶۴ء کے اوائل میں سرینگر کشمیر کی درگاہ حضرت بل سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مُوئے مقدس کی چوری کے سلسلے میں ہنگامے ہوئے جس میں پولیس کی فائرنگ سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ کشمیری مسلمانوں کے قتل عام پر پاکستان کے وزیر بھٹو نے اعلان کیا کہ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کرنا ضروری ہو گیا ہے، اُدھر سیالکوٹ کی سرحدوں پر بھارتی فوجوں کے اجتماع کی خبریں آنے لگیں۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں سلامتی کونسل کا اجلاس تو ہوا لیکن کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دیر، باجوڑ کے مُعاملات

افغانستان کا رویّہ پاکستان سے شروع ہی سے ناقابلِ فہم رہا۔ پاکستان نے ہر چند حکومت افغانستان کو اپنی امن پسندی کا یقین دلایا لیکن افغانستان کے مطلق العنان فرمان روا اشتعال انگیزیوں سے باز نہ آئے۔ ۱۹۶۰ء کے اوائل سے پاکستان کی سرحدوں پر افغان فوجیوں کے اجتماعات کی خبریں آنے لگیں، اکتوبر ۱۹۶۰ء میں صوبہ سرحد کی ریاست دیر باجوڑ کی سرحد پر ہزاروں افغان لشکریوں کی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی حکومت پاکستان کو معلوم ہوا کہ ان شر انگیزیوں میں دیر کے نواب شاہ جہان خان اور اُن کا بیٹا شہاب الدین خان آف جندول بھی ملوث ہیں اور افغانی حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں چنانچہ حکومت کی مشینری حرکت میں آگئی۔ کابلی مداخلت کاروں کو بُری طرح ہزیمت اٹھانی پڑی اور وہ شدید نقصان اٹھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے، اب دیر کے معاملات پر توجہ دینی ضروری تھی۔

چنانچہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۰ء کو جمعہ کے دن افواجِ پاکستان کے دستے دیر کے علاقہ جندول میں داخل ہو گئے اور انہوں نے منڈا میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ۸ اکتوبر کو شہاب الدین خان آف جندول کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دن نواب دیر شاہ جہان خان کی گرفتاری بھی عمل میں آئی، نواب موصوف کو سمجھایا گیا کہ وہ اپنے ولی عہد محمد شاہ خان خسرو کے حق میں دست برداری کا اعلان کر دے لیکن اس نے بات نہ مانی، اس پر دونوں باپ بیٹے (نواب دیر اور خان آف جندول) کو لاہور لے جا کر گلبرگ کے ایک بنگلہ میں نظر بند کر دیا گیا۔

نواب شاہ جہان خان نے اپنے بڑے بیٹے محمد نواز خان کو اپنی زندگی ہی میں جلاوطن کر دیا تھا اور وہ مردان میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس پر منجھلے بیٹے محمد شاہ خان خسرو کو نوابی عطا کی گئی ۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو چکدرہ کے دربار ہال میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان نے محمد شاہ خان خسرو کی دستار بندی کی اور حکومتِ پاکستان کا ایک اعلان پڑھ کر سنایا جس کی رُو سے محمد شاہ خان خسرو کو دیر کا حکمران تسلیم کر لیا گیا تھا اور اعزازی بریگیڈیر کا عہدہ بھی عطا کیا گیا (بعد میں نواب خسرو کو میجر جنرل (اعزازی) بنا دیا گیا) اس موقع پر ایڈیشنل پولیٹیکل ایجنٹ مالاکنڈ مسٹر عبدالرزاق عباسی کو دیر کا وزیر اعظم اور نواب خسرو کا مشیر کار بھی مقرر کیا گیا۔

نواب خسرو ایک آرام طلب حکمران تھا۔ اس نے ریاست کے معاملات اور عوام کے فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ نہ دی، بالآخر ریاستی عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے نواب کی برطرفی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا ـــــ اس سلسلہ میں سب سے بڑا اور نمائندہ جلسہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء کو تیمر گرہ میں ہوا۔ جس میں ریاست کے ہر مقام کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ریاست دیر کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا عوامی جلسہ تھا۔ سب لوگوں نے متفقہ طور پر نواب خسرو کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس پر دس جون ۱۹۶۷ء کو حکومت نے ایک گزٹ نوٹیفکیشن جاری کیا جس کی رُو سے تمام اختیارات نواب خسرو سے لے کر براہِ راست پولیٹیکل ایجنٹ کے حوالے کر دیئے گئے اور نواب محمد شاہ خان خسرو کو برطرف کر دیا گیا۔

پولیٹیکل ایجنٹ راحت اللہ خان جرال نے نہایت خوش اسلوبی سے ریاست کا نظم و نسق چلایا۔ تعمیری کاموں پر توجہ دی اور ریاست ہی کے تعلیم یافتہ افراد کو مختلف عہدوں پر فائز کر دیا۔

۱۹۶۹ء میں ایک صدارتی حکم کے تحت ریاستیں ختم کر دی گئیں تو دیر کو ضلع بنا دیا گیا۔

خارجہ پالیسی افغانستان کی طرف سے معاندانہ کارروائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جون ۱۹۶۱ء میں افغانستان کا ایک جیٹ طیارہ غلطی سے پشاور کے ہوائی اڈہ پر اُتر گیا۔ جسے پاکستان نے واپس کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد باجوڑ کے علاقہ بگنڈیل میں افغان لشکر جمع ہو گیا، اُس نے پاکستانی علاقہ کے ایک افغان ایجنٹ سے ساز باز کر رکھی تھی، تاہم پاک فضائیہ نے بروقت اور مؤثر کارروائی کی، مشین گنوں سے دشمن کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ بہت سے افغان عسکری بھاگ گئے اور باقی ماندہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ افغان حکام نے پاکستانی سفارت خانوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اس پر پاکستان نے قندھار اور جلال آباد کے قونصل خانے بند کر دیئے۔ پشاور میں بھی افغان قونصل خانہ اور دفاتر بند ہو گئے، افغانستان نے باجوڑ اور دیر کے پاس فوجی چوکیاں قائم کر لیں۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں افغان لشکریوں نے ایک اور حملہ کیا جسے ناکام بنا دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں شاہ ایران کی ثالثی پر پاکستان اور افغانستان کے تعلقات بہتر ہوئے تو پاک افغان سرحد پھر سے کھول دی گئی اور قونصل خانوں نے کام شروع کر دیا۔

انہی دنوں ایک بھارتی جاسوس کرنل بھٹا چارجی کو گرفتار کیا گیا جس کے قبضے سے اہم دستاویزات برآمد ہوئیں۔

۱۹۶۲ء کے آخر میں امریکہ پاکستان سے کھچا کھچا رہنے لگا اور اُس نے امداد بند کر دینے کی دھمکی دی، اس پر پاکستانی وزیر خارجہ مسٹر بھٹو نے حزبِ اختلاف کے رہنماؤں سے بند کمرے میں ملاقات کی اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کی، خود صدر ایوب نے یقین دلایا کہ پاکستان آئندہ آزاد خارجہ پالیسی اپنائے گا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما محمود علی قصوری نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ امریکہ پاکستان کا شیرازہ بکھیرنا چاہتا ہے۔ حزبِ اختلاف کے رہنما خواجہ ناظم الدین نے مشورہ دیا کہ مسئلہ کشمیر پر جہاد کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

خارجہ تعلقات کے سلسلے میں سب سے اہم اقدام چین سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا تھا۔ مسٹر بھٹو چین گئے۔ وہاں کے رہنماؤں سے سرحدی تنازعہ پر بات چیت کی جس کے نتیجہ میں چین ۵۰، ۷ مربع میل کے علاقہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہو گیا، علاوہ بریں چین نے ہر قسم کے اقتصادی تعاون کا بھی یقین دلایا۔

حکومتِ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں بھارت سے رابطہ قائم رکھا۔ وفود کے تبادلے ہوئے تاہم بات چیت آگے بڑھنے نہ پائی بلکہ بھارت نے تین ہزار کشمیری مسلمانوں کو آزاد کشمیر کی طرف دھکیل دیا۔

سیاسی سرگرمیاں اب چونکہ سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھالی گئی تھی اس لئے حزب اختلاف کے رہنماؤں نے ایک مشترکہ محاذ بنا کر ایوب خان کی مخالفت شروع کردی، جس پر مئی ۱۹۶۳ء میں قومی جمہوری محاذ کے ۸ رہنماؤں نوابزادہ نصراللہ خان، میاں طفیل محمدؒ مولانا عبدالستار نیازی، عبدالمجید سندھی، محمود الحق عثمانی، زیڈ۔ ایچ لاری، محمود علی قصوری اور خواجہ رفیق کو گرفتار کرلیا گیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں ایک ایک کرکے رہا کردیا گیا۔ ایک موقع پر جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے اور اس کے سربراہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کو گرفتار کرلیا گیا ہے، تاہم انہوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو یہ پابندیاں ختم کردی گئیں اور سیّد مودودی کو رہا کردیا گیا۔

صدارتی انتخاب صدر ایوب کو صدارت کا عہدہ سنبھالے پانچ سال گزر چکے تھے۔ ۱۹۶۴ء کے آخر میں بنیادی جمہوری اداروں کے ملک گیر انتخاب ہونے تھے اور اس کے بعد صدارتی انتخاب کے لئے ووٹ ڈالے جانے تھے اس لئے سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ صدر ایوب نے ملک بھر میں جلسے کئے اور اپنی پالیسیوں کی وضاحت کی، پشاور میں بھی ۱۹۶۴ء کے وسط میں شاہی باغ میں ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ صدارتی انتخاب کی مہم کا آغاز بھی جناح پارک پشاور کے ایک جلسے سے ہوا۔

اُدھر متحدہ حزب مخالف میں شامل جماعتیں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئیں، ملک کے صدارتی انتخاب کے لئے کنونشن (پاکستان) مسلم لیگ کی جانب سے فیلڈ مارشل ایوب خان کو اور متحدہ حزب مخالف کی جانب سے محترمہ فاطمہ جناح کو امیدوار کھڑا کیا گیا، حزب مخالف نے ۲۹ ستمبر ۱۹۶۴ء کو ملک گیر پیمانے پر "یوم احتجاج" منایا۔ حزب مخالف پارلیمانی حکومت کی بحالی اور بالغ رائے دہی کی بناء پر انتخاب چاہتی تھی جب کہ کنونشن مسلم لیگ صدارتی طرز حکومت کی حامی تھی اور بنیادی جمہوریتوں کو انتخابی ادارہ بنانا چاہتی تھی، مولانا غلام غوث ہزاروی اور اُن کے ساتھی علماء کسی خاتون کو سربراہ مملکت بنانے کے مخالف تھے جبکہ مفتی محمود اور سیّد مودودی محترمہ فاطمہ جناح کی کھلی حمایت کررہے

تھے۔ عین اُن دنوں جب انتخابی مُہم پورے زور پر تھی۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کو حزبِ مخالف کے مقتدر رہنما خواجہ ناظم الدین وفات پا گئے۔

صدر ایوب نے اس موقع پر اپنا انتخابی منشور جاری کیا اور اپنی خدمات اور پروگرام عوام کے سامنے رکھے، حزبِ مخالف نے بڑے بڑے جلوس نکالے جن میں طلباء پیش پیش تھے، ملک کی صدارت کے عہدے کے لئے محترمہ فاطمہ جناح، فیلڈ مارشل ایوب خان، بشیر احمد اور کمال الدین احمد نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے، اصل مقابلہ اوّل الذکر دو شخصیتوں ہی کے درمیان تھا۔ ۲ر جنوری ۱۹۶۵ء کو پولنگ کا دن تھا۔ ووٹوں کی گنتی کے بعد نتیجے کا اعلان ہوا تو ایوب خان کو ۴۹۶۴۷، مس فاطمہ جناح کو ۲۸،۳۴۳ میاں بشیر احمد کو ۶۵ اور کمال الدین احمد کو ۱۸۵ ووٹ ملے۔

جہاں تک پشاور ڈویژن کا تعلق ہے، یہاں کُل ووٹروں کی تعداد ۵۹۲۵ تھی جس میں سے ایوب خان کو ۴۸۲۱ ووٹ ملے۔ کچھ ووٹ مسترد ہو گئے۔ گویا اضلاع میں ۷۳ فیصد اور قبائلی علاقوں میں ۹۵ فیصد ووٹ صدر ایوب کو ملے۔ چارسدہ میں جسے کانگرس (حزبِ مخالف) کا گڑھ سمجھا جاتا تھا صدر ایوب کو ۱۶۶ اور فاطمہ جناح کو ۱۵۷ ووٹ ملے۔

اس انتخاب کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ملک کے سبھی بڑے بڑے شہروں میں مشترکہ انتخابی جلسوں کا اہتمام کیا جاتا اور تمام صدارتی اُمیدوار ایک ہی پلیٹ فارم سے اپنے ووٹروں (بنیادی جمہوریتوں کے ارکان) سے خطاب کرتے تھے۔

متحدہ حزبِ مخالف کے رہنماؤں اور خاص طور پر کونسل مسلم لیگ کے صدر خواجہ ناظم الدین کے کہنے پر محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی اُمیدوار بننا قبول تو کر لیا تھا تاہم اُن کی کمزور صحت اتنی مشقت کی متحمل نہ ہو سکتی تھی، پشاور کے انتخابی جلسے کے دن بارش اور تیز ہواؤں کی وجہ سے سخت سردی تھی، مس جناح اتنے سرد موسم کی عادی نہ تھیں، لازماً ان کی صحت متاثر ہوئی، انتخاب میں ناکامی کے باعث بھی انہیں مایوسی سے دوچار ہونا پڑا ـــــ وہ تنہائی پسند اور عُزلت گزین ہو گئیں اور بالآخر ۹ر جولائی ۱۹۶۷ء کو وفات پا گئیں۔

تاہم فاطمہ جناح کی شمولیت سے متحدہ حزبِ مخالف کی جماعتوں کو بہت تقویت ملی، آمریت کے خلاف تحریک میں جان پڑ گئی، جمہوری اقدار سربلند ہوئیں بالآخر فیلڈ مارشل ایوب خان کو چند سال بعد

اس عوامی تحریک کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی۔

صدارتی انتخاب کے بعد صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخاب ہوئے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۶۵ء کو اس کے نتائج سامنے آئے تو صدر ایوب کی کنونشن مسلم لیگ نے ۱۵۰ میں سے ۱۲۰، متحدہ حزب اختلاف نے ۹ جمہوری محاذ نے ۳ نشستیں حاصل کیں۔ جب کہ باقی ماندہ ارکان نے آزاد امیدوار کے طور الیکشن میں حصہ لیا۔ نئی کابینہ تشکیل دی گئی جس میں مسٹر محمد شعیب، عبدالصبور خان، خواجہ شہاب الدین غلام فاروق خان، الطاف حسین، ایس۔ ایم ظفر، قاضی انوار الحق اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔

اب کے قومی اسمبلی کے لئے صوبہ سرحد سے منتخب ہونے والے ارکان میں بیگم زری سرفراز، گوہر ایوب خان، فدا محمد خان، خداداد خان، محمد شاہ خان خسرو، ملک دریا خان توری خیل، میاں گل اورنگ زیب، محمد ایوب خان الائی، محمد حنیف خان، میاں جمال شاہ، نوابزادہ عبدالغفور خان، نوابزادہ عظمت علی خان، سردار فضل کریم قصوریہ، مولانا مفتی محمود وغیرہ کے نام قابل ذکر تھے۔

مغربی پاکستان کی وزارت میں صوبہ سرحد سے خان حبیب اللہ خان، غلام سرور خان اور محمد علی خان ہوتی شامل تھے جبکہ پشاور کے سید یوسف علی شاہ اسمبلی کے سینئر ڈپٹی سپیکر تھے۔

صدر ایوب کی خارجہ پالیسی

اپنی خارجہ پالیسی کے متعلق فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی خود نوشت میں یوں تصریح کی ہے کہ

ہماری خارجہ پالیسی کو قومی پالیسی ہونا چاہیئے جس میں ہمارے اپنے مفادات پر نظر رکھی جائے۔ تاریخ نے ہمیں بڑی بڑی حکومتوں کے متضاد مفادات کی راہ میں لا کھڑا کیا ہے ہمارے محل وقوع کی وجہ سے ہمیں جنوب مشرقی ایشیا میں بھی اور مشرق وسطیٰ میں بھی بڑی جنگی اہمیت حاصل ہے لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہندوستان ہمارے وجود کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکا۔ وہ بڑی طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اپنی فوجی طاقت میں بے اندازہ اضافہ کرتا رہا ہے اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ یا تو پاکستان کو اپنے اندر جذب کر لے یا اپنا حاشیہ نشین بنا لے، چنانچہ جب میں نے خارجہ پالیسی کا ڈھانچہ تیار کیا تو اس میں یہ التزام رکھا کہ غیر ممالک سے تعلقات کا ایک ایسا سلسلہ پیدا کیا جائے کہ ہمارا ملک غنیم کے حملے سے

بھی محفوظ رہے اور اسے ترقی کرنے اور متحد ہونے کی مہلت بھی مل جائے۔ مُہلت کی اس خواہش کی وجہ ملک کا جغرافیائی محلِ وقوع ہے خصوصاً مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین ایک ہزار میل کی دُوری ہماری بہت بڑی کمزوری کا باعث ہے۔ کشمیر کے معاملے میں بھی بھارت پوری ہٹ دھرمی سے انصاف کے تقاضوں کو پامال کرتا رہا ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جواہر لعل نہرو کو باہمی مسائل کے حل پر آمادہ کر سکوں مگر وہ ہر بار مجھے طرح دے گئے۔

بڑی طاقتوں مثلاً روس اور امریکہ کے ساتھ بھی میں نے صحت مند دوستانہ تعلقات کی بنیاد رکھی۔ انہیں باور کرایا کہ پاکستان اپنی بقاء اور ترقی کے لئے ان کے تعاون کا خواستگار ہے اور انہیں بھارت کو اتنی شہ نہیں دینی چاہیئے کہ وہ پاکستان کے وجود کے لئے خطرہ ثابت ہو، چین کے ساتھ میں نے خصوصی تعلقات قائم کئے۔ ہمارے یہ تعلقات پُرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر قائم ہیں اور ہماری یکجائی کسی کے خلاف نہیں ہے"۔

آر۔ سی۔ ڈی

آر۔ سی۔ ڈی کے بارے میں صدر ایوب کا کہنا ہے:۔

"میں نے علاقائی تعاون برائے ترقی کا منصوبہ پیش کیا تو اُسے خوب پذیرائی ہوئی، اسی منصوبے کے سبب سے ایران اور ترکی پاکستان کے اتنے قریب آ گئے۔ جتنے پہلے کبھی نہیں تھے، افغانستان کے ساتھ بھی میں نے خوشگوار تعلقات استوار کرنا چاہے مگر اُس کا جھکاؤ شروع ہی سے بھارت کی جانب رہا ہے۔ تاہم اس کی اشتعال انگیزی کے باوجود میں میانہ روی پر قائم رہا کیونکہ افغانستان بہرحال ہمارا برادر ملک ہے"۔

رَن کچھ کا معرکہ

کراچی کے قریب بحیرہ عرب کے کنارے ایک نشیبی اور دلدلی علاقہ ہے جو رَن آف کچھ کے نام سے موسوم ہے، ۱۹۵۶ء میں بھارت نے بلاوجہ اس علاقے کے کافی حصّہ پر قبضہ کر لیا، پاکستان محض امن پسندی کی بنا پر خاموش رہا اور بھارت سے متواتر احتجاج کرتا رہا لیکن بھارت کے نیتا جہاں اپنے آپ کو عدم تشدد اور اہمسا کے پیروکار کہتے وہیں وقت پڑنے پر "گرگ باراں دیدہ" کا کردار ادا کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے، ریاست حیدر آباد جونا گڈھ، مناودر، گوا اور کشمیر کے علاقے ہڑپ کر جانے پر بھی بھارت کی جوع الارض کو ابھی قرار نہ آیا تھا۔

۱۹۵۶ء میں بھارت نے رَن آف کچھ کے ایک اہم مقام چھڈ بیٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں قدم جمانے کے بعد ۱۹۶۵ء میں اس نے پاکستانی علاقہ میں مزید پیش قدمی کرنی چاہی تو پاکستانی افواج کو کارروائی کرنے کی اجازت دے دی گئی، پاکستانی مجاہدوں نے دشمن پر کاری ضربیں لگائیں اور اُسے بہت سے علاقوں سے نکال باہر کیا، یہ حال دیکھ کر بھارت نے جنگ بند کرانے کے لئے واویلا شروع کر دیا۔ بالآخر برطانیہ کے وزیراعظم کی مداخلت پر جنگ بند ہو گئی اور اس علاقے کی ملکیت کا تنازعہ حل کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی ٹریبونل مقرر کیا گیا جس نے ۱۹۶۸ء میں فیصلہ کیا کہ چھڈ بیٹ اور کنجرکوٹ کے علاقوں پر پاکستان کا حق ہے، رَن کچھ کے یہی علاقے سرسبز چراگاہوں پر مشتمل ہیں باقی علاقہ دلدلی ہے۔ اس ٹریبونل کی رپورٹ کے مطابق اس معرکہ میں بھارت کا پاکستان سے دس گنا زیادہ جانی نقصان ہوا۔ پاکستانی مجاہدوں نے اس محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔

پاک بھارت جنگ

رَن کچھ کے علاوہ کشمیر میں بھی بھارتی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رہا مارچ ۱۹۶۵ء میں مقبوضہ کشمیر کو باقاعدہ طور پر بھارت میں مدغم کر کے ایک صوبے کی حیثیت دے دی گئی، حالانکہ یہ متنازعہ علاقہ تھا اور اس کا فیصلہ خود اہلِ کشمیر نے رائے شماری کے ذریعے کرنا تھا۔ شیخ عبداللہ اور رائے شماری کا مطالبہ کرنے والے کشمیری رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا، عوام کے غم و غصہ میں اور اضافہ ہوا۔ اس پر جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کو تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے جواب میں حریت پسندوں نے ۷ راگست ۱۹۶۵ء کو ایک انقلابی کونسل قائم کر کے اپنی آزادی کی جنگ لڑنی شروع کر دی اور بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

بھارت اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر پاکستان اور آزاد کشمیر کے خلاف مسلسل اشتعال انگیز کارروائیوں میں مصروف رہا۔ اگست ۱۹۶۵ء کے وسط میں اس نے کارگل کی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ ۲۳ر اگست کو ضلع گجرات کے ایک گاؤں اعوان شریف پر گولہ باری کی، ننانوے پونڈ کے آٹھ گولے پھینکے گئے جس کے نتیجے میں گاؤں کا ایک مکان بھی سلامت نہ رہنے پایا، بہت سے پُرامن اور نہتے شہری ہلاک ہوئے۔ ۲۵ر اگست کو بھارت نے آزاد کشمیر کے مقام ٹیٹوال میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اس نام نہاد فتح کا

ذکر بھارتی پارلیمنٹ میں بڑے فخر سے کیا گیا۔ اس پر یکم ستمبر کو صدر ایوب خان نے بھارتی جارحیت پسندوں کو متنبہ کیا کہ

"بھارت کی کھلی جارحانہ کارروائیوں کو ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اُن کا مؤثر جواب دیا جائے گا۔ بھارت کو اپنی جارحانہ کارروائیوں کے شدید نتائج بھگتنے پڑیں گے اور کشمیر میں جنگ چھیڑنے کی ساری ذمہ داری بھارت اور صرف بھارت پر ہو گی" تنگ آکر ۶ ستمبر کو پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجیں اپنے دفاع میں نکلیں، چھمب جوڑیاں میں بھارت نے زبردست قلعہ بندیاں تعمیر کر رکھی تھی۔ ٹینکوں اور بکتر بند دستوں کی کافی تعداد وہاں موجود تھی۔ لیکن پاکستان کی افواج نے اس زور اور اس جرأت سے ان چوکیوں پر حملہ کیا کہ بھارتی سپاہی پاکستانی مجاہدوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے ـــــ مجاہدین نے جان پر کھیل کر بھارت کا حصار توڑ دیا اور اس محاذ پر بھارت کو ذلت آمیز شکست اُٹھانی پڑی"۔

اب بھارت کی آنکھیں کھلیں اور اُس نے کوئی چیلنج دیئے بغیر رات کی تاریکی میں لاہور کے نواحی علاقے پر بھرپور ہلہ بول دیا۔ بھارت کو اپنی فوجی برتری پر اتنا ناز تھا کہ اُس نے اپنی رعایا کو یقین دلا رکھا تھا کہ دو دن کے اندر اندر پاکستان کو ختم کر دیا جائے گا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی دوپہر کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی گرج ریڈیو پاکستان سے سُنائی دی۔ اس تقریر نے لوگوں کے دلوں کو عزم اور ولولہ عطا کیا اور پوری پاکستانی قوم بھارتی جارحیت کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔ ایوب خان کے الفاظ تھے :۔

"میرے عزیز ہم وطنو! السلام علیکم ـــــ آج بھارتی حکمرانوں نے کسی رسمی اعلانِ جنگ کے بغیر اپنی روایتی بزدلی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے ـــــ ہمارے لئے وقت آگیا ہے کہ دشمن کو دندان شکن جواب دیں اور بھارتی جارحیت کو کچل کر رکھ دیں"!

"پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں، اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کے دہانے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد نہیں ہو جاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ کہ انہوں نے کس جری قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی

سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر ایمان کامل رکھتے ہیں، اللہ کے نام پر فردِ واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے ـــــ نوعِ انسانی کو اللہ تعالےٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا بول بالا ہمیشہ رہے گا۔"

"عزیز ہم وطنو! آزمائش کی اس ساعت میں تمہیں بالکل پُرسکون رہنا ہوگا ـــــ ہم میں سے ہر فرد کو ایک عظیم فریضہ ادا کرنا ہے جس کے لئے عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمتِ بے پایاں سے ہمیں کامیابی نصیب کرے گا، حق کی فتح ہوگی ـــــ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہو جاؤ کیونکہ شکست اور تباہی اُس باطل کا مقدر ہے جس نے تمہاری سرحد پر سر اُٹھایا ہے ـــــ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو ـــــ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو!

ـــــ "پاکستان پائندہ باد!!"

اور واقعی ملک کے تمام افراد، تمام طبقے، تمام جماعتیں متحد العمل ہو کر پشاور سے چاٹگام تک اُٹھ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے دشمن کو مزا چکھا دیا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پاکستانی سرفروشوں نے اپنی جان پر کھیل کر لاہور کے محاذ پر دشمن کی پیش قدمی روک دی، دشمن کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور امرتسر تک میں بھگدڑ مچ گئی۔

۷ ستمبر کو پاک فضائیہ نے بھارت کے ۳۱ طیارے مار گرائے۔ زمینی لڑائی میں بھی مجاہدینِ پاکستان نے وہ کمالات دکھائے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس دن جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرنے اور قیادت کے اعلیٰ جوہر دکھانے پر میجر جنرل اختر حسین ملک کو "ہلالِ جرأت" دیا گیا۔

۸ ستمبر کو بھارت نے پچاس ہزار سپاہی بھیج کر سیالکوٹ میں نیا محاذِ جنگ کھول دیا۔ تین اطراف سے پاکستانی علاقے پر ہلّہ بول دیا گیا، دشمن اس نیت سے بڑھا تھا کہ مغربی پاکستان کو دریائے چناب کے مقام پر دو حصوں میں کاٹ دے تاکہ ایک حصہ دوسرے حصہ تک کوئی مدد نہ بھیج سکے۔ ۹ ستمبر کو پاکستانی مجاہدوں نے ٹینکوں کی گولیوں کو اپنے سینوں پر لیا۔ وہ ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے اور انہیں تباہ کر دیا ۱۱ ستمبر تک اس محاذ پر دشمن کے چھ سو طاقتور ٹینک تباہ ہو چکے تھے۔ سیالکوٹ کا سارا علاقہ بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن چکا تھا اور بھارت سر پیٹ کر رہ گیا تھا۔ پاک فضائیہ بیدار اور چوکنی تھی۔ ہمارے

ہوابازوں نے پورے جذبۂ ایمانی سے دشمن کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا ، ۱۰ ستمبر کو فضائیہ کے ۱۱۴ افسروں اور جوانوں کو بہادری کے اعلیٰ اعزاز عطا کئے گئے ـــــ ۱۲ ستمبر کو لڑائی کا سب سے زیادہ زور کھیم کرن سیکٹر میں رہا ، بریگیڈیر شامی اور دوسرے سرفروشوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی لیکن دشمن کے ناپاک قدم اپنی سرزمین پر نہ پڑنے دیئے ۔ اس دن لاہور سیکٹر میں بھی مزید کامیابیاں ہوئیں ، میجر عزیز بھٹی نے اسی محاذ پر اپنے وطنِ عزیز کی خاطر جان کی قربانی دے کر "نشانِ حیدر" کا اعلیٰ اعزاز حاصل کیا ۔ ۱۳ ستمبر کو سیالکوٹ سیکٹر میں دشمن کے مزید پچاس ٹینک ناکارہ بنا دیئے گئے ۔ اُدھر فضائیہ نے انبالہ اور ہلواڑہ کے بھارتی ہوائی اڈوں کا پٹڑہ کر دیا ۔ پٹھان کوٹ ، آدم پور اور جامنگر کے ہوائی اڈوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ۔ ایک نامور ہوا باز ایم ۔ ایم عالم نے بیک وقت دشمن کے چار طیاروں کو مار گرایا اور اس طرح ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ۔ راجستھان سیکٹر میں مونا بھاؤ سٹیشن پر پاکستان کا قبضہ ہو گیا ۔ ۱۴ ستمبر تک کے نو دنوں میں بھارت کے ۲۰۹ ٹینک اور ۱۴۰ طیارے تباہ ہوئے ۔ پاکستان کے مجاہدوں کے حوصلے بلند تھے ۔ ۱۵ ستمبر کو صدر ایوب نے اعلان کیا کہ ہم اپنی بقاء کے لئے آخر دم تک لڑیں گے ۔ ۱۶ ستمبر کو سیالکوٹ کے محاذ پر پاکستانی جنگ آزماؤں نے دشمن کی صفیں اُلٹ دیں ۔ دس دن میں سات ہزار بھارتی فوجی ہلاک ہوئے ۔ ۱۷ ستمبر تک پاکستانی فوج دشمن کے ہزاروں مربع میل علاقے پر قابض ہو چکی تھی ۔ بھارت کے تباہ شدہ ٹینکوں کی تعداد ۴۴۱ تک جا پہنچی تھی اور ہندی لیڈر اب سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ ۱۸ ستمبر کو پاک فضائیہ کے لڑاکا طیاروں نے قصور سیکٹر میں دشمن کے کئی جہاز مار گرائے ۔

۱۹ ستمبر کو سیالکوٹ جموں محاذ پر دشمن کو مزید نقصان پہنچایا گیا ، ۲۰ ستمبر کو لاہور شہر پر فضائی جنگ میں بھارت کے دو طیارے مار گرائے ۔ اب سلامتی کونسل نے بھارت اور پاکستان سے جنگ بندی کی اپیلیں کرنی شروع کر دیں ، اُدھر پاک فضائیہ نے دشمن کا ایک جنگی جہاز ڈبویا اور دوارکا کے بحری اڈے پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ اُسے تہس نہس کر کے رکھ دیا ۔ ان سترہ دنوں میں پاکستان دشمن کے علاقے میں ۱۶۰۰ مربع میل کے علاقے پر قبضہ کر چکا تھا ۔

جنگ بندی ہوئی تو جو اعداد و شمار سامنے آئے اُن کی رُو سے پاکستان کے ۱۰۳۳ افراد جاں بحق ہوئے تھے اور پاکستان کے ۱۶۵ ٹینک (جن میں سے ۸۰ مرمت کرا لئے گئے) اور چودہ طیارے

تباہ ہوئے تھے جبکہ بھارت کے ساڑھے نو ہزار فوجی ہلاک اور گیارہ ہزار زخمی ہوئے اور ۴۷۵ ٹینک اور ۱۱۰ طیارے تباہ ہوئے۔

پاکستان کی شہری آبادی نے بھی ۱۹۶۵ء کے اس جہاد میں بھرپور حصہ لیا، دفاعی فنڈ میں مغربی پاکستان نے ۲۷ کروڑ اور مشرقی پاکستان نے آٹھ کروڑ کے عطیے دیئے — اس موقع پہ نمایاں خدمات بجالانے پہ ۲۲۲ افراد کو سول ایوارڈ بھی دیئے گئے۔

جہاد میں صوبہ سرحد کا حصّہ

ملک کے دوسرے حصّوں کے عوام کے شانہ بشانہ صوبہ سرحد نے بھی ۱۹۶۵ء کے اس جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔ بھارتی حملے کی خبر سنتے ہی قبائلی علاقوں کے رضاکاروں نے اپنی خدمات پیش کر دیں، پہلے ہی دن صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید نے کمشنر پشاور کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا اور محاذ جنگ پہ جانے کی اجازت چاہی۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے ہزاروں طلباء نے حکام کو یقین دہانی کی کہ انہیں موقع دیا جائے تو اس جہاد میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، خواتین تک میدان میں کود پڑیں۔ انہوں نے اپنے زیور تک اتار کر دفاعی فنڈ میں دے دیئے۔ ہر طبقہ فکر کے رہنماؤں اور کارکنوں نے اپنی خدمات حکومت کو پیش کر دیں۔ سیاسی جماعتوں نے پورے اتحاد عمل و فکر کا ثبوت دیا۔

صوبہ سرحد بھی جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ۱۳ ستمبر کو بھارتی طیاروں نے پشاور، لنڈی ارباب اور کوہاٹ کی شہری آبادی پہ وحشیانہ بمباری کی، پاکستان کی طیارہ شکن توپوں کی کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ دشمن کو زیادہ نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا اور پشاور میں صرف مال روڈ کے ایک بنگلہ کو نقصان پہنچا، بمباری سے عمارت کا ایک حصہ گر گیا اور چند لوگ جان بحق ہو گئے، اس کے علاوہ صوبہ سرحد کے دارالحکومت میں فوجی تنصیبات وغیرہ کو کوئی نقصان پہنچنے نہ پایا۔

لنڈی ارباب میں بمباری سے کئی مکان تباہ ہوئے اور گیارہ افراد نے شہادت پائی۔ شہید ہونے والوں میں ایک معمر بزرگ بھی شامل تھا جو نماز تہجد کی نیت سے بیدار ہوا تھا اور وضو کے لئے لوٹا سنبھالا ہی تھا کہ بم آن کر گرا اور وہ شہادت کے مرتبے تک جا پہنچا۔ مرنے والوں میں کچھ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ہوائی جہازوں نے اس گاؤں پہ پہ در پہ بمباری کی تو وہاں کے چند منچلوں نے چھت پہ کھڑے ہو کر بندوق سے اُن پہ فائر کئے، بھارتی ہوابازوں نے خیال کیا کہ

فائر کسی فوجی چھاؤنی سے ہوئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بمباری شروع کر دی۔ گاؤں کی مسجد میں بہت بڑا تالاب تھا جس کا پانی چاندنی رات میں چمک رہا تھا، بھارتی سورماؤں نے تالاب کو تیل کا ذخیرہ سمجھ کر بم گرانے شروع کر دیئے جس سے مسجد کا کچھ حصہ بھی شہید ہو گیا۔

سب سے زیادہ تباہی کوہاٹ میں ہوئی، دشمن کے طیاروں نے کوہاٹ شہر کے عین وسط میں محلہ فتح خان خیل پر بم گرائے، بمباری کا نشانہ بننے والے مکانوں میں سب سے زیادہ نقصان مولانا احمد گل کے مکان کو پہنچا، وہ ملبے کا ڈھیر بن گیا اور گھر کے قریباً سبھی افراد موت کا لقمہ بن گئے ـــــ مولانا احمد گل تحریک خلافت کے بے حد مخلص رہنما تھے۔ ان کی ساری زندگی برطانوی سامراج سے جہاد میں گزری تھی، اُن کے خاندان کے افراد کی موت نے سارے کوہاٹ کو غمزدہ کر دیا ـــــ مرنے والوں میں بچے اور عورتیں بھی تھے اور بڑے بوڑھے بھی ـــــ بھارتی طیاروں نے جو بم گرائے تھے اُن میں کئی پھٹ نہ سکے، بعد میں فوج اور پولیس نے ان بموں کو تلف کر دیا۔ اس کارروائی نے کئی دن تک لوگوں کا سکون برباد کر دیا، ہر لحظہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں اُن میں سے کوئی بم پھٹ نہ جائے۔

صوبہ سرحد کے جن فوجی افسروں اور جوانوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ خود فیلڈ مارشل ایوب خان بھی اسی صوبے کے فرزند تھے، وہ ایک ایک مورچہ پر پہنچتے اور مجاہدین کو جنگی اہمیت کے مشورے دیتے۔ دوسرے فوجی افسروں میں کوہاٹ کے بریگیڈیر قیوم شیر کا نام قابلِ ذکر ہے، وہ واگہہ محاذ پر جنرل سرفراز کے رفیقِ کار تھے، جنرل نے انہیں ایک خطرناک کام سپرد کیا۔ اُنہیں دریائے راوی کو پار کر کے اپنی فوج کو بی۔ آر۔ بی نہر کے مشرقی کنارے پر پہنچانا تھا۔ یہ نقل و حرکت انتہائی مشکل تھی۔ کیونکہ دشمن بی۔ آر۔ بی نہر کا پُل اُڑا چکا تھا اور ۶ میل تک کا علاقہ سخت دلدلی تھا۔ تاہم بریگیڈیر قیوم شیر نے جان جوکھوں میں ڈال کر اپنی ذمہ داری سنبھالی اور لاہور کے دفاع میں بہت نمایاں حصہ لے کر اپنی شجاعت کا لوہا منوایا۔

کرنل صاحبزادہ گل (شہید) تحصیل ہنگو ضلع کوہاٹ کے گاؤں توغ سرائے کے رہنے والے تھے، وہ کھیم کرن کے محاذ پر ایک دستے کی کمان کر رہے تھے، اگرچہ عام حالات میں کمانڈر اپنے دستے کے عقب میں رہتا ہے لیکن صاحبزادہ گل اپنے مجاہدوں کے آگے آگے جاتے اور اُن کی ہمت بڑھاتے تھے انہوں نے اس کامیابی سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ اُسے میدان چھوڑ کر بھاگتے ہی بن پڑی اور کھیم کرن فتح ہو گیا ـــــ اس فتح کے بعد بھی کرنل صاحب زادہ گل نے بھگوڑے بھارتیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک جگہ وہ

اپنے سپاہیوں کو ہدایت دینے کے لئے اپنے ٹینک سے نکلے ہی تھے کہ ایک گولہ انہیں آکر لگا اور وہ شہادت کا مرتبہ پانے میں کامیاب ہو گئے

پشاور شہر کے محلہ سربانان علاقہ رامداس کے ایک معزز خاندان کے فرد میجر امان اللہ خان بھی ملک و ملت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے والے مجاہدوں میں شامل تھے، ۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو وہ آزاد کشمیر کے ٹیٹوال سیکٹر میں اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہے تھے کہ بہادری سے لڑتے لڑتے راہِ خدا میں قربان ہو گئے۔

میجر قاضی بشیر احمد ہوتی مردان کے ایک عالم فاضل گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو وہ جوڑیاں کے محاذ پر متعین تھے۔ اُن کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر وقت اپنے لڑاکوں سے آگے آگے رہتے تھے، دشمن کی شدید گولہ باری کے باوجود اُن کے پائے استقلال میں لغزش آنے نہ پائی۔ اسی عالم میں اچانک سینہ پر دائیں جانب "شل" کا ٹکڑا لگنے سے گرے اور ملک و ملت پہ جان نثار کر گئے۔

میجر فخر عالم خان شہید موضع متھرا ضلع پشاور کے رہنے والے تھے اور جنرل محمد اعظم خان کے حقیقی بھائی تھے۔ بڑے دلیر اور جرأت آزما انسان تھے، خوف و ہراس اُن کے نزدیک تک نہ پھٹکتا تھا، ستمبر ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں جوڑیاں سے چار میل آگے دیوی پورہ کے مقام پر ٹینکوں کے ایک دستہ کی کمان کر رہے تھے، گولہ باری کے دوران بھی وہ ٹینک میں کھڑے ہو کر اپنے سپاہیوں کو ہدایات دیتے تھے، ایک بار اسی حال میں کہ وہ دشمن کی پوزیشنوں کا جائزہ لے رہے تھے ایک گولہ اُن کے بازو پر لگا اور بازو جسم سے الگ ہو گیا۔ اسی زخمی حالت میں وہ بدستور آگے بڑھتے گئے اور دشمن کو سخت نقصان پہنچایا۔ خون بہتا رہا اور زندگی کی شمع ٹمٹمانے لگی — ایسے میں انہوں نے پوچھا "کیا دیوی پورہ فتح ہو گیا"؟ ساتھیوں نے کہا، "جی! فتح مبارک ہو —" یہ خوشخبری سن کر وہ آخری بار مسکرائے اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

میجر مُنیر خان ادرک زئی ہنگو ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے ان کے والد بھی فوج کے افسر رہ چکے تھے، میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ سپاہی کے طور فوج میں بھرتی ہو گئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت میجر کے رینک تک جا پہنچے، ۷ ستمبر کو جوڑیاں کے محاذ پر دشمن سے لڑتے

ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔

کیپٹن عبدالجلیل اورک زئی بھانہ ماڑی پشاور شہر کے ایک قابلِ فخر ——— فرد تھے، پشاور یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا، ایم اے انگلش کی تیاری کر رہے تھے کہ فوج میں کمیشن مل گیا۔ بڑے باحوصلہ نوجوان تھے اور نماز روزے کے انتہائی پابند ——— ، ستمبر کو چھمب جوڑیاں کے محاذ پر مردانہ وار داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور ابدی زندگی پا گئے۔

میجر خادم حسین شہید استرزئی ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے، انہوں نے رن کچھ کے معرکے میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، یہ معرکہ ختم ہوا تو وہ کوئٹہ چلے گئے، جہاں سے انہیں لاہور کے محاذ پر پہنچنے کا حکم ملا۔ وہ کوارٹر ماسٹر منتر ہوئے۔ ایک روز وہ اپنی جیپ میں اگلے مورچوں کا دورہ کر کے آ رہے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ دشمن کے تین ٹینک بڑھتے آ رہے ہیں، پاکستانی مورچہ اُن کے عین سامنے تھا لیکن وہاں سے کوئی فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ فوراً اس مورچے کی طرف لپکے، معلوم ہوا کہ وہاں کا توپچی شہید ہو چکا ہے اور توپ کے پاس دو گولے پڑے ہیں۔ اگرچہ توپ چلانا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا تاہم غیر معمولی شجاعت سے کام لے کر انہوں نے ایک گولے سے دشمن کا ایک اور دوسرے گولے سے دوسرا ٹینک تباہ کر دیا جب کہ تیسرا فائر دشمن کی طرف سے ہوا گولہ اُن کے پاس آ کر گرا اور چشم زدن میں وہ اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔

فرانٹیئر کور یا ملیشیا کے جانبازوں کا اصل کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت ہے تاہم جب ۱۹۶۵ء کا جہاد شروع ہوا تو ان لوگوں کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ انہیں محاذِ جنگ پر جانے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے خون سے جرأت و بہادری کا ایک شاندار باب رقم کیا۔ اس چھوٹی سی فوجی جمعیت نے اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت تیس فوجی اعزاز حاصل کئے۔ جن میں سات ستارۂ جرأت، سات تمغۂ جرأت، دو تمغۂ بسالت اور چودہ امتیازی اسناد شامل ہیں۔ ستارۂ جرأت پانے والے تھے۔ صوبیدار نظر بند شہید، نائب صوبیدار بہرام گل، صوبیدار سمن گل کوکی خیل، صوبیدار افضل گل شہید، نائب صوبیدار یعقوب خان آفریدی، میجر غلام مرتضیٰ، صوبیدار علی مدد شامل تھے، جبکہ کیپٹن سمندر خان اور کیپٹن خادم حسین نے تمغۂ بسالت پایا۔ تمغۂ جرأت حوالدار پائندہ خان، حوالدار عظیم خان شہید، سپاہی امام غلام اورک زئی، حوالدار گلی شاہ، لانس نائیک نور رحمان آدم خیل

اور حوالدار رمضان شہید کو ملا۔ اسی طرح صوبیدار سمندر گل، کپتان رحیم بخش ناصر (چترال) کپتان سکندر خان (محسود) نور حسین طوری، حوالدار عظیم خان (شہید) صوبیدار شیر اسلم شہید۔ سپاہی نیاز بادشاہ شہید گل حسن خان شہید ظہور الاسلام آفریدی شہید۔ آفریدی خان شہید، لفٹیننٹ کرنل غلام حسن خان، محمود احمد شہید، گل رحمان شہید، میجر میاں رضا شاہ شہید، نور البصر شہید، سخی احمد شاہ شہید میر محمد خان خٹک شہید، محمد بلال شہید، میر محمد خان شہید، اجمل خان شہید اور محمد لطیف شہید کے علاوہ ہزاروں سرحدی سرفروش ہیں جو آسمانِ شجاعت پہ چاند تارے بن کر چمکے اور آنے والی نسلوں کے لئے زرّیں روایات چھوڑ گئے۔

پاک فضائیہ نے دشمن پہ وہ کاری ضربیں لگائیں کہ دنیا عش عش کر اٹھی، سرزمینِ ہزارہ کے نامور فرزند ونگ کمانڈر (حال ایئر چیف مارشل) محمد انور شمیم، فلائٹ لفٹیننٹ ارشد سمیع، فلائٹ لفٹیننٹ غنی اکبر خان (صوابی) اور بیسیوں ایسے ہوا باز اور افسر تھے جن کے نام ہماری قومی تاریخ سے کبھی محو ہونے نہ پائیں گے۔

۱۹۶۵ء کے اس جہاد میں ریاست سوات نے ایک ہزار مجاہدین کی خدمات حکومت کو پیش کیں۔ یہ غازی مختلف محاذوں پر افواجِ پاکستان کے شانہ بشانہ سرگرم عمل رہے، اسی طرح ریاست دیر کے کئی سو نوجوان بھی رضاکارانہ طور پہ شریکِ جہاد رہے۔

ایک عجیب جوش اور ولولہ تھا جو اُن دنوں دیکھنے میں آیا، پاکستانی افواج اپنے سے دس گنا بڑی طاقت کے مقابلے میں صف آراء ہوئیں اور آزمائش کی اس کٹھن سے کامیاب ہو کر نکلیں۔

اعلانِ تاشقند یوں تو اقوامِ متحدہ کی مداخلت پہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء ہی کو جنگ بندی ہو گئی تھی ـــــ تاہم کئی ماہ تک دونوں ملکوں کی فوجیں مورچوں میں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹی رہیں اور کشیدگی کی فضا قائم رہی، آخر روس کے وزیرِ اعظم کوسیجن نے دونوں ملکوں کے رہنماؤں کو تاشقند کے مقام پہ گفت و شنید کی دعوت دی۔ پاکستان کے صدر محمد ایوب خان اور بھارت کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری نے دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے تاشقند پہنچے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو ایک مشترکہ اعلان جاری ہوا جسے اعلانِ تاشقند کہا جاتا ہے، اس معاہدے کی رُو سے طے پایا کہ ۲۵ فروری ۱۹۶۶ء تک دونوں ملکوں کی فوجیں سابقہ سرحدوں پر چلی جائیں۔

سفارتی تعلقات بحال کیے جائیں دونوں ملکوں کی باہمی تجارت و مواصلات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے اور جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ معاہدہ کرنے کے بعد اُسی رات بھارتی وزیراعظم شاستری دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

اعلانِ تاشقند کا ردِ عمل کچھ اچھا نہ ہوا۔ اکثر پاکستانیوں کا خیال تھا کہ ہم نے میدانِ جنگ میں جیتی ہوئی بازی سیاسی میدان میں ہار دی ہے، حزب مخالف کی جماعتوں نے اُسے اور ہوا دی۔ اُدھر وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اس معاہدے پر کسی خوشگوار ردِ عمل کا اظہار نہ کیا ـــــ کچھ عرصہ بعد مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خان بھی اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے ـــــ صدر ایوب کی حکومت افشائے راز کے ڈر سے معاہدے کی پوری تفصیل عوام کے سامنے لانے سے قاصر تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ "معاہدہ تاشقند" وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک پُراسرار معاملہ بنتا گیا ـــــ صدر ایوب اپنی دنوں علیل ہوئے تو حالات پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، نوکر شاہی من مانی کرنے لگی۔ معاہدہ تاشقند روس کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا یہ بات امریکہ کو کھٹکتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کھچا کھچا رہنے لگا ـــــ تنگ آکر پاکستان کی حکومت نے امریکہ سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ بڈہ بیر پشاور کے جاسوسی کے امریکی اڈے کو ختم کیا جائے یا اسے تل ابیب (اسرائیل) منتقل کیا جائے۔ پاکستان اسلامی ملکوں اور عربوں کی حمایت کرتا اور اسرائیل کی پالیسیوں کو تشویش کی نظروں سے دیکھتا تھا یہ بات بھی امریکہ کو کھٹکتی تھی۔

سیاسی سرگرمیاں

فیلڈ مارشل ایوب خان نے اختیار سنبھالتے ہی بہت سے سیاسی رہنماؤں پر "ایبڈو" قانون کے تحت پابندی لگا دی تھی کہ وہ چھ سال تک سیاست میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں یہ مدت پوری ہو چکی تھی، اکثر سیاستدانوں پر پابندی ختم ہو چکی تھی، اس لئے وہ اعلانیہ حکومت کی پالیسیوں کو نشانۂ تنقید بنانے لگے، اُدھر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن نے ۶ نکاتی پروگرام پیش کر دیا۔ یہ پروگرام اصل میں علیحدگی کی پسندی کا پیش خیمہ تھا۔ مولانا مودودی تک نے اس پروگرام کو ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف قرار دیا۔ تاہم انتقام کے جذبے اور ایوب دشمنی کی بناء پر مغربی پاکستان کی کئی سیاسی جماعتوں نے بھی چھ نکات کی حمایت شروع کر دی، اس پر ۱۸ فروری ۱۹۶۶ء

کو سردار شوکت حیات، نوابزادہ نصر اللہ خان، خواجہ رفیق اور غلام جیلانی کو گرفتار کر لیا گیا۔ جون ۱۹۶۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو (جو اس وقت تک صدر ایوب کے دست راست تھے) نے بھی وزارتِ خارجہ کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ مستعفی ہونے پر لاہور اور کراچی میں بھٹو کا زبردست استقبال ہوا۔ بعد میں صدر ایوب کے ایک اور قابلِ اعتماد ساتھی ملک امیر محمد خان نے بھی گورنری چھوڑ دی، اس پر ۱۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کو جنرل محمد موسیٰ کو مغربی پاکستان کا گورنر اور آغا محمد یحییٰ خان کو افواجِ پاکستان کا کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔ مغربی پاکستان میں نئی کابینہ تشکیل دی گئی جس میں ملک خدا بخش بچہ، میاں یٰسین وٹو، محمد خان جونیجو، مخدوم حمید الدین، محمد علی خان ہوتی، بیگم زاہدہ خلیق الزمان، احمد سعید کرمانی، غلام سرور خان پنیالہ، ملک اللہ یار اور اے۔ بی خواند شامل تھے۔

یکم جنوری ۱۹۶۷ء سے سیاستدانوں پر پابندیاں ختم ہو گئیں، جگہ جگہ جلسے منعقد ہونے لگے جلوس نکلنے لگے اور نعرہ بازی اور ہنگامہ پروری شروع ہو گئی۔ اُدھر اندرونی انتشار کو دیکھ کر بھارت بھی شیر ہو گیا، اس نے پاکستان کو آنکھیں دکھانی شروع کر دیں، صدر ایوب نے رُوس سے احتجاج کیا کہ معاہدہ تاشقند پر عملدرآمد نہیں کیا جا رہا۔ وہ خود رُوس گئے جس کے جواب میں روسی وزیر اعظم کوسیجن بھی پاکستان آئے جس سے باہمی تعلقات میں کچھ خوشگواری پیدا ہوئی۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کو بھٹو کھل کر میدان میں آ گئے اور انہوں نے پیپلز پارٹی کے نام سے اپنی سیاسی جماعت قائم کر لی۔

۱۹۶۸ء کے شروع ہی میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ایک منظم سازش پکڑی گئی۔ اسے اگرتلہ سازش کیس بھی کہا جاتا ہے، بھارتی ڈپٹی ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکرٹری اوجھا سے ساز باز کی گئی تھی کہ بھارت مشرقی پاکستان کی مدد کرے تاکہ وہ پاکستان سے الگ ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر سکے، شیخ مجیب سازش کے سرغنہ تھے، ۲۸ افراد کو اس سازش میں ملوث ہونے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا اور ایک ٹریبونل اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ اس سازش میں ملوث افراد پر مقدمہ قائم کرے اور انہیں مناسب سزائیں دے۔

بھٹو نے پیپلز پارٹی قائم کرتے ہی مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں جلسے کئے،

لوگوں کو روٹی، کپڑے اور مکان" کا نعرہ دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ صدارتی انتخاب میں حصہ لیں گے، وہ پشاور، کوہاٹ اور ڈیرہ پہنچے اور اپنی شعلہ بیانی سے عوام کو اپنی طرف مائل کیا۔

۵ نومبر ۱۹۶۷ء کو پشاور پہنچے، پشاور کے ایک ہوٹل میں انہیں دعوتِ استقبالیہ دی گئی، حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے جناب بھٹو نے اپنی مجوزہ پارٹی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ۷ نومبر کو سرحد زونل مسلم لیگ کے خزانچی حیات محمد خان شیرپاؤ نے جو بھٹو سے بے حد عقیدت رکھتے تھے، اپنے گاؤں شیرپاؤ تحصیل چارسدہ میں ایک عصرانہ دیا جس میں ایک ہزار کے لگ بھگ لوگوں نے شرکت کی، خان عبدالولی خان، ارباب محمد سعید خان، سردار علی خان، سید مظہر گیلانی، کریم اللہ خان درّانی، صفدر حسین ایڈووکیٹ، حمید اللہ صراف، سیف الرحمٰن کیانی اور دوسرے قومی کارکن عصرانے میں شامل ہوئے۔ بھٹو نے اپنے اسلامی مساوات کے فلسفے پر روشنی ڈالی اور صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کے عزم کا اظہار کیا۔

طلباء کی بے چینی

ادھر سیاسی جماعتیں خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی تھیں اور طرح طرح کے نعروں سے عوام کو اپنے طرف مائل کر رہی تھیں، اُدھر طلبا میں بے چینی کی لہر چل نکلی، بظاہر تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یونیورسٹی آرڈیننس جاری کیا گیا تھا جس کے تحت طلباء کو سیاسی سرگرمیاں سے باز رکھنے کے لئے یہ شق شامل تھی کہ تخریبی کارروائیوں میں ملوث طلباء کی تعلیمی ڈگریاں واپس لے لی جائیں گی۔ طلباء نے اس آرڈیننس کے خلاف احتجاجی تحریک چلائی تاہم حقیقت یہ تھی کہ سیاسی جماعتیں طلباء کو اکسا رہی تھیں۔ کالجوں اور سکولوں میں سیاسی پارٹیوں نے اپنی ذیلی تنظیمیں قائم کر رکھی تھیں۔ اتفاق سے اُن دنوں راولپنڈی کے ایک تعلیمی ادارے کے طلباء سیر و سیاحت کی غرض سے درّہ خیبر آئے تھے۔ ان پر سمگلنگ کے تحت کسٹمز نے کیس بنا دیا تھا، یہ طلباء راولپنڈی کے ایک ہوٹل کے پاس جمع تھے کہ انہیں ایک سیاسی لیڈر کے پشاور سے راولپنڈی آنے کی خبر ملی — طلباء پولی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ کے پاس جمع ہو گئے اور ہنگامہ بازی شروع کر دی۔ جس پر پولیس نے اُن پر لاٹھی چارج اور فائرنگ کر دی، عبدالحمید نامی طالب علم مارا گیا، ہنگامہ چل نکلا۔ دوسرے دن طلباء نے پھر جلوس نکالا تو پولیس نے پھر گولی چلا دی، ۲ افراد ہلاک ہو گئے، طلباء میں اشتعال پیدا ہوا تو حکومت نے تمام

یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے بند کر دیئے ہر چند وزیر تعلیم انوار الحق نے اعلان کیا کہ آرڈیننس منسوخ کر دیا جائے گا کسی سے تعلیمی ڈگریاں واپس نہ لی جائیں گی لیکن بات اب چل نکلی تھی اسے روکا نہ جا سکا۔

صدر ایوب پر فائرنگ

ان سیاستدانوں کے مقابلے میں صدر ایوب نے بھی پاکستان مسلم لیگ کے تنظیمی جلسوں کا فیصلہ کیا، ۱۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو اس سلسلے میں ایک عظیم الشان اجتماع جناح پارک پشاور میں ہوا۔ دو تین لاکھ افراد نے اجتماع میں شرکت کی، صوبے بھر سے صدر ایوب کے حامی جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ نوابزادہ عبدالغفور خان آف ہوتی نے (جو اس وقت وزیر تجارت تھے) صدر کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ایوب خان جلسے سے خطاب کرنے ہی والے تھے کہ پستول کی دو گولیوں کی آواز سنائی دی۔ یہ گولیاں ایک نوجوان محمد ہاشم نے چلائی تھیں۔ فوج کے ایک سابق صوبیدار دلی محمد شنواری نے، جو قریب ہی بیٹھا تھا۔ فوراً اس نوجوان کو دبوچ لیا۔ پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی۔ تاہم صدر ایوب خان نے نہایت دلجمعی سے برجستہ تقریر کی اور ساری تقریر میں گولی چلانے کے واقعہ کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔ وہ ہوا کا رُخ بھانپ گئے تھے۔ اس لئے جلسے کے آخر میں دُعا کی تو یہی کی کہ "خدا پاکستان کو استحکام ترقی اور خوشحالی عطا کرے اور پاکستان کے رہنے والوں میں تحمل اور بردباری پیدا کرے"۔

طلباء پر گولی چلنے سے اشتعال پھیلا تو حالات دن بدن خراب ہوتے گئے، گورنمنٹ کالج نوشہرہ کے طلباء کے ایک اجتماع پر بھی گولی چلی اور ظہیر نامی ایک طالب علم مارا گیا۔ مظاہروں کا یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ وکلاء، ڈاکٹر، مزدور، کسان، اساتذہ اور سرکاری ملازم سبھی اپنے اپنے مطالبات کے حق میں جلوس نکالنے لگے۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو پشاور میں مسلم لیگ کے جلسہ میں گولی چل گئی ۶ افراد زخمی ہوئے، ہنگامہ آرائی عام ہوتی گئی اور امن و امان درہم برہم ہو گیا۔

عشرۂ ترقیات

۱۹۶۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان کو حکومت سنبھالے دس سال گذر گئے تھے، اس عرصے میں ہر شعبۂ زندگی میں اصلاحات نافذ کی گئی تھیں، حکومت نے فیصلہ کیا کہ ملک بھر میں "عشرۂ ترقیات" منایا جائے اور حکومت کے حق میں پروپیگنڈہ کیا جائے لیکن یہ پروپیگنڈہ چونکہ سرکاری مشینری کے توسط سے ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کا اُلٹا اثر

ہوا، حمایت کی بجائے حکومت کی مخالفت بڑھتی چلی گئی اور یہ جشنِ ترقی ایوب خان کے خلاف تحریک کا پیش خیمہ بن گیا۔

گول میز کانفرنس مشرقی پاکستان میں بھی سیاسی ہلڑ بازی اور ہنگامہ آرائی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، متحدہ محاذ کی طرف سے آئے دن احتجاجی جلوس نکلتے تھے۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں کئی بار پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی، اُدھر صدر ایوب خان کے ساتھیوں میں سے جنرل اعظم خان اور ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان بھی عوامی رہنمائی کے شوق میں میدانِ سیاست میں وارد ہو چکے تھے اور ایوب خان کی مخالفت کو اپنا مقصدِ اولیٰ بنائے ہوئے تھے۔

۱۹۶۹ء کے شروع ہوتے ہی ملک میں سیاسی طوفان اور شدت اختیار کر گیا، پاکستان کی آٹھ سیاسی جماعتوں نے صدر ایوب کی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا، آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت تحریک شروع کر دی گئی، ڈھاکہ، کراچی، راولپنڈی، پشاور اور متعدد بڑے شہروں میں پولیس نے صورتِ حال پر قابو پانے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ جس پر وہاں فوج طلب کرنی پڑی بالخصوص مشرقی پاکستان اور کراچی میں حالات انتہائی خراب ہو گئے۔ صوبہ سرحد بھی اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ ریاست دیر میں مظاہرین نے پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر کو آگ لگا دی جس پر حکومت کو گولی چلانی پڑی جس سے ستّرہ افراد ہلاک ہو گئے۔ ان ہنگاموں میں کروڑوں روپے کی نجی اور سرکاری املاک تباہ ہو گئی، کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا اور زندگی کا ہر شعبہ ان ہنگاموں اور بدنظمی سے متاثر ہوا۔

بالآخر جب ملک کی انتظامیہ اس تحریک کے سامنے بے بس ہو گئی تو مارچ ۱۹۶۹ء کے آغاز میں صدر ایوب نے سیاسی جماعتوں کی گول میز بلانے پر رضامندی ظاہر کر دی، سیاسی لیڈروں نے اسے حکومت کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے طرح طرح کے مطالبات شروع کر دیئے۔ سیاسی نظربندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جسے ایوب خان نے تسلیم کر لیا لیکن پھر اگرتلہ سازش کیس کو واپس لینے پر اصرار ہونے لگا۔ جو سراسر ناجائز مطالبہ تھا۔ اس پر مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا۔ بعد میں سیاسی دباؤ کے تحت ایوب خان کو یہ مطالبہ بھی ماننا ہی پڑا لیکن اس کا جو انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے سارے

مطالبات ماننے کے بعد گول میز کانفرنس شروع ہوئی تو بھی بھٹو اور اصغر خان اس میں شریک نہ ہوئے۔ ۲۰ مارچ سے حکومت اور سیاسی رہنماؤں میں مذاکرات کا آغاز ہوا۔ حزب مخالف کی جانب سے اس میں خان عبدالولی خان، پروفیسر غلام اعظم، مظفر احمد، شیخ مجیب الرحمٰن، سید مودودی مولوی فرید احمد، میاں ممتاز دولتانہ، نوابزادہ نصراللہ خان، سردار شوکت حیات، محمود الحق عثمانی، مولانا مفتی محمود، عبدالسلام، اصغر خان اور جسٹس مرشد نے حصہ لیا جب کہ حزب اقتدار یا حکومت کی طرف سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، اے آر خان، خواجہ شہاب الدین، ایس۔ ایم ظفر، چوہدری فضل الٰہی، ملک قاسم، نورالہدیٰ، قاضی محمد عیسیٰ، فخر الدین احمد، قاضی محمد اکبر، ہاشم الدین اور فدا محمد خان نے نمائندگی کی۔ بھٹو، بھاشانی اور جنرل اعظم خان گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوئے بعد میں اصغر خان بھی کسی بات پر اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔

صدر ایوب خان نے پارلیمانی نظام کی بحالی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کے مطالبات تسلیم کر لئے۔ یہ بھی اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس پر حزب مخالف کی جانب سے اضافی مطالبات شروع ہو گئے ایک یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔ پھر دفاع، امور خارجہ اور چند شرائط کے ساتھ کرنسی کے سوا تمام معاملات صوبوں کو دیئے جانے پر زور دیا گیا ـــــ ساتھ ہی ہڑتالوں، جلسے جلوسوں کا بھی زور رہا ـــــ ایوب خان نے دونوں صوبوں میں نئے گورنروں کے تقرر اور وزیروں کی فہرستوں کو از سر نو مرتب کرنے کے احکام بھی جاری کر دیئے لیکن حزب اختلاف کے رہنماؤں کی تسلی نہ ہوئی۔ صدر ایوب خان نے جب کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو اقتدار کمانڈر ان چیف جنرل محمد یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ حالانکہ اُن کا اپنا وضع کردہ آئین موجود تھا جس کی رُو سے اقتدار کی منتقلی قومی اسمبلی کے سپیکر کو ہونی چاہیئے تھی۔ بعض سیاسی حلقوں کے مطابق ایوب خان کا یہ اقدام یحییٰ خان کے شدید دباؤ کے تحت عمل میں آیا جو اس وقت صدارت کے خواب دیکھ رہے تھے۔

اقتدار کی منتقلی سے قبل صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا، اپنی خدمات گنوائیں۔ اپنے خلوص کی یقین دہانی کرائی، بعض سیاسی رہنماؤں کے غیر مصالحانہ رویے کا ذکر کیا اور بتایا کہ

ملک کی بقاء کے لئے انتقالِ اقتدار ناگزیر ہو گیا تھا۔

ایوب خان چاہتے تو سیاسی میدان میں رہ کر نئی حکومت کی مخالفت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ وہ کچھ ایسے دل شکستہ ہوئے کہ کنونشن مسلم لیگ کی صدارت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ وہ راولپنڈی ہی میں اپنے ذاتی بنگلے میں مقیم رہے۔ انہوں نے ملک ٹوٹتے اور بنگلہ دیش بنتے ہوئے دیکھا — اپنی بیماری کے دوران وہ علاج کے لئے بیرونی ملکوں میں بھی گئے مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۴ء کو دوپہر سوا بارہ بجے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن انہیں اپنے آبائی گاؤں ریحانہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پاکستان کے سربراہوں میں ایوب خان سب سے طویل عرصہ کے لئے برسرِ اقتدار رہے۔

یحییٰ خان کا دورِ حکومت

مارچ ۱۹۶۹ء — دسمبر ۱۹۷۱ء

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے تمام اختیارات جنرل محمد یحییٰ خان، کمانڈر اِن چیف افواج پاکستان کے حوالے کر دیئے۔ جنرل یحییٰ خان اپنے پیش رَو کی طرح صوبہ سرحد ہی کے ایک فرزند تھے، وہ پشاور شہر کے مشہور قزلباش خاندان سے تعلق رکھتے تھے، فوج میں اُن کا ریکارڈ بہت شاندار تھا اور ان کا شمار پاک فوج کے سرکردہ اور تجربہ کار افسروں میں ہوتا تھا۔ ترقی کرتے کرتے وہ کمانڈر اِن چیف کے بلند منصب تک پہنچے اور بالآخر پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔

۲۶ مارچ کو انہوں نے سربراہ مملکت کی حیثیت میں پہلی بار ریڈیو پاکستان سے قوم سے خطاب کیا۔ انہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ فوجی حکومت کا اوّلین کام ملک میں امن و امان اور نظم و نسق بحال کرنا ہوگا۔ اس کے بعد حالات کے سازگار ہوتے ہی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرائے جائیں گے اور حکومت کا کاروبار منتخب نمائندوں کے سپرد کیا جائے گا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں، آئین منسوخ کر دیا گیا۔ صوبائی اور مرکزی وزراء کو سبکدوش کر دیا گیا، فوجی عدالتیں قائم کی گئیں اور ملک کو مختلف خطّوں میں تقسیم کر کے اُن پر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے، خود آغا محمد یحییٰ خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا منصب سنبھالا جبکہ لفٹیننٹ جنرل عبدالحمید خان، وائس ایڈمرل ایس۔ ایم احسن اور ایئر مارشل نور خان کو ڈپٹی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ لفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن کو مغربی پاکستان اور میجر جنرل مظفر الدین کو مشرقی پاکستان کا گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا، ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کی ممانعت کر دی

گئی اور جلسے کرنے اور جلوس نکالنے پر پابندی لگا دی گئی ۔ اس امر پر زور دیا گیا کہ آئینی حکومت بحال کرنے کے لئے فضا سازگار بنائی جائے ۔ مغربی پاکستان کو سات سیکٹروں میں تقسیم کر کے ان پر سب مارشل ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے ۔ تعلیمی ادارے کھل گئے اور طلباء کو یقین دلایا گیا کہ اُن سے اس عرصے کی فیس وصول نہیں کی جائے گی جس میں سکول اور کالج بند رہے ، ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایک انتظامی کونسل قائم کر دی گئی اور مختلف محکموں کی نگرانی انتظامی کونسل کے مختلف ارکان کے سپرد کی گئی ۔ تعلیم و تربیت کا شعبہ ایئر مارشل نور خان کے سپرد کر دیا گیا ۔ سرکاری واجبات کی وصولی کی مہم تیز کر دی گئی ، رشوت ستان افسروں اور سرکاری ملازموں کے خلاف تادیبی کارروائی عمل میں آئی اور کئی ایک کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا ـــــ ڈھاکہ ہیر کے مواصلاتی اڈے سے امریکیوں کی واپسی شروع ہو گئی ، مسئلہ کشمیر کو حل کرنے اور پاک بھارت تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے کوششیں تیز تر کر دی گئیں ، ایئر مارشل نور خان اس سلسلے میں دہلی گئے اور اندرا گاندھی وزیر اعظم بھارت ، شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ سے بات چیت کی ، اسی طرح جنرل یحییٰ خان نے سیاست دانوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا ۔ اسی طرح یحییٰ خان اور روسی وزیر اعظم کوسیجن میں بات چیت بھی ہوئی جس میں باہمی دلچسپی کے کئی امور پر اتفاق رائے ہو گیا ۔

جون ۱۹۶۹ء میں نظر بند طلباء اور سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا گیا اور محدود پیمانہ پر سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں ـــــ کنونشن لیگ نے اپنے اجلاس میں فیلڈ مارشل ایوب خان کو صدر ، نواب ممدوٹ عبدالجبار خان اور قاضی عیسیٰ کو نائب صدر ، ملک قاسم کو جنرل سیکرٹری اور نوابزادہ عبدالغفور خان کو جماعت کا خزانچی منتخب کیا ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اعلان کیا ۔ اُن کے اور ان کی جماعت کے نزدیک امن کی بحالی کے لئے ۱۹۵۶ء کے آئین پر عمل درآمد ضروری ہے ، ۲۴ جون ۱۹۶۹ء کو چار سیاسی جماعتیں (قومی جمہوری محاذ ، نظام اسلام ، عوامی لیگ اور جسٹس پارٹی) پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ۔ ڈی ۔ پی) میں مدغم ہو گئیں ۔ باقی جماعتوں نے بھی انتخابی مہم چلانے کی تیاریاں زور شور سے شروع کر دی ۔ جس سے لوگوں کے دلوں میں فوجی حکومت پر اعتماد بحال ہو گیا ۔

۲۴ جولائی ۱۹۶۹ء کو امریکہ کے خلا باز آرمسٹرانگ ، ایڈون الڈرین اور مائیکل کولنز چاند کی تسخیر کے بعد پاکستان کے وقت کے مطابق ٹھیک نو بجکر ۴۵ منٹ پر واپس بحر الکاہل میں گرے ہوئے ایک

سمندری جہاز پر اتر آئے، طیارہ بردار جہاز ہاؤنٹ پر امریکی صدر نکسن خلاء پیماؤں کے استقبال کے لئے خود موجود تھے، صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان نے انسانی عظمت کے اس عظیم کارنامے پر امریکی صدر کو مبارک کا پیغام دیا۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء میں خان عبدالغفار خان نے ۲۵ دن تک ہندوستان کا دورہ کیا، خدائی خدمتگار لیڈر پاکستانی پاسپورٹ پر وہاں گئے تھے اور ان کے دورے کا مقصد گاندھی جی کی صد سالہ تقریبات میں حصہ لینا تھا، اُن کے پہنچنے پر جن لوگوں نے، اُن کے استقبال میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ صوبہ سرحد سے گئے ہوئے ہندو تھے۔ سرحدی رہنما کو "نہرو ایوارڈ" اور کئی لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی گئی ـــــ احمد آباد گجرات میں اُن دنوں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے، خان عبدالغفار خان نے ان پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور عدم تشدد کے علمبردار گاندھی جی کے دیس میں تشدد پسندی کے واقعات کی شدید مذمت کی، پشاور کے انگریزی روزنامہ "خیبر میل" کے ایڈیٹر عسکر علی شاہ بھی اس دورے میں "بادشاہ خان" کے ساتھ تھے، انہوں نے اس دورے کے تاثرات مفصل بیان کئے۔

سرحدی ریاستوں کا خاتمہ

صدر یحییٰ خان یوں تو بڑے سنجیدہ شخص تھے تاہم اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے بڑے جذباتی فیصلے کئے اور بڑی عجلت پسندی سے کام لیا، وہ لوگوں کی ہر بات کو اخلاص و صداقت پر محمول قرار دیتے تھے، ریاست دیر اور سوات کے کئی وفد انہیں ملے، وفد کے ارکان نے ان ریاستوں کے حکمرانوں کے مظالم کی فرضی داستانیں بیان کیں۔ ان شکایات کی چھان بین کرائے بغیر یحییٰ خان نے بیک جنبشِ قلم چترال دیر، سوات اور امب کی سرحدی ریاستیں ختم کر دیں اور انہیں پاکستانی علاقوں میں ضم کر کے ضلعے بنا دیا گیا، ریاستوں میں ڈپٹی کمشنر اور دوسرے انتظامی افسر مقرر کر دیئے گئے، مالاکنڈ کو ڈویژن کا درجہ دے کر وہاں ایک ڈویژنل کمشنر مقرر کر دیا گیا۔

یہ فیصلہ اتنا اچانک تھا کہ نئی انتظامیہ کو اتنا وقت بھی نہ ملا کہ وہاں جا کر پورا جائزہ لینے کے بعد مقامی حالات کے مطابق کوئی قدم اٹھاتے، ریاستی حکمران ختم ہو چکے تھے اور پاکستانی حکام کو انتظامی مشینری کو حرکت میں لانے کے لئے وقت درکار تھا۔ افراتفری کا سا سماں دیکھنے

میں آیا۔ ریاستی عوام نے اکثر جنگلات کا صفایا کر دیا، سڑکوں کے کناروں سے درخت کاٹ لیے اور اپنی من مانی کرنے لگے۔

درحقیقت چترال ۱۹۵۰ء سے اور دیر ۱۹۶۰ء سے اپنا علیحدہ وجود کھو چکے تھے۔ ان علاقوں کی آبادی ابھی زمانہ وسطیٰ کے قبائلی قوانین اور رسم و رواج کے مطابق چل رہی تھی، قومی امور اور تنازعوں کا تصفیہ مقامی جرگوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ تعلیم یہاں نہ ہونے کے برابر تھی، اس لئے فوری طور پر ان لوگوں سے ذہنی تبدیلی کی توقع کرنا ناممکن تھا۔ پاکستانی علاقے کے قوانین وہاں فوری طور پر نافذ کرنا کسی طرح بھی قرینِ دانش نہ تھا۔ ہمارے ہاں عدلیہ کا نظام کچھ ایسا پیچیدہ تھا کہ مقدمے کے فیصلے کے لئے سالہا سال درکار تھے، اس میں وکیلوں اور عدالتی کارکنوں کے بغیر کام نہ چل سکا۔ قبائلی علاقوں کے پس ماندہ اور اَن پڑھ عوام کے لئے یہ التواء اور یہ مسائل ناقابلِ برداشت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے پر اس کا شدید ردِعمل ہوا۔ دیر اور باجوڑ میں لوگوں سے نپٹنا مشکل ہو گیا۔ اور ہر طرف بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔

ریاست سوات البتہ پہلے ہی سے کافی ترقی یافتہ تھی، والیٔ سوات کی کوششوں سے وہاں تعلیم عام تھی، لوگ امن پسند تھے، اس لئے وہاں حالات نسبتاً پُرسکون رہے، تاہم کئی شعبوں میں وہاں بھی روزمرہ کا کاروبار متاثر ہوا۔ سوات کے حکمران نے لوگوں کو سہولت دے رکھی تھی کہ وہاں کپڑا بنانے والی فیکٹریوں سے ٹیکس اور محصولات نہ لئے جائیں گے چنانچہ وہاں سینکڑوں فیکٹریاں قائم ہو گئی تھیں۔ اب اُن فیکٹریوں پر ٹیکس اور اکسائز ڈیوٹی لگی تو کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ـــــ اسی طرح ان علاقوں میں انکم ٹیکس وغیرہ لاگو نہ تھا، نئے قوانین کے تحت انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی وصولی وہاں بھی شروع ہو گئی۔

۱۹۶۹ء کے وسط میں جنرل محمد یحییٰ خان نے سات ارکان پر مشتمل ایک وزارتی کونسل قائم کر دی علاوہ بریں ایئر مارشل نور خان کو فضائیہ سے سبکدوش کر کے مغربی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ انہی دنوں صیہونی فتنہ پردازوں نے فلسطین میں مسجدِ اقصیٰ کو نذرِ آتش کر دیا۔ جس پر پاکستانی عوام نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا، ملک بھر میں اسرائیل اور اُس کے سرپرست امریکہ کے خلاف مظاہرے ہونے لگے ان مظاہروں کی آڑ میں سیاسی جماعتوں کو اپنی مقصد برآری کا موقع مل گیا۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں صدر یحییٰ خان کی حکومت نے بالغ رائے دہی کی بناء پر انتخابات کے لئے قواعد کا اعلان کر دیا، ووٹروں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا اور سیاسی سرگرمیاں بھی تیز تر ہو گئیں۔ ۲۸ نومبر کو ایک لیگل فریم ورک حکم نافذ ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ صرف اُنہی جماعتوں کو انتخابات میں حصّہ لینے کی اجازت ہو گی جو محبِّ وطن ہوں اور نظریۂ پاکستان پر یقین رکھتی ہوں، ساتھ ہی مغربی پاکستان میں ون یونٹ ختم کرنے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دینے کا اعلان بھی کیا گیا اور اس امر کا یقین بھی دلایا گیا کہ ملک میں آئندہ پارلیمانی وفاقی نظام رائج ہو گا۔

ون یونٹ توڑنے اور صوبوں کو خود مختاری دینے کا یہ اعلان بھی ایک عجلت پسندانہ اقدام تھا، سالہا سال تک غور و فکر کے بعد ملک کے دونوں بازوؤں میں مساوات قائم رکھنے اور ملکی سالمیت کے تقاضوں کے تحت چوہدری محمد علی، جنرل سکندر مرزا، حسین شہید سہروردی اور ڈاکٹر خان صاحب جیسے تجربہ کار اور مدبر زعماء نے وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام کو ملک میں آئینی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا تھا ـــــ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک آئین کے مسئلے کے حل کی اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور آئین کی تشکیل کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ـــــ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو ترازو کے دونوں پلڑوں کی طرح برابر رکھنے کے لئے پنجاب، سرحد سندھ اور بلوچستان پر مشتمل وحدتِ مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یونٹ کے دوران پسماندہ صوبوں میں ترقیاتی کام کی رفتار بھی تیز تر ہو گئی تھی ـــــ اگر کوئی طبقہ یونٹ کے قیام سے ناخوش تھا تو وہ اُن سیاستدانوں کا طبقہ تھا۔ جنہیں علیحدہ صوبوں کی صورت میں وزارتوں اور عہدوں پر آسانی سے قبضہ جمانے کا موقع مل سکتا تھا۔ یحییٰ خان نے اُن کے پروپیگنڈے کے تحت یونٹ ختم کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ مشرقی پاکستان کو، جو پہلے ہی اکثریت آبادی کا دعویدار تھا اور علیحدگی پسندی کا اعلان بھی کر چکا تھا، آخر کون سی طاقت مغربی پاکستان سے ہم آہنگ اور متحد ہونے پر مجبور کر سکے گی۔ ملکی سلامتی کو متاثر کرنے والے اتنے بڑے مسئلے کو طے کرنا منتخب نمائندوں پر مشتمل قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا کام تھا نہ کہ ایک فردِ واحد کا جسے سول انتظامیہ کے امور میں صرف چند ماہ کا تجربہ تھا۔

مغربی پاکستان کی وحدت کا قیام تبھی عمل میں آیا تھا۔ جب صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ کی صوبائی اسمبلیوں اور بلوچستان کے شاہی جرگہ نے اپنے اپنے اجلاس میں اُس کی حمایت میں قراردادیں منظور کیں اور پھر

قومی اسمبلی نے اس پر بحث و تمحیص کے بعد اسے قانونی تحفظ دیا۔ لیکن اب ایک طالع آزما مطلق العنان شخص نے بیک جنبش قلم یونٹ کو ختم کر دینے کا اعلان کیا ـــــ یہی عجلت پسندانہ اعلان آگے چل کر تمام ملکی مصائب اور انتشار کا سبب بن گیا اور پاکستان اپنے نصف حصّہ کے اقتدار ہی سے محروم ہو گیا۔

بہر حال یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے ون یونٹ ختم ہو کر رہ گیا اور مغربی پاکستان میں شامل تمام صوبے بحال کر دیئے گئے، لفٹیننٹ جنرل خواجہ محمد اظہر خان کو صوبہ سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا، پشاور صوبائی دارالحکومت بنا تو سیکرٹریٹ کا سارا عملہ لاہور سے یہاں منتقل ہو گیا اور بڑی چہل پہل اور رونق دکھائی دینے لگی، ۱۹۵۵ء سے قبل پانچ چھ وزراء، پانچ سات سیکرٹری اور چند آفس سپرنٹنڈنٹ صوبہ سرحد کا نظم و نسق چلاتے تھے، یونٹ کے دوران عملے میں اور اس کے اخراجات میں کئی گنا اضافہ ہوا اور ایک وقت ایسا آیا جب وزراء کی تعداد پندرہ سولہ تک جا پہنچی، درجنوں سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری اور جائنٹ سیکرٹری کرسیوں پر براجمان نظر آنے لگی اور سیکشن افسروں اور آفس سپرنٹنڈنٹوں کی تعداد ڈھائی تین سو تک جا پہنچی۔ مالی خسارے کا یہ صوبہ مزید زیر بار ہوا تو لوگوں پر ٹیکسوں کا بوجھ اور بڑھتا گیا ـــــ اس کے باوجود ہر جگہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنہوں نے ون یونٹ ٹوٹنے پر بڑی خوشیاں منائیں، چراغاں کئے اور جلوس نکالے۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے عام سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی، اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں ایک طوفانِ بدتمیزی مچ گیا۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ جنوری کے مہینے میں حیدر آباد، سندھ میں مخالف گروہوں میں تصادم ہوا۔ فوج بُلائی گئی۔ اس کے باوجود مشتعل ہجوم نے روزنامہ "ہلال پاکستان" کے دفتر کو آگ لگا دی، فروری میں سوات میں ہنگاموں کے بعد فرانٹیئر کور کے جوانوں کو امن و امان بحال کرنے کے لئے طلب کر لیا گیا، ان دنوں نواب دیر کے بیٹے شہاب الدین خان آف جندول نے نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت کر لی تھی، عوام میں اُسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ہنگامہ آرائی پر اُتر آئے۔ سیدو شریف کے قریب نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان کے جلوس پر فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ۲ افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔ کنونشن مسلم لیگ راولپنڈی کے جلسے میں ہنگامہ ہوا۔

انتخابات ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا فیصلہ جنرل یحییٰ خان کا ایک اور عجلت پسندانہ

اور آمرانہ اقدام تھا، اُن کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ مشرقی پاکستان میں مجیب کے چھ نکات نے آگ لگا رکھی تھی، بہاریوں، مغربی پاکستانیوں اور اسلام پسندوں کا قتل عام ہو رہا تھا، بھارتی جاسوس ہزاروں کی تعداد میں سرگرم عمل تھے، خود وہاں کے ہندو، جو مال و دولت میں بھی مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے اور تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ تھے، مرکزی حکومت اور مغربی پاکستانیوں کے خلاف زہر پھیلانے میں مصروف تھے۔ رونا رویا جاتا تھا کہ بنگال کے بھوک اور افلاس کی ساری ذمہ داری مغربی پاکستانیوں پر عائد ہوتی ہے، بنگالی عوام میں اس احساسِ محرومی کو ہوا دی جا رہی تھی۔ جنرل یحییٰ خان پر یہ بھی واضح تھا کہ "ایک آدمی ایک ووٹ" کی بنیاد پر انتخاب ہوئے تو لازماً اپنی عددی برتری کی بدولت مشرقی پاکستان کے نمائندوں کو اکثریت حاصل ہو گی جو مغربی پاکستان کو اپنی ایک کالونی بنا کر رکھ دیں گے ـــــ تاہم یحییٰ خان کو مقبولیتِ عامہ کا تاج اپنے سر پر سجانے کی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے حالات کے سازگار ہونے کا بھی انتظار نہ کیا۔ ۱۰ اپریل کو چیف الیکشن کمشنر نے اعلان کر دیا کہ ملک بھر میں انتخابات ایک ہی وقت پر ہوں گے۔ ساتھ ہی قومی اور صوبائی اسمبلی کی صوبہ وار نشستیں کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کی رُو سے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں مردوں کے لئے چالیس اور خواتین کے لئے دو نشستیں رکھی گئی تھیں اور قومی اسمبلی میں صوبہ سرحد کے لئے اٹھارہ، قبائلی علاقوں کے لئے سات اور خواتین کے لئے ایک نشست مختص تھی۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں فوج کی نگرانی میں انتخابات ہوئے، سب نے تسلیم کیا کہ انتخابات واقعی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوئے ہیں۔ لیکن ہوا یہی کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کا سیلاب سب کو بہا کر لے گیا، کسی دوسری جماعت کے نمائندے کو سامنے آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی ـــــ کہیں مقابلہ ہوا بھی تو عوامی لیگ کے آگے کسی کے پاؤں نہ جم سکے۔ قریباً سبھی نشستوں پر شیخ مجیب الرحمٰن کے حامی علیحدگی پسند لوگ کامیاب ہو گئے۔

مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی، یہ جماعت پہلی بار انتخابی اکھاڑے میں اتری تھی لیکن دو تہائی کے قریب نشستوں پر اس کے اُمیدوار کامیاب ہو گئے۔ صوبہ سرحد میں قومی اسمبلی میں قیوم مسلم لیگ نے ۷، نیشنل عوامی پارٹی نے ۳، اور جمعیت العلمائے اسلام نے ۲ نشستیں حاصل کیں، جب کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کے انتخابی نتائج کے مطابق نیشنل عوامی پارٹی کو ۱۳،

پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کو ۱۰، جمعیت العلمائے اسلام کو چار، پیپلز پارٹی کو ۳، کونسل مسلم لیگ کو ایک، کنونشن مسلم لیگ کو دو، جماعت اسلامی کو ایک اور آزاد امیدواروں کو پانچ صوبائی نشستیں ملیں۔ بلوچستان میں بھی نیپ اور جمعیت العلماء زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔

انتخابات کے باوجود ملک بھر میں سیاسی جماعتیں آمادۂ فساد رہیں، جگہ جگہ ہنگامے برپا ہوتے رہے، بہاول پور کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک نے زور پکڑا جس پر حکومت کی مشینری حرکت میں آئی اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا۔ لاہور چھاؤنی کے نواح میں ہولناک دھماکہ ہوا جس سے سارا شہر لرز اُٹھا، ۲۳ افراد جاں بحق اور زخمی ہوئے، اکتوبر میں پشاور میں چار کروڑ روپیہ کا غیر ملکی اسلحہ پکڑا گیا۔ کراچی کے ہوائی اڈہ پر پی۔ آئی۔ اے کی ایک گاڑی نے پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ کو کچل دیا۔ مشرقی پاکستان میں طوفان سے ایک لاکھ افراد کے مارے جانے کی خبریں اخباروں میں چھپیں۔

"گنگا" کا اغواء

انہی دنوں ہندوستان کی طرف سے ایک اور سازش کی گئی، دو کشمیری نوجوانوں نے "گنگا" نامی مسافر بردار طیارہ سری نگر سے اغوا کر کے اُسے لاہور کے ہوائی اڈہ پر اتار لیا اور مسافروں کو اتار کر طیارہ کو آگ لگا دی، بھارت نے طیارے کے اغوا اور اُس کے جلائے جانے کو بہانہ بنا کر مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہوائی راستہ بند کر دیا یہ ایک بہت بڑی چال تھی، اب پاکستان کے جہازوں کو کراچی یا لاہور سے ڈھاکہ جانے کے لئے کولمبو کا راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا جس سے بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ شروع میں طیارہ اغوا کرنے والوں کو مجاہدین سمجھا جاتا رہا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل میں یہ بھارت کی چال تھی، اُس نے ایک جہاز کا نقصان قبول کیا لیکن پاکستان کو اربوں روپے کا نقصان پہنچایا اور ہماری مشکلات میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔

صوبہ سرحد کے انتخابی نتائج

دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں صوبہ سرحد کی پارٹی پوزیشن یہ تھی۔

سرحد اسمبلی

پاکستان مسلم لیگ	(قیوم گروپ)	= ۱۰

نیشنل عوامی پارٹی ——— ۱۳

جمعیت العلمائے اسلام ——— ۴

پیپلز پارٹی ——— ۳

جماعت اسلامی ——— ۱

کونسل مسلم لیگ ——— ۱

کنونشن مسلم لیگ ——— ۲

آزاد ——— ۶

کل ۴۰

بعد میں دو خواتین منتخب ہوئیں تو تعداد ۴۲ کو پہنچ گئی۔

اس انتخاب کے نتیجے میں کامیاب ہونے والوں کے نام یہ تھے، حیات محمد خان شیرپاؤ، ارباب جہانگیر خان، ارباب سکندر خان، ارباب سیف الرحمٰن خان، خان عبدالولی خان، خان محمد اکرم خان حاجی تاج محمد، ولی محمد خان، سعد اللہ خان، عبدالرازق خان۔ حق نواز خان، محمد ہارون خان، سید مزمل شاہ، اقبال خان جدون، سردار گل زمان خان، راجہ سکندر زمان خان، محمد نواز خان، عبدالصمد خان، محمد اکرم خان مردان، امیر زادہ خان، میجر جنرل (ریٹائرڈ) جی۔ ایم جیلانی، محمد فردوس خان، عبدالمستعان خان، عظمت علی خان، مولانا حبیب گل، محمد اسلم خان خٹک، سردار عنایت اللہ خان گنڈہ پور، مخدوم عطاء الرحمٰن، ہمایوں سیف اللہ خان، مولوی محمد یعقوب، عبدالصمد خان بنوں، قادر نواز خان، مسٹر حنیف خان، مسٹر عبدالرؤف، مولانا عبدالباقی، محمد افضل خان، حاجی محمد الرحمٰن رحمان اللہ خان، مولوی محمد یعقوب، امان اللہ خان، بیگم کلثوم سیف اللہ اور بیگم محمودہ سلیم۔

جب کہ قومی اسمبلی کے لئے صوبہ سرحد سے منتخب ہونے والے ارکان کی جماعت وار تفصیل یہ تھی

۱۔ پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) ——— ۷

۲۔ جمعیت العلماء اسلام ——— ۶

۳۔ نیشنل عوامی پارٹی ——— ۳

۴۔ پیپلز پارٹی ——— ۱

۵۔ جماعت اسلامی ——— ۱

کل = ۱۸

قومی اسمبلی کے منتخب ارکان یہ حضرات تھے :۔

محمد یوسف خان خٹک، غلام فاروق خان، خان عبدالولی خان، مولانا عبدالحق، مولوی عبدالحکیم ہزاروی، مولانا غلام غوث ہزاروی، سردار عنایت الرحمٰن عباسی، خان عبدالقیوم خان، خان عبدالخالق خان، امیرزادہ خان، محمد حنیف خان مانسہرہ، مولوی نعمت اللہ، مولانا مفتی محمود، مولانا صدرالشہید، لالہ رحیم شاہ، صاحبزادہ صفی اللہ، آنالیق جعفر علی۔

قبائلی علاقوں اور مخصوص نشستوں سے حاجی صالح خان، اکبر خان، نعمت اللہ خان شنواری، میجر جنرل (ریٹائرڈ) جمال دار خان، ملک جہانگیر خان، عبدالسبحان خان، بیگم شیریں وہاب، مسٹر اینڈریوز (اعدان کی وفات پر مسز نجمہ اینڈریوز) اور عبدالمالک کو قومی اسمبلی کا رکن چنا گیا۔

بعد میں جماعتی پوزیشن تبدیل بھی ہوتی رہی اور ایک جماعت کے ارکان اپنی پرانی جماعت کو چھوڑ کر نئی جماعت میں شریک ہونے لگے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو بنگال پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے سبھی مسلمانوں نے عہد کیا تھا کہ ہم اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے مریں گے۔ لیکن خود غرض سیاست دانوں کی دُنیوی اغراض نے عوام میں علاقہ پرستی اور ذاتی مقصد برآری کا وہ زہر گھول دیا کہ ایک علاقہ کے لوگ دوسرے علاقہ کے لوگوں کے مقابلے میں صف آراء ہو گئے۔ اس نفاق سے غیروں نے فائدہ اٹھایا، بھارت اور دوسری پاکستان دشمن طاقتیں کھل کر سامنے آگئیں اور جو مقصد وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حاصل نہ کر سکے، اب اس کے حصول میں کامیاب ہو گئیں۔

مشرقی پاکستان میں انتخاب کے دنوں ہی میں دجل و فریب کا یہ کھیل کھیلا جاتا رہا۔ دشمن کے جاسوس اور گوریلا ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے اور انہوں نے دہشت انگیزی کی ایسی فضا پیدا کر دی کہ جو مجیب الرحمٰن چاہتے تھے۔ وہی ہونا تھا۔ دوسرے لوگ نہ جلسہ کر سکتے تھے نہ اعلانیہ کنونشنگ کر سکتے تھے۔ ایسے میں انتخابات محض ایک دھوکا تھے لیکن جنرل یحییٰ خان کی حکومت چُپ سادھے رہی۔

انتخابات کے نتیجے سامنے آئے تو یحییٰ خان کی آنکھیں کھلیں۔ اُدھر مجیب الرحمٰن اس کامیابی پر

اتنے مست ہوئے کہ ۶ نکات پر زور دینے کی بجائے اعلانیہ علیحدگی کی باتیں کرنے لگے۔

۱۲۔ جنوری ۱۹۷۱ء کو صدر یحییٰ اور مجیب الرحمٰن میں مذاکرات ہوئے، صدر نے یہ تسلیم بھی کر لیا کہ ملک کی آئندہ حکومت مجیب الرحمٰن بنائیں گے لیکن مجیب اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ مغربی پاکستان میں واضح اکثریت مسٹر بھٹو کو حاصل تھی، بھٹو چاہتے تھے کہ مجیب ۶ نکات میں مناسب ترمیم پر راضی ہو جائیں لیکن وہ ذرا بھر جھکنے پر تیار نہ تھے۔ خان عبدالقیوم خان اور مولانا مودودی بھی ۶ نکات کو تسلیم کرنے پر راضی نہ تھے تاہم شیخ مجیب الرحمٰن ۶ نکات کو حرفِ آخر مانتے تھے۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہے اس پر مسٹر بھٹو نے لاہور میں اعلان کر دیا کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو وہ قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس ڈھاکہ کا بائیکاٹ کر دیں گے۔ بھٹو صاحب کی اس دھمکی کے جواب میں مجیب نے مشرقی پاکستان میں سول نافرمانی کی تحریک چلا دی، بنکوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے دفتروں میں کام کرنا ناممکن بنا دیا گیا۔ ڈھاکہ میں لوٹ مار اور آتش زنی کی کئی وارداتیں ہوئیں۔ بندرگاہیں بند کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ فوجی رسد رسانی میں بھی رکاوٹ ڈالی گئی۔ سرکاری عمارتوں پر عوامی لیگ اور بنگلہ دیش کے پرچم لہرا دیئے گئے۔ گویا کھلم کھلا بغاوت شروع ہو گئی۔

اس پر مارشل لاء سخت کر دیا گیا، جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ انہوں نے شرپسندوں کو سختی سے کچل دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں حالات پر قابو پا لیا۔ یہ حال دیکھ کر کئی لاکھ ہندو اور عوامی لیگی کلکتہ کو بھاگ گئے۔ فوج کے اختیار سنبھالنے سے عارضی طور پر پھر سے امن و امان قائم ہو گیا، بنک اور سرکاری دفتر کام کرنے لگے اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن اور بھارت نے اس پر واویلا مچا دیا، چپکے چپکے بھارت کے کئی ہزار تخریب پسند مشرقی پاکستان میں داخل کر دیئے گئے۔ اب یحییٰ خان کے لئے شیخ مجیب اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کئے بغیر کوئی چارہ نہ رہا ـــــ اُدھر بھارت کھلم کھلا شرپسندوں کی حمایت کرنے لگا، بھارت کی طرف سے قرارداد منظور کی گئی کہ مشرقی پاکستان میں عوام پر مظالم بند کئے جائیں ـــــ اس دوران مشرقی پاکستان میں کارروائیوں کے دوران پاک فوج نے آٹھ سو بھارتی فوجی گرفتار کئے جو تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے، اسی طرح جیسور میں بھی بھارتی فوج کی دو کمپنیوں کا صفایا کر دیا گیا۔ جنگ کا خطرہ بڑھتا گیا۔ بھارت نے کئی ڈویژن فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر جمع کر دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ بھارتی

فوجی شرپسندوں کے ساتھ مل کر سارے مشرقی پاکستان میں گوریلا جنگ شروع کر دیں ـــــ پاکستانی علاقے پر بھارتی لڑاکا طیارے بلا روک ٹوک پروازیں کرنے لگے ـــــ اصل میں شرپسندوں کا منصوبہ یہ تھا کہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو آزاد بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان کر دیں۔ تاہم جنرل ٹکا خان کی بروقت کارروائی سے اُن کے یہ منصوبے خاک میں مل گئے۔

۱۵ مئی ۱۹۷۱ء تک جنرل ٹکا خان نے مزاحمت کو کچل دیا اور حالات نسبتاً پُرسکون ہو گئے۔ اور عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ بھی یحییٰ خان کی حکومت کی سیاسی بصیرت کی کمی کا ثبوت تھا۔ معافی کا اعلان ہوتے ہی بھارت سے تربیت یافتہ ہزاروں تخریب کار مشرقی پاکستان واپس پہنچ گئے لنڈن ٹائمز نے ان شرپسندوں کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے۔ پھر سے بنگلہ دیش ریڈیو نے جو دراصل آل انڈیا ریڈیو ہی تھا، پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر دیا ـــــ ۲۸ جون ۱۹۷۱ء کو جنرل یحییٰ خان نے اعلان کیا کہ چار ماہ تک اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس دوران بھارت کی مسلح اشتعال انگیزیوں میں اضافہ ہو گیا۔

ان دنوں صدر یحییٰ خان کی حکومت سے ایک اور سیاسی غلطی سرزد ہوئی۔ انہوں نے امریکہ کے نمائندے کسنجر کو پیکنگ بھیجنے اور چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا اہتمام کیا۔ اس پر رُوس بگڑ گیا ـــــ روس، بھارت اور بنگلہ دیش کے شرپسندوں کے اس گٹھ جوڑ سے صورتِ حال مزید خراب ہو گئی، مشرقی پاکستان کے سرحدی دیہات پر بارہا بھارتی جنگی طیاروں نے بمباری کی، اُدھر بنگالی باشندوں کے ذہن میں تعصب کا زہر ایسا بھرا گیا کہ انہوں نے مغربی پاکستان کے لوگوں سے تعاون کرنے یا مغربی پاکستان کے افسروں کا حکم ماننے تک سے انکار کر دیا ـــــ ۲۹ اگست ۱۹۷۱ء کو پاک فضائیہ کے ایک بنگالی ہوا باز نے ایک پاکستانی طیارے کے اغواء کا منصوبہ بنایا لیکن پاکستانی فضائیہ کے نوعمر جرأت مند پائلٹ راشد منہاس نے جان کی بازی لگا کر پاکستان کے اس طیارے کو بھارت لے جانے کی سازش ناکام بنا دی، راشد منہاس زیرِ تربیت ہوا باز تھا اور بنگال کا افسر مطیع الرحمان اس کا انسٹرکٹر تھا، انسٹرکٹر کراچی سے اس ہوائی جہاز کو اغوا کر کے بھارت میں اتارنا چاہتا تھا۔ لیکن راشد منہاس نے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔ اس کش مکش میں طیارہ پاکستانی علاقے ہی میں (بھارت کی سرحد سے ۳۲ میل دُور) گرا اور تباہ ہو گیا۔ اس جرأت مندانہ کارنامے پر راشد منہاس

کو نشانِ حیدر عطا کیا گیا۔

اس دوران بھارت کی جنگی تیاریاں جاری رہیں، عام لام بندی کا اعلان کر دیا گیا، چھ لاکھ ریزرو سپاہی بھی طلب کر لئے گئے، رُوس بھی بھارت کی امداد کرنے لگا۔ کبھی سلہٹ پر فوجی کارروائی کی گئی جسے پاکستانی فوج نے پسپا کیا، کبھی میمن سنگھ کی سرحدی چوکی پر جھڑپ ہوتی۔ نواکھالی میں پاکستانی مجاہدوں نے دشمن کے کئی حملوں کو روکا ـــــ تری پورہ کے سرحدی گاؤں پر گولہ باری کی گئی۔ کومیلا میں بھارتی ٹینکوں کا حملہ پسپا کیا گیا۔

اب تک تو بھارتی فوج کی یہ اکا دکا کارروائیاں جاری تھیں۔ اب ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء سے بھارت کی باقاعدہ فوج تمام بین الاقوامی آداب کو پس پشت ڈال کر مشرقی پاکستان پر ٹوٹ پڑی، کسی باضابطہ اعلان کے بغیر ہی انہوں نے کھلم کھلا لڑائی شروع کر دی، جیسور، چٹاگانگ اور سلہٹ میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ پاکستان نے سلامتی کونسل تک کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن جنگ بندی کی بجائے بھارت کی جارحیت اور مداخلت بڑھتی ہی گئی۔

۳ دسمبر کو بھارتی فوج نے جنگ کا دائرہ بڑھا کر مغربی پاکستان پر بھی حملے شروع کر دیئے۔ پاک فضائیہ نے بھارتی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا ـــــ بھارت کے ۱۸۰ طیارے تباہ کر دیئے مغربی پاکستان میں تو پاکستانی مجاہدوں نے بھارت کی پیش قدمی روک دی۔ تاہم مشرقی پاکستان میں حالات دن بدن نازک صورت اختیار کرتے گئے، مغربی پاکستان سے خشکی کی راہ تو مشرقی پاکستان کو کوئی امداد پہنچ ہی نہ سکتی تھی۔ لے دے کے فضائی راستہ تھا لیکن ڈھاکہ کا ہوائی اڈہ تباہ کر دیا گیا اس کا رن وے بے کار ہو گیا، نہ کوئی ہوائی جہاز وہاں اتر سکتا تھا، نہ اُڑ سکتا تھا۔ جب فوج کو ہوائی تحفظ ہی حاصل نہ رہا تو وہ لڑتی کیسے؟ بھارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی تین لاکھ فوج تو پہلے ہی مشرقی پاکستان میں لڑ رہی تھی۔ اب اس نے ڈھاکہ کے گرد و نواح بیسیوں محاذ کھول دیئے۔ ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود پاکستانی فوج نے اپنا فرض ادا کیا، ہلی، دیناجپور راجشاہی، سلہٹ، رنگ پور جیسور، ڈھاکہ ہر جگہ وہ سر پر کفن باندھ کر لڑے، انہوں نے اپنے خون سے شجاعت و عزیمت کی تاریخ رقم کی لیکن ان پر جو سب سے بڑی قیامت ٹوٹی وہ اپنوں ہی کے ہاتھوں ٹوٹی۔ ہمارے فوجی لڑتے تو کس کے لئے لڑتے؟ جن لوگوں کے تحفظ اور دفاع کے لئے

وہ سر ہتھیلی پر رکھے لڑنے گئے تھے، وہ تو ہندوؤں کے فریب میں آکر انہیں پانی تک دینے کے روادار نہ تھے، شیخ مجیب نے اُن کے ذہنوں کو مسموم کر رکھا تھا۔ وہ اسلامی اخوت سے منہ موڑ چکے تھے وہ الٹا مغربی پاکستان کے فوجی مجاہدوں ہی کو اپنا دشمن سمجھے بیٹھے تھے، چنانچہ وہی بھارتی جو ۱۹۶۵ء کے جہاد میں کسی بھی جگہ ہماری جانباز فوجوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے تھے، اب شیر ہو گئے انہوں نے اُس شکست کا بدلہ مشرقی پاکستان میں یوں لیا کہ پاکستان کے ایک بازو کے مسلمانوں کو دوسرے بازو کے مسلمانوں بدظن کر دیا۔ مسلمان مسلمان کا خون بہانے لگے تو قیامت کیونکر نہ ٹوٹے ــــ سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں وہ قیامت ہم پر ٹوٹ کر رہی ــــ ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء تک صورتِ حال بہت ہی سنگین ہو گئی جس پر پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنگ بندی کی قرارداد منظور کر لی۔

پاکستان کی جانب سے مسٹر بھٹو کو جو اُن دنوں نائب وزیرِ خارجہ تھے، امریکہ بھیجا گیا، انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اقوامِ متحدہ کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں اور مشرقی پاکستان کے سلسلے میں کوئی آبرومندانہ حل نکل آئے۔ اپنی شعلہ بیانی سے مسٹر بھٹو نے اقوام متحدہ کو گرمایا لیکن وہ کرتے بھی تو کیا روس نے جنگ بندی کی قرارداد کو ویٹو کر دیا ــــ ۱۵ر دسمبر کو سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا تو بھٹو نے سلامتی کونسل کے ارکان پر صورتِ حال پوری طرح واضح کی۔ لیکن وہاں تو سپر طاقتوں کی مصلحتیں اور خوشنودیاں مطلوب تھیں، انصاف مانگا جاتا تو کس سے؟ اس پر ۱۵ر دسمبر کو بھٹو نے اقوامِ متحدہ کی قرارداد پھاڑ دی اور یہ کہتے ہوئے اجلاس سے واک آؤٹ کر دیا کہ جس قرارداد پر عمل درآمد نہ ہو سکے اس کے منظور کرنے کا کیا فائدہ؟

یحییٰ خان اور اُس کی فوجی قیادت اس نازک صورت حال سے نمٹنے سے قاصر رہی، بالآخر مشرقی پاکستان میں ہماری فوجوں کو ہتھیار ڈالنے کے بغیر چارہ نہ رہا۔ قریباً ۹۶ ہزار سپاہی اور ۱۰۵۸ افسر دشمن کے قیدی بن گئے ــــ کروڑوں روپے کا اسلحہ اور سامانِ جنگ دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔ بھارت نے مشرقی پاکستان پر اپنے قبضے کا اعلان کر دیا ــــ مجیب کی مکتی باہنی اور بھارتی فوج نے مل کر پاکستان کے حامی بہاریوں، مغربی پاکستانیوں اور اسلام کا نام لینے والوں کا قتلِ عام شروع کر دیا اور پانچ لاکھ کے قریب بے بس مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ــــ چھ ماہ تک بھارتی فوج مشرقی پاکستان میں مقیم رہی، وہاں سے سارے کارخانے اور مشینری بھارت کو منتقل کر دی، جب

مشرقی پاکستان بالکل قلاش اور بے بس ہو گیا تو شیخ مجیب الرحمٰن "بنگلہ بندھو" بنے لیکن بدحالی اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ چار سال کے بعد ہی انہیں اس برادر کشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا، ۱۵ر اگست ۱۹۷۵ء کی خوفناک رات کو شیخ مجیب اور اس کے تمام عزیز و اقارب کو چُن چُن کر گولی کا نشانہ بنایا گیا اور گولی چلانے والے خود اُن کے ماتحت فوجی افسر تھے، میجر جنرل ضیاء الرحمٰن نے اُن کی جگہ لی تو کچھ عرصہ بعد اُن کا انجام بھی یہی ہوا۔ آج کل وہاں میجر جنرل ارشاد برسر اقتدار ہیں اور کوئی مجیب الرحمٰن کا نام تک لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کا شدید ردِ عمل ہوا۔ سارا ملک ماتم کدہ بن کر رہ گیا، عوام نے جنرل یحییٰ اور اور اس کے صلاح کاروں کو اس تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ـــــ ہر طرف مظاہرے شروع ہو گئے۔ مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ یحییٰ خان دستبردار ہو اور اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو نیویارک سے اسلام آباد پہنچے تو یحییٰ خان نے اختیارات انہیں سونپ دیئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ ہمارے ایک لاکھ افراد بھارت کی قید میں تھے اور مغربی پاکستان کے پانچ ہزار مربع میل کے علاقے پر بھی بھارت کا قبضہ ہو چکا تھا۔

یحییٰ خان کا دورِ حکومت بڑا کرب ناک اور صبر آزما تھا۔ اس کے عاجلانہ فیصلوں نے مغربی پاکستان کی وحدت ختم کی، سرحدی ریاستوں کو توڑ کر خواہ مخواہ کا مسئلہ کھڑا کیا، "ایک آدمی، ایک ووٹ" کے چکر میں آکر ایسے وقت انتخابات کرائے جب مشرقی پاکستان میں نفرت کا لاوا پھوٹنے ہی والا تھا، ہماری افواج کو بنگال میں انتہائی ذلت آمیز شکست میں جھونک دیا گیا اور مغربی پاکستان کے محاذ پر بھی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہمیں نقصان سے دوچار ہونا پڑا ـــــ ؟ ملک پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹی لیکن کسی غلط کار فوجی جرنیل سے باز پرس تک نہ ہوئی ـــــ جنرل یحییٰ، جنرل حمید اور لفٹیننٹ جنرل پیرزادہ کا کورٹ مارشل ہوا نہ جنرل نیازی اور دوسروں سے باز پرس ہوئی ـــــ بلکہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب تک پر حکومت کی طرف سے روشنی نہ ڈالی گئی اور عوام جس طرح اندھیرے میں تھے اندھیرے ہی میں رہے ـــــ اگر کوئی تحقیقات ہوئی بھی تو وہ عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہی۔

بتایا جاتا ہے کہ افسر شاہی نے بھی ملک کو توڑنے کے اس عمل میں کردار انجام دیا۔ "افسر شاہی کو پوری طرح معلوم تھا کہ اُس وقت ملک کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں اور خود اُس (افسر شاہی) کے اسلام آباد

گروپ میں ایک خاص طبقہ موجود تھا، جو مشرقی پاکستان کو پاکستان کی معیشت کے لئے بوجھ تصور کرتا تھا گویا بیرونی طاقتوں کے اس "پاکستان توڑ" عمل سے یہ لوگ بھی بخوبی واقف تھے"[1]

تاہم ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمارے عام فوجی کا کردار نہایت شاندار رہا، انہوں نے پوری جان نثاری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ اگر ۱۹۶۵ء کے جہاد میں صرف میجر عزیز بھٹی "نشان حیدر" کے حقدار قرار پائے تھے تو ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر میجر محمد اکرم شہید اور مغربی پاکستان کے محاذ پر پائلٹ آفیسر راشد منہاس، میجر شبیر شریف شہید، سوار محمد حسین شہید اور سپاہی محفوظ شہید نے اپنی جان کی قربانی دے کر "نشانِ حیدر" حاصل کیا۔ یہ انہی قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کے دلوں میں فوج کی عظمت اور عزت نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوا — تاہم اگر کہیں خامی تھی تو اُس کی ذمہ داری اس قیادت پر عائد ہوتی ہے جس کی غلط پالیسیوں، غلط اندازوں اور غلط فیصلوں نے قوم کو تباہی سے ہم کنار کر دیا اور ملک کا ایک بازو دوسرے بازو سے جُدا ہو کر رہ گیا۔

---

[1] مسٹر ابو سعید انور، "نوائے وقت" ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء

فہرست منابع و مراجع

۱۔ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ ——— پنجاب یونیورسٹی

۲۔ اُردو میں پشتو کا حصّہ ——— امتیاز علی عرشی

۳۔ آثارِ قدیمہ ——— عنایت علیشاہ بخاری

۴۔ پاک تاریخ ——— پروفیسر رضا خان

۵۔ تاریخ ہند کے ماخذ ——— عطا حسین، فیروز سنز

۶۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ——— سیّد ہاشمی فرید آبادی

۷۔ تاریخ پاکستان و اسلام ——— صاحبزادہ عبدالرسول

۸۔ تاریخ پنجاب ——— اقبال صلاح الدین

۹۔ تاریخ خٹک ——— سرفراز خان عقاب خٹک

۱۰۔ پاکستان کے تیئس ۲۳ سال ——— زاہد حسین انجم

۱۱۔ تاریخ سرحد ——— چوہدری بے کرشن

۱۲۔ تاریخ آزاد پٹھان ——— اللہ بخش یوسفی

۱۳۔ تواریخ حافظ رحمت خان ——— پشتو اکاڈمی

۱۴۔ تاریخ پنجاب (مختصر) ——— فیروز سنز

۱۵۔ تاریخ ہند (مختصر) ——— سیّد ابوظفر ندوی

۱۶۔ تاریخِ مغربی پاکستان ——— رشید اختر ندوی

۱۷۔ نادر التواریخ ——— فیروز سنز

۱۸۔ تاریخ ہزارہ ——— ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی

۱۹۔ تاریخ ہزارہ ——— محمد ارشاد خان

۲۰۔ تاریخ پاک و ہند ——— پروفیسر ایم شمس الدین
۲۱۔ تحقیق الافغان ——— سمیع اللہ جان
۲۲۔ افغانوں کی نسلی تاریخ ——— خان روشن خان
۲۳۔ تذکرہ صوفیائے سرحد ——— قدوسی
۲۴۔ جماعتِ مجاہدین ——— غلام رسول مہر
۲۵۔ حیات حافظ رحمت خان ——— سید الطاف علی بریلوی
۲۶۔ حیات محمد علی جناح ——— رئیس احمد جعفری
۲۷۔ داستانِ خیبر ——— محمد شفیع صابر
۲۸۔ داستانِ دیر ——— ریاض الحسن آزاد
۲۹۔ خوشحال خان خٹک ——— دوست محمد خان کامل
۳۰۔ خوشحال نامہ ——— اباسین آرٹس کونسل
۳۱۔ خان بہادر شہید ——— سید مصطفیٰ علی بریلوی
۳۲۔ سرحد اور جدوجہد آزادی ——— اللہ بخش یوسفی
۳۳۔ سیاسیاتِ سرحد کے ارتقائی مراحل ——— " " "
۳۴۔ سید احمد شہیدؒ ——— غلام رسول مہر
۳۵۔ سکندر کی کہانی ——— سید قاسم محمود
۳۶۔ سکندر اعظم ——— ہیرلڈ لیم
۳۷۔ سوانح احمدیہ ——— جعفر تھانیسری
۳۸۔ صراط التوحید ——— بایزید انصاری
۳۹۔ قائد اعظم اور صوبہ سرحد ——— محمد شفیع صابر
۴۰۔ قیامِ پاکستان ——— فاروق اختر نجیب
۴۱۔ کشمیر کے حملہ آور ——— میجر جنرل اکبر خان
۴۲۔ کاروانِ سرحد کے مضامین ——— محکمہ اطلاعات صوبہ سرحد

۴۳۔ کمپنی کی حکومت ——— باری علیگ

۴۴۔ لوئے پختون ——— میر عبدالصمد خان

۴۵۔ مسلم لیگ کا دورِ حکومت ——— صفدر محمود

۴۶۔ مغربی پاکستان ——— ادارہ مطبوعاتِ پاکستان

۴۷۔ میرا وطن ——— سید جمال الدین افغانی

۴۸۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے ——— دارالمصنفین

۴۹۔ یوسف زئی ——— اللہ بخش یوسفی

۵۰۔ مختلف اخبارات و رسائل ———

۵۱۔ د آزادی تلاش ——— میاں اکبر شاہ بدرشی

۵۲۔ د پښتنو تاریخ ——— قاضی عطاء اللہ خان

۵۳۔ بنوں او د وزیرستان تاریخ ——— گل ایوب خان سیفی

۵۴۔ پښتانہ د تاریخ په رنړا کښ ——— سید بہادر شاہ ظفر

۵۵۔ روبنانیان ——— عبدالاکبر خان اکبر

۵۶۔ مرقعِ مشاہیر ——— ادارہ مطبوعات پاکستان

۵۷۔ ننگیالئ ——— خان میر ہلالی

۵۸۔ تذکرۂ علماء و مشائخ سرحد ——— سید محمد امیر قادری

۵۹۔ د آزادی جنگ ——— عبدالخالق خلیق

BIBLIOGRAPHY

1.	A short Guide to Takhat Bhai	...	M.A.Shakoor
2.	A short History of Muslim Rule in India	...	Ishwari Parshad
3.	A Peep into Early History of India	...	R.G. Bhanlarkar.
4.	A year on the Frontier.	...	Herbert Edwards.
5.	Barakzais	...	Edward A. Pears.
6.	British Rule in India	...	R. R. Sethi.
7.	Buddhism in Pakistan	...	Pakistan Publication
8.	Cabinet Mission & After	...	M. Ashraf.
9.	Chronology of Pakistan	...	Press Information Deptt.
10.	Campaigns against N.W.F.P.	...	Nevill.
11.	Dost Muhammad Khan	...	Sir John Kaye.
12.	District Census Report	...	Government of Pakistan.
13.	District Gazetteer-Peshawar	...	Government of Pakistan.
14.	Eighteen years in the Khyber	...	Warburton.
15.	Evolution of the N.W.F.P.	...	Oberoi.
16.	Expeditions against N.W.F.P.	...	Mason.
17.	Freinds not Masters	...	F. M. Mohd. Ayub Khan.
18.	Freedom at Midnight	...	Larry Collins.
19.	Frontier speaks	...	M. Younas.
20.	Frontier Information	...	Information Department N.W.F.P.
21.	Hazara Gazetteer	...	N.W.F.P. Government.
22.	History of India	...	Longman.
23.	History of the Punjab	...	H. Allen & Co., London.
24.	History of India	...	Perceival Spear.
25.	History of Swat	...	A. Ghafoor Qasmi.
26.	History of the Punjab.	...	Maj. E. A. P. Holiday.
27.	History of the Muslim World	...	Ahsanullah
28.	Here and There in Afghanistan	...	Prita K. Shilzi
29.	Imperial Gazetteer of India	...	1908.
30.	Indian Year Book	...	1945-46.
31.	Indian Year Book	...	1946-47.
32.	India	...	1921-22.
33.	India	...	1924-25.
34.	India's North-West Frontier	...	Sir William Barton.
35.	Jinnah.	...	M. H. Sayid.
36.	Kabul.	...	Stewart Elphinston
37.	Muslim League—yesterday and Today	...	A. B. Rajpoot.
38.	Muslim India.	...	M. Noman.
39.	North-West Frontier	...	David Dichter.

40.	North-West Frontier Province	...	S. M. Idrees.
41.	North-West Frontier	...	Arther Swinson.
42.	Notes on the Frontier Province	...	1926.
43.	N.W.F.P. Year Book	...	1981.
44.	Pakistan	...	Ian Stephens.
45.	Peshawar—A Historic City	...	Prof. A. H. Dani.
46.	Peshawar—Past and Present	...	S. M. Jaffar.
47.	Peshawar to Moscow	...	Shaukat Usmani.
48.	Peshawar Distt. Gazetteer	...	1931.
49.	Rising of the North-West Frontier	...	1897-98.
50.	Ranjit Singh	...	Sir Leppil Griffin.
51.	Shahbaz Garhi	...	A. H. Dani.
52.	Some Cultural Aspects of Muslim Rule in India.	...	S. M. Jaffar.
53.	Story of Khyber	...	M. Shafi Sabir.
54.	Tales of Tirah & Tibet	...	Mrs. Starr.
55.	The Pathans.	...	Sir Olaf Caroe.
56.	The Romance of the Indian Frontier	...	Lt. Gen. Mac Man.
57.	The Arab Invasion of India	...	Maujamdar.
58.	The year Book of N.W.F.P.	...	Information Department.
59.	The Afghans in India	...	Dr. M. A. Rabim.
60.	The Indian Musalmans	...	W. W. Hunter.
61.	Twenty Years of Pakistan	...	Govt. Publications.
62.	Winston Churchil.	...	Phillip Guedalla.
63.	Yousafzais	...	Bellew.